معارف القرآن

جلد ہشتم

سورۂ ق سے آخر قرآن تک ۔ پارہ ۲۶ رکوع ۱۵ تا آخر قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمہ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف
کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه

ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا

من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له

ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له

ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله

صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين

معارف القرآن

جلد ہشتم

سورۂ محمّد سے آخرِ قرآن تک ○ پارہ:۲۶، رُکوع:۵ تا آخرِ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012 — جامع مسجد آرام باغ کراچی — موبائل نمبر 0300-3311811

نشان مجاریہ: آر۔آر۔او (اوقاف)
R.O. 45-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ''اِدارۃُ المعارف کراچی'' احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ''معارف القرآن'' مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان، جلد ہشتم کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ''معارف القرآن'' کے مکمل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اَغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ دُرست کروا دیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ''معارف القرآن'' حتی الامکان لفظی اور اعرابی اَغلاط سے ان شاء اللہ تعالیٰ پاک ومبرّا ہے۔

نوٹ:۔حکومت پاکستان کے قانون کے مطابق کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر **2743** کے تحت تفسیر ''معارف القرآن'' (جلد ہشتم) کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

المصدق

4-2-2021

RESEARCH AND REGISTRATION OFFICER — GOVERNMENT OF SINDH — AUQAF DEPARTMENT

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

باہتمام : محمد مشتاق سنّی

طبع جدید : محرم ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء ④

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : اِدارۃُ المعارف کراچی

عرضِ ناشر:- اگرچہ ''معارف القرآن'' کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ و کتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مطّلع فرمائیں۔

اِدارۃُ المعارف کراچی

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: 75180
فون: 021-35032020، 021-35123161
موبائل: 0300 - 2831960
ای میل: imaarif@live.com

Idaratul-ma-Arif Karachi-14 Pakistan — المعارف

فہرست مضامین ''معارف القرآن'' جلد ہشتم

***

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

آیاتھا ۳۸ | ۴۷ سُورَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ ۹۵ | رکوعاتھا ۴

سورۂ محمد مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں اڑتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ①

جو لوگ کہ منکر ہوئے اور روکا اوروں کو اللہ کی راہ سے کھودیئے اللہ نے ان کے کئے کام

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ

اور جو یقین لائے اور کئے بھلے کام اور مانا اس کو جو اُترا محمد پر

وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ②

اور وہی ہے سچا دِین ان کے ربّ کی طرف سے اُن پر سے اُتاریں اُن کی بُرائیاں اور سنوارا اُن کا حال

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ

یہ اس لئے کہ جو منکر ہیں وہ چلے جھوٹی بات پر اور جو یقین لائے انہوں نے مانی سچی بات

مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③

اپنے رب کی طرف سے، یوں بتلاتا ہے اللہ لوگوں کو اُن کے احوال

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جن لوگوں نے کفر اختیار کرلیا ہے، اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے، اللہ نے اُن کے اعمال اکارت کر دیئے ہیں۔ ① اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اور ہر اُس بات کو دِل سے مانا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی گئی ہے ــــ اور وہی حق ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے ــــ اللہ نے اُن کی بُرائیوں کو معاف کردیا ہے، اور ان کی حالت سنوار دی ہے۔ ② یہ اس لئے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، وہ باطل کے پیچھے چلے ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اُس حق کے پیچھے چلے ہیں جو اُن کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے۔ اسی طرح اللہ لوگوں کو بتا رہا ہے کہ اُن کے حالات کیا کیا ہیں۔ ③

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (خود بھی) کافر ہوئے اور (دوسروں کو بھی) اللہ کے راستے سے روکا (جیسا رؤسائے کفار کی عادت تھی کہ جان و مال سے ہر طرح کی کوشش اسلام کا راستہ روکنے میں کرتے تھے سو) خدا نے اُن کے عمل کالعدم کردیئے (یعنی جن کاموں کو وہ نیک سمجھ رہے ہیں بوجہ عدم ایمان کے وہ مقبول نہیں، بلکہ اُن میں سے بعضے کام اور اُلٹے موجب عتاب ہیں جیسے اللہ کے راستے پر چلنے سے روکنے میں خرچ کرنا، کما قال تعالیٰ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً[1] الخ (الانفال:۳۶) اور (برخلاف ان کے) جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کئے اور (ان کے ایمان کی کیفیت تفصیلی یہ ہے کہ) وہ اس سب پر ایمان لائے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے اور وہ (جو نازل کیا گیا ہے وہ)

۱ ترجمہ: سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہی رہیں گے پھر وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے۔

اُن کے رَبّ کے پاس سے (آیا ہوا) امر واقعی (بھی) ہے (جس کا ماننا ہے بھی ضروری سو) اللہ تعالیٰ ان کے گناہ اُن پر سے اُتارے گا (یعنی معاف کردے گا) اور (دونوں جہان میں) اُن کی حالت دُرست رکھے گا (دُنیا میں تو اس طرح کہ اُن کو اعمالِ صالحہ کی توفیق بڑھتی جائے گی اور آخرت میں اس طرح کہ ان کو عذاب سے نجات اور جنت میں داخلہ ملے گا اور) یہ (جو مؤمنین کی خوشحالی اور کفار کی بدحالی بیان کی گئی) اس وجہ سے ہے کہ کافر تو غلط راستہ پر چلے اور اہلِ ایمان صحیح راستہ پر چلے جو اُن کے رَبّ کی طرف سے (آیا) ہے، (اور غلط راستہ کا موجب ناکامی ہونا اور صحیح راستہ کا سبب کامیابی ہونا ظاہر ہے اس لئے وہ ناکام ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ اور اگر اسلام کے صحیح راستہ ہونے میں کوئی شبہ ہو تو مِنْ رَّبِّهِمْ سے اس کا جواب ہوگیا کہ دلیل اس کی صحیح ہونے کی یہ ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے اور من جانب اللہ ہونا تمام معجزاتِ نبویہ سے بالخصوص اعجازِ قرآنی سے ثابت ہے اور) اللہ تعالیٰ اسی طرح (جیسے یہ حالت بیان فرمائی) لوگوں کے (نفع وہدایت کے) لئے اُن (مذکورین) کے حالات بیان فرماتا ہے (تاکہ ترغیب وترہیب کے دونوں طریقوں سے ہدایت کی جائے)۔

معارف ومسائل

سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی ہے کیونکہ جہاد وقتال کے اَحکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد ہی یہ سورت نازل ہوئی یہاں تک کہ اس کی ایک آیت وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ[1] (محمد: ۱۳) کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ وہ مکی آیت ہے کیونکہ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی نیت سے مکہ معظمہ سے نکلے اور مکہ مکرمہ کی بستی اور بیت اللہ پر نظر کرکے آپ نے فرمایا کہ ساری دُنیا کے شہروں میں مجھے تو ہی محبوب ہے، اگر اہلِ مکہ مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں خود اپنے اختیار سے مکہ مکرمہ کو نہ چھوڑتا، اور اصطلاحِ مفسرین کے مطابق جو آیات سفرِ ہجرت مدینہ کے دَوران میں نازل ہوئی ہیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت مدینہ کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے اور یہیں پہنچ کر کفار سے جہاد وقتال کے اَحکام نازل ہوئے ہیں۔

وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ میں ان کفار کے وہ اعمال مراد ہیں جو فی نفسہٖ نیک کام ہیں جیسے مساکین کی امداد واعانت، پڑوسی کی حمایت وحفاظت، سخاوت اور صدقہ خیرات وغیرہ کہ یہ اعمال اگرچہ اپنی ذات میں نیک اور اچھے عمل ہیں لیکن آخرت میں ان کا فائدہ ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہے کافروں کے ایسے نیک اعمال آخرت میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے البتہ دنیا میں ہی ان کو ان کے نیک کاموں کے بدلے میں راحت وآرام دے دیا جاتا ہے۔

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو عذاب سے ہلاک کر دیا سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ، اگرچہ پہلے جملے میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر آچکا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر نازل ہونے والی وحی بھی شامل ہے مگر اس دوسرے جملے میں اس کو بالتصریح ذکر کرنے میں یہ بتلانا منظور ہے کہ ایمان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کو صدق دل سے قبول کیا جائے۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ② لفظ بال کبھی شان اور حال کے معنی میں آتا ہے اور کبھی قلب کے معنی میں یہاں دونوں معنی لئے جاسکتے ہیں، پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حال کو یعنی دُنیا و آخرت کے تمام کاموں کو درست کر دیا اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کو درست کر دیا حاصل اس کا بھی وہی ہوگا کہ تمام کام درست کر دیئے کیونکہ کاموں کی درستی قلب کی درستی کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ

سو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو اُن کو

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ مع

تو مضبوط باندھ لو قید پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب اُن لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہو جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے، تو گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم اُن کی طاقت کچل چکے ہو، تو مضبوطی سے گرفتار کرلو، پھر چاہے احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار پھینک کر ختم ہو جائے۔

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر کی آیات میں اہلِ ایمان کا مصلح ہونا اور کفار کا مفسد ہونا بیان ہوا ہے اس کی مناسبت سے کفر و کفار کا فساد

رفع کرنے کے لئے اس آیت میں اَحکامِ جہاد کا ذکر ہے) سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو جائے تو اُن کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم اُن کی خوب خونریزی کر چکو (جس کی حد یہ ہے کہ کفار کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے اور قتال بند کرنے سے مسلمانوں کی مضرت یا کفار کے غلبہ کا خوف نہ رہے) تو (اس وقت کفار کو قید کر کے) خوب مضبوط باندھ لو پھر اس کے بعد (تم کو دو باتوں کا اختیار ہے) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا (اور یہ قید اور قتل کا حکم اُس وقت تک ہے) جب تک کہ لڑنے والے (دشمن) اپنے ہتھیار نہ رکھ دیں (مراد اس سے اسلام یا استسلام ہے یعنی یا تو اسلام قبول کر لیں یا مسلمانوں کا ذمی ہو کر رہنا قبول کر لیں تو پھر نہ قتل جائز ہے نہ قید)

معارف و مسائل

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ جب قتال کے ذریعہ کفار کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے تو اب بجائے قتل کرنے کے ان کو قید کر لیا جائے پھر ان جنگی قیدیوں کے متعلق مسلمانوں کو دو اختیار دیئے گئے، ایک یہ کہ اُن پر احسان کیا جائے بغیر کسی فدیہ اور معاوضہ کے چھوڑ دیا جائے دوسرے یہ کہ اُن سے کوئی فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔ فدیہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے کچھ مسلمان ان کے ہاتھ میں قید ہوں تو اُن سے تبادلہ کر لیا جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ مال کا فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔ یہ حکم بظاہر اس حکم کے خلاف ہے جو سورۂ انفال کی آیت میں گزر چکا ہے جس میں غزوۂ بدر کے قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اس عمل پر اللہ تعالیٰ کا عذاب قریب آ گیا تھا اگر یہ عذاب آتا تو اس سے بجز عمر بن خطابؓ اور سعد بن معاذؓ کے کوئی نہ بچتا کیونکہ اُنہوں نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے سے اختلاف کیا تھا جس کی پوری تفصیل معارف القرآن جلد چہارم میں صفحہ: ۳۱۲ سے ۳۱۸ تک لکھی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت انفال نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا بھی ممنوع کر دیا تو بلا معاوضہ چھوڑنا بدرجۂ اَولیٰ ممنوع ہوگا۔ اور سورۂ محمد کی آیتِ مذکورہ نے ان دونوں چیزوں کو جائز قرار دیا ہے اس لئے اکثر صحابہ اور ائمہ فقہاء نے فرمایا کہ سورۂ محمد کی اس آیت نے سورۂ انفال کی آیت کو منسوخ کر دیا تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حسن اور عطاء اور اکثر صحابہ و جمہور فقہاء کا یہی قول ہے اور ائمہ فقہاء میں سے ثوری، شافعی، احمد، اسحاق رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی قلّت تھی اس وقت منّ وفداء کی ممانعت آئی اور پھر جب مسلمانوں کی شوکت وتعداد بڑھ گئی تو سورۂ محمد میں منّ وفداء کی اجازت دے دی گئی۔ تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہؒ نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہی قول صحیح اور مختار ہے کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل فرمایا اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے اس پر عمل فرمایا اس لئے یہ آیت سورۂ انفال کی آیت کے لئے

ناسخ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سورۂ انفال کی آیت غزوۂ بدر کے وقت نازل ہوئی جو ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ غزوۂ حدیبیہ میں جن قیدیوں کو بلا معاوضہ آزاد فرمایا ہے وہ سورۂ محمد کی اس آیت مذکورہ کے مطابق ہے۔[1]

صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اہلِ مکہ میں سے اسّی آدمی اچانک جبل تنعیم سے اُترے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے خبر پا کر قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زندہ گرفتار کر لیا پھر بلا معاوضہ آزاد کر دیا۔ اسی پر سورۂ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ[2][3] (الفتح: ۲۴)، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اُن کی ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لے کر آزاد کرنا جائز نہیں اسی لئے علماء حنفیہ نے سورۂ محمد کی آیت مذکورہ کو امام اعظم کے نزدیک منسوخ اور سورۂ انفال کی آیت کو ناسخ قرار دیا ہے مگر تفسیر مظہری نے یہ واضح کر دیا کہ سورۂ انفال کی آیت پہلے اور سورۂ محمد کی آیت بعد میں نازل ہوئی ہے اس لئے وہی ناسخ اور انفال کی آیت منسوخ ہے اور امام اعظم کا مختار مذہب بھی جمہور صحابہ وفقہاء کے مطابق آزاد کر دینے کے جواز کا نقل کیا ہے جبکہ مسلمانوں کی مصلحت اس میں ہو، اور فرمایا کہ یہی اصح اور مختار ہے۔ علمائے حنفیہ میں سے علامہ ابنِ ہمام فتح القدیر میں اسی طرف مائل ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قدوری اور ہدایہ کی روایت کے مطابق امام اعظم کے نزدیک قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک روایت ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے، مگر اُنہی سے دوسری روایت سیر کبیر میں جمہور کے قول کے مطابق جواز کی منقول ہے[4] اور یہی ان دونوں روایتوں میں اظہر ہے[5] اور امام طحاوی نے معانی الآثار میں اسی کو ابوحنیفہؒ کا مذہب قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ محمد اور سورۂ انفال کی دونوں آیتیں جمہور صحابہ وائمہ کے نزدیک منسوخ نہیں، مسلمانوں کے حالات اور ضرورت کے تابع امام المسلمین کو اختیار ہے کہ ان میں جس صورت کو مناسب سمجھے اختیار کر لے۔ قرطبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو کبھی قتل کیا گیا ہے اور کبھی غلام بنایا گیا اور کبھی فدیہ لے کر چھوڑا گیا اور کبھی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا گیا۔ فدیہ لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے بدلے میں مسلمان قیدی آزاد کرا لئے جائیں اور یہ بھی کہ اُن سے کچھ مال لے کر چھوڑا جائے، دونوں قسم کی صورتیں رسول اللہ صلی اللہ

---

۱ تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۸ ص:۴۲۲

۲ ترجمہ: اور وہ ایسا ہے کہ اس نے اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے عین مکہ میں روک دیئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔

۳ صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب قول الله تعالىٰ: وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ الآية، ج:۲ ص:۱۱۶

۴ المبسوط، كتاب السير، باب الأسير يقتل او يفادى ج:۱۰ ص:۳۴۳

۵ تفسير المظهري، تفسير سورة الأنفال ج:۴ ص:۱۱۴

علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت ہیں اس تفصیل کو نقل کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملے میں جن آیتوں کو ناسخ منسوخ کہا گیا درحقیقت وہ سب محکم ہیں ان میں سے کوئی منسوخ نہیں، اس لئے کہ جب کفار قید ہو کر ہمارے قبضے میں آئیں تو امام المسلمین کو چار چیزوں کا اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو قتل کر دے اور مصلحت مسلمانوں کی سمجھے تو ان کو غلام اور لونڈی بنالے، اور فدیہ لے کر چھوڑنے میں مصلحت ہو تو فدیہ مال کا یا مسلمان قیدیوں کا لے کر چھوڑ دے یا بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دے۔ قرطبی نے یہ تفصیل نقل کر کے لکھا ہے وَھٰذَا الْقَوْلُ یُرْوٰی مِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَةِ وَالشَّافِعِیّ وَاَبِیْ عُبَیْد وَحَکَاہُ الطَّحَاوِیُّ مَذْھَبًا عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَالْمَشْھُوْرُ مَا قَدَّمْنَاہُ، یعنی علمائے مدینہ کا یہی قول ہے اور یہی قول امام شافعیؒ اور ابوعبیدؒ کا ہے اور امام طحاویؒ نے ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اگرچہ مشہور مذہب ان کا اس کے خلاف ہے۔ (قرطبی ص:۲۲۸ ج:۱۶)

جنگی قیدیوں کے متعلق امام المسلمین کو چار اختیار

مذکورالصدر تقریر سے واضح ہو گیا کہ جنگی قیدیوں کے قتل اور استرقاق یعنی غلام بنالینے کا جو امام المسلمین کو اختیار ہے اس پر تو تمام اُمت کا اجماع ہے اور فدیہ لے کر یا بلا معاوضہ آزاد کرنے میں اگرچہ کچھ اختلافات ہیں مگر جمہور کے نزدیک یہ دونوں صورتیں بھی جائز ہیں۔

اسلام میں غلامی کی بحث

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دینے میں تو فقہاء کا کچھ اختلاف ہے بھی، قتل کرنے اور غلام بنانے کی اجازت میں کوئی اختلاف نہیں سب کا اجماع ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، پھر قرآنِ کریم میں ان دو صورتوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اور صرف آزاد چھوڑنے کی دو صورتوں ہی کا بیان کیوں کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب امام رازی نے تفسیر کبیر میں یہ دیا ہے کہ یہاں صرف اُن دو صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت جائز ہوں، غلام بنانے کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ عرب کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے، اور قتل بھی اپاہجوں وغیرہ کا جائز نہیں اس کے علاوہ قتل کا ذکر اوپر آ بھی چکا ہے۔ (تفسیر کبیر ص:۵۰۸ ج:۷)[1]

دُوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک قتل کرنے اور غلام بنانے کا تعلق ہے اس کا جواز بہت معروف و مشہور تھا، سب کو معلوم تھا کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اس کے برخلاف آزاد چھوڑ دینے کو غزوۂ بدر کے موقع پر ممنوع کر دیا گیا تھا، اب اس

[1] التفسیر الکبیر تحت ھٰذہ الآیة ج:۱۴ ص:۸۰

مقام پر آزاد چھوڑنے کی اجازت دیناہی مقصود تھا اس لئے اسی کی دوصورتوں یعنی منّ اور فداء کا ذکر کردیا گیا، اور جوصورتیں پہلے سے جائز تھیں انہیں اس موقع پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے ان آیات میں اُن سے سکوت اختیار کیا گیا، لہٰذا ان آیات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد قتل یا غلام بنانے کی اجازت منسوخ کردی گئی ہے، ورنہ اگر غلام بنانے کا حکم منسوخ ہوگیا ہوتا تو قرآن وحدیث میں کسی ایک جگہ تو اس کی ممانعت مذکور ہوتی، اور اگر یہ آیت ہی ممانعت کے قائم مقام تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد قرآن وحدیث پر جان دینے والے صحابۂ کرامؓ نے بے شمار غزوات میں جنگی قیدیوں کو غلام کیوں بنایا؟ روایاتِ حدیث وتاریخ میں غلام بنانے کا ذکر اس کثرت اور معنوی تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ اس کا انکار مکابرہ کے سوا کچھ نہیں۔

رہا یہ اشکال کہ اسلام، جو حقوقِ انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہے، اُس نے غلامی کی اجازت کیوں دی؟ سو درحقیقت یہ اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی جائز کی ہوئی غلامی کو دیگر مذاہب واقوام کی غلامی پر قیاس کرلیا گیا ہے، حالانکہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق عطا کئے اور معاشرے میں ان کو جو مقام دیا اس کے بعد وہ صرف نام کی غلامی رہ گئی ورنہ حقیقت میں وہ بھائی چارہ بن گیا ہے، اور اگر اس کی حقیقت اور رُوح پر نظر کی جائے تو بہت سی صورتوں میں جنگی قیدیوں کے ساتھ اس سے بہتر سلوک ممکن نہیں، مشہور مستشرق موسیو گستا ولیبان اپنی کتاب تمدّن عرب میں لکھتا ہے:-

> ''غلام کا لفظ جب کسی ایسے یوروپین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو تیس سال کے دَوران لکھی ہوئی امریکی روایتوں کو پڑھنے کا عادی ہے تو اس کے دل میں اُن مسکینوں کا تصوّر آجاتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ان کے گلوں میں طوق پڑے ہیں اور اُنہیں کوڑے مار مار کر ہنکایا جارہا ہے، ان کی غذا ان کی سدِ رمق کے لئے بھی کافی نہیں، اور انہیں رہنے کے لئے تاریک کوٹھریوں کے سوا کچھ میسر نہیں، مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ تصویر کس حد تک درست ہے اور انگریزوں نے چند سالوں سے امریکا میں جو کچھ کیا ہے یہ باتیں اس پر صادق آتی ہیں یا نہیں؟.... لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اہلِ اسلام کے یہاں غلام کا تصوّر نصاریٰ کے یہاں غلام کے تصوّر سے بالکلیہ مختلف ہے۔''

(منقول از دائرۃ معارف القرن العشرین، لفرید وجدی، ج: ۴ ص: ۲۷۹، مادّہ: ''استرقاق'')

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قیدیوں کو غلام بنانے سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، کیونکہ اگر غلام نہ بنایا جائے تو تین ہی صورتیں عقلاً ممکن ہیں، یا قتل کردیا جائے، یا آزاد چھوڑ دیا جائے یا دائمی قیدی بنا کر رکھا جائے، اور بسا اوقات یہ تینوں صورتیں مصلحت کے خلاف ہوتی ہیں، قتل کرنا اس لئے مناسب نہیں ہوتا کہ قیدی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ آزاد چھوڑ دینے میں بعض مرتبہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دارالحرب میں پہنچ کر وہ مسلمانوں کے لئے

دوبارہ عظیم خطرہ بن جائے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو اسے دائمی قیدی بنا کر آج کل کی طرح کسی الگ تھلگ جزیرے میں ڈال دیا جائے یا پھر غلام بنا کر اس کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے اور اس کے حقوقِ انسانی کی پوری نگہداشت کی جائے، ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ ان میں سے بہتر صورت کونسی ہے؟ بالخصوص جبکہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر وہ ہے جو ایک معروف حدیث میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالفاظ ذیل بیان فرمایا ہے:

"اِخْوَانُکُمْ جَعَلَھُمُ اللہُ تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ فَمَنْ کَانَ اَخُوْہُ تَحْتَ یَدَیْہِ فَلْیُطْعِمْہُ مِمَّا یَاْکُلُ وَلْیُلْبِسْہُ مِمَّا یَلْبَسُ وَلَا یُکَلِّفُہُ مَا یَغْلِبُہُ فَاِنْ کَلَّفَہُ مَا یَغْلِبُہُ فَلْیُعِنْہُ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، وغیرہ)[1]

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیردست کر دیا ہے، پس جس کا بھائی اس کے زیردست ہو اسے چاہئے کہ اس کو بھی اسی میں سے کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور اسی میں سے پہنائے جسے وہ خود پہنتا ہے اور اس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو، اور اگر اسے ایسے کام کی تکلیف دے تو خود بھی اس کی مدد کرے۔

معاشرتی اور تمدّنی حقوق کے اعتبار سے اسلام نے غلاموں کو جو مرتبہ عطا کیا وہ آزاد افراد کے قریب قریب مساوی ہے، چنانچہ دوسری اقوام کے برخلاف اسلام نے غلاموں کو نکاح کی نہ صرف اجازت دی بلکہ آقاؤں کو وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ[2] (النور: ۳۲) والی آیت کے ذریعہ اس کی تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ آزاد عورتوں سے بھی نکاح کر سکتا ہے، مالِ غنیمت میں اس کا حصہ آزاد مجاہدین کے برابر ہے اور دشمن کو امان دینے میں اس کا قول اسی طرح معتبر ہے جس طرح آزاد فرد کا، قرآن و حدیث میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے اتنے احکام آئے ہیں کہ ان کو جمع کرنے سے ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ آخری وقت تک زبانِ مبارک پر جاری تھے اور جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خالقِ حقیقی سے جا ملے، وہ یہ الفاظ تھے: اَلصَّلٰوۃُ اَلصَّلٰوۃُ، اِتَّقُوا اللہَ فِیْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ترجمہ: نماز کا خیال رکھو، نماز کا خیال رکھو، اپنے زیردست غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ (ابوداؤد، باب فی حق المملوک)[3]

غلاموں کے لئے تعلیم و تربیت کے جو مواقع اسلام نے فراہم کئے ہیں ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما ینھی من السباب واللعن، ج:۲ ص:۸۹۳، وصحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة الممالیك، ج:۲ ص:۵۲

[2] ترجمہ: اور تم میں جو بے نکاحے ہوں تم اُن کا نکاح کر دیا کرو۔

[3] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق المملوک ج:۲ ص:۷۰۱

کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں اسلامی سلطنت کے تقریباً تمام صوبوں میں علم وفضل کے مرجع اعلیٰ سب کے سب غلاموں میں سے تھے جس کا واقعہ متعدد کتب تاریخ میں مذکور ہے، پھر اس نام کی غلامی کو بھی رفتہ رفتہ ختم یا کم کرنے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنے کے اتنے فضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں کہ شاید ہی کوئی نیکی اس کی ہمسری کر سکے۔ مختلف فقہی احکام میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈے گئے ہیں۔ کفّارۂ صوم، کفّارۂ قتل، کفارۂ ظہار، کفارۂ یمین ان تمام صورتوں میں سب سے پہلا حکم یہ مذکور ہے کہ کوئی غلام آزاد کیا جائے، یہاں تک کہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے غلام کو ناحق تھپڑ مار دیا تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ اُسے آزاد کردیا جائے (صحیح مسلم، باب صحبة الممالیك)۔[1] چنانچہ صحابۂ کرامؓ جس کثرت کے ساتھ غلام آزاد کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ صاحب النجم الوہاج نے بعض صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی یہ تعداد نقل کی ہے:

حضرت عائشہؓ	۶۹	حضرت عباسؓ	۷۰
حضرت حکیم بن حزامؓ	۱۰۰	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۰۰۰
حضرت عثمان غنیؓ	۲۰	حضرت ذوالکلاع حمیریؓ	۸,۰۰۰ (صرف ایک دن میں)
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	۳۰,۰۰۰		

(فتح العلّام شرح بلوغ المرام از نواب صدیق حسن خان صاحب ج:۲ ص:۲۳۲ کتاب العتق)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سات صحابہؓ نے اُنتالیس ہزار دو سو اُنسٹھ غلام آزاد کئے، اور ظاہر ہے کہ دوسرے ہزاروں صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اس سے کہیں زائد ہوگی۔ غرض اسلام نے غلامی کے نظام میں جو ہمہ گیر اصلاحات کیں جو شخص بھی انہیں بنظر انصاف دیکھے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے دوسری اقوام کے احکامِ غلامی پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، اور ان اصلاحات کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ان پر ایک عظیم احسان بن گئی ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم صرف اباحت اور جواز کی حد تک ہے۔ یعنی اگر اسلامی حکومت مصالح کے مطابق سمجھے تو انہیں غلام بنا سکتی ہے ایسا کرنا مستحب یا واجب فعل نہیں ہے بلکہ قرآن وحدیث کے مجموعی ارشادات سے آزاد کرنے کا افضل ہونا سمجھ میں آتا ہے اور یہ اجازت بھی اس وقت تک کے لئے ہے جب تک اس کے خلاف دشمن سے کوئی معاہدہ نہ ہو اور اگر دشمن سے یہ معاہدہ ہو جائے کہ نہ وہ ہمارے قیدیوں کو غلام بنائیں گے نہ ہم اُن کے قیدیوں کو، تو پھر اس معاہدہ کی پابندی لازم ہوگی۔ ہمارے زمانے میں دُنیا کے بہت سے ملکوں نے ایسا معاہدہ

[1] كتاب الإيمان، باب في صحبة المماليك ج:۲ ص:۵۲

کیا ہوا ہے، لہٰذا جو اسلامی ممالک اس معاہدے میں شریک ہیں ان کے لئے غلام بنانا اس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ معاہدہ قائم ہے۔

ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ

یہ سن چکے اور اگر چاہے اللہ تو بدلہ لے اُن سے، پر جانچنا چاہتا ہے تمہارے ایک سے دُوسرے کو

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴ سَيَهْدِيْهِمْ

اور جو لوگ مارے گئے اللہ کی راہ میں تو نہ ضائع کرے گا وہ ان کے کئے کام، ان کو راہ دے گا

وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اور سنوارے گا ان کا حال اور داخل کرے گا اُن کو بہشت میں جو معلوم کرادی ہے ان کو، اے ایمان والو!

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اگر تم مدد کروگے اللہ کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور جمادے گا تمہارے پاؤں اور جو لوگ کہ منکر ہوئے

فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

وہ گرے منہ کے بل اور کھودیئے ان کے کئے کام یہ اس لئے کہ ان کو پسند نہ ہوا جو اُتارا اللہ نے

فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ

پھر اکارت کردیئے ان کے کئے کام کیا وہ پھرے نہیں مُلک میں کہ دیکھیں کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰

انجام اُن کا جو اُن سے پہلے تھے ہلاکی ڈالی اللہ نے اُن پر اور منکروں کو ملتی رہتی ہیں ایسی چیزیں

ع ۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ⑪ ع

یہ اس لئے کہ اللہ رفیق ہے اُن کا جو یقین لائے اور یہ کہ جو منکر ہیں اُن کا رفیق نہیں کوئی

آسان ترجمۂ قرآن

تمہیں تو یہی حکم ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لے لیتا، لیکن (تمہیں یہ حکم اس لئے دیا ہے) تا کہ تمہارا ایک دوسرے کے ذریعے امتحان لے۔ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے، اللہ اُن کے اعمال کو ہرگز اکارت نہیں کرے گا۔ ④ وہ انہیں منزل تک پہنچا دے گا، اور اُن کی حالت سنوار دے گا، ⑤ اور اُنہیں جنت میں داخل کرے گا جس کی اُنہیں خوب پہچان کرا دی ہوگی۔ ⑥ اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دِین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم جما دے گا۔ ⑦ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، اُن کے لئے تباہی ہے، اور اللہ نے اُن کے اعمال اکارت کر دیئے ہیں۔ ⑧ یہ اس لئے کہ انہوں نے اُس بات کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تھی، چنانچہ اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔ ⑨ بھلا کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ اُن لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے گذرے ہیں؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈالی، اور کافروں کے لئے اسی جیسے انجام مقدر ہیں۔ ⑩ یہ اس لئے کہ اللہ اُن لوگوں کا رکھوالا ہے جو ایمان لائیں، اور کافروں کا کوئی رکھوالا نہیں ہے۔ ⑪

خلاصۂ تفسیر

یہ حکم (جہاد کا جو مذکور ہوا) بجالانا اور (جو بعض صورتوں میں کفار سے انتقام لینے کے لئے طریقہ جہاد کا مقرر کیا، یہ خاص حکمت کی وجہ سے ہے ورنہ) اگر اللہ چاہتا تو اُن سے (خود ہی آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ) انتقام لے لیتا (جیسے پچھلی اُمتوں سے اسی طرح انتقام لیا، کسی پر پتھر برسے کسی پر ہوا کا طوفان آیا، کسی کو غرق کیا گیا، اگر ایسا ہوتا تو تم کو جہاد نہ کرنا پڑتا) لیکن (تم کو جہاد کرنے کا حکم اس لئے دیا) تا کہ تمہارا ایک دوسرے کے ذریعہ امتحان کرے (مسلمانوں کا امتحان یہ کہ کون حکمِ الٰہی پر اپنی جان کو ترجیح دیتا ہے، اور کفار کا امتحان یہ کہ قتال و جہاد کی تکلیف سے متنبہ ہو کر کون حق کو قبول کرتا ہے) اور (جہاد میں جیسے کفار کا قاتل ہونا کامیابی ہے اسی طرح مقتول ہونا بھی ناکامی نہیں کیونکہ) جو لوگ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں مارے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو (جن میں یہ عمل جہاد بھی داخل ہے) ہرگز ضائع نہ کرے گا

(جیسا کہ ظاہر میں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب وہ کافروں پر غالب نہ آسکا یہ خود مقتول ہو گیا تو گویا اس کا عمل بے کار گیا مگر واقعہ یوں نہیں کیونکہ اس کے اس عمل پر دوسرا نتیجہ جو ظاہری کامیابی سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اس کو حاصل ہو گیا وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ اُن کو (منزل) مقصود تک (جس کا بیان آگے آتا ہے) پہنچا دے گا اور اُن کی حالت (قبر اور حشر اور پُل صراط اور تمام مواقع آخرت میں) درست رکھے گا (کہیں کوئی خرابی اور مضرت اُن کو نہ پہنچے گی) اور (اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کا بیان یہ ہے کہ) اُن کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُن کو پہچان کرا دے گا (کہ ہر جنتی اپنے اپنے مقررہ مکان پر بغیر کسی تلاش تفتیش کے بے تکلف جا پہنچے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جہاد میں ظاہری ناکامی یعنی خود مقتول ہو جانا بھی بڑی کامیابی ہے۔ آگے جہاد کے دُنیوی فوائد وفضائل کا ذکر کر کے اس کی ترغیب ہے کہ) اے ایمان والو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا (جس کا نتیجہ دنیا میں بھی دشمنوں پر غالب آنا ہے خواہ ابتداءً ہی یا کچھ عرصہ کے بعد انجام کار میں۔ اور بعض مؤمنین کا مقتول ہو جانا یا کسی معرکہ میں وقتی طور پر مغلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں) اور (اسی طرح دشمنوں کے مقابلہ میں) تمہارے قدم جما دے گا (اسی طرح کا مطلب یہ ہے خواہ ابتداء ہی سے یا وقتی پسپائی کے بعد انتہا میں ثابت قدم رکھ کر کفار پر غالب کرے گا جیسا کہ بار بار اس کا مشاہدہ دُنیا میں ہو چکا ہے یہ تو مسلمانوں کا حال بیان کیا گیا) اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے (دُنیا میں جبکہ مؤمنین سے مقابلہ کریں) تباہی (اور مغلوبیت) ہے اور (آخرت میں) ان کے اعمال کو خدا تعالیٰ کالعدم کر دے گا (جیسا کہ شروع سورت میں بیان ہوا۔ غرض کفّار دونوں جہان میں خسارے میں رہے اور) یہ (کفار کا خسارہ اور اعمال کی بربادی) اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے اللہ کے اُتارے ہوئے اَحکام کو ناپسند کیا (عقیدۃً بھی اور عملاً بھی) سو اللہ نے ان کے اعمال کو (اوّل ہی سے) اکارت کر دیا (کیونکہ کفر کا جو اعلیٰ درجہ کی بغاوت ہے یہی اثر ہے اور یہ لوگ جو عذابِ الٰہی سے نہیں ڈرتے) کیا یہ لوگ مُلک میں چلے پھرے نہیں اور اُنہوں نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن کا انجام کیسا ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اُن پر کیسی تباہی ڈالی (جو اُن کے اُجڑے ہوئے محلات ومکانات سے ظاہر ہے تو اُن کو بھی اس سے بے فکر نہ ہونا چاہئے کہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو) ان کافروں کے لئے بھی اسی قسم کے معاملات ہونے کو ہیں (آگے فریقین کے حال کا اجمالی ذکر ہے کہ) یہ (مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کی تباہی) اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی (ایسا) کارساز نہیں (کہ خدا کے مقابلہ میں ان کے کام بنا سکے اس لئے وہ دونوں جہان میں ناکام رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اگر کبھی دُنیا میں وقتی ناکامی بھی ہو جائے تو انجام کار کامیابی ہوگی، اور آخرت کی فلاح تو ظاہر ہی ہے اس لئے مسلمان ہمیشہ کامیاب اور کافر ناکام رہتا ہے)۔

معارف و مسائل

مشروعیتِ جہاد کی ایک حکمت

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس اُمت میں کفار سے جہاد و قتال کی مشروعیت درحقیقت ایک رحمت ہے۔ کیونکہ وہ آسمانی عذابوں کے قائم مقام ہے کیونکہ کفر و شرک اور اللہ سے بغاوت کی سزا پچھلی قوموں کو آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ دی گئی ہے، اُمتِ محمدیہ میں ایسا ہوسکتا تھا مگر رحمۃ للعالمین کی برکت سے اس اُمت کو ایسے عام عذابوں سے بچالیا گیا، اس کے قائم مقام جہادِ شرعی کو کردیا گیا جس میں بہ نسبت عذابِ عام کے بڑی سہولتیں اور مصلحتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ عذابِ عام میں پوری قومیں مرد، عورت، بچے سبھی تباہ ہوتے ہیں اور جہاد میں عورتیں بچے تو مأمون ہیں ہی، مرد بھی صرف وہی اس کی زد میں آتے ہیں جو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والوں کے مقابلہ پر قتال کے لئے آ کھڑے ہوں، پھر اُس میں بھی سب مقتول نہیں ہوتے، اُن میں بہت سے لوگوں کو اسلام و ایمان کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے نیز جہاد کی مشروعیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ جہاد و قتال کے دونوں فریق، مسلمان اور کافر کا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کے حکم پر اپنی جان و مال نثار کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور کون سرکشی اور کفر پر جما رہتا ہے یا اسلام کے روشن دلائل کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ شروع سورت میں ذکر تھا کہ جو لوگ کفر و شرک پر جمع ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے نیک اعمال کو بھی اکارت اور ضائع کردیا یعنی صدقہ خیرات اور رفاہِ عام کے نیک کام جو وہ کرتے ہیں کفر و شرک کی وجہ سے اللہ کے نزدیک آخرت میں ان کا کوئی ثواب نہیں، اس کے بالمقابل اس آیت میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں ان کے اعمال ضائع نہیں ہوتے یعنی اگر انہوں نے کچھ گناہ بھی کئے ہوں تو اُن کے گناہوں کی وجہ سے اُن کے نیک اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ بسا اوقات اُن کے نیک اعمال اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ اس میں شہید فی سبیل اللہ کے لئے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک یہ کہ اللہ ان کو ہدایت کردے گا۔ دوسرے اُن کے سب حالات درست کردے گا۔ حالات سے مراد دُنیا و آخرت دونوں جہان کے حالات ہیں۔ دنیا میں تو یہ کہ جو شخص جہاد میں شریک ہوا اگرچہ وہ شہید نہ ہوا سلامت رہا وہ بھی شہید کے ثواب کا مستحق ہوگیا، اور آخرت میں یہ کہ وہ قبر کے عذاب سے محشر کی پریشانی سے نجات پائے گا اور اگر کچھ لوگوں کے حقوق اس کے ذمہ رہ گئے

ہیں تو اللہ تعالیٰ اصحابِ حقوق کو اس سے راضی کر کے اس کی خلاصی کرادیں گے (کما ورد فی حدیث ابی نُعیم والبزار والبیھقی، مظھری)۔ [۱] اور موت کے بعد ہدایت کر دینے سے مراد ان کی منزلِ مقصود یعنی جنت پر پہنچا دینا ہے جیسا کہ قرآن میں اہلِ جنت کے متعلق آیا ہے کہ جنت میں پہنچ کر کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا [۲] (الاعراف: ۴۳)

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝ یہ ایک تیسرا انعام ہے کہ اُن کو صرف یہی نہیں کہ جنت میں پہنچا دیا جائے گا بلکہ ان کے دِلوں میں خود بخود جنت کے اپنے اپنے مقام اور اس میں ملنے والی نعمتوں حور و قصور سے ایسی واقفیت پیدا کر دی جائے گی جیسے وہ ہمیشہ سے انہی میں رہتے اور ان سے مانوس تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو جنت ایک نیا عالَم تھا اس میں اپنا مقام تلاش کرنے میں وہاں کی چیزوں سے مناسبت اور تعلق قائم ہونے میں وقت لگتا، اور ایک مدّت تک اجنبیت کے احساس سے قلب مطمئن نہ ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے دینِ حق دے کر بھیجا ہے کہ تم دُنیا میں جس طرح اپنی بیبیوں اور گھروں سے واقف اور مانوس ہو اس سے بھی زیادہ اپنے جنت کے مقام اور وہاں کی بیبیوں سے واقف اور مانوس ہو جاؤ گے (رواہ ابن جریر والطبرانی وابویعلی والبیھقی۔ مظھری)۔ [۳] اور بعض روایتوں میں ہے کہ ایک فرشتہ ہر ایک جنتی کے لئے مقرر کر دیا جائے گا جو ان کا اپنے مقامِ جنت اور وہاں کی بیبیوں سے تعارف کرائے گا۔ [۴] واللہ اعلم۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝ یہاں الکافرین کا الف لام عہد کے لئے ہے، اور مراد کفّارِ مکہ ہیں مراد ان کو ڈرانا ہے کہ جس طرح پچھلی اُمتوں پر عذاب آئے ہیں تم پر بھی آسکتے ہیں بے فکر نہ رہنا چاہئے۔

وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ لفظ مَوْلٰی بہت سے معانی کے لئے مستعمل ہوتا ہے ایک معنی کارساز کے ہیں جو اس جگہ مراد ہیں اور ایک معنی مالک کے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ کفّار کے بارے میں آیا ہے وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ [۵] (یونس: ۳۰)، اس میں اللہ تعالیٰ کو کفار کے لئے بھی مَوْلٰی قرار دیا ہے کیونکہ مَوْلٰی کے معنی مالک کے ہیں اور مالکیت اللہ تعالیٰ کی عام ہے مؤمن کافر کوئی اُس سے خارج نہیں۔

---

[۱] التفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۴۲۴، وشعب الإیمان للبیھقیؒ، رقم الحدیث: ۵۳۱۶

[۲] ترجمہ: اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا۔

[۳] تفسیر المظھری ج:۸ ص:۴۲۵، والبعث والنشور للبیھقی، رقم الحدیث: ۵۹۳

[۴] تفسیر القرطبی ج:۷ ص:۳۱۰، والدر المنثور ج:۹ ص:۱۶۷

[۵] ترجمہ: اور یہ لوگ اللہ کی طرف جو ان کا مالک حقیقی ہے لوٹائے جاویں گے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ

مقرر اللہ داخل کرے گا اُن کو جو یقین لائے اور کئے بھلے کام باغوں میں

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ط وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ

جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور جو لوگ منکر ہیں برت رہے ہیں اور کھاتے ہیں

كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ ﴿١٢﴾ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ

جیسے کہ کھائیں چوپائے اور آگ ہے گھر اُن کا اور کتنی تھیں بستیاں

هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ ج أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿١٣﴾

جو زیادہ تھیں زور میں اس تیری بستی سے جس نے تجھ کو نکالا ہم نے ان کو غارت کردیا پھر کوئی نہیں اُن کا مددگار،

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ

بھلا ایک جو چلتا ہے واضح رستہ پر اپنے ربّ کے برابر ہے اس کے جس کو بھلا دِکھلایا اُس کا بُرا کام

وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿١٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ط فِيهَا أَنْهَارٌ

اور چلتے ہیں اپنی خواہشوں پر احوال اس بہشت کا جس کا وعدہ ہوا ہے ڈرنے والوں سے اس میں نہریں ہیں

مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ ج وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ ج وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ

پانی کی جو بُو نہیں کرے گا، اور نہریں ہیں دُودھ کی جس کا مزہ نہیں پھرا، اور نہریں ہیں شراب کی

لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ج وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى ط وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ

جس میں مزہ ہے پینے والوں کے واسطے اور نہریں ہیں شہد کی جھاگ اُتارا ہوا، اور اُن کے لئے وہاں سب طرح کے

الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا

میوے ہیں اور معافی ہے اُن کے رَبّ سے یہ برابر ہے اس کے جو سدا رہے آگ میں اور پلایا جائے ان کو

مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ⑮

کھولتا پانی تو کاٹ نکالے ان کی آنتیں

آسان ترجمۂ قرآن

یقین رکھو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اللہ اُن کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جنہوں نے کفر اپنالیا ہے، وہ (یہاں تو) مزے اُڑا رہے ہیں، اور اس طرح کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں، اور جہنم اُن کا آخری ٹھکانا ہے۔ ⑫ اور کتنی بستیاں ہیں جو طاقت میں تمہاری اُس بستی سے زیادہ مضبوط تھیں جس نے (اے پیغمبر!) تمہیں نکالا ہے، ان سب کو ہم نے ہلاک کردیا، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔ ⑬ اب بتاؤ کہ جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن راستے پر ہوں، کیا وہ اُن جیسے ہو سکتے ہیں جن کی بدکاری ہی اُن کے لئے خوشنما بنادی گئی ہو، اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلتے ہوں؟ ⑭ متقی لوگوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اُس کا حال یہ ہے کہ اُس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو خراب ہونے والا نہیں، ایسے دُودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا، ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے سراپا لذت ہوگی، اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو نتھرا ہوا ہوگا، اور ان جنتیوں کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے، اور ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت! کیا یہ لوگ اُن جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور انہیں گرم پانی پلایا جائے گا، چنانچہ وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا؟ ⑮

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور جو لوگ کافر ہیں وہ (دُنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور اس طرح (آخرت سے بے فکر ہو کر) کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں (کہ وہ نہیں سوچتے کہ ہم کو کیوں کھلایا پلایا جاتا ہے اور

ہمارے ذمہ اس کا کیا حق واجب ہے) اور جہنم اُن لوگوں کا ٹھکانا ہے (اور اوپر جو کفار کے دُنیا میں عیش کرنے کا ذکر ہوا اُس سے آپ کے مخالفین کو دھوکہ نہ کھانا چاہئے ، اور نہ آپ کو اُن کی اس غفلت پر کچھ حزن و ملال ہونا چاہئے ، جو اُن کی مخالفت کا سبب بنی ہوئی ہے یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو تنگ کر کے مکہ میں بھی نہیں رہنے دیا کیونکہ) بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت (جسم اور قوت مال و جاہ) میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو (عذاب سے) ہلاک کر دیا سو اُن کا کوئی مددگار نہ ہوا (تو یہ بیچارے کیا چیز ہیں ان کو مغرور نہ ہونا چاہئے ، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں ان کی صفائی کر سکتے ہیں اور آپ ان کے چند روزہ عیش سے مغموم نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر وقت پر اُن کو بھی سزا دینے والے ہیں) تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح (ثابت بالدلیل) راستہ پر ہوں کیا وہ اُن شخصوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہوں (یعنی جب ان دونوں فریق کے اعمال میں تفاوت ہے تو ان کے مآل اور انجام میں بھی تفاوت ضروری ہے، اہلِ حق ثواب کے اور اہلِ باطل عقاب و عذاب کے مستحق ہیں جس کا بیان یہ ہے) جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا (نہ بُو میں نہ رنگ میں نہ مزے میں) اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا ، اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوگی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل (میل کچیل سے پاک) صاف ہوگا اور ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (اس میں داخل ہونے سے پہلے) ان کے رَبّ کی طرف سے (گناہوں کی) بخشش ہوگی کیا ایسے لوگ اُن جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ، اور کھولتا ہوا پانی اُن کو پینے کو دیا جائے گا تو وہ اُن کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

معارف و مسائل

چونکہ دُنیا کا پانی کبھی رنگ میں، کبھی بُو میں کبھی ذائقہ میں متغیر ہو جاتا ہے اسی طرح دُنیا کا دودھ بگڑ جاتا ہے اسی طرح دُنیا کی شراب بدمزہ و تلخ ہوتی ہے صرف بعض منافع کی خاطر پی جاتی ہے جیسے تمباکو کڑوا ہونے کے باوجود کھایا جاتا ہے پھر عادت پڑ جاتی ہے۔ جنت کے پانی اور دودھ اور شراب کے بارے میں بتلا دیا گیا کہ وہ سب ان تغیرات اور بدمزگی کی آفات سے خالی ہیں اور جنت کا دوسری مضرتوں اور مفاسد سے خالی ہونا سورۂ صافات کی آیت میں آیا ہے لَا فِیْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا یُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ [1] اسی طرح دُنیا کے شہد میں موم اور میل کچیل ملا ہوتا ہے جنت کی نہر میں شہد کا پاک صاف ہونا بتلایا گیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ انہار جنت کی چاروں قسمیں ، پانی ، دودھ ، شراب ، شہد اپنے حقیقی معنی میں ہیں بلا وجہ مجازی

[1] ترجمہ: نہ اس میں دردِ سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا۔

معنی لینے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ جنت کی چیزوں کو دُنیا کی چیزوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، وہاں کی ہر چیز کی لذت و کیف کچھ اور ہی ہوگا جس کی دُنیا میں کوئی نظیر نہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ

اور بعضے ان میں ہیں کہ کان رکھتے ہیں تیری طرف یہاں تک کہ جب نکلیں تیرے پاس سے

قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

کہتے ہیں ان کو جن کو علم ملا ہے کیا کہا تھا اس شخص نے ابھی، یہ وہی ہیں جن کے

طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ

دلوں پر مہر لگادی ہے اللہ نے اور چلے ہیں اپنی خواہشوں پر اور جو لوگ راہ پر آئے ہیں ان کو اور بڑھ گئی اس سے

هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ

سوجھ اور ان کو اس سے ملا بچ کر چلنا، اب یہی انتظار کرتے ہیں قیامت کا کہ آ کھڑی ہو اُن پر

بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾

اچانک سو آچکی ہیں اس کی نشانیاں پھر کہاں نصیب ہوگا ان کو جب وہ آپہنچے اُن پر سمجھ پکڑنا

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو تمہاری باتیں کانوں سے تو سنتے ہیں، لیکن جب تمہارے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو جنہیں علم عطا ہوا ہے، اُن سے پوچھتے ہیں کہ: ''ابھی ابھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا کہا تھا؟'' یہ وہ لوگ ہیں جن کے دِلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے، اور جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے لگ گئے

ہیں۔ (۱۶) اور جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا ہے، اللہ نے اُنہیں ہدایت میں اور ترقی دی ہے، اور اُنہیں اُن کے حصے کا تقویٰ عطا فرمایا ہے۔ (۱۷) اب کیا یہ (کافر) لوگ قیامت ہی کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ یکا یک ان پر آن پڑے؟ (اگر ایسا ہے) تو اُس کی علامتیں تو آچکی ہیں۔ پھر جب وہ آہی جائے گی تو اُس وقت ان کے لئے نصیحت ماننے کا موقع کہاں سے آئے گا؟ (۱۸)

خلاصۂ تفسیر

اور (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) بعض آدمی ایسے ہیں (مراد منافقین ہیں) کہ وہ (آپ کی تبلیغ و تعلیم کے وقت ظاہر میں تو) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں (لیکن دل سے بالکل متوجہ نہیں ہوتے) یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ کے پاس سے (اُٹھ کر مجلس سے) باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہلِ علم (صحابہ) سے کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی (جب ہم مجلس میں تھے) کیا بات فرمائی تھی (اُن کا یہ کہنا بھی ایک قسم کا استہزاء ہی تھا کہ اس سے یہ جتلانا تھا کہ ہم آپ کی گفتگو کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے، یہ بھی ایک شعبہ نفاق ہی کا تھا) یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر کردی ہے (ہدایت سے دُور ہوگئے) اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اور (انہی کی قوم میں سے) جو لوگ راہ پر ہیں (یعنی مسلمان ہوچکے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو (اَحکام سننے کے وقت) اور زیادہ ہدایت دیتا ہے (کہ وہ ان اَحکامِ جدیدہ پر بھی ایمان لاتے ہیں یعنی ان کی ایمانیات کی تعداد بڑھ گئی یا یہ کہ ان کے ایمان کو اور زیادہ قوی اور پختہ کردیتے ہیں جو عمل صالح کا خاصہ ہے کہ اس سے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے) اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دے دیتا ہے (آگے ان منافقین کے لئے وعید ہے کہ یہ جو قرآن اور اَحکامِ الٰہیہ سن کر بھی متاثر نہیں ہوتے) سو (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ اُن پر دفعۃً آپڑے (یہ بطور زجر و توبیخ کے فرمایا کہ اب بھی متاثر نہیں ہوتے تو کیا قیامت میں تذکُّر اور ہدایت حاصل کریں گے) سو (یاد رکھو کہ قیامت بھی نزدیک ہے چنانچہ) اس کی (متعدد) علامتیں تو آچکی ہیں (چنانچہ از روئے حدیث خود خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوّت بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے [۱] اور شقِ قمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہونے کے علاوہ قیامت کی علامات میں سے بھی ہے۔ یہ سب علامات زمانہ نزول قرآن میں موجود ہوچکی تھیں، آگے اس کا بیان ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پانے میں قیامت کا انتظار کرنا محض جہالت ہے کیونکہ وہ وقت سمجھنے اور عمل کرنے کا نہیں ہوگا۔ فرمایا) تو جب قیامت اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی اُس وقت اُن کو سمجھنا کہاں میسر ہوگا (یعنی مفید نہیں ہوگا)۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بعثت أنا والسّاعة کهاتين، ج:۲ ص:۹۶۳

معارف و مسائل

اشـراط ، کے معنی علامات کے ہیں اور علاماتِ قیامت کی ابتداء خود خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہو جاتی ہے کیونکہ ختم نبوّت بھی قربِ قیامت کی علامت ہے۔ اسی طرح شقِ قمر کے معجزہ کو بھی قرآن میں اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ [1] (القمر:۱) کے ساتھ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ یہ تو علامات ابتدائیہ ہیں جو خود نزولِ قرآن کے وقت میں ظاہر ہو چکی تھیں دوسری علامات قریبہ احادیث صحیحہ میں ثابت ہیں ان میں سے ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ علاماتِ قیامت یہ ہیں۔

علم اُٹھ جائے گا، جہل بڑھ جائے گا، زنا کی کثرت ہوگی، شراب خوری کی کثرت ہوگی، مرد کم رہ جائیں گے، عورتیں بڑھ جائیں گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا متکفل ایک مرد ہوگا۔ [2] اور ایک روایت میں ہے کہ علم گھٹ جائے گا اور جہل پھیل جائے گا۔ (بخاری و مسلم) [3]

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مالِ غنیمت کو شخصی دولت سمجھ لیا جائے اور امانت کو مالِ غنیمت قرار دے لیا جائے (کہ حلال سمجھ کر کھا جائیں) اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے (یعنی اس کی ادائیگی میں دل میں تنگی محسوس ہو) اور علمِ دین اغراضِ دُنیوی کے لئے حاصل کیا جانے لگے، اور مرد اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دُور کر دے، اور مساجد میں شور و شغب ہونے لگے۔ اور قوم کا سردار اُن سب میں کا فاسق بدکردار آدمی ہو جائے، اور قوم کا نمائندہ ان سب میں کا رذیل ہو جائے، اور شریر آدمی کا اکرام صرف اس لئے کرنا پڑے کہ اس کا اکرام نہ کریں گے تو یہ ستائے گا اور گانے والی عورتوں کا گانا عام ہو جائے، اور مزامیر باجے گاجے پھیل جائیں اور شرابیں پی جانے لگیں، اور اس اُمت کے آخری لوگ اپنے اسلاف پر لعنت کرنے لگیں تو اس وقت تم لوگ انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا اور زلزلہ کا اور لوگوں کے زمین میں دھنس جانے کا اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور آسمان سے پتھر برسنے کا اور دوسری علامات قیامت کا جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے موتیوں کی لڑی کو کاٹ دیا جائے اور موتی ایک ایک کر کے نیچے آ گرتے ہیں۔ [4]

---

[1] ترجمہ: قیامت نزدیک آ پہنچی۔

[2] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب یقل الرجال ویکثر النساء، ج:۲ ص:۷۸۷

[3] صحیح البخاری، کتاب الأشربة، (فی الإبتداء) ج:۲ ص:۸۳۶

[4] جامع الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی علامة حلول المسخ والخسف (بالإختصار) ج:۲ ص:۴۱۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

سو تو جان لے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایمان دار مردوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ⑲ ع

اور عورتوں کے لئے اور اللہ کو معلوم ہے بازگشت تمہاری اور گھر تمہارا

آسان ترجمۂ قرآن

لہٰذا (اے پیغمبر!) یقین جانو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اور اپنے قصور پر بھی بخشش کی دُعا مانگتے رہو، اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی بخشش کی بھی، اور اللہ تم سب کی نقل وحرکت اور تمہاری قیام گاہ کو خوب جانتا ہے۔ ⑲

خلاصۂ تفسیر

(جب آپ خدا تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار بندوں اور سرکشوں دونوں کا حال ومآل سُن چکے) تو آپ اس کا (اکمل طریقہ پر) یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں (اس میں دین کے تمام اُصول وفروع آ گئے، کیونکہ علم سے مراد علم کامل اکمل ہے اور علم کامل کے لئے لازم ہے کہ تمام احکامِ الٰہیہ پر پورا عمل ہو۔ حاصل یہ ہے کہ تمام احکامِ الٰہیہ پر مداومت رکھو) اور (اگر کبھی کوئی خطا سرزد ہو جائے جو آپ کی عصمتِ نبوّت کی بناء پر درحقیقت گناہ نہیں بلکہ صرف ترک افضل ہی ہوگا مگر آپ کی شانِ ارفع کے اعتبار سے صورۃً خطا ہے اس لئے) آپ اپنی (اُس ظاہری) خطا کی معافی مانگتے رہئے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی (بخشش کی دُعا مانگتے رہئے) اور (یہ بھی یاد رہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی (یعنی سب اعمال واحوال کی) خبر رکھتا ہے۔

معارف ومسائل

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے سوا اور کوئی قابلِ عبادت

نہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو ہر مؤمن مسلمان کو بھی حاصل ہے سیّد الانبیاء کو کیوں حاصل نہ ہوتا پھر اس علم کے حاصل کرنے کا حکم دینا یا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے اور یا اس کے مقتضیات پر عمل کرنا مراد ہے جیسا کہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ سفیان بن عُیینہؒ سے کسی نے علم کی فضیلت کا سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کیا تم نے قرآن کا ارشاد نہیں سنا، فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ، کہ اس میں علم کے بعد عمل کا حکم دیا ہے اسی طرح دوسری جگہ فرمایا اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ [1] (الحدید:۲۰) اور پھر فرمایا سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ [2] (الحدید:۲۱) اسی طرح انفال میں فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ [3] (الانفال:۲۸) اور تغابن میں فرمایا فَاحْذَرُوْهُمْ [4] (التغابن:۱۴)، ان سب مقامات میں اوّل علم پھر اُس کے مقتضا پر عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے یہاں آیتِ مذکورہ میں بھی اگرچہ یہ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے حاصل تھا مگر مقصود اس سے اس کے مقتضٰی پر عمل ہے اسی لئے اس کے بعد وَاسْتَغْفِرْ کا حکم دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجہ عصمتِ نبوّت کے اس کے خلاف کرنے کا اگرچہ احتمال نہیں تھا مگر انبیاء علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے اور اجتہادی خطا قانون شرع میں گناہ نہیں بلکہ اُس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کو اس خطا پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے اور ان کی شانِ عالی کے اعتبار سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ عبس میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک قسم کا عتاب نازل ہوا وہ بھی اسی خطاء اجتہادی کی ایک مثال تھی جس کی تفصیل سورۂ عبس میں آئے گی کہ وہ اجتہادی خطا گرچہ کوئی گناہ نہ تھا بلکہ ایک اجر اس پر بھی ملنے کا وعدہ تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی کے لئے اس کو پسند نہیں کیا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ آیتِ مذکورہ میں اسی طرح کا ذنب مراد ہو سکتا ہے۔

فائدہ

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اِستغفار کی کثرت کیا کرو کیونکہ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں میں مبتلا کر کے ہلاک کیا تو اُنہوں نے مجھے کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر ہلاک کر دیا، جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے ان کو ایسے خیالات باطلہ کے پیچھے لگا دیا جن کو وہ نیکی سمجھ کر کرتے ہیں [5]

[1] ترجمہ: تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو ولعب ہے۔

[2] ترجمہ: تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو۔

[3] ترجمہ: اور تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے۔

[4] ترجمہ: سو تم ان سے ہوشیار رہو۔

[5] مسند ابی یعلی الموصلیؒ رقم الحدیث:۱۲۷، ومجمع الزوائد رقم الحدیث:۱۷۵۷۴

جیسے عام بدعات کا یہی حال ہے۔ اس سے اُن کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰكُمْ ﴿۱۹﴾ متقلّب کے لفظی معنی لوٹ پوٹ ہونے یا اُلٹ پلٹ ہونے کے اور مثویٰ کے معنی جائے قرار کے ہیں، اس کی مراد میں مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں اسی لئے حضرات مفسرین نے مختلف معنی بیان کئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ہر انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں، ایک وہ جن میں عارضی اور وقتی طور پر اشتغال ہوتا ہے دوسرے وہ جن کو وہ مستقل اپنا مشغلہ سمجھتا ہے، اسی طرح بعض مکانات میں انسان کا قیام عارضی ہوتا ہے بعض میں مستقل، تو آیت میں عارضی کو متقلّب کے لفظ سے اور مستقل کو مثویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس طرح تمام احوال کا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونا اس آیت کا مفہوم ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ

اور کہتے ہیں ایمان والے کیوں نہ اُتری ایک سورت پھر جب اُتری ایک سورت جانچی ہوئی

وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ

اور ذکر ہوا اس میں لڑائی کا تو تُو دیکھتا ہے اُن کو جن کے دل میں روگ ہے تکتے ہیں تیری طرف

نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ

جیسے تکتا ہے کوئی بیہوش پڑا ہوا مرنے کے وقت سو خرابی ہے اُن کی۔ حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنا

فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن

پھر جب تاکید ہو کام کی تو اگر سچے رہیں اللہ سے تو اُن کا بھلا ہے پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر

تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾

تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰٓ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ

ایسے لوگ ہیں جن پر لعنت کی اللہ نے پھر کر دیا ان کو بہرا اور اندھی کر دیں ان کی آنکھیں۔ کیا دھیان نہیں کرتے

الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰٓ أَدْبَارِهِمْ

قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل بے شک جو لوگ اُلٹے پھر گئے اپنی پیٹھ پر

مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۖ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٥﴾

بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکی اُن پر سیدھی راہ شیطان نے بات بنائی ان کے دل میں اور دیر کے وعدے کئے

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ

یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہا اُن لوگوں سے جو بیزار ہیں اللہ کی اُتاری کتاب سے ہم تمہاری بات بھی مانیں گے

فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ

بعضے کاموں میں اور اللہ جانتا ہے اُن کا مشورہ کرنا پھر کیسا ہوگا حال جبکہ فرشتے جان نکالیں گے اُن کی

يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَآ أَسْخَطَ اللَّهَ

مارتے جاتے ہوں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر یہ اس لئے کہ وہ چلے اس راہ جس سے اللہ بیزار ہے

ع وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾ ع أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم

اور ناپسند کی اس کی خوشی پھر اُس نے اکارت کر دیئے ان کے کئے کام، کیا خیال رکھتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں

مَّرَضٌ أَن لَّن يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَأَرَيْنَٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم

روگ ہے کہ اللہ ظاہر نہ کر دے گا اُن کے کینے۔ اور اگر ہم چاہیں تجھ کو دکھلا دیں وہ لوگ، سو تو پہچان تو چکا ہے ان کو

بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰

ان کے چہرے سے، اور آگے پہچان لے گا بات کے ڈھب سے، اور اللہ کو معلوم ہے تمہارے سب کام

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ

اور البتہ ہم تم کو جانچیں گے تا معلوم کرلیں جو تم میں لڑائی کرنے والے ہیں اور قائم رہنے والے

وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ۝۳۱

اور تحقیق کرلیں تمہاری خبریں

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: ''کیا اچھا ہو کہ کوئی (نئی) سورت نازل ہو جائے؟'' پھر جب کوئی جچی تلی سورت نازل ہو جائے، اور اُس میں لڑائی کا ذِکر ہو تو جن لوگوں کے دِلوں میں روگ ہے، تم اُنہیں دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف اس طرح نظریں اُٹھائے ہوئے ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو۔ بڑی خرابی ہے ایسے لوگوں کی۔ ۝۲۰ یہ فرماں برداری کا اظہار اور اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، لیکن جب (جہاد کا) حکم پکا ہو جائے، اُس وقت اگر یہ اللہ کے ساتھ سچے نکلیں تو ان کے حق میں اچھا ہو۔ ۝۲۱ پھر اگر تم نے (جہاد سے) منہ موڑا تو تم سے کیا توقع رکھی جائے؟ یہی کہ تم زمین میں فساد مچاؤ، اور اپنے خونی رشتے کاٹ ڈالو! ۝۲۲ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے، چنانچہ اُنہیں بہرا بنا دیا ہے، اور ان کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ ۝۲۳ بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا دِلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں جو دِلوں پر پڑا کرتے ہیں؟ ۝۲۴ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ حق بات سے پیٹھ پھیر کر مڑ گئے ہیں، باوجودیکہ ہدایت اُن کے سامنے خوب واضح ہو چکی تھی، اُنہیں شیطان نے پٹی پڑھائی ہے، اور اُنہیں دُور دراز کی اُمیدیں دِلائی ہیں۔ ۝۲۵ یہ سب اس لئے ہوا کہ جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، ان (منافقوں) نے اُن سے یہ کہا ہے کہ: ''بعض معاملات میں، ہم تمہاری بات مانیں گے''۔ اور اللہ ان کی خفیہ باتوں کو خوب جانتا ہے۔ ۝۲۶ پھر اس وقت ان کا کیا حال بنے گا جب فرشتے ان کی رُوح اس طرح قبض کریں گے کہ ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر مارتے جاتے ہوں گے؟ ۝۲۷ یہ سب اس لئے کہ یہ اس طریقے پر چلے جس نے اللہ کو ناراض کیا، اور اُس کی رضامندی حاصل کرنے کو خود انہوں

نے ناپسند کیا، اس لئے اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔ ﴿۲۸﴾ جن لوگوں کے دِلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے چھپے ہوئے کینوں کو اللہ کبھی ظاہر نہیں کرے گا؟ ﴿۲۹﴾ اور (مسلمانو!) اگر ہم چاہیں تو تمہیں یہ لوگ اس طرح دِکھا دیں کہ تم اُن کی علامت سے اُنہیں پہچان جاؤ، اور (اب بھی) تم اُنہیں بات کرنے کے ڈھب سے ضرور پہچان ہی جاؤ گے، اور اللہ تم سب کے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۳۰﴾ اور ہم ضرور تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے، تاکہ ہم یہ دیکھ لیں کہ تم میں سے کون ہیں جو مجاہد اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، اور تاکہ تمہارے حالات کی جانچ پڑتال کر لیں۔ ﴿۳۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (تو ہمیشہ اس بات کے مشتاق رہتے ہیں کہ کلامِ الٰہی اور نازل ہوتا کہ ایمان تازہ ہو اور اَحکامِ جدید آئیں تو اُن کا ثواب بھی حاصل کریں اور اگر اَحکامِ سابقہ کی تاکید ہو تو اور زیادہ ثبات حاصل ہو اور اس اشتیاق میں) کہتے رہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہ نازل ہوئی (اگر نازل ہوتی تو تمنا پوری ہو) سو جس وقت کوئی صاف صاف (مضمون کی) سورت نازل ہوتی ہے اور (اتفاق سے) اُس میں جہاد کا بھی (صاف صاف) ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح (بھیانک نگاہوں سے) دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو (اس طرح دیکھنے کا سبب خوف اور بزدلی ہے کہ اب اپنے دعوائے ایمان کو نبھانے کے لئے جہاد میں جانا پڑا اور مصیبت آئی اور وہ جو اس طرح خدا کے حکم سے جی چُراتے ہیں) سو (اصل یہ ہے کہ) عنقریب اُن کی کم بختی آنے والی ہے (خواہ دنیا میں بھی کسی وبال میں گرفتار ہوں ورنہ بعد موت کے تو ضروری ہی ہے اور گو فرصت میں یہ بہت باتیں اطاعت اور خوشامد کی بنایا کرتے ہیں لیکن) ان کی اطاعت اور بات چیت (کی حقیقت) معلوم ہے (جس کا اب نزولِ حکم قتال کے وقت ان کی حالت سے سب ہی پر ظہور ہو گیا) پھر (بعد نزولِ حکم جہاد کے) جب سارا کام (اور سامان لڑائی کا) تیار ہی ہو جاتا ہے تو (اُس وقت بھی) اگر یہ لوگ (دعویٰ ایمان باللہ میں) اللہ سے سچے رہتے (یعنی دعویٰ ایمان کے مقتضا پر عمل کرتے جس میں تمام اَحکامِ شرعیہ عموماً اور حکم جہاد خصوصاً شامل ہے اور صدق دل سے جہاد کرتے) تو اُن کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا (یعنی ابتداء میں اگر منافق تھے تو اخیر ہی میں نفاق سے تائب ہو جاتے تب بھی ایمان مقبول ہو جاتا اور انتہاء کو اس میں منحصر نہ سمجھا جائے کیونکہ وقت موت تک صدق دل سے توبہ مقبول ہے، آگے جہاد کی تاکید اور اُس سے پیچھے رہنے والوں کو خطاب کر کے ترکِ جہاد پر بیان فرماتے ہیں کہ تم لوگ جو جہاد سے کراہت کرتے ہو) سو (اس میں ایک دُنیوی مضرت بھی ہے چنانچہ) اگر تم (اور اسی طرح سب جہاد سے) کنارہ کش ہو رہو تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے (یعنی ہونا چاہئے) کہ تم (یعنی تمام آدمی) دُنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع قرابت کر دو

(یعنی جہاد سے بڑا فائدہ اقامت عدل و اصلاح و امن کا ہے اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو مفسدین کا غلبہ ہو جائے اور کوئی انتظام جس میں تمام لوگوں کے مصالح کی حفاظت ہو نہ رہے اور ایسے انتظام نہ ہونے کے لئے فساد عام اور اضاعۃ حقوق لازم ہے پس جس جہاد میں دُنیوی منفعت بھی ہو اُس سے پیچھے ہٹنا اور بھی عجیب ہے آگے ان منافقین مذکورین کی تقبیح ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا (اس لئے اس کے احکام پر عمل کی توفیق نہ رہی) پھر (رحمت سے بعید کرنے پر یہ امر مرتب ہوا کہ) اُن کو (بگوش قبول احکام الٰہیہ سننے سے) بہرا کر دیا اور (راہِ حق کے دیکھنے سے) ان کی (باطنی) آنکھوں کو اندھا کر دیا (آگے ان پر توبیخ ہے کہ باوجودیکہ قرآن میں جہاد اور دیگر اَحکام کا وجوب مع دلائل حقانیت قرآن کے اور ان اَحکام کے مصالح ومنافع اخرویہ لازماً اور دنیویہ بھی احیاناً اور ان اَحکام کی مخالفت پر وعیدیں مذکور ہیں پھر جو یہ لوگ اُس طرف التفات نہیں کرتے) تو کیا یہ لوگ قرآن (کے اعجاز اور مضامین) میں غور نہیں کرتے (اس لئے ان کو انکشاف نہیں ہوتا) یا (غور کرتے ہیں مگر) دلوں پر (غیبی) قفل لگ رہے ہیں (یہ منع الخلو ہے، یعنی ان دونوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے اور دونوں جمع ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے، اور واقع میں یہاں دونوں باتیں مجتمع ہیں، اوّل ان کی طرف سے ایک فعل ہوا یعنی انکار کی وجہ سے قرآن میں غور نہ کرنا پھر اس کے وبال میں قفل لگ گیا جس کو طبع اور ختم (یعنی مہر لگا دینا) بھی کہا گیا ہے اور دلیل اس ترتیب کی یہ آیت ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور اس مجموعہ پر فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳ [1] (المنافقون) مرتب ہے، آگے اس عدم تدبر کی وجہ فرماتے ہیں کہ) جو لوگ (حق سے) پشت پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے سیدھا راستہ اُن کو (دلائلِ عقلیہ مثل اعجاز قرآن اور دلائل نقلیہ مثل پیشین گوئی کتب سابقہ سے) صاف معلوم ہو گیا شیطان نے ان کو چکمہ دیا ہے اور اُن کو دُور دُور کی سجھائی ہے (کہ ایمان لانے سے فلاں فلاں مصلحتیں موجودہ یا جو آئندہ متوقع ہیں فوت ہو جائیں گی، حاصل یہ ہوا کہ اس عدم تدبر کی وجہ عناد ہے کہ ہدایت کے واضح ثبوت کے بعد پھر یہ اُلٹے پاؤں لوٹے جا رہے اور اس عناد کے بعد تسویل شیطانی ہوئی، یعنی شیطان نے ان کی نظروں میں اس غلط اور مہلک عمل کو مزین کر کے دکھلایا اور اس تسویل سے عدم تدبر ہوا اور عدم تدبر سے ختم اور طبع یعنی دلوں پر مہر ہوئی پھر) یہ (ہدایت سامنے آجانے کے باوجود اس سے لوٹنا اور دُور ہونا) اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اُتارے ہوئے احکام کو (حسداً) ناپسند کرتے ہیں (مراد اس سے رؤسائے یہود ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرتے تھے اور باوجود معرفت حق کے اتباع سے عار کرتے تھے، حاصل یہ کہ ان منافقین نے رؤسائے یہود سے) یہ کہا بعضی باتوں میں ہم تمہارا کہنا مان لیں گے (یعنی تم جو ہم کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہو اس کے دو جزء ہیں ایک عدم اتباع ظاہراً دوسرا عدم اتباع باطناً سو جزو اوّل میں تو ہم بمصلحت تمہارا کہنا نہیں مان سکتے لیکن جزو ثانی میں مان لیں

[1] ترجمہ: یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لے آئے پھر کافر ہو گئے سو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو یہ نہیں سمجھتے۔

گے کیونکہ عقائد میں ہم تمہارے ساتھ ہیں، کما قال اِنَّا مَعَكُمْ [1] (البقرۃ: ۱۴)، مطلب یہ ہوا کہ حق سے پھرنے کا سبب قومی تعصب اور کورانہ تقلید ہے، غرض ابتداء سلسلہ کی اس سے ہے اور انتہاء ختم وطبع پر) اور (گو اس قسم کی باتیں یہ منافقین خفیہ کرتے ہیں مگر) اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ باتیں کرنے کو (خوب) جانتا ہے (اور بعض اُمور پر وحی سے آپ کو مطلع کر دیتا ہے، آگے وعید ہے جو کہ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ کی تفسیر کے طور پر ہو سکتی ہے یعنی یہ جو ایسی حرکتیں کر رہے ہیں) سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہوں گے اور ان کے مونہوں پر اور پشتوں پر مارتے جاتے ہوں گے (اور) یہ (سزا) اس سبب سے (ہوگی) کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اُسی پر چلے اور اس کی رضا (یعنی اعمال موجبہ رضا) سے نفرت کیا کئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے سب اعمال (نیک ابتداء ہی سے) کالعدم کر دیئے (پس اس سزا کے مستحق ہو گئے اور کسی کے پاس کوئی عمل مقبول ہوتو اُس کی برکت سے عقوبت میں کچھ تو کمی ہو جاتی ہے آگے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ کے مضمون کی شرح کے طور پر ہے کہ) جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے (اور وہ اُس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں) کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا (یعنی یہ ان کو کیسے اطمینان ہو گیا جبکہ حق تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا ثابت اور مسلّم ہے) اور ہم (تو) اگر چاہتے تو آپ کو انکا پورا پتہ پتلا دیتے سو آپ اُن کو اُن کے حلیہ سے پہچان لیتے (پورے پتہ کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک کا پورا حلیہ بتا دیتے) اور (گو بمصلحت ہم نے اس طرح نہیں بتلایا لیکن) آپ اُن کو طرزِ کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے (کیونکہ اُن کا کلام صدق پر مبنی نہیں اور آپ کو نورِ فراست سے اللہ تعالیٰ نے صدق وکذب کی پہچان دی تھی کہ صدق کا اثر قلب پر اور ہوتا تھا اور کذب کا اور، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صدق اطمینان بخش ہوتا ہے اور جھوٹ دل میں شک پیدا کرتا ہے [2]) اور (آگے مؤمنین ومنافقین سب کو خطاب میں جمع کر کے بطور ترغیب وترہیب کے فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (پس مسلمانوں کو ان کے اخلاص پر جزا اور منافقین کو ان کے نفاق اور دھوکہ پر سزا دے گا) اور (آگے احکام شاقہ مثل جہاد وغیرہ کی ایک حکیمانہ حکمت ارشاد ہے جیسا اوپر فَهَلْ عَسَيْتُمْ الخ میں ایک حکیمانہ حکمت ارشاد فرمائی تھی یعنی) ہم (ایسے اُمور شاقہ کا حکم دے کر) ضرور تمہاری سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) ان لوگوں کو معلوم (اور ممیّز) کر لیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو (جہاد میں) ثابت قدم رہنے والے ہیں، اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کر لیں (یہ اس لئے بڑھا دیا کہ علاوہ حکم جہاد کے اور احکام بھی داخل ہو جائیں اور علاوہ حالت مجاہدہ وصبر کے دوسرے حالات بھی داخل ہو جائیں)۔

---

[1] ترجمہ: ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں۔

[2] جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة والرقائق، رقم الحديث: ۲۴۴۲

معارف ومسائل

سُوْرَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ، محکمہ کے لفظی معنی مضبوط و مستحکم کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے تو قرآن کی ہر سورت محکمہ ہے لیکن اصطلاحِ شرع میں محکم بمقابلہ منسوخ استعمال ہوتا ہے، یہاں سورۃ کے ساتھ محکمہ کی قید کا اضافہ اس لئے ہے کہ عمل کا شوق تو جبھی پورا ہوسکتا ہے جبکہ وہ سورت منسوخ نہ ہو۔ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ جتنی سورتوں میں قتال و جہاد کے اَحکام آئے ہیں وہ سب محکمہ ہیں۔ یہاں چونکہ اصل مقصود حکم جہاد اور اُس پر عمل ہے اس لئے سورت کے ساتھ محکمہ کا لفظ بڑھا کر ذکر جہاد کی طرف اشارہ کردیا جس کی آگے تصریح آرہی ہے۔ (قرطبی) [۱]

فَاَوْلٰی لَہُمْ ﴿۲۰﴾ کے معنی اصمعی کے قول کے مطابق یہ ہیں قَارَبَہٗ مَا یُھْلِکُہٗ یعنی اس کی ہلاکت کے اسباب قریب آچکے ہیں۔ (قرطبی) [۲]

فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ ﴿۲۲﴾ لفظ توّلی کے لغت کے اعتبار سے دو معنی ہوسکتے ہیں، ایک اعراض دوسرے کسی قوم و جماعت پر اقتدار حکومت۔ اس آیت میں بعض حضرات مفسرین نے پہلے معنی لئے ہیں جس کو اوپر خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔ ابوحیان نے بحرمحیط میں اسی کو ترجیح دی ہے [۳] اس معنی کے اعتبار سے مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر تم نے اَحکامِ شرعیہ الٰہیہ سے روگردانی کی جن میں حکمِ جہاد بھی شامل ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ تم جاہلیت کے قدیم طریقوں پر پڑ جاؤ گے جس کا لازمی نتیجہ زمین میں فساد اور قطع ارحام ہے جیسا کہ جاہلیت کے ہر کام میں اس کا مشاہدہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چڑھائی اور قتل و غارت کرتا تھا، اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور کردیتے تھے۔ اسلام نے ان تمام رسوم جاہلیت کو مٹایا اور اس کے مٹانے کے لئے حکمِ جہاد جاری فرمایا جو اگرچہ ظاہر میں خونریزی ہے مگر درحقیقت اس کا حاصل سڑے ہوئے عضو کو جسم سے الگ کردینا ہے تاکہ باقی جسم سالم رہے، جہاد کے ذریعہ عدل و انصاف اور قرابتوں اور رشتوں کا احترام قائم ہوتا ہے۔ اور روح المعانی [۴] قرطبی [۵] وغیرہ میں اس جگہ توّلی کے معنی حکومت و امارت کے لئے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمہارے حالات جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اُن کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمہاری مراد پوری ہو، یعنی اسی حالت میں تمہیں ملک و قوم کی ولایت اور اقتدار حاصل ہوجائے تو نتیجہ اس کے سوا نہیں

---

۱ تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۴۳

۲ بحوالۂ بالا۔

۳ تفسیر البحر المحیط تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۳۳۱

۴ روح المعانی ج:۱۹ ص:۱۴۷

۵ تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۴۳

ہوگا کہ تم زمین میں فساد پھیلاؤ گے اور رشتوں قرابتوں کو توڑ ڈالو گے۔

صلہ رحمی کی سخت تاکید

اور لفظ اَرْحَامْ رِحْمْ کی جمع ہے، جو ماں کے پیٹ میں انسان کی تخلیق کا مقام ہے۔ چونکہ عام رشتوں قرابتوں کی بنیاد وہیں سے چلتی ہے اس لئے محاورات میں رحم بمعنی قرابت اور رشتہ کے استعمال کیا جاتا ہے تفسیر روح المعانی میں اس جگہ اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ ذوی الارحام اور ارحام کا لفظ کن کن قرابتوں پر حاوی ہے۔ اسلام نے رشتہ داری اور قرابت کے حقوق پورے کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے دو اصحاب سے اس مضمون کی حدیث نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص صلہ رحمی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے قریب کریں گے اور جو رشتہ قرابت قطع کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قطع کر دیں گے جس سے معلوم ہوا کہ اقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ اقوال و افعال اور مال کے خرچ کرنے میں احسان کا سلوک کرنے کا تاکیدی حکم ہے حدیث مذکور میں حضرت ابوہریرہؓ نے اس آیت قرآن کا حوالہ بھی دیا کہ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ [1] اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کوئی ایسا گناہ جس کی سزا اللہ تعالیٰ دُنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں اس کے علاوہ، ظلم اور قطع رحمی کے برابر نہیں (رواہ ابوداؤد والترمذی، ابن کثیر) [2] اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور رزق میں برکت ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔ [3] احادیث صحیحہ میں یہ بھی ہے کہ قرابت کے حق کے معاملہ میں دوسری طرف سے برابری کا خیال نہ کرنا چاہئے اگر دوسرا بھائی قطع تعلق اور ناروا سلوک بھی کرتا ہے جب بھی تمہیں حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا چاہئے۔ صحیح بخاری میں ہے لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِىءِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِىْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو صرف برابر کا بدلہ دے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب دوسری طرف سے قطع تعلق کا معاملہ کیا جائے تو یہ ملانے اور جوڑنے کا کام کرے۔ (ابن کثیر) [4]

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ، یعنی ایسے آدمی جو زمین میں فساد پھیلائیں اور رشتوں قرابتوں کو قطع کریں اُن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے یعنی ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے اُمّ الولد کی بیع کو حرام قرار دیا، یعنی وہ مملوکہ کنیز جس سے کوئی اولاد پیدا ہو چکی ہو اس کو فروخت کرنا اس اولاد سے قطع رحمی کا ذریعہ

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب من وصل وصله الله ج:۲ ص:۸۸۵

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۱۸، ومسند احمد، حدیث ابی بکرة نفیع بن الحارث بن کلدہ، رقم الحدیث:۲۰۳۷۴

[3] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب من أحب البسط فی الرزق (بروایة انس بن مالك رضی الله تعالیٰ عنه) ج:۱ ص:۲۷۷

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۱۹، وصحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافیء ج:۲ ص:۸۸۶

ہے جو موجب لعنت ہے اس لئے امّ ولد کی فروخت کو حرام قرار دیا۔ (رواه الحاكم وصححه وابن المنذر عن بريدة) [1]

کسی معین شخص پر لعنت کا حکم اور لعنِ یزید کی بحث

اور حضرت امام احمد رحمہ اللہ کے صاحبزادے عبداللہ نے اُن سے یزید پر لعنت کرنے کی اجازت کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ اُس شخص پر کیوں نہ لعنت کی جائے جس پر اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے؟ صاحبزادے نے عرض کیا کہ میں نے تو قرآن کو پورا پڑھا اُس میں کہیں یزید پر لعنت نہیں آئی۔ آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ یزید سے زیادہ کون قطعِ ارحام کا مرتکب ہوگا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ وقرابت کی بھی رعایت نہیں کی۔ [2] مگر جمہور اُمت کے نزدیک کسی معین شخص پر لعنت کرنا جائز نہیں، جب تک کہ اس کا کفر پر مرنا یقینی طور پر ثابت نہ ہو۔ ہاں! عام وصف کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے جیسے لعنة الله على الكاذبين، لعنة الله على المفسدين ولعنة الله علىٰ قاطع الرحم وغیرہ، روح المعانی میں اس جگہ اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔ (روح ص:۷۲ ج:۲۶) [3]

اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ دل پر قفل لگ جانے کے وہی معنی ہیں جس کو دوسری آیتوں میں ختم اور طبع یعنی مہر لگ جانے سے تعبیر کیا گیا اور مراد اس سے دل کا سخت اور ایسا بے حس ہو جانا ہے کہ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگے۔ بے پروائی کے ساتھ مسلسل گناہوں میں لگا رہنا عموماً اس کا سبب ہوتا ہے نعوذ بالله منه۔

اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ اس میں شیطان کی طرف دو کاموں کی نسبت کی گئی۔ ایک تسویل جس کے معنی تزیین کے ہیں کہ بُری چیز یا بُرے عمل کو کسی کی نظروں میں اچھا اور مزین کردے۔ دوسرا املاء، جس کے معنی امہال اور مہلت دینے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ شیطان نے اوّل تو ان کے بُرے اعمال کو اُن کی نظروں میں اچھا اور مزین کر کے دکھلایا پھر ان کو ایسی طویل آرزوؤں اور اُمیدوں میں اُلجھا دیا جو پوری ہونے والی نہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ اضغان جمع ضغن کی ہے، جس کے معنی مخفی عداوت اور حسد وکینہ کے ہیں۔ منافقین جو اسلام کا دعویٰ اور ظاہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار اور باطن میں عداوت وکینہ رکھتے تھے اُن کے بارے میں نازل ہوا کہ یہ لوگ اللہ رَبّ العالمین کو عالم الغیب جانتے ہوئے اس بات سے کیوں بے فکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے باطنی راز اور مخفی عداوت کو لوگوں پر ظاہر کردیں۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ براءت میں ان کے ایسے اعمال وافعال اور حرکتوں کا پتہ دے دیا جن سے منافقین کے نفاق کا پتہ چل جائے اور وہ

---

[1] المستدرك للحاكم رقم الحديث:۳۷۰۸

[2] تفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۴۳۴

[3] روح المعانی ج:۱۹ ص:۱۵۱

پہچانے جائیں، اسی لئے سورۂ براءت کو فاضحہ بھی کہا جاتا ہے یعنی رُسوا کرنے والی کیونکہ اس نے منافقین کی خاص خاص علامتیں ظاہر کردی ہیں۔ [۱]

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو آپ کو بالتعیین منافقین کو دکھلا دیں اور ان کا ایسا حلیہ بتلادیں جس سے آپ ہر ایک منافق کو شخصی طور پر پہچان لیں، قرآن نے اس مضمون کو بحرف لَوْ بیان کیا ہے جس کا استعمال ایسی شرط کے لئے ہوتا ہے جس کا وقوع نہ ہوا ہو، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر منافق کو آپ کو شخصی طور پر متعین کر کے بتلا دیتے مگر ہم نے بحکمت و مصلحت اپنے حلم و بردباری سے ان کو اس طرح رُسوا کرنا پسند نہیں کیا تاکہ ضابطہ یہ قائم رہے کہ تمام اُمور کو ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے اور باطنی حالات اور قلبی مضمرات کو صرف علیم وخبیر اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے، البتہ آپ کو ایسی بصیرت ہم نے دے دی ہے کہ آپ منافق کو خود انہیں کے کلام سے پہچان لیں، وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۔ کا یہی مفہوم ہے۔ (ابن کثیر) [۲]

حضرت عثمان بن عفانؓ نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز اپنے دل میں چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اُس کے چہرے سے اور سبقتِ لسانی سے ظاہر کردیتے ہیں یعنی دورانِ گفتگو اس سے کچھ ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے اس کا دلی راز ظاہر ہو جائے۔ ایسی ہی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے دل میں کوئی بات چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے وجود پر اُس چیز کی چادر اُڑھا دیتے ہیں۔ اگر وہ چیز کوئی اچھی بھلی ہے تو وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے اور بُری ہے تو وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ [۳] اور بعض روایاتِ حدیث میں یہ بھی ہے آیا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شخصی طور پر بھی علم دے دیا گیا تھا، جیسا کہ مسند احمد [۴] میں عقبہ بن عمروؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں خاص خاص منافقین کے نام لے کر ان کو مجلس سے اُٹھا دیا اس میں چھتیس آدمیوں کے نام شمار کئے گئے ہیں۔ (ابن کثیر) [۵]

حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ ، اللہ تعالیٰ کو تو اَزل سے ہر شخص کے اعمال و افعال کا علم محیط ازلی ابدی ہے۔ یہاں علم سے مراد ظہور و وقوع ہے۔ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھی اس کا وقوع وظہور ہو کر واقعاتی علم ہو جائے۔ (ابن کثیر) [۶] واللہ اعلم۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۲۱

[۲] بحوالہ بالا۔

[۳] المعجم الکبیر للطبرانیؒ رقم الحدیث: ۱۶۸۱

[۴] مسند احمد، حدیث ابی مسعود عقبة بن عمرو الأنصاری رقم الحدیث:۲۲۳۴۸

[۵] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۲۱، ۳۲۲

[۶] بحوالہ بالا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکا انہوں نے اللہ کی راہ سے اور مخالف ہوگئے رسول سے بعد اس کے

مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْــًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

کہ ظاہر ہوچکی اُن پر سیدھی راہ نہ بگاڑ سکیں گے اللہ کا کچھ اور وہ اکارت کردے گا ان کے سب کام

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا

اے ایمان والو! حکم پر چلو اللہ کے اور حکم پر چلو رسول کے اور ضائع مت کرو

اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا

اپنے کئے ہوئے کام جو لوگ منکر ہوئے اور روکا لوگوں کو اللہ کی راہ سے پھر مرگئے

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ

اور وہ منکر ہی رہے تو ہرگز نہ بخشے گا اُن کو اللہ سو تم بودے نہ ہوئے جاؤ اور لگو پکارنے صلح

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

اور تم ہی رہوگے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور نقصان نہ دے گا تم کو تمہارے کاموں میں

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ

یہ دُنیا کا جینا تو کھیل ہے اور تماشا اور اگر تم یقین لاؤگے اور بچ کر چلوگے دے گا تم کو تمہارا بدلہ

وَلَا يَسْــَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْــَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ

اور نہ مانگے گا تم سے مال تمہارے اگر مانگے تم سے وہ مال پھر تم کو تنگ کرے تو بخل کرنے لگو اور ظاہر کردے

اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ

تمہارے دل کی خفگیاں، سنتے ہو تم لوگ، تم کو بلاتے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں

فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ

پھر تم میں کوئی ایسا ہے کہ نہیں دیتا اور جو کوئی نہ دے گا سو نہ دے گا آپ کو اور اللہ بے نیاز ہے

وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ

اور تم محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو بدل لے گا اور لوگ تمہارے سوائے، پھر

لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ ع

وہ نہ ہوں گے تمہاری طرح کے

آسان ترجمۂ قرآن

یقین رکھو کہ جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، اور دُوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے، اور پیغمبر سے دشمنی ٹھانی ہے باوجودیکہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہو کر آگئی تھی، وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور عنقریب اللہ ان کا سارا کیا دھرا غارت کر دے گا۔ ﴿۳۲﴾ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔ ﴿۳۳﴾ جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، اور دُوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے، پھر کفر ہی کی حالت میں مر گئے ہیں، اللہ کبھی اُن کو نہیں بخشے گا۔ ﴿۳۴﴾ لہٰذا (اے مسلمانو!) تم کمزور پڑ کر صلح کی دعوت نہ دو، تم ہی سربلند رہو گے، اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور وہ تمہارے اعمال کو ہرگز برباد نہیں کرے گا۔ ﴿۳۵﴾ یہ دُنیوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے، اور اگر تم ایمان لاؤ، اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے اَجر تمہیں دے گا، اور تمہارے مال تم سے نہیں مانگے گا۔ ﴿۳۶﴾ اگر وہ تم سے تمہارے مال طلب کرے، اور تم سے سب کچھ سمیٹ لے تو تم بخل سے کام لو گے، اور وہ تمہارے دِل کی ناراضیوں کو ظاہر کر دے گا۔ ﴿۳۷﴾ دیکھو! تم ایسے ہو کہ تمہیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں، اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے، وہ خود اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اور اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہو جو محتاج ہو۔ اور اگر تم منہ

موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ (۳۸)

خلاصۂ تفسیر

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے (اوروں کو بھی) اللہ کے رستہ (یعنی دینِ حق) سے روکا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان کو (دین کا) راستہ (دلائلِ عقلیہ سے مشرکین کے لئے اور نقلیہ سے بھی اہلِ کتاب کے لئے) نظر آ چکا تھا یہ لوگ اللہ (کے دین) کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے (بلکہ یہ دین ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا چنانچہ ہوا) اور اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو (جو دینِ حق کے مٹانے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں) مٹا دے گا، اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور (چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ ہی کا حکم بتلاتے ہیں خواہ خاص طور پر وحی الٰہی میں اس کا حکم ہوا ہو یا وحی الٰہی میں کُلّی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہو، اور اس خاص حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضابطہ میں داخل ہونے کی بناء پر حکم دیا ہو اس لئے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (بھی) اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ و رسول کی مخالفت کر کے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو (اس کی تفصیل معارف و مسائل میں آئے گی) بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے رستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر (بھی) گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا (عدم مغفرت کے لئے کفر کے ساتھ صَدُّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ شرط نہیں بلکہ صرف كَفَرُوْا اِلَى الْمَوْتِ تک کا یہی اثر ہے لیکن زیادت تشنیع کے لئے یہ قید واقعی بڑھا دی کہ اس وقت کے رؤسائے کفار میں یہ امر بھی متحقق تھا، آگے مؤمنین کے مدائح اور کفار کے قبائح پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب معلوم ہو گیا کہ مسلمان خدا کے محبوب اور کفار مبغوض ہیں) تو (اے مسلمانو) تم (کفار کے مقابلہ میں) ہمت مت ہارو اور (ہمت ہار کر ان کو) صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے (اور وہ مغلوب ہوں گے کہ تم محبوب ہو اور وہ مبغوض ہیں) اور اللہ تمہارے ساتھ ہے (یہ تو تم کو دُنیا کی کامیابی ہوئی) اور (آخرت میں یہ کامیابی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ) تمہارے اعمال (کے ثواب) میں ہرگز کمی نہ کرے گا (یہ تو ہمت افزائی کر کے جہاد کی ترغیب تھی آگے دُنیا کے فانی ہونے کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب اور انفاق فی سبیل اللہ کی تمہید ہے کہ) یہ دنیوی زندگی تو محض ایک لہو و لعب ہے (اگر اس میں جان اور مال کو اپنے فائدہ کے لئے بچانا چاہے تو وہ فائدہ ہی کتنے دن کا ہے اور کیا اس کا حاصل) اور اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو (جس میں جہاد بالنفس والمال بھی آ گیا) تو (تم کو تو اپنے پاس سے نفع پہنچا دے گا اس طرح کہ) تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور (تم سے کسی نفع کا طالب نہ ہو گا چنانچہ) تم سے تمہارے مال (تک بھی جو کہ جان سے اہون ہے اپنے نفع کے لئے) طلب نہیں کرے گا (جب تم سے ایسی چیز نہیں طلب کرتا جس کا دینا آسان ہے تو جان جس کا دینا مشکل ہے وہ تو کیوں طلب کرے گا چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارے جان و مال کے خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں

اور نہ یہ ممکن ہے وھٰذا کقولہ تعالیٰ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ [۱] (الانعام: ۱۴، چنانچہ) اگر (امتحاناً) تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے (یعنی سب مال طلب کرنے لگے) تو تم (یعنی تم میں سے اکثر) بخل کرنے لگو (یعنی دینا گوارا نہ کرو) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کردے (یعنی نہ دینے سے کہ فعل ظاہری ہے باطنی ناگواری کھل جائے اس لئے یہ فرد ممکن بھی واقع نہیں کی گئی اور) ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں (جس کا نفع تمہاری طرف عائد ہونا یقینی ہے تھوڑا سا حصہ مال کا) خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے (اور بقیہ اکثر تمہارے قبضہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے) سو (اس پر بھی) بعضے تم میں سے وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور (آگے اس فرد واقع پر بخل کی مذمت ہے کہ) جو شخص (ایسی جگہ خرچ کرنے سے) بخل کرتا ہے تو وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے (یعنی اپنے ہی کو اُس کے نفع دائمی سے محروم رکھتا ہے) اور (نہیں تو) اللہ تو کسی کا محتاج نہیں (تاکہ احتمال اس کے ضرر کا ہو) اور (بلکہ) تم سب (اس کے) محتاج ہو (اور تمہاری اس احتیاج کی رعایت سے تم کو انفاق کا حکم کیا گیا کیونکہ آخرت میں تم کو ثواب کی حاجت ہوگی اور طریق اس کا یہی اعمال ہیں اور) اگر تم (ہمارے احکام سے) روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور) پھر وہ تم جیسے (روگردانی کرنے والے) نہ ہوں گے (بلکہ نہایت فرمانبردار ہوں گے، یہ کام اُن سے لیا جائے گا اور اس طرح وہ حکمت پوری ہو جائے گی)۔

معارف و مسائل

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، یہ آیت بھی منافقین اور یہود بنی قریظہ و بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ اُن منافقین کے متعلق ہے جنہوں نے غزوۂ بدر کے موقع پر کفارِ قریش کی امداد اس طرح کی کہ ان میں سے بارہ آدمیوں نے اُن کے پورے لشکر کا کھانا اپنے ذمہ لے لیا تھا، ہر روز اُن میں سے ایک آدمی لشکر کفار کے کھانے کا انتظام کرتا تھا۔ [۲]

وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ یہاں حبطِ اعمال سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی اسلام کے خلاف کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے بلکہ اکارت کردے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے کفر و نفاق کی وجہ سے ان کے نیک عمل مثل صدقہ خیرات وغیرہ کے سب اکارت ہو جائیں گے قابلِ قبول نہ ہوں گے وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ قرآنِ کریم نے اس جگہ حبطِ اعمال کے بجائے ابطالِ اعمال کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا مفہوم بہت عام

---

[۱] ترجمہ: اور جو کھانے کو دیتے ہیں اور ان کو کوئی کھانے کو نہیں دیتا۔

[۲] تفسیر المظہری ج:۸ ص:۴۳۷، وتفسیر روح المعانی ج:۱۹ ص:۱۶۴

ہے کیونکہ ابطال کی ایک تو وہ صورت ہے جو کفر کی وجہ سے پیش آتی ہے جس کو اوپر آیت میں حبطِ اعمال کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ کافر اصلی کا تو کوئی عمل بوجہ کفر کے مقبول ہی نہیں اور جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا تو زمانۂ اسلام کے اعمال اگرچہ لائقِ قبول تھے مگر اس کے کفر وارتداد نے ان سب اعمال کو بھی اکارت کر دیا۔

دُوسری صورت ابطالِ اعمال کی یہ بھی ہے کہ بعض اعمالِ صالحہ کے لئے کچھ دُوسرے اعمالِ صالحہ شرط ہیں تو جس شخص نے اُس شرط کو ضائع کر دیا تو اس کا یہ عملِ صالح بھی ضائع ہوگیا جو اس شرط کے ساتھ مشروط تھا۔ مثلاً ہر عملِ صالح کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو، رِیا وسُمعہ اس میں نہ ہو یعنی محض لوگوں کے دِکھانے یا سنانے کے لئے یہ عمل نہ کیا ہو۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ [1] (البيّنة:۵) اور دُوسری جگہ فرمایا: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ [2] (الزمر:۳) تو جس شخص کے نیک اعمال ریا ونمود کے لئے ہوں وہ عمل اللہ کے نزدیک باطل ہوجائے گا۔ اسی طرح صدقات کے بارے میں خود قرآن نے تصریح فرمادی: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرة:۲۶۴) یعنی اپنے صدقات کو اِحسان جتلاکر یا غریب کو اِیذا دے کر باطل نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ جس نے صدقہ دے کر غریب پر اِحسان جتلایا یا اُسے کوئی اور اِیذا پہنچائی اس کا صدقہ باطل ہے۔ یہی مفہوم ہوسکتا ہے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے قول کا جو انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اپنی نیکیوں کو گناہوں کے ذریعہ باطل نہ کرو، جیسا کہ ابنِ جریج کا قول ہے یعنی بِالرِّيَآءِ وَالسُّمْعَةِ اور مقاتل وغیرہ نے فرمایا بِالْمَنِّ، کیونکہ باتفاق اہلِ سنت والجماعت کفر وشرک کے علاوہ کوئی گناہ اگرچہ کبیرہ ہو ایسا نہیں جو مؤمن کے تمام اعمالِ صالحہ کو حبط اور باطل کردے مثلاً کسی شخص نے چوری کرلی اور وہ نماز روزہ کا پابند ہے تو شرعاً اس کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تیری نماز اور روزہ بھی باطل ہوگئے اس کی قضا کر۔ اس لئے ابطالِ اعمال بالمعاصی سے مراد وہی معاصی ہوں گے جن کے نہ کرنے پر عمل کی مقبولیت کا مدار ہے جیسا ریا ونمود کہ ان کا نہ ہونا ہر عمل صالح کی مقبولیت کی شرط ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے قول میں ابطالِ اعمال سے مراد اعمالِ صالحہ کی برکات سے محرومی ہو نفس عمل کا ضائع ہوجانا مراد نہ ہو تو یہ تمام معاصی کے لئے شرط ہے۔ جس شخص کے اعمال میں معاصی کا غلبہ ہو تو اس کے تھوڑے سے نیک اعمال میں بھی وہ برکت نہیں ہوتی کہ عذاب سے بچالے بلکہ وہ اپنے اعمال کی سزا قاعدہ کے مطابق بھگتے گا مگر بالآخر اپنے ایمان کی برکت سے سزا بھگتنے کے بعد انجام کار نجات پائے گا۔

مسئلہ: تیسری صورت اِبطالِ عمل کی یہ بھی ہے کہ کوئی نیک عمل کر کے اس کو قصداً فاسد کردے، مثلاً نفل نماز یا روزہ شروع کرے پھر بغیر کسی عذر کے اس کو قصداً فاسد کردے یہ بھی اس آیت کے ذریعہ ناجائز قرار پایا، امام اعظم

[1] ترجمہ: حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اس کے لئے خالص رکھیں۔

[2] ترجمہ: یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔

ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے کہ جو اعمال صالحہ ابتداءً فرض یا واجب نہیں تھے مگر کسی نے ان کو شروع کر دیا تو اب ان کی تکمیل اس آیت کی رُو سے واجب ہوگئی تا کہ ابطال عمل کا مرتکب نہ ہو، اگر کسی نے ایسا عمل شروع کر کے بلا عذر کے چھوڑ دیا یا قصداً فاسد کر دیا تو وہ گناہگار بھی ہوا اور اس کے ذمہ قضا بھی لازم ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نہ تو قضا لازم ہے اور نہ اس کے فاسد کرنے کا گناہگار ہوگا کیونکہ جب ابتداءً یہ عمل فرض یا واجب نہیں تھا تو بعد میں بھی فرض و واجب نہیں جس کے ترک یا فساد سے گناہ لازم آئے مگر حنفیہ کے نزدیک آیت مذکورہ کے الفاظ عام ہیں ہر عمل صالح کو شامل ہیں خواہ پہلے فرض و واجب ہو یا نفلی طور پر کرنا شروع کر دیا ہو تو شروع کرنے سے وہ نفلی عمل بھی واجب ہوگیا، تفسیر مظہری میں اس جگہ احادیث کثیرہ سے اس بحث کو مفصل لکھا گیا ہے۔ [1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ، انہیں الفاظ کے ساتھ ایک حکم ابھی پہلے آیا ہے، مکرّر ذِکر یا تو اس لئے ہے کہ پہلی آیت میں کفار کے خسارۂ دُنیوی کا بیان ہوا ہے اور اس آیت میں ان کا اُخروی نقصان بتلانا منظور ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں نقل کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی آیت میں عام کفار کا ذِکر تھا جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بعد میں مسلمان ہوگئے ان کا حکم تو یہ آیا کہ جو اعمالِ صالحہ انہوں نے بحالتِ کفر کئے تھے وہ سب اکارت گئے اسلام لانے کے بعد بھی ان کا ثواب نہیں ملے گا اور اس آیت میں ایسے کفار کا خاص ذِکر ہے جو مرتے دم تک کفر و شرک ہی پر جمے رہے کہ ان کا حکم یہ ہے کہ آخرت میں ان کی ہرگز مغفرت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ اس آیت میں کفار کو صلح کی دعوت دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال:۶۱) یعنی اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جایئے جس سے صلح کی اجازت معلوم ہوتی ہے اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ اجازت والی آیت اس شرط کے ساتھ ہے کہ کفار کی طرف صلح جوئی کی ابتداء ہو اور اس آیت میں جس کو منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے صلح کی درخواست کی جائے اس لئے دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں مگر صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ابتداءً صلح کر لینا بھی جائز ہے جبکہ مصلحت مسلمانوں کی اس میں دیکھی جائے۔ محض بزدلی اور عیش کوشی اس کا سبب نہ ہو اور اس آیت نے شروع میں فَلَا تَهِنُوْا کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ممنوع وہ صلح ہے جس کا منشاء بزدلی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے فرار ہو اس لئے اس میں بھی کوئی تعارض نہیں کہ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کی آیت کے حکم کو اُس صورت کے ساتھ مقید کیا جائے جس میں صلح جوئی کا سبب وَهْن اور سستی بزدلی نہ ہو بلکہ خود مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو۔ واللہ اعلم۔

وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی جزاء میں کوئی کمی نہیں کرے گا، اشارہ اس طرف

---

[1] تفسیر المظہری ج:۸ ص:۴۳۸

ہے کہ دنیا میں کوئی تکلیف بھی پہنچ گئی تو اس کا اجرِ عظیم آخرت میں ملنے والا ہے اس لئے مؤمن تکلیف کی حالت میں بھی ناکام نہیں۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، چونکہ جہاد سے روکنے والی چیز انسان کے لئے دُنیا کی محبت ہی ہوسکتی ہے، جس میں اپنی جان کی محبت، اہل وعیال کی محبت مال ودولت کی محبت سب داخل ہیں اس آیت میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ سب چیزیں بہرحال ختم اور فنا ہونے والی ہیں اس وقت ان کو بچا بھی لیا تو پھر کیا، دوسرے وقت یہ چیزیں ہاتھ سے نکلیں گی اس لئے ان فانی اور ناپائیدار چیزوں کی محبت کو آخرت کی دائمی پائیدار نعمتوں کی محبت پر غالب نہ آنے دو۔

وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرتا مگر پورے قرآن میں زکوٰۃ وصدقات کے اَحکام اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے بے شمار مواقع آئے ہیں اور خود اس کے بعد ہی دوسری آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید آرہی ہے اس لئے بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اس لئے بعض حضرات نے وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اموال تم سے کسی اپنے نفع کے لئے نہیں مانگتا بلکہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے مانگتا ہے جس کا ذکر اسی آیت میں بھی يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ کے الفاظ سے کردیا گیا ہے کہ تم سے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا وہ اس لئے ہے کہ آخرت میں جہاں تمہیں سب سے زیادہ ضرورت نیکیوں کی ہوگی اس وقت یہ خرچ کرنا تمہارے کام آئے وہاں تمہیں اس کا اجر ملے۔ مذکور الصدر خلاصۂ تفسیر میں اسی مفہوم کو اختیار کیا گیا ہے، اس کی نظیر یہ آیت مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ (الذاریات: ۵۷) ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے اپنے لئے کوئی رزق نہیں لیتے نہ اس کی ہمیں حاجت ہے اور بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ سے مراد پورا مال طلب کرلینا ہے (وهو قول ابن عُيَينه قرطبی)[1] اس کا قرینہ اگلی آیت ہے جس میں فرمایا ہے اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ کیونکہ يُحْفِ احفاء سے مشتق ہے، جس کے معنٰی مبالغہ اور کسی کام میں آخر تک پہنچ جانے کے ہیں۔ اس دوسری آیت کا مفہوم سب کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے اموال پورے طلب کرتا تو تم بخل کرنے لگتے اور اس حکم کی تعمیل تمہیں ناگوار ہوتی یہاں تک کہ ادائیگی کے وقت تمہاری یہ ناگواری ظاہر ہوجاتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ سے مراد یہی ہے جو دوسری آیت میں فَيُحْفِكُمْ کی قید کے ساتھ آیا ہے تو مطلب ان دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مالی فرائض زکوٰۃ وغیرہ تم پر عائد کئے ہیں اوّل تو وہ خود تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی اپنا فائدہ نہیں، دوسرے پھر اُن فرائض میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے مال کا اتنا تھوڑا سا جزو

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۵۷

فرض کیا ہے جو کسی طرح بارِ خاطر نہ ہونا چاہئے زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ زمین کی پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصہ، سو بکریوں میں سے ایک بکری، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پورے اموال طلب نہیں کئے جن کا دینا ناگوار بار خاطر طبعاً ہوتا بلکہ اس کا قدر قلیل طلب فرمایا ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ اس کو خوش دلی کے ساتھ ادا کیا کرو۔ اور اس دوسری آیت میں جو ارشاد ہے وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ اس میں اضغان جمع ضِغن کی ہے جس کے معنی مخفی کینہ اور مخفی کراہت کے ہیں اس جگہ بھی مخفی کراہت و ناگواری مراد ہے یعنی طبعی طور پر انسان کو اپنا پورا مال بخشش کر دینا ناگوار ہوتا ہے جس کو وہ ظاہر بھی نہ کرنا چاہے تو ادائیگی کے وقت ٹال مٹول وغیرہ سے یہ ناگواری کھل ہی جاتی ہے تو حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے پورے اموال کا مطالبہ کر لیتا تو تم بخل کرنے لگتے اور بخل کی وجہ سے جو ناگواری اور کراہت تمہارے دلوں میں ہوتی وہ لامحالہ ظاہر ہو جاتی۔ اس لئے اُس نے تمہارے اموال میں سے ایک حقیر اور قلیل حصہ تم پر فرض کیا ہے تم اس میں بھی بخل کرنے لگے اسی کا بیان آخری آیت میں اس طرح فرمایا ہے کہ:

تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ یعنی تم کو تمہارے اموال کا کچھ حصہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو تم میں سے بعض اس میں بھی بخل کرنے لگتے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ یعنی جو شخص اس میں بھی بخل کرتا ہے وہ کچھ اللہ کا نقصان نہیں کرتا بلکہ خود اپنی جان کا نقصان اس بخل کے ذریعہ کرتا ہے کہ آخرت کے ثواب سے محرومی اور ترک فرض کا وبال ہے۔ پھر اسی بات کو زیادہ وضاحت سے فرما دیا وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ یعنی اللہ تو غنی ہے تم ہی حاجت مند ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خود تمہاری حاجت کا پورا کرنا ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ اس آیت میں حق تعالیٰ کے غنی الاغنیاء ہونے کو اس طرح واضح کیا ہے کہ اللہ کو تمہارے اموال کی تو کیا خود تمہارے وجود کی بھی کوئی ضرورت نہیں، اگر تم سب کے سب ہمارے اَحکام کی تعمیل چھوڑ دو تو جب تک ہمیں دُنیا کو اور اس میں اسلام کو باقی رکھنا ہے، ہم اپنے دینِ حق کی حفاظت اور اپنے اَحکام کی تعمیل کے لئے دوسری ایسی قوم پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح اَحکامِ شرعیہ سے گریز اور اعراض نہ کرے گی بلکہ ہماری مکمل اطاعت کرے گی۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ مراد اس سے عجمی لوگ ہیں، اور حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد فارس اور روم ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت صحابۂ کرام کے سامنے فرمائی تو صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ ایسی کونسی قوم ہے کہ اگر ہم (خدانخواستہ) اَحکامِ دین سے روگردانی کرنے لگیں تو وہ ہمارے بدلے میں لائی جائے گی اور پھر وہ ہماری طرح اَحکام سے روگردانی نہیں کرے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ (جو مجلس میں موجود تھے) کی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ اور اس

کی قوم، اور اگر (بالفرض) دینِ حق ثریا ستارے پر بھی ہوتا (جہاں لوگوں کی رسائی مشکل ہوتی) تو فارس کے کچھ لوگ وہاں بھی پہنچ کر دین کو حاصل کرتے اور اس پر عمل کرتے۔ (رواه الترمذی والحاکم وصححاه وابن حبان مظھری) [١]

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب جو ابوحنیفہؒ کے مناقب میں لکھی ہے اس میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب ہیں کیونکہ ابناء فارس میں کوئی جماعت علم کے اُس مرتبہ پر نہیں پہنچی جس پر ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب پہنچے ہیں۔ (حاشیہ تفسیر مظہری) [٢]

تمّت بحمد الله تعالىٰ وعونہ سورة محمد (صلى الله عليه وسلم) للرّابع عشر من شعبان ١٣٩٢ھ یَوْم السّبت بعد العصر

---

[١] تفسير المظهرى ج:٨ ص:٤٤٧، وجامع الترمذى، ابواب التفسير، باب سورة تفسير محمد صلى الله عليه وسلم ج:٢ ص:١٦١، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:٣٦٦٨، وصحيح ابن حبان رقم الحديث:٧٢٤٦

[٢] تفسير المظهرى بحوالہ بالا۔

سُورَةُ الفَتح

آیاتھا ۲۹ ۴۸ سُورَةُ الفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱ رکوعاتھا ۴

سورۂ فتح مدینہ میں نازل ہوئی اس کی اُنتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝١ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ

ہم نے فیصلہ کردیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ

وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢

اور جو پیچھے رہے، اور پورا کردے تجھ پر اپنا احسان اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝٣

اور مدد کرے تیری اللہ زبردست مدد۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) یقین جانو، ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے، ۞ تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دے، اور تا کہ اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے، اور تمہیں سیدھے راستے پر لے چلے، ۞ اور (تا کہ) اللہ تمہاری ایسی مدد کرے جو سب پر غالب آ جائے۔ ۞

خلاصۂ تفسیر

بے شک ہم نے (اس صلح حدیبیہ سے) آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی (یعنی صلح حدیبیہ سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ سبب ہوگئی ایک فتح مطلوب یعنی فتح مکہ کا، اس لحاظ سے یہ صلح ہی فتح ہوگئی۔ اور فتح مکہ کو فتح مبین اس لئے کہا گیا کہ فتح سے مقصود شریعتِ اسلام میں کوئی حکمرانی نہیں بلکہ دینِ اسلام کا غلبہ مقصود ہوتا ہے، اور فتح مکہ سے یہ مقصود بڑی حد تک حاصل ہوگیا، کیونکہ تمام قبائلِ عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آگئے تو ہم بھی اطاعت کرلیں گے۔ جب مکہ فتح ہوا تو چاروں طرف سے عرب کے قبائل اُمڈ پڑے اور خود یا بواسطہ اپنے وفود کے اسلام لانا شروع کیا (رواہ البخاری عن عمرو بن سلمہ)۔[1] چونکہ غلبۂ اسلام کے بڑے آثار فتح مکہ سے نمایاں ہوئے اس لئے اس کو فتح مبین فرمایا گیا، اور صلح حدیبیہ اس فتح مکہ کا سبب اور ذریعہ اس طرح ہوگئی کہ اہلِ مکہ سے آئے دن لڑائی رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی قوت اور سامان بڑھانے کی مہلت و فرصت نہ ملتی تھی۔ حدیبیہ کے واقعہ میں جو صلح ہوگئی تو اطمینان کے ساتھ مسلمانوں نے کوشش کی جس سے بہت سے نئے آدمی مسلمان ہوگئے اور مجمع مسلمانوں کا بڑھ گیا اور فتح خیبر وغیرہ سے سامان بھی درست ہوگیا اور ایسے ہوگئے کہ دوسروں پر دباؤ پڑ سکے، پھر قریش کی طرف سے عہد شکنی ہوئی تو آپ دس ہزار صحابۂ کرام کے ساتھ مقابلے کے لئے چلے۔ اہلِ مکہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ زیادہ لڑائی بھی نہیں ہوئی اور اطاعت قبول کر لی اور جو لڑائی ہوئی بھی تو اتنی کم اور خفیف کہ اہلِ علم کا اس میں اختلاف ہوگیا کہ مکہ مکرمہ صلح کے ساتھ فتح ہوا یا جنگ سے، غرض اس طرح یہ صلح سبب فتح ہوگئی اس لئے مجازی طور پر اس صلح کو بھی فتح فرما دیا گیا جس میں فتح مکہ کی پیشین گوئی بھی ہے۔ آگے اس فتح کے دینی اور دنیوی ثمرات و برکات کا بیان ہے کہ یہ فتح اس لئے میسر ہوئی) تا کہ (تبلیغ دین اور دعوتِ حق میں آپ کی کوششوں کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں اور اس سے آپ کا اجر بہت بڑھ جائے اور کثرتِ اجر

---

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي، رقم الحديث: ۴۳۰۲

وقرب کی برکت سے) اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی (صوری) خطائیں معاف فرمادے اور آپ پر (جو اللہ تعالیٰ) اپنے احسانات (کرتا آتا ہے مثلاً آپ کو نبوّت دی، قرآن دیا، بہت سے علوم دیئے بہت سے اعمال کا ثواب دیا اُن احسانات) کی (اور زیادہ) تکمیل کردے (اس طرح کہ آپ کے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں جس سے آپ کا اجر اور مقام قرب اور بلند ہو یہ دو نعمتیں تو آخرت سے متعلق ہیں) اور (دو نعمتیں دُنیوی ہیں ایک یہ کہ) آپ کو بغیر کسی روک ٹوک کے دین کے) سیدھے راستہ پر لے چلے (اور اگرچہ آپ کا صراطِ مستقیم پر چلنا پہلے سے یقینی ہے مگر اس میں کفار کی مزاحمت بھی ہوتی تھی اب یہ مزاحمت نہیں رہے گی) اور (دوسری دُنیوی نعمت یہ ہے کہ) اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزّت ہی عزّت ہو (یعنی جس کے بعد آپ کو کبھی کسی سے دبنا نہ پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تمام جزیرۃ العرب پر آپ کا تسلط ہوگیا)۔

معارف و مسائل

جمہور صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمۂ تفسیر کے نزدیک سورۂ فتح ۶ھ میں اُس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقصدِ عمرہ مکہ مکرمہ مع جماعت صحابہ کے تشریف لے گئے اور حرم مکہ کے قریب مقامِ حدیبیہ تک پہنچ کر قیام فرمایا مگر قریشِ مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے منع کیا پھر اس پر صلح کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ اس سال تو آپ واپس چلے جائیں اگلے سال اس عمرہ کی قضاء کرلیں، بہت سے صحابۂ کرام خصوصاً فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اس طرح کی صلح سے ناراض تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باشاراتِ ربانی اس صلح کو انجام کار مسلمانوں کے لئے ذریعۂ کامیابی سمجھ کر قبول فرمالیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا احرام عمرہ کھول دیا اور حدیبیہ سے واپس روانہ ہوئے تو راستے میں یہ سورت پوری نازل ہوئی، جس میں بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا ہے ضرور واقع ہوگا، مگر اُس کا یہ وقت نہیں بعد میں فتح کے وقت ہوگا۔ اور اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ صلح ہی درحقیقت فتحِ مکہ کا سبب بنی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام نے فرمایا ہے کہ تم لوگ تو فتحِ مکہ کو فتح کہتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم صلح حدیبیہ ہی کو فتح سمجھتے ہیں۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ تو فتحِ مکہ ہی کو فتح سمجھتے ہو اور کوئی شک نہیں کہ وہ فتح ہے لیکن ہم تو واقعہ حدیبیہ کے وقت بیعتِ رضوان کو اصلی فتح سمجھتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین صحابہ سے جن کی تعداد چودہ سو تھی[1] ایک درخت کے نیچے جہاد کرنے پر بیعت لی تھی۔ جیسا کہ اسی سورت میں اُس

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ ج:۲ ص:۵۹۸

بیعت کا ذکر بھی آگے آرہا ہے۔ (ملخص از ابن کثیر) [۱] اور جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سورت واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے اور اس واقعے کے بہت سے اجزاء کا خود اس سورت میں تذکرہ بھی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس واقعے کو پہلے ذِکر کردیا جائے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں اس کی بڑی تفصیل ہے اور اُس سے زیادہ تفسیر مظہری میں اس جگہ چودہ صفحات میں یہ قصہ اوّل سے آخر تک مفصل اور مرتب مستند کتبِ حدیث کے حوالے سے بیان کیا ہے، جو بہت سے معجزات اور نصائح اور علمی، دِینی، سیاسی فوائد و حِکَم پر مشتمل ہے، اس میں سے یہاں اس قصے کے صرف وہ اجزاء لکھے جاتے ہیں جن کا ذِکر خود اس سورت میں کیا گیا ہے یا جن سے اس کا گہرا تعلق ہے، تاکہ آگے اُن آیتوں کی تفسیر سمجھنا آسان ہوجائے جو اس قصہ سے متعلق ہیں۔ اور یہ سب بیان تفسیرِ مظہری سے لیا گیا ہے اور جو کسی دُوسری تفسیر سے لیا ہے اس کا حوالہ دے دیا ہے۔

واقعۂ حدیبیہ

حُدَیْبِیَۃ، ایک مقام مکہ مکرمہ سے باہر حدودِ حرم کے بالکل قریب ہے۔ جس کو آج کل شمیسہ کہا جاتا ہے یہ واقعہ اس مقام پر پیش آیا ہے۔

جزوِ اوّل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب

اس واقعہ کا ایک جزو بروایت عبد بن حُمَیْد و ابن جریر و بیہقی وغیرہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپ مکہ مکرمہ میں مع صحابۂ کرام کے امن و اطمینان کے ساتھ داخل ہوئے اور احرام سے فارغ ہوکر کچھ لوگوں نے حسبِ قاعدہ سر کا حلق کرایا، بعض نے بال کٹوالئے اور یہ کہ آپ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اور بیت اللہ کی چابی آپ کے ہاتھ آئی، [۲] یہ اس واقعہ کا ایک جزو ہے جس کا ذکر اسی سورت میں آنے والا ہے (انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اس لئے اس صورت کا واقع ہونا یقینی ہوگیا مگر خواب میں اس واقعہ کے لئے کوئی سال یا مہینہ متعین نہیں کیا گیا، اور درحقیقت یہ خواب فتح مکہ کے وقت پورا ہونے والا تھا۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو خواب سنایا تو وہ سب کے سب مکہ مکرمہ جانے اور بیت اللہ کا طواف کرنے وغیرہ کے ایسے مشتاق تھے کہ ان حضرات نے فوراً ہی تیاری شروع کردی اور جب صحابۂ کرام کا ایک مجمع تیار ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارادہ فرمالیا کیونکہ خواب میں کوئی خاص سال یا مہینہ متعین نہیں تھا تو احتمال یہ بھی تھا کہ ابھی یہ مقصد حاصل ہوجائے۔ (کذا فی بیان القرآن بحوالہ روح المعانی) [۳]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۲۵

[۲] دلائل النبوۃ للبیہقیؒ (باختصار) رقم الحدیث:۱۵۱۲

[۳] بیان القرآن تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۲۶، وروح المعانی (بالاختصار) ج:۱۹ ص:۲۲۹

جزوِ دوم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیہات کے مسلمانوں کو ساتھ چلنے کے لئے بلانا اور بعض کا انکار کرنا

ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے عمرہ کا ارادہ فرمالیا تو آپ کو یہ خطرہ سامنے تھا کہ قریشِ مکہ ممکن ہے کہ ہمیں عمرہ کرنے سے روکیں اور ممکن ہے کہ مدافعت کے لئے جنگ کی صورت پیش آجائے اس لئے آپ نے مدینہ طیبہ کے قریبی دیہات میں اعلان کر کے ان لوگوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دی، ان میں سے بہت سے اعراب (دیہات) نے ساتھ چلنے سے عذر کر دیا اور کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب ہمیں قریشِ مکہ سے لڑوانا چاہتے ہیں جو ساز و سامان والے اور طاقتور ہیں ان کا انجام تو یہ ہونا ہے کہ یہ اس سفر سے زندہ واپس نہ لوٹیں گے۔ (مظہری) [1]

جزوِ سوم: مکہ کی طرف روانگی

امام احمد و بخاری، ابوداؤد و نسائی وغیرہ کی روایت کے مطابق روانگی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا اور نیا لباس زیب تن فرمایا اور اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار ہوئے، اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کو ساتھ لیا اور آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار اور دیہات کے آنے والوں کا بڑا مجمع تھا جن کی تعداد اکثر روایات میں چودہ سو بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی وجہ سے ان میں کسی کو شک نہیں تھا کہ مکہ اسی وقت فتح ہو جائے گا، حالانکہ بجز تلواروں کے اُن کے ساتھ اور کچھ اسلحہ نہ تھا۔ آپ مع صحابۂ کرام کے شروع ماہ ذیقعدہ میں پیر کے دن روانہ ہوئے اور ذُوالحلیفہ میں پہنچ کر احرام باندھا۔ (مظہری ملخصاً) [2]

جزوِ چہارم: اہلِ مکہ کی مقابلے کے لئے تیاری

دوسری طرف جب اہلِ مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بڑی جماعت صحابہ کے ساتھ مکہ کے لئے روانہ ہونے کی خبر ملی تو جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لئے آرہے ہیں اگر ہم نے ان کو مکہ میں آنے دیا تو تمام عرب میں یہ شہرت ہو جائے گی کہ وہ ہم پر غلبہ پا کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی جنگیں ہو چکی ہیں سب نے عہد کیا کہ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے اور آپ کو روکنے کے لئے خالد بن

---

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۷

[2] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۱، وطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ ج:۲ ص:۹۵، وکتاب المغازی للواقدی، غزوۃ الحدیبیۃ ج:۱ ص:۲۲۹

ولید (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک جماعت کو مکہ سے باہر مقام کُرَاعِ الغَمِيم پر بھیج دیا اور آس پاس کے دیہات والوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور طائف کا قبیلہ بنو ثقیف بھی ان کے ساتھ لگ گیا، انہوں نے مقام بَلْدَح پر اپنا پڑاؤ ڈال لیا، ان سب نے آپس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے اور آپ کے مقابلے میں جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

خبر رسانی کا ایک عجیب سادہ طریقہ

ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مقام بلدح سے لے کر اُس مقام تک جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ چکے تھے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کچھ آدمی بٹھا دیئے تا کہ آپ کے پورے حالات دیکھ کر آپ کے متصل پہاڑ والا بآوازِ بلند دوسرے پہاڑ والے تک وہ تیسرے تک وہ چوتھے تک پہنچا دے اس طرح چند منٹوں میں آپ کی نقل وحرکت کا بَلْدَح والوں کو علم ہو جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر رساں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرؓ ابن سفیان کو آگے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا کہ وہ خفیہ اہلِ مکہ کے حالات جا کر دیکھیں اور آپ کو اطلاع کریں۔ وہ مکہ سے واپس آئے تو اہلِ مکہ کی ان جنگی تیاریوں اور مکمل مزاحمت کے واقعات کی خبر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس ہے قریش پر کہ متعدد جنگوں نے ان کو کھا لیا ہے پھر بھی وہ جنگ سے باز نہیں آتے، اُن کے لئے تو اچھا موقع تھا کہ وہ مجھے اور دوسرے اہلِ عرب کو آزاد چھوڑ دیتے اگر یہ عرب لوگ مجھ پر غالب آجاتے تو اُن کی مراد گھر بیٹھے حاصل تھی اور میں اُن پر غالب آجاتا تو یا تو پھر وہ بھی اسلام میں داخل ہو جاتے اور اگر یہ نہ کرتے اور جنگ ہی کرنے کا ارادہ ہوتا تو تازہ اور قوی ہوتے اور پھر وہ میرے مقابلے پر آجاتے، معلوم نہیں کہ یہ قریش کیا سمجھ رہے ہیں قسم ہے اللہ کی کہ میں اُس حکم پر جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے ہمیشہ ان کے خلاف جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ تنہا میری گردن رہ جائے۔

جزوِ پنجم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کا راستے میں بیٹھ جانا

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا اور مشورہ لیا کہ اب ہمیں یہیں سے ان عربوں کے خلاف جہاد شروع کر دینا چاہئے یا ہم بیت اللہ کی طرف بڑھیں، پھر جو ہمیں روکے اُس سے قتال کریں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ نے مشورہ دیا کہ آپ بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں کسی سے جنگ کے لئے نہیں

نکلے اس لئے آپ اپنے قصد پر رہیں ہاں اگر کوئی ہمیں مکہ سے روکے گا تو ہم اُس سے قتال کریں گے، اس کے بعد حضرت مقداد بن اسودؓ اُٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ، ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ آپ سے یہ کہہ دیں فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ (المائدۃ: ۲۴) (یعنی جایئے آپ اور آپ کا ربّ لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) بلکہ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ قتال کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا، بس اب اللہ کے نام پر مکہ کی طرف چلو۔ جب آپ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے اور خالد بن ولید اور اُن کے ساتھیوں نے آپ کو مکہ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے لشکر کی صفوف جانب قبلہ کی طرف مستحکم کر کے کھڑا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباد بن بشر کو ایک دستہ فوج کا امیر بنا کر آگے کیا، اُنہوں نے خالد بن ولید کے لشکر کے بالمقابل صفوف بنالیں، اسی حالت میں نماز ظہر کا وقت آگیا حضرت بلالؓ نے اذان کہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابۂ کرام کو نماز پڑھائی۔ خالد بن ولید اور اُن کے سپاہی دیکھتے رہے۔ بعد میں خالد بن ولید نے کہا کہ ہم نے بڑا اچھا موقع ضائع کر دیا جب یہ لوگ سب نماز میں تھے اُس وقت ہم اُن پر ٹوٹ پڑتے مگر کچھ بات نہیں اب اُن کی دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے اس کا انتظار کرو مگر جبرئیل علیہ السلام صلوٰۃ الخوف کے احکام لے کر نازل ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادوں سے باخبر کر کے نماز کے وقت لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ بتلا دیا اور ان کے شر سے محفوظ رہے۔

جزوِ ششم: مقامِ حدیبیہ میں ایک معجزہ

مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے قریب پہنچے تو آپ کی اونٹنی کا ہاتھ پھسل گیا وہ بیٹھ گئی صحابۂ کرام نے اُٹھانا چاہا تو نہ اُٹھی لوگوں نے کہا کہ قصویٰ بگڑ گئی آپ نے فرمایا قصویٰ کا قصور نہیں نہ اُس کی ایسی عادت ہے بلکہ اُس کو تو اُس ذات نے روک دیا ہے جس نے اصحابِ فیل کو روک دیا تھا (غالباً اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جو واقعہ خواب میں دکھلایا گیا ہے اس کا یہ وقت نہیں ہے) آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے آج کے دن قریش مجھ سے جو بات بھی ایسی کہیں گے جس میں شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم ہو تو میں اس کو ضرور مان لوں گا۔ پھر آپ نے اونٹنی پر ایک آواز لگائی تو اُٹھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کی جانب سے ہٹ کر حدیبیہ کی دوسری جانب قیام فرمایا جہاں پانی بہت ہی کم تھا۔ پانی کے مواقع پر خالد بن ولید اور بلدح والے قابض ہو چکے تھے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ ایک کنواں جس میں پانی کچھ کچھ رستا تھا اُس میں آپ نے کُلّی کر دی اور اپنا ایک تیر دیا کہ اس کے اندر گاڑ دو، یہ عمل ہوتے ہی اُس کا پانی جوش مار کر کنویں کی مَن کے قریب پہنچ گیا کنویں کے اوپر والوں نے اپنے برتنوں سے پانی نکالا اور سیراب ہو گئے۔

جزوِ ہفتم: اہلِ مکہ کے ساتھ بواسطہ وفود بات چیت

اس طرح سب صحابہ رضی اللہ عنہم مطمئن ہوکر یہاں مقیم ہوئے اور اہلِ مکہ سے بواسطہ وفود بات چیت شروع ہوئی۔ پہلے بدیل بن ورقاء (جو بعد میں مسلمان ہوگئے) اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہانہ عرض کیا کہ قریشِ مکہ پوری قوت کے ساتھ مقابلے کے لئے نکل آئے ہیں اور پانی کی جگہوں پر انہوں نے قبضہ کرلیا ہے وہ ہرگز آپ کو نہ چھوڑیں گے کہ آپ مکہ میں داخل ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں آئے البتہ اگر کوئی ہمیں عمرہ کرنے سے روکے گا تو ہم قتال کریں گے پھر آپ نے اُسی بات کا اعادہ فرمایا جو پہلے جاسوس بشرؓ کے سامنے کہی تھی کہ قریش کو متعدد جنگوں نے کمزور کردیا ہے اگر وہ چاہیں تو کسی معین مدت تک کے لئے ہم سے صلح کرلیں تاکہ وہ بے فکر ہوکر اپنی تیاری میں لگ جائیں اور ہمیں اور باقی عرب کو چھوڑ دیں، اگر وہ مجھ پر غالب آگئے تو ان کی مراد گھر بیٹھے پوری ہوجائے گی اور اگر ہم غالب آگئے اور وہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو ان کو اختیار ہوگا کہ وہ بھی اسلام میں داخل ہوجائیں یا ہمارے خلاف جنگ کریں اور اس عرصہ میں وہ اپنی قوت محفوظ رکھ کر بڑھا چکے ہوں گے اور اگر قریش اس بات سے انکار کریں تو بخدا ہم اپنے معاملہ پر اُن سے جہاد کرتے رہیں گے جب تک کہ میری تنہا گردن باقی ہے۔ بُدَیل یہ کہہ کر واپس ہوگئے کہ میں جاکر قریشی سرداروں سے آپ کی بات کہہ دیتا ہوں۔ وہاں پہنچے تو کچھ لوگوں نے تو اُن کی بات ہی سننا نہ چاہا بلکہ جنگ کے جوش میں رہے پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ بات تو سن لیں، یہ کہنے والے عروہ بن مسعود اپنی قوم کے سردار تھے، جب بات سنی تو عروہ بن مسعود نے قریشی سرداروں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو بات پیش کی ہے وہ درست ہے اس کو قبول کرلو اور مجھے اجازت دو کہ میں جاکر اُن سے بات کروں، چنانچہ دوسری مرتبہ عروہ بن مسعود گفتگو کے لئے حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ اگر اپنی قوم قریش کا صفایا ہی کردیں تو یہ کونسی اچھی بات ہوگی، کبھی دُنیا میں آپ نے سنا ہے کہ کوئی شخص اپنی ہی قوم کو ہلاک کردے۔ پھر صحابہ کرام سے ان کی نرم وگرم باتیں ہوتی رہیں، اسی حال میں عروہ صحابۂ کرام کے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوکا بھی تو صحابہ نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے چہروں سے مل لیا۔ اور جب آپ نے وضو کیا تو وضو کے گرنے والے پانی پر صحابۂ کرام ٹوٹ پڑتے اور اپنے چہروں کو ملتے تھے اور جب آپ گفتگو فرماتے تو سب اپنی آوازیں پست کرلیتے۔ عروہ نے واپس جاکر قریشی سرداروں سے یہ حال بیان کہ میں بڑے بڑے شاہی درباروں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے پاس جاچکا ہوں، خدا کی قسم میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا جس کی قوم اُس پر اس طرح فدا ہو جیسے اصحابِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن پر فدا ہیں اور وہ ایک صحیح بات کہہ رہے ہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ان کی بات مان لو، مگر لوگوں نے کہا

ہم یہ بات نہیں مان سکتے بجز اس کے کہ اس سال تو آپ لوٹ جائیں پھر اگلے سال آجائیں۔ جب عروہ کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی جماعت کو ساتھ لے کر واپس ہو گئے اس کے بعد ایک صاحب جلیس بن علقمہ جو اعراب کے سردار تھے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحابہ کرام کو احرام کی حالت میں قربانی کے جانور ساتھ لئے دیکھا تو واپس ہو کر اُس نے بھی اپنی قوم کو سمجھایا کہ یہ لوگ بیت اللہ کے عمرہ کے لئے آئے ہیں ان کو روکنا کسی طرح درست نہیں، لوگوں نے اس کا کہنا نہ سنا تو یہ بھی اپنی جماعت کو لے کر واپس ہو گیا۔ پھر ایک چوتھا آدمی آپ سے بات کرنے کے لئے آیا اور آپ سے گفتگو کی تو آپ نے اپنی وہی بات پیش کر دی جو اس سے پہلے بُدَیل اور عروہ ابن مسعود کے سامنے پیش کی تھی اس نے جا کر آپ کا جواب قریش کو سنا دیا۔

جزوِ ہشتم: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اہلِ مکہ کے لئے پیغام دے کر بھیجنا

امام بیہقی نے حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں پہنچ کر قیام فرمایا تو قریش گھبرا گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ ان کے پاس اپنا کوئی آدمی بھیج کر بتلا دیں کہ ہم جنگ کرنے نہیں عمرہ کرنے آئے ہیں ہمارا راستہ نہ روکو۔ اس کام کے لئے حضرت عمرؓ کو بلایا انہوں نے عرض کیا کہ یہ قریش میرے سخت دشمن ہیں۔ کیونکہ اُن کو میری عداوت وشدّت کا حال معلوم ہے اور میرے قبیلہ کا کوئی آدمی ایسا مکہ میں نہیں جو میری حمایت کرے اس لئے میں آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں اپنے قبیلہ وغیرہ کی وجہ سے خاص قوت وعزت رکھتے ہیں یعنی عثمان بن عفانؓ، آپ نے حضرت عثمانؓ کو اس کام کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا اور یہ بھی فرمایا کہ جو ضعفاء مسلمین مرد اور عورتیں مکہ مکرمہ سے ہجرت نہیں کر سکے اور مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں ان کے پاس جا کر تسلی کر دیں کہ پریشان نہ ہوں ان شاء اللہ مکہ مکرمہ فتح ہو کر تمہاری مشکلات کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ پہلے اُن لوگوں کے پاس پہنچے جو مقام بَلدَح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روکنے اور مقابلے کے لئے جمع ہوئے تھے اُن سے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی بات سنا دی جو آپ نے بُدَیل اور عروہ ابنِ مسعود وغیرہ کے سامنے کہی تھی، ان لوگوں نے کہا ہم نے پیغام سن لیا آپ جا کر اپنے بزرگ سے کہہ دو کہ یہ بات ہرگز نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کا جواب سن کر آپ مکہ مکرمہ کے اندر جانے لگے تو ابان بن سعد کی (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے حضرت عثمانؓ کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنی پناہ میں لے کر اُن سے کہا کہ مکہ میں اپنا پیغام لے کر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اس میں آپ کوئی فکر نہ کریں پھر اپنے گھوڑے پر حضرت عثمانؓ کو سوار کر کے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کیونکہ اُن کا قبیلہ

بنو سعید مکہ مکرمہ میں بہت قوی اور عزّت دار تھا، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں قریش کے ایک ایک سردار کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے نہیں آئے عمرہ کر کے واپس جائیں گے ہاں کوئی ہمارا راستہ روکے گا تو لڑیں گے اور قریش خود جنگوں سے نیم جان ہو چکے ہیں ان کے لئے مناسب یہ ہے کہ ہمیں اور دوسرے اہلِ عرب کو چھوڑ دیں قریش ہمارے مقابلہ پر نہ آئیں پھر دیکھیں اگر عرب ہم پر غالب آ گئے تو اُن کی مراد پوری ہو جائے گی اور ہم غالب آئے تو اُنہیں پھر بھی اختیار باقی ہوگا اس وقت قتال کر سکتے ہیں اور اس عرصہ میں ان کو اپنی طاقت بڑھانے اور محفوظ رکھنے کا موقع بھی مل جائے گا مگر ان سب نے آپ کی بات کو رد کر دیا۔ پھر عثمان غنیؓ ضعفاء مسلمین سے ملے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا وہ بہت خوش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام بھیجا۔ جب حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامات پہنچانے سے فارغ ہوئے تو اہلِ مکہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طواف کر سکتے ہیں۔ عثمان غنیؓ نے کہا کہ میں اس وقت تک طواف نہیں کروں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں، عثمان غنیؓ مکہ میں تین رات رہے اور رؤساء قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کی طرف دعوت دیتے رہے۔ [1]

جزوِ نہم: اہلِ مکہ اور مسلمانوں میں آویزش اور اہلِ مکہ کے ساٹھ آدمیوں کی گرفتاری

اسی عرصہ میں قریش نے اپنے پچاس آدمی اس کام پر لگائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر موقع کا انتظار کریں اور موقع ملنے پر (معاذ اللہ) آپ کا قصہ ختم کر دیں۔ یہ لوگ اسی تاک میں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت ونگرانی پر مأمور حضرت محمد بن مسلمہؓ نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قید کر کے حاضر کر دیا، دوسری طرف حضرت عثمانؓ جو مکہ میں تھے اور ان کے ساتھ تقریباً دس مسلمان اور مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ قریش نے جب اپنے پچاس آدمیوں کی گرفتاری کا حال سنا تو حضرت عثمان سمیت ان سب مسلمانوں کو روک لیا اور قریش کی ایک جماعت مسلمانوں کے لشکر کی طرف نکلی اور مسلمانوں کی جماعت پر تیر اور پتھر پھینکے اس میں مسلمانوں میں سے ایک صحابی ابن زنیمؓ شہید ہو گئے اور مسلمانوں نے ان قریشیوں کے دس سواروں کو گرفتار کر لیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے یہ خبر پہنچائی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے۔

---

[1] دلائل النبوة للبيهقيؒ رقم الحديث:۱۴۶۷

جزو دہم: بیعتِ رضوان کا واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سن کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا کہ سب جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کے لئے بیعت کریں، سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جس کا ذکر آگے اس سورت میں آنے والا ہے احادیثِ صحیحہ میں اُن لوگوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جو اس بیعت میں شریک تھے اور حضرت عثمان غنیؓ چونکہ آپ کے حکم سے مکہ گئے ہوئے تھے اس لئے اُن کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ عثمان کی بیعت ہے [1] یہ خصوصی فضیلت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تھی کہ آپ نے اپنے ہی ہاتھ کو عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر اُن کی طرف سے بیعت کر لی۔

جزو یازدہم: حدیبیہ کا واقعہ

دُوسری طرف اہل مکہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا رُعب مسلط کر دیا اور خود مصالحت پر آمادہ ہو کر انہوں نے اپنے تین آدمی سہیل بن عمرو اور حُوَیْطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کو عذر معذرت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اُن میں سے پہلے دو حضرات بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ سہیل بن عمرو نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ تک جو خبر پہنچی ہے کہ عثمان غنیؓ اور اُن کے ساتھی قتل کر دیئے یہ بالکل غلط ہے ہم اُن کو آپ کے پاس بھیجتے ہیں، ہمارے قیدیوں کو آزاد کر دیجئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا، مسند احمد اور مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ اس سورت میں جو آگے آیت آنے والی ہے ''وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ'' [2] [3] (الفتح: ۲۴) یہ اسی واقعہ سے متعلق ہے اب سہیل اور ان کے ساتھیوں نے جا کر بیعتِ رضوان میں صحابۂ کرام کی مسارعت اور جاں نثاری کے عجیب و غریب منظر کا حال قریش کے سامنے بیان کیا تو قریش کے اصحابِ رائے لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس بات پر صلح کر لیں کہ وہ اس سال تو واپس چلے جائیں تا کہ پورے عرب میں یہ شہرت نہ ہو جائے کہ ہم نے ان کو روکنا چاہا وہ زبردستی مکہ میں داخل ہو گئے، اور اگلے سال عمرہ کے لئے آ جائیں اور تین روز مکہ میں قیام کریں، اُس وقت اپنے جانور قربانی کے ذبح کر ڈالیں اور احرام کھول دیں چنانچہ یہی سہیل بن عمرو یہ پیغام لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے اُن کو دیکھتے ہی فرمایا کہ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم نے

---

[1] دلائل النبوة للبيهقيؒ رقم الحديث: ۱۴۶۸

[2] صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب قول الله تعالىٰ "وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ" ج: ۲ ص: ۱۱۶، ومسند احمد رقم الحديث: ۱۲۲۲۷

[3] ترجمہ: اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے۔

صلح کا ارادہ کرلیا ہے کہ سہیل کو پھر بھیجا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چہارزانو بیٹھ گئے اور صحابہ میں سے عباد بن بشرؓ اور سلمہؓ ہتھیاروں سے مسلح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حفاظت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سہیل حاضر ہوئے تو ادب کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گئے اور قریش کا پیغام آپ کو پہنچایا۔ صحابۂ کرام عموماً اس پر راضی نہ تھے کہ اس وقت اپنے احرام بغیر عمرہ کئے کھول دیں، اُنہوں نے سہیل سے سخت گفتگو کی، آوازیں کبھی بلند ہوگئیں کبھی پست ہوئیں، عباد بن بشرؓ نے سہیل کو ڈانٹا کہ حضور کے سامنے آواز بلند نہ کر، طویل گفتگو کے بعد آپ اُس شرط کو قبول کر کے صلح کر لینے پر راضی ہوگئے، سہیل نے کہا کہ لائیے ہم اپنے اور آپ کے درمیان صلح نامہ لکھ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا لکھو، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سہیل نے یہیں سے بحث شروع کر دی اور کہا کہ لفظ رحمٰن اور رحیم ہمارے محاورات میں نہیں ہے آپ یہاں وہی لفظ لکھیں جو پہلے لکھا کرتے تھے یعنی بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ۔ آپ نے اس کو بھی مان لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ایسا ہی لکھ دو۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ یہ لکھو کہ یہ وہ عہد نامہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ سہیل نے اس پر بھی ضد کی کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو آپ کو ہرگز بیت اللہ سے نہیں روکتے (صلح نامہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہونا چاہئے جو کسی فریق کے عقیدہ کے خلاف ہو) آپ صرف محمد بن عبداللہ لکھوائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منظور فرما کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ جو لکھا ہے اس کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے باوجود سراپا اطاعت ہونے کے عرض کیا میں تو یہ نہیں کرسکتا کہ آپ کے نام کو مٹادوں۔ حاضرین میں سے حضرت اُسَید بن حُضَیرؓ اور سعد بن عبادہؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اس کو نہ مٹائیں اور بجز محمد رسول اللہ کے اور کچھ نہ لکھیں اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ہمارے اور ان کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی اور کچھ آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کا کاغذ خود اپنے دستِ مبارک میں لے لیا اور باوجود اس کے کہ آپ اُمّی تھے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا مگر اس وقت خود اپنے قلم سے آپ نے یہ لکھ دیا هٰذَا مَا قَاضٰی مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو، اَصْلَحَا عَلٰی وَضْعِ الْحَرْبِ عَنِ النَّاسِ عَشْرَ سِنِيْنَ يَاْمَنُ فِيْهِ النَّاسُ وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ، یعنی یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے دس سال کے لئے باہم جنگ نہ کرنے کا کیا ہے جس میں سب لوگ مامون رہیں ایک دوسرے پر چڑھائی اور جنگ سے پرہیز کریں۔ [1]

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری ایک شرط یہ ہے کہ اس وقت ہمیں طواف کرنے سے نہ روکا جائے، سہیل نے کہا بخدا یہ نہیں ہوسکتا، آپ نے اس کو بھی قبول فرمالیا اس کے بعد سہیل نے اپنی ایک شرط یہ لکھی کہ جو شخص مکہ والوں میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آپ کے پاس جائے گا اس کو واپس کر دیں گے اگر چہ وہ آپ ہی کے دین

[1] التفسیر المظہری ج: ۹ ص: ۱۵، وطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ، غزوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیبیۃ ج: ۲ ص: ۹۷

پر ہو اور مسلمانوں میں سے جو کوئی قریش کے پاس مکہ چلا آئے اس کو ہم واپس نہ کریں گے۔ اس پر عام مسلمانوں کی آواز اُٹھی سبحان اللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کو مشرکین کی طرف لوٹا دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی قبول فرمالیا اور یہ فرمایا کہ ہم میں سے کوئی آدمی اگر ان کے پاس گیا تو اُس کو اللہ ہی نے ہم سے دُور کر دیا اس کی ہم کیوں فکر کریں اور ان میں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آیا اور ہم نے لوٹا بھی دیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ سہولت کا نکال دیں گے حضرت براءؓ نے اس صلح نامہ کا خلاصہ تین شرطیں بیان کیا ہے، ایک یہ کہ اُن کا کوئی آدمی ہمارے پاس آجائے گا تو ہم اس کو واپس کر دیں گے، دوسرے یہ کہ ہمارا کوئی آدمی اُن کے پاس چلا جائے گا تو وہ واپس نہ کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اب آئندہ سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور تین روز مکہ میں قیام کریں گے اور زیادہ ہتھیار لے کر نہیں آئیں گے، اور آخر میں لکھا گیا کہ یہ عہد نامہ اہلِ مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک محفوظ دستاویز ہے۔ جس کی کوئی خلاف ورزی نہ کرے گا اور باقی سب عرب آزاد ہیں جس کا جی چاہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں داخل ہوجائے اور جس کا جی چاہے قریش کے عہد میں داخل ہوجائے۔ یہ سن کر قبیلہ خزاعہ اُچھل پڑا اور کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عقد میں داخل ہیں اور بنو بکر نے آگے بڑھ کر کہا کہ ہم قریش کے عقد و عہد میں داخل ہیں۔

شرائطِ صلح سے عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ناراضی اور رنج

جب یہ شرائطِ صلح طے ہوگئیں تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ اللہ کے نبی برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا ہم حق پر اور وہ لوگ باطل پر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ کیا ہمارے مقتولین جنت اور اُن کے مقتولین جہنم میں نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: تو پھر ہم کیوں اس ذلّت کو قبول کریں کہ بغیر عمرہ کئے واپس چلے جائیں جب تک جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہ کر دیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا، اور اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہ فرمائے گا وہ میرا مددگار ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ بے شک یہ کہا تھا، مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کام اسی سال ہوگا؟ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: بس یہ واقعہ جیسا کہ میں نے کہا تھا ہو کر رہے گا کہ آپ بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خاموش ہوگئے مگر غم و غصہ نہیں گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور اسی گفتگو کا اعادہ کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کے بندے! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور وہ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کریں گے اور اللہ ان کا مددگار ہے، اس لئے تم مرتے دم تک آپ کی رکاب تھامے رہو، خدا کی قسم وہ حق پر ہیں۔ غرض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ان شرائطِ صلح سے سخت رنج وغم پہنچا، خود انہوں نے فرمایا کہ واللہ! جب سے میں نے اسلام قبول کیا مجھے کبھی شک پیش نہیں آیا بجز اس واقعہ کے۔ (تفسیر الطبری) [1] حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سمجھایا اور فرمایا کہ شیطان کے شر سے پناہ مانگو! فاروقِ اعظمؓ نے کہا: میں شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں برابر صدقہ خیرات کرتا اور روزے رکھتا اور غلام آزاد کرتا رہا کہ میری یہ خطا معاف ہو جائے۔

ایک اور حادثہ اور معاہدے کی پابندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے نظیر عمل

ابھی ابھی یہ شرائطِ صلح طے ہوئی تھیں اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ناگواری اس پر ہو رہی تھی کہ اچانک اسی سہیل بن عمرو کا، جو صلح نامہ کا فریق منجانب قریش تھا، بیٹا ابوجندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور باپ نے اس کو قید کر رکھا تھا اور سخت ایذائیں ان کو دیتا تھا، وہ کسی طرح بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا اور آپ سے پناہ مانگی، کچھ مسلمان بڑھے اور اس کو اپنی پناہ میں لے لیا مگر سہیل چلّا اُٹھا کہ یہ پہلی عہد نامے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اگر اس کو واپس نہ کیا گیا تو میں صلح کی کسی شرط کو نہ مانوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عہد کر کے پابند ہو چکے تھے، اس لئے ابوجندلؓ کو آواز دے کر فرمایا کہ اے ابوجندل! تم چند روز اور صبر کرو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور ضعفاء مسلمین کے لئے جو مکہ میں محبوس ہیں، جلد رہائی اور فراخی کا انتظام کرنے والا ہے۔ مسلمانوں کے دِلوں پر ابوجندل رضی اللہ عنہ کے اس واقعے نے اور زیادہ نمک پاشی کی وہ تو یقین کر کے آئے تھے کہ اسی وقت مکہ فتح ہوگا اور یہاں یہ حالات دیکھے تو ان کے رنج وغم کی انتہا نہ رہی قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں پڑ جاتے مگر معاہدہ صلح مکمل ہو چکا تھا، اس صلح نامے پر مسلمانوں کی طرف سے ابوبکر وعمر، عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن سہیل بن عمر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ اور علی بن ابی طالب وغیرہ رضی اللہ عنہم کے دستخط ہوئے اسی طرح مشرکین کی طرف سے سہیل کے ساتھ چند دوسرے لوگوں کے بھی دستخط ہو گئے۔

اِحرام کھولنا اور قربانی کے جانور ذبح کرنا

جب صلح نامے کی کتابت سے فراغت ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قرارداد صلح کے مطابق اب ہمیں واپس جانا ہے) سب لوگ اپنی قربانی کے جانور جو ساتھ ہیں اُن کی قربانی کر دیں اور سر کے بال منڈوا کر اِحرام کھول

[1] تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج:۲۲ ص:۲۴۶، ومصنَّف عبدالرزاق ج:۵ ص:۳۳۹، والمعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث:۱۶۴۴۵

دیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مسلسل رنج وغم کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی تھی کہ آپ کے فرمانے کے باوجود کوئی اس کام کے لئے نہیں اُٹھا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہوئے اور اُم المؤمنین اُمّ سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے اس رَنج کا ذِکر کیا، اُمّ المؤمنینؓ نے بہت مناسب اور اچھا مشورہ دیا کہ آپ صحابۂ کرام کو اس پر کچھ نہ کہیں، ان کو اس وقت سخت صدمہ اور رنج شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ کے واپسی کی وجہ سے پہنچا ہوا ہے، آپ سب کے سامنے حجام کو بلا کر خود اپنا حلق کر کے اِحرام کھول دیں اور اپنی قربانی کر دیں۔ آپ نے مشورے کے مطابق ایسا ہی کیا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھا تو سب کھڑے ہوگئے، ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے اور قربانی کے جانوروں کی قربانی کرنے لگے، آپ نے سب کے لئے دُعا فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقامِ حدیبیہ میں اُنیس اور بعض روایات کے اعتبار سے بیس دن قیام فرمایا تھا، اب یہاں سے واپسی شروع ہوئی اور آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کے ساتھ پہلے مرّ ظہران پھر عسفان پہنچے، یہاں پہنچ کر سب مسلمانوں کا زادِ راہ تقریباً ختم ہو چکا تھا، کھانے کے لئے بہت کم سامان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دسترخوان بچھایا اور سب کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ ہے لا کر یہاں جمع کر دے، اس طرح جو کچھ باقی ماندہ کھانے کا سامان تھا، سب اس دسترخوان پر جمع ہوگیا۔ چودہ سو حضرات کا مجمع تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی اور سب کو کھانا شروع کرنے کا حکم دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ پورے چودہ سو حضرات نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا پھر اپنے برتنوں میں بھر لیا اس کے بعد بھی اتنا ہی کھانا باقی تھا، اس مقام پر یہ دوسرا معجزہ ظاہر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایمان اور اطاعتِ رسول کا ایک اور اِمتحان اور ان کی بےنظیر قوتِ ایمانی

اُوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر ان شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ اور بغیر جنگ میں اپنے حوصلے نکالنے کے واپسی سخت بھاری اور ناگوار تھی، یہ اُنہی کا ایمان تھا کہ ان سب حالات میں ایمان اور اطاعتِ رسول پر جمے رہے۔ حدیبیہ سے واپسی پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام کُراعِ غمیم پر پہنچے تو آپ پر یہ سورۂ فتح نازل ہوئی آپ نے صحابۂ کرامؓ کو پڑھ کر سنایا، صحابۂ کرامؓ کے قلوب اس طرح کی شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ کے واپسی سے زخم خوردہ پہلے ہی سے تھے، اب اس سورت نے یہ بتلایا کہ فتحِ مبین حاصل ہوئی ہے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پھر سوال کر بیٹھے کہ یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ آپ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! یہ فتحِ مبین ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

نے اس پر بھی سرِ تسلیم خم کیا اور ان سب چیزوں کو فتحِ مبین یقین کیا۔

صلحِ حدیبیہ کے ثمرات و برکات کا ظہور

سب سے پہلی بات اس واقعہ میں یہ ہوئی کہ قریشِ مکہ اور ان کے بہت سے متبعین پر ان کی ضد اور بے جا ہٹ دھرمی واضح ہو کر خود اُن میں پھوٹ پڑی، بُدَیل ابن ورقاء اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے الگ ہو گئے، پھر عروہ ابنِ مسعود اپنی جماعت کو لے کر الگ ہو گئے۔ دوسرے صحابہ کرام کی بے نظیر جاں نثاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال اطاعت و محبت و عظمت دیکھ کر قریشِ مکہ کا مرعوب ہو جانا اور صلح کی طرف مائل ہونا حالانکہ اُن کے لئے مسلمانوں کا صفایا کر دینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا کیونکہ وہ اپنے گھروں میں مطمئن تھے، مسلمان مسافرت کی حالت میں تھے قریش نے پانی کی جگہوں پر قبضہ کیا ہوا تھا یہ بے آب و دانہ جنگل میں تھے، اُن کی پوری قوت موجود تھی مسلمانوں کے پاس کچھ زیادہ اسلحہ بھی نہیں تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں رعب ڈالا اور ان کی جماعت کے بہت سے افراد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور اختلاط کے مواقع مل کر اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام و ایمان راسخ ہو گیا اور بعد میں مسلمان ہو گئے۔ تیسرے صلح و امان کی وجہ سے راستے مامون ہو گئے دعوتِ اسلام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واسطے راستے کھل گئے، عرب کے وفود کو آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے گوشہ گوشہ میں دعوتِ اسلام کو پھیلایا، دُنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے خطوط بھیجے گئے ان میں سے چند بڑے بڑے بادشاہ متاثر ہوئے جس کا حاصل یہ نکلا کہ واقعہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عام اور سب کو عمرہ کے لئے نکلنے کی تاکید کے باوجود ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسلمان ساتھ نہیں تھے اور صلح حدیبیہ کے بعد جوق جوق لوگ اسلام میں داخل ہوئے، اسی عرصہ میں ۷ھ ہجری میں خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کو سامان بڑی مقدار میں مل گیا اور ان کی مادّی قوت مستحکم ہو گئی۔ اور اس صلح پر دو سال گزرنے نہ پائے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی کثیر ہو گئی جو اس سے پہلے تمام پچھلی مدّت میں نہیں تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قریشِ مکہ نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے معاہدہ توڑ ڈالا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرنے کی خفیہ تیاری شروع کی تو اس صلح نامہ پر صرف بیس اکیس مہینے گزرے تھے کہ فتح مکہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے والے جاں نثار سپاہی دس ہزار تھے قریشِ مکہ کو خبر لگی تو گھبرا کر ابوسفیان کو عذر معذرت کر کے تجدید معاہدہ پر آمادہ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا آپ نے معاہدہ کی تجدید نہ کی اور بالآخر دس ہزار کے اس حزب اللہ کے ساتھ آپ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے کفار قریش ایسے مغلوب و مرعوب ہو چکے تھے کہ مکہ مکرمہ میں کچھ زیادہ لڑائی کی بھی نوبت نہیں آئی، کچھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ سیاست نے جنگ نہ ہونے کا یہ انتظام کر دیا کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ مأمون ہے جو مسجد میں داخل ہو جائے وہ مأمون جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے وہ مأمون ہے اس طرح سب لوگوں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی اور قتل وقتال کی زیادت نوبت نہیں آئی اسی لئے ائمہ، فقہاء میں یہ اختلاف ہو گیا کہ مکہ مکرمہ صلح سے فتح ہوا یا جنگ سے۔ بہر حال بڑی سہولت کے ساتھ مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب واقعہ بن کر سب کے سامنے آ گیا، صحابۂ کرام نے بے خطر ہو کر بیت اللہ کا طواف پھر حلق وقصر کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ کی چابی آپ کے ہاتھ آئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب کو خصوصاً اور سب صحابہ کو عموماً خطاب کر کے فرمایا کہ یہ ہے وہ واقعہ جو میں نے آپ سے کہا تھا، پھر حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تھا وہ واقعہ جو میں نے تم سے کہا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ بے شک کوئی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ بہتر اور اعظم نہیں ہے۔ صدیق اکبرؓ تو پہلے سے فرماتے تھے کہ اسلام میں کوئی فتح صلح حدیبیہ کے برابر نہیں ہے لیکن لوگوں کی رائے اور بصیرت وہاں تک نہ پہنچی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک طے شدہ حقیقت تھی یہ لوگ جلد بازی کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جلد بازی سے متأثر ہو کر جلدی نہیں کرتا بلکہ حکمت ومصلحت کے ساتھ ہر کام اپنے صحیح وقت پر انجام پاتا ہے اس لئے سورۂ فتح میں حق تعالیٰ نے واقعہ حدیبیہ کو فتح مبین فرمایا۔ یہ واقعہ حدیبیہ کے اہم اجزاء تھے جن سے اگلی آیات کے سمجھنے میں سہولت ملے گی اب آیات کی تفسیر دیکھئے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ، اس میں لِيَغْفِرَ کا لام اگر تعلیل یعنی بیان علت کے لئے لیا جائے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ فتح مبین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے دی گئی ہے تاکہ آپ کو یہ تین کمالات حاصل ہو جائیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، ان میں پہلی چیز تمام اگلی پچھلی لغزشوں اور خطاؤں کی معافی ہے۔ سورۂ محمد میں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں ان کی طرف قرآن میں جہاں کہیں ذنب یا عصیان وغیرہ کے الفاظ منسوب کئے گئے وہ ان کے مقامِ عالی کی مناسبت سے ایسے کاموں کے لئے استعمال کئے گئے جو خلافِ اولیٰ تھے مگر نبوّت کے مقامِ بلند کے اعتبار سے غیر افضل پر عمل کرنا بھی ایسی لغزش ہے جس کو قرآن نے بطور تہدید کے ذنب وگناہ سے تعبیر کیا ہے اور مَا تَقَدَّمَ سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو نبوّت سے پہلے ہوئیں اور وَمَا تَاَخَّرَ سے مراد وہ لغزشیں جو رسالت ونبوّت کے بعد صادر ہوئیں (مظہری) [1] اور فتح مبین کا اس مغفرت کے لئے سبب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس فتح مبین سے بہت لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوں گے اور اسلام کی دعوت کا عام ہو جانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مقصدِ عظیم اور آپ

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳

کے اجر و ثواب کو بہت بڑھانے والا ہے اور اجر و ثواب کی زیادتی سبب ہوتی ہے کفارہ سیئات کی۔ (بیان القرآن) [۱]

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ یہ دوسری نعمت ہے جو اس فتح مبین پر مرتب ہوئی، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوّل ہی سے ہیں اور نہ صرف خود صراطِ مستقیم پر ہیں بلکہ دُنیا کو اسی صراطِ مستقیم کی دعوت دینا آپ کا رات دن کا مشغلہ ہے تو ہجرت کے چھٹے سال فتح مبین کے ذریعہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے کیا معنی ہیں اس کا جواب سورۂ فاتحہ کی تفسیر لفظ ہدایت کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ ہدایت ایک ایسا مفہوم عام ہے کہ جس کے درجات غیر متناہی ہیں وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی منزل مقصود کا راستہ دکھلانا یا اُس پر پہنچانا ہے اور اصل منزلِ مقصود ہر انسان کی حق تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنا ہے اور اس رضا و قرب کے متفاوت درجات بے شمار ہیں، ایک درجہ حاصل ہونے کے بعد دوسرے اور تیسرے درجہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا ولی بلکہ نبی و رسول بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی لئے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دُعا نماز کی ہر رکعت میں کرنے کی تعلیم جیسے اُمت کو ہے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے۔ جس کا حاصل صراط مستقیم کی ہدایت یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کے درجات میں ترقی حاصل کرنا ہے اس فتح مبین پر حق تعالیٰ نے اسی قرب و رضا کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو عطا فرمایا جس کو يَهْدِيَكَ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ یہ تیسری نعمت ہے جو اس فتح مبین پر مرتب ہوئی کہ حق تعالیٰ کی امداد و اعانت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ حاصل رہی ہے اس وقت اس مدد کا ایک بڑا درجہ آپ کو دیا گیا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوٓا اِيمَانًا

وہی ہے جس نے اُتارا اطمینان دل میں ایمان والوں کے تاکہ اور بڑھ جائے ان کو ایمان

مَّعَ اِيمَانِهِمْ ط وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ اللّٰهُ

اپنے ایمان کے ساتھ اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے اور زمین کے اور اللہ ہے

عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ

خبردار حکمت والا تاکہ پہنچادے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو باغوں میں

[۱] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۲۸

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَیُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ ؕ

نیچے بہتی ہیں اُن کے نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اور اُتار دے اُن پر سے ان کی بُرائیاں

وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا ۙ۝۵ وَّیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ

اور یہ ہے اللہ کے یہاں بڑی مراد ملنی اور تاکہ عذاب کرے دغاباز مَردوں کو اور دغاباز عورتوں کو

وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَیْهِمْ

اور شرک والے مَردوں کو اور شرک والی عورتوں کو جو اٹکلیں کرتے ہیں اللہ پر بُری اٹکلیں اُنہی پر پڑے

دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ

پھیر مصیبت کا اور غصہ ہوا اللہ اُن پر اور لعنت کی اُن کو اور تیار کی ان کے واسطے دوزخ،

وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝۶ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اور بُری جگہ پہنچے اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے اور زمین کے اور ہے اللہ

عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝۷

زبردست حکمت والا

آسان ترجمۂ قرآن

وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دِلوں میں سکینت اُتار دی، تاکہ اُن کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو ــــ اور آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر اللہ ہی کے ہیں، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک ــــ (۴) تاکہ وہ مؤمن مردوں اور عورتوں کو ایسے باغات میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن کی بُرائیوں کو اُن سے دُور کردے ــــ اور اللہ کے نزدیک یہ بڑی زبردست کامیابی ہے ــــ (۵) اور تاکہ اُن منافق

مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے جو اللہ کے ساتھ بدگمانیاں رکھتے ہیں۔ بُرائی کا پھیرا اُنہی پر پڑا ہوا ہے، اور اللہ اُن سے ناراض ہے، اُس نے اُن کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے، اور اُن کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے، اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ⑥ اور آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر اللہ ہی کے ہیں، اور اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ⑦

خلاصۂ تفسیر

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا (جس کے دو اثر ہیں ایک بیعت جہاد کے وقت اس کی طرف مسابقت اور عزم وہمت جیسا کہ بیعت رضوان کے واقعہ میں اوپر ذکر آچکا ہے اور دوسرا اثر کفار کی بے جا ضد کے وقت اپنے جوش اور غیظ وغضب کو قابو میں رکھنا جس کا ذکر اس واقعہ کے جزو دوم میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اور آگے بھی فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ [1] (الفتح:۲۶) میں آئے گا) تاکہ اُن کے پہلے ایمان کے ساتھ اُن کا ایمان اور زیادہ ہو (کیونکہ دراصل اطاعتِ رسول ذریعہ ہے نور ایمان میں زیادتی کا اور اس واقعہ میں ہر پہلو سے مکمل اطاعتِ رسول کا امتحان ہو گیا کہ جب رسول نے دعوتِ جہاد کے لئے بلایا اور بیعت لی تو بڑی خوش دلی اور مسابقت کے ساتھ سب نے بیعت کی اور جہاد کے لئے تیار ہو گئے اور جب حکمت ومصلحت کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال سے روکا اور سب صحابہ جوشِ جہاد میں قتال کے لئے بے قرار تھے مگر اطاعتِ رسول میں سرِ تسلیم خم کر دیا اور قتال سے باز رہے۔) اور آسمان وزمین کے سب لشکر (جیسے ملائکہ اور سب مخلوقات) اللہ ہی کے (لشکر) ہیں (اس لئے کفار کی شکست اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ تعالیٰ تمہارے قتال وجہاد کا محتاج نہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے فرشتوں کے لشکر بھیج دیں جیسا کہ بدر۔ احزاب۔ حنین کے غزوات میں اس کا مشاہدہ ہو چکا، اور یہ لشکر بھیجنا بھی مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہے ورنہ ایک فرشتہ بھی سب کے لئے کافی ہے اس لئے تم لوگوں کو نہ تو کفار کی کثرت دیکھ کر جہاد وقتال میں کوئی تردّد ہونا چاہئے کہ افسوس صلح ہو گئی اور کفار بچ گئے ان کو سزا نہ ہوئی اور قتال یا ترک قتال کے نتائج اور عواقب کو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کا) بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (جب قتال میں حکمت ہوتی ہے اس کا حکم دیتا ہے اور جب ترک قتال میں مصلحت ہوتی ہے اُس کا حکم فرماتا ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں اپنے جذبات کو امرِ رسول کے تابع رکھیں جو سبب ہے زیادتِ ایمان کا۔ آگے زیادتی ایمان کے ثمرہ کا بیان ہے یعنی) تاکہ اللہ تعالیٰ (اس اطاعت کی بدولت) مسلمان

[1] ترجمہ: سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور مؤمنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا فرمایا۔

مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی بہشتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (اس اطاعت کی بدولت) اُن کے گناہ دُور کر دے (کیونکہ اطاعتِ رسول میں گناہوں سے توبہ اور اعمالِ صالحہ سب داخل ہیں جو تمام سیئات اور گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں) اور یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے (اس آیت میں اوّل قلوب مؤمنین پر سکینت اور تحمل نازل کرنے کا انعام ذکر فرمایا پھر یہ انعام ایمان کی زیادتی کا بذریعہ اطاعتِ رسول سبب بنا اور اطاعتِ رسول دخولِ جنت کا سبب بنی اس لئے یہ سب اُمور مؤمنین کے قلوب میں نزولِ سکینت پر مرتب ہوئے، آگے اسی سکینت پر مرتب کر کے منافقین کی اس سے محرومی) اور (اس محرومی کے سبب سے گرفتارِ عذاب ہونا بیان فرماتے ہیں یعنی یہ سکینت مسلمانوں کے قلوب پر نازل فرمائی اور کفار کے قلوب پر نہیں فرمائی) تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو (بوجہ ان کے کفر کے) عذاب دے جو کہ اللہ کے ساتھ بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں (اس بُرے گمان سے مراد باعتبار سیاقِ کلام کے اُن لوگوں کا گمان ہے جن کو عمرہ کے لئے حدیبیہ کے سفر کی دعوت دی گئی اور انہوں نے انکار کر دیا اور باہم یہ کہا کہ یہ لوگ اہلِ مکہ سے ہمیں لڑانا چاہتے ہیں ان کو جانے دو یہ ان کے ہاتھ سے بچ کر نہیں آئیں گے ایسا کہنے والے لوگ منافقین ہی ہو سکتے ہیں، اور اپنے مفہومِ عام سے سارے عقائدِ کفریہ شرکیہ اسی گمانِ بد میں داخل ہیں ان سب کے لئے وعید ہے کہ دُنیا میں) ان پر بُرا وقت پڑنے والا ہے (چنانچہ چند ہی روز کے بعد مقتول اور محبوس ہوئے اور منافقین کی تمام عمر حسرت و پریشانی میں کٹی کہ اسلام بڑھتا تھا اور وہ گھٹتے جاتے تھے یہ تو دُنیا میں ہوا) اور (آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن پر غضب ناک ہوگا اور اُن کو رحمت سے دُور کر دے گا اور اُن کے لئے اس نے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے اور (آگے اس وعید کی تاکید ہے کہ) آسمان و زمین کے سب لشکر اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست (یعنی پوری قدرت والا ہے اگر چاہتا اپنے کسی بھی لشکر سے ان سب کی ایک دم صفائی کر دیتا کہ یہ اس کے مستحق ہیں لیکن چونکہ وہ) حکمت والا ہے (اس لئے بمصلحت سزا میں مہلت دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

شروع سورت کی تین آیتوں میں اُن خاص انعامات کا ذکر ہے جو اس فتح مبین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے۔ بعض صحابہ جو سفر حدیبیہ میں ساتھ تھے انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ انعامات تو آپ کے لئے ہیں اللہ آپ کو مبارک فرمائے ہمارے لئے کیا ہے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ان میں اصالۃً حاضرین حدیبیہ اور بیعت رضوان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے اور چونکہ وہ انعامات ایمان اور اطاعتِ رسول کے سبب ملے اس حیثیت سے سب

مؤمنین کو بھی شامل ہے کہ جو بھی ایمان اور اطاعت میں کامل ہوگا وہ ان انعامات کا مستحق ہوگا۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۞ ٨ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ

ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سنانے والا تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر

وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۞ ٩ إِنَّ ٱلَّذِينَ

اور اس کی مدد کرو اور اس کی عظمت رکھو اور اس کی پاکی بولتے رہو صبح اور شام تحقیق جو لوگ

يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ ۚ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ

بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے اللہ کا ہاتھ ہے اُوپر ان کے ہاتھ کے پھر جو کوئی قول توڑے

فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ

سو توڑتا ہے اپنے نقصان کو، اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے

فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۞ ١٠ ع

ع ۹

تو وہ اس کو دے گا بدلہ بہت بڑا

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں گواہی دینے والا، خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، ⑧ تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اُس کی مدد کرو، اور اُس کی تعظیم کرو، اور صبح وشام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ ⑨ (اے پیغمبر!) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ اس کے بعد جو کوئی عہد توڑے گا، اُس کے عہد توڑنے کا وبال اُسی پر پڑے گا، اور جو کوئی اُس عہد کو پورا

کرے گا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے، تو اللہ اُس کو زبردست ثواب عطا کرے گا۔ ⑩

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو (اعمالِ اُمت پر قیامت کے دن) گواہی دینے والا (عموماً) اور (دُنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لئے) بشارت دینے والا اور (کافروں کے لئے) ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے (اور اے مسلمانو، ہم نے اُن کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تا کہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس (کے دین) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو (عقیدۃً بھی کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کمالات کے ساتھ موصوف اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک سمجھو اور عملاً بھی کہ اُس کی اطاعت کرو) اور صبح و شام اُس کی تسبیح (وتقدیس) میں لگے رہو (اگر اس تسبیح کی تفسیر نماز سے کی جائے تو صبح شام کی فرض نمازیں مراد ہوں گی ورنہ مطلق ذکر اگرچہ مستحب ہی ہو مراد ہوگا۔ آگے بعض حقوق خاصہ کے متعلق ارشاد ہے کہ) جو لوگ آپ سے (حدیبیہ کے روز اس بات پر) بیعت کر رہے ہیں (یعنی بیعت کر چکے ہیں کہ جہاد سے بھاگیں گے نہیں) تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں (کیونکہ مقصود آپ سے اس پر بیعت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام بجالائیں گے اور جب یہ بات ہے تو گویا) خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد توڑے گا (یعنی بجائے اطاعت کے مخالفت کرے گا) تو اُس کے عہد توڑنے کا وبال اُسی پر پڑے گا اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا اُس کو بڑا اجر دے گا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا ذکر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت پر خصوصاً بیعتِ رضوان کے شرکاء پر مبذول ہوئے، اور چونکہ ان انعامات کا عطا کرنے والا اللہ اور واسطہ عطا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کی مناسبت سے آیاتِ مذکورہ میں ان کے حقوق اور تعظیم و تکریم کا ذکر ہے اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کی تین صفات بیان فرمائیں۔ شاہد، بشیر، نذیر۔ شاہد کے معنی گواہ کے ہیں، مراد اس کی وہی ہے جو سورۂ نساء کی آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ؀ کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم صفحہ: ۴۲۷ میں گزر چکی ہے کہ ہر نبی اپنی اُمت کی بابت اس بات کی گواہی دے گا کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُمت کو پہنچا دیا پھر کسی نے اطاعت

کی کسی نے نافرمانی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے متعلق گواہی دیں گے۔ سورۂ نساء کی آیت کی تفسیر میں قرطبی نے لکھا ہے کہ انبیاء کی یہ گواہی اپنے زمانے کے موجود لوگوں کے متعلق ہوگی کہ ان کی دعوتِ حق کو کس نے قبول کیا اور کس نے نافرمانی کی، اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گواہی اپنے زمانے کے لوگوں کے متعلق ہوگی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گواہی تمام اُمت کے اعمال طاعات وسیئات پر ہوگی کیونکہ بعض روایات کے مطابق اُمت کے اعمال صبح شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فرشتے پیش کرتے ہیں اس لئے آپ تمام اُمت کے اعمال سے باخبر ہوں گے (ذکرہ القرطبی عن سعید بن المسیبؒ)[1] اور بشیر کے معنی بشارت دینے والا، نذیر کے معنی ڈرانے والا۔ مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کے مؤمنین اور اطاعت کرنے والوں کو جنت کی بشارت دینے والے ہیں اور کفار فجار کو عذاب سے ڈرانے والے ہیں آگے رسول کو بھیجنے کا مقصد یہ بتلایا گیا کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور ایمان کے ساتھ مزید تین اَوصاف کا ذکر فرمایا ہے جو مؤمنین میں ہونے چاہئیں تُعَزِّرُوْهُ۔ تُوَقِّرُوْهُ اور تُسَبِّحُوْهُ، تُعَزِّرُوْهُ، تعزیر سے مشتق ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور سزا کو جو تعزیر کہا جاتا ہے وہ بھی اس لئے کہ مجرم کی مدد حقیقی اس میں ہے کہ اس پر سزا جاری کی جائے (مفردات القرآن راغب)[2] اور تُوَقِّرُوْهُ، توقیر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تعظیم، اور تُسَبِّحُوْهُ، تسبیح سے مشتق ہے جس کے معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں ان میں آخری لفظ تو متعین ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہوسکتا ہے اس لئے تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر میں بجز اس کے کوئی احتمال نہیں کہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہو اسی لئے اکثر حضرات نے پہلے دونوں جملوں کی ضمیریں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کرکے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ایمان لاؤ اور اللہ کی یعنی اس کے دین اور رسول کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور اس کی تسبیح کرو۔ اور بعض حضرات نے پہلے دو جملوں کی ضمیر رسول کی طرف راجع کرکے مطلب یہ قرار دیا کہ رسول کی مدد کرو اور تعظیم کرو اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو مگر بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس میں انتشار ضمائر لازم آتا ہے جو بلاغت کے خلاف ہے واللہ اعلم۔ اس کے بعد اس بیعت کا ذکر ہے جس کا واقعہ قصہ حدیبیہ کے جزو دہم میں گزر چکا ہے۔ اس بیعت کے متعلق حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی چونکہ مقصود اس سے اللہ کے حکم کی تعمیل اور رضا جوئی ہے اس لئے گویا خود اللہ تعالیٰ سے بیعت کی اور جب انہوں نے رسول کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اللہ کا ہاتھ متشابہات میں سے ہے جس کی کیفیت اور حقیقت نہ کسی کو معلوم ہے نہ معلوم کرنے کی فکر میں رہنا درست ہے، اس بیعت کی فضیلت آگے بھی آرہی ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی، تفسیر سورۃ النساء: ۴۱، ج:۵ ص:۱۹۸، والزھد والرقائق لابن المبارکؒ، باب فی عرض عمل الأحیاء علی الأموات، رقم الحدیث: ۱۶۷۸

[2] مفردات القرآن للراغبؒ ج:۱ ص:۳۳۳

لفظ بیعت دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے اس کا قدیم اور مسنون طریقہ باہم عہد کرنے والوں کا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے اگرچہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا شرط اور ضروری نہیں۔ بہرحال جس کام کا کسی سے عہد کیا جائے اس کی پابندی شرعاً واجب وضروری ہے اور خلاف ورزی حرام ہے اسی لئے آگے فرمایا کہ جو شخص اس عہد بیعت کو توڑے گا تو کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا اللہ اور اس کے رسول کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ بڑا اجر دینے والے ہیں۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا

اب کہیں گے تجھ سے پیچھے رہ جانے والے گنوار ہم کام میں لگے رہ گئے اپنے مالوں کے اور گھر والوں کے

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ؕ قُلْ

سو ہمارا گناہ بخشوا وہ کہتے ہیں اپنی زبان سے جو اُن کے دل میں نہیں تو کہہ

فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ

کس کا کچھ بس چلتا ہے اللہ سے تمہارے واسطے اگر وہ چاہے تمہارا نقصان یا چاہے تمہارا فائدہ

بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ

بلکہ اللہ ہے تمہارے سب کاموں سے خبردار کوئی نہیں تم نے تو خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ آئے گا رسول

وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ

اور مسلمان اپنے گھر کبھی اور کھب گیا تمہارے دل میں یہ خیال اور اٹکل کی تم نے

ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿١٢﴾ وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ

بُری اٹکلیں اور تم لوگ تھے تباہ ہونے والے اور جو کوئی یقین نہ لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر

فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

تو ہم نے تیار کر رکھی ہے منکروں کے واسطے دہکتی آگ اور اللہ کے لئے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

بخشے جس کو چاہے اور عذاب میں ڈالے جس کو چاہے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

آسان ترجمۂ قرآن

وہ دیہاتی جو (حدیبیہ کے سفر میں) پیچھے رہ گئے تھے، اب وہ تم سے ضرور یہ کہیں گے کہ: ''ہمارے مال ودولت اور ہمارے اہل وعیال نے ہمیں مشغول کرلیا تھا، اس لئے ہمارے لئے مغفرت کی دُعا کردیجئے۔'' وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دِلوں میں نہیں ہوتیں۔ (ان سے) کہو کہ: ''اچھا تو اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا فائدہ پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اللہ کے سامنے تمہارے معاملے میں کچھ بھی کرنے کی طاقت رکھتا ہو؟ بلکہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۱﴾ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھا تھا کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے مسلمان کبھی اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے، اور یہی بات تمہارے دِلوں کو اچھی معلوم ہوتی تھی، اور تم نے بُرے بُرے گمان کئے تھے، اور تم ایسے لوگ بن گئے تھے جنہیں برباد ہونا تھا۔ ﴿۱۲﴾ اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول پر اِیمان نہ لائے، تو (وہ یاد رکھے کہ) ہم نے کافروں کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ﴿۱۳﴾ اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت تمام تر اللہ ہی کی ہے، وہ جس کو چاہے، بخش دے، اور جس کو چاہے، عذاب دے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ﴿۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

جو دیہاتی (اس سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے (شریکِ سفر نہیں ہوئے) وہ عنقریب (جبکہ آپ مدینہ پہنچیں گے) آپ سے (بات بنانے کے طور پر) کہیں گے کہ (ہم جو آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے وجہ اس کی یہ ہوئی کہ)

ہم کو ہمارے مال اور عیال نے فرصت نہ لینے دی (یعنی ان کی ضروریات میں مشغول رہے) تو ہمارے لئے (اس کوتاہی کی) معافی کی دُعا کر دیجئے (آگے حق تعالیٰ اُن کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہیں (آگے آپ کو تلقین ہے کہ یہ لوگ جب آپ سے یہ عذر پیش کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اوّل تو یہ عذر اگر سچا بھی ہوتا تو بمقابلہ اللہ ورسول کے حکم قطعی کے محض عذر لنگ اور باطل ہوتا) سو (ہم پوچھتے ہیں کہ) وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لئے (نفع ونقصان میں) کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے (یعنی تمہاری ذات یا تمہارے مال اور عیال میں جو نفع یا نقصان تقدیر الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے اس کے خلاف کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ البتہ شریعتِ اسلام نے بہت سے مواقع پر اس طرح کے خطرات کا عذر قبول کر کے رخصت دے دی ہے بشرطیکہ وہ عذر واقعی ہو، اور جہاں شریعت نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور رخصت نہیں دی بلکہ حکم قطعی کر دیا جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں ہے کہ سفر حدیبیہ کے لئے اللہ ورسول نے گھربار کے مشاغل کو قابلِ قبول عذر قرار نہیں دیا اگرچہ وہ واقعی ہو۔ دوسرے یہ عذر جو تم کر رہے ہو واقعی اور سچا بھی نہیں جیسا کہ آگے آتا ہے اور تم سمجھتے ہو گے کہ مجھ کو اس جھوٹ کی خبر نہیں ہوئی) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (نے جو کہ) تمہارے سب اعمال پر مطلع ہے (مجھ کو بذریعہ وحی اطلاع کر دی ہے کہ تمہاری غیر حاضری کی وجہ وہ نہیں جو تم بیان کر رہے ہو) بلکہ (اصل وجہ یہ ہے کہ) تم نے یہ سمجھا کہ رسول اور مؤمنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے (بلکہ مشرکین سب کی صفائی کر دیں گے) اور یہ بات تمہارے دلوں میں اچھی بھی معلوم ہوتی تھی (بوجہ اللہ ورسول کی عداوت کے تمہاری دلی تمنا بھی تھی) اور تم نے بُرے بُرے گمان کئے اور تم (ان بُرے گمانوں کی وجہ سے جو کہ خیالاتِ کفریہ ہیں) برباد ہونے والے لوگ ہو گئے اور (اگر ان وعیدوں کو سن کر تم اب بھی دل سے ایمان لے آؤ تو خیر ورنہ) جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے گا تو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور (مؤمن وغیر مؤمن کے لئے مذکورہ قانون مقرر کرنے سے تعجب نہ کیا جائے کیونکہ) تمام آسمان وزمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے اور (کافر اگرچہ مستحقِ عذاب ہوتا ہے لیکن) اللہ تعالیٰ بڑا غفور ورحیم ہے (کہ وہ بھی سچے دل سے ایمان لے آئیں تو اُن کو بھی بخش دیتا ہے)۔

معارف ومسائل

یہ مضمون جو اوپر مذکور ہوا اُن اعراب کے متعلق ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر حدیبیہ میں ساتھ چلنے

کا حکم کیا تھا مگر اُنہوں نے بہانہ بازی سے کام لیا جس کا بیان قصہ حدیبیہ کے جزو اوّل میں ہو چکا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بعض حضرات بعد میں تائب اور مخلص ہو گئے تھے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ

اب کہیں گے پیچھے رہ گئے ہوئے جب تم چلوگے غنیمتیں لینے کو چھوڑو ہم بھی چلیں تمہارے ساتھ

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ

چاہتے ہیں کہ بدل دیں اللہ کا کہا تو کہہ دے تم ہمارے ساتھ ہرگز نہ چلوگے یوں ہی کہہ دیا اللہ نے

مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا

پہلے سے پھر اب کہیں گے نہیں تم تو جلتے ہو ہمارے فائدہ سے کوئی نہیں پر وہ نہیں سمجھتے ہیں مگر

قَلِيْلًا ۝۱۵ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ

تھوڑا سا، کہہ دے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر

اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ

بڑے سخت لڑنے والے، تم اُن سے لڑوگے یا وہ مسلمان ہوں گے، پھر اگر حکم مانو گے دے گا تم کو اللہ

اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ

بدلہ اچھا اور اگر پلٹ جاؤگے جیسے پلٹ گئے تھے پہلی بار دے گا تم کو

عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۶ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ

ایک عذاب دردناک۔ اندھے پر تکلیف نہیں اور نہ لنگڑے پر تکلیف

وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ

اور نہ بیمار پر تکلیف اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا اس کو داخل کرے گا باغوں میں

ع ۲

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور جو کوئی پلٹ جائے اُس کو عذاب دے گا دردناک

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) جب تم غنیمت کے مال لینے کے لئے چلو گے تو یہ (حدیبیہ کے سفر سے) پیچھے رہنے والے تم سے کہیں گے کہ: ''ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔'' وہ چاہیں گے کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ تم کہہ دینا کہ: ''تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ اللہ نے پہلے سے یوں ہی فرما رکھا ہے۔'' اس پر وہ کہیں گے کہ: ''دراصل آپ لوگ ہم سے حسد رکھتے ہیں۔'' نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خود ہی ایسے ہیں کہ بہت کم بات سمجھتے ہیں۔ ﴿۱۵﴾ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے کہہ دینا کہ: عنقریب تمہیں ایسے لوگوں کے پاس (لڑنے کے لئے) بلایا جائے گا جو بڑے سخت جنگجو ہوں گے، کہ یا تو اُن سے لڑتے رہو، یا وہ اطاعت قبول کرلیں۔ اُس وقت اگر تم (جہاد کے اُس حکم کی) اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا اَجر دے گا، اور اگر تم منہ موڑو گے جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا تھا تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ ﴿۱۶﴾ اندھے آدمی پر (جہاد نہ کرنے کا) کوئی گناہ نہیں ہے، نہ لنگڑے آدمی پر کوئی گناہ ہے، اور نہ بیمار آدمی پر گناہ ہے۔ اور جو شخص بھی اللہ اور اُس کے رسول کا کہنا مانے، اللہ اُس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جو کوئی منہ موڑے گا، اُسے دردناک عذاب دے گا۔ ﴿۱۷﴾

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے (مطلب یہ ہے کہ خیبر فتح کرنے کے لئے چلو گے جہاں غنیمت ملنے والی ہے تو یہ لوگ تم سے) کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں (وجہ اس درخواست کی مالِ غنیمت کی طمع تھی جس کا حاصل ہونا قرائن سے ان کو معلوم اور متوقع تھا بخلاف سفر حدیبیہ کے کہ اس میں زحمت بلکہ ہلاکت زیادہ متوقع تھی، اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ) وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ خدا کے

حکم کو بدل ڈالیں (یعنی حکم اللہ کا یہ تھا کہ اس غزوہ میں صرف وہ لوگ جائیں جو حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے
ان کے سوا اور کوئی نہ جائے خصوصاً اُن لوگوں میں جنہوں نے سفر حدیبیہ میں تخلّف اختیار کیا اور بہانہ بازی کی سو) آپ کہہ
دیجئے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے (یعنی تمہاری یہ درخواست ہم منظور نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں حکم خدا تعالیٰ کی
تبدیلی کا گناہ ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یوں ہی فرمادیا ہے (یعنی حدیبیہ سے واپسی ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم
دے دیا تھا کہ غزوۂ خیبر میں اہلِ حدیبیہ کے سوا کوئی نہ جائے گا اور یہ حکمِ خداوندی بظاہر قرآن میں مذکور نہیں اس سے معلوم
ہوا کہ یہ حکم وحی غیر متلو کے ذریعہ آپ کو ملا تھا جو احادیث کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیبیہ سے واپسی
میں جو سورت فتح نازل ہوئی اور اس میں یہ آیت آئی وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿١٨﴾ اس فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہی ہے تو اس
آیت نے اشارہ کر دیا کہ یہ فتح خیبر اُنہی اہلِ حدیبیہ کو نصیب ہوگی، اور جب آپ اُن کو یہ جواب دیں گے) تو وہ لوگ کہیں
گے (ظاہر یہ ہے کہ آپ کے سامنے کہنا مراد نہیں بلکہ اَوروں سے کہیں گے کہ ہمارے ساتھ نہ لینے کو جو خدا کا حکم بتلایا جاتا
ہے بات یہ نہیں) بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو (اس لئے ہمارا شریک ہونا گوارا نہیں حالانکہ مسلمانوں میں حسد کا کوئی
شائبہ نہیں) بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (اگر سمجھ پوری ہوتی تو اللہ کے اس حکم کی حکمت بآسانی سمجھ سکتے تھے کہ
حدیبیہ میں ان حضرات نے ایک بہت بڑے خطرہ اور بڑے امتحان کا کام کیا منافقین نے اپنی دُنیوی اغراض کو مقدم رکھا یہ
وجہ ان کی تخصیص اور ان کی محرومی کی ہے۔ یہاں تک مضمون خیبر کے متعلق تھا آگے ایک دوسرے واقعہ کے متعلق گفتگو کے
لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (اگر ایک خیبر میں نہ گئے تو نہ سہی
ثواب حاصل کرنے کے اور بھی مواقع آنے والے ہیں چنانچہ) عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے
جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہوں گے (مراد اس سے فارس وروم کے غزوات ہیں (كذا في الدر عن ابن عباسؓ) کیونکہ ان
کی فوجیں تربیت یافتہ اور باسامان تھیں کہ) یا تو اُن سے لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جائیں (خواہ اسلام قبول کر کے یا
اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینا قبول کر کے۔ مطلب یہ کہ تم اس کام کے لئے بلائے جاؤ گے) سو (اُس وقت) اگر
تم اطاعت کرو گے (اور اُن سے جہاد کرو گے) تو تم کو اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دے گا اور اگر تم (اُس وقت بھی) روگردانی
کرو گے جیسا اس کے قبل (حدیبیہ وغیرہ میں) روگردانی کر چکے ہو تو وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا (البتہ دعوتِ جہاد سے
معذور لوگ مستثنیٰ ہیں چنانچہ) نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور (اوپر جو
مجاہدین کے لئے جنت ونعمت کے وعدے اور جہاد سے جان چُرانے والوں کے لئے وعیدیں مذکور ہیں ان میں کچھ انہی
لوگوں کی تخصیص نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مانے گا اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن
کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو شخص (حکم سے) روگردانی کرے گا اس کو دردناک عذاب کی سزا دے گا۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد ۷ھ میں پیش آیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کا ارادہ فرمایا تو صرف ان لوگوں کو ساتھ لیا جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی فتح اور وہاں سے اموالِ غنیمت ملنے کا وعدہ فرمایا تھا اس وقت دیہات کے وہ لوگ جو سفرِ حدیبیہ میں باوجود بلانے کے عذر کر کے پیچھے رہ گئے تھے ان لوگوں نے بھی جہاد خیبر میں ساتھ چلنے کا ارادہ کیا خواہ اس طرح سے کہ اُن کو قرائن سے خیبر کا فتح ہونا اور وہاں مال غنیمت ملنے کی توقع تھی یا اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملات اور صلح حدیبیہ کے کچھ برکات دیکھ کر اُن کو جہاد سے پیچھے رہنے پر ندامت ہوئی اور اب شرکتِ جہاد کا ارادہ کیا۔ ان کے جواب میں قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے کلام یعنی اُس کے حکم کو بدلنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ اور مراد اس حکم سے غزوۂ خیبر اور اس کے مغانم کا صرف اہلِ حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہونا ہے اور اس کے بعد كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ میں بھی یہی تخصیص اہلِ حدیبیہ کا قول ہے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو کہیں اس تخصیص کا ذکر ہے نہیں پھر اس تخصیص کے وعدہ کو كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ اور قَالَ اللّٰهُ کہنا کیسے صحیح ہوا۔

وحیٔ الٰہی صرف قرآن میں منحصر نہیں، قرآن کے علاوہ بھی بذریعہ وحی اَحکام آئے ہیں، اور اَحادیثِ رسول بھی کلام اللہ کے حکم میں ہیں

علماء نے فرمایا کہ یہ تخصیص اہلِ حدیبیہ کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، اس کا قرآن میں کہیں صراحۃً ذکر نہیں، بلکہ یہ تخصیص اہلِ حدیبیہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلو کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر حدیبیہ میں فرمایا تھا، اسی کو اس جگہ كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ اور قَالَ اللّٰهُ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ اَحکامِ قرآن کے جو اَحکام احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہیں وہ بھی حسب تصریح اس آیت کے کلام اللہ اور قول اللہ میں داخل ہیں۔ جو ملحدین احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجتِ دین نہیں مانتے یہ آیتیں ان کے الحاد کو کھولنے کے لئے کافی ہیں، رہا یہ معاملہ کہ اسی سورت میں جو سفر حدیبیہ کے شروع میں نازل ہوئی ہے یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ اور باتفاق مفسرین یہاں فتح قریب سے فتح خیبر مراد ہے تو اس طرح قرآن میں فتح خیبر کا اور اُس کے غنائم اہلِ حدیبیہ کو ملنے کا وعدہ آ گیا وہی اس لفظ كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ اور قَالَ اللّٰهُ کی مراد ہو سکتی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں غنیمت کا وعدہ تو ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ غنیمت اہلِ حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہوگی دوسرے اس میں شریک نہ ہو سکیں گے یہ تخصیص تو بلاشبہ حدیثِ رسول

ہی سے معلوم ہوئی ہے وہی كَلٰمَ اللّٰهِ اور قَالَ اللّٰهُ کا مصداق اور بعض حضرات نے جو سورۂ توبہ کی آیت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے یعنی فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ [1] (التوبۃ: ۸۳) تو اس لئے صحیح نہیں کہ یہ آیات غزوۂ تبوک کے متعلق آئی ہیں، اور وہ غزوۂ خیبر کے بعد ۹ھ میں ہوا ہے۔ (قرطبی وغیرہ) [2]

قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا، اس میں جو تاکیدی طور پر متخلّفین حدیبیہ سے یہ فرمایا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتے یہ صرف غزوۂ خیبر کے ساتھ مخصوص ہے آگے کسی اور جہاد میں بھی شریک نہ ہوسکیں یہ اس سے لازم نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ ان متخلّفین حدیبیہ میں سے قبائل مزنیہ اور جُہینہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے۔ (کما فی الروح عن البحر، بیان) [3]

متخلّفین حدیبیہ میں سے بعض لوگ بعد میں تائب ہوکر سچے مسلمان ہو گئے تھے

غزوۂ خیبر کے وقت جتنے متخلّفین حدیبیہ تھے سبھی کو اس جہاد کی شرکت سے روک دیا گیا تھا حالانکہ ان میں سب منافق نہیں، بعض مسلمان بھی تھے اور بعض گو اس وقت منافق تھے مگر بعد میں سچے ایمان کی ان کو توفیق ہوگئی تھی اس لئے ایسے لوگوں کی دلجوئی کے لئے اگلی آیات آئیں جن میں اُن کو تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ غزوۂ خیبر اللہ کے وعدے کے مطابق اہلِ حدیبیہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا مگر جو مخلص مسلمان ہیں اور دل سے شرکتِ جہاد چاہتے ہیں اُن کے لئے دوسرے مواقع آنے والے ہیں ان مواقع کو قرآن کریم ایک خاص پیشین گوئی کی صورت میں بیان فرماتا ہے جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہونے والا ہے۔ ارشاد فرمایا، سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ، یعنی ایک ایسا وقت آنے والا ہے جبکہ تمہیں جہاد کی دعوت دی جائے گی اور یہ جہاد ایک بڑی سخت جنگجو قوم کے ساتھ ہوگا۔ اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش نہیں آیا، کیونکہ اوّلاً تو آپ کا اس کے بعد اعراب کو کسی غزوہ میں دعوت شرکت دینا ثابت نہیں ثانیاً اس کے بعد کسی ایسی قوم سے مقابلہ بھی نہیں ہوا جس کے بہادر اور سخت ہونے کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے کیونکہ غزوۂ تبوک میں اگرچہ مقابلہ ایسی قوم سے تھا مگر نہ اُس غزوہ میں اعراب کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اس

---

[1] ترجمہ: پھر یہ لوگ چلنے کی اجازت مانگیں تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ نہ چلو گے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۷۱، وتفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۳۳۷، ۳۳۸

[3] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۳۳، وروح المعانی ج:۱۹ ص:۲۰۵

میں قتال کی نوبت آئی کیونکہ مقابل آدمیوں پر اللہ نے رعب ڈال دیا وہ مقابلہ پر نہیں آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بغیر قتال کے واپس آئے اور غزوۂ حنین میں بھی نہ ان کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اُس وقت مقابل کوئی ایسی قوم تھی جو سخت اور ساز وسامان والی ہو۔ اس لئے ائمۂ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے فارس اور رُوم یعنی کسریٰ وقیصر کی قومیں ہیں جن کے ساتھ جہاد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا ہے (ھو قول ابن عباسؓ وعطاء ومجاھد وابن ابی لیلی والحسن قرطبی) [۱] اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس قوم سے کونسی قوم مراد ہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ہمیں بنوحنیفہ اہل یمامہ یعنی مسیلمہ کذاب کی قوم کے ساتھ جہاد کرنے کی دعوت دی، اس وقت ہم سمجھے کہ یہی قوم اس آیت میں مراد تھی۔ مگر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد وتعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ سبھی قومیں اس میں داخل ہوں۔

امام قرطبیؒ نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی خلافت حق کے مطابق تھی ان کی دعوت کا ذکر خود قرآن نے آیتِ مذکورہ میں فرمایا ہے۔ [۲]

تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ حضرت اُبیّ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اَوْ يُسْلِمُوْا بغیر نون کے آیا ہے اس لئے قرطبی نے اس کے مطابق حرف اَوْ کو حتیٰ کے معنی میں لیا ہے، یعنی اُس قوم سے قتال اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ وہ مطیع فرمانبردار نہ ہو جائیں خواہ اسلام قبول کر کے یا اسلامی حکومت کی اطاعت میں رہنا قبول کر کے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اُوپر کی آیات میں جہاد کی شرکت سے ہٹنے والوں کے لئے عذاب کی وعید آئی وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾ تو کچھ معذور لوگ جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تھے اُن کو فکر ہوئی کہ ہم تو شرکتِ جہاد کے قابل نہیں، کہیں ہم بھی اس وعید میں شامل نہ ہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اندھے، لنگڑے اور بیمار کو حکمِ جہاد سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ (قرطبی) [۳] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ

تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے پھر معلوم کیا

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۷۲

[۲] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۷۳

مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ لا

جو اُن کے جی میں تھا پھر اُتارا اُن پر اطمینان اور انعام دیا ان کو ایک فتح نزدیک

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ

اور بہت غنیمتیں جن کو وہ لیں گے اور ہے اللہ زبردست حکمت والا وعدہ کیا ہے تم سے اللہ نے

مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ج

بہت غنیمتوں کا کہ تم ان کو لوگے سو جلدی پہنچادی تم کو یہ غنیمت اور روک دیا لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے

وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ لا

اور تاکہ ایک نمونہ ہو قدرت کا مسلمانوں کے واسطے اور چلائے تم کو سیدھی راہ

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

اور ایک فتح اور جو تمہارے بس میں نہ آئی وہ اللہ کے قابو میں ہے اور اللہ

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

ہر چیز کرسکتا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

یقیناً اللہ ان مؤمنوں سے بڑا خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اور ان کے دِلوں میں جو کچھ تھا وہ بھی اللہ کو معلوم تھا، اس لئے اُس نے اُن پر سکینت اُتار دی، اور اُن کو اِنعام میں ایک قریبی فتح عطا فرمادی، ﴿۱۸﴾ اور غنیمت میں ملنے والے بہت سے مال بھی جو اُن کے ہاتھ آئیں گے! اور اللہ اِقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی

مالک۔ ⑲ اللہ نے تم سے بہت سے مالِ غنیمت کا وعدہ کر رکھا ہے جو تم حاصل کرو گے، اب فوری طور پر اُس نے تمہیں یہ فتح دے دی ہے، اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا، تا کہ یہ مؤمنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے، اور تمہیں اللہ سیدھے راستے پر ڈال دے، ⑳ اور ایک فتح اور بھی ہے جو ابھی تمہارے قابو میں نہیں آئی لیکن اللہ نے اُس کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے، اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ ㉑

خلاصۂ تفسیر

تحقیق اللہ ان مسلمانوں سے (جو آپ کے ہم سفر ہیں) خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے (جہاد میں ثابت قدم رہنے پر) بیعت کر رہے تھے اور اُن کے دِلوں میں جو کچھ (اخلاص اور عہد کو پورا کرنے کا عزم) تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے اُن (کے قلب) میں اطمینان پیدا کر دیا (جس سے اُن کو خدا کا حکم ماننے میں ذرا پس وپیش یا تردّد نہیں ہوا۔ یہ تو معنوی نعمتیں ہوئیں) اور (اس کے ساتھ کچھ محسوس نعمتیں بھی دی گئیں جن میں معنوی نعمتیں بھی شامل تھیں، چنانچہ) اُن کو ایک لگتے ہاتھ فتح دے دی (مراد اس فتح سے فتح خیبر ہے) اور (اُس فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) بڑا حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے جس وقت جس کے لئے مناسب سمجھتا ہے فتح دے دیتا ہے۔ اور کچھ اسی فتح خیبر پر بس نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لو گے سو (ان میں سے) سرِ دست تم کو یہ دے دی ہے اور (اس کے دینے کے لئے خیبر اور حلفاء خیبر کے) لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے (یعنی سب کے دِلوں پر رُعب ڈال دیا کہ اُن کو زیادہ دراز دستی کی ہمت نہ ہوئی اور اس سے تمہارا دُنیوی نفع بھی مقصود تھا تا کہ آرام اور فراغت ملے) اور (دینی نفع بھی تھا) تا کہ یہ (واقعہ) اہلِ ایمان کے لئے (دوسرے وعدوں کے سچے ہونے کا) ایک نمونہ ہو جائے (یعنی خدا کے وعدوں کے سچا ہونے پر اور زیادہ ایمان پختہ ہو جائے) اور تا کہ (اس نمونہ کے ذریعہ) تم کو (آئندہ کے لئے ہر کام میں) ایک سیدھے راستہ پر ڈال دے (مراد اس راستہ سے توکل اور اللہ پر بھروسہ ہے یعنی ہمیشہ کے لئے اس واقعہ کو سوچ کر اللہ پر اعتماد سے کام لیا کرو اس طرح دینی نفع دو ہو گئے ایک علمی اور اعتقادی جس کو وَلِتَكُونَ سے بیان فرمایا ہے، دوسرا عملی و اخلاقی جس کو وَيَهْدِيَكُمْ کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے) اور ایک فتح اور بھی (موعود) ہے جو (اس وقت تک) تمہارے قابو میں نہیں آئی (مراد اس سے فتح مکہ ہے جو اب تک واقع نہیں ہوئی تھی مگر) خدا تعالیٰ اس کو احاطہ (قدرت) میں لئے ہوئے ہے (جب چاہے گا تم کو عطا کر دے گا) اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

معارف و مسائل

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، اس بیعت سے مراد بیعتِ حدیبیہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلے بھی اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ میں آچکا ہے، یہ آیت بھی اسی سے متعلق اور اس کی تاکید ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس بیعت کے شرکاء سے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا ہے، اسی لئے اس کو بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے، اور مقصود اس سے اُن شرکاء بیعت کی مدح اور اُن کو اس عہد کے پورا کرنے کی تاکید ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن ہماری تعداد چودہ سو نفر کی تھی ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتُمْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ، یعنی تم لوگ تمام روئے زمین کے انسانوں سے بہتر ہو۔[1] اور صحیح مسلم میں اُمّ بشرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ لَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ مِّمَّنْ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، یعنی جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی ہے اُن میں کوئی جہنم میں نہیں جائے گا (مظہری)۔[2] اس لئے اس بیعت کے شرکاء کی مثال شرکاء غزوۂ بدر کی سی ہے جیسا ان کے متعلق قرآن و حدیث میں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارتیں ہیں اسی طرح شرکائے بیعتِ رضوان کے لئے بھی یہ بشارت آئی ہے۔

یہ بشارتیں اس پر شاہد ہیں کہ ان سب حضرات کا خاتمہ ایمان اور اعمالِ صالحہ مرضیہ پر ہوگا کیونکہ رضائے الٰہی کا یہ اعلان اس کی ضمانت دے رہا ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر طعن و تشنیع اور ان کی لغزشوں میں غور و بحث اس آیت کے خلاف ہے

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ جن خیارِ اُمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے غفران و مغفرت کا یہ اعلان فرمادیا ہے، اگر اُن سے کوئی لغزش یا گناہ ہوا بھی ہے تو یہ آیت اُس کی معافی کا اعلان ہے۔ پھر ان کے ایسے معاملات کو جو مستحسن نہیں ہیں غور و فکر اور بحث و مباحثہ کا میدان بنانا بدبختی اور بظاہر اس آیت کی مخالفت ہے۔ یہ آیت روافض کے قول کی واضح تردید ہے جو ابوبکر و عمر اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کفر و نفاق کے الزام لگاتے ہیں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحدیبیة ج:۲ ص:۵۹۸، وصحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب إستحباب مبایعة الإمام الجیش ...إلخ ج:۲ ص:۱۲۹

[2] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۳، وصحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل اصحاب الشجرة أهل بیعة الرضوان ج:۲ ص:۳۰۲

شجرۂ رضوان

شجرہ، جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے ایک ببول کا درخت تھا اور مشہور یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگ وہاں چل کر جاتے اور اس درخت کے نیچے نمازیں پڑھتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں آئندہ آنے والے جہلاء اسی درخت کی پرستش نہ شروع کر دیں جیسے پچھلی اُمتوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں اس لئے اس درخت کو کٹوا دیا مگر صحیحین میں ہے کہ حضرت طارق بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حج کے لئے گیا تو راستے میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو ایک مقام پر جمع تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ کونسی مسجد ہے انہوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی، میں اس کے بعد حضرت سعید بن مسیّبؒ کے پاس حاضر ہوا اور اس واقعہ کی خبر اُن کو دی، انہوں نے فرمایا کہ میرے والد ان لوگوں میں سے تھے جو اس بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ہم جب اگلے سال مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو ہم نے وہ درخت تلاش کیا ہمیں بھول ہوگئی اس کا پتہ نہیں لگا۔ پھر سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جو خود اس بیعت میں شریک تھے اُن کو تو پتہ نہیں لگا تمہیں وہ معلوم ہوگیا عجیب بات ہے کیا تم اُن سے زیادہ واقف ہو (روح المعانی) [1] اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں لوگوں نے محض اپنے تخمینہ اور اندازہ سے کسی درخت کو متعین کرلیا اور اس کے نیچے حاضر ہونا اور نمازیں پڑھنا شروع کر دیں، فاروق اعظم کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہ درخت نہیں پھر خطرہ ابتلائے شرک کا لاحق ہوگیا اس لئے اس کو قطع کرا دیا ہو کیا بعید ہے۔

فتحِ خیبر

خیبر درحقیقت ایک صوبہ کا نام ہے جس میں بہت سی بستیاں اور قلعے اور باغات شامل ہیں۔ (مظہری) [2]

وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ اس فتح قریب سے مراد باتفاق فتح خیبر ہے جو حدیبیہ سے واپس آنے کے بعد واقع ہوئی ہے بعض روایات کے مطابق تو حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام مدینہ منورہ میں صرف دس روز اور دُوسری روایت کے مطابق بیس روز رہا اس کے بعد خیبر کے لئے روانہ ہوگئے، اور ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق آپ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور محرم ۷ھ میں آپ غزوۂ خیبر کے لئے تشریف لے گئے

---

[1] روح المعانی ج:۱۹ ص:۲۰۸، وصحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب إستحباب مبايعة الإمام الجيش ...إلخ، ج:۲ ص:۱۲۹

[2] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۳

اور ماہ صفر ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ واقدی کے مغازی میں یہی لکھا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہی راجح ہے۔ (تفسیر مظہری) [۱]

بہرحال یہ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ فتح خیبر سفر حدیبیہ سے کافی دنوں کے بعد پیش آیا ہے۔ اور سورۂ فتح کا سفر حدیبیہ کے دوران نازل ہونا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ پوری سورت اُسی وقت نازل ہوئی یا کچھ آیتیں بعد میں آئیں۔ اگر پہلی صورت راجح ہو تو ان آیتوں میں واقعہ خیبر کا بیان بطور پیش گوئی کے ہوا اور اس کو بصیغہ ماضی قطعی اور یقینی ہونے کی بناء پر تعبیر کیا گیا، اور اگر دوسرا قول راجح ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ آیتیں بعد وقوع فتح خیبر کے نازل ہوئی ہوں۔ واللہ اعلم۔

وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا مراد اس سے خیبر کا مالِ غنیمت ہے جس سے مسلمانوں کو سہولت اور فراغ بالی حاصل ہوئی۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ، اس سے مراد تمام اسلامی فتوحات اور ان کے غنائم ہیں جو قیامت تک حاصل ہونے والی ہیں۔ پہلے مغانم اہلِ حدیبیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخصوص کردیئے گئے تھے یہ سب کے لئے عام ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تخصیص کا حکم ان آیات میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہ جداگانہ وحی کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا ہے۔ آپ نے اُس پر عمل کیا اور صحابۂ کرام کو بتلایا۔

وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ اس سے مراد کفار اہلِ خیبر ہیں کہ اُن کو اس جہاد میں کچھ زیادہ زور دکھانے کا موقع اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ قبیلہ غطفان یہود خیبر کا حلیف تھا جب اس قبیلہ نے خبر سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی ہے تو یہ لوگ یہود کی مدد کے لئے بڑے ساز و سامان سے نکلے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور یہ اس فکر میں پڑ گئے کہ اگر ہم اس طرف گئے تو بعید نہیں کہ مسلمانوں کا کوئی لشکر ہمارے پیچھے ہمارے گھروں پر حملہ کردے اس لئے سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔ (مظہری) [۲]

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ اصل ہدایت صراطِ مستقیم کی تو ان حضرات کو پہلے سے حاصل تھی مگر جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ ہدایت کے درجات بے شمار ہیں یہاں وہ درجہ مراد ہے جو پہلے سے حاصل نہ تھا یعنی اللہ پر بھروسہ اور قوتِ ایمان کی زیادتی۔

[۱] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۲۳

[۲] حوالۂ بالا۔

وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اور بہت سی فتوحات کا وعدہ کیا ہے جس پر ابھی اُن کو قدرت نہیں۔ ان فتوحات میں چونکہ سب سے پہلے مکہ مکرمہ کی فتح ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے فتح مکہ مراد لیا ہے مگر الفاظ عام ہیں قیامت تک ہونے والی فتوحات اس میں شامل ہیں۔ (مظہری) [۱]

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا

اور اگر لڑتے تم سے کافر تو پھیرتے پیٹھ پھر نہ پاتے کوئی حمایتی

وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ

اور نہ مددگار رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے اور تو ہرگز نہ دیکھے گا

لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿۲۳﴾ وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ

اللہ کی رسم کو بدلتے اور وہی ہے جس نے روک رکھا اُن کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو اُن سے

بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بیچ شہر مکہ کے بعد اس کے کہ تمہارے ہاتھ لگادیا اُن کو اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو

بَصِیْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

دیکھتا یہ وہی لوگ ہیں جو منکر ہوئے اور روکا تم کو مسجد حرام سے

وَالْهَدْیَ مَعْكُوْفًا اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ

اور نیاز کی قربانی کو بھی بند پڑی ہوئی اس بات سے کہ پہنچے اپنی جگہ تک، اور اگر نہ ہوتے کتنے ایک مرد ایمان والے

[۱] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۲

وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ

اور کتنی عورتیں ایمان والیاں جو تم کو معلوم نہیں یہ خطرہ کہ تم ان کو پیس ڈالتے پھر تم پر ان کی وجہ سے خرابی پڑ جاتی

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا

بے خبری سے کہ اللہ کو داخل کرنا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہے اگر وہ لوگ ایک طرف ہوجاتے

لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

تو آفت ڈالتے ہم منکروں پر عذاب دردناک کی جب رکھی منکروں نے

فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

اپنے دلوں میں کد نادانی کی ضد پھر اُتارا اللہ نے اپنی طرف کا اطمینان اپنے رسول پر

وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ

اور مسلمانوں پر اور قائم رکھا ان کو ادب کی بات پر اور وہی تھے اس کے لائق

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾ ع

اور اس کام کے اور ہے اللہ ہر چیز سے خبردار

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ کافر لوگ تم سے لڑتے تو یقیناً پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، پھر اُنہیں کوئی یار و مددگار بھی نہ ملتا، ﴿۲۲﴾ جیسا کہ اللہ کا یہی دستور ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے، اور تم اللہ کے دستور میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ﴿۲۳﴾ اور وہی اللہ ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے، اور تمہارے ہاتھوں کو اُن تک پہنچنے سے روک دیا، جبکہ وہ تمہیں اُن پر قابو دے چکا تھا، اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ ﴿۲۴﴾ یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، اور تمہیں مسجدِ حرام سے

روکا، اور قربانی کے جانوروں کو جو ٹھہرے ہوئے کھڑے تھے، اپنی جگہ پہنچنے سے روک دیا۔ اور اگر کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں (مکہ میں) نہ ہوتیں جن کے بارے میں تمہیں خبر بھی نہ ہوتی کہ تم اُنہیں پیس ڈالوگے، اور اُس کی وجہ سے بے خبری میں تم کو نقصان پہنچ جاتا (تو ہم ان کافروں سے تمہاری صلح کے بجائے جنگ کروادیتے، لیکن ہم نے جنگ کو اس لئے روکا) تاکہ اللہ جس کو چاہے، اپنی رحمت میں داخل کردے۔ (البتہ) اگر وہ مسلمان وہاں سے ہٹ جاتے تو ہم ان (اہلِ مکہ) میں سے جو کافر تھے، اُنہیں دردناک سزا دیتے۔ ﴿۲۵﴾ (چنانچہ) جب ان کافروں نے اپنے دِلوں میں اُس حمیت کو جگہ دی جو جاہلیت کی حمیت تھی تو اللہ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں پر سکینت نازل فرمائی، اور اُن کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ﴿۲۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (چونکہ ان کفار کے مغلوب ہونے کے مقتضیات موجود تھے جو آگے آتے ہیں اس لئے) اگر (تم میں یہ صلح نہ ہوتی بلکہ) تم سے یہ کافر لڑتے تو (اُن مقتضیات کی وجہ سے وہ) ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا نہ مددگار (اور) اللہ تعالیٰ نے (کفار کے لئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے (کہ مقابلہ میں اہلِ حق غالب اور اہلِ باطل مغلوب رہے ہیں اور کبھی کسی وقت کسی حکمت و مصلحت سے اس میں تاخیر ہونا اس کے منافی نہیں) اور آپ خدا کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) ردّ و بدل نہ پائیں گے (کہ خدا تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے اور کوئی اس کو نہ ہونے دے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ اُن (کے قتل) سے عین مکہ (کے قریب) میں (یعنی حدیبیہ میں) روک دیئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا (یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو قصہ حدیبیہ کے جزء ہشتم میں شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ قریش کے پچاس آدمیوں کو صحابۂ کرام نے گرفتار کرلیا تھا اور پھر کچھ لوگ بھی گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے اس وقت اگر مسلمان ان کو قتل کردیتے تو دوسری طرف مکہ میں حضرت عثمان غنی اور ان کے چند ساتھی روک لئے گئے تھے وہ ان کو شہید کردیتے اس کا لازمی نتیجہ مکمل طور پر جنگ چھڑ جانا ہوتا اور اگرچہ مذکور الصدر آیات کی پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ اگر جنگ ہو بھی جاتی تو فتح مسلمانوں ہی کی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلمانوں کی بڑی مصلحت اس میں تھی کہ اس وقت جنگ نہ ہو اس لئے اس طرف مسلمانوں کے دِل میں یہ بات ڈال دی کہ اُن کے قیدیوں کو قتل نہ کریں اس طرح مسلمانوں کے ہاتھ ان کے قتل سے روک دیئے دوسری طرف قریش کے دلوں پر اللہ نے مسلمانوں کا رعب ڈال دیا کہ اُنہوں نے صلح کی طرف مائل ہو کر سہیل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، اس طرح حق تعالیٰ کی حکمت نے دو طرفہ انتظام جنگ نہ ہونے کا کردیا)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو (اُس وقت) دیکھ رہا تھا (اور اُن کاموں کے نتائج کو جانتا تھا اس لئے ایسا کام نہیں ہونے دیا جس سے جنگ چھڑ جائے۔ آگے اس کا بیان ہے کہ اگر جنگ ہو جاتی تو کفار کی مغلوبیت کس طرح اور کیوں ہوتی) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو (عمرہ کرنے کے لئے) مسجدِ حرام سے روکا (مراد مسجد حرام اور صفا مروہ کے درمیان کا میدان جہاں سعی ہوتی ہے دونوں ہی ہیں مگر چونکہ طواف اصل اور اوّل ہے اور وہ مسجد حرام میں ہوتا ہے اس لئے اُس سے روکنے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا) اور قربانی کے جانور کو جو (حدیبیہ میں) رُکا ہوا رہ گیا اس کو اس کے موقع میں پہنچنے سے روکا (جانوروں کی قربانی کا موقع منیٰ ہے ان لوگوں نے جانوروں کو منیٰ تک نہیں جانے دیا، اُن کے ان جرائم) اور (حرمِ محترم میں بیٹھ کر ایسا ظلم کرنے کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دے کر ان کو مغلوب کر دیا جاتا، لیکن بعض حکمتیں اس تقاضے کو پورا کرنے سے مانع ہو گئیں اُن حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس وقت مکہ میں بہت سے مسلمان کفار کے ہاتھوں محبوس اور مظلوم تھے جیسا کہ قصہ حدیبیہ کے جزو دہم میں اس کا ذکر آیا ہے اور اُن میں سے ابوجندل کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر فریاد کرنا بیان ہو چکا ہے، اگر اس وقت جنگ چھڑ جاتی تو غیر شعوری طور پر ان مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا اور ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ سے ہی وہ قتل ہو جاتے اور عام مسلمانوں کو پھر اس پر ندامت و افسوس ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ جنگ نہ ہو۔ اسی مضمون کو آگے فرمایا ہے کہ) اگر (مکہ میں اس وقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی یعنی ان کے پِس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں (رنج و افسوس کا) ضرر پہنچتا (اگر یہ بات نہ ہوتی) تو سب قصہ طے کر دیا جاتا، لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے (چنانچہ جنگ نہ ہونے سے اُن مسلمانوں کی جان بچی اور تم اُن کے قتل کے گناہ اور پھر اُس پر رنج و افسوس سے بچے البتہ) اگر یہ (مذکورہ مسلمان مکہ سے کہیں) ٹل گئے ہوتے تو ان (اہلِ مکہ) میں جو کافر تھے ہم اُن کو (مسلمانوں کے ہاتھ سے) دردناک سزا دیتے (اور ان کفار کے مغلوب و مقتول ہونے کا ایک مقتضی اور بھی تھا) جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی (اس عار سے وہ ضد مراد ہے جو بسم اللہ اور لفظ رسول اللہ کے لکھنے پر اُنہوں نے مزاحمت کی جیسا کہ اوپر صلح نامہ حدیبیہ کے بیان میں اس کا ذکر آچکا ہے) سو (اس کا مقتضا یہ تھا کہ مسلمان جوش میں آکر لڑ پڑتے مگر) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور مؤمنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا فرمایا۔ (جس کی وجہ سے انہوں نے اس کلمہ کے لکھنے پر اصرار چھوڑ دیا اور صلح ہو گئی) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا (تقویٰ کی بات سے مراد کلمہ طیبہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار ہے اور مطلب اس پر جمائے رکھنے کا یہ ہے کہ توحید و رسالت کے اعتقاد کا تقاضا اطاعت ہے اللہ اور رسول کی اور مسلمانوں کا یہ صبر و ضبط اپنے جذبات کے خلاف صرف اس وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضبط و صبر کا حکم فرمایا تھا ایسے سخت مرحلہ میں اپنے

جذبات کے خلاف رسول کی اطاعت ہی کا نام کلمہ تقویٰ پر جمنا ہے) اور وہ (مسلمان) اُس (کلمۂ تقویٰ) کے (دُنیا میں بھی) زیادہ مستحق ہیں (کیونکہ ان کے قلوب میں طلبِ حق ہے اور یہ طلب ہی ایمان تک پہنچاتی ہے) اور (آخرت میں بھی) اس (کے ثواب) کے اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

معارف و مسائل

بَطْنِ مَكَّةَ، اس لفظ کے اصل معنی عین مکہ کے ہیں مگر یہاں اس سے مراد مقامِ حدیبیہ ہے اس کو مکہ مکرمہ سے بہت متصل ہونے کی بناء پر بطنِ مکہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے اُس بات کی تائید ہوتی ہے جو حنفیہ نے اختیار کی ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُحْصَر عن الحج والعمرہ یعنی جس کو احرام باندھنے کے بعد کسی وجہ سے دخولِ مکہ سے روک دیا گیا ہو اُس پر باتفاق یہ تو لازم ہے کہ قربانی کر کے احرام سے حلال ہو لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ قربانی اسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں وہ روک دیا گیا ہے، یا دوسری قربانیوں کی طرح اس کے لئے بھی حدودِ حرم کے اندر ہونا شرط ہے حنفیہ کے نزدیک اس کے لئے بھی حدود حرم شرط ہیں اس آیت سے ان کا استدلال ہے کہ یہاں اس قربانی کے لئے قرآن نے ایک خاص محل قرار دیا ہے جس سے کفار نے مسلمانوں کو روک دیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس قربانی کے لئے حدود حرم میں ہونا شرط ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ خود حنفیہ ہی کا یہ قول بھی ہے کہ حدیبیہ کے بعض حصے حرم میں داخل ہیں تو پھر حرم سے روکنا کیسے ثابت ہوا، تو جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس قربانی کا حدود حرم میں کسی بھی جگہ کر دینا شرعاً کافی ہے مگر اُس خاص جگہ میں جو منیٰ کے اندر منحر کے نام سے موسوم ہے اس میں ہونا افضل ہے۔ کفار مکہ نے اس وقت مسلمانوں کو اس افضل مقام تک قربانی کا جانور لے جانے سے روک دیا تھا۔

فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لفظ معرّہ کے معنی بعض حضرات نے گناہ کے بیان کئے ہیں اور بعض حضرات نے مطلق مضرّت کے اور بعض نے عیب کے بیان کئے ہیں، اس مقام پر ظاہر یہی آخری معنی ہیں کہ اگر جنگ چھڑ جاتی اور بے خبری کی حالت میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مکہ میں محبوس مسلمان قتل ہو جاتے تو یہ ایک عیب اور عار کی بات بھی تھی کہ کفار ان کو عار دلاتے کہ اپنے ہی دینی بھائیوں کو مار ڈالا اور مضرّت بھی، مقتول مسلمانوں کی مضرّت تو ظاہر ہی ہے۔ قاتل مسلمانوں کو جب خبر ہوتی سخت ندامت اور افسوس ہوتا، یہ مضرت عام مسلمانوں کو پہنچتی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو غلطی اور عیب سے بچانے کا قدرتی انتظام

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ بغیر علم کے اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ گناہ تو نہیں مگر ایک

عیب اور عار اور ندامت وافسوس کا سبب ضرور ہے اور قتل خطاء پر دیت وغیرہ دینے کے بھی احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے صحابہ کی اس سے بھی حفاظت فرمائی۔ [1] اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں مگر عامۃً اُن کو خطاؤں اور عیبوں سے بچانے کا قدرتی انتظام ہو جاتا ہے۔

لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ یعنی حق تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کے قلوب میں تحمل پیدا کر کے جنگ نہ ہونے کا انتظام اس لئے فرمایا کہ ان میں سے بہت سے لوگوں کا آئندہ اسلام قبول کر لینا اللہ تعالیٰ جانتا تھا اُن پر رحمت کرنے کے لئے نیز جو مسلمان محبوس تھے اُن پر رحمت کے لئے یہ سارا سامان کیا گیا۔

لَوْ تَزَيَّلُوْا، تزیل کے معنی اصل میں تفرق کے ہیں مطلب یہ ہے کہ مکہ میں محبوس مسلمان اگر کفار سے الگ اور ممتاز ہوتے کہ مسلمان اُن کو پہچان کر تکلیف سے بچا لیتے تو ان کفار کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اسی وقت ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوا دی جاتی مگر چونکہ محبوس ضعفاء مسلمین مرد اور عورتیں اُنہی کے اندر مخلوط تھے اگر قتال ہوتا تو اُن کو بچانے کی صورت نہ بنتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو موقوف رکھا۔

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ کلمۂ تقویٰ سے مراد اہلِ تقویٰ کا کلمہ ہے یعنی کلمۂ توحید ورسالت، اس کو کلمۂ تقویٰ اس لئے کہا گیا کہ یہ کلمہ ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔ اور صحابۂ کرام کو اس کلمہ کا احق اور اہل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی رُسوائی واضح کر دی جو ان حضرات پر کفر ونفاق کا الزام لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو کلمۂ اسلام کا اہل اور احق فرمائے اور یہ بدبخت اُن پر تبرّا کریں۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

اللہ نے سچ دکھلایا اپنے رسول کو خواب تحقیقی کہ تم داخل ہو رہو گے مسجد حرام میں

اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ

اگر اللہ نے چاہا آرام سے بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے بے کھٹکے

[1] تفسیر القرطبی ج:۱٦ ص:۲۸٦

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ

پھر جانا وہ جو تم نہیں جانتے پھر مقرر کر دی اس سے ورے ایک فتح نزدیک۔ وہی ہے جس نے

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ

بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر تاکہ اوپر رکھے اُس کو ہر دین سے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ

اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا محمد رسول اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زورآور ہیں

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے اُن کو رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل

وَرِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ

اور اس کی خوشی نشانی اُن کی ان کے منہ پر ہے سجدے کے اثر سے یہ شان ہے اُن کی

فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ

معانقة ۱۵

تورات میں اور مثال اُن کی انجیل میں جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس کی کمر مضبوط کی،

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ

پھر موٹا ہوا پھر کھڑا ہوگیا اپنی نال پر خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو تاکہ جلائے ان سے جی کافروں کا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً

وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن سے جو یقین لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام معافی کا

ع ۱۲ ۴

وَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾ ع

اور بڑے ثواب کا

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دِکھایا ہے جو واقعے کے بالکل مطابق ہے۔ تم لوگ اِن شاء اللہ ضرور مسجدِ حرام میں اس طرح امن وامان کے ساتھ داخل ہو گے کہ تم (میں سے کچھ) نے اپنے سروں کو بے خوف وخطر منڈوایا ہوگا، اور (کچھ نے) بال تراشے ہوں گے۔ اللہ وہ باتیں جانتا ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے ایک قریبی فتح طے کردی ہے۔ ﴿۲۷﴾ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دِین دے کر بھیجا ہے، تاکہ اُسے ہر دُوسرے دِین پر غالب کردے۔ اور (اس کی) گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے۔ ﴿۲۸﴾ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں، (اور) آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحم دِل ہیں۔ تم اُنہیں دیکھو گے کہ کبھی رُکوع میں ہیں، کبھی سجدے میں، (غرض) اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی علامتیں سجدے کے اثر سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ہیں اُن کے وہ اوصاف جو تورات میں مذکور ہیں۔ اور انجیل میں اُن کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اُس کو مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوگئی، پھر اپنے تنے پر اس طرح سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کاشتکار اُس سے خوش ہوتے ہیں، تاکہ اللہ ان (کی اس ترقی) سے کافروں کا دِل جلائے۔ یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور زبردست ثواب کا وعدہ کرلیا ہے۔ ﴿۲۹﴾

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو مطابق واقعہ کے ہے تم لوگ مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا کوئی بال کتراتا ہوگا تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا (چنانچہ سال آئندہ ایسا ہی ہوا، اور اس سال سے تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ) سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں (اور حکمتیں) معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں (اُن حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ) پھر اس (خواب کے واقع ہونے) سے پہلے تم کو ایک قریبی فتح (خیبر

کی) دے دی (تاکہ اُس سے مسلمانوں کو قوت اور سامان حاصل ہو جائے اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ عمرہ ادا کریں جیسا کہ ایسا ہی واقع ہوا)۔

وہ اللہ ایسا ہے کہ اُس نے اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اُس (دین) کو تمام دینوں پر غالب کردے (یہ غلبہ حجت و دلیل کے اعتبار سے تو دائمی اور ہمیشہ ہی رہے گا اور شوکت وسلطنت کے اعتبار سے بھی غلبہ رہے گا مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ اہلِ دین یعنی مسلمان باصلاحیت ہوں۔ جب یہ شرط نہیں ہوگی تو غلبۂ ظاہری کا وعدہ نہیں اور چونکہ صحابۂ کرام میں یہ شرط موجود تھی جیسا کہ اگلی آیات جو صحابہ کے متعلق آرہی ہیں ان میں اس صلاحیت کا ذکر ہے اس لئے اس آیت میں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی بشارت ہے ایسا ہی صحابۂ کرام کے لئے فتوحات کی بشارت ہے جیسا کہ مشاہدہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اسلام اور قرآن دُنیا کے گوشہ گوشہ میں فاتحانہ طور پر پہنچ گیا) اور (حمیت جاہلیت والے اگر آپ کے نام کے ساتھ رسول کا لفظ لکھنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ آپ کی رسالت پر) اللہ کافی گواہ ہے (جس نے آپ کی رسالت کو دلائلِ واضحہ اور کھلے ہوئے معجزات سے ثابت کردکھایا جس سے ثابت ہوگیا کہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں (اس جگہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا پورا جملہ لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حمیت جاہلیت والوں نے ان کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھنا گوارا نہ کیا تو کیا پرواہ ہے اللہ نے یہ کلمہ آپ کے نام کے ساتھ لکھ دیا جو قیامت تک پڑھا جائے گا، آگے آپ کے متبعین صحابہؓ کے فضائل و بشارات مذکور ہیں کہ) اور جو لوگ آپ کی صحبت پائے ہوئے ہیں (یہ لفظ تمام صحابۂ کرام کو شامل ہے خواہ اُن کی صحبت طویل میسر ہو یا قلیل اور جو صحابہ حدیبیہ میں آپ کے ساتھ تھے وہ اصالۃً اور خصوصاً اس کے مصداق ہیں، حاصل یہ ہے کہ سب صحابۂ کرام ان صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہیں کہ) وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں (اور) آپس میں مہربان ہیں (اور) اے مخاطب تو اُن کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی (یعنی ثواب اور قرب) کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اُن (کی عبدیت) کے آثار (اُن کے) سجدہ کی تاثیر سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں (مراد ان آثار سے خشوع و خضوع کے انوار ہیں جو مؤمن متقی کے چہرہ میں عموماً مشاہدہ کئے جاتے ہیں) یہ اُن کے اوصاف (مذکورہ) تورات میں ہیں اور انجیل میں اُن کا یہ وصف (مذکور) ہے کہ جیسے کھیتی کہ اُس نے (اول زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اُس نے (مٹی پانی ہوا وغیرہ سے غذا پاکر اپنی) اُس (سوئی) کو قوی کیا (یعنی یہ کھیتی قوی ہوگئی) پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ (اپنے ہرے بھرے ہونے سے) کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح صحابہ میں اول ضعف تھا پھر روزانہ قوت بڑھتی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو یہ نشو و نما اس لئے دیا) تاکہ اُن (کی اس حالت) سے کافروں کو (حسد میں) جلادے اور

(آخرت میں) اللہ نے اُن صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعات پر) اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

جب صلح حدیبیہ مکمل ہوگئی اور یہ بات طے ہوگئی کہ اس وقت بغیر دخولِ مکہ اور بغیر ادائے عمرہ کے واپس مدینہ جانا ہے اور صحابۂ کرام کا یہ عزمِ عمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بناء پر ہوا تھا جو ایک طرح کی وحی تھی۔ اب بظاہر اس کے خلاف ہوتا ہوا دیکھ کر بعض صحابۂ کرام کے دلوں میں خود یہ شکوک پیدا ہونے لگے کہ (معاذ اللہ) آپ کا خواب سچا نہ ہوا۔ دوسری طرف کفار و منافقین نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تمہارے رسول کا خواب صحیح نہ ہوا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الآیۃ۔ (رواہ البیہقی وغیرہ عن مجاهد) [1]

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لفظ صدق بمقابلہ کذب کے اقوال میں استعمال ہوتا ہے۔ جو قول واقعہ کے مطابق ہو اس کو صدق جو مطابق نہ ہو اس کو کذب کہا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ لفظ افعال کے لئے بھی بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کے معنی کسی فعل کو محقق اور ثابت کرنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ (الاحزاب: ۲۳) یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے معاہدہ کو پورا کر دکھایا اس وقت لفظ صدق کے دو مفعول ہوتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں لفظ صدق کا پہلا مفعول رسولہ اور دوسرا رؤیا ہے۔ اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول کو اپنے خواب میں سچا کر دکھایا (بیضاوی) [2] اور اگرچہ یہ سچا کر دکھانے کا واقعہ آگے آنے والا تھا مگر اس کو بلفظ ماضی تعبیر کر کے اس کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ کر دی چنانچہ آگے بلفظ مستقبل فرمایا گیا کہ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خواب میں دیکھا تھا کہ ہم مسجدِ حرام میں داخل ہوئے یہ ضرور ہو کر رہے گا مگر اس سال نہیں بلکہ اس سال کے بعد ہوگا۔ خواب میں اُس کا وقت معین نہیں تھا، صحابۂ کرام نے اپنے اشتیاق کی وجہ سے اسی سال عزمِ سفر کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی موافقت فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں تھیں جن کا ظہور صلح حدیبیہ کے وقت ہوا، جیسا کہ صدیقِ اکبرؓ نے اول ہی حضرت عمرؓ کے جواب میں فرمایا تھا کہ آپ کو شک میں نہیں پڑنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں کوئی وقت اور سال معین نہیں تھا اگر اس وقت نہیں تو پھر ہوگا۔ (قرطبی) [3]

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۸۹، ۲۹۰، ودلائل النبوۃ للبیہقی رقم الحدیث:۱۵۱۲

[2] تفسیر البیضاوی تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۲۰۸

[3] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۹۰

آئندہ ہونے والے کاموں کے لئے "اِن شاء اللہ" کہنے کی تاکید

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آئندہ ہونے والے داخلہ مسجد حرام کے ساتھ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کا لفظ استعمال فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ تو خود اپنی مشیت کے عالم ہیں ان کو اس کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے رسول اور سب بندوں کو تعلیم دینے کے لئے اس جگہ حق تعالیٰ نے بھی لفظ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ استعمال فرمایا۔ (قرطبی) [۱]

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ صحیح بخاری میں ہے کہ اگلے سال عمرہ قضاء میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک قینچی سے تراشے تھے۔ [۲] یہ واقعہ عمرہ قضاء ہی کا ہے کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آپ نے حلق فرمایا ہے۔ (قرطبی) [۳]

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا، یعنی اللہ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ اسی سال تمہیں دخول مسجدِ حرام اور عمرہ نصیب ہو جاتا مگر اگلے سال تک تاخیر کرنے میں بڑی مصالح تھیں جو اللہ کو معلوم تھیں تم ان کو نہ جانتے تھے۔ من جملہ ان مصالح کے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس سے پہلے خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کی قوت اور سامان میں اضافہ ہو جائے اور وہ فراغت واطمینان کے ساتھ عمرہ ادا کریں اسی لئے فرمایا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۞ - دُوْنِ ذٰلِكَ سے مراد دُوْنَ الرُّؤْيَا ہے یعنی اس خواب کے واقع ہونے سے پہلے خیبر کی فتح قریب مسلمانوں کو حاصل ہو جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس فتح قریب سے مراد خود صلح حدیبیہ ہے کہ وہ فتح مکہ اور دوسری تمام فتوحات کا مقدمہ تھی اور بعد میں تو سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو اعظم الفتوحات قرار دیا ہے تو اب مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس سال تمہارے عزم سفر اور پھر نا کام ہونے اور صلح ہونے میں جو حکمتیں اور مصالح تھیں وہ تمہارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ سب سے واقف تھا وہ چاہتا تھا کہ تم کو اس خواب کے واقعہ سے پہلے صلح حدیبیہ کے ذریعہ ایک فتح قریب نصیب فرمادے اسی فتح قریب کا یہ نتیجہ سب نے دیکھ لیا کہ صحابہ کرام جن کی تعداد سفر حدیبیہ میں ڈیڑھ ہزار سے زائد نہ تھی اس کے بعد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ (از قرطبی) [۴]

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ، سابقہ آیات میں جو فتوحات اور غنائم کے وعدے اور اہلِ حدیبیہ کے خصوصاً اور تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عموماً فضائل اور بشارتیں مذکور ہوئی ہیں، اب خاتمہ سورت میں ان مضامین کی تلخیص وتاکید ہے اور چونکہ یہ سب نعمتیں اور بشارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور تصدیق کی بنا پر ہوئیں، اس لئے اس تصدیق واطاعت کی مزید تاکید کے لئے نیز منکرینِ رسالتِ محمدیہ پر رَدّ کرنے کے لئے، اور صلح

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۹۰

[۲] راجح یہ ہے کہ موئے مبارک تراشنے کا یہ واقعہ عمرۂ جعرانہ میں پیش آیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم (فتویٰ تبویب دارالافتاء نمبر ۳/۳۱۱۲)

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۲۹۱

[۴] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

حدیبیہ کے وقت جو بعض مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اُن کے ازالے کے لئے ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اِثبات بلکہ تمام دُنیا کے دینوں پر آپ کے دِین کو غالب کرنے کی بشارت دی گئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ پورے قرآن میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لینے کے بجائے عموماً آپ کا ذکر اوصاف والقاب کے ساتھ کیا گیا، خصوصاً ندا کے موقع پر یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ، یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ بخلاف دُوسرے انبیاء کے کہ ان کے نام کے ساتھ ندا کی گئی، یٰاِبْرٰھِیْمُ، یٰمُوْسٰی، یٰعِیْسٰی۔ پورے قرآن میں صرف چار جگہ آپ کا نامِ مبارک محمد ذکر فرمایا ہے جہاں اس نام کے ذکر ہی میں کوئی مصلحت تھی۔ اس مقام پر مصلحت یہ تھی کہ حدیبیہ کے صلح نامہ میں آپ کے نام کے ساتھ جب حضرت علیؓ نے محمد رسول اللہ لکھا تو کفارِ قریش نے اس کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے پر اصرار کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ ربانی اس کو منظور کر لینا قبول کیا۔ حق تعالیٰ نے اس مقام پر خصوصیت سے آپ کے نامِ مبارک کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ قرآن میں لا کر اس کو دائمی بنا دیا جو قیامت تک اسی طرح پڑھا لکھا جائے گا۔

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ، یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل کا بیان ہے۔ اگرچہ اس کے پہلے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شریک تھے لیکن الفاظ کے عموم میں سبھی صحابۂ کرام شامل ہیں کیونکہ صحبت ومعیت سب کو حاصل ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف وفضائل اور خاص علامات

اس مقام پر حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کے دین کو سب دینوں پر غالب کرنے کا بیان فرما کر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف وفضائل اور خاص علامات کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس میں ان کے سخت امتحان کا انعام بھی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت لیا گیا تھا کہ اُن کے قلبی یقین اور قلبی جذبات کے خلاف صلح ہو کر بغیر دخولِ مکہ وغیرہ کے ناکام واپسی کے باوجود اُن کے قدم متزلزل نہیں ہوئے اور بے نظیر اطاعتِ رسول اور قوتِ ایمانی کا ثبوت دیا۔ نیز صحابۂ کرام کے فضائل اور علامات کی تفصیل بیان فرمانے میں یہ حکمت بھی ہو تو بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی ورسول تو مبعوث ہونے والا نہیں تھا آپ نے اپنے بعد اُمت کے لئے کتاب اللہ کے ساتھ اپنے اصحاب ہی کو بطورِ نمونہ کے چھوڑا ہے اور ان کی اقتداء واتباع کے اَحکام دیئے ہیں، اس لئے قرآن نے بھی ان کے کچھ فضائل اور علامات کا بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کے اتباع کی ترغیب وتاکید فرما دی ہے۔ اس مقام پر صحابۂ کرام کا سب سے پہلا وصف تو یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ کفار کے مقابلہ میں سخت ہونا اُن کا ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے کہ نسبی رشتے ناتے سب اسلام پر قربان کر دیئے اور حدیبیہ کے موقع پر خصوصیت سے اس کا اظہار

ہوا۔ اور آپس میں مہربان اور ایثار پیشہ ہونا صحابۂ کرام کا اس وقت خصوصیت سے ظاہر ہوا جبکہ مہاجرین و انصار میں مواخات ہوئی اور انصار نے اپنی سب چیزوں میں مہاجرین کو شریک کرنے کی دعوت دی۔ قرآن نے صحابۂ کرام کے اس وصف کو مقدم بیان فرمایا کیونکہ درحقیقت اس کا حاصل یہ ہے کہ اُن کی دوستی اور دشمنی، محبت یا عداوت کوئی چیز اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لئے ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایمانِ کامل کا اعلیٰ مقام ہے صحیح بخاری وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهٗ[1] یعنی جو شخص اپنی محبت اور بغض وعداوت دونوں کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ صحابۂ کرام کے کفار کے مقابلہ پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ ورسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں اُن کو اپنے رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہاں تک اُن کے ساتھ رحم وکرم کے معاملہ کا تعلق ہے وہ تو خود قرآن نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ (الی) اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ:۸)، یعنی جو کفار مسلمانوں کے درپئے آزار اور مقاتلہ پر نہیں اُن کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے بے شمار واقعات ہیں جن میں ضعیف ومجبور یا ضرورت مند کفار کے ساتھ احسان وکرم کے معاملات کئے گئے ہیں اور ان کے معاملہ میں عدل وانصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے۔ عین میدان کارزار میں بھی عدل وانصاف کے خلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

دُوسرا وصف: - صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُن کا عام حال یہ ہے کہ وہ رکوع وسجدہ اور نماز میں مشغول رہتے ہیں اُن کو دیکھنے والے اکثر ان کو اسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ پہلا وصف کمال ایمان کی علامت تھی دوسرا وصف کمال عمل کا بیان ہے کیونکہ اعمال میں سب سے افضل نماز ہے۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ یعنی نماز اُن کا ایسا وظیفۂ زندگی بن گیا ہے کہ نماز اور سجدہ کے مخصوص آثار اُن کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ مراد ان آثار سے وہ انوار ہیں جو عبدیت اور خشوع وخضوع سے ہر متقی عبادت گزار کے چہرہ پر مشاہدہ کئے جاتے ہیں، پیشانی میں جو نشان سجدہ کا پڑ جاتا ہے وہ مراد نہیں۔ خصوصاً نماز تہجد کا یہ اثر بہت زیادہ واضح ہوتا ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں بروایت جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مَنْ كَثُرَ صَلٰوتُهٗ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهٗ بِالنَّهَارِ[2] یعنی جو شخص رات میں نماز کی کثرت کرتا ہے دن میں اس کا چہرہ حسین پُرنور نظر آتا ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد نمازیوں کے

---

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب السنة، باب الدليل على الزيادة والنقصان، رقم الحديث: ۴۰۶۱، والمعجم الكبير للطبرانیؒ رقم الحديث: ۷۴۹۳

[2] سنن ابن ماجة، ابواب إقامة الصلاة والسُّنَّة فيها، ما جاء في قيام شهر رمضان، باب ما جاء في قيام اللّيل ج:۱ ص:۹۴، وشعب الإيمان للبيهقیؒ رقم الحديث: ۲۹۵۷

چہروں کا وہ نور ہے جو قیامت میں نمایاں ہوگا۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ صحابۂ کرام کی جو علامات اوپر بیان فرمائی ہے کہ سجدوں اور نمازوں کا نور ان کی پیشانیوں کی علامت ہے اس آیت میں فرمایا کہ اُن کی یہی مثال تورات میں بیان کی گئی ہے پھر فرمایا کہ انجیل میں اُن کی ایک اور مثال یہ دی گئی ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے کوئی کاشتکار زمین میں بیج اُگائے تو اوّل وہ ایک ضعیف سی سوئی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے پھر اس میں شاخیں نکلتی ہیں پھر وہ اور قوی ہوتا ہے پھر اس کا مضبوط تنہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شروع میں بہت کم تھے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا صرف تین مسلمان تھے مردوں میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر رفتہ رفتہ اُن کی قوت بڑھتی رہی یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب بتلائی گئی ہے۔ اس آیت میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف کیا جائے اور پچھلی مثال یعنی چہروں کا نور، یہ علامت تورات کے حوالہ سے بیان ہوئی آگے وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ پر وقف نہ کریں بلکہ ملا کر پڑھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ صحابہ کی مثال انجیل میں اُس کھیتی یا درخت کی ہے جو شروع میں نہایت کمزور ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ قوی تناور ہو جاتا ہے۔

دُوسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف نہ ہو بلکہ فِي الْإِنْجِيلِ پر وقف کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ سابقہ نشانی چہروں کے نور کی تورات میں بھی ہے انجیل میں بھی اور آگے كَزَرْعٍ کی مثال کو ایک الگ مثال قرار دیا جائے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر کلام ختم ہو نہ فِي الْإِنْجِيلِ پر اور لفظ ذٰلِكَ اگلی مثال کی طرف اشارہ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تورات وانجیل دونوں میں صحابہ کی مثال زَرْعٍ یعنی کھیتی کی دی گئی ہے۔ اگر اس زمانہ میں تورات وانجیل اپنی اصلی حالت میں ہوتیں تو ان کو دیکھ کر مراد قرآنی متعین ہو جاتی لیکن ان میں تحریفات کا سلسلہ بے حد و بے شمار رہا ہے اس لئے کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہو سکتا، مگر اکثر حضرات مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے جس میں پہلی مثال تورات میں اور دوسری انجیل میں ہونا معلوم ہے۔ امام بغویؒ نے فرمایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ مثال انجیل میں ہے کہ شروع میں قلیل ہوں گے پھر بڑھیں گے اور قوی ہوں گے جیسا کہ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ "ایک قوم ایسے نکلے گی جو کھیتی کی طرح بڑھے گی اور وہ نیک کاموں کا حکم اور بُرے کاموں سے منع کیا کرے گی (مظہری)"[1] موجودہ زمانہ کی تورات وانجیل میں بھی بے شمار تحریفات کے باوجود اس کی پیشین گوئی کے حسب ذیل الفاظ موجود ہیں۔ تورات باب استثناء ۱۲۳۔ ۱تا۳ کے یہ الفاظ ہیں:

[1] تفسير البغوی ج:۷ ص:۳۲۵، والمظہری ج:۹ ص:۳۶

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں تیری باتیں مانیں گے۔''

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فتح مکہ کے وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد دس ہزار تھی جو فاران سے طلوع ہونے والے اس نورانی پیکر کے ساتھ شہر خلیل میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی کے لفظ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مضمون سمجھا جاتا ہے اس کی پوری تفصیل مع دوسرے حوالوں کے اظہار الحق جلد سوم باب ششم ص:۲۵۶ میں ہے یہ کتاب عیسائیت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر کے مقابلہ پر تحریر فرمائی تھی اس کتاب میں انجیل کی تمثیل کا اس طرح ذکر ہے۔ انجیل متی باب ۱۳ آیت ۳۱ میں یہ الفاظ ہیں۔ اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ اور انجیل مرقس ۲۶:۴ کے یہ الفاظ ہیں جو الفاظِ قرآنی کے زیادہ قریب ہیں۔'' اس نے کہا کہ خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے پتی ہو پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (اظہار الحق جلد ۳) باب ششم ص:۳۱۰، آسمان کی بادشاہی سے مراد نبی آخر الزماں کا ہونا انجیل کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ یعنی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اُن صفاتِ کمال کے ساتھ مزین فرمایا اور ان کو ضعف کے بعد قوت، قلت کے بعد کثرت بخشی، یہ سب کام اس لئے ہوا تاکہ ان کو دیکھ کر کافروں کو غیظ ہو۔ اور وہ حسد کی آگ میں جلیں۔ حضرت ابوعروہ زبیریؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت امام مالکؒ کی مجلس میں حاضر تھے ایک شخص نے بعض صحابۂ کرام کی تنقیص کے کچھ کلمات کہے تو امام مالکؒ یہ آیت پوری تلاوت کر کے جب لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ پر پہنچے تو فرمایا کہ جس شخص کے دل میں صحابۂ کرام میں سے کسی کے ساتھ غیظ ہو تو اس آیت کی وعید اس کو ملے گی (قرطبی) [1] حضرت امام مالکؒ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ کافر ہو جائے گا مگر یہ فرمایا کہ یہ وعید اس کو بھی پہنچے گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں جیسا کام کرنے والا ہو جائے گا۔

---

[1] تفسير القرطبی ج:۱۶ ص:۲۹۷

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾، مِنْهُمْ کا حرف مِنْ اس جگہ باتفاق مفسرین بیانیہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سب صحابۂ کرام ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں۔ دُوسرے یہ کہ اُن سب سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ ہے اور یہ مِنْ بیانیہ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ [1] (الحج:۳۰) بیان ہے لفظ رِجس کا، اسی طرح یہاں مِنْهُمْ بیان ہے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا۔ اور روافض نے جو اس جگہ حرف من کو تبعیض کے لئے یہ کہہ کر مطلب نکالا ہے کہ ان میں سے جو بعض لوگ ایمان و عمل صالح پر ہیں اُن سے یہ وعدہ ہے یہ سراسر سیاقِ کلام اور اوپر کی آیات کے منافی ہے کیونکہ اس آیت کے مفہوم میں وہ صحابۂ کرام تو بلاشبہ داخل، اور آیت کے پہلے مصداق ہیں جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے ان سب کے متعلق اوپر کی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرمادیا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:۱۸) اور رضائے الٰہی کا یہ اعلان اس کی ضمانت ہے کہ یہ سب مرتے دم تک ایمان و عمل صالح پر قائم رہیں گے کیونکہ اللہ تو علیم و خبیر ہے اگر کسی کے متعلق اس کو یہ معلوم ہو کہ یہ کسی وقت ایمان سے پھر جانے والا ہے تو اُس سے اپنی رضا کا اعلان نہیں فرما سکتے۔ ابن عبدالبر نے مقدمہ استیعاب میں اسی آیت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ وَمَنْ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَمْ يَسْخَطْ عَلَيْهِ اَبَدًا [2] یعنی اللہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس پر کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی بناء پر ارشاد فرمایا کہ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی آگ میں نہ جائے گا تو یہ وعدہ جو اصالۃً انہی کے لئے کیا گیا ہے ان میں سے بعض کا مستثنیٰ ہونا قطعاً باطل ہے اسی لئے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ صحابۂ کرام سب کے سب عادل و ثقہ ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب اہلِ جنت ہیں، اُن کی خطائیں مغفور ہیں، اُن کی تنقیص گناہِ عظیم ہے

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کی تصریحات ہیں جن میں چند آیات تو اسی سورت میں آچکی ہیں لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ [3] (الفتح:۱۸) اور وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا [4] (الفتح:۲۶) ان کے علاوہ

---

[1] ترجمہ: تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے (بالکل) کنارہ کش رہو۔

[2] الاستیعاب ج:۱ ص:۲

[3] ترجمہ: بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا۔

[4] ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔

اور بہت سی آیات میں یہ مضمون مذکور ہے يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ [۱] (التحریم:۸)۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ [۲] (التوبۃ:۱۰۰) اور سورۂ حدید میں حق تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے بارے میں فرمایا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى [۳] (الحدید:۱۰) یعنی ان سب سے اللہ نے حُسنیٰ کا وعدہ کیا ہے پھر سورۂ انبیاء میں حُسنیٰ کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حُسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دُور رکھے جائیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔ (بخاری) [۴]

یعنی تمام زمانوں میں میرا زمانہ بہتر ہے اس کے بعد اُس زمانے کے لوگ بہتر ہیں جو میرے زمانے کے متصل ہیں پھر وہ جو ان کے متصل ہیں۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ (اُن کی قوتِ ایمان کی وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں اُحد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کر دے تو وہ اُن کے خرچ کئے ہوئے ایک مُد کی برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ نصف مُد کی برابر۔ مُد عرب کا ایک پیمانہ ہے جو تقریباً ہمارے آدھے سیر کی برابر ہوتا ہے (بخاری) [۵] اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کو سارے جہان میں سے پسند فرمایا ہے پھر میرے صحابہ میں میرے لئے چار کو پسند فرمایا ہے۔ ابوبکر عمر عثمان علی رضی اللہ عنہم (رواہ البزار بسند صحیح) [۶] اور ایک حدیث میں ارشاد ہے:

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِيْ وَمَنْ آذَانِيْ فَقَدْ آذَى اللّٰهَ وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ۔ (رواہ الترمذی عن عبداللہ بن مغفل از جمع الفوائد) [۷]

۱ ترجمہ: جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں ان کو رُسوا نہ کرے گا۔

۲ ترجمہ: اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

۳ ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔

۴ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۵۱۵

۵ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذاً خلیلاً ... إلخ ج:۱ ص:۵۱۶

۶ مجمع الزوائد بحوالہ مسند البزار، رقم الحدیث:۱۶۳۸۳، کتاب المناقب، باب ما جاء فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصہارہ

۷ جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فی من سب أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۲ ص:۲۲۵، ومسند احمد، حدیث عبداللہ بن مغفل، رقم الحدیث:۲۰۵۷۸

اللہ سے ڈرو! اللہ سے ڈرو! میرے صحابہ کے معاملے میں! میرے بعد ان کو طعن تشنیع کا نشانہ مت بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اُس نے مجھے ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذاء دی اُس نے اللہ کو ایذاء پہنچائی اور جو اللہ کو ایذاء پہنچانے کا قصد کرے تو قریب ہے کہ اللہ اس کو عذاب میں پکڑے گا۔

آیات واحادیث اس کے متعلق بہت ہیں جن کو احقر نے اپنی کتاب ''مقامِ صحابہ'' میں جمع کر دیا ہے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عدل وثقہ ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اور صحابۂ کرام کے مابین جو اختلافات جنگ وقتال تک پہنچے ان کے متعلق بحث وتمحیص اور تنقید وتحقیق یا سکوت کا مسئلہ بھی اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے اور اس میں سے بقدر ضرورت سورۂ محمد کی تفسیر میں آ چکا ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَان۔

تَمَّتْ بِحَمْدِ اللّٰہِ وَعَوْنِہٖ سُوْرَۃُ الْفَتْحِ لِلتَّاسِعِ وَالْعِشْرِیْنَ
مِنْ شَعْبَانَ ۱۳۹۲ھ لِلّٰہِ الْحَمْدُ اَوَّلُہٗ وَآخِرُہٗ

سُورَةُ الحُجُرٰت

آیاتھا ۱۸　　۴۹ سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۶　　رکوعاتھا ۲

سورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ

اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور ڈرتے رہو اللہ سے،

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ

اللہ سنتا ہے جانتا ہے اے ایمان والو بلند نہ کرو اپنی آوازیں

فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے پر

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِيْنَ

کہیں اکارت نہ ہوجائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو، جو لوگ

يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ کے پاس وہی ہیں جن کے دِلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے

لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ

ادب کے واسطے اُن کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا جو لوگ پکارتے ہیں تجھ کو

مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى

دیوار کے پیچھے سے وہ اکثر عقل نہیں رکھتے اور اگر وہ صبر کرتے جب تک

تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

تُو نکلتا ان کی طرف تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سب کچھ سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔ ۝۱ اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ اُن سے بات کرتے ہوئے اس طرح زور سے بولا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہوجائیں، اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔ ۝۲ یقین جانو جو لوگ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جن کے دِلوں کو اللہ نے خوب جانچ کر تقویٰ کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ اُن کو مغفرت بھی حاصل ہے، اور زبردست اَجر بھی۔ ۝۳ (اے پیغمبر!) جو لوگ تمہیں حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں، اُن میں سے اکثر کو عقل نہیں

ہے۔ ④ اور اگر یہ لوگ اُس وقت تک صبر کرتے جب تک تم خود باہر نکل کر ان کے پاس آ جاتے، تو ان کے لئے بہتر ہوتا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ⑤

خلاصۂ تفسیر

ربط سورت و شانِ نزول

اس سے پہلی دو سورتوں میں جہاد کے اَحکام تھے جس سے اصلاح عالم و آفاق مقصود ہے۔ اس سورت میں اصلاحِ نفس کے اَحکام و آداب مذکور ہیں، خصوصاً وہ اَحکام جو آدابِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں اور قصہ ان آیتوں کے نزول کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ بات زیر غور تھی کہ اس قبیلہ پر حاکم کس کو بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قعقاع ابن معبد کی نسبت رائے دی اور حضرت عمرؓ نے اقرع بن حابس کے متعلق رائے دی، اس معاملہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین آپ کی مجلس میں گفتگو ہوگئی اور گفتگو بڑھ کر دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (رواہ البخاری) [1]

اے ایمان والو! اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو (یعنی جب تک قرائن قویہ سے یا بالتصریح گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو۔ جیسا کہ واقعہ مذکورہ جو سبب نزول ان آیات کا ہوا اُس میں انتظار کرنا چاہئے تھا کہ یا تو آپ خود کچھ فرماتے یا آپ حاضرین مجلس سے پوچھتے بدون انتظار کے ازخود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا کیونکہ گفتگو کا جواز اذنِ شرعی پر موقوف تھا خواہ یہ اذن قطعی ہو یعنی صریح طور پر یا ظنی قرائن قویہ کے ذریعہ۔ غلطی یہ ہوئی انتظار نہیں کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی) اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو) سننے والا (اور تمہارے افعال کو) جاننے والا ہے (اور) اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ اُن سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو (یعنی نہ بلند آواز سے بولو جبکہ آپ کے سامنے آپس میں کوئی بات کرنا ہو اور نہ برابر کی آواز سے بولو جبکہ خود آپ سے خطاب کرنا ہو) کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز کا بلند کرنا جو صورۃً بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں یہ ایک قسم کی گستاخی ہے اپنے تابع اور خادم سے اس طرح کی گفتگو ناگوار اور ایذا دہ ہوسکتی ہے اور اللہ کے رسول کو ایذا

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الحجرات، باب لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ الآیۃ ج:۲ ص:۷۱۸

پہنچانا تمام اعمالِ خیر کو برباد کردینے والا ہے۔ البتہ بعض اوقات جبکہ طبیعت میں زیادہ انبساط ہو یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اس وقت عدم ایذاء رسول کی وجہ سے یہ گفتگو حبطِ اعمال کا موجب نہیں ہوگی، لیکن متکلم کو یہ معلوم کرنا کہ اس وقت ہماری ایسی گفتگو ناگوار خاطر اور موجب ایذا نہیں ہوگی آسان نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ متکلم تو یہ سمجھ کر کلام کرے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہیں ہوگی مگر واقع میں اس سے ایذاء پہنچ جائے تو گفتگو اس کے اعمال کو حبط اور برباد کردے گی اگرچہ اس کو گمان بھی نہ ہوگا کہ میری اس گفتگو سے مجھے کتنا بڑا خسارہ ہوگیا، اس لئے آواز بلند کرنے اور جہر بالقول کو مطلقاً ممنوع کردیا گیا کیونکہ ایسی گفتگو کے بعض افراد اگرچہ موجب ایذاء وحبط اعمال نہیں ہوں گے مگر اس کی تعیین کیسے ہوگی اس لئے مطلقاً جہر بالقول کے تمام افراد کو ترک کردینا چاہئے یہاں تک تو آواز بلند کرنے سے ڈرایا گیا ہے آگے آواز پست کرنے کی ترغیب ہے)۔

بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کردیا ہے (یعنی اُن کے قلوب میں تقویٰ کے خلاف کوئی چیز آتی ہی نہیں، مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ حضرات کمالِ تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ ترمذی کی حدیث مرفوع میں کمال تقویٰ کا بیان ان الفاظ میں آیا ہے لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَأْسٌ، [1] یعنی بندہ کمالِ تقویٰ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کچھ ایسی چیزوں کو بھی جن میں کوئی گناہ نہیں اس احتیاط کی بناء پر چھوڑ دے کہ یہ جائز کام کہیں مجھے کسی ناجائز کام میں مبتلا نہ کردے۔ مراد وہ مشتبہ امور ہیں جن میں گناہ کا خطرہ اور شبہ ہو۔ جیسا کہ آواز بلند کرنے کی ایک فرد ایسی ہے جس میں گناہ نہیں، یعنی وہ جس میں مخاطب کو ایذا نہ ہو۔ اور ایک فرد وہ ہے جس میں گناہ ہے یعنی جس سے ایذا پہنچے، تو کمالِ تقویٰ اس میں ہے کہ آدمی مطلقاً آواز بلند کرنے کو چھوڑ دے، آگے ان کے عمل کے اُخروی فائدہ کا بیان ہے) اُن لوگوں کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ اور اگلی آیتوں کا قصہ یہ ہے کہ وہی بنوتمیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ باہر تشریف فرما نہ تھے بلکہ ازواجِ مطہرات کے حجرات میں سے کسی مکان میں تھے۔ یہ لوگ غیر مہذّب گاؤں والے تھے باہر ہی سے کھڑے ہوکر آپ کا نام لے کر پکارنے لگے کہ يَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ اِلَيْنَا، یعنی اے محمد ہمارے لئے باہر آیئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (كذا في الدر المنثور برواية ابن اسحاق عن ابن عباسؓ) [2] جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں اُن میں اکثروں کو عقل نہیں ہے (کہ عقل ہوتی تو آپ کا ادب کرتے اس طرح نام لے کر باہر سے پکارنے کی جرأت نہ کرتے۔ اور اَكْثَرُهُمْ فرمانے کی

[1] جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ما جاء في صفة اواني الحوض ج:۲ ص:۷۱

[2] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۹ ص:۲۴۵

وجہ یا تو یہ ہے کہ بعض پکارنے والے فی نفسہٖ جری نہ ہوں گے، دوسروں کے ساتھ دیکھا دیکھی لگ گئے اس طرح اُن سے بھی یہ غلطی ہوگئی اور یا اگرچہ سب ایک ہی طرح کے ہوں مگر اَكْثَرُهُمْ کا لفظ فرمانے سے کسی کو اشتعال نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرسکتا ہے کہ شاید مجھ کو کہنا مقصود نہ ہو۔ وعظ ونصیحت کا یہی طریقہ ہے کہ ایسے کلمات سے احتیاط کی جائے جن سے مخاطب کو اشتعال پیدا ہو) اور اگر یہ لوگ (ذرا) صبر (اور انتظار) کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معاف ہوجائے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کے نزول کے متعلق روایات حدیث میں بقول قرطبی [1] چھ واقعات منقول ہیں، اور قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ سب واقعات صحیح ہیں کیونکہ وہ سب واقعات مفہوم آیات کے عموم میں داخل ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بروایت بخاری ذکر کیا گیا ہے۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، بَيْنَ الْيَدَيْنِ کے اصل معنی دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں مراد اس سے سامنے کی جہت ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقدّم اور پیش قدمی نہ کرو۔ کس چیز میں پیش قدمی کو منع فرمایا ہے قرآن کریم نے اس کو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ کسی قول یا فعل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش قدمی نہ کرو بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیتے ہیں، ہاں آپ ہی کسی کو جواب کے لئے مامور فرمادیں تو وہ جواب دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ بڑھے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے مگر یہ کہ آپ کی تصریح یا قرائن قویہ سے یہ ثابت ہوجائے کہ آپ خود ہی کسی کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

علمائے دین اور دینی مقتداؤں کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئے

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء ومشائخِ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارثِ انبیاء ہیں اور دلیل اس کی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے

[1] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۶ ص:۳۰۰،۳۰۱

چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دُنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دُنیا میں آفتاب کا طلوع و غروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر سے بہتر و افضل ہو (روح البیان از کشف الاسرار)[۱] اس لئے علماء نے فرمایا کہ اپنے اُستاد اور مرشد کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ، یہ دُوسرا ادب مجلسِ نبوی کا بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا کیا کرتے ہیں ایک قسم کی بے ادبی گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال ہوگیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو۔ (دُرِ منثور عن البیہقی)[۲] اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا۔ (کذا فی الصحاح)[۳] اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سن کر وہ بہت ڈرے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا۔ (بیان القرآن از دُرِّ منثور)[۴]

روضۂ اقدس کے سامنے بھی بہت بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ممنوع ہے

قاضی ابوبکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے بھی زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح جس مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی یا بیان کی جارہی ہوں اُس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے کیونکہ آپ کا کلام جس وقت آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اس وقت سب کے لئے خاموش ہو کر اس کا سننا واجب و ضروری تھا اسی طرح بعد وفات جس مجلس میں آپ کا کلام سنایا جاتا ہو وہاں شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔[۵]

مسئلہ:- جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارثِ انبیاء ہونے کے داخل ہیں، اسی

---

۱ روح البیان المعروف بتفسیر حقی تحت هذه الآیة ج:۱۴ ص:۴۸، وكنز العمال رقم الحدیث:۳۲۶۲۲

۲ الدر المنثور ج:۹ ص:۲۴۰، ومسند البزار، مسند ابی بکر الصدیق (رضی الله تعالٰی عنه) رقم الحدیث:۵۶

۳ جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة الحجرات ج:۲ ص:۱۶۲، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة الحجرات، باب لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ الآیة، ج:۲ ص:۷۱۸

۴ الدر المنثور ج:۹ ص:۲۴۲، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب مخافة المؤمن أن یحبط ...إلخ (بألفاظ مختلفة ومفصلة) ج:۱ ص:۷۵

۵ احکام القرآن لابن العربیؒ تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۴۶

طرح رفعِ صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے اُن کی آواز دَب جائے۔(قرطبی) [1]

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ لفظ اَنْ تَحْبَطَ مفعول لہ ہے لَا تَرْفَعُوْٓا کا، جس میں حکم کی علت بتلائی گئی ہے۔ بحذف مصدر یعنی خشیۃ ان تحبط معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو بسبب اس خطرہ اور خوف کے کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلّمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ حبط اعمال یعنی اعمالِ صالحہ کو ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہلِ سنت والجماعت صرف کفر ہے۔ کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمالِ صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مؤمنین اور صحابۂ کرام کو ہے اور لفظ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر نہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبط اعمال کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے مؤمن نہیں ہوتا اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ یعنی تمہیں خبر بھی نہ ہو تو حبطِ اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی۔

سیّدی حضرت حکیم الامۃؒ نے بیان القرآن میں اس کی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ سب اشکالات وسوالات ختم ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو تم رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو، کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں، اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسول سے پیش قدمی یا اُن کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول کا۔ اگرچہ صحابۂ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذاء کا سبب بنے لیکن بعض اعمال وافعال جیسے تقدّم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذاء نہ ہوں پھر بھی اُن سے ایذاء کا احتمال ہے اسی لئے اُن کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبط اعمال کا، کسی اپنے دینی مقتداء استاد یا مرشد کی ایذاء رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھہریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہو جائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچا دے جس سے تمام اعمالِ صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں اور کرنے

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۳۰۷

والے نے چونکہ قصد ایذاء کا نہ کیا تھا اس لئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلاء کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہو اس کے ساتھ گستاخی و بے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلبِ توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاعِ ایمان کو بھی ضائع کر دیتی ہے،[۱] نعوذ باللہ منہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تیسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوار پن کے ساتھ کہ نام لے کر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے عقل والوں کے یہ کام نہیں۔ حجرات، حجرہ کی جمع ہے اصل لغت میں حجرہ ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقّف عمارت ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات مدینہ طیبہ میں نو تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک حجرہ الگ الگ تھا جن میں آپ باری باری تشریف فرما ہوتے تھے۔

حجراتِ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن

ابنِ سعد نے بروایت عطا خراسانی لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں سے بنے ہوئے تھے اور اُن کے دروازوں پر موٹے سیاہ اُون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔[۲] امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے، میرا گمان یہ ہے کہ حجرے کے دروازے سے مسقّف بیت تک چھ سات ہاتھ ہوگا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اُونچائی سات آٹھ ہاتھ ہوگی۔[۳] یہ حجراتِ اُمہات المؤمنین ولید بن عبدالملک کی حکومت میں اُن کے حکم سے مسجدِ نبوی میں شامل کر دیئے گئے۔ مدینہ میں اُس روز لوگوں پر گریہ و بکا طاری تھی۔[۴]

سببِ نزول امام بغوی نے بروایت قتادہؓ ذِکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جن کا ذکر اُوپر آیا ہے۔ یہ دو پہر کے وقت مدینہ میں پہنچے جبکہ آپ کسی حجرے میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ

---

[۱] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۴۱

[۲] الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ، ذکر بیوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحجر ازواجہ ج:۱ ص:۴۹۹

[۳] شعب الإیمان للبیہقیؒ رقم الحدیث:۱۰۳۲۹، والأدب المفرد للبخاریؒ رقم الحدیث:۴۶۵، ج:۲ ص:۱۷۹

[۴] الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ ج:۱ ص:۴۹۹

لوگ اَعراب آدابِ معاشرت سے ناواقف تھے، اُنہوں نے حجرات کے باہر ہی سے پکارنا شروع کر دیا، اُخْرُجْ اِلَيْنَا يَا مُحَمَّدُ۔ [۱] اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس طرح پکارنے کی ممانعت اور انتظار کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسند احمد، ترمذی وغیرہ میں بھی یہ روایت مختلف الفاظ سے آئی ہے۔ (مظہری) [۲]

تنبیہ

صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے علماء ومشائخ کے ساتھ بھی اسی ادب کا استعمال کیا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب میں کسی عالم صحابی سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو ان کے مکان پر پہنچ کر ان کو آواز، یا دروازے پر دستک دینے سے پرہیز کرتا، اور دروازے کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لائیں گے اس وقت اُن سے دریافت کروں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی! آپ نے دروازے پر دستک دے کر کیوں نہ اطلاع کر دی؟ تو ابن عباس نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اُن کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازے پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اس کا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لائیں گے اس وقت ملاقات کروں گا۔ (روح المعانی) [۳]

مسئلہ:- آیت مذکورہ میں حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ میں اِلَيْهِمْ کی قید بڑھانے سے یہ ثابت ہوا کہ صبر وانتظار اس وقت تک کرنا ہے جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے ملاقات وگفتگو کے لئے باہر تشریف لائیں، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا باہر تشریف لانا کسی دُوسری ضرورت سے ہو، اس وقت بھی آپ سے اپنے مطلب کی بات کرنا مناسب نہیں، بلکہ اس کا انتظار کریں کہ جب آپ اُن کی طرف متوجہ ہوں، اس وقت بات کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا

اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی گناہگار خبر لے کر تو تحقیق کرلو کہیں جا نہ پڑو

---

[۱] ترجمہ: ہماری طرف نکلئے یا محمد!

[۲] تفسیر المظھری ج:۹ ص:۴۳، والدر المنثور ج:۹ ص:۲۴۴، ومسند احمد رقم الحدیث:۲۷۲۰۳، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورة الحجرات ج:۲ ص:۱۶۲

[۳] روح المعانی ج:۱۹ ص:۲۶۳، (تحت هذه الآیة)

قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ ۝٦

کسی قوم پر نادانی سے پھر کل کو اپنے کئے پر لگو پچھتانے

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو، اور پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔ ۝٦

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جس میں کسی کی شکایت ہو) تو (بدون تحقیق کے اس پر عمل نہ کیا کرو بلکہ اگر عمل کرنا مقصود ہو تو) خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول

اس آیت کے نزول کا واقعہ ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد یہ نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار بن ابی ضرار جن کی صاحبزادی حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا، امہات المؤمنین میں سے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، میں نے اسلام کو قبول کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ اب میں اپنی قوم میں جا کر ان کو بھی اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے میں اُن کی زکوٰۃ جمع کر لوں گا۔ اور آپ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیج دیں تا کہ جو رقم زکوٰۃ کی میرے پاس جمع ہو جائے اس کو سپرد کر دوں، پھر جب حارث نے حسبِ وعدہ ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کر لی اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے

لئے طے ہوئی تھی گزر گئی اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حارث کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حارث نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ ادھر واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر ولید بن عقبہؓ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیج دیا تھا مگر ولید بن عقبہ کو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلہ کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے قتل کر ڈالیں اس خوف کے سبب وہ راستہ ہی سے واپس ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر یہ کہا کہ اُن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک دستہ مجاہدین کا روانہ کیا، ادھر یہ دستہ مجاہدین کا روانہ ہوا ادھر سے حارث مع اپنے ساتھیوں کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلے، مدینہ کے قریب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حارث نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ حارث نے سبب پوچھا تو ان کو واقعہ ولید بن عقبہ کے بھیجنے کا اور ان کی واپسی کا بتلایا گیا اور یہ کہ ولید بن عقبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حارث نے یہ سن کر کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بنا کر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ اس کے بعد حارث جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حارث نے کہا کہ ہرگز نہیں، قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو پیغامِ حق دے کر بھیجا ہے نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے ان کو دیکھا۔ پھر جب مقررہ وقت پر آپ کا قاصد نہ پہنچا تو مجھے خطرہ ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا جس پر حضور ناراض ہوئے اس لئے میں حاضرِ خدمت ہوا۔ حارثؓ فرماتے ہیں کہ اس پر سورۂ حجرات کی آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر) [1]

اور بعض روایات میں ہے کہ ولید بن عقبہؓ حسب الحکم بنی المصطلق میں پہنچے، اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد آئے گا یہ تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہؓ کو شبہ ہو گیا کہ یہ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں یہیں سے واپس ہو گئے اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۷ ص:۳۷۱، ومسند احمد رقم الحديث: ۱۸۴۵۹، حديث الحارث بن ضرار۔

اپنے گمان کے مطابق یہ عرض کردیا کہ وہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار نہیں، بلکہ میرے قتل کے دَرپے ہوئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی کہ خوب تحقیق کرلیں اس کے بعد کوئی اقدام کریں۔ خالد بن ولیدؓ نے بستی سے باہر رات کو پہنچ کر قیام کیا اور تحقیقِ حال کے لئے چند آدمی بطور جاسوس کے خفیہ بھیج دیئے۔ ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام و ایمان پر قائم، نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں اور کوئی بات خلافِ اسلام نہیں پائی گئی، خالد بن ولیدؓ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یہ ابن کثیر کی متعدد روایات کا خلاصہ ہے)۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شریر فاسق آدمی اگر کسی شخص یا قوم کی شکایت کرے اُن پر کوئی الزام لگائے تو اس کی خبر یا شہادت پر بغیر مکمل تحقیق کے عمل کرنا جائز نہیں۔

آیت سے متعلقہ اَحکام و مسائل

امام جصاصؒ نے احکام القرآن [1] میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کرکے اس کا صدق ثابت نہ ہوجائے، کیونکہ اس آیت میں ایک قراءت تو فَتَثَبَّتُوْا کی ہے جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو بلکہ ثابت قدم رہو جب تک دوسرے ذرائع سے اس کا صدق ثابت نہ ہوجائے۔ اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا تو شہادت کو قبول کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا کیونکہ ہر شہادت ایک خبر ہوتی ہے جو حلف و قسم کے ساتھ موکد کی جاتی ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت شرعاً مقبول نہیں۔ البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آیت قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے یعنی اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ۔ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے اس کی مزید تفصیل کتبِ فقہ معین الحکام وغیرہ میں ہے اور احقر نے احکام القرآن عربی حزب سادس میں اس کی تفصیل لکھ دی ہے اہلِ علم اس میں دیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] احکام القرآن للجصّاص تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۳۳۴

ایک اہم سوال وجواب متعلقہ عدالتِ صحابہ

اس آیت کا ولید بن عقبہؓ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے اور آیت میں اُن کو فاسق کہا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی فاسق بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ اُس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کے خلاف ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ، یعنی صحابۂ کرام سب کے سب ثقہ ہیں ان کی کسی خبر وشہادت پر کوئی گرفت نہیں کی جاسکتی۔ علامہ آلوسی نے رُوح المعانی[1] میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں اُن سے گناہِ کبیرہ بھی سرزد ہوسکتا ہے جو فسق ہے اور اُس گناہ کے وقت اُن کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو ان کی خبر وشہادت رد کردی جائے گی لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعت کا نصوصِ قرآن وسنت کی بناء پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہوسکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کرکے پاک نہ ہوگیا ہو۔ قرآنِ کریم نے علی الاطلاق اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرمادیا ہے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ الآیۃ[2] (التوبۃ: ۱۰۰)، اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی، جیسا کہ قاضی ابویعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ اُن کی وفات موجباتِ رضا پر ہوگی۔ (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)[3]

خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گنے چنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو اُن کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ نے اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایسا بنادیا تھا کہ شریعت اُن کی طبیعت بن گئی تھی۔ خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ ونادر تھا اُن کے اعمال صالحہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اس کے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی۔ ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل وکمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہوجانا اس کو خود ہی کالعدم کردیتا ہے۔ دُوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت اُن کا خوف وخشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کردینا کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ روایاتِ حدیث میں معروف ومشہور ہیں

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج: ۱۹ ص: ۲۶۷

[2] ترجمہ: اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔

[3] الصارم المسلول ج: ۱ ص: ۳۱۲

اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے حسب ارشاد قرآن اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (ہود: ۱۱۴) خصوصاً جبکہ اُن کے حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابوداؤد و ترمذی نے حضرت سعید بن زید سے نقل کیا ہے کہ وَاللہِ لَمَشْهَدُ رَجُلٍ مِّنْهُمْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَغْبَرُّ فِیْهِ وَجْهُهٗ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِ اَحَدِکُمْ وَلَوْ عُمِّرَ عُمُرَ نُوْحٍ، [۱] یعنی خدا کی قسم ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں اُن کے چہرہ پر غبار پڑ گیا ہو تمہاری عمر بھر کی طاعت وعبادت سے افضل ہے اگر چہ اس کو عمر نوح علیہ السلام دے دی گئی ہو۔ اس لئے ان سے صدور گناہ کے وقت اگر چہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لئے مقرر تھا مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے، اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہوا اور اس وقت ان کو فاسق کہا بھی گیا تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو ان کے لئے مستمر سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے۔ (کذا فی الروح) [۲]

اور آیتِ مذکورہ میں تو قطعاً یہ ضروری نہیں کہ ولید بن عقبہ کو فاسق کہا گیا ہو سببِ نزول خواہ اُن کا معاملہ ہی سہی مگر لفظ فاسق اُن کے لئے استعمال کیا گیا یہ ضرور نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو ولید بن عقبہ سے کوئی ایسا کام نہ ہوا تھا جس کے سبب ان کو فاسق کہا جائے اور اس واقعہ میں بھی جو انہوں نے بنی المصطلق کے لوگوں کی طرف ایک بات غلط منسوب کی وہ بھی اپنے خیال کے مطابق صحیح سمجھ کر کی اگر چہ واقع میں غلط تھی اس لئے آیت مذکورہ کا مطلب بے تکلف وہ بن سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اوپر گزر را ہے کہ اس آیت نے قاعدہ کلیہ فاسق کی خبر کے نامقبول ہونے کے متعلق بیان کیا ہے اور واقعہ مذکورہ پر اس آیت کے نزول سے اس کی مزید تاکید اس طرح ہوگئی کہ ولید بن عقبہ اگر چہ فاسق نہ تھے مگر ان کی خبر قرائن قویہ کے اعتبار سے ناقابلِ قبول نظر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کی خبر پر کسی اقدام سے گریز کر کے خالد بن ولید کو تحقیقات پر مامور فرما دیا تو جب ایک ثقہ اور صالح آدمی کی خبر میں قرائن کی بناء پر شبہ ہو جانے کا معاملہ یہ ہے کہ اس پر قبل از تحقیق عمل نہیں کیا گیا تو فاسق کی خبر کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اور زیادہ واضح ہے۔ عدالتِ صحابہ کی مکمل بحث احقر نے اپنی کتاب مقامِ صحابہ میں بیان کر دی جو شائع ہو چکی ہے اور اس کا کچھ حصہ اگلی آیت وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الآیة [۳] (الحجرات: ۹) کے تحت بھی آجائے گا۔

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب السُّنَّة، باب فی الخلفاء ج: ۲ ص: ۶۳۹

[۲] روح المعانی ج: ۱۹ ص: ۲۶۷

[۳] ترجمہ: اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ

اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا اگر وہ تمہاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں تو تم پر مشکل پڑے

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ

پر اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دل میں ایمان کی اور کُھبا دیا اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی

اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝۷

تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی، وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر۔

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۸

اللہ کے فضل سے اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں جن میں وہ اگر تمہاری بات مان لیں تو خود تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہارے دِل میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے، اور اُسے تمہارے دِلوں میں پُرکشش بنادیا ہے، اور تمہارے اندر کفر کی اور گناہوں اور نافرمانی کی نفرت بٹھادی ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آچکے ہیں، (۷) جو اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کا نتیجہ ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۸)

خلاصۂ تفسیر

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما) ہیں (جو خدا کی بڑی نعمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ الخ [1] (آل عمران: ۱۶۴)) اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ کسی بات میں تم آپ کے خلاف مت کرو گو دُنیوی ہی

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

کیوں نہ ہو اور اس فکر میں مت پڑو کہ اُمور دنیویہ میں خود حضور ہماری رائے کی موافقت فرمایا کریں کیونکہ) بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ اُس میں تمہارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے (کیونکہ وہ مصلحت کے خلاف ہو تو ضرور اس کے موافق عمل کرنے میں مضرّت ہو بخلاف اس کے کہ آپ کی رائے پر عمل کیا جائے کیونکہ امر دُنیوی ہونے کے باوجود اس میں خلاف مصلحت ہونے کا احتمال گو فی نفسہٖ مستبعد اور خلاف شان نبوّت نہیں لیکن اوّل تو ایسے امور جن میں ایسا احتمال ہو شاذ و نادر ہوں گے پھر اگر ہوں بھی اور اُن میں مصلحت فوت ہو بھی جائے تو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس مصلحت کا نعم البدل یعنی اجر و ثواب اطاعتِ رسول کا ضرور ہی میسر ہوگا بخلاف اس کے تمہاری رائے پر عمل ہو کہ گو شاذ و نادر ایسے اُمور بھی نکلیں گے جن میں مصلحت تمہاری رائے کے موافق ہو لیکن متعین تو ہیں نہیں اور پھر بہت ہی کم ہوں گے زیادہ احتمال مضرت ہی کا ہے پھر اس مضرت کا کوئی تدارک نہیں اور اس تقریر سے فائدہ کثیر کی قید کا بھی معلوم ہوگیا، بہرحال اگر آپ تم لوگوں کی موافقت کرتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ نے (تم کو مصیبت سے بچالیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق (یعنی گناہِ کبیرہ) اور (مطلق) عصیان (یعنی گناہِ صغیرہ) سے تم کو نفرت دے دی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسول کی جستجو رہتی ہے اور جس سے تم اُن اَحکام کو مان لیتے ہو جو رضائے رسول کے موجبات ہیں چنانچہ جب تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُمور دنیویہ میں بھی اطاعت رسول کی واجب ہے اور بدون اطاعت مطلقہ کے ایمان کامل نہیں ہوتا اور ایمان کامل کی تحصیل کی رغبت پہلے سے موجود ہے پس تم نے فوراً اُس حکم کو بھی قبول کرلیا اور قبول کر کے ایمان کی اور تکمیل کر لی) ایسے لوگ (جو کہ تکمیلِ ایمان کے محبّ ہیں) خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہِ راست پر ہیں اور اللہ تعالیٰ (نے جو یہ اَحکام فرمائے ہیں تو وہ ان کی مصلحتوں کو) جاننے والا (ہے اور چونکہ) حکمت والا ہے (اس لئے ان اَحکام کو واجب کر دیا ہے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں واقعہ حضرت ولید بن عقبہ اور قبیلہ بنی المصطلق کا مذکور تھا جس میں ولید بن عقبہ نے بنی المصطلق کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ مرتد ہوگئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اشتعال پیدا ہوا، ان کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں پر جہاد کے لئے مجاہدین کو بھیج دیا جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کی خبر کو قرائنِ قویہ کے خلاف سمجھ کر قبول نہ کیا اور تحقیقات کے لئے حضرت خالد بن ولید کو مامور فرما دیا۔ پچھلی آیت میں قرآن کریم نے اس کو قانون بنا دیا کہ جس شخص کی خبر میں قرائن قویہ سے کوئی شبہ ہو جائے تو قبل از تحقیق اُس پر عمل

جائز نہیں۔اس آیت میں صحابۂ کرام کو ایک اور ہدایت کی گئی ہے کہ اگرچہ بنی المصطلق کے متعلق خبر ارتداد سن کر تمہارا جوش غیرتِ دینی کے سبب تھا مگر تمہاری رائے صحیح نہ تھی۔ اللہ کے رسول نے جو صورت اختیار کی وہ ہی بہتر تھی۔ [۱] مقصد یہ ہے کہ مشورہ طلب امور میں کوئی رائے دے دینا تو درست ہے لیکن یہ کوشش کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے کے مطابق ہی عمل کریں یہ درست نہیں کیونکہ اُمورِ دُنیویہ میں اگرچہ شاذ ونادر رسول کی رائے خلاف مصلحت ہونے کا امکان ضرور ہے جو شانِ نبوّت کے خلاف نہیں لیکن حق تعالیٰ نے جو فراست اور دانش اپنے رسول کو عنایت فرمائی ہے وہ تمہیں حاصل نہیں ہے اس لئے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے پر چلا کریں تو بہت سے معاملات میں نقصان ومصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ اور کہیں شاذ ونادر تمہاری رائے ہی میں مصلحت ہو اور تم اطاعتِ رسول کے لئے اپنی رائے کو چھوڑ دو جس سے تمہیں کچھ دُنیوی نقصان بھی پہنچ جائے تو اس میں اتنی مضرت نہیں جتنی تمہاری رائے کے تابع ہو کر چلنے میں ہے کیونکہ اس صورت میں اگر کچھ دُنیوی نقصان ہو بھی گیا تو اطاعتِ رسول کا اجر وثواب اس کا بہتر بدل موجود ہے اور لفظ عَنِتُّمْ، عَنَت سے مشتق ہے جس کے معنی گناہ کے بھی آتے ہیں اور کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے بھی یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ (قرطبی) [۲]

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ

اور اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرادو پھر اگر چڑھا چلا جائے

اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ

ایک اُن میں سے دُوسرے پر تو تم سب لڑو اُس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ پھر آئے اللہ کے حکم پر

فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

پھر اگر پھر آیا تو ملاپ کرادو اُن میں برابر اور انصاف کرو بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۴۷

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۶ ص:۳۱۴

الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٩﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ

انصاف والے۔ مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں سو ملاپ کرادو اپنے دو بھائیوں میں

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾ ع

ع ۱۴

اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم پر رحم ہو

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ دُوسرے کے ساتھ زیادتی کرے تو اُس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ چنانچہ اگر وہ لوٹ آئے، تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو، اور (ہر معاملے میں) انصاف سے کام لیا کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ﴿٩﴾ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان تعلقات اچھے بناؤ، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے۔ ﴿١٠﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان اصلاح کردو (یعنی جھگڑے کی بنیاد کو رفع کر کے لڑائی موقوف کرادو) پھر اگر (اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) اُن میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے (اور لڑائی بند نہ کرے) تو اُس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے (حکم خدا سے مراد لڑائی بند کرنا ہے) پھر اگر وہ (زیادتی کرنے والا فرقہ حکم خدا کی طرف) رجوع ہو جائے (یعنی لڑائی بند کر دے) تو اُن دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو (یعنی حدود شرعیہ کے موافق اس معاملہ کو طے کردو محض لڑائی بند کرنے پر اکتفا نہ کرو اگر صلح مصالحت نہ ہوئی تو پھر بھی لڑائی کا احتمال رہے گا) اور انصاف کا خیال رکھو (یعنی کسی نفسانی غرض کو غالب نہ ہونے دو) بیشک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے (اور باہمی اصلاح کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ) مسلمان تو سب (دینی اشتراک جو روحانی اور معنوی رشتہ ہے اس رشتہ سے ایک دوسرے کے) بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو (تاکہ یہ اسلامی برادری قائم رہے) اور (اصلاح کے وقت) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (یعنی حدود

شرعیہ کی رعایت رکھا کرو) تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

معارف و مسائل

ربط

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب اور ایسے اعمال سے پرہیز کا بیان تھا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچے، آگے عام معاشرت کے آداب واَحکام ہیں جن میں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے آداب اور باہمی حقوق کا بیان ہے اور سب میں قدر مشترک ایذاء رسانی سے اجتناب ہے۔

سببِ نزول

ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان فرمائے ہیں جن میں خود مسلمانوں کے دو گروہوں میں باہم تصادم ہوا اور کوئی بعید نہیں کہ یہ سبھی واقعات کا مجموعہ سببِ نزول ہوا ہو یا نزول کسی ایک واقعہ میں ہوا، دوسرے واقعات کو اس کے مطابق پاکر ان کو بھی سببِ نزول میں شریک کر دیا گیا۔ اس آیت کے اصل مخاطب وہ اولوالامر اور ملوک ہیں جن کو قتال و جہاد کے وسائل حاصل ہیں (کذا قال ابو حیان فی البحر واختارہ فی روح المعانی)[1] اور بالواسطہ تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں کہ وہ اس معاملے میں اولوالامر کی اعانت کریں۔ اور جہاں کوئی امام وامیر یا بادشاہ و رئیس نہیں وہاں حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کو فہمائش کر کے ترکِ قتال پر آمادہ کیا جائے، اور دونوں نہ مانیں تو دونوں لڑنے والے فرقوں سے الگ رہے نہ کسی کے خلاف کرے نہ موافقت، کذا فی بیان القرآن۔[2]

مسائلِ متعلقہ

مسلمانوں کے دو گروہوں کی باہمی لڑائی کی چند صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ دونوں جماعتیں امام المسلمین کے تحت ولایت ہیں یا دونوں نہیں، یا ایک ہے ایک نہیں۔ پہلی صورت میں عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ فہمائش کر کے ان کو باہمی جنگ سے روکیں۔ اگر فہمائش سے باز نہ آئیں تو امام المسلمین پر اِصلاح کرنا واجب ہے اگر حکومتِ اسلامیہ کی مداخلت سے دونوں فریق جنگ سے باز آ گئے تو قصاص و دیت کے اَحکام جاری ہوں گے۔ اور باز نہ آئیں تو دونوں فریق کے ساتھ باغیوں کا سا معاملہ کیا جائے اور ایک باز آ گیا دوسرا ظلم و تعدی پر جمارہا تو دوسرا فریق باغی ہے اس کے

---

[1] البحر المحیط تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۰ ص:۱۱۰

[2] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۴۵

ساتھ باغیوں کا معاملہ کیا جائے اور جس نے اطاعت قبول کر لی وہ فریق عادل کہلائے گا۔ اور باغیوں کے اَحکام کی تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے اور مختصر جامع حکم یہ ہے کہ قبل قتال ان کے ہتھیار چھین لئے جائیں گے اور اُن کو گرفتار کر کے توبہ کرنے کے وقت تک قید رکھیں گے اور عین قتال کی حالت میں اور قتال کے بعد اُن کی ذرّیت کو غلام یا لونڈی نہ بنائیں گے اور ان کا مال مالِ غنیمت نہیں ہوگا البتہ توبہ کرنے تک اموال کو محبوس رکھا جائے گا توبہ کے بعد واپس دے دیا جائے گا۔

آیاتِ مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا یعنی اگر بغاوت کرنے والا فرقہ بغاوت اور قتال سے باز آجائے تو صرف جنگ بند کر دینے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اسبابِ جنگ اور باہمی شکایات کے ازالہ کی فکر کرو تاکہ دلوں سے بغض و عداوت نکل جائے اور ہمیشہ کے لئے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے۔ اور چونکہ یہ لوگ امام المسلمین کے خلاف بھی جنگ کر چکے ہیں اس لئے ہوسکتا تھا کہ ان کے بارے میں پورا انصاف نہ ہو اس لئے قرآن نے تاکید فرمائی کہ دونوں فریق کے حقوق میں عدل و انصاف کی پابندی کی جائے۔ (یہ سب تفصیل بیان القرآن سے لی گئی ہے اور اس میں ہدایہ کے حوالہ سے ہے) [۱]

مسئلہ:- اگر مسلمانوں کی کوئی بڑی طاقتور جماعت امام المسلمین کی اطاعت سے نکل جائے تو امام المسلمین پر لازم ہے کہ اوّل اُن کی شکایات سنے ان کو کوئی شبہ یا غلط فہمی پیش آئی ہے تو اس کو دُور کرے اور اگر وہ اپنی مخالفت کی ایسی وجوہ پیش کریں جن کی بناء پر کسی امام و امیر کی مخالفت شرعاً جائز ہے یعنی جن سے خود امام المسلمین کا ظلم و جور ثابت ہو تو عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس جماعت کی مدد کریں تاکہ امام اپنے ظلم سے باز آجائے بشرطیکہ اس کے ظلم کا ثبوت یقینی بلا کسی اشتباہ کے ثابت ہو جائے (کذا قال ابن الهمام۔ مظهری) [۲] اور اگر کوئی ایسی واضح وجوہ اپنی بغاوت اور عدم اطاعت کی بیان نہ کر سکیں اور امام المسلمین کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں تو مسلمانوں کو اُن سے قتال کرنا حلال ہے اور اِمام شافعیؒ نے فرمایا کہ جب تک وہ خود قتال شروع نہ کر دیں اس وقت تک مسلمانوں کو اُن سے قتال کی ابتدا کرنا جائز نہیں (مظہری) [۳] یہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس جماعت کا باغی اور ظالم ہونا بالکل یقینی اور واضح ہو، اور اگر صورت ایسی ہے کہ دونوں فریق کوئی شرعی حجت رکھتے ہیں اور یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون باغی ہے کون عادل وہاں جس شخص کو کسی ایک کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو وہ اس کی مدد کر سکتا ہے اور جس کو کسی جانب رجحان نہ ہو وہ دونوں سے الگ رہے جیسا کہ مشاجراتِ صحابہ کرام کے وقت جنگ جمل اور صفّین میں پیش آیا۔

---

[۱] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۴۵، والهداية، كتاب السير، باب البغاة، ج:۲ ص:۱۱۰ تا ۱۱۲

[۲] فتح القدير، كتاب السير، باب البغاة ج:۱۳ ص:۳۰۸، والمظهري تحت هذه الآية ج:۹ ص:۴۹

[۳] تفسير المظهري ج:۹ ص:۴۹

مشاجراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

امام ابوبکر ابن العربی نے فرمایا کہ یہ آیت قتال بین المسلمین کی تمام صورتوں کو حاوی اور شامل ہے [۱] اس میں وہ صورت بھی داخل ہے جس میں دونوں فریق کسی حجتِ شرعی کے تحت جنگ کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ صحابہ کرام کے مشاجرات اسی قسم میں داخل ہیں۔ قرطبی نے ابنِ عربی کا یہ قول نقل کر کے اس جگہ مشاجرات صحابہ جنگ جمل اور صفین وغیرہ کی اصل حقیقت بیان کی ہے اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعد کے آنے والے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ احقر نے یہ سب مضامین اُحکام القرآن میں بزبان عربی اور بزبان اُردو اپنے رسالہ مقامِ صحابہ میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیئے ہیں یہاں اس کا خلاصہ جو تفسیر قرطبی ج:۱۶ ص:۳۲۲ کے حوالہ سے اس رسالہ میں دیا گیا ہے نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

''یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اس لئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرزِ عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا، اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کفِّ لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی کہ اللہ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے۔'' اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: اِنَّ طَلْحَةَ شَهِيْدٌ يَّمْشِيْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ، یعنی طلحہ رُوئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں۔ [۲]

اب اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا جنگ کے لئے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہو کر وہ ہرگز شہادت کا رُتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح حضرت طلحہؓ کا یہ عمل تاویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جاسکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا، کیونکہ شہادت تو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعتِ ربانی میں قتل ہوا ہو۔ لہٰذا ان حضرات کے معاملہ کو اسی عقیدہ پر محمول کرنا ضروری ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

---

۱ احکام القرآن لابن العربی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۱۶۹

۲ جامع الترمذی، بألفاظ مختلفة، ابواب المناقب، باب مناقب طلحة بن عبیدالله رضی الله عنه، ج:۲ ص:۲۱۵، والمعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث:۲۱۵

اس بات کی دوسری دلیل وہ صحیح اور معروف ومشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''زبیر کا قاتل جہنم میں ہے۔'' [۱]

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''صفیہؓ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی خبر دے دو۔'' [۲] جب یہ بات ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت طلحہ کو شہید نہ فرماتے اور حضرت زبیر کے قاتل کے بارے میں جہنم کی پیشین گوئی نہ کرتے۔ نیز ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے، جن کے جنتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔

اسی طرح جو حضرات صحابہؓ ان جنگوں میں کنارہ کش رہے، انہیں بھی تاویل میں خطا کار نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کا طرزِ عمل بھی اس لحاظ سے درست تھا کہ اللہ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر قائم رکھا جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا ان سے براءت کا اظہار کرنا اور انہیں فاسق قرار دینا، ان کے فضائل ومجاہدات اور ان عظیم دینی مقامات کو کالعدم کر دینا کسی طرح درست نہیں۔ بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابۂ کرامؓ کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا؟ تو انہوں نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ (البقرۃ)، یہ ایک اُمت تھی جو گزر گئی، اس کے اعمال اس کے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو اُنہوں نے کہا، ''ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو ان میں (رنگنے سے) بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا۔'' مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو کسی ایک معاملے میں یقینی طور پر خطا کار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔

علامہ ابن فورکؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے درمیان پیش آنے والے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۶ ص:۳۲۱، والمعجم الأوسط للطبرانیؒ رقم الحدیث:۴۷۲۴ (باختلاف)

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۳۲۱، والمستدرك للحاکمؒ رقم الحدیث:۵۵۸۰، ومسند احمد رقم الحدیث:۶۸۱ (باختلاف)

اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوّت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے۔ بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنے والے واقعات کا بھی ہے۔''

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ:

''جہاں تک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا۔''

اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے، جس معاملے پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملے میں اُن کے درمیان اختلاف ہے اس میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔''

حضرت محاسبی فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے۔ لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جس میں ان کا اختلاف ہو اس میں خاموشی اختیار کریں اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی تھی اس لئے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا

اے ایمان والو! ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسرے سے شاید وہ بہتر ہوں

مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا

اُن سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور عیب نہ لگاؤ

اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ

ایک دُوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دُوسرے کے، بُرا نام ہے گنہگاری پیچھے ایمان کے

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! نہ تو مرد دُوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑا رہے ہیں) خود اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دُوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑا رہی ہیں) خود اُن سے بہتر ہوں۔ اور تم ایک دُوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ ایک دُوسرے کو بُرے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بہت بُری بات ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں، تو وہ ظالم لوگ ہیں۔ ﴿۱۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ ان (ہنسنے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتے ہیں) اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ اُن (ہنسنے والیوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتی ہیں) اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو (کیونکہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں اور) ایمان لانے کے بعد (مسلمان پر) گناہ کا نام لگنا (ہی) بُرا ہے (یعنی یہ گناہ کر کے تمہاری شان میں یہ کہا جا سکنا کہ فلاں مسلمان جس سے تم مراد ہو گناہ یعنی خدا کی نافرمانی کرتا ہے نفرت کی بات ہے تو اس سے بچو) اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں گے تو وہ ظلم کرنے والے (اور حقوق العباد کو تلف کرنے والے) ہیں (جو سزا ظالموں کو ملے گی وہی اُن کو ملے گی)۔

معارف و مسائل

سورۂ حجرات کے شروع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب کا بیان آیا پھر عام مسلمانوں کے باہمی حقوق و آدابِ معاشرت کا بیان شروع ہوا، سابقہ دو آیتوں میں ان کی اجتماعی و جماعتی اصلاح کے اَحکام بیان ہوئے، مذکور الصدر آیتوں میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آدابِ معاشرت کا ذکر ہے۔ ان میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اوّل کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرنا، دوسرے کسی پر طعنہ زنی کرنا، تیسرے کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا

جس سے اس کی توہین ہوتی ہو یا وہ اُس سے بُرا مانتا ہو۔

پہلی چیز سخریہ یا تمسخر ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اُس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ۔ تمسخر۔ استہزاء کہا جاتا ہے[1] اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اس کی نقل اُتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سن کر بطور تحقیر کے ہنسی اُڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اُس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بنصِ قرآن حرام ہیں۔

سخریہ کی ممانعت کا قرآنِ کریم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اس میں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا عورتوں کو الگ، مردوں کو لفظ **قوم** سے تعبیر فرمایا، کیونکہ اصل میں یہ لفظ مردوں ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً و توسّعاً عورتوں کو اکثر شامل ہو جاتا ہے اور قرآنِ کریم نے عموماً لفظ **قوم** مردوں عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے مگر یہاں لفظ **قوم** خاص مردوں کے لئے استعمال فرمایا اس کے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ **نساء** سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتا ہے اس کو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو، اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ استہزاء و تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اس کو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ قرآن میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ استہزاء کرنے اور اس کی حرمت کا ذکر فرمایا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اس کا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آئے تو کسی کو اس پر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرأت نہ کرنا چاہئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔ اس آیت کو سن کر سلف صالحین کا حال یہ ہو گیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اُس پر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتّے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر رہتا ہے کہ میں خود کتّا نہ بنا دیا جاؤں۔ (قرطبی)[2]

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱٦ ص:۳۲۴

[2] تفسیر القرطبی ج:۱٦ ص:۳۲۵، ومصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث:۲۵۵۴٦

مسلمانوں کی صورتوں اوران کے مال ودولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ اُن کے قلوب اوراعمال کو دیکھتا ہے، [۱] قرطبی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ اوراصل یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے معاملہ میں اس کے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگادینا درست نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال وافعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات کو جانتا ہے وہ اس کے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال بُرے ہیں ہوسکتا ہے کہ اس کے باطنی حالات اور قلبی کیفیات اس کے اعمالِ بد کا کفارہ بن جائیں اس لئے جس شخص کو بُری حالت یا بُرے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اُس کی اس حالت کو تو بُرا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ [۲] دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے۔ وہ لَمْز ہے۔ لَمْز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو، یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسا قرآنِ کریم میں ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (النساء:۲۹) جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے کیونکہ اکثر تو ایسا واقع ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کردیا، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے آپ کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے یہی معنی یہاں وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے تو کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اس کے عیب نکالو گے تو وہ تمہارے عیب نکالے گا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ: ''وَفِيْكَ عُيُوْبٌ وَلِلنَّاسِ اَعْيُنٌ''، یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو اُن کو دیکھتی ہیں تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کرو گے تو وہ تم پر یہی عمل کریں گے اور بالفرض اگر اس نے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل وتحقیر ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کرے گا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفرؔ نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر، تو جہان میں کوئی بُرا نہ رہا

[۱] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم وخذله ...إلخ، ج:۲ ص:۳۱۷
[۲] تفسیر القرطبي ج:۱۶ ص:۳۲۷

تیسری چیز جس سے آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو بُرے لقب سے پکارنا ہے، جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا لُولا یا اندھا کانا کہہ کر پکارنا یا اس لفظ سے اس کا ذکر کرنا اسی طرح جو نام کسی شخص کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اُس نام سے اُس کو پکارنا۔ حضرت ابوجبیرہ انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ہم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے دو یا تین نام مشہور تھے اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے اس کو عار دلانے اور تحقیر و توہین کے لئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپ کو یہ معلوم نہ تھا بعض اوقات وہی بُرا نام لے کر آپ اس کو خطاب کرتے تو صحابہ عرض کرتے کہ یارسول اللہ وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [۱]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیت میں تنابز بالالقاب سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا بُرا عمل کیا ہو اور پھر اُس سے تائب ہو گیا ہو اس کے بعد اس کو اُس بُرے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور یا زانی یا شرابی وغیرہ۔ جس نے چوری، زنا، شراب سے توبہ کر لی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔ [۲] حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اُس نے توبہ کر لی ہے تو اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ اس کو اسی گناہ میں مبتلا کر کے دُنیا و آخرت میں رُسوا کرے گا۔ (قرطبی) [۳]

بعض القاب کا استثناء

بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہٖ بُرے ہیں مگر وہ بغیر اُس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے، بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا مقصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو، جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ ''اعرج'' یا ''احدب'' مشہور ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جس کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ''ذُوالیدین'' کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ [۴] حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اسانیدِ حدیث میں بعض ناموں کے ساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً: حمید الطّویل، سلیمان الاعمش، مروان الاصفر، وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذِکر کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا مقصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے۔ (قرطبی) [۵]

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة الحجرات (بالإختصار) ج:۲ ص:۱۶۲

[۲] جامع الترمذی، ابواب صفة القیامة ...إلخ، بعد باب ما جاء فی صفة أوانی الحوض ج:۲ ص:۷۱

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۳۲۸و۳۲۹

[۴] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یجوز من ذکر الناس نحو قولهم الطویل والقصیر ج:۲ ص:۸۹۴

[۵] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۳۲۹

سنت یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے القاب سے یاد کیا جائے

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا حق دوسرے مؤمن پر یہ ہے کہ اس کا ایسے نام ولقب سے ذکر کرے جو اُس کو زیادہ پسند ہو۔ [۱] اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو "عتیق"، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو "فاروق"، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو "اسد اللہ" [۲] اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو "سیف اللہ" فرمایا ہے۔ [۳]

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

اے ایمان والو! بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت گناہ ہے

وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ

اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے

لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

گوشت اپنے بھائی کا جو مُردہ ہو سو گھن آتا ہے تم کو اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو، اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو! اور اللہ سے ڈرو۔ بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔ ﴿۱۲﴾

---

[۱] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:۵۸۱۵، ومجمع الزوائد، رقم الحديث:۱۳۰۶۵

[۲] دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۲ ص:۳۹۶ محمود اشرف عثمانی

[۳] تفسير القرطبی ج:۱۶ ص:۳۳۰

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (اس لئے ظن وگمان کی جتنی قسمیں ہیں اُن سب کے اقسام کے اَحکام کی تحقیق کرلو کہ کونسا گمان جائز ہے کونسا ناجائز، پھر جائز کی حد تک رہو) اور (کسی کے عیب کا) سراغ نہ لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے (آگے غیبت کی مذمت ہے کہ) کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے اس کو تو تم (ضرور) بُرا سمجھتے ہو (تو سمجھ لو کہ کسی بھائی کی غیبت بھی اسی کے مشابہ ہے) اور اللہ سے ڈرتے رہو (غیبت چھوڑ دو توبہ کرلو) بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

معارف ومسائل

یہ آیت بھی باہمی حقوق اور آدابِ معاشرت کے متعلق اَحکام پر مشتمل ہے اس میں بھی تین چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اوّل ظن جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرے تجسّس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سراغ لگانا۔ تیسرے غیبت یعنی کسی غیر حاضر آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سنتا تو اس کو ناگوار ہوتی۔ پہلی چیز یعنی ظن کے معنی گمان غالب کے ہیں، اس کے متعلق قرآن کریم نے اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ "بہت سے گمانوں سے بچا کرو" پھر اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں" جس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں تو یہ ارشاد سننے والوں پر اس کی تحقیق واجب ہوگئی کہ کونسے گمان گناہ ہیں تاکہ اُن سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہوجائے اس کے پاس نہ جائیں۔ علماء وفقہاء نے اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ قرطبی نے فرمایا کہ ظن سے مراد اس جگہ تہمت ہے یعنی کسی شخص پر بغیر کسی قوی دلیل کے کوئی الزام عیب یا گناہ کا لگانا۔[1] امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں ایک جامع تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ ظن کی چار قسمیں ہیں، ایک حرام ہے دوسری مأمور بہ اور واجب ہے، تیسری مستحب اور مندوب ہے چوتھی مباح اور جائز ہے۔ ظنِ حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دے گا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۶ ص:۳۳۱

لَا یَمُوْتَنَّ اَحَدُکُمْ اِلَّا وَھُوَ یُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰہِ۔ [1]

تم میں سے کسی کو اس کے بغیر موت نہ آنی چاہئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ، [2] یعنی اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اب اس کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ حسنِ ظن فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے۔ اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں، اُن کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ، [3] یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مراد باتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور جو کام ایسے ہیں کہ اُن میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسے باہمی منازعات ومقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیونکہ حاکم اور قاضی جس کی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اُس پر اس کا فیصلہ دینا واجب وضروری ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن وحدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان واحتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اس وقت جھوٹ بولا ہو اس لئے اس کا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کیا جاسکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہوا تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے اور ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہوجائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دے چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے اور ظن مستحب ومندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے۔ (جصاص، ملخصًا) [4]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب الأمر بحسن الظنّ باللہ تعالٰی عند الموت، ج:۲ ص:۳۸۷، وسنن ابی داوٗد، کتاب الجنائز، باب ما یستحب من حسن الظنّ باللہ عند الموت، ج:۲ ص:۴۴۴

[2] صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالٰی وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ج:۲ ص:۱۱۰۱

[3] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر ج:۲ ص:۸۹۶

[4] احکام القرآن للجصّاصؒ ج:۸ ص:۴۵۶ تا ۴۵۸

قرطبی نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا [۱] (النور:۱۲)، اس میں حسن ظن بالمؤمنین کی تاکید آئی ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ اِنَّ مِنَ الْحَزْمِ سُوْءُ الظَّنِّ یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے نہ یہ کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملے میں احتیاط برتے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے۔

نگہ دار وآں شوخ در کیسہ دُر　　کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر [۲]

دُوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے تجسّس یعنی کسی کے عیب کی تلاش اور سراغ لگانا ہے۔ اس میں قراءتیں دو ہیں ایک وَلَا تَجَسَّسُوْا بالجیم دوسرے وَلَا تَحَسَّسُوْا بالحاء اور حدیث صحیحین میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے یہ دونوں لفظ آئے ہیں ارشاد ہوا لَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا [۳] اور ان دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں۔ اخفش نے دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تجسّس بالجیم کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور تحسّس بالحاء مطلق تلاش اور جستجو کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ یوسف میں فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ [۴] (یوسف:۸۷) اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو چیز تمہارے سامنے آجائے اس کو پکڑ سکتے ہو اور کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اُس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ فَاِنَّ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَّبِعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ يَّتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ فِيْ بَيْتِهٖ۔ (قرطبی) [۵]

مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور اُن کے عیوب کی جستجو نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رُسوا کر دیتا ہے۔

---

[۱] ترجمہ: جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے آپس والوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہ کیا۔

[۲] ترجمہ: تھیلے میں وہی شخص اپنے پیسوں کی حفاظت کر سکتا ہے جو ہر آدمی کو جیب کترا سمجھتا ہے۔

[۳] صحیح البخاري، كتاب النكاح، باب لا يخطب على خِطبة أخيه حتّى ينكح أو يدع ج:۲ ص:۷۷۲، وصحيح مسلم، كتاب البر، باب تحريم الظنّ والتجسّس والتنافس والتناجش ونحوها ج:۲ ص:۳۱۶

[۴] ترجمہ: اور یوسف اور ان کے بھائی کی تلاش کرو۔

[۵] تفسير القرطبي ج:۱۶ ص:۳۳۳، وسنن ابي داوٗد، كتاب الأدب، باب في الغيبة، ج:۲ ص:۶۶۹

بیان القرآن میں ہے کہ چھپ کر کسی کی باتیں سننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سننا بھی تجسّس میں داخل ہے البتہ اگر کسی سے مضرت پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے مضرت پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسّس کرے تو جائز ہے۔ [۱] تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے، یعنی اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگر چہ وہ سچی بات ہی ہو کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے، جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دِہ بات کہنا جائز ہے۔ کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لَمز میں داخل ہے جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا، اس آیت نے کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین وتحقیر کو اس کا گوشت کھانے کی مثل ومشابہ قرار دیا ہے اگر اس کے وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کر کے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (الحجرات:۱۱) اور آگے آئے گا وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝۱ [۲] (الہمزۃ) اور وہ آدمی غائب ہو اس کے پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اُس کی آبرو میں خلل آئے اور اُس کی تحقیر ہو یہ ایسا ہے جیسے کسی مُردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مُردہ کا گوشت کھانے سے مُردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خست ودناءت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خست ودناءت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسّس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اُس کی حرمت اور خست ودنائت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اُس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگر چہ ایذاء رسانی کی بناء پر حرام ہے مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کر سکتا ہے اور مدافعت کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادةً زیادہ دیر تک بھی نہیں سکتا۔ بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کر سکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لئے اس کا سلسلہ بھی عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء بھی زیادہ ہے اس لئے غیبت کی حرمت زیادہ مؤکد کی گئی۔ اور عام

---

[۱] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۴۷

[۲] ترجمہ: بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو اور رُو در رُو طعنہ دینے والا ہو۔

مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سنے وہ اپنے غائب بھائی کی طرف سے بشرطِ قدرت مدافعت کرے اور مدافعت پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اس کے سننے سے پرہیز کرے کیونکہ غیبت کا بقصد و اختیار سننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

غیبت کے متعلق مسائل

حضرت میمونؒ نے فرمایا کہ ایک روز خواب میں مَیں نے دیکھا کہ ایک زنگی کا مُردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کر کے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے بندے! میں اس کو کیوں کھاؤں؟ تو اُس شخص نے کہا اس لئے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے تو اس کے متعلق کوئی اچھی بُری بات کی ہی نہیں تو اُس شخص نے کہا کہ ہاں! لیکن تو نے اس کی غیبت سنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمونؒ کا حال اس خواب کے بعد یہ ہو گیا کہ نہ خود کبھی کسی کی غیبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔ [1]

حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ شبِ معراج کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لے جایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، میں نے جبریلِ امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور اُن کی آبروریزی کرتے تھے (رواہ البغوی، [2] مظہری) اور حضرت ابوسعید اور جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا'' یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ کیسے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے، اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد، ازمظہری) [3]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے اور حق العبد بھی ضائع ہوتا ہے اس لئے جس کی غیبت کی گئی ہے اُس سے معاف کرانا ضروری ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ غیبت کی خبر جب تک صاحبِ غیبت کو نہ پہنچے اس وقت تک وہ حق العبد نہیں ہوتی اس لئے اُس سے معافی کی ضرورت نہیں (نقلہ فی الروح عن الحسن والخیاطی وابن الصباغ والنووی وابن الصّلاح والزرکشی وابن عبدالبر عن ابن المبارک) [4] مگر

---

[1] المظہری ج:۹ ص:۵۵

[2] تفسیر البغوی ج:۷ ص:۳۴۶، وسنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبۃ، ج:۲ ص:۲۶۹

[3] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۵۶،۵۵، والمعجم الأوسط للطبرانیؒ رقم الحدیث:۶۷۷۸، شعب الإیمان رقم الحدیث:۶۳۱۵

[4] روح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۹ ص:۲۸۶

"بیان القرآن" میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس صورت میں گو اس شخص سے معافی مانگنا ضروری نہیں مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اس کے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ضروری ہے اور اگر وہ شخص مر گیا ہے یا اس کا پتہ نہیں تو اس کا کفارہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ يَّسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَابَهٗ تَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهٗ (رواہ البیهقی۔ مظهری) [1] یعنی کفارہ غیبت کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ! ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔ [2]

مسئلہ:- بچے اور مجنون اور کافر ذمّی کی غیبت بھی حرام ہے کیونکہ ان کی ایذا بھی حرام ہے، اور جو کافر حربی ہیں اگرچہ ان کی ایذا حرام نہیں، مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

مسئلہ:- غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے جیسے کسی لنگڑے کی چال بنا کر چلنا جس سے اُس کی تحقیر ہو۔

مسئلہ:- بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوئی ہے مثلاً کسی شخص کی بُرائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت و مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کر سکے، یا کسی کی اولاد و بیوی کی شکایت اُس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو اُن کی اصلاح کر سکے، یا کسی واقعے کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لئے صورتِ واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دُنیوی شر سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لئے اس کا حال ذکر کرنا۔ یا جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے، اس کے اعمالِ بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں، مگر بلا ضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی بناء پر مکروہ ہے (یہ سب مسائل بیان القرآن میں بحوالہ رُوح المعانی بیان کئے گئے ہیں) اور ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی بُرائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت و مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ

اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے

---

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۵۲، وشعب الإيمان للبیهقی (باختصار) رقم الحدیث:۶۳۶۷، وکنز العمال رقم الحدیث:۸۰۶۴۔ ؟؟یستغفر/تقول؟؟؟

[2] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۴۷

لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

تا کہ آپس کی پہچان ہو، تحقیق عزت اللہ کے یہاں اُسی کو بڑی جس کو ادب بڑا، اللہ سب کچھ جانتا ہے خبردار

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تا کہ تم ایک دُوسرے کی پہچان کر سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔ ﴿۱۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم وحوّاء) سے پیدا کیا ہے (اس لئے اس میں تو سب انسان برابر ہیں) اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (یہ محض اس لئے) تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں نہ اس لئے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو کیونکہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے جس کا پورا حال کسی کو معلوم نہیں بلکہ اس کے حال کو محض) اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور پورا خبردار ہے (اس لئے کسی نسب اور قومیت پر فخر نہ کرو)۔

معارف ومسائل

اُوپر کی آیات میں انسانی اور اسلامی حقوق اور آدابِ معاشرت کی تعلیم کے سلسلے میں چھ چیزوں کو حرام وممنوع کیا گیا ہے جو باہمی منافرت اور عداوت کا سبب ہوتی ہیں۔ اس آیت میں ایک جامع تعلیم انسانی مساوات کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے کو کمتر یا رذیل نہ سمجھے اور اپنے نسب اور خاندان یا مال ودولت وغیرہ کی بناء پر فخر نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں درحقیقت تفاخر کی ہیں نہیں، پھر اس تفاخر سے باہمی منافرت اور عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ اور خاندان اور قبائل یا مال ودولت کے اعتبار سے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا تو قریشِ مکہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اُن میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے اُن کو یہ روزِ بد دیکھنا نہیں پڑا، اور حارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی آدمی نہیں جُڑا کہ جو مسجد حرام میں اذان دے۔ ابوسفیان بولے کہ میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمان کا مالک ان کو خبر کردے گا۔ چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا انہوں نے اقرار کرلیا اُسی پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلایا کہ فخر وعزت کی چیز درحقیقت ایمان اور تقویٰ ہے جس سے تم لوگ خالی اور حضرت بلال آراستہ ہیں اس لئے وہ تم سب سے افضل واشرف ہیں (مظہری عن البغوی)۔ [1] حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا (تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں) طواف سے فارغ ہو کر آپ نے یہ خطبہ دیا:

> اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَتَکَبُّرَھَا۔ اَلنَّاسُ رَجُلَانِ بَرٌّ تَقِیٌّ کَرِیْمٌ عَلَی اللّٰہِ وَفَاجِرٌ شَقِیٌّ ھَیِّنٌ عَلَی اللّٰہِ ثُمَّ تَلَا یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ الآیۃ۔ (ترمذی وبغوی) [2]
> شکر ہے اللہ کا جس نے فخرِ جاہلیت کو اور اس کے تکبر کو تم سے دُور کردیا، اب تمام انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک نیک اور متقی وہ اللہ کے نزدیک شریف اور محترم ہے۔ دوسرا فاجر شقی وہ اللہ کے نزدیک ذلیل وحقیر ہے اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دُنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت مال ودولت کا نام ہے اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کا۔

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ، شُعُوْبٌ، شِعْبٌ کی جمع ہے، بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں پھر اُن میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں۔ پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اس کے مختلف حصوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں۔ سب سے بڑا حصہ شعب اور سب سے چھوٹا حصہ عشیرہ کہلاتا ہے۔ اور ابوروَاق کا قول ہے کہ شعب

---

[1] تفسیر البغوی تحت ھذہ الآیۃ ج:۷ ص:۳۴۷

[2] تفسیر البغوی ج:۷ ص:۳۴۸ و۳۴۹، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الحجرات ج:۲ ص:۱۶۲، ومصنف ابن ابی شیبۃ رقم الحدیث: ۳۶۹۱۹

اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں، اور قبائل عرب کے لوگوں کے لئے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور اسباط بنی اسرائیل کے لئے۔ [1]

نسبی اور وطنی یا لسانی امتیاز میں حکمت و مصلحت تعارف کی ہے

قرآنِ کریم نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے مگر پھر اس کی تقسیم مختلف قوموں قبیلوں میں جو حق تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے اُس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کا تعارف اور شناخت آسان ہو جائے مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے تفاوت سے ان میں امتیاز ہو سکتا ہے اور اس سے دُور اور قریب کے رشتوں کا علم ہو سکتا ہے اور نسبی قرب و بعد کی مقدار پر ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جاتے ہیں۔ عصبات کا قرب و بعد معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کے لئے استعمال کرو تفاخر کے لئے نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ

کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی نہیں گھسا

الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ

ایمان تمہارے دلوں میں اور اگر حکم پر چلو گے اللہ کے اور اس کے رسول کے کاٹ نہ لے گا تمہارے کاموں میں سے

شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ

کچھ، اللہ بخشتا ہے مہربان ہے، ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر

وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

اور اس کے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے

[1] تفسیر البغوی ج:۷، ص:۳۴۸ (تحت هٰذه الآية)

أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾ قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے تو کہہ کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنی دینداری اور اللہ کو تو خبر ہے

مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٦﴾

جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ

تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے تو کہہ مجھ پر اِحسان نہ رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ

يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ

تم پر اِحسان رکھتا ہے کہ اُس نے تم کو راہ دی ایمان کی اگر سچ کہو اللہ جانتا ہے

غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ ع

چھپے بھید آسمانوں کے اور زمین کے اور اللہ دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ: ''ہم ایمان لے آئے ہیں۔'' ان سے کہو کہ: ''تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اور اِیمان ابھی تمہارے دِلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم واقعی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروگے تو اللہ تمہارے اعمال (کے ثواب) میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔'' ﴿۱۴﴾ اِیمان لانے والے تو وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کو دِل سے مانا ہے، پھر کسی شک میں نہیں پڑے، اور جنہوں نے اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔ ﴿۱۵﴾ (اے پیغمبر! ان دیہاتیوں سے) کہو کہ: ''کیا تم اللہ کو اپنے دِین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ اُن تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جو

آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور اللہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔" (۱۶) یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ: "مجھ پر اپنے اسلام لانے کا اِحسان نہ جتلاؤ۔ بلکہ اگر تم واقعی (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر اِحسان ہے کہ اُس نے تمہیں اِیمان کی ہدایت دی۔" (۱۷) واقعہ یہ ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ بات کو خوب جانتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ (۱۸)

خلاصۂ تفسیر

یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آکر جو ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہیں، یہ اس میں کئی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو کذب کہ بلا تصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیقِ قلبی پر، اور وہ موجود نہیں جیسا عنقریب آتا ہے وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے) اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ و رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہوں گے محض اس وقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو کہ اس وقت کے اعتبار سے گزشتہ ہوگا) ذرا بھی کم نہ کرے گا (بلکہ سب کا پورا پورا ثواب دے گا کیونکہ) بے شک اللہ غفور رحیم ہے (اب ہم سے سنو کہ کامل مؤمن کون ہیں تا کہ تم کو مؤمن بننا ہے تو ویسے بنو سو) پورے مؤمن وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (ایمان پر مستمر بھی رہے یعنی عمر بھر کبھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستہ میں (یعنی دین کے لئے) محنت اُٹھائی (جس میں جہاد وغیرہ سب آ گیا سو) یہ لوگ ہیں سچے (یعنی پورے سچے اور یوں اگر صرف تصدیق ہی ہو تب بھی نفس صدق ہو جائے گا، بخلاف تمہارے کہ ادنیٰ درجہ کا ایمان کہ تصدیق ہے وہ تک حاصل نہیں اور دعویٰ کرتے ہیں ایمان کامل کا، پس ایک امر قبیح تو اُن سے یہ صادر ہوا یعنی کذب کما قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا الیٰ قولہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) (البقرۃ)، اور دُوسرا امر قبیح یہ کہ یہ دھوکہ دیتے ہیں کما قال تعالیٰ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ [1] (البقرۃ:۹) سو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ کیا خدا تعالیٰ کو اپنے دین (قبول کرنے) کی

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور لوگوں میں بعضے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں۔

خبر دیتے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ تم نے ایمان قبول نہیں کیا باوجود اس کے جو تم دعویٰ قبول کرنے کا کرتے ہو تو لازم آتا ہے کہ خلاف علمِ خداوندی خدا تعالیٰ کو ایک بات بتلاتے ہو) حالانکہ (یہ محال ہے کیونکہ) اللہ کو تو سب آسمان اور زمین کی سب چیزوں کی (پوری) خبر ہے اور (علاوہ سمٰوٰت والارض کے) اللہ (اور بھی) سب چیزوں کو جانتا ہے (تو اس کو کوئی کیا بتلائے گا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو جو تمہارے متعلق علم ہے کہ تم ایمان نہیں لائے وہی صحیح ہے اور تیسرا امر قبیح جس کے یہ مرتکب ہوتے ہیں یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں (جو نہایت درجہ گستاخی ہے کہ دیکھئے ہم نہ لڑے نہ بھڑے مسلمان ہوگئے اور دوسرے لوگ بہت پریشان کر کر کے مسلمان ہوئے ہیں سو) آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو (اس لئے کہ قطع نظر گستاخی کے تمہارے اسلام سے میرا کیا نفع ہوگیا اور اسلام نہ لانے سے میرا کیا ضرر ہوگیا اگر تم سچے ہوتے تو تمہاری ہی آخرت کا نفع تھا اور جھوٹے ہونے میں بھی تمہارا ہی دنیا کا نفع ہے کہ قتل وقید سے بچ گئے سو مجھ پر احسان رکھنا محض جہل ہے) بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم (اس دعوئ ایمان میں) سچے ہو (کیونکہ ایمان بڑی نعمت ہے اور بدون تعلیم وتوفیق حق تعالیٰ کے نصیب نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ ایسی بڑی نعمت عطا فرمادی، پس دھوکے اور احسان جتلانے سے باز آجاؤ اور یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی سب مخفی باتوں کو جانتا ہے اور (اسی علم محیط کی وجہ سے) تمہارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے (اور اُن ہی کے موافق تم کو جزا دے گا پھر اُس کے سامنے باتیں بنانے سے کیا فائدہ)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت وشرافت کا مدار تقویٰ پر ہے جو ایک باطنی چیز ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں کسی شخص کے لئے اپنے تقدس کا دعویٰ جائز نہیں، مذکور الصدر آیات میں ایک خاص واقعہ کی بناء پر یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل مدار قلبی تصدیق پر ہے اس کے بغیر محض زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہنا صحیح نہیں، اس پوری سورت میں اوّل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تعظیم وتکریم کا پھر باہمی حقوق اور آدابِ معاشرت کا ذکر آیا ہے ختم سورت پر یہ بتلایا گیا کہ آخرت میں سب اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان اور تصدیقِ قلبی اور اللہ ورسول کی اطاعت پر ہے۔

شانِ نزول

واقعہ اس آیت کے نزول کا امام بغویؒ [1] کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ قبیلہ بنی اسد کے چند آدمی مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک قحط شدید کے زمانے میں حاضر ہوئے، یہ لوگ دل سے تو مؤمن تھے نہیں محض صدقات حاصل کرنے کے لئے اپنے اسلام لانے کا اظہار کیا، اور چونکہ واقع میں مؤمن نہ تھے اسلامی اَحکام وآداب سے بے خبر اور غافل تھے انہوں نے مدینہ کے راستوں پر غلاظت ونجاست پھیلا دی اور بازاروں میں اشیاءِ ضرورت کی قیمت بڑھا دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک تو جھوٹا دعویٰ ایمان لانے کا کیا، دوسرے آپ کو دھوکا دینا چاہا، تیسرے آپ پر احسان جتلایا کہ دوسرے لوگ تو ایک زمانہ تک آپ سے برسرِ پیکار رہے آپ کے خلاف جنگیں لڑیں پھر مسلمان ہوئے ہم بغیر کسی جنگ کے خود آپ کے پاس حاضر ہوکر مسلمان ہوگئے اس لئے ہماری قدر کرنی چاہئے جو شانِ رسالت میں ایک طرح کی گستاخی بھی تھی کہ اپنے مسلمان ہوجانے کا احسان آپ پر جتلایا، اور مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے صدقات سے اپنی مفلسی دُور کریں۔ اور اگر یہ واقعی اور سچے مسلمان ہی ہوجاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا احسان تھا خود اپنا ہی نفع تھا اس پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جن میں اُن کے جھوٹے دعوے کی تکذیب اور احسان جتلانے پر مذمت کی گئی ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، چونکہ ان کے دلوں ایمان نہ تھا جھوٹا دعویٰ صرف ظاہری افعال کی بناء پر کررہے تھے اس لئے قرآن نے ان کے ایمان کی نفی اور دعوائے ایمان کے غلط ہونے کو بیان کرکے یہ فرمایا کہ تمہارا "اٰمَنَّا" کہنا تو جھوٹ ہے تم زیادہ سے زیادہ اَسْلَمْنَا کہہ سکتے ہو کیونکہ اسلام کے لفظی معنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنے کے ہیں اور یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لئے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے لگے تھے اس لئے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہوگئی اس لئے لغوی معنی کے اعتبار سے اَسْلَمْنَا کہنا صحیح ہوسکتا ہے۔

اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟

اُوپر کی تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں، اِصطلاحی معنی مراد ہی نہیں اس لئے اس آیت سے اسلام اور اِیمان میں اِصطلاحی فرق پر کوئی اِستدلال نہیں ہوسکتا۔ اور اِصطلاحی ایمان اور اِصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم ومعنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اِصطلاحِ شرع میں تصدیقِ قلبی کا نام ہے، یعنی اپنے دل سے

---

[1] تفسير البغوی ج:۷ ص:۳۵۰

اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اِسلام نام ہے اعمالِ ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کا لیکن شریعت میں تصدیقِ قلبی اس وقت تک قابلِ اعتبار نہیں، جب تک اس کا اثر جوارح کے اعمال و افعال تک نہ پہنچ جائے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرے۔ اسی طرح اسلام اگرچہ اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے ورنہ وہ نفاق ہے۔ اس طرح اسلام و ایمان مبدأ اور منتہی کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہو کر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعالِ ظاہرہ سے شروع ہو کر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں، اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مؤمن نہ ہو یا مؤمن ہو مسلم نہ ہو مگر یہ کلام اِصطلاحی ایمان و اسلام میں ہے۔ لُغوی معنی کے اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو مؤمن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعتِ اَحکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مؤمن نہ تھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمّت بحمد الله تعالىٰ وعونه سورة الحجرات للثّامن
من شعبان ۱۳۹۲ھ یوم الأحد ولله الحمد والمنّة

سُورَةُ قٓ

اٰیاتھا ۴۵ | ۵۰ سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ ۳۴ | رکوعاتھا ۳

سورۂ قٓ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۴۵ آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ

قٓ قسم ہے اس قرآن بڑی شان والے کی، بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ آیا اُن کے پاس ڈر سنانے والا انہی میں کا

فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ

تو کہنے لگے منکر یہ تعجب کی چیز ہے، کیا جب ہم مرچکیں اور ہوجائیں مٹی،

ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ

یہ پھر آنا بہت دور ہے، ہم کو معلوم ہے جتنا گھٹاتی ہے زمین اُن میں سے

وَ عِنۡدَنَا كِتٰبٌ حَفِيۡظٌ ﴿۴﴾ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ

اور ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے، کوئی نہیں پر جھٹلاتے ہیں سچے دین کو جب اُن تک پہنچا

فَهُمۡ فِىۡۤ اَمۡرٍ مَّرِيۡجٍ ﴿۵﴾ اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا

سو وہ پڑ رہے ہیں اُلجھی ہوئی بات میں، کیا نہیں دیکھتے آسمان کو اپنے اوپر کیسا ہم نے اس کو بنایا

وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ﴿۶﴾ وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَيۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ

اور رونق دی اور اس میں نہیں کوئی سوراخ اور زمین کو پھیلایا اور ڈالے اس میں بوجھ

وَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ﴿۷﴾ تَبۡصِرَةً وَّذِكۡرٰى

اور اُگائی اس میں ہر ہر قسم کی رونق کی چیز، سمجھانے کو اور یاد دلانے کو

لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ﴿۸﴾ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ

اس بندہ کے لئے جو رجوع کرے، اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی برکت کا پھر اُگائے ہم نے اس سے باغ

وَّحَبَّ الۡحَصِيۡدِ ﴿۹﴾ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ

اور اناج جس کا کھیت کاٹا جاتا ہے، اور کھجوریں لمبی اُن کا خوشہ ہے تہ پر تہ روزی دینے کو بندوں کے

وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ؕ كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ ﴿۱۱﴾ كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ

اور زندہ کیا ہم نے اُس سے ایک مُردہ دیس کو یونہی ہوگا نکل کھڑے ہونا، جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم

وَّاَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوۡدُ ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرۡعَوۡنُ وَاِخۡوَانُ لُوۡطٍ ﴿۱۳﴾

اور کنویں والے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی

وَّاَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ وَقَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾

اور بن کے رہنے والے اور تبّع کی قوم ان سب نے جھٹلایا رسولوں کو پھر ٹھیک پڑا میرا ڈرانا،

اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۵﴾ ع

اب کیا ہم تھک گئے پہلی بار بنا کر کوئی نہیں ان کو دھوکا ہے ایک نئے بنانے میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قٓ، قرآن مجید کی قسم! (ان کافروں نے پیغمبر کو کسی دلیل کی وجہ سے نہیں جھٹلایا) ① بلکہ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ کوئی (آخرت سے) ڈرانے والا خود اُنہی میں سے (کیسے) آ گیا، چنانچہ ان کافروں نے یہ کہا ہے کہ: "یہ تو بڑی عجیب بات ہے، ② بھلا کیا جب ہم مر کھپ جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، (اُس وقت ہمیں پھر زندہ کیا جائے گا؟) یہ واپسی تو ہماری سمجھ سے دُور ہے۔" ③ واقعہ تو یہ ہے کہ زمین ان کے جن حصوں کو (کھا کر) گھٹا دیتی ہے، ہمیں اُن کا پورا علم ہے، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سب کچھ محفوظ رکھتی ہے۔ ④ دراصل انہوں نے سچ کو اُسی وقت جھٹلا دیا تھا جب وہ ان کے پاس آیا تھا، چنانچہ وہ متضاد باتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ⑤ بھلا کیا انہوں نے اپنے اُوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کیسے بنایا ہے؟ اور ہم نے اُسے خوبصورتی بخشی ہے، اور اُس میں کسی قسم کے رخنے نہیں ہیں، ⑥ اور زمین ہے کہ ہم نے اُسے پھیلا دیا ہے، اور اُس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے ہیں، اور اُس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اُگائی ہیں، ⑦ تاکہ وہ اللہ سے لو لگانے والے ہر بندے کے لئے بصیرت اور نصیحت کا سامان ہو، ⑧ اور ہم نے آسمان سے برکتوں والا پانی اُتارا، پھر اُس کے ذریعے باغات اور وہ اناج کے دانے اُگائے جن کی کٹائی ہوتی ہے، ⑨ اور کھجور کے اُونچے اُونچے درخت جن میں تہ بر تہ خوشے ہوتے ہیں! ⑩ تاکہ ہم بندوں کو رِزق عطا کریں، اور (اس طرح) ہم نے اُس پانی سے ایک مردہ پڑے ہوئے شہر کو زندگی دے دی۔ بس اسی طرح (انسانوں کا قبروں سے) نکلنا بھی ہوگا۔ ⑪ ان سے پہلے نوح کی قوم اور اَصحابُ الرس اور ثمود کے لوگوں نے بھی (اس بات کو) جھٹلایا تھا، ⑫ نیز قومِ عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے بھی، ⑬ اور اَصحابُ الایکہ اور تبع کی قوم نے بھی۔ ان سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا، اس لئے میں نے جس عذاب سے ڈرایا تھا، وہ سچ ہو کر رہا۔ ⑭ بھلا کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے تھک گئے تھے؟ نہیں! لیکن یہ

لوگ از سرِ نو پیدا کرنے کے بارے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ⑮

خلاصۂ تفسیر

قٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے قرآن مجید کی (یعنی جس کو دوسری کتابوں پر فضیلت و شرف ہے کہ ہم نے آپ کو عذابِ قیامت سے ڈرانے کے لئے بھیجا ہے مگر ان لوگوں نے نہ مانا) بلکہ ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی (کی جنس) میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایک ڈرانے والا (پیغمبر) آ گیا (جس نے ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا) سو (اس پر) کافر لوگ کہنے لگے کہ (اوّل تو خود) یہ (ایک) عجیب بات ہے (کہ بشر پیغمبر ہو، دوسرے پھر دعویٰ بھی عجیب بات کا کرے کہ دوبارہ زندہ ہوں گے بھلا) جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے یہ دوبارہ زندہ ہونا (امکان سے) بہت ہی بعید ہے (خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ ہم جیسے انسان ہیں ان کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں، پھر وہ اپنے دعوے میں ایک محال چیز کا دعویٰ کرتے ہیں، کہ مرنے اور مٹی ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اس کے جواب میں حق تعالیٰ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا امکان ثابت کر کے اُن کے محال کہنے کو رَد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کو تم جو غیر ممکن کہتے ہو اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ جن چیزوں کے زندہ ہونے کو کہا گیا ہے ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، یہ تو مشاہدہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ اس وقت تمہارے سامنے زندہ موجود ہیں، اگر زندگی کی صلاحیت ہی نہ ہوتی تو اس وقت کیسے زندہ ہیں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت اس لئے نہ ہو کہ جو اجزاءِ میّت کے مٹی ہو کر منتشر ہو گئے وہ اس کو معلوم نہ ہوں کہ کہاں بکھرے ہیں، تو اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ) ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی ہے اور) کم کرتی ہے اور (یہ نہیں کہ آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم تو قدیم ہے، حتیٰ کہ ہم نے قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیئے تھے اور اب تک) ہمارے پاس (وہ) کتاب (یعنی لوح) محفوظ (موجود) ہے (جس میں ان اجزاءِ منتشر کا مکان اور وضع اور مقدار اور وصف سب کچھ ہے، سو اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یوں ہی سمجھ لے کہ وہ دفتر جس میں سب کچھ ہے، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے مگر یہ لوگ پھر بھی بلا وجہ تعجب ہی میں ہیں اور صرف تعجب ہی نہیں) بلکہ سچی بات کو (جس میں مسئلۂ نبوّت اور آخرت کی دوبارہ زندگی بھی ہے) جبکہ وہ اُن کو پہنچتی ہے جھٹلاتے ہیں، غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں (کہ کبھی تعجب ہے، کبھی تکذیب ہے، یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے تھا، آگے بیان ہے قدرت کا یعنی) کیا ان لوگوں (کو ہماری قدرت کا علم نہیں ہے اور کیا انہوں) نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا (اونچا اور بڑا) بنایا اور (ستاروں سے) اس کو آراستہ کیا اور

اس میں (بوجہ مکمل استحکام کے) کوئی رخنہ تک نہیں (جیسا کہ اکثر تعمیرات میں زمانہ کے دراز ہونے کے بعد رخنہ پڑ جایا کرتا ہے، یہ تو آسمان میں ہماری قدرت نمایاں ہے) اور زمین (میں یہ قدرت ظاہر ہے کہ اس) کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اُگائیں جو ذریعہ ہے دانائی اور بینائی کا (یعنی ہماری قدرت کی معرفت کا) ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے (یعنی ایسے شخص کے لئے جو مصنوعات کو اس نظر سے دیکھے کہ ان کو کس نے بنایا ہے) اور (ہماری قدرت اس سے ظاہر ہے کہ) ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا پھر اس سے بہت سے باغ اُگائے اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے رزق دینے کے لئے اور (دوسری نباتات مثل گھاس وغیرہ کے جمانے کے لئے بھی) ہم نے اس (بارش) کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو زندہ کیا (پس) اسی طرح (سمجھ لو کہ مُردوں کا) زمین سے نکلنا ہوگا (کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کے اعتبار سے تمام مقدورات برابر ہیں بلکہ جو ذات بڑی چیزوں پر قادر ہے اس کا چھوٹی چیزوں پر قادر ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، اسی لئے آسمان و زمین کا یہاں ذکر کیا گیا، کہ ان کی تخلیق ایک مُردہ کو دوبارہ زندہ کرنے سے بہت بڑی بات ہے کما قال تعالیٰ (لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ) [1] (المؤمن: ۵۷) تو جب ان بڑے بڑے کاموں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ثابت ہوگئی تو مُردہ کو زندہ کر دینے پر کیوں نہ ہوگی، تو معلوم ہوا کہ مُردوں کو زندہ کرنا محال نہیں ممکن ہے، اور زندہ کرنے والا فاعلِ مختار بڑی قدرت والا ہے، پھر اس میں تعجب یا تکذیب کی کیا بات ہے، آگے تکذیب کرنے والوں کو ڈرانے کے لئے پچھلی امتوں کے واقعات بتلا کر وعید کی گئی ہے کہ جس طرح یہ لوگ انکارِ قیامت سے رسول کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح) ان سے پہلے قومِ نوح اور اصحاب الرّس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور قومِ لوط اور اصحاب اَیکہ اور قوم تُبَّع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو (یعنی اپنے اپنے پیغمبر کو توحید اور رسالت اور قیامت کے معاملہ میں) جھٹلایا سو میری وعید (ان پر) محقق ہوگئی (کہ ان سب پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح ان مکذبین پر عذاب آئے گا، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، وعید کے بعد پھر مضمون اوّل کی طرف دوسرے طور پر عود ہے کہ) کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ دوبارہ زندہ نہ کر سکیں، یعنی ایک مانع یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کام بھی ممکن ہو اور کرنے والے کو قدرت بھی پوری ہو، مگر کوئی عارضی مانع پیش آجائے جیسے کرنے والا تھک گیا ہو، اس لئے یہ کام نہیں کر سکا، اس آیت میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عیوب سے پاک ہے وہ کسی چیز سے متأثر نہیں ہوتا، نہ اس کو تکان ہونے کا کوئی امکان ہے، اس لئے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا دلائل سے ثابت ہوگیا، اور یہ لوگ جو انکار کر رہے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ ازسرنو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) شبہ میں (پڑے ہوئے) ہیں (جو دلائل کے سامنے کسی طرح قابلِ التفات نہیں)۔

---

[1] ترجمہ: بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔

معارف ومسائل

سورۂ قٓ کی خصوصیات

سورۂ قٓ میں بیشتر مضامین آخرت اور قیامت اور مُردوں کے زندہ ہونے اور حساب وکتاب سے متعلق ہیں، اور یہی مناسبت ہے اس کو اس سے پہلی سورۂ حجرات سے کہ اس کے آخر میں انہی مضامین کا ذکر تھا۔

سورۂ قٓ کی ایک خاص اہمیت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ اُم ہشام بنت حارثہ بن النعمانؓ کہتی ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب میرا مکان تھا) دو سال کے قریب ہمارا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنور (جس میں روٹی پکتی تھی) ایک ہی تھا، مجھے سورۂ قٓ پوری اس طرح حفظ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ (رواہ مسلم از قرطبی) [1]

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ علیہ نے ابو واقد لیثیؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازوں میں کونسی سورت پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں بکثرت سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے، (یہ سورت خاصی بڑی ہے) مگر اس کے باوجود نماز ہلکی رہتی تھی۔ (قرطبی) [2] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تلاوت کا خاص اثر تھا کہ بڑی سے بڑی سورت اور طویل سے طویل نماز بھی پڑھنے والوں پر ہلکی رہتی تھی۔

کیا آسمان نظر آتا ہے؟

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نظر آتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ یہ نیلگوں رنگ جو نظر آتا ہے یہ ہوا کا رنگ ہے، مگر اس کی نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، کہ یہی رنگ آسمان کا بھی ہو، اس کے علاوہ آیت میں نظر سے مراد نظر عقلی بمعنی غور وفکر بھی مراد ہوسکتی ہے۔ (بیان القرآن) [3]

اِحیاء بعد الموت پر مشہور شبہ کا جواب

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ کفار ومشرکین جو قیامت میں بعث بعد الموت (یعنی مُردوں کے زندہ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۱، وصحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب فی الخطبة والصلاة قصدًا ج:۱ ص:۲۸۶

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۱، وصحیح مسلم، کتاب صلاة العیدین، فصل فی قراءة قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ إلخ ج:۱ ص:۲۹۱

[3] بیان القرآن ج:۱۱ ص:۵۲

ہونے) کا انکار کرتے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تعجب ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے اکثر اجزاء جسم مٹی ہو جاتے ہیں، پھر وہ مٹی منتشر ہو کر دنیا میں پھیل جاتی ہے، پانی اور ہوا اس کے ذرّات کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں، قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء کو معلوم رکھنا کہ یہ جزء فلاں کا ہے، یہ فلاں کا، اور پھر ہر ایک کے اجزاء کو الگ الگ جمع کر دینا کس کے بس کی بات ہے؟ قرآن کریم نے اس کا جواب دیا کہ انسان اپنے محدود علم وبصیرت پر اللہ تعالیٰ کے غیر محدود ولامتناہی علم کو قیاس کر کے اس گمراہی میں پڑتا ہے (قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ)، اللہ تعالیٰ کا علم تو اتنا وسیع اور محیط ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک ایک جزء اس کی نظر میں ہے، وہ جانتا ہے کہ مُردے کے کس کس حصہ کو زمین نے کھالیا ہے، کیونکہ اس کی کچھ ہڈیاں تو اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں کہ ان کو زمین نہیں کھاتی، اور جن کو زمین کھا کر مٹی کر دیتی ہے پھر وہ مٹی دنیا جہان کے جس گوشہ میں پہنچتی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، جب وہ چاہے گا سب کو ایک جگہ جمع کر دے گا، اور ذرا غور کرو تو اس وقت ہر انسان کا جسم جن اجزاء سے مرکب چلتا پھرتا نظر آتا ہے اس میں تو ساری دنیا کے مختلف گوشوں کے اجزاء جمع ہیں، کوئی غذا کی صورت سے کوئی دوا کی صورت میں سارے عالم کے مختلف شہروں اور جنگلوں کے اجزاء یہی تو ہیں جن سے یہ موجود جسم مرکب ہوا ہے، پھر اس کے لئے کیا دشوار ہے کہ دوبارہ ان اجزاء کو دنیا میں منتشر کرنے کے بعد پھر ایک جگہ جمع کر دے، اور صرف یہی نہیں کہ اب مرنے اور مٹی ہونے کے بعد انسان کے یہ اجزاء اس کے علم میں آئے ہوں، بلکہ انسان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اور اس میں پیدا ہونے والے تغیرات اور پھر مرنے کے بعد اس پر کیا کیا حالات پیش آئیں گے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس پہلے سے لکھا ہوا لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔

پھر جو ایسا علیم وبصیر ہے اور جس کی قدرت اتنی کامل اور سب چیزوں پر حاوی ہے اس کے متعلق یہ تعجب کرنا خود قابلِ تعجب ہے، مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ اور جمہور مفسرین سے منقول ہے۔ (بحر محیط)[1]

فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ لفظ مَرِيْج کے معنی لغت میں مختلط کے ہیں، جس میں مختلف چیزوں کا اختلاط والتباس ہو اور ایسی چیز عموماً فاسد ہوتی ہے، اسی لئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مَرِيْج کا ترجمہ فاسد سے فرمایا، اور ضحاک اور قتادہ اور حسن بصری وغیرہ نے مُخْتَلِطْ اور مُلْتَبِسْ سے فرمایا،[2] مراد یہ ہے کہ کفار ومنکرین رسالت اپنے انکار میں بھی کسی ایک بات پر نہیں جمتے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر وجادوگر بتاتے ہیں، کبھی شاعر کہتے ہیں، کبھی کاہن ونجومی کہتے ہیں، اُن کا کلام خود ملتبس اور فاسد ہے، جواب کس کا دیا جائے۔

---

[1] تفسير البحر المحيط تحت هذه الآية ج:١٠ ص:١٢٠

[2] تفسير البحر المحيط ج:١٠ ص:١٢١

آگے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ کا بیان ہے جو آسمان وزمین اور ان کے اندر پیدا ہونے والی بڑی بڑی چیزوں کی تخلیق کے حوالہ سے کیا گیا ہے اس میں آسمان کے متعلق فرمایا وَمَالَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ ، فُرُوْجٌ، فَرْجٌ کی جمع ہے جس کے معنی شق کے آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ آسمان کا اتنا بڑا عظیم الشان کُرہ حق تعالیٰ نے بنایا ہے اگر انسان کی بنائی ہوئی چیز ہوتی تو اس میں ہزار جوڑ و پیوند اور شقوق کے نشانات پائے جاتے، مگر تم آسمان کو دیکھتے ہو اس میں نہ کوئی پیوند لگا ہوا ہے نہ کسی جگہ سے جُڑائی اور سلائی کے نشان نظر آتے ہیں اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ نے دروازے بنائے ہیں، دروازے کو شق نہیں کہا جاتا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ، سابقہ آیات میں کفار کی تکذیبِ رسالت وآخرت کا ذکر تھا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِیذا پہنچنا ظاہر ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لئے پچھلے انبیاء اور ان کی امتوں کے حالات بتلائے ہیں کہ ہر پیغمبر کو منکرین وکفار کی طرف سے ایسی ایذائیں پیش آتی ہی ہیں، یہ سنتِ انبیاء ہے، اس سے آپ شکستہ خاطر نہ ہوں، قوم نوح علیہ السلام کا قصہ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ ساڑھے نوسو برس نوح علیہ السلام ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے مگر ان کی طرف سے نہ صرف انکار بلکہ طرح طرح کی ایذائیں پہنچتی رہیں۔

''اَصْحٰبُ الرَّسِّ'' کون لوگ ہیں؟

اَصْحٰبُ الرَّسِّ، لفظ رَسّ عربی زبان میں مختلف معنی کے لئے آتا ہے، مشہور معنی یہ ہیں کہ کچے کنویں کو رس کہا جاتا ہے، جو اینٹ پتھر وغیرہ سے پختہ نہ کیا گیا ہو، اصحابُ الرس سے مراد قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگ ہیں جو عذاب کے بعد باقی رہے، ضحاک وغیرہ مفسرین نے ان کا قصہ یہ لکھا ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم (ثمود) پر عذاب آیا تو ان میں سے چار ہزار آدمی جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے وہ عذاب سے محفوظ رہے، یہ لوگ اپنے مقام سے منتقل ہو کر حضر موت میں جا کر مقیم ہو گئے، حضرت صالح علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے، ایک کنویں پر جا کر یہ لوگ ٹھہر گئے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہو گئی، اسی لئے اس جگہ کا نام حَضَرَ مَوْتُ (یعنی موت حاضر ہو گئی) ہے، یہ لوگ یہیں رہ پڑے، پھر ان کی نسل میں بت پرستی شروع ہو گئی، ان کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک نبی کو بھیجا، جس کو انہوں نے قتل کر ڈالا، اُن پر خدا تعالیٰ کا عذاب آیا، ان کا کنواں جس پر ان کی زندگی کا انحصار تھا وہ بیکار ہو گیا، اور عمارتیں ویران ہو گئیں، قرآن کریم نے اسی کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے: وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝۴۵ (الحج) یعنی چشم عبرت والوں کے لئے ان کا بیکار پڑا ہوا کنواں اور پختہ بنے ہوئے محلات ویران پڑے ہوئے عبرت کے لئے کافی ہیں۔[1]

ثمود: حضرت صالح علیہ السلام کی اُمت ہیں، ان کا واقعہ قرآن میں بار بار پہلے گزر چکا ہے۔

---

[1] تفسیر المظہری ج: ۹ ص: ۶۴

عاد ؛ قومِ عاد اپنے ڈیل ڈول اور قوت وشجاعت میں ضرب المثل تھی، حضرت ہود علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، اُن کو ستایا اُن کی نافرمانی کی، آخر کار ہوا کے طوفان کا عذاب آیا، اور سب فنا ہوئے۔

فِرْعَوْن؛ بہت ہی معروف ومشہور مصر کے بادشاہ کا نام ہے۔

اِخْوَانُ لُوْطٍ ؛ حضرت لوط علیہ السلام کی اُمت ہے، جن کا قصہ کئی مرتبہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ؛ اَیکہ گھنے جنگل اور بَن کو کہتے ہیں، یہ لوگ ایسے ہی مقام پر آباد تھے، حضرت شعیب علیہ السلام اُن کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے، انہوں نے نافرمانی کی، بالآخر عذابِ الٰہی سے تباہ وبرباد ہوئے۔

وَقَوْمُ تُبَّعٍ؛ تُبَّع یمن کے ایک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی ضروری تحقیق جلد ہفتم میں سورۂ دخان کے تحت گزر چکی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ

اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝١٦ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ

اور ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ، جب لیتے جاتے ہیں دو لینے والے

عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝١٧ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ

داہنے بیٹھا اور بائیں بیٹھا، نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس

رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝١٨ وَجَاۗءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ

ایک راہ دیکھنے والا تیار، اور وہ آئی بیہوشی موت کی تحقیق، یہ وہ ہے

مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝١٩ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝٢٠

جس سے تو ٹلتا رہتا تھا، اور پھونکا گیا صور یہ ہے دن ڈرانے کا،

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ

اور آیا ہر ایک جی اس کے ساتھ ہے ایک ہانکنے والا اور ایک احوال بتلانے والا، تو بے خبر رہا

مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ

اس دن سے اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری سو تیری نگاہ آج تیز ہے، اور بولا (فرشتہ)

قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿٢٣﴾ أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٢٤﴾

اس کے ساتھ والا یہ ہے جو میرے پاس تھا حاضر، ڈال دو تم دونوں دوزخ میں ہر ناشکر مخالف کو،

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ

نیکی سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا شبہ ڈالنے والا، جس نے ٹھہرایا اللہ کے ساتھ اور کو پوجنا سو ڈال دو اس کو

فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ

سخت عذاب میں، بولا (شیطان) اس کا ساتھی اے ربّ ہمارے میں نے اس کو شرارت میں نہیں ڈالا پر یہ تھا

فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُم

راہ کو بھولا دُور پڑا ہوا، فرمایا: جھگڑا نہ کرو میرے پاس اور میں پہلے ہی ڈرا چکا تھا تم کو

بِالْوَعِيدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾ ع ۲ ۱۴ ۱۶

عذاب سے، بدلتی نہیں بات میرے پاس اور میں ظلم نہیں کرتا بندوں پر

آسان ترجمۂ قرآن

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اُس کے دِل میں جو خیالات آتے ہیں، اُن (تک) سے ہم

خوب واقف ہیں، اور ہم اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں، ⑯ اُس وقت بھی جب (اعمال کو) لکھنے والے دو فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں، ایک دائیں جانب اور دُوسرا بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے۔ ⑰ انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اُس پر ایک نگراں مقرّر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لئے) تیار! ⑱ اور موت کی سختی سچ مچ آنے ہی والی ہے۔ (اے انسان!) یہ وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔ ⑲ اور صور پھونکا جانے والا ہے۔ یہ وہ دن ہوگا جس سے ڈرایا جاتا تھا۔ ⑳ اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا، اور ایک گواہی دینے والا۔ ㉑ حقیقت یہ ہے کہ تو اس واقعے کی طرف سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تجھ سے وہ پردہ ہٹا دیا ہے جو تجھ پر پڑا ہوا تھا، چنانچہ آج تیری نگاہ خوب تیز ہوگئی ہے۔ ㉒ اور اُس کا ساتھی کہے گا کہ: "یہ ہے وہ (اعمال نامہ) جو میرے پاس تیار ہے۔" ㉓ (حکم دیا جائے گا کہ) تم دونوں ہر اُس شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کٹر کافر اور حق کا پکا دُشمن تھا، ㉔ جو دُوسروں کو بھلائی سے روکنے کا عادی، بے حد زیادتی کرنے والا اور (حق بات میں) شک ڈالنے والا تھا، ㉕ جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا رکھا تھا۔ لہٰذا اب تم دونوں اُسے سخت عذاب میں ڈال دو۔ ㉖ اُس کا ساتھی کہے گا کہ: "اے ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔" ㉗ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ: "تم میرے سامنے جھگڑے نہ کرو، اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس عذاب کی دھمکی بھیج چکا تھا۔ ㉘ میرے سامنے وہ بات بدلی نہیں جاسکتی، اور میں بندوں پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔" ㉙

خلاصۂ تفسیر

(اوپر قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کا امکان ثابت ہو چکا ہے آگے اس کے وقوع کا بیان ہے اور وقوع موقوف ہے علم کامل اور قدرت کاملہ پر، اس لئے اوّل اس کو بتلاتے ہیں کہ) اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے قدرت پر) اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان (تک) کو (بھی) جانتے ہیں (تو جو افعال ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے صادر ہوں اُن کو جاننا تو بدرجۂ اَولیٰ ہے) اور (بلکہ ہم کو تو اس کے احوال کا ایسا علم ہے کہ اس کو خود بھی اپنے احوال کا ایسا علم نہیں پس باعتبار علم کے) ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ (جس کے قطع ہونے سے انسان مرجاتا ہے، اور چونکہ لوگوں کی عام عادت میں جانور کی رُوح نکالنے کے لئے گردن کاٹنے ہی کا طریقہ رائج ہے، اس لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی، اور یہ گردن کی رگیں وَرِیْد اور شریان دونوں کو محتمل ہیں، مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان میں رُوح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے، اور وَرِیْد میں بالعکس، اور یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے، اور سورۂ حاقہ میں لفظ وَتِیْن (الحاقۃ:۴۶) بمعنی رگِ دل سے تعبیر کرنا اس کا

مؤید ہے، کیونکہ جو رگیں دل سے نکلتی ہیں وہ شرائین ہیں، اور گو قرآن میں لفظ وَرِیْد ہے مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں، جس میں دل سے نکلنے والی رگیں شرائین بھی داخل ہیں اور جگر سے نکلنے والی رگیں وَرِیْد بھی، پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے، چنانچہ انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا تو علم ہی نہیں ہوتا، اور جن کا علم ہوتا ہے ان میں بھی بعض اوقات نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ میں ان احتمالات کی گنجائش ہی نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا، غرض علم الٰہی کا جمیع احوالِ انسانیہ کے ساتھ متعلق ہونا بھی ثابت ہو گیا، آگے اس کی مزید تاکید کے لئے یہ بیان فرمایا کہ انسان کے اعمال و احوال صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہوں بلکہ ظاہری حجت تمام کرنے کے لئے وہ اعمال فرشتوں کے ذریعہ لکھوا کر بھی محفوظ کئے گئے، ارشاد ہے) جب دو اخذ کرنے والے فرشتے (انسان کے اعمال کو جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں) اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ داہنی اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں (اور برابر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں، لقولہ تعالیٰ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ [1] (یونس) وقولہ تعالیٰ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ [2] (الجاثیۃ) یہاں تک کہ سب اعمال میں خفیف انسان کی گفتگو اور کلام ہے، مگر اس کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار (موجود ہوتا) ہے (اگر وہ نیکی کا کلام ہو تو داہنے والا اس کو ضبط اور تحریر میں لاتا ہے، اگر بدی کا کلام ہو تو بائیں والا، اور جب زبان سے نکلنے والا ایک ایک کلمہ محفوظ و مکتوب ہے تو دوسرے اعمال کیوں نہ ہوں گے) اور (چونکہ آخرت کی زندگی اور اعمال کی جزاء و سزاء سب کا مقدمہ موت ہے، اس لئے انسان کو متنبہ کرنے کے لئے آگے اس کا ذکر ہے، کیونکہ قیامت سے انکار درحقیقت موت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، ارشاد ہے کہ تو ہوشیار ہو جاؤ) موت کی سختی حقیقۃً (قریب) آپہنچی (یعنی ہر شخص کی موت قریب ہے چنانچہ ظاہر ہے) یہ (موت) وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا (اور بھاگتا) تھا (موت سے بھاگنا طبعی طور پر تو ہر نیک و بد میں یکساں ہے، اور کافر فاجر کا موت سے بھاگنا بوجہ حب دنیا کے اور بھی زیادہ واضح ہے، کسی خاص بندہ پر اللہ سے ملنے کے شوق کا غلبہ ہو کر موت کا لذیذ اور مطلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں کیونکہ وہ عام عادت انسانی سے مافوق حالت ہے) اور (اس مقدمہ یعنی ذکر موت کے بعد اب وقوعِ قیامت کا بیان ہے، جو کہ مقصود تھا یعنی قیامت کے دن دوبارہ) صور پھونکا جائے گا (جس سے سب زندہ ہو جائیں گے یہی دن ہوگا وعید کا (جس سے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا) اور (آگے قیامت کے ہولناک واقعات اور حالات کا بیان ہے) ہر شخص اس طرح (میدانِ قیامت میں) آئے گا کہ اس کے

---

[1] ترجمہ: بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب شرارتوں کو لکھ رہے ہیں۔

[2] ترجمہ: ہم تمہارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔

ساتھ (دو فرشتے ہوں گے جن میں) ایک (تو میدانِ قیامت کی طرف) اس کو اپنے ہمراہ لائے گا اور ایک (اس کے اعمال کا) گواہ ہوگا (حدیث مرفوع میں ہے کہ یہ سائق اور شہید وہی دو فرشتے ہیں جو زندگی میں انسان کے دائیں اور بائیں اس کے اعمال کو لکھتے تھے (رواہ فی الدر) [1] اور اگر یہ حدیث موافق شرائط محدثین کے قوی نہ ہو تو احتمال ہے کہ دو فرشتے اور ہوں جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں، گو اس صورت میں بھی بوجہ موافقتِ حدیث کے راجح احتمال اوّل ہی ہوگا اور جب وہ میدانِ قیامت میں حاضر ہوں گے تو ان میں جو کافر ہوں گے ان سے خطاب ہوگا کہ) تو اس دن سے بے خبر تھا (یعنی اس کا قائل نہ تھا) سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت اور انکار کا) ہٹا دیا (اور قیامت کا معائنہ کرا دیا) سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے (کہ کوئی امر مانعِ ادراک نہیں، کاش تو دنیا میں بھی اس مانعِ غفلت کو رفع کر دیتا تو تیرے دن بھلے ہوتے) اور (اس کے بعد) فرشتہ (کاتبِ اعمال) جو اس کے ساتھ رہتا تھا (اور اب بھی ایک قول پر سائق یا شاہد بن کر آیا ہے نامۂ اعمال حاضر کر کے) عرض کرے گا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے جو میرے پاس تیار ہے (کذا فسّر ھذا القرین بالملك ابن جریج والقرین الذی یلیه بالشیطان رواہ فی الدر) [2] چنانچہ اس روزنامچہ کے موافق کافروں کے بارے میں دو فرشتوں کو خواہ وہ سائق و شہید مذکور ہوں، یا اور دو فرشتے ہوں، حکم ہوگا کہ) ہر ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا ہو اور (حق سے) ضد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبدیت) سے باہر ہو جانے والا ہو اور (دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو، جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کیا ہو سو ایسے شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو (جب کفار کو معلوم ہوگا کہ اب خسارۂ ابدی میں پڑنے والے ہیں اس وقت اپنے بچاؤ کے واسطے گمراہ کرنے والوں کے ذمہ الزام رکھیں گے کہ ہمارا قصور نہیں ہمیں تو دوسروں نے گمراہ کیا ہے اور چونکہ ان گمراہ کرنے والوں میں شیاطین بھی داخل ہیں، اس لئے فرمایا کہ) وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اس کو (جبراً) گمراہ نہیں کیا تھا جیسا کہ اس کے الزام رکھنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے اختیار کو بالکل دخل نہ ہو) لیکن (بات یہ ہے کہ) یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں (باختیار خود) تھا (گو اغواء میں نے بھی کیا جس میں کوئی جبر نہ تھا، اس لئے اس کی گمراہی کا اثر مجھ پر نہ ہونا چاہئے) ارشاد ہوگا کہ میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے سود ہیں) اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا (کہ جو کفر کرے گا از خود یا کسی کے اغواء سے اور جو کفر کا حکم کرے گا خواہ اپنی مرضی سے یا کسی کے جبر سے سب کو جہنم کی سزا علیٰ تفاوت المراتب دوں گا سو) میرے ہاں (وہ) بات (وعید مذکور کی) نہیں بدلی جائے گی (بلکہ تم سب دوزخ میں

---

[1] الدر المنثور ج: ۹ ص: ۲۸۴

[2] الدر المنثور تحت ھٰذہ الآیة ج: ۹ ص: ۲۸۴

جھونکے جاؤ گے) اور میں (اس تجویز میں) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (بلکہ بندوں نے خود ایسے ناشائستہ کام کئے جس کی سزا آج بھگت رہے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منکرین حشر و نشر اور مُردوں کے زندہ ہونے کو بعید از عقل و قیاس کہنے والوں کے شبہات کا ازالہ اس طرح کیا تھا کہ تم نے حق تعالیٰ کے علم کو اپنے علم و بصیرت پر قیاس کر رکھا ہے اس لئے یہ اشکال ہے کہ مُردے کے اجزاء مٹی ہو کر دنیا میں بکھرنے کے بعد ان کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے، مگر حق تعالیٰ نے بتلایا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے، ہمارے لئے ان سب کو جب چاہیں جمع کر دینا کیا مشکل ہے، آیات مذکورہ میں بھی علم الٰہی کی وسعت اور ہمہ گیری کا بیان ہے، کہ انسان کے اجزائے منتشرہ کا علم ہونے سے بھی زیادہ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر انسان کے دل میں آنے والے خیالات کو بھی ہر وقت ہر حال میں جانتے ہیں، اور اس کی وجہ دوسری آیت میں یہ بیان فرمائی کہ ہم انسان سے اتنے قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن جس پر اس کی زندگی کا مدار ہے وہ بھی اتنی قریب نہیں، اس لئے ہم اس کے حالات کو خود اس سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں اس کی تحقیق

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ کا جمہور مفسرین نے یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ قرب سے مراد قرب علمی اور احاطۂ علمی ہے قربِ مسافت مراد نہیں۔

لفظ وَرِيْد عربی زبان میں ہر جاندار کی وہ رگیں ہیں جن سے خون کا سیلان تمام بدن میں ہوتا ہے، طبّی اصطلاح میں یہ دو قسم کی رگیں ہیں، ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور خالص خون سارے بدنِ انسانی میں پہنچاتی ہیں، طبی اصطلاح میں صرف انہی رگوں کو وَرِيْد اور جمع کو اَوْرِدَہ کہا جاتا ہے، دوسری قسم وہ رگیں جو حیوان کے قلب سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ جس کو طبّی اصطلاح میں رُوح کہا جاتا ہے، وہ اسی طرح تمام بدنِ انسانی میں پھیلاتی اور پہنچاتی ہیں ان کو شریان اور شرائین کہا جاتا ہے، پہلی قسم کی رگیں موٹی اور دوسری باریک ہوتی ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں یہ ضروری نہیں کہ وَرِيْد کا لفظ طبّی اصطلاح کے مطابق اس رگ کے لئے لیا جائے جو جگر سے نکلتی ہے، بلکہ قلب سے نکلنے والی رگ کو بھی لغت کے اعتبار سے وَرِيْد کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کا خون ہی دوران کرتا ہے، اور اس جگہ چونکہ مقصود آیت کا انسان کے قلبی خیالات اور احوال سے مطلع ہونا ہے، اس لئے وہ زیادہ انسب

ہے، اور بہر حال خواہ وَرِيْد باصطلاحِ طب جگر سے نکلنے والی رگ کے معنی میں ہو یا قلب سے نکلنے والی شریان کے معنی میں، بہر دو صورت جاندار کی زندگی اس پر موقوف ہے، یہ رگیں کاٹ دی جائیں تو جاندار کی رُوح نکل جاتی ہے، تو خلاصہ یہ ہوا کہ جس چیز پر انسان کی زندگی موقوف ہے ہم اس چیز سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں یعنی اس کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔

اور صوفیائے کرام کے نزدیک قرب سے مراد اس جگہ صرف قربِ علمی اور احاطۂ علمی ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے، جس کی حقیقت اور کیفیت تو کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی، مگر یہ قرب و اتصال بلا کیف موجود ضرور ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ (العلق) ''یعنی سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہو جاؤ۔'' اور ہجرت کے واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (التوبۃ: ۴۰) ''یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے'' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ (الشعراء: ۶۲) ''یعنی میرا ربّ میرے ساتھ ہے'' اور حدیث میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ سجدہ میں ہو، [۱] اسی طرح حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''میرا بندہ میرے ساتھ نفلی عبادات کے ساتھ تقرب حاصل کرتا رہتا ہے۔'' [۲]

یہ قرب و تقرب جو عبادات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کے اپنے کسب و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے یہ صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے، اور ایسے مؤمنین اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جن کو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تقرب حاصل ہو یہ اتصال و قرب اس قرب کے علاوہ ہے جو حق تعالیٰ کو ہر انسان مؤمن و کافر کی جان کے ساتھ یکساں ہے، غرض مذکورہ آیات و روایات اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتصال حاصل ہے گو ہم اس کی حقیقت اور کیفیت کا ادراک نہ کرسکیں، مولانا رومی نے اسی کو فرمایا ہے ؎

اتصالے بے مثال و بے قیاس — ہست ربّ الناس را با جانِ ناس [۳]

یہ قرب و اتصال آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ فراستِ ایمانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

تفسیر مظہری میں اسی قرب و اتصال کو اس آیت کا مفہوم قرار دیا ہے، [۴] اور جمہور مفسرین کا قول پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اتصال سے مراد اتصالِ علمی اور احاطۂ علمی ہے، اور ابن کثیر نے ان دونوں معنی سے الگ ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، ج:۱ ص:۱۹۱

[۲] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ج:۲ ص:۹۶۲

[۳] ترجمہ: لوگوں کے رَبّ کو ان کی جان کے ساتھ ایسا تعلق ہے جس کی نہ تو کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے اور نہ ہی وہ عقل میں آسکتا ہے۔

[۴] التفسیر المظہری ج:۹ ص:۶۸

ہے کہ آیت میں لفظ وَنَحْنُ سے خود حق تعالیٰ کی ذات مراد نہیں، بلکہ اس کے فرشتے مراد ہیں،[۱] جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، وہ انسان کی جان سے اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ خود انسان بھی اپنی جان سے اتنا باخبر نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ، تَلَقِّی کے لغوی معنی اخذ کرنے، لے لینے اور حاصل کر لینے کے آتے ہیں، فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرۃ: ۳۷) "یعنی لے لئے اور حاصل کر لئے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات" اس آیت میں مُتَلَقِّيَان سے مراد وہ دو فرشتے ہیں جو ہر انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس کے اعمال کو اپنے صحیفوں میں لکھتے رہتے ہیں، عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ "یعنی ان میں ایک اس کے داہنی طرف رہتا ہے (جو اس کے اعمالِ صالحہ کو لکھتا ہے) دوسرا اس کے بائیں جانب (جو اس کی سیئات کو لکھتا ہے) قَعِيْدٌ بمعنی القاعد ہے مفرد و جمع دونوں کے لئے لفظ قعید استعمال ہوتا ہے، اگرچہ قعید بمعنی قاعد ہے، جیسے جلیس بمعنی جالس، مگر ایک فرق یہ ہے کہ قاعد اور جالس تو صرف بیٹھنے کی حالت میں بولا جاتا ہے، اور قعید و جلیس عام ہے جو کسی کے ساتھ ہو خواہ بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے یا چلتے پھرتے ہوئے ان کو قعید و جلیس کہیں گے، ان دونوں فرشتوں کا یہی حال ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بیٹھا ہو یا کھڑا، چلتا پھرتا ہو یا سو رہا ہو، صرف ایسی حالت میں جبکہ یہ پیشاب، پاخانہ یا جماع کی ضرورت سے ستر کھولے ہوتا ہے تو یہ فرشتے ہٹ جاتے ہیں، مگر اللہ نے ان کو اس کا ملکہ دے دیا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ کوئی گناہ کریں تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے۔

ابن کثیر نے احنف بن قیس کی روایت سے لکھا ہے کہ ان دو فرشتوں میں سے صاحبِ یمین نیک اعمال لکھتا ہے اور وہ صاحبِ شمال یعنی بائیں جانب کے فرشتے کا بھی نگران و امین ہے، اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو صاحبِ یمین صاحبِ شمال سے کہتا ہے کہ ابھی اس کو اپنے صحیفے میں نہ لکھو اس کو مہلت دو اگر توبہ کر لی تو رہنے دو ورنہ پھر اعمال نامہ میں درج کرو۔ (رواہ ابن ابی حاتم)[۲]

اعمال نامہ لکھنے والے فرشتے

حضرت حسن بصریؒ نے آیت مذکورہ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ تلاوت فرما کر کہا:-

---

[۱] التفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۳۹۸

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۹۹

"اے ابن آدم! تیرے لئے نامۂ اعمال بچھادیا گیا ہے، اور تجھ پر دو معزز فرشتے مقرر کردیئے گئے ہیں، ایک تیری داہنی جانب دُوسرا بائیں جانب، داہنی جانب والا تیری حسنات کو لکھتا ہے اور بائیں جانب والا تیری سیئات اور گناہوں کو، اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جو تیرا جی چاہے عمل کر اور کم کر یا زیادہ، یہاں تک کہ جب تو مرے گا تو یہ صحیفہ یعنی نامۂ اعمال لپیٹ دیا جائے گا، اور تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا، جو تیرے ساتھ قبر میں جائے گا، اور رہے گا، یہاں تک کہ جب تو قیامت کے روز قبر سے نکلے گا تو اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا (وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴) (بنی اسرائیل) "یعنی ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لگادیا ہے اور قیامت کے روز وہ اس کو کھلا ہوا پائے گا، اب اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لے تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے۔"

پھر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اس ذات نے بڑا عدل وانصاف کیا، جس نے خود تجھ کو ہی تیرے اعمال کا محاسب بنادیا، (ابن کثیر) [۱] یہ ظاہر ہے کہ اعمال نامہ کوئی دنیوی کاغذ تو ہے نہیں، جس کے قبر میں ساتھ جانے اور قیامت تک باقی رہنے پر اشکال ہو ایک معنوی چیز ہے جس کی حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اس لئے اس کا ہر انسان کے گلے کا ہار بننا اور قیامت تک باقی رہنا کوئی تعجب کی چیز نہیں۔

انسان کا ہر قول ریکارڈ کیا جاتا ہے

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸ (یعنی انسان کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالتا جس کو یہ نگراں فرشتہ محفوظ نہ کرلیتا ہو) حضرت حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ یہ فرشتے اس کا ایک ایک لفظ لکھتے ہیں، خواہ اس میں کوئی گناہ یا ثواب ہو یا نہ ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صرف وہ کلمات لکھے جاتے ہیں جن پر کوئی ثواب یا عتاب ہو، [۲] ابن کثیرؒ نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آیت قرآن کے عموم سے پہلی ہی بات کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، کہ ہر ہر لفظ لکھا جاتا ہے، پھر علی ابن ابی طلحہؒ کی ایک روایت ابن عباسؓ ہی سے ایسی نقل فرمائی جس میں یہ دونوں قول جمع ہوجاتے ہیں، اس روایت میں یہ ہے کہ پہلے تو ہر کلمہ لکھا جاتا ہے، خواہ گناہ وثواب اس میں ہو یا نہ ہو، مگر ہفتے میں جمعرات کے روز اس پر فرشتے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۹۹

[۲] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث: ۳۷۳۰

نظر ثانی کر کے صرف وہ رکھ لیتے ہیں جن میں ثواب یا عتاب ہو یعنی خیر یا شر ہو، باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، قرآنِ کریم میں یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ ﴿۳۹﴾ [1] (الرعد) کے مفہوم میں یہ محو و اثبات بھی داخل ہے۔ [2]

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

انسان بعض اوقات کوئی کلمہ خیر بولتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، مگر یہ اس کو معمولی بات سمجھ کر بولتا ہے، اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا ثواب کہاں تک پہنچا، کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضائے دائمی قیامت تک کی لکھ دیتے ہیں، اسی طرح انسان کوئی کلمہ اللہ کی ناراضی کا (معمولی سمجھ کر) زبان سے نکال دیتا ہے اس کو گمان نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ و وبال کہاں تک پہنچے گا، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس شخص سے اپنی دائمی ناراضی قیامت تک کے لئے لکھ دیتے ہیں۔ (از ابن کثیر) [3]

حضرت علقمہؒ حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس حدیث نے مجھے بہت سی باتیں زبان سے نکالنے کو روک دیا ہے۔ (ابن کثیر) [4]

سکرات الموت

وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ ﴿۱۹﴾، سَکْرَۃُ الْمَوْتِ کے معنی موت کی شدت اور غشی جو موت کے وقت پیش آتی ہے، ابوبکر بن الانباریؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت مسروق سے روایت کی ہے کہ جب حضرت صدیقِ اکبرؓ پر موت کے آثار شروع ہوئے تو صدیقہ عائشہؓ کو بلایا، وہ پہنچیں تو یہ حالت دیکھ کر بے ساختہ ایک شعر زبان سے نکلا۔

اِذَا حَشْرَجَتْ یَوْمًا وَضَاقَ بِھَا الصَّدْرُ

"یعنی جب رُوح ایک دن مضطرب ہوگی اور سینہ اس سے تنگ ہو جائے گا۔"

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ تم نے فضول یہ شعر پڑھا، یوں کیوں نہ کہا (وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ

---

[1] ترجمہ: خدا تعالیٰ جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب ان ہی کے پاس ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۹۸، ۳۹۹، وتفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۸۶۳۲

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۹۸، وجامع الترمذی، ابواب الزھد، باب فی قلۃ الکلام ج:۲ ص:۵۸، ومسند احمد، حدیث بلال بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث:۱۵۸۵۲

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۳۹۸

الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالت پیش آئی تو آپ پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرۂ مبارک پر ملتے اور فرماتے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ، یعنی کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے فرمایا کہ موت کی بڑی شدتیں ہوتی ہیں۔ [۱]

بِالْحَقِّ ۖ اس میں حرف باء تعدیہ کے لئے ہے، معنی یہ ہیں کہ لے آئی شدّتِ موت امر حق کو یعنی موت کی شدت نے وہ چیزیں سامنے کردیں جو حق وثابت ہیں، اور کسی کو ان سے فرار کی گنجائش نہیں۔ (مظہری) [۲]

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ تَحِيْدُ، حَيْدٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی مائل ہونے، جگہ سے ہٹ جانے اور اقرار کرنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ موت وہ چیز ہے جس سے تو بدَکتا اور بھاگتا تھا۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہے، موت سے بدَکنا اور بھاگنا طبعی طور پر پوری نوعِ انسانی میں پایا جاتا ہے، ہر شخص زندگی کو مرغوب اور موت کو آفت و مصیبت سمجھ کر اس سے بچنے کی تدبیریں کرتا ہے، جو شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں، لیکن آیت میں بتلانا یہ منظور ہے کہ انسان کی یہ طبعی اور فطری خواہش مکمل طور پر ہرگز پوری نہیں ہوسکتی، ایک نہ ایک دن تو بہرحال موت نے آنا ہی ہے، خواہ تم اس سے کتنا ہی بھاگنا چاہو۔

انسان کو میدانِ حشر میں لانے والے دو فرشتے

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ اس آیت سے اُوپر قیامت قائم ہونے کا ذِکر ہے، اس آیت میں میدانِ حشر میں تمام انسانوں کے حاضر ہونے کی ایک خاص کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک سَآئِقٌ ہوگا۔ سَآئِقٌ کہتے ہیں اس شخص کو جو جانوروں کے یا کسی جماعت کے پیچھے رہ کر اس کو کسی خاص جگہ پر پہنچانا چاہتا ہے، اور شَهِيْدٌ کے معنی گواہ کے ہیں، سَآئِقٌ کا فرشتہ ہونا تو باتفاق روایت سے ثابت ہے، شَهِيْدٌ کے بارے میں علمائے تفسیر کے اقوال مختلف ہیں، بعض کے نزدیک وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا، اس طرح سَآئِقٌ اور شَهِيْدٌ دو فرشتے ہوگئے، ایک کا کام اس کو میدانِ حشر میں پہنچانا ہے، دُوسرے کا کام یہ ہے کہ جب اس کے اعمال پیش ہوں تو وہ اُس پر گواہی دیں یہ دو فرشتے وہ بھی ہوسکتے ہیں جو اِنسان کے داہنے اور بائیں اعمال کی کتابت کے لئے ہر وقت دُنیا میں ساتھ رہتے ہیں، یعنی کرام کاتبین، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور دو ہوں۔

اور شَهِيْدٌ کے متعلق بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ انسان کا عمل ہوگا، اور بعض نے خود اسی انسان کو شَهِيْدٌ

---

[۱] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۴۰۰، وكنز العمال رقم الحديث:۳۵۷۱۸

[۲] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۹

فرمایا، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر آیت سے یہی ہے کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا جو اس کے اعمال پر شہادت دے گا، حضرت عثمان غنیؓ نے خطبہ میں یہ آیت تلاوت فرما کر یہی تفسیر فرمائی ہے، اور حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید مفسرین سے بھی یہی منقول ہے، ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ [1]

مرنے کے بعد آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو زندگی میں نہ دیکھ سکتی تھیں

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (یعنی ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا آج تمہاری نگاہ بڑی تیز ہے) اس کا مخاطب کون ہے، اس میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر راجح یہی ہے کہ عام انسان مخاطب ہیں، جن میں مؤمن، کافر، متقی، فاسق، سب داخل ہیں، اسی تفسیر کو ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اختیار فرمایا ہے، [2] اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی مثال خواب کی سی زندگی کی ہے، اور آخرت کی مثال بیداری کی، جیسے خواب میں آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں کچھ نہیں دیکھتا، اسی طرح انسان اُن حقائق کو جن کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے دنیا میں آنکھوں سے نہیں دیکھتا، مگر یہ ظاہری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ خواب کا عالم ختم ہو کر بیداری کا عالم آتا ہے، جس میں وہ سارے حقائق سامنے آجاتے ہیں اسی لئے بعض علماء نے فرمایا اَلنَّاسُ نِيَامٌ فَإِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوْا (یعنی آج کی دنیا کی زندگی میں سب انسان سو رہے ہیں جب مریں گے اُس وقت جاگیں گے)۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے رہتا تھا، اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتے ہوتے ہیں، مگر قیامت میں انسان کی حاضری کے وقت ایک کو سَآئِقٌ دوسرے کو شَهِيْدٌ اس سے پہلی آیت میں فرمایا ہے، اس لئے نسقِ کلام سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کاتبِ اعمال دو فرشتوں کو میدانِ حشر میں اس کی حاضری کے وقت دو کام سپرد کر دیئے گئے ہیں، ایک کے ذمہ اس کے پیچھے رہ کر اس کو میدانِ حشر میں پہنچانا لگا دیا گیا، جس کو آیت میں سَآئِقٌ کا نام دیا گیا ہے دوسرے کے سپرد اس کے نامۂ اعمال کر دیئے گئے، جس کو شَهِيْدٌ کے نام سے تعبیر کیا گیا، تو میدانِ حشر میں پہنچنے کے بعد نامۂ اعمال والا فرشتہ یعنی شَهِيْدٌ یہ عرض کرے گا هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ یعنی اس کے اعمال میرے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں لفظ "قرین" سَآئِقٌ اور شَهِيْدٌ دونوں کو شامل ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۰۱

[2] بحوالۂ بالا۔

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۰۲

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ لفظ اَلْقِيَا تثنیہ کا صیغہ ہے جو دو شخصوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں جن دو فرشتوں کو خطاب ہے وہ کون ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یہی دو فرشتے جن کو پہلے سَآئِقٌ اور شَهِيْدٌ کہا گیا ہے اس کے مخاطب ہیں، بعض حضرات مفسرین نے دوسری توجیہات بھی لکھی ہیں۔ (از ابن کثیر) [1]

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ، لفظ قرین کے اصلی معنی پاس رہنے والے اور ملے ہوئے کے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے پچھلی آیت میں قرین سے مراد وہ فرشتہ یا فرشتے لئے گئے ہیں جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں اور انسان کے ساتھ جیسے دو فرشتے قرین بنائے گئے ہیں اسی طرح ایک شیطان بھی ہر انسان کا قرین رہتا ہے جو اس کو گمراہی اور گناہوں کی طرف بلاتا ہے، اس آیت میں قرین سے یہی شیطان مراد ہے، جب اس شخص کو جہنم میں ڈالنے کا حکم ہو جائے گا تو یہ شیطان اس سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا کہ اس کو میں نے گمراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی گمراہ تھا کہ گمراہی کی بات کو قبول کرتا اور نیک بات پر کان نہ دھرتا تھا ظاہر کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں جانے والا اُس وقت یہ عذر کرے گا کہ مجھے تو اس شیطان نے بہکایا تھا، ورنہ میں نیک کام کرتا، اس کے جواب میں شیطان اپنی براءت ظاہر کرے گا، ان دونوں کے جھگڑے کے جواب میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا:

لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ ''یعنی میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں تو پہلے ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ تمہارے فضول عذر کا جواب دے چکا ہوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ دلائل واضح کر چکا ہوں، یہ فضول عذر تراشی اور جھگڑا آج نہ چلے گا۔''

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ ''میرے پاس قول بدلا نہیں کرتا جو فیصلہ کر دیا ہے وہ نافذ ہوگا، اور ہم نے کوئی کسی پر ظلم نہیں کیا، عین انصاف کا فیصلہ ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ وَاُزْلِفَتِ

جس دن ہم کہیں دوزخ کو تو بھر بھی چکی اور وہ بولے کچھ اور بھی ہے، اور نزدیک لائی جائے

الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾

بہشت ڈرنے والوں کے واسطے دُور نہیں، یہ ہے جس کا وعدہ ہوا تھا تم سے ہر ایک رجوع رہنے والے یاد رکھنے والے کے واسطے،

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۰۲

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِۨ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ

جو ڈرا رحمٰن سے بن دیکھے اور لایا دل رجوع ہونے والا، چلے جاؤ اس میں سلامت

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا، ان کے واسطے ہے وہاں جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی

آسان ترجمۂ قرآن

وہ وقت (یاد رکھو) جب ہم جہنم سے کہیں گے کہ: ''کیا تو بھر گئی؟'' اور وہ کہے گی کہ: ''کیا کچھ اور بھی ہے؟'' ﴿۳۰﴾ اور پرہیزگاروں کے لئے جنت اتنی قریب کر دی جائے گی کہ کچھ بھی دُور نہیں رہے گی۔ ﴿۳۱﴾ (اور کہا جائے گا کہ:) ''یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے یہ وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر اُس شخص کے لئے ہے جو اللہ سے خوب لو لگائے ہوئے ہو، (اور) اپنی نگرانی رکھنے والا ہو، ﴿۳۲﴾ جو خدائے رحمٰن سے اُسے دیکھے بغیر ڈرتا ہو، اور اللہ کی طرف رُجوع ہونے والا دِل لے کر آئے۔ ﴿۳۳﴾ تم سب اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔'' وہ دن ابدی زندگی کا دن ہوگا۔ ﴿۳۴﴾ ان (جنتیوں) کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہاں وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس کچھ اور زیادہ بھی ہے۔ ﴿۳۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(یہاں سے محشر کے بقیہ واقعات کا بیان ہے کہ وہ دن لوگوں کو یاد دلائیے) جس دن کہ ہم دوزخ سے (کفار کو اس میں داخل کرنے کے بعد) کہیں گے کہ تو بھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے (یہ پوچھنا شاید کفار کو اور زیادہ ڈرانے کے لئے ہو کہ جواب سن کر ان کے دل میں دوزخ کی اور بھی زیادہ ہول پیدا ہو جائے کہ ہم کیسے غضب کے ٹھکانے پر پہنچے ہیں جو سب کو کھا جانا چاہتا ہے، اور جہنم کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ کا جواب بھی غالباً اسی غیظ و غضب کا مظاہرہ ہے جو جہنم کو خدا کے دشمن کفار کے ساتھ ہے جس کا ذکر سورۂ ملک میں ان الفاظ سے آیا ہے وَهِيَ تَفُوْرُ ﴿۷﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ [1] جہنم نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میرا پیٹ نہیں بھرا بلکہ مزید کی فرمائش بوجہ غیظ و غضب کے کی، اس لئے قرآن میں دوسری جگہ جو حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (ہود) (یعنی میں بھر دوں گا

[1] ترجمہ: اور وہ جوش مارتی ہوگی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ غصہ کے مارے پھٹ پڑے گی۔

جہنم کو جنات اور انسانوں سے) یہ اس کے منافی نہیں، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدۂ سابقہ لَاَمۡلَئَنَّ کے لئے جنات اور انسانوں کو جہنم میں ڈالتے جائیں گے اور وہ یہی کہتا رہے گا کہ کچھ اور بھی ہے (ابن کثیر)[1] اور (جنت کا بیان یہ ہے کہ وہ) جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی (اور متقیوں سے کہا جائے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (بایں عنوان) وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال وطاعات کی) پابندی کرنے والا ہو (غرض یہ کہ) جو خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہوگا اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آئے گا (ان کو حکم ہوگا کہ) اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لئے حکم ہونے) کا اُن کو بہشت میں سب کچھ ملے گا جو چاہیں گے اور ہمارے پاس (ان کی چاہی ہوئی چیزوں سے) اور بھی زیادہ (نعمت) ہے (کہ وہاں تک جنتی کا ذہن بھی نہ پہنچے گا جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی نعمتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ایسی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا،[2] ان نعمتوں میں سے ایک نعمت حق تعالیٰ کا دیدار ہے۔

معارف ومسائل

اَوّاب کون لوگ ہیں؟

لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾ یعنی جنت کا وعدہ ہر اُس شخص کے لئے ہے جو اَوّابْ اور حَفِيْظ ہو، اَوّابْ کے معنی رجوع ہونے والے کے ہیں، مراد وہ شخص ہے جو معاصی سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور شعبیؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ اَوّابْ وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور ان سے اِستغفار کرے، اور حضرت عبید بن عمیرؒ نے فرمایا کہ اَوّابْ وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے، اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اَوّابْ اور حَفِيْظ وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دُعا پڑھے: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَغْفِرُكَ مِمَّآ اَصَبْتُ فِيْ مَجْلِسِيْ هٰذَا (پاک ہے اللہ اور اسی کی حمد ہے، یا اللہ میں مغفرت مانگتا ہوں اُس بُرائی سے جو میں نے اس مجلس میں کی ہو)۔[3]

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی مجلس سے اُٹھنے کے وقت یہ دُعا پڑھے اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۷ ص:۴۰۳

[2] صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة ج:۱ ص:۴۳، وصحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها ج:۲ ص:۳۷۸

[3] تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۲۰

اس کے وہ سب گناہ معاف فرمادیں گے جو اس مجلس میں سرزد ہوئے، دُعا یہ ہے:-

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ۔

یعنی یا اللہ! تو پاک ہے اور تیری حمد و ثناء ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ [1]

اور حَفِيْظ کے معنی حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بتلائے کہ جو شخص اپنے گناہوں کو یاد رکھے تا کہ ان سے رُجوع کر کے تلافی کرے، اور ان سے ایک روایت میں حَفِيْظ کے معنی هُوَ الْحَافِظُ لِاَمْرِ اللّٰهِ کے بھی منقول ہیں، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو یاد رکھے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شروع دن میں چار رکعتیں (اشراق کی) پڑھ لے وہ اَوَّاب اور حَفِيْظ ہے۔ (قرطبی) [2]

وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴿۳۳﴾ ابوبکر ورّاقؒ فرماتے ہیں کہ مُنِيْب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے، اور اس کے سامنے تواضع اور عاجزی سے رہے، اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا، (یعنی اہلِ جنت کو جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے) یعنی اہلِ جنت جس چیز کی خواہش کریں گے وہ فوراً حاضر تیار ملے گی، دیر و انتظار کی زحمت نہ ہوگی، مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں اگر کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہوگی تو حمل اور وضعِ حمل، پھر بچے کا بڑھنا یہ سب ایک ساعت میں ہو جائے گا۔ (ابن کثیر) [3]

وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾ یعنی ہمارے پاس ایسی نعمتیں بھی ہیں جن کی طرف انسان کا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا اس لئے وہ اُن کی خواہش بھی نہیں کر سکتا، حضرت انس اور جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ مزید نعمت حق تعالیٰ کی زیارت بلا کیف ہے جو اہلِ جنت کو حاصل ہوگی، اس مضمون کی احادیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ [4] (یونس:۲۶) کی تفسیر میں روایت کی گئی ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ اہلِ جنت کو زیارتِ حق سبحانہ وتعالیٰ جمعہ کے روز ہوا کرے گی۔ (قرطبی) [5]

---

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی کفارة المجلس ج:۲ ص:۲۶۷، وجامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما یقول إذا قام من المجلس ج:۲ ص:۱۸۱

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۰، مزید دیکھئے کنز العمال رقم الحدیث:۲۱۵۰۷

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲، وجامع الترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء ما لأدنیٰ اهل الجنة من الكرامة ج:۲ ص:۸۲، ومسند احمد، مسند ابی سعید الخدری رضی الله عنه، رقم الحدیث:۱۱۰۶۳

[4] ترجمہ: جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید براں بھی۔

[5] تفسیر القرطبی ج:۷ ص:۲۱، ومسند البزار، مسند ابی حمزة انس بن مالك (رضی الله عنه) رقم الحدیث:۷۵۲۸

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا فَنَقَّبُوۡا فِى الۡبِلَادِ ؕ

اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ اُن کی قوت زبردست تھی ان سے پھر لگے کُریدنے شہروں میں،

هَلۡ مِنۡ مَّحِيۡصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ

کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانا، اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے

اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِيۡدٌ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا

یا لگائے کان دل لگا کر، اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ

بَيۡنَهُمَا فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ

اُن کے بیچ میں ہے چھ دن میں، اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان، سو تو سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے ہیں

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ ۚ ﴿۳۹﴾

اور پاکی بولتا رہ خوبیاں اپنے ربّ کی پہلے سورج کے نکلنے سے اور پہلے ڈوبنے سے،

وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ ﴿۴۰﴾

اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیچھے سجدہ کے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ان (مکہ کے کافروں) سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کی طاقت پر گرفت ان سے زیادہ سخت تھی، چنانچہ اُنہوں نے سارے شہر چھان مارے تھے۔ کیا اُن کے لئے بھاگنے کی کوئی جگہ تھی؟ ﴿۳۶﴾ یقیناً اس میں اُس شخص کے لئے بڑی نصیحت کا سامان ہے جس کے پاس دِل ہو، یا جو حاضر دِماغ بن کر کان دَھرے۔ ﴿۳۷﴾ اور ہم نے سارے آسمان اور زمین کو اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، اور ہمیں ذرا سی تھکاوٹ بھی چھو کر نہیں

گذری۔ (۳۸) لہٰذا (اے پیغمبر!) جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں، تم اُس پر صبر کرو، اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو، سورج نکلنے سے پہلے بھی، اور سورج ڈوبنے سے پہلے بھی۔ (۳۹) اور رات کے حصوں میں بھی اُس کی تسبیح کرو، اور سجدوں کے بعد بھی۔" (۴۰)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم ان (اہلِ مکہ) سے پہلے بہت سی اُمتوں کو (ان کے کفر کی شامت سے) ہلاک کر چکے ہیں، جو قوت میں ان سے (کہیں) زیادہ تھے اور (دنیا کا سامان بڑھانے کے لئے) تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (یعنی قوت کے ساتھ اسبابِ معیشت میں بھی بڑی ترقی کی تھی، لیکن جب ہمارا عذاب نازل ہوا تو ان کو) کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہ ملی (یعنی کسی طرح بچ نہ سکے) اس (واقعۂ ہلاک) میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے، جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا (اگر فہیم نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سننے کے بعد اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اس بات کو قبول کر لیتا ہو) اور (اگر قیامت کا انکار اس بناء پر ہے کہ تم اللہ کی قدرت کو اس سے قاصر سمجھتے ہو تو وہ اس لئے باطل ہے کہ ہماری قدرت ایسی ہے کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس سب کو چھ دن (کی مقدار کے موافق زمانہ) میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں (پھر آدمی کا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، وھذا کقولہ تعالٰی فی الأحقاف اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى [1] (الاحقاف: ۳۳)، اور باوجود ان قاطع شبہات جوابوں کے یہ لوگ پھر انکار ہی پر اڑے ہیں) سو ان کی باتوں پر صبر کیجئے (یعنی رنج نہ کیجئے) اور (چونکہ بدون اس کے کہ کسی طرف دل کو مشغول کیا جائے وہ غم کی بات دل سے نہیں نکلتی، اور بار بار یاد آ کر دل کو محزون کرتی ہے، اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اپنے رَبّ کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے (اس میں نماز بھی داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور (اس کے) چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر وعصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح (وتحمید) کیا کیجئے (اس میں مغرب اور عشاء آ گئیں) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی (اس میں نوافل واوراد آ گئے، حاصل یہ ہوا کہ ذکر اللہ میں اور اس کی فکر میں لگے رہئے تاکہ ان کے اقوالِ کفریہ کی طرف دھیان ہی نہ ہو)۔

معارف ومسائل

فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (۳۶) نَقَّبُوْا، تَنْقِيْبٌ سے مشتق ہے، اس کے اصلی معنی سوراخ کرنے اور پھاڑنے

---

[1] ترجمہ: کیا ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے میں ذرا نہیں تھکا وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔

کے ہیں، محاورات میں زمین میں دور دراز ملکوں تک پھرنے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (ذکرہ فی القاموس) [1]

اور مَحِیْص کے معنی جائے پناہ کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے کتنی قوموں اور جماعتوں کو ہلاک کر دیا ہے جو قوت و طاقت میں تم سے کہیں زیادہ تھیں، اور جو مختلف ملکوں اور خطوں میں تجارت وغیرہ کے لئے پھرتی رہیں، مگر دیکھو کہ انجام کار ان کو موت آئی اور ہلاک ہوئیں، کوئی خطۂ زمین یا مکان ان کو موت سے پناہ نہ دے سکا۔

حصولِ علم کے دو طریقے

لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد عقل ہے چونکہ عقل کا مرکز قلب ہی ہے اس لئے اس کو قلب سے تعبیر کر دیا گیا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد حیات ہے، وہ بھی اسی لئے کہ حیات کا مدار قلب ہے، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اس سورتِ قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے نصیحت و عبرت کا فائدہ اسی شخص کو پہنچ سکتا ہے جس میں عقل ہو یا زندگی ہو، بے عقل یا مردے کو کیا فائدہ پہنچے گا۔

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾ القاءِ سمع کے معنی کسی بات کی طرف کان لگانے کے آتے ہیں، شَهِيْدٌ بمعنی حاضر، معنی یہ ہیں کہ آیات مذکورہ کا فائدہ دو شخصوں کو پہنچتا ہے، ایک وہ جو خود عقل رکھتا ہے، اپنی عقل سے ان سب مضامین کی تصدیق کرتا ہے، یا پھر وہ آدمی جو آیاتِ الٰہیہ کو کان لگا کر سنے اور اس طرح سنے کہ وہ خود حاضر بھی ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ کان تو سن رہے ہیں دل حاضر نہیں ہے، تفسیر مظہری میں فرمایا کہ پہلی قسم کاملین امت کی ہے اور دوسری ان کے متبعین اور مریدین مخلصین کی جو اُن کے اعتقاد سے دین کی باتیں مان لیتے ہیں۔ [2]

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ سَبِّحْ، تَسْبِیْح سے مشتق ہے، اس کے حقیقی معنی اللہ کی تسبیح کرنا یعنی پاکی بیان کرنا ہے، وہ زبانی تسبیح کو بھی شامل ہے اور عباداتِ نماز کو بھی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ تسبیح قبل طلوع الشمس سے مراد نماز فجر ہے، اور تسبیح قبل الغروب سے مراد نماز عصر ہے، حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک طویل حدیث کے ضمن میں) فرمایا:

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا، يَعْنِى الْعَصْرَ وَالْفَجْرِ ثُمَّ قَرَأَ جَرِيْرٌ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ۔ (بخاری ومسلم واللفظ لمسلم) [3]

---

[1] المحیط فی اللغة ج:۱ ص:۴۸۵، مادّة: "نقب"۔

[2] المظهری ج:۹ ص:۷۵

[3] صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب فضل صلاة العصر ج:۱ ص:۷۸، وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاتی الصبح والعصر ج:۱ ص:۲۲۷

''کوشش کرو کہ تم سے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے کی نمازیں چھوٹنے نہ پائیں، یعنی نماز فجر اور عصر، اور اس پر استدلال کرنے کے لئے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔'' (قرطبی) [۱]

اور آیت کے مفہوم میں وہ عام تسبیحات بھی داخل ہیں جن کے صبح و شام پڑھنے کی ترغیب احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت اور شام کے وقت سو سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کرے قیامت کے روز کوئی آدمی اس سے بہتر عمل لے کر نہیں آئے گا، بجز اس کے کہ وہ بھی یہ تسبیح اتنی یا اس سے زیادہ پڑھتا ہو۔ [۲] اور صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ جس شخص نے دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ پڑھا اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اگرچہ وہ سمندر کی موجوں سے بھی زیادہ ہوں۔ (مظہری) [۳]

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ حضرت مجاہدؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ سجود سے مراد فرض نمازیں ہیں، اور وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ سے مراد وہ تسبیحات پڑھنا ہے جس کی فضیلت ہر نماز کے بعد حدیث مرفوع میں آئی ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سُبْحَانَ اللہِ، ۳۳ مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، ۳۳ مرتبہ اَللہُ اَکْبَرُ اور ایک مرتبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، پڑھ لیا کرے تو اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی، اگرچہ وہ دریا کی موجوں کے برابر ہوں (رواہ البخاری ومسلم) [۴] اور وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ سے مراد وہ سنتیں بھی ہو سکتی ہیں جو فرض نمازوں کے بعد احادیث صحیحہ میں آئی ہیں۔ (مظہری) [۵]

وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ ﴿۴۱﴾ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ

اور کان رکھ جس دن پکارے پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے، جس دن سنیں گے چنگھاڑ

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۴

[۲] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التهلیل والتسبیح والدعاء (بالزیادۃ) ج:۲ ص:۳۴۴

[۳] التفسیر المظهری ج:۹ ص:۷۷۸، وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التهلیل والتسبیح والدعاء ج:۲ ص:۳۴۴

[۴] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ ج:۱ ص:۲۱۸

[۵] التفسیر المظهری ج:۹ ص:۷۶

بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا

محقق، وہ ہے دن نکل پڑنے کا، ہم ہیں جِلاتے اور مارتے اور ہم تک ہے

الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ لا يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ

سب کو پہنچنا، جس دن زمین پھٹ کر نکل پڑیں وہ سب دوڑتے ہوئے، یہ اکٹھا کرنا

عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ قف

ہم کو آسان ہے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور تو نہیں ہے اُن پر زور کرنے والا سو

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾ ع

ع ۳

تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ذرا توجہ سے سنو! جس دن ایک پکارنے والا ایک قریبی جگہ سے پکارے گا، ﴿۴۱﴾ جس دن لوگ سچ مچ اُس پکار کی آواز سنیں گے، وہ قبروں سے نکلنے کا دن ہوگا۔ ﴿۴۲﴾ یقین رکھو ہم ہی ہیں جو زندگی بھی دیتے ہیں، اور موت بھی، اور آخر کار سب کو ہمارے پاس ہی لوٹنا ہے، ﴿۴۳﴾ اُس دن جب زمین پھٹ کر ان کو اس طرح باہر کر دے گی کہ وہ جلدی جلدی نکل رہے ہوں گے۔ اس طرح سب کو جمع کر لینا ہمارے لئے بہت آسان ہے۔ ﴿۴۴﴾ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں، ہمیں خوب معلوم ہے، اور (اے پیغمبر!) تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے ہر اُس شخص کو نصیحت کرتے رہو جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔ ﴿۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مخاطب تو اس اگلی بات کو توجہ سے) سن رکھ کہ جس دن ایک پکارنے والا (فرشتہ یعنی اسرافیل علیہ السلام بذریعہ نفخِ صور مُردوں کو قبروں سے نکلنے کے لئے) پاس ہی سے پکارے گا (پاس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آواز سب کو

بے تکلف پہنچے گی، گویا پاس سے ہی کوئی پکار رہا ہے، اور جیسے اکثر دور کی آواز کسی کو پہنچتی ہے کسی کو نہیں پہنچتی ایسا نہ ہوگا) جس روز اُس چیخنے کو بالیقین سب سن لیں گے، یہ دن ہوگا (قبروں سے) نکلنے کا ہم ہی (اب بھی) جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف پھر لَوٹ کر آنا ہے (اس میں بھی مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت کی طرف اشارہ ہے) جس روز زمین ان (مُردوں) پر سے کھل جائے گی جبکہ وہ (نکل کر میدانِ قیامت کی طرف) دوڑتے ہوں گے یہ (جمع کر لینا) ہمارے نزدیک ایک آسان جمع کر لینا ہے (غرض مکرر در مکرر قیامت کا امکان اور وقوع سب ثابت ہو چکا، مگر اس پر بھی جو لوگ نہ مانیں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) جو کچھ یہ لوگ (قیامت وغیرہ کے بارے میں) کہہ رہے ہیں ہم خوب جانتے ہیں (ہم خود سمجھ لیں گے) اور آپ اُن پر (من جانب اللہ) جبر کرنے والے (کر کے) نہیں (بھیجے گئے) ہیں (بلکہ صرف مُنْذِر اور مُبَلِّغ ہیں، جب یہ بات ہے) تو آپ قرآن کے ذریعہ سے (عام تذکیر سے سب کو اور خاص تذکیر نافع سے صرف) ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہئے جو میری وعید سے ڈرتا ہو (اس مفعول کی تقیید سے اشارہ ہو گیا کہ آپ اگرچہ تذکیر و تبلیغ عام کرتے ہیں جیسا مشاہدہ ہے لیکن پھر بھی مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (یعنی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا) کوئی کوئی ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں جب آپ کے اختیار میں نہیں پھر بے اختیار بات کی فکر کیا)۔

معارف و مسائل

يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ (یعنی جس دن ایک پکارنے والا فرشتہ پاس ہی سے پکارے گا) ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ اسرافیل ہوگا، جو بیت المقدس کے صخرہ پر کھڑا ہو کر ساری دُنیا کے مُردوں کو یہ خطاب کرے گا کہ:

"اے گلی سڑی ہڈیو! اور ریزہ ریزہ ہو جانیوالی کھالو! اور بکھر جانے والے بالو! سن لو! تم کو اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ حساب کے لئے جمع ہو جاؤ۔" (مظہری) [1]

یہ قیامت کے نفخۂ ثانیہ کا بیان ہے جس سے دوبارہ عالَم کو زندہ کیا جائے گا، اور مکان قریب سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اُس فرشتے کی آواز پاس اور دُور کے سب لوگوں کو اس طرح پہنچے گی کہ گویا پاس ہی سے پکار رہا ہے، حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ یہ آواز اس طرح سنی جائے گی جیسے کوئی ہمارے کان میں آواز دے رہا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مکان قریب سے مراد صخرۂ بیت المقدس ہے، کیونکہ وہ زمین کا وسط ہے، سب طرف سے اس کی مسافت یکساں ہے۔ (قرطبی) [2]

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۷۷
[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۷

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا (یعنی جب زمین پھٹ کر یہ سب مُردے نکل آئیں گے، اور دوڑتے ہوں گے) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوڑنا ملکِ شام کی طرف ہوگا، جہاں صخرۂ بیت المقدس پر اسرافیل علیہ السلام نداء کرتے ہوں گے۔

جامع ترمذی میں حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک سے ملکِ شام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مِنْ هٰهُنَا اِلٰى هٰهُنَا تُحْشَرُوْنَ رُكْبَانًا وَّمُشَاةً وَّتُجَرُّوْنَ عَلٰى وُجُوْهِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الحديث۔ (از قرطبی) [1]

"یہاں سے اُس طرف (یعنی شام کی طرف) تم سب اٹھائے جاؤ گے کچھ لوگ سوار کچھ پیدل اور بعض کو چہروں کے بل گھسیٹ کر قیامت کے روز اس میدان میں لایا جائے گا۔"

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾ (یعنی آپ تذکیر ونصیحت فرمایئے قرآن سے اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ آپ کی تبلیغ اور وعظ ونصیحت اگرچہ عام ہی ہوگی سبھی مخلوق اس کی مخاطب اور مکلّف ہوگی، مگر اس کا اثر قبول وہی کرے گا جو اللہ کے عذاب اور وعید سے ڈرتا ہے۔

حضرت قتادہؒ اس آیت کو پڑھ کر یہ دعاء مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يَّخَافُ وَعِيْدَكَ وَيَرْجُوْا مَوْعُوْدَكَ يَا بَارُّ يَا رَحِيْمُ۔

"یعنی یا اللہ ہمیں ان لوگوں میں داخل فرما دیجئے جو آپ کی وعیدِ عذاب سے ڈرتے ہیں، اور آپ کے وعدے کے امیدوار ہیں، اے وعدہ پورے کرنے والے اے رحمت والے۔" [2]

تَمَّتْ

سُوْرَةُ قٓ بِعَوْنِ اللهِ سُبْحَانَهٗ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ مِنْ ثَانِيْ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ اِلٰى سَابِعِ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ يَوْمَ الْخَمِيْسِ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ فِيْ تَكْمِيْلِ الْبَاقِيْ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ۔

---

[1] تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۲۷، وجامع الترمذي (بالاختصار) ابواب التفسير، باب ومن سورة بني إسرائيل ج:۲ ص:۱۴۵

[2] تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۲۹

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰت

اٰیاتھا ۶۰ | ۵۱ سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ ۶۷ | رکوعاتھا ۳

سورۂ ذاریات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝۳

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرتی ہیں اُڑا کر، پھر اُٹھانے والیاں بوجھ کو، پھر چلنے والیاں نرمی سے،

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶

پھر بانٹنے والیاں حکم سے، بے شک جو وعدہ کیا ہے تم سے سو سچ ہے، اور بے شک انصاف ہونا ضرور ہے،

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸ يُّؤْفَكُ عَنْهُ

قسم ہے آسمان جال دار کی، تم پڑ رہے ہو ایک جھگڑے کی بات میں، اس سے باز رہے

مَنْ اُفِكَ ۝٩ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝١١

وہی جو پھیرا گیا، مارے گئے اٹکل دوڑانے والے، وہ جو غفلت میں ہیں بھول رہے،

يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٢ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝١٣

پوچھتے ہیں کب ہے دن انصاف کا، جس دن وہ آگ پر اُلٹے سیدھے پڑیں گے،

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝١٤ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ

چکھو مزہ اپنی شرارت کا، یہ ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے، البتہ ڈرنے والے

فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝١٥ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ

باغوں میں ہیں اور چشموں میں، لیتے ہیں جو دیا اُن کو ان کے ربّ نے وہ تھے اس سے پہلے

مُحْسِنِيْنَ ۝١٦ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝١٧ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ

نیکی والے، وہ تھے رات کو تھوڑا سوتے، اور صبح کے وقتوں میں

يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝١٨ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝١٩ وَفِي الْاَرْضِ

معافی مانگتے، اور ان کے مال میں حصہ تھا مانگنے والوں کا اور ہارے ہوئے کا، اور زمین میں

اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝٢٠ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝٢١ وَفِي السَّمَاۗءِ

نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے واسطے اور خود تمہارے اندر سو کیا تم کو سُوجھتا نہیں، اور آسمان میں ہے

رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝٢٢ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ

روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے ربّ آسمان اور زمین کی کہ یہ بات تحقیق ہے

مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع

جیسے کہ تم بولتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو گرد اُڑا کر بکھیر دیتی ہیں، ﴿۱﴾ پھر اُن کی جو (بادلوں کا) بوجھ اُٹھاتی ہیں، ﴿۲﴾ پھر اُن کی جو آسانی سے رواں دواں ہو جاتی ہیں، ﴿۳﴾ پھر اُن کی جو چیزیں تقسیم کرتی ہیں، ﴿۴﴾ کہ جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ یقینی طور پر سچا ہے، ﴿۵﴾ اور اعمال کا بدلہ یقیناً مل کر رہے گا۔ ﴿۶﴾ قسم ہے راستوں والے آسمان کی، ﴿۷﴾ کہ تم متضاد باتوں میں پڑے ہوئے ہو، ﴿۸﴾ اس (آخرت کی حقیقت) سے وہی منہ موڑتا ہے جو حق سے بالکل ہی مڑا ہوا ہے۔ ﴿۹﴾ خدا کی مار ہو اُن پر جو (عقیدے کے معاملے میں) اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے ہیں، ﴿۱۰﴾ جو غفلت میں ایسے ڈوبے ہیں کہ سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں۔ ﴿۱۱﴾ پوچھتے ہیں کہ: ''جزا و سزا کا دِن کب ہوگا؟'' ﴿۱۲﴾ اُس دن ہوگا جب انہیں آگ پر تپایا جائے گا! ﴿۱۳﴾ کہ چکھو مزہ اپنی شرارت کا! یہی ہے وہ چیز جس کے بارے میں تم یہ مطالبے کرتے تھے کہ وہ جلدی آجائے! ﴿۱۴﴾ متقی لوگ بیشک باغوں اور چشموں میں اس طرح رہیں گے ﴿۱۵﴾ کہ اُن کا پروردگار اُنہیں جو کچھ دے گا، اُسے وصول کر رہے ہوں گے۔ وہ لوگ اس سے پہلے ہی نیک عمل کرنے والے تھے، ﴿۱۶﴾ وہ رات کے وقت کم سوتے تھے، ﴿۱۷﴾ اور سحری کے اوقات میں وہ اِستغفار کرتے تھے، ﴿۱۸﴾ اور اُن کے مال و دولت میں سائلوں اور محروم لوگوں کا (باقاعدہ) حق ہوتا تھا۔ ﴿۱۹﴾ اور اُن کے لئے جو یقین کرنے والے ہوں، زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، ﴿۲۰﴾ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی! کیا پھر بھی تمہیں دِکھائی نہیں دیتا؟ ﴿۲۱﴾ اور آسمان ہی میں تمہارا رِزق بھی ہے، اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ﴿۲۲﴾ لہٰذا آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم! یہ بات یقیناً ایسی ہی سچی ہے جیسے یہ بات کہ تم بولتے ہو۔ ﴿۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو غبار وغیرہ کو اڑاتی ہیں! پھر اُن بادلوں کی جو بوجھ (یعنی بارش کو) اُٹھاتے ہیں! پھر ان کشتیوں کی جو نرمی سے چلتی ہیں! پھر ان فرشتوں کی جو (حکم کے موافق اہلِ ارض میں) چیزیں تقسیم کرتے ہیں! (مثلاً جہاں

جس قدر بارش کا حکم ہوتا ہے جو مادّہ ہے رزق کا وہاں بادلوں کے ذریعہ سے اسی قدر پہنچاتے ہیں، اسی طرح حسبِ حدیث رحمِ مادر میں بچے کی صورت میں مذکر ومؤنث پوچھ کر بناتے ہیں، اور سکینہ اور رعب بھی تقسیم کرتے ہیں، آگے ان قسموں کا جواب ہے کہ) تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور (اعمال کی) جزا (وسزا) ضرور ہونے والی ہے (ان قسموں میں اشارہ ہے استدلال کی طرف یعنی یہ سب تصرفات عجیبہ قدرتِ الٰہیہ سے ہونا دلیل ہے عظمتِ قدرت کی، پھر ایسی عظیم القدرت ذات کو قیامت کا واقع کرنا کیا مشکل ہے، اور تفسیر ان کلمات کی جن کی آیات مذکورہ میں قسم کھائی گئی ہے درمنثور میں حدیث مرفوع سے اسی طرح نقل کی ہے [۱] جو آگے آتی ہے، اور تخصیص ان چیزوں کی شاید اس لئے ہو کہ اس میں اشارہ ہو گیا مخلوق کی اصناف مختلفہ کی طرف چنانچہ ملائکہ سماویات میں سے ہیں اور ریاح وسُفُن (کشتیاں) ارضیات میں سے ہیں اور سحاب کائناتِ جَو یعنی فضائی مخلوقات میں سے اور ارضیات میں دو چیزیں جن میں ایک آنکھ سے نظر آتی ہے دوسری نظر نہیں آتی، شاید اس لئے آئی ہوں کہ قیامت کے متعلق ایک مضمون پر خود آسمان کی قسم ہے جیسے اوپر سماویات کی تھی یعنی) قسم ہے آسمان کی جس میں (فرشتوں کے چلنے کے) راستے ہیں (کقوله تعالیٰ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ [۲] (المؤمنون: ۱۷)، آگے جواب قسم ہے) کہ تم (یعنی سب) لوگ (قیامت کے بارے میں) مختلف گفتگو میں ہو (کوئی تصدیق کرتا ہے، کوئی تکذیب کرتا ہے، وھٰذا کقولہ تعالیٰ: عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ [۳] (النبا) اَلَّذِیْ فَسَّرَهٗ قَتَادَةُ كَمَا فِي الدُّرِّ بِقَوْلِهٖ مُصَدِّقٌ بِهٖ وَمُكَذِّبٌ، اور آسمان کی قسم سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جنت آسمان میں ہے اور آسمان میں راستہ بھی ہے، مگر جو حق میں اختلاف کرے گا اس کے لئے راہ بند ہو جائے گی، اور ان اختلاف والوں میں) اس (وقوعِ قیامت وجزاء کے اعتقاد) سے وہی پھرتا ہے جس کو (بالکلیہ خیر وسعادت ہی سے) پھرنا ہوتا ہے، (جیسا کہ حدیث میں ہے مَنْ حُرِمَهٗ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ، رواہ ابن ماجۃ، [۴] یعنی جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہر خیر سے محروم رہا، اور اختلاف والوں کے دوسرے فریق کا یعنی تصدیق کرنے والوں کا حال اسی کے مقابلہ سے معلوم ہو گیا کہ وہ خیر وسعادت سے پھرے ہوئے نہیں، اب آگے ان پھرنے والوں کی مذمت ہے کہ) غارت ہو جائیں بے سند باتیں کرنے والے (یعنی جو قیامت کا انکار کرتے ہیں بلا اس کے کہ ان کے پاس کوئی اس کی دلیل ہو) جو کہ جہالت میں بھولے ہوئے ہیں (بھولنے سے مراد اختیاری غفلت ہے اور وہ لوگ بطور استہزاء واستعجال کے) پوچھتے ہیں کہ روزِ جزاء

---

[۱] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۲۹۶

[۲] ترجمہ: اور ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے۔

[۳] ترجمہ: اس سے بڑے واقعہ کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔

[۴] سنن ابن ماجۃ، ابواب الصیام، باب ما جاء فی فضل شھر رمضان۔ ج:۱ ص:۱۱۸

کب ہوگا (آگے جواب ہے کہ وہ اس دن ہوگا) جس دن (کہ) وہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے (اور کہا جائے گا کہ) اپنی اس سزا کا مزہ چکھو یہی ہے جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے (یہ جواب یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اس طرز کا ہے جیسے کسی مجرم کے لئے پھانسی کا حکم ہو جائے، مگر وہ احمق باوجود قیام براہین کے محض اس وجہ سے کہ اس کو تاریخ نہیں بتلائی گئی تکذیب ہی کئے جائے اور کہے جائے کہ اچھا وہ دن کب آئے گا، چونکہ یہ سوال محض کج روی کی راہ سے ہے اس لئے جواب میں بجائے تاریخ بتلانے کے یہ کہنا نہایت مناسب ہوگا کہ وہ دن اس وقت آئے گا جب تم پھانسی پر لٹکا دیئے جاؤ گے، آگے دوسرے فریق یعنی مؤمنین ومصدقین کے ثواب کا ذکر ہے کہ) بے شک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے (اور) اُن کے رَبّ نے اُن کو جو (ثواب) عطا کیا ہوگا وہ اس کو (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے (اور کیوں نہ ہو؟) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) نکوکار تھے (پس حسبِ وعدہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ [۱] (الرحمٰن) کے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا، آگے اُن کی نکوکاری کی قدرے تفصیل ہے کہ) وہ لوگ (فرائض وواجبات سے ترقی کر کے نوافل وتطوّعات کے لئے التزام کرنے والے تھے کہ) رات کو بہت کم سوتے تھے (یعنی زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صَرف کرتے تھے) اور (پھر باوجود اس کے اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ) اخیر شب میں (اپنے کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر اِستغفار کیا کرتے تھے، (یہ تو عبادتِ بدنیہ میں اُن کی حالت تھی) اور (عبادتِ مالیہ کی یہ کیفیت تھی کہ) ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق تھا (یعنی ایسے التزام سے دیتے تھے جیسے اُن کے ذمہ اُن کا کچھ آتا ہو، مراد اس سے غیر زکوٰۃ ہے (هٰكذا فی الدر عن ابن عباس ومجاهد وابراهيم) [۲] اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جنات وعیون کا ملنا نوافل پر موقوف ہے، بلکہ یہاں اہلِ درجاتِ عالیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے) اور (چونکہ کفار قیامت کی صحت کا انکار کرتے تھے اس لئے آگے اس کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ) یقین لانے (کی کوشش اور طلب کرنے) والوں کے لئے (قیامت کے ممکن اور واقع ہونے پر) زمین (کے کائنات) میں بہت نشانیاں (اور دلیلیں) ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی (یعنی تمہارے ظاہری و باطنی احوال مختلفہ بھی دلائل ہیں قیامت کے ممکن ہونے کے، کیونکہ امور آفاقیہ وانفسیہ بالیقین داخل تحت القدرت ہیں اور قدرت ذاتیہ کی نسبت تمام ممکنات کے ساتھ یکساں ہے، اور جبکہ قیامت کے ناممکن ہونے کی کوئی دلیل نہیں تو قیامت بھی ممکنات سے ہے، پس وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اور چونکہ ان دلائل کی دلالت بہت واضح تھی، اس لئے توبیخاً فرماتے ہیں کہ جب ایسے دلائل موجود ہیں) تو کیا تم کو (مطلوب پھر بھی) دکھلائی نہیں دیتا اور (رہا تعین وقتِ وقوع کا جس کے عدم سے استدلال عدمِ وقوع پر کرتے تھے، سو اُس کی نسبت یہ ہے کہ) تمہارا رزق اور جو تم

[۱] ترجمہ: بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔

[۲] تفسير الدر المنثور ج:۹ ص:۲۹۷ تحت هٰذه الآية۔

سے (قیامت کے متعلق) وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب (کا معین وقت) آسمان میں (جو لوح محفوظ ہے اس میں درج) ہے (زمین پر اس کا یقینی علم کسی مصلحت سے نازل نہیں کیا گیا چنانچہ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ [1] (لقمان: ۳۴) میں بھی نہیں بتلایا گیا، اور مشاہدہ بھی ہے کہ یقینی تعیین کسی کو نہیں معلوم، لیکن جب باوجود تعیین وقت کا علم نہ ہونے کے رزق کا وجود یقینی ہے پھر اس عدم تعیین تاریخ سے قیامت کا عدم کیسے لازم آ گیا، اور ایسے استدلال کی طرف اشارہ کرنے کے لئے وَمَا تُوعَدُونَ ﴿۲۲﴾ کے ساتھ رِزْقُكُمْ بڑھا دیا، آگے اسی پر تفریع فرماتے ہیں کہ جب نفی کی کوئی دلیل نہیں اور اثبات کی دلیل ہے) تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ (روزِ جزاء) برحق ہے (اور ایسا یقینی) جیسا تم باتیں کر رہے ہو (کبھی اس میں شک نہیں ہوتا، اِسی طرح اس کو یقینی سمجھو)۔

معارف و مسائل

سورۂ ذاریات میں بھی اس سے پہلی سورت قٓ کی طرح زیادہ تر مضامین آخرت وقیامت اور اس میں مُردوں کے زندہ ہونے، حساب کتاب اور ثواب وعذاب کے متعلق ہیں۔

پہلی چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کے متعلق جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے وہ سچا وعدہ ہے، جن چیزوں کی قسم ہے وہ چار ہیں: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾

ایک حدیث مرفوع میں جس کو ابن کثیر نے ضعیف کہا ہے، اور حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے موقوفاً ان چاروں چیزوں کے معنی اور مفہوم یہ بتلایا گیا ہے کہ ذَارِيَاتِ سے مراد وہ ہوائیں ہیں جن کے ساتھ غبار ہوتا ہے، اور حَامِلَاتِ وِقْرًا کے لفظی معنی بوجھ اٹھانے والے کے ہیں، اس سے مراد بادل ہیں جو پانی کا بوجھ اٹھائے ہوتے ہیں، اور جَارِيَاتِ يُسْرًا سے مراد کشتیاں ہیں جو پانی میں آسانی کے ساتھ چلتی ہیں، اور مُقَسِّمَاتِ اَمْرًا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام مخلوقات میں رزق اور بارش کا پانی اور تکلیف وراحت کی مختلف اقسام تقدیر الٰہی کے مطابق تقسیم کرتے ہیں، تفسیر ابن کثیر، قرطبی اور درمنثور میں یہ روایات موقوفہ ومرفوعہ مذکور ہیں۔ [2]

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴿۷﴾ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ﴿۸﴾ حُبُك، حَبِيْكَةٌ کی جمع ہے، کپڑے کی بناوٹ میں جو دھاریاں ہو جاتی ہیں ان کو حُبُك کہا جاتا ہے، وہ چونکہ راستہ اور سڑک کے مشابہ ہوتی ہیں اس لئے راستوں کو بھی حُبُك

---

[1] ترجمہ: اور وہی مینہ برساتا ہے۔

[2] الدر المنثور ج: ۹ ص: ۲۹۶، وتفسیر القرطبی ج: ۱۷ ص: ۲۹، ۳۰

کہہ دیا جاتا ہے، بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی مراد لئے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے، راستوں سے وہ راستے بھی مراد ہو سکتے ہیں جن سے فرشتے آتے جاتے ہیں، اور اس سے مراد ستاروں اور سیاروں کے راستے اور ان کے مدار بھی ہو سکتے ہیں، جو دیکھنے والوں کو آسمان میں نظر آتے ہیں۔

اور چونکہ یہ بناوٹ کی دھاریاں کپڑے کی زینت اور حسن بھی ہوتی ہیں، اس لئے بعض حضرات مفسرین نے یہاں حُبُك کے معنی زینت اور حسن کے لئے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو حسن و زینت والا ہے، یہ قسم جس مضمون کے لئے آئی ہے وہ (اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝) میں مذکور ہے، بظاہر اس کے مخاطب مشرکینِ مکہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف اور متضاد باتیں کہا کرتے تھے، کبھی مجنون، کبھی جادوگر، کبھی شاعر وغیرہ کے لغو خطابات دیتے تھے، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کے مخاطب عام اُمت کے لوگ مسلم و کافر سب ہوں، اور قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ سے مراد یہ ہو کہ بعض تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں، بعض انکار و مخالفت سے پیش آتے ہیں۔ (ذکرہ فی المظہری) [۱]

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ ۝ أُفِكَ کے لفظی معنی پھر جانے، منحرف ہو جانے کے ہیں، اور عَنْهُ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں، دونوں کے معنی الگ الگ ہیں، ایک احتمال تو یہ ہے کہ ضمیر قرآن اور رسول کی طرف راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ قرآن اور رسول سے وہی بدنصیب منحرف ہوتا ہے جس کے لئے محرومی مقدر ہو چکی ہے۔

اور دُوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ تمہارے مختلف اور متضاد اقوال کی وجہ سے وہی شخص قرآن و رسول کا منکر ہوتا ہے جو بدنصیب محروم ہی ہو۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝ خَرّٰاص کے لفظی معنی اندازہ لگانے والے اور ظن و تخمینہ سے بات کرنے والے کے ہیں، مراد اس سے وہ قول مختلف والے کفار و منکرین ہیں جو بغیر کسی دلیل اور وجہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں متضاد باتیں کہتے ہیں، اس لئے یہاں خَرّٰاصُوْنَ کا ترجمہ كَذّٰابُوْنَ سے بھی کر دیا جائے تو بعید نہیں ان کے لئے اس جملے میں بددُعا ہے، جو درحقیقت لعنت کے معنی میں ہے (مظہری) [۲] کفار کے ذکر کے بعد مؤمنین متقین کا ذکر کئی آیتوں میں آیا ہے۔

عبادت میں شب بیداری اور اس کی تفصیل

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ يَهْجَعُوْنَ، هُجُوْع سے مشتق ہے جس کے معنی رات کو سونے کے آتے

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۸۰

[۲] تفسیر المظهری بحوالۂ بالا

ہیں، اس میں مؤمنین متقین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں، سوتے کم ہیں، جاگتے زیادہ ہیں، اور وقت نماز و عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے، [۱] اور حضرت حسن بصریؒ سے یہی منقول ہے کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اُٹھاتے ہیں، اور بہت کم سوتے ہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف مَا کو اس میں نفی کے لئے قرار دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں، بلکہ عبادتِ نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں، اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہو جاتے ہیں، جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کر لیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں، اسی لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابوالعالیہؒ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا ہے جو مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں، اور امام ابوجعفر باقرؒ نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوویں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر) [۲]

حضرت حسن بصریؒ نے احنف بن قیس سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے عمل کا اہلِ جنت کے اعمال سے موازنہ کیا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو ہم سے بہت بلند و بالا اور ممتاز ہے، وہ ایک ایسی قوم ہے کہ ہمارے اعمال ان کے درجہ تک نہیں پہنچتے، کیونکہ وہ لوگ راتوں میں سوتے کم ہیں عبادت زیادہ کرتے ہیں، پھر میں نے اپنے اعمال کا اہلِ جہنم کے اعمال سے موازنہ کیا تو دیکھا کہ وہ اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والے قیامت کا انکار کرنے والے ہیں (جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا) اس لئے ہمارے اعمال موازنہ کے وقت نہ اصل اہلِ جنت کے درجہ کو پہنچتے ہیں اور نہ (بحمد اللہ) اہلِ جہنم کے ساتھ ملتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ ہمارا درجہ عمل کے اعتبار سے وہ ہے جن کا قرآن کریم نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے: خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (التوبۃ: ۱۰۲)، یعنی وہ لوگ جنہوں نے اچھے بُرے اعمال خلط ملط کر رکھے ہیں، تو ہم میں بہتر آدمی وہ ہے جو کم از کم اس طبقے کی حدود میں رہے۔

اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے والد سے کہا کہ اے ابواُسامہؒ! ہم اپنے اندر وہ صفت نہیں پاتے جو اللہ تعالیٰ نے متقین کے لئے ذکر فرمائی ہے، یعنی (كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾) کیونکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا نَقُوْمُ "یعنی رات میں بہت کم جاگتے اور عبادت کرتے ہیں، میرے والد نے اس کے جواب میں فرمایا:

---

[۱] تفسیر الطبری لابن جریرؒ ج:۲۲ ص:۴۱۱

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۱۷و۴۱۸

طُوبٰی لِمَنْ رَقَدَ اِذَا نَعَسَ وَاتَّقَی اللّٰهَ اِذَا اسْتَیْقَظَ۔ (ابن کثیر) [۱]

''بشارت ہے اس شخص کے لئے جس کو نیند آئے تو سو جائے مگر جب بیدار ہو تو تقویٰ اختیار کرے یعنی خلافِ شرع کوئی کام نہ کرے۔''

مطلب یہ ہے کہ مقبولیت عنداللہ صرف رات کو بہت جاگنے میں منحصر نہیں، جو شخص نیند سے مجبور ہو اور رات میں زیادہ نہ جاگے، مگر بیداری میں گناہ و معصیت سے بچے وہ بھی قابلِ مبارک باد ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بروایت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہ منقول ہے:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَاَفْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔ (ابن کثیر) [۲]

''اے لوگو! تم لوگوں کو کھانا کھلاؤ، رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرو، اور سلام ہر شخص مسلمان کو کرو اور رات کو اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

اِستغفارِ سحری کی برکات وفضائل

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ یعنی مؤمنین متقین سحر گاہ کے وقت اپنے گناہوں سے اِستغفار کرتے ہیں، اَسْحَارٌ، سِحْرٌ کی جمع ہے، رات کے آخری چھٹے حصے کو سحر کہا جاتا ہے اس آخری حصۂ شب میں اِستغفار کرنے کی فضیلت اس آیت میں بھی ہے، اور دُوسری آیت وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ [۳] (آل عمران) میں بھی، صحاح حدیث کی سب کتابوں میں یہ حدیث مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کو آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں، (جو ان کی شان کے مناسب ہے، اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں) اور اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا جس کی میں توبہ قبول کروں، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں۔ (ابن کثیر) [۴]

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس اِستغفارِ سحریٰ میں اُن متقین کا بیان ہو رہا ہے جن کا حال اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بہت کم سوتے ہیں، ان حالات میں اِستغفار کرنے کا بظاہر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۱۷

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۱۷، وسنن ابن ماجة، ابواب الأطعمة، باب إطعام الطعام ج:۲ ص:۲۳۴

[۳] ترجمہ: اور اخیر شب میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

[۴] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۱۸، وصحیح البخاری، کتاب التهجد، باب الدعاء فی الصلاة من آخر اللیل، ج:۱ ص:۱۵۳، وصحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب صلاة اللیل ...إلخ، ج:۱ ص:۲۵۸

کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ طلبِ مغفرت تو گناہ سے کی جاتی ہے، جن لوگوں نے ساری رات عبادت میں گزار دی وہ آخر میں اِستغفار کس گناہ سے کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کو پہچانتے ہیں، اور اپنی ساری عبادت کو اس کے شایانِ شان نہیں دیکھتے، اس لئے اپنی اس تقصیر و کوتاہی سے اِستغفار کرتے ہیں۔ (مظہری) [1]

صدقہ وخیرات کرنے والوں کو خاص ہدایت

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ⑲ سائل سے مراد وہ غریب حاجت مند ہے جو اپنی حاجت لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے، اور لوگ اس کی مدد کرتے ہیں، اور محروم سے مراد وہ شخص ہے کہ فقیر و مفلس اور حاجت مند ہونے کے باوجود شرافتِ نفس کے سبب اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتا، اس لئے لوگوں کی امداد سے محروم رہتا ہے، اس آیت میں مؤمنین متقین کی یہ صفت بتلائی گئی کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے وقت صرف سائلین یعنی اپنی حاجات ظاہر کرنے والوں ہی کو نہیں دیتے بلکہ ایسے لوگوں پر بھی نظر رکھتے اور حالات کی تحقیق سے باخبر رہتے ہیں جو اپنی حاجت کسی سے کہتے نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ مقصد آیت کا یہ ہے کہ یہ مؤمنین متقین صرف بدنی عبادت نماز اور شب بیداری پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ مالی عبادت میں بھی ان کا بڑا حصہ رہتا ہے، کہ سائلین کے علاوہ ایسے لوگوں پر بھی نظر رکھتے ہیں جو شرافت کے سبب اپنی حاجت کسی پر ظاہر نہیں کرتے، مگر اس مالی عبادت کا ذکر قرآن کریم نے اس عنوان سے فرمایا (وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ) یعنی یہ لوگ جن فقراء و مساکین پر خرچ کرتے ہیں ان پر کوئی احسان نہیں جتلاتے، بلکہ یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ ہمارے اموال خداداد میں اُن کا بھی حق ہے، اور حق دار کا حق اس کو پہنچا دینا کوئی احسان نہیں ہوا کرتا، بلکہ ایک حق اور ذمہ داری سے اپنی سبکدوشی ہوتی ہے۔

آفاق وانفس دونوں میں قدرت کی نشانیاں

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ⑳ (یعنی زمین میں بہت نشانیاں قدرت کی ہیں، یقین کرنے والوں کے لئے) پچھلی آیات میں اوّل کفار و منکرین کا حال اور انجام بد بتلایا گیا ہے، پھر مؤمنین متقین کے حالات وصفات اور ان کے درجات عالیہ کا ذکر فرمایا، اب پھر کفار و منکرینِ قیامت کے حال کی طرف غور اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ان کے

---

[1] تفسیر المظہری ج: ۹ ص: ۸۲

پیش نظر کر کے انکار سے باز آجانے کی ہدایت ہے، تو اس جملہ کا تعلق مذکورہ سابق جملے (اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝) سے ہوا، جس میں قرآن ورسول سے انکار کا ذکر ہے۔

اور تفسیر مظہری میں اس کو بھی مؤمنین متقین ہی کی صفات میں داخل کیا ہے،[1] اور موقنین سے مراد وہی متقین ہیں، اور اس میں ان کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت جو زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں غور وفکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کا ایمان وایقان بڑھتا ہے، جیسا کہ ایک دُوسری آیت میں ان کے بارے میں ارشاد ہے: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج [2] (آل عمران:۱۹۱)

اور زمین میں جن آیاتِ قدرت کا ذکر فرمایا ہے وہ بے شمار ہیں، زمین میں نباتات اور اشجار وباغات ہی کو دیکھو ان کے اقسام وانواع ان کے رنگ وبو ایک ایک پتہ کی تخلیق میں کمالِ حسن پھر ان میں سے ہر ایک کے خواص وآثار میں اختلاف کی ہزاروں قسمیں، اسی طرح زمین میں نہریں، کنویں اور پانی کے دوسرے مرکز اور اُن سے تیار ہونے والی لاکھوں انواعِ مخلوقات، زمین کے پہاڑ اور غار، زمین میں پیدا ہونے والے حیوانات اور ان کی اَن گنت اقسام وانواع، ہر ایک کے حالات اور منافع مختلف، زمین میں پیدا ہونے والے انسانوں کے حالات مختلف قبائل اور مختلف خطوں کے انسانوں میں رنگ اور زبان کا امتیاز، اخلاق وعادات کا اختلاف وغیرہ جن میں آدمی غور کرے تو ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے اتنے مظاہر پائے گا کہ شمار کرنا بھی مشکل ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱ اس جگہ آیاتِ قدرت کے بیان میں آسمان اور فضائی مخلوقات کا ذکر چھوڑ کر صرف زمین کا ذکر فرمایا ہے جو انسان کے بہت قریب ہے، جس پر انسان بستا اور چلتا پھرتا ہے، اس آیت میں اس سے بھی زیادہ قریب یعنی خود انسان کی ذات کی طرف توجہ دلائی کہ زمین اور زمین کی مخلوقات کو بھی چھوڑ و خود اپنے وجود اپنے جسم اور اس کے اعضاء وجوارح ہی میں غور کرلو تو ایک ایک عضو کو حکمت حق تعالیٰ کا ایک دفتر پاؤ گے، اور سمجھ لوگے کہ سارے عالم میں جو آیاتِ قدرت حق تعالیٰ کی ہیں انسان کے اپنے چھوٹے سے وجود میں وہ سب گویا سمٹ آئی ہیں، انسان اگر اپنی ابتداء پیدائش سے لے کر موت تک کے پیش آنے والے حالات ہی میں غور وتدبر کرنے لگے تو اس کو حق تعالیٰ گویا اپنے سامنے نظر آنے لگیں۔

کہ کس طرح ایک انسانی نطفہ دُنیا کے مختلف خطوں کی غذاؤں اور دُنیا میں بکھرے ہوئے اجزاءِ لطیفہ کا خلاصہ بن کر رحم میں قرار پایا، پھر کس طرح نطفے سے ایک منجمد خون عَلَقَہ بنا، پھر عَلَقَہ سے مُضْغَہ (گوشت کا ٹکڑا) بنا، پھر کس

---

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۸۳

[2] ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

طرح اس میں ہڈیاں بنائی گئیں، پھران پر گوشت چڑھایا گیا، پھر کس طرح اس بے جان پتلے میں جان ڈالی گئی، اور اُس کی تخلیق کی تکمیل کرکے اِس دنیا میں لایا گیا، پھر کس طرح تدریجی ترقی کرکے ایک بے علم بے شعور بچے سے ایک دانشمند فعال انسان بنایا گیا، اور کس طرح ان کی صورتیں اور شکلیں مختلف بنائی گئیں کہ اربوں پدموں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، اس چند اِنچ کے رقبہ میں ایسے امتیازات رکھنا کس کے بس کی بات ہے، پھر اُن کی طبائع اور مزاجوں میں اختلاف اور اس اختلاف کے باوجود ایک وحدت یہ سب اس قدرت کاملہ کی کرشمہ سازی ہے جو بے مثل و بے مثال ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ [1] (المؤمنون: ۱۴)

یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ہر انسان کہیں باہر اور دُور نہیں خود اپنے ہی وجود میں دن رات مشاہدہ کرتا ہے، اس کے باوجود بھی اگر وہ اللہ جل شانہٗ اور اس کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف نہ کرے تو کوئی اندھا ہی ہوسکتا ہے جس کو کچھ نہ سوجھے، اسی لئے آخر میں فرمایا اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ "یعنی کیا تم دیکھتے نہیں" اشارہ اس طرف ہے کہ اس میں کچھ زیادہ عقل و سمجھ کا بھی کام نہیں، بینائی ہی دُرست ہو تو اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ (یعنی آسمان میں ہے تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اس کی بے غبار و بے تکلف تفسیر وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اختیار کی گئی، یعنی آسمان میں ہونے سے مراد آسمان میں لوحِ محفوظ کے اندر لکھا ہونا مراد ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کا رزق اور جو کچھ اس سے وعدے کئے گئے اور اس کا جو کچھ انجام ہونا ہے وہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے مقررہ رزق سے بچنے اور بھاگنے کی بھی کوشش کرے تو رزق اس کے پیچھے پیچھے بھاگے گا، جیسے موت سے انسان بھاگ نہیں سکتا، ایسے ہی رزق سے بھی فرار ممکن نہیں۔ (قرطبی) [2]

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ رزق سے مراد بارش ہے، اس صورت میں اس کا آسمان میں ہونا باین صورت ہوگا کہ آسمان سے مراد یہاں جِرمِ سمٰوٰت نہ ہو بلکہ مافوق مراد ہو جس میں فضائے آسمانی بھی داخل ہے تو بارش جو بادلوں سے برستی ہے اس کو بھی فی السماء کہا جاسکتا ہے، اور وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

---

[1] ترجمہ: سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۴۳، والمعجم الأوسط للطبرانیؒ رقم الحدیث:۴۵۹۸

اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ (یعنی جس طرح تمہیں اپنے اپنے کلام کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا، اسی طرح قیامت کا آنا بھی ایسا ہی واضح ہے اور کھلا ہوا ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، انسان کے محسوسات جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے سے متعلق ہیں، ان سب میں سے اس جگہ نطق یعنی بولنے کو خاص طور سے انتخاب شاید اس لئے کیا کہ مذکورہ سب محسوسات میں کبھی کبھی کسی مرض وغیرہ کے سبب سے التباس ہوجاتا ہے، دیکھنے سننے میں فرق ہوجانا معروف ہے، بیماری میں ذائقہ بعض اوقات خراب ہوکر میٹھے کو کڑوا بتلانے لگتا ہے، مگر نطق وگویائی ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی دھوکہ اور تلبیس کا شائبہ نہیں ہوسکتا۔ (قرطبی) [1]

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے، جب اندر پہنچے اس کے پاس

فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

تو بولے سلام وہ بولا سلام ہے یہ لوگ ہیں اوپرے، پھر دوڑا اپنے گھر کو

فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾

تو لے آیا ایک بچھڑا گھی میں تلا ہوا، پھر اُن کے سامنے رکھا کہا کیوں تم کھاتے نہیں؟

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

پھر جی میں گھبرایا اُن کے ڈر سے بولے تو مت ڈر اور خوش خبری دی اس کو ایک لڑکے ہوشیار کی،

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾

پھر سامنے سے آئی اس کی عورت بولتی ہوئی پھر پیٹا اپنا ماتھا اور کہنے لگی کہیں بڑھیا بانجھ،

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۴۱، ۴۲

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

وہ بولے یونہی کہا تیرے رب نے وہ جو ہے وہی ہے حکمت والا خبردار

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ

بولا پھر کیا مطلب ہے تمہارا اے بھیجے ہوؤ، وہ بولے ہم کو بھیجا گیا ہے

اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ ۙ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ ۙ مُّسَوَّمَةً

ایک گنہگار قوم پر، کہ چھوڑیں ہم اُن پر پتھر مٹی کے، نشان پڑے ہوئے

عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ ۚ

تیرے رب کے یہاں سے حد سے نکل چلنے والوں کے لئے، پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا،

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ ۚ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ

پھر نہ پایا ہم نے اس جگہ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں سے، اور باقی رکھا ہم نے اس میں نشان اُن لوگوں کے لئے

يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ ؕ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ

جو ڈرتے ہیں عذاب دردناک سے، اور نشانی ہے موسیٰ (کے حال) میں جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ

دے کر کھلی سند، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ پھر پکڑا ہم نے اس کو

وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ ؕ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ

اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام، اور نشانی ہے عاد میں جب بھیجی ہم نے ان پر

الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾

ہوا خیر سے خالی، نہیں چھوڑتی کسی چیز کو جس پر گزرے کہ نہ کرڈالے اس کو جیسے چورا،

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ

اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو برت لو ایک وقت تک، پھر شرارت کرنے لگے اپنے ربّ کے حکم سے

فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ

پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے، پھر نہ ہوسکا ان سے کہ اٹھیں

وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں، اور ہلاک کیا نوح کی قوم کو اس سے پہلے، تحقیق وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ع ۲

لوگ نافرمان

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) کیا ابراہیم کے معزز مہمانوں کا واقعہ تمہیں پہنچا ہے؟ ﴿۲۴﴾ جب وہ ابراہیم کے پاس آئے، تو انہوں نے سلام کہا۔ ابراہیم نے بھی سلام کہا۔ (اور دِل میں سوچا کہ) یہ کچھ انجان لوگ ہیں۔ ﴿۲۵﴾ پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے، اور ایک موٹا سا بچھڑا لے آئے، ﴿۲۶﴾ اور اُسے ان مہمانوں کے سامنے رکھا۔ کہنے لگے: "کیا آپ لوگ کھاتے نہیں؟" ﴿۲۷﴾ اس سے ابراہیم نے اُن کی طرف سے اپنے دِل میں ڈر محسوس کیا۔ انہوں نے کہا: "ڈریئے نہیں" اور انہیں ایک لڑکے کی خوشخبری دی جو بڑا عالم ہوگا۔ ﴿۲۸﴾ اس پر اُن کی بیوی زور سے بولتی ہوئی آئیں، اور انہوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا، اور کہنے لگیں: "(کیا) ایک بانجھ بڑھیا (بچہ جنے گی؟)" ﴿۲۹﴾ مہمانوں نے کہا: "تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ یقین جانو وہی ہے جو بڑی حکمت کا، بڑے علم کا مالک ہے۔" ﴿۳۰﴾

اِبراہیم نے کہا: ''اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس مہم پر ہو؟'' ⦿۳۱ انہوں نے کہا: ''ہمیں کچھ مجرم لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے، ⦿۳۲ تا کہ ہم ان پر پکی مٹی کے پتھر برسائیں ⦿۳۳ جن پر حد سے گذرے ہوئے لوگوں کے لئے تمہارے پروردگار کے پاس سے خاص نشان بھی لگا ہوگا۔'' ⦿۳۴ پھر ہوا یہ کہ اُس بستی میں جو کوئی مؤمن تھا، اُس کو ہم نے وہاں سے نکال لیا، ⦿۳۵ اور اُس میں ایک گھر کے سوا ہم نے کسی اور گھر کو مؤمن نہیں پایا، ⦿۳۶ اور ہم نے اُس بستی میں اُن لوگوں کے لئے (عبرت کی) ایک نشانی چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔ ⦿۳۷ اور موسیٰ (کے واقعے) میں بھی (ہم نے ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی) جب ہم نے اُنہیں ایک کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تھا، ⦿۳۸ تو فرعون نے اپنی قوّتِ بازو کے بل پر منہ موڑا، اور کہا کہ: ''یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ہے۔'' ⦿۳۹ چنانچہ ہم نے اُسے اور اُس کے لشکر کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا، اور وہ تھا ہی ملامت کے لائق! ⦿۴۰ نیز قومِ عاد میں (بھی ہم نے ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی) جب ہم نے اُن پر ایک ایسی آندھی بھیجی جو ہر بہتری سے بانجھ تھی، ⦿۴۱ وہ جس چیز پر بھی گذرتی، اُسے ایسا کر چھوڑتی جیسے وہ گل کر چورا چورا ہوگئی ہو۔ ⦿۴۲ اور ثمود میں بھی (ایسی ہی نشانی تھی)، جب اُن سے کہا گیا تھا کہ: ''تھوڑے وقت تک مزے اُڑا لو۔'' (پھر سیدھے نہ ہوئے تو عذاب آئے گا) ⦿۴۳ اس پر بھی اُنہوں نے اپنے پروردگار کا حکم ماننے سے سرکشی اختیار کی تو اُنہیں کڑکے نے آ پکڑا، اور وہ دیکھتے رہ گئے۔ ⦿۴۴ نتیجہ یہ کہ نہ تو اُن میں یہ سکت رہی کہ کھڑے ہوسکیں، اور نہ وہ اس قابل تھے کہ اپنا بچاؤ کرتے۔ ⦿۴۵ اور اس سے بھی پہلے نوح کی قوم کو بھی ہم نے پکڑ میں لیا تھا۔ یقین جانو وہ بڑے نافرمان لوگ تھے۔ ⦿۴۶

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی حکایت آپ تک پہنچی ہے، (معزز یا تو اس لئے کہا کہ وہ ملائکہ تھے جن کی شان میں ہے بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ⦿۲۶ [1] (الانبیاء) اور یا اس لئے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادت کے موافق اُن کا اکرام کیا تھا، اور مہمان کہنا بنا بر ظاہری حالت کے ہے، کہ بشکلِ انسان آئے تھے اور یہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ وہ (مہمان) ان کے پاس آئے پھر اُن کو سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی (جواب میں) کہا سلام (اور کہنے لگے کہ) انجان لوگ (معلوم ہوتے) ہیں (ظاہر تو یہی ہے کہ دل میں سوچا قرینہ اس کا یہ ہے کہ آگے جواب فرشتوں کا مذکور نہیں، اور احتمال بعید یہ بھی ہے کہ بطور پوچھنے کے انہی سے کہہ دیا ہو کہ آپ لوگوں کو پہچانا نہیں اور انہوں نے جواب نہ دیا ہو، اور ابراہیم علیہ السلام نے جواب کا انتظار نہ کیا ہو غرض یہ سلام و کلام ہو کر) پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور

[1] ترجمہ: بلکہ بندے ہیں معزز۔

ایک فربہ بچھڑا (تلا ہوا لقولہ تعالیٰ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ [۱] (ہود)) لائے اور اس کو ان کے پاس (یعنی سامنے) لاکر رکھا (چونکہ وہ فرشتے تھے، کیوں کھاتے اس وقت ابراہیم علیہ السلام کو شبہ ہوا اور) کہنے لگے کہ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (جب پھر بھی نہ کھایا) تو ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ لوگ کہیں مخالفین اور اعداء میں سے نہ ہوں، کما مرّ فی سورۃ ھود) انہوں نے کہا کہ تم ڈرومت (ہم آدمی نہیں ہیں، فرشتے ہیں) اور (یہ کہہ کر) ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم (یعنی نبی) ہوگا، کیونکہ مخلوق میں سب سے زیادہ علم انبیاء کو ہوتا ہے اور مراد اس سے اسحاق علیہ السلام ہیں، یہ گفتگو ان سے ہو رہی تھی کہ) اتنے میں ان کی بی بی (حضرت سارہ جو کہیں کھڑی سن رہی تھیں لقولہ تعالیٰ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ [۲] (ہود:۷۱) اولاد کی خبر سن کر) بولتی پکارتی آئیں پھر (جب فرشتوں نے ان کو بھی یہ خبر سنائی لقولہ تعالیٰ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ [۳] (ہود:۷۱) تو تعجب سے) ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ (اوّل تو میں) بڑھیا (پھر) بانجھ (اس وقت بچہ پیدا ہونا بھی عجیب بات ہے) فرشتے کہنے لگے کہ (تعجب مت کرو لقولہ تعالیٰ اَتَعْجَبِيْنَ [۴] (ہود:۷۳)) تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے (اور) کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا بڑا جاننے والا ہے (یعنی گو فی نفسہٖ یہ بات تعجب کی ہے مگر تم کہ خاندانِ نبوّت میں رہتی ہو اور علم وفہم سے مشرف ہو، یہ معلوم کرکے کہ خدا کا ارشاد ہے تعجب نہ رہنا چاہئے) ابراہیم (علیہ السلام) کو فراستِ نبوّت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علاوہ بشارت کے اُن کے آنے سے اور بھی کچھ مقصود ہے تو ان سے) کہنے لگے (کہ) اچھا تو (یہ بتلاؤ کہ) تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے، اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم (یعنی قومِ لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر کنکر کے پتھر برسائیں جن پر آپ کے ربّ کے پاس (یعنی عالمِ غیب میں) خاص نشان بھی ہے (جس کا بیان سورۂ ہود میں ہوا ہے اور وہ) حد سے گزرنے والوں کے لئے (ہیں، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب ان بستیوں پر عذاب کا وقت قریب آیا) تو ہم نے جتنے ایمان دار تھے سب کو وہاں سے علیحدہ کردیا، سو بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کوئی گھر (مسلمانوں کا) ہم نے نہیں پایا، (یہ کنایہ ہے کہ وہاں کوئی اور گھر مسلمانوں کا تھا ہی نہیں، کیونکہ جس چیز کا وجود اللہ کے علم میں نہ ہو وہ موجود ہو ہی نہیں ہوسکتی) اور ہم نے اس واقعہ میں (ہمیشہ کے واسطے) ایسے لوگوں کے لئے ایک عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں اور (آگے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ سنو کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ہم نے ان کو فرعون کے پاس ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی معجزہ) دے کر بھیجا سو اس نے مع اپنے ارکانِ سلطنت کے سرتابی کی اور کہنے لگا کہ یہ ساحر یا مجنون ہیں، سو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ کر دریا

---

[۱] ترجمہ: ایک تلا ہوا بچھڑا لائے۔

[۲] ترجمہ: اور ابراہیم کی بی بی کھڑی تھیں۔

[۳] ترجمہ: سو ہم نے ان کو بشارت دی اسحاق کی۔

[۴] ترجمہ: کیا تم تعجب کرتی ہو۔

میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) اور اس نے کام ہی ملامت کا کیا تھا اور (آگے عاد کا قصہ سنو کہ) عاد کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ہم نے اُن پر نامبارک آندھی بھیجی جس چیز پر گزرتی تھی (یعنی ان اشیاء میں سے کہ جن کے اہلاک کا حکم تھا جس پر گزرتی تھی) اس کو ایسا کر چھوڑتی تھی جیسے کوئی چیز گل کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور (آگے ثمود کا قصہ سنو) ثمود کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ان سے کہا گیا (یعنی صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ) اور تھوڑے دنوں چین کر لو (یعنی کفر سے باز نہیں آ ؤ گے تو بعد چندے ہلاک ہو گے) سو (اس ڈرانے پر بھی) ان لوگوں نے اپنے رَبّ کے حکم سے سرکشی کی، سو اُن کو عذاب نے آلیا اور وہ (اس عذاب کے آثار کو) دیکھ رہے تھے (یعنی یہ عذاب کھلے طور پر آیا) سو نہ تو کھڑے ہی ہو سکے، (بلکہ اوندھے منہ گر گئے لقوله تعالٰى جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ [1] (ہود)) اور نہ (ہم سے) بدلہ لے سکے اور ان سے پہلے قوم نوح کا یہی حال ہو چکا تھا (یعنی اس سبب سے کہ) وہ بڑے نافرمان لوگ تھے (ان کو بھی ہلاک کیا تھا)۔

معارف و مسائل

یہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے گزری ہوئی اُمتوں میں سے چند انبیاء کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ فرشتوں نے سَلٰمًا کہا تھا، خلیل اللہ نے جواب میں سَلٰمٌ رفع کے ساتھ کہا، کیونکہ مرفوع ہونے کی صورت میں یہ جملہ اسمیہ بنا، جس میں دوام واستمرار اور قوت زیادہ ہے، تو جیسا قرآن کریم میں حکم ہے کہ سلام کا جواب سلام کرنے والے کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں ہو اس کی تعمیل فرمائی۔

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ مُنْكَرٌ، بضم میم وفتح کاف، اوپرے اور اجنبی کو کہا جاتا ہے، چونکہ گناہ کے کام بھی اسلام میں اوپرے اور اجنبی ہوتے ہیں، اس لئے گناہ کو بھی مُنْكَرٌ کہہ دیا جاتا ہے، مراد جملے کی یہ ہے کہ یہ حضرات فرشتے بشکل بشر آئے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو پہچانا نہیں، اس لئے اپنے دل میں یہ کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں، جن کو ہم نہیں پہچانتے، اور ممکن ہے کہ خود مہمانوں کے سامنے ہی اس کا ذکر بطور استفہام کے کر دیا ہو، اور مقصد ان کا تعارف دریافت کرنا ہو۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ، رَاغَ، رَوْغٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی جگہ سے کھسک جانے اور خفیہ طور پر چلنے جانے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے گھر میں اس طرح گئے کہ مہمانوں کو ان کے اُٹھ جانے کی خبر نہ ہو، ورنہ وہ کھانا اور مہمانی لانے سے انکار کرتے۔

---

[1] ترجمہ: اوندھے پڑے رہ گئے۔

آدابِ مہمانی

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں مہمان کے لئے چند آدابِ میزبانی کی تعلیم ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے مہمانوں سے پوچھا نہیں کہ میں آپ کے لئے کھانا لاتا ہوں، بلکہ چپکے سے کھسک گئے، اور ان کی مہمانی کے لئے اپنے پاس جو سب سے اچھی چیز کھانے کی تھی یعنی بچھڑا ذبح کیا، اس کو بھونا اور لے آئے اور دوسرے یہ کہ لانے کے بعد مہمانوں کو اس کی تکلیف نہیں دی کہ ان کو کھانے کی طرف بلاتے، بلکہ جہاں وہ بیٹھے تھے وہیں لا کر ان کے سامنے پیش کر دیا (فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ) تیسرے یہ کہ مہمانی پیش کرنے کے وقت انداز گفتگو میں کھانے پر اصرار نہ تھا بلکہ فرمایا اَلَا تَاْكُلُوْنَ ؀ (کیا آپ کھائیں گے نہیں) [1] اشارہ اس طرف ہوا کہ اگرچہ آپ کو حاجت کھانے کی نہ ہو، مگر ہماری خاطر سے کچھ کھائیے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ان سے خطرہ محسوس کرنے لگے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت شرفاء کا تعامل تھا کہ مہمان کچھ نہ کچھ مہمانی قبول کرتا، اور کھاتا تھا، جو مہمان اتنی بھی قبول نہ کرے اس سے خطرہ ہوتا تھا، کہ یہ شاید کوئی دشمن نہ ہو جو تکلیف پہنچانے آیا ہو، اس وقت کے چوروں ظالموں میں بھی یہ شرافت تھی کہ جس کا کچھ کھا لیا پھر اس کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے، اس لئے نہ کھانا سبب خطرہ کا بنتا تھا۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ، صَرَّةٌ کے معنی غیر معمولی آواز کے ہیں، صَرِیْرٌ قلم سے نکلنے کی آواز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ حضرت سارہؓ نے جب سنا کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کو بچے کی پیدائش کی خوش خبری دے رہے ہیں، اور یہ ظاہر تھا کہ بچہ بیوی سے پیدا ہوتا ہے، بیوی حضرت سارہ ہی تھیں، تو سمجھیں کہ یہ خوش خبری ہم دونوں ہی کے لئے ہے، تو غیر اختیاری طور پر اُن کے منہ سے کچھ الفاظ حیرت وتعجب کے نکلے، اور کہا عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ؀ کہ اوّل تو میں بڑھیا، پھر بانجھ یعنی جوانی میں بھی اولاد کے قابل نہیں تھی، اب بڑھاپے میں یہ کیسے ہوگا، جس کے جواب میں فرشتوں نے فرمایا كَذٰلِكِ ۙ یعنی اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے، یہ کام یونہی ہوگا، چنانچہ جس وقت اس بشارت کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت سارہؓ کی عمر ننانوے سال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی تھی۔ (قرطبی) [2]

اس گفتگو میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ مہمان اللہ کے فرشتے ہیں تو پوچھا کہ آپ کس مہم پر تشریف لائے ہیں، انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنے کا تذکرہ کیا کہ ان کی قوم پر پتھراؤ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲۱

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۴۷

کیا جائے گا، اور پتھراؤ بھی کچھ بڑے بڑے پتھروں سے نہیں، بلکہ مٹی سے بنی ہوئی کنکریوں سے ہوگا، مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ، یعنی کنکریاں اللہ کی طرف سے خاص علامت لگی ہوئی ہوں گی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر کنکری پر اس شخص کا نام لکھا تھا جس کو ہلاک کرنے کے لئے یہ بھیجی گئی تھی، اور وہ جس طرف بھاگا اس کنکری نے اس کا تعاقب کیا، اور دوسری آیات میں جو اس قوم کا عذاب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جبرئیل امین نے اس پورے شہر کو اٹھا کر پلٹ دیا تو یہ اس کے منافی نہیں کہ پہلے یہ پتھراؤ کیا گیا ہو اس کے بعد پوری زمین کا تختہ اُلٹا گیا ہو۔

قوم لوط کے بعد قوم موسیٰ علیہ السلام اور فرعون وغیرہ کا ذکر فرمایا، اس میں فرعون کو جب موسیٰ علیہ السلام نے پیغامِ حق دیا تو فرعون کا عمل یہ ذکر فرمایا فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ، یعنی فرعون موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنی قوت یعنی اپنی فوج اور امراءِ دولت کی طرف متوجہ ہوگیا، رُکن کے لفظی معنی قوت کے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کے کلام میں (اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۞٨٠ [1]) (ہود) اسی معنی کے لئے آیا ہے۔

اس کے بعد قوم عاد و ثمود اور آخر میں قوم نوح کا واقعہ بیان فرمایا، یہ واقعات اس سے پہلے کئی مرتبہ گزر چکے ہیں۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۞٤٧ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا

اور بنایا ہم نے آسمان ہاتھ کے بَل سے اور ہم کو سب مقدور ہے، اور زمین کو بچھایا ہم نے

فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۞٤٨ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ

سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم، اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے تاکہ

تَذَكَّرُوْنَ ۞٤٩ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۞٥٠

تم دھیان کرو، سو بھاگو اللہ کی طرف میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر،

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۞٥١ كَذٰلِكَ

اور مت ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ اور کسی کو معبود میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر، اسی طرح

---

[1] ترجمہ: یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا۔

مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا اس کو یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ،

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾

کیا یہی وصیت کر مرے ہیں ایک دوسرے کو، کوئی نہیں پر یہ لوگ شریر ہیں، سو تو لوٹ آ ان کی طرف سے اب تجھ پر نہیں ہے الزام،

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾

اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور آسمان کو ہم نے قوّت سے بنایا ہے، اور ہم یقیناً وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔ ﴿۴۷﴾ اور زمین کو ہم نے فرش بنایا ہے، چنانچہ ہم کیا خوب بچھانے والے ہیں! ﴿۴۸﴾ اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ﴿۴۹﴾ لہٰذا دوڑو اللہ کی طرف۔ یقین جانو، میں اُس کی طرف سے تمہارے لئے صاف صاف خبردار کرنے والا (بن کر آیا) ہوں۔ ﴿۵۰﴾ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بناؤ۔ یقین جانو میں اُس کی طرف سے تمہارے لئے صاف صاف خبردار کرنے والا (بن کر آیا) ہوں۔ ﴿۵۱﴾ اسی طرح ان سے پہلے جو لوگ تھے، اُن کے پاس بھی کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کے بارے میں اُنہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ: ''جادوگر ہے، یا دیوانہ ہے۔'' ﴿۵۲﴾ کیا یہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے چلے آئے ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں۔ ﴿۵۳﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) تم ان سے بے رُخی اختیار کرو، کیونکہ تم قابلِ ملامت نہیں ہو۔ ﴿۵۴﴾ اور نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کو فائدہ دیتی ہے۔ ﴿۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے آسمان کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو ہم (کیسے) اچھے بچھانے والے ہیں (یعنی اس میں کیسے کیسے منافع رکھے ہیں) اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنایا (اس قسم

سے مراد مقابل ہے، سو ظاہر ہے کہ ہر شے میں کوئی نہ کوئی صفت ذاتیہ یا عرضیہ ایسی معتبر ہوتی ہے جس سے دوسری چیز جس میں اس صفت کی نقیض یا ضد ملحوظ ہو، اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے، جیسے آسمان وزمین، جوہر وعرض، گرمی وسردی، شیریں وتلخ، چھوٹی وبڑی، خوش نما وبدنما، سفیدی وسیاہی، روشنی وتاریکی، وعلیٰ ھٰذا) تاکہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو (اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما دیجئے کہ جب یہ مصنوعات وحدتِ صانع پر دلالت کر رہی ہیں) تو تم (کو چاہئے کہ ان سے استدلال کر کے) اللہ ہی کی (توحید کی) طرف دوڑو (اور اوّل تو بوجہ دلائل مذکورہ کے خود عقل ہی اعتقادِ توحید کو ضروری بتلا رہی ہے، پھر اوپر سے) میں (بھی) تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے صاف طور پر ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں (کہ منکرِ توحید کو عذاب ہوگا، پس خوفِ عذاب کے اعتبار سے اعتقادِ توحید اور بھی ضروری ہوگیا) اور (پھر اور زیادہ توضیح سے کہتا ہوں کہ) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود قرار نہ دو (پھر تغیرِ عنوان کے ساتھ مضمونِ توحید کی وجہ سے انذار کی پھر تاکید ہے کہ) میں تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ واقع میں بلاشبہ نذیر مبین ہیں جیسا ابھی مذکور ہوا، لیکن یہ آپ کے مخالفین ایسے جاہل ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو کبھی ساحر کبھی مجنون بتلاتے ہیں، سو آپ صبر کیجئے کیونکہ جس طرح یہ آپ کو کہہ رہے ہیں) اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو انہوں نے (یعنی کُل نے یا بعض نے) ساحر یا مجنون نہ کہا ہو (آگے کفار کے اس قول (سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾) پر متفق ہونے سے تعجب دلاتے ہیں کہ) کیا اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آئے تھے (یعنی یہ اجماع تو ایسا ہو گیا جیسے ایک دوسرے کو کہتے چلے آئے ہوں کہ دیکھو جو رسول آئے تم بھی ہماری طرح کہنا، آگے حقیقتِ واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ تواصی واقع نہ ہوئی تھی، کیونکہ بعض قومیں بعض قوموں سے ملی بھی نہیں) بلکہ (وجہ اس اجماع واتفاق کی یہ ہوئی کہ) یہ سب کے سب شرکش لوگ ہیں (یعنی سبب اس قول کا سرکشی ہے چونکہ وہ ان سب میں مشترک ہے، اس لئے قول بھی مشترک ہو گیا) سو (جب پہلے لوگ بھی ایسے گزرے ہیں اور سب اس کا معلوم ہو گیا کہ انہیں کا طغیان ہے تو) آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے (یعنی ان کی تکذیب کی پروا اور غم نہ کیجئے) کیونکہ آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں (کقولہ تعالیٰ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ [1] (البقرۃ)) اور (اطمینان کے ساتھ اپنے منصبی کام میں لگے رہئے فقط) سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا (جن کی قسمت میں ایمان نہیں ان پر تو اتمامِ حجت ہوگا اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان) ایمان (لانے) والوں کو (بھی اور جو پہلے مؤمن ہیں ان کو بھی) نفع دے گا (بہر حال تذکیر میں عام فوائد اور حکمتیں سب کے اعتبار سے ہیں، آپ اس کو کئے جایئے اور کسی کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کیجئے)۔

[1] ترجمہ: اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں قیامت و آخرت کا بیان اور اس کو نہ ماننے والوں پر عذاب کا ذکر تھا، ان آیات میں بھی حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے جس سے قیامت اور اس میں مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر جو تعجب منکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے اس کا ازالہ ہے، نیز توحید کا اثبات اور رسالت پر ایمان کی تاکید ہے۔

بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ لفظ اَیْد، قوت و قدرت کے معنی میں آتا ہے، اس جگہ حضرت ابن عباسؓ نے اَیْد کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ "یعنی دوڑو اللہ کی طرف"، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے بھاگو اللہ کی طرف توبہ کے ذریعہ، ابوبکر ورّاق اور جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ نفس و شیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں، اور بہکانے والے ہیں، تم اُن سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو تو وہ تمہیں ان کے شر سے بچالیں گے۔ (قرطبی)[1]

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ

اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو، میں نہیں چاہتا ان سے

مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ

روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں، اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا

ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ

زور آور مضبوط، سو اُن گنہگاروں کا بھی ڈول بھر چکا ہے جیسے ڈول بھرا اُن کے ساتھیوں کا

فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ

اب مجھ سے جلدی نہ کریں، سو خرابی ہے منکروں کو ان کے اس دن سے

---

1 تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۵۳ و ۵۴

ع ۳

الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

جس کا اُن سے وعدہ ہو چکا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور میں نے جِنّات اور اِنسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ ﴿۵۶﴾ میں ان سے کسی قسم کا رِزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ ﴿۵۷﴾ اللّٰہ تو خود ہی رزّاق ہے، مستحکم قوت والا! ﴿۵۸﴾ اب تو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، اُن کی بھی ایسی ہی باری آئے گی جیسے ان کے (پچھلے) ساتھیوں کی باری آئی تھی، اس لئے وہ مجھ سے جلدی (عذاب لانے) کا مطالبہ نہ کریں۔ ﴿۵۹﴾ غرض جن لوگوں نے کفر اِختیار کیا ہے، اُن کی اُس دن کی وجہ سے بڑی خرابی ہوگی جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ ﴿۶۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور میں جن اور انسان کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں (اور تبعًا وتکمیلًا للعبادۃ جن وانس کی پیدائش پر دوسرے منافع کا مرتب ہونا اس کے منافی نہیں، اور اسی طرح بعض جن وانس سے عبادت کا صادر نہ ہونا بھی اس مضمون کے منافی نہیں، کیونکہ حاصل اس لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ کا ارادۂ تشریعیہ ہے یعنی اُن کو عبادت کا حکم دینا نہ کہ ارادۂ تکوینیہ یعنی عبادت پر مجبور کرنا، اور تخصیص جن وانس کی اس لئے ہے کہ عبادت سے مراد عبادت بالاختیار وابتلاء ہے، اور ملائکہ میں اگرچہ عبادت ہے ابتلاء نہیں اور دوسری مخلوقات حیوانات ونباتات وغیرہ میں اختیار نہیں، حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ مجھ کو مطلوبِ شرعی ان سے عبادت کرانا ہے باقی) میں اُن سے (مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں اللّٰہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے (تو ہم کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ ہم مخلوقات کی روزی رسانی ان کے متعلق کرتے اور وہ) قوّت والا نہایت قوت والا ہے (کہ اس میں عجز وضعف اور کسی قسم کی احتیاج کا عقلی احتمال بھی نہیں تو ان سے کھانا مانگنے کا کوئی امکان ہی نہیں، یہ ترغیب ہوگئی، آگے ترہیب ہے کہ جب عبادت کا وجوب ثابت ہوگیا اور عبادت کا اہم رکن ایمان ہے تو اگر یہ لوگ اب بھی شرک وکفر پر مصر رہیں گے) تو (سن رکھیں کہ) ان ظالموں کی (سزا کی) بھی باری (علم الٰہی میں مقرر ہے) جیسے ان کے (گزشتہ) ہم مشربوں کی باری (مقرر) تھی (یعنی ہر مجرم ظالم کے لئے اللّٰہ کے علم میں خاص خاص وقت مقرر ہے، اس طرح نوبت بہ نوبت ہر مجرم کی باری آتی ہے تو وہ عذاب

میں پکڑا جاتا ہے، کبھی دنیا وآخرت دونوں میں اور کبھی صرف آخرت میں) سو مجھ سے (عذاب) جلدی طلب نہ کریں (جیسا کہ اُن کی عادت ہے، کہ وعیدیں سن کر تکذیب کے طور پر استعجال کرنے لگتے ہیں) غرض (جب وہ باری کے دن آئیں گے جن میں سب سے اشد یوم موعود یعنی قیامت ہے تو) ان کافروں کے لئے اس دن کے آنے سے بڑی خرابی ہوگی جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، (چنانچہ خود سورت بھی اسی وعدے سے شروع ہوتی ہے اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ [1] اوراس سے سورت کے آغاز وانجام کا حُسن ظاہر ہے)۔

معارف ومسائل

جن وانس کی تخلیق کا مقصد

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶ ”یعنی ہم نے جنات اور انسان کو عبادت کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، اس میں دو اشکال ظاہر نظر میں پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا ہے، اور اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ مخلوق اس کام کو کرے تو عقلی طور پر یہ ناممکن ومحال ہوگا کہ پھر وہ مخلوق اس کام سے انحراف کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کے خلاف کوئی کام محال ہے، دوسرا اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں انسان اور جن کی تخلیق کو صرف عبادت میں منحصر کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان کی پیدائش میں علاوہ عبادت کے دوسرے فوائد اور حکمتیں بھی موجود ہیں۔

پہلے اشکال کے جواب میں بعض حضرات مفسرین نے اس مضمون کو صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یعنی ہم نے مؤمن جنات اور مؤمن انسانوں کو بجز عبادت کے اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا اور مؤمنین ظاہر ہے کہ عبادت کے کم وبیش پابند ہوتے ہیں، یہ قول ضحاک اور سفیان وغیرہ کا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک قراءت آیت مذکورہ میں لفظ مؤمنین مذکور بھی ہے، اور قراءت اس طرح ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اس قراءت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ مضمون صرف مؤمنین کے حق میں آیا ہے، اور خلاصۂ تفسیر میں اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ارادۂ الٰہیہ سے مراد ارادۂ تکوینی نہیں ہے جس کے خلاف کا وقوع محال ہوتا ہے بلکہ ارادۂ تشریعی ہے، یعنی یہ کہ ہم نے اُن کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم ان کو عبادت کے لئے مامور کریں، امرِ الٰہی چونکہ انسانی اختیار کے ساتھ مشروط رکھا گیا ہے، اس کے خلاف کا وقوع محال نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو حکم عبادت کا سب کو

[1] ترجمہ: تم سے جس کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور جزا ضرور ہونے والی ہے۔

دیا ہے مگر ساتھ ہی اختیار کو غلط استعمال کیا، عبادت سے منحرف ہو گیا، یہ قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغویؒ نے نقل کیا ہے، [۱] اور زیادہ بہتر اور بے غبار توجیہ وہ ہے جو تفسیر مظہری میں کی گئی ہے کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ ہم نے ان کی تخلیق اس انداز پر کی ہے کہ ان میں استعداد اور صلاحیت عبادت کرنے کی ہو، چنانچہ ہر جن وانس کی فطرت میں یہ استعداد قدرتی موجود ہے، پھر کوئی اس استعداد کو صحیح مصرف میں خرچ کر کے کامیاب ہوتا ہے، کوئی اس استعداد کو اپنے معاصی اور شہوات میں ضائع کر دیتا ہے، اور اس مضمون کی مثال وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ [۲] (یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو (اس فطرت سے ہٹا کر کوئی) یہودی بنا دیتا ہے کوئی مجوسی، فطرت پر پیدا ہونے سے مراد اکثر علماء کے نزدیک دینِ اسلام پر پیدا ہونا ہے، تو جس طرح اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر انسان میں فطری اور خلقی طور پر اسلام وایمان کی استعداد وصلاحیت رکھی جاتی ہے، پھر کبھی اس کے ماں باپ اس صلاحیت کو ضائع کر کے کفر کے طریقوں پر ڈالتے ہیں، اسی طرح اس آیت میں (اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾) کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ جن وانس کے ہر فرد میں اللہ تعالیٰ نے اِستعداد اور صلاحیت عبادت کی رکھی ہے۔ [۳] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اور دُوسرے اِشکال کا جواب خلاصۂ تفسیر میں یہ آچکا ہے کہ کسی مخلوق کو عبادت کے لئے پیدا کرنا اس سے دوسرے منافع اور فوائد کی نفی نہیں کرتا۔

مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ الآیۃ یعنی جن وانس کو پیدا کر کے ان سے عام انسانوں کی عادت کے مطابق اپنا کوئی نفع نہیں چاہتا، کہ وہ رزق پیدا کریں، میرے لئے یا اپنے لئے یا میری دوسری مخلوق کے لئے، اور یا یہ کہ وہ مجھے کما کر کھلائیں، یہ سب کلام انسان کی عام عادت پر کیا گیا ہے، کیونکہ بڑے سے بڑا انسان جو غلام خریدتا اور اس پر خرچ کرتا ہے تو اس کا مقصد ان غلاموں سے اپنے کام لینا اپنی ضروریات اور کاموں میں مدد لینا اور کمائی کر کے آقا کو دینا ہوتا ہے، حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک اور بالا و برتر ہیں، اس لئے فرمایا کہ ان کو پیدا کرنے سے میرا کوئی نفع مقصود نہیں۔

ذَنُوْبًا، لفظ ذَنُوْب بِفَتْحِ الذَّالِ اصل میں بڑے ڈول کو کہا جاتا ہے، اور بستی کے عام کنوؤں پر پانی بھرنے کے لئے بغرض سہولت بھرنے والوں کے نمبر اور باری مقرّر کر لی جاتی ہے، ہر ایک پانی بھرنے والا اپنی باری میں پانی بھرتا ہے، اس لئے یہاں لفظ ذَنُوْب کے معنی باری اور حصہ کے لئے گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ جس طرح پچھلی اُمتوں کو اپنے اپنے وقت

---

[۱] تفسیر البغوی ج:۱۷ ص:۳۸۰

[۲] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب إذا اسلم الصبی فمات ...إلخ، ج:۱ ص:۱۸۰

[۳] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۹۱

میں عمل کرنے کا موقع اور باری دی گئی، جن لوگوں نے اپنی باری میں کام نہیں کیا وہ ہلاک و برباد اور گرفتارِ عذاب ہوئے، اسی طرح موجودہ مشرکین کی بھی باری اور وقت مقرر ہے، اگر اس وقت تک یہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو خدا کا عذاب ان کو کبھی تو اسی دنیا میں اور نہیں تو آخرت میں ضرور پکڑے گا، اس لئے ان کو فرما دیجئے کہ اپنی جلد بازی سے باز آجاؤ، یعنی یہ کفار جو بطور تکذیب و انکار کے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم واقعی مجرم ہیں اور مجرمین پر عذاب آنا آپ کے قول سے ثابت ہے تو پھر ہم پر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ ان کا جواب یہ ہے کہ عذاب اپنے مقررہ وقت پر اور اپنی باری پر آتا ہے، تمہاری باری بھی آنے والی ہے جلد بازی نہ کرو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

سورۂ ذاریات آج دوشنبہ ۲۱/ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ کو پوری ہوگئی۔

سُوْرَةُ الطُّوْرِ

اٰیاتها ۴۹ ۵۲ سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ ۷۶ رکوعاتها ۲

سورۂ طور مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالطُّوْرِ ۙ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ ۝۳

قسم ہے طور کی، اور لکھی ہوئی کتاب کی، کشادہ ورق میں،

وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ ۝۴ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ ۝۵ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ ۝۶

اور آباد گھر کی، اور اُونچی چھت کی، اور اُبلتے ہوئے دریا کی،

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ ۝۷ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ ۝۸ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ

بے شک عذاب تیرے ربّ کا ہوکر رہے گا، اس کو کوئی نہیں ہٹانے والا، جس دن لرزے آسمان

مَوْرًا ﴿٩﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿١٠﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾

کپکپا کر، اور پھریں پہاڑ چل کر، سو خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کو

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿١٢﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿١٣﴾ وقف لازم

جو باتیں بناتے ہیں کھیلتے ہوئے، جس دن کہ دھکیلے جائیں دوزخ کی طرف دھکیل کر،

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٤﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ

یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھوٹ جانتے تھے، اب بھلا یہ جادو ہے

اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿١٥﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا

یا تم کو نہیں سوجھتا، چلے جاؤ اس کے اندر پھر تم صبر کرو یا نہ صبر کرو

سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ

تم کو برابر ہے وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے، جو ڈرنے والے ہیں

فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿١٧﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ

وہ باغوں میں ہیں اور نعمت میں، میوے کھاتے ہوئے جو اُن کو دیئے ان کے ربّ نے، اور بچایا ان کو ان کے ربّ نے

عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿١٨﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾

دوزخ کے عذاب سے، کھاؤ اور پیو رچتا ہوا بدلہ ان کاموں کا جو تم کرتے تھے،

مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٢٠﴾

تکیہ لگائے بیٹھے تختوں پر برابر بچھے ہوئے قطار باندھ کر اور بیاہ دیں ہم نے ان کو حوریں بڑی آنکھوں والیاں،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

اور جو لوگ یقین لائے اور ان کی راہ پر چلی ان کی اولاد ایمان سے پہنچادیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱

اور گھٹایا نہیں ہم نے ان سے ان کا کیا ذرا بھی، ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہے،

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۲۲ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا

اور تار لگادیا ہم نے ان پر میووں کا اور گوشت کا جس چیز کو چاہیں، جھپٹتے ہیں وہاں پیالہ

لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ۝۲۳ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ

نہ بکنا ہے اس شراب میں اور نہ گناہ میں ڈالنا، اور پھرتے ہیں ان کے پاس چھوکرے ان کے گویا وہ موتی ہیں

مَّكْنُوْنٌ ۝۲۴ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ يَّتَسَاۗءَلُوْنَ ۝۲۵ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ

اپنے غلاف کے اندر، اور منہ کیا بعضوں نے دوسروں کی طرف آپس میں پوچھتے ہوئے، بولے ہم بھی تھے اس سے پہلے

فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝۲۷

اپنے گھروں میں ڈرتے رہتے، پھر احسان کیا اللہ نے ہم پر اور بچادیا ہم کو لو کے عذاب سے،

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝۲۸ ع

ہم پہلے سے پکارتے تھے اس کو بے شک وہی ہے نیک سلوک والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے کوہِ طور کی، (۱) اور اُس کتاب کی جو ایک کھلے ہوئے صحیفے میں لکھی ہوئی ہے (۲) و (۳) اور قسم ہے بیتِ معمور کی (۴) اور بلند کی ہوئی چھت کی، (۵) اور بھرے ہوئے سمندر کی، (۶) کہ تمہارے پروردگار کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے، (۷) کوئی نہیں ہے جو اُسے روک سکے، (۸) جس دن آسمان تھرتھرا کر لرز اُٹھے گا، (۹) اور پہاڑ ہولناک طریقے سے چل پڑیں گے، (۱۰) تو اُس دن بڑی خرابی ہوگی اُن کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں، (۱۱) جو بے ہودہ باتوں میں ڈوبے ہوئے کھیل رہے ہیں، (۱۲) اُس دن جب اُنہیں دھکے دے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، (۱۳) (کہ:) ''یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ (۱۴) بھلا کیا یہ جادو ہے یا تمہیں (اب بھی) کچھ نظر نہیں آرہا؟ (۱۵) داخل ہو جاؤ اس میں! پھر تم صبر کرو، یا نہ کرو، تمہارے لئے برابر ہے۔ تمہیں اُنہی کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔'' (۱۶) متقی لوگ بیشک باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، (۱۷) اُن کے پروردگار نے اُنہیں جس طرح نوازا اور اُن کے پروردگار ہی نے اُنہیں دوزخ کے عذاب سے جس طرح بچایا، اُس کا لطف اُٹھا رہے ہوں گے۔ (۱۸) (اُن سے کہا جائے گا کہ:) ''خوب مزے سے کھاؤ پیو، اُن اعمال کے صلے میں جو تم کیا کرتے تھے۔'' (۱۹) وہ ایک قطار میں لگی ہوئی اُونچی نشستوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے اُن کا بیاہ کر دیں گے۔ (۲۰) اور جو لوگ اِیمان لائے ہیں، اور اُن کی اولاد نے بھی اِیمان میں اُن کی پیروی کی ہے، تو اُن کی اولاد کو ہم اُنہی کے ساتھ شامل کر دیں گے، اور اُن کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے۔ ہر اِنسان کی جان اپنی کمائی کے بدلے رہن رکھی ہوئی ہے۔ (۲۱) اور ہم اُنہیں ایک کے بعد ایک پھل اور گوشت، جو بھی اُن کا دِل چاہے گا، دیئے چلے جائیں گے۔ (۲۲) وہاں وہ ایسے جامِ شراب پر (دوستانہ) چھینا جھپٹی کر رہے ہوں گے جس میں نہ کوئی بے ہودگی ہوگی، اور نہ کوئی گناہ ہوگا۔ (۲۳) اور ان کے اِردگرد وہ نوجوان پھر رہے ہوں گے جو اُنہی (کی خدمت) کے لئے مخصوص ہوں گے، ایسے (خوبصورت) جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی! (۲۴) اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے، (۲۵) کہیں گے کہ: ''ہم پہلے جب اپنے گھر والوں (یعنی دُنیا) میں تھے تو ڈرے سہمے رہتے تھے، (۲۶) آخر اللہ نے ہم پر بڑا اِحسان فرمایا، اور ہمیں جھلسانے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ (۲۷) ہم اس سے پہلے اُس سے دُعائیں مانگا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے جو بڑا محسن، بہت مہربان ہے۔'' (۲۸)

خلاصہ تفسیر

قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے (مراد اس سے نامہ اعمال ہے جس کی نسبت دوسری آیت میں آیا ہے کِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ [1] (بنی اسرائیل) اور جس چیز میں وہ لکھا ہوا ہے اس کو تشبیہاً کاغذ کہہ دیا) اور (قسم ہے) بیت المعمور کی (کہ ساتویں آسمان میں عبادت خانہ ہے فرشتوں کا، کما فی الدر مرفوعًا) [2] اور (قسم ہے) اونچی چھت کی (مراد آسمان ہے، قال تعالیٰ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا [3] (الانبیاء: ۳۲) وقال تعالیٰ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ [4] (الرعد: ۲)، وصرّح بهٰذا التفسیر عن علیؓ بسند صحیح کنز العمال عن مستدرك الحاکم) [5] اور (قسم ہے) دریائے شور کی جو (پانی سے) پُر ہے (آگے جواب قسم ہے) کہ بے شک آپ کے رَبّ کا عذاب ضرور ہوکر رہے گا کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا (اور یہ اس روز واقع ہوگا) جس روز آسمان تھرتھرانے لگے گا اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹ جائیں گے (مراد قیامت کا دن ہے، اور تھرّانا یا تو باعتبار معنی متبادر کے ہو، یا مراد اس سے انشقاق ہو جو دوسری آیت میں مذکور ہے فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ [6] (الرحمٰن: ۳۷)، روح المعانی میں ابن عباسؓ سے دونوں تفسیریں نقل کی ہیں، [7] اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں، آگے پیچھے دونوں کا تحقق ہوسکتا ہے، اور یہاں پہاڑوں کا ہٹنا مذکور ہے، اور دوسری آیتوں میں ریزہ ریزہ ہونا پھر اُڑ جانا مذکور ہے قولہ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ [8] (طٰہٰ: ۱۰۵)، قولہ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً [9] (الواقعہ)، اور ان قسموں میں اس مقصد کو ذہن کے قریب لانا ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے اور وہ یہ کہ قیامت کے وقوع کی اصل وجہ جزاء وسزا ہے، اور مجازاۃ میں مدارِ کار اَحکام شرعیہ ہیں، پس طور کی قسم کھانے میں اشارہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ کلام واَحکام ہے، پھر ان اَحکام کی مخالفت یا موافقت مبنیٰ ہے مجازاۃ کا، نامۂ اعمال کی قسم کھانے میں اشارہ ہوگیا اس موافقت یا مخالفت کے محفوظ ومنضبط ہونے کی طرف، مجازاۃ اس پر بھی موقوف ہے کہ اَحکامِ الٰہیہ کی اطاعت ضروری ہو، بیت المعمور

---

[1] ترجمہ: اور ہم اس کا نامۂ اعمال اس کے واسطے نکال کر سامنے کردیں گے۔

[2] الدر المنثور ج: ۹ ص: ۳۰۶

[3] ترجمہ: اور ہم نے آسمان کو ایک چھت بنایا ہے جو محفوظ ہے۔

[4] ترجمہ: اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدوں ستون کے اونچا کھڑا کردیا۔

[5] المستدرك للحاکم، رقم الحدیث: ۳۷۴۳

[6] ترجمہ: غرض جب آسمان پھٹ جاوے گا۔

[7] روح المعانی ج: ۱۹ ص: ۴۲۸

[8] ترجمہ: میرا رَبّ اُن کو بالکل اُڑا دے گا۔

[9] ترجمہ: اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہوجاویں گے پھر وہ پراگندہ غبار ہوجاویں گے۔

کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ عبادت ایسا ضروری امر ہے کہ فرشتوں کو بھی باوجود اس کے کہ ان کے لئے جزاء وسزا نہیں اس سے نہیں چھوڑا گیا، پھر نتیجۂ مجازاۃ دو چیزیں ہیں، جنت اور دوزخ، سماء کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ جنت ایسی ہی رفعت کا مکان ہے، جیسے آسمان، اور بحر مسجور کی قسم میں اشارہ ہوگیا کہ دوزخ بھی ایسی ہی خوفناک چیز ہے، جیسے سمندر، یہ وجہ تخصیص تقسیمِ اقسام کی ہوسکتی ہے، اور نفسِ قسم کی توجیہ سورۂ حِجْر کی ایک آیت لَعَمْرُكَ [1] (الحجر: ۷۲) کے ذیل میں اور غایت وغرض کی شروع سورۂ صافات میں گزر چکی ہے، آگے اس یوم کے بعض واقعات ارشاد فرماتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوا کہ مستحقینِ عذاب کے لئے عذاب ضرور واقع ہوگا) تو جو لوگ (قیامت کے اور دیگر امور حقہ توحید و رسالت کے) جھٹلانے والے ہیں (اور) جو (تکذیب کے) مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگ رہے ہیں (جس سے وہ مستحقِ عذاب ہوگئے ہیں) اُن کی اس روز بڑی کم بختی آئے گی جس روز کہ ان کو آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لائیں گے (کیونکہ خوشی سے ایسی جگہ کون آتا ہے، پھر جب اُن کے ڈالنے کا وقت ہوگا تو اس حالت سے پکڑ کے ڈال دیئے جائیں گے فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ [2] (الرحمٰن: ۴۱) اور اُن کو دوزخ دکھلا کر زجراً کہا جائے گا کہ) یہ وہی دوزخ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (یعنی جن آیتوں میں اس کی خبر تھی ان کو جھٹلاتے تھے اور نیز ان آیات کو سحر کہا کرتے تھے، خیر وہ تو تمہارے نزدیک سحر تھا) تو کیا یہ (بھی) سحر ہے (دیکھ کر بتلاؤ) یا یہ کہ تم کو (اب بھی) نظر نہیں آتا (جیسا دنیا میں نظر نہ آنے کی وجہ سے منکر ہوگئے تھے اچھا تو اَب) اس میں داخل ہو پھر خواہ (اس کی) سہار کرنا یا سہار نہ کرنا تمہارے حق میں دونوں برابر ہیں (نہ یہی ہوگا کہ تمہاری ہائے واویلا سے نجات ہوجائے اور نہ یہی ہوگا کہ تمہاری تسلیم وانقیاد وسکوت پر رحم کر کے نکال دیا جائے بلکہ ہمیشہ اسی میں رہنا ہوگا اور) جیسا تم کرتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائے گا (تم کفر کیا کرتے تھے جو سب سے بڑی نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اور کمالات غیر متناہیہ کی ناشکری ہے، پس بدلہ میں دوزخ کا خلود نصیب ہوگا جو کہ عذاب اشد وغیر متناہی ہے، آگے ان کے اضداد کا بیان ہے یعنی) متقی لوگ بلاشبہ (بہشت کے) باغوں اور سامانِ عیش میں ہوں گے (اور) اُن کو جو چیزیں (عیش وآرام کی) اُن کے پروردگار نے دی ہوں گی ان سے خوش دل ہوں گے، اور اُن کا پروردگار ان کو عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھے گا (اور جنت میں داخل کر کے فرمائے گا کہ) خوب کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ اپنے (ان نیک) عملوں کے بدلہ میں (جو دنیا میں کیا کرتے تھے) تکیہ لگائے ہوئے تختوں پر جو برابر بچھائے ہوئے ہیں، اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے (یعنی حوروں سے) بیاہ کردیں گے (یہ حال تو سب اہلِ ایمان کا ہوا) اور (آگے ان خاص مؤمنین کا ذکر ہے جن کی اولاد بھی موصوف بالایمان تھی پس ارشاد ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور ان کی

---

[1] ترجمہ: آپ کی جان کی قسم۔

[2] ترجمہ: سو سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جاویں گے۔

اولاد نے بھی ایمان میں اُن کا ساتھ دیا، (یعنی وہ بھی ایمان لائے گو اعمال میں وہ اپنے آباء کے رتبہ کو نہیں پہنچے، جیسا کہ عدمِ ذکرِ اعمال اس کا قرینہ ہے، و نیز احادیث میں مصرّح ہے كَانُوْا دُوْنَهٗ فِي الْعَمَلِ، وَكَانَتْ مَنَازِلُ آبَائِهِمْ اَرْفَعَ، وَلَمْ يَبْلُغُوْا دَرَجَتَكَ وَعَمَلَكَ، رواها في الدر المنثور، [1] تو گو اُن کے عمل میں کمی کا مقتضا یہ تھا کہ ان کا درجہ بھی کم ہو، لیکن ان آباء مؤمنین کے اکرام اور ان کو خوش کرنے کے لئے) ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور (اس شامل کرنے کے لئے) ہم ان (اہلِ جنت متبوعین) کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے، یعنی یہ نہ کریں گے کہ ان متبوعین کے بعض اعمال لے کر اُن کی ذُرّیت کو دے کر دونوں کو برابر کر دیں، جیسے مثلاً ایک شخص کے پاس چھ سو روپے ہوں اور ایک کے پاس چار سو اور دونوں کا برابر کرنا مقصود ہو تو اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ چھ سو روپے والے سے ایک سو روپے لے کر اس چار سو والے کو دے دیئے جائیں کہ دونوں کے پاس پانچ پانچ سو ہو جائیں۔ اور دوسری صورت جو کریموں کی شان کے لائق ہے یہ ہے کہ چھ سو والے سے کچھ نہ لیا جائے بلکہ اس چار سو والے کو دو سو روپے اپنے پاس سے دے دیں اور دونوں کو برابر کر دیں، پس مطلب یہ ہے کہ وہاں پہلی صورت واقع نہ ہوگی جس کا اثر یہ ہوتا کہ متبوع کو بوجہ کم ہو جانے اعمال کے اس کے درجہ سے کچھ نیچے لاتے، اور تابع کو کچھ اوپر لے جاتے اور دونوں ایک متوسط درجہ میں رہتے یہ نہ ہوگا، بلکہ دوسری صورت واقع ہوگی اور متبوع اپنے درجۂ عالیہ میں بدستور رہے گا، اور تابع کو وہاں پہنچا دیا جائے گا اور متبوع اور ذُرّیت میں ایمان کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ ذرّیت مؤمن نہیں تو آباء مؤمنین کے ساتھ الحاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ کافروں میں سے) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (فی النار اور ماخوذ) رہے گا (کقوله تعالىٰ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝۳۸ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝۳۹ [2] (المدثر) فسّره ابن عباس كما في الدر، [3] یعنی نجات کی کوئی صورت نہیں، لہٰذا اِن کا الحاق آباء مؤمنین کے ساتھ متصوّر نہیں، اس لئے الحاق میں ایمان ذُرّیت کی شرط ہے) اور (آگے پھر مطلق اہلِ ایمان و اہل جنت کا بیان ہے کہ) ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا اُن کو مرغوب ہو روز افزوں دیتے رہیں گے (اور) وہاں آپس میں (بطور خوش طبعی کے) جامِ شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ اس (شراب) میں نہ بک بک لگے گی (کیونکہ نشہ نہ ہوگا) اور نہ کوئی بیہودہ بات (عقل و متانت کے خلاف) ہوگی اور ان کے پاس (فواکہ وغیرہ لانے کے لئے) ایسے لڑکے آئیں جائیں گے (یہ لڑکے کون ہوں گے اس کی تحقیق تفسیر سورۂ واقعہ میں آئے گی) جو خاص انہی (کی خدمت) کے لئے ہوں گے، (اور غایت حسن و جمال سے ایسے ہوں گے کہ) گویا ہو حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں

---

[1] الدر المنثور ج:۹ ص:۳۰۹، والمعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث:۱۲۰۸۲ (بالإختصار)

[2] ترجمہ: ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں محبوس ہوگا مگر داہنے والے۔

[3] الدر المنثور، تفسير سورة المدّثر ج:۱۰ ص:۱۳۹

(کہ اُن پر ذرا گرد و غبار نہیں ہوتا، اور آب و تاب اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے) اور (ان کو روحانی مسرّت بھی ہوگی، چنانچہ اس میں سے ایک کا بیان یہ ہے کہ) وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اور اثنائے گفتگو میں) یہ بھی کہیں گے کہ (بھائی) ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا میں انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچا لیا (اور) ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے (کہ ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جائے سو اللہ نے دُعاء قبول کرلی) واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے (اور اس مضمون سے مسرّت ہونا ظاہر ہے، اور چونکہ یہ امر دو حیثیت سے نعمت تھا، ایک فی نفسہٖ عذاب سے بچانا، دوسرے ہم ناکاروں کی ناچیز عرض قبول کرلینا، اس لئے دو عنوانوں سے تعبیر کیا گیا)۔

معارف و مسائل

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ طور کے معنی عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہیں جس پر درخت اُگتے ہوں، یہاں طور سے مراد وہ طور سینین ہے جوارضِ مَدْيَنْ میں واقع ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے شرفِ ہم کلامی نصیب ہوا، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ دنیا میں چار پہاڑ جنت کے ہیں ان میں سے ایک طور ہے (قرطبی) [1] طور کی قسم کھانے میں اس کی خاص تعظیم وتشریف کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے کچھ کلام اور احکام آئے ہیں جن کی پابندی اُن پر فرض ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ لفظ رَقّ دراصل پتلی باریک کھال کے لئے بولا جاتا ہے، جو لکھنے کے واسطے کاغذ کی جگہ بنائی جاتی تھی، مراد اس سے وہ چیز ہے جس پر لکھا گیا ہو، اس لئے اس کا ترجمہ کاغذ سے کر دیا جاتا ہے اور كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ سے مراد یا تو انسان کا نامۂ اعمال ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد قرآن کریم قرار دیا ہے۔ (قرطبی) [2]

آسمانی کعبہ بیت معمور

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ بیت معمور آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے، دنیا کے کعبہ کے بالمقابل ہے، صحیحین کی احادیث میں ثابت ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے تو آپ کو بیت معمور کی

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۵۸، ومعجم الکبیر للطبرانیؒ، رقم الحدیث:۱۳۴۹۶

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۵۹

طرف لے جایا گیا، جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں، پھر کبھی ان کو دوبارہ یہاں پہنچنے کی نوبت نہیں آتی (کیونکہ ہر روز دوسرے نئے فرشتوں کا نمبر ہوتا ہے)۔ (ابن کثیر) [1]

بیتِ معمور ساتویں آسمان کے رہنے والے فرشتوں کا کعبہ ہے، اسی لئے شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیتِ معمور پر پہنچے تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، چونکہ وہ دنیا کے کعبہ کے بانی تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی جزاء میں آسمان کے کعبہ سے بھی ان کا خاص تعلق قائم کر دیا۔ (ابن کثیر) [2]

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝ بَحْرٌ سے مراد سمندر اور مَسْجُوْرٌ سَجْرٌ سے مشتق ہے جو کئی معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنی آگ بھڑکانے کے بھی ہیں، بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے کہ قسم ہے سمندر کی جو آگ بنا دیا جائے گا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قیامت کے روز سارا سمندر آگ بن جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے (وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝) (التکویر) یعنی چاروں طرف کے سمندر آگ بن کر میدانِ حشر میں جمع ہونے والے انسانوں کے محیط ہو جائیں گے، یہی معنی حضرت سعید بن مسیبؒ نے حضرت علیؓ سے نقل کئے ہیں، حضرت ابن عباس اور سعید بن مسیبؒ، مجاہدؒ، عُبید اللہ بن عمیرؒ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ (ابن کثیر) [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی یہودی نے پوچھا کہ جہنم کہاں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: سمندر ہے۔ یہودی نے بھی جو کتبِ سابقہ کا عالم تھا اس کی تصدیق کی۔ (قرطبی) [4] اور حضرت قتادہؒ وغیرہ نے مَسْجُوْرٌ کے معنی مَمْلُوْ کے کئے ہیں، یعنی پانی سے بھرا ہوا، ابنِ جریر نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ (ابن کثیر) [5] یہی معنی خلاصۂ تفسیر میں اُوپر بیان ہوئے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ (بے شک آپ کے رَبّ کا عذاب واقع ہو کر رہے گا، اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں) یہ جوابِ قسم ہے، اوپر طور، صحائف اعمال، بیت المعمور، آسمان، سمندر کی جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے اس کا یہ بیان ہے کہ کفار کے اوپر اللہ کا عذاب ضرور واقع ہوگا۔

واقعۂ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک روز سورۂ طور پڑھی، جب اس آیت پر پہنچے تو ایک آہ سرد بھری، جس

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲۷، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإسراء برسول الله صلی الله علیه وسلم إلی السماوات ج:۱ ص:۹۱

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲۷

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲۹

[4] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۶۱، وشعب الإیمان للبیهقیؒ، رقم الحدیث:۳۶۲، وکنز العمال، رقم الحدیث:۴۴۲۶ (باختلاف)

[5] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۲۹

کے بعد بیس روز تک بیمار رہے، لوگ عیادت کو آتے، مگر یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ بیماری کیا ہے۔ (ابن کثیر) [۱]

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے سے پہلے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ اس لئے آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر کے قیدیوں کے متعلق گفتگو کروں، میں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے اور آواز مسجد سے باہر تک پہنچ رہی تھی، جب یہ آیت پڑھی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ اچانک میری یہ حالت ہوئی کہ گویا میرا دل خوف سے پھٹ جائے گا، میں نے فوراً اسلام قبول کیا، مجھے اُس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس جگہ سے ہٹ نہیں سکوں گا، کہ مجھ پر عذاب آجائے گا۔ (قرطبی) [۲]

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ لغت میں مضطربانہ حرکت کو مَوْرٌ کہا جاتا ہے، آسمان کی اضطرابی حرکت جو قیامت کے روز ہوگی یہ اس کا بیان ہے۔

بزرگوں کے ساتھ نسبی تعلق آخرت میں بھی نفع دے گا، بشرطِ ایمان

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، (یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں اُن کے تابع رہی یعنی مؤمن ہوئی تو ہم ان کی اولاد کو بھی جنت میں انہی کے ساتھ ملحق کر دیں گے) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین صالحین کی ذُرّیت واولاد کو بھی ان کے بزرگ آباء کے درجہ میں پہنچا دیں گے، اگرچہ وہ عمل کے اعتبار سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں تاکہ ان بزرگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ (رواه الحاكم والبيهقي في سننه والبزار وابو نُعيم في الحِلية وابن المنذر وابن جرير وابن ابي حاتم، ازمظهري) [۳]

اور طبرانی نے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اور میرا گمان یہ ہے کہ انہوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص جنت میں داخل ہوگا تو اپنے ماں باپ اور بیوی اور اولاد کے متعلق پوچھے گا (وہ کہاں ہیں؟) اس سے کہا جائے گا کہ وہ تمہارے درجے کو نہیں پہنچے (اس لئے ان کا جنت میں الگ مقام ہے) یہ شخص عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے جو کچھ عمل کیا

---

[۱] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۴۳۰

[۲] تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۶۲، والمعجم الكبير للطبرانيؒ رقم الحديث:۱۴۸۴

[۳] تفسير المظهري ج:۹ ص:۹۶، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۳۷۴۴ (باختصار)، وتفسير ابن ابي حاتم، رقم الحديث:۱۸۶۸۳

وہ اپنے لئے اور ان سب کے لئے کیا تھا، تو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ان کو بھی اسی درجۂ جنت میں اُن کے ساتھ رکھا جائے۔ (ابن کثیر) [۱]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایات مذکورہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت میں ان روایات سے تو یہ ثابت ہوا کہ آباء صالحین کی برکت سے ان کی اولاد کو فائدہ پہنچے گا اور عمل میں ان کا درجہ کم ہونے کے باوجود اپنے آباء صالحین کے درجے میں پہنچائے جائیں گے، اس کا دُوسرا رُخ کہ اولاد صالحین کی وجہ سے والدین کو نفع پہنچے یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کا درجہ جنت میں اس کے عمل کی مناسبت سے بہت اونچا کردیں گے، تو یہ دریافت کرے گا کہ میرے پروردگار مجھے یہ مقام اور درجہ کہاں سے مل گیا (میرا عمل تو اس قابل نہ تھا) تو جواب یہ دیا جائے گا کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لئے اِستغفار و دُعا کی اس کا یہ اثر ہے۔ (رواہ الامام احمد وقال ابن کثیر اسنادہ صحیح ولم یخرجوہ ولکن لہٗ شاھد فی صحیح مسلم عن ابی ھریرۃؓ) [۲]

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اَلَتْ اور اِیْلَاتْ کے لفظی معنی کم کرنے کے ہیں (قرطبی) [۳] معنی آیت کے یہ ہیں کہ صالحین کی اولاد کو ان کے درجۂ عمل سے بڑھا کر صالحین کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ایسا نہیں کیا گیا کہ صالحین کے عمل میں سے کچھ کم کرکے ان کی اولاد کا عمل پورا کیا جاتا بلکہ اپنے فضل سے ان کی برابر کردیا گیا۔

كُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ یعنی ہر اِنسان اپنے عمل میں محبوس ہوگا ایسا نہیں ہوگا کہ کسی دُوسرے کا گناہ اس کے سر ڈال دیا جائے، یعنی جس طرح آیت سابقہ میں اولاد صالحین کو صالحین کی خاطر سے درجہ بڑھا دیا گیا یہ عملِ حسنات میں تو ہوگا، سیئات میں ایک کے گناہ کا کوئی اثر دُوسرے پر نہ پڑے گا۔ (ابن کثیر) [۴]

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ

اب تو سمجھا دے کہ تو اپنے ربّ کے فضل سے نہ جنوں سے خبر لینے والا ہے اور نہ دیوانہ، کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۳۳، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ رقم الحدیث:۱۲۰۸۲

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۳۴، وسنن ابن ماجة، ابواب الأدب، باب بر الوالدین ج:۲ ص:۲۶۰، ومسند احمد، مسند ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم الحدیث:۱۰۶۱۰

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۶۷

[۴] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۳۴

نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ

ہم منتظر ہیں اس پر گردشِ زمانہ کے تو کہہ تم منتظر رہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ

مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾

منتظر ہوں، کیا اُن کی عقلیں یہی سکھلاتی ہیں اُن کو یا یہ لوگ شرارت پر ہیں،

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ

یا کہتے ہیں یہ قرآن خود بنالایا کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے، پھر چاہیئے کہ لے آئیں کوئی بات اسی طرح کی

اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

اگر وہ سچے ہیں، کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ یا وہی ہیں بنانے والے،

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ

یا انہوں نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے، کیا اُن کے پاس ہیں

خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ

خزانے تیرے رَبّ کے یا وہی داروغہ ہیں، کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر سُن آتے ہیں،

فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾

تو چاہیئے لے آئے جو سنتا ہے ان میں ایک سند کھلی ہوئی، کیا اُس کے یہاں بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے،

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ

کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ بدلہ سو اُن پر تاوان کا بوجھ ہے، کیا اُن کو خبر ہے بھید کی

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾

سو وہ لکھ رکھتے ہیں، کیا چاہتے ہیں کچھ داؤ کرنا، سو جو منکر ہیں وہی آتے ہیں داؤ میں،

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا

کیا اُن کا کوئی حاکم ہے اللہ کے سوائے وہ اللہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے اور اگر دیکھیں ایک تختہ

مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا

آسمان سے گرتا ہوا کہیں یہ بادل ہے گاڑھا، سو تو چھوڑ دے اُن کو یہاں تک کہ دیکھ لیں

يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـــًٔا

اپنے اس دن کو جس میں ان پر پڑے گی بجلی کی کڑک، جس دن کام نہ آئے گا ان کو اُن کا داؤ ذرا بھی

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ

اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی، اور ان گنہگاروں کے لئے ایک عذاب ہے اس سے ورے پر

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ

بہت ان میں کے نہیں جانتے، اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رَبّ کے حکم کا تُو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور پاکی بیان کر

بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲

اپنے رَبّ کی خوبیاں جس وقت تو اُٹھتا ہے، اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے

آسان ترجمۂ قرآن

لہٰذا (اے پیغمبر!) تم نصیحت کرتے رہو، کیونکہ تم اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہو، نہ مجنون۔ ﴿۲۹﴾ بھلا کیا یہ

لوگ یوں کہتے ہیں کہ: "یہ صاحب شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں۔"؟ (۳۰) کہہ دو کہ: "کرلو اِنتظار! میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔" (۳۱) کیا ان کی عقلیں ان کو یہی کچھ کرنے کو کہتی ہیں، یا وہ ہیں ہی سرکش لوگ؟ (۳۲) ہاں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ان صاحب نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے"؟ نہیں! بلکہ یہ (ضد میں) ایمان نہیں لا رہے۔ (۳۳) اگر یہ واقعی سچے ہیں تو اس جیسا کوئی کلام (گھڑ کر) لے آئیں۔ (۳۴) کیا یہ لوگ بغیر کسی کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے ہیں، یا یہ خود (اپنے) خالق ہیں؟ (۳۵) یا کیا آسمان اور زمین انہوں نے پیدا کئے ہیں؟ نہیں! بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ (۳۶) کیا تمہارے پروردگار کے خزانے ان کے پاس ہیں، یا وہ داروغہ بنے ہوئے ہیں؟ (۳۷) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ (عالمِ بالا کی باتیں) سن لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان میں سے جو سنتا ہو، وہ کوئی واضح ثبوت تو لائے۔ (۳۸) کیا اللہ کے حصے میں تو بیٹیاں ہیں، اور بیٹے تمہارے حصے میں آئے ہیں؟ (۳۹) اور کیا تم اِن سے کوئی اُجرت مانگ رہے ہو جس کی وجہ سے یہ تاوان کے بوجھ میں دبے جا رہے ہیں؟ (۴۰) یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ لیتے ہوں؟ (۴۱) کیا یہ کوئی مکر کرنا چاہتے ہیں؟ تو درحقیقت جو کافر ہیں، مکر تو اُنہی پر پڑے گا۔ (۴۲) کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی اور خدا ہے؟ پاک ہے اللہ اُس شرک سے جو یہ کر رہے ہیں! (۴۳) اور اگر یہ آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتے ہوئے بھی دیکھ لیں تو یہ کہیں گے کہ یہ کوئی گہرا بادل ہے۔ (۴۴) لہٰذا (اے پیغمبر!) تم انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن سے جا ملیں جس میں ان کے ہوش جاتے رہیں گے، (۴۵) جس دن ان کی مکاری ان کے کچھ کام نہیں آئے گی، اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔ (۴۶) اور اس سے پہلے بھی ان ظالموں کے لئے ایک عذاب ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔ (۴۷) اور تم اپنے پروردگار کے حکم پر جمے رہو، کیونکہ تم ہماری نگاہوں میں ہو، اور جب تم اُٹھتے ہو، اُس وقت اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کیا کرو، (۴۸) اور کچھ رات کو بھی اُس کی تسبیح کرو، اور اُس وقت بھی جب ستارے ڈُوبتے ہیں۔ (۴۹)

خلاصۂ تفسیر

(جب آپ پر مضامین واجب التبلیغ کی وحی کی جاتی ہے جیسے اوپر ہی جنت و دوزخ کے مستحقین کی تفصیل کی گئی ہے) تو آپ (ان مضامین سے لوگوں کو) سمجھاتے رہئے کیونکہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں (جیسا مشرکین کا یہ قول سورۂ والضحیٰ کی شانِ نزول میں منقول ہے قَدْ تَرَكَكَ شَيْطَانُكَ رواہ البخاری، [1] جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کاہن نہیں ہو سکتے، کیونکہ کاہن شیاطین سے خبریں حاصل کرتا ہے اور آپ کا شیطان سے کوئی واسطہ نہیں، اور ایک

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة الضحى (بالتقديم والتأخير) ج:٢ ص:٧٣٨

آیت میں ہے وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ الآیۃ [۱] (القلم) اس میں آپ سے جنون کی نفی کی گئی ہے، مطلب یہ کہ آپ نبی ہیں اور نبی کا کام ہمیشہ نصیحت کرتے رہنا ہے، گو لوگ کچھ ہی بکیں) ہاں کیا یہ لوگ (علاوہ کاہن اور مجنون کہنے کے آپ کی نسبت) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں (اور) ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں (جیسا درمنثور میں ہے کہ قریش دارالندوہ میں مجتمع ہوئے اور آپ کے بارے میں یہ مشورہ قرار پایا کہ جیسے اور شعراء مر کر ختم ہو گئے آپ بھی ان ہی میں کے ایک ہیں، اسی طرح آپ بھی ہلاک ہو جائیں گے تو اسلام کا قصہ ختم ہو جائے گا) [۲] آپ فرما دیجئے کہ (بہتر) تم منتظر رہو سو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (یعنی تم میرا انجام دیکھو میں تمہارا انجام دیکھتا ہوں، اس میں اشارۃً پیشین گوئی ہے کہ میرا انجام فلاح و کامیابی ہے اور تمہارا انجام خسارہ اور ناکامی ہے، اور یہ مقصود نہیں کہ تم مرو گے میں نہ مروں گا، بلکہ ان لوگوں کا جو اس سے مقصود تھا کہ ان کا دین چلے گا نہیں، یہ مر جائیں گے تو دین مٹ جائے گا، جواب میں اس کا رد مقصود ہے، چنانچہ یوں ہی ہوا اور یہ لوگ جو ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں تو) کیا ان کی عقلیں (جس کے یہ بڑے مدعی ہیں) ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں (ان کا مدعی عقل و دانش ہونا ان کے اس قول سے ثابت ہے، لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ [۳] (الاحقاف)، اور معالم کی نقل سے اس کی اور تائید ہوتی ہے کہ عظمائے قریش لوگوں میں بڑے عقل مند مشہور تھے، پس اس آیت میں ان کی عقل کی حالت دکھلائی گئی ہے کہ کیوں صاحب بس یہی عقل ہے جو ایسی تعلیم دے رہی ہے، اور اگر یہ عقل کی تعلیم نہیں ہے تو نری شرارت اور ضد ہے) ہاں کیا وہ یہ (بھی) کہتے ہیں کہ انہوں نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے (سو تحقیقی جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ بات نہیں ہے) بلکہ (یہ بات صرف اس وجہ سے کہتے ہیں کہ) یہ لوگ (بوجہ عناد کے اس کی) تصدیق نہیں کرتے (اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کی آدمی تصدیق نہیں کرتا ہزار وہ حق ہو مگر اس کی ہمیشہ نفی ہی کیا کرتا ہے، اور دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا اگر یہ ان کا بنایا ہوا ہے) تو یہ لوگ (بھی عربی اور بڑے فصیح و بلیغ اور قادر الکلام ہیں) اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعوے میں) سچے ہیں (یہ سب مضامین رسالت کے متعلق ہیں آگے توحید کے متعلق گفتگو ہے کہ یہ لوگ جو توحید کے منکر ہیں تو) کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا (یہ کہ نہ اپنے خالق ہیں اور نہ بلا خالق مخلوق ہوئے ہیں لیکن) انہوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے (اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت میں شریک ہیں، حاصل یہ کہ جو شخص صفتِ خالقیت صرف حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے اور خود اپنے آپ کا بھی محتاج خالق ہونے کا اعتقاد رکھے تو عقلاً اس پر لازم

---

[۱] ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ یہ مجنون ہیں۔

[۲] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۳۱۲

[۳] ترجمہ: اگر یہ قرآن کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے۔

ہے کہ توحید کا بھی قائل ہو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دے، اور توحید کا انکار وہ شخص کر سکتا ہے جو صفت خالقیت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ جانے یا اپنی مخلوقیت کا منکر ہو، اور چونکہ یہ لوگ اپنے عدم غور و فکر کی وجہ سے یہ نہیں جانتے تھے کہ خالق جب ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہونا لازم ہے، اس لئے آگے ان کے اس جہل کی طرف اشارہ ہے کہ واقع میں ایسا نہیں) بلکہ یہ لوگ (بوجہ جہل کے توحید کا) یقین نہیں لاتے (وہ جہل یہی ہے کہ اس میں غور نہیں کرتے کہ خالقیت اور معبودیت میں تلازم ہے، یہ گفتگو توحید کے متعلق ہوئی، آگے رسالت کے متعلق ان کے دوسرے مزعومات کا رد ہے، چنانچہ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر نبوت ہی ملنی تھی تو فلاں فلاں رؤساءِ مکہ و طائف کو ملتی، حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کے پاس تمہارے ربّ (کی نعمتوں اور رحمتوں) کے (جن میں نبوت بھی داخل ہے) خزانے ہیں، (کہ جس کو چاہو نبوت دے دو، کقولہ تعالیٰ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ [1] (الزخرف: ۳۲)) یا یہ لوگ (اس محکمہ نبوت کے) حاکم ہیں، (کہ جسے چاہیں نبوت دلوا دیں، یعنی دینے دلانے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ مثلاً خزانہ اپنے قبضہ میں ہو، دوسری یہ کہ قبضہ میں نہ ہو مگر قابضانِ خزانہ اس کے محکوم ہوں کہ اس کے دستخط دیکھ کر دیتے ہوں، یہاں دونوں کی نفی فرما دی، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو رسالت محمدیہ کے منکر ہیں اور مکہ و طائف کے رؤسا کو رسالت کا مستحق قرار دیتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل عقلی تو ہے نہیں بلکہ خود اس کے عکس پر دلائل عقلیہ قائم ہیں، اور اسی لئے محض استفہام انکاری پر اکتفاء فرمایا، اب آگے دلیل نقلی کی نفی فرماتے ہیں، یعنی) کیا ان لوگوں کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر (چڑھ کر آسمان کی) باتیں سن لیا کرتے ہیں (یعنی دلیل نقلی وحی آسمانی ہے اور اس کے علم کے دو طریقے ہیں، یا تو وحی کسی شخص پر آسمان سے نازل ہو، یا صاحبِ وحی آسمان پر چڑھے اور دونوں کا منتفی ہونا ان لوگوں سے ظاہر ہے، آگے اس کے متعلق ایک احتمال عقلی کا ابطال فرماتے ہیں کہ اگر فرضاً یہ لوگ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہم آسمان پر چڑھ جاتے اور وہاں کی باتیں سنتے ہیں) تو ان میں جو (وہاں کی) باتیں سن آتا ہو وہ (اس دعویٰ پر) کوئی صاف دلیل پیش کرے (جس سے ثابت ہو کہ یہ شخص مشرف بہ وحی ہوا ہے، جیسا ہمارے نبی اپنی وحی پر دلائلِ خارقہ یقینیہ رکھتے ہیں، آگے پھر توحید کے بارے میں ایک خاص مضمون کے متعلق کلام ہے، یعنی منکرینِ توحید جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر شرک کرتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا خدا کے لئے بیٹیاں (تجویز کی جائیں) اور تمہارے لئے بیٹے (تجویز ہوں یعنی اپنے لئے تو وہ چیز پسند کرتے ہو جس کو اعلیٰ درجہ کا سمجھتے ہو، اور خدا کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہو جس کو ادنیٰ درجہ کی سمجھتے ہو، جس کا بیان سورۂ صافات کے اخیر میں مفصل مدلل گزرا ہے، آگے پھر رسالت کے متعلق کلام ہے کہ ان کو جو باوجود آپ کی حقانیت ثابت ہو جانے کے آپ کا اتباع اس

[1] ترجمہ: کیا یہ لوگ آپ کے ربّ کی رحمت کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔

قدر نا گوار ہے تو) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ (تبلیغ احکام کا) مانگتے ہیں کہ وہ تاوان ان کو گراں معلوم ہوتا ہے، (وھذا کقولہ تعالیٰ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا اِلخ [1] (المومنون:۷۲)۔ آگے قیامت اور جزاء کے متعلق کلام ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اوّل تو قیامت ہوگی نہیں، اور اگر بالفرض ہوگی تو ہم وہاں بھی اچھے رہیں گے، کما فی قولہ تعالیٰ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ [2] (حم السجدة:۵۰) تو ہم اس کے متعلق ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یہ احقر کے نزدیک کنایہ ہے یَحْفَظُوْنَ سے کیونکہ کتابت طریقہ ہے حفظ کا، پس حاصل یہ ہوا کہ جس امر پر اثباتاً یا نفیاً کوئی دلیل عقلی قائم نہ ہو وہ غیب محض ہے، اس کا دعویٰ اثباتاً یا نفیاً وہ کرے جس کو کسی واسطہ سے اس غیب پر مطلع کیا جائے اور پھر مطلع ہونے کے بعد وہ اس کو محفوظ بھی رکھے، اس لئے کہ اگر معلوم ہونے کے بعد محفوظ نہ ہو تب بھی حکم اور دعویٰ بلا علم ہوگا، پس تم جو قیامت کی نفی اور اپنے لئے حسنیٰ کے قائل ہو تو کیا تم کو غیب پر کسی واسطہ سے اطلاع دی گئی ہے جیسا کہ ہمارے نبی کو اثباتِ قیامت اور تم سے اچھی حالت کی نفی کی خبر غیبی بواسطہ وحی دی گئی ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھ کر اوروں کو پہنچا رہے ہیں، آگے رسالت کے متعلق ایک اور کلام ہے وہ یہ کہ) کیا یہ لوگ (صاحبِ رسالت کے ساتھ) کچھ بُرائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (جس کا بیان دوسری آیت میں ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ [3] (الانفال:۳۰)) سو یہ کافر خود ہی (اس) بُرائی (کے وبال) میں گرفتار ہوں گے (چنانچہ اس قصد میں ناکام ہوئے اور بدر میں مقتول ہوئے، آگے پھر توحید کے متعلق کلام ہے کہ) کیا ان کا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے اللہ تعالیٰ اُن کے شرک سے پاک ہے اور (آگے پھر رسالت کے متعلق ایک کلام ہے وہ یہ کہ یہ لوگ نفیِ رسالت کے لئے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کو اس وقت رسول جانیں جب ہم پر ایک آسمان کا ٹکڑا گرادو، کما قال تعالیٰ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ الی قولہ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا [4] (بنی اسرائیل:۹۰ تا ۹۲)، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو دعویٰ پر خواہ وہ دعویٰ رسالت ہو یا اور کچھ ہو مطلق دلیل کا بشرطیکہ صحیح ہو قائم کر دینا کافی ہے جو کہ دعویٰ رسالت ہی کے وقت سے بلا کسی قدح وجرح کے قائم ہے اور کسی خاص دلیل کا قائم ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے دعویٰ نبوت میں قدح لازم آتا ہے، تبرعاً کوئی فرمائشی دلیل قائم کی جائے تو یہ اُس وقت ہے جب اس میں کوئی مصلحت ہو، مثلاً درخواست کنندہ طالبِ حق ہو، تو یہی سمجھا جائے کہ خیر اسی ذریعہ سے اس کو ہدایت

[1] ترجمہ: یا آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں۔

[2] ترجمہ: اور میں قیامت کو آنے والا خیال نہیں کرتا، اور اگر میں اپنے ربّ کے پاس پہنچایا بھی گیا تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔

[3] ترجمہ: اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کردیں۔

[4] ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لاویں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کردیں یا خاص آپ کے لئے کھجور اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کردیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرادیں۔

ہو جائے گی، اور کوئی معتد بہ حکمت ہو، اور یہاں یہ مصلحت بھی نہیں، کیونکہ ان کی یہ فرمائش حق کے لئے نہیں بلکہ محض تعنّت وعناد کی راہ سے ہے، اور وہ ایسے ضدی ہیں کہ) اگر (ان کا یہ فرمائشی معجزہ واقع بھی ہو جائے اور) وہ آسمان کے ٹکڑے کو دیکھ (بھی) لیں کہ گرتا ہوا آ رہا ہے تو (اس کو بھی) یوں کہہ دیں کہ یہ تو تہ بتہ جما ہوا بادل ہے (کقولہ تعالیٰ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ⑭ [1] (الحجر)، پس جب مصلحت بھی نہیں ہے اور دوسری مصلحتوں کی نفی کا بھی ہم کو علم ہے بلکہ ان فرمائشی معجزات کا وقوع خلافِ حکمت ہے، پس جب ضرورت نہیں مصلحت نہیں بلکہ خلافِ مصلحت ہے، پھر کیوں واقع کیا جائے اور نہ اس کے عدمِ وقوع سے نبوّت کی نفی ہوتی ہے، آگے اُن کے غلو فی الکفر پر جو اوپر کی آیتوں سے اور شدّتِ عناد پر جو کہ آخر کی آیت سے معلوم ہوتا ہے بطور تفریع کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ ایسے طاغی اور باغی اور غالی ہیں) تو (ان سے توقع ایمان کر کے رنج میں نہ پڑیئے بلکہ) ان کو (انہی کی حالت پر) رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ (واقع) ہو جس میں ان کے ہوش اُڑ جائیں گے (مراد قیامت کا دن ہے، اور اس صعق کی تفصیل سورۂ زمر کی آخری آیت وَنُفِخَ اِلخ [2] (الزمر:٦٨) کی تفسیر میں گزری ہے، اور معنٰی حَتّٰی کی تحقیق سورۂ زخرف کے آخر میں جہاں حَتّٰى يُلٰقُوْا [3] (الزخرف:٨٣) آیا ہے، گزری ہے، آگے اس دن کا بیان ہے، یعنی) جس دن اُن کی تدبیریں (جو دنیا میں اسلام کی مخالفت اور اپنی کامیابی کے بارے میں کیا کرتے تھے) ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گی اور نہ (کہیں سے) ان کو مدد ملے گی (نہ تو مخلوق کی طرف سے کہ اس کا امکان ہی نہیں اور نہ خالق کی طرف سے کہ اس کا وقوع نہیں، یعنی اُس روز ان کو حقیقت معلوم ہو جائے گی، باقی اس سے اِدھر ایمان لانے والے نہیں) اور (آخرت میں تو یہ مصیبت اُن پر آئے ہی گی لیکن) ان ظالموں کے لئے قبل اس (عذاب) کے بھی عذاب ہونے والا ہے (یعنی دنیا میں جیسے قحط اور غزوۂ بدر میں قتل ہونا) لیکن ان میں اکثر کو معلوم نہیں (اکثر شاید اس لئے فرمایا ہو کہ بعضوں کے لئے ایمان مقدر تھا اور ان کا عدمِ علم بوجہ اس کے کہ علم سے مبدل ہونے والا تھا، اس لئے وہ عدمِ علم نہیں قرار دیا گیا) اور (جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہم ان کی سزا کے لئے ایک وقت معین کر چکے ہیں تو) آپ اپنے رَبّ کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے (اور ان لوگوں کے لئے انتقامِ الٰہی کی جلدی نہ کیجئے، جس کو آپ مسلمانوں کی خواہش اور ان کی امداد کی حیثیت سے چاہتے تھے، اور نہ اس خیال سے انتقام میں جلدی کیجئے کہ یہ لوگ مدتِ مہلت میں آپ کو کوئی ضرر پہنچا سکیں گے سو اس کا بھی اندیشہ نہ کیجئے کیوں) کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں (پھر کاہے کا ڈر، چنانچہ یونہی واقع ہوا) اور (اگر ان کے کفر کا غم دل پر آئے تو

---

[1] ترجمہ: اور اگر ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت اس پر چڑھ جاویں۔

[2] ترجمہ: اور صور میں پھونک ماری جاوے گی۔

[3] ترجمہ: یہاں تک ان کو اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو۔

اس کا علاج یہ ہے کہ توجہ الی اللہ رکھا کیجئے، مثلاً یہ کہ) اٹھتے وقت (یعنی مجلس سے یا سونے سے اٹھتے وقت، مثلاً تہجد میں) اپنے رَبّ کی تسبیح وتحمید کیا کیجئے اور رات (کے کسی حصہ) میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (مثلاً عشاء کے وقت) اور ستاروں (کے غروب ہونے) سے پیچھے بھی (مثلاً نماز صبح اور مطلقِ ذکر بھی اس میں آ گیا، اور تخصیص ان اوقات کی بوجوہ خاصہ اہتمام کے لئے ہے، حاصل یہ کہ اپنے دل کو ادھر مشغول رکھئے پھر فکر وغم کا غلبہ نہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا، دشمنوں کی دشمنی اور مخالفت وتکذیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے آخر سورت میں پہلے تو یہ فرمایا کہ ''آپ ہماری نظروں میں ہیں'' یعنی ہماری حفاظت میں ہیں، ہم آپ کو ان کے ہر شر سے بچائیں گے، آپ اُن کی کسی بات کی پروا نہ کریں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں ارشاد ہے (وَ اللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ) (المائدۃ:۶۷) اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید میں لگ جانے کا حکم فرمایا جو اصل مقصد زندگی بھی ہے، اور ہر مصیبت سے بچنے کا اصلی علاج بھی فرمایا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ یعنی اللہ کی حمد کی تسبیح کیا کریں جبکہ آپ کھڑے ہوں، کھڑے ہونے سے مراد سو کر اٹھنا بھی ہو سکتا ہے، ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے، [۱] اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمدؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اس نے یہ کلمات پڑھے تو جو دعا کرے گا قبول کی جائے گی وہ کلمات یہ ہیں: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، پھر اگر اس نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔ (ابن کثیر) [۲]

کفارۂ مجلس

اور حضرت مجاہد اور ابوالاحوص وغیرہ ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی کسی مجلس سے اُٹھے تو یہ کہے کہ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ، حضرت عطاء ابن ابی رباح نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ

---

[۱] تفسیر الطبری ج:۲۲ ص:۴۸۹

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۳۹، وصحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب فضل من تعار من اللیل فصلی، ج:۱ ص:۱۵۵، وسنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب ما یقول الرجل إذا تعار من اللیل ج:۲ ص:۶۸۹، ومسند احمد، حدیث عبادة بن الصامت رضی اللہ عنه، رقم الحدیث: ۲۲۶۷۳

جب تم اپنی مجلس سے اٹھو تو تسبیح وتحمید کرو، اگر تم نے اس مجلس میں کوئی نیک کام کیا ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی اور برکت حاصل ہوگی، اور اگر کوئی غلط کام کیا ہے تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اچھی بُری باتیں ہوں تو اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اگر وہ یہ کلمات پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب خطاؤں کو جو اس مجلس میں ہوتی ہیں معاف فرما دیں گے، وہ کلمات یہ ہیں:- سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ، رواه الترمذی وھذا لفظهٗ والنسائی فی الیوم واللیلة وقال الترمذی حدیث حسن صحیح۔ [۱] (از ابن کثیر) [۲]

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ، یعنی رات میں تسبیح کیجئے، اس میں نماز مغرب وعشاء بھی داخل ہے اور عام تسبیحات بھی، وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ یعنی ستاروں کے غائب ہونے کے بعد، مراد اس سے نمازِ فجر اور اس وقت کی تسبیحات ہیں۔ (ابن کثیر) [۳]

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الطُّوْرِ بِحَمْدِ اللهِ سُبْحَانَهٗ عَصْرَ يَوْمِ الْاَرْبِعَاءِ
لِثَلَاثٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنْ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ ۱۳۹۱ھ
وَاللهُ الْمَسْئُوْلُ لِاِتْمَامِ الْبَاقِيْ بِعَوْنِهٖ وَحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ما يقول إذا قام من المجلس ج:۲ ص:۱۸۱

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۴۰ و ۴۴۱

[۳] تفسیر ابن کثیر (بالاختصار) ج:۷ ص:۴۴۱

سُوْرَةُ النَّجْمِ

آیاتها ۶۲ ۵۳ سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ ۲۳ رکوعاتها ۳

سورۂ نجم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲ وَمَا يَنْطِقُ

قسم ہے تارے کی جب گرے، بہکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا، اور نہیں بولتا

عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵

اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا، اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے،

ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸

زور آور نے، پھر سیدھا بیٹھا، اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے، پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا،

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴿٩﴾ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ﴿١٠﴾

پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندہ پر جو بھیجا،

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿١١﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ

جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو دیکھا، اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو اس نے دیکھا، اور اس کو اس نے دیکھا ہے

نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾

اترتے ہوئے ایک بار اور بھی، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی،

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى

جب چھا رہا تھا اس بیری پر جو کچھ چھا رہا تھا، بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی، بے شک دیکھے اس نے

مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

اپنے رَبّ کے بڑے نمونے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے، ﴿۱﴾ (اے مکے کے باشندو!) یہ تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب نہ راستہ بھولے ہیں، نہ بھٹکے ہیں، ﴿۲﴾ اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، ﴿۳﴾ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے، ﴿۴﴾ انہیں ایک ایسے مضبوط طاقت والے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے ﴿۵﴾ جو قوّت کا حامل ہے۔ چنانچہ وہ سامنے آ گیا، ﴿۶﴾ جبکہ وہ بلند اُفق پر تھا۔ ﴿۷﴾ پھر وہ قریب آیا، اور جھک پڑا، ﴿۸﴾ یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر قریب آ گیا، بلکہ اُس سے بھی زیادہ نزدیک۔ ﴿۹﴾ اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی۔ ﴿۱۰﴾ جو کچھ انہوں نے دیکھا، دِل نے اُس میں کوئی غلطی نہیں کی۔ ﴿۱۱﴾ کیا پھر بھی تم اِن سے اُس چیز کے بارے میں

جھگڑتے ہو جسے وہ دیکھتے ہیں؟ ⑫ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اُس (فرشتے) کو ایک اور مرتبہ دیکھا ہے، ⑬ اُس بیر کے درخت کے پاس جس کا نام سدرۃ المنتہیٰ ہے، ⑭ اُسی کے پاس جنت المأویٰ ہے۔ ⑮ اُس وقت اُس بیر کے درخت پر وہ چیزیں چھائی ہوئی تھیں جو بھی اُس پر چھائی ہوئی تھیں۔ ⑯ (پیغمبر کی) آنکھ نہ تو چکرائی، اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ ⑰ سچ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بہت کچھ دیکھا۔ ⑱

خلاصہ تفسیر

قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے! (یعنی کوئی بھی ستارہ ہو، اور اس قسم میں مضمون جواب قسم مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ② کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، یعنی جس طرح ستارہ طلوع سے غروب تک اس تمام تر مسافت میں اپنی باقاعدہ رفتار سے اِدھر اُدھر نہیں ہوا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر بھر ضلال وغوایت سے محفوظ ہیں، اور نیز اشارہ ہے اس طرف کہ جیسے نجم سے ہدایت ہوتی ہے، اسی طرح آپ سے بھی بوجہ عدمِ ضلال وعدمِ غوایت کے ہدایت ہوتی ہے، اور چونکہ ستاروں کے وسطِ سماء میں ہونے کے وقت کسی سمت کا اندازہ نہیں ہوتا، اس لئے اس وقت ستارے سے راستہ کا پتہ نہیں لگتا، اس لئے اس میں قید لگائی غروب کے وقت کی، اور گو قرب من الافق طلوع کے وقت بھی ہوتا ہے، لیکن غروب میں یہ بات زیادہ ہے، کہ اس وقت طالبانِ اہتداء اس کو غنیمت سمجھتے ہیں اس خیال سے کہ اگر استدلال میں ذرا توقف کیا پھر غائب ہو جائے گا، بخلاف طلوع کے کہ اس میں بے فکری رہتی ہے پس اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت حاصل کر لینے کو غنیمت سمجھو اور شوق سے دوڑو، آگے جوابِ قسم ہے کہ) یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ کے (اور سامنے) رہنے والے (پیغمبر جن کے عام احوال وافعال تم کو معلوم ہیں جن سے بشرط انصاف ان کی راستی اور حقانیت پر استدلال کر سکتے ہو یہ پیغمبر) نہ راہِ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستے ہو لئے (ضلال یہ کہ بالکل راستہ بھول کر کھڑا رہ جائے اور غوایت یہ کہ غیر راہ کو راہ سمجھ کر غلط سمت میں چلتا رہے كذا فى الخازن، [1] یعنی تم جو اُن کو دعوائے نبوّت ودعوت الی الاسلام میں بے راہ سمجھتے ہو یہ بات نہیں ہے، بلکہ آپ نبی برحق ہیں) اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں (جیسا تم لوگ کہتے ہو اِفْتَرٰىهُ بلکہ) ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ کی بھی وحی ہو جو قرآن کہلاتا ہے خواہ صرف معانی کی ہو جو سنت کہلاتی ہے اور خواہ وحی جزئی ہو یا کسی قاعدۂ کلیہ کی وحی ہو، جس سے اجتہاد فرماتے ہوں، پس اس سے نفی اجتہاد کی نہیں ہوتی اور اصل مقصود مقام نفی ہے کفار کے اس خیال کی کہ آپ خدا کی طرف غلط بات کی نسبت فرماتے ہیں، آگے وحی آنے کا واسطہ بتلاتے ہیں کہ) ان کو ایک فرشتہ (اس وحی کی

[1] تفسیر الخازن ج:۵ ص:۴۹۶

منجانب اللہ) تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے (اور وہ اپنی کوشش و محنت سے طاقتور نہیں ہوا بلکہ) پیدائشی طاقتور ہے (جیسا کہ ایک روایت میں خود جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طاقت کا بیان فرمایا کہ میں نے قوم لوط کی بستیوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر آسمان کے قریب اس کو لے جا کر چھوڑ دیا، (رواہ فی تفسیر سورۃ التکویر من الدر المنثور) [۱] مطلب یہ کہ یہ کلام کسی شیطان کے ذریعہ سے آپ تک نہیں پہنچا کہ کاہن ہونے کا احتمال ہو بلکہ فرشتہ کے ذریعہ سے آیا ہے اور شاید شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ کا ذکر فرمانے میں یہ مقصود ہو کہ اس کا احتمال بھی نہ کیا جائے کہ شاید اصل میں فرشتہ ہی لے کر چلا ہو مگر درمیان میں کوئی شیطانی تصرف ہو گیا ہو اس میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ وہ نہایت شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ہیں شیطان کی مجال نہیں کہ ان کے پاس پھٹک سکے، پھر ختم وحی کے بعد خود حق تعالیٰ نے اس کے بعینہٖ ادا کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ [۲] (القیامۃ) آگے اس شبہ کا جواب ہے کہ اس وحی لانے والے کا فرشتہ اور جبریل ہونا اس وقت معلوم ہو سکتا ہے، جب آپ ان کو پہچانتے ہوں اور پوری صحیح پہچان موقوف ہے اصلی صورت میں دیکھنے پر تو کیا آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ ہاں یہ بھی ہوا ہے، جس کی کیفیت یہ ہے کہ چند بار تو دوسری صورت میں دیکھا) پھر (ایک بار ایسا بھی ہوا کہ) وہ فرشتہ (اپنی) اصلی صورت پر (آپ کے روبرو) نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ (آسمان کے) بلند کنارہ پر تھا (ایک روایت میں افق شرقی سے اس کی تفسیر آئی ہے، کما فی الدر المنثور، [۳] اور افق میں دکھلا دینے کی غالباً یہ حکمت ہے کہ وسط سماء میں دیکھنا خالی از مشقت و تکلف نہیں اور اعلیٰ میں غالباً یہ حکمت تھی کہ بالکل نیچے افق پر بھی پوری چیز نظر نہیں آتی، اس لئے ذرا اونچے پر نظر آئے، اور اس دیکھنے کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے خواہش کی کہ مجھ کو اپنی اصلی صورت دکھلا دو، انہوں نے حراء کے پاس و حسب روایت ترمذی محلہ جیاد میں وعدہ ٹھہرایا، آپ وہاں تشریف لے گئے تو ان کو افق مشرق میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو ہیں اور اس قدر پھیلے ہوئے ہیں، کہ اُفقِ غربی تک گھیر رکھا ہے، آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، اس وقت جبرئیل علیہ السلام بصورتِ بشر ہو کر آپ کے پاس تسکین کے لئے اتر آئے جس کا آگے ذکر ہے کذا فی الجلالین، [۴] حاصل یہ کہ وہ فرشتہ اوّل صورت اصلیہ میں افقِ اعلیٰ پر نمودار رہا) پھر (جب آپ بے ہوش ہو گئے تو) وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو (قرب کی وجہ سے) دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ (غایت قرب کی وجہ سے) اور بھی کم (فاصلہ رہ گیا، مطلب دو کمانوں کا یہ ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ جب دو شخص باہم غایت درجہ کا اتفاق و اتحاد کرنا چاہتے تھے تو دونوں

---

[۱] تفسیر الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۰۸

[۲] ترجمہ: ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوا دینا۔

[۳] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۳۱۶

[۴] تفسیر الجلالین ج:۱۰ ص:۲۸۹، تحت هذه الآية، وجامع الترمذي، ابواب التفسير، باب ومن سورة النجم ج:۲ ص:۱۶۳

اپنی اپنی کمانیں لے کر ان کے چلّے یعنی تانت کو باہم متصل کر دیتے، اور اس صفت میں بھی بعض اجزاء کے اعتبار سے کچھ فصل ضرور ہی رہتا ہے، پس اس محاورہ کی وجہ سے یہ کنایہ ہو گیا قرب واتحاد سے، اور چونکہ یہ محض اتفاقِ صوری کی علامت تھی تو اگر رُوحانی و قلبی اتفاق بھی ہو تو وہاں اَوْ اَدْنٰی ۞ بھی صادق آسکتا ہے، پس اَوْ اَدْنٰی ۞ کے بڑھا دینے میں اشارہ ہو گیا کہ مجاورت صوریہ کے علاوہ آپ میں اور جبرئیل علیہ السلام میں رُوحانی مناسبت بھی تھی جو مدارِ اعظم ہے معرفتِ تامہ اور حفظِ صورت کا، غرض یہ کہ ان کی تسکین سے آپ کو تسکین ہوئی اور افاقہ ہوا) پھر (افاقہ کے بعد) اللہ تعالیٰ نے (اس فرشتہ کے ذریعہ سے) اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی (جس کی تعیین بالتخصیص معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہونے کی حاجت، اور باوجودیکہ اصل مقصود اس وقت وحی نازل کرنا نہیں بلکہ جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دِکھلا کر ان کی پوری معرفت آپ کو عطا کرنی تھی، مگر اس وقت اور بھی وحی نازل فرمانا شاید اس لئے ہو کہ یہ معرفت میں اور زیادہ معین ہو، کیونکہ اس وقت کی وحی کو جس کا منجانب اللہ ہونا جبرئیل علیہ السلام کی اصلی صورت میں ہونے کی وجہ سے قطعی اور یقینی ہے، اور دوسرے اوقات کی وحی جو بواسطۂ صورتِ بشریہ ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو ایک شان پر دیکھیں گے تو زیادہ سے زیادہ یقین میں قوت ہوگی کہ دونوں حالتوں میں وحی لانے والا واسطہ یعنی فرشتہ ایک ہی ہے، جیسا کہ کسی شخص کی آواز کے لب و لہجہ اور طرزِ کلام سے خوب آگاہ ہوں تو اگر کبھی وہ صورت بدل کر بھی بولتا ہے تو صاف پہچانا جاتا ہے، آگے اس دیکھنے کے متعلق ایک شبہ کا جواب ہے وہ شبہ یہ ہے کہ صورت اصلیہ میں دیکھنے کے باوجود یہ بھی تو احتمال ہو سکتا ہے کہ قلب کے ادراک و احساس میں غلطی ہو جائے جیسا کہ احساسات میں غلطی ہو جانا اکثر مشاہدہ کیا جاتا ہے، مجنون باوجود سلامتِ حس کے بعض اوقات پہچانے ہوئے لوگوں کو دوسرا شخص بتلانے لگتا ہے، پس یہ رُویت رُویتِ صحیحہ تھی یا نہیں، آگے اس شبہ کا جواب ہے یعنی وہ رُویتِ صحیحہ تھی کہ اس کے دیکھنے کے وقت) قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں غلطی نہیں کی (رہا یہ کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ قلب نے غلطی نہیں کی سو بات یہ ہے کہ اگر مطلقاً ایسے احتمالات قابلِ التفات ہوا کریں تو محسوسات کا کبھی اعتبار نہ رہے، پھر تو ساری دنیا کے معاملات ہی مختل ہو جائیں، ہاں کسی کے پاس کوئی منشا شبہ کا معتدبہ موجود ہو تو اس پر غور کیا جاتا ہے، اور احتمال خطائے قلبی کا منشاء یہ ہو سکتا ہے کہ ادراک کرنے والا مختل العقل ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح العقل، فطین و ذہین، صاحبِ فراست ہونا مشاہد اور ظاہر تھا، چونکہ باوجود اس اثباتِ بلیغ کے پھر بھی معاندین جدال و خلاف سے باز نہ آتے تھے اسی لئے آگے بطور توبیخ و تعجیب کے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم نے ایسے شافی کافی بیان سے معرفت و رُویت کا ثبوت سن لیا) تو کیا ان (پیغمبر) سے ان کی دیکھی (بھالی) ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو (یعنی جن چیزوں کا علم و ادراک انسان کو ہوتا ہے ان میں محسوسات جیسی چیزیں شک وشبہ سے بالاتر ہوتی ہیں، غضب کی بات یہ ہے کہ تم حسیات میں بھی اختلاف کرتے ہو، پھر یوں تو تمہاری حسیات میں بھی ہزاروں خدشے نکل

سکتے ہیں) اور (اگر یہ مہمل خدشہ ہو کہ جس چیز کو ایک ہی بار دیکھا ہو تو اس کی پہچان کیسے ہوسکتی ہے، تو جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ ایک بار دیکھنے سے پہچان نہ ہو اور اگر علیٰ سبیل التنزّل شناخت کے لئے تکرار مشاہدہ ہی کی ضروری ہے تو) انہوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی (صورتِ اصلیہ میں) دیکھا ہے (پس اب تو وہ توہّم بھی مدفوع ہوگیا، کیونکہ تطابق صورتین سے پوری تعیین ہوگئی کہ ہاں جبرئیل علیہ السلام یہی ہیں، آگے اس دوبارہ دیکھنے کی جگہ بتلاتے ہیں کہ کہاں دیکھا یعنی شبِ معراج میں دیکھا ہے) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس (سدرہ کہتے ہیں بیری کے درخت کو اور منتہیٰ کے معنی ہیں انتہاء کی جگہ، حدیث میں آیا ہے کہ یہ ایک درخت ہے بیری کا، ساتویں آسمان [1] میں عالمِ بالا سے جو اَحکام وارزاق وغیرہ آتے ہیں وہ اوّل سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں پھر وہاں سے ملائکہ زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح یہاں سے جو اعمال صعود کرتے ہیں وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں، پھر وہاں سے اوپر اٹھالئے جاتے ہیں، دنیا میں اس کی مثال ڈاک خانہ کی سی ہے کہ آمد و برآمد خطوط وہاں سے ہوتی ہے، اور عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ میں تو مکانِ رُویت بتلایا تھا، آگے اس مکان کا شرف بتلاتے ہیں کہ) اس (سدرۃ المنتہیٰ) کے قریب جنت الماویٰ ہے (ماویٰ کے معنی رہنے کی جگہ، چونکہ جنت نیک بندوں کے رہنے کی جگہ ہے اس لئے جنت الماویٰ کہتے ہیں، حاصل یہ کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ ایک ممتاز موقع پر ہے، اب بعد تعیین مکانِ رُویت کے رُویت کا زمانہ بتلاتے ہیں کہ رُویت کب ہوئی، پس فرماتے ہیں کہ) جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں (ایک روایت میں ہے کہ سونے کے پروانے تھے، [2] یعنی صورت پروانہ کی سی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ وہ فرشتے تھے، یعنی حقیقت اُن کی یہ تھی، اور ایک روایت میں ہے کہ ملائکہ نے حق تعالیٰ سے اجازت چاہی تھی کہ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں ان کو اجازت ہوگئی، وہ اس سدرَہ پر جمع ہوگئے تھے، (الروایات کلّھا فی الدر المنثور) [3] اس میں بھی اشارہ ہوسکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز ومکرم ہونے کی طرف، اور باقی وہی تقریر ہے جو تقیید سابق میں بیان کی گئی، اب ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر نگاہ چکرا جاتی ہے پوری طرح ادراک پر قدرت نہیں رہتی، پس اس صورت میں جبرئیل علیہ السلام کی صورت کا کیا ادراک ہوگا، جب یہ ادراک ثانی معتبر نہ ہوا تو پھر اس خدشۂ مذکورہ کا جو جواب وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ سے دیا گیا ہے وہ کافی نہ ہوا اس احتمال کے رفع کے لئے فرماتے ہیں کہ آپ ان عجائب کو دیکھ کر ذرا نہیں چکرائے اور بالکل متحیر نہیں ہوئے، چنانچہ جن چیزوں کی رُویت کا حکم تھا اُن کی طرف نظر کرنے سے آپ کی) نگاہ نہ تو ہٹی (بلکہ اُن چیزوں کو خوب

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۹۴، المستدرك للحاکمؒ رقم الحدیث: ۲۷۱

[2] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإسراء برسول الله صلی الله علیه وسلم إلی السماوات ج:۱ ص:۹۷، وجامع الترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورة النجم ج:۲ ص:۱۶۳

[3] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۳۲۲

دیکھا) اور (جن چیزوں کے دیکھنے کا حکم جب تک نہ ہوا) نہ (ان کی طرف دیکھنے کو آپ کی نگاہ) بڑھی (یعنی قبل اذن نہیں دیکھا، کذا فی المدارك فی الفرق بین زاغ وطغی،[۱] یہ دلیل ہے آپ کے غایت استقلال کی، کیونکہ عجیب چیزوں میں آ کر آدمی یہی دو حرکتیں کیا کرتا ہے جن چیزوں کے دیکھنے کو کہا جاتا ہے ان کو تو دیکھتا نہیں اور جن کے لئے نہیں کہا گیا ان کو تکتا ہے، غرض اس میں انضباط نہیں رہتا، آگے آپ کے استقلال کی قوت بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ) انہوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے پروردگار (کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے (مگر ہر چیز کے دیکھنے میں آپ کی یہی شان رہی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾، وہ عجائبات احادیثِ معراج میں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا ارواح کو دیکھنا جنت وغیرہ کو دیکھنا، پس ثابت ہوا کہ آپ میں غایت استقلال ہے، پس متحیر ہو جانے کا احتمال نہیں پس خدشہ کا جو جواب وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ میں مذکور تھا وہ سالم رہا، غرض تمام تر تقدیر سے رُویت ومعرفتِ جبرئیلؑ کے متعلق شبہ مندفع ہو کر امر رسالت ثابت اور متحقق ہو گیا جو کہ مقصود مقام تھا)۔

معارف ومسائل

سورۂ نجم کی خصوصیات

سورۂ نجم پہلی سورت ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اعلان فرمایا (رواہ عبداللہ بن مسعودؓ، قرطبی)[۲] اور یہی سب سے پہلی سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ تلاوت کیا، اور اس سجدہ میں ایک عجیب صورت یہ پیش آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت مجمع عام میں تلاوت فرمائی، جس میں مسلمان اور کفار سب شریک تھے، جب آپ نے آیت سجدہ پر سجدہ ادا کیا تو مسلمان تو آپ کے اتباع میں سجدہ کرتے ہی، سب نے حضور کے ساتھ سجدہ کیا، تعجب کی چیز یہ پیش آئی کہ جتنے کفار ومشرکین موجود تھے وہ بھی سب سجدہ میں گر گئے، صرف ایک متکبر شخص جس کے نام میں اختلاف ہے، ایسا رہا جس نے سجدہ نہیں کیا، مگر زمین سے ایک مٹھی مٹی کی اُٹھا کر پیشانی سے لگالی، اور کہنے لگا کہ بس یہی کافی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود راوی حدیث فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو کفر کی حالت میں مرا ہوا دیکھا ہے۔ (رواہ البخاری ومسلم واصحاب السُّنن، ابن کثیر ملخصًا)[۳]

---

[۱] مدارك التنزیل ج:۳ ص:۳۹۱، تحت هٰذه الآیة۔

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۷ ص:۸۱

[۳] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب سورة النجم، ج:۲ ص:۷۲۱، وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب سجود التلاوة، ج:۱ ص:۲۱۵

اس سورت کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے اور آپ پر نازل ہونے والی وحی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہونے کا بیان ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ لفظ نجم ستارے کے معنی میں آتا ہے، ہر ایک ستارے کو نجم اور جمع نجوم بولی جاتی ہے، اور کبھی یہ لفظ خاص طور سے ثریا ستارے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو چند ستاروں کا مجموعہ ہے، اس آیت میں بھی بعض حضرات نے نجم کی تفسیر ثریا سے کی ہے، فرّاء اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے پہلی تفسیر یعنی مطلق ستارے کو ترجیح دی ہے (قرطبی) [1] اسی کو اوپر خلاصۂ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔

اِذَا هَوٰى ۝ لفظ هَوٰى، ساقط ہونے اور گرنے کے معنی میں آتا ہے، ستارے کا گرنا اس کا غروب ہونا ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا حق وصحیح اور شکوک سے بالاتر ہونا بیان فرمایا ہے، سورۂ صافات میں مفصل گزر چکا ہے کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ خاص مصالح اور حکمتوں کے لئے اپنی خاص خاص مخلوقات کی قسم کھاتے ہیں، دوسروں کو اس کی اجازت نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائے، یہاں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھائی جس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ستارے اندھیری رات میں سمتیں اور راستے بنانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان سے سمت مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے، ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ کے راستے کی طرف ہدایت ہوتی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ یہ جواب قسم ہے یعنی وہ مضمون ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ صراط مستقیم اور منزل مقصود یعنی رضائے الٰہی کا صحیح راستہ ہے نہ آپ راستہ بھولے ہیں اور نہ غلط راستہ پر چلتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ ''صَاحِبُكُمْ'' سے تعبیر کرنے کی حکمت

اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک یا لفظ رسول و نبی ذکر کرنے کے بجائے آپ کی ذات کو لفظ صَاحِبُكُمْ سے تعبیر کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے نہیں آئے، کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں جن کے صدق وکذب میں تمہیں اشتباہ رہے بلکہ وہ تمہارے ہر وقت کے ساتھی ہیں، تمہارے وطن میں پیدا ہوئے ہیں یہیں بچپن گزارا، یہیں جوان ہوئے ان کی زندگی کا کوئی گوشہ تم سے مخفی نہیں، اور تم نے تجربہ کر لیا ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی غلط اور بُرے کام میں تم نے اُن کو بچپن میں بھی نہیں دیکھا، اُن کے اخلاق وعادات، ان کی امانت

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۸۲

ودیانت پر تم سب کو اتنا اعتماد تھا کہ پورے مکہ والے آپ کو امین کہا کرتے تھے، اب دعوائے نبوّت کے وقت تم ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنے لگے، جس نے انسانوں کے معاملہ میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، غضب ہے کہ اس پر یہ الزام لگانے لگے کہ اس نے خدا تعالیٰ کے معاملہ میں جھوٹ بولا ہے، اس لئے آگے فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں، اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں، بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا ہوا ہوتا ہے، وحی کی بہت سی اقسام احادیث بخاری سے ثابت ہیں، ان میں ایک قسم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، جس کا نام قرآن ہے، دوسری وہ کہ صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کو اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں اس کا نام حدیث اور سنت ہے، پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملے کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے، کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے، جس سے اَحکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے نکالتے اور بیان کرتے ہیں، اس اجتہاد میں اس کا امکان رہتا ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو اَحکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں ان میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے وہ اپنے غلط اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے، بخلاف دُوسرے علمائے مجتہدین کے کہ ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان کی یہ خطا بھی عند اللہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ دین کے سمجھنے میں جو اپنی پوری توانائی وہ خرچ کرتے ہیں اس پر بھی ان کو ایک ثواب ملتا ہے۔ (كما في الأحاديث الصحيحة المعروفة)

اس تقریر سے آیت مذکورہ پر اُس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب وحی من اللہ ہوتا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ نہیں فرماتے، حالانکہ احادیث صحیحہ میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں کہ شروع میں آپ نے کوئی حکم دیا پھر بذریعہ وحی اس کو بدلا گیا، جو علامت اس کی ہے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ آپ کی رائے اور اجتہاد سے تھا، جواب اوپر آ چکا ہے کہ بعض اوقات وحی کسی قاعدۂ کلیہ کی شکل میں آتی ہے، جس سے اَحکام کا استخراج کرنے میں پیغمبر کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑتا ہے، چونکہ یہ قاعدہ کلیہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اس لئے ان سب اَحکام کو بھی وحی من اللہ کہا گیا ہے، واللہ اعلم!

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ یہاں سے سترہویں آیت (لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝) تک تمام آیات میں اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، یہ اللہ کا کلام ہے، جو آپ کو اس طرح دیا گیا ہے کہ اس میں کسی التباس وتلبیس یا خطا اور غلطی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

آیاتِ نجم کی تفسیر میں ائمۂ تفسیر کا اختلاف

ان آیات کے بارے میں ائمۂ تفسیر سے دو تفسیریں منقول ہیں، ایک کا حاصل یہ ہے کہ ان سب آیات کو واقعۂ معراج کا بیان قرار دے کر حق تعالیٰ سے تعلیم بلاواسطہ اور رُؤیت وقرب حق تعالیٰ کے ذکر پر محمول فرمایا۔ اور شَدِيْدُ الْقُوٰى ، ذُوْمِرَّةٍ ، فَاسْتَوٰى اور دَنَا فَتَدَلّٰى سب کو حق تعالیٰ کی صفات وافعال قرار دیا، اور آگے جو رُؤیت ومشاہدہ کا ذکر ہے اس سے بھی حق تعالیٰ کی رُؤیت وزیارت مراد لی، صحابۂ کرام میں حضرت انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر منقول ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو اختیار کیا ہے،[1] اور بہت سے حضرات صحابہ وتابعین اور ائمۂ تفسیر نے ان آیات کو جبرئیل علیہ السلام کے ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کا بیان قرار دیا ہے، اور شَدِيْدُ الْقُوٰى وغیرہ جبرئیل امین کی صفات بتلائی ہیں، اس کی بہت سی وجوہ ہیں، تاریخی حیثیت سے بھی سورۂ نجم بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے، اور حسب تصریح حضرت عبداللہ بن مسعود سب سے پہلی سورت جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اعلاناً پڑھا ہے یہی سورت ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ واقعہ معراج اس سے مؤخر ہے، لیکن اس میں کلام کیا جا سکتا ہے اصل وجہ یہ ہے کہ حدیث مرفوع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کی تفسیر رُؤیتِ جبرئیل سے منقول ہے، جس کے الفاظ مسندِ احمد میں یہ ہیں:-

عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ اَلَيْسَ اللّٰهُ يَقُوْلُ (وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ،[2] وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى[3]) فَقَالَتْ اَنَا اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّمَا ذَاكَ جِبْرَئِيْلُ لَمْ يَرَهُ فِيْ صُوْرَتِهِ الَّتِيْ خُلِقَ عَلَيْهَا اِلَّا مَرَّتَيْنِ رَاٰهُ مُنْهَبِطًا مِّنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهٖ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ،[4] اَخْرَجَاهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ الشَّعْبِيِّ۔ (ابن کثیر)[5]

"شعبیؒ حضرت مسروق رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ایک روز حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے (رُؤیتِ باری تعالیٰ کے مسئلہ میں گفتگو تھی) مسروق کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ

---

۱ تفسیر المظہری ج:۹ ص:۱۰۵

۲ سورۃ التکویر آیت:۲۳۔ ترجمہ: اور انہوں نے اس فرشتہ کو صاف کنارہ پر دیکھا بھی ہے۔

۳ سورۃ النجم آیت:۱۳۔ ترجمہ: اور انہوں نے اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے۔

۴ مسند احمد، مسند الصدیقۃ عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، رقم الحدیث: ۲۶۰۴۰

۵ تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۵۲

پوری اُمت میں سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ جس کے دیکھنے کا آیت میں ذکر ہے وہ جبریل علیہ السلام ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو مرتبہ ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے، آیت میں جس رُؤیت کا ذِکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جبریلِ امین کو آسمان سے زمین کی طرف اُترتے ہوئے دیکھا کہ ان کے جثّے نے زمین وآسمان کے درمیان کی فضا کو بھر دیا تھا۔“

صحیح مسلم میں بھی یہ روایت تقریباً انہی الفاظ سے منقول ہے، [۱] اور فتح الباری کتابُ التفسیر میں حافظ نے ابنِ مردویہ سے یہی روایت اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے، جس میں صدیقہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَا اَوَّلُ مَنْ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ھٰذَا، فَقُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ھَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ؟ فَقَالَ: لَا اِنَّمَا رَاَیْتُ جِبْرِیْلَ مُنْھَبِطًا۔ (فتح الباری ج:۸ ص:۴۹۳)

”یعنی صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس آیت کے متعلق سب سے پہلے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے رَبّ کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے جبریل کو اُترتے ہوئے دیکھا ہے۔“

اور صحیح بخاری میں شیبانی سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت زِرّ سے اس آیت کا مطلب پوچھا (فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝) انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔ [۲] اور ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین علیہ السلام کو دیکھا اس حالت میں کہ وہ رفرف کے لباس میں تھے، اور زمین وآسمان کی درمیانی فضاء کو ان کے وجود نے بھر رکھا تھا۔ [۳]

ابنِ کثیر کی تحقیق

یہ سب روایاتِ حدیث ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ سورہ نجم کی آیاتِ مذکورہ میں رُؤیت اور قرب سے مراد جبریل کی رُؤیت اور قرب ہے، یہ قول صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ

[۱] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب معنی قول اللہ عز وجل "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ....إلخ" ج:۱ ص:۹۸

[۲] صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب إذا قال احدکم آمین والملائکة فی السماء ....إلخ، ج:۱ ص:۴۵۸

[۳] صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، ج:۱ ص:۴۵۵

رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے، اسی لئے ابن کثیرؒ نے آیاتِ مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:-

''ان آیات میں جس رُؤیت اور قرب کا ذکر ہے وہ رُؤیت وقرب جبریلِ اُمین کی مراد ہے جبکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا، پھر دوسری مرتبہ شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا، اور یہ پہلی رُؤیت نبوّت کے بالکل ابتدائی زمانہ میں ہوئی، جبکہ جبریل علیہ السلام پہلی مرتبہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتوں کی وحی لے کر آئے، اس کے بعد وحی میں فترت یعنی وقفہ پیش آیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم اور تکلیف تھی، بارہا یہ خیالات دل میں آئے کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دیں، مگر کبھی ایسی صورت ہوئی تو جبریل امین غائبانہ ہوا سے آواز دیتے کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں برحق ہیں، اور میں جبریل ہوں، ان کی آواز سے آپ کا دِل ٹھہر جاتا، اور سکون ہو جاتا تھا، جب کبھی ایسا خیال آیا اسی وقت جبریل نے اس آواز کے ذریعہ تسلی دی، مگر یہ تسلیاں غائبانہ تھیں، یہاں تک کہ ایک روز جبریلِ امین بطحاء کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور پورے اُفق کو گھیر رکھا تھا، پھر جبریلِ امین آپ کے قریب آئے اور آپ کو وحیِ الٰہی پہنچائی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریلِ امین کی عظمت اور اللہ کے نزدیک جلالتِ قدر کی حقیقت روشن ہوئی۔ (ابنِ کثیر) [1]

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے خود تفسیر مرفوع اور صحابہ کرام کے اقوال کی بناء پر سورۂ نجم کی آیات مذکورہ کی تفسیر یہی قرار دی ہے کہ اس میں رُؤیت اور قرب جبریل کا مراد ہے، اور یہ پہلی رُؤیت ہے جو اسی عالم میں مکہ مکرمہ کے اُفق پر ہوئی، بعض روایات میں اس رُؤیت کی یہ تفصیل آئی ہے کہ جبریلِ امین کو پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہوگئی، تو پھر جبریلِ امین آدمی کی صورت میں آپ کے قریب آئے اور بہت قریب آگئے۔

دُوسری رُؤیت کا تذکرہ آگے سورۂ نجم ہی کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ میں آیا ہے، جو شبِ معراج میں ہوئی، مذکور الصدر وجوہ کی بناء پر عامۂ مفسرین حضرات نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، ابنِ کثیر کا مضمون تو ابھی اُوپر گزرا ہے، قرطبی، ابوحیان، امام رازی وغیرہ عموماً اسی تفسیر کو ترجیح دے رہے ہیں، [2] سیّدی حضرت حکیم الامتؒ نے بھی اسی کو اختیار

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۴۷

[2] انظر تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲۲ ص:۵۰۶، والقرطبی ج:۱۷ ص:۸۸

فرمایا ہے جو اُوپر خلاصۂ تفسیر کے عنوان میں بیان ہو چکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں حق تعالیٰ کی رُؤیت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ رُؤیتِ جبریل علیہ السلام مذکور ہے، نوویؒ نے شرح مسلم میں اور حافظ نے فتح الباری میں بھی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے۔ [1]

ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ مِــرَّة کے معنی قوت کے ہیں، یہ بھی جبرئیل امین کی دوسری صفت قوت وطاقت کی زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ وحی لانے والے فرشتے کے کام میں کوئی شیطان دخیل ہوسکتا ہے، کیونکہ جبرئیل امین اتنے قوی ہیں کہ شیطان اُن کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا، اور فَاسْتَوٰى ۝ کے معنی ''برابر ہوگئے'' مراد یہ ہے کہ اوّل جب جبرئیل امین کو دیکھا تو وہ آسمان سے اُتر رہے تھے، اُترنے کے بعد افق بلند پر مستوی ہوکر بیٹھ گئے، اُفق کے ساتھ اعلیٰ کی قید میں یہ حکمت ہے کہ افق کا وہ حصہ جو زمین کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے وہ عموماً نظروں سے مخفی رہتا ہے اس لئے افق بلند پر جبرئیل امین کو دکھلایا گیا۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ دَنٰى کے معنی ''قریب ہوگیا'' اور تَـدَلّٰى کے لفظی معنی ''لٹک گیا'' مراد جھک کر قریب ہو جانا ہے۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ قَابَ، کمان کی لکڑی جہاں دستہ پکڑنے کا ہوتا ہے، اور اس کے مقابل کمان کی ڈور (تانت) ہوتی ہے، ان دونوں کے درمیانی فاصلہ کو قَابَ کہا جاتا ہے، جس کا اندازہ تقریبی ایک ہاتھ سے کیا جاتا ہے، قَابَ قَوْسَيْنِ، یعنی دو کمانوں کی قاب فرمانے کی وجہ عرب کی ایک خاص عادت ہے، کہ دو آدمی اگر آپس میں معاہدہ صلح اور دوستی کا کرنا چاہتے تو جیسی اس کی ایک علامت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی معروف ومشہور ہے، اسی طرح دوسری علامت جس سے دوستی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا یہ تھی کہ دونوں شخص اپنی اپنی کمانوں کی لکڑی تو اپنی طرف کر لیتے اور کمان کی ڈور دوسرے کی طرف، اس طرح جب دونوں کمانوں کی ڈوریں آپس میں مل جاتیں تو باہمی قرب ومودّت کا اعلان سمجھا جاتا تھا، اس قرب کے وقت ان دونوں شخصوں کے درمیان دونوں قوسوں کے قاب کا فاصلہ رہتا تھا، یعنی تقریباً دو ہاتھ (یا ایک گز) اس کے بعد اَوْ اَدْنٰى ۝ کہہ کر یہ بھی بتلا دیا کہ یہ قرب واتصال عام رسمی اتصال کی طرح نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھا۔

آیاتِ مذکورہ میں جبرئیل کا بغایت قریب ہو جانا اس لئے بیان فرمایا گیا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ جو وحی انہوں نے پہنچائی ہے اس کے سننے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور یہ کہ اس قرب واتصال کی وجہ سے یہ بھی احتمال نہیں رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل امین کو نہ پہچانیں اور کوئی شیطان مداخلت کر سکے۔

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ اَوْحٰى کی ضمیر فاعل حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور عَبْدِهٖ کی ضمیر بھی، معنی یہ ہیں

[1] شرح صحیح مسلم للنوویؒ، کتاب الإیمان، باب معنی قول اللہ عز وجل: "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ...إلخ" ج:۱ ص:۹۸

کہ جبرئیل امین کو معلم کی حیثیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب بھیج کر حق تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی نازل فرمائی۔

ایک علمی اِشکال اور اُس کا جواب

یہاں جو ظاہری شکل میں ایک علمی اِشکال یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُوپر کی آیات میں ضمیریں جمہور مفسرین ومحدثین نے جبریلِ امینؑ علیہ السلام کی طرف راجع کی ہیں، فَاسْتَوٰى سے لے کر فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ تک سب ضمیریں جبریل ہی کی طرف راجع ہیں، اور اگلی آیات میں بھی بقول جمہور مفسرین جبریل علیہ السلام ہی کا ذِکر ہے، تو صرف اس آیت میں اَوْحٰى اور عَبْدِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کرنا نظم ونسقِ عبارت کے خلاف اور اِنتشارِ ضمائر کا موجب ہے۔

اس کا جواب اُستاذِ محترم حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہؒ نے یہ دیا ہے کہ نہ یہاں نظمِ کلام میں کوئی اِختلال ہے نہ اِنتشارِ ضمائر، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سورۂ نجم کی شروع آیت میں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ کا ذِکر فرما کر جس مضمون کی ابتدا کی گئی ہے اسی کا نہایت منضبط بیان اس طرح کیا گیا کہ وحی بھیجنے والا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، مگر اس وحی کو پہنچانے میں ایک واسطہ جبریل کا تھا، چند آیات میں اس واسطے کی توثیق پوری طرح کرنے کے بعد پھر فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ فرمایا، تو یہ ابتدائی کلام کا تکملہ ہے، اور اس میں اِنتشارِ ضمیر اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اَوْحٰى اور عَبْدِهٖ کی ضمیر میں اس کے سوا کوئی احتمال ہی نہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اس لئے یہ مرجع پہلے سے متعین ہے، اور مَآ اَوْحٰى ۝ یعنی ''جو کچھ وحی فرمانا تھا'' اس کو مبہم رکھ کر اس کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، صحیح بخاری، باب بدء الوحی کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو وحی کی گئی وہ سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں۔[1] واللہ اعلم۔

اس پورے نظمِ کلام سے قرآنِ کریم کی حقانیت اور اس کا ٹھیک کلامِ حق ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح حضراتِ محدثین احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند اپنے سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مکمل بیان کرتے ہیں، ان آیات میں حق تعالیٰ نے قرآن کی سند اس طرح بیان فرمادی کہ مُوْحِیْ یعنی وحی کرنے والا خود حق تعالیٰ ہے، اور معلّم ومبلّغ جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطۂ سند ہیں وہ جبریلِ امین علیہ السلام ہیں، آیات مذکورہ میں جبریل کی جلالتِ شان اور شدید القویٰ ہونا گویا اس واسطۂ سند کی تعدیل ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ فُؤَاد کے معنی قلب، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے قلب نے بھی اس کے ادراک میں کوئی غلطی نہیں کی، اسی غلطی اور خطا کو آیت میں لفظ كَذَبَ سے تعبیر کیا ہے کہ دیکھی ہوئی چیز کے

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱ ص:۳

ادراک میں قلب نے جھوٹ نہیں بولا، یعنی غلطی اور خطا نہیں کی، اور لفظ مَا رَاٰی ⑪ کے معنی ''جو کچھ دیکھا'' قرآن کے الفاظ نے یہ متعین نہیں کیا کہ کیا دیکھا، اس کی تفسیر میں صحابہ وتابعین اور ائمۂ تفسیر کے وہی دو قول ہیں جو اُوپر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعض کے نزدیک خود حق تعالیٰ کو دیکھنا مراد ہے (وھو قول ابن عباس) اور بعض کے نزدیک جبریلِ امین علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنا مراد ہے۔ (وھو قول عائشة وابن مسعود وابی ھریرة وابی ذر الغِفَاری رضی اللہ عنھم) اس تفسیر کے مطابق لفظ رَاٰی اپنے حقیقی معنی کے مطابق آنکھ سے دیکھنے کے لئے بولا گیا اور دیکھنے کے بعد ادراک وفہم جو قلب کا کام ہے وہ قلب کی طرف منسوب ہوا ہے، رُؤیت کو مجازی طور پر رُؤیتِ قلبیہ کے معنی میں لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ (کما فعلہ القرطبی) [۱]

رہا یہ سوال کہ آیت میں ادراک کی نسبت قلب کی طرف کی ہے، حالانکہ مشہور حکماء کا قول ہے کہ ادراک کا تعلق عقل یا نفسِ ناطقہ سے ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک وفہم کا اصل مرکز قلب ہے، اس لئے کبھی عقل کو بھی لفظ قلب سے تعبیر کردیا ہے، جیسے آیت (لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ [۲] (ق:۳۷)) میں قلب سے مراد عقل لی گئی ہے، کیونکہ قلب مرکزِ عقل ہے، آیاتِ قرآنیہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا [۳] (الاعراف:۱۷۹) وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ⑬ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ⑭ یہاں بھی رَاٰهُ کی ضمیر میں وہی دو قول ہیں کہ حق تعالیٰ مراد ہیں، یا جبرئیل امین نَزْلَةً اُخْرٰی ⑬ کے معنی دوسری مرتبہ کا نزول ہے، راجح تفسیر کے مطابق یہ نزول بھی جبرئیل امین کا ہے اور جیسا کہ پہلی رُؤیت کا مقام قرآن کریم نے اسی عالم دنیا میں مکہ مکرمہ کا اُفقِ اعلیٰ بتلایا تھا، اسی طرح اس دوسری رُؤیت کا مقام ساتویں آسمان میں سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی بتلایا، اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا شبِ معراج میں ہوا ہے، اس سے اس دوسری رُؤیت کا وقت بھی فی الجملہ متعین ہوجاتا ہے، سِدْرَہ لغت مین بیری کے درخت کو کہتے ہیں، اور منتھٰی کے معنی انتہا کی جگہ، ساتویں آسمان پر عرشِ رحمٰن کے نیچے یہ بیری کا درخت ہے، مسلم کی روایت میں اس کو چھٹے آسمان پر بتلایا ہے، اور دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر اور شاخیں ساتویں آسمان پر پھیلی ہوئی ہیں (قرطبی) [۴] اور عام فرشتوں کی رسائی کی یہ آخری حد ہے، اسی لئے اس کو منتھٰی کہتے ہیں، بعض روایات میں ہے احکامِ الٰہیہ اوّل عرشِ رحمٰن سے سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی پر نازل ہوتے ہیں، یہاں سے متعلقہ

---

[۱] تفسیر القرطبی بالاختصار، ج:۱۷ ص:۹۳

[۲] ترجمہ: جس کے پاس دل ہو۔

[۳] ترجمہ: جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے۔

[۴] تفسیر القرطبی بالاختصار ج:۱۷ ص:۹۴

فرشتوں کے سپرد ہوتے ہیں، اور زمین سے آسمان پر جانے والے اعمال نامے وغیرہ بھی فرشتے یہیں تک پہنچاتے ہیں، وہاں سے حق تعالیٰ کے سامنے پیشی کی اور کوئی صورت ہوتی ہے، مسند احمد میں یہ مضمون حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے۔ (ابن کثیر) [۱]

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۞ اَلْمَاْوٰى کے معنی ٹھکانا اور آرام کی جگہ، جنت کو اَلْمَاْوٰى اس لئے فرمایا کہ انسان کا اصل ٹھکانا اور مقام یہی ہے، یہیں آدم وحوّاء علیہما السلام کی تخلیق ہوئی ہے، یہیں سے اُن کو زمین پر اُتارا گیا، اور پھر یہیں اہلِ جنت کا مقام ہوگا۔

جنت ودوزخ کا موجودہ مقام

اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جنت اس وقت بھی موجود ہے، جیسا کہ جمہور امت کا عقیدہ یہی ہے کہ جنت ودوزخ قیامت کے بعد پیدا نہیں کی جائیں گی، یہ دونوں مقام اس وقت بھی موجود ہیں، اس آیت نے جنت کا محلِ وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر، عرش رحمٰن کے نیچے ہے، گویا ساتواں آسمان جنت کی زمین اور عرشِ رحمٰن اس کی چھت ہے، دوزخ کا محلِ وقوع کسی آیتِ قرآن یا روایتِ حدیث میں صراحۃً نہیں بتلایا، سورۂ طور کی آیت وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۞ [۲] سے بعض مفسرین نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ دوزخ سمندر کے نیچے زمین کے قعر میں ہے، جس پر اس وقت کوئی بھاری اور سخت غلاف چڑھا ہوا ہے، جو قیامت میں پھٹ جائے گا، اور اس کی آگ پھیل کر پورے سمندر کو آگ میں تبدیل کر دے گی۔

زمانۂ حال میں یورپ کے بہت سے ماہرین نے جو زمین کو برما کر ایک طرف سے دُوسری طرف جانے کا راستہ بنانے کی کوشش سالہا سال جاری رکھی، اور بڑی سے بڑی مشینیں اس کام کے لئے ایجاد کیں، مختلف جماعتوں نے اس پر محنت خرچ کی، سب سے زیادہ جو جماعت کامیاب ہوئی وہ مشینوں کے ذریعے زمین کی گہرائی میں چھ میل تک پہنچ سکی، مگر چھ میل کے بعد سخت پتھر نے ان کو عاجز کر دیا، تو پھر دُوسری جگہ سے کھدائی شروع کی، مگر وہی چھ میل کے بعد سخت پتھر سے سابقہ پڑا، متعدّد جگہوں میں اس کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی تحقیق یہ قرار پائی کہ چھ میل کی گہرائی کے بعد کوئی غلاف حجری پوری زمین پر چڑھا ہوا ہے، جس میں کوئی مشین کام نہیں کر سکتی، زمین کا قطر جو ہزاروں میل کا ہے اس میں سے سائنس کے اس عروج کے زمانے میں سائنس کی رسائی صرف چھ میل تک ہوسکی، آگے غلافِ حجری کا اقرار کر کے اپنی کوشش چھوڑنا پڑی، اس واقعے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ زمین پوری کسی غلافِ حجری سے بند کی ہوئی ہے، اگر کسی روایتِ صحیحہ سے جہنم کا محلِ وقوع اس غلاف کے اندر ہونا ثابت ہو جائے تو کچھ بعید نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

---

[۱] تفسیر ابن كثير تحت هذه الآية ج:۷ ص:۴۵۴، ومسند احمد، مسند عبدالله بن مسعود رضى الله عنه، رقم الحديث:۳۶۶۵

[۲] ترجمہ: اور دریائے شور کی جو پُر ہے۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ⑯ یعنی جبکہ ڈھانپ لیا تھا سدرہ کوڈھانپنے والی چیز نے، صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہ روایت ہے کہ اس وقت سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى پر سونے کے بنے ہوئے پروانے ہر طرف گر رہے تھے،[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روز سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کو خاص طور سے سجایا گیا تھا، جس میں آنے والے مہمان حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز تھا۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ زَاغَ، زَيْغ سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹیڑھا یا بے راہ ہو جانا اور طَغٰى طُغيَان سے مشتق ہے، جس کے معنی حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ بیان کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اس میں نظر نے کوئی خطاء یا غلطی نہیں کی، یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ بعض اوقات انسان کی نظر بھی خطا کر جاتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ کوئی عجیب غیر معمولی واقعہ دیکھ رہا ہو اس شبہ کے جواب میں قرآن کریم نے دو لفظ استعمال فرمائے، کیونکہ نظر کی غلطی دو وجہ سے ہوسکتی ہے، ایک یہ کہ جس چیز کو دیکھنا چاہتا تھا نظر اُس سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی، لفظ مَا زَاغَ سے اس قسم کی غلطی کی نفی کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کسی دوسری چیز پر نہیں، بلکہ جس کو دیکھنا تھا ٹھیک اسی پر پڑی، دُوسری وجہ نظر کی غلطی یہ ہوسکتی ہے کہ نظر پڑی تو اسی چیز پر جس کو دیکھنا مقصود تھا، مگر اس کے ساتھ وہ ادھر اُدھر کی دوسری چیزوں کو بھی دیکھتی رہی، اس میں بھی بعض اوقات التباس ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس قسم کی غلطی کے ازالے کے لئے وَمَا طَغٰى ⑰ فرمایا۔

جن حضرات نے آیاتِ سابقہ کی تفسیر رُویتِ جبریل علیہ السلام سے کی ہے، وہ اس آیت کا بھی یہی مفہوم قرار دیتے ہیں کہ جبریلِ امین کے دیکھنے میں آنکھوں نے کوئی غلطی نہیں کی، اس کے بیان کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ جبریل علیہ السلام واسطۂ وحی ہیں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اچھی طرح نہ دیکھیں اور نہ پہچانیں تو وحی شبہ سے خالی نہیں رہتی۔

اور جن حضرات نے آیاتِ سابقہ کی تفسیر رُویت حق سبحانہٗ سے کی ہے وہ یہاں بھی یہی فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ کے دیدار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں نے کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ صحیح صحیح دیکھا، البتہ اس آیت نے اس بات کو اور مزید واضح کر دیا کہ یہ رُویت بچشم سر ہوئی ہے، صرف دل کی رُویت نہیں تھی۔

آیاتِ مذکورہ کی تفسیر میں ایک اور تحقیقِ مفید

نمونۂ اسلافِ محدثین حضرت اُستاذ مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ جو بلاشبہ اس زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ اور حجۃ اللہ فی الارض تھے، ان کے علوم بلاشبہ حافظ ابن حجر اور ذہبی جیسے ائمۂ محدثین کے علوم کا نمونہ تھے، اور

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإسراء، ج: ۱ ص: ۹۷

مشکلات القرآن پر آپ کی ایک مستقل تصنیف نہایت دقیق علوم و معارف کا خزانہ ہے، سورۂ نجم کی آیات میں چونکہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم سے لے کر ائمۂ مجتہدین اور محدثین کے مختلف اقوال اور ان میں علمی اشکالات معروف ومشہور ہیں، مشکلات القرآن میں آپ نے ان آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی کہ بیشتر روایات میں تطبیق ہو جائے۔

پھر احقر کے دُوسرے اُستاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جب صحیح مسلم کی شرح فتح الملهم تحریر فرمائی، اور اِسراء ومعراج کے بیان میں سورۂ نجم کی ان آیات کا حوالہ آیا تو مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ان آیات کی تفسیر خود حضرت انور الاساتذہ قدس سرہٗ کے قلم سے لکھوا کر اس کو اپنی کتاب فتح الملهم کا جز بنایا، اور اپنے فوائد القرآن میں بھی اسی کو اِختیار فرمایا، اس طرح یہ تحقیق احقر کے دو بزرگ اساتذہ کی متفقہ تحقیق ہوگئی، اس کے دیکھنے سے پہلے چند باتیں پیش نظر رہنا چاہئے جو تقریباً سب علماء وائمہ کے نزدیک مسلّم ہیں، اوّل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، اور ان دونوں مرتبہ دیکھنے کا ذکر سورۂ نجم کی آیات مذکورہ میں موجود ہے، دُوسری مرتبہ کس جگہ کس زمانے میں دیکھا؟ اس کو تو انہی آیات میں متعین کر کے بتلا دیا ہے کہ یہ رُؤیت ساتویں آسمان پر سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے پاس ہوئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا صرف لیلۃ المعراج میں ہوا ہے، اس سے اس رُؤیت کی جگہ بھی معلوم ہوگئی، اور وقت بھی، کہ وہ شبِ معراج میں ہوئی، پہلی رُؤیت کے محل وقوع اور وقت کا تعین ان آیات میں نہیں ہے، مگر صحیح بخاری باب بدء الوحی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذیل سے یہ دونوں چیزیں متعین ہو جاتی ہیں:

قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ فَقَالَ فِيْ حَدِيْثِهٖ بَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَنِيْ بِحِرَاءَ جَالِسٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ فَاَنْزَلَ اللهُ تَعَالٰى يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② اِلٰى قَوْلِهٖ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی میں فترت یعنی وقفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ (ایک روز) جبکہ میں چل رہا تھا اچانک آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو حراء میں میرے پاس آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان (معلّق) ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، میں اس سے مرعوب ہو کر گھر لوٹ آیا اور کہا کہ مجھے ڈھانپ دو، اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ مدثر کی آیات وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ تک نازل فرمائیں، اور اس کے بعد وحی آسمانی مسلسل آنے لگی۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کا پہلا واقعہ فترۃ وحی کے زمانہ میں

مکہ معظمہ کے اندر اُس وقت پیش آیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر مکہ میں کہیں جارہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ پہلا واقعہ معراج سے پہلے زمین مکہ پر اور دوسرا واقعہ ساتویں آسمان پر شب معراج میں پیش آیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں کم از کم آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ سے لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ تک سب آیتیں واقعۂ معراج کے متعلق ہیں۔

اُمورِ مذکورہ کے پیشِ نظر اُستاذِ محترم حجۃ الاسلام حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے کہ:

قرآنِ کریم نے اپنے عام اُسلوب کے مطابق سورۂ نجم کی ابتدائی آیتوں میں دو واقعات کا ذکر فرمایا ہے، ایک واقعہ جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں اس وقت دیکھنے کا ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فترتِ وحی کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں کسی جگہ جارہے تھے، اور یہ واقعہ اسراء و معراج سے پہلے کا ہے۔

دُوسرا واقعہ شبِ معراج کا ہے، جس میں جبریلِ امین علیہ السلام کو اُن کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھنے سے کہیں زیادہ دُوسرے عجائب اور اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ کا دیکھنا مذکور ہے، ان آیاتِ کبریٰ میں خود حق تعالیٰ سبحانہ کی زیارت و رُؤیت کا شامل ہونا بھی محتمل ہے۔

سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کا اصل مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی وحی میں شبہات نکالنے والوں کا جواب ہے کہ ستاروں کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشادات امت کو دیتے ہیں، نہ ان میں کسی غیر اختیاری غلطی کا امکان ہے نہ اختیاری غلطی کا، اور یہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اپنی کسی نفسانی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے، پھر چونکہ یہ وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے بھیجی جاتی ہے وہ بحیثیت معلّم و مبلّغ وحی پہنچاتے ہیں اس لئے جبریلِ امین کی مخصوص صفات اور عظمتِ شان کا بیان کئی آیتوں میں ذکر فرمایا، اس میں زیادہ تفصیل کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ مشرکینِ مکہ اسرافیل، میکائیل فرشتوں سے تو واقف تھے، جبریل سے واقف نہ تھے، بہرحال جبریل کی صفات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مضمونِ وحی کو بیان فرمایا فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿۱۰﴾ یہاں تک یہ سب گیارہ آیتیں ہیں جن میں وحی و رسالت کی توثیق کے ضمن میں جبریلِ امین کی صفات کا ذکر ہے، اور غور کیا جائے تو یہ سب صفات جبریلِ امین پر بے تکلف صادق آتی ہیں، ان کو اگر اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین نے کیا ہے تو تکلف و تاویل سے خالی نہیں، مثلاً شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴿۵﴾، ذُوْ مِرَّةٍ، دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿۸﴾، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴿۹﴾ ان کلمات کو تاویل کے ساتھ تو حق تعالیٰ کے لئے کہا جاسکتا ہے مگر بے تاویل و بے تکلف اس کا مصداق جبریلِ امین ہی ہوسکتے ہیں، اس لئے ان ابتدائی آیات میں جس رُؤیت اور قرب و اتصال کا ذکر ہے، وہ سب

حضرت جبریل علیہ السلام کی رُؤیت سے متعلق قرار دینا ہی اقرب واسلم معلوم ہوتا ہے۔

البتہ اس کے بعد بارہویں آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪ سے لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱ تک جن میں واقعہ اسراء ومعراج کا بیان ہو رہا ہے، اس میں بھی جبریلِ امین کا دوبارہ بصورت اصلیہ دیکھنا اگرچہ مذکور ہے، مگر دوسری آیات کبریٰ کے ضمن میں ہے، جن میں رُؤیت باری تعالیٰ کے شامل ہونے کا احتمال بھی جو مؤید بالا حادیث الصحیحہ واقوال صحابہ وتابعین ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لئے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪ کی تفسیر یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ سے دیکھا آپ کے قلبِ مبارک نے اس کی تصدیق کی کہ صحیح دیکھا، اس تصدیق میں قلب مبارک نے کوئی غلطی نہیں کی، اسی کو مَا كَذَبَ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس میں "جو کچھ دیکھا" کے الفاظ عام ہیں، ان میں سب سے اہم خود حق تعالیٰ کی رُؤیت وزیارت ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگلی آیت میں ارشاد ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ⑫ جن میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے کہ آپ نے جو کچھ دیکھا یا آئندہ دیکھیں گے وہ جھگڑا اور اختلاف کرنے یا شک وشبہ میں پڑنے کی چیز نہیں عین حق وحقیقت ہے، اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا قَدْ رَاٰى، بلکہ عَلٰى مَا يَرٰى ⑫ بصیغہ مستقبل فرمایا، جس میں اگلی رُؤیت جو لیلۃ المعراج میں ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ اور اس کے بعد کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ⑬ میں اس کی تصریح ہے، اور اس آیت میں بھی دونوں رُؤیتوں کا احتمال ہے، یعنی رُؤیت جبریل علیہ السلام اور رُؤیتِ حق تعالیٰ، جبریل علیہ السلام کی رُؤیت تو ظاہر ہے، اور حق تعالیٰ کی رُؤیت کی طرف اشارہ اس طرح پایا جاتا ہے کہ رُؤیت کے لئے قرب عادۃً ضروری ہے، جیسا کہ حدیث میں حق تعالیٰ کا نزول سماء دنیا کی طرف آخر شب میں مذکور ہے، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ⑭ کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے پاس تھے جو مقام قرب ہے حق تعالیٰ کے ساتھ اس وقت دیکھا، اس میں حق تعالیٰ کی زیارت بھی مراد ہونے پر یہ حدیث شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَاَتَيْتُ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰى فَغَشِيَتْنِىْ ضَبَابَةٌ خَرَرْتُ سَاجِدًا وَّهٰذِهِ الضَّبَابَةُ [1] هِىَ الظُّلَلُ مِنَ الْغَمَامِ الَّتِىْ يَاْتِىْ فِيْهَا اللّٰهُ وَيَتَجَلّٰى۔

"میں سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى کے پاس پہنچا تو مجھے بادل کی طرح کی کسی چیز نے گھیر لیا، میں اس کے لئے سجدہ میں گر پڑا، قیامت کے روز محشر میں حق تعالیٰ کا ظہور قرآن کریم کی ایک آیت میں اسی طرح مذکور ہے کہ بادلوں کے سایہ کی طرح کی کوئی چیز ہوگی اس میں حق تعالیٰ نزولِ اجلال فرمائیں گے۔"

اسی طرح اگلی آیت مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ کا مفہوم بھی دونوں رُؤیتوں کو شامل ہے، اور اس سے یہ مزید ثابت

---

[1] سنن النسائی، کتاب الصلاۃ، باب فرض الصلاۃ ...إلخ، رقم الحدیث: ۴۵۰

ہوا کہ یہ رُؤیت حالتِ بیداری میں آنکھوں سے ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن آیات میں لیلۃ المعراج کا ذکر ہے اُن میں رُؤیت کے بارے میں جتنے الفاظ آئے ہیں ان سب میں رُؤیتِ جبرئیل اور رُؤیتِ حق سبحانہ' دونوں محتمل ہیں، اور بھی حضرات نے اُن کی تفسیر رُؤیتِ حق تعالیٰ سے کی ہے، اس کی گنجائش الفاظِ قرآن میں موجود ہے۔

رُؤیتِ باری کا مسئلہ

تمام صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور جمہور اُمت اس پر متفق ہیں کہ آخرت میں اہلِ جنت وعام مؤمنین حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں اس سے اتنا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت وزیارت کوئی امر محال یا ناممکن نہیں، البتہ عالمِ دنیا میں انسانی نگاہ میں اتنی قوت نہیں جو اس کو برداشت کر سکے اس لئے دنیا میں کسی کو رُؤیت وزیارت حق تعالیٰ کی نہیں ہوسکتی، آخرت کے معاملہ میں خود قرآن کریم کا ارشاد ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (قٓ)، یعنی آخرت میں انسان کی نگاہ تیز اور قوی کر دی جائے گی اور پردے ہٹا دیئے جائیں گے، حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس کی نگاہ فانی ہے، اور اللہ تعالیٰ باقی، پھر جب آخرت میں انسان کو غیر فانی نگاہ عطا کر دی جائے گی تو حق تعالیٰ کی رُؤیت میں کوئی مانع نہ رہے گا، تقریباً یہی مضمون قاضی عیاضؒ سے بھی منقول ہے، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تقریباً تصریح ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا (فتح الباری) [1] اس سے امکان تو اس کا بھی نکل آیا کہ عالمِ دنیا میں بھی کسی وقت خصوصی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں وہ قوت بخش دی جائے جس سے وہ حق تعالیٰ کی زیارت کر سکیں لیکن اس عالم سے باہر نکل کر جبکہ شبِ معراج میں آپ کو آسمانوں اور جنت و دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی خاص آیات قدرت کا مشاہدہ کرانے ہی کے لئے امتیازی حیثیت سے بلایا گیا، اُس وقت تو حق تعالیٰ کی زیارت اس عام ضابطہ سے بھی مستثنیٰ ہے کہ اس وقت آپ اس عالمِ دنیا میں نہیں ہیں، ثبوتِ امکان کے بعد مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کیا رُؤیت واقع ہوئی یا نہیں؟ اس معاملہ میں روایات حدیث مختلف اور آیاتِ قرآن محتمل ہیں، اسی لئے صحابہ وتابعین اور ائمہ دین میں یہ مسئلہ ہمیشہ زیر اختلاف ہی رہا، ابن کثیر نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رُؤیتِ حق سبحانہ' وتعالیٰ کو ثابت فرماتے ہیں، اور سلف صالحین کی ایک جماعت نے ان کا اتباع کیا ہے، اور صحابہ وتابعین کی بہت سی جماعتوں نے اس سے اختلاف کیا ہے، آگے دونوں جماعتوں کے دلائل وغیرہ بیان کئے ہیں۔

---

[1] فتح الباری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ النجم، ج:۱۳ ص:۴۳۴

اسی طرح حافظؒ نے فتح الباری تفسیر سورۂ نجم میں اس اختلاف صحابہ وتابعین کے ذکر کرنے کے بعد بعض اقوال ایسے بھی نقل کئے جن سے ان دونوں مختلف اقوال میں تطبیق ہو سکے، اور فرمایا کہ قرطبی نے مُفْهِم میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ ہم اس معاملہ میں کوئی فیصلہ نہ کریں، بلکہ توقف اور سکوت اختیار کریں، کیونکہ یہ مسئلہ کوئی عملی مسئلہ نہیں جس کے کسی ایک رُخ پر عمل کرنا ناگزیر ہو، بلکہ یہ مسئلہ عقیدہ کا ہے جس میں جب تک قطعی الثبوت دلائل نہ ہوں کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا، اور جب تک کسی امر میں قطعی بات نہ معلوم ہو حکم ثبوت اور توقف کا ہے، (فتح الباری) [1] احقر کے نزدیک یہی اسلم واحوط ہے، اس لئے اس مسئلہ کے دوطرفہ دلائل و وجوہات کو ذکر نہیں کیا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ ⑲ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ⑳ اَلَكُمُ الذَّكَرُ

بھلا تم دیکھو تو لات اور عزّیٰ کو، اور منات تیسرے پچھلے کو، کیا تم کو تو ملے بیٹے

وَلَهُ الْاُنْثٰى ㉑ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ㉒ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ

اور اس کو بیٹیاں، یہ بانٹا تو بہت بھونڈا، یہ سب نام ہیں

سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے اللہ نے نہیں اُتاری ان کی کوئی سند

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ

محض اٹکل پر چلتے ہیں، اور جو جیوں کی امنگ ہے، اور پہنچی ہے ان کو

مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ؕ ㉓ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۖ ㉔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ع ㉕ ع ۲۵ ۵

ان کے رَبّ سے راہ کی سوجھ، کہیں آدمی کو ملتا ہے جو کچھ چاہے، سو اللہ کے ہاتھ ہے سب بھلائی پچھلی اور پہلی

[1] فتح الباری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة النجم، ج:۱۳ ص:۴۳۴

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ

اور بہت فرشتے ہیں آسمانوں میں کچھ کام نہیں آتی ان کی سفارش مگر جب حکم دے

اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

اللہ جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے، جو لوگ یقین نہیں رکھتے آخرت کا

لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ

وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کے زنانے نام، اور ان کو اس کی کچھ خبر نہیں،

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾ ۚ

محض اٹکل پر چلتے ہیں، اور اٹکل کچھ کام نہ آئے ٹھیک بات میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا کیا تم نے لات اور عزّیٰ (کی حقیقت) پر بھی غور کیا ہے؟ ﴿۱۹﴾ اور اُس ایک اور تیسرے پر جس کا نام منات ہے؟ ﴿۲۰﴾ کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہوں، اور اللہ کے لئے بیٹیاں؟ ﴿۲۱﴾ پھر تو یہ بڑی بھونڈی تقسیم ہوئی! ﴿۲۲﴾ ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی ثبوت نازل نہیں کیا۔ درحقیقت یہ (کافر) لوگ محض وہم وگمان اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ ﴿۲۳﴾ کیا انسان کو ہر اُس چیز کا حق پہنچتا ہے جس کی وہ تمنا کرے؟ ﴿۲۴﴾ (نہیں!) کیونکہ آخرت اور دُنیا تو تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ ﴿۲۵﴾ اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کچھ بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اِس کے بعد ہی کام آسکتی ہے کہ اللہ جس کے لئے چاہے اجازت دیدے، اور اُس پر راضی ہوجائے۔ ﴿۲۶﴾ جو لوگ آخرت پر اِیمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو زنانے ناموں سے یاد کرتے ہیں، ﴿۲۷﴾ حالانکہ اُنہیں اس بات کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ وہ محض وہم وگمان کے پیچھے چل رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ وہم وگمان حق کے معاملے میں بالکل کارآمد نہیں۔ ﴿۲۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مشرکو! بعد اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناطق بالحق ومتبع للوحی ہونا ثابت ہوگیا اور آپ اس وحی سے توحید کا حکم فرماتے ہیں، جو کہ دلائلِ عقلیہ سے بھی ثابت ہے، اور تم پھر بھی بتوں کی پرستش کرتے ہو تو) بھلا تم نے (کبھی ان بتوں کے مثلاً) لات اور عزیٰ اور ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے (تا کہ تم کو معلوم ہوتا کہ وہ قابلِ پرستش ہیں یا نہیں، پس کلمہ فاء سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ کی تنبیہ کے بعد متنبہ ہونا چاہئے تھا، اور توحید کے متعلق ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ تم جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر معبود کہتے ہو تو) کیا تمہارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا کے لئے بیٹیاں (تجویز ہوں یعنی جن لڑکیوں کو تم عار وننگ وقابلِ نفرت سمجھتے ہو وہ خدا کی طرف نسبت کی جائیں) اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی، (کہ اچھی چیز تمہارے حصے میں اور بُری چیز خدا کے حصہ میں، نعوذ باللہ منہ، یہ بناءً علی العرف فرمایا ورنہ خدا تعالیٰ کے لئے بیٹا تجویز کرنا بھی بے ڈھنگی بات ہے) یہ (معبودات مذکورہ اصنام وملائکہ بعقیدۂ مذکورہ) نرے نام ہی نام ہیں (یعنی یہ مسمّیات خدا ہونے کی حیثیت سے کوئی موجود چیز ہی نہیں بلکہ مثل ان اسماء کے ہیں جن کا کہیں کوئی مصداق نہ ہو) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (بلکہ) یہ لوگ (اس اعتقادِ اُلوہیۃ غیر اللہ میں) صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر (جو کہ ان بے اصل خیالات سے پیدا ہوتی ہے) چل رہے ہیں (دونوں میں فرق یہ ہوا کہ ہر عمل سے پہلے ایک عقیدہ ہوتا ہے، اور ایک عزم وارادہ جو عمل کے لئے محرّک ہوتا ہے، پس دونوں سے دونوں کی طرف اشارہ ہے) حالانکہ ان کے پاس ان کے رَبّ کی جانب سے (بواسطۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حق گو اور وحیِ الٰہی کے پیرو ہیں آپ سے) ہدایت (امرِ واقعی کی) آچکی ہے (یعنی خود اپنے دعوے پر تو کوئی دلیل نہیں رکھتے، اور اس دعوے کی تفصیل پر رسول کے ذریعہ سے دلیل سنتے ہیں، اور پھر نہیں مانتے، یہ تو گفتگو تھی اللہ کے سوا کسی کے معبود ہونے کے ابطال میں، آگے اس کا بیان ہے کہ تم نے جو بتوں کو اس غرض سے معبود مانا ہے کہ یہ اللہ کے پاس تمہاری شفاعت کریں گے یہ غرض بھی محض دھوکہ اور باطل ہے، سو چو کہ) کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے (واقعہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ ہر تمنا) سو خدا ہی کے اختیار میں ہے، آخرت (کی بھی) اور دنیا (کی بھی پس وہ جس کو چاہیں پورا فرما دیں، اور نصِ قطعی میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس تمنائے باطل کو پورا کرنا نہیں چاہیں گے نہ دنیا میں اُن کی دنیوی حاجات میں شفاعت کریں نہ آخرت میں کہ وہاں عذاب سے نجات کی شفاعت کریں اس لئے یقیناً وہ پوری نہ ہوگی) اور (بیچارے بت تو کیا شفاعت کرتے کہ ان میں خود اہلیت ہی شفاعت کی نہیں، اس دربار میں تو جو لوگ اہل ہیں ان کی بھی بلا اجازتِ حق کچھ نہیں چلتی

چنانچہ) بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں (شاید اس میں اشارہ ہو علوِ شان کی طرف مگر باوجود اس علوِ شان کے) ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی (بلکہ خود شفاعت ہی نہیں پائی جاسکتی) مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دے دیں اور (اس کے لئے شفاعت کرنے سے) راضی ہوں (وَيَرْضٰى ﴿٢٦﴾ اس لئے بڑھایا تاکہ کبھی مخلوق کا اذن بلا رضا بھی کسی دباؤ یا مصلحت سے ہو جاتا ہے، اللہ جل شانہ کے معاملہ میں اس کا بھی دور کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ کسی دباؤ سے مجبور ہو کر راضی ہو جائیں، آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے دینا کفر ہے کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (بلکہ اس کے انکار کی وجہ سے کافر ہیں) وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں (ان کی تعبیر بالکفر میں آخرت کی تخصیص سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ سب ضلالتیں آخرت کی بے فکری سے پیدا ہوئی ہیں، ورنہ معتقدِ آخرت کو اپنی نجات کی ضرور فکر رہتی ہے، اور یہاں اُنثیٰ بمعنے دختر کے ہیں، کما فی قولہ تعالیٰ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى [1] (النحل: ۵۸)، اور جب ملائکہ کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے کفر ہونے کی تصریح فرمادی تو بتوں کے شریک ٹھہرانے کا کفر ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا اس لئے صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا، آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں قرار دینے کا عقیدہ باطل ہے) حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، اور یقیناً بے اصل خیالات امرِ حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت اور آپ کی وحی کے محفوظ ہونے کے دلائل کا تفصیلی ذکر تھا، ان آیات میں اس کے بالمقابل مشرکینِ عرب کے اس فعل کی مذمت ہے کہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے مختلف بتوں کو اپنا معبود و کارساز بنا رکھا ہے، اور فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ ان بتوں کو بھی وہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

مشرکینِ عرب کے بت جن کی وہ پرستش کرتے تھے بے شمار ہیں، مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں، اور اُن کی عبادت پر عرب کے بڑے بڑے قبائل لگے ہوئے تھے، لات، عزّٰی، منات۔ لات قبیلۂ ثقیف (اہلِ طائف) کا بت تھا، عزّٰی قریش کا اور منات بنی ہلال کا، ان بتوں کے مقامات پر مشرکین نے بڑے بڑے شاندار مکانات بنا رکھے تھے، جن کو کعبہ کی حیثیت دیتے تھے، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو منہدم کرا دیا (قرطبی ملخصاً)۔ [2]

---

[1] ترجمہ: اور جب ان میں کسی کو بیٹی کی خبر دی جاوے۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۹۹

قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ ضَـوْزٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ظلم کرنے اور حق تلفی کرنے کے ہیں، اسی لئے ابن عباسؓ نے قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ کے معنی ظالمانہ تقسیم کے کئے ہیں۔

ظن کے مختلف اَقسام اور ان کے اَحکام

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿۲۸﴾ لفظ ظن عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک معنی یہ بھی ہیں کہ بے بنیاد خیالات کو ظـــن کہا جاتا ہے، آیت میں یہی مراد ہے، اور یہی مشرکینِ مکہ کی بت پرستی کا سبب تھا، اسی کے ازالہ کے لئے یہ فرمایا گیا ہے، دوسرے معنی ظـــن کے وہ ہیں جو یقین کے بالمقابل آتے ہیں، یقین کہا جاتا ہے اس علمِ قطعی مطابق للواقع کو جس میں کسی شک وشبہ کی راہ نہ ہو، جیسے قرآن کریم یا احادیث متواترہ سے حاصل شدہ علم، اس کے مقابل ظـــن اس علم کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد خیالات تو نہیں دلیل کی بنیاد پر قائم ہے، مگر یہ دلیل اس درجہ قطعی نہیں جس میں کوئی دوسرا احتمال ہی نہ رہے، جیسے عام روایاتِ حدیث سے ثابت ہونے والے اَحکام، اسی لئے قسمِ اوّل کے مسائل کو قطعیات اور یقینیات کہا جاتا ہے، اور دوسری قسم کو ظنّیات، اور یہ ظن شریعت میں معتبر ہے، قرآن وحدیث میں اس کے معتبر ہونے کے شواہد موجود ہیں، اور تمام امت کے نزدیک واجب العمل ہے، آیت مذکورہ میں ظن کو جو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے اس سے مراد ظن بمعنی بے بنیاد و بے دلیل خیالات ہیں، اس لئے کوئی اِشکال نہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۵ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ؕ

سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دُنیا کا جینا،

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ

بس یہیں تک پہنچی اُن کی سمجھ، تحقیق تیرا ربّ ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے،

وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ

اور وہی خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا، اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا

تاکہ وہ بدلہ دے بُرائی والوں کو اُن کے کئے کا اور بدلہ دے بھلائی والوں کو

بِالْحُسْنٰى ﴿٣١﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ

بھلائی سے، جو کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے مگر کچھ آلودگی،

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

بے شک تیرے ربّ کی بخشش میں بڑی سمائی ہے، وہ تم کو خوب جانتا ہے جب بنا نکالا تم کو زمین سے

وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ

اور جب تم بچے تھے ماں کے پیٹ میں سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں،

هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿٣٢﴾ ع ٢

وہ خوب جانتا ہے اس کو جو بچ کر چلا

آسان ترجمۂ قرآن

لہٰذا (اے پیغمبر!) تم ایسے آدمی کی فکر نہ کرو جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑ لیا ہے، اور دُنیوی زندگی کے سوا وہ کچھ اور چاہتا ہی نہیں۔ ﴿٢٩﴾ ایسے لوگوں کے علم کی پہنچ بس یہیں تک ہے۔ تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون اُس کے راستے سے بھٹک چکا ہے، اور وہی خوب جانتا ہے کہ کون راہ پا گیا ہے۔ ﴿٣٠﴾ اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ بھی اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنہوں نے بُرے کام کئے ہیں، وہ اُن کو اُن کے عمل کا بھی بدلہ دے گا، اور جنہوں نے نیک کام کئے ہیں، اُن کو بہترین بدلہ عطا کرے گا۔ ﴿٣١﴾ اُن لوگوں کو جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، البتہ کبھی کبھار پھسل جانے کی بات اور ہے۔ یقین رکھو تمہارا پروردگار بہت وسیع مغفرت والا ہے،

وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب اُس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے، لہٰذا تم اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔ (۳۲)

خلاصۂ تفسیر

(جب اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ اور جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳) سے مشرکینِ عرب کا معاند ہونا معلوم ہو گیا کہ باوجود نزولِ قرآن اور ہدایت کے یہ اپنے گمان اور ہوئ پر چلتے ہیں، اور معاند سے قبولِ حق کی امید نہیں ہوتی) تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے، اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی طلب) مقصود نہ ہو (جس کی وجہ عدمِ ایمان بالآخرۃ ہے جو لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ سے اوپر مفہوم ہوا ہے اور) ان لوگوں کے فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنیوی زندگی) ہے (جب اُن کی بدفہمی اور بے فکری کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اُن کی فکر نہ کیجئے، اُن کا معاملہ اللہ کے حوالے کیجئے بس) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہے (اس سے تو اس کا علم ثابت ہوا) اور (اس سے قدرت ثابت ہے کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، (جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے اور اس کے قانون اور اُحکام پر عمل کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں گمراہ اور ہدایت پر عمل کرنے والے تو) انجام کار یہ ہے کہ بُرا کام کرنے والوں کو اُن کے (بُرے) کام کے عوض میں (خاص طور کی) جزاء دے گا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے عوض میں (خاص طور کی) جزاء دے گا (اس کا مقتضا یہ ہے کہ اسی کے حوالہ کیجئے، آگے ان لوگوں کا بیان ہے جو نیکوکار محسنین ہیں) وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ (کبھی کبھار ہو جائیں تو جس نیکوکاری کا یہاں ذکر ہے اس میں اُن سے خلل نہیں آتا، مطلب استثناء کا یہ ہے کہ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا یعنی محسنین جن کی اس آیت میں مدح کی گئی ہے اور ان کے محبوب عنداللہ ہونے کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مصداق بننے کے لئے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو شرط ہے، لیکن صغائر کا کبھی کبھی صدور اس محبوبیت کے منافی نہیں، البتہ صغیرہ گناہوں میں بھی یہ شرط ہے کہ اُن کی عادت نہ ڈال لے اور ان پر اصرار نہ کرے، کبھی اتفاقی طور پر ہو جائے، ورنہ اصرار اور عادت سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اور استثناء کا یہ مطلب نہیں کہ صغائر کی اجازت ہے اور کبائر سے اجتناب کی شرط کا یہ مطلب ہے کہ محسنین کو ان کے نیک عمل کی اچھی جزاء ملنا کبائر سے اجتناب پر موقوف ہے، کیونکہ مرتکبِ کبائر بھی جو حسنہ کرے گا اس کی جزاء پاوے گا، لقولہٖ تعالیٰ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) [1] (الزلزال)، پس

[1] ترجمہ: سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

یہ شرط جزا دینے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کو محسن اور محبوب عند اللہ کا لقب دینے کے اعتبار سے ہے، جس پر عنوان اَحْسَنُوْا دلالت کرتا ہے خوب سمجھ لو، اور اوپر جو بدکاروں کو سزا دینے کا بیان آیا اس سے گناہگاروں کو ناامید کرنے کا وہم ہوسکتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا کہ ایمان و توبہ سے ہمت ہار دیں اور محسنین کو جزائے حسنہ دینے کے وعدہ سے ان کے عجب و غرور میں مبتلا ہونے کا ایہام اور خطرہ تھا، آگے ان دونوں ایہاموں کو رَد کیا گیا ہے) بلاشبہ آپ کے رَبّ کی مغفرت بڑی وسیع ہے (گناہگاروں کو تدارکِ گناہ سے ہمت نہ ہارنی چاہئے، وہ اگر چاہے تو بجز کفر و شرک کے اور سیئات کو محض فضل سے معاف کر دیتا ہے تو تدارک سے کیوں معاف نہ کرے گا، اور اسی طرح محسنین کو عُجب اور فخر نہ کرنا چاہئے، کیونکہ حسنات میں بعض اوقات ایسے مخفی نقائص مل جاتے ہیں، جس کے سبب وہ قابلِ قبول نہیں رہتے اور عامل کو اس طرف التفات نہ ہونے سے اُن کی اطلاع بھی نہیں ہوتی، اور حق تعالیٰ کو تو علم ہوتا ہے جب وہ حسنہ مقبول نہیں تو ان کا کرنے والا محسن اور محبوب نہیں، پھر عجب و غرور کیسا، اور یہ بات کہ تمہاری کسی حالت کی خود تم کو اطلاع نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ ابتداء ہی سے اس کا وقوع ہو رہا ہے، چنانچہ) وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اُس وقت سے) خوب جانتا ہے، جب تم کو (یعنی تمہارے جد امجد آدم علیہ السلام کو) زمین (کی خاک) سے پیدا کیا تھا (جن کے ضمن میں بواسطہ تم بھی مٹی سے مخلوق ہوئے) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے (اور ان دونوں حالتوں میں تم کو خود اپنا کوئی علم نہ تھا اور ہم کو علم تھا، پس اسی طرح اب بھی تمہارا خود اپنے سے ناواقف ہونا اور ہمارا عالم و واقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، جب یہ بات ہے) تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (کیونکہ) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے (کہ فلاں متقی ہے فلاں نہیں، گو صورۃً افعال تقویٰ کے دونوں سے صادر ہوتے ہوں)۔

معارف و مسائل

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ یعنی آپ ایسے لوگوں سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری یاد سے رُخ پھیر لیں، اور دنیوی زندگی کے سوا ان کا کوئی مقصد نہ ہو، یہی اُن کا انتہائی علم و ہنر ہے۔

ضروری تنبیہ

قرآن کریم نے یہ اُن کفار کا حال بیان کیا ہے جو آخرت و قیامت کے منکر ہیں، افسوس ہے کہ انگریزوں کی تعلیم اور دنیا کی ہوا و ہوس نے آج کل ہم مسلمانوں کا یہی حال بنا دیا ہے کہ ہمارے سارے علوم و فنون اور علمی ترقی کی

ساری کوششیں صرف معاشیات کے گرد گھومنے لگیں، معادیات (معاملاتِ آخرت) کا بھول کر بھی دھیان نہیں آتا، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں، اور آپ کی شفاعت کی امید لگائے ہوئے ہیں، مگر حالت یہ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت والوں سے رُخ پھیر لینے کی ہدایت کرتا ہے، نعوذ باللہ منہ۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اس آیت میں ہدایت ربانی کی پیروی کرنے والے محسنین (نیک لوگوں) کا ذکر مقامِ مدح میں فرما کر ان کی پہچان یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے عموماً اور فحش و بے حیائی کے کاموں سے بالخصوص دور رہتے ہیں، اس میں ایک استثناء بلفظ لَمَمْ فرمایا گیا ہے (جس کی تشریح آگے آتی ہے) اور حاصل استثناء کا وہی ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا کہ ان لوگوں کو جو مُحْسِنْ یعنی نیکوکار کا خطاب دیا گیا ہے، لَمَمْ میں ابتلاء ان کو اس خطاب سے محروم نہیں کرتا۔

لَمَمَ کی تفسیر میں صحابہ وتابعین سے دو قول منقول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جن کو سورۂ نساء کی آیت میں سیئات سے تعبیر فرمایا ہے، اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ [1] (النساء:۳۱)، یہ قول حضرت ابن عباس وابوہریرہ سے ابن کثیر نے نقل کیا ہے، [2] دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جو انسان سے اتفاقی طور پر کبھی سرزد ہوگیا، پھر اس سے توبہ کرلی، اور توبہ کے بعد اس کے پاس نہیں گیا، یہ قول بھی ابن کثیر نے بروایت ابن جریر اوّل حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے، اور پھر ابن جریر ہی کی دوسری روایات میں یہ قول بواسطۂ عطاء حضرت ابن عباس سے اور بروایت حضرت حسن بصری حضرت ابوہریرہ بھی نقل کیا ہے، [3] اس کا بھی حاصل یہ ہے کہ کسی نیک آدمی سے کبھی اتفاقاً گناہ کبیرہ بھی سرزد ہوگیا اور اس نے توبہ کرلی تو یہ شخص بھی صالحین اور متقین کی فہرست سے خارج نہیں ہوگا، سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت میں یہی مضمون بالکل واضح اور صریح آیا ہے، وہ یہ ہے کہ متقین کی صفات بیان کرنے کے ذیل میں فرمایا (وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۠ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾) (یعنی وہ لوگ بھی متقین ہی میں داخل ہیں جن سے کوئی فحش کبیرہ گناہ سرزد ہوگیا یا وہ گناہ کرکے اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تو فوراً ان کو اللہ کی یاد آئی اور اپنے گناہوں سے مغفرت مانگی اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف بھی کون کرسکتا ہے، اور جو کچھ گناہ ہوگیا تھا اس پر جمے نہیں رہے) اور یہ بھی جمہور علماء کے نزدیک متفق

---

[1] ترجمہ: جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اُن میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم اُن سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف بُرائیاں تم سے دُور فرمادیں گے۔

[2] تفسیر ابن کثیر، تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۴۶۰

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۱

علیہ ہے کہ جس صغیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے اور اس کی عادت ڈال لی جائے وہ بھی کبیرہ ہوجاتا ہے، اس لئے خلاصۂ تفسیر مذکور میں لَمَمْ کی تفسیر اُن صغیرہ گناہوں سے کی گئی ہے جس پر اصرار نہ کیا گیا ہو۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف

یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ [۱] (النساء:۳۱) کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم، ص: ۴۳۲ سے ۴۳۸ تک لکھ دیا گیا ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ اَجِنّه جَنِيْن کی جمع ہے، بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے اس کو جنین کہا جاتا ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ وہ خود اپنی جان کا بھی اتنا علم نہیں رکھتا جتنا اس کے خالق سبحانہ کو ہے، کیونکہ ماں کے پیٹ میں جو تخلیق کے مختلف دور اس پر گزرے ہیں اس وقت وہ کوئی علم و شعور ہی نہ رکھتا تھا، مگر اس کا بنانے والا خوب جانتا تھا جس کی حکیمانہ تخلیق اس کو بنارہی تھی، اس میں انسان کو عجز و کم علمی پر متنبہ کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جو بھی کوئی اچھا اور نیک کام کرتا ہے وہ اس کا ذاتی کمال نہیں، خدا تعالیٰ کا بخشا ہوا انعام ہی ہے کہ کام کرنے کے لئے اعضاء و جوارح اُس نے بنائے، اُن میں حرکت کی قوت اس نے بخشی، پھر دل میں نیک کام کرنے کا داعیہ اور پھر اس پر عزم و عمل اسی کی توفیق سے ہوا، تو کسی بڑے سے بڑے نیک، صالح اور متقی و پرہیزگار انسان کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے عمل پر فخر کرے، اور اس عمل کو اپنا کمال قرار دے کر غرور میں مبتلا ہوجائے، اس کے علاوہ سب چیزوں کا مدار خاتمہ اور انجام پر ہے، ابھی اس کا حال معلوم نہیں کہ خاتمہ کس حال پر ہوتا ہے تو فخر و غرور کرنا کس بات پر، اس ہدایت کو اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲ یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو، کیونکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون کیسا ہے اور کس درجہ کا ہے، کیونکہ مدار فضیلت تقویٰ پر ہے، ظاہری اعمال پر نہیں، اور تقویٰ بھی وہ معتبر ہے جو موت تک قائم رہے۔

حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ کا نام اُن کے والدین نے ''بَرَّہ'' رکھا تھا، جس کے معنی ہیں نیکوکار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ تلاوت فرما کر اس نام سے منع کیا، کیونکہ اس میں اپنے نیک ہونے کا دعویٰ ہے، اور نام بدل کر زینب رکھ دیا۔ (رواہ مسلم فی صحیحہ، ابن کثیر) [۲]

---

[۱] ترجمہ: جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اُن میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم اُن سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دُور فرمادیں گے۔

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۳، وصحیح مسلم، کتاب الآداب، باب استحباب تغییر الإسم إلی حسن ....إلخ، ج:۲ ص:۲۰۸

امام احمد نے عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دُوسرے آدمی کی مدح وتعریف کی، آپ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ تمہیں کسی کی مدح وثناء کرنا ہی ہو تو ان الفاظ سے کرو کہ میرے علم میں یہ شخص نیک متقی ہے، وَلَآ اُزَكِّيْ عَلَى اللّٰهِ اَحَدًا، یعنی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ ایسا ہی پاک صاف ہے جیسا میں سمجھ رہا ہوں۔ [1]

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ

بھلا تو نے دیکھا اس کو جس نے منہ پھیرلیا، اور لایا تھوڑا سا اور سخت نکلا، کیا اس کے پاس

عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾

خبر ہے غیب کی سو وہ دیکھتا ہے، کیا اس کو خبر نہیں پہنچی اس کی جو ہے ورقوں میں موسیٰ کے،

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾

اور ابراہیم کے جس نے کہ اپنا قول پورا اُتارا، کہ اُٹھاتا نہیں کوئی اُٹھانے والا بوجھ کسی دُوسرے کا،

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾

اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اُس نے کمایا، اور یہ کہ اُس کی کمائی اس کو دکھلانی ضرور ہے،

ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ

پھر اس کو بدلہ ملنا ہے پورا بدلہ، اور یہ کہ تیرے رَبّ تک سب کو پہنچنا ہے، اور یہ کہ وہی ہے

اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ

ہنساتا اور رُلاتا، اور یہ کہ وہی ہے مارتا اور جِلاتا، اور یہ کہ اس نے بنایا جوڑا

[1] مسند احمد، حدیث ابی بکرة رضی الله تعالٰی عنه، رقم الحدیث: ۲۰۴۸۴

الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝٤٥ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنٰى ۝٤٦ وَأَنَّ عَلَيْهِ

نر اور مادہ، ایک بوند سے جب ٹپکائی جائے، اور یہ کہ اس کے ذمہ ہے

النَّشْأَةَ الْأُخْرٰى ۝٤٧ وَأَنَّهٗ هُوَ أَغْنٰى وَأَقْنٰى ۝٤٨ وَأَنَّهٗ هُوَ

دُوسری دفعہ اٹھانا، اور یہ کہ اس نے دولت دی اور خزانہ، اور یہ کہ وہی ہے

رَبُّ الشِّعْرٰى ۝٤٩ وَأَنَّهٗ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولٰى ۝٥٠ وَثَمُودَا فَمَا أَبْقٰى ۝٥١

رَبّ شِعریٰ کا، اور یہ کہ اس نے غارت کیا عاد پہلے کو، اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا،

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغٰى ۝٥٢

اور نوح کی قوم کو پہلے ان سے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور شریر،

وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوٰى ۝٥٣ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى ۝٥٤ فَبِأَيِّ اٰلَاءِ رَبِّكَ

اور اُلٹی بستی کو پٹک دیا، پھر آپڑا اس پر جو کچھ کہ آپڑا، اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی

تَتَمَارٰى ۝٥٥ هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولٰى ۝٥٦ أَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝٥٧

جھٹلائے گا، یہ ایک ڈر سُنانے والا ہے پہلے ڈر سُنانے والوں میں کا، آپہنچی آنے والی،

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝٥٨ أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ

کوئی نہیں اس کو اللہ کے سوائے کھول کر دکھانے والا، کیا تم کو اس بات سے

تَعْجَبُونَ ۝٥٩ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ۝٦٠ وَأَنْتُمْ سٰمِدُونَ ۝٦١

تعجب ہوتا ہے، اور ہنستے ہو اور روتے نہیں، اور تم کھلاڑیاں کرتے ہو،

السجدة ۱۲ | ع ۳

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

سو سجدہ کرو اللہ کے آگے اور بندگی

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) بھلا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو (حق سے) منہ موڑ گیا، ﴿۳۳﴾ اور جس نے تھوڑا سا دیا، پھر رُک گیا؟ ﴿۳۴﴾ کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے جو وہ دیکھ رہا ہو؟ ﴿۳۵﴾ کیا اُسے اُن باتوں کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں درج ہے، ﴿۳۶﴾ اور ابراہیم کے صحیفوں میں بھی، جو مکمل وفادار رہے؟ ﴿۳۷﴾ یعنی یہ کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا، ﴿۳۸﴾ اور یہ کہ انسان کو خود اپنی کوشش کے سوا کسی اور چیز کا (بدلہ لینے کا) حق نہیں پہنچتا، ﴿۳۹﴾ اور یہ کہ اُس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی، ﴿۴۰﴾ پھر اُس کا بدلہ اُسے پورا پورا دیا جائے گا، ﴿۴۱﴾ اور یہ کہ آخر کار (سب کو) تمہارے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے، ﴿۴۲﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا اور رُلاتا ہے، ﴿۴۳﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو موت بھی دیتا ہے، اور زندگی بھی، ﴿۴۴﴾ اور یہ کہ اُسی نے نر اور مادہ کے دو جوڑے پیدا کئے ہیں ﴿۴۵﴾ (وہ بھی صرف) ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے، ﴿۴۶﴾ اور یہ کہ دوسری زندگی دینے کا بھی اُسی نے ذمہ لیا ہے، ﴿۴۷﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو مالدار بناتا اور دولت کو محفوظ کراتا ہے، ﴿۴۸﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو شعریٰ ستارے کا پروردگار ہے، ﴿۴۹﴾ اور یہ کہ وہی ہے جس نے پچھلے زمانے کی قومِ عاد کو ہلاک کیا، ﴿۵۰﴾ اور ثمود کو بھی، اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، ﴿۵۱﴾ اور اس سے پہلے نوح کی قوم کو بھی (ہلاک کیا)۔ بیشک وہ سب سے زیادہ ظالم اور سرکش تھے۔ ﴿۵۲﴾ اور جو بستیاں اوندھی گری تھیں، اُن کو بھی اُسی نے اُٹھا پھینکا تھا، ﴿۵۳﴾ پھر جس (خوفناک) چیز نے اُنہیں ڈھانپا، وہ اُنہیں ڈھانپ کر ہی رہی۔ ﴿۵۴﴾ لہٰذا (اے انسان!) تو اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں میں شک کرے گا؟ ﴿۵۵﴾ یہ (پیغمبر) بھی پہلے خبردار کرنے والے پیغمبروں کی طرح ایک خبردار کرنے والے ہیں۔ ﴿۵۶﴾ جو گھڑی جلد آنے والی ہے، وہ قریب آ پہنچی ہے، ﴿۵۷﴾ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جو اُسے ہٹا سکے۔ ﴿۵۸﴾ تو کیا تم اسی بات پر حیرت کرتے ہو؟ ﴿۵۹﴾ اور (اُس کا مذاق بنا کر) ہنستے ہو، اور روتے نہیں ہو، ﴿۶۰﴾ جبکہ تم تکبر کے ساتھ کھیل کود میں پڑے ہوئے ہو؟ ﴿۶۱﴾ اب (بھی) جھک جاؤ اللہ کے سامنے، اور اُس کی بندگی کرلو۔ ﴿۶۲﴾

شانِ نزول

درمنثور میں بروایت ابن جریر یہ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص اسلام لے آیا تھا، اس کے کسی ساتھی نے اس کو ملامت کی

کہ تو نے اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں وہ بولا کہ تو مجھے کچھ دے دے تو میں آخرت کا تیرا عذاب اپنے سر پر رکھ لوں گا، تو عذاب سے بچ جائے گا، چنانچہ اس نے کچھ دے دیا، اس نے اور مانگا تو کچھ کشاکشی کے بعد کچھ اور بھی دے دیا، اور بقیہ کی دستاویز مع گواہوں کے لکھ دی، روح المعانی میں اس شخص کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے، جس کا اسلام کی طرف میلان ہو گیا تھا، اس کے دوست نے ملامت کی، اور عذاب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ [1]

خلاصۂ تفسیر

(آپ نے نیکوں کی صفات تو سن لیں) تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے (دینِ حق سے) روگردانی کی (یعنی اسلام سے ہٹ گیا) اور تھوڑا مال دیا اور (پھر) بند کر دیا (یعنی جس شخص سے مال دینے کا وعدہ اپنے مطلب کے واسطے کیا تھا، وہ بھی پورا نہ دیا، اور اسی سے مفہوم ہوا کہ ایسا شخص دوسروں کی نفع رسانی کے لئے کیا خرچ کرے گا جب اپنے ہی مطلب کے لئے پورا خرچ نہ کر سکا، جس کا حاصل اس کا بخیل ہونا ہے) کیا اس شخص کے پاس (کسی صحیح ذریعہ سے) علمِ غیب ہے کہ اس کو دیکھ رہا ہے (جس کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص میری طرف سے میرے گناہوں کا عذاب اپنے سر لے کر مجھے عذاب سے بچا دے گا) کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں ہے (اور حسب روایت درمنثور در تفسیر سورۂ اعلیٰ موسیٰ علیہ السلام کے یہ دس صحیفے علاوہ توریت کے ہیں) اور نیز ابراہیم (علیہ السلام) کے (صحیفوں میں ہے وسيأتي في سورة الأعلى) جنہوں نے اَحکام کی پوری بجا آوری کی (اور وہ مضمون) یہ (ہے) کہ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر (ایسے طور سے) نہیں لے سکتا (کہ گناہ کرنے والا بَری ہو جائے، پھر یہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ میرا سارا گناہ یہ شخص اپنے سر رکھ لے گا) اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی (یعنی کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا، پس اگر اس ملامت کرنے والے شخص کے پاس ایمان ہوتا تب بھی اس شخص کے کام نہ آتا، چہ جائیکہ وہاں بھی ایمان ندارد ہے) اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا (باوجود اس کے یہ شخص اپنی فلاح کی سعی سے کیسے غافل ہو گیا) اور یہ (مضمون ہے) کہ (سب کو) آپ کے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے (پھر وہ شخص کیسے نڈر ہو گیا) اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی ہنساتا اور رُلاتا ہے اور یہ کہ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے اور یہ کہ وہی دونوں قسم یعنی نر اور مادہ کو نطفہ سے بناتا ہے جب

[1] الدر المنثور، تحت هذه الآية ج:۹ ص:۳۲۹، وروح المعاني، تحت هذه الآية ج:۲۰ ص:۱۵

(وہ رحم میں) ڈالا جاتا ہے (یعنی مالک تمام تصرّفات کا خدا ہی ہے، دوسرا نہیں، پھر وہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ قیامت کے روز یہ تصرف کہ مجھ کو عذاب سے بچالے کسی دوسرے کے قبضہ میں ہو جائے گا) اور یہ (مضمون ہے) کہ دوبارہ پیدا کرنا (حسب وعدہ) اس کے ذمہ ہے (یعنی ایسا ضروری ہونے والا ہے جیسے کسی کے ذمہ ہو تو اس شخص کے نڈر ہونے کی وجہ یہ بھی نہ ہونا چاہئے کہ قیامت نہ آئے گی) اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی غنی کرتا ہے (یعنی سرمایہ دیتا ہے) اور سرمایہ (دے کر محفوظ اور) باقی رکھتا ہے اور یہ کہ وہی مالک ہے ستارۂ شِعریٰ کا بھی (جس کی عبادت جاہلیت میں بعض لوگ کرتے تھے، یعنی ان تصرّفات واشیاء کا مالک بھی وہی ہے جیسے پہلے تصرّفات کا مالک وہی ہے اور اوپر کے تصرّفات خود انسان کے وجود میں ہیں اور بعد کے تصرّفات متعلقات انسان میں ہیں، چنانچہ مال اور ستارہ دونوں خارج ہیں اور شاید ان دو کے ذکر میں اشارہ ہو کہ جس کو تم اپنا مددگار سمجھتے ہو اس کے ربّ بھی ہم ہی ہیں، پھر دوسرے کو قیامت میں اس شخص کے گمان کے موافق کیا تصرف پہنچ سکتا ہے) اور یہ (مضمون ہے) کہ اس نے قدیم قومِ عاد کو (اس کے کفر کی وجہ سے) ہلاک کیا اور ثمود کو بھی کہ (ان میں سے) کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قومِ نوح (علیہ السلام) کو (ہلاک کیا) بے شک وہ سب سے بڑھ کر ظالم اور شریر تھے (کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت میں بھی راہ پر نہ آئے) اور (قوم لوط علیہ السلام کی) اُلٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک مارا تھا، پھر اُن بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا (یعنی اوپر سے پتھر برسنا شروع ہوئے، پس یہ شخص اگر ان قصوں میں غور کرتا تو عذابِ کفر سے ڈرتا، اور بے فکر نہ ہوتا، آگے ان سب مضامین پر تفریع فرماتے ہیں کہ اے انسان جب ایسے ایسے مضامین سے تجھ کو آگاہ کیا جاتا ہے جو بوجہ ہدایت ہونے کے ہر مضمون بجائے خود ایک نعمتِ ربانی ہے) سو تو اپنے ربّ کی کون کون سی نعمت میں شک (وانکار) کرتا رہے گا (اور ان مضامین کی تصدیق کر کے منتفع نہ ہوگا) یہ (پیغمبر) بھی پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں (ان کو مان لو کیونکہ) وہ جلدی آنے والی چیز قریب آپہنچی ہے (مراد قیامت ہے اور جب وہ آئے گی تو) کوئی غیر اللہ اس کا ہٹانے والا نہیں (پس کسی کے بھروسہ بے فکری کی گنجائش ہی نہیں) سو کیا (ایسی خوف کی باتیں سن کر بھی) تم لوگ اس کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے اور (استہزاءً) ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں ہو اور تم (اطاعت سے) تکبر کرتے ہو سو (اس کبر وغفلت سے باز آؤ اور حسبِ تعلیم ان پیغمبر کے) اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کی بلا شرکت) عبادت کرو (تاکہ تم کو نجات ہو)۔

معارف ومسائل

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ تَوَلّٰى کے لفظی معنی منہ پھیر لینے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے منہ پھیرے۔

وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَكْدٰى، كُدْيَةٌ سے مشتق ہے، كُدْيَةٌ اس سخت پتھر کو کہا جاتا ہے جو کوئی کنواں یا بنیاد کھودتے ہوئے زمین میں نکل آئے، اور کھدائی کے لئے رکاوٹ بن جائے، اس لئے اَكْدٰى کے معنی یہ ہوئے کہ پہلے کچھ دیا پھر دینے سے رُک گیا، آیت کے شانِ نزول میں جو ایک واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے مطابق تو معنی ظاہر ہیں، اور اس سے قطع نظر کی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جس نے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کیا پھر چھوڑ دیا، یا شروع میں کچھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف مائل ہوا، کچھ کرنے لگا پھر چھوڑ بیٹھا، اس لفظ کی یہ تفسیر حضرت مجاہد، سعید بن جُبیر، عکرمہ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔ (ابن کثیر) [1]

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾، شانِ نزول میں جو قصہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آخرت کا تیرا عذاب میں اپنے سر لے کر تجھ کو بچا دوں گا، اس احمق نے اس کا یقین کیسے کر لیا، کیا اس کو علم غیب حاصل ہے؟ جس سے وہ دیکھ رہا ہے کہ بے شک کفر کی صورت میں وہ جس عذاب کا مستحق ہوگا وہ عذاب یہ ساتھی اپنے سر لے لے گا اور مجھے بچا دے گا، جو ظاہر ہے کہ سراسر دھوکہ ہے نہ اس کو علمِ غیب ہے نہ کوئی دوسرا آدمی کسی کا عذابِ آخرت اپنے سر لے کر اس کو بچا سکتا ہے، اور اگر اس قصہ سے قطع نظر کی جائے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کرتا رُک گیا ہے اور خرچ کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ موجودہ مال خرچ کر دوں گا تو پھر کہاں سے آئے گا، اس خیال کی تردید میں فرمایا کہ کیا اس کو غیب کا علم ہے جس کے ذریعہ گویا وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ مال ختم ہو جائے گا اور اس کے بجائے اور مال اس کو نہ مل سکے گا، یہ غلط ہے، کیونکہ نہ اس کو غیب کا علم ہے اور نہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ (سبا)) یعنی تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا بدل تمہیں دے دیتے ہیں اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والے ہیں، انسان غور کرے تو قرآن کا یہ ارشاد صرف مال اور پیسہ کے معاملہ میں نہیں، بلکہ ہر قوت و توانائی جو وہ دنیا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدن میں اس کا بدل ما یتحلّل پیدا کرتے رہتے ہیں، ورنہ انسان کے بدن کا ایک ایک عضو اگر فولاد کا بھی بنا ہوتا تو ساٹھ ستر سال کام لینے سے کبھی کا گھس گھسا کر برابر ہو جاتا، جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کے تمام اعضاء میں جو کچھ محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے خود کار مشین کی طرح اس کا بدل اندر سے پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح مال کا بھی معاملہ یہی ہے کہ انسان خرچ کرتا رہتا ہے اس کا بدل آتا رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو فرمایا: اَنْفِقْ يَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۳

اِقْلَالًا، ''یعنی بلال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور عرش والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا خطرہ نہ رکھو کہ وہ تمہیں مفلس کر دے گا۔'' (ابن کثیر) [1]

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اس آیت میں حضرت ابرہیم علیہ السلام کی ایک خاص صفت وَفّٰى بیان فرمائی گئی، وفاء کے معنی کسی وعدے یا معاہدے کو پورا کر دینے کے آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خاص صفت ایفائے عہد کی کچھ تفصیل

مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور اس کا پیغام مخلوق کو پہنچا دیں گے، انہوں نے اس معاہدہ کو ہر حیثیت سے پورا کر دکھایا، جس میں ان کو بہت سخت آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا، وَفّٰى کی یہی تفسیر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اختیار کی ہے۔ [2]

بعض روایاتِ حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاص خاص اعمال کو لفظ وَفّٰى کا سبب بتایا گیا ہے وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ اصل وفاء عہد عام ہے، تمام اَحکامِ الٰہیہ کی تعمیل و اطاعت جس میں اپنے اعمال بھی داخل ہیں، اور فرائضِ رسالت و نبوّت کے ذریعہ عام خلق اللہ کی اصلاح بھی، انہیں اعمال میں یہ عمل بھی ہیں جن کا ذکر ان روایاتِ حدیث میں ہے۔

مثلاً ابن ابی حاتم نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی (وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾) اور پھر ان سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ وَفّٰى کا مطلب کیا ہے؟ ابوامامہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ:-

وَفّٰى عَمَلَ يَوْمِهٖ بِاَرْبَعِ رَكْعَاتٍ فِيْ اَوَّلِ النَّهَارِ۔ (ابن كثير) [3]

''یعنی انہوں نے اپنے دن کے اعمال کی تکمیل اس طرح کر دی کہ شروع دن میں چار رکعت (نماز اشراق کی) پڑھ لیں۔''

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ترمذی نے حضرت ابوذر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

---

[1] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۴۶۳، والمعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث:۱۰۱۳

[2] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۴۶۳

[3] تفسير ابن كثير بحوالۂ بالا، والدر المنثور ج:۹ ص:۳۲۹

اِبْنَ اٰدَمَ ارْكَعْ لِیْ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ مِّنْ اَوَّلِ النَّهَارِ اَكْفِكَ اٰخِرَهٗ۔ (ابن کثیر) [1]

''یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے! تو شروع دن میں میرے لئے چار رکعتیں پڑھ لیا کر تو میں آخر دن تک تیرے سب کاموں کی کفالت کروں گا۔''

اور اِبنِ ابی حاتم ہی نے ایک روایت حضرت معاذ بن انسؓ سے یہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں بتلاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اَلَّذِیْ وَفّٰۤى کا خطاب کیوں دیا، پھر فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ وہ روزانہ صبح شام ہونے کے وقت یہ پڑھا کرتے تھے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ [2] (الروم) (ابن کثیر) [3]

صحفِ موسیٰ و اِبراہیم علیہما السلام کی خاص ہدایات وتعلیمات

انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے جب کسی کا قول یا کوئی تعلیم قرآن میں ذِکر کی جاتی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس اُمت کے لئے بھی وہ واجب العمل ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی نص شرعی نہ ہو، آگے اٹھارہ آیتوں میں اُن خاص تعلیمات کا ذِکر ہے جو حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں تھیں، ان میں عملی اَحکام جن کا تعلق سابقہ آیات کے ساتھ ہے وہ صرف دو ہیں، باقی تعلیمات عبرت ونصیحت اور حق تعالیٰ کی آیاتِ قدرت سے متعلق ہیں، وہ دو یہ ہیں:-

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وِزْر کے معنی دراصل بوجھ کے ہیں اور پہلی آیت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا اپنے سوا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا بوجھ سے مراد گناہ کا بوجھ اور اس کا عذاب ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کا عذاب دوسرے پرنہیں ڈالا جائے گا، نہ کسی کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ دوسرے کا عذاب اپنے سر لے لے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا بیان اس طرح آیا ہے: وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ (فاطر: ۱۸) ''یعنی اگر کوئی گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا شخص لوگوں سے درخواست کرے گا کہ میرا کچھ بوجھ تم اٹھا لو تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اُٹھا سکے۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۳، وجامع الترمذی، ابواب الوتر، باب ما جاء فی صلاۃ الضحٰی ج:۱ ص:۱۰۸

[2] ترجمہ: سو تم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت اور صبح کے وقت اور تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت۔

[3] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۳ و ۴۶۴، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۱۷۴۷۹، ومسند احمد، حدیث معاذ بن انس الجهنی (رضی اللہ عنہ) رقم الحدیث: ۱۵۶۲۴

ایک کے گناہ میں دُوسرا نہیں پکڑا جائے گا

اس آیت میں اُس شخص کے خیال کی بھی تردید ہوگئی جس کا ذکر شانِ نزول میں آیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا تھا یا ہونے والا تھا، اس کے ساتھی نے ملامت کی، اور اس کی ضمانت لی کہ قیامت میں تجھ پر کوئی عذاب ہوا تو وہ میں اپنے سر لے کر تجھ بچادوں گا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسے معاملہ کا اللہ کے یہاں کوئی امکان نہیں کہ کسی کے گناہ میں کسی دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ جس میّت پر اس کے گھر والے ناجائز نوحہ وبکاء کرتے ہیں تو ان کے اس فعل سے میّت کو عذاب ہوتا ہے (کما ورد فی الصحیحین عن ابن عمر) [۱] تو یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو خود بھی میّت پر نوحہ خوانی، گریہ وزاری کا عادی ہو، یا جس نے اپنے وارثوں کو اس کی وصیت کی ہو کہ میرے بعد نوحہ وبکاء کا انتظام کیا جائے (مظہری) [۲] اس صورت میں اس پر عذاب خود اس کے اپنے عمل کا ہوا، دُوسروں کے عمل کا نہیں۔

دُوسرا حکم ہے (وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾) اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح کوئی دُوسرے کا عذاب اپنے سر نہیں لے سکتا، اسی طرح کسی کو یہ بھی حق نہیں کہ کسی دُوسرے کے عمل کے بدلے خود عمل کرلے اور وہ اس عمل سے سبکدوش ہوجائے، مثلاً ایک شخص دُوسرے کی طرف سے نماز فرض ادا کردے، یا دُوسرے کی طرف سے فرض روزہ رکھ لے اور وہ دُوسرا اپنے فرض نماز وروزے سے سبکدوش ہوجائے، یا یہ کہ ایک شخص دُوسرے کی طرف سے ایمان قبول کرلے اور اس سے اس کو مؤمن قرار دیا جائے۔

آیتِ مذکورہ کی اس تفسیر پر کوئی فقہی اِشکال اور شبہ عائد نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ شبہ حج اور زکوٰۃ کے مسئلے میں یہ ہوسکتا ہے کہ ضرورت کے وقت شرعاً ایک شخص دُوسرے کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے، یا دُوسرے کی زکوٰۃ اس کی اجازت سے ادا کرسکتا ہے، مگر غور کیا جائے تو یہ اِشکال اس لئے صحیح نہیں کہ کسی کو اپنی جگہ حجِ بدل کے لئے بھیج دینا اور اس کے مصارف خود ادا کرنا، یا کسی شخص کو اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کردینے کے لئے مامور کردینا بھی درحقیقت اسی شخص کے اپنے عمل اور سعی کا جز ہے، اس لئے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے منافی نہیں۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من النیاحۃ علی المیّت، ج:۱ ص:۱۷۲، وصحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب المیّت یعذّب ببکاء اھلہ، ج:۱ ص:۳۰۲

[۲] تفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۹ ص:۱۲۶

ایصالِ ثواب کا مسئلہ

جب کہ اُوپر یہ معلوم ہو چکا کہ آیتِ مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے فرائض ایمان و نماز و روزہ کو ادا کر کے دوسرے کو سبکدوش نہیں کرسکتا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک شخص کے نفلی عمل کا کوئی فائدہ اور ثواب دوسرے شخص کو نہ پہنچ سکے، ایک شخص کی دعاء اور صدقہ کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچنا نصوصِ شرعیہ سے ثابت اور تمام اُمت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے۔ (ابن کثیر) [۱]

صرف اس مسئلے میں اِمام شافعی رحمہ اللہ کا اختلاف ہے کہ تلاوتِ قرآن کا ثواب کسی دُوسرے کو بخشا اور پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اِمام شافعی اس کا انکار کرتے ہیں اور آیتِ مذکورہ کا مفہوم عام لے کر اس سے استدلال فرماتے ہیں، جمہور ائمہ اور اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح دُعا اور صدقے کا ثواب دُوسرے کو پہنچایا جاسکتا ہے اسی طرح تلاوتِ قرآن اور ہر نفلی عبادت کا ثواب دُوسرے شخص کو بخشا جاسکتا ہے اور وہ اس کو ملے گا، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ احادیثِ کثیرہ اس پر شاہد ہیں کہ مؤمن کو دُوسرے شخص کی طرف سے عملِ صالح کا ثواب پہنچتا ہے، [۲] تفسیر مظہری میں اس جگہ ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن سے ایصالِ ثواب کا فائدہ دُوسرے کو پہنچنا ثابت ہوتا ہے۔ [۳]

اُوپر صحفِ موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے حوالے سے جو دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص کے گناہ کا عذاب کسی دُوسرے کو نہیں پہنچے گا، اور ایک کے گناہ میں دُوسرا کوئی نہ پکڑا جائے گا، دُوسرا یہ کہ ہر شخص پر جن اعمال کی شرعی ذمہ داری ہے اس سے سبکدوشی خود اسی کے اپنے عمل سے ہوگی، دُوسرے کا عمل اس کو سبکدوش نہ کرے گا۔

یہ دونوں حکم اگرچہ دُوسرے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی تھے، مگر حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کی خصوصیت شاید اس بناء پر کی گئی کہ اُن کے زمانے میں یہ جاہلانہ رسم جاری ہوگئی تھی کہ باپ کے بدلے میں بیٹے کو اور بیٹے کے بدلے میں باپ کو یا بھائی، بہن وغیرہ کو قتل کر دیا جاتا تھا، ان دونوں بزرگوں کی شریعتوں نے اس رسمِ جاہلیت کو مٹایا تھا۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ یعنی صرف ہر شخص کی ظاہری سعی کافی نہیں، اللہ تعالیٰ کے دربار میں سعی کی اصل حقیقت بھی دیکھی جائے گی کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے کی ہے یا دوسری اغراضِ دنیویہ اس میں شامل ہیں، جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، [۴] یعنی صرف صورتِ عمل کافی نہیں،

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۵

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۱۱۴

[۳] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۱۲۷

[۴] صحیح البخاری ج:۱ ص:۲

عمل میں نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیل حکم کی ہونا ضروری ہے۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی ﴿۴۲﴾ مراد یہ ہے کہ آخر کار سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور اعمال کا حساب دینا ہے۔

بعض حضراتِ مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ انسانی غور و فکر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، اس کی ذات وصفات کی حقیقت کسی غور و فکر سے نہ حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں غور و فکر کی اجازت، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو اس کی ذات میں غور و فکر نہ کرو بلکہ اس کو علمِ الٰہی کے سپرد کرو وہ تمہارے بس کا نہیں۔ [۱]

وَاَنَّہٗ ہُوَ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی ﴿۴۳﴾ یعنی نوع انسان میں خوشی اور غم اور اس کے نتیجے میں ہنسنے اور رونے کا سلسلہ ہر شخص دیکھتا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو اُن کے ظاہری طور پر پیش آنے والے اسباب کی طرف منسوب کر کے معاملہ ختم کر دیتا ہے، یہاں غور و فکر کی جگہ ہے، گہری نظر سے جو دیکھے گا کہ کسی کی خوشی یا غم اور ہنسنا یا رونا خود اس کے یا کسی دوسرے کے قبضہ میں نہیں، یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، وہ اسباب کو پیدا کرتا ہے وہی اسباب میں تاثیر دیتا ہے وہ جب چاہتا ہے تو رونے والوں کو ایک لمحہ میں ہنسا دیتا ہے، اور ہنسنے والوں کو ایک منٹ میں رُلا دیتا ہے، وَلَنِعْمَ مَا قِیْلَ ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست [۲]

وَاَنَّہٗ ہُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ﴿۴۸﴾ غِنَآء کے معنی مالداری کے معروف ہیں، اِغناء کے معنی دوسرے کو مالدار بنا دینا، اور اَقْنٰی، قِنْیَۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی محفوظ اور ریزرو سرمایہ کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کو مالدار اور غنی بناتا ہے وہی جس کو چاہے اتنا سرمایہ دیتا ہے کہ اس کو محفوظ رکھ سکے۔

وَاَنَّہٗ ہُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ﴿۴۹﴾ شِعْرٰی بکسر شین، ایک ستارے کا نام ہے جو جوزاء کے پیچھے ہے، عرب کی بعض اقوام اس ستارے کی پرستش کرتی تھیں، اس لئے خصوصیت سے اس کا نام لے کر بتلایا کہ اس ستارے کا مالک اور پروردگار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اگرچہ وہ سارے ہی ستاروں، آسمانوں، زمینوں کا خالق و مالک اور پروردگار ہے۔

وَاَنَّہٗ اَہْلَکَ عَادَا الْاُوْلٰی ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰی ﴿۵۱﴾ قوم عاد دنیا کی قوی اور سخت ترین قوم ہے، ان کے دو طبقے، یکے بعد دیگرے اُولیٰ اور اُخریٰ کے نام سے موسوم ہیں، ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا گیا، نافرمانی پر ہوا

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۶۶، والمظہری ج:۹ ص:۱۳۰

[۲] ترجمہ: پھول کے کان میں آپ نے کیا بات کہی ہے کہ وہ ہنس رہا ہے، عندلیب کو آپ نے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ رو رہی ہے۔

کے طوفان کا عذاب آیا، پوری قوم ہلاک ہوئی، قومِ نوح علیہ السلام کے بعد عذاب سے ہلاک ہونے والی یہ پہلی قوم ہے۔ (مظہری) [1] اور ثمود بھی انہی کی نظیر دوسری شاخ ہے، جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا گیا، ان کی نافرمانی کرنے والوں پر سخت آواز کا عذاب آیا، جس سے اُن کے کلیجے پھٹ کر ہلاک ہوگئے۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوٰى ﴿۵۳﴾ مُؤْتَفِكَهْ کے لفظی معنی مُؤْتَلِفَهْ کے ہیں، یہ چند بستیاں اور شہر متصل تھے حضرت لوط علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، نافرمانی اور بے حیائی کے اعمال کی سزا میں ان کی بستیاں جبریلِ امین نے اُلٹ دیں۔

فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ یعنی ڈھانپ لیا اُن بستیوں کو جس چیز نے ڈھانپ لیا، مراد وہ پتھراؤ ہے جو بستیاں اُلٹنے کے بعد اُن پر کیا گیا، یہاں تک صحفِ موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کے حوالہ سے جو تعلیمات بیان کرنی تھیں وہ ختم ہوگئیں۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ تَمَارٰى کے معنی جھگڑا اور مخالفت کرنا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ خطاب ہر انسان کو ہے، کہ سابقہ آیات اور صحفِ موسیٰ وابراہیم علیہما السلام میں آئی ہوئی آیاتِ ربانی میں کوئی ذرا بھی غور وفکر کرے تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وحی اور تعلیمات کے حق ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور اقوامِ سابقہ کی ہلاکت وعذاب کے واقعات سن کر مخالفت سے باز آجانے کا اچھا موقع ملتا ہے جو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت میں جھگڑا اور خلاف کرتے رہوگے۔

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولٰى ﴿۵۶﴾ هٰذَا کا اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کی طرف ہے کہ یہ بھی پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں جو صراطِ مستقیم اور دین ودنیا کی فلاح پر مشتمل ہدایات لے کر آئے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔

أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ أَزِفَ بمعنی قَرُبَ آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ قریب آنے والی چیز قریب آپہنچی، جس کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ہٹانے والا نہیں، مراد اس سے قیامت ہے اس کا قریب آپہنچنا پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے ہے کہ امتِ محمدیہ اس کے بالکل آخر میں قیامت کے قریب ہے۔

أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ﴿۶۰﴾ هٰذَا الْحَدِيثِ سے مراد قرآن کریم ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کریم جیسا کلام الٰہی جو خود ایک معجزہ ہے تمہارے سامنے آچکا کیا اس پر بھی تم تعجب کرتے ہو اور بطور استہزاء کے ہنستے ہو، اور اپنی معصیت یا عمل میں کوتاہی پر روتے نہیں۔

وَأَنتُمْ سَامِدُونَ ﴿۶۱﴾ سمود کے معنی غفلت وبے فکری کے ہیں، سَامِدُونَ بمعنی غافلون ہے، اور ایک معنی سمود

---

[1] تفسیر المظہری ج: ۹ ص: ۱۳۲

کے گانے بجانے کے بھی آتے ہیں وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں۔ (کما فسّرہ بہ بعض الأئمة) [۱]

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ یعنی پچھلی آیات جو غور کرنے والے انسان کو عبرت و موعظت کا سبق دیتی ہیں اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم سب اللہ کے سامنے خشوع و تواضع کے ساتھ جھکو اور سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔

صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سورۂ نجم کی اس آیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ سب مسلمانوں اور مشرکوں نے اور تمام جن و انس نے سجدہ کیا۔ [۲] اور بخاری و مسلم ہی کی دُوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور اس میں سجدۂ تلاوت ادا کیا، اور آپ کے ساتھ سب حاضرینِ مجلس (مؤمنین و مشرکین) نے سجدہ کیا بجز ایک قریشی بوڑھے کے جس نے زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھا کر پیشانی سے لگالی، اور کہا کہ مجھے یہی کافی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ پھر میں نے اُس شخص کو حالتِ کفر میں مقتول پڑا ہوا دیکھا ہے۔ [۳] اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مسلمانوں کو تو سجدہ کرنا تھا ہی، جو مشرکین اُس وقت حاضر تھے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بھی کچھ ایسی حالت غالب کردی کہ سب سجدہ کرنے پر مجبور ہوگئے، گو اُس وقت اُن کا سجدہ بوجہ کفر کے کچھ ثواب نہ رکھتا تھا، مگر وہ بھی اپنا ایک اثر یہ چھوڑ گیا کہ بعد میں ان سب کو اسلام و ایمان کی توفیق ہوگئی، صرف ایک آدمی کفر پر مرا جس نے سجدہ سے گریز کیا تھا۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے یہ مذکور ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پوری پڑھی، مگر آپ نے سجدہ نہیں کیا، [۴] اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سجدہ واجب یا لازم نہیں، کیونکہ اس میں یہ اِحتمال ہے کہ آپ اس وقت باوضو نہ ہوں، یا کوئی دُوسرا عذر سجدہ کرنے سے مانع ہو، ایسی حالت میں فوری سجدہ کرنا ضروری نہیں، بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ النَّجْمِ بِعَوْنِهٖ وَحَمْدِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ لِغُرَّةِ الرَّبِيْعِ الثَّانِيْ ۱۳۹۱ھ فِيْ اُسْبُوْعٍ وَّاحِدٍ وَيَتْلُوْهُ تَفْسِيْرُ سُوْرَةِ الْقَمَرِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ وَلِيُّ التَّوْفِيْق

[۱] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۴۶۸

[۲] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة النجم، ج:۲ ص:۷۲۱

[۳] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة النجم، ج:۲ ص:۷۲۰، وصحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب سجود التلاوة ج:۱ ص:۲۱۵

[۴] صحيح البخاري، ابواب ما جاء في سجود القرآن وسنتها، باب من قرأ السجدة ولم يسجد ج:۱ ص:۱۴۶، وصحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب سجود التلاوة۔

سُوْرَةُ الْقَمَرِ

آیاتها ۵۵ (۵۴) سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ (۳۷) رکوعاتها ۳

سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچپن آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا

پاس آلگی قیامت اور پھٹ گیا چاند، اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹلا جائیں اور کہیں

سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ③

یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا، اور جھٹلایا اور چلے اپنی خوشی پر اور ہر کام ٹھہرا رکھا ہے وقت پر،

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ④ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ

اور پہنچ چکے ہیں ان کے پاس احوال جن میں ڈانٹ ہوسکتی ہے، پوری عقل کی بات ہے

وقف لازم

فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶

پھر اُن میں کام نہیں کرتے ڈر سُنانے والے، سوتو ہٹ آان کی طرف سے۔ جس دن پکارے پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف،

خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۝۷

آنکھیں جھکائے نکل پڑیں قبروں سے جیسے ٹڈی پھیلی ہوئی،

مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸

دوڑتے جائیں اس پکارنے والے کے پاس کہتے جائیں منکر یہ دن مشکل آیا

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قیامت قریب آ لگی ہے، اور چاند پھٹ گیا ہے۔ ۞۱ اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں، تو منہ موڑ لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک چلتا ہوا جادو ہے۔ ۞۲ انہوں نے حق کو جھٹلایا، اور اپنی خواہشات کے پیچھے چل نکلے۔ اور ہر کام کو آخر کسی ٹھکانے پر ٹک کر رہنا ہے۔ ۞۳ اور ان لوگوں کو (پچھلی قوموں کے) واقعات کی اتنی خبریں پہنچ چکی ہیں جن میں تنبیہ کا بڑا سامان تھا، ۞۴ دِل میں اُتر جانے والی دانائی کی باتیں تھیں، پھر بھی یہ تنبیہات (ان پر) کچھ کارگر نہیں ہو رہیں۔ ۞۵ لہٰذا (اے پیغمبر!) تم بھی ان کی پروا مت کرو۔ جس دن پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا، ۞۶ اُس دن یہ اپنی آنکھیں جھکائے قبروں سے اس طرح نکل کھڑے ہوں گے جیسے ہر طرف پھیلی ہوئی ٹڈیاں، ۞۷ دوڑے جا رہے ہوں گے اُسی پکارنے والے کی طرف! ـــــ یہی کافر (جو قیامت کا انکار کرتے تھے) کہیں گے کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے۔ ۞۸

خلاصۂ تفسیر

(ان کفار کے لئے زاجر یعنی غلطی پر متنبہ کرنے والا امر تو اعلیٰ درجہ کا متحقق ہے، چنانچہ) قیامت نزدیک آ پہنچی

(جس میں تکذیب پر بڑی مصیبت آئے گی) اور (اس اخبار قرب ساعت کا مصداق بھی واقع ہوگیا چنانچہ) چاند شق ہوگیا (اور اس سے قربِ قیامت کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ شقِ قمر معجزہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، جس سے آپ کی نبوّت ثابت ہوتی ہے اور نبی کا ہر قول صادق ہے، اس لئے ضروری ہے کہ قیامت کے قریب آنے کی خبر جو آپ نے دی ہے وہ بھی صادق ہے اس سے تحقق زاجر کا متعین ہوگیا) اور (اس کا مقتضا یہ تھا کہ) یہ لوگ (اس سے منزجر اور متاثر ہوتے لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے (یہ کنایہ ہے اس کے باطل ہونے سے کہ باطل کا اثر دیر تک قائم نہیں رہا کرتا، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝ [۱] (سبا)، مطلب یہ کہ قربِ قیامت سے نصیحت حاصل کرنا تو نبوّت محمدیہ کے اعتقاد پر موقوف ہے، یہ لوگ خود اس کی دلیل ہی کو نظر تامل سے نہیں دیکھتے اور اس کو باطل سمجھتے ہیں تو پھر اس سے اُن پر کیا اثر ہوتا) اور (اس اعراض اور بطلانِ دعویٰ معجزہ میں خود) ان لوگوں نے (باطل پر مصر ہو کر حق کو) جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی (یعنی ان کا اعراض کسی دلیل صحیح کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سبب اس اعراض کا ہوائے نفسانی کا اتباع اور از روئے عناد تکذیبِ حق ہے) اور (یہ جو معجزات کو جادو کہتے ہیں جس کا اثر جلد زائل ہو جایا کرتا ہے سو قاعدہ یہ ہے کہ) ہر بات کو (بعد چندے اپنی اصلی حالت پر آ کر) قرار آ جاتا ہے (یعنی حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا، اسباب و آثار سے عام طور پر متعین ہو جاتا ہے، مطلب یہ کہ گو واقع میں تو فی الحال بھی حق متعین اور واضح ہے، مگر کم فہموں کی سمجھ میں اگر اب نہیں آتا تو بعد چندے تو اُن کو بھی ظاہر ہو سکتا ہے، بشرطیکہ غور سے کام لیں تو چند روز کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سحر فانی ہے یا حق باقی ہے) اور (اس زاجر مذکور کے علاوہ) ان لوگوں کے پاس (تو امم ماضیہ کی بھی) خبریں اتنی پہنچ چکی ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت یعنی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی (حاصل ہوسکتی) ہے سو (ان کی یہ کیفیت ہے کہ) خوف دلانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں (اور جب یہ حال ہے) تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے (جب وہ وقت قیامت اور عذاب کا جس سے اُن کو ڈرایا جاتا ہے آ جائے گا تو خود معلوم ہو جائے گا، آگے اس روز کا بیان ہے، یعنی) جس روز ایک بلانے والا فرشتہ (ان کو) ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا ان کی آنکھیں (مارے ذلت اور ہیبت کے) جھکی ہوئی ہوں گی (اور) قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے، (اور پھر نکل کر) بلانے والے کی طرف (یعنی موقفِ حساب کی طرف جہاں جمع ہونے کے لئے بلانے والے نے پکارا ہے) دوڑے چلے جا رہے ہوں گے (اور وہاں کی سختیاں دیکھ کر) کافر کہتے ہوں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

---

[۱] ترجمہ: اور باطل نہ کرنے کا نہ دھرنے کا۔

معارف و مسائل

پچھلی سورت (النجم) اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ الخ پر ختم ہوئی ہے جس میں قیامت کے قریب آجانے کا ذکر ہے، اس سورت کو شروع اسی مضمون سے کیا گیا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ، آگے قربِ قیامت کی ایک دلیل معجزہ انشقاقِ قمر کا ذکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ علاماتِ قیامت جن کی بڑی تفصیل ہے ان میں سے ایک بڑی علامت تو خود حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوّت ہے، جیسا کہ حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ میرا آنا اور قیامت اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں،[1] اور بھی چند روایاتِ حدیث میں آپ کا قیامت کے قریب ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اسی طرح ایک بڑی علامت قیامت کی یہ بھی ہے کہ آپ کے معجزہ کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے ہو کر الگ الگ ہو جائیں گے پھر باہم جڑ جائیں گے، نیز معجزۂ شق القمر اس حیثیت سے بھی قیامت کی علامت ہے کہ جس طرح اُس وقت چاند کے دو ٹکڑے اللہ کی قدرت سے ہو گئے قیامت میں سارے ہی سیاروں اور ستاروں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا کوئی امر مستبعد نہیں۔

معجزہ شق القمر

کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوّت و رسالت کے لئے کوئی نشانی معجزہ کی طلب کی، حق تعالیٰ نے آپ کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ معجزہ شق القمر ظاہر فرمایا، اس معجزہ کا ثبوت قرآن کریم کی اس آیت میں بھی موجود ہے وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ ، اور احادیثِ صحیحہ جو صحابۂ کرام کی ایک جماعت کی روایت سے آئی ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، جبیر بن مطعم، ابن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم، وغیرہ شامل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود اپنا اس وقت میں موجود ہونا اور معجزے کا مشاہدہ کرنا بھی بیان فرماتے ہیں،[2] امام طحاوی اور ابنِ کثیر رحمہما اللہ نے واقعۂ شق القمر کی روایات کو متواتر قرار دیا ہے،[3] اس لئے اس معجزۂ نبوی کا وقوع قطعی دلائل سے ثابت ہے۔

واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے مقامِ منیٰ میں تشریف رکھتے تھے، مشرکینِ مکہ نے آپ سے نبوّت کی نشانی طلب کی، یہ واقعہ ایک چاندنی رات کا ہے، حق تعالیٰ نے یہ کھلا ہوا معجزہ دکھلا دیا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو کر ایک مشرق کی طرف دُوسرا مغرب کی طرف چلا گیا، اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان میں پہاڑ حائل نظر آنے لگا،

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بعثت أنا والسّاعة کهاتین، ج:۲ ص:۹۶۳

[2] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ القمر ج:۲ ص:۱۶۴

[3] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۴۷۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرین سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو، جب سب لوگوں نے صاف طور پر یہ معجزہ دیکھ لیا تو یہ دونوں ٹکڑے پھر آپس میں مل گئے، اس کھلے ہوئے معجزہ کا انکار تو کسی آنکھوں والے سے ممکن نہ ہوسکتا تھا، مگر مشرکین کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے جہان پر جادو نہیں کر سکتے، اطرافِ ملک سے آنے والے لوگوں کا انتظار کرو، وہ کیا کہتے ہیں؟ بیہقی اور ابوداؤد طیالسی کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ بعد میں تمام اطراف سے آنے والے مسافروں سے ان لوگوں نے تحقیق کی تو سب نے ایسا ہی چاند کے دو ٹکڑے دیکھنے کا اعتراف کیا۔ [۱]

بعض روایات میں ہے کہ یہ معجزۂ شق القمر مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ پیش آیا، مگر روایاتِ صحیحہ سے ایک ہی مرتبہ کا ثبوت ملتا ہے (بیان القرآن) [۲] اس معاملے سے متعلق چند روایاتِ حدیث یہ ہیں (جو تفسیر ابنِ کثیر سے لی گئی ہیں):-

۱- صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ:-

اِنَّ اَهْلَ مَكَّةَ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّرِيَهُمْ آيَةً فَاَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّيْنِ حَتّٰى رَاَوْا حِرَاءَ بَيْنَهُمَا۔ (بخاری ومسلم) [۳]

"یعنی اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اپنی نبوّت کے لئے کوئی نشانی (معجزہ) دکھلائیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھلا دیا، یہاں تک کہ انہوں نے جبلِ حراء کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا۔"

۲- صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شِقَّيْنِ حَتّٰى نَظَرُوْا اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوْا۔ [۴]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں چاند شق ہوا اور دو ٹکڑے ہو گئے جس کو سب نے صاف طور سے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ شہادت دو۔

اور ابن جریر نے بھی اپنی سند سے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنٰى فَانْشَقَّ الْقَمَرُ فَاَخَذَتْ فِرْقَةٌ خَلْفَ الْجَبَلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوْا

---

[۱] مسند الطیالسی، رقم الحدیث: ۲۸۹، ودلائل النبوة للبیهقیؒ، رقم الحدیث: ۵۶۵

[۲] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج: ۱۱ ص: ۸۲

[۳] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب سؤال المشرکین ان یریهم النبی صلی الله علیه وسلم آیةً ...إلخ ج: ۱ ص: ۵۱۳

[۴] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب سؤال المشرکین ان یریهم النبی صلی الله علیه وسلم آیةً ...إلخ ج: ۱ ص: ۵۱۳، وصحیح مسلم، کتاب صفة القیامة، باب إنشقاق القمر، ومسند احمد، مسند عبدالله بن مسعود رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۳۵۸۳

اشْهَدُوْا (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اچانک چاند کے دوٹکڑے ہوگئے، اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گواہی دو، گواہی دو)۔ [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی روایت سے ابوداؤد طیالسی نے اور بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَكَّةَ حَتّٰى صَارَ فِرْقَتَيْنِ فَقَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ اَهْلُ مَكَّةَ هٰذَا سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهٖ اِبْنُ اَبِىْ كَبْشَةَ اُنْظُرُوْا السُّفَّارَ فَاِنْ كَانُوْا رَاَوْا مَا رَاَيْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ وَاِنْ كَانُوْا لَمْ يَرَوْا مِثْلَ مَا رَاَيْتُمْ فَهُوَ سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهٖ فَسُئِلَ السُّفَّارُ قَالَ وَقَدِمُوْا مِنْ كُلِّ جِهَةٍ فَقَالُوْا رَاَيْنَا۔ (ابن کثیر) [۲]

"مکہ مکرمہ (کے قیام کے زمانہ) میں چاند شق ہوکر دوٹکڑے ہوگیا، کفارِ قریش کہنے لگے کہ یہ جادو ہے ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر جادو کردیا ہے، اس لئے تم انتظار کرو باہر سے آنے والے مسافروں کا، اگر انہوں نے بھی یہ دوٹکڑے چاند کے دیکھے ہیں تو انہوں نے سچ کہا ہے اور اگر باہر کے لوگوں نے ایسا نہیں دیکھا تو پھر یہ بے شک جادو ہی ہوگا، پھر باہر سے آنے والے مسافروں سے تحقیق کی جو ہر طرف سے آئے تھے، سب نے اعتراف کیا کہ ہم نے بھی یہ دوٹکڑے دیکھے ہیں۔"

شق القمر کے واقعہ پر کچھ شبہات اور جواب

اس پر ایک شبہ تو یونانی فلسفہ کے اصول کی بناء پر کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آسمان اور سیّارات میں خرق والتیام (یعنی شق ہونا اور جڑنا) ممکن نہیں، مگر یہ محض ان کا دعویٰ ہے اس پر جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ سب لچر اور بے بنیاد ہیں، اُن کا لغو و باطل ہونا متکلمینِ اسلام نے بہت واضح کردیا ہے، اور آج تک کسی عقلی دلیل سے شقِ قمر کا محال اور ناممکن ہونا ثابت نہیں ہوسکا، ہاں ناواقف عوام ہر مستبعد چیز کو ناممکن کہنے لگتے ہیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ معجزہ تو نام ہی اس فعل کا ہے جو عام عادت کے خلاف اور عام لوگوں کی قدرت سے خارج حیرت انگیز و مستبعد ہو، ورنہ معمولی کام جو ہر وقت ہوسکے اُسے کون معجزہ کہے گا؟

دُوسرا عامیانہ شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہوتا تو پوری دُنیا کی تاریخوں میں اس کا ذِکر ہوتا، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ معظّمہ میں رات کے وقت پیش آیا ہے، اُس وقت بہت سے ممالک میں تو دن ہوگا

---

[۱] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآية ج:۲۲ ص:۵۲۶

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۷۲، ومسند ابی داؤد الطیالسی، رقم الحدیث:۲۸۹، ودلائل النبوة للبیهقی رقم الحدیث:۵۶۵

وہاں اس واقعے کے نمایاں اور ظاہر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، اور بعض ممالک میں نصف شب اور آخر شب میں ہوگا، جس وقت عام دُنیا سوتی ہے، اور جاگنے والے بھی تو ہر وقت چاند کو نہیں تکتے رہتے، زمین پر پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کے دو ٹکڑے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، جس کی وجہ سے کسی کو اس طرف توجہ ہوتی، پھر یہ تھوڑی دیر کا قصہ تھا، روزمرّہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی ملک میں چاند گہن ہوتا ہے، اور آج کل تو پہلے سے اس کے اعلانات بھی ہوجاتے ہیں، اس کے باوجود ہزاروں لاکھوں آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا، تو کیا اس کی یہ دلیل بنائی جاسکتی ہے کہ چاند گہن ہوا ہی نہیں، اس لئے دنیا کی عام تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے اس واقعہ کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی مشہور و مستند ''تاریخ فرشتہ'' میں اس کا ذکر بھی موجود ہے، کہ ہندوستان میں مہاراجہ مالیبار نے یہ واقعہ بچشمِ خود دیکھا، اور اپنے روزنامچہ میں لکھوایا، اور یہی واقعہ ان کے مسلمان ہونے کا سبب بنا، اور اُوپر ابوداؤد طیالسی اور بیہقی کی روایات سے بھی یہ ثابت ہوچکا ہے کہ خود مشرکینِ مکہ نے بھی باہر کے لوگوں سے اس کی تحقیق کی تھی اور مختلف اطراف کے آنے والوں نے یہ واقعہ دیکھنے کی تصدیق کی تھی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ مُسْتَمِرٌّ کے مشہور معنی جو فارسی اور اُردو میں بھی معروف ہیں، وہ دیر تک اور دائم رہنے کے ہیں، مگر عربی زبان میں یہ لفظ مَرَّ اور اِسْتَمَرَّ کبھی گزر جانے اور ختم ہوجانے کے معنی میں بھی آتا ہے، ائمہ تفسیر میں سے مجاہد اور قتادہ نے اس جگہ یہی معنی بیان کئے ہیں، اس پر مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ یہ جادو کا اثر ہے جو دیر تک نہیں چلا کرتا خود ہی گزر جائے گا اور ختم ہوجائے گا اور ایک معنی مُسْتَمِرٌّ کے قوی وشدید کے بھی آتے ہیں، ابوالعالیہ اور ضحاک نے اس آیت میں مُسْتَمِرٌّ کی یہی تفسیر کی ہے اور مراد یہ ہوگی کہ یہ بڑا قوی جادو ہے۔

اہلِ مکہ جب اس مشاہدہ کی تکذیب نہ کرسکے تو اس کو جادو یا سخت جادو کہہ کر اپنے دلوں کو تسلی دینے لگے۔

وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ استقرار کے لغوی معنی قرار پکڑنے کے ہیں، مفہوم آیت کا یہ ہے کہ ہر کام اور ہر چیز اپنی غایت پر پہنچ کر آخرکار صاف ہوجاتی ہے، کسی جعل سازی سے جو پردہ حقیقت پر ڈالا جاتا ہے وہ انجام کار کھل کر رہتا ہے، اور حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح ہوجاتا ہے۔

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ، مُّهْطِعِيْنَ کے لفظی معنی سر اٹھا ہونے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ بلانے والے کی آواز کی سمت میں دیکھتے ہوئے محشر کی طرف دوڑیں گے، اور اس سے پہلی آیت میں جو خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ آیا ہے جس کے معنی ہیں نگاہ اور سر جھکانے کے، ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ محشر کے مواقف مختلف ہوں گے، کسی موقف میں ایسا بھی ہوگا کہ سب کے سر جھکے ہوئے ہوں گے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۝٩

جھٹلا چکی ہے اُن سے پہلے نوح کی قوم پھر جھوٹا کہا ہمارے بندہ کو اور بولے دیوانہ ہے اور جھڑک لیا اس کو

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝١٠ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ

پھر پکارا اپنے ربّ کو کہ میں عاجز ہوگیا ہوں تو بدلہ لے، پھر ہم نے کھول دیئے دہانے آسمان کے

بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝١١ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓي اَمْرٍ

پانی ٹوٹ کر برسنے والے سے اور بہادیئے زمین سے چشمے پھر مل گیا سب پانی ایک کام پر

قَدْ قُدِرَ ۝١٢ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝١٣ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا

جو ٹھہر چکا تھا، اور ہم نے اس کو سوار کردیا ایک تختوں اور کیلوں والی پر، بہتی تھی ہماری آنکھوں کے سامنے

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝١٤ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٥

بدلہ لینے کو اس کی طرف سے جس کی قدر نہ جانی تھی، اور اس کو ہم نے رہنے دیا نشانی کے لئے پھر کوئی ہے سوچنے والا،

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝١٦ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، اور ہم نے آسان کردیا قرآن سمجھنے کو

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٧

پھر ہے کوئی سوچنے والا

آسان ترجمۂ قرآن

ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی جھٹلانے کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اُنہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا، اور کہا کہ:

''یہ دیوانے ہیں'' اور اُنہیں دھمکیاں دی گئیں۔ ⑨ اس پر اُنہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ: ''میں بے بس ہو چکا ہوں، اب آپ ہی بدلہ لیجئے۔'' ⑩ چنانچہ ہم نے ٹوٹ کر برسنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے، ⑪ اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح (دونوں قسم کا) سارا پانی اُس کام کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔ ⑫ اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا، ⑬ جو ہماری نگرانی میں رواں دواں تھی، تاکہ اُس (پیغمبر) کا بدلہ لیا جائے جس کی ناقدری کی گئی تھی۔ ⑭ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس کو (عبرت کی) ایک نشانی بنا دیا۔ تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ ⑮ اب سوچو کہ میرا عذاب اور میری تنبیہات کیسی تھیں؟ ⑯ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ ⑰

خلاصۂ تفسیر

ان لوگوں سے پہلے قومِ نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندہ (خاص نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی اور کہا کہ یہ مجنون ہیں اور (محض اس قول بیہودہ ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ان سے ایک بیہودہ فعل بھی سرزد ہوا یعنی) نوح (علیہ السلام) کو (ان کی طرف سے) دھمکی (بھی) دی گئی (جس کا ذکر سورۂ شعراء میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ [1]) تو نوح (علیہ السلام) نے اپنے ربّ سے دعاء کی کہ میں (محض) درماندہ ہوں، (ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا) سو آپ (ان سے) انتقام لے لیجئے (یعنی اُن کو ہلاک کر دیجئے، کقولہ تعالیٰ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ [2] (نوح)) پس ہم نے کثرت سے برسنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے، اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے پھر (آسمان اور زمین کا) پانی اس کام کے (پورا ہونے کے) لئے مل گیا جو (علمِ الٰہی میں) تجویز ہو چکا تھا (مراد اس کام سے ہلاکت ہے کفار کی، یعنی دونوں پانی مل کر طوفان بڑھا، جس میں سب غرق ہو گئے) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے) تختوں اور میخوں والی کشتی پر جو کہ ہماری نگرانی میں (پانی کی سطح پر) رواں تھی (مع مؤمنین کے) سوار کیا یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا جس کی بے قدری کی گئی تھی (مراد نوح علیہ السلام ہیں اور چونکہ رسول اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تلازم ہے، اس میں کفر باللہ بھی آ گیا، پس یہ شبہ نہ رہا کہ یہ غرق کفر باللہ کے سبب نہ ہوا تھا) اور ہم نے اس واقعہ کو عبرت کے واسطے (حکایات اور تذکروں میں) رہنے دیا، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (مقصود اس سے ترغیب ہے تذکر کی) پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا ہوا (یعنی جس چیز

[1] ترجمہ: اگر تم اے نوح باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

[2] ترجمہ: اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ۔

سے ڈرانا واقع ہوا تھا وہ کیسا پورا ہو کر رہا تو اس ڈرانے کا حاصل بھی عذاب ہی ہو گیا، غرض عذابِ الٰہی کے دو عنوان ہو گئے، ایک خود عذاب اور دوسرا وعدۂ الٰہی کا پورا ہونا) اور ہم نے قرآن کو (جو کہ مشتمل ہے ایسے قصصِ مذکورہ پر) نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا (سب کے لئے عموماً بوجہ واضح ہونے بیان کے اور عرب کے لئے خصوصاً بوجہ عربی زبان کے) سو کیا (اس قرآن میں ایسے مضامین نصیحت کے دیکھ کر) کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (یعنی کفار مکہ کو بالخصوص ان قصص سے ڈر جانا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝ وَازْدُجِرَ کے لفظی معنی ہیں ڈانٹ دیا گیا (اس کا عطف لفظ قَالُوْا پر ہے اس لئے) مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو مجنون بھی کہا اور پھر ان کو ڈانٹ دھمکا کر تبلیغِ رسالت سے روکنا بھی چاہا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے کہ ان لوگوں نے نوح علیہ السلام کو یہ دھمکی دی کہ اگر آپ اپنی تبلیغ و دعوت سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو پتھراؤ کر کے مار دیں گے۔

عبد بن حُمیدؒ نے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کے بعض لوگ جب حضرت نوح کو کہیں پاتے تو بعض اوقات ان کا گلا گھونٹ دیتے تھے یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو جاتے، پھر جب افاقہ ہوتا تو اللہ سے یہ دُعا کرتے تھے کہ یا اللہ میری قوم کو معاف کر دے، وہ حقیقت سے ناواقف ہیں۔[1] ساڑھے نو سو سال قوم کی ایسی ایذاؤں کا جواب دُعاؤں سے دے کر گزارنے کے بعد آخر میں عاجز ہو کر بددُعا کی، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے، جس کے نتیجے میں یہ پوری قوم غرق کی گئی۔

فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ یعنی زمین سے اُبلنے والا پانی اور آسمان سے برسنے والا پانی دونوں اس انداز پر مل گئے جس سے اللہ تعالیٰ کا مقدّر کیا ہوا فیصلہ کہ پوری قوم غرق ہو جائے نافذ ہو گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک بھی کسی کو پناہ نہ ملی۔

ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ اَلْوَاحٌ، لَوْحٌ کی جمع ہے بمعنی تختی، اور دُسُر، دِسَارٌ کی جمع ہے، جس کے معنی میخ اور مسمار کے بھی آتے ہیں، اور اس ڈورے یا تار کو بھی کہا جاتا ہے جس سے کشتی کے تختے جوڑے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ لِلذِّكْرِ، ذِکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت و عبرت حاصل کرنے کے بھی، یہ دونوں معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں، کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو

[1] الزهد للإمام احمد بن حنبل، رقم الحديث: ۲۸۰، وتفسير المظهری ج: ۹ ص: ۱۳۷

حفظ کرنے کے لئے آسان کر دیا، یہ بات اس سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی کہ پوری کتاب توراۃ یا انجیل یا زبور لوگوں کو برزبان یاد ہو، اور یہ حق تعالیٰ ہی کی تیسیر اور آسانی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پورے قرآن کو ایسا حفظ کر لیتے ہیں کہ ایک زیر زبر کا فرق نہیں آتا، چودہ سو برس سے ہر زمانے، ہر طبقے، ہر خطے میں ہزاروں لاکھوں حافظوں کے سینوں میں یہ اللہ کی کتاب محفوظ ہے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اپنے مضامینِ عبرت و نصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم و ماہر، فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اسی طرح ہر عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت و نصیحت کے مضامین قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔

حفظ کرنے اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان کیا گیا ہے نہ کہ اِجتہاد اور اِستنباطِ اَحکام کے لئے

اس آیت میں یَسَّرْنَا کے ساتھ لِلذِّکْرِ کی قید لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کر دیا گیا ہے، جس سے ہر عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل اور اَحکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صَرف کرنے والے علماء راسخین کو ہی حصہ ملتا ہے ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو قرآنِ کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم، اس کے اُصول و قواعد سے حاصل کئے بغیر، مجتہد بننا اور اپنی رائے سے اَحکام و مسائل کا اِستخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، ہم نے بھیجی اُن پر ہوا

صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ

تند ایک نحوست کے دن جو چلے گئے، اکھاڑ مارا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی

مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

اُکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، اور ہم نے آسان کردیا قرآن سمجھنے کو

ع ۲۲ ۸ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ ع كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا

پھر ہے کوئی سوچنے والا، جھٹلایا ثمود نے ڈر سُنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا

نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا

ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو تو ہم غلطی میں پڑے اور سودا میں، کیا اُتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾

کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے، بڑائی مارتا ہے، اب جان لیں گے کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا،

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ ز وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ

ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ، اور سنادے اُن کو کہ

الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ

پانی کا بانٹا ہے ان میں ہر باری پر پہنچنا چاہئے، پھر پکارا انہوں نے اپنے رفیق کو

فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا، پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، ہم نے بھیجی اُن پر

صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

ایک چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کردیا قرآن سمجھنے کو

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

پھر ہے کوئی سوچنے والا، جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈر سنانے والوں کو، ہم نے بھیجی اُن پر

حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ

آندھی پتھر برسانے والی سوائے لوط کے گھر کے ان کو ہم نے بچادیا پچھلی رات سے، فضل سے اپنی طرف کے

كَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا

ہم یوں بدلہ دیتے ہیں اس کو جو حق مانے، اور وہ ڈرا چکا تھا ان کو ہماری پکڑ سے پھر لگے مکرانے

بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِىْ

ڈرانے کو، اور اس سے لینے لگے اس کے مہمانوں کو پس ہم نے مٹادیں اُن کی آنکھیں اب چکھو میرا عذاب

وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِىْ

اور میرا ڈرانا، اور پڑا ان پر صبح کو سویرے عذاب جو ٹھہر چکا تھا، اب چکھو میرا عذاب

وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ ع

اور میرا ڈرانا، اور ہم نے آسان کردیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا،

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ

اور پہنچے فرعون والوں کے پاس ڈرانے والے، جھٹلایا انہوں نے ہماری نشانیوں کو سب کو پھر پکڑا ہم نے ان کو

اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾

پکڑنا زبردست کا قابو میں لے کر۔

آسان ترجمۂ قرآن

عاد کی قوم نے بھی تنبیہ کرنے والوں کو جھٹلانے کا رویہ اختیار کیا، پھر دیکھ لو کہ میرا عذاب اور میری تنبیہات کیسی تھیں؟ (۱۸) ہم نے ایک مسلسل نحوست کے دن میں اُن پر تیز آندھی والی ہوا چھوڑ دی تھی، (۱۹) جو لوگوں کو اس طرح اُکھاڑ پھینک دیتی تھی جیسے وہ کھجور کے اُکھڑے ہوئے درخت کے تنے ہوں۔ (۲۰) اب سوچو کہ میرا عذاب اور میری تنبیہات کیسی تھیں؟ (۲۱) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ (۲۲) ثمود کی قوم نے بھی تنبیہ کرنے والوں کو جھٹلانے کا رویہ اختیار کیا۔ (۲۳) چنانچہ کہنے لگے کہ: "کیا ہم اپنے ہی میں سے ایک تنہا آدمی کے پیچھے چل پڑیں؟ ایسا کریں گے تو یقیناً ہم بڑی گمراہی اور دیوانگی میں جا پڑیں گے۔ (۲۴) بھلا کیا ہم سارے لوگوں کے درمیان یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر نصیحت نازل کی گئی؟ نہیں! بلکہ دراصل یہ پرلے درجے کا جھوٹا شیخی باز شخص ہے۔" (۲۵) (ہم نے پیغمبر صالح علیہ السلام سے کہا کہ:) "کل ہی انہیں پتہ چل جائے گا کہ پرلے درجے کا جھوٹا شیخی باز کون تھا؟ (۲۶) ہم ان کے پاس ان کی آزمائش کے طور پر اُونٹنی بھیج رہے ہیں، اس لئے تم انہیں دیکھتے رہو، اور صبر سے کام لو، (۲۷) اور ان کو بتادو کہ (کنویں کا) پانی اُن کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر پانی کا حق دار اپنی باری میں حاضر ہوگا۔" (۲۸) پھر انہوں نے اپنے آدمی کو بلایا، چنانچہ اُس نے ہاتھ بڑھایا، اور (اُونٹنی کو) قتل کر ڈالا۔ (۲۹) اب سوچو کہ میرا عذاب اور میری تنبیہات کیسی تھیں؟ (۳۰) ہم نے اُن پر بس ایک ہی چنگھاڑ بھیجی، جس سے وہ ایسے ہو کر رہ گئے جیسے کانٹوں کی روندی ہوئی باڑھ ہوتی ہے۔ (۳۱) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ (۳۲) لوط کی قوم نے (بھی) تنبیہ کرنے والوں کو جھٹلایا۔ (۳۳) ہم نے اُن پر پتھروں کا مینہ برسایا، سوائے لوط کے گھر والوں کے جنہیں ہم نے سحری کے وقت بچالیا تھا، (۳۴) یہ ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ جو لوگ شکر گذار ہوتے ہیں، اُن کو ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ (۳۵) اور لوط نے اُن لوگوں کو ہماری پکڑ سے ڈرایا تھا، لیکن وہ ساری تنبیہات میں مین میکھ نکالتے رہے۔ (۳۶) اور اُنہوں نے لوط کو اُن کے مہمانوں کے بارے میں پھسلانے کی کوشش کی، جس پر ہم نے اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا کہ: "چکھو میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ! (۳۷) اور صبح سویرے اُن پر ایسا عذاب حملہ آور ہوا جو جم کر رہ گیا (۳۸) کہ: "چکھو میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ!" (۳۹) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ (۴۰) اور فرعون کے خاندان کے پاس بھی تنبیہات آئیں، (۴۱) اُنہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلا دیا تھا، اس لئے ہم نے اُن کو ایسی پکڑ میں لیا جیسی ایک زبردست قدرت والے کی پکڑ ہوتی ہے۔ (۴۲)

خلاصۂ تفسیر

عادنے (بھی اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی سو (اس کا قصہ سنو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا، (اور وہ قصہ یہ ہے کہ) ہم نے اُن پر ایک سخت ہوا بھیجی ایک مسلسل نحوست کے دن میں (یعنی وہ زمانہ اُن کے حق میں ہمیشہ کے لئے اس لئے منحوس رہا کہ اس روز جو عذاب آیا وہ عذاب برزخ سے متصل ہوگیا، پھر عذاب آخرت اس سے متصل ہوگیا، جو اُن سے کبھی قطع نہ ہوگا اور) وہ ہوا لوگوں کو اس طرح (ان کی جگہ سے) اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اُکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں (اس تشبیہ میں علاوہ اُن کے پھینکے جانے کے اشارہ ان کے طولِ قامت کی طرف بھی ہے) سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا (ہولناک) ہوا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے، ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب مستلزم ہے سب پیغمبروں کی تکذیب کو) اور کہنے لگے کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے، اور (حشم وخدم سے) اکیلا ہے (یعنی یا تو فرشتہ ہوتا تو ہم دین میں اتباع کرتے، یا صاحبِ خدَم وحشم ہوتا تو دنیوی امور میں اتباع کرتے جبکہ بشر ہے اور وہ بھی اکیلا، نہ تو اتباع فی الدنیا کو کوئی امر مقتضی ہے نہ اتباع فی الدین کو اور اگر ہم اس حالت میں اتباع کریں) تو اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور (بلکہ) جنون میں پڑ جائیں کیا ہم سب میں سے (منتخب ہوکر) اسی (شخص) پر وحی نازل ہوئی ہے (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا اور شیخی باز ہے (شیخی یعنی تکبر کے مارے ایسی باتیں بڑائی کی کرتا ہے، کہ لوگ مجھ کو سردار قرار دے لیں، حق تعالیٰ نے صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے بکنے پر رنج مت کرو) اُن کو عنقریب (مرتے ہی) معلوم ہوجائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا (یعنی یہی لوگ تھے کہ انکار نبوّت میں کاذب تھے، اور اتباعِ نبی سے بوجہ شیخی کے عار کرتے تھے، اور یہ لوگ جو اونٹنی کا معجزہ طلب کرتے تھے تو) ہم (ان کی درخواست کے موافق پتھر میں سے) اونٹنی کو نکالنے والے ہیں، اُن کی آزمائش (ایمان) کے لئے سو ان (کی حرکتوں) کو دیکھتے بھالتے رہنا اور صبر سے بیٹھے رہنا اور ان لوگوں کو (جب اونٹنی پیدا ہوتو) یہ بتلا دینا کہ پانی (کنویں کا) بانٹ دیا گیا ہے، (یعنی تمہارے مواشی اور اونٹنی کی باری مقرر ہوگئی ہے) ہر ایک باری پر باری والا حاضر ہوا کرے (یعنی اونٹنی اپنی باری میں پانی پیوے اور مواشی اپنی باری میں، چنانچہ اونٹنی پیدا ہوئی، اور صالح علیہ السلام نے اسی طرح فرمادیا) سو (اس باری سے وہ لوگ تنگ آگئے اور) انہوں نے (اس کے قتل کرنے کی غرض سے) اپنے رفیق (قُدَار) کو بلایا سو اس نے (اونٹنی پر) وار کیا اور (اس کو) مار ڈالا سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا (جس

کا بیان آگے آتا ہے وہ یہ کہ) ہم نے ان پر ایک ہی نعرہ (فرشتہ کا) مسلط کیا سو وہ (اس سے) ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے (کی باڑ) کا چورا (یعنی کھیت یا مواشی وغیرہ کی حفاظت کے لئے جیسے کانٹوں وغیرہ کی باڑ لگا دیتے ہیں اور چند روز بعد سب چورا چورا ہو جاتا ہے اسی طرح وہ ہلاک وتباہ ہو گئے، عرب کے لوگ اس مشبّہ بہ کو یعنی کھیت کے گرد کی باڑ کو شب وروز دیکھتے تھے تو وہ اس تشبیہ کو خوب سمجھتے تھے) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے، قومِ لوط نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک نبی کی تکذیب مستلزم ہے سب کی تکذیب کو) ہم نے اُن پر پتھروں کا مینہ برسایا بجز متعلقینِ لوط (علیہ السلام) کے (یعنی بجز مؤمنین کے) کہ ان کو اخیر شب میں (بستی سے باہر کر کے عذاب سے) بچا لیا اپنی جانب سے فضل کر کے جو شکر کرتا ہے (یعنی ایمان لاتا ہے) ہم اس کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ قہر سے بچا لیتے ہیں) اور (قبل عذاب آنے کے) لوط (علیہ السلام) نے اُن کو ہماری دارو گیر سے ڈرایا تھا، سو انہوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کئے (یعنی یقین نہ لائے) اور (جب لوط علیہ السلام کے پاس ہمارے فرشتے بشکل مہمان آئے اور ان لوگوں کو حسین لڑکوں کا آنا معلوم ہوا تو یہاں آ کر) ان لوگوں نے لوط (علیہ السلام) سے ان کے مہمانوں کو بُری نیت سے لینا چاہا (جس سے لوط علیہ السلام اوّل گھبرائے مگر وہ فرشتے تھے) سو ہم نے (ان فرشتوں کو حکم دے کر) ان کی آنکھیں چوپٹ کر دیں (یعنی جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پَر اُن کی آنکھوں پر پھیر دیئے جس سے اندھے بھٹ ہو گئے، كذا في الدر عن قتادة [1] اور بزبان قال یا حال اُن سے کہا گیا کہ) لو میرے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو (پہلے تو یہ واقعہ طُمس یعنی اندھے کرنے کا پیش آیا) اور (پھر) صبح سویرے ہی ان پر دائمی عذاب آ پہنچا (اور ارشاد ہوا) کہ لو میرے ڈرانے اور عذاب کا مزہ چکھو (یہی جملہ پہلے اندھے ہونے کے عذاب پر کہا گیا تھا یہاں ہلاکت کے عذاب پر ہے، اس لئے کوئی تکرار نہیں) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے اور (فرعون اور) فرعون والوں کے پاس بھی ڈرانے کی بہت سی چیزیں پہنچیں (مراد موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور معجزات ہیں کہ ارشادات سے تشریعی طور پر اور معجزات سے تکوینی طور پر ان کو ڈرایا گیا مگر) ان لوگوں نے ہماری تمام (ان) نشانیوں (کو جو اُن کے پاس آئی تھیں وہ آیات تسعہ (نو آیتیں، مشہور ہیں) جھٹلایا (یعنی اُن کے مدلول ومقتضا توحیدِ الٰہی اور نبوّت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا، ورنہ واقعات کے وقوع کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی) سو ہم نے ان کو زبردست صاحبِ قدرت کا پکڑنا پکڑا (یعنی جب ہم نے ان کو قہر اور غلبہ سے پکڑا تو اس پکڑ کو کوئی دفع نہیں کر سکا، پس عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے)۔

---

[1] الدر المنثور ج: ۹ ص: ۳۴۵

معارف و مسائل

بعض لغات کی تشریح

سُعُر، یہ لفظ آیاتِ مذکورہ میں دو جگہ آیا ہے، اوّل قومِ ثمود کے ذکر میں ان کا اپنا قول ہے، اس میں سُعُر کا لفظ جنون کے معنی میں آیا ہے، دوسری جگہ یہی لفظ آگے آنے والی آیات میں حق تعالیٰ کی طرف سے عذابِ مجرمین کے ذکر میں آیا ہے، فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ؀ یہاں سُعُر کے معنی جہنم کی آگ کے ہیں، حسبِ تصریح اہلِ لغت لفظ سُعُر ان دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ، مُرَاوَدَتْ کے معنی کسی کو اپنی نفسانی شہوت پورا کرنے کے لئے بہلانا پھسلانا ہے، مراد یہ ہے کہ قوم لوط علیہ السلام چونکہ اپنی خباثت سے لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کے خوگر تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان ہی کے لئے فرشتوں کو حسین اَمْرَدْ لڑکوں کی صورت میں بھیجا تھا، یہ شیاطین ان کو اپنی خواہش کا نشانہ بنانے کے لئے لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے، لوط علیہ السلام نے دروازہ بند کر لیا تو یہ دروازہ توڑ کر یا اوپر سے پھلانگ کر اندر آنے لگے، حضرت لوط علیہ السلام پریشان ہوئے تو اس وقت فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کیا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہم اللہ کے فرشتے اُن کو عذاب دینے ہی کے لئے آئے ہیں۔

سورۂ قمر کو قربِ قیامت کے ذکر سے شروع کیا گیا، تاکہ کفار و مشرکین جو دنیا کی ہوا و ہوس میں مبتلا اور آخرت سے غافل ہیں وہ ہوش میں آئیں، پہلے قیامت کے عذاب کا بیان کیا گیا، اس کے بعد دنیا میں بھی ان کے انجامِ بد کو بتلانے کے لئے پانچ مشہور عالم اقوام کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت پر ان کے انجامِ بد اور دنیا میں بھی طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہونا بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے قومِ نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا، کیونکہ یہی سب سے پہلی دنیا کی قوم ہے جو عذابِ الٰہی میں پکڑی گئی، یہ قصہ سابقہ آیات میں آچکا ہے، مذکور الصدر آیات میں چار اقوام کا ذکر ہے، عاد، ثمود، قومِ لوط، قومِ فرعون، ان کے واقعات اور مفصل قصے قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بیان ہوئے ہیں، یہاں ان کا اجمالی ذکر ہے۔

یہ پانچوں اقوام دنیا کی قوی ترین اور قابو یافتہ قومیں تھیں، جن کو کسی طاقت سے رام کرنا کسی کے لئے آسان نہ تھا، آیاتِ مذکورہ میں اُن پر اللہ کا عذاب آنا دکھلایا گیا، اور ہر ایک قوم کے انجام پر قرآن کریم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا (فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ) یعنی اتنی بڑی قوی اور بھاری تعداد والی قوم پر جب اللہ کا عذاب آیا تو دیکھو کہ وہ کس طرح اس عذاب

کے سامنے مکھیوں، مچھروں کی طرح مارے گئے، اور اس کے ساتھ ہی مؤمنین و کفار کی عام نصیحت کے لئے اس جملے کو بار بار دُہرایا گیا، وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ، یعنی اللہ کے اس عذاب عظیم سے بچنے کا راستہ قرآن ہے، اور قرآن کو نصیحت و عبرت حاصل کرنے کی حد تک ہم نے بہت آسان کر دیا ہے، بڑا بدنصیب اور محروم ہے جو اس سے فائدہ نہ اٹھائے، آگے آنے والی آیات میں زمانۂ نبوّت کے موجودین کو خطاب کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ اس زمانے کے منکرین و کفار دولت و ثروت، تعداد، طاقت و قوّت میں عاد و ثمود اور قومِ فرعون وغیرہ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں، پھر یہ کیسے بےفکر بیٹھے ہیں۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

اب تم میں جو منکر ہیں کیا یہ بہتر ہیں ان سب سے یا تمہارے لئے فارغ خطی لکھ دی گئی ورقوں میں، کیا کہتے ہیں

نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾

ہم سب کا مجمع ہے بدلہ لینے والا، اب شکست کھائے گا یہ مجمع اور بھاگیں گے پیٹھ پھیر کر،

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ

بلکہ قیامت ہے ان کے وعدہ کا وقت اور وہ گھڑی بڑی آفت ہے اور بہت کڑوی، جو لوگ گنہگار ہیں

فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا

وقف لازم

غلطی میں پڑے ہیں اور سودا میں، جس دن گھسیٹے جائیں گے آگ میں اوندھے منہ، چکھو

مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ

مزہ آگ کا، ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر، اور ہمارا کام تو یہی ایک دم کی بات ہے

كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾

جیسے لپک نگاہ کی، اور ہم برباد کر چکے ہیں تمہارے ساتھ والوں کو، پھر ہے کوئی سوچنے والا،

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝۵۲ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَّكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳

اور جو چیز انہوں نے کی ہے لکھی گئی ورقوں میں اور ہر چھوٹا اور بڑا لکھا جاچکا،

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝۵۴ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵ ع

جو لوگ ڈرنے والے ہیں باغوں میں ہیں اور نہروں میں، بیٹھے سچی بیٹھک میں نزدیک بادشاہ کے جس کا سب پر قبضہ ہے

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تمہارے یہ کافر لوگ اُن سے اچھے ہیں، یا تمہارے لئے (خدا کی) کتابوں میں کوئی بے گناہی کا پروانہ لکھا ہوا ہے؟ ۝۴۳ یا ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایسی جمعیت ہیں جو اپنا بچاؤ آپ کر لے گی؟ ۝۴۴ (حقیقت تو یہ ہے کہ) اس جمعیت کو عنقریب شکست ہو جائے گی، اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ ۝۴۵ یہی نہیں، بلکہ ان کے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے، اور قیامت اور زیادہ مصیبت اور کہیں زیادہ کڑوی ہوگی۔ ۝۴۶ حقیقت یہ ہے کہ یہ مجرم لوگ بڑی گمراہی اور بے عقلی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۝۴۷ جس دن ان کو منہ کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا، (اُس دن انہیں ہوش آئے گا، اور ان سے کہا جائے گا کہ:) ''چکھو دوزخ کے چھونے کا مزہ!'' ۝۴۸ ہم نے ہر چیز کو ناپ تول کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ۝۴۹ اور ہمارا حکم بس ایک ہی مرتبہ آنکھ جھپکنے کی طرح (پورا) ہو جاتا ہے۔ ۝۵۰ اور تمہارے ہم مشرب لوگوں کو ہم پہلے ہی ہلاک کر چکے ہیں۔ اب بتاؤ، ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے؟ ۝۵۱ اور جو جو کام انہوں نے کئے ہیں، وہ سب اعمال ناموں میں درج ہیں، ۝۵۲ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔ ۝۵۳ (البتہ) جن لوگوں نے تقویٰ کی رَوِش اپنا رکھی ہے، وہ باغات اور نہروں میں ہوں گے، ۝۵۴ ایک سچی عزت والی نشست میں! ـــــ اُس بادشاہ کے پاس جس کے قبضے میں سارا اقتدار ہے! ۝۵۵

خلاصۂ تفسیر

(یہ کفار کے قصے اور کفر کی وجہ سے ان پر عذاب ہونے کے واقعات تو تم نے سن لئے اب جبکہ تم بھی اسی جرمِ کفر کے مرتکب ہو تو تمہارے عذاب سے بچنے کی کوئی وجہ نہیں) کیا تم میں جو کافر ہیں ان میں ان (مذکورہ پچھلے) لوگوں سے کچھ فضیلت ہے (جس کی وجہ سے تم باوجود ارتکابِ جرم کے سزایاب نہ ہو) یا تمہارے لئے (آسمانی) کتابوں میں کوئی معافی (نامہ لکھ دیا) ہے (گو کوئی خاص فضیلت نہ ہو) یا (ان میں کوئی ایسی قوّت ہے جو اُن کو عذاب سے بچالے جیسا) یہ لوگ

کہتے ہیں کہ ہماری ایسی جماعت ہے جو غالب ہی رہیں گے (اور جبکہ ان کے مغلوب ہونے کے دلائل واضحہ موجود ہیں اور خود بھی اپنی مغلوبیت کا اُن کو یقین ہے تو پھر ایسی بات کہنا اس کو مستلزم ہے کہ ان میں کوئی ایسی قوت ہے جو عذاب کو روک سکتی ہے، یہ تین احتمال ہیں عذاب سے بچنے کے بتاؤ کہ ان میں سے کون سی صورت واقع میں ہے، پہلے دو احتمالوں کا بطلان تو ظاہر و باہر ہے، رہا تیسرا احتمال سو اسبابِ عادیہ کے اعتبار سے گو فی نفسہٖ ممکن ہے مگر بدلالتِ دلائل وقوع اس کا نہ ہوگا، بلکہ اس کے عکس کا وقوع ہوگا، جس سے اُن کا کذب ظاہر ہو جائے گا اور وہ عکس کا وقوع اس طرح ہوگا کہ) عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے (اور یہ پیشین گوئی بدر و احزاب وغیرہ میں واقع ہوئی، اور یہی نہیں کہ اس دنیوی عذاب پر بس ہو کر رہ جائے گا) بلکہ (عذاب اکبر) قیامت (میں ہوگا کہ) ان کا (اصل) وعدہ (وہی) ہے اور قیامت (کو کوئی ہلکی چیز نہ سمجھو بلکہ وہ) بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے (اور یہ موعود اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿٤٦﴾ ضرور واقع ہونے والا ہے اور اس کے وقوع کے انکار میں) یہ مجرمین (یعنی کفار) بڑی غلطی اور بے عقلی میں (پڑے) ہیں (اور وہ غلطی ان کو عنقریب جب علم الیقین مبدل بہ عین الیقین ہوگا ظاہر ہو جائے گی، اور وہ اس طرح ہوگا کہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں گھسیٹے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو (اور اگر ان کو اس سے شبہ ہو کہ قیامت ابھی کیوں نہیں واقع ہوتی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ) ہم نے ہر چیز کو (باعتبار زمان وغیرہ کے ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے (جو ہمارے علم میں ہے، یعنی زمانہ وغیرہ اس کا اپنے علم میں معین و مقدر کیا ہے، اسی طرح قیامت کے وقوع کے لئے بھی ایک وقت معین ہے، پس اس کا عدمِ وقوع فی الحال بوجہ اس کے وقت نہ آنے کے ہے، یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ قیامت کا وقوع ہی نہ ہوگا) اور (جب اس کا وقت آجائے گا تو اس وقت) ہمارا حکم (اس وقوع کے متعلق) بس ایسا یکبارگی ہو جائے گا جیسے آنکھ کا جھپکانا (غرض وقوع کی نفی تو باطل ٹھہری) اور (اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ ہمارا طریقہ اللہ کے نزدیک ناپسند اور مبغوض نہیں ہے تو اگر قیامت کا وقوع بھی ہو تب بھی ہم کو کوئی فکر نہیں، تو اس باب میں سن رکھو کہ) ہم تمہارے ہم طریقہ لوگوں کو (اپنے عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں (جو دلیل ہے اس طریقہ کے مبغوض ہونے کی اور وہی تمہارا طریقہ ہے اس لئے مبغوض ہے، اور یہ دلیل نہایت واضح ہے) سو کیا (اس دلیل سے) کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے اور (یہ بھی نہیں ہے کہ اُن کے اعمال علمِ الٰہی سے غائب رہ جائیں، جس کی وجہ سے اللہ کے نزدیک ان کے طریقہ کے مبغوض ہونے کے باوجود سزا سے بچ جانے کا احتمال ہو بلکہ) جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں سب (حق تعالیٰ کو معلوم ہے) اعمال ناموں میں (بھی مندرج) ہے اور (یہ نہیں کہ کچھ لکھ لیا گیا ہو کچھ رہ گیا ہو بلکہ) ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے (پس وقوعِ عذاب میں کوئی شبہ نہ رہا یہ تو کفار کا حال ہوا اور جو) پرہیزگار لوگ (ہیں وہ بہشت کے) باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے، ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس (یعنی جنت کے ساتھ قرب حق تعالیٰ بھی ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تشریح

زُبُر ، زَبور کی جمع ہے، لغت میں ہر لکھی ہوئی کتاب کو زَبور کہتے ہیں، اور اس خاص کتاب کا نام بھی زَبور ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

اَدْهٰى وَ اَمَرُّ (۴۶) **اَدْهٰى** کے معنی زیادہ ہیبت ناک اور **اَمَرُّ** ، مُرٌّ سے ماخوذ ہے، جس کے اصلی معنی کڑوے کے ہیں، اور ہر سخت اور تکلیف دہ چیز کو بھی مُرٌّ اور اَمَرٌّ کہہ دیا جاتا ہے، **فِىْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ** (۴۷) **ضَلَالٌ** کے معنی معروف ہیں گمراہی، اور **سُعُرٌ** کے معنی اس جگہ جہنم کی آگ کے ہیں، **اَشْيَاعَكُمْ** ، **اشیاع** شیعہ کی جمع ہے، جس کے معنی متبع اور پیروکار کے ہیں، مراد وہ لوگ ہیں جو عمل میں اُن کے متبع یا مثل ہیں، **مَقْعَدِ صِدْقٍ** ، **مَقْعَدٌ** کے معنی مجلس اور مقام کے ہیں، اور **صدق** بمعنی حق ہے، مراد یہ ہے کہ یہ مجلس حق ہوگی جس میں کوئی لغو و بیہودہ بات نہ ہوگی۔

اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹) **قَدْرٌ** کے لغوی معنی اندازہ کرنے اور کسی چیز کو حکمت و مصلحت کے مطابق اندازے سے بنانے کے ہیں، اس آیت میں یہ لغوی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے عالم کی تمام مخلوقات کو اور اس کی ہر نوع وصنف کو ایک حکیمانہ انداز سے بڑا چھوٹا اور مختلف ہیئت وصورت میں بنایا ہے، پھر ہر نوع وصنف کے ہر فرد کی تخلیق میں بھی حکیمانہ انداز بڑی حکمت کے ساتھ رکھا ہے، انگلیاں سب یکساں نہیں بنائیں، طول میں فرق رکھا، ہاتھوں پاؤں کے طول وعرض اور اُن کے کھلنے بند ہونے سمٹنے اور پھیلنے کے لئے اِسپرنگ لگائے، ایک ایک عضو کے ایک ایک جزء کو دیکھو تو قدرت وحکمتِ خداوندی کے عجیب وغریب دروازے کھلتے نظر آنے لگیں۔

اور اِصطلاحِ شرع میں لفظ **قَدْرٌ** بمعنی تقدیرِ الٰہی بھی استعمال ہوتا ہے، اور اکثر ائمۂ تفسیر نے بعض روایاتِ حدیث کی بناء پر اس آیت میں **قَدْرٌ** سے تقدیرِ الٰہی مراد لی ہے۔

مسند احمد، مسلم، ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ مشرکین قریش ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق مخاصمت کرنے لگے، تو اس پر یہ آیتِ قرآن نازل ہوئی، [1] اس معنی کے اعتبار سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہم نے تمام عالم کی ایک ایک چیز کو اپنی تقدیر ازلی کے مطابق بنایا ہے، یعنی ازل میں پیدا ہونے

[1] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب کل شیء بقدر ج:۲ ص:۳۳۶، وجامع الترمذی، ابواب القدر، باب ما جاء فی الرضا بالقضاء ج:۲ ص:۳۷، ومسند احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالٰی عنہ رقم الحدیث: ۹۷۳۶

والی چیز اور اس کی مقدار زمانہ و مکان اور اس کے بڑھنے گھٹنے کا پیمانہ عالم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا، جو کچھ عالم میں پیدا ہوتا ہے وہ اسی تقدیر ازلی کے مطابق ہوتا ہے

تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے، اس کا منکر کافر، اور جو فرقے بتاویل انکار کرتے ہیں وہ فاسق ہیں۔ امام احمد، ابوداؤد، طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر اُمت میں کچھ لوگ مجوسی ہوتے ہیں، اس اُمتِ محمدیہ کے مجوسی وہ لوگ ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں، ایسے لوگ بیمار پڑیں تو ان کی بیمار پُرسی کو نہ جاؤ اور مر جائیں تو اُن کے کفن دفن میں شریک نہ ہو۔ (از روح المعانی)[1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

بِعَوْنِ اللهِ سُبْحَانَهٗ وَبِحَمْدِهٖ سُوْرَةُ الْقَمَرِ
يَوْمَ الثَّلَاثَاءِ لِسِتَّةٍ مِّنَ الرَّبِيْعِ الثَّانِيْ ۱۳۹۱ھ
وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَآءَ اللهُ تَعَالٰى سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ۔

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج: ۲۰ ص: ۱۰۳، وسنن ابی داوٗد، کتاب السُّنَّة، باب فی القدر، ج: ۲ ص: ۶۴۴، ومسند احمد، مسند عبدالله بن عمر رضی الله تعالٰی عنهما، رقم الحدیث: ۵۵۸۴

سُوْرَةُ الرَّحْمٰن

اٰیاتھا ۷۸ | ۵۵ سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ ۹۷ | رکوعاتھا ۳

سورۂ رحمٰن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④

رحمٰن نے سکھلایا قرآن، بنایا آدمی، پھر سکھلایا اس کو بات کرنا،

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ⑤ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ⑥

سورج اور چاند کے لئے ایک حساب ہے، اور جھاڑ اور درخت مشغول ہیں سجدہ میں،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ⑦ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ⑧

اور آسمان کو اونچا کیا اور رکھی ترازو، کہ زیادتی نہ کرو ترازو میں،

وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾ وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا

اور سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو، اور زمین کو بچھایا

لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّ النَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَ الْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ

واسطے خلق کے، اس میں میوہ ہے اور کھجوریں جن کے میوہ پر غلاف، اور اس میں اناج ہے جس کے ساتھ بھُس ہے

وَ الرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ

اور پھول خوشبودار، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں، بنایا آدمی کو

مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾

کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا، اور بنایا جن کو آگ کی لپٹ سے،

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں، مالک دو مشرقوں کا اور مالک دو مغربوں کا،

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، چلائے دو دریا مل کر چلنے والے،

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾

ان دونوں میں ہے ایک پردہ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے،

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

نکلتا ہے ان دونوں سے موتی اور مونگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے،

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ

اور اسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے دریا میں جیسے پہاڑ، پھر کیا کیا نعمتیں

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

وہ رحمٰن ہی ہے ﴿۱﴾ جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ ﴿۲﴾ اُسی نے انسان کو پیدا کیا، ﴿۳﴾ اُسی نے اُس کو بات واضح کرنا سکھایا۔ ﴿۴﴾ سورج اور چاند ایک حساب میں جکڑے ہوئے ہیں، ﴿۵﴾ اور بیلیں اور درخت سب اُس کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ﴿۶﴾ اور آسمان کو اُسی نے بلند کیا ہے، اور اُسی نے ترازو قائم کی ہے، ﴿۷﴾ کہ تم تولنے میں ظلم نہ کرو۔ ﴿۸﴾ اور اِنصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو، اور تول میں کمی نہ کرو۔ ﴿۹﴾ اور زمین کو اُسی نے ساری مخلوقات کے لئے بنایا ہے، ﴿۱۰﴾ اُسی میں میوے اور کھجور کے گابھوں والے درخت بھی ہیں، ﴿۱۱﴾ اور بھوسے والا غلہ اور خوشبودار پھول بھی۔ ﴿۱۲﴾ (اے انسانو اور جنّات!) اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۳﴾ اُسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا، ﴿۱۴﴾ اور جنّات کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا، ﴿۱۵﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۶﴾ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار وہی ہے۔ ﴿۱۷﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۸﴾ اُسی نے دو سمندروں کو اس طرح چلایا کہ وہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں، ﴿۱۹﴾ (پھر بھی) اُن کے درمیان ایک آڑ ہوتی ہے کہ وہ دونوں اپنی حد سے بڑھتے نہیں۔ ﴿۲۰﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۱﴾ ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے، ﴿۲۲﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۳﴾ اور اُسی کے قبضے میں وہ جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اُونچے کھڑے کئے گئے ہیں۔ ﴿۲۴﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۵﴾

ربطِ سورت اور جملہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا کے تکرار کی حکمت

اس سے پہلی سورت القمر میں زیادہ تر مضامین سرکش قوموں پر عذابِ الٰہی آنے کے متعلق تھے اسی لئے ہر ایک عذاب کے بعد لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے ایک خاص جملہ بار بار استعمال فرمایا ہے، یعنی فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ، اور اس کے متصل ایمان واطاعت کی ترغیب کے لئے دُوسرا جملہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ بار بار لایا گیا ہے۔

سورۃ الرحمٰن میں اس کے مقابل بیشتر مضامین حق تعالیٰ کی دنیوی اور اُخروی نعمتوں کے بیان میں ہیں، اسی لئے جب کسی خاص نعمت کا ذکر فرمایا تو ایک جملہ لوگوں کو متنبہ کرنے اور شکرِ نعمت کی ترغیب دینے کے لئے فرمایا فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، اور پوری سورت میں یہ جملہ اکتیس مرتبہ لایا گیا ہے، جو بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے، اور کسی لفظ یا جملے کا تکرار بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے، اس لئے وہ بھی فصاحت و بلاغت کے خلاف نہیں، خصوصاً قرآن کریم کی ان دونوں سورتوں میں جس جملے کا تکرار ہوا ہے وہ تو صورت کے اعتبار سے تکرار ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہر ایک جملہ ایک نئے مضمون سے متعلق ہونے کی وجہ سے مکرر محض نہیں ہے، کیونکہ سورۂ قمر میں ہر نئے عذاب کے بعد اس کے متعلق (فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ) آیا ہے، اسی طرح سورۂ رحمٰن میں ہر نئی نعمت کے بیان کے بعد (فَبِاَيِّ اٰلَآءِ) کا تکرار کیا گیا ہے جو ایک نئے مضمون کے متعلق ہونے کے سبب تکرار محض نہیں، علامہ سیوطی نے اس قسم کے تکرار کا نام تردید بتلایا ہے، وہ فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں مستحسن اور شیریں سمجھا گیا ہے، نثر اور نظم دونوں میں استعمال ہوتا ہے، اور صرف عربی نہیں، فارسی، اُردو وغیرہ زبانوں کے مسلّم شعراء کے کلام میں بھی اس کی نظائر پائی جاتی ہیں، یہ موقع ان کو جمع کرنے کا نہیں، تفسیر روح المعانی وغیرہ میں اس جگہ متعدد نظائر بھی نقل کئے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

رحمٰن (کی بے شمار نعمتیں ہیں ان میں سے ایک روحانی نعمت یہ ہے کہ اسی) نے (اپنے بندوں کو اَحکام) قرآن کی تعلیم دی (یعنی قرآن نازل کیا کہ اس کے بندے اس کے اوپر ایمان لائیں، اور اس کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کریں تاکہ دائمی عیش وراحت کا سامان حاصل ہو اور اس کی ایک نعمتِ جسمانی ہے وہ یہ کہ) اسی نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھلائی (جس پر ہزاروں منافع مرتب ہوتے ہیں، من جملہ ان کے قرآن کا دوسرے کی زبان سے پہنچنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، اور ایک نعمت جسمانی آفاقی یہ ہے کہ اس کے حکم سے) سورج اور چاند حساب کے ساتھ (چلتے) ہیں، اور بے تنہ کے درخت اور تنہ دار درخت دونوں (اللہ کے) مطیع ہیں (سورج چاند کا چلنا تو اس لئے نعمت ہے کہ اس پر

لیل ونہار سردی گرمی، ماہ وسال کا حساب مرتب ہوتا ہے اوران کے منافع ظاہر ہیں اور درختوں کا سجدہ اس لئے نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسان کے لئے بے شمار منافع کی تخلیق فرمائی ہے) اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے آسمان کو اونچا کیا (جس سے علاوہ دوسرے منافع متعلقہ بالسماء کے بڑی منفعت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان کے بنانے والے کی عظمت شان پر استدلال کرے، کما قال تعالیٰ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ إلخ [1] (آل عمران:۱۹۱)) اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے (دنیا میں) ترازو رکھ دی تا کہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور (جب یہ ایسی بڑی منفعت کے لئے موضوع ہے کہ یہ آلہ ہے حقوق کے لین دین کو پورا کرنے کا، جس سے ہزاروں مفاسد ظاہری و باطنی دُور ہو جاتے ہیں، تو تم اس نعمت کا خصوصیت کے ساتھ شکر کرو، اور (اس شکر یہ میں سے یہ بھی ہے کہ) انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے خلقت کے (فائدہ کے) واسطے زمین کو (اس کی جگہ) رکھ دیا کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے پھل) پر غلاف (چڑھا) ہوتا ہے اور (اس میں) غلہ ہے جس میں بھوسہ (بھی) ہوتا ہے اور (اس میں) اور غذا کی چیز (بھی) ہے (جیسے بہت سی ترکاریاں وغیرہ) سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یعنی منکر ہونا بڑی ہٹ دھرمی اور بدیہیات بلکہ محسوسات کا انکار ہے، اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے انسان (کی اصل اوّل یعنی آدم علیہ السلام) کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح (کھن کھن) بجتی تھی پیدا کیا (جس کا اجمالاً چند آیت میں اوپر ذکر آیا ہے) اور جنّات (کی اصل اوّل) کو خالص آگ سے (جس میں دُھواں نہ تھا) پیدا کیا، (اور پھر دونوں نوع میں توالد وتناسل کے ذریعہ سے نسل چلی، شرح اس کی سورۂ حجر کے رکوع دوم میں آ چکی ہے) سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (مراد اس کی اوپر گزری ہے اور) وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک (حقیقی) ہے (مراد اس سے سورج اور چاند کے طلوع وغروب کا افق ہے اس میں بھی وجہ نعمت ظاہر ہے کہ لیل ونہار کے افتتاح واختتام کے ساتھ بہت سے اغراض متعلق ہیں) سوائے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں (اور حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان میں ایک حجاب (قدرتی) ہے کہ (اس کی وجہ سے) دونوں (اپنے اپنے موقع سے) بڑھ نہیں سکتے (جس کی شرح سورۂ فرقان کے ختم سے ڈیڑھ رکوع قبل گزری ہے اور آبِ شور وآبِ شیریں کے منافع بھی ظاہر ہیں، اور دونوں کے ملنے میں نعمت استدلال بھی ہے) سوائے جن وانس (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور بحرین کے متعلق

---

[1] ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

ایک یہ نعمت ہے کہ) ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے (موتی، مونگے کے منافع اور وجوہِ نعمت ہونا ظاہر ہے) سو اے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی کے (اختیار اور مِلک میں) ہیں جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (نظر آتے) ہیں (ان کی منفعت بھی ظاہر بلکہ اظہر ہے) سواے جن وانس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت وعظمت کے) تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

معارف ومسائل

سورۂ رحمٰن کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، امام قرطبی نے چند روایاتِ حدیث کی وجہ سے مکی ہونے کو ترجیح دی ہے، ترمذی میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے سامنے سورۂ رحمٰن پوری تلاوت فرمائی، یہ لوگ سن کر خاموش رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے لیلۃ الجن میں جنات کے سامنے یہ سورت تلاوت کی تو اثر قبول کرنے کے اعتبار سے وہ تم سے بہتر رہے، کیونکہ جب میں قرآن کے اس جملے پر پہنچتا تھا: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تو جنات سب کے سب بول اُٹھتے تھے: لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِّعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ۔ ''یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی کسی بھی نعمت کی تکذیب وناشکری نہ کریں گے، آپ ہی کے لئے حمد ہے۔'' [۱] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے، کیونکہ لیلۃ الجنّ وہ رات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو تبلیغ وتعلیم فرمائی مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے۔

اسی طرح کی اور بھی چند روایات قرطبی نے نقل کی ہیں جن سے اس سورت کا مکی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ [۲]

اس سورت کو لفظ رحمٰن سے شروع کیا گیا اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ کفارِ مکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے رحمٰن سے واقف نہ تھے، اسی لئے کہتے تھے وَمَا الرَّحْمٰنُ (الفرقان:۶۰) کہ رحمٰن کیا چیز ہے، ان لوگوں کو واقف کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے یہاں رحمٰن کا انتخاب کیا گیا۔

دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آگے جو کام رحمٰن کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی تعلیمِ قرآن، اس میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اس تعلیمِ قرآن کا مقتضی اور سببِ داعی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، ورنہ اس کے ذمہ کوئی کام واجب وضروری نہیں، جس کا اس سے سوال کیا جا سکے، اور نہ وہ کسی کا محتاج ہے۔

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الرحمٰن ج:۲ ص:۱۶۴

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۱۵۱

آگے پوری سورت میں حق تعالیٰ کی دُنیوی اور دینی نعمتوں کا ذکر مسلسل ہوا ہے، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت ہے اس کے ذکر سے ابتدا کی گئی، اور سب سے بڑی نعمت قرآن ہے، کیونکہ قرآنِ کریم انسان کے معاش اور معاد، دین اور دنیا دونوں کی خیرات و برکات کا جامع ہے، جنہوں نے قرآن کو لیا اور اس کا حق ادا کیا، جیسے صحابۂ کرامؓ حق تعالیٰ نے ان کو آخرت کے درجات اور نعمتوں سے تو سرفراز فرمایا ہی ہے، دنیا میں بھی وہ درجہ اور مقام عطا فرمایا جو بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں۔

قاعدے کے مطابق لفظ ''عَلَّمَ'' کے دو مفعول ہوتے ہیں، ایک وہ علم جو سکھایا جائے، دوسرے وہ شخص جس کو سکھایا جائے۔ یہاں آیت میں وہ چیز تو بتلادی گئی جو سکھائی گئی ہے، یعنی قرآن، دوسرا مفعول یعنی قرآن جس کو سکھایا گیا اس کا ذکر نہیں کیا۔ بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ بلاواسطہ حق تعالیٰ نے جن کو تعلیم دی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی مراد ہیں، پھر آپ کے واسطے سے ساری مخلوقات اس میں داخل ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تنزیلِ قرآن کا مقصد ساری ہی خلقِ خدا کو راہِ ہدایت دکھانا اور سب ہی کو اخلاق و اعمالِ صالحہ کا سکھانا ہے، اس لئے کسی خاص مفعول کی تخصیص نہیں کی گئی، دوسرا مفعول ذکر نہ کرنے سے اشارہ اسی عموم کی طرف ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ انسان کی تخلیق خود حق تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اور ترتیب طبعی کے اعتبار سے وہی سب سے مقدم ہے، یہاں تک کہ تعلیمِ قرآن جس کو پہلے ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ظاہر ہے کہ تخلیق کے بعد ہی ہوسکتی ہے، مگر قرآنِ حکیم نے نعمتِ تعلیمِ قرآن کو مقدم اور تخلیقِ انسان کو مؤخر کر کے اس طرف اشارہ کردیا کہ تخلیقِ انسان کا اصل مقصد ہی تعلیمِ قرآن اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات:۵۶) یعنی ''میں نے جن وانس کو صرف اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں۔'' اور ظاہر ہے کہ عبادت بغیر تعلیمِ الٰہی کے نہیں ہوسکتی، اسی کا ذریعہ قرآن ہے، اس لئے اس حیثیت میں تعلیمِ قرآن تخلیقِ انسان سے مقدم ہوگئی۔

تخلیقِ انسان کے بعد جو نعمتیں انسان کو عطا ہوئیں، وہ بے شمار ہیں، ان میں خاص طور پر تعلیمِ بیان کو یہاں ذکر فرمانے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن نعمتوں کا تعلق انسان کے نشو و نما اور وجود و بقا سے ہے، مثلاً کھانا پینا، سردی گرمی سے بچنے کا سامان، رہنے بسنے کا انتظام وغیرہ، ان نعمتوں میں تو ہر جاندار انسان اور حیوان شریک ہے، وہ نعمتیں جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اُن میں سے پہلے تو تعلیمِ قرآن کا ذکر فرمایا، اس کے بعد تعلیمِ بیان کا، کیونکہ تعلیمِ قرآن کا افادہ واستفادہ ''بیان'' پر موقوف ہے۔

اور ''بیان'' میں زبانی بیان بھی داخل ہے، تحریر وخط اور اِفہام وتفہیم کے جتنے ذرائع حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے

ہیں، وہ ''بیان'' کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اور پھر مختلف خطّوں، مختلف قوموں کی مختلف زبانیں اور اُن کے محاورات سب اسی تعلیمِ بیان کے اجزا ہیں جو: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا [1] (البقرة:۳۱) کی عملی تفسیر ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ انسان کے لئے حق تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس آیت میں علویات میں سے شمس وقمر کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لئے کیا ہے کہ عالمِ دنیا کا سارا نظام کار ان دونوں سیاروں کی حرکات اور ان کی شعاعوں سے وابستہ ہے۔ اور لفظ ''حُسْبَان'' بضم الحاء بعض حضرات نے فرمایا کہ حساب کے معنے میں مصدر ہے، جیسے: ''غُفْرَانْ، سُبْحَانْ، قُرْآنْ'' اور بعض نے فرمایا کہ حساب کی جمع ہے، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ شمس وقمر کی حرکات جن پر انسانی زندگی کے تمام کاروبار موقوف ہیں، رات دن کا اختلاف، موسموں کی تبدیلی، سال اور مہینوں کی تعیین، ان کی تمام حرکات اور دوروں کا نظامِ محکم ایک خاص حساب اور اندازے کے مطابق چل رہا ہے۔ اور اگر ''حُسْبَان'' کو حساب کی جمع قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذرہ کا الگ الگ حساب ہے، مختلف قسم کے حسابوں پر یہ نظامِ شمسی اور قمری چل رہا ہے، اور حساب بھی ایسا محکم و مضبوط کہ لاکھوں سال سے اس میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔

یہ زمانہ سائنس کی معراج کا زمانہ کہا جاتا ہے اور اس کی حیرت انگیز نئی نئی ایجادوں نے عقلاء کو حیران کر رکھا ہے، لیکن انسانی مصنوعات اور ربّانی تخلیقات کا کھلا ہوا فرق ہر دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ انسانی مصنوعات میں بگاڑ اور سنوار کا سلسلہ ایک لازمی امر ہے، مشین کوئی کتنی ہی مضبوط و مستحکم ہو، کچھ عرصے کے بعد اس کو مرمت کی اور کم از کم گریس وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس وقت تک کے لئے وہ مشین معطل رہتی ہے، حق تعالیٰ کی جاری کی ہوئی یہ عظیم الشان مخلوقات نہ کبھی مرمت کی محتاج ہیں نہ کبھی ان کی رفتار میں کوئی فرق آتا ہے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ نَجْم اس درخت کو کہا جاتا ہے جس کی بیل پھیلتی ہے، تنا نہیں ہوتا، اور شجر تنہ دار درخت کو کہتے ہیں، یعنی ہر قسم کے درخت خواہ بیل والے ہوں یا تنے اور شاخوں والے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ سجدہ کرنا چونکہ انتہائی تعظیم اور اطاعت کی علامت ہے، اس سے مراد یہاں یہ ہے کہ ہر ایک درخت، پودے اور بیل اور اس کے پتوں اور پھلوں اور پھولوں کو حق تعالیٰ نے جن خاص خاص کاموں اور انسان کے فوائد کے لئے بنایا ہے، اور گویا ہر ایک کی ایک ڈیوٹی مقرر کر دی ہے، کہ وہ فلاں کام کیا کرے، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگا ہوا

[1] ترجمہ: اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے اسماء کا۔

ہے اور حکمِ ربانی کے تابع، اس میں رکھے ہوئے فوائد اور خواص سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اسی تکوینی اور جبری اطاعتِ حق کو اس آیت میں سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (رُوح، مظہری) [1]

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ رفع اور وضع دو متقابل لفظ ہیں، رفع کے معنی اونچا اور بلند کرنے کے ہیں، اور وضع کے معنی نیچے رکھنے اور پست کرنے کے آتے ہیں۔ اس آیت میں اوّل آسمان کو بلند کرنے اور رفعت دینے کا ذکر ہے، جس میں ظاہری بلندی بھی داخل ہے، اور معنوی معنی درجہ اور رتبہ کی بلندی بھی کہ آسمان کا درجہ زمین کی نسبت بالا و برتر ہے، آسمان کا مقابل زمین سمجھی جاتی ہے، اور پورے قرآن میں اسی تقابل کے ساتھ آسمان و زمین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں رفعِ سماء کا ذکر کرنے کے بعد وضعِ میزان کا ذکر کیا گیا ہے، جو آسمان کے تقابل میں نہیں آتا، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی درحقیقت آسمان کے تقابل میں زمین کو لایا گیا ہے، جیسا کہ تین آیتوں کے بعد: وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ آیا ہے، تو دراصل تقابل رفعِ سماء اور وضعِ ارض ہی کا ہے، مگر ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز یعنی وضعِ میزان کا ذکر کسی خاص حکمت سے کیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمت اس میں یہ ہے کہ وضعِ میزان اور پھر اس کے بعد میزان کے صحیح صحیح استعمال کا حکم جو بعد کی تین آیتوں میں آیا ہے، اُن سب کا خلاصہ عدل و انصاف کا قائم کرنا ہے، اور کسی کی حق تلفی اور ظلم و جور سے بچانا ہے۔ یہاں رفعِ سماء اور وضعِ ارض کے درمیان آیات میزان کے ذکر میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق کی اصلی غایت و مقصود بھی عالم میں عدل و انصاف کا قیام ہے، اور زمین میں امن و امان بھی عدل و انصاف ہی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے، ورنہ فساد ہی فساد ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

لفظ "میزان" کی تفسیر اس آیت میں حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ، سدیؒ وغیرہ نے عدل سے کی ہے، کیونکہ میزان کا اصل مقصد عدل ہی ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے یہاں میزان کو اپنے معروف معنی میں لیا ہے، اور حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ حقوق میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے، اور میزان کے معنی میں ہر وہ آلہ داخل ہے جس سے کسی چیز کی مقدار معین کی جائے، خواہ وہ دو پلے والی ترازو ہو یا کوئی جدید آلۂ پیمائش۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ پہلی آیت میں جو میزان پیدا کرنے کا ذکر تھا، اس جملے میں اس کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے، تَطْغَوْا، طُغْيَانٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی بے انصافی اور ظلم کے ہیں، مراد یہ ہے کہ میزان کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ تم وزن میں کمی بیشی کر کے ظلم و جور میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ، قِسْط کے لفظی معنی انصاف کے ہیں، مراد ظاہر ہے کہ وزن کو ٹھیک ٹھیک قائم کرو انصاف کے ساتھ۔

---

[1] روح المعاني تحت هٰذه الآية ج:۲۰ ص:۱۱۵، والمظهري ج:۹ ص:۱۴۶

وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ خُسْرٌ کے معنی وزن میں کمی کرنے کے ہیں، جو بات پہلے جملے: وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ میں مثبت انداز سے بیان کی گئی ہے، یہ اُسی کا منفی پہلو ہے کہ وزن میں کم تولنا حرام ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ اَنَام بالفتح بروزن سَحَاب، ہر جاندار کو کہا جاتا ہے جو زمین پر رہتا چلتا ہے۔ (قاموس) [۱] بیضاوی نے ہر ذِی رُوح اس کا ترجمہ کیا ہے، [۲] اور ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں اَنَام سے مراد انسان اور جنات ہیں، کیونکہ کل ذِی رُوح ارواح میں سے یہی دونوں اَحکامِ شرعیہ کے مکلّف اور مامور ہیں، اور اس سورت میں بار بار انہی دونوں کو خطاب بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ "فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" میں یہی دونوں جن وانس مخاطب ہیں۔

فِيْهَا فَاكِهَةٌ فاکھۃ ہر ایسے میوے اور پھل کو کہا جاتا ہے جو عادۃً غذا کے بعد تفریحاً کھایا جاتا ہے۔

وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ اکمام، کِمّ بالکسر کی جمع ہے، جس کے معنی اس غلاف کے ہیں جو کھجور وغیرہ کے پھلوں پر ابتدا میں چڑھا ہوتا ہے۔

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ، لفظ حَبّ بفتح حاء وتشدید باء، دانے یعنی غلے کو کہا جاتا ہے، جیسے گندم، چنا، چاول، ماش، مسور وغیرہ۔ اور عَصْف اُس بھوسے کو کہتے ہیں جس کے اندر پیک کیا ہوا دانہ بقدرت خداوندی وحکمتِ بالغہ پیدا کیا جاتا ہے، عَصْف یعنی بھوسے کے غلاف میں پیک ہو کر خراب ہواؤں اور مکھی، مچھر وغیرہ سے پاک وصاف رہتا ہے، دانے کی پیدائش کے ساتھ ذُو الْعَصْفِ کا لفظ بڑھا کر غافل انسان کو اس طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ روٹی، دال وغیرہ جو وہ دن میں کئی مرتبہ کھاتا ہے، اس کا ایک ایک دانہ مالک وخالق نے کیسی کیسی صنعتِ عجیبہ کے ساتھ مٹی اور پانی سے پیدا کیا، اور پھر کس طرح اس کو حشرات الارض سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک ایک دانے پر غلاف چڑھایا، جب وہ تمہارا لقمۂ تر بنا۔ اس کے ساتھ شاید عَصْف کو ذکر کرنے سے ایک دوسری نعمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ یہ عَصْف (بھوسہ) تمہارے مواشی کی غذا بنتا ہے، جن کا تم دُودھ پیتے ہو، اور سواری وباربرداری کی خدمت اُن سے لیتے ہو۔

وَالرَّيْحَانُ ۝ رَيْحَان کے مشہور معنی خوشبو کے ہیں، اور ابنِ زید نے یہی معنی آیت میں مراد لئے ہیں کہ اس نے زمین سے پیدا ہونے والے درختوں سے طرح طرح کی خوشبوئیں اور خوشبودار پھول پیدا فرمائے۔ اور کبھی لفظ رَيْحَان بمعنی مغز اور رزق بھی استعمال کیا جاتا ہے: خَرَجْتُ اَطْلُبُ رَيْحَانَ اللهِ۔ "یعنی میں نکلا اللہ کا رزق تلاش کرنے کے لئے" [۳] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں رَيْحَان کی تفسیر رزق ہی سے کی ہے۔

---

[۱] تاج العروس، فصل الهمزة ج:۱ ص:۲۱۵ / ۷

[۲] تفسير البيضاوي ج:۵ ص:۲۵۳

[۳] تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۱۵۷

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ لفظ آلاء جمع ہے نعمتوں کے معنے میں، اور مخاطب اس کا انسان اور جن ہیں، جس کا قرینہ سورۂ رحمٰن کی متعدد آیتوں میں جنات کا ذکر ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ انسان سے مراد اس جگہ باتفاق آدم علیہ السلام ہیں، جن کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، صَلْصَالٌ پانی میں ملی ہوئی مٹی جب کہ وہ خشک ہو جائے، اور فَخَّار وہ پانی میں ملائی ہوئی مٹی جس کو آگ پر پکا لیا جائے۔

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ جَانّ بتشدید نون، جنس جنات کو کہا جاتا ہے، اور مَارِجٍ آگ سے اُٹھنے والا شعلہ ہے، جنات کی تخلیق کا بڑا عنصر آگ کا شعلہ ہے، جیسا کہ انسان کی تخلیق میں بڑا جز مٹی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ سردی اور گرمی میں آفتاب کا مطلع بدلتا ہے، اس لئے سردی کے زمانے میں مشرق یعنی آفتاب کے نکلنے کی جگہ اور ہوتی ہے، اور گرمی کے زمانے میں دُوسری، انہی دونوں جگہوں کو آیت میں مشرقین سے تعبیر فرمایا ہے، اسی طرح اس کے بالمقابل مغربین فرمایا، کہ سردی میں غروبِ آفتاب کی جگہ اور ہوتی ہے اور گرمی میں دُوسری۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ، مَرَجَ کے لغوی معنی آزاد و بے قید چھوڑ دینے کے ہیں، اور بَحْرَيْنِ سے دو دریا شیریں اور نمکین مراد ہیں، زمین پر حق تعالیٰ نے دونوں قسم کے دریا پیدا فرمائے ہیں، اور بعض جگہ یہ دونوں مل جاتے ہیں، جس کی نظائر دنیا کے ہر خطے میں پائی جاتی ہیں۔ مگر جہاں دو دریا شیریں اور نمکین مل کر بہتے ہیں وہاں کافی دُور تک دونوں کا پانی الگ الگ ممتاز رہتا ہے، ایک طرف میٹھا، دُوسری طرف کھارا۔ اور بعض جگہ یہ صورت اوپر نیچے بھی ہوتی ہے، جہاں دریائے شور کسی شیریں دریا کے اوپر چڑھ آتا ہے وہاں بھی نیچے کا پانی اپنی جگہ شیریں ہوتا ہے، اور اوپر کا نمکین اور کھاری پانی باوجود دقیق اور لطیف ہونے کے ایک مسافت تک ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتا، الگ الگ اپنے ذائقہ کے ساتھ چلتا ہے، اسی قدرتِ حق تعالیٰ کے بیان کے لئے فرمایا: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ یعنی دونوں دریا ملتے ہیں، مگر ان کے درمیان قدرتِ خداوندی کا ایک پردہ حائل رہتا ہے جو دُور تک آپس میں ان کو ملنے نہیں دیتا۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ لُؤْلُؤ کے معنی موتی، اور مَرْجَانُ کے معنی مونگا، یہ بھی قیمتی جواہرات سے ہے۔ اس میں درخت کے مشابہ شاخیں ہوتی ہیں، یہ دونوں چیزیں دریا سے نکلتی ہیں مگر معروف یہ ہے کہ موتی اور جواہرات دریائے شور سے نکلتے ہیں، شیریں دریا سے نہیں۔ اس آیت میں دونوں سے نکلنا بیان فرمایا ہے۔ اس کی توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ موتی دونوں ہی دریاؤں میں پیدا ہوتے ہیں، مگر شیریں دریا سب جاری ہوتے ہیں، اُن سے موتی کا نکالنا آسان نہیں۔ اور شیریں دریا سب جا کر دریائے شور میں گر جاتے ہیں، وہیں سے موتی نکالے جاتے

ہیں، اس لئے موتیوں کا منبع دریائے شور کو کہا جاتا ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ جَوَارِیْ، جَارِیَۃٌ کی جمع ہے، اس کے ایک معنی کشتی کے بھی آتے ہیں، وہی یہاں مراد ہیں۔ اَلْمُنْشَئٰتُ، نَشاء سے مشتق ہے، جس کے معنی اُبھرنے اور بلند ہونے کے ہیں، مراد کشتیوں کے بادبان ہیں جو جھنڈوں کی طرح اونچے اور بلند بنائے جاتے ہیں، اس میں کشتی کی صنعت اور اس کے پانی کے اوپر چلنے کی حکمت کا بیان ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾

جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے، اور باقی رہے گا منہ تیرے رَبّ کا بزرگی اور عظمت والا،

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ يَسْــَٔـلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ

ہر روز اس کو ایک دھندا ہے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، ہم جلد فارغ ہونے والے ہیں تمہاری طرف

اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ

اے دو بھاری قافلو! پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، اے گروہ جنوں کے! اور انسانوں کے!

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ

اگر تم سے ہوسکے کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو،

لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا

نہیں نکل سکنے کے بدون سند کے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، چھوڑے جائیں تم پر

شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

شعلے آگ کے صاف اور دُھواں ملے ہوئے پھر تم بدلہ نہیں لے سکتے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ﴿۳۷﴾

جھٹلاؤ گے، پھر جب پھٹ جائے آسمان تو ہوجائے گلابی جیسے نری،

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ

پھر کیا کی نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤ گے، پھر اس دن پوچھ نہیں اس کے گناہ کی کسی آدمی سے

وَّ لَا جَآنٌّ ۚ﴿۳۹﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ

اور نہ جن سے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤ گے، پہچانے پڑیں گے گنہگار اپنے چہرے سے

فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ۚ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾

پھر پکڑا جائے گا پیشانی کے بال سے اور پاؤں سے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤ گے،

وقف لازم

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۘ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا

یہ دوزخ ہے جس کو جھوٹ بتاتے تھے گنہگار، پھریں گے بیچ اس کے

ع ۲

وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ۚ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ ع

اور کھولتے پانی کے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤ گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس زمین میں جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے، ﴿۲۶﴾ اور (صرف) تمہارے پروردگار کی جلال والی، فضل و کرم والی

ذات باقی رہے گی۔ ﴿۲۷﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۸﴾ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُسی سے (اپنی حاجتیں) مانگتے ہیں۔ وہ ہر روز کسی شان میں ہے! ﴿۲۹﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۰﴾ اے دو بھاری مخلوقو! ہم عنقریب تمہارے (حساب کے) لئے فارغ ہونے والے ہیں۔ ﴿۳۱﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۲﴾ اے انسانوں اور جنّات کے گروہ! اگر تم میں یہ بل بوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے پار نکل سکو، تو پار نکل جاؤ۔ تم زبردست طاقت کے بغیر پار نہیں ہوسکو گے۔ ﴿۳۳﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۴﴾ تم پر آگ کا شعلہ اور تانبے کے رنگ کا دُھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم اپنا بچاؤ نہیں کرسکو گے۔ ﴿۳۵﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۶﴾ غرض (وہ وقت آئے گا) جب آسمان پھٹ پڑے گا، اور لال چمڑے کی طرح سرخ گلاب بن جائے گا۔ ﴿۳۷﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۸﴾ پھر اُس دن نہ کسی انسان سے اُس کے گناہ کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور نہ کسی جن سے۔ ﴿۳۹﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۰﴾ مجرم لوگوں کو اُن کی علامتوں سے پہچان لیا جائے گا، پھر اُنہیں سر کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا، ﴿۴۱﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۲﴾ یہ ہے وہ جہنم جسے یہ مجرم لوگ جھٹلاتے تھے! ﴿۴۳﴾ یہ اُسی کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگائیں گے۔ ﴿۴۴﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(جتنی نعمتیں تم لوگوں نے سُنی ہیں تم کو توحید و طاعت سے اُن کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور کفر و معصیت سے ناشکری نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس عالم کے فنا کے بعد ایک دوسرا عالم آنے والا ہے، جہاں ایمان و کفر پر جزا و سزا واقع ہوگی، جس کا بیان آیاتِ آئندہ کے ضمن میں ہے، پس ارشاد ہے کہ) جتنے (جن و اِنس) رُوئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہوجائیں گے، اور (صرف) آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت (والی) اور (باوجود عظمت کے) احسان والی ہے باقی رہ جائے گی (چونکہ مقصود تنبیہ کرنا ثقلین یعنی جن و اِنس کو ہے، اور وہ سب زمین پر ہیں، اس لئے فنا میں اہلِ ارض کا ذکر کیا گیا، اس تخصیص ذکری سے دوسری چیزوں کی فنا کی نفی لازم نہیں آتی، اور اس جگہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں عظمت و احسان اس لئے ذکر کی گئیں کہ ایک صفت ذاتی، دوسری اضافی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ اکثر اہلِ عظمت دوسروں کے حال پر توجہ نہیں کیا کرتے، مگر حق تعالیٰ باوجود اس عظمت کے وہ اپنے بندوں پر رحمت و فضل فرماتے ہیں، اور چونکہ یہ فناءِ عالم اور اس کے بعد جزا و سزا کی خبر دینا انسان کو دولتِ ایمان بخشتا ہے، اس لئے یہ مجموعہ بھی ایک بڑی نعمت ہے، اس لئے فرمایا) سوائے جن

وانس! (باوجود اس کثرت وعظمت ِنعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (آگے ایک خاص طور پر اس کی عظمت واکرام کے متعلق مضمون ہے یعنی وہ ایسا باعظمت ہے کہ) اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان وزمین والے مانگتے ہیں (زمین والوں کی حاجتیں تو ظاہر ہیں اور آسمان والے گو کھانے پینے کے محتاج نہ ہوں، لیکن رحمت وعنایت کے تو سب محتاج ہیں، آگے اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کو ایک دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے) وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے (یہ مطلب نہیں کہ صدورِ افعال اس کے لوازمِ ذات سے ہے، ورنہ قدیم ہونا حادث کا لازم آئے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنے تصرفات عالم میں واقع ہو رہے ہیں وہ اسی کے تصرفات ہیں، جن میں اس کے انعامات واحسانات بھی داخل ہیں، جیسے ایجاد وابقاء جو رحمتِ عامہ ہے، اور اِعطائے رزق واولاد جو سب دنیوی رحمتیں ہیں، اور ہدایت واعطائے علم وتوفیقِ عمل جو دینی رحمتیں ہیں، پس باوجود عظمت کے ایسا اکرام واحسان فرمانا یہ بھی ایک نعمتِ عظیمہ ہے) سو اے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمت ِنعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (یہ مضمون جلال واکرام کا بقاء خالق کے متعلق فرما کر آگے پھر فناء خلق کے متعلق ارشاد ہے کہ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ پھر وہ فنا مستمر رہے گی اور عذاب وثواب نہ ہوگا، بلکہ ہم تم کو دوبارہ زندہ کریں گے اور جزا وسزا دیں گے اسی کو اس طرح فرماتے ہیں کہ) اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے (حساب وکتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے ہیں (یعنی حساب وکتاب لینے والے ہیں، مجازاً ومبالغۃً اس کو خالی ہونے سے تعبیر فرما دیا، اور مبالغہ اس طرح ہے کہ انسان جب سب کاموں سے خالی ہو کر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو پوری توجہ سمجھی جاتی ہے، انسانی فہم کے مطابق یہ عنوان اختیار کیا گیا، ورنہ حق تعالیٰ کی اصل شان یہ ہے کہ اس کو ایک مشغولیت کسی دوسری مشغولیت سے مانع نہیں ہوتی، اور اس کی جس طرف جس وقت توجہ ہوتی ہے تام اور کامل ہی ہوتی ہے، وہاں ناقص توجہ کا احتمال ہی نہیں، اور مثل سابق آگے ارشاد ہے کہ یہ حساب کتاب کی خبر دینا بھی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمت ِنعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (آگے تاکید وقوعِ حساب کے لئے یہ بتلاتے ہیں کہ اس وقت یہ بھی احتمال نہیں کہ کوئی کہیں بچ کر نکل جائے، چنانچہ ارشاد ہے کہ) اے گروہ جن اور اِنسانوں کے! اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں) نکلو (مگر) بدون زور کے نہیں نکل سکتے (اور زور ہے نہیں، پس نکلنے کا وقوع بھی ممکن نہیں، اور یہی حالت بعینہٖ قیامت میں ہوگی، بلکہ وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ عجز ہوگا، غرض بھاگ نکلنے کا احتمال نہ رہا، اور یہ بات بتلا دینا بھی موجبِ ہدایت ونعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمت ِنعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (آگے بوقتِ عذاب انسان کے عجز کا ذِکر فرماتے ہیں، جیسا اُوپر حساب کے وقت اس کے عاجز ہونے کا ذِکر تھا، یعنی اے جن وانس کے مجرمو!) تم دونوں پر (قیامت کے روز) آگ کا شعلہ اور دُھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم (اس کو)

ہٹا نہ سکو گے (یہ شعلہ اور دُھواں غالباً وہ ہے جس کا ذِکر سورۂ وَالْمُرْسَلٰتِ میں ہے: اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝۳۰ الی قوله: اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ [۱] فَالظِّلُّ هُوَ دُخَانٌ، وَالشَّرَرُ هُوَ الشُّوَاظُ، والله اعلم۔ اور اس کا بتلانا بھی بوجہ ذریعہ ہدایت ہونے کے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے) سوائے جن واِنس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ غرض (جب ہمارا حساب لینا اور تمہارا حساب وعقاب کے وقت عاجز ہونا معلوم ہو گیا تو اس سے قیامت کے روز حساب وعقاب کا وقوع ثابت ہو گیا، جس کا بیان یہ ہے کہ) جب (قیامت آئے گی جس میں) آسمان پھٹ جائے گا اور ایسا سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ نری (یعنی چمڑا، شاید یہ رنگ اس لئے ہو کہ علامت غضب کی ہے، کہ غضب میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اور یہ آسمان کا پھٹنا وہ ہے جو شروع پارہ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ میں آیا ہے، فی قوله تعالٰی: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ ...اِلخ [۲] (الفرقان:۲۵) اور یہ خبر دینا بھی نعمت ہے) سوائے جن واِنس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (یہ تو حساب کا وقوع اور اس کا وقت بتلایا گیا، آگے کیفیتِ حساب وطریقِ فیصلہ ارشاد فرماتے ہیں، یعنی جس روز یہ واقعاتِ ارسالِ شواظ ونحاس واِنشقاقِ سماء وغیرہ ہوں گے) تو اس روز (اللہ تعالیٰ کے معلوم کرنے کے لئے) کسی انسان اور جن سے اس کے جرم کے متعلق نہ پوچھا جائے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب معلوم ہے، یعنی حساب اس غرض سے نہ ہوگا، بلکہ خود ان کو معلوم کرانے اور جتلانے کے لئے سوال اور حساب ہوگا، لقوله تعالٰی: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹۲ (الحجر) [۳] اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن واِنس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (یہ تو حساب کی کیفیت ہوئی کہ بطور تحقیق نہ ہوگا، بلکہ بطور توبیخ ہوگا، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو تعیین جرائم ومجرمین کی معلوم ہے، اس لئے تحقیق کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن فرشتوں کو مجرمین کی تعیین کیسے ہوگی؟ پس ارشاد فرماتے ہیں کہ) مجرم لوگ اپنے حلیہ سے (کہ چہرے کی سیاہی اور آنکھوں کا نیلگوں ہونا ہے، کقوله تعالٰی: وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ [۴] (آل عمران:۱۰۶)، وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝۱۰۲ [۵] (طٰہٰ)) پہچانے جائیں گے، سو (ان کے) سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جائیں گے (اور ان کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، یعنی کسی کا سر، کسی کی ٹانگ حسبِ اعمال، یا کبھی سر، کبھی ٹانگ، بغرض اِجتماعِ انواعِ عذاب ونکال۔ اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن واِنس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی

---

[۱] (المُرسَلٰت:۳۰-۳۲) ترجمہ: ایک سائبان کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں، جس میں نہ سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے وہ انگارے برسادے گا۔

[۲] ترجمہ: اور جس روز آسمان پھٹ جاوے گا۔

[۳] ترجمہ: سو آپ کے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔

[۴] ترجمہ: اور بعضے چہرے سیاہ ہوں گے۔

[۵] ترجمہ: اور ہم اس روز مجرم لوگوں کو اس حالت سے جمع کریں گے کہ کرنجے ہوں گے۔

کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (آگے مزید عذاب بتلاتے ہیں) یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ (یعنی تم) جھٹلاتے تھے، وہ لوگ دوزخ کے اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے (یعنی کبھی آگ کا عذاب ہوگا، کبھی کھولتے ہوئے پانی کا، جس کی تحقیق سورۂ مؤمن، رُکوع ہشتم میں گزر چکی ہے، اور یہ خبر دینا بھی نعمت ہے) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

معارف ومسائل

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ عَلَيْهَا کی ضمیر اَرْض کی طرف راجع ہے، جس کا ذِکر پہلے آچکا ہے: وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ اس کے علاوہ زمین اُن عام اشیاء میں سے ہے جس کی طرف ضمیر راجع کرنے کے لئے پہلے مرجع کا ذِکر لازم نہیں ہے، معنی اس کے یہ ہوئے کہ جو جنات اور اِنسان زمین پر ہیں سب فنا ہونے والے ہیں، اس میں جن واِنس کے ذِکر کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس سورت میں مخاطب یہی دونوں ہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آسمان اور آسمان والی مخلوقات فانی نہیں ہیں، کیونکہ دُوسری آیت میں حق تعالیٰ نے عام لفظوں میں پوری مخلوقات کا فانی ہونا بھی واضح فرمادیا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ [1] (القصص:۸۸)

وَجْهُ رَبِّكَ، وَجْهُ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، اور رَبِّكَ میں ضمیرِ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، یہ حضرت سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز واکرام ہے کہ آپ کو خاص مقامِ مدح میں کہیں تو عَبْدُهٗ کا خطاب ہوا ہے، اور کہیں رَبّ الارباب نے اپنی ذات کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے رَبُّكَ سے خطاب فرمایا ہے۔

مشہور تفسیر کے مطابق معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے، جن میں جن واِنس بھی داخل ہیں، سب کے سب فانی ہیں، باقی رہنے والی ایک ہی ذاتِ حق جل وعلاشانہٗ کی ہے۔

فانی ہونے سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس وقت بھی اپنی ذات میں فانی ہیں، ان میں دوام وبقاء کی صلاحیت نہیں، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے وَجْهُ رَبِّكَ کی تفسیر جہت اور سَمت سے کی ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ کُل موجودات میں بقاء صرف اس چیز کو ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب میں ہے، اس میں اس کی ذات وصفات بھی داخل ہیں، اور مخلوقات کے اعمال واحوال میں جس چیز کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ بھی شامل ہے، جس

[1] ترجمہ: سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے۔

کا حاصل یہ ہوگا کہ انسان اور جن اور فرشتے جو کام اللہ کے لئے کرتے ہیں وہ کام بھی باقی ہے وہ فنا نہیں ہوگا، (کذا فی المظہری والقرطبی والرّوح) [۱] اور اس مفہوم کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: مَاعِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ (النحل:۹۶) یعنی ''جو کچھ تمہارے پاس ہے مال و دولت ہو یا قوت و طاقت یا راحت و کلفت یا کسی کی محبت و عداوت یہ سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔'' اللہ کے پاس انسان کے اعمال واحوال میں سے وہ چیز ہے جس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے کہ اس کو فنا نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۲۷﴾ یعنی وہ رَبّ صاحبِ عظمت وجلال بھی ہے اور صاحبِ اکرام بھی۔ صاحبِ اکرام ہونے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ درحقیقت ہر اکرام واعزاز کا مستحق تنہا وہی ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ خود صاحبِ عظمت وجلال ہونے کے باوجود عام دنیا کے بادشاہوں اور عظمت والوں کی طرح نہیں کہ ان کو دُوسروں کی اور غریبوں کی طرف التفات وتوجہ نہ ہو، بلکہ وہ عظمت وجلال کے ساتھ اپنی مخلوقات کا بھی اکرام کرتا ہے، کہ ان کو عطائے وجود کے بعد طرح طرح کی بے شمار نعمتوں سے نوازتا ہے، اور ان کی درخواستیں اور دُعائیں سنتا ہے، اگلی آیت اسی دوسرے معنی کی شہادت دیتی ہے۔ اور یہ لفظ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۲۷﴾ حق تعالیٰ کی اُن خاص صفات میں سے ہے کہ ان کو ذِکر کر کے انسان جو دُعا مانگتا ہے قبول ہوتی ہے۔ ترمذی، نسائی اور مسندِ احمد میں ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلِظُّوْا بِیَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔'' [۲] اَلِظُّوْا، اِلْظَاظ سے مشتق ہے، جس کے معنی لازم پکڑنے کے ہیں، مراد حدیث کی یہ ہے کہ اپنی دُعاؤں میں یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ کو یاد رکھو اور اس کے ساتھ دُعا کیا کرو (کیونکہ وہ اقرب الی القبول ہے)۔ (مظہری) [۳]

یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ یعنی زمین وآسمان کی ساری مخلوقات حق تعالیٰ کی محتاج ہیں، اور اسی سے اپنی حاجات مانگتی ہیں، زمین والے اپنے مناسب حاجات رزق اور صحت وعافیت اور آرام وراحت، پھر آخرت کی مغفرت ورحمت اور جنت مانگتے ہیں۔ آسمان والے اگرچہ کھاتے پیتے نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے ہر وقت محتاج ہیں، وہ بھی رحمت ومغفرت وغیرہ اپنی حاجات کے طلب گار رہتے ہیں۔ آگے کُلَّ یَوْمٍ اسی یَسْــئَـلُ کا ظرف ہے، یعنی ان کے یہ سوالات اور درخواستیں حق تعالیٰ سے ہر روز رہتی ہیں اور یوم اور روز سے مراد بھی عرفی دن نہیں، بلکہ مطلقاً وقت مراد ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ساری مخلوقات مختلف خطوں، مختلف زبانوں میں اس سے اپنی اپنی حاجات

---

[۱] روح المعانی ج:۲۰ ص:۱۳۹، والقرطبی ج:۱۷ ص:۱۶۵

[۲] مسند احمد، حدیث ربیعۃ بن عامر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رقم الحدیث:۱۷۵۹۶

[۳] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۱۵۰

ہر وقت مانگتی رہتی ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ پوری مخلوقاتِ ارضی وسمائی اور ان کے ایک ایک فرد کی بے شمار حاجتیں اور وہ بھی ہر گھڑی ہر آن سوائے اس عظمت وجلال والے قادرِ مطلق کے کون سن سکتا ہے اور کون ان کو پورا کر سکتا ہے، اسی لئے كُلَّ يَوْمٍ کے ساتھ یہ بھی فرمایا هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ یعنی ہر وقت، ہر لحظہ حق تعالیٰ کی ایک خاص شان ہوتی ہے، وہ کسی کو زندہ کرتا ہے، کسی کو موت دیتا ہے، کسی کو عزت دیتا ہے، کسی کو ذلت دیتا ہے، کسی تندرست کو بیمار اور کسی بیمار کو تندرست کرتا ہے، کسی مصیبت زدہ کو مصیبت سے نجات دیتا ہے، کسی غم زدہ رونے والے کو ہنسا دیتا ہے، کسی سائل کو اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کر دیتا ہے، کسی کا گناہ معاف کر کے جنت میں داخل ہونے کا مستحق بنا دیتا ہے، کسی قوم کو بلند وصاحبِ اقتدار بنا دیتا ہے، کسی قوم کو پست وذلیل کر دیتا ہے، غرض ہر آن، ہر لمحہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ایک خاص شان ہوتی ہے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ ثَقَلَانْ، ثَقَلٌ کا تثنیہ ہے، جس کا معنی وزن اور بوجھ کے ہیں، ثقلان دو بوجھ مراد اس سے انسان اور جنات ہیں۔ لفظ ثَقَلٌ عربی زبان میں ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا وزن اور قدر و قیمت معروف ہو، اسی لئے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ ...الخ" [۱] یعنی میں اپنے بعد دو وزن دار قابلِ قدر چیزیں چھوڑتا ہوں، جو تمہاری ہدایت واصلاح کا کام دیتی رہیں گی۔ ان دونوں چیزوں کا بیان بعض روایات میں "كِتَابُ اللهِ وَعِتْرَتِیْ" آیا ہے، بعض میں "كِتَابُ اللهِ وَسُنَّتِیْ" [۲] اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ عترت سے مراد اپنی اولاد ہے، جس میں نسبی اور رُوحانی دونوں قسم کی اولاد شامل ہے، اس لئے مراد سب صحابۂ کرام ہوئے، اور معنی حدیث کے یہ ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو چیزیں مسلمانوں کی ہدایت واصلاح کا ذریعہ ہوں گی، ایک اللہ کی کتاب، دُوسرے آپ کے صحابۂ کرام اور معاملات واَحکام میں ان کا تعامل۔ اور جس روایت میں "عترت" کی جگہ "سنت" آیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واسطے سے مسلمانوں کو پہنچی ہیں۔

بہرحال اس حدیث میں "ثَقَلَيْنِ" سے مراد دو وزن دار، قابلِ قدر چیزیں ہیں، آیتِ مذکورہ میں جن وانس کی دونوں نوعوں کو "ثَقَلَيْنِ" اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ زمین پر بسنے رہنے والی سب ذِی رُوح چیزوں میں جن وانس سب سے زیادہ وزن دار اور قابلِ قدر ہیں۔ اور سَنَفْرُغُ، فَرَاغٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی شغل سے فارغ اور خالی ہونے کے ہیں۔ فَرَاغٌ کا مقابل لغت میں شُغْلٌ ہے، اور لفظ فَرَاغٌ دو چیزوں کی خبر دیتا ہے، اوّل یہ کہ کسی شغل میں مشغول تھا، دوسرے یہ کہ اب اس شغل کو ختم کر کے فارغ ہو گیا، یہ دونوں باتیں مخلوقات میں تو معروف ومشہور ہیں، انسان

[۱] السنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۸۱۴۸، والمعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۴۹۴۷

[۲] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ، رقم الحدیث: ۴۲۶۵، والمستدرک للحاکمؒ، رقم الحدیث: ۲۹۱

کبھی ایک شغل میں لگا ہوا ہوتا ہے، پھر اس سے فارغ ہو جاتا ہے، مگر حق تعالیٰ جل شانہ' ان دونوں سے بَری ہیں، نہ اُن کو ایک شغل دوسرے شغل سے مانع ہوتا ہے، نہ وہ کبھی اس طرح فارغ ہوتے ہیں جس طرح انسان فارغ ہوا کرتا ہے۔

اس لئے آیتِ مذکورہ میں سَنَفْرُغُ کا لفظ ایک تشبیہ و استعارہ کے طور پر لایا گیا ہے جو عام انسانوں میں رائج ہے کہ کسی کام کی اہمیت بتلانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ ہم اس کام کے لئے فارغ ہو گئے، یعنی اب پوری توجہ اسی کام پر ہے۔ اور جو آدمی کسی کام پر اپنی پوری توجہ خرچ کرتا ہے اس کے لئے محاورے میں کہا جاتا ہے کہ ''اس کو تو اس کے سوا کوئی کام نہیں۔''

اس سے پہلی آیت میں جو یہ مذکور تھا کہ آسمان و زمین کی ساری مخلوقات اور ان کا ایک ایک فرد حق تعالیٰ سے اپنی حاجات مانگتا رہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر حال میں اُن کی درخواست پورا کرنے کے لحاظ سے ایک خاص شان میں ہوتے ہیں، آیت سَنَفْرُغُ لَكُمْ الخ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قیامت کے روز درخواستوں اور ان کے قبول اور اُن پر عمل کا سب سلسلہ بند ہو جائے گا، اُس وقت کام صرف ایک رہ جائے گا اور شُیُونِ مختلفہ میں سے صرف ایک شان ہوگی، یعنی حساب و کتاب اور عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ۔ (روح) [1]

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝۳۳

پچھلی آیت میں جن و انس کو بلفظ ''ثَقَلَيْنِ'' مخاطب کر کے بتلایا گیا تھا کہ قیامت کے روز ایک ہی کام ہوگا کہ سب جن و انس کے اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، اور اس کے ذرّہ ذرّہ پر جزا و سزا ہوگی، اس آیت میں یہ بتلانا منظور ہے کہ روزِ جزا کی حاضری اور حسابِ اعمال سے کوئی شخص راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا، کسی کی مجال نہیں جو موت سے یا روزِ قیامت کے حساب سے کہیں بھاگ کر بچ نکلے۔ اس آیت میں ''ثَقَلٰن'' کے بجائے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کے صریح نام ذکر فرمائے، اور ''جن'' کو ''اِنس'' پر مقدم کیا، شاید اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ آسمان و زمین کے اقطار سے پار نکل جانا بڑی قوت و قدرت چاہتا ہے، جنات کو حق تعالیٰ نے ایسے اُمور کی قوت انسان سے زیادہ بخشی ہے، اس لئے جن کے ذِکر کو مقدم کیا گیا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے جنات اور اِنسانو! اگر تمہیں یہ گمان ہو کہ ہم کہیں بھاگ جائیں گے اور اس طرح ملک الموت کے تصرف سے بچ جائیں یا میدانِ حشر سے بھاگ کر نکل جائیں گے اور حساب کتاب سے بچ جائیں گے، تو لو اپنی قوت آزما دیکھو، اگر تمہیں اس پر قدرت ہے کہ آسمان و زمین کے دائروں سے باہر نکل جاؤ تو نکل کر دِکھلاؤ، یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے تو بڑی قوت و قدرت درکار ہے، جو جن و اِنس کی دونوں قوموں کو حاصل نہیں، اس کا حاصل ان کا اَقطارِ سماء وارض سے باہر نکلنے کا اِمکان و اِحتمال بتلانا نہیں، بلکہ بطور فرضِ محال ان کا عاجز ہونا دِکھلانا ہے۔

---

[1] روح المعاني تحت هذه الآية ج:۲۰ ص:۱۲۵

آیت میں مراد اگر موت سے فرار ہے، تو یہی دُنیا اس کا مصداق ہے، کہ کسی کے اِمکان میں نہیں کہ زمین سے آسمانوں تک کی حدود کو پھلانگ کر باہر نکل جائے، اور موت سے بچ جائے، ان حدود کو پار کرنے کا ذِکر بھی انسانی خیال کے مطابق کیا گیا ہے، ورنہ بالفرض کوئی آسمانوں کی حدود سے باہر نکل جائے تو اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے بھی باہر نہیں، اور اگر مراد محشر کے حساب و کتاب اور جواب دہی سے فرار کا ناممکن ہونا بتلانا ہے، تو اس کی عملی صورت قرآنِ کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث میں یہ ہے کہ قیامت کے روز آسمان شق ہو کر سب فرشتے زمین کے کناروں پر آجائیں گے، اور ہر طرف سے محاصرہ ہوگا، جن و اِنس قیامت کی ہولناک چیزوں کو دیکھ کر مختلف سمتوں میں بھاگیں گے، ہر سمت میں فرشتوں کا محاصرہ دیکھ کر پھر اپنی جگہ لوٹ آئیں گے۔ (روح) [1]

فضائی سفر جو آج کل مصنوعی سیاروں اور راکٹوں سے ہو رہے ہیں، ان کا اس آیت سے کوئی جوڑ نہیں

اس زمانے میں جو زمین کی کشش سے باہر نکلنے اور خلا میں سیارات پر پہنچنے کے تجربات ہو رہے ہیں، وہ سب ظاہر ہے کہ آسمان کے حدود سے باہر نہیں، بلکہ سطحِ آسمان سے بہت نیچے ہو رہے ہیں، اَقْطَارُ السَّمٰوٰتُ سے باہر نکل جانے کا اس سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو اَقْطَارُ السَّمٰوٰتُ کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے، باہر نکلنا تو کجا، اس لئے اس آیت کے مفہوم سے ان خلائی سفروں اور سیارات پر پہنچنے کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں، بعض سادہ لوح لوگ اس آیت ہی کو خلائی سفروں کے اِمکان و جواز کے لئے پیش کرنے لگے، جو معانی قرآن سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ شُوَاظٌ بضم شین آگ کے اُس شعلے کو کہا جاتا ہے، جس میں دُھواں نہ ہو، اور نُحَاسٌ اس دُھویں کو کہا جاتا ہے جس میں آگ کی روشنی نہ ہو۔ اس آیت میں بھی جن و اِنس کو خطاب کر کے ان پر آگ کے شعلے اور دُھواں چھوڑنے کا بیان ہے، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حساب کتاب کے بعد جو مجرمین کو جہنم میں ڈالا جائے گا، اس میں یہ دو طرح کے عذاب ہوں گے، کہیں آگ ہی آگ اور شعلہ ہی شعلہ، دُھویں کا نام نہیں، اور کہیں دُھواں ہی دُھواں، جس میں آگ کی کوئی روشنی نہیں، اور بعض مفسرین نے اس آیت کو پچھلی آیت کا تکملہ قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اے جن و اِنس آسمانوں

[1] روح المعانی ج:۲۰ ص:۱۴۸۔

کے حدود سے نکل جانا تمہارے بس کی بات نہیں، اگر تم ایسا ارادہ کر بھی لو تو جس طرف بھاگ کر جاؤ گے آگ کے شعلے اور دُھویں تمہیں گھیر لیں گے۔ (ابن کثیر) [۱]

فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۝۳۵ اِنْتِصَارٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی کی مدد کر کے مصیبت سے نکالنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذابِ الٰہی سے بچنے کے لئے تم سب جن و انس میں سے کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا کہ اس کے ذریعہ عذاب سے چھوٹ جائے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝۳۹ یعنی اس دن کسی انسان یا جن سے اُس کا گناہ نہ پوچھا جائے گا، اس کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے قیامت میں یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے فلاں جرم کیا ہے یا نہیں؟ وہ تو فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمال ناموں میں محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے علم اَزَلی میں اس سے پہلے سے موجود ہے، بلکہ سوال یہ ہوگا کہ فلاں جرم تم نے کیوں کیا؟ یہ تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی ہے، اور مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فرشتے جو مجرمین کے عذاب پر مأمور ہیں، اُن کو مجرمین سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ تم نے یہ جرم کیا ہے یا نہیں؟ بلکہ ہر جرم کی ایک خاص نشانی مجرمین کے چہروں سے ظاہر ہوگی۔ فرشتے وہ نشانی دیکھ کر ان کو جہنم میں دھکیل دیں گے۔ اگلی آیت میں یہی مضمون آیا ہے: يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ان دونوں تفسیروں کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ محشر میں حساب کتاب کے بعد مجرمین کے جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ ہو چکے گا، تو اب ان سے اُن کے گناہوں کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہوگی، وہ علامت سے پہچان کر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ یہ اُس وقت کا حال ہے جب ایک مرتبہ ان سے اُن کے جرائم کی پُرسش ہو چکے گی، اور وہ انکار کر دیں گے، قسمیں اُٹھا لیں گے، تو ان کے مونہوں اور زبانوں پر مہر کر دی جائے گی، ہاتھوں، پاؤوں کی گواہی لی جائے گی۔ یہ تینوں تفسیریں ابنِ کثیر نے نقل کی ہیں، [۲] تینوں متقارب ہیں، کوئی اختلاف نہیں۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝۴۱ سِيْمَاء کے معنی علامت کے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس روز مجرمین جن کو جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ ہوگا، اُن کی علامت یہ ہوگی کہ چہرے سیاہ اور آنکھیں نیلگوں ہوں گی، رنج و غم سے چہرے فق ہوں گے، فرشتے اسی علامت کے ذریعے اُن کو پکڑیں گے۔

نَوَاصِیْ، نَاصِيَة کی جمع ہے، پیشانی کے بالوں کو کہا جاتا ہے، نَوَاصِیْ اور اَقْدَام سے پکڑنے کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کو سر کے بال پکڑ کر گھسیٹا جائے گا، کسی کو ٹانگیں پکڑ کر، یا کبھی اِس طرح، کبھی اُس طرح گھسیٹا جائے گا، اور یہ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۹۷ و ۴۹۸

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۴۹۹

معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پیشانی کے بالوں اور ٹانگوں کو ایک جگہ جکڑ دیا جائے گا۔ (کذا قالہ الضحاك، روح) [1] واللہ اعلم۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾

اور جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے اپنے رَبّ کے آگے اس کے لئے ہیں دو باغ، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ

جن میں بہت سی شاخیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، ان دونوں میں دو چشمے

تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ

بہتے ہیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، ان دونوں میں ہر میوہ

زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ

قسم قسم کا ہوگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے، تکیہ لگائے بیٹھے بچھونوں پر

بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

جن کے استر تافتے کے، اور میوہ ان باغوں کا جھک رہا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ

جھٹلاؤ گے، اُن میں عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں، نہیں قربت کی ان سے کسی آدمی نے ان سے پہلے

وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ

اور نہ کسی جن نے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤ گے، وہ کیسی جیسے کہ لعل

۱. روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۲۰ ص:۱۵۶

وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ

اور مونگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے، اور کیا بدلہ ہے نیکی کا

اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا

مگر نیکی، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے، اور ان دو کے سوائے

جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ

اور دو باغ ہیں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے، گہری سبز جیسے سیاہ، پھر کیا نعمتیں

رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے، ان میں دو چشمے ہیں اُبلتے ہوئے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی

تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِیْهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

جھٹلاؤگے، ان میں میوے ہیں اور کھجوریں اور انار، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی

تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾

جھٹلاؤگے، اُن سب باغوں میں اچھی عورتیں ہیں خوبصورت، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے،

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

حوریں ہیں رُکی رہنے والیاں خیموں میں، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے،

لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾

نہیں ہاتھ لگایا اُن کو کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے ربّ کی جھٹلاؤگے،

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا

تکیہ لگائے بیٹھے سبز مسندوں پر اور قیمتی بچھونے نفیس پر، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رَبّ کی جھٹلاؤ گے،

ع ۳ ۱۴ تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

بڑی برکت ہے نام کو تیرے رَبّ کے جو بڑائی والا اور عظمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو شخص (دُنیا میں) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا تھا، اُس کے لئے دو باغ ہوں گے۔ ﴿۴۶﴾
اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۷﴾ دونوں باغ شاخوں سے بھرے ہوئے! ﴿۴۸﴾ اب بتاؤ
کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۹﴾ اُنہی دو باغوں میں دو چشمے بہ رہے ہوں گے، ﴿۵۰﴾ اب بتاؤ
کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۱﴾ اُن دونوں میں ہر پھل کے دو دو جوڑے ہوں گے، ﴿۵۲﴾ اب
بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۳﴾ وہ (جنتی لوگ) ایسے فرشوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں
گے جن کے اَستر دبیز ریشم کے ہوں گے، اور دونوں باغوں کے پھل جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ ﴿۵۴﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے
پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۵﴾ انہی باغوں میں وہ نیچی نگاہ والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے نہ کسی
انسان نے کبھی چھوا ہوگا، اور نہ کسی جن نے! ﴿۵۶﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۷﴾ وہ
ایسی ہوں گی جیسے یاقوت اور مرجان! ﴿۵۸﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۹﴾ اچھائی کا
بدلہ اچھائی کے سوا اور کیا ہے؟ ﴿۶۰﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۱﴾ اور ان دو باغوں
سے کچھ کم درجے کے دو باغ اور ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۳﴾
دونوں سبزے کی کثرت سے سیاہی کی طرف مائل! ﴿۶۴﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو
جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۵﴾ اُنہی میں دو اُبلتے ہوئے چشمے ہوں گے، ﴿۶۶﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو
جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۷﴾ اُنہی میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے، ﴿۶۸﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو
جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۹﴾ اُنہی میں خوب سیرت خوبصورت عورتیں ہوں گی، ﴿۷۰﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی
نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۷۱﴾ وہ حوریں جنہیں خیموں میں حفاظت سے رکھا گیا ہوگا! ﴿۷۲﴾ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی

کَون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۳) اُنہیں ان جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے کبھی چھوا ہوگا، اور نہ کسی جن نے۔ (۷۴) اب
بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۵) وہ (جنتی) سبز رَفرَف اور عجیب وغریب قسم کے
خوبصورت فرش پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ (۷۶) اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۷۷)
بڑا بابرکت نام ہے تمہارے پروردگار کا جو عظمت والا بھی ہے، کرم والا بھی! (۷۸)

خلاصۂ تفسیر

(ان آیتوں میں دو باغوں کا ذکر ''وَلِمَنْ خَافَ'' سے شروع ہوا ہے، اور دو باغوں کا ذِکر ''وَمِنْ دُوْنِهِمَا'' سے، پہلے دو باغ خواص مقربین کے ہیں، اور پچھلے دو باغ عامۂ مؤمنین کے لئے، دلائل اس تعیین وتقسیم کے آگے لکھ دیئے جائیں گے، یہاں صرف تفسیر لکھی جاتی ہے۔ پچھلی آیات میں مجرمین کی سزاؤں کا ذِکر تھا، یہاں سے مؤمنینِ صالحین کی جزا کا ذِکر شروع ہوتا ہے) اور (اہلِ جنت کا حال یہ ہے کہ ان میں دو قسم ہیں، خواص اور عوام، پس) جو شخص (خواص میں سے ہو اور) اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے ہونے سے (ہر وقت) ڈرتا رہتا ہو (اور ڈر کر شہوات ومعاصی سے مجتنب رہتا ہو، اور یہ شان خواص ہی کی ہے، کیونکہ عوام پر تو گاہ گاہ خوف طاری ہوجاتا ہے، اور کبھی ان سے معاصی بھی سرزد ہوجاتے ہیں، گو توبہ کرلیں، غرض جو شخص ایسا متقی ہو) اس کے لئے (جنت میں) دو باغ ہوں گے (یعنی ہر متقی کے لئے دو باغ اور غالباً اس تعدّد میں حکمت ان کے تکرّم اور تنعّم کا اظہار ہوگا جس طرح دُنیا میں اہلِ تنعّم کے پاس اکثر چیزیں منقولات وغیر منقولات میں سے متعدّد ہوتی ہیں) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے۔ (اور وہ) دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے (اس میں سایہ کی گنجانی اور ثمرات کی کثرت کی طرف اشارہ ہے) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے۔ (اور) ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ (دُور تک) بہتے چلے جائیں گے، سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے۔ (اور) ان دو باغوں میں ہر میوے کی دو قسمیں ہوں گی (کہ اس میں زیادہ تلذّذ ہے، کبھی ایک قسم کا مزہ لے لیا، کبھی دُوسری قسم کا) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے۔ (اور) وہ لوگ تکیہ لگائے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے اَستر دبیز ریشم کے ہوں گے (اور قاعدہ ہے کہ اُوپر کا کپڑا بہ نسبت اَستر کے زیادہ نفیس ہوتا ہے، پس جب اَستر اِستبرق ہوگا تو اُوپر کا کیسا کچھ ہوگا) اور ان دونوں باغوں کا پھل بہت نزدیک ہوگا (کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر طرح بلا مشقت ہاتھ آسکتا ہے) سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی

نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (اور) ان (باغوں کے مکانات اور محلات) میں نیچی نگاہ والیاں (یعنی حوریں) ہوں گی کہ ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے (یعنی بالکل محفوظ و غیر مستعمل ہوں گی) سو اے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (اور رنگت اس قدر صاف و شفاف ہوگی کہ) گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں (اور ممکن ہے کہ تشبیہ سرخی میں بھی ہو اور تعدّد مشبہ کا غالباً اہتمام کے لئے ہے) سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (آگے مضمونِ مذکور کی تقریر و تاکید ہے کہ) بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، (انہوں نے غایت اطاعت کی، اس لئے صلے میں غایت عنایت کے مورد ہوئے) سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (یہ تو خواص کے باغوں کی صفت مذکور ہوئی) اور (آگے عامۂ مؤمنین کے باغوں کا ذکر ہے یعنی) ان (مذکورہ) دونوں باغوں سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں (جو عامۂ مؤمنین کے لئے ہیں، اور ہر ایک کو دو دو ملیں گے) سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (اور آگے ان باغوں کی صفت ہے کہ) وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے، سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ جوش مارتے ہوں گے، سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (جوش مارنا بوجہ اس کے کہ چشمے کے لوازم میں سے ہے، اُوپر کے چشموں میں بھی یہ صفت مشترک ہے اور وہاں تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ بھی ہے، اور یہاں نہیں، پس یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ چشمے صفتِ جریان میں پہلے دو چشموں سے کم ہیں، اور یہ باغ ان باغوں سے کم ہیں، اور) ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور اَنار ہوں گے، سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمتِ نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (یہاں مطلق فَاكِهَةٌ اور پھر تفصیل میں نَخْلٌ وَّرُمَّانٌ پر اکتفا فرمانا اور وہاں لفظ كُلِّ سے ہر قسم کے فواکہ کی تصریح اور پھر لفظ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ سے ان کے متعدد ہونے کا ذکر، جس سے فواکہ کی کثرت معلوم ہوتی ہے، یہ سب قرائن اس کے ہیں کہ جَنَّتَيْنِ اُوْلَيَيْنِ ان اُخْرَيَيْنِ سے افضل و اعلیٰ ہیں، اور) ان (باغوں کے مکانات) میں خوب سیرت، خوب صورت عورتیں ہوں گی (یعنی حوریں)، سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ وہ عورتیں گوری رنگت والی ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی، سواے جن و انس! (باوجود اس کثرت و عظمت نِعَم کے) تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (اور) ان (جنتی) لوگوں سے پہلے اُن پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے (یعنی غیر مستعمل ہوں گی)، سواے جن و انس! (باوجود

اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (وہاں یاقوت ومرجان سے تشبیہ دینا جو کہ مفید مبالغہ ہے اور یہاں صرف حِسَانٌ پر اکتفا فرمانا، نیز قرینہ ہے کہ پہلے دو باغ دوسرے دو باغوں سے افضل ہیں، اور یہاں کے سب صفات وہاں صراحۃً یا اشارۃً مذکور ہیں، مثلاً خوش سیرت ہونا قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ سے مفہوم ہوتا ہے، حُوْر ہونا قرینۂ مقام سے معلوم ہوتا ہے، مَّقْصُوْرٰتٌ سے زیادہ عصمت وعفت پر لفظ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ دلالت کرتا ہے، کہ جو ایسی ہوں گی وہ ضرور ہی گھر میں رہیں گی اور) وہ لوگ سبز مشجّر اور عجیب خوب صورت کپڑوں (کے فرشوں) پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، سوائے جن وانس! (باوجود اس کثرت وعظمتِ نِعَم کے) تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ (اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو باغوں کے فرش بہ نسبت پہلے دو باغوں کے کم درجے کے ہوں گے، کیونکہ وہاں تصریح ہے ریشمی ہونے کی، پھر دُہرے ہونے کی، اور یہاں نہیں ہے۔ آگے خاتمہ میں حق تعالیٰ کی ثنا وصفت ہے جس میں ان تمام مضامین کی جو سورۂ رحمٰن میں مفصل بیان ہوئے ہیں تائید وتاکید ہے کہ) بڑا بابرکت نام ہے آپ کے ربّ کا جو عظمت والا اور اِحسان والا ہے۔ (نام سے مراد صفات ہیں جو کہ ذات کے غیر نہیں، پس حاصل جملے کا ثنا ہوئی کمالِ ذات وصفات کے ساتھ، اور شاید لفظ اسم بڑھانے سے مقصود مبالغہ ہو کہ مسمّٰی تو کیسا کامل اور بابرکت ہوگا اس کا تو اسم بھی مبارک اور کامل ہے)۔

معارف ومسائل

جس طرح سابقہ آیات میں مجرمین کی سخت سزاؤں کا ذِکر تھا، اِن آیات میں ان کے بالمقابل مؤمنینِ صالحین کی عمدہ جزاؤں اور نعمتوں کا بیان ہے، جن میں اہلِ جنت کے پہلے دو باغوں کا ذِکر اور ان میں جو نعمتیں ہیں ان کا بیان ہے، اس کے بعد دُوسرے دو باغوں کا، اور ان میں مہیا کی ہوئی نعمتوں کا ذِکر ہے۔

پہلے دو باغ جن حضرات کے لئے مخصوص ہیں اُن کو تو متعین کر کے بتلا دیا ہے: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ یعنی ان دو باغوں کے مستحق وہ لوگ ہیں جو ہر وقت، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے روز کی پیشی اور حساب وکتاب سے ڈرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کسی گناہ کے پاس نہیں جاتے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سابقین اور مقربینِ خاص ہی ہو سکتے ہیں۔

دُوسرے دو باغوں کے مستحق کون ہوں گے؟ اس کی تصریح آیاتِ مذکورہ میں نہیں کی گئی، مگر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ دونوں باغ پہلے دو باغوں کی نسبت کم درجے کے ہوں گے: وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ یعنی پہلے دو باغوں سے کمتر اور دو باغ ہیں، اس سے بقرینۂ مقام معلوم ہو گیا کہ ان دو باغوں کے مستحق عام مؤمنین ہوں گے، جو مقربینِ خاص سے درجے میں کم ہیں۔

پہلے اور دُوسرے دو باغوں کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے اور بھی توجیہات بیان فرمائی ہیں، یہاں جو تفسیر اختیار کی گئی ہے کہ پہلے دو باغ سابقین اوّلین اور مقربین خاص کے لئے ہیں، اور دُوسرے دو باغ عامۂ مؤمنین کے لئے، اور یہ کہ یہ دُوسرے دو باغ پہلے دو باغوں سے درجے میں کم ہیں، روایاتِ حدیث سے یہی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ "بیان القرآن" [۱] میں بحوالۂ "درِّ منثور" یہ حدیثِ مرفوع نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ اور وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ کی تفسیر میں فرمایا: "جَنَّتَانِ مِنْ ذَهَبٍ لِّلْمُقَرَّبِيْنَ وَجَنَّتَانِ مِنْ وَرِقٍ لِّـاَصْحَابِ الْيَمِيْنِ "یعنی دو باغ سونے کے بنے ہوئے ہیں مقربین کے لئے، اور دو باغ چاندی کے اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنینِ صالحین کے لئے۔ [۲] نیز دُرِّ منثور میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے موقوفاً یہ روایت کیا ہے: "اَلْعَيْنَانِ الَّتِيْ تَجْرِيَانِ خَيْرٌ مِّنَ النَّضَّاخَتَيْنِ" [۳] یعنی پہلے دو باغوں کے دو چشمے جن کے بارے میں تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فرمایا ہے، وہ بہتر ہیں دُوسرے دو باغوں کے چشموں سے جن کے متعلق نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فرمایا ہے، کیونکہ نَضَّاخَتٰنِ کے معنی ہیں اُبلنے والے دو چشمے، تو یہ صفت ہر چشمے میں ہوتی ہے، لیکن جن کو تَجْرِيٰنِ کے عنوان سے بیان کیا ہے، ان میں اُبلنے کے علاوہ دُور تک سطحِ زمین پر جاری رہنے کی صفت مزید ہے۔

یہ اِجمالی بیان تھا ان چار چشموں کا جو اہلِ جنت کو ملیں گے، اب الفاظ آیات کے ساتھ ان کے معانی کو دیکھئے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ، مقامِ رَبّ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے حساب کے لئے پیشی ہے، اور اس سے خوف کے معنی یہ ہیں کہ جلوَت وخلوَت میں اور ظاہر و باطن کے تمام اَحوال میں اس کو یہ مراقبہ دائمی رہتا ہے کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور اعمال کا حساب دینا ہے، اور ظاہر ہے جس کو ایسا مراقبہ ہمیشہ رہتا ہو وہ گناہ کے پاس نہیں جائے گا۔

اور قرطبی وغیرہ بعض حضراتِ مفسرین نے مقامِ رَبّ کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر قول و فعل اور خفیہ وعلانیہ عمل پر نگراں اور قائم ہے، ہماری ہر حرکت اس کے سامنے ہے۔ حاصل اس کا بھی وہی ہوگا کہ حق تعالیٰ کا یہ مراقبہ اس کو گناہوں سے بچادے گا۔ [۴]

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ یہ پہلے دو باغوں کی صفت ہے کہ بہت شاخوں والے ہوں گے، جس کا یہ اثر لازمی ہے کہ ان کا

---

[۱] تفسیر بیان القرآن ج:۱۱ ص:۹۴ تحت هٰذه الآية۔

[۲] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۳۶۷، وشعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:۴۱۰، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۲۸۲ (باختلاف فی الألفاظ)

[۳] تفسیر ابن ابی حاتمؒ رقم:۱۸۷۵۳، والتفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۳۷۳

[۴] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۱۷۶

سایہ بھی گھنا ہوگا اور پھل بھی زیادہ ہوگا۔ دُوسرے دو باغ جن کا ذِکر آگے آتا ہے اُن میں یہ صفت مذکور نہیں، جس سے اس معاملے میں ان کی کمی کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ پہلے دو باغوں کی صفت میں مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ کے الفاظ سے تمام انواعِ فواکہ کا ہونا بیان فرمایا ہے، اس کے بالمقابل دُوسرے باغوں میں مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ کے بجائے صرف فَاكِهَةٌ کے الفاظ ہیں۔ اور زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہر میوے کی دو دو قسمیں ہوں گی، یہ دو قسمیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خشک وتر کی ہوں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک تو عام معروف ومشہور اور مزے کی ہو، اور دُوسری غیر معمولی انداز کی۔ (مظہری) [1]

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿۵۶﴾ لفظ طَمْثٌ کئی معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، حیض کے خون کو طَمْثٌ کہتے ہیں، اور حائضہ عورت کو طَامِثٌ کہا جاتا ہے، اور کنواری لڑکی سے مباشرت کو بھی طَمْثٌ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، اور اس میں جو اس کی نفی کی گئی ہے کہ جن اہلِ جنت کے لئے یہ حوریں مقرّر ہیں، ان سے پہلے ان کو کسی انسان یا جن نے مس نہیں کیا ہوگا، اس کا مفہوم وہ بھی ہوسکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ جو حوریں انسانوں کے لئے مقرّر ہیں ان کو کسی انسان نے، اور جو مؤمنین جنات کے لئے مقرّر ہیں اُن کو کسی جن نے ان سے پہلے مَس نہیں کیا ہوگا، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جیسے دُنیا میں انسانی عورتوں پر کبھی جنات بھی مسلط ہوجاتے ہیں، وہاں اس کا بھی کوئی اِمکان نہیں ہوگا۔

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ مقربینِ خاص کے دو باغوں کی کچھ تفصیل ذِکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ احسانِ عمل کا بدلہ احسانِ جزا ہی ہوسکتا ہے، اس کے سوا کوئی اِحتمال نہیں، ان حضرات نے احسانِ عمل یعنی ہمیشہ نیک عمل کرنے کی پابندی کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو عمدہ جزا ہی کا بدلہ دیا جانا چاہئے تھا، جو اُن کو دِیا گیا۔

مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ گہری سبزی کی وجہ سے جو سیاہی جھلکنے لگتی ہے، اس کو اِدْهِـمَـامٌ کہا جاتا ہے، مراد یہی ہے کہ ان دونوں باغوں کی سرسبزی ان کے سیاہی مائل ہونے کا سبب ہوگی، یہ صفت اگرچہ پہلے دو باغوں میں ذِکر نہیں کی گئی ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن میں یہ صفت نہ ہو، بلکہ ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ جو وہاں کی صفت بتلائی ہے، اس میں مُدْهَآمَّتٰنِ کی صفت بھی شامل ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ خَيْرٰتٌ سے مراد سیرت وکردار کی خوبی، اور حِسَانٌ سے مراد شکل وصورت کی خوبی ہے، اور یہ امر بھی دونوں باغوں کی حوروں میں مشترک ہوگا جس کی طرف اشارہ سابقہ آیات میں موجود ہے۔

---

[1] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۱۵۸

مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ قاموس میں ہے کہ رَفْرَفٌ سبز رنگ کا ریشمی کپڑا ہے، جس کے فرش اور تکئے اور دوسرا زینت کا سامان بنایا جاتا ہے۔[1] اور صحاح میں ہے کہ اس پر نقش ونگار درختوں اور پھولوں کے ہوتے ہیں،[2] جس کو اُردو میں مشجّر کہا جاتا ہے۔ عَبْقَرِی ہر عمدہ، خوبصورت کپڑے کو کہا جاتا ہے۔ حِسَان سے اسی کا وصف خوبصورتی بیان کیا گیا ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ سورۂ رحمٰن میں بیشتر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور انسان پر احسانات کا ذکر ہے، اس کے خاتمے پر خلاصے کے طور پر یہ جملہ ارشاد ہوا کہ اُس ذاتِ پاک کا تو کہنا کیا ہے، اس کا نام بھی بڑا بابرکت ہے، اس کے نام ہی سے یہ ساری نعمتیں قائم ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ بِحَمْدِ اللهِ وَعَوْنِهٖ
لِلْحَادِیْ عَشَرَ مِنَ الرَّبِیْعِ الثَّانِیْ
۱۳۹۱ھ یَوْمَ السَّبْتِ

---

[1] القاموس ج:۲ ص:۳۸۴

[2] تفسیر المظہری بحوالہ الصحاح ج:۹ ص:۱۶۳

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

اٰیاتها ۹۶ ۵۶ سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۴۶ رکوعاتها ۳

سورۂ واقعہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چھیانوے آیتیں ہیں اور تین رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣ وقف لازم

جب ہو پڑے، ہو پڑنے والی، نہیں ہے اس کے ہو پڑنے میں کچھ جھوٹ، پست کرنے والی ہے بلند کرنے والی،

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝٤ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝٥ فَكَانَتْ هَبَآءً

جب لرزے زمین کپکپا کر، اور ریزہ ریزہ ہوں پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر، پھر ہوجائیں غبار

مُّنْۢبَثًّا ۝٦ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝٧ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ

اُڑتا ہوا، اور تم ہوجاؤ تین قسم پر، پھر داہنے والے، کیا خوب ہیں

الْمَيْمَنَةِ ۝٨ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝٩ وَ السّٰبِقُوْنَ

داہنے والے، اور بائیں والے کیا بُرے ہیں بائیں والے، اور اگاڑی والے

السّٰبِقُوْنَ ۝١٠ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝١١ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝١٢ ثُلَّةٌ

تو اگاڑی والے، وہ لوگ ہیں مقرّب، باغوں میں نعمت کے، انبوہ ہے

مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝١٤ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۝١٥

پہلوں میں سے، اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے، بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر،

مُّتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۝١٦ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۝١٧

تکیہ لگائے ان پر ایک دُوسرے کے سامنے، لئے پھرتے ہیں ان کے پاس لڑکے سدا رہنے والے،

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝١٨ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا

آبخورے اور کوزے اور پیالہ نتھری شراب کا، جس سے نہ سر دُکھے اور نہ

يُنْزِفُوْنَ ۝١٩ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝٢٠ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝٢١

بکواس لگے، اور میوہ جونسا پسند کرلیں، اور گوشت اڑتے جانوروں کا جس قسم کو جی چاہے،

وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۝٢٢ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۝٢٣ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

اور عورتیں گوری بڑی آنکھوں والیاں، جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر، بدلہ ان کاموں کا جو

يَعْمَلُوْنَ ۝٢٤ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ۝٢٥ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝٢٦

کرتے تھے، نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات، مگر ایک بولنا سلام سلام،

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ

اور داہنے والے، کیا کہنے داہنے والوں کے، رہتے ہیں بیری کے درختوں میں جن میں کانٹا نہیں، اور کیلے

مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾

تہ پر تہ، اور سایہ لمبا، اور پانی بہتا ہوا، اور میوہ بہت،

لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ

نہ اُس میں سے ٹوٹا اور نہ روکا ہوا، اور بچھونے اُونچے، ہم نے اُٹھایا ان عورتوں کو

اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ع

ایک اچھے اُٹھان پر، پھر کیا اُن کو کنواریاں، پیار دِلانے والیاں ہم عمر، واسطے داہنے والوں کے،

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ

انبوہ ہے پہلوں میں سے، اور انبوہ ہے پچھلوں میں سے، اور بائیں والے،

مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾

کیسے بائیں والے، تیز بھاپ میں اور جلتے پانی میں، اور سایہ میں دُھویں کے،

لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾

نہ ٹھنڈا اور نہ عزّت کا، وہ لوگ تھے اس سے پہلے خوش حال،

وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا

اور ضد کرتے تھے اس بڑے گناہ پر، اور کہا کرتے تھے: کیا جب ہم مرگئے

وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ

اور ہو چکے مٹی اور ہڈیاں، کیا ہم پھر اُٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟ تو کہہ دے

اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾

کہ اگلے اور پچھلے، سب اکٹھے ہونے والے ہیں، ایک دن مقرّر کے وقت پر،

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ

پھر تم جو ہو اے بہکے ہوؤ جھٹلانے والو! البتہ کھاؤ گے ایک درخت

مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾

سینڈ کے سے، پھر بھرو گے اس سے پیٹ، پھر پیو گے اس پر ایک جلتا پانی،

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾

پھر پیو گے جیسے پییں اُونٹ تونسے ہوئے، یہ مہمانی ہے اُن کی انصاف کے دن

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا، ① تو اُس کے پیش آنے کو کوئی جھٹلانے والا نہیں ہوگا، ② وہ ایک تہ وبالا کرنے والی چیز ہوگی، ③ جب زمین ایک بھونچال سے جھنجوڑ دی جائے گی، ④ اور پہاڑوں کو پیس کر چورا کر دیا جائے گا ⑤ یہاں تک کہ وہ بکھرا ہوا غبار بن کر رہ جائیں گے، ⑥ اور (لوگو!) تم تین قسموں میں بٹ جاؤ گے۔ ⑦ چنانچہ جو دائیں ہاتھ والے ہیں، کیا کہنا اُن دائیں ہاتھ والوں کا! ⑧ اور جو بائیں ہاتھ والے ہیں، کیا بتائیں وہ بائیں ہاتھ والے کیا ہیں؟ ⑨ اور جو سبقت لے جانے والے ہیں، وہ تو ہیں ہی سبقت لے جانے والے! ⑩ وہی ہیں جو اللہ کے خاص مقرّب بندے ہیں، ⑪ وہ نعمتوں کے باغات میں ہوں گے، ⑫ ـــ شروع کے لوگوں میں سے بہت سے، ⑬

اور بعد کے لوگوں میں سے تھوڑے ــــــــ ⑭ سونے کے تاروں سے بُنی ہوئی اُونچی نشستوں پر ⑮ ایک دوسرے کے سامنے اُن پر تکیہ لگائے ہوئے! ⑯ سدا رہنے والے لڑکے اُن کے سامنے گردش میں ہوں گے، ⑰ ایسی شراب کے پیالے، جگ اور جام لے کر ⑱ جس سے نہ اُن کے سر میں درد ہوگا، اور نہ اُن کے ہوش اُڑیں گے، ⑲ اور وہ پھل لے کر جو وہ پسند کریں، ⑳ اور پرندوں کا وہ گوشت لے کر جس کو اُن کا دِل چاہے! ㉑ اور وہ بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں! ㉒ ایسی جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی! ㉓ یہ سب بدلہ ہوگا اُن کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے۔ ㉔ وہ اُس جنت میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے، اور نہ کوئی گناہ کی بات، ㉕ ہاں جو بات ہوگی، سلامتی ہی سلامتی کی ہوگی۔ ㉖ اور وہ جو دائیں ہاتھ والے ہوں گے، کیا کہنا اُن دائیں ہاتھ والوں کا! ㉗ (وہ عیش کریں گے) کانٹوں سے پاک بیریوں میں! ㉘ اور اُوپر تلے لدے ہوئے کیلے کے درختوں میں، ㉙ اور دُور تک پھیلے ہوئے سائے میں، ㉚ اور بہتے ہوئے پانی میں، ㉛ اور ڈھیر سارے پھلوں میں ㉜ جو نہ کبھی ختم ہوں گے، اور نہ اُن پر کوئی روک ٹوک ہوگی، ㉝ اور اُونچے رکھے ہوئے فرشوں میں۔ ㉞ یقین جانو، ہم نے اُن عورتوں کو نئی اُٹھان دی ہے، ㉟ چنانچہ اُنہیں کنواریاں بنایا ہے، ㊱ (شوہروں کے لئے) محبت سے بھری ہوئی، عمر میں برابر! ㊲ سب کچھ دائیں ہاتھ والوں کے لئے، ㊳ (جن میں سے) بہت سے شروع کے لوگوں میں سے ہوں گے، ㊴ اور بہت سے بعد والوں میں سے۔ ㊵ اور جو بائیں ہاتھ والے ہیں، کیا بتائیں بائیں ہاتھ والے کیا ہیں؟ ㊶ وہ ہوں گے تپتی ہوئی لُو میں، اور کھولتے ہوئے پانی میں، ㊷ اور سیاہ دُھویں کے سائے میں، ㊸ جو نہ ٹھنڈا ہوگا، نہ کوئی فائدہ پہنچانے والا۔ ㊹ یہ لوگ اس سے پہلے بڑے عیش میں تھے، ㊺ اور بڑے بھاری گناہ پر اڑے رہتے تھے ㊻ اور کہا کرتے تھے کہ: ''کیا جب ہم مرجائیں گے، اور مٹی اور ہڈیاں بن کر رہ جائیں گے، تو کیا ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ ㊼ اور کیا ہمارے پہلے گذرے ہوئے باپ دادوں کو بھی؟'' ㊽ کہہ دو کہ: ''یقیناً سب اگلے اور پچھلے لوگ ㊾ ایک متعین دن کے طے شدہ وقت پر ضرور اِکٹھے کئے جائیں گے، ㊿ پھر اے جھٹلانے والے گمراہو! تم لوگوں کو (٥١) ایک ایسے درخت میں سے کھانا پڑے گا جس کا نام زقوم ہے، (٥٢) پھر اُسی سے پیٹ بھرنے ہوں گے، (٥٣) پھر اُس کے اُوپر سے کھولتا ہوا پانی پینا پڑے گا، (٥٤) اور پینا بھی اس طرح جیسے پیاس کی بیماری والے اُونٹ پیتے ہیں۔'' (٥٥) یہ ہوگی جزا و سزا کے دن ان لوگوں کی مہمانی! (٥٦)

خلاصۂ تفسیر

جب قیامت آئے گی جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں (بلکہ اس کا واقع ہونا بالکل صحیح اور حق ہے) تو وہ (بعض کو) پست کردے گی (اور بعض کو) بلند کردے گی (یعنی کفار کی ذِلت کا اور مؤمنین کی رفعت کا اس روز ظہور ہوگا) جبکہ

زمین کو سخت زلزلہ آئے گا، اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر وہ پراگندہ غبار (کی طرح) ہو جائیں گے اور تم (سب آدمی جو اس وقت موجود ہو یا پہلے گزر چکے ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں) تین قسم ہو جاؤ گے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے، خواص مؤمنین اور عوام مؤمنین اور کفار کہ سورۂ رحمٰن میں بھی یہی تین قسمیں مذکور ہیں اور آئندہ آیات میں خواص کو مقربین اور سابقین کہا ہے، اور عوام مؤمنین کو اَصحاب الیمین اور کفار کو اَصحاب الشمال۔ اور ان آیات اِذَا وَقَعَتِ سے ثُلَّةٌ تک میں بعض واقعات نفخۂ اُولیٰ یعنی پہلے صور کے وقت کے بیان فرمائے ہیں، جیسے: رُجَّتْ، جیسا شروع سورۂ حجر میں آیا ہے، اور بُسَّتْ، اور بعض واقعات نفخۂ ثانیہ یعنی دُوسرے صور کے وقت کے جیسے: خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ اور وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا اور بعض مشترک جیسے اِذَا وَقَعَتِ اور لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا، چونکہ نفخۂ اُولیٰ سے نفخۂ ثانیہ تک کا تمام وقت ایک وقت کے حکم میں ہے، اس لئے ہر جز وقت کو ہر واقعے کا وقت کہا جا سکتا ہے، آگے ان تینوں قسموں میں تقسیم بیان کرنے کے بعد تینوں کے اَحکام الگ الگ ذکر کئے ہیں، اوّل اِجمالاً، پھر تفصیلاً کہ تین قسمیں جو مذکور ہیں) سو (ان میں ایک قسم یعنی) جو داہنے والے ہیں، وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (مراد اس سے جن کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور گو یہ مفہوم مقربین میں بھی مشترک ہے، لیکن اسی صفت پر اِکتفا کرنے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ ان میں اصحابُ الیمین سے زائد کوئی اور صفت قربِ خاص کی نہیں پائی جاتی، اس طرح مراد اس سے عوام مؤمنین ہو گئے، اور اس میں اِجمالاً ان کی حالت کا اچھا ہونا بتلا دیا، آگے فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝ الخ سے اس اِجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (دُوسری قسم یعنی) جو بائیں والے ہیں، وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں، (مراد اس سے جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے یعنی کفار، اور اس میں اِجمالاً ان کی حالت کا بُرا ہونا بتلا دیا، آگے فِي سَمُومٍ الخ سے اس اِجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (تیسری قسم یعنی) جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے کے ہی ہیں (اور) وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں، (اس میں تمام اعلیٰ درجے کے بندے داخل ہیں، انبیاء اور اولیاء وصدیقین اور کامل متقی اور اس میں اجمالاً اُن کی حالت کا عالی ہونا بتلا دیا، آگے فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ۝ الخ سے اس اِجمال کی تفصیل کی جاتی ہے یعنی) یہ (مقرب) لوگ آرام کے باغوں میں ہوں گے (جس کی مزید تفصیل عَلٰى سُرُرٍ سے آتی ہے اور درمیان میں ان مقربینِ خاص میں بہت سی جماعتوں کا شامل ہونا بتلاتے ہیں کہ) ان (مقربین) کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے (اگلوں سے مراد متقدمین ہیں آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل تک، اور پچھلوں سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر قیامت تک، کذا فی الدّر عن جابر مرفوعاً، [1] اور متقدمین میں کثرتِ سابقین اور متاخرین میں قلّتِ سابقین کی وجہ یہ ہے کہ خواص ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، اور

[1] الدّرّ المنثور ج:۹ ص:۳۸۳

متقدمین یعنی آدم علیہ السلام سے زمانۂ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کا زمانہ بہت طویل ہے، بہ نسبت اُمت محمدیہ کے جو قربِ قیامت میں پیدا ہوئی ہے، تو باقتضاء عادتِ زمانہ اس طویل زمانے کے خواص بہ نسبت اُمت محمدیہ کے مختصر زمانے کے خواص کے زیادہ ہوں گے، کیونکہ اس طویل زمانے میں لاکھ دو لاکھ تو انبیاء ہی ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی اور نبی نہیں، اسی لئے خواص مقربین کا بڑا گروہ متقدمین کا ہوگا، اور متأخرین یعنی اُمت محمدیہ میں اس سے کم ہوگا، آگے مقربین خواص کے لئے جو نعمتیں مقرر ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ (مقرّب) لوگ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، (دُرِّ منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لفظ موضونہ کی یہی تفسیر نقل کی ہے،[1] اور) ان کے پاس ایسے لڑکے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، یہ چیزیں لے کر آمد و رفت کیا کریں گے آبخورے اور آفتابے اور ایسا جامِ شراب جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا، (اس کی تحقیق سورۂ صافات میں گزر چکی ہے)، نہ اس سے ان کو دردِ سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، یہ بھی سورۂ صافات میں گزر چکا ہے)، اور میوے جن کو وہ پسند کریں اور پرندوں کا گوشت جو اُن کو مرغوب ہو اور ان کے لئے گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی (مراد حوریں ہیں جن کی رنگت ایسی صاف شفاف ہوگی) جیسے (حفاظت سے) پوشیدہ رکھا ہوا موتی، یہ ان کے اعمال کے صلے میں ملے گا۔ (اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ وہ کوئی بیہودہ بات (سنیں گے، یعنی شراب پی کر یا ویسے بھی ایسی چیزیں نہ پائی جائیں گی جن سے عیش مکدّر ہوتی ہے) بس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی (کقولہ تعالیٰ: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ[2] (الرعد)، وقولہ تعالیٰ: تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾[3] (ابراہیم) جو کہ دلیل اکرام و اعزاز کی ہے، غرض روحانی و جسمانی ہر طرح کی لذت و مسرت اعلیٰ درجے کی ہوگی، یہ جزائے سابقین کا بیان کیا گیا) اور (آگے اصحاب الیمین کی جزاء کی تفصیل ہے یعنی) جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (اس اجمال کا اعادہ تفصیل کے قبل اس لئے کیا گیا کہ اُس اِجمال کو فصل ہوگیا تھا آگے ان کے اچھے ہونے کا بیان ہے کہ) وہ ان باغوں میں ہوں گے جہاں بے خار بیریاں ہوں گی اور تہ بہ تہ کیلے ہوں گے، اور لمبا لمبا سایہ ہوگا، اور چلتا ہوا پانی ہوگا اور کثرت سے میوے ہوں گے جو نہ ختم ہوں گے (جیسے دُنیا کے میوے کہ فصل تمام ہونے سے تمام ہو جاتے ہیں) اور نہ ان کی روک ٹوک ہوگی (جیسے دنیا میں باغ والے اس کی روک تھام کرتے ہیں) اور اُونچے اُونچے فرش (کیونکہ جن درجوں میں وہ بچھے ہیں وہ درجے بلند) ہوں گے (اور چونکہ مقام خوش عیشی کا ہے اور خوش عیشی

---

[1] الدُّرّ المنثور ج: ۹ ص: ۳۸۳، ومصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث: ۳۴۰۸۰

[2] ترجمہ: اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے آتے ہوں گے کہ تم صحیح سلامت رہو گے۔

[3] ترجمہ: وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جاوے گا السلام علیکم۔

بدون عورتوں کے کامل نہیں ہوتی، اس طور پر ان اسبابِ عیش کے ذِکر ہی سے عورتوں کا ہونا معلوم ہوگیا، لہٰذا آگے بہشتی عورتوں کی طرف اَنْشَأْنٰهُنَّ کی ضمیر راجع کرکے ان کا ذِکر فرمایا جاتا ہے کہ) ہم نے (وہاں کی) اُن عورتوں کو (جن میں جنت کی حوریں بھی شامل ہیں اور دُنیا کی عورتیں بھی، جیسا کہ رُوح المعانی میں ترمذی کے حوالے سے یہ حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ اس آیت میں جن عورتوں کی تخلیق جدید کا ذِکر ہے، اُن سے مراد وہ عورتیں ہیں جو دُنیا میں بوڑھی یا بدشکل تھیں،[1] اُن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے ان عورتوں کو) خاص طور پر بنایا ہے (جن کی تفصیل آگے ہے) یعنی ہم نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں (یعنی بعد مقاربت کے پھر کنواری ہوجائیں گی، جیسا کہ دُرِّ منثور میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے ثابت ہے،[2] اور) محبوبہ ہیں (یعنی حرکات وشمائل وناز وانداز وحسن وجمال سب چیزیں اُن کی دلکش ہیں اور اہلِ جنت کی) ہم عمر ہیں (اس کی تحقیق سورۂ صٓ میں گزرچکی ہے) یہ سب چیزیں داہنے والوں کے لئے ہیں (آگے یہ بتلاتے ہیں کہ داہنے والے بھی مختلف قسم کے لوگ ہوں گے، یعنی) ان (اصحاب الیمین) کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور ایک بڑا گروہ پچھلے لوگوں میں سے ہوگا (بلکہ متأخرین میں اصحاب الیمین بہ نسبت متقدمین کے تعداد میں زیادہ ہوں گے، چنانچہ احادیث میں تصریح ہے کہ اس اُمت کے مؤمنین کا مجموعہ پچھلی تمام اُمتوں کے مؤمنین کے مجموعے سے زیادہ ہوگا،[3] اور اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اصحاب الیمین اس اُمت میں زیادہ ہوں کیونکہ خواص مقربین کی اکثریت تو متقدمین میں خود آیتِ بالا سے ثابت ہوچکی ہے، اور جب اصحاب الیمین مرتبے میں مقربین سے کم ہیں تو ان کی جزا بھی کم ہوگی، سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ مقربین کی جزا میں وہ سامانِ عیش زیادہ مذکور ہے جو اہلِ شہر کو زیادہ مرغوب ہے، اور اَصحاب الیمین کی جزا میں وہ سامانِ عیش زیادہ مذکور ہے جو دیہات وقصبات والوں کو مرغوب ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں میں ایسا تفاوت ہوگا جیسا اہلِ شہر واہلِ قریہ میں ہوا کرتا ہے، کذا فی الروح)[4] اور (آگے کفار کا اور ان کے عقاب وعذاب کا ذِکر ہے، یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں (اور اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دُھویں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا (یعنی سایہ سے ایک جسمانی نفع ہوتا ہے راحت وبرودت، اور ایک رُوحانی نفع ہوتا ہے لذت وفرحت، وہاں دونوں نہ ہوں گے، یہ وہی دُھواں ہے جس کا ذِکر اُوپر سورۂ رحمٰن میں بلفظ نُحَاسٌ آیا ہے، آگے اس عذاب کی وجہ ارشاد ہے

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورۃ الواقعۃ ج:۱ ص:۱۶۵۔

[2] الدُّر المنثور ج:۹ ص:۳۹۰، والمعجم الصغیر للطبرانیؒ رقم الحدیث:۲۵۰

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: جامع الترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ، باب ما جاء فی صف اھل الجنۃ، ج:۲ ص:۸۱، وسنن ابن ماجۃ، ابواب الزھد، باب صفۃ اُمّۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ج:۲ ص:۳۱۶

[4] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۲۵

کہ) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) بڑی خوش حالی میں رہتے تھے اور (اس خوش حالی کے غرہ میں) بڑے بھاری گناہ (یعنی شرک و کفر) پر اِصرار کیا کرتے تھے (مطلب یہ کہ ایمان نہیں لائے تھے) اور (آگے ان کے کفر کا بیان ہے، جس کو زیادہ دخل ہے طلبِ حق نہ ہونے میں یعنی وہ) یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں (ہو کر) رہ گئے تو کیا (اس کے بعد) ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے، چونکہ منکرینِ قیامت میں بعض کفار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تھے، اس لئے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے جمع کئے جائیں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر، پھر (جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو! جھٹلانے والو! درخت زَقوم سے کھانا ہوگا، پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا، پھر پینا بھی پیاسے اُونٹوں کا سا (غرض) ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ مہمانی ہوگی۔

معارف و مسائل

سورۂ واقعہ کی خصوصی فضیلت، مرضِ وفات میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سبق آموز ہدایات

ابنِ کثیر نے بحوالۂ ابنِ عساکر ابوظبیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مرضِ وفات میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت عثمان نے پوچھا: مَا تَشْتَكِيْ؟ (تمہیں کیا تکلیف ہے؟) تو فرمایا: ذُنُوْبِيْ! (یعنی اپنے گناہوں کی تکلیف ہے)، پھر پوچھا: مَا تَشْتَهِيْ؟ (یعنی آپ کیا چاہتے ہیں؟) تو فرمایا: رَحْمَةُ رَبِّيْ (یعنی اپنے ربّ کی رحمت چاہتا ہوں)۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں آپ کے لئے کسی طبیب (معالج) کو بلاتا ہوں، تو فرمایا: ''اَلطَّبِيْبُ اَمْرَضَنِيْ'' (یعنی مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے)۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں آپ کے لئے بیت المال سے کوئی عطیہ بھیج دُوں؟ تو فرمایا: لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْهَا (مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: عطیہ لے لیجئے! وہ آپ کے بعد آپ کی لڑکیوں کے کام آئے گا۔ تو فرمایا کہ کیا آپ کو میری لڑکیوں کے بارے میں یہ فکر ہے کہ وہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گی، مگر مجھے یہ فکر اس لئے نہیں کہ میں نے اپنی لڑکیوں کو تاکید کر رکھی ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ پڑھا کریں، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَّمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ اَبَدًا۔ (ابن كثير) [۱]

''جو شخص ہر رات میں سورۂ واقعہ پڑھا کرے وہ کبھی فاقے میں مبتلا نہیں ہوگا۔''

ابن کثیر نے یہ روایت بسند ابنِ عساکر نقل کرنے کے بعد اس کی تائید دُوسری سندوں اور دُوسری کتابوں سے بھی پیش کی ہے۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ واقعہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ اس کے وقوع میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ [۲]

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ كَاذِبَةٌ مصدر ہے، جیسے عَافِيَة اور عَاقِبَة اور معنی یہ ہیں کہ اس کے وقوع میں کوئی کذب نہیں ہوسکتا، بعض حضرات نے كَاذِبَةٌ کو بمعنی تکذیب قرار دیا ہے، معنی ظاہر ہیں کہ اس کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ یعنی واقعۂ قیامت بہت سی بلند رُتبہ قوموں اور اَفراد کو پست وذلیل کردے گا اور بہت سی پست وحقیر قوموں اور اَفراد کو سربلند کردے گا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس جملے کی یہی تفسیر منقول ہے، اور مقصد اس کا ہولناک ہونا اور اس میں عجیب قسم کے انقلابات پیش آنے کا بیان ہے، جیسا کہ سلطنتوں اور حکومتوں کے انقلاب کے وقت مشاہدہ ہوا کرتا ہے، کہ اُوپر والے نیچے اور نیچے والے اُوپر ہوجاتے ہیں، فقیر مال دار ہوجاتے ہیں، مال دار فقیر ہوجاتے ہیں۔ (روح) [۳]

میدانِ حشر میں حاضرین کی تین قسمیں

وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ قیامت کے روز تمام لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے، ایک قوم عرش کے داہنی جانب ہوگی، یہ وہ ہوں گے جو آدم علیہ السلام کی داہنی جانب سے پیدا ہوئے، اور ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے، اور ان کو عرش کی داہنی جانب میں جمع کردیا جائے گا، یہ سب لوگ جنتی ہیں۔

دُوسری قوم عرش کے بائیں جانب میں جمع ہوگی، جو آدم علیہ السلام کے بائیں جانب سے پیدا ہوئی، اور جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھوں میں دیئے گئے، ان سب کو بائیں جانب جمع کردیا جائے گا، اور یہ سب لوگ جہنمی ہیں۔ (نعوذ باللہ من صنیعهم)

---

[۱] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۵۱۲، وشعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:۲۳۹۵۔

[۲] تفسير ابن كثير ج:۷ ص:۵۱۳

[۳] روح المعاني ج:۲۰ ص:۱۹۷

اور تیسری قسم طائفہ سابقین کا ہوگا، جو ربِّ عرش کے سامنے خصوصی امتیاز اور قرب کے مقام میں ہوگا، جن میں انبیاء ورُسل، صدیقین، شہداء اور اولیاء اللہ شامل ہوں گے، ان کی تعداد بہ نسبت اصحاب الیمین کے کم ہوگی۔[1]

آخر سورۃ میں ان تینوں کا ذِکر پھر اس سلسلے میں آئے گا کہ انسانوں کی موت کے وقت سے ہی آثار اس کے محسوس ہو جائیں گے کہ یہ ان تینوں گروہوں میں سے کس گروہ میں شامل ہونے والا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ قیامت کے روز ظل اللہ کی طرف سبقت کرنے والے کون لوگ ہوں گے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ، آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اُن کو حق کی طرف دعوت دی جائے تو اس کو قبول کریں، اور جب اُن سے حق مانگا جائے تو اَدا کر دیں، اور لوگوں کے معاملات میں وہ فیصلہ کریں جو اپنے حق میں کرتے ہیں۔[2]

مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سابقین سے مراد انبیاء ہیں۔ ابنِ سیرین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے دونوں قبلوں یعنی بیت المقدس اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھی ہے وہ سابقین ہیں۔ اور حضرت حسن وقتادہ رحمہما اللہ نے فرمایا کہ ہر اُمت میں سابقین ہوں گے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ مسجد کی طرف سب سے پہلے جانے والے سابقین ہوں گے۔

ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب اقوال اپنی اپنی جگہ صحیح ودُرست ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ سابقین وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے دُنیا میں نیک کاموں کی طرف مسابقت کی ہوگی، تو جو آدمی اس دُنیا میں اعمالِ صالحہ کے اندر دُوسروں سے آگے بڑھا رہا وہ آخرت میں بھی سابقین میں سے ہوگا، کیونکہ آخرت کی جزا عمل کے مناسب دی جائے گی۔[3]

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ لفظ ثُلَّۃٌ بضم ثاء جماعت کو کہتے ہیں، اور زمخشری نے کہا کہ بڑی جماعت کو ثُلَّہ کہا جاتا ہے۔ (رُوح)[4]

اوّلین وآخرین سے کیا مراد ہے؟

یہاں اوّلین وآخرین کی تقسیم کا دو جگہ ذِکر آیا ہے، اوّل سابقین مقربین کے سلسلے میں، دُوسرا اَصحاب الیمین یعنی

---

۱ تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۵

۲ مسند احمد، مسند الصديقة عائشة رضى الله عنها، رقم الحديث: ۲۴۳۷۹

۳ تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۶

۴ روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۰۶

عامہ مؤمنین کے سلسلے میں۔ پہلی جگہ یعنی سابقین میں تو یہ فرق کیا گیا ہے کہ یہ سابقین مقربین اوّلین میں سے ثُلّہ یعنی بڑی جماعت ہوگی، اور آخرین میں سے کم ہوں گے، جیسا کہ آیتِ مذکورہ میں ہے، اور دُوسری جگہ اصحاب الیمین کے بیان میں اوّلین و آخرین دونوں میں لفظ ثُلّہ وارد ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اصحابِ یمین اوّلین میں سے بڑی جماعت ہوگی، اسی طرح آخرین میں سے بھی بڑی جماعت ہوگی: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

اب قابلِ غور یہ امر ہے کہ اوّلین سے مراد کون ہیں؟ اور آخرین سے کون؟ اس میں حضراتِ مفسرین کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قربِ زمانۂ خاتم الانبیاء تک کی تمام مخلوقات اوّلین میں داخل ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک آنے والی مخلوق آخرین میں داخل ہے، یہ تفسیر مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ سے ابنِ ابی حاتم رحمہ اللہ نے سند کے ساتھ نقل کی ہے،[1] اور ابنِ جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، "بیان القرآن" کے خلاصۂ تفسیر میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، جو اُوپر بیان ہو چکا ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے، یہ حدیث ابنِ عساکر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ اس طرح نقل کی ہے کہ جب پہلی آیت جو سابقینِ مقربین کے سلسلے میں آئی ہے، نازل ہوئی: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب کے ساتھ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا پچھلی اُمتوں میں سابقین زیادہ ہوں گے اور ہم میں کم ہوں گے؟ اس کے بعد سال بھر تک اگلی آیت نازل نہیں ہوئی، جب ایک سال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِسْمَعْ يَا عُمَرُ! مَا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ اَلَا وَاِنَّ مِنْ اٰدَمَ اِلَيَّ ثُلَّةٌ وَّاُمَّتِيْ ثُلَّةٌ۔ الحديث (ابن کثیر)[2]

"اے عمر! سنو! جو اللہ نے نازل فرمایا کہ اوّلین میں سے بھی ثُلّہ یعنی بڑی جماعت ہوگی اور آخرین میں سے بھی ثُلّہ یعنی بڑی جماعت ہوگی، اور یاد رکھو کہ آدم علیہ السلام سے مجھ تک ایک ثُلّہ ہے اور میری اُمت دُوسرا ثُلّہ۔"

اور اس مضمون کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو اِمام احمد اور ابنِ ابی حاتم رحمہما اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آیت: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر شاق ہوا کہ ہم بہ نسبت اُممِ سابقہ کے کم رہیں گے، اُس وقت دُوسری آیت نازل ہوئی: ثُلَّةٌ

---

[1] التفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۷۴، ۱۷۵

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۸

مِنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اُمید ہے کہ تم یعنی اُمتِ محمدیہ جنت میں ساری مخلوق کے مقابلے میں چوتھائی، تہائی بلکہ نصف اہلِ جنت ہوں گے، اور باقی نصف میں بھی کچھ تمہارا حصہ ہوگا۔ (ابن کثیر) [1] جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی طور پر اہلِ جنت میں اکثریت اُمتِ محمدیہ کی ہو جائے گی، مگر ان دونوں حدیثوں سے استدلال میں ایک اِشکال یہ ہے کہ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ تو سابقین مقربین کے متعلق آیا ہے، اور دُوسری آیت میں جو وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ آیا ہے، وہ سابقین مقربین کے متعلق نہیں، بلکہ اصحاب الیمین کے متعلق ہے۔

اس کا جواب روح المعانی [2] میں یہ دیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو پہلی آیت سے رنج و غم ہوا، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انہوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ جو نسبت سابقین میں ہے، وہی شاید اصحاب الیمین اور عام اہلِ جنت میں ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کُل اہلِ جنت میں ہماری تعداد بہت کم رہے گی، جب اصحاب الیمین کی تشریح میں اوّلین و آخرین دونوں میں لفظ ثُلَّة نازل ہوا تو اس شبہ کا ازالہ ہوگیا کہ مجموعی اعتبار سے اہلِ جنت میں اُمتِ محمدیہ کی اکثریت رہے گی، اگرچہ سابقینِ اوّلین میں ان کی تعداد مجموعہ اُممِ سابقہ کے مقابلے میں کم رہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ مجموعہ اُممِ سابقہ میں ایک بھاری تعداد انبیاء علیہم السلام کی ہے، اُن کے مقابلے میں اُمتِ محمدیہ کے لوگ کم رہیں تو کوئی غم کی چیز نہیں۔

لیکن ابنِ کثیر، ابوحیان، قرطبی، روح المعانی، مظہری وغیرہ نے سب تفسیروں میں دُوسری تفسیر کو ترجیح دی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اوّلین و آخرین دونوں طبقے اسی اُمت کے مراد ہیں، اوّلین اِس اُمت کے قرونِ اُولیٰ یعنی صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ ہیں، جن کو حدیث میں خیر القرون فرمایا ہے، اور آخرین قرونِ اُولیٰ کے بعد والے حضرات ہیں۔ [3]

ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث جو پہلی تفسیر کی تائید میں اُوپر لکھی گئی ہے، اس کی سند کے متعلق کہا ہے: "وَلٰكِنْ فِيْ اِسْنَادِهٖ نَظَرٌ" دُوسری تفسیر کے لئے استدلال میں وہ آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں جن میں اُمتِ محمدیہ کا خیر الامم ہونا مذکور ہے، [4] جیسے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران:۱۱۰) وغیرہ اور فرمایا کہ یہ بات بہت مستبعد ہے کہ سابقین مقربین کی تعداد خیر الامم میں دُوسری اُمتوں کی نسبت سے کم ہو، اس لئے راجح یہ ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ سے

---

[1] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۸۷۷۵، وتفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۸، ومسند احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۹۰۸۰

[2] روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۰۸

[3] روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۰۸، وتفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۸

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۸

مراد اسی اُمت کے قرونِ اُولیٰ ہیں، اور وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ سے مراد بعد کے لوگ ہیں کہ ان میں سابقین مقربین کی تعداد کم ہوگی۔

اس قول کی تائید میں ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول بروایت ابنِ ابی حاتم یہ پیش کیا ہے کہ حضرت حسن نے یہ آیت وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ تلاوت کر کے فرمایا کہ سابقین تو ہم سے پہلے گزر چکے، لیکن یا اللہ! ہمیں اصحاب الیمین میں داخل فرما دیجئے۔ اور حضرت حسن رحمہ اللہ سے دُوسری روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ''ثُلَّةٌ مِّمَّنْ مَّضٰى مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ''، یعنی اوّلین سے مراد اسی اُمت کے سابقین ہیں۔

اسی طرح محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ کے متعلق علماء یہ کہتے اور توقع کرتے تھے کہ یہ اوّلین و آخرین سب اسی اُمت میں سے ہوں۔ (ابن کثیر) [۱]

اور رُوح المعانی میں اس دُوسری تفسیر کی تائید میں ایک حدیث مرفوع بسند حسن حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ نقل کی ہے:-

اَخْرَجَ مُسَدَّدٌ فِيْ مُسْنَدِهٖ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَالطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ مَرْدُوْيَه بِسَنَدٍ حَسَنٍ عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِهٖ سُبْحَانَهٗ: ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هُمَا جَمِيْعًا مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ۔ [۲]

''مسدّد نے اپنی مسند میں اور ابن المنذر، طبرانی اور ابنِ مردویہ نے سندِ حسن کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ دونوں جماعتیں اسی اُمتِ محمدیہ میں سے ہوں گی۔''

اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی سند ضعیف کے ساتھ حدیثِ مرفوع بہت سے حضراتِ محدثین نے نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''هُمَا جَمِيْعًا مِّنْ اُمَّتِيْ''، یعنی یہ دونوں اوّلین و آخرین میری ہی اُمت میں سے ہوں گے۔ [۳]

اس تفسیر کے مطابق شروع آیت میں وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾ کا مخاطب اُمتِ محمدیہ ہی ہوگی، اور یہ تینوں

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۷ ص:۵۱۸ و ۵۱۹

[۲] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۲۰ ص:۲۰۸

[۳] حوالۂ بالا۔

قسمیں اُمتِ محمدیہ ہی کی ہوں گی۔ (روح المعانی) [1]

تفسیر مظہری میں پہلی تفسیر کو اس لئے بہت بعید قرار دیا ہے کہ آیاتِ قرآن کی واضح دلالت اس پر ہے کہ اُمتِ محمدیہ تمام اُممِ سابقہ سے افضل ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ کسی اُمت کی فضیلت اس کے اندر اعلیٰ طبقے کی زیادہ تعداد ہی سے ہوتی ہے، اس لئے یہ بات بعید ہے کہ افضل الامم کے اندر سابقین مقربین کی تعداد کم ہو، آیاتِ قرآن: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰) اور لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرة:۱۴۳) سے اُمتِ محمدیہ کی افضلیت سب اُمتوں پر ثابت ہے، اور ترمذی، ابن ماجہ ودارمی نے حضرت بہز بن حکیم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

اَنْتُمْ تُتِمُّوْنَ سَبْعِيْنَ اُمَّةً اَنْتُمْ اٰخِرُهَا وَاَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔ [2]

"تم ستر سابقہ اُمتوں کا تتمہ ہوگے، جن میں تم سب سے آخر میں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ اکرم وافضل ہوگے۔"

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اہلِ جنت کے چوتھائی تم لوگ ہو جاؤ گے؟ ہم نے عرض کیا کہ بے شک ہم اس پر راضی ہیں، تو آپ نے فرمایا:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔ (ازمظہری) [3]

"قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! مجھے یہ اُمید ہے کہ تم (یعنی اُمتِ محمدیہ) اہلِ جنت کے نصف ہوگے۔"

اور ترمذی، حاکم وبیہقی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اور ترمذی نے اس کی سند کو "حسن" اور حاکم نے "صحیح" کہا ہے، الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَهْلُ الْجَنَّةِ مِائَةٌ وَّعِشْرُوْنَ صَفًّا، ثَمَانُوْنَ مِنْهَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَرْبَعُوْنَ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ۔ (مظہری) [4]

---

[1] روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۰۸

[2] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورة آل عمران ج:۲ ص:۱۲۹، وسنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب صفة اُمّة محمد صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۳۱۶، وسنن الدارى، كتاب الرقاق، باب فى قول النبى صلى الله عليه وسلم: "انتم آخر الاُمم" رقم الحديث:۲۸۱۶

[3] تفسير المظهرى ج:۹ ص:۱۶۸، وصحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب كيف الحشر، ج:۲ ص:۹۶۵

[4] تفسير المظهرى ج:۹ ص:۱۶۸، وجامع الترمذى، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فى صف اهل الجنة ج:۲ ص:۸۱، والمستدرك للحاكم، رقم الحديث:۲۷۴

''اہلِ جنت کل ایک سو بیس صفوں میں ہوں گے، جن میں سے اَسّی صفیں اس اُمت کی ہوں گی، باقی چالیس صفوں میں ساری اُمتیں شریک ہوں گی۔''

مذکور الصدر روایات میں اس اُمت کے اہلِ جنت کی نسبت دُوسری اُمتوں کے اہلِ جنت سے کہیں چوتھائی، کہیں نصف، اور اس آخری روایت میں دوتہائی مذکور ہے، اس میں کوئی تعارض اس لئے نہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازہ بیان کیا گیا ہے، اس اندازے میں مختلف اوقات میں زیادتی ہوتی رہی۔ واللہ اعلم۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ﴿۱۵﴾ مَّوْضُونَةٍ کے متعلق حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ نے یہ نقل کیا ہے کہ وہ کپڑا جس پر سونے کے تاروں سے کام بنایا گیا ہو۔ [۱]

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ﴿۱۷﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ لڑکے ہمیشہ اسی حالت میں لڑکے ہی رہیں گے، ان مین کوئی تغیر عمر وغیرہ کا نہ ہوگا، اُن جنت کے غلمان کے متعلق راجح تحقیق یہ ہے کہ حوروں کی طرح یہ بھی جنت ہی میں پیدا ہوئے ہوں گے، اور یہ سب اہلِ جنت کے خادم ہوں گے، روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس ہزاروں خادم ہوں گے۔ (مظہری) [۲]

بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ﴿۱۸﴾ اَكْوَابٌ، كُوْبٌ کی جمع ہے، پانی وغیرہ پینے کے ایسے برتن کو کہتے ہیں، جیسے ہمارے عرف میں گلاس ہوتے ہیں۔ اور اَبَارِيْق، اِبْرِيْقٌ کی جمع ہے، ٹونٹی دار لوٹے کو کہتے ہیں۔ كَأْس خاص شراب کے پیالے کو کہا جاتا ہے، مَعِيْن سے مراد یہ ہے کہ یہ شراب ایک چشمۂ جاریہ سے لائی گئی ہوگی۔

لَا يُصَدَّعُونَ، صُدَاع سے مشتق ہے، جس کے معنی دردِ سر کے ہیں، دُنیا میں شراب زیادہ پینے سے سر میں درد اور چکر جیسے ہوتے ہیں، جنت کی یہ شراب اس سے پاک ہوگی۔

وَلَا يُنْزِفُونَ ﴿۱۹﴾ نزف کے اصلی معنی کنویں کا تمام پانی سینچ لینے کے ہیں، یہاں مراد عقل سے خالی ہوجانا ہے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۲۱﴾ یعنی پرندوں کا گوشت جیسی ان کی خواہش ہو، حدیث میں ہے کہ اہلِ جنت جس وقت کسی پرندے کے گوشت کی طرف رغبت کریں گے تو اس کا گوشت جس طرح کھانے کی رغبت دل میں آئے گی کہ کباب ہو یا دُوسری طرح کا پکا ہوا ہو، اسی طرح کا فوراً تیار ہوکر اس کے سامنے آجائے گا۔ (مظہری) [۳]

وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ مَا أَصْحٰبُ الْيَمِينِ ﴿۲۷﴾ اصحابِ یمین، دراصل مؤمنینِ متقین اور اولیاء اللہ میں گناہگار مسلمان بھی

---

[۱] تفسیر الطبری ج:۲۴ ص:۳۸۷ تحت هذه الآية، وابن ابی حاتم الرقم:۱۸۷۷۶

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۶۸، وجامع الترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی ما لأدنٰی اهل الجنة من الكرامة ج:۲ ص:۸۳

[۳] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۶۹، ومسند البزار، مسند عبدالله بن مسعود رضی الله عنه، رقم الحدیث:۲۰۳۲، ومجمع الزوائد رقم الحدیث:۱۸۷۳۴، کتاب اهل الجنة، باب في ثياب الجنة۔

اُن کے ساتھ مل جائیں گے، بعض تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعض کسی نبی ولی کی شفاعت سے مغفرت اور معافی ہو جانے کے بعد اور بعض کو عذاب ہوگا، مگر اپنے گناہ کا عذاب بھگتنے کے بعد یہ بھی گناہ سے پاک صاف ہو کر اصحاب الیمین کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے، کیونکہ گناہگار مؤمن کے لئے جہنم کی آگ درحقیقت عذاب نہیں، بلکہ کھوٹ سے پاک صاف کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ (مظہری) [۱]

فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ جنت کی نعمتیں بے شمار اور بے مثال و بے قیاس ہیں، ان میں سے جو نعمتیں قرآن کریم ذِکر کرتا ہے وہ مخاطبین کے اندازِ فکر اور اُن کی محبوب و پسندیدہ چیزوں کا ذِکر کرتا ہے، عرب کے لوگ جن تفریحات اور جن پھلوں کے خوگر تھے، یہاں ان میں سے چند کا ذِکر کیا گیا ہے۔ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ سِدْرٍ بیری کے درخت کو کہتے ہیں، مَّخْضُوْدٍ وہ بیری جس کے کانٹے قطع کر دیئے گئے ہوں، اور پھل کے بوجھ سے شاخ جھکی ہوئی ہو، اور یہ جنت کے بیر دُنیا کے بیروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ یہ بیر مٹکوں کے برابر بڑے اور ذائقے میں بھی دُنیا کے بیر سے اس کی کوئی نسبت نہیں (کذا فی الحدیث)۔ [۲] وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ طَلْحٍ، کیلے کا درخت، مَّنْضُوْدٍ، جس کے پھل تہ بر تہ ہوں، جیسے کیلے کے چرخوں میں ہوتے ہیں۔ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ دراز سایہ، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جنت کے بعض درختوں کا سایہ اتنا دراز ہوگا کہ گھوڑے سوار آدمی اس کو سو سال میں بھی قطع نہ کر سکے گا۔ [۳]

وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ جاری پانی جو سطحِ زمین پر بہتا ہو۔

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ كَثِيْرَةٍ کے معنی میں یہ بھی داخل ہے کہ پھلوں کی تعداد بہت ہوگی، اور یہ بھی کہ ان کے اَقسام واَجناس بے شمار ہوں گے۔ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ مَقْطُوْعَةٍ سے مراد جو فصل ختم ہونے پر ختم ہو جائیں، جیسے دُنیا کے عام پھلوں کا یہی حال ہے، کوئی گرمی میں ہوتا ہے، موسم ختم ہونے پر ختم ہو جاتا ہے، کوئی سردی یا برسات میں ہوتا ہے، اور موسم کے ختم پر اس کا نام ونشان نہیں رہتا۔ جنت کا ہر پھل دائمی، ہر وقت، ہر موسم میں موجود رہے گا۔ مَمْنُوْعَةٍ سے مراد بھی یہ ہے کہ دُنیا میں جس طرح درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کے نگراں اُن کو توڑنے سے منع کرتے ہیں، جنت کے پھل اس سے بھی آزاد ہوں گے، اُن کو توڑنے میں کوئی رُکاوٹ نہ ہوگی۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ فُرُشٍ، فِرَاشٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں بستر یا فرش، فرش کی بلندی اوّل تو اس لئے ہے کہ یہ مقام خود ہی بلند ہے، دُوسرے خود یہ فرش زمین پر نہیں بلکہ تختوں اور چارپائیوں کے اُوپر ہوں گے، تیسرے خود فرش

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۷۱

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۷۱، وایضًا انظر: المستدرك للحاكمؒ، تفسیر سورة الواقعة، رقم الحدیث:۳۷۳۷

[۳] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الواقعة، ج:۲ ص:۷۲۴، وصحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها ج:۲ ص:۳۷۸

بھی دبیز ہوگا، اور بعض مفسرین نے اس جگہ فراش سے مراد عورت کو قرار دیا ہے، کیونکہ عورت کو بھی لفظ فراش سے تعبیر کیا جاتا ہے، حدیث میں ہے: "اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ" [۱] اس میں فراش سے بیوی مراد ہے، اور اگلی آیتوں میں جو جنتی عورتوں کی صفات مذکور ہیں وہ بھی اس معنی کا قرینہ ہیں (مظہری)۔ [۲] اس صورت میں لفظ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ رفعت درجے کے اعتبار سے ہوگا، بمعنی بلند پایہ۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ اِنْشَآءً کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، هُنَّ کی ضمیر جنت کی عورتوں کی طرف راجع ہے، اگرچہ سابقہ قریبی آیات میں اُن کا ذِکر نہیں ہے، مگر ذرا فاصلے سے السّٰبِقُوْنَ کے بیان میں ان کا ذِکر آچکا ہے، اس لئے ضمیر ان کی طرف راجع ہوسکتی ہے، اور اگر آیتِ مذکورہ میں فراش سے مراد جنت کی عورتیں ہیں، تو ضمیر ان کی طرف ہونا ظاہر ہے، نیز فرش وبستر وغیرہ عیش کی چیزوں کے ذکر میں خود ایک دلالت عورت کی طرف پائی جاتی ہے، اس لئے بھی ضمیر اس طرف راجع ہوسکتی ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے جنت کی عورتوں کی پیدائش وتخلیق ایک خاص انداز سے کی ہے، یہ خاص انداز حورانِ جنت کے لئے تو اس طرح ہے کہ وہ جنت ہی میں بغیر ولادت کے پیدا کی گئی ہیں۔ اور دُنیا کی عورتیں جو جنت میں جائیں گی ان کی خاص تخلیق سے مطلب یہ ہوگا کہ جو دُنیا میں بدشکل، سیاہ رنگ یا بوڑھی تھی، اب اس کو حسین شکل وصورت میں جوان رعنا کر دیا جائے گا، جیسا کہ ترمذی اور بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً کی تفسیر میں فرمایا کہ جو عورتیں دُنیا میں بوڑھی چندھی، سفید بال، بدشکل تھیں، انہیں یہ نئی تخلیق حسین، نوجوان بنادے گی۔ [۳] اور بیہقی نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، میرے پاس ایک بُڑھیا بیٹھی ہوئی تھی، آپ نے دریافت فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری رشتے کی ایک خالہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مزاح کے فرمایا: "لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ" یعنی جنت میں کوئی بُڑھیا نہ جائے گی۔ یہ بے چاری سخت غمگین ہوئی، بعض روایات میں ہے کہ رونے لگی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلی دی اور اپنی بات کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ جس وقت یہ جنت میں جائے گی تو بوڑھی نہ ہوگی، بلکہ جوان ہوکر داخل ہوگی، اور یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (مظہری) [۴]

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب تفسیر المشبهات ج:۱ ص:۲۷۵

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۷۲

[۳] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب من تفسیر سورة الواقعة (بالاختصار) ج:۲ ص:۱۲۵

[۴] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۷۳، وشرح السُّنَّة للبغویؒ (باختلاف فی الألفاظ) رقم الحدیث:۳۲۰۶، والمعجم الأوسط للطبرانی، رقم الحدیث:۵۷۰۳

اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ بِکْر، بکسر الیاء کی جمع ہے، کنواری لڑکی کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ جنت کی عورتوں کی تخلیق اس شان کی ہوگی کہ وہ ہر صحبت و مباشرت کے بعد پھر کنواری جیسی ہو جائیں گی۔

عُرُبًا، بضم عین وراء، عروبہ کی جمع ہے، اُس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر کی عاشق اور اس کی من پسند محبوبہ ہو۔

اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ تِرب، بکسر تاء کی جمع ہے، جس کے معنی ہم عمر کے ہیں جو مٹی میں ساتھ کھیلا ہو۔ جنت میں مرد و عورت سب ہم عمر کر دیئے جائیں گے، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ سب کی عمر تینتیس سال ہوگی۔ (مظہری) [1]

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ ثُلَّةٌ کے معنی بڑی جماعت اور اوّلین و آخرین کی تفسیر میں حضراتِ مفسرین کے دو قول اُوپر السّٰبِقُوْنَ کے بیان میں مذکور ہو چکے ہیں۔ اگر ''اوّلین'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک کے حضرات، اور ''آخرین'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تا قیامت ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا، تو اس آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اصحاب الیمین یعنی مؤمنین متقین کی تعداد پچھلی اُمتوں کے مجموعے میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اور تنہا اُمتِ محمدیہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اس صورت میں اوّل تو اُمتِ محمدیہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اس صورت میں اوّل تو اُمتِ محمدیہ کی فضیلت کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں کہ پچھلے لاکھوں انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں کی برابر یہ اُمت ہو جائے جس کا زمانہ بہت مختصر ہے، اس کے علاوہ لفظ ثُلَّةٌ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ یہ ثلّہ آخرین تعدادِ اوّلین سے بڑھ جائے گا۔

اور اگر دُوسری تفسیر مراد لی جائے کہ اوّلین و آخرین دونوں اسی اُمت کے مراد ہیں، جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بغوی نے اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مسدّد، طبرانی اور ابنِ مردویہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر فرمایا کہ: ''هُمَا مِنْ اُمَّتِيْ'' [2] یعنی یہ اوّلین و آخرین میری اُمت ہی کے دو طبقے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ سابقینِ اوّلین صحابہ و تابعین وغیرہ جیسے حضرات سے بھی یہ اُمت آخر تک بالکل محروم نہ ہوگی، اگرچہ آخری دور میں ایسے لوگ کم ہوں گے، اور مؤمنین و متقین و اولیاء اللہ تو اس پوری اُمت کے اوّل و آخر میں بھاری تعداد میں رہیں گے، اور اُمتِ محمدیہ کا کوئی دور، کوئی طبقہ اصحاب الیمین سے خالی نہ رہے گا، اس کی شہادت اس حدیث سے بھی ملتی ہے جو صحیح بخاری و مسلم میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

[1] تفسیر المظھری ج:۹ ص:۱۷۳، وجامع الترمذی، ابواب صفة الجنّة، باب ما جاء فی سن أھل الجنّة ج:۲ ص:۸۱

[2] تفسیر البغوی تحت ھٰذہ الآیة ج:۸ ص:۱۸، وتفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۰۸

علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور ہزاروں مخالفتوں کے نرغے میں بھی وہ اپنا رُشد وہدایت کا کام کرتی رہے گی، اس کو کسی کی مخالفت نقصان نہ پہنچا سکے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہونے تک یہ جماعت اپنے کام میں لگی رہے گی۔ [۱]

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْ لَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾

ہم نے تم کو بنایا پھر کیوں نہیں سچ مانتے، بھلا دیکھو تو جو پانی تم ٹپکاتے ہو،

ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ

اب تم اس کو بناتے ہو یا ہم ہیں بنانے والے، ہم ٹھہرا چکے تم میں مرنا

وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ

اور ہم عاجز نہیں اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اُٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں

فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

جہاں تم نہیں جانتے، اور تم جان چکے ہو پہلا اُٹھان پھر کیوں نہیں یاد کرتے،

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾

بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو، کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے،

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا ہوا گھاس، پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے، ہم تو قرض دار رہ گئے،

---

[۱] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين ...إلخ، ج:۲ ص:۱۴۳، وصحيح البخاري، كتاب المناقب، باب بعد باب سؤال المشركين أن يريهم النبي صلى الله عليه وسلم ج:۱ ص:۵۱۴

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾

بلکہ ہم بے نصیب ہوگئے، بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو،

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ

کیا تم نے اُتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اُتارنے والے، اگر ہم چاہیں کردیں اس کو

اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾

کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے، بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو،

ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً

کیا تم نے پیدا کیا اس کا درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے، ہم نے ہی تو بنایا وہ درخت یاد دلانے کو

وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾ ج فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ ع الثّلاثة

اور برتنے کو جنگل والوں کے، سو بول پاکی اپنے رَبّ کے نام کی جو سب سے بڑا

آسان ترجمۂ قرآن

ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ ﴿۵۷﴾ ذرا یہ بتلاؤ کہ جو نطفہ تم ٹپکاتے ہو، ﴿۵۸﴾ کیا اُسے تم پیدا کرتے ہو، یا پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ﴿۵۹﴾ ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کے فیصلے کر رکھے ہیں، اور کوئی نہیں ہے جو ہمیں اس بات سے عاجز کر سکے ﴿۶۰﴾ کہ ہم تمہاری جگہ تم جیسے اور لوگ لے آئیں، اور تمہیں پھر سے کسی ایسی حالت میں پیدا کر دیں جسے تم نہیں جانتے۔ ﴿۶۱﴾ اور تمہیں اپنی پہلی پیدائش کا پورا پتہ ہے، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟ ﴿۶۲﴾ اچھا یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم زمین میں بوتے ہو، ﴿۶۳﴾ کیا اُسے تم اُگاتے ہو، یا اُگانے والے ہم ہیں؟ ﴿۶۴﴾ اگر ہم چاہیں تو اُسے چورا چورا کر ڈالیں، جس پر تم بھونچکے رہ جاؤ ﴿۶۵﴾ کہ ہم پر تو تاوان پڑ گیا، ﴿۶۶﴾ بلکہ ہم ہیں ہی بدنصیب! ﴿۶۷﴾ اچھا یہ بتاؤ کہ یہ پانی جو تم پیتے ہو، ﴿۶۸﴾ کیا اُسے بادلوں سے تم نے اُتارا ہے، یا اُتارنے والے ہم ہیں؟ ﴿۶۹﴾ اگر ہم چاہیں تو اُسے کڑوا بنا کر رکھ دیں، پھر تم کیوں

شکر ادا نہیں کرتے؟ (۷۰) اچھا یہ بتاؤ کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، (۷۱) کیا اُس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے، یا پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ (۷۲) ہم نے ہی اُس کو نصیحت کا سامان اور صحرائی مسافروں کے لئے فائدے کی چیز بنایا ہے۔ (۷۳) لہٰذا (اے پیغمبر!) تم اپنے عظیم پروردگار کا نام لے کر اُس کی تسبیح کرو۔ (۷۴)

خلاصۂ تفسیر

ہم نے تم کو (اوّل بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) تو پھر تم (باعتبار اس کے نعمت ہونے کے توحید کی اور باعتبار اس کے دلیل قدرت علی الاعادہ ہونے کے قیامت کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ (آگے اس تخلیق کی، پھر اس کے اسبابِ بقاء کی تفصیل وتذکیر ہے، یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو، اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟ (اور ظاہر ہے کہ ہم ہی بناتے ہیں، اور) ہم ہی نے تمہارے درمیان میں موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے (مطلب یہ کہ بنانا اور اس بنائے ہوئے کو ایک وقتِ خاص تک باقی رکھنا یہ سب ہمارا ہی کام ہے، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ جیسا انسان کی ذات کا پیدا کرنا اور باقی رکھنا ہمارا فعل ہے، اسی طرح تمہاری موجودہ صورت کو برقرار رکھنا بھی ہمارا ہی فعل ہے) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تو تم جیسے اور (آدمی) پیدا کر دیں، اور تم کو ایسی صورت بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں، (یعنی مثلاً آدمی سے جانور کی صورت میں مسخ کر دیں جس کا گمان بھی نہیں) اور (آگے تنبیہ ہے اس کی دلیل پر یعنی) تم کو اوّل پیدائش کا علم حاصل ہے (کہ وہ ہماری قدرت سے ہے) پھر تم کیوں نہیں سمجھتے (کہ سمجھ کر اس نعمت کا شکر ادا کرو اور توحید کا اِقرار کرو اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے پر بھی استدلال کرو، آگے ایک دُوسری تنبیہ ہے، یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو، اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں، (یعنی زمین میں بیج ڈالنے میں تو تم کو کچھ دخل ہے بھی، لیکن اس کو زمین سے نکالنا یہ کس کا فعل ہے؟ آگے یہ بتلاتے ہیں کہ زمین سے درخت اُگانا جیسا ہمارا کام ہے، آگے اس درخت سے تمہارا فائدہ اُٹھانا بھی ہماری قدرت وحکمت پر موقوف ہے، جیسا اُوپر بھی فرمایا تھا، یعنی اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چُورا چُورا کر دیں، (یعنی دانہ کچھ نہ پڑے، پتی خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے) پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ کہ (اب کے تو) ہم پر تاوان ہی پڑ گیا (یعنی سرمایہ میں نقصان آ گیا، اور نقصان کیا) بلکہ بالکل ہی محروم رہ گئے (یعنی سارا ہی سرمایہ گیا گزرا، آگے تیسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں، (پھر اس پانی کو پینے کے قابل بنانا ہماری دُوسری نعمت ہے کہ) اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر ڈالیں، تو تم شکر کیوں نہیں کرتے، (اور بڑا شکر عقیدۂ توحید وترکِ کفر ہے، آگے چوتھی

تنبیہ ہے، یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو (جس میں سے یہ آگ جھڑتی ہے، جس کا بیان آخر سورۂ یٰسٓ میں آچکا ہے، اور اسی طرح جن ذرائع سے یہ آگ پیدا ہوتی ہے، اُن ذرائع کو) تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو (آتشِ دوزخ کی یا اپنی قدرتِ عجیبہ کی یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے لئے فائدے کی چیز بنایا ہے (یاددہانی ایک دینی فائدہ ہے، اور دُوسرا دُنیوی فائدہ آگ سے کھانا پکانے کا ہے، اور تخصیص مسافر کی حصر کے لئے نہیں بلکہ سفر میں آگ کمیاب ہونے کے سبب ایک شے عجیب ہوتی ہے، اور مَتَاعًا میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ آگ سے فائدہ اُٹھانا بھی ہماری قدرت سے ہے) سو (جس کی ایسی قدرت ہے) اپنے (اُس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے (کہ کمال ذات وصفات مقتضی اِستحقاقِ حمد وثنا ہیں، اور نام کی تسبیح وغیرہ کی تحقیق آیۃ آخر سورۂ رحمٰن میں گزر چکی ہے)۔

معارف ومسائل

شروع سورت سے یہاں تک محشر میں انسانوں کی تین قسمیں اور تینوں قسموں کے اَحکام اور جزا وسزا کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں اُن گمراہ لوگوں کو تنبیہ ہے جو سرے سے قیامت قائم ہونے اور دوبارہ زندہ ہونے ہی کے قائل نہیں، یا اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دُوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، انسان کی اُس غفلت اور جہالت کا پردہ چاک کرنا ہے جس نے اس کو بھول میں ڈال رکھا ہے۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ اس عالمِ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، یا وجود میں آرہا ہے، یا آئندہ آنے والا ہے، اس کی تخلیق، پھر اس کو باقی رکھنا، اور پھر اس کو اِنسان کے مختلف کاموں میں لگا دینا، یہ سب درحقیقت حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرت وحکمت کے کرشمے ہیں، اگر اسباب کے پردے درمیان میں نہ ہوں اور اِنسان ان سب چیزوں کی تخلیق بلاواسطہ اسباب کے مشاہدہ کرلے تو اِیمان لانے پر مجبور ہوجائے، مگر حق تعالیٰ نے دُنیا کو دارُ الامتحان بنایا ہے، اس لئے یہاں جو کچھ وجود وظہور میں آتا ہے وہ اسباب کے پردوں میں آتا ہے۔

اور حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے ان اسباب اور مسبّبات میں ایک ایسا رابطۂ مستحکم قائم فرمادیا ہے کہ جہاں کہیں سبب موجود ہوتا ہے، تو مسبّب ساتھ ساتھ وجود میں آجاتا ہے، جس کو دیکھنے والا لازم وملزوم سمجھتا ہے، اور ظاہر بین نظریں اسی سلسلۂ اسباب میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، اور تخلیقِ کائنات کو ان ہی اسباب کی طرف منسوب کرنے لگتی ہیں، اصل قدرت اور حقیقی قوتِ فاعلہ جو ان اسباب ومسبّبات کو گردش کردینے والی ہے، اس کی طرف التفات نہیں رہتا۔

آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اوّل خود اِنسان کی تخلیق کی حقیقت کو واضح فرمایا، پھر اِنسانی ضروریات کی تخلیق کی

حقیقت سے پردہ اُٹھایا، خود اِنسان کو مخاطب کر کے سوالات کئے، ان سوالات کے ذریعے اصل جواب کی طرف رہنمائی فرمائی، کیونکہ سوالات میں اُن اسباب کی کمزوری اور ان کا علتِ تخلیق نہ ہونا واضح فرمادیا۔

آیاتِ مذکورہ میں پہلی آیت نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ ایک دعویٰ ہے، اور اگلی آیات اس کے دلائل ہیں، سب سے پہلے خود اِنسان کی تخلیق پر ایک سوال کیا گیا، کیونکہ غافل انسان چونکہ روزمرّہ اس کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ مرد وعورت کے اِختلاط سے حمل قرار پاتا ہے، اور پھر وہ رحمِ مادر میں بڑھتا اور تیار ہوتا رہتا ہے، اور نو مہینے کے بعد ایک مکمل انسان کی صورت میں پیدا ہوجاتا ہے، اس روزمرّہ کے مشاہدے سے غفلت شعار اِنسان کی نظر بس یہیں تک رہ جاتی ہے، کہ مرد وعورت کے باہمی اِختلاط ہی کو تخلیقِ انسانی کی علتِ حقیقی سمجھنے لگتا ہے، اس لئے سوال یہ کیا گیا: اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝۵۸ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۵۹ یعنی اے انسان! ذرا غور تو کر کہ بچے کی پیدائش میں تیرا دخل اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے ایک قطرۂ منی ایک خاص محل میں پہنچادیا، اس کے بعد کیا تجھے کچھ خبر ہے کہ اس نطفے پر کیا کیا دور گزرے؟ کیا کیا تغیرات آئے؟ کس کس طرح اس میں ہڈیاں اور گوشت پوست پیدا ہوئے؟ اور کس کس طرح اس عالمِ اصغر کے وجود میں کیسی کیسی نازک مشینیں غذا حاصل کرنے، خون بنانے اور رُوحِ حیوانی پیدا کرنے کی، پھر دیکھنے، بولنے، سننے، چکھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوّت اس کے وجود میں نصب فرمائیں کہ ایک انسان کا وجود ایک متحرک فیکٹری بن گیا، نہ باپ کو خبر ہے نہ ماں کو جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہورہا ہے، آخر اگر عقل دُنیا میں کوئی چیز ہے تو وہ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ عجیب وغریب حکمتوں پر مشتمل انسانی وجود کیا خود بخود بغیر کسی کے بنائے بن گیا؟ اور اگر کوئی بنانے والا ہے تو وہ کون ہے؟ ماں باپ کو تو خبر بھی نہیں کہ کیا بنا؟ کس طرح بنا؟ ان کو تو وضعِ حمل تک یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حمل لڑکا ہے یا لڑکی؟ پھر آخر وہ کون سی قدرت ہے جس نے پیٹ کی، پھر رحم کی، پھر بچے کے اُوپر لپیٹ کی ہوئی جھلی کی تین اندھیریوں میں یہ حسین وجمیل، سمیع وبصیر، سوچنے سمجھنے والا وجود تیار کردیا، یہاں جو فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴ (المؤمنون)[1] بول اُٹھنے پر مجبور نہ ہوجائے، وہ عقل کا اندھا ہی ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں یہ بھی بتلادیا کہ اے انسانو! تم پیدا ہوجانے اور چلتا پھرتا فعال آدمی بن جانے کے بعد بھی اپنے وجود وبقاء اور تمام کاروبار میں ہمارے ہی محتاج ہو۔ ہم نے تمہاری موت کا بھی ابھی سے ایک وقت مقرّر کر رکھا ہے اور اس وقتِ مقرّر سے پہلے پہلے جو عمر تمہیں ملی اس میں تم اپنے آپ کو خودمختار پاتے ہو، یہ بھی تمہارا مغالطہ ہی ہے، ہمیں اس پر بھی قدرت ہے کہ ابھی ابھی تمہیں فنا کر کے تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم پیدا کردیں، اور یہ بھی قدرت ہے کہ تمہیں فنا کرنے کے بجائے کسی دُوسری صورتِ حیوانی یا جماداتی میں تمہیں تبدیل کردیں، یہ مضمون ان آیات کا ہے: نَحْنُ قَدَّرْنَا

[1] ترجمہ: سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ موت کے مقدّر اور وقتِ معین پر آنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم اپنی بقاء میں آزاد و خود مختار نہیں، بلکہ تمہاری بقاء ایک معین وقت تک ہے، تمہیں حق تعالیٰ نے ایک خاص قوّت وقدرت اور عقل وحکمت کا حامل بنایا ہے، اس سے کام لے کر تم بہت کچھ کر سکتے ہو، وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ﴿۶۰﴾ کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے ارادے پر سبقت کرنے والا اور ہماری مشیت پر غالب آنے والا کوئی نہیں، ہم اس وقت بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں، کہ اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ یعنی تمہاری جگہ تمہارے مثل کوئی اور قوم لے آئیں، وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ اور تمہاری وہ شکل بنادیں جس کو تم جانتے بھی نہیں، اس کی یہ شکل بھی ہوسکتی ہے کہ مر کر مٹی ہو جاؤ، یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جاؤ، جیسے پچھلی اُمتوں پر صورتیں مسخ ہو کر بندر اور خنزیر بن جانے کا عذاب آچکا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہیں پتھروں اور جمادات کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ تخلیقِ انسانی کے معاملے میں انسان کی غفلت اور اسبابِ طبعیہ کے پردے میں اُلجھ کر اصل خالق و مالک سے بے خبر ہونے کا پردہ چاک کرنے کے بعد اس کی غذا جو اس کی زندگی کا مدار ہے، اس کی حقیقت اسی انداز سے ظاہر فرمائی کہ سوال کیا کہ تم جو کچھ زمین میں بیج بوتے ہو ذرا غور تو کرو کہ اس بیج میں سے درخت پیدا کرنے میں تمہارے عمل کا کیا اور کتنا دخل ہے؟ غور کرو گے تو جواب اس کے سوا نہ ملے گا کہ کاشتکار کا دَخل اس میں اس سے زیادہ نہیں کہ اُس نے زمین کو ہل چلا کر پھر کھاد ڈال کر نرم کر دیا، کہ جو ضعیف کونپل اس دانے سے پیدا ہو کر اُوپر آنا چاہے اس کی راہ میں زمین کی سختی رُکاوٹ نہ بنے، بیج بونے والے انسان کی ساری کوشش اسی ایک نقطے کے گرد دائر ہے، اور جب درخت نمودار ہو جائے تو اس کی حفاظت پر یہ کوشش لگ جاتی ہے، لیکن ایک دانے کے اندر سے درخت نکال لانا، نہ اس کے بس کا ہے، نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے یہ درخت بنایا ہے، تو پھر وہی سوال آتا ہے کہ منوں مٹی کے ڈھیر میں پڑے ہوئے دانے کے اندر سے یہ خوب صورت اور ہزاروں فوائد پر مشتمل درخت کس نے بنایا؟ تو جواب اس کے سوا کیا ہے کہ وہی مالک وخالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ اور صنعتِ عجیبہ اس کی بنانے والی ہے۔

اس کے بعد اسی طرح پانی جس کو پی کر انسان زندہ رہتا ہے، آگ جس پر اپنا کھانا پکاتا ہے اور اپنی صنعتوں کو اس سے چلاتا ہے، ان سب کی تخلیق پر ایسے ہی سوال وجواب کا ذکر فرمایا، اور آخر میں سب کا خلاصہ یہ بیان فرمایا:-

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ مُقْوِيْنَ، اِقْوَاءٌ سے مشتق ہے، اور وہ قُوَاءٌ بمعنی صحراء سے مشتق ہے، مُقْوِی کے معنے ہوئے صحراء میں اُترنے والا، مراد اس سے مسافر ہے جو جنگل میں کہیں ٹھہر کر اپنے کھانے کے انتظام میں لگا ہو، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ یہ سب تخلیقات ہماری ہی قدرت وحکمت کا نتیجہ ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ اس کا لازمی اور عقلی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور توحید پر ایمان لائے اور اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح پڑھا کرے، کہ یہی اس کی نعمتوں کا شکر ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾

سو میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے ڈوبنے کی، اور یہ قسم ہے اگر سمجھو تو بڑی قسم،

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾

بے شک یہ قرآن ہے عزت والا، لکھا ہوا ہے ایک پوشیدہ کتاب میں، اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں،

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾

اُتارا ہوا ہے پروردگارِ عالم کی طرف سے، اب کیا اس بات میں تم سستی کرتے ہو،

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾

اور اپنا حصہ تم یہی لیتے ہو کہ اس کو جھٹلاتے ہو، پھر کیوں نہیں جس وقت جان پہنچے حلق کو،

وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ

اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو، اور ہم اس کے پاس ہیں تم سے زیادہ پر

لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ

تم نہیں دیکھتے، پھر کیوں نہیں اگر تم نہیں ہو کسی کے حکم میں، تو کیوں نہیں پھیر لیتے اس رُوح کو اگر ہو تم

صٰدِقِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ

سچے، سو جو اگر وہ (مردہ) ہوا مقرّب لوگوں میں، تو راحت ہے اور روزی ہے

وَّجَنّٰتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ

اور باغ نعمت کا، اور جو اگر وہ ہوا داہنے والوں میں، تو سلامتی پہنچے تجھ کو

مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾

داہنے والوں سے، اور جو اگر وہ ہوا جھٹلانے والوں، بہکنے والوں میں سے،

فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾

تو مہمانی ہے جلتا پانی، اور ڈالنا آگ میں، بے شک یہ بات یہی ہے لائق یقین کے،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

سو بول پاکی اپنے رَبّ کے نام سے جو سب سے بڑا

آسان ترجمۂ قرآن

اب میں اُن جگہوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جہاں ستارے گرتے ہیں، ﴿٧٥﴾ ــــ اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی زبردست قسم ہے ــــ ﴿٧٦﴾ کہ یہ بڑا باوقار قرآن ہے ﴿٧٧﴾ جو ایک محفوظ کتاب میں (پہلے سے) درج ہے، ﴿٧٨﴾ اُس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو خوب پاک ہیں، ﴿٧٩﴾ یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا جا رہا ہے۔ ﴿٨٠﴾ کیا پھر بھی تم اس کلام سے بے پروائی برتتے ہو؟ ﴿٨١﴾ اور تم نے اسی کو اپنا روزگار بنا لیا ہے کہ (اس کو) جھٹلاتے رہو؟ ﴿٨٢﴾ پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب (کسی کی) جان گلے تک پہنچ جاتی ہے، ﴿٨٣﴾ اور اُس وقت تم (حسرت سے اُس کو) دیکھ رہے ہوتے ہو، ﴿٨٤﴾ ــــ اور تم سے زیادہ ہم اُس کے قریب ہوتے ہیں، مگر تمہیں نظر نہیں آتا ــــ ﴿٨٥﴾ اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے تو ایسا کیوں نہیں ہوتا ﴿٨٦﴾ کہ تم اُس جان کو واپس لے آؤ، اگر تم سچے ہو؟ ﴿٨٧﴾ پھر اگر وہ (مرنے والا) اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو ﴿٨٨﴾ تو (اُس کے لئے) آرام ہی آرام ہے، خوشبو ہی خوشبو ہے، اور نعمتوں سے بھرا باغ ہے۔ ﴿٨٩﴾ اور اگر وہ دائیں ہاتھ والوں میں سے ہو ﴿٩٠﴾ تو (اُس سے کہا جائے گا کہ:) "تمہارے لئے سلامتی ہی سلامتی ہے کہ تم دائیں ہاتھ والوں میں سے ہو۔" ﴿٩١﴾ اور اگر وہ اُن گمراہوں میں سے ہو جو حق کو جھٹلانے والے تھے ﴿٩٢﴾ تو (اُس کے

لئے) کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی ہے، ﴿۹۳﴾ اور دوزخ کا داخلہ ہے! ﴿۹۴﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ بالکل صحیح معنی میں یہی یقینی بات ہے۔ ﴿۹۵﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) تم اپنے عظیم پروردگار کا نام لے کر اُس کی تسبیح کرو۔ ﴿۹۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور دلائلِ عقلیہ سے بعث یعنی مرکر زندہ ہونے کا امکان ثابت ہونے کے بعد قرآن سے جو اس کا وقوع ثابت ہے اور تم اس قرآن کو نہیں مانتے) سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے (اور قسم اس بات کی کھاتا ہوں) کہ یہ (قرآن جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے بوجہ منزّل من اللہ ہونے کے) ایک مکرّم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں (پہلے سے) درج ہے (اور وہ لوحِ محفوظ ایسی ہے) کہ بجز اس کو پاک فرشتوں کے (کہ گناہوں سے بالکلیہ پاک ہیں) کوئی (شیطان وغیرہ) ہاتھ نہیں لگانے پاتا (اس کے مضامین پر مطلع ہونا تو دُور کی بات ہے، پس وہاں سے یہاں خاص طور پر آنا فرشتے ہی کے ذریعے سے ہے، اور یہی نبوّت ہے، اور شیاطین اس کو لا ہی نہیں سکتے، کہ احتمالِ کہانت وغیرہ سے نبوّت میں شبہ ہو، کقولہ تعالیٰ: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿۱۹۳﴾ (الشعراء)[1]، وقولہ تعالیٰ: وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ﴿۲۱۰﴾ (الشعراء)[2] اس سے ثابت ہوا کہ) یہ ربّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے (جو کہ اشارۂ کریم کا مدلول تھا، یہاں ستاروں کے چھپنے کی قسم اپنے مفہوم ومقصد کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے شروع سورۂ والنجم میں ہے، جس کا وہاں بیان ہو چکا ہے، جس میں ستاروں کا باعتبار غروب کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موصوف بالنبوۃ اور منارالہدیٰ ہونے کا نظیر ہونا بھی بیان ہوا ہے، جو کہ مقصود مقام ہے، اور قسمیں جتنی قرآن میں ہیں بوجہ دلالت علی المطلوب کے سب ہی عظیم ہیں، لیکن کہیں کہیں مطلوب کے خاص اہتمام اور اس پر زیادہ متنبہ کرنے کے لئے عظیم ہونے کی تصریح بھی فرمادی ہے، جیسا کہ اس جگہ اور سورۂ والفجر میں، حاصل مقام کا اجمالاً وہ ہے جو تفصیلاً اَخیر رُکوع میں سورۂ شعراء کے اِرشاد ہوا ہے) سو (جب اس کا منزّل من اللہ ہونا ثابت ہے تو) کیا تم لوگ اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو (یعنی اس کو واجب التصدیق نہیں جانتے) اور (اس مداہنت سے بڑھ کر یہ کہ) تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے ہو (اور اس لئے توحید ووقوعِ قیامت کا بھی انکار کرتے ہو) سو (اگر یہ انکار حق ہے تو) جس وقت (مرنے کے قریب کسی شخص کی) رُوح حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم اُس وقت (بیٹھے حسرت آلودہ نگاہ سے) تکا کرتے ہو اور ہم (اس وقت) اُس (مرنے والے) شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں (یعنی تم سے بھی زیادہ اس شخص کے حال سے واقف ہوتے ہیں، کیونکہ تم صرف ظاہری حالت

---

[1] ترجمہ: اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔

[2] ترجمہ: اور اس کو شیاطین لے کر نہیں آئے۔

دیکھتے ہو، اور ہم اس کی باطنی حالت پر بھی مطلع ہوتے ہیں) لیکن (ہمارے اس قربِ علمی کو بوجہ اپنے جہل وکفر کے) تم سمجھتے نہیں ہو تو (فی الواقع) اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے (جیسا تمہارا خیال ہے) تو تم اس رُوح کو (بدن کی طرف) پھر کیوں نہیں لوٹا لاتے ہو (جس کی اس وقت تم کو تمنا بھی ہوا کرتی ہے) اگر (اس انکارِ قیامت وحساب میں) تم سچے ہو (مطلب یہ کہ قرآن صادق ہے اور وقوع بعث کا ناطق ہے، پس مقتضی وقوع متحقق ہوا اور مانع کوئی امر ہے نہیں، پس وقوع ثابت ہو گیا اور اس پر بھی تمہارا انکار اور نفی کئے چلا جانا بدلالتِ حال اس کو مستلزم ہے کہ گویا تم روح کو اپنے بس میں سمجھتے ہو کہ گو قیامت میں خدا دوبارہ رُوح ڈالنا چاہے جیسا کہ مقتضا قرآن کا ہے، مگر ہم نہ ڈالنے دیں گے اور بعث نہ ہونے دیں گے، جب ہی تو ایسے زور سے نفی کرتے ہو، ورنہ جو اپنے کو عاجز جانے وہ دلائل وقوع کے بعد ایسے زور کی بات کیوں کہے؟ سو اگر تم اپنے بس میں سمجھتے ہو تو ذرا اپنا زور اسی وقت دِکھلا دو جبکہ کسی قریب الموت انسان کے بقائے حیات کے متمنّی بھی ہوتے ہو، اور دیکھ دیکھ کر رحم بھی آتا ہے، دِل گیر بھی ہوتے ہو، اور وہ زور دِکھلانا یہ کہ اس رُوح کو نکلنے نہ دو، بدن میں لوٹا دو، جب اس پر بس نہیں کہ رُوح کو بدن سے نکلنے نہ دو تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے سے روکنے پر کیسے تمہارا بس چلے گا؟ پس ایسے لاطائل دعوے کیوں کرتے ہو؟ اور چونکہ مقام ہے نفیٔ قدرت کا، اور نفیٔ علم مستلزم ہے نفیٔ تعلق قدرت کو، اس لئے وَنَحْنُ اَقْرَبُ جملہ معترضہ میں اُن کے علمِ تام کی نفی فرمادی، اور چونکہ یہ دلیل کافی ان کے لئے شافی نہ ہوئی، اس لئے لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ میں توبیخ بھی فرمادی، اور چونکہ اس تقدیر سے اِثباتِ قدرت بھی ہوا، اس لئے بعث کے ساتھ یہ توحید کی بھی دلیل ہے، آگے کیفیت مجازاۃ کی ارشاد ہے، یعنی یہ تو ثابت ہو چکا کہ قیامت اپنے وقت پر ضرور آئے گی) پھر (جب قیامت واقع ہو گی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا (جن کا ذِکر اُوپر آیا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الخ) اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں، اور آرام کی جنت ہے، اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا (جن کا ذِکر اُوپر آیا ہے وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ الخ) تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے (ہر آفت اور خطرے سے) امن وامان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے، (اور یہ کہنا خواہ ابتداءً ہو، اگر فضل یا توبہ کے سبب اوّل ہی مغفرت ہو جائے یا انتہاءً ہو، اگر بعد سزا کے مغفرت ہو اور یہاں رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ کا ذِکر نہ فرمانا نفی کے لئے نہیں، بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سابقین سے ان اُمور میں کم ہوگا) اور جو شخص جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں میں سے ہوگا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہو گی اور دوزخ میں داخل ہونا ہوگا، بے شک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کے یہ تصرفات ہیں) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے (وقد مرّ آنفًا)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں عقلی دلائل سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس دُنیاوی

تخلیق کے ذریعے دیا گیا تھا، آگے نقلی دلیل اسی پر حق تعالیٰ کی طرف سے قسم کے ساتھ دی گئی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ لفظ لَا قسم کے شروع میں ایک عام محاورہ ہے، جیسے: "لَا وَاللّٰہِ"، اور جاہلیت کی قسموں میں: "لَا وَاَبِیْكَ" مشہور ہے، بعض حضرات نے اس حرف لَا کو زائد قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کی توجیہ یہ کی کہ اس موقع میں حرف لَا مخاطب کے گمان کی نفی کے لئے ہوتا ہے، یعنی: "لَیْسَ کَمَا تَقُوْلُ" یعنی جیسا تم کہتے اور سمجھتے ہو وہ بات نہیں، بلکہ حقیقت وہ ہے جو آگے قسم کھا کر بتلائی جاتی ہے۔

مَوَاقِع، مَوْقِع کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ یا وقت۔ اس آیت میں ستاروں کی قسم کو غروب کے وقت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جیسے سورۂ نجم میں بھی وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ﴿۱﴾ میں بھی وقتِ غروب کی قید ہے، اس قید کی حکمت یہ ہے کہ غروب کے وقت ہر ستارے کے عمل کا اس اُفق سے انقطاع نظر آتا ہے اور اس کے آثار کی فنا کا مشاہدہ ہوتا ہے، جس سے ان کا حادث اور قدرتِ الٰہیہ کا محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ سابقہ آیات میں مواقع النجوم کی قسم کھا کر جو مضمون جوابِ قسم کا بیان کرنا ہے، وہ ان آیات میں مذکور ہے، جس کا حاصل قرآنِ کریم کا مکرّم و محفوظ ہونا اور مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا، یا معاذ اللہ شیطان کا اِلقاء کیا ہوا کلام ہے۔

كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ کے لفظی معنی چھپی ہوئی مستور کتاب، مراد اس سے لوحِ محفوظ ہے۔ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ یہاں دو مسئلے غور طلب اور ائمۂ تفسیر میں مختلف فیہ ہیں۔ اوّل یہ کہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے اس جملے میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ جس کتاب کی ایک صفت مکنون آئی، یہ جملہ اُسی کتاب کی دُوسری صفت ہے، اور ضمیر لَا يَمَسُّهٗٓ کی اسی کتاب کی طرف راجع ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوتے ہیں: کتابِ مکنون یعنی لوحِ محفوظ کو سوائے پاک لوگوں کے اور کوئی نہیں چھوسکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں الْمُطَهَّرُوْنَ کی مراد صرف فرشتے ہی ہوسکتے ہیں، جن کی رسائی لوحِ محفوظ تک ہوسکے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ مَسّ اپنے حقیقی معنی ہاتھ سے چھونے کے مفہوم میں نہیں لیا جاسکتا، بلکہ مَسّ کرنے اور چھونے کے مجازی اور لازمی معنی مراد لینے ہوں گے، یعنی لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے مضامین پر مطلع ہونا، کیونکہ لوحِ محفوظ کو ہاتھ سے چھونا کسی مخلوق فرشتے وغیرہ کا کام نہیں۔ (قرطبی)[1] بیان القرآن کے مذکور الصدر خلاصۂ تفسیر میں یہی ترکیب اور مفہوم اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔

دُوسرا احتمال اس جملے کی ترکیبِ نحوی میں یہ ہے کہ اس کو قرآن کی صفت بنایا جائے جو اُوپر اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ میں مذکور ہے، اس صورت میں لَا يَمَسُّهٗٓ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوگی، اور اس سے مراد وہ صحیفہ ہوگا جس میں قرآن

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۲۵

لکھا ہوا ہو، اور لفظ مَسّ اپنے حقیقی معنی ہاتھ سے چھونے کے مفہوم میں رہے گا، مجاز کی ضرورت نہ ہوگی، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کو ترجیح دی ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ آیت لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ کی تفسیر میں جو کچھ میں نے سنا ہے اُن سب میں بہتر یہ قول ہے کہ اس کا وہی مفہوم ہے جو سورۂ عبس کی آیت کا ہے، یعنی: فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾ [1] (قرطبی وروح المعانی) [2] اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ جملہ کتابِ مکنون کی صفت نہیں بلکہ قرآن کی صفت ہے، اور قرآن سے مراد وہ صحیفے ہیں جو وحی لانے والے فرشتوں کے ہاتھ میں دیئے جاتے ہیں۔

دُوسرا مسئلہ غور طلب اور مختلف فیہ اس آیت میں یہ ہے کہ الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ سے کون مراد ہیں؟ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اور مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ سے مراد فرشتے ہیں جو معاصی اور رذائل سے پاک ومعصوم ہیں، یہ قول حضرت انس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، (قرطبی) [3] حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے، (ابن کثیر) [4] اِمام مالک رحمۃ اللہ نے بھی اسی کو اِختیار کیا ہے۔ (قرطبی) [5]

اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ قرآن سے مراد وہ مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، اور الْمُطَهَّرُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نجاستِ ظاہری اور معنوی یعنی حدثِ اصغر واکبر سے پاک ہوں۔ حدثِ اصغر کے معنی بے وضو ہونے کے ہیں، اس کا اِزالہ وضو کرنے سے ہوجاتا ہے، اور حدثِ اکبر جنابت اور حیض ونفاس کو کہا جاتا ہے جس سے پاکی کے لئے غسل ضروری ہے، یہ تفسیر حضرت عطاء، طاؤس، سالم اور حضرت محمد باقر رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ (روح) [6] اس صورت میں جملہ لَا يَمَسُّهُ اگرچہ جملہ خبریہ ہے، مگر اس خبر کو بحکم اِنشاء یعنی نہی وممانعت کے معنی میں قرار دِیا جائے گا، اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مصحفِ قرآن کو چھونا بغیر طہارت کے جائز نہیں، اور طہارت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ ظاہری نجاست سے بھی اس کا ہاتھ پاک ہو، اور بے وضو بھی نہ ہو، اور حدثِ اکبر یعنی جنابت بھی نہ ہو، قرطبی نے اسی تفسیر کو اَظہر فرمایا ہے، تفسیر مظہری میں اسی کی ترجیح پر زور دِیا ہے۔ [7]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے میں جو مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بہن کو قرآن

---

[1] ترجمہ: وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں، رفیع المکان ہیں، مقدس ہیں جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مکرم نیک ہیں۔

[2] تفسیر القرطبی ج:١٧ ص:٢٢٥، وروح المعانی ج:٢٠ ص:٢٧٤ و٢٧٥

[3] تفسیر القرطبی ج:١٧ ص:٢٢٥

[4] تفسیر ابن کثیر ج:٧ ص:٥٤٤

[5] تفسیر القرطبی ج:١٧ ص:٢٢٥

[6] تفسیر روح المعانی ج:٢٠ ص:٢٧٥

[7] تفسیر المظہری ج:٩ ص:١٨٢

پڑھتے ہوئے پایا تو اَوراقِ قرآن کو دیکھنا چاہا، ان کی بہن نے یہی آیت پڑھ کر اَوراقِ قرآن اُن کے ہاتھ میں دینے سے انکار کیا کہ اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھوسکتا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مجبور ہوکر غسل کیا، پھر یہ اوراق پڑھے، اس واقعے سے بھی اسی آخری تفسیر کی ترجیح ہوتی ہے، اور روایاتِ حدیث جن میں غیر طاہر کو قرآن کے چھونے سے منع کیا گیا ہے، [۱] ان روایات کو بھی بعض حضرات نے اس آخری تفسیر کی ترجیح کے لئے پیش کیا ہے۔

مگر چونکہ اس مسئلے میں حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا اِختلاف ہے، جو اُوپر آچکا ہے، اس لئے بہت سے حضرات نے بے وضو قرآن کو ہاتھ لگانے کی ممانعت کے مسئلے میں آیتِ مذکورہ سے اِستدلال کو چھوڑ کر صرف روایاتِ حدیث کو پیش کیا ہے، (روح المعانی) [۲] وہ احادیث یہ ہیں:-

اِمام مالک رحمہ اللہ نے موطأ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوبِ گرامی نقل کیا ہے جو آپ نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا، جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: ”لَا يَمَسُّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ“ (ابن کثیر) [۳] یعنی قرآن کو وہ شخص نہ چھوئے جو طاہر نہ ہو۔

اور رُوح المعانی میں یہ روایت مسند عبدالرزّاق، ابن ابی داؤد اور ابن المنذر سے بھی نقل کی ہے۔ اور طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا يَمَسُّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ“ (روح المعانی) [۴] یعنی قرآن کو ہاتھ نہ لگائے بجز اس شخص کے جو پاک ہو۔

مسئلہ:- روایاتِ مذکورہ کی بناء پر جمہورِ اُمت اور ائمۂ اَربعہ کا اس پر اِتفاق ہے کہ قرآنِ کریم کو ہاتھ لگانے کے لئے طہارت شرط ہے، اُس کے خلاف گناہ ہے، ظاہری نجاست سے ہاتھ کا پاک ہونا، باوضو ہونا، حالتِ جنابت میں نہ ہونا، سب اس میں داخل ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ، ابنِ مسعود، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، رضی اللہ عنہم، عطاء اور زہری، نخعی، حکم، حماد، اِمام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، رحمہم اللہ سب کا یہی مسلک ہے۔ اُوپر جو اِختلافِ اقوال نقل کیا گیا ہے، وہ صرف اس بات میں ہے کہ یہ مسئلہ جو اَحادیثِ مذکورہ سے ثابت اور جمہورِ اُمت کے نزدیک مُسلّم ہے، کیا یہ بات قرآن کی آیتِ مذکورہ سے بھی ثابت ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم اور اَحادیثِ مذکورہ کا مفہوم ایک قرار دیا، اور اس آیت اور اَحادیثِ مذکورہ کے مجموعے سے اس مسئلے کو ثابت کیا۔ دُوسرے حضرات نے آیت کو اِستدلال میں پیش کرنے

---

[۱] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:۱۴۴۷، والموطأ مالك، كتاب القرآن، باب الأمر بالوضوء لمن مس القرآن ج:۱ ص:۱۹۹

[۲] تفسير روح المعاني ج:۲۰ ص:۲۷۵

[۳] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۷ ص:۹۴۵، والموطأ مالك، كتاب القرآن، باب الأمر بالوضوء لمن مسّ القرآن ج:۱ ص:۱۹۹، والمستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:۱۴۴۷

[۴] تفسير روح المعاني ج:۲۰ ص:۲۷۵، والمعجم الكبير للطبرانيؒ، رقم الحديث:۱۳۰۳۹

سے بوجہ اختلافِ صحابہ احتیاط کی، لیکن احادیثِ مذکورہ کی بناء پر مسلک سب نے یہی اختیار کیا کہ بے وضو و بے طہارت قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں، اس لئے خلاف مسئلے میں نہیں، بلکہ اس کی دلیل میں ہوا ہے۔

مسئلہ:- قرآن مجید کا غلاف جو جلد کے ساتھ سلا ہوا ہو، وہ بھی بحکم قرآن ہے، اس کو بھی بغیر وضو و بغیر طہارت کے ہاتھ لگانا باتفاقِ ائمۂ اربعہ ناجائز ہے، البتہ قرآن مجید کا جزدان جو علیحدہ کپڑے کا ہوتا ہے، اگر اس میں قرآن بند ہے تو اس جزدان کے ساتھ قرآنِ کریم کو ہاتھ لگانا بلاوضو، ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، مگر امام مالک وشافعی رحمہما اللہ کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے۔ (مظہری) [۱]

مسئلہ:- جو کپڑا آدمی نے پہنا ہوا ہے اس کی آستین یا دامن سے قرآن مجید کو بلاوضو چھونا بھی جائز نہیں، البتہ علیحدہ رُومال یا چادر سے چھوا جاسکتا ہے۔ (مظہری) [۲]

مسئلہ:- علماء نے فرمایا کہ اسی آیت سے بدرجۂ اولیٰ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں قرآن کی تلاوت بھی جائز نہیں، جب تک غسل نہ کرے، کیونکہ مصحف میں لکھے ہوئے حروف ونقوش کی جب یہ تعظیم واجب ہے تو اصل حروف جو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کی تعظیم اس سے زیادہ اہم اور واجب ہونا چاہئے، اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ بے وضو آدمی کو بھی تلاوتِ قرآن جائز نہ ہو، مگر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو بخاری ومسلم میں ہے، [۳] اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی حدیث جو مسندِ احمد میں ہے، اس سے بغیر وضو کے تلاوتِ قرآن فرمانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، [۴] اس لئے فقہاء نے بلاوضو تلاوت کی اجازت دی ہے۔ (تفسیر مظہری) [۵]

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾ مُّدْهِنُوْنَ، اِدْهَانٌ سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی تیل کی مالش کرنے کے ہیں، اور تیل مالش سے اعضا نرم ہوجاتے ہیں، اس لئے نرم کرنے اور ناجائز مواقع میں نرمی برتنے کے معنی اور نفاق کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، آیتِ مذکورہ میں یہ لفظ آیاتِ الٰہیہ کی تصدیق میں نفاق یا تکذیب کے معنی میں استعمال ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ اِنْ

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۸۲، وردّ المحتار (الشامية) كتاب الطّهارة، باب الحيض ج:۲ ص:۳۹۴

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۸۲، والبحر الرّائق، كتاب الطّهارة، باب ما يمنعه الحيض ج:۲ ص:۲۸۳، ۲۸۴

[۳] تفصیل کے لئے دیکھیں: صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب قراءة القرآن بعد الحدث وغيره ج:۱ ص:۳۰، وصحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة النبي صلى الله عليه وسلم ودعاءه بالليل ج:۱ ص:۲۶۰

[۴] مسند احمد، مسند علی بن ابی طالب كرّم الله وجهه رقم الحديث: ۸۴۰

[۵] تفسير المظهری ج:۹ ص:۱۸۲

كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٨٧﴾

سابقہ آیات میں پہلے عقلی دلائل سے، پھر حق تعالیٰ کی طرف سے ستاروں کی قسم کھا کر اور ان کے مقہور و مغلوب ہونے کی کیفیت کی طرف اشارہ کر کے دو باتیں ثابت کی گئی ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس میں کسی شیطان وجن وغیرہ کا کوئی تصرف نہیں ہوسکتا، جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے۔ دُوسرا مسئلہ جو قرآن کے مسائل میں خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ قیامت کا آنا اور سب مُردوں کا زِندہ ہو کر رَبّ العزّت کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونا ہے، اور اس کے آخر میں کفار و مشرکین کا ان سب دلائلِ واضحہ کے خلاف قرآن کی حقانیت اور قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے سے اِنکار کا ذِکر کیا گیا تھا۔

قیامت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے سے انکار گویا ان کی طرف سے اس کا دعویٰ ہے کہ ان کی جان اور رُوح خود ان کے قبضے میں ہے، اور ان کی اپنی زندگی میں ان کو بھی کچھ دخل ہے، ان کے اس خیالِ باطل کی تردید کے لئے آیاتِ مذکورہ میں ایک قریب الموت انسان کی مثال دے کر بتلایا کہ جب اس کی رُوح حلق میں پہنچتی ہے اور تم یعنی مرنے والے کے عزیز وقریب، دوست واحباب سب اس کے حال کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، اور بتقاضائے محبت وتعلق یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کی رُوح نہ نکلے، یہ زندہ رہے، مگر اس وقت سب کو اپنی بے چارگی اور عاجزی کا احساس واقرار ہوتا ہے کہ کوئی اس مرنے والے کی جان نہیں بچا سکتا، اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت اپنے علم وقدرت کے لحاظ سے ہم تمہاری نسبت اُس مرنے والے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ قریب ہونے سے مراد اس کے اندرونی اور ظاہری حالات سے واقفیت اور اس پر پوری قدرت ہے۔ اور فرمایا کہ مگر تم ہمارے اس قرب کو اور مرنے والے کے زیرِ تصرف ہونے کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تم سب مل کر اس کی زندگی اور رُوح کی حفاظت چاہتے ہو مگر تمہاری بات نہیں چلتی، ہم اپنے علم وقدرت کے اعتبار سے اس کے زیادہ قریب ہیں، وہ ہمارے زیرِ تصرف اور مشیت وحکم کے تابع ہے، جس لمحے میں اس کی رُوح نکالنا ہم طے کر چکے ہیں، اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اس مثال کو سامنے کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد تمہیں زندہ نہیں کیا جا سکتا، اور تم اتنے قوی اور بہادر ہو کہ خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر ہو تو ذرا اپنی قوت وقدرت کا امتحان یہیں کر دیکھو کہ اس مرنے والے کی رُوح کو نکلنے سے بچا لو، یا نکلنے کے بعد اس میں لوٹا دو، اور جب تم سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا تو پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر سمجھنا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے اِنکار کرنا کس قدر بے عقلی کی علامت ہے۔

فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾ سابقہ آیات میں مختلف دلائل اور مختلف عنوانات سے یہ واضح کر دیا گیا کہ دُنیا کی موجودہ زندگی کا ایک روز ختم ہو جانا اور مرنے کے وقت سب عزیزوں، دوستوں، طبیبوں کا عاجز ہو جانا روز مشاہدہ میں آتا

ہے، اسی طرح اس کو بھی یقینی سمجھو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے، اور حساب کے بعد جزا وسزا بھی یقینی ہے، اور جزا وسزا میں کُل مخلوق کا تین گروہوں میں تقسیم ہوجانا اور ہر ایک کی جزا الگ الگ ہونا جو شروع سورت میں بیان ہوچکا ہے، اس کا اِجمال پھر یہاں ذِکر کردیا گیا کہ مرنے کے بعد اگر یہ شخص مقربین یعنی سابقین کے گروہ میں سے ہے تو راحت ہی راحت، آرام ہی آرام ہے، اور اگر سابقین مقربین میں نہیں، مگر اَصحاب الیمین یعنی عام مؤمنینِ صالحین میں سے ہے تو بھی جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا، اور اگر تیسرے گروہ یعنی اَصحابِ شمال، کفار ومشرکین میں سے ہوا تو جہنم کی آگ اور کھولتے ہوئے پانی سے اس کو سابقہ پڑے گا، آخر میں فرمایا:-

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ یعنی یہ جزا وسزا جس کا ذِکر اُوپر ہوا ہے، حق اور بالکل یقینی ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾ ختمِ سورۃ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنے رَبّ کے نام کی تسبیح پڑھتے رہئے، یعنی اس کی پاکی تمام اُن چیزوں سے جو اس کے لائقِ شان نہیں، بیان کرتے رہئے، اس میں نماز کی تسبیحات بھی داخل ہیں، اور خارجِ نماز کی تسبیحات بھی، اور خود نماز کو بھی بعض اوقات تسبیح سے تعبیر کردیا جاتا ہے، تو یہ حکم نماز کے اہتمام کا بھی ہوگیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ بِحَمْدِ اللهِ وَعَوْنِهٖ لَيْلَةَ

الثُّلَاثَاءِ لِعِشْرِيْنَ مِنْ رَّبِيْعِ الثَّانِيْ

١٣٩١ھ وَيَتْلُوْهُ اِنْ شَآءَ اللهُ تَعَالٰى

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ

اٰیاتها ۲۹ ۵۷ سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ ۹۴ رکوعاتها ۴

سورۂ حدید مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنتیس آیتیں ہیں اور چار رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ مُلْكُ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا، اسی کے لئے ہے راج

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ②

آسمانوں کا اور زمین کا، جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے،

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③

وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے،

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں، پھر قائم ہوا

عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ

تخت پر، جانتا ہے جو اندر جاتا ہے زمین کے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اُترتا ہے

مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ

آسمان سے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤﴾ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ

اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔ اسی کے لئے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا، اور اللہ ہی تک

تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٥﴾ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ

پہنچتے ہیں سب کام، داخل کرتا ہے رات کو دِن میں اور داخل کرتا ہے دِن کو رات میں،

وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٦﴾

اور اس کو خبر ہے جیوں کی بات کی

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے، اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ① آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کی ہے، وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ ② وہی اوّل بھی ہے، اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے، اور چھپا ہوا بھی، اور وہ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا

ہے۔ ③ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر استواء فرمایا۔ وہ ہر اُس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے، اور جو اُس سے نکلتی ہے، اور ہر اُس چیز کو جو آسمان سے اُترتی ہے، اور جو اُس میں چڑھتی ہے، اور تم جہاں کہیں ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ اُس کو دیکھتا ہے۔ ④ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کی ہے، اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ ⑤ وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے، اور دِن کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور وہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ ⑥

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (زبانِ قال سے یا زبانِ حال سے) اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے، اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، وہی حیات دیتا ہے اور (وہی) موت دیتا ہے، اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، وہی (سب مخلوق سے) پہلے ہے اور وہی (سب کے فناء ذاتی یا صفاتی سے) پیچھے (بھی رہے گا، یعنی اس پر نہ پہلے عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کسی درجے میں اس پر عدم طاری ہونے کا اِمکان ہے، اس لئے سب سے آخر میں وہی ہے) اور وہی (مطلق وجود کے اعتبار سے اَز رُوئے دلائل نہایت) ظاہر ہے اور وہی (کنہِ ذات کے اعتبار سے نہایت) مخفی ہے (یعنی کوئی اس کی ذات کا اِدراک نہیں کر سکتا) اور (گو وہ خود تو ایسا ہے کہ مخلوق کو ایک حیثیت سے معلوم ہے اور ایک حیثیت سے غیر معلوم، لیکن مخلوق سب من کل الوجوہ اس کو معلوم ہے اور) وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے (اور) وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو چھ روز (کی مقدارِ زمانہ) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو کہ مشابہ ہے تختِ سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو اس کی شان کے لائق ہے اور) وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش) اور جو چیز اُس میں سے نکلتی ہے (مثلاً نباتات) اور جو چیز آسمان سے اُترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً ملائکہ کہ نزول وعروج کرتے ہیں، اور مثلاً اَحکام جن کا نزول ہوتا ہے اور اعمالِ عباد جن کا صعود ہوتا ہے) اور (جس طرح ان چیزوں کا اس کو علم ہے، اسی طرح تمہارے تمام اَحوال کا بھی اس کو علم ہے، چنانچہ) وہ (علم واطلاع کے اعتبار سے) تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو (یعنی تم کسی جگہ اس سے مخفی نہیں رہ سکتے) اور وہ تمہارے سب اعمال کو بھی دیکھتا ہے، اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف سب اُمور (جوہریہ وعرضیہ) لوٹ جائیں گے (یعنی قیامت میں پیش ہو جائیں گے، اسی میں توحید کے ساتھ ضمناً قیامت کا بھی اِثبات ہو گیا) وہی رات (کے اجزاء) کو دِن میں داخل کرتا ہے (جس سے دِن بڑا ہو جاتا ہے) اور وہی دِن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کرتا ہے (جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے) اور (اس قدرت کے ساتھ اس کا علم

ایسا ہے کہ) وہ دِل کی باتوں (تک) کو جانتا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ حدید کی بعض خصوصیات

پانچ سورتوں کو حدیث میں ''مُسَبِّحَاتْ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جن کے شروع میں ''سَبَّحَ'' یا ''يُسَبِّحُ'' آیا ہے، ان میں سے پہلی یہ سورت حدید ہے، دُوسری: حشر، تیسری: صف، چوتھی: جمعہ، پانچویں: تغابن۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے پہلے یہ مسبّحات پڑھا کرتے تھے، اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں ایک آیت ایسی ہے جو ہزار آیتوں سے افضل ہے۔[1] اِبنِ کثیر نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ افضل آیت سورۂ حدید کی یہ آیت ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③[2]

ان پانچ سورتوں میں سے تین یعنی حدید، حشر، صف میں تو لفظ ''سَبَّحَ'' بصیغۂ ماضی آیا ہے، اور آخری دو یعنی جمعہ اور تغابن میں ''يُسَبِّحُ'' بصیغۂ مضارع، اس میں اشارہ اس طرف ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذِکر ہر زمانے، ہر وقت، ماضی و مستقبل اور حال میں جاری رہنا چاہئے۔ (مظہری)[3]

وساوسِ شیطانیہ کا علاج

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر کبھی تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ اور دِینِ حق کے معاملے میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرو: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③ (ابن کثیر)[4]

اس آیت کی تفسیر اور اَوَّلُ وَآخِرُ، ظَاهِرُ وَبَاطِنُ کے معنی میں حضراتِ مفسرین کے اقوال دس سے زیادہ منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض نہیں، سبھی کی گنجائش ہے۔ لفظ اَوَّلُ کے معنی تو تقریباً متعین ہیں، یعنی وجود کے اعتبار سے تمام

---

[1] سنن ابی داود، كتاب الأدب، باب ما يقال عند النوم، ج:۲ ص:۶۸۸، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فيمن قرأ حرفًا من القرآن ما له من الأجر، ج:۲ ص:۱۱۹، والسُّنن الكبرىٰ للنسائی رقم الحديث:۸۰۲۶

[2] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۵

[3] تفسير المظهری ج:۹ ص:۱۸۷

[4] تفسير ابن كثير ج:۶ ص:۷

موجودات وکائنات سے مقدم اور پہلا ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لئے وہ سب سے اَوّل ہے۔اور آخِـرُ کے معنی بعض حضرات نے یہ کئے ہیں کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، جیسا کہ آیت کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ [۱] (القصص:۸۸) میں اس کی تصریح ہے، اور فنا سے مراد عام ہے، خواہ فنا و عدم ممکن ہو اور وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرے سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں، اس کی مثال جنت ودوزخ اور ان میں داخل ہونے والے اچھے بُرے انسان ہیں کہ اُن کا وجود فنا نہیں ہوگا، مگر باوجود وقوعاً فنا نہ ہونے کے اِمکان واِحتمالِ فنا سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کا اِمکان ہے، اس لئے اس کو سب سے آخر کہہ سکتے ہیں۔

اور اِمام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کو آخِرُ باعتبار معرفت کے کہا گیا ہے کہ سب سے آخر معرفت اس کی ہے، انسان علم ومعرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب درجات جو اس کو حاصل ہوئے راستے کی مختلف منزلیں ہیں، اس کی انتہا اور آخری حد حق تعالیٰ کی معرفت ہے۔(از رُوح المعانی) [۲]

اور ظَاهِرُ سے مراد وہ ذات ہے جو اپنے ظہور میں ساری چیزوں سے فائق اور برتر ہو، اور ظہور چونکہ وجود کی فرع ہے، تو جب حق تعالیٰ کا وجود سب موجودات پر فائق اور مقدم ہے، اس کا ظہور بھی سب پر فائق ہے کہ اس سے زیادہ اس عالم میں کوئی چیز ظاہر نہیں کہ اس کی حکمت وقدرت کے مظاہر دُنیا کے ہر ہر ذرّے میں نمایاں ہیں۔

اور بَـاطِنُ اپنی ذات کی کنہ اور حقیقت کے اعتبار سے ہے، کہ اس کی حقیقت تک کسی عقل وخیال کی رسائی نہیں ہوسکتی ۔

اے برتر از قیاس وگمان وخیال ووہم ۔۔۔ وز ہر چہ دیدہ ایم وشنیدیم وخواندہ ایم
اے بروں از جملہ قال وقیلِ من ۔۔۔ خاک بر فرقِ من وتمثیلِ من [۳]

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ''یعنی اللہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو'' اس معیت کی حقیقت اور کیفیت کسی مخلوق کے احاطۂ علم میں نہیں آسکتی، مگر اس کا وجود یقینی ہے، اس کے بغیر اِنسان کا نہ وجود قائم رہ سکتا ہے، نہ کوئی کام اس سے ہوسکتا ہے، اس کی مشیت وقدرت ہی سے سب کچھ ہوتا ہے، جو ہر حال اور ہر جگہ میں ہر اِنسان کے ساتھ، واللہ اعلم۔

---

[۱] ترجمہ: سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے۔

[۲] روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۰

[۳] ترجمہ: اے قیاس، گمان، خیال اور وہم سے برتر ذات! اور ان تمام چیزوں سے (برتر ذات!) جن کو ہم نے دیکھا، جن کو ہم نے سنا اور جن کے بارے میں ہم نے پڑھا۔ اے میرے تمام بحث ومباحثہ سے بلند ذات! میں اگر کوئی فرق بیان کروں اور میں اگر کوئی مثال دوں تو اس پر خاک۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ

یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس میں سے جو تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اپنا نائب کرکر،

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۷﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ

سو جو لوگ تم میں یقین لائے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کو بڑا ثواب ہے، اور تم کو کیا ہوا کہ یقین نہیں لاتے

بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ

اللہ پر اور رسول بلاتا ہے تم کو کہ یقین لاؤ اپنے رَبّ پر اور لے چکا ہے تم سے عہد پکّا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ

اگر ہو تم ماننے والے، وہی ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر آیتیں صاف

لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹﴾

کہ نکال لائے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں اور اللہ تم پر نرمی کرنے والا ہے مہربان،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور اللہ ہی کو بچ رہتی ہے ہر شے آسمانوں اور زمین میں

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ

برابر نہیں تم میں سے جس نے کہ خرچ کیا فتح (مکہ) سے پہلے اور لڑائی کی، ان لوگوں کا

اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ

درجہ بڑا ہے ان سے جو کہ خرچ کریں اس کے بعد اور لڑائی کریں، اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے

الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا

خوبی کا اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو

حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱

اچھی طرح پھر وہ اس کو دونا کر دے اس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ اور اُس کے رسول پر اِیمان رکھو، اور جس (مال) میں اللہ نے تمہیں قائم مقام بنایا ہے، اُس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرو۔ چنانچہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا ہے، اُن کے لئے بڑا اَجر ہے۔ ۞۷ اور تمہارے لئے کونسی وجہ ہے کہ تم اللہ پر اِیمان نہ رکھو، حالانکہ رسول تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر اِیمان رکھو، اور وہ تم سے عہد لے چکے ہیں، اگر تم واقعی مؤمن ہو۔ ۞۸ اللہ وہی تو ہے جو اپنے بندے پر کھلی کھلی آیتیں نازل فرماتا ہے، تاکہ تمہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اور یقین جانو اللہ تم پر بہت شفیق، بہت مہربان ہے۔ ۞۹ اور تمہارے لئے کونسی وجہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو، حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ساری میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم میں سے جنہوں نے (مکہ کی) فتح سے پہلے خرچ کیا، اور لڑائی لڑی، وہ (بعد والوں کے) برابر نہیں ہیں۔ وہ درجے میں اُن لوگوں سے بڑھے ہوئے ہیں جنہوں نے (فتحِ مکہ کے) بعد خرچ کیا، اور لڑائی لڑی۔ یوں اللہ نے بھلائی کا وعدہ ان سب سے کر رکھا ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۞۱۰ کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض! جس کے نتیجے میں اللہ اُسے دینے والے کے لئے کئی گنا بڑھا دے؟ اور ایسے شخص کو بڑا باعزت اَجر ملے گا ۞۱۱

خلاصۂ تفسیر

تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر اِیمان لاؤ اور (ایمان لا کر) جس مال میں تم کو اس نے دُوسروں کا قائم مقام بنایا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو (اس عنوانِ اِستخلاف میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال تم سے پہلے اور کسی کے پاس تھا، اور اسی طرح تمہارے بعد کسی اور کے ہاتھ میں چال جائے گا، بس جب یہ سدا رہنے والی چیز نہیں تو اس کو اس

طرح جوڑ جوڑ کر رکھنا کہ ضروری مصرف میں بھی خرچ نہ کیا جائے حماقت کے سوا کیا ہے؟) سو (اس حکم کے موافق) جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور (ایمان لا کر اللہ کی راہ میں) خرچ کریں اُن کو بڑا ثواب ہوگا اور (جو لوگ ایمان نہ لائیں ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے (اسی میں ایمان بالرسل بھی آ گیا) حالانکہ (دواعیٔ قویہ ایمان لانے کے موجود ہیں، وہ یہ کہ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم جن کی رسالت دلائل سے ثابت ہے) تم کو اس بات کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رَبّ پر (اسی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (ایک داعی تو یہ ہوا) اور (دُوسرا داعی یہ کہ) خود خدا نے تم سے (ایمان لانے کا میثاق اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ [1] (الاعراف:۱۷۲) میں) عہد لیا تھا (جس کا اجمالی اثر تمہاری فطرت میں بھی موجود ہے، اور اللہ کے رسول جو معجزات اور دلائل لے کر آئے انہوں نے بھی اس کی یاددہانی کی سو) اگر تم کو ایمان لانا ہو (تو یہ دواعی کافی ہیں، ورنہ پھر ایمان لانے کے لئے کس داعی کا انتظار ہے؟ کقولہ تعالیٰ: فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ [2] (الجاثیہ) آگے اس مضمون وَالرَّسُوْلُ الخ کی اور شرح ہے کہ) وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندۂ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے (جو حسنِ عبارت اور اعجازِ خاص کی وجہ سے مقصود پر واضح دلالت کرتی ہیں) تاکہ وہ (بندۂ خاص) تم کو (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علمِ حقائق کی) روشنی کی طرف لائے (کقولہ تعالیٰ: لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ [3] (ابراہیم:۱)) اور بے شک اللہ تمہارے حال پر بڑا شفیق مہربان ہے (کہ اس نے ایسا اندھیریوں سے نکالنے والا تمہاری طرف بھیجا) اور (اس مضمون میں تو ایمان نہ لانے پر سوال تھا، اب اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر سوال ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ (اس کا بھی ایک قوی داعی ہے وہ یہ کہ) سب آسمان وزمین اَخیر میں اللہ ہی کا رہ جائے گا (جب سب مالک مر جائیں گے اور وہی رہ جائے گا، پس جب سب مال ایک روز چھوڑنا ہے تو خوشی سے کیوں نہ دیا جائے کہ ثواب بھی ہو۔ اور آسمان کا ذِکر کرنا باوجودیکہ کوئی مخلوق اس کی مالک نہیں، شاید اس نکتے کے لئے ہو کہ جیسے آسمان بلاشرکت اس کی مِلک ہے، اسی طرح زمین بھی حقیقت کے اعتبار سے تو فی الحال بھی اس کی مِلک ہے اور آخر کار ظاہری طور پر بھی اسی کی مِلک رہ جائے گی، یہ مضمون لفظ مُسْتَخْلَفِيْنَ کی شرح کے طور پر ہوگیا، آگے خرچ کرنے والوں کے درجات کا تفاضل بتلاتے ہیں کہ گو خرچ کرنا بوجہ مامور بہ ہونے کے ہر ایک کے لئے جو ایمان لا کر

---

[1] ترجمہ: کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں۔

[2] ترجمہ: تو پھر اس کی آیتوں کے بعد اور کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لاویں گے۔

[3] ترجمہ: تاکہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاویں۔

خرچ کرے موجبِ اجر ہے، لیکن پھر بھی تفاوت ہے، وہ یہ کہ) جو لوگ فتحِ مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور (فی سبیل اللہ) لڑ چکے (اور جو کہ بعد فتحِ مکہ کے لڑے اور خرچ کیا، دونوں) برابر نہیں (بلکہ) وہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتحِ مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے، اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (اس لئے ثواب دونوں وقت کے عمل پر دیں گے، اس لئے جن لوگوں کو موقع فتحِ مکہ کے قبل خرچ کا نہیں ملا، ہم ان کو بھی ترغیباً کہتے ہیں کہ) کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ) قرض کے طور پر دے، پھر خدا تعالیٰ اس (دیئے ہوئے ثواب) کو اس شخص کے لئے بڑھاتا چلا جائے اور (مضاعفت کے ساتھ) اس کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (مضاعفت سے تو مقدار بڑھا دینے کو بیان کیا گیا اور لفظ كَرِيْمٌ سے اس جزا کی کیفیت بہتر ہونے کی طرف اشارہ ہے)۔

معارف و مسائل

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ، اس سے میثاقِ ازل بھی مراد ہو سکتا ہے، جب کہ حق تعالیٰ نے مخلوقات کے پیدا ہونے سے پہلے ہی وجود میں آنے والی تمام ارواح کو جمع کر کے ان سے رُبوبیت یعنی اللہ تعالیٰ کے ربّ العالمین ہونے کا اقرار اور عہد لیا تھا، جس کا ذکر قرآن میں: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ [1] (الاعراف: ۱۷۲) کے الفاظ سے آیا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میثاق سے وہ عہد و میثاق مراد ہو جو پچھلے انبیاء اور اُن کی اُمتوں سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کے متعلق لیا گیا ہے، جس کا ذکر قرآنِ کریم کی اس آیت میں ہے: ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ [2] (آل عمران)

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ یعنی اگر تم مؤمن ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام اُن کفار سے ہو رہا ہے جن کے مؤمن نہ ہونے پر تنبیہ اس سے پہلے آ چکی ہے، وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ پھر ان کو یہ کہنا کیسے دُرست ہوگا کہ: ''اگر تم مؤمن ہو؟''

[1] ترجمہ: کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔

[2] ترجمہ: پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آوے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اُس کی طرف داری بھی کرنا فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا وہ بولے ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

جواب یہ ہے کہ کفار ومشرکین بھی اللہ تعالیٰ پر تو ایمان کے مدعی تھے، بتوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ہم ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [1] (الزمر: ۳) تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ تم جو اللہ پر ایمان رکھنے کے مدعی ہو، اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو پھر ایمان باللہ کی صحیح اور معتبر صورت اختیار کرو جو اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لاؤ۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ مِيْرَاثُ اصل میں اُس ملکیت کو کہا جاتا ہے جو پچھلے مالک کے انتقال کے بعد، اس کے بعد زندہ رہنے والے وارثوں کو ملا کرتی ہے، اور یہ مِلک جبری ہوتی ہے، مرنے والا چاہے یا نہ چاہے، جو وارث ہوتا ہے ملکیت اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہاں حق تعالیٰ کی ملکیتِ آسمان وزمین کو ''مِيْرَاثُ'' کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تم چاہو، یا نہ چاہو، جس جس چیز کے مالک آج تم سمجھے جاتے ہو، وہ سب بالآخر حق تعالیٰ کی ملکیتِ خاصہ میں منتقل ہو جائے گی، مراد یہ ہے کہ اگرچہ حقیقی مالک تمام اشیائے عالم کا پہلے بھی حق تعالیٰ ہی تھا، مگر اس نے اپنے فضل سے کچھ اشیاء کی ملکیت تمہارے نام کر دی تھی، اور اَب وہ ظاہری ملکیت بھی تمہاری باقی نہیں رہے گی، بلکہ حقیقۃً اور ظاہراً ہر طرح اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہو جائے گی، اس لئے اس وقت جبکہ تمہیں ظاہری ملکیت حاصل ہے، اگر تم اللہ کے نام پر خرچ کر دو گے تو اس کا بدل تمہیں آخرت میں مل جائے گا، اس طرح گویا اللہ کی راہ میں خرچ کی ہوئی چیز کی ملکیت تمہارے لئے دائمی ہو جائے گی۔

ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نے ایک بکری ذبح کی، جس کا اکثر حصہ تقسیم کر دیا، صرف ایک دست گھر کے لئے رکھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس بکری کے گوشت میں سے تقسیم کے بعد کیا باقی رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک دست رہ گیا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ساری بکری باقی رہی صرف یہ دست باقی نہیں رہا، جس کو تم باقی سمجھ رہی ہو، [2] کیونکہ ساری بکری اللہ کی راہ میں خرچ کر دی گئی، وہ اللہ کے یہاں تمہارے لئے باقی رہے گی، اور یہ دست جو اپنے کھانے کے لئے رکھا ہے، اس کا آخرت میں کوئی معاوضہ نہیں، اس لئے یہ یہیں فنا ہو جائے گا۔ (مظہری) [3]

گزشتہ آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید بیان فرمانے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ کی

---

[1] ترجمہ: ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

[2] جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، بابٌ منه ج: ۲ ص: ۷۳

[3] تفسير المظهری ج: ۹ ص: ۱۹۰

راہ میں جو کچھ جس وقت بھی خرچ کیا جائے ثواب تو ہر ایک پر، ہر ایک حال میں ملے گا، لیکن ثواب کے درجات میں ایمان واخلاص اور مسابقت کے اعتبار سے فرق ہوگا، اس کے لئے فرمایا:-

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، یعنی مسلمانوں میں فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو فتحِ مکہ سے پہلے ایمان لے آئے، اور مؤمن ہو کر اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا۔ دُوسرے وہ جو فتحِ مکہ کے بعد جہاد میں شریک ہوئے اور فی سبیل اللہ خرچ میں بھی، یہ دونوں قسمیں اللہ کے نزدیک برابر نہیں، بلکہ درجاتِ ثواب کے اعتبار سے ان میں تفاضل ہے، فتحِ مکہ سے پہلے ایمان لانے والے اور جہاد کرنے والے اور خرچ کرنے والے درجۂ ثواب کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں دُوسری قسم سے، یعنی جن لوگوں نے فتحِ مکہ کے بعد اسلامی خدمات میں شرکت کی۔

فتحِ مکہ کو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درجات متعین کرنے کے لئے حدِ فاصل قرار دینے کی حکمت

آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے دو طبقے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جنہوں نے فتحِ مکہ سے پہلے مسلمان ہو کر اسلامی خدمات میں حصہ لیا، دُوسرے وہ لوگ جنہوں نے فتحِ مکہ کے بعد یہ کام کیا ہے، پہلے لوگوں کا مقام بہ نسبت دُوسرے لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

فتحِ مکہ میں ان دونوں طبقوں میں حدِ فاصل قرار دینے کی ایک بڑی حکمت تو یہ ہے کہ فتحِ مکہ مکرمہ سے پہلے پہلے سیاسی حالات اور اَسبابِ ظاہرہ کے اعتبار سے مسلمانوں کی بقاوفنا اور اِسلام کے آگے بڑھنے، پھیلنے یا بہت سی تحریکات کی طرح مُردہ ہوجانے کے اِحتمالات ظاہر بین نظروں میں یکساں انداز سے گردش کرتے رہتے تھے، دُنیا کے ہوشیار لوگ کسی ایسی جماعت یا تحریک میں شرکت نہیں کیا کرتے جس کے شکست کھا جانے یا ختم ہوجانے کا خطرہ سامنے ہو، انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں، جب کامیابی کے اِمکانات روشن ہوجائیں تو شریک ہوجاتے ہیں۔ اور بعض لوگ اگرچہ اس کو حق وصحیح سمجھتے ہوں، لیکن مخالفین کی ایذاؤں کے خوف اور اپنے ضعف کے سبب شرکت کرنے کی ہمت نہیں کرتے، لیکن باعزم وہمت لوگ جو کسی نظریہ اور عقیدہ کو صحیح اور حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں، وہ فتح وشکست اور جماعت کی قلّت وکثرت پر نظر کئے بغیر اس کے قبول کی طرف دوڑتے ہیں۔

فتحِ مکہ سے پہلے جو لوگ ایمان لائے، ان کے سامنے مسلمانوں کی قلّت اور ضعف اور اس کی وجہ سے مشرکین کی ایذاؤں کا سلسلہ تھا، خصوصاً اِبتدائے اسلام کے وقت کہ اسلام وایمان کا اظہار کرنا اپنی جان کی بازی لگانے اور اپنے گھربار

کو ہلاکت کے لئے پیش کر دینے کے مرادف تھا، یہ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جنہوں نے اسلام قبول کر کے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور دین کی خدمت میں اپنی جان و مال کو لگایا، ان کی قوّتِ ایمان اور اخلاصِ عمل کو دُوسرے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔

رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے، مسلمانوں کو قوّت حاصل ہوتی گئی، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ فتح ہو کر پورے عرب پر اِسلام کی حکومت قائم ہوگئی، اس وقت جیسا کہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ (النصر) یعنی لوگ اللہ کے دِین میں فوج درفوج ہو کر داخل ہوں گے، اس کا ظہور ہوا، کیونکہ بہت سے لوگ اسلام کی حقانیت پر تو یقین رکھتے تھے، مگر اپنے ضعف اور مخالفینِ اسلام کی قوّت و شوکت اور ان کی ایذاؤں کے خوف سے اسلام و ایمان کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے تھے، اب اُن کی راہ سے یہ رُکاوٹ دُور ہوگئی، تو فوج درفوج ہو کر اِسلام میں داخل ہوگئے۔ قرآنِ کریم کی اس آیت نے ان کا بھی اِکرام و احترام کیا ہے، اور اُن کے لئے بھی مغفرت و رحمت کا وعدہ دِیا ہے، لیکن یہ بتلا دیا کہ اُن کا درجہ اور مقام اُن لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا، جنہوں نے اپنی ہمت و اُولوالعزمی اور قوّتِ ایمان کے سبب مخالفتوں اور ایذاؤں کے خوف و خطر سے بالاتر ہو کر اِسلام کا اعلان کیا، اور آڑے وقت میں اسلام کے کام آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عزم و ہمت اور قوّتِ ایمان کے درجات متعین کرنے کے لئے فتحِ مکہ سے پہلے اور بعد کے حالات ایک حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ یہ دونوں طبقے برابر نہیں ہوسکتے۔

تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے مغفرت و رحمت کی بشارت اور صحابہ کا باقی اُمت سے اِمتیاز

آیاتِ مذکورہ میں اگرچہ صحابۂ کرام میں باہمی درجات کا تفاضل ذِکر کیا گیا ہے، لیکن آخر میں فرمایا: وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۚ یعنی باوجود باہمی فرقِ مراتب کے اللہ تعالیٰ نے الْحُسْنٰى یعنی جنت و مغفرت کا وعدہ سب ہی کے لئے کرلیا ہے، یہ وعدہ صحابۂ کرام کے ان دونوں طبقوں کے لئے جنہوں نے فتحِ مکہ سے پہلے یا بعد میں اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور مخالفینِ اسلام کا مقابلہ کیا۔ اس میں تقریباً صحابۂ کرام کی پوری جماعت شامل ہوجاتی ہے، کیونکہ ایسے افراد تو شاذ و نادر ہی ہوسکتے ہیں جنہوں نے مسلمان ہوجانے کے باوجود اللہ کے لئے کچھ خرچ بھی نہ کیا ہو اور مخالفینِ اسلام کے مقابلے و مقاتلے میں بھی شریک نہ ہوئے ہوں، اس لئے قرآنِ کریم کا یہ اعلانِ مغفرت و رحمت پوری جماعتِ صحابۂ کرام کے لئے عام اور شامل ہے۔

اِبنِ حزم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ قرآن کی دُوسری آیت سورۂ انبیاء کو ملاؤ جس میں فرمایا ہے: اِنَّ

الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ یعنی ''جن لوگوں کے لئے ہم نے حسنیٰ کو مقرّر کردیا ہے، وہ جہنم سے ایسے دُور رہیں گے کہ اس کی تکلیف دہ آوازیں بھی اُن کے کانوں تک نہ پہنچیں گی، اور اپنی دِل خواہ نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

آیاتِ زیرِ بحث میں کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى مذکور ہے، اور اس آیت میں جن کے لئے حسنیٰ کا وعدہ ہوا ان کے لئے جہنم کی آگ سے بہت دُور رہنے کا اعلان ہے، [۱] اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کی ضمانت دے دی کہ حضراتِ صحابہ سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کرلے گا، یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت اور دِین کی خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہوکر وہ صاف و بے باق ہوجائیں، یا دُنیا کے مصائب و آفات اور زیادہ سے زیادہ برزخ میں کوئی تکلیف ان کے سیئات کا کفارہ ہوجائے۔

اور جن احادیث میں بعض صحابۂ کرام پر مرنے کے بعد عذاب کا ذِکر آیا ہے، [۲] وہ عذابِ آخرت و عذابِ جہنم کا نہیں، برزخی یعنی قبر کا عذاب ہے، یہ کوئی بعید نہیں کہ صحابۂ کرام میں سے اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اِتفاقاً توبہ کرکے اس سے پاک ہوجانے کا بھی موقع نہیں ہوا تو ان کو برزخی عذاب کے ذریعے پاک کردیا جائے گا، تاکہ آخرت کا عذاب اُن پر نہ رہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام قرآن وحدیث سے پہچانا جاتا ہے، تاریخی روایات سے نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ حضراتِ صحابۂ کرام عام اُمت کی طرح نہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک واسطہ ہیں، اُن کے بغیر اُمت کو قرآن پہنچنے کا کوئی راستہ ہے اور نہ معانیٔ قرآن اور تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اسلام میں اُن کا ایک خاص مقام ہے، ان کے مقامات کتبِ تاریخ کی رطب و یابس روایات سے نہیں پہچانے جاتے، بلکہ قرآن و سنت کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔

ان میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش اور غلطی بھی ہوتی ہے تو اکثر وہ اِجتہادی خطا ہوتی ہے، جس پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ حسبِ تصریح احادیثِ صحیحہ ایک اجر ہی ملتا ہے۔ اور اگر فی الواقع کوئی گناہ ہی ہوگیا تو اوّل وہ اُن کے عمر بھر کے

[۱] المحلی بالآثار لابن حزم، كتاب التوحيد ومسألة إعتقاد أن أحدًا لا يموت قبل أجله، ج:۱ ص:۹۴

[۲] دیکھئے: سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب ضمة القبر وضغطته، ج:۱ ص:۲۸۹

اعمالِ حسنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی نصرت وخدمت کے مقابلے میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اُن میں خشیت اور خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے گناہ سے بھی لرز جاتے اور فوراً توبہ کرتے اور اپنے نفس پر اس کی سزا جاری کرنے کے لئے کوشش کرتے تھے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا اور جب تک توبہ قبول ہو جانے کا یقین نہ ہو جائے بندھا کھڑا رہتا تھا، [1] اور پھر ان میں سے ہر ایک کی حسنات اتنی ہیں کہ وہ خود گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں۔ اُن سب پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطاؤں کی مغفرت کا عام اعلان اس آیت میں اور دُوسری آیات میں فرما دیا، اور صرف مغفرت ہی نہیں، بلکہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (التوبۃ:۱۰۰) فرما کر اپنی رضا کی بھی سند دے دی، اس لئے اُن کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے اُن کی وجہ سے اُن میں سے کسی کو بُرا کہنا، یا اُس پر طعن وتشنیع کرنا قطعاً حرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق موجبِ لعنت اور اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

آج کل تاریخ کی جھوٹی سچی، قوی ضعیف روایات کی بنا پر جو بعض لوگوں نے بعض حضراتِ صحابہ کو موردِ طعن والزام بنایا ہے، اوّل تو اس کی بنیاد جو تاریخی روایات پر ہے، وہ بنیاد ہی متزلزل ہے، اور اگر کسی درجے میں اُن روایات کو قابلِ التفات مان بھی لیا جائے تو قرآن وحدیث کے کھلے ہوئے ارشادات کے خلاف اُن کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، وہ سب مغفور ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں پوری اُمت کا اِجماعی عقیدہ

یہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام کی تعظیم وتکریم، ان سے محبت رکھنا، ان کی مدح وثنا کرنا واجب ہے، اور ان کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے، اُن کے معاملے میں سکوت کرنا، کسی کو موردِ الزام نہ بنانا لازم ہے۔ عقائدِ اسلامیہ کی تمام کتابوں میں اس اِجماعی عقیدے کی تصریحات موجود ہیں، اِمام احمد رحمہ اللہ کا رسالہ جو بروایت اصطخری معروف ہے، اس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

لَا يَجُوْزُ لِاَحَدٍ اَنْ يَّذْكُرَ شَيْئًا مِّنْ مَّسَاوِيْهِمْ وَلَا يَطْعَنُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ بِعَيْبٍ وَّلَا نَقْصٍ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ وَجَبَ تَأْدِيْبُهٗ۔ (شرح العقیدۃ الواسطیۃ، معروف بالدرۃ المضیۃ ص: ۳۸۹)

''کسی کے لئے جائز نہیں کہ صحابۂ کرام کی کسی بُرائی کا ذِکر کرے، یا اُن میں سے کسی پر طعن کرے، یا کوئی عیب یا نقصان ان کی طرف منسوب کرے، اور جو ایسا کرے اس کو سزا دینا واجب ہے۔''

---

[1] دیکھئے: دلائل النبوۃ للبیہقیؒ، رقم الحدیث: ۱۳۶۳

اور ابن تیمیہؒ نے ''الصارم المسلول'' میں صحابۂ کرام کے متعلق فضائل و خصوصیات کی بہت سی آیات اور روایاتِ حدیث لکھنے کے بعد لکھا ہے:-

وَهٰذَا مِمَّا لَا نَعْلَمُ فِيْهِ خِلَافًا بَيْنَ اَهْلِ الْفِقْهِ وَالْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ وَّسَائِرِ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهُمْ مُجْمِعُوْنَ عَلٰى اَنَّ الْوَاجِبَ الثَّنَاءُ عَلَيْهِمْ وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ وَالتَّرَحُّمُ عَلَيْهِمْ وَالتَّرَضِّىْ عَنْهُمْ وَاعْتِقَادُ مَحَبَّتِهِمْ وَمَوَالَاتِهِمْ وَعُقُوْبَةُ مَنْ اَسَاءَ فِيْهِمُ الْقَوْلَ۔ [1]

''جہاں تک ہمارے علم میں ہے ہم اس معاملہ میں علماء، فقہاء، صحابہ و تابعین اور تمام اہل السنۃ والجماعۃ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پاتے کیونکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ اُمت پر واجب یہ ہے کہ سب صحابۂ کرام کی مدح و ثنا کرے، اور ان کے لئے اِستغفار کرے اور ان کو اللہ کی رحمت و رضا کے ساتھ ذکر کرے، اُن کی محبت اور دوستی پر ایمان رکھے، اور جو اُن کے معاملہ میں بے ادبی کرے اس کو سزا دے۔''

اور ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدۃ واسطیہ میں تمام اُمتِ محمدیہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے مشاجراتِ صحابہ کے متعلق لکھا ہے:-

وَيُمْسِكُوْنَ عَمَّا شَجَرَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ وَيَقُوْلُوْنَ هٰذِهِ الْاٰثَارُ الْمَرْوِيَّةُ فِىْ مَسَاوِيْهِمْ مِنْهَا مَا هُوَ كِذْبٌ وَّمِنْهَا مَا زِيْدَ فِيْهَا وَنُقِصَ وَغُيِّرَ وَجْهُهٗ وَالصَّحِيْحُ مِنْهُ هُمْ فِيْهِ مَعْذُوْرُوْنَ، اِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُصِيْبُوْنَ، وَاِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُخْطِئُوْنَ، وَهُمْ مَعَ ذَالِكَ لَا يَعْتَقِدُوْنَ اَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ مَعْصُوْمٌ مِّنْ كَبَائِرِ الذُّنُوْبِ وَصَغَائِرِهٖ بَلْ يَجُوْزُ عَلَيْهِمُ الذُّنُوْبُ فِى الْجُمْلَةِ وَلَهُمْ مِّنَ الْفَضَائِلِ وَالسَّوَابِقِ مَا يُوْجِبُ مَغْفِرَةَ مَا يَصْدُرُ مِنْهُمْ حَتّٰى اَنَّهُمْ يُغْفَرُ لَهُمْ مِّنَ السَّيِّئَاتِ مَا لَا يُغْفَرُ لِمَنْ بَعْدَهُمْ۔ [2]

''اہل السنۃ والجماعۃ سکوت اِختیار کرتے ہیں اُن اِختلافی معاملات سے جو صحابۂ کرام کے درمیان پیش آئے، اور کہتے ہیں کہ جو روایات اُن میں سے کسی پر عیب لگانے والی ہیں، اُن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض تو بالکل جھوٹ ہے، اور بعض میں کتر بیونت کر کے ان کی اصل حقیقت بگاڑ دی گئی ہے، اور جو کچھ صحیح ہے وہ اس میں معذور ہیں، کیونکہ (انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ کے لئے کیا، اِجتہاد سے کیا) اس اِجتہاد میں یا وہ صحیح بات پر تھے (تو دُہرے ثواب کے مستحق تھے)، یا خطا پر تھے (تو معذور اور ایک

[1] الصَّارم المسلول، المسئلة الثالثة: انه يقتل ولا يستتاب سواء كان مسلمًا أو كافرًا، ج:۱ ص:۵۷۸

[2] شرح العقيدة الواسطية لابن تيمية، إمساك اهل السُّنَّة عن الخوض فيما شجر في الصّحابة، ج:۱ ص:۳۴۱

ثواب کے مستحق تھے) ان تمام باتوں کے ساتھ وہ اس کے معتقد نہیں کہ ہر صحابی چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہے، بلکہ ان سے گناہ کا صدور ممکن ہے، مگر ان کے فضائل اور اسلام کی عظیم الشان خدمات ایسی ہیں جو اُن سب کی مغفرت کی مقتضی ہیں، یہاں تک کہ ان کی مغفرت و معافی اتنی وسیع ہوگی جو اُمت میں دُوسروں کے لئے نہ ہوگی۔"

مقامِ صحابہ اور اُن کے درجات و فضائل پر مفصل بحث سورۂ فتح کی آیات وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ... الخ (الفتح:۲۹) کے تحت گزر چکی ہے، اور احقر نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ "مقامِ صحابہ" کے نام سے لکھ دیا ہے، جو جداگانہ شائع ہو چکا ہے، جس میں عدالتِ صحابہ، مشاجراتِ صحابہ اور ان کے بارے میں تاریخی روایات کی حیثیت اور درجے کی مکمل تحقیق ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ

جس دن تو دیکھے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو دوڑتی ہوئی چلتی ہے ان کی روشنی ان کے آگے

وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

اور ان کے داہنے، خوش خبری ہے تم کو آج کے دن، باغ ہیں کہ نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں، سدا رہو

فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑫ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ

ان میں، یہ جو ہے یہی ہے بڑی مراد ملنی۔ جس دن کہیں گے دغاباز مرد اور عورتیں

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ

ایمان والوں کو راہ دیکھو ہماری، ہم بھی روشنی لے لیں تمہارے نور سے۔ کوئی کہے گا لوٹ جاؤ پیچھے،

فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ

پھر ڈھونڈ لو روشنی! پھر کھڑی کردی جائے ان کے بیچ میں ایک دیوار جس میں ہوگا دروازہ، اس کے اندر رحمت ہوگی

وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝۱۳ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى

اور باہر کی طرف عذاب۔ یہ اُن کو پکاریں گے کیا ہم نہ تھے تمہارے ساتھ کہیں گے کیوں نہیں

وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ

لیکن تم نے بچلا دیا اپنے آپ کو اور راہ دیکھتے رہے اور دھوکے میں پڑے اور بہک گئے اپنے خیالوں پر

حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۱۴ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ

یہاں تک کہ آپہنچا حکم اللہ کا، اور تم کو بہکا دیا اللہ کے نام سے اس دغاباز نے، سو آج تم سے قبول نہ ہوگا

فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ

فدیہ دینا اور نہ منکروں سے، تم سب کا گھر دوزخ ہے، وہی ہے رفیق تمہاری،

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۵ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

اور بُری جگہ جا پہنچے۔ کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں اُن کے دِل اللہ کی یاد سے

وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ

اور جو اُترا ہے سچا دِین اور نہ ہوں اُن جیسے جن کو کتاب ملی تھی اس سے پہلے،

فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۱۶

پھر دراز گزری اُن پر مدت، پھر سخت ہوگئے اُن کے دِل اور بہت اُن میں نافرمان ہیں۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ

جان رکھو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد، ہم نے کھول کر سنا دیئے تم کو پتے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٧﴾ إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ

اگر تم کو سمجھ ہے۔ تحقیق جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد اور عورتیں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو

قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ

اچھی طرح، اُن کو ملتا ہے دُونا اور اُن کو ثواب ہے عزّت کا۔ اور جو لوگ یقین لائے اللہ پر

وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط

اور اس کے سب رسولوں پر، وہی ہیں سچے ایمان والے اور لوگوں کا احوال بتلانے والے اپنے ربّ کے پاس،

لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ط وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

ان کے واسطے ہے اُن کا ثواب اور اُن کی روشنی، اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری باتوں کو

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٩﴾ ع ۲ ع ۱۸

وہ ہیں دوزخ کے لوگ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اُس دن جب تم مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا، (اور اُن سے کہا جائے گا کہ:) ''آج تمہیں خوش خبری ہے اُن باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں تم ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔ یہی ہے جو بڑی زبردست کامیابی ہے۔'' ﴿۱۲﴾ اُس دن جب منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ: ''ذرا ہمارا انتظار کرلو کہ تمہارے نور سے ہم بھی کچھ روشنی حاصل کرلیں۔'' اُن سے کہا جائے گا کہ: ''تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔'' پھر اُن کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی، اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔'' ﴿۱۳﴾ وہ مؤمنوں کو پکاریں گے کہ: ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟'' مؤمن کہیں گے کہ: ''ہاں! تھے تو سہی، لیکن تم نے خود اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا، اور انتظار میں رہے،

شک میں پڑے رہے، اور جھوٹی آرزوؤں نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا، اور وہ بڑا دھوکے باز (یعنی شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا ہی دیتا رہا۔ ⑭ چنانچہ آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا، اور نہ اُن لوگوں سے جنہوں نے (کھلے بندوں) کفر اختیار کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے، وہی تمہاری رکھوالی ہے، اور یہ بہت بُرا اَنجام ہے۔'' ⑮ جو لوگ اِیمان لے آئے ہیں، کیا اُن کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دِل اللہ کے ذِکر کے لئے اور جو حق اُترا ہے، اُس کے لئے پسیج جائیں؟ اور وہ اُن لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر اُن پر ایک لمبی مدت گذر گئی، اور اُن کے دِل سخت ہو گئے، اور (آج) اُن میں سے بہت سے نافرمان ہیں؟ ⑯ خوب سمجھ لو کہ اللہ زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے تمہارے لئے نشانیاں کھول کھول کر واضح کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔ ⑰ یقیناً وہ جو صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں ہیں ــــ اور انہوں نے اللہ کو قرض دیا ہے، اچھا قرض ــــ اُن کے لئے اُس (صدقے) کو کئی گنا بڑھا دیا جائے گا، اور اُن کے لئے باعزت اجر ہے۔ ⑱ اور جو لوگ اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر اِیمان لائے ہیں، وُہی اپنے ربّ کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ اُن کے لئے اُن کا اَجر اور اُن کا نور ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا، اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، وہ دوزخی لوگ ہیں۔ ⑲

خلاصۂ تفسیر

(وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن آپ مسلمان مَردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور اُن کے آگے اور اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا (یہ نور پل صراط پر سے گزرنے کے لئے ان کے ہمراہ ہوگا، اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف بھی ہوگا، کذا فی الدر المنثور،[1] تو تخصیص داہنی طرف کی شاید اس لئے ہو کہ اس طرف نور زیادہ قوی ہو، اور نکتہ اس تخصیص میں شاید یہ ہو کہ یہ علامت ہو اُن کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جانے کا، اور سامنے نور ہونا تو ایسے موقع پر عادتِ عامہ ہے، اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، (اور) یہ بڑی کامیابی ہے (ظاہر یہ ہے کہ یہ بات بھی اُسی وقت کہی جائے گی، اور اِس وقت بطور خبر دینے کے کہی جا رہی ہے، اور بُشْرٰىكُمُ کہنے والے غالباً فرشتے ہیں، لقولہ تعالیٰ: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا ...الخ[2] (حٰمٓ السجدۃ: ۳۰) یا حق تعالیٰ خود اس خطاب سے مشرف

[1] تفسیر الدر المنثور ج: ۹ ص: ۴۱۵، والمستدرك للحاکمؒ، رقم الحدیث: ۳۷۸۴

[2] ترجمہ: ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو اور خوش رہو۔

فرمائیں، اور یہ وہ دن ہوگا) جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے (پل صراط پر) کہیں گے کہ (ذرا) ہمارا اِنتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں (یہ اس وقت ہوگا جب کہ مسلمان اپنے اعمال وایمان کی برکت سے بہت آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین جو کہ پل صراط پر مسلمانوں کے ساتھ چڑھائے جائیں گے پیچھے اندھیرے میں رہ جائیں گے، خواہ اُن کے پاس پہلے ہی سے نور نہ ہو، یا جیسا کہ دُرِّ منثور کی ایک روایت میں ہے کہ ان کے پاس بھی قدرے نور ہو اور پھر وہ گُل ہوجائے، [۱] اور حکمت عطائے نور میں یہ ہو کہ دُنیا میں ظاہری اعمال کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے ساتھ رہا کرتے تھے مگر باعتبار اِعتقاد کے دل سے جدا تھے، اس لئے اُن کو اوّلاً اُن اعمالِ ظاہری کی وجہ سے نور مل جائے، مگر پھر دِل میں ایمان وتصدیق نہ ہونے کے سبب وہ نور مفقود ہوجائے، ونیز ان کے خداع اور دھوکے کی جزا بھی یہی ہے کہ اوّل ان کو نور مل گیا، پھر خلافِ گمان مفقود ہوگیا، غرض وہ مسلمانوں سے ٹھہرنے کو کہیں گے) اُن کو جواب دیا جائے گا (یہ جواب دینے والے خواہ فرشتے ہوں یا مؤمنین ہوں) کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر (وہاں سے) روشنی تلاش کرو (حسبِ روایت دُرِّ منثور [۲] اس پیچھے سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ظلمتِ شدیدہ کے بعد پل صراط پر چڑھنے کے وقت نور تقسیم ہوا تھا، یعنی نور تقسیم ہونے کی جگہ وہ ہے، وہاں جا کرلو، چنانچہ وہ اُدھر جائیں گے، جب وہاں بھی کچھ نہ ملے گا، پھر ادھر ہی آئیں گے) پھر (مسلمانوں کے پاس نہ پہنچ سکیں گے بلکہ) اُن (فریقین) کے درمیان میں ایک دیوار قائم کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ (بھی) ہوگا (جس کی کیفیت یہ ہے کہ) اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب کی طرف عذاب ہوگا (حسبِ روایت دُرِّ منثور یہ دیوار اَعراف ہے، [۳] اور اندرونی جانب سے مؤمنین کی طرف والی جانب اور بیرونی جانب سے مراد کافروں کی طرف والی جانب، اور رحمت سے مراد جنت اور عذاب سے مراد دوزخ ہے، اور شاید یہ دروازہ بات چیت کے لئے ہو، یا اسی دروازے میں سے جنت کا راستہ ہو، اور زیادہ تحقیق اَعراف کی سورۂ اَعراف کے رُکوعِ پنجم میں گزری ہے، غرض جب اُن میں اور مسلمانوں میں دیوار حائل ہوجائے گی اور یہ خود تاریکی میں رہ جائیں گے تو اس وقت) یہ (منافق) ان (مسلمانوں) کو پکاریں گے کہ کیا (دُنیا میں) ہم تمہارے ساتھ نہ تھے (یعنی اعمال وطاعات میں تمہارے شریک رہا کرتے تھے، تو آج بھی رفاقت کرنا چاہئے) وہ (مسلمان) کہیں گے کہ (ہاں) تھے تو سہی لیکن (ایسا ہونا کس کام کا کیونکہ محض ظاہر میں ساتھ تھے اور باطنی حالت تمہاری یہ تھی کہ) تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور

---

[۱] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۴۱۶، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ، رقم الحدیث:۱۱۰۷۹، ومجمع الزوائد، کتاب البحث، باب ما جاء فی المیزان، رقم الحدیث:۱۸۴۴۳

[۲] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۴۱۶

[۳] تفسیر الدر المنثور ج:۷ ص:۴۱۷

(وہ گمراہی یہ تھی کہ تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے، اور اُن پر حوادث واقع ہونے کے) تم منتظر (اور متمنّی) رہا کرتے تھے اور (اسلام کے حق ہونے میں) تم شک رکھتے تھے اور تم کو تمہاری بیہودہ تمناؤں نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا، یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آ پہنچا (مراد بیہودہ تمناؤں سے یہ ہے کہ اسلام مٹ جائے گا اور یہ کہ ہمارا مذہب حق ہے اور موجب نجات ہے، اور مراد حکمِ خدا سے موت ہے، یعنی عمر بھر اُن ہی کفریات پر مصر رہے توبہ بھی نہ کی) اور تم کو دھوکا دینے والے (یعنی شیطان) نے اللہ کے ساتھ دھوکے میں ڈال رکھا تھا، (وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم پر مؤاخذہ نہ کرے گا، حاصل مجموعے کا یہ ہے کہ ان کفریات کی وجہ سے تمہاری معیتِ ظاہر یہ نجات کے لئے کافی نہیں) غرض آج نہ تم سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کافروں سے (یعنی اوّل تو معاوضہ دینے کے واسطے تمہارے پاس کوئی چیز ہے نہیں، لیکن بالفرض اگر ہوتی بھی تب بھی مقبول نہ ہوتی، کیونکہ یہ دارُ الجزاء ہے دارُ العمل نہیں، اور) تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمہاری (ہمیشہ کے لئے) رفیق ہے اور وہ (واقعی) بُرا ٹھکانا ہے (یہ قول فَالْيَوْمَ الخ یا تو مؤمنین کا ہو، یا حق تعالیٰ کا، اس تمام تر بیان سے ثابت ہو گیا کہ جس ایمان میں طاعاتِ ضروریہ کی کمی ہو، وہ گو کالعدم نہیں، لیکن کامل بھی نہیں، اس لئے اگلی آیات میں اس کی تکمیل کے لئے بصورت عتاب کے مسلمانوں کو حکم فرماتے ہیں کہ) کیا ایمان والوں (میں سے جو لوگ طاعاتِ ضروریہ میں کمی کرتے ہیں، جیسے گناہگار مسلمانوں کی حالت ہوتی ہے، تو کیا ان) کے لئے (اب بھی) اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دِینِ حق (من جانب اللہ) نازل ہوا ہے (کہ وہی نصیحتِ خداوندی ہے) اس کے سامنے جھک جائیں (یعنی دل سے عزم پابندی طاعاتِ ضروریہ وترکِ معاصی کا کرلیں اور اس کو خشوع بمعنی سکون اس لئے کہا کہ دل کا حالتِ مطلوبہ پر رہنا سکون ہے، اور معصیت کی طرف جانا مشابہ حرکت کے ہے) اور (خشوع بالمعنی المذکور میں دیر کرنے سے جس کا حاصل توبہ میں دیر کرنا ہے وہ) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود ونصاریٰ کہ انہوں نے بھی برخلاف مقتضائے اپنی کتابوں کے شہوات ومعاصی میں اِنہماک شروع کیا) پھر (اسی حالت میں) اُن پر ایک زمانۂ دراز گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر (اس توبہ نہ کرنے سے) ان کے دل (خوب ہی) سخت ہو گئے (کہ ندامت وملامت اضطراری بھی نہ ہوتی تھی) اور (اس کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسی قساوت کی بدولت) بہت سے آدمی اُن میں کے (آج) کافر ہیں (کیونکہ معصیت پر اِصرار اور اس کو اچھا سمجھنا اور نبی برحق کی عداوت اکثر سببِ کفر بن جاتا ہے، مطلب یہ کہ مسلمان کو جلدی توبہ کر لینا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات پھر توبہ کی توفیق نہیں رہتی، اور بعض اوقات کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے دلوں میں معاصی سے کوئی خرابی کم وبیش پیدا ہو گئی ہو تو اس کو اس وہم کی بنا پر توبہ سے مانع نہ سمجھو کہ اب توبہ سے کیا اصلاح ہوگی بلکہ) یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ (کی ایسی شان ہے کہ

وہ) زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے (بس اسی طرح توبہ کرنے پر اپنی رحمت سے قلبِ مردہ کو زندہ اور دُرست کر دیتا ہے، پس مایوس نہ ہونا چاہئے، کیونکہ) ہم نے تم سے (اس کے) نظائر بیان کر دیئے ہیں تاکہ تم سمجھو (نمونے سے مراد جیسا مدارک میں ہے اِحیائے ارض ہے[1] اور شاید جمع لانا بوجہ تکرارِ وقوع کے ہو، آگے فضیلت اِنفاق مذکورہ بالا کی اِرشاد ہے، یعنی) بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور یہ (صدقہ دینے والے) اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں، وہ صدقہ (باعتبار ثواب کے) ان کے لئے بڑھا دیا جائے گا اور (مضاعفت کے ساتھ) اُن کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (تفسیر اس کی ابھی گزر چکی ہے) اور (آگے فضیلت ایمان مذکورہ بالا کی ارشاد ہے کہ) جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر (پورا) ایمان رکھتے ہیں (یعنی جن میں ایمان اور تصدیق اور پابندیٔ طاعت مکمل درجے میں ہو) ایسے ہی لوگ اپنے رَبّ کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں (جس کا بیان سورۂ نساء کے رُکوع نہم میں آچکا ہے، یعنی یہ مراتب کمال ایمانِ کامل ہی کی بدولت نصیب ہوتے ہیں، اور شہید کا حاصل باذل نفس فی اللہ ہے، یعنی جو اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کر دے، گو قتل نہ ہو، کیونکہ وہ اختیار سے خارج ہے) اُن کے لئے (جنت میں) ان کا اجر (خاص) اور (صراط پر) اُن کا نور (خاص) ہوگا، اور (آگے کفار کا ذِکر فرماتے ہیں کہ) جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یہی لوگ دوزخی ہیں۔

معارف و مسائل

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ، یعنی وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے جس دن آپ مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور داہنی طرف ہوگا... الخ۔

اس دن سے مراد قیامت کا دِن ہے، اور یہ نور عطا ہونے کا معاملہ پل صراط پر چلنے سے کچھ پہلے پیش آئے گا، اس کی تفصیل ایک حدیث میں ہے جو حضرت ابواُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے اس کو بحوالۂ ابنِ ابی حاتم نقل کیا ہے، حدیث طویل ہے جس میں ابواُمامہ رضی اللہ عنہ کا دمشق میں ایک جنازے میں شریک ہونا اور فارغ ہونے کے بعد لوگوں کو موت اور آخرت کی یاد دِلانے کے لئے موت اور قبر، پھر حشر کے کچھ حالات بیان فرمانا مذکور ہے، اس کے چند جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ:-

''پھر تم قبروں سے میدانِ حشر کی طرف منتقل کئے جاؤ گے، جس میں مختلف مراحل اور مواقف ہوں

[1] تفسیر المدارک تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۴۰۰

گے، ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ بحکم خداوندی کچھ چہرے سفید اور روشن کر دیئے جائیں گے، اور کچھ چہرے کالے سیاہ کر دیئے جائیں گے، پھر ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ میدانِ حشر میں جمع ہونے والے سب لوگوں پر جن میں مؤمن و کافر سب ہوں گے، ایک شدید ظلمت اور اندھیری طاری ہو جائے گی، کسی کو کچھ نظر نہ آئے گا، اس کے بعد نور تقسیم کیا جائے گا، ہر مؤمن کو نور عطا کیا جائے گا۔[۱] (ابن ابی حاتم رحمہ اللہ ہی کی دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مؤمن میں یہ نور بقدر اُن کے اعمال کے تقسیم ہوگا، کسی کا نور مثل پہاڑ کے، کسی کا کھجور کے درخت کے مثل، کسی کا قامتِ انسانی کے برابر ہوگا، سب سے کم نور اس شخص کا ہوگا جس کے صرف انگوٹھے میں نور ہوگا، اور وہ بھی کبھی روشن ہو جائے گا، کبھی بجھ جائے گا۔ ابن کثیر)[۲]

پھر حضرت ابواُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ منافقین اور کفار کو کوئی نور نہ دیا جائے گا، اور فرمایا کہ اسی واقعے کو قرآنِ کریم نے ایک مثال کے عنوان سے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ؀ (النور) اور فرمایا کہ مؤمنین کو جو نور عطا ہوگا (اس کا حال دُنیا کے نور کی طرح نہیں ہوگا کہ جہاں کہیں نور ہو اس کے پاس والے بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں) بلکہ جس طرح کوئی اندھا آدمی دوسرے بصیر آدمی کے نورِ بصر سے نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح مؤمنین کے اس نور سے کوئی کافر یا فاسق فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا۔'' (ابنِ کثیر)[۳]

حضرت ابواُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس موقف میں ظلمتِ شدیدہ کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں میں نور تقسیم ہوگا، اسی وقت سے کافر اور منافق اس نور سے محروم رہیں گے، اُن کو کسی قسم کا نور ملے ہی گا نہیں۔

مگر طبرانی نے حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک مرفوع روایت یہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

''پل صراط کے پاس اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو نور عطا فرمائیں گے اور ہر منافق کو بھی، مگر جس وقت یہ

---

[۱] تفسير ابن ابى حاتم تحت هٰذه الآية، رقم: ۱۸۸۲۱

[۲] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۱۵، ومصنف ابن ابى شيبة، كلام ابن مسعود رضى الله عنه، رقم الحديث: ۳۴۵۵۸

[۳] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۱۶

پل صراط پر پہنچ جائیں گے تو منافقین کا نور سلب کرلیا جائے گا۔ (ابن کثیر) [۱]

اس سے معلوم ہوا کہ منافقین کو بھی ابتدا میں نور دِیا جائے گا، مگر پل صراط پر پہنچ کر یہ نور سلب ہو جائے گا، بہر حال خواہ ابتدا ہی سے اُن کو نور نہ ملا ہو، یا مل کر بجھ گیا ہو، اس وقت وہ مؤمنین سے درخواست کریں گے کہ ذرا ٹھہرو، ہم بھی تمہارے نور سے کچھ فائدہ اُٹھالیں، کیونکہ ہم دُنیا میں بھی نماز، زکوٰۃ، حج، جہاد سب چیزوں میں تمہارے شریک رہا کرتے تھے، تو ان کو اس درخواست کا جواب نامنظوری کی شکل میں دیا جائے گا، جس کا بیان آگے آتا ہے، اور منافقین کے مناسبِ حال تو یہی ہے کہ پہلے ان کو بھی مسلمانوں کی طرح نور ملے، پھر اس کو سلب کرلیا جائے، جس طرح وہ دُنیا میں خدا اور رسول کو دھوکا دینے کی ہی کوشش میں لگے رہے تھے، ان کے ساتھ قیامت میں معاملہ بھی ایسا ہی کیا جائے گا جیسے کسی کو دھوکا دینے کے لئے کچھ روشنی دِکھلا کر بجھادی جائے، جیسا کہ اُن کے بارے میں قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (النساء: ۱۴۲)، یعنی ''منافقین اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکا دینے والا ہے۔''

اِمام بغویؒ نے فرمایا کہ اس دھوکے سے یہی مراد ہے کہ پہلے نور دے دیا جائے گا، مگر عین اُس وقت جب نور کی ضرورت ہوگی، سلب کرلیا جائے گا۔ [۲] اور یہی وہ وقت ہوگا جبکہ مؤمنین کو بھی یہ اندیشہ لگ جائے گا کہ کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں گے کہ ہمارے نور کو آخر تک پورا کر دیجئے، جس کا ذِکر اس آیت میں ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا...الآیۃ [۳] (التحریم: ۸) (مظہری) [۴]

مسلم، احمد اور دارقطنی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ شروع میں مؤمن ومنافق دونوں کو نور دِیا جائے گا، پھر پل صراط پر پہنچ کر منافقین کا نور سلب ہو جائے گا۔ [۵]

اور تفسیر مظہری میں ان دونوں روایتوں کی تطبیق [۶] اس طرح بیان کی ہے کہ اصل منافقین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اُن کو تو شروع ہی سے کفار کی طرح کوئی نور نہ ملے گا، مگر وہ منافقین جو اس اُمت میں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں گے، جن کو منافقین کا نام تو اس لئے نہیں دیا جاسکے گا کہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۱۷، والمعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۱۱۰۷۹

[۲] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۳۵

[۳] ترجمہ: جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا، یوں دُعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رَبّ ہمارے لئے اس نور کو اخیر تک رکھئے۔

[۴] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۹۵

[۵] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدین من النار ج:۱ ص:۱۰۷، ومسند احمد، مسند جابر بن عبدالله رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۱۴۷۲۱

[۶] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۹۶

ختم ہو چکا اور کسی کے بارے میں بغیر وحیِ قطعی کے یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ دل سے مؤمن نہیں، صرف زبان کا اقرار ہے، اس لئے اُمت میں کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی کو منافق کہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کس کے دل میں ایمان ہے، کس کے دل میں نہیں تو ان میں سے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم میں منافق ہیں گو ظاہر میں ان کی منافقت نہیں کھلی، ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا کہ شروع میں اُن کو بھی نور دے دیا جائے گا، بعد میں سلب کرلیا جائے۔

اس قسم کے منافقین اُمت کے وہ لوگ ہیں جو قرآن وحدیث میں تحریف کر کے ان کے معانی کو بگاڑتے اور اپنے مطلب کے موافق بناتے ہیں۔ نعوذ بالله منه۔

میدانِ حشر میں نور اور ظلمت کے اسباب

اس جگہ تفسیرِ مظہری میں قرآن وحدیث سے محشر کی ظلمت ونور کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، جو علمی تحقیقات سے زیادہ اہم ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔ لَعَلَّ اللهَ تَعَالٰى يَرْزُقُنَا نُوْرًا۔

۱- ابوداؤد و ترمذی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ اور ابنِ ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”خوش خبری سنا دو ان لوگوں کو جو اندھیری راتوں میں مسجد کی طرف جاتے ہیں، قیامت کے روز مکمل نور کی۔“ اور اسی مضمون کی روایات حضرت سہل بن سعد، زید بن حارثہ، ابنِ عباس، ابنِ عمر، حارثہ ابنِ وہب، ابواُمامہ، ابوالدرداء، ابوسعید، ابوموسیٰ، ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ وغیرہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی منقول ہیں۔ (مظہری) [۱]

۲- مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مَنْ حَافَظَ عَلَى الصَّلَوَاتِ كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَّبُرْهَانًا وَّنَجَاةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَّمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ يَكُنْ لَّهٗ نُوْرًا وَّلَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَّكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَهَامَانَ وَفِرْعَوْنَ۔“

”جو شخص پانچوں نمازوں کی محافظت کرے گا (یعنی ان کے اوقات اور آداب کو پابندی کے ساتھ بجا لائے گا) اس کے لئے یہ نماز قیامت کے روز نور اور بُرہان اور نجات بن جائے گی، اور جو اس پر

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۹۲، وسنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی المشی إلى الصلاة فی الظلم ج:۱ ص:۸۳، وجامع الترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعة ج:۱ ص:۵۳، وسنن ابن ماجة، ابوابُ المساجد والجماعات، باب المشی إلى الصلاة ج:۱ ص:۵۶

محافظت نہ کرے گا، نہ اُس کے لئے نور ہوگا، نہ بُرہان اور نہ نجات، اور وہ قارون اور ہامان اور فرعون کے ساتھ ہوگا۔'' [۱]

۳- اور طبرانی نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو سورۂ کہف پڑھے گا قیامت کے روز اس کے لئے اتنا نور ہوگا جو اس کی جگہ سے مکہ مکرمہ تک پھیلے گا۔ [۲] اور ایک روایت میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھے گا، قیامت کے روز اس کے قدموں سے آسمان کی بلندی تک نور چمکے گا۔ [۳]

۴- امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کی ایک آیت بھی تلاوت کرے گا، وہ آیت اس کے لئے قیامت کے روز نور ہوگی۔ [۴]

۵- دیلمی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مجھ پر دُرود بھیجنا پل صراط پر نور کا سبب بنے گا۔ [۵]

۶- طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے اَحکام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حج وعمرہ کے اِحرام سے فارغ ہونے کے لئے جو سر منڈایا جاتا ہے تو اس میں جو بال زمین پر گرتا ہے وہ قیامت کے روز نور ہوگا۔ [۶]

۷- مسند بزار میں حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ منیٰ میں جمرات کی رَمی کرنا قیامت کے روز نور ہوگا۔ [۷]

۸- طبرانی نے بسند جید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس شخص کے بال حالتِ اسلام میں سفید ہوجائیں، وہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔ [۸]

۹- بزار نے بسند جید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد میں

---

[۱] مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، رقم الحدیث:۶۵۷۶، وصحیح ابن حبان رقم الحدیث:۱۴۶۷

[۲] المعجم الأوسط رقم الحدیث:۱۴۵۵

[۳] المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث:۱۶۸۴۱

[۴] مسند احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۸۴۷۵

[۵] الفردوس بمأثور الخطاب للدیلمیؒ، رقم الحدیث:۳۸۱۴

[۶] المعجم الأوسط، رقم الحدیث:۲۳۲۰

[۷] مسند البزار بحوالہ تفسیر المظہری ج:۹ ص:۱۹۴

[۸] جامع الترمذی، ابواب الجہاد، فضل من شاب شیبۃ فی سبیل اللہ، ج:۲ ص:۲۹۲

ایک تیر بھی پھینکے گا، اس کے لئے قیامت میں نور ہو گا۔ [۱]

۱۰- بیہقی نے شعب الایمان میں بسند منقطع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بازار میں اللہ کا ذکر کرنے والے کو اس کے ہر بال کے مقابلے میں قیامت کے روز ایک نور ملے گا۔ [۲]

۱۱- طبرانی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت و تکلیف کو دُور کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے پل صراط پر نور کے دو شعبے بنا دے گا، جس سے ایک جہان روشن ہو جائے گا، جن کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ [۳]

۱۲- بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور حاکم نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اور طبرانی نے ابن زیاد سے روایت کیا ہے کہ ان سب نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِيَّاكُمْ وَالظُّلْمَ فَإِنَّهُ هُوَ الظُّلُمَاتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''، یعنی تم ظلم سے بہت بچو، کیونکہ ظلم ہی قیامت کے روز ظلمات اور اندھیری ہوگی۔ [۴]

نَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الظُّلُمَاتِ وَنَسْأَلُهُ النُّوْرَ التَّامَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ یعنی اس روز جب منافق مرد اور منافق عورتیں مؤمنین سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اُٹھالیں۔

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا اُن سے کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹو جہاں یہ نور تقسیم ہوا تھا، وہیں نور تلاش کرو۔ یہ بات یا تو مؤمنین اُن کے جواب میں کہیں گے، یا فرشتے جواب دیں گے، (كما روى عن ابن عباس وقتادة قولين)۔

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یعنی مؤمنین یا فرشتوں کا جواب سن کر منافقین اُسی جگہ کی طرف لوٹیں گے جہاں نور تقسیم ہوا تھا، وہاں کچھ نہ پائیں گے تو پھر اُس طرف آئیں گے، اُس وقت یہ مؤمنین تک پہنچنے نہ پائیں گے بلکہ ان کے اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی، جس کے پرلی طرف جہاں مؤمنین ہوں گے، رحمت ہوگی، اور اس طرف جہاں منافقین ہوں گے، عذاب ہوگا۔

رُوح المعانی میں ابن زیدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ دیوار اَعراف ہوگی جو مؤمنین و کفار کے درمیان حائل کر دی

[۱] مسند البزار، رقم الحديث: ۹۳۱۲

[۲] شعب الإيمان للبيهقيؒ، رقم الحديث: ۵۶۲

[۳] المعجم الكبير للطبرانيؒ، رقم الحديث: ۸۳۸

[۴] صحيح البخاري، ابواب المظالم، والقصاص، باب الظلم ظلمات يوم القيامة، ج: ۱ ص: ۳۳۱

جائے گی۔ [۱] اور بعض دُوسرے مفسرین نے دیوارِ اَعراف کے علاوہ کوئی دُوسری دیوار قرار دی ہے، اور اس دیوار میں جو دروازہ رکھا جائے گا یا تو اس لئے کہ اس کے راستے سے مؤمنین و کفار میں باہم گفتگو ہو سکے، یا مؤمنین کو اسی دروازے سے گزارنے کے بعد بند کر دیا جائے گا۔

فائدہ:- اس نور کے معاملے میں کفار کا کہیں ذِکر نہیں آیا، کیونکہ ان میں نور کا کوئی اِحتمال ہی نہ تھا، منافقین کے نور کے بارے میں دو روایتیں آئیں کہ اوّل ہی سے ان کو نور نہ ملے گا، یا ملنے کے بعد پل صراط پر جانے کے وقت بجھا دیا جائے گا، اور ان کے اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی، اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پل صراط کے ذریعہ جہنم کو پار کرنا یہ صرف مؤمنین کے لئے ہوگا، کفار و مشرکین پل صراط پر نہیں چڑھیں گے، وہ جہنم کے دروازوں کے راستے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے، اور مؤمنین پل صراط کے راستے سے گزریں گے، پھر گناہگار مؤمن جن کے لئے ان کے اعمال کی سزا چند روز جہنم میں رہنا ہے، وہ اس پل سے گر کر جہنم میں پہنچیں گے، باقی مؤمنین صحیح سالم گزر کر جنت میں داخل ہوں گے، وصرّح به الشاه عبدالقادر الدهلوی رحمه الله ویؤیده ما فی الدر هٰهُنا۔ والله اعلم۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ یعنی کیا اب بھی وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے قلوب اللہ کے ذِکر کے لئے جھک جائیں اور نرم ہو جائیں اور اس قرآن کے لئے جو اُن پر نازل کیا گیا۔ [۲]

خشوعِ قلب سے مراد دِل کا نرم ہونا اور وعظ و نصیحت کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ (ابنِ کثیر)

قرآن کے لئے خشوع یہ ہے کہ اس کے اَحکام اَوامر و نواہی کی مکمل اطاعت کے لئے تیار ہو جائے، اور اس پر عمل کرنے میں کسی سستی اور کمزوری کو راہ نہ دے۔ (رُوح المعانی) [۳]

یہ عتاب و تنبیہ مؤمنین کو ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض مؤمنین کے قلوب میں عمل کے اعتبار سے کچھ سستی معلوم کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابنِ کثیر) [۴] اِمام اَعمش رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد صحابہ کرام کو کچھ معاشی سہولتیں اور آرام ملا تو بعض حضرات میں عمل کی جدوجہد جو اُن کی عادت تھی، اس میں کچھ کمی اور سستی پائی گئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (رُوح المعانی) [۵]

---

[۱] تفسیر روح المعانی، تحت هٰذه الآیة ج:۲۰ ص:۳۲۱

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۱۹

[۳] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۲۷

[۴] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۰

[۵] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۲۶

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ آیت عتاب نزولِ قرآن سے تیرہ سال بعد نازل ہوئی۔(رواہ عنہ ابن ابی حاتم) [۱] اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہمارے اسلام لانے کے چار سال بعد اس آیت کے ذریعے ہم پر عتاب وتنبیہ نازل کی گئی۔ [۲] واللہ اعلم۔

بہرحال حاصل اس عتاب وتنبیہ کا مؤمنین کو مکمل خشوع اور عملِ صالح کے لئے مستعد رہنے کی تعلیم ہے، اور خشوعِ قلب ہی پر تمام اعمال کا مدار ہے۔

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز لوگوں سے اُٹھالی جائے گی، وہ خشوع ہے۔ (ابن کثیر) [۳]

کیا ہر مؤمن صدّیق وشہید ہے؟

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدیق وشہید ہر مؤمن کو کہا جاسکتا ہے، اور حضرت قتادہ اور عمرو بن میمون رحمہما اللہ نے اس آیت کی بنا پر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے وہ صدّیق وشہید ہے۔

ابنِ جریر رحمہ اللہ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مُؤْمِنُوْا اُمَّتِیْ شُهَدَآءُ''یعنی میری اُمت کے سب مؤمن شہید ہیں، اور اس کی دلیل میں آپ نے آیتِ مذکورہ تلاوت فرمائی۔ [۴]

ابنِ ابی حاتم رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک روز اُن کے پاس کچھ حضراتِ صحابہ جمع تھے، انہوں نے فرمایا: ''كُلُّكُمْ صِدِّيْقٌ وَّشَهِيْدٌ''یعنی تم میں سے ہر ایک صدّیق بھی ہے، شہید بھی۔ لوگوں نے تعجب سے کہا کہ ابوہریرہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری بات کا یقین نہیں آتا تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ۔ [۵]

لیکن قرآنِ کریم کی ایک دُوسری آیت سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صدیق وشہید ہر مؤمن نہیں، بلکہ مؤمنین

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتمؒ، رقم الحدیث: ۱۸۸۲۵، قولہ تعالیٰ: "اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا"

[۲] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، بابٌ فی قولہ تعالیٰ: "اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا" ج:۲ ص:۴۲۱

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۰، وجامع الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی ذھاب العلم، ج:۲ ص:۹۳، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ، رقم الحدیث: ۷۱۸۳

[۴] تفسیر الطبری تحت ھذہ الآیۃ ج:۲۳ ص:۱۹۲

[۵] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۴۲۱، وابن ابی حاتم رقم: ۱۸۸۳۱

میں سے ایک اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو "صدیق وشہید" کہا جاتا ہے، آیت یہ ہے: فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ [۱] (النساء:۶۹) کیونکہ اس آیت میں انبیاء کے ساتھ عام مؤمنین میں تین طبقے خصوصیت سے ذِکر کئے گئے ہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور ظاہر اس سے یہ ہے کہ ان تینوں کے مفہوم اور مصداق میں فرق ہے، ورنہ تینوں کو الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ صدیقین وشہداء تو دراصل مؤمنین کے مخصوص اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں، جو بڑی صفاتِ عالیہ کے حامل ہیں، یہاں سب مؤمنین کو صدیق وشہید فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ ہر مؤمنین بھی ایک حیثیت سے صدیقین وشہداء کے حکم میں ہے، اور اُن کے زُمرے میں لاحق سمجھا جائے گا۔

اور رُوح المعانی [۲] میں ہے کہ مناسب یہ ہے کہ اس آیت میں وَالَّذِينَ آمَنُوا سے مراد وہ مؤمن لئے جائیں جو ایمانِ کامل رکھتے ہیں اور طاعات کے پابند ہیں، ورنہ وہ مؤمن جو شہوات اور غفلت میں منہمک ہو، اس کو صدیق وشہید نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللَّعَّانُوْنَ لَا يَكُوْنُوْنَ شُهَدَآءَ" [۳] یعنی لوگوں پر لعنت کرنے والے شہداء میں شامل نہ ہوں گے۔ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا کہ: "تمہیں کیا ہوگیا کہ تم دیکھتے ہو کہ کوئی آدمی لوگوں کی عزّت وآبرو کو مجروح کرتا ہے اور تم اس کو نہ روکتے ہو، نہ کوئی بُرا مانتے ہو؟" ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم اس کی بدزبانی سے ڈرتے ہیں کہ ہم کچھ بولیں گے تو وہ ہماری بھی عزّت وآبرو پر حملہ کرے گا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر یہ بات ہے تو تم لوگ شہداء نہیں ہوسکتے۔" [۴] ابنِ اثیر رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کر کے اس کا مطلب یہ بتلایا کہ ایسی مداہنت کرنے والے اُن شہداء میں شامل نہیں ہوں گے جو قیامت کے روز انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اُمتوں کے مقابلے میں شہادت دیں گے۔ (رُوح المعانی) [۵]

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں وَالَّذِينَ آمَنُوا سے مراد صرف وہ حضرات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایمان لائے اور آپ کی صحبت سے مشرف ہوئے۔ [۶]

---

[۱] ترجمہ: تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء۔

[۲] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۳۳

[۳] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها، ج:۲ ص:۳۲۳

[۴] مصنف عبدالرزّاق، کتاب الجامع، باب الإغتياب والشتم، رقم الحديث: ۲۰۲۶۱

[۵] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۴ ص:۱۸۳

[۶] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۱۹۹

اور آیت میں لفظ هُمُ الصِّدِّيقُونَ جو کلمۂ حصر ہے، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صدیقیت صحابۂ کرام میں منحصر ہے، حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحابۂ کرام سب کے سب کمالاتِ نبوّت کے حامل تھے، جس شخص نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کے ساتھ دیکھ لیا، وہ کمالاتِ نبوّت میں مستغرق ہوگیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ

جان رکھو کہ دُنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں

وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ

اور بہتائیت ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی، جیسے حالت ایک مینہ کی جو خوش لگا کسانوں کو اس کا سبزہ

ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ

پھر زور پر آتا ہے، پھر تو دیکھے زرد ہوگیا، پھر ہوجاتا ہے روندا ہوا گھاس، اور آخرت میں

عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ

سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی اور دُنیا کی زندگانی تو

اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

یہی ہے مال دغا کا۔ دوڑو اپنے رَبّ کی معافی کی طرف کو اور بہشت کو جس کا پھیلاؤ ہے

كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ

جیسے پھیلاؤ آسمان اور زمین کا، تیار رکھی ہے واسطے اُن کے جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾

یہ فضل اللہ کا ہے، دے اس کو جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

خوب سمجھ لو کہ اس دُنیا والی زندگی کی حقیقت بس یہ ہے کہ وہ نام ہے کھیل کود کا، ظاہری سجاوٹ کا، تمہارے ایک دُوسرے پر فخر جتانے کا، اور مال اور اولاد میں ایک دُوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنے کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش جس سے اُگنے والی چیزیں کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہیں، پھر وہ اپنا زور دِکھاتی ہے، پھر تم اُس کو دیکھتے ہو کہ زرد پڑ گئی ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں (ایک تو) سخت عذاب ہے، اور (دُوسرے) اللہ کی طرف سے بخشش ہے، اور خوشنودی ـــــ اور دُنیا والی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ﴿۲۰﴾ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف اور اُس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی جیسی ہے، یہ اُن لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر اِیمان لائے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ﴿۲۱﴾

خلاصۂ تفسیر

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلے میں) دُنیوی حیات (ہرگز قابلِ اِشتغال چیز نہیں، کیونکہ) محض لہو ولعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دُوسرے پر فخر کرنا (قوت و جمال اور دُنیوی ہنر و کمال میں) اور اَموال اور اَولاد میں ایک کا دُوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی مقاصدِ دُنیا کے یہ ہیں کہ بچپن میں لہو ولعب کا غلبہ رہتا ہے، اور جوانی میں زینت و تفاخر کا، اور بڑھاپے میں مال و دولت، آل و اولاد کو گنوانا، اور یہ سب مقاصد فانی اور خواب و خیال محض ہیں، جس کی مثال ایسی ہے) جیسے مینہ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زَرد دیکھتا ہے، پھر وہ چُورا چُورا ہو جاتی ہے (اسی طرح دُنیا چند روزہ بہار ہے، پھر زوال و اِضمحلال، یہ تو دُنیا کی حالت ہوئی) اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں، ایک تو کفار کے لئے) عذابِ شدید ہے اور (دُوسری اہلِ ایمان کے لئے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں، پس آخرت تو باقی ہے) اور دُنیوی زندگانی محض (فانی ہے، جیسے فرض کرو کہ ایک) دھوکے کا اسباب ہے (ومرّ فی تفسیرہ فی آل عمران

قریبًا من الأخیر، پس جب متاعِ دُنیا فانی اور دولتِ آخرت باقی ہے جو ایمان کی بدولت نصیب ہوتی ہے تو تم کو چاہئے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے (یعنی اس سے کم کی نفی ہے، زیادہ کی نفی نہیں، اور) وہ اُن لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور) یہ (مغفرت ورضوان) اللہ کا فضل ہے، وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں، اور اللہ بڑے فضل والا ہے (اس میں اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر کوئی مغرور نہ ہو، اور اپنے اعمال پر اِستحقاقِ جنت کا مدعی نہ ہو، یہ محض فضل ہے جس کا مدار ہماری مشیت پر ہے، مگر ہم نے اپنی رحمت سے ان عملوں کے کرنے والوں کے ساتھ مشیت متعلق کرلی، اگر ہم چاہتے تو مشیت نہ کرتے کہ اَلْقُدْرَةُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّيْنِ)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں اہلِ جنت کے اور اہلِ جہنم کے حال کا بیان تھا، جو آخرت میں پیش آئے گا اور دائمی ہوگا، اور آخرت کی نعمتوں سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہونے کا بڑا سبب انسان کے لئے دُنیا کی فانی لذتیں اور ان میں منہمک ہوکر آخرت سے غفلت ہونا ہے، اس لئے ان آیات میں دُنیائے فانی کا ناقابلِ اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ابتدائے عمر سے آخر تک جو کچھ دُنیا میں ہوتا ہے، اور جس میں دُنیادار منہمک ومشغول اور اس پر خوش رہتے ہیں، اُس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی کا خلاصہ بہ ترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لَعِب، پھر لَهْو، پھر زینت، پھر تفاخر، پھر مال واولاد کی کثرت پر ناز وفخر۔

لَعِبٌ وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیشِ نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں۔ اور لَهْوٌ وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دِل بہلانا اور وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے، ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دُوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہوجاتا ہے، جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند، شناوری یا نشانہ بازی وغیرہ، حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے۔ زینت بدن اور لباس وغیرہ کی معروف ہے، ہر اِنسان اس دور سے گزرتا ہے کہ عمر کا بالکل ابتدائی حصہ تو خالص کھیل یعنی لَعِبْ میں گزرتا ہے، اس کے بعد لَهْوْ شروع ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے، اس کے بعد ہم عصروں، ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

اور اِنسان پر جتنے دور اس ترتیب سے آتے ہیں، غور کرو تو ہر دور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دور سے دُوسرے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے تو سابقہ دور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے، بچے ابتدائی دور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایۂ زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں، کوئی اُن سے چھین لے تو اُن کو ایسا

ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال واسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اُس وقت مقصودِ زندگی بنایا ہوا تھا، وہ کچھ نہ تھیں، سب خرافات تھیں، بچپن میں لعب، پھر لَهْو میں مشغولیت رہی، جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا، بڑھاپا آیا، اب مشغلہ تکاثر فی الأموال والأولاد کا ہو گیا، کہ اپنے مال و دولت کے اعداد و شمار اور اولاد و نسل کی زیادتی پر خوش ہوتا رہے، ان کو گنتا گناتا رہے، مگر جیسے جوانی کے زمانے میں بچپن کی حرکتیں لغو معلوم ہونے لگی تھیں، بڑھاپے میں پہنچ کر جوانی کی حرکتیں لغو و ناقابلِ التفات نظر آنے لگیں، اب بڑے میاں کی آخری منزل بڑھاپا ہے، اس میں مال کی بہتات، اولاد کی کثرت و قوت اور ان کے جاہ و منصب پر فخر سرمایۂ زندگی اور مقصودِ اعظم بنا ہوا ہے، قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ حال بھی گزر جانے والا ہے اور فانی ہے، اگلا دور برزخ پھر قیامت کا ہے، اس کی فکر کرو کہ وہ ہی اصل ہے، قرآنِ کریم نے اس ترتیب کے ساتھ ان سب مشاغل و مقاصدِ دُنیویہ کا زوال پذیر، ناقص، ناقابلِ اعتماد ہونا بیان فرما دیا، اور آگے اس کو ایک کھیتی کی مثال سے واضح فرمایا:-

كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۔ غَيْثٌ کے معنی بارش کے ہیں، اور لفظ ''کُفَّار'' جو مؤمنین کے مقابلے میں آتا ہے، اس کے یہ معنی تو معروف و مشہور ہی ہیں، اس کے ایک دُوسرے لغوی معنی کاشتکار کے بھی آتے ہیں، اس آیت میں بعض حضرات نے یہی معنی مراد لئے ہیں، اور مطلب آیت کا یہ قرار دیا ہے کہ جس طرح بارش سے کھیتی اور طرح طرح کی نباتات اُگتی ہیں، اور جب وہ ہری بھری ہوتی ہیں تو کاشتکار ان سے خوش ہوتا ہے۔

اور بعض دُوسرے حضراتِ مفسرین نے لفظ ''کُفَّار'' کو اس جگہ بھی معروف معنی میں لیا ہے کہ کافر لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں، اس پر جو یہ اِشکال ہے کہ کھیتی ہری بھری دیکھ کر خوش ہونا تو کافر کے ساتھ مخصوص نہیں، مسلمان بھی اس سے خوش ہوتا ہے، اس کا جواب حضراتِ مفسرین نے یہ دیا ہے کہ مؤمن کی خوشی اور کافر کی خوشی میں بڑا فرق ہے، مؤمن خوش ہوتا ہے تو اس کی فکر کا رُخ حق تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے، وہ یقین کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی قدرت و حکمت اور رحمت کا نتیجہ ہے، وہ اس چیز کو زندگی کا مقصود نہیں بناتا، پھر اس خوشی کے ساتھ اس کو آخرت کی فکر بھی ہر وقت لگی رہتی ہے، اس لئے جو مؤمن ایمان کے تقاضے کو پورا کرتا ہے، دُنیا کی بڑی سے بڑی دولت پر بھی وہ ایسا خوش اور مگن اور مست نہیں ہوتا جیسا کافر ہوتا ہے، اس لئے یہاں خوشی کا اظہار کفار کی طرف منسوب ہے۔

آگے اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کھیتی اور دُوسری نباتات پھول پھلواریاں جب ہری بھری ہوتی ہیں تو سب دیکھنے والے خصوصاً کفار بڑے خوش اور مگن نظر آتے ہیں، مگر آخر کار پھر وہ خشک ہونا شروع ہوتی ہے، پہلے زرد پیلی پڑ جاتی ہے، پھر بالکل خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے، یہی مثال انسان کی ہے کہ شروع میں تر و تازہ، حسین، خوب صورت ہوتا

ہے، بچپن سے جوانی تک کے مراحل اسی حال میں طے کرتا ہے، مگر آخر کار بڑھاپا آجاتا ہے جو آہستہ آہستہ بدن کی تازگی اور حسن و جمال سب ختم کردیتا ہے، اور بالآخر مر کر مٹی ہو جاتا ہے، دُنیا کی بے ثباتی اور زوال پذیر ہونے کا بیان فرمانے کے بعد پھر اصل مقصود آخرت کی فکر کی طرف توجہ دلانے کے لئے آخرت کے حال کا ذِکر فرمایا:

وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ یعنی آخرت میں انسان ان دو حالوں میں سے کسی ایک میں ضرور پہنچے گا، ایک حال کفار کا ہے، اُن کے لئے عذابِ شدید ہے، دُوسرا حال مؤمنین کا ہے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے۔

یہاں عذاب کا ذِکر پہلے کیا گیا، کیونکہ دُنیا میں مست و مغرور ہونا جو پہلی آیت میں مذکور ہے، اس کا نتیجہ بھی عذابِ شدید ہے، اور عذابِ شدید کے مقابلے میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں: مغفرت اور رضوان، جس میں اشارہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی ایک نعمت ہے، جس کے نتیجے میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے، مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے، جس کا سبب رضوان یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔

اس کے بعد دُنیا کی حقیقت کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰ یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عاقل و بصیر انسان کے لئے اس کے سوا کوئی نتیجہ دُنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک دھوکے کا سرمایہ ہے، اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آسکے، پھر آخرت کے عذاب و ثواب اور دُنیا کی بے ثباتی بیان فرمانے کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ انسان دُنیا کی لذتوں میں منہمک نہ ہو، آخرت کی نعمتوں کی فکر زیادہ کرے، اس کا بیان اگلی آیات میں اس طرح آیا:-

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ یعنی مسابقت کرو اپنے رَبّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے برابر ہے۔

مسابقت کرنے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ عمر اور صحت و قدرت کا کچھ بھروسہ نہیں، نیک اعمال میں سستی اور ٹال مٹول نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی بیماری یا عذر آکر تمہیں اس کام کے قابل نہ چھوڑے یا موت ہی آجائے، تو حاصل مسابقت کا یہ ہے کہ عجز و ضعف اور موت سے مسابقت کرو کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے ایسے اعمال کا ذخیرہ کرلو جو جنت تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں۔

اور مسابقت کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ نیک اعمال میں دُوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی نصائح میں فرمایا کہ: ’’تم مسجد میں سب سے پہلے جانے والے اور سب سے آخر میں نکلنے والے بنو!‘‘ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ’’جہاد کی صفوف میں سے پہلی صف میں رہنے کے لئے بڑھو!‘‘

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: "جماعت نماز میں پہلی تکبیر میں حاضر رہنے کی کوشش کرو۔" (رُوح) [1]

جنت کی تعریف میں فرمایا کہ اس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہوگا۔ سورۂ آلِ عمران میں بھی اسی مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے، اس میں لفظ سَمٰوٰت جمع کے ساتھ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آسمان سے مراد ساتوں آسمان ہیں، اور معنی یہ ہیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت کو ایک جگہ جمع کرلو تو وہ جنت کا عرض ہو، یعنی چوڑائی، اور یہ ظاہر ہے کہ طول ہر چیز کا اس کے عرض سے زائد ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جنت کی وسعت ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور لفظ عرض کبھی مطلق وسعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس میں طول کا مقابلہ مقصود نہیں ہوتا، دونوں صورتوں میں جنت کی عظیم الشان وسعت کا بیان ہوگیا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱ اس سے پہلی آیت میں جنت اور اس کی نعمتوں کے لئے مسابقت اور کوشش کا حکم تھا، اس سے کسی کو یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ جنت اور اس کی لازوال نعمتیں ہمارے عمل کا ثمرہ اور ہمارا عمل اس کے لئے کافی ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے اعمال حصولِ جنت کے لئے علتِ کافیہ نہیں ہیں، جن پر عطائے جنت کا مرتب ہونا لازمی ہی ہو، انسان کے عمر بھر کے اعمال تو ان نعمتوں کا بدلہ بھی نہیں ہوسکتے جو دُنیا میں اس کو مل چکی ہیں، ہمارے یہ اعمال جنت کی لازوال نعمتوں کی قیمت نہیں بن سکتے، جنت میں جو بھی داخل ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان ہی سے داخل ہوگا، جیسے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کسی کو صرف اس کا عمل نجات نہیں دلاسکتا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت حاصل نہیں کرسکتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت ہوجائے۔ (مظہری) [2]

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں

[1] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۳۶

[2] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۰۰ و ۲۰۱، وصحیح مسلم، کتاب صفة المنافقین ...إلخ، باب صفة القیامة، باب لن یدخل احد الجنة ...إلخ، ج:۲ ص:۳۷۶

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۚ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى

پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو دُنیا میں، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے، تاکہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر

مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۙ ﴿۲۳﴾

جو ہاتھ نہ آیا اور نہ شیخی کیا کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا، اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اِترانے والا بڑائی مارنے والا۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ

وہ جو کہ آپ نہ دیں اور سکھلائیں لوگوں کو بھی نہ دینا، اور جو کوئی منہ موڑے تو اللہ آپ ہے

هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

بے پرواسب خوبیوں کے ساتھ موصوف۔

آسان ترجمۂ قرآن

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں نازل ہوتی یا تمہاری جانوں کو لاحق ہوتی ہو، مگر وہ ایک کتاب میں اُس وقت سے درج ہے جب ہم نے ان جانوں کو پیدا بھی نہیں کیا تھا۔ یقین جانو یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔ ﴿۲۲﴾ یہ اس لئے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے، اُس پر تم غم میں نہ پڑو، اور جو چیز اللہ تمہیں عطا فرمادے، اُس پر تم اِتراؤ نہیں، اور اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اِتراہٹ میں مبتلا ہو، شیخی بگھارنے والا ہو، ﴿۲۳﴾ وہ ایسے لوگ ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں، اور دُوسرے لوگوں کو بھی کنجوسی کی تلقین کرتے ہیں۔ اور جو شخص منہ موڑلے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جو سب سے بے نیاز ہے، بذاتِ خود قابلِ تعریف! ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

کوئی مصیبت نہ دُنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ (سب) ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ

میں) لکھی ہیں قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں (یعنی تمام مصیبتیں خارجی ہوں یا داخلی، وہ سب مقدّر ہیں اور) یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (کہ واقع ہونے سے پہلے لکھ دیا، کیونکہ اس کو علمِ غیب حاصل ہے، اور ہم نے یہ بات اس واسطے بتلادی ہے) تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (تندرستی، یا اولاد، یا مال) تم اس پر (اتنا) رنج نہ کرو (جو حق تعالیٰ کی مرضی کے طلب کرنے اور آخرت کے اُمور میں مشغول ہونے میں رُکاوٹ ہوجائے، اور طبعی تکلیف کا مضائقہ نہیں) اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے (اس کی نسبت بھی یہی سمجھ کر کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت وفضل سے عطا فرمانا تجویز کردیا تھا اور اسی نے ہم کو دی ہے) اس پر اتراؤ نہیں (کیونکہ اترائے تو وہ جس کا اِستحقاق ذاتی ہو، اور جب دُوسرے کی مشیت وحکم سے ایک چیز ملی ہے، اس پر اترانے کا کیا حق ہے) اور (آگے اس اِترانے پر وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا (''اختیال'' کا لفظ اکثر اندرونی فضائل پر اِترانے کے لئے، اور ''فخر'' اکثر خارجی اشیاء مال ومرتبے وغیرہ پر اِترانے کے لئے مستعمل ہوتا ہے، آگے بخل کی مذمت ہے کہ) جو ایسے ہیں کہ (دُنیا کی محبت کی وجہ سے) خود بھی (خدا کے نزدیک پسندیدہ حقوق میں صَرف کرنے سے) بخل کرتے ہیں (گو اپنی خواہشات وگناہوں میں کتنا ہی اِسراف کریں) اور (اس گناہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں کہ) دُوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہیں (الَّذِيْنَ ...اِلـخ سے جو ترکیب میں بدل ہے یہ مقصود نہیں کہ وعید ان افعال کے مجموعے کے ساتھ متعلق ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر بُری خصلت پر وعید ہے، بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ دُنیا کی محبت ایسی ہے جس سے اکثر بُری صفات جمع ہوہی جاتی ہیں، اِختیال اور افتخار بھی اور بخل بھی وغیر ذالک) اور (یہی دُنیا کی محبت کبھی حق سے رُوگردانی کرنے تک پہنچادیتی ہے، جس کے حق میں یہ وعید ہے کہ) جو شخص (دِینِ حق سے جس کی ایک فرع اِنفاق فی سبیل اللہ بھی ہے) اِعراض کرے گا تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ سب کی عبادت اور اموال سے) بے نیاز ہیں (اور اپنی ذات وصفات میں کامل اور) سزاوارِ حمد ہیں۔

معارف ومسائل

دُنیا کی دو چیزیں انسان کو اللہ کی یاد اور آخرت کی فکر سے غافل کرنے والی ہیں، ایک راحت وعیش، جس میں مبتلا ہوکر انسان اللہ کو بُھلا بیٹھتا ہے، اس سے بچنے کی ہدایت سابقہ آیات میں آچکی ہے، دُوسری چیز مصیبت وغم ہے، اس میں مبتلا ہوکر بھی بعض اوقات انسان مایوس اور خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، آیاتِ مذکورہ میں اس کا بیان ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۔ یعنی جو کوئی مصیبت تم کو زمین میں یا اپنی جانوں میں پہنچتی ہے، وہ سب ہم نے کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں مخلوقات کو پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھ دیا تھا،

زمین کی مصیبت سے مراد قحط، زلزلہ، کھیت اور باغ میں نقصان، تجارت میں گھاٹا، مال و دولت کا ضائع ہو جانا، دوست احباب کی موت سب داخل ہیں، اور اپنی جانوں کی مصیبت میں ہر طرح کے امراض اور زخم اور چوٹ وغیرہ شامل ہیں۔

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ دُنیا میں جو کچھ مصیبت یا راحت، خوشی یا غم انسان کو پیش آتا ہے، وہ سب حق تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ رکھا ہے، اس کی اطلاع تمہیں اس لئے دی گئی تاکہ تم دُنیا کے اچھے بُرے حالات پر زیادہ دھیان نہ دو، نہ یہاں کی تکلیف و مصیبت یا نقصان وفقدان کچھ زیادہ حسرت وافسوس کرنے کی چیز ہے اور نہ یہاں کی راحت وعیش یا مال ومتاع اتنا زیادہ خوش اور مست ہونے کی چیز ہے جس میں مشغول ہو کر اللہ کی یاد اور آخرت سے غافل ہو جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہر انسان طبعی طور پر بعض چیزوں سے خوش ہوتا ہے، بعض سے غمگین، لیکن ہونا یہ چاہئے کہ جس کو کوئی مصیبت پیش آئے وہ اس پر صبر کر کے آخرت کا اجر وثواب کمائے، اور جو کوئی راحت وخوشی پیش آئے وہ اس پر شکر گزار ہو کر اجر وثواب حاصل کرے۔ (رواہ الحاکم وصححہ، از رُوح) [1]

اگلی آیت میں راحت وآرام یا مال ودولت پر اترانے والے اور فخر کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿٢٣﴾ یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اترانے والے، فخر کرنے والے کو۔ اور یہ ظاہر ہے جس کو پسند نہیں کرتا اس سے بغض ونفرت رکھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی نعمتوں پر اترانے اور فخر کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں، مگر عنوانِ تعبیر میں پسند نہ کرنا ذِکر کرکے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ عقل مند، عاقبت اندیش انسان کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے ہر کام میں اس کی فکر کرے کہ وہ اللہ کے نزدیک پسند ہے یا نہیں، اس لئے یہاں ناپسند ہونے کا ذِکر فرمایا گیا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو

لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ

تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر، اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے

[1] روح المعانی ج:۲۰ ص:۲۳۹، والمستدرک للحاکمؒ، رقم الحدیث: ۳۷۸۹، وشعب الإیمان للبیهقی، رقم الحدیث: ۲۳۴

وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ

اور لوگوں کے کام چلتے ہیں اور تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے،

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ ع

بے شک اللہ زور آور ہے زبردست۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب بھی اُتاری، اور ترازو بھی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اُتارا جس میں جنگی طاقت بھی ہے، اور لوگوں کے لئے دوسرے فائدے بھی، اور یہ اس لئے تاکہ اللہ جان لے کہ کون ہے جو اُس کو دیکھے بغیر اُس (کے دین) کی اور اُس کے پیغمبروں کی مدد کرتا ہے۔ یقین رکھو کہ اللہ بڑی قوت کا، بڑے اِقتدار کا مالک ہے۔ ﴿۲۵﴾

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (اسی اِصلاحِ آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے اَحکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور (اس کتاب میں بالخصوص) انصاف کرنے (کے حکم) کو (جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے) نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ اور حقوق العباد میں) اِعتدال پر قائم رہیں (اس میں ساری شریعت آگئی جو معتدل یعنی بین الافراط والتفریط ہے) اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے، (تاکہ اس کے ذریعے سے عالم کا اِنتظام رہے کہ ڈر سے بہت سی بے انتظامیاں بند ہوجاتی ہیں) اور (اس کے علاوہ) لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں (چنانچہ اکثر آلات لوہے سے بنتے ہیں) اور (اس لئے لوہا پیدا کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہری طور پر) جان لے کہ بے (اس کے کہ خدا کو) دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی دِین کی) کون مدد کرتا ہے (کیونکہ لوہا جہاد میں بھی کام آتا ہے، تو یہ بھی اُخروی نفع ہوا اور جہاد کا حکم اس لئے نہیں کہ اللہ اس کا محتاج ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (خود) قوی زبردست ہے (بلکہ تمہارے ثواب کے لئے ہے)۔

معارف ومسائل

آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا اصل مقصد لوگوں کو عدل وانصاف پر قائم کرنا ہے

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ الآیۃ، لفظ بَيِّنٰت کے لغوی معنی واضح اور کھلی ہوئی چیزوں کے ہیں، اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واضح احکام ہوں، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں یہی ترجمہ لیا گیا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے معجزات اور نبوّت ورسالت پر واضح دلائل مراد ہوں، (کمافسرہ بہ ابن کثیر وابن حیان)۔ [1] اور بَيِّنٰت کے بعد وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب نازل کرنے کا علیحدہ ذکر بظاہر اسی تفسیر کا مؤید ہے کہ بَيِّنٰت سے مراد معجزات ودلائل ہوں اور احکام کی تفصیل کے لئے کتاب نازل کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

کتاب کے ساتھ ایک دوسری چیز مِیْزَان نازل کرنے کا بھی ذکر ہے، مِیْزَان اصل میں اس آلے کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، جس کی عام صورت ترازو ہے، اور مروّجہ ترازو کے علاوہ مختلف چیزوں کے وزن تولنے کے لئے جو دوسرے مختلف قسم کے آلات ایجاد ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی مِیْزَان کے مفہوم میں داخل ہیں، جیسے آج کل روشنی، ہوا وغیرہ کے ناپنے والے آلات ہیں۔

اس آیت میں کتاب کی طرح میزان کے لئے بھی نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے، کتاب کا آسمان سے نازل ہونا اور فرشتوں کے ذریعے پیغمبر تک پہنچنا تو معلوم ومعروف ہے، میزان کے نازل کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے متعلق تفسیر رُوح المعانی، مظہری وغیرہ میں ہے کہ اِنزالِ میزان سے مراد اُن اَحکام کا نزول ہے جو ترازو استعمال کرنے اور اِنصاف کرنے کے متعلق نازل ہوئے۔ اور قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دراصل اِنزال تو کتاب ہی کا ہوا ہے، ترازو کے وضع کرنے اور ایجاد کرنے کو اس کے ساتھ لگا دیا گیا ہے، جیسا کہ عرب کے کلام میں اس کی نظائر موجود ہیں، تو گویا مفہوم کلام کا یہ ہے کہ "اَنْزَلْنَا الْكِتَابَ وَوَضَعْنَا الْمِيْزَانَ" یعنی ہم نے اُتاری کتاب اور ایجاد کی ترازو۔ اس کی تائید سورۂ رحمٰن کی آیت وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں میزان کے ساتھ لفظ "وَضَعَ" استعمال فرمایا ہے۔ [2]

اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پر حقیقی معنی میں آسمان سے ترازو نازل کی گئی تھی اور حکم دیا گیا

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة، ج:۸ ص:۲۷، وتفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة، ج:۱۰ ص:۲۳۰

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۶۰ و ۲۶۱

تھا کہ اس سے وزن کر کے حقوق پورے کرنا چاہئیں۔ واللہ اعلم۔

کتاب اور میزان کے بعد ایک تیسری چیز کے نازل کرنے کا ذِکر ہے، یعنی حدید (لوہا) اس کے نازل کرنے کا مطلب بھی اس کو پیدا کرنا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت میں چوپایہ جانوروں کے متعلق بھی لفظ ''اِنْزَال'' استعمال فرمایا ہے، حالانکہ وہ کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے، زمین پر پیدا ہوتے ہیں، آیت یہ ہے: وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ [۱] (الزمر:۶) یہاں باتفاق ''اَنْزَلْنَا'' سے مراد ''خَلَقْنَا'' ہے، یعنی تخلیق کو اِنزال کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے، جس میں اشارہ اس طرف پایا جاتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اس اعتبار سے منزّل من السماء ہے کہ اس کے پیدا ہونے سے بھی بہت پہلے وہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا۔ (رُوح) [۲]

حَدِيْدٌ یعنی لوہے کو نازل کرنے کی دو حکمتیں آیت میں بیان فرمائی ہیں، اوّل یہ کہ مخالفین پر اس کا رُعب پڑتا ہے، اور سرکشوں کو اس کے ذریعے اَحکامِ الٰہیہ اور عدل و انصاف کے اَحکام کا پابند بنایا جاسکتا ہے، دُوسرے یہ کہ اس میں لوگوں کے لئے بہت منافع حق تعالیٰ نے رکھے ہیں، کہ جس قدر صنعتیں اور اِیجادات و مصنوعات دُنیا میں ہوئیں یا آئندہ ہو رہی ہیں اُن سب میں لوہے کی ضرورت ہے، لوہے کے بغیر کوئی صنعت نہیں چل سکتی۔

فائدہ:- یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس آیت میں اصل مقصد پیغمبروں اور کتابوں کے بھیجنے اور میزانِ عدل ایجاد کرنے اور اس کے استعمال کرنے کا یہ بیان کیا ہے کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ یعنی لوگ انصاف پر قائم ہوجائیں، اس کے بعد ایک تیسری چیز یعنی لوہے کے نازل کرنے یعنی ایجاد کرنے کا بھی ذِکر فرمایا گیا ہے، یہ بھی درحقیقت اُسی عدل و انصاف کی تکمیل کے لئے ہے جو پیغمبر اور کتاب کے نازل کرنے سے مقصود ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں عدل و انصاف قائم کرنے کے واضح دلائل دیتے ہیں، اور نہ کرنے کی صورت میں عذابِ آخرت سے ڈراتے ہیں، میزان ان حدود کو بتلاتی ہے جن سے انصاف کیا جاتا ہے، مگر سرکش معاند جو نہ کسی دلیل سے مانتا ہے، نہ ترازو کی تقسیم کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے، اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ دُنیا میں عدل و انصاف قائم نہ ہونے دے گا، اس کو پابند کرنا لوہے اور تلوار کا کام ہے، جو حکومت و سیاست کرنے والے آخر میں بدرجۂ مجبوری استعمال کرتے ہیں۔

فائدۂ ثانیہ:- یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآنِ کریم نے دُنیا میں عدل و انصاف کرنے کے لئے دو چیزوں کو تو اصل قرار دیا، ایک کتاب، دُوسرے میزان، کتاب سے حقوق کی ادائیگی اور اس میں کمی بیشی کی ممانعت کے

[۱] ترجمہ: اور تمہارے لئے آٹھ نر و مادہ چارپایوں کے پیدا کئے۔

[۲] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۴۱

اَحکام معلوم ہوتے ہیں، اور میزان سے وہ حصے متعین ہوتے ہیں جو دُوسروں کے حقوق ہیں، ان ہی دونوں چیزوں کے نازل کرنے کا مقصد لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ قرار دِیا ہے، حدید کا ذِکر اس کے بعد آخر میں فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ اِقامتِ عدل وانصاف کے لئے لوہے کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہے، وہ اصل ذریعہ اِقامتِ عدل وانصاف کا نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ خلقِ خدا کی اصل اصلاح اور ان کا عدل وانصاف پر قائم کرنا درحقیقت ذہنوں کی تربیت اور تعلیم سے ہوتا ہے، حکومت کا زور زبردستی دراصل اس کام کے لئے نہیں، بلکہ راستے سے رُکاوٹ دُور کرنے کے لئے بدرجۂ مجبوری ہے، اصل چیز ذہنوں کی تربیت اور تعلیم وتلقین ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ یہاں وَلِيَعْلَمَ حرفِ عطف کے ساتھ آیا ہے، رُوح المعانی[1] میں ہے کہ یہ عطف ایک محذوف جملے پر ہے، یعنی لِيَنْتَفِعَهُمْ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم نے لوہا اس لئے پیدا کیا کہ مخالفوں پر اس کا رُعب پڑے، اور اس لئے کہ لوگ اس سے صنعت وحرفت میں فائدہ اُٹھائیں اور اس لئے کہ قانونی اور ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ یہ جان لیں کہ کون لوگ لوہے کے آلاتِ حرب کے ذریعے اللہ اور اس کے رسولوں کے مددگار بنتے ہیں، اور دِین کے لئے جہاد کرتے ہیں، قانونی اور ظاہری طور پر اس لئے کہا گیا کہ ذاتی طور پر تو حق تعالیٰ کو سب کچھ پہلے ہی سے معلوم ہے، مگر اِنسان جب عمل کر لیتا ہے تو وہ نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، قانونی ظہور اس کا اسی سے ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اور اِبراہیم کو اور ٹھہرادی دونوں کی اولاد میں پیغمبری

وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ

اور کتاب، پھر کوئی ان میں راہ پر ہے اور بہت ان میں نافرمان ہیں، پھر

قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۵

پیچھے بھیجے اُن کے قدموں پر اپنے رسول اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو اور اس کو ہم نے دِی اِنجیل

[1] روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۴۱

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ

اور رکھ دی اس کے ساتھ چلنے والوں کے دل میں نرمی اور مہربانی، اور ایک ترک کرنا دُنیا کا

ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا

جو انہوں نے نئی بات نکالی تھی، ہم نے نہیں لکھا تھا یہ اُن پر، مگر کیا چاہنے کو اللہ کی رضامندی، پھر نہ نباہا اس کو

حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ

جیسا چاہئے تھا نباہنا، پھر دِیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان دار تھے اُن کا بدلہ، اور بہت اُن میں

فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ

نافرمان ہیں۔ اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر،

يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ

دے گا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے اور رکھ دے گا تم میں روشنی جس کو لئے پھرو

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ

اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان، تاکہ نہ جانیں کتاب والے

اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ

کہ پا نہیں سکتے کوئی چیز اللہ کے فضل میں سے اور یہ کہ بزرگی اللہ کے ہاتھ ہے دیتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع ۲۰

جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو ہدایت پر آ گئے، اور ان میں سے بہت سے لوگ نافرمان رہے۔ (۲۶) پھر ہم نے اُن کے پیچھے اُنہی کے نقشِ قدم پر اپنے اور پیغمبر بھیجے، اور اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا، اور اُنہیں انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اُن کی پیروی کی، اُن کے دِلوں میں ہم نے شفقت اور رحم دِلی پیدا کر دی۔ اور جہاں تک رَہبانیت کا تعلق ہے، وہ انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی، ہم نے اُس کو ان کے ذمے واجب نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی، پھر اُس کی ویسی رعایت نہ کر سکے جیسے اُس کا حق تھا۔ غرض اُن میں سے جو ایمان لائے تھے، اُن کو ہم نے اُن کا اَجر دیا، اور ان میں سے بہت لوگ نافرمان ہی رہے۔ (۲۷) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اُس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ، تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے، اور تمہارے لئے وہ نور پیدا کرے جس کے ذریعے تم چل سکو، اور تمہاری بخشش فرمادے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے، (۲۸) تاکہ اہلِ کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر اُنہیں کوئی اختیار نہیں ہے، اور یہ کہ فضل تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے، اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ (۲۹)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (مخلوق کی اسی اصلاحِ آخرت کے لئے) نوح (علیہ السلام) اور ابراہیم (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی (یعنی اُن کی اولاد میں بھی بعض پیغمبر اور ان میں سے بعض صاحبِ کتاب بنائے) سو (جن جن لوگوں کے پاس یہ پیغمبر آئے) اُن لوگوں میں بعض تو ہدایت یافتہ ہوئے اور بہت سے ان میں نافرمان تھے (اور یہ مذکور پیغمبر تو صاحبِ شریعتِ مستقلّہ تھے، ان میں بعض صاحبِ کتاب بھی تھے، جیسے موسیٰ علیہ السلام، جو حضرت نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام دونوں کی اولاد میں تھے، اور بعض اگرچہ صاحبِ کتاب نہیں تھے، جیسے ہود اور صالح علیہما السلام کہ ان کا صاحبِ کتاب ہونا منقول نہیں، مگر شریعت ان کی مستقل تھی، بہرحال بہت سے نبی تو صاحبِ شریعتِ مستقلّہ بھیجے) پھر اُن کے بعد اور رسولوں کو (جو کہ صاحبِ شریعتِ مستقلّہ نہ تھے) یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے (جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بعد توراۃ کے اَحکام کی تعمیل کرانے کے لئے بہت سے پیغمبر آئے) اور ان کے بعد (پھر ایک صاحبِ شریعتِ مستقلّہ کو یعنی) عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل دی اور (ان کی اُمت میں دو قسم کے لوگ ہوئے،

ایک ان کا اِتباع کرنے والے، یعنی اُن پر ایمان لانے والے، اور دُوسرے اِنکار کرنے والے) اور جن لوگوں نے ان کا اِتباع کیا تھا (یعنی قسمِ اوّل) ہم نے ان کے دِلوں میں شفقت اور ترحم (ایک دُوسرے کے ساتھ جو کہ اَخلاقِ حمیدہ میں سے ہے) پیدا کردیا (كَقَوْلِهٖ تَعَالٰى فِي الصَّحَابَةِ: رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [۱] (الفتح:۲۹)، اور شاید بوجہ اس کے کہ ان کی شریعت میں جہاد نہ تھا، اس کے مقابل کی صفت: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ [۲] (الفتح:۲۹) ذِکر نہیں فرمائی، غرض غالب اُن پر شفقت و رحمت تھی) اور (ہماری طرف سے تو ان لوگوں کو صرف اَحکام میں اِتباع کرنے کا حکم ہوا تھا، لیکن ان متبعین میں بعض وہ ہوئے کہ) انہوں نے رَہبانیت کو خود اِیجاد کرلیا (رَہبانیت کا حاصل نکاح اور جائز لذتوں اور اِختلاط کا چھوڑنا ہے، اور اس کے ایجاد کا سبب یہ ہوا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب لوگوں نے اَحکامِ الٰہیہ کو چھوڑنا شروع کیا تو بعض اہلِ حق بھی تھے جو اِظہارِ حق کرتے رہتے تھے، یہ بات خواہشِ نفسانی والوں کو مشکل معلوم ہوئی اور انہوں نے اپنے بادشاہوں سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ ہمارے ہم مشرب بن کر رہیں، جب اُن کو مجبور کیا گیا تو انہوں نے درخواست کی کہ ہم کو اِجازت دی جائے کہ ہم ان لوگوں سے کوئی تعلق و غرض نہ رکھیں اور آزادانہ زندگی بسر کریں، خواہ گوشے میں بیٹھ کر یا سفر و سیاحت میں عمر گزار کر۔ چنانچہ اسی پر وہ چھوڑ دیئے گئے (كذا في الدر المنثور) [۳] اس مقام پر یہی ذکر ہے کہ انہوں نے رَہبانیت کو ایجاد کرلیا) ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے (اپنے دِین کو محفوظ رکھنے کے لئے) اس کو اِختیار کرلیا تھا سو (پھر اُن راہبوں میں زیادہ وہ ہوئے کہ) انہوں نے اس (رَہبانیت) کی پوری رعایت نہ کی (یعنی جس غرض سے اس کو اِختیار کیا تھا اور وہ غرض اللہ کی رضا جوئی تھی، اس کا اِہتمام نہیں کیا، یعنی اصل اَحکام کی بجا آوری نہ کی، گو صورۃً رہبان اور اَحکام کی بجا آوری کا اظہار کرتے رہے، اس طرح رہبانوں میں دو قسم کے لوگ ہوگئے، اَحکام کی رعایت کرنے والے، اور رعایت نہ کرنے والے، اور ان میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے اُن کے حق میں رعایتِ اَحکام کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، اس لئے عہدِ مبارک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں اَحکام کی رعایت و اِہتمام کرنے والے وہ لوگ ہوئے جو آپ پر ایمان لائے، اور جنہوں نے آپ پر ایمان سے گریز کیا وہ اَحکام کی رعایت نہ کرنے والوں میں شامل ہوئے) سو ان میں سے جو (حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا اجر (وعدہ کیا ہوا) دِیا (مگر ایسے کم تھے) اور زیادہ اُن میں نافرمان ہیں (کہ آپ پر ایمان نہیں لائے اور چونکہ اکثریت نافرمانوں کی تھی اس لئے سب ہی کی طرف رعایت نہ کرنا منسوب کردیا گیا کہ فَمَا رَعَوْهَا

---

[۱] ترجمہ: آپس میں مہربان ہیں۔

[۲] ترجمہ: وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں۔

[۳] تفسیر الدر المنثور ج:۹ ص:۴۲۴، تحت هٰذه الآية۔

فرمایا، معلوم ہوا کہ یہ نفی رعایت اکثر کے اعتبار سے ہے، اور قلیل جو ایمان لائے تھے ان کا بیان آخر آیت میں فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ میں بیان فرمایا۔

یہاں تک عیسائیوں میں سے ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں کی دو قسموں کا ذکر تھا، آگے ایمان والوں کا حکم ہے کہ) اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان رکھنے والو! تم اللہ سے ڈرو اور (اس ڈر کے مقتضا پر عمل کرو، یعنی) اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے چلتے پھرتے ہوگے (یعنی ایسا ایمان دے گا جو ہر وقت ساتھی رہے گا، یہاں سے پل صراط تک) اور تم کو بخش دے گا (کیونکہ اسلام سے زمانۂ کفر کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں) اور اللہ غفور رحیم ہے (اور یہ دولتیں تم کو اس لئے عنایت کرے گا) تاکہ (جس وقت ان عطایا کا ظہور ہو، یعنی قیامت کے روز، اس وقت) اہل کتاب کو (یعنی جو ایمان نہیں لائے ان کو) یہ بات معلوم ہوجائے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل کے کسی جزو پر بھی (بغیر ایمان لائے) دسترس نہیں اور یہ (بھی معلوم ہوجائے) کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے دے دے (چنانچہ اس کی مشیت اس کے فضل کے ساتھ مسلمانوں سے متعلق ہوئی تو انہی کو عنایت فرمادیا) اور اللہ بڑے فضل والا ہے (مطلب یہ کہ ان کا غرور اور زعم ٹوٹ جائے کہ وہ حالتِ موجودہ میں بھی اپنے کو فضل کا مورد اور مغفرت کا محل سمجھتے ہیں)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں اس عالم کی ہدایت اور اس میں قسط یعنی عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کرنے کا عمومی ذکر تھا، مذکور الصدر آیات میں ان میں سے خاص خاص انبیاء ورسل کا ذکر ہے، پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا کہ وہ آدم ثانی ہیں، اور بعد طوفانِ نوح کے دُنیا میں باقی رہنے والی سب مخلوق ان کی نسل سے ہے، دُوسرے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو ابوالانبیاء اور قدوۃ الخلائق ہیں، اُن دونوں کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان فرمادیا کہ آئندہ جتنے انبیاء اور آسمانی کتابیں دُنیا میں آئیں گی وہ سب انہی دونوں کی ذُرّیت میں ہوں گی، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی وہ شاخ اس فضیلت کے لئے مخصوص کردی گئی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعد میں جتنے انبیاء مبعوث ہوئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔

ان کے خصوصی ذکر کے بعد پورے سلسلۂ انبیاء کو ایک مختصر جملے میں بیان فرمایا: ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا آخر

میں خصوصیت کے ساتھ آخر انبیائے بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر کے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کا ذکر فرمایا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے اُن کے حوارِیین کی خاص صفت یہ بتلائی گئی: وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً یعنی جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا انجیل کا اِتباع کیا، ہم نے اُن کے دِلوں میں رأفت اور رحمت پیدا کر دی۔ یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دُوسرے پر مہربان و رحیم ہیں، یا پوری خلقِ خدا کے ساتھ ان کو شفقت و رحمت کا تعلق ہے، رأفت و رحمت کے دونوں لفظ ایک دُوسرے کے ہم معنی اور مرادف سمجھے جاتے ہیں، یہاں مقابلے کی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا کہ رأفت شدّتِ رحمت کو کہا جاتا ہے، گویا عام رحمت سے اس میں زیادہ مبالغہ ہے، اور بعض نے فرمایا کہ کسی شخص پر رحمت و شفقت کے دو تقاضے عادۃً ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ اگر کسی تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہے تو اس کی تکلیف کو دُور کر دیا جائے، اس کو رأفت کہا جاتا ہے، دُوسرے یہ کہ اس کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ دے دی جائے، یہ رحمت ہے، غرض رأفت کا تعلق دفعِ مضرّت کے ساتھ ہے، اور رحمت کا جلبِ منفعت کے ساتھ، اور چونکہ دفعِ مضرّت ہر اعتبار سے مقدم سمجھی جاتی ہے، اس لئے عموماً جب یہ دونوں لفظ یک جا بولے جاتے ہیں تو رأفت کو رحمت پر مقدم بولا جاتا ہے۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب جن کو ''حوارِیین'' کہا جاتا ہے، اُن کی خصوصی صفت رأفت و رحمت بیان فرمائی گئی ہے، جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کی چند صفات سورۂ فتح میں بیان فرمائی ہیں، جن میں ایک صفت: ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' بھی ہے، مگر وہاں اس صفت سے پہلے صحابۂ کرام کی خاص صفت: ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' بھی بیان فرمائی ہے، وجہ فرق کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں کفار سے جہاد و قتال کے اَحکام نہ تھے، اس لئے کفار کے مقابلے میں شدّت ظاہر کرنے کا وہاں کوئی محل نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

رہبانیت کا مفہوم اور ضروری تشریح

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا، رہبانیت، رَہبان کی طرف منسوب ہے، راہب اور رہبان کے معنی ہیں ڈرنے والا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل میں فسق فجور عام ہو گیا، خصوصاً ملوک اور رُؤسا نے اَحکامِ انجیل سے کھلی بغاوت شروع کر دی، ان میں جو کچھ علماء و صلحاء تھے انہوں نے اس بدعملی سے روکا تو ان کو قتل کر دیا گیا، جو کچھ بچ رہے انہوں نے دیکھا کہ اب منع کرنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، اگر ہم ان لوگوں میں مل جل کر رہے تو ہمارا دِین بھی برباد ہوگا، اس لئے ان لوگوں نے اپنے اُوپر یہ بات لازم کر لی کہ اب دُنیا کی سب جائز لذتیں اور آرام بھی چھوڑ دیں، نکاح نہ کریں، کھانے پینے کے سامان جمع کرنے کی فکر نہ کریں، رہنے سہنے کے لئے مکان اور گھر کا اہتمام نہ کریں، لوگوں سے دُور کسی

جنگل پہاڑ میں بسر کریں، یا پھر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی سیاحت میں گزار دیں، تاکہ دین کے احکام پر آزادی سے پورا پورا عمل کر سکیں، ان کا یہ عمل چونکہ خدا کے خوف سے تھا، اس لئے ایسے لوگوں کو راہب یا رہبان کہا جانے لگا، ان کی طرف نسبت کر کے ان کے طریقے کو رہبانیت سے تعبیر کرنے لگے۔

ان کا یہ طریقہ چونکہ حالات سے مجبور ہو کر اپنے دین کی حفاظت کے لئے تھا، اس لئے اصالۃً کوئی مذموم چیز نہ تھی، البتہ ایک چیز کو اللہ کے لئے اپنے اُوپر لازم کر لینے کے بعد اس میں کوتاہی اور خلاف ورزی بڑا گناہ ہے، جیسے نذر اور منّت کا حکم ہے، کہ وہ اصل سے تو کسی پر لازم و واجب نہیں ہوتی، خود کوئی شخص اپنے اُوپر کسی چیز کو نذر کر کے حرام یا واجب کر لیتا ہے، تو پھر شرعاً اس کی پابندی واجب اور خلاف ورزی گناہ ہو جاتی ہے، مگر ان میں سے بعض لوگوں نے رہبانیت کا نام رکھ کر دُنیا طلبی اور عیش و عشرت کا ذریعہ بنالیا، کیونکہ عام آدمی ایسے لوگوں کے معتقد ہوئے، تحفے تحائف اور نذرانے آنے لگے، لوگوں کا ان کی طرف رُجوع ہوا تو فواحش کی نوبت آنے لگی۔

قرآنِ کریم نے آیتِ مذکورہ میں ان کی اسی بات پر نکیر فرمائی، کہ خود ہی تو اپنے اُوپر ترکِ لذّات کو لازم کیا تھا، جو من جانب اللہ اُن پر لازم نہ کیا گیا تھا، اور جب لازم کر لیا تو پھر اس کی پابندی ان کو کرنا چاہئے تھی، لیکن اس کی خلاف ورزی کی۔

ان لوگوں کا یہ طریقہ اصل سے مذموم نہ تھا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر شاہد ہے کہ ابنِ کثیرؒ نے بروایت ابنِ ابی حاتم و ابنِ جریر ایک طویل حدیث نقل کی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، جن میں سے صرف تین فرقوں کو عذاب سے نجات ملی، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ظالم و جابر بادشاہوں اور دولت و قوّت والے فاسق و فاجر لوگوں کو ان کے فسق و فجور سے روکا، اُن کے مقابلے میں حق کا کلمہ بلند کیا، اور دینِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعوت دی، اُن میں سے پہلے فرقے نے قوّت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر ان کے مقابلے میں مغلوب ہو کر قتل کر دیئے گئے، تو پھر ان کی جگہ ایک دُوسری جماعت کھڑی ہوئی، جن کو مقابلے کی اتنی بھی قوت و طاقت نہیں تھی، مگر کلمۂ حق پہنچانے کے لئے اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر ان کو حق کی طرف بلایا، ان سب کو بھی قتل کر دیا گیا، بعض کو آروں سے چیرا گیا، بعض کو زندہ آگ میں جلایا گیا، مگر انہوں نے اللہ کی رضا کے لئے ان سب مصائب پر صبر کیا، یہ بھی نجات پاگئے، پھر ایک تیسری جماعت ان کی جگہ کھڑی ہوئی، جن میں نہ مقابلے کی قوت تھی نہ اُن کے ساتھ رہ کر خود اپنے دین پر عمل کرنے کی صورت بنتی تھی، اس لئے ان لوگوں نے جنگلوں اور پہاڑوں کا

راستہ لیا، اور راہب بن گئے، یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے اصل رَہبانیت اختیار کرنے والے جنہوں نے رَہبانیت کے لوازم کی رعایت کی اور مصائب پر صبر کیا وہ بھی نجات یافتہ لوگوں میں سے ہیں۔

آیتِ مذکورہ کی اس تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کی رَہبانیت اِبتداءً اِختیار کرنے والوں نے اِختیار کی تھی وہ اپنی ذات سے مذموم اور بُری چیز نہ تھی، البتہ وہ کوئی حکم شرعی بھی نہیں تھا، ان لوگوں نے اپنی مرضی وخوشی سے اس کو اپنے اُوپر لازم کرلیا تھا، بُرائی اور مذمت کا پہلو یہاں سے شروع ہوا کہ اس اِلتزام کے بعد بعض لوگوں نے اس کو نبھایا نہیں، اور چونکہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی زیادہ ہوگئی تھی، اس لئے ''لِلْاَكْثَرِ حُكْمُ الْكُلِّ ''یعنی اکثریت کے عمل کو کل کی طرف منسوب کردینا عرفِ عام ہے، اس قاعدے کے موافق قرآن نے عام بنی اسرائیل کی طرف یہ منسوب کیا کہ انہوں نے جس رَہبانیت کو اپنے اُوپر لازم کرلیا تھا اس کو نبھایا نہیں، اور اس کی شرائط کی رعایت نہیں کی، اسی کو فرمایا: فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رَہبانیت کے متعلق جو قرآن نے فرمایا: ''اِبْتَدَعُوْهَا ''یعنی اس کو انہوں نے ایجاد کرلیا، اس میں لفظ اِبتداع جو بدعت سے مشتق ہے، وہ اس جگہ اپنے لغوی معنی یعنی اِختراع و اِیجاد کے لئے بولا گیا ہے، شریعت کی اِصطلاحی بدعت مراد نہیں ہے، جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے: ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ''یعنی ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' [2]

قرآنِ کریم کے نسق و نظم میں غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، سب سے پہلے تو اس جملے پر نظر ڈالئے: وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نعمت کے اظہار کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے ان کے دِلوں میں راُفت، رحمت، رَہبانیت پیدا کردی، نسقِ کلام بتلاتا ہے کہ جس طرح راُفت ورحمت مذموم نہیں، اسی طرح ان کی اِختیار کردہ رَہبانیت بھی اپنی ذات سے کوئی مذموم چیز نہ تھی، ورنہ مقامِ امتنان میں راُفت ورحمت کے ساتھ رَہبانیت کا ذِکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اسی لئے جن حضرات نے مطلقاً رَہبانیت کو مذموم وممنوع قرار دِیا ان کو اس جگہ رَہبانیت کے عطف میں غیرضروری تاویل کرنا پڑی، کہ اس کو راُفت ورحمت پر عطف نہیں مانا بلکہ ایک مستقل جملہ یہاں محذوف قرار دِیا یعنی: ''اِبْتَدَعُوْا ''(كما فعله القرطبي رحمه الله) لیکن مذکورہ تفسیر پر اس تاویل کی کوئی ضرورت

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۹، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ۳۷۹۰، تفسیر سورة الحديد، والمعجم الكبير للطبرانیؒ رقم الحديث: ۱۰۲۰۳

[2] صحیح مسلم، کتاب الجمعة، فصل فی الخطبة والصلاة قصدًا، ج:۱ ص:۲۸۴

نہیں رہتی، آگے بھی قرآنِ کریم نے ان کے اس اِبتداع پر کوئی نکیر اور رَدّ نہیں فرمایا، بلکہ نکیر اس پر کی گئی کہ انہوں نے اس اِختیار کردہ رَہبانیت کو نبھایا نہیں، اس کے حقوق و شرائط کی رعایت نہیں کی، یہ بھی جب ہی ہوسکتا ہے کہ اِبتداع کو لغوی معنی میں لیا جائے، شرعی اور اِصطلاحی معنی ہوتے تو قرآن خود اس پر بھی نکیر کرتا، کیونکہ بدعت اِصطلاحی خود ایک گمراہی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے اور بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ ترہب اختیار کرنے والی جماعت کو نجات یافتہ جماعتوں میں شمار فرمایا، اگر یہ بدعتِ اِصطلاحی کے مجرم ہوتے تو نجات یافتہ میں شمار نہ ہوتے، بلکہ گمراہوں میں شمار کئے جاتے۔

کیا رَہبانیت مطلقاً مذموم و ناجائز ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ لفظِ ''رَہبانیت'' کا عام اِطلاق ترکِ لذّات و ترکِ مباحات کے لئے ہوتا ہے، اس کے چند درجے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مباح و حلال چیز کو اِعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے، یہ تو دِین کی تحریف و تغییر ہے، اس معنی کے اِعتبار سے رَہبانیت قطعاً حرام ہے، اور آیتِ قرآن: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ [1] (المائدۃ:۸۷) اور اس کی اَمثال میں اسی کی ممانعت و حرمت کا بیان ہے، اس آیت کا عنوان ''لَا تُحَرِّمُوْا'' خود یہ بتلا رہا ہے کہ اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اِعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے رہا ہے، جو اَحکامِ اِلٰہیہ میں تبدیل و تحریف کے مرادف ہے۔

دُوسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کے کرنے کو اِعتقاداً یا عملاً حرام قرار نہیں دیتا، مگر کسی دُنیوی یا دِینی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے، دُنیوی ضرورت جیسے کسی بیماری کے خطرے سے کسی مباح چیز سے پرہیز کرے، اور دِینی ضرورت یہ کہ یہ محسوس کرے کہ میں نے اس مباح کو اِختیار کیا تو اَنجامِ کار میں کسی گناہ میں مبتلا ہوجاؤں گا، جیسے: جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنے کے لئے کوئی آدمی لوگوں سے اِختلاط ہی چھوڑ دے، یا کسی نفسانی رذیلے کے علاج کے لئے چند روز بعض مباحات کو ترک کردے اور اس ترک کی پابندی بطور علاج و دوا کے اس وقت تک کرے جب تک یہ رذیلہ دُور نہ ہوجائے، جیسے صوفیائے کرام مبتدی کو کم کھانے، کم سونے، کم اِختلاط کی تاکید کرتے ہیں، کہ یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے نفس کو اِعتدال پر لانے کا، جب نفس پُر قابو ہوجاتا ہے کہ ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ نہ رہے تو یہ پرہیز چھوڑ دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت رَہبانیت نہیں، تقویٰ ہے جو مطلوب فی الدین اور اَسلافِ کرام صحابہ و تابعین اور ائمۂ دِین سے ثابت ہے۔

---

[1] ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان میں لذیذ چیزوں کو حرام مت کرو۔

تیسرا درجہ یہ کہ کسی مباح کو حرام تو قرار نہیں دیتا، مگر اس کا استعمال جس طرح سنت سے ثابت ہے اس طرح کے استعمال کو بھی چھوڑنا ثواب اور افضل جان کر اس سے پرہیز کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کا غلو ہے، جس سے احادیثِ کثیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور جس حدیث میں: "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" [۱] آیا ہے، یعنی "اسلام میں رہبانیت نہیں" اس سے مراد ایسا ہی ترکِ مباحات ہے کہ ان کے ترک کو افضل وثواب سمجھے، بنی اسرائیل میں جو رہبانیت اوّل شروع ہوئی وہ اگر حفاظتِ دِین کی ضرورت سے تھی تو دُوسری قسم یعنی تقویٰ میں داخل ہے، لیکن اہلِ کتاب میں غلو فی الدین کی آفت بہت تھی، وہ اس غلو میں پہلے درجے میں تحریمِ حلال تک پہنچے تو حرام کے مرتکب ہوئے اور تیسرے درجے تک رہے تو بھی ایک مذموم فعل کے مجرم بنے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ

اس آیت میں "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" سے مراد اہلِ کتاب ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام پر اِیمان لائے، قرآنِ کریم کی عام عادت یہ ہے کہ "الَّذِينَ آمَنُوا" کا لفظ صرف مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے، یہود ونصاریٰ کے لئے "اہلِ کتاب" کا لفظ آتا ہے، کیونکہ صرف حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ان کا ایمان کافی اور معتبر نہیں جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان نہ لائیں، اس لئے وہ "الَّذِينَ آمَنُوا" کہلانے کے مستحق نہیں، مگر یہاں اس عام عادت کے خلاف یہ لفظ نصاریٰ کے لئے بولا گیا، شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ آگے ان کو حکم کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح اِیمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاؤ، اور جب وہ ایسا کرلیں تو "الَّذِينَ آمَنُوا" کے خطاب کے مستحق ہوگئے۔

آگے اس تکمیلِ ایمان پر ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو دُہرا اَجر وثواب ملے گا، ایک پہلے نبی حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام پر اِیمان لانے اور ان کی شریعت پر عمل کرنے کا، اور دُوسرا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان لانے کا اور آپ کی شریعت پر عمل کرنے کا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگرچہ یہود ونصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان نہ لانے کے وقت تک کافر تھے، اور کافر کی کوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی، اس کا مقتضایہ تھا کہ پچھلی شریعت پر جو عمل کیا وہ سب اکارت ہوگیا، مگر اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ اہلِ کتاب کافر جب مسلمان ہوجائے تو زمانۂ کفر کے کئے ہوئے نیک اعمال بھی پھر اس کے بحال کردیئے جاتے ہیں، اس لئے دُہرا اَجر ہوجاتا ہے۔

---

[۱] شرح السُّنّة للبغویؒ، کتاب الصلاۃ، باب فضل القعود فی المسجد لانتظار الصلاۃ ج:۲ ص:۳۷۱، وکشف الخفاء رقم الحدیث:۳۱۵۴

لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ، اس میں ''لَا'' زائدہ ہے، معنی ''لِيَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتَابِ'' کے ہیں، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مذکور الصدر احکام اس لئے بیان کئے گئے تا کہ اہلِ کتاب سمجھ لیں کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں، اس حالت میں وہ اللہ کے کسی فضل کے مستحق نہیں، جب تک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آئیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ

بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ للسّادس والعشرین من الرّبیع الثّانی

یوم الإثنین بعد العشاء ویتلوہ إن شاء اللہ سورۃ المجادلة

سورۃ المجادلۃ

آیاتھا ۲۲ | ۵۸ سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۵ | رکوعاتھا ۳

سورۂ مجادلہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں اور تین رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ

سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی تھی اللہ کے آگے،

وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝۱ اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ

اور اللہ سنتا تھا سوال وجواب تم دونوں کا، بے شک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے۔ جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں

مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ

تم میں سے اپنی عورتوں کو وہ نہیں ہوجاتیں ان کی مائیں، اُن کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے اُن کو جنا،

وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿٢﴾

اور وہ بولتے ہیں ایک ناپسند بات اور جھوٹی، اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ

اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر کرنا چاہیں وہی کام جس کو کہا ہے تو آزاد کرنا چاہئے ایک بردہ

مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ۚ ذَٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٣﴾

پہلے اس سے کہ آپس میں ہاتھ لگائیں، اس سے تم کو نصیحت ہوگی، اور اللہ خبر رکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو،

فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ۖ

پھر جو کوئی نہ پائے تو روزے ہیں دو مہینے کے لگاتار پہلے اس سے کہ آپس میں چھوئیں،

فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ۚ ذَٰلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ

پھر جو کوئی یہ نہ کرسکے تو کھانا دینا ہے ساٹھ محتاجوں کا، یہ (حکم) اس واسطے کہ تابعدار ہوجاؤ اللہ کے

وَرَسُولِهِ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ

اور اس کے رسول کے اور یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی، اور منکروں کے واسطے عذاب ہے دردناک، جو لوگ کہ

يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

مخالفت کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ خوار ہوئے ہیں جیسے کہ خوار ہوئے وہ لوگ جو اُن سے پہلے تھے،

وَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥﴾ يَوْمَ

اور ہم نے اُتاری ہیں آیتیں بہت صاف، اور منکروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا، جس دن کہ

يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ

اُٹھائے گا اللہ ان سب کو پھر جتلائے گا ان کو ان کے کئے کام، اللہ نے وہ سب گن رکھے ہیں اور وہ بھول گئے

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝٦ ع

اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) اللہ نے اُس عورت کی بات سن لی ہے جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث کر رہی ہے، اور اللہ سے فریاد کرتی جاتی ہے۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے دیکھنے والا ہے۔ ① تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، (ان کے اس عمل سے) وہ بیویاں اُن کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ اُن کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے اُن کو جنم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں جو بہت بُری ہے، اور جھوٹ ہے، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔ ② اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اُس سے رُجوع کرتے ہیں، تو اُن کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا ہے، قبل اس کے کہ وہ (میاں بیوی) ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ یہ ہے وہ بات جس کی تمہیں نصیحت کی جارہی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ③ پھر جس شخص کو غلام میسر نہ ہو، اُس کے ذمے دو متواتر مہینوں کے روزے ہیں، قبل اس کے کہ وہ (میاں بیوی) ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ پھر جس کو اس کی بھی استطاعت نہ ہو، اُس کے ذمے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لئے تاکہ تم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدیں ہیں، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ④ یقین رکھو کہ جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ایسے ہی ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے تھے، اور ہم نے کھلی کھلی آیتیں نازل کردی ہیں، اور کافروں کے لئے ایسا عذاب ہے جو خوار کر کے رکھ دے گا، ⑤ اُس دن جب اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا، پھر انہیں بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا تھا۔ اللہ نے اُسے گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے، اور یہ اُسے بھول گئے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔ ⑥

سببِ نزول

اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کا سبب ایک خاص واقعہ ہے کہ حضرت اُوس بن الصامتؓ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ کو یہ کہہ دیا کہ: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ'' تو میرے حق میں ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت یعنی حرام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ ابدی اور دائمی حرمت کے لئے بولے جاتے تھے جو طلاقِ مغلّظہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ حضرت خولہؓ یہ واقعہ پیش آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا حکمِ شرعی معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، اس وقت تک اس خاص مسئلے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آپ نے قولِ مشہور کے موافق ان سے فرمادیا: ''مَا اَرَاکِ اِلَّا قَدْ حَرُمْتِ عَلَیْہِ'' یعنی میری رائے میں تو تم اپنے شوہر پر حرام ہوگئیں۔ وہ یہ سن کر واویلا کرنے لگیں کہ میری جوانی سب اس شوہر کی خدمت میں ختم ہوگئی، اب بڑھاپے میں انہوں نے مجھ سے یہ معاملہ کیا، میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا گزارہ کیسے ہوگا؟ اور ایک روایت میں ہے کہ خولہ نے یہ عرض کیا کہ ''مَا ذَکَرَ طَلَاقًا'' یعنی میرے شوہر نے طلاق کا تو نام بھی نہیں لیا تو پھر طلاق کیسے ہوگئی؟ اور ایک روایت میں ہے کہ خولہؓ نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْآ اِلَیْکَ'' اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خولہؓ سے یہ فرمایا: ''مَا اُمِرْتُ فِیْ شَاْنِکِ بِشَیْءٍ حَتَّی الْاٰنَ'' یعنی ابھی تک تمہارے مسئلے کے متعلق مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ (ان سب روایات میں کوئی تضاد و تعارض نہیں، سبھی اقوال صحیح ہوسکتے ہیں) اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، (کذا فی الدر المنثور وابن کثیر) [1] اس لئے اس سورت کی ابتدائی آیات میں اس خاص مسئلے کا جس کا نام ''ظہار'' ہے، حکمِ شرعی بیان فرمایا گیا، جس میں حق تعالیٰ نے حضرت خولہؓ کی فریاد سنی اور ان کے لئے آسانی فرمادی، ان کی وجہ سے حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ مستقل اَحکام نازل فرمادیئے، اسی لئے حضراتِ صحابہ ان کا بڑا اِحترام کرتے تھے۔ ایک روز فاروقِ اعظمؓ ایک مجمع کے ساتھ چلے جارہے تھے، یہ عورت خولہؓ سامنے آکر کھڑی ہوگئیں، کچھ کہنا چاہتی تھیں، حضرت عمرؓ نے راستے میں ٹھہر کر اُن کی بات سنی، بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی خاطر اتنے بڑے مجمع کو روکے رکھا، تو آپ نے فرمایا کہ خبر ہے یہ کون ہے؟ یہ وہ عورت ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اُوپر سنی، میں کون تھا کہ ان کی بات کو ٹال دیتا، واللہ! اگر یہ خود ہی رُخصت نہ ہوجاتی تو میں رات تک ان کے ساتھ یہیں کھڑا رہتا۔ (ابنِ کثیر) [2]

---

[1] تفسیر الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۹ ص:۴۲۸، وتفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۴

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۷، وتفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۲۶۹

خلاصہ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑتی تھی (مثلاً یہ کہتی تھی: ''مَا ذَكَرَ طَلَاقًا''یعنی اُس نے طلاق کا صیغہ تو ذِکر نہیں کیا، پھر حرمت کیسے ہوگئی) اور (اپنے رنج وغم کی) اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتی تھی (مثلاً یہ کہا تھا: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْا اِلَیْكَ'' [1]) اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا (اور) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے (تو اس کی بات کو کیسے نہ سنتا، اور قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ سے خدا تعالیٰ کا مقصود اپنے لئے سمع ثابت کرنا نہیں، بلکہ عورت کی تکلیف کو ختم کرنا اور اس کی عاجزی کو قبول کرنا ہے) تم میں جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں (مثلاً یوں کہہ دیتے ہیں: ''اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ'') وہ (بیبیاں) ان کی مائیں نہیں ہیں، اُن کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے اُن کو جنا ہے (اس لئے یہ الفاظ کہنے سے یہ عورتیں ان کی مائیں نہیں ہوگئیں، تاکہ ہمیشہ کی حرمت مثل ماں کے ثابت ہوجائے، اور کوئی دُوسرا سبب بھی دائمی حرمت کا کسی دلیل سے متحقق نہیں، مثلاً تحریم نسب، رضاع یا مصاہرت وغیرہ، پس دائمی حرمت کی نفی ہوگئی) اور وہ لوگ (جو کہ بیبیوں کو ماں کہتے ہیں) بلاشبہ ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں (اس لئے گناہ ضرور ہوگا) اور (اگر اس گناہ کا تدارک کردیا جائے تو وہ گناہ معاف بھی ہوجائے گا کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردینے والے، بخش دینے والے ہیں۔ اور (آگے اس تدارک کا بعض صورتوں کے اعتبار سے بیان ہے کہ) جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات (کے مقتضا) کی (جو تحریمِ زوجہ ہے) تلافی کرنا چاہتے ہیں (یعنی بیبیوں سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں) تو اُن کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں (میاں بی بی) باہم اختلاط کریں (صحبت سے یا اسبابِ صحبت سے) اس (کفارہ کا حکم کرنے) سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے (کفارہ سے علاوہ تکفیر سیئات کے یہ بھی نفع ہے کہ اس سے آئندہ کو تمہیں تنبیہ ہوجائے گی) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کفارہ کے متعلق پوری بجا آوری اَحکام کی کرتے ہو یا نہیں پس کفارے میں دو حکمتیں ہوگئیں، ایک گناہ کی معافی جس کی طرف اشارہ ہے لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲ میں۔ دُوسری زجر و تنبیہ جس کا تُوْعَظُوْنَ میں بیان ہے، اور یہ دُوسری حکمت بھی کفارے کی تینوں قسموں میں ہے، لیکن غلام یا لونڈی آزاد کرنا چونکہ کفارے کے اَقسام میں ذِکراً مقدم ہے، اس لئے اس کو اس کے ساتھ ذِکر کردیا گیا) پھر جس کو (غلام، لونڈی) میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ پے بہ پے (یعنی لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ دونوں (میاں بی بی) باہم اِختلاط کریں، پھر جس سے یہ بھی

---

[1] سنن ابن ماجة، ابواب الطّلاق، باب الظهار ج: ۱، ص: ۱۴۹

نہ ہوسکیں تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (آگے اس حکم کا مثل دیگر احکام کے واجب التصدیق ہونا اس لئے بیان فرماتے ہیں کہ اس حکم کا مقصد قدیم رسم اور جاہلیت کے حکم کو توڑنا ہے، اس لئے اہتمام مناسب ہوا، پس ارشاد ہوا کہ) یہ حکم اس لئے (بیان کیا گیا) ہے تاکہ (اس حکم سے متعلق مصلحتوں کے حاصل کرنے کے علاوہ) اللہ اور رسول پر ایمان (بھی) لے آؤ (یعنی ان احکام میں اُن کی تصدیق بھی کرو کہ ایمان سے متعلق مصالح بھی حاصل ہوں) اور (آگے مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ اللہ کی حدیں (باندھی ہوئی) ہیں (یعنی خداوندی ضابطے ہیں) اور کافروں کے لئے (جو کہ ان احکام کی تصدیق نہیں کرتے بالخصوص) سخت دردناک عذاب ہوگا (اور مطلق عذاب عمل میں خلل ڈالنے والے کو بھی ہوسکتا ہے، اور کچھ اسی حکم کی تخصیص نہیں، بلکہ) جو لوگ اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں (خواہ کسی حکم میں کریں جیسے کفارِ مکہ) وہ (دُنیا میں بھی) ایسے ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے (چنانچہ کئی غزوات میں اُس کا وقوع ہوا) اور (سزا کیسے نہ ہو کیونکہ) ہم نے کھلے کھلے احکام (جن کی صحت اعجاز آیات سے ثابت ہے) نازل کئے ہیں (تو ان کا انکار لامحالہ موجب سزا ہوگا اور یہ سزا تو دُنیا میں ہوگی) اور کافروں کو (آخرت میں بھی) ذِلت کا عذاب ہوگا (اور آگے اس عذاب کا وقت بتلاتے ہیں کہ یہ اِس روز ہوگا) جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا پھر اُن سب کا کیا ہوا ان کو بتلادے گا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھول گئے ہیں (خواہ حقیقۃً یا باعتبار بے فکری و بے التفاتی کے) اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے (خواہ ان کے اعمال ہوں یا اور کچھ)۔

معارف و مسائل

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ الآیۃ، ان آیات کا سببِ نزول جو اُوپر بیان ہو چکا ہے، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عورت جس کا ذِکر اس آیت میں ہے وہ حضرت اوس بن الصامتؓ کی بیوی خولہ بنت ثعلبہؓ ہیں، جن کے شوہر نے ان سے ظہار کرلیا تھا، اور یہ اس کی شکایت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

حق تعالیٰ نے اس کو یہ عزّت بخشی کہ اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں، اور ان میں صرف ظہار کا حکمِ شرعی اور اس کی تکلیف دُور کرنے کا اِنتظام ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس کی دِلداری کے لئے شروع کلام میں فرمادیا کہ ہم اس عورت کی باتیں سن رہے تھے، جو اپنے شوہر کے معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجادلہ کر رہی تھی۔ مجادلہ سے مراد وہ جھگڑا ہے جس سے مراد ایک مرتبہ جواب دے دینے کے باوجود اپنی تکلیف کو بار بار بیان کر کے آپ کو متوجہ کرنا ہے، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو یہ جواب دیا کہ تمہارے معاملے میں مجھ پر کوئی حکم

اللہ کا نازل نہیں ہوا تو اس پر غم زدہ کی زبان سے یہ نکلا کہ یوں تو آپ پر ہر چیز کے حکم نازل ہوتے رہتے ہیں، میرے بارے میں کیا ہوا کہ وحی بھی رُک گئی؟ (قرطبی) [1] اور اللہ تعالیٰ سے فریاد شروع کی وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں: پاک ہے وہ ذات جس کا سماع تمام آوازوں کو محیط ہے، ہر ایک کی آواز سنتا ہے، میں اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھی، جب خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر کی شکایت بیان کر رہی تھیں، مگر اتنے قریب ہونے کے باوجود ان کی بعض باتیں نہ سن سکی تھی، مگر حق تعالیٰ نے اُن سب کو سنا اور فرمایا: قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ۔ (بخاری، ابن کثیر) [2]

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ، يُظٰهِرُوْنَ، ظِهَار بکسر ظاء سے مشتق ہے، جو بیوی کو اپنے اُوپر حرام کر لینے کی ایک خاص صورت کے لئے بولا جاتا ہے، اور زمانۂ اسلام سے پہلے رائج و معروف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ دے: ''اَنْتِ عَلَیَّ كَظَهْرِ اُمِّیْ''یعنی تو مجھ پر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ اس موقع پر ''پشت'' کا ذکر شاید بطور کنایہ کے ہے، کہ اصل مراد تو بطن تھا، ذِکر پشت کا کر دیا۔ (کما ذکرہ القرطبی) [3]

ظہار کی تعریف اور حکم شرعی

اِصطلاحِ شرع میں ظہار کی تعریف یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرماتِ اَبدیہ، ماں، بہن، بیٹی وغیرہ کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دینا جس کو دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں، ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے، زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لئے بولا جاتا تھا، اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا، کیونکہ طلاق کے بعد تو رَجعت یا نکاحِ جدید ہو کر پھر بیوی بن سکتی ہے، مگر ظہار کی صورت میں رسمِ جاہلیت کے مطابق اُن کے آپس میں میاں بیوی ہو کر رہنے کی قطعی کوئی صورت نہ تھی۔

آیاتِ مذکورہ کے ذریعے شریعتِ اسلامیہ نے اس رسم کی اصلاح دو طرح فرمائی، اوّل تو خود اس رسمِ ظہار کو ناجائز و گناہ قرار دیا، کہ جس کو بیوی سے علیحدگی اِختیار کرنا ہے اس کا طریقہ طلاق ہے، اس کو اِختیار کرے، ظہار کو اس کام کے لئے استعمال نہ کرے، کیونکہ یہ ایک لغو اور جھوٹا کلام ہے کہ بیوی کو ماں کہہ دیا، قرآنِ کریم نے فرمایا: مَا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ یعنی اُن کے اس بیہودہ کلام کی وجہ سے بیوی ماں نہیں بن جاتی، ماں تو وہی ہے جس کے بطن سے پیدا ہوا

[1] تفسير القرطبی ج:۱۷ ص:۲۷۰

[2] صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالیٰ: "وکان الله سمیعًا بصیرًا" ج:۲ ص:۱۰۹۹

[3] تفسير القرطبی، تفسیر سورة المجادلة ج:۱۷ ص:۲۷۳

ہے، پھر فرمایا: وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ یعنی اُن کا یہ قول جھوٹ بھی ہے کہ خلافِ واقع بیوی کو ماں کہہ رہا ہے، اور منکر یعنی گناہ بھی ہے۔

دُوسری اصلاح یہ فرمائی کہ اگر کوئی ناواقف جاہل یا اَحکامِ دِین سے غافل آدمی ایسا کر ہی بیٹھے تو اس لفظ سے حرمتِ ابدی شریعتِ اسلامیہ میں نہیں ہوتی، لیکن اس کو کھلی چھٹی بھی نہیں دی جاتی کہ ایسا لفظ کہنے کے بعد پھر بیوی سے پہلے کی طرح اِختلاط واِنتفاع کرتا رہے، بلکہ اس پر ایک جرمانہ کفارہ کا لگایا گیا کہ اگر پھر یہ اپنی بیوی سے رُجوع ہونا چاہتا ہے اور سابق کی طرح بیوی سے انتفاع چاہتا ہے تو کفارہ ادا کر کے اپنے اس گناہ کی تلافی کرے، بغیر کفارہ ادا کئے بیوی حلال نہ ہوگی، اگلی آیت میں: وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کا یہی مطلب ہے، ''يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا'' میں حرفِ لام کو ''عَنْ'' کے معنی میں لیا گیا، یعنی رُجوع کرتے ہیں وہ اپنے قول سے، اور حضرت ابنِ عباسؓ سے ''يَعُوْدُوْنَ'' کی تفسیر بلفظ ''يَنْدَمُوْنَ'' بھی منقول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قول کہنے کے بعد وہ اپنے قول پر نادم ہوجائیں اور پھر بیوی سے اِختلاط کرنا چاہیں۔ (مظہری) [1]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفارے کا وجوب بیوی کے ساتھ اِختلاط حلال ہونے کی غرض سے ہے، اس کے بغیر حلال نہیں، خود ظہار اس کفارے کی علت نہیں، بلکہ ظہار کرنا ایک گناہ ہے، جس کا کفارہ توبہ واِستغفار ہے، جس کی طرف آیت کے آخر میں وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ سے اشارہ کردیا گیا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص ظہار کر بیٹھے اور اَب بیوی سے اِختلاط نہیں کرنا چاہتا تو کوئی کفارہ لازم نہیں، البتہ بیوی کی حق تلفی ناجائز ہے، اگر وہ مطالبہ کرے تو کفارہ ادا کر کے اِختلاط کرنا یا پھر طلاق دے کر آزاد کرنا واجب ہے، اگر یہ شخص خود نہ کرے تو بیوی حاکمِ اسلام کی طرف مراجعت کر کے شوہر کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، یہ سب مسائل کتبِ فقہ میں مفصل لکھے گئے ہیں۔

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ الآیۃ، یعنی کفارہ ظہار کا یہ ہے کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کرے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو دو مہینے کے لگاتار مسلسل روزے رکھے، اور کسی بیماری یا ضعف کے سبب اتنے روزوں پر بھی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یعنی دونوں وقت پیٹ بھرائی کھانا ساٹھ مسکینوں کو کھلا دے، اور کھانا کھلانے کے قائم مقام یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو فی کس ایک فطرے کی مقدار گندم یا اس کی قیمت دے دے، فطرے کی مقدار ہمارے موجودوزن کے اعتبار سے پونے دو سیر گندم ہیں، اس کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے۔

ظہار سے متعلقہ اَحکام اور اس کے کفارے کے مفصل مسائل کتبِ فقہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ کی واویلا اور فریاد پر جب آیاتِ مذکورہ اور کفارۂ ظہار کے اَحکام نازل

[1] تفسیر المظہری، سورۃ المجادلۃ، ج:۹ ص:۲۱۳

ہوئے اور شوہر سے دائمی مفارقت و حرمت سے بچنے کا راستہ نکل آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کو بلایا، دیکھا کہ ضعیف البصر بوڑھا آدمی ہے، آپ نے اس کو نازل شدہ آیات اور کفارے کا حکم سنایا کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کردو۔ اس نے کہا کہ یہ میری قدرت میں نہیں کہ غلام خرید کر آزاد کروں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ اس نے کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو رسولِ برحق بنایا، میری حالت یہ ہے کہ اگر دن میں دو تین مرتبہ کھانا نہ کھاؤں تو میری نگاہ بالکل ہی جاتی رہتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اس نے عرض کیا کہ یہ بھی میری قدرت میں نہیں بجز اس کے کہ آپ ہی کچھ مدد کریں۔ آپ نے اس کو کچھ غلہ عطا فرمایا، پھر کچھ دُوسرے لوگوں نے جمع کردیا، اس طرح ساٹھ مسکینوں کو فطرے کی مقدار دے کر کفارہ ادا ہوگیا۔ (ابنِ کثیر)[1]

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④ اس آیت میں لِتُؤْمِنُوْا فرمایا اور مراد ایمان سے شرائع و اَحکام پر عمل کرنا ہے، اور پھر فرمایا کہ یہ کفارہ وغیرہ کے اَحکام اللہ کی مقرّر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز کرنا حرام ہے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اسلام نے نکاح، طلاق، ظہار اور دُوسرے سب معاملات میں جاہلیت کی رُسوم کو مٹا کر ان کی جگہ معتدل اور صحیح طریقوں کی تعلیم دی ہے، تم اس پر قائم رہو اور جو لوگ ان حدودِ شرعیہ کے منکر اور کافر ہیں ان کو دردناک سزا ملے گی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، سابقہ آیت میں حدودُ اللہ اور شریعتِ اسلام کے اَحکام کی پابندی کی تاکید تھی، اس میں ان لوگوں پر وعید ہے جو حدودُ اللہ کے مخالف اور منکر ہیں، اس وعید میں اُن کے لئے دُنیا میں بھی انجامِ کار ذِلت و خواری اور ان کے کفریہ عزائم کی ناکامی کا بیان ہے اور آخرت میں عذابِ الیم کا۔

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۚ میں اس پر تنبیہ ہے کہ غافل انسان دُنیا میں گناہ اور فسق و فجور کے کام کرتا رہتا ہے، جو اس کو یاد بھی نہیں رہتے اور بھولنے کا سبب دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اس لئے ذہن میں بھی نہیں رہتا، وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس لکھے ہوئے ہیں، یہ تو کر کے بھول گئے، مگر اللہ تعالیٰ کو سب یاد ہیں، سب پر محاسبہ اور عذاب ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، کہیں نہیں ہوتا

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية، ج:۸ ص:۱۲۱، ومسند احمد، رقم الحديث: ۲۷۳۶۰، حديث خولة بنت ثعلبه رضي الله عنها۔

مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ

مشورہ تین کا جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چوتھا، اور نہ پانچ کا جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چھٹا، اور نہ

اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ

اس سے کم اور نہ زیادہ جہاں وہ نہیں ہوتا ان کے ساتھ جہاں کہیں ہوں، پھر جتلادے گا ان کو

بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ

جو کچھ انہوں نے کیا قیامت کے دن، بے شک اللہ کو معلوم ہے ہر چیز، تو نے نہ دیکھا اُن لوگوں کو

نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ

جن کو منع ہوئی کاناپھوسی پھر بھی وہی کرتے ہیں جو منع ہوچکا ہے اور کان میں باتیں کرتے ہیں گناہ کی

وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ

اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی اور جب آئیں تیرے پاس تجھ کو وہ دُعا دیں جو دُعا نہیں دی تجھ کو

بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ

اللہ نے اور کہتے ہیں اپنے دِل میں کیوں نہیں عذاب کرتا ہم کو اللہ اس پر جو ہم کہتے ہیں

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

کافی ہے ان کو دوزخ، داخل ہوں گے اس میں، سو بُری جگہ پہنچے۔ اے ایمان والو!

اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ

جب تم بات کرو کان میں تو مت کرو بات گناہ کی اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی،

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ⑨

اور بات کرو احسان کی اور پرہیزگاری کی، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم کو جمع ہونا ہے۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْــًٔا

یہ جو ہے کاناپھوسی سو شیطان کا کام ہے تاکہ دلگیر کرے ایمان والوں کو اور وہ اُن کا کچھ نہ بگاڑے گا

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑩ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

بدون اللہ کے حکم کے اور اللہ پر چاہئے کہ بھروسہ کریں ایمان والے۔ اے ایمان والو!

اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ

جب کوئی تم کو کہے کہ کُھل کر بیٹھو مجلسوں میں تو کُھل جاؤ، اللہ کشادگی دے تم کو، اور جب کوئی کہے کہ

انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہو اللہ بلند کرے گا اُن کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم اُن کے

دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ

درجے، اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اے ایمان والو! جب تم کان میں بات کہنا چاہو

الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ

رسول سے تو آگے بھیجو اپنی بات کہنے سے پہلے خیرات، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں

وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫ ءَاَشْفَقْتُمْ

اور بہت ستھرا، پھر اگر نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کیا تم ڈر گئے

اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ

کہ آگے بھیجا کرو کان کی بات سے پہلے خیراتیں سو جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے معاف کردیا

عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

تم کو تو اب تم قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو اللہ اور اس کے رسول کے،

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ اُسے جانتا ہے؟ کبھی تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو، اور نہ پانچ آدمیوں کی کوئی سرگوشی ایسی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو، اور چاہے سرگوشی کرنے والے اس سے کم ہوں یا زیادہ، وہ جہاں بھی ہوں، اللہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر وہ قیامت کے دن اُنہیں بتائے گا کہ اُنہوں نے کیا کچھ کیا تھا۔ بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ﴿۷﴾ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی کرنے سے منع کردیا گیا تھا، پھر بھی وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے اُنہیں منع کیا گیا تھا؟ اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسی سرگوشیاں کرتے ہیں جو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور (اے پیغمبر!) جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں ایسے طریقے سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے تمہیں سلام نہیں کیا، اور اپنے دِلوں میں کہتے ہیں کہ: ''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، اُس پر اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دے دیتا؟'' ــــ جہنم ہی ان (کی خبر لینے) کے لئے کافی ہے، وہ اسی میں جا پہنچیں گے، اور وہ پہنچنے کی بہت بُری جگہ ہے۔ ﴿۸﴾ اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کرو تو ایسی سرگوشی نہ کرو جو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی پر مشتمل ہو، ہاں ایسی سرگوشی کرو جو نیک کاموں اور تقویٰ پر مشتمل ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس تم سب کو جمع کرکے لے جایا جائے گا۔ ﴿۹﴾ ایسی سرگوشی تو شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، تاکہ وہ ایمان والوں کو غم میں مبتلا کرے، اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر اُنہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور مؤمنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ﴿۱۰﴾ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں دوسروں کے لئے گنجائش پیدا کرو، تو گنجائش

پیدا کردیا کرو، اللہ تمہارے لئے وسعت پیدا کرے گا، اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ، تو اُٹھ جاؤ، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ⑪ اے ایمان والو! جب تم رسول سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کردیا کرو۔ یہ طریقہ تمہارے حق میں بہتر اور زیادہ ستھرا طریقہ ہے۔ ہاں اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لئے) کچھ نہ ہو تو اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ⑫ کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی تنہائی کی بات سے پہلے صدقات دیا کرو؟ اب جبکہ تم ایسا نہیں کر سکے، اور اللہ نے تمہیں معاف کردیا تو تم نماز قائم کرتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو۔ اور جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ⑬

شانِ نزول

اسبابِ نزول ان آیات کے چند واقعات ہیں:

اوّل:- یہود اور مسلمانوں میں صلح تھی، لیکن یہود جب کسی مسلمان کو دیکھتے تو اس کے خیالات پریشان کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی کرنے لگتے، وہ مسلمان سمجھتا کہ میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اس سے منع فرمایا، مگر وہ باز نہ آئے، اس پر آیت: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى...الخ نازل ہوئی۔

دوم:- اسی طرح منافقین بھی باہم سرگوشی کیا کرتے، اس پر آیت: اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا ...الخ اور آیت: اِنَّمَا النَّجْوٰى...الخ نازل ہوئی۔

سوم:- یہود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آتے تو براہِ شرارت بجائے ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہنے کے ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ'' کہتے، سام بمعنی موت کے ہیں۔

چہارم:- منافقین بھی اسی طرح کہتے ان دونوں واقعوں پر: وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ...الخ نازل ہوا، اور ابنِ کثیر نے امام احمد کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود اس طرح سلام کر کے خفیہ کہتے: لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ یعنی ''اگر ہم نے یہ گناہ کیا ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔'' [1]

پنجم:- ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور مجلس میں مجمع زیادہ تھا، چند صحابہ جو غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے تھے، آئے تو ان کو کہیں جگہ نہ ملی، اور نہ اہلِ مجلس نے ایسا کیا کہ مل مل کر بیٹھ جاتے جس سے جگہ کھل جاتی۔ آپ نے جب دیکھا تو بعض آدمیوں کو مجلس سے اُٹھنے کے لئے فرمادیا، منافقین نے طعن کیا کہ یہ کون سی انصاف کی

[1] مسند احمد، مسند عبدالله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما، رقم الحديث: ۶۵۸۹، وتفسير ابن كثير ج:۸ ص:۴۴

بات ہے اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے بھائی کے لئے جگہ کھول دے، سو لوگوں نے جگہ کھول دی۔ اس پر آیت: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا... الخ نازل ہوئی۔ (رواہ ابن کثیر عن ابی حاتم) [۱] مجموعہ اجزائے روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جگہ کھولنے کے لئے فرمایا ہوگا، بعضوں نے تو جگہ کھول دی، جو کافی نہ ہوئی ہوگی، اور بعضوں نے جگہ نہیں کھولی، آپ نے تأدیباً جیسے مدارس کے طلبہ میں ہوتا ہے اُن کو اُٹھ جانے کے لئے فرمایا، جو کہ منافقین کو ناگوار ہوا۔

ششم:- بعض اغنیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی دیر تک آپ سے سرگوشی کیا کرتے اور فقراء کو استفادے کا وقت کم ملتا، آپ کو ان لوگوں کا دیر تک بیٹھنا اور دیر تک سرگوشی کرنا ناگوار گزرتا، اس پر آیت اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ... الخ نازل ہوئی۔ فتح البیان میں زید بن اسلم سے بلا سند نقل کیا ہے کہ یہود و منافقین بلاضرورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشیاں کرتے، مسلمانوں کو اس خیال سے کہ شاید کسی نقصان دہ بات کی سرگوشی ہو، ناگوار گزرتا، اس پر اُن کو منع کیا گیا، جس کا ذکر آیت: نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى میں ہے، مگر جب وہ باز نہ آئے تو یہ حکم نازل ہوا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ... الخ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ باطل اس سرگوشی سے رُک گئے، [۲] کیونکہ حبِ مال کی وجہ سے صدقہ اُن کو گوارا نہ تھا۔

ہفتم:- جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم ہوا تو بہت سے آدمی ضروری بات کرنے سے بھی رُک گئے، اس پر آیت ءَاَشْفَقْتُمْ نازل ہوئی۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صدقہ دینے کے حکم میں پہلے سے بھی فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا میں ناداروں کو رُخصت دے دی گئی تھی، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ نہ تو بالکل نادار ہوتے ہیں اور نہ پورے صاحبِ ثروت ہوتے ہیں، گو صاحبِ نصاب ہوں، غالباً ایسے لوگوں کو تنگی پیش آئی ہوگی کہ کم وسعتی کی وجہ سے تو خرچ کرنا شاق ہوا، اور اپنی ناداری میں بھی شبہ ہوا، اس لئے نہ صدقہ دے سکے اور نہ اپنے کو محلِ رُخصت سمجھا، اور سرگوشی کرنا کوئی عبادت نہ تھی کہ اس کا چھوڑنا ملامت کا سبب ہو سکے، اس لئے اس سے رُک گئے، (الروایات کلها فی الدرّ المنثور) [۳] ان اسبابِ نزول سے فہمِ تفسیر میں اعانت و سہولت ہوگی۔ (از بیان القرآن) [۴]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۸ ص:۴۵

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۷ ص:۳۰۱

[۳] تفسیر الدّرّ المنثور ج:۹ ص:۴۳۸ تا ۴۴۱

[۴] تفسیر بیان القرآن ج:۱۱ ص:۱۱۶و۱۱۷

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی (مطلب اوروں کو سنانا ہے جو ممنوع کی ہوئی سرگوشی سے باز نہ آتے تھے) کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (اور اسی میں ان کی تناجی یعنی سرگوشی بھی داخل ہے پس) کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) نہ ہو، اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس (عدد) سے کم (میں ہوتی ہے جیسے دو یا چار آدمیوں میں) اور نہ اس سے زیادہ (میں ہوتی ہے، جیسے چھ سات یا زیادہ آدمیوں میں) مگر وہ (ہر حالت میں) اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (خواہ) وہ لوگ کہیں بھی ہوں، پھر ان (سب) کو قیامت کے روز اُن کے کئے ہوئے کام بتلا دے گا، بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر بات کی پوری خبر ہے (اس آیت کا مضمون بعنوان کلی اگلے مضامین جزئیہ کی تمہید ہے، یعنی یہ ایذائے مسلمین کے لئے باطل سرگوشی کرنے والے خدا سے ڈرتے نہیں کہ خدا کو سب خبر ہے اور ان کو سزا دے گا، آگے وہ جزئی مضامین ہیں، یعنی) کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا (مگر) پھر (بھی) وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے اُن کو منع کر دیا گیا تھا اور گناہ اور ظلم اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں (یعنی ایسی سرگوشی کرتے ہیں جس میں بوجہ منہی عنہ ہونے کے خود بھی گناہ ہے اور مسلمانوں کو غمگین کرنے کی وجہ سے عدوان یعنی ظلم بھی ہے، اور بوجہ اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع فرما چکے تھے رسول کی نافرمانی بھی ہے جیسا واقعۂ اوّل اور دوم میں بیان ہوا) اور وہ لوگ (ایسے ہیں کہ) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ کے الفاظ تو یہ ہیں:
وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ [۱] (الصّٰفّٰت)، وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى [۲] (النمل:۵۹)، صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ [۳] (الاحزاب) اور وہ کہتے ہیں: ''اَلسَّامُ عَلَيْكَ'') اور اپنے جی میں (یا اپنے آپس میں) کہتے ہیں کہ (اگر یہ پیغمبر ہیں تو) اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے اس کہنے پر (جس میں سراسر آپ کی بے ادبی ہے) سزا (فوراً) کیوں نہیں دیتا؟ (جیسا واقعہ سوم و چہارم میں گزرا، آگے ان کے اس فعل کی وعید اور اس قول کا جواب ہے کہ جلدی عذاب بعض حکمتوں کے سبب نہ آنے سے مطلقاً عذاب نہ دینا لازم نہیں آتا) اُن (کی سزا) کے لئے جہنم کافی ہے، اس میں یہ لوگ (ضرور) داخل ہوں گے سو وہ بُرا ٹھکانا ہے (آگے ایمان والوں کو خطاب ہے جس سے منافقین کے ساتھ مشابہت کرنے سے ان کو بھی ممانعت کی گئی ہے اور

---

[۱] ترجمہ: اور سلام ہو پیغمبروں پر۔

[۲] ترجمہ: اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے۔

[۳] ترجمہ: آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔

منافقین کو بھی سنانا منظور ہے، کہ تم تو مدعی ایمان کے ہو تو مقتضائے ایمان پر عمل کرو، پس ارشاد ہے کہ) اے ایمان والو! جب تم (کسی ضرورت سے) سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو (تفسیر ان الفاظ کی ابھی گزری ہے) اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں کرو (بِرّ، عُدوان کا مقابل ہے، اس سے مراد وہ نفع ہے جو دوسروں تک پہنچے، اور تقویٰ، اِثم اور معصیت الرسول یعنی رسول کی نافرمانی کا مقابل ہے) اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے، ایسی سرگوشی محض شیطان کی طرف سے (یعنی اس کے بہکانے سے) ہے تاکہ مسلمانوں کو رنج میں ڈالے (جیسا واقعۂ اوّل میں بیان ہوا) اور (آگے اُن مسلمانوں کی تسلی ہے کہ رنجیدہ نہ ہوا کریں، کیونکہ) وہ (شیطان) بدون خدا کے ارادے کے ان (مسلمانوں) کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا (مطلب یہ کہ اگر بالفرض وہ شیطان کے بہکانے سے تمہارے خلاف ہی کوئی تدبیر کر رہے ہیں تب بھی وہ ضرر بغیر مشیتِ ازلیہ کے تم کو نہیں پہنچ سکتا، پھر کیوں فکر میں پڑتے ہو) اور مسلمانوں کو (ہر امر میں) اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے (آگے واقعۂ پنجم کے متعلق حکم ہے، یعنی مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آ جائیں تو اُن کے لئے جگہ کھولنے کا حکم ہے کہ) اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں، یا اُولی الامر، یا واجب الاطاعت لوگوں میں سے کوئی کہے) کہ مجلس میں جگہ کھول دو (جس میں آنے والے کو بھی جگہ مل جائے) تو تم جگہ کھول دیا کرو (اور آنے والے کو جگہ دے دیا کرو) اللہ تعالیٰ تم کو (جنت میں) کھلی جگہ دے گا اور جب (کسی ضرورت سے) یہ کہا جائے کہ (مجلس سے) اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو (خواہ اُٹھنے کے لئے اس غرض سے کہا جائے کہ آنے والے کے لئے جگہ کھل جائے، اور خواہ اس وجہ سے کہا جائے کہ صدرِ مجلس کو اُس وقت کسی مصلحت، مشورۂ خاص یا کسی ضرورت، آرام یا عبادت وغیرہ سے تنہائی کی ضرورت ہو، جو بغیر تنہائی کے مطلقاً حاصل نہ ہو سکیں، یا کامل نہ ہو سکیں، بس صدرِ مجلس کے کھڑے ہونے کے حکم سے اُٹھ جانا چاہئے، اور یہ حکم غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عام ہے، کذا فی الروح۔ [۱] پس صاحبِ مجلس کو ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے کہ کسی شخص کو اُٹھ جانے کے لئے کہہ دے، البتہ آنے والے کو نہ چاہئے کہ کسی کو اُٹھا کر اس کی جگہ بیٹھ جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے، (رواہ الشیخان) [۲] غرض حکم یہ دیا گیا کہ صدرِ مجلس کے کہنے سے اُٹھ جایا کرو) اللہ تعالیٰ (اس حکم کی اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) اُن لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم (دین) عطا ہوا ہے (اُخروی) درجے بلند کر دے گا (یعنی اس حکم کو بجالانے والوں کی تین قسمیں ہیں، ایک کفار جو کسی مصلحتِ دُنیویہ سے مان لیں، جیسے منافقین وہ تو

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۳۱۸

[۲] صحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب لا یقیم الرجل الرجل من مجلسه ج:۲ ص:۹۲۷، وصحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم إقامة الإنسان من موضع المباح الذی سبق إلیه، ج:۲ ص:۲۱۷

لفظ مِنْكُمْ کی بنا پر اس وعدے سے خارج ہیں، دُوسرے اہلِ ایمان جو صاحبِ علم نہ ہوں، ان کے لئے محض رفعِ درجات ہے، تیسرے وہ اہلِ ایمان جو اہلِ علم بھی ہوں، چونکہ بوجہ علم و معرفت ان کے عمل کا منشا زیادتِ خشیت و زیادتِ خلوص ہے، جس سے عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے، ان کے لئے مزید رفع درجات ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کس کا عمل ایمان کے ساتھ ہے اور کس کا بغیر ایمان کے، پھر اس میں کس کے عمل میں کم خلوص ہے اور کس کے عمل میں زیادہ خلوص ہے، اس لئے ہر ایک کی جزا و ثمرہ میں تفاوت رکھا۔ آگے واقعۂ ششم کے متعلق حکم ہے جو واقعۂ اوّل و دوم سے مربوط ہے یعنی) اے ایمان والو! جب تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے کچھ خیرات (مساکین کو) دے دیا کرو (جس کی مقدار آیت میں منصوص نہیں، اور روایاتِ حدیث میں مختلف مقداریں آئی ہیں، ظاہراً مقدار غیر معین معلوم ہوتی ہے، لیکن معتد بہ ہونا ضروری ہے) یہ تمہارے لئے (ثواب حاصل کرنے کے واسطے) بہتر ہے اور (گناہوں سے) پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے (کیونکہ طاعت سے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے، یہ مصلحت مال دار مؤمنین کے اعتبار سے ہے، اور فقراء مؤمنین کے اعتبار سے یہ ہے کہ ان کو نفعِ مالی پہنچے گا، جیسے لفظ "صدقہ" سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صدقہ کے مصارف فقراء ہی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے یہ ہے کہ اس میں آپ کی شان کی بلندی ہے، اور منافقین کی سرگوشی سے آپ کو جو تکلیف ہوتی تھی اس سے نجات اور آرام ہے، کیونکہ ان کو ضرورت تو تناجی یعنی سرگوشی کی تھی نہیں، اور بے ضرورت محض اس لئے مال خرچ کرنا ان کو اَز حد شاق تھا، اور غالباً اس صدقے میں حکم یہ ہوگا کہ سب کے سامنے صدقہ کریں تاکہ نہ کرنے والا دھوکا نہ دے سکے، آگے فرماتے ہیں کہ یہ حکم تو مقدور کی حالت میں ہے) پھر اگر تم کو (صدقہ دینے کا) مقدور نہ ہو (اور ضرورت پڑے سرگوشی کی) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (اس صورت میں اس نے تم کو معاف کر دیا ہے، اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صدقے کا واجب تھا، مگر ناداری کی صورت مستثنیٰ تھی۔ آگے واقعۂ ہفتم کے متعلق جو کہ واقعۂ ششم سے مربوط ہے، ارشاد ہے کہ) کیا تم (یعنی تم میں کے بعض جن کا بیان واقعۂ ہفتم کے ذیل میں ہوا ہے) اپنی سرگوشی کے قبل خیرات دینے سے ڈر گئے سو (خیر) جب تم (اس کو) نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی (کہ بالکل اس کو منسوخ کر کے معاف فرما دیا، جس کی حکمت ظاہر ہے کہ جس مصلحت کے واسطے یہ حکم واجب ہوا تھا، وہ مصلحت حاصل ہوگئی، کیونکہ مصلحت سدِّباب تھی، جو بعد نسخ بھی باقی رہی کہ لوگ احتیاط کرنے لگے، غرض ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرما دیا) تو تم (دُوسری عبادت کے پابند رہو، یعنی) نماز کے پابند رہو اور زکوٰۃ دِیا کرو اور اللہ و رسول کا کہنا مانا کرو (مطلب یہ ہے کہ اس کے نسخ کے بعد تمہارے

قرب وقبولِ نجات کے لئے اَحکام باقیہ پر اِستقامت وہمیشگی ہی کافی ہے) اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی (اور ان کی حالت ظاہری وباطنی کی) پوری خبر ہے۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ اگرچہ خاص واقعات کی بناء پر نازل ہوئی ہیں، جن کا ذِکر اُوپر شانِ نزول میں آچکا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سببِ نزول کچھ بھی ہو، ہدایاتِ قرآنی عام ہوتی ہیں، ان میں عقائد وعبادات اور معاملات ومعاشرت کے متعلق تمام اَحکام ہوتے ہیں، ان آیات میں بھی باہمی سرگوشی اور مشورے کے متعلق چند ایسی ہی ہدایات ہیں۔

خفیہ مشوروں کے متعلق ایک ہدایت

خفیہ مشورہ عموماً مخصوص راز دار دوستوں میں ہوتا ہے، جن پر یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ اِس راز کو کسی پر ظاہر نہ کریں گے، اس لئے ایسے موقع پر ایسے منصوبے بھی بنائے جاتے جن میں کسی پر ظلم کرنا ہے، کسی کو قتل کرنا ہے، کسی کی املاک پر قبضہ کرلینا ہے، وغیرذٰلک، حق تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ساری کائنات پر حاوی ہے، تم کہیں کیسا ہی چھپ کر مشورہ کرو، اللہ تعالیٰ اپنے علم اور سمع وبصر کے اعتبار سے تمہارے پاس موجود ہوتا ہے، اور تمہاری ہر بات کو دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے، اگر اس میں کوئی گناہ کروگے تو سزا سے نہ بچوگے، اس میں بتلانا تو یہ ہے کہ تم کتنے ہی کم یا زیادہ آدمی مشورہ اور سرگوشی میں شریک ہو، حق تعالیٰ ان میں موجود ہوتا ہے، مثال کے طور پر دو عدد بتلا دیئے گئے، تین اور پانچ، یعنی اگر تم تین آدمی مشورہ کررہے ہو تو سمجھو کہ چوتھا اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہے، اور پانچ آدمی مشورہ کررہے ہو تو سمجھو کہ چھٹا حق تعالیٰ موجود ہے، تین اور پانچ کے عدد کی تخصیص میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جماعت کے لئے اللہ کے نزدیک طاق عدد پسند ہے: مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ الآیۃ، کا یہی حاصل ہے۔

سرگوشی اور مشورہ کے متعلق ایک ہدایت

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُھُوْا عَنِ النَّجْوٰی، واقعۂ شانِ نزول میں بتلایا گیا ہے کہ جس زمانے میں یہود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح ہوگیا تھا، اس وقت وہ کھل کر تو مسلمانوں کے خلاف کوئی کام نہ کرسکتے تھے، مگر اِسلام اور مسلمانوں سے دِل میں بھرا ہوا بغض نکالنے کا ایک یہ طریقہ اِختیار کیا تھا کہ جب صحابۂ کرام میں سے کسی کو اپنے قریب آتے دیکھتے تو باہم سرگوشی اور خفیہ مشورے کی شکل بنالیتے، اور آنے والے مسلمانوں کی طرف کچھ اشارے کرتے جس سے ان کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ ہمارے خلاف کوئی سازش کررہے ہیں اور اس سے پریشانی اور رنج ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اُن کو ایسی سرگوشی سے منع فرمایا، نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى میں اسی ممانعت کا بیان ہے۔

اس ممانعت سے یہ حکم مسلمانوں کے لئے بھی نکل آیا کہ وہ بھی آپس میں کوئی سرگوشی اور مشورہ اس طرح نہ کریں جس سے دُوسرے کسی مسلمان کو ایذا پہنچے۔

بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجَا رَجُلَانِ دُوْنَ الْآخَرِ حَتّٰى يَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ فَإِنَّ ذَالِكَ يَحْزُنُهٗ'' یعنی ''جس جگہ تم تین آدمی جمع ہو تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر باہم سرگوشی اور خفیہ باتیں نہ کیا کرو، جب تک دُوسرے آدمی نہ آجائیں، کیونکہ اس سے اُس کی دِل شکنی ہوگی۔'' (غیریت اور اَجنبیت کا اِحساس ہوگا اور ممکن ہے کہ ایسے شبہات پیدا ہوجائیں کہ شاید یہ دونوں کوئی بات میرے خلاف کر رہے ہیں جو مجھ سے چھپاتے ہیں)۔ (از مظہری) [1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى سابقہ آیات میں کفار کو ناجائز سرگوشی پر تنبیہ کی گئی تھی، اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ اپنی سرگوشیوں اور مشوروں میں اس کا دھیان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے سب حالات اور گفتگو کا علم ہے، اور اس اِستحضار کے ساتھ یہ کوشش کریں کہ اُن کے مشورے اور سرگوشی میں کوئی بات فی نفسہٖ گناہ کی، یا دُوسروں پر ظلم کرنے کی، یا کسی خلافِ شرع کام کی نہ ہو، بلکہ جب بھی آپس میں مشورہ کرو، نیک کاموں کے لئے کرو۔

کفار کی شرارت پر بھی نرمی اور شریفانہ مدافعت کی ہدایت

سابقہ آیات کے ضمن میں یہودیوں اور منافقوں کی ایک شرارت یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بجائے ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کے ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ'' کہتے تھے، سام کے معنی موت کے ہیں، اور لفظوں میں زیادہ فرق نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کو اس طرف اِلتفات نہ ہوتا تھا، ایک روز ایسا ہی ہوا، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی سن رہی تھیں، جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ'' کہا تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ'' یعنی ''ہلاکت تم پر ہو اور خدا کی لعنت و غضب'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایسا کہنے سے روکا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فحش کلام کو پسند نہیں فرماتے، آپ کو سختی و درشتی سے بچنا اور نرمی اِختیار کرنا چاہئے۔ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ نے نہیں سنا کہ ان لوگوں نے آپ کو کیا کہا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں سن بھی لیا اور اس کا معتدل بدلہ بھی لے لیا، کہ میں

[1] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۲۲۳، وصحیح البخاری، كتاب الإستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة فلا بأس بالمسارة والمناجاة، ج: ۲ ص: ۹۳۱

نے جواب میں کہہ دیا "عَلَيْكُمْ" یعنی "ہلاکت تم پر ہو۔" اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی دُعا قبول ہوگی نہیں، میری دُعا قبول ہوگی، اس لئے اُن کی شرارت کا بدلہ ہوگیا۔ (رواہ البخاری، ازمظہری) [1]

بعض آدابِ مجلس

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا الآیۃ۔ یہ حکم عام مجالس کا ہے جہاں مسلمانوں کا اِجتماع ہو کہ جب مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آجائیں تو مسلمان اُن کے لئے جگہ دینے کی کوشش کریں اور سمٹ کر بیٹھ جائیں، ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ وسعت پیدا فرمادیں گے، یہ وسعت آخرت میں تو ظاہر ہی ہے، کچھ بعید نہیں کہ دُنیوی معیشت میں بھی یہ وسعت حاصل ہو۔

اس آیت میں دُوسرا حکم آدابِ مجلس کے متعلق یہ ہے کہ: وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یعنی "جب (تم میں سے کسی سے) کہا جائے کہ مجلس سے اُٹھ جاؤ تو اُسے اُٹھ جانا چاہئے۔" اس آیت میں لفظ "قِيْلَ" مجہول استعمال فرمایا ہے، اس کا ذِکر نہیں کہ یہ کہنے والا کون ہو؟ مگر اَحادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنے والے شخص کو اپنے لئے جگہ کرنے کے واسطے کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھانا جائز نہیں۔

صحیحین اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَّجْلِسِهٖ فَيَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا" یعنی "کوئی شخص کسی دُوسرے شخص کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے، بلکہ مجلس میں کشادگی پیدا کر کے آنے والے کو جگہ دے دیا کرو۔ (ابن کثیر) [2]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کے لئے کہنا آنے والے شخص کے لئے تو جائز نہیں، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ اس کا کہنے والا امیرِ مجلس، یا مجلس کا انتظام کرنے والے افراد ہو سکتے ہیں، تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اگر میرِ مجلس یا اس کی طرف سے مقرّر کردہ منتظمین کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کے لئے کہیں تو اَدبِ مجلس یہ ہے کہ اُن سے مزاحمت نہ کرے، اپنی جگہ سے اُٹھ جائے، کیونکہ بعض اوقات خود صاحبِ مجلس کسی ضرورت سے خلوَت اِختیار کرنا چاہتا ہے، یا کچھ مخصوص لوگوں سے کوئی راز کی بات کرنا چاہتا ہے، یا بعد میں آنے والے حضرات کے لئے اس کے سوا کوئی انتظام نہیں پاتا کہ بعض بے تکلف لوگوں کو مجلس سے اُٹھا دے جن کے متعلق معلوم ہو کہ ان کا کوئی نقصان مجلس سے اُٹھنے میں نہیں ہوگا، یہ

---

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۲۲، وصحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشًا ولا متفحشًا، ج:۲ ص:۸۹۱

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۱۴۶، وصحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ ...إلخ، ج:۲ ص:۹۲۷، وصحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم إقامة الإنسان من موضعه المباح الذی سبق إلیه، ج:۲ ص:۲۱۷، ومسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما، رقم الحدیث: ۴۶۵۹

دُوسرے وقت میں اِستفادہ کرسکیں گے۔

البتہ صاحبِ مجلس یا منتظمینِ مجلس کے لئے یہ لازم ہے کہ طریقہ ایسا اِختیار کریں کہ اُٹھنے والا اپنی خفت محسوس نہ کرے، اس کو اِیذا نہ پہنچے۔

اور جس واقعے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، یہ جگہ حاضرین سے پُر ہوچکی تھی، بعد میں بعض اکابرِ صحابہ جو شرکائے بدر ہونے کے سبب قابلِ احترام زیادہ تھے، وہ پہنچے اور جگہ نہ ہونے کے سبب کھڑے رہے، اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو عام حکم یہ دیا کہ ذرا کھسک کر مجلس میں کشادگی پیدا کرو اور اُن کو جگہ دے دو، اور بعض حضراتِ صحابہ کو اُٹھ جانے کے لئے بھی فرمایا، جن کو مجلس سے اُٹھایا ان میں یہ بھی اِحتمال ہے کہ وہ ہر وقت کے حاضر باش لوگ ہوں جن کے اس وقت کی مجلس سے اُٹھ جانے میں کوئی بڑا نقصان نہیں تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے جب مجلس میں وسعت کرنے اور سمٹ کر بیٹھنے کا حکم دیا تو کچھ لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا، اُن کو تأدیباً مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔

بہرحال اس آیت اور اَحادیثِ واردہ سے آدابِ مجلس کے متعلق ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اہلِ مجلس کو چاہئے کہ بعد میں آنے والوں کو جگہ دینے کی کوشش کریں، اور دُوسری بات آنے والوں کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ کسی کو اس کی جگہ سے نہ اُٹھائیں، تیسری بات صاحبِ مجلس کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ ضرورت سمجھے تو بعض لوگوں کو مجلس سے اُٹھا دینے کی بھی اس کو گنجائش ہے، اور بعض دُوسری روایاتِ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والوں کے لئے ادب یہ ہے کہ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں گھسنے کے بجائے کسی کنارے پر بیٹھ جائے، جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین آنے والے شخصوں کا ذِکر ہے، ان میں ایک وہ بھی ہے جو مجلس میں جگہ نہ پانے کی وجہ سے ایک گوشے میں بیٹھ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پھر تعریف و ثنا فرمائی۔ [1]

مسئلہ:- مجلس کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان بغیر اُن کی اجازت کے داخل نہ ہو، کہ بعض اوقات دونوں کے یکجا بیٹھنے میں اُن کی کوئی خاص مصلحت ہوتی ہے۔ حضرت اُسامہ بن زید لیثیؓ کی روایت ابوداؤد و ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا'' یعنی ''کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ دو شخص جو ملے بیٹھے ہیں، اُن کے درمیان تفریق پیدا کرے جب تک کہ ان سے ہی اجازت نہ ملے۔ (ابنِ کثیر) [2]

---

[1] صحيح البخارى، كتاب العلم، باب من قعد حيث ينتهي به المجلس ...إلخ، ج:١ ص:١٥

[2] تفسير ابن كثير ج:٨ ص:٤٨، وسنن ابى داود، كتاب الأدب، باب في الرجل يجلس بين الرجلين بغير إذنهما، ج:٢ ص:٢٦٥، وجامع الترمذى، ابواب الأدب، باب ما جاء في كراهية الجلوس بين الرجلين بغير إذنهما، ج:٢ ص:١٠٤

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ الآیۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم واصلاحِ خلق کے کام میں تو شب وروز مشغول رہتے ہی تھے، مجالسِ عامہ میں سب حاضرینِ مجلس آپ کے ارشادات سے فائدہ اُٹھاتے تھے، اس سلسلے میں ایک صورت یہ بھی تھی کہ بعض لوگ آپ سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہتے اور آپ وقت دے دیتے تھے، یہ ظاہر ہے کہ ایک ایک شخص کو الگ وقت دینا بڑا وقت بھی چاہتا ہے اور محنت بھی، اس میں کچھ منافقین کی شرارت بھی شامل ہوگئی کہ مخلص مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی اور سرگوشی کا وقت مانگتے اور اس میں مجلس کو طویل کردیتے تھے، بعض ناواقف مسلمان بھی بات لمبی کر کے مجلس طویل کردیتے تھے، حق تعالیٰ نے آپ سے یہ بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ابتداءً یہ حکم نازل فرمایا کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ کردے۔ اس صدقے کی کوئی مقدار قرآن میں منقول نہیں، مگر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے اس پر عمل فرمایا، اور ایک دینار صدقہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں بات کرنے کا وقت لیا۔

اس آیت پر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا تھا، پھر منسوخ ہوگئی اور کسی کو عمل کی نوبت نہیں آئی

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس حکم سے چونکہ بہت سے صحابہ کرام کو تنگی پیش آئی اس لئے بہت جلد ہی منسوخ کردیا گیا، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں ایک آیت ایسی ہے جس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا، نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا، اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا۔[1] پہلے نہ کرنا تو ظاہر ہے، بعد میں نہ کرنا اس لئے کہ منسوخ ہوگئی وہ آیت یہی تقدیم صدقہ کی ہے۔ (ابن کثیر)[2]

یہ حکم اگرچہ منسوخ ہوگیا مگر جس مصلحت کے لئے جاری کیا گیا تھا وہ اس طرح حاصل ہوگئی کہ مسلمان تو اپنی دِلی محبت کے تقاضے سے ایسی مجلس طویل کرنے سے بچ گئے، اور منافقین اس لئے کہ عام مسلمانوں کے طرز کے خلاف ہم نے ایسا کیا تو ہم پہچان لئے جائیں گے اور نفاق کھل جائے گا۔ واللہ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ

کیا تو نے نہ دیکھا اُن لوگوں کو جو دوست ہوئے ہیں اس قوم کے جن پر غصہ ہوا ہے اللہ، نہ وہ تم میں ہیں

[1] مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث: ۳۲۱۲۵

[2] تفسیر ابن کثیر ج: ۸ ص: ۵۰

وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ

اور نہ اُن میں ہیں، اور قسمیں کھاتے ہیں جھوٹ بات پر اور ان کو خبر ہے، تیار رکھا ہے اللہ نے اُن کے لئے

عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

سخت عذاب، بے شک وہ بُرے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔ بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو

جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ

ڈھال، پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے تو ان کو ذِلت کا عذاب ہے، کام نہ آئیں گے ان کو

اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ

اُن کے مال اور نہ اُن کی اولاد اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی، وہ لوگ ہیں دوزخ کے،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ

وہ اسی میں پڑے رہیں گے۔ جس دن جمع کرے گا اللہ ان سب کو، پھر قسمیں کھائیں گے اُس کے آگے جیسے کھاتے ہیں

لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ

تمہارے آگے، اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ کچھ بھلی راہ پر ہیں، سنتا ہے وہی ہیں اصل جھوٹے۔ قابو کرلیا ہے

عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰـىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ

اُن پر شیطان نے، پھر بھلادی اُن کو اللہ کی یاد، وہ لوگ ہیں گروہ شیطان کا، سنتا ہے

اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ

جو گروہ ہے شیطان کا وہی خراب ہوتے ہیں۔ جو لوگ خلاف کرتے ہیں اللہ کا اور اس کے رسول کا،

أُولٰٓئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ ط إِنَّ اللّٰهَ

وہ لوگ ہیں سب سے بے قدر لوگوں میں، اللہ لکھ چکا کہ میں غالب ہوں گا اور میرے رسول، بے شک اللہ

قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ

زورآور ہے زبردست۔ تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں

مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ أَوْ أَبْنَآءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے، خواہ وہ اپنے باپ ہوں، یا اپنے بیٹے، یا اپنے بھائی،

أَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْإِيْمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط

یا اپنے گھرانے کے، اُن کے دِلوں مین اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان اور اُن کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے،

وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط

اور داخل کرے اُن کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، ہمیشہ رہیں اُن میں،

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ

اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی، وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا، سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع

وہی مراد کو پہنچے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے اُن کو نہیں دیکھا جنھوں نے ایسے لوگوں کو دوست بنایا ہوا ہے جن پر اللہ کا غضب ہے؟ یہ نہ تو تمہارے

ہیں، اور نہ اُن کے، اور یہ جانتے بوجھتے جھوٹی باتوں پر قسمیں کھا جاتے ہیں۔ ⑭ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت بُرے ہیں وہ کام جو یہ کرتے رہے ہیں۔ ⑮ انہوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنالیا ہے، پھر وہ دُوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ایسا عذاب ہے جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ ⑯ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں اُن کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ یہ دوزخ والے لوگ ہیں۔ یہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ ⑰ جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا تو اُس کے سامنے بھی یہ اُسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے کھاتے ہیں، اور یہ سمجھیں گے کہ انہیں کوئی سہارا مل گیا ہے۔ یاد رکھو یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔ ⑱ ان پر شیطان نے پوری طرح قبضہ جما کر انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ شیطان کا گروہ ہے۔ یاد رکھو شیطان کا گروہ ہی نامراد ہونے والا ہے۔ ⑲ بیشک جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل ترین لوگوں میں شامل ہیں۔ ⑳ اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب آئیں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ بڑی قوت والا، بڑے اِقتدار والا ہے۔ ㉑ جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو تم ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ اُن سے دوستی رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی ہے، چاہے وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے خاندان والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دِلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے، اور اپنی رُوح سے اُن کی مدد کی ہے، اور اُنہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہو گیا ہے، اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔ ㉒

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے (پہلے لوگوں سے مراد منافقین ہیں، اور دُوسرے لوگوں سے مراد یہود و جمیع کفار مجاہرین، اور منافقین چونکہ یہودی تھے اس لئے اُن کی دوستی یہود سے اور اسی طرح اور کفار سے بھی مشہور اور معلوم ہے) یہ (منافق) لوگ نہ تو (پورے پورے) تم میں ہیں اور نہ (پورے پورے) اُن ہی میں (بلکہ ظاہر میں تو تم سے ملے ہوئے ہیں، اور باطناً وعقیدۃً کفار کے ساتھ ہیں) اور جھوٹی بات پر قسمیں کھا جاتے ہیں (وہ جھوٹی بات یہی ہے کہ ہم مسلمانوں میں شامل ہیں، کقولہ تعالیٰ: وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ [1] (التوبۃ:۵۶)) اور وہ (خود بھی) جانتے ہیں (کہ ہم جھوٹے ہیں، آگے اُن کے لئے وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے (کیونکہ) بے شک وہ بُرے بُرے کام کیا کرتے تھے (چنانچہ کفر

[1] ترجمہ: اور یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں کے ہیں حالانکہ وہ تم میں کے نہیں۔

ونفاق سے بدتر کون سا کام ہوگا؟ اور انہی بُرے کاموں میں سے ایک بُرا کام یہ ہے کہ) انہوں نے اپنی (ان جھوٹی) قسموں کو (اپنے بچاؤ کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (تاکہ مسلمان ہم کو مسلمان سمجھ کر ہماری جان و مال سے تعرض نہ کریں) پھر (اوروں کو بھی) خدا کی راہ (یعنی دِین) سے روکتے رہتے ہیں (یعنی بہکاتے رہتے ہیں) سو (اس وجہ سے) اُن کے لئے ذِلت کا عذاب ہونے والا ہے (یعنی وہ عذاب جیسا شدید ہوگا ایسا ہی ذلیل کرنے والا بھی ہوگا، اور جب وہ عذاب ہونے لگے گا تو) اُن کے اموال اور اولاد اللہ (کے عذاب) سے اُن کو ذرا نہ بچاسکیں گے (اور) یہ لوگ دوزخی ہیں (اس میں تعیین فرما دی اُس عذابِ شدید و مہین کی کہ وہ دوزخ ہے اور) وہ لوگ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (آگے وقت عذاب کا بتلاتے ہیں کہ وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (مع دیگر مخلوقات کے) دوبارہ زندہ کرے گا، سو یہ اس کے رُوبرو بھی (جھوٹی) قسمیں کھا جائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں (جیسا مشرکین کی جھوٹی قسم قیامت کے دن اس آیت میں مذکور ہے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ [۱] (الانعام)) اور یوں خیال کریں گے کہ ہم کسی اچھی حالت میں ہیں (کہ اس جھوٹی قسم کی بدولت بچ جائیں گے) خوب سن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں (کہ خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے نہ چوکے، اور ان کی جو حرکات اُوپر مذکور ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ) اُن پر شیطان نے پورا تسلط کرلیا ہے (کہ اس کے کہنے پر عمل کررہے ہیں) سو اُس نے اُن کو خدا کی یاد بھلا دی (یعنی اس کے اَحکام کو چھوڑ بیٹھے، واقعی) یہ لوگ شیطان کا گروہ ہے، خوب سن لو کہ شیطان کا گروہ ضرور برباد ہونے والا ہے (آخرت میں تو ضرور، اور گاہے دُنیا میں بھی، اور ان کی یہ حالت کیوں نہ ہو کہ یہ اللہ اور رسول کے مخالف ہیں، اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) سخت ذلیل لوگوں میں ہیں (جب اللہ کے نزدیک ذلیل ہیں تو آثارِ مذکورہ کا ترتب کیا مستبعد ہے اور جس طرح خدا تعالیٰ نے ان کے لئے ذِلت تجویز فرما رکھی ہے، اسی طرح مطیعین کے لئے عزّت، کیونکہ وہ لوگ اللہ اور رسولوں کے متبع ہیں اور) اللہ تعالیٰ نے یہ بات (اپنے حکمِ اَزلی میں) لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے (جو کہ حقیقت ہے عزّت کی، مقصود یہاں غلبہ بیان کرنا ہے انبیاء کا، اپنا ذِکر تشریفِ انبیاء کے لئے فرما دیا، پس جب رُسل ذِی عزّت ہیں تو ان کے متبعین بھی، اور معنی غلبہ کے سورۂ مائدہ کی آیت: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ [۲] اور سورۂ مؤمن کی آیت: لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا...اِلخ [۳] (المؤمن:۵۱) کے ذیل میں گزر چکے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا غلبے والا ہے (اس لئے وہ جس کو چاہے غالب کردے، آگے دوستیٔ کفار میں

---

[۱] ترجمہ: قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔

[۲] ترجمہ: سو اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے۔

[۳] ترجمہ: ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔

منافقین کے حال کے خلاف اہلِ ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، آپ اُن کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ، یا بیٹے، یا بھائی، یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو، ان لوگوں کے دِلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان (کے قلوب) کو اپنے فیض سے قوّت دی ہے (فیض سے مراد نور ہے، یعنی مقتضائے ہدایت پر ظاہراً عمل و باطناً سکونِ قلب، وَھُوَ الْمَذْکُوْرُ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی: فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ [1] (الزمر:۲۲)، چونکہ یہ نور سبب ہے زیادتِ حیاتِ معنویہ کا، اس لئے اس کو رُوح سے تعبیر فرمایا، یہ دولت تو ان کو دُنیا میں ملی، کقولہٖ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ [2] (البقرۃ:۵)) اور (آخرت میں اُن کو یہ نعمت ملے گی کہ) اُن کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے، خوب سن لو! کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے (کقولہٖ تعالیٰ: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ [3] (البقرۃ) بعد قولہ: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرۃ:۵))۔

معارف و مسائل

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ان آیات میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی بدحالی اور انجامِ کار عذابِ شدید کا ذِکر فرمایا ہے جو اللہ کے دُشمنوں کافروں سے دوستی رکھیں، کفار خواہ مشرکین ہوں یا یہود و نصاریٰ، یا دُوسرے اقسام کے کفار، کسی مسلمان کے لئے دِلی دوستی کسی سے جائز نہیں، اور وہ عقلاً ہو بھی نہیں سکتی، کیونکہ مؤمن کا اصل سرمایہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، کفار اللہ تعالیٰ کے مخالف اور دُشمن ہیں، اور جس شخص کے دِل میں کسی شخص کی سچی محبت اور دوستی ہو اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کے دُشمن سے بھی محبت اور دوستی رکھے، اسی لئے قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں موالاتِ کفار کی شدید حرمت و ممانعت کے اَحکام آئے ہیں، اور جو مسلمان کسی کافر سے دِلی دوستی رکھے تو اس کو کفار ہی کے زُمرے میں شامل سمجھے جانے کی وعید آئی ہے، لیکن یہ سب اَحکام دِلی اور قلبی دوستی کے متعلق ہیں۔

کفار کے ساتھ حسنِ سلوک، ہمدردی، خیرخواہی، اُن پر اِحسان، حسنِ اخلاق سے پیش آنا، یا تجارتی اور اِقتصادی معاملات اُن سے کرنا، دوستی کے مفہوم میں داخل نہیں، یہ سب اُمور کفار کے ساتھ بھی جائز ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ترجمہ: اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

[2] ترجمہ: بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر۔

[3] ترجمہ: اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔

اور صحابۂ کرام کا کھلا ہوا تعامل اس پر شاہد ہے، البتہ ان سب چیزوں میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ ان کے ساتھ ایسے معاملات رکھنا اپنے دِین کے لئے مضر نہ ہو، اپنے ایمان اور عمل میں سستی پیدا نہ کرے، اور دُوسرے مسلمانوں کے لئے بھی مضر نہ ہو۔

اس مسئلے میں موالات اور مواسات اور معاملات کے فرق کی پوری تفصیل سورۂ آلِ عمران آیت: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ [۱] (آل عمران:۲۸) کے تحت معارف القرآن، جلد دوم صفحہ: ۶۵ تا ۷۰ میں گزر چکی ہے، وہاں مطالعہ کرلیا جائے۔

وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ، بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی اور عبداللہ بن نَبْتَل منافق کے بارے میں نازل ہوئی، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ تشریف رکھتے تھے تو فرمایا کہ اب تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جس کا قلب قلبِ جبار ہے اور جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کے بعد ہی عبداللہ بن نَبْتَل منافق داخل ہوا جو نیلگوں چشم، گندم گوں، پست قد، خفیف اللحیہ تھا، آپ نے اس سے فرمایا کہ تم اور تمہارے ساتھی مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو؟ اس نے حلف کرکے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، پھر اپنے ساتھیوں کو بھی بلالیا، انہوں نے بھی یہ جھوٹا حلف کرلیا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کے جھوٹ کی خبر دے دی۔ (قرطبی) [۲]

مسلمان کی دِلی دوستی کسی کافر سے نہیں ہوسکتی

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ الآیۃ، پہلی آیات میں کفار ومشرکین سے دوستی کرنے والوں پر غضبِ الٰہی اور عذابِ شدید کا ذِکر تھا، اس آیت میں مؤمنینِ مخلصین کا حال اُن کے مقابل بیان فرمایا کہ وہ کسی ایسے شخص سے دوستی اور دِلی تعلق نہیں رکھتے جو اللہ کا مخالف یعنی کافر ہے، اگرچہ وہ ان کا باپ یا اولاد یا بھائی یا اور قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

صحابۂ کرام سبھی کا حال یہ تھا، اس جگہ مفسرین نے بہت سے صحابۂ کرام کے واقعات ایسے بیان کئے ہیں جن میں باپ بیٹے، بھائی وغیرہ سے جب کوئی بات اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سنی تو سارے تعلقات کو بھلا کر اُن کو سزا دِی، بعض کو قتل کیا۔

عبداللہ بن اُبیّ منافق کے بیٹے عبداللہؓ کے سامنے اس کے منافق باپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں

[۱] ترجمہ: مسلمانوں کو چاہئے کہ کفار کو دوست نہ بناویں۔
[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۳۰۳

گستاخانہ کلمہ بولا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ میں اپنے باپ کو قتل کردوں، آپ نے منع فرمادیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے اُن کے باپ ابوقحافہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ کلمۂ گستاخانہ کہہ دیا تو اَرحمِ اُمت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو اتنا غصہ آیا کہ زور سے طمانچہ رسید کیا، جس سے ابوقحافہ گر پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ [1] حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے والد جراح غزوۂ اُحد میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کے لئے آئے تو میدانِ جہاد میں وہ بار بار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آتے وہ ان کے درپے تھے، یہ سامنے سے ٹل جاتے، جب انہوں نے مسلسل یہ صورت اختیار کی تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اُن کو قتل کردیا۔ [2] یہ اور ان کے امثال بہت سے واقعات صحابۂ کرام کے پیش آئے، ان پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں۔ (قرطبی) [3]

مسئلہ:- بہت سے حضراتِ فقہاء نے یہی حکم فساق وفجار اور دین سے عملاً منحرف مسلمانوں کا قرار دیا ہے کہ اُن کے ساتھ دِلی دوستی کسی مسلمان کی نہیں ہوسکتی، کام کاج کی ضرورتوں میں اشتراک یا مصاحبت بقدرِ ضرورت الگ چیز ہے، دِل میں دوستی کسی فاسق وفاجر کی اسی وقت ہوگی جب کہ فسق وفجور کے جراثیم خود اس کے اندر موجود ہوں گے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دُعاؤں میں فرمایا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عَلَيَّ يَدًا" [4] یعنی "یا اللہ! مجھ پر کسی فاجر آدمی کا احسان نہ آنے دیجئے۔ کیونکہ شریف النفس انسان اپنے محسن کی محبت پر طبعاً مجبور ہوتا ہے، اس لئے فساق وفجار کا احسان قبول کرنا جو ذریعہ ان کی محبت کا بنے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی پناہ مانگی۔ (قرطبی) [5]

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یہاں **رُوح** کی تفسیر بعض حضرات نے نور سے کی ہے جو من جانب اللہ مؤمن کو ملتا ہے، اور وہی اس کے عملِ صالح کا اور قلب کے سکون واطمینان کا ذریعہ ہوتا ہے، اور یہ سکون واطمینان ہی بڑی قوت ہے، اور بعض حضرات نے **رُوح** کی تفسیر قرآن اور دلائلِ قرآن سے کی ہے، وہی مؤمن کی اصل طاقت وقوت ہے۔ (قرطبی) [6] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ بِحَمْدِهٖ وَعَوْنِهٖ لِغُرَّةِ جُمَادَى الْاُوْلٰى ۱۳۹۱ھ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَيَتْلُوْهُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى تَفْسِيْرُ سُوْرَةِ الْحَشْرِ

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۳۰۳
[2] مجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۱۴۹۰۹، باب مناقب ابی عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔
[3] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۳۰۷
[4] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۳۰۸
[5] کنز العمال، بألفاظ مختلفۃ، رقم الحدیث: ۳۸۱۰
[6] تفسیر القرطبی ج:۱۷ ص:۳۰۸ و۳۰۹

سورۃ الحشر

أیاتها ۲۴ | ۵۹ سُوْرَةُ الْحَشْرِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۱ | رکوعاتها ۳

سورۂ حشر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوبیس آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ

وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں ان کے گھروں سے۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ

پہلے ہی اجتماع پر لشکر کے، تم نہ اٹکل کرتے تھے کہ نکلیں گے وہ اور وہ خیال رکھتے تھے کہ ان کو بچالیں گے ان کے قلعے

مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ

اللہ کے ہاتھ سے، پھر پہنچا اُن پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا، اور ڈال دی اُن کے دِلوں میں دھاک،

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا

اُجاڑنے لگے اپنے گھر اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں، سو عبرت پکڑو

يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲ وَ لَوْلَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ

اے آنکھ والو! اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ لکھ دیا تھا اللہ نے اُن پر جلاوطن ہونا تو اُن کو عذاب دیتا

فِي الدُّنْيَا ۖ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ

دُنیا میں اور آخرت میں اُن کے لئے ہے آگ کا عذاب، یہ اس لئے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ سے

وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴ مَا قَطَعْتُمْ

اور اس کے رسول سے اور جو کوئی مخالف ہو اللہ سے تو اللہ کا عذاب سخت ہے، جو کاٹ ڈالا تم نے

مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ

کھجور کا درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر، سو اللہ کے حکم سے

وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

اور تاکہ رُسوا کرے نافرمانوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

آسمانوں اور زمین میں جو بھی کوئی چیز ہے، اُس نے اللہ کی تسبیح کی ہے، اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۱) وہی ہے جس نے اہلِ کتاب میں سے کافر لوگوں کو اُن کے گھروں سے پہلے اجتماع کے موقع پر نکال دیا۔ (مسلمانو!) تمہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اُن کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے۔ پھر اللہ اُن کے پاس ایسی جگہ سے آیا جہاں اُن کا گمان بھی نہیں تھا، اور اللہ نے اُن کے دِلوں میں رُعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اُجاڑ رہے تھے۔ لہٰذا اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرلو۔ (۲) اور اگر اللہ نے اُن کی قسمت میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو وہ دُنیا ہی میں اُن کو عذاب دے دیتا، البتہ آخرت میں اُن کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔ (۳) یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے دُشمنی ٹھانی، اور جو شخص اللہ سے دُشمنی کرتا ہے، تو اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۴) تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے، یا اُنہیں اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے تھا، اور اس لئے تھا تاکہ اللہ نافرمانوں کو رُسوا کرے۔ (۵)

ربطِ سورت اور شانِ نزول

پچھلی سورت میں یہود کی دوستی جو منافقین نے اختیار کر رکھی تھی، اس کی مذمت کا بیان تھا، اس سورت میں یہود پر دُنیا میں جلاوطنی کی سزا اور آخرت کا عذاب مذکور ہے۔ اور قصہ اُن یہود کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود سے معاہدہ صلح کا ہو چکا تھا، اور ان یہودیوں کے مختلف قبائل میں ایک قبیلہ بنو نضیر کا تھا، وہ بھی معاہدۂ صلح میں داخل تھا، اور یہ لوگ مدینہ طیبہ سے دو میل پر رہتے تھے، ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہو گئے تھے، جس کا خون بہا سب کو مل کر ادا کرنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلمانوں سے اس کے لئے چندہ حاصل کیا، پھر یہ ارادہ ہوا کہ یہود بھی از رُوئے صلح نامہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں، خون بہا کی رقم میں اُن کو بھی شریک کیا جائے، اس کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبیلۂ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے یہ سازش کی کہ آپ کو قتل کر دینے کا موقع ہمارے ہاتھ آگیا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھلا دیا، اور کہا کہ ہم خون بہا کی رقم جمع کرنے کا انتظام کرتے ہیں، اور خفیہ مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جس دیوار کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں، کوئی شخص اُوپر چڑھ کر کوئی بڑا بھاری پتھر آپ کے اُوپر چھوڑ دے کہ آپ کا کام تمام ہو جائے۔ آپ کو فوراً بذریعہ وحی اُن کی

یہ سازش معلوم ہوگئی، آپ وہاں سے اُٹھ کر واپس تشریف لائے اور ان سے کہلا بھیجا کہ تم نے عہد شکنی کر کے صلح توڑ دی اس لئے اب تمہیں دس روز کی مہلت دی جاتی ہے، اس میں تم جہاں چاہو چلے جاؤ، اس مدّت کے بعد جو شخص یہاں نظر آئے گا اس کی گردن مار دی جائے گی۔ انہوں نے چلے جانے کا ارادہ کیا، تو عبداللہ بن اُبَیّ منافق نے اُن کو روکا کہ کہیں نہ جاؤ، میرے پاس دو ہزار آدمیوں کی جمعیت ہے جو اپنی جان دے دیں گے، تم پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ اور ''رُوح المعانی'' میں ابنِ اسحاق کی روایت سے اس میں عبداللہ کے ساتھ ودیعہ بن مالک اور سوید اور رَاعس کا شریک ہونا بھی لکھا ہے۔ [1] یہ لوگ اُن کے کہنے میں آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجئے! آپ صحابۂ کرام کے ساتھ اس قبیلے پر حملہ آور ہوئے، اور یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے، اور منافقین منہ چھپا کر بیٹھ گئے، آپ نے ان کا محاصرہ کر لیا، اور ان کے درخت جلوا دیئے، کچھ کٹوا دیئے، آخر تنگ آ کر انہوں نے جلاوطن ہونا منظور کر لیا، آپ نے اس حال میں بھی ان کے ساتھ یہ رعایت کی کہ حکم دے دیا کہ جتنا سامان تم ساتھ لے جا سکتے ہو، لے جاؤ، بجز ہتھیار کے، وہ ضبط کر لئے جائیں گے۔ یہ لوگ نکل کر کچھ شام میں چلے گئے، کچھ خیبر میں، اور حرصِ دُنیا کی وجہ سے اپنے گھروں کی کڑیاں، تختے، کواڑ تک اُکھاڑ کر لے گئے، اور یہ قصہ غزوۂ اُحد کے بعد ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو دُوسرے یہود کے ساتھ ملکِ شام کی طرف نکال دیا، یہ دونوں جلاوطنی حشرِ اوّل اور حشرِ ثانی کہلاتی ہیں، کذا فی زاد المعاد۔ [2]

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اس کی علوِشان اور قدرت اور حکمت کا ایک اثر یہ ہے کہ) وہی ہے جس نے (ان) کفار اہلِ کتاب (یعنی بنی نضیر) کو اُن کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا (یعنی بقول زہری اس کے قبل اُن پر یہ مصیبت واقع نہ ہوئی تھی، یہ مصیبت اُن پر پہلی بار ہی آئی ہے جو اُن کی حرکاتِ شنیعہ کا ثمرہ ہے۔ اور اس میں ایک لطیف اشارہ ہے ایک پیشین گوئی کی طرف کہ اُن کے لئے پھر بھی ایسا اتفاق ہوگا، چنانچہ دوبارہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا، کذا فی الخازن۔ [3] اور اشارہ کو لطیف اس لئے کہا گیا کہ لفظ اوّل ہمیشہ مقتضی نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی ثانی بھی

[1] روح المعاني تحت هٰذه الآية ج:۲۰ ص:۴۳۲

[2] زاد المعاد، كتاب الجهاد والمغازي والسّرايا والبعوث، فصل نقض بني النضير العهد ج:۳ ص:۱۱۵۔

[3] تفسير الخازن تحت هٰذه الآية، ج:۶ ص:۷۰

ہو، چنانچہ بولتے ہیں فلاں عورت کے پہلی ہی بار بچہ پیدا ہوا ہے، ان کا گھروں سے نکال دینا مسلمانوں کی طاقت اور غلبہ کا اثر تھا، آگے اس کی تقریر ہے کہ اے مسلمانو! ان کا سامان وشوکت دیکھ کر) تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ (کبھی اپنے گھروں سے) نکلیں گے اور (خود) انہوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ (کے انتقام) سے بچالیں گے (یعنی اپنے قلعوں کے اِستحکام پر ایسے مطمئن تھے کہ اُن کے دل میں انتقامِ غیبی کا خطرہ بھی نہ آتا تھا، پس اُن کی حالت مشابہ اس شخص کے تھی جس کا یہ گمان ہو کہ ان کے قلعے اللہ کی گرفت سے بچالیں گے، اور اگر خاص قبیلہ بنونضیر کے قلعے متعدد نہ ہوں تو حُصُوْنُهُمْ جمع کی ضمیر مطلق یہود کی طرف ہوگی، اور اَنَّهُمْ کی ضمیر بھی، اور صرف وَظَنُّوْٓا کی ضمیر بنی نضیر کی طرف ہوجائے گی، یعنی بنی نضیر کا یہ خیال تھا کہ سب یہود کو ان کے قلعے حوادث سے بچالیں گے، ان سب یہود میں یہ بھی آگئے، کہ اپنے قلعے کو اپنا محافظ سمجھتے تھے) سو اُن پر خدا (کا عِقاب) ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال (اور گمان) بھی نہ تھا، (مراد اس جگہ سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں نکالے گئے جن کی بے سروسامانی پر نظر کر کے اس کا اِحتمال بھی نہ تھا کہ یہ بے سامان ان باسامانوں پر غالب آجائیں گے) اور اُن کے دِلوں میں (اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا) رُعب ڈال دیا کہ (اس رُعب کی وجہ سے نکلنے کا قصد کیا اور اس وقت یہ حالت تھی کہ) اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اُجاڑ رہے تھے (یعنی خود بھی کڑی تختہ لے جانے کے واسطے اپنے مکانوں کو منہدم کرتے تھے اور مسلمان بھی اُن کے قلب کو صدمہ پہنچانے کے واسطے منہدم کرتے تھے، اور مسلمانوں کے منہدم کرنے کو بھی ان کی طرف منسوب اس لئے کیا کہ سبب اس اِنہدام کا وہی لوگ تھے، کیونکہ انہوں نے عہد شکنی کی اور وہ فعل یہود کا ہے، پس اسناد سبب کی طرف ہوگئی، اور مسلمانوں کا ہاتھ بمنزلہ آلہ کے ہوگیا) سو اے دانش مندو! (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو (کہ انجام خدا اور رسول کی مخالفت کا بعض اوقات دُنیا میں بھی نہایت بُرا ہوتا ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ اُن کی قسمت میں جلاوطن ہونا نہ لکھ چکتا تو اُن کو دُنیا ہی میں (قتل کی) سزا دیتا (جس طرح اُن کے بعد بنی قریظہ کے ساتھ معاملہ کیا گیا) اور (گو دُنیا میں عذابِ قتل سے بچ گئے لیکن) ان کے لئے آخرت میں دوزخ کا عذاب (تیار) ہے (اور) یہ (سزائے جلاوطنی دُنیا میں اور سزائے نار آخرت میں) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے (اور وہی مخالفت رسول کی بھی ہے) تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے (یہ مخالفت دو طرح کی ہوئی، ایک نقضِ عہد سے جس سے کہ سزائے جلاوطنی ہوئی، اور دُوسرے عدمِ ایمان سے جو سبب عذابِ آخرت کا ہے، آگے یہود کے ایک طعن کا جواب ہے جو درختوں کے کاٹنے اور جلانے کے باب میں کیا تھا کہ ایسا کرنا تو فساد ہے، اور فساد مذموم ہے، کذا فی الدر [1] ونیز بعض مسلمانوں نے باوجود اِجازت کے یہ سمجھ کر کہ ترکِ جائز جائز ہے، اور آخر میں یہ درخت مسلمانوں ہی کے ہوجائیں گے تو

---

[1] تفسیر الدرّ المنثور ج:۲ ص:۴۱۴

ان کا رہنا ہی بہتر ہے، نہیں کاٹے، اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ یہود کا دل دُکھے گا، کاٹ دیئے، کذا فی الدر، [۱] جواب کے ساتھ ان دونوں فعل کی بھی تصویب ہے پس ارشاد ہے کہ) جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے (اسی طرح جو جلا دیئے) یا ان کو ان کی جڑوں پر (بحالہا) کھڑا رہنے دیا سو (دونوں باتیں) خدا ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہیں اور تاکہ کافروں کو ذلیل کرے (یعنی دونوں فعل میں مصلحت ہے، چنانچہ ترک میں بھی مسلمانوں کی ایک کامیابی اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ یہ مسلمان اس کو برتیں گے، اور قطع کرنے اور جلا دینے میں بھی مسلمانوں کی دُوسری کامیابی یعنی ظہور آثارِ غلبہ اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ مسلمان ہماری چیزوں میں کیسے تصرفات کر رہے ہیں، پس دونوں امر جائز ہیں، اور حکمت پر مبنی ہونے کے سبب ان میں کوئی قباحت نہیں)۔

معارف ومسائل

سورۂ حشر کی خصوصیات اور قبیلۂ بنو نضیر کی تاریخ

سورۂ حشر پوری یہود کے قبیلۂ بنو نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے (قالہ ابن اسحاق)، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اس سورت کا نام ہی سورۂ بنی نضیر کہا کرتے تھے۔ (ابنِ کثیر) [۲] بنو نضیر یہود کا ایک قبیلہ ہے، جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہے، ان کے آباء واجداد تورات کے عالم تھے، جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور آپ کا حلیہ اور علامات مذکور تھیں، اور یہ کہ اُن کی ہجرت یثرب (مدینہ) کی طرف ہوگی، یہ خاندان اس طمع میں کہ خاتم الانبیاء کے ساتھ رہیں، شام سے مدینہ طیبہ منتقل ہوا تھا، ان کے موجودہ لوگوں میں بھی کچھ تورات کے عالم تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد علامات دیکھ کر پہچان بھی لیا تھا کہ یہ وہی خاتم الانبیاء ہیں، لیکن اُن کا خیال تھا کہ وہ آخری نبی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں اُن کے خاندان میں ہوں گے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے، تو اس حسد نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روک دیا، مگر دِل میں اُن کے اکثر لوگ آپ کے آخر الانبیاء ہونے کو جانتے پہچانتے تھے، اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی حیرت انگیز فتح اور مشرکین کی شکست دیکھ کر ان کا یہ یقین کچھ اور بڑھا بھی تھا، اس کا اِقرار ان کی زبانوں سے سنا بھی گیا، مگر اس ظاہری فتح وشکست کو حق وباطل کے پہچاننے کا معیار بنالینا ہی ایک بودی اور کمزور بنیاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جب اِبتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی، کچھ

[۱] تفسیر الدرّ المنثور ج:۲ ص:۴۱۴

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۶

حضراتِ صحابہ شہید ہوئے تو ان کا یقین متزلزل ہوگیا، اور اس کے بعد سے انہوں نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ ساز باز شروع کردی۔

اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر حکیمانہ سیاست کے مقتضا پر سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں اور شہر کے آس پاس کچھ یہود کے قبائل آباد تھے، ان سے معاہدۂ صلح اس پر کرلیا تھا کہ یہ لوگ نہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے اور نہ کسی جنگ کرنے والے کی اِمداد کریں گے، اگر ان پر کوئی حملہ آور ہوا تو مسلمان ان کی اِمداد کریں گے، صلح نامے میں اور بھی بہت سی دفعات تھیں جن کی تفصیل سیرت ابنِ ہشام وغیرہ میں مذکور ہے۔ [۱] اسی طرح یہود کے تمام قبائل کی جن میں بنونضیر بھی داخل تھے، مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلے پر اُن کی بستی اور مضبوط قلعے اور باغات تھے۔

غزوۂ اُحد تک تو یہ لوگ بظاہر اس صلح نامے کے پابند نظر آئے، مگر اُحد کے بعد انہوں نے غداری کی اور خفیہ خیانت شروع کردی، اس غدر وخیانت کی ابتدا اس سے ہوئی کہ بنونضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف غزوۂ اُحد کے بعد اپنے یہودیوں کے چالیس آدمیوں کے ایک قافلے کے ساتھ مکہ معظّمہ پہنچا اور یہاں کے کفارِ قریش جو غزوۂ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی نیت سے غزوۂ اُحد پر گئے تھے، اور اس میں بالآخر شکست کھا کر واپس ہو چکے تھے، اُن سے ملاقات کی، اور ان دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا ایک معاہدہ ہونا قرار پایا، جس کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ کعب بن اشرف اپنے چالیس یہودیوں کے ساتھ اور ان کے بالمقابل ابوسفیان اپنے چالیس قریشیوں کے ساتھ حرمِ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر یہ معاہدہ کیا کہ ہم ایک دُوسرے کا ساتھ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے۔

کعب بن اشرف اس معاہدے کے بعد مدینہ طیبہ واپس آیا تو جبرائیل امین علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ اور معاہدے کی تفصیل بتلادی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف کے قتل کا حکم جاری فرمادیا، چنانچہ محمد بن مسلمہ صحابی رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کردیا۔ [۲]

اس کے بعد بنونضیر کی مختلف خیانتیں اور سازشیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتی رہیں، جن میں ایک وہ واقعہ ہے جو اُوپر شانِ نزول کے عنوان سے لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، اور اگر فوری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی اس سازش پر مطلع نہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی سازشِ قتل میں کامیاب ہوجاتے، کیونکہ

[۱] سیرة ابنِ هشام، كتابه صلى الله عليه وسلم بين المهاجرين والأنصار وموادعة يهود، ج:۱ ص:۵۰۱ تا ۵۰۳

[۲] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب قتل كعب بن اشرف، ج:۲ ص:۵۷۶

جس مکان کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے بٹھایا تھا، اس کی چھت پر چڑھ کر ایک بڑا بھاری پتھر آپ کے سرِ مبارک پر چھوڑ دینے کا منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا، جو شخص اس منصوبے کو عملی صورت دینے والا تھا، اس کا نام عمر بن جحاش تھا، حق تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور یہ منصوبہ فیل ہو گیا۔

ایک عبرت

یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ بعد کے واقعے میں سارے ہی بنونضیر جلاوطن ہو کر مدینہ سے نکل گئے، مگر ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر محفوظ و مامون رہے، ان دو میں ایک یہی عمر بن جحاش تھے، دُوسرے اُن کے چچا یامین بن عمرو بن کعب تھے۔ (ابنِ کثیر) [1]

عمرو بن اُمیہ ضمری کا واقعہ

شانِ نزول کے واقعے میں جو یہ ذِکر آیا ہے کہ عمرو بن اُمیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہو گئے تھے، ان کا خون بہا جمع کرنے کی کوشش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے، اسی خون بہا کے سلسلے میں بنونضیر کا چندہ حاصل کرنے کے لئے آپ ان کی بستی میں تشریف لے گئے تھے، اس کا واقعہ اِبنِ کثیر نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی سازشیں اور مظالم کی داستان تو بہت طویل ہے، ان میں سے ایک واقعہ بیرِ معونہ کا تاریخِ اسلام میں معروف و مشہور ہے، کہ بعض منافقین و کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بستی میں تبلیغِ اسلام کے لئے صحابۂ کرام کی ایک جماعت بھیجنے کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابۂ کرام اُن کے ساتھ کئے، بعد میں حقیقت یہ کھلی کہ ان لوگوں نے یہ محض سازش کی تھی، ان سب کو گھیر کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے صرف عمرو بن اُمیہ ضمری کسی طرح نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے، جو بزرگ ابھی کفار کی یہ غدّاری اور خیانت اور اپنے انہتر بھائیوں کا بے دردی سے قتل دیکھ کر آ رہے تھے، اُن کا جذبہ کفار کے مقابلے میں کیا ہوگا؟ ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے، اتفاق یہ ہوا کہ مدینہ طیبہ واپس آنے کے وقت راستے میں ان کو دو کافروں سے سابقہ پڑا، انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا، بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں آدمی قبیلۂ بنی عامر کے تھے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح تھا۔

مسلمانوں کے معاہدات آج کل کے سیاسی لوگوں کے معاہدات تو ہوتے نہیں کہ پہلے ہی خلاف ورزی اور عہد شکنی کی راہیں تلاش کر لی جاتی ہیں، یہاں تو جو کچھ زبان یا قلم سے نکلتا تھا دِین و مذہب اور خدا تعالیٰ کے حکم کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کی پابندی لازمی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غلطی کا علم ہوا تو آپ نے اُصولِ شرعیہ کے مطابق ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۹

دونوں مقتولوں کی دیت (خون بہا) ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس کے لئے مسلمانوں سے چندہ کیا، اس میں بنونضیر کے پاس بھی چندے کے سلسلے میں جانا ہوا۔ (ابن کثیر) [1]

بنونضیر کو جلاوطن کرنے کے وقت اسلام اور مسلمانوں کی رواداری، موجودہ اہلِ سیاست کے لئے سبق آموز معاملہ

آج کے بڑے حکمران اور بڑی حکومتیں جو انسانی حقوق کے تحفظ پر بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں، اور اس کے لئے اِدارے قائم کرتے ہیں اور دُنیا میں تحفظِ حقوقِ انسانیت کے چودھری کہلاتے ہیں، ذرا اس واقعے پر نظر ڈالیں کہ بنونضیر کی مسلسل سازشیں، خیانتیں، قتلِ رسول کے منصوبے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے رہے، اگر آج کل کے کسی حکمران اور کسی سربراہِ مملکت کے سامنے آئے ہوتے تو ذرا دِل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا، آج کل تو زندہ لوگوں پر پیٹرول چھڑک کر میدان صاف کر دینا کسی بڑے اقتدار وحکومت کا بھی محتاج نہیں، کچھ غنڈے شریر جمع ہوجاتے ہیں اور یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، شاہانہ غیظ وغضب کے کرشمے کچھ اس سے آگے ہی ہوتے ہیں۔

مگر یہ حکومت خدا کی اور اس کے رسول کی ہے، جب خیانتیں اور غداریاں انتہا کو پہنچ گئیں تو اس وقت بھی ان کے قتلِ عام کا ارادہ نہیں فرمایا، اُن کے مال واسباب چھین لینے کا کوئی تصوّر نہیں تھا، بلکہ:-

۱- اپنا سب سامان لے کر صرف شہر خالی کر دینے کا فیصلہ کیا۔

۲- اور اس کے لئے بھی دس روز کی مہلت دی کہ آسانی سے اپنا سامان ساتھ لے کر اطمینان سے کسی دُوسرے مقام پر منتقل ہوجائیں، جب اس کی بھی خلاف ورزی کی تو فوجی اِقدام کی ضرورت پیش آئی۔

۳- اس لئے کچھ درخت تو جلائے گئے، کچھ کاٹے گئے کہ اُن پر اثر پڑے، مگر قلعے کو آگ لگادینے کا، یا اُن کے قتلِ عام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا گیا۔

۴- پھر جب مجبور ہوکر ان لوگوں نے شہر خالی کر دینا منظور کرلیا تو اس فوجی اِقدام کے باوجود ان کو یہ اِختیار دیا گیا کہ ایک اُونٹ پر جس قدر سامان ایک آدمی لے جاسکتا ہے لے جائے، اُسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکانوں کی کڑیاں، تختے، دروازے، کواڑ تک اُتار کر لادلئے۔

۵- اس ساز وسامان کے ساتھ منتقل ہونے والوں کو کسی مسلمان نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا، امن وعافیت اور

[1] تفسير ابن كثير ج:٨ ص:٥٨، وسيرة ابن هشام، خروج الرسول صلى الله عليه وسلم إلى بني نضير ليستعينهم في دية قتلى بن عامر وهمهم بالغدر به، ج:٢ ص:١٨٩

پورے اطمینان کے ساتھ سامان لے کر رُخصت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معاملات اس وقت کے ہیں جب کہ آپ کو اپنے دُشمن سے اِنتقام پورا پورا لے لینے کی مکمل قدرت وطاقت حاصل تھی، ان غدار، خائن، سازشی دُشمنوں کے ساتھ اُس وقت آپ کا یہ معاملہ، اسی کی نظیر ہے جو فتحِ مکہ کے بعد اپنے قدیمی دُشمنوں کے ساتھ آپ نے فرمایا۔

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ بنونضیر کی اس جلاوطنی کو قرآنِ کریم نے اوّل حشر فرمایا، حشر کے معنی اُٹھ جانے، کھڑے ہو جانے کے ہیں۔ اوّل حشر کہنے کی ایک وجہ خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکی ہے کہ یہ لوگ زمانۂ قدیم میں ایک جگہ آباد تھے، نقلِ مکانی اور جلاوطنی کا یہ واقعہ اُن کو پہلی بار پیش آیا، اور دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کا اصل حکم آگے یہ آنے والا تھا کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلموں سے خالی کرایا جائے، تا کہ وہ اسلام کا ایک مستحکم قلعہ بن سکے، اس کے نتیجے میں ایک دُوسرا حشر آئندہ بشکل جلاوطنی ہونے والا تھا، جو عملاً حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوا کہ ان میں سے جو لوگ منتقل ہو کر خیبر میں آباد ہو گئے تھے ان کو جزیرۃ العرب سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا، اس لحاظ سے بنونضیر کی یہ جلاوطنی پہلا حشر اور دُوسری جلاوطنی بعہدِ عمری دُوسرا حشر ہوا۔

فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ آ گیا ان کے پاس اللہ تعالیٰ اس انداز سے کہ ان کو اس کا گمان بھی نہ تھا، اللہ کے آنے سے مراد اس کے حکم اور حکم بردار فرشتوں کا آنا ہے۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ اُن کا اپنے مکانات کا اپنے ہاتھوں خراب کرنا تو اس طرح ہوا کہ اپنے دروازے، کواڑ ساتھ لے جانے کے لئے اُکھاڑے، اور مسلمانوں کے ہاتھوں اس طرح کہ جب یہ قلعہ بند تھے تو قلعے سے باہر مسلمانوں نے اُن پر اثر ڈالنے کے لئے درختوں اور مکانوں کو ویران کیا۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵ لفظ لِيْنَه کھجور کے ہر درخت یا عجوہ کے علاوہ باقی درختوں کے لئے بولا جاتا ہے، بنونضیر کے باغات کھجور کے تھے، جب قلعہ بند ہو گئے تو بعض صحابۂ کرام نے ان لوگوں کو غیظ دِلانے اور اُن پر رُعب ڈالنے کے لئے اُن کی کھجوروں کے چند درختوں کو کاٹ کر، یا جلا کر ختم کر دیا۔ اور بعض دُوسرے صحابۂ کرام نے خیال کیا کہ اِن شاء اللہ فتح ہماری ہوگی، اور یہ درخت اور باغات مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے، تو کیوں ان کو ضائع کیا جائے وہ ان کے کاٹنے یا جلانے سے باز رہے، یہ ایک رائے کا اِختلاف تھا، بعد میں جب آپس میں گفتگو ہوئی تو جن حضرات نے کچھ درخت کاٹے یا جلائے تھے اُن کو یہ فکر ہوئی کہ شاید ہم گناہگار ہو گئے کہ جو مال مسلمانوں کو ملنے والا تھا اُس کو نقصان پہنچایا، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، جس نے دونوں فریق کے عمل کو جائز و دُرست فرمایا، اور دونوں کو باذن اللہ میں داخل کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم درحقیقت اللہ ہی کا حکم ہوتا ہے، منکرینِ حدیث کے لئے تنبیہ

اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے، جلانے یا اُن کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عملوں کو باذن اللہ فرمایا ہے، حالانکہ قرآن کی کسی آیت میں دونوں میں سے کوئی بھی حکم مذکور نہیں، ظاہر تو یہ ہے کہ دونوں حضرات نے جو عمل کیا، وہ اپنے اِجتہاد سے کیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی ہو، مگر قرآن نے اس اجازت کو جو کہ ایک حدیث تھی اِذن اللہ قرار دے کر واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تشریعِ اَحکام کا اِختیار دِیا گیا ہے، اور جو حکم آپ جاری فرمادیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں داخل ہے، اس کی تعمیل قرآنی آیات کی تعمیل کی طرح فرض ہے۔

اِجتہادی اِختلاف کی دونوں جانبوں میں کسی کو گناہ نہیں کہہ سکتے

دُوسرا اہم اُصول اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ اِجتہادِ شرعی کی صلاحیت رکھتے ہیں، اگر ان کا اِجتہاد کسی مسئلے میں مختلف ہوجائے، ایک فریق جائز قرار دے اور دُوسرا ناجائز، تو عنداللہ یہ دونوں حکم دُرست اور جائز ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو گناہ و معصیت نہیں کہہ سکتے، اور اسی لئے ان پر نہی عن المنکر کا قانون جاری نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے کوئی جانب بھی منکرِ شرعی نہیں۔ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵ میں درختوں کے کاٹنے یا جلانے والوں کے عمل کی توجیہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی فساد میں داخل نہیں، بلکہ کفار کو ذلیل کرنے کے قصد سے موجبِ ثواب ہے۔

مسئلہ:- بحالتِ جنگ کفار کے گھروں کو منہدم کرنا یا جلانا، اسی طرح درختوں، کھیتوں کو برباد کرنا جائز ہے یا نہیں، اس میں ائمہ فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بحالتِ جنگ ان سب کاموں کا جائز ہونا منقول ہے، مگر شیخ ابنِ ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ جواز اس وقت میں ہے جب کہ اس کے بغیر کفار پر غلبہ پانا مشکل ہو، یا اس صورت میں جب کہ مسلمانوں کی فتح کا گمان غالب نہ ہو، تو یہ سب کام اس لئے جائز ہیں کہ ان سے کفار کی طاقت وشوکت کو توڑنا مقصود ہے، یا عدمِ فتح کی صورت میں اُن کے مال کو ضائع کرنا بھی ان کی قوت کو کمزور کردینے کے لئے اس میں داخل ہے۔ (مظہری)[1]

[1] تفسیر المظھری ج:۹ ص:۲۳۶، وفتح القدیر، کتاب السیر، باب کیفیة القتال، ج:۱۲ ص:۳۹۹

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ

اور جو مال کہ لوٹادیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے، سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے

وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

اور نہ اُونٹ، ولیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہے، اور اللہ

عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى

سب کچھ کرسکتا ہے، جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے

فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے،

كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ

تاکہ نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے، اور جو دے تم کو رسول سو لے لو

وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٧﴾ م وقف لازم

اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے،

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ

واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ

ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی اور مدد کرنے کو اللہ کی اور اس کے رسول کی، وہ لوگ

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ

وہی ہیں سچے۔ اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے سے وہ محبت کرتے ہیں

مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا

اس سے جو وطن چھوڑ کر آئے اُن کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دل میں تنگی اس چیز سے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ

اور مقدم رکھتے ہیں اُن کو اپنی جان سے اور اگرچہ ہو اپنے اُوپر فاقہ، اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے

فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ

تو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔ اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ

اے ربّ بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں، اور نہ رکھ

فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ ع

ہمارے دِلوں میں بیر ایمان والوں کا، اے ربّ! تو ہی ہے نرمی والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ نے اپنے رسول کو اُن کا جو مال بھی فَیۡ کے طور پر دِلوایا، اُس کے لئے تم نے نہ اپنے گھوڑے دوڑائے، نہ اُونٹ، لیکن اللہ اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے، تسلط عطا فرما دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ (۶) اللہ اپنے رسول کو (دُوسری) بستیوں سے جو مال بھی فَیۡ کے طور پر دِلوادے، تو وہ اللہ کا حق ہے، اور اُس کے رسول کا، اور قرابت داروں کا، اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا، تاکہ وہ مال صرف اُنہی کے درمیان گردش کرتا نہ رہ جائے جو تم میں

دولت مند لوگ ہیں۔ اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں، اُس سے رُک جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (۷) (نیز یہ مالِ فیئ) اُن حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جنہیں اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے بے دخل کیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے فضل اور اُس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں، اور اللہ اور اُس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں۔ (۸) (اور یہ مالِ فیئ) اُن لوگوں کا حق ہے جو پہلے ہی سے اس جگہ (یعنی مدینہ میں) اِیمان کے ساتھ مقیم ہیں، جو کوئی ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے، یہ اُس سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ اُن (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے، یہ اپنے سینوں میں اُس کی کوئی خواہش بھی محسوس نہیں کرتے، اور اُن کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے اُن پر تنگ دستی کی حالت گذر رہی ہو۔ اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ (۹) اور (یہ مالِ فیئ) اُن لوگوں کا بھی حق ہے جو ان (مہاجرین اور اَنصار) کے بعد آئے، وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرمائیے، اور ہمارے اُن بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے اِیمان لاچکے ہیں، اور ہمارے دِلوں میں اِیمان لانے والوں کے لئے کوئی بُغض نہ رکھئے۔ اے ہمارے پروردگار! آپ بہت شفیق، بہت مہربان ہیں۔'' (۱۰)

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر جو بیان ہوا، وہ تو بنی نضیر کی جانوں کے ساتھ معاملہ تھا) اور (ان کے اموال کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا بیان یہ ہے کہ) جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دِلوادیا سو (اس میں تم کو کوئی مشقت نہیں پڑی، چنانچہ) تم نے اس پر (یعنی اس کے حاصل کرنے پر) نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اُونٹ (مطلب یہ کہ نہ سفر کی مشقت ہوئی، کیونکہ مدینہ سے دو میل پر ہے، اور نہ قتال کی، اور برائے نام جو مقابلہ کیا گیا وہ غیر معتد بہ تھا، کذا فی الرُّوح۔[1] اس لئے اس مال میں تمہارا اِستحقاق تقسیم و تملیک کا نہیں، جس طرح مالِ غنیمت میں ہوتا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو (اپنے دُشمنوں میں سے) جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرمادیتا ہے (یعنی محض رُعب سے مغلوب کردیتا ہے، جس میں کسی کو کچھ مشقت اُٹھانی نہیں پڑتی، چنانچہ اُن رسولوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اَموالِ بنی نضیر پر اسی طرح مسلط فرمادیا، اس لئے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ اس میں مالکانہ تصرف کرنے کا مکمل اِختیار آپ کو ہی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (پس وہ جس طرح چاہے دُشمنوں کو مغلوب کرے، اور جس طرح چاہے اپنے رسول کو اِختیار اور تصرف دے، اور جیسا اموالِ بنی نضیر کا یہ حکم ہے اسی طرح) جو کچھ اللہ تعالیٰ (اسی طور

[1] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۴۱۶، تحت هذه الآیة۔

پر) اپنے رسول کو دُوسری بستیوں کے (کافر) لوگوں سے دِلوادے (جیسا باغِ فدک اور ایک جزو خیبر کا اسی طرح ہاتھ آیا) سو (اس میں بھی تمہارا کوئی اِستحقاق ملکیت کا نہیں، بلکہ) وہ (بھی) اللہ کا حق ہے (یعنی وہ جس طرح چاہے اس میں حکم دے جیسا کہ اور سب چیزوں میں اس کا اسی طرح کا حق ہے اور تخصیص حصر کے لئے نہیں) اور رسول کا (حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس مال میں مالکانہ تصرفات اپنی صوابدید سے کرنے کا اِختیار دے دیا ہے) اور (آپ کے) قرابت داروں کا (حق ہے) اور یتیموں کا (حق ہے) اور غریبوں کا (حق ہے) اور مسافروں کا (حق ہے یعنی یہ سب حسب صوابدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مال کے مصرف ہیں، اور ان میں بھی اِنحصار نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو اپنی رائے سے دینا چاہیں وہ بھی اس میں شامل ہے، اور مذکورہ اَقسام کا خاص طور پر ذِکر شاید اس لئے کیا گیا کہ اُن کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ جب شرکائے جہاد کا اس مال میں اِستحقاق نہیں تو یہ اَقسام جو شریکِ جہاد بھی نہیں، ان کا بھی حق نہیں ہوگا، مگر آیت میں اُن کا ذِکر خاص اوصاف یتیم، غریب، مسافر وغیرہ کے ساتھ کر کے اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے ان اوصاف کی وجہ سے اس مال کے مصرف باختیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں، جہاد کی شرکت سے اس کا تعلق نہیں، پھر ان اوصاف میں ایک وصف ذَوِی القربیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کا بھی ہے، ان کو اس مال میں سے اس لئے دیا جاتا تھا کہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار رہتے، ہر مشکل کے وقت کام آتے تھے، یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہوگیا، جیسا کہ سورۂ اَنفال میں اس کا بیان آچکا ہے، اور یہ حکم مذکور اس لئے مقرّر کر دیا) تاکہ وہ (مال فئی) تمہارے مال داروں کے قبضے میں نہ آجائے (جیسا جاہلیت میں سب غنائم ومحاصل جنگ اصحابِ اِقتدار رکھا جاتے تھے اور فقراء بالکل محروم رہ جاتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کی رائے پر رکھا اور مصارف بھی بتلادیئے کہ آپ باوجود مالک ہونے کے پھر بھی اہلِ حاجت ومواقع مصلحتِ عامہ میں صرف فرمادیں گے) اور (جب یہ معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ہونے میں حکمت ہے تو) رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں تم رُک جایا کرو (اور بعمومِ الفاظ یہی حکم ہے تمام افعال واَحکام میں بھی) اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے (اور یوں تو فئی میں مطلقاً سب مساکین کا حق ہے، لیکن) ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے (جبراً وظلماً) جدا کر دیئے گئے (یعنی کفار نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور اس ہجرت سے) وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں (کسی دُنیوی غرض سے ہجرت نہیں کی) اور وہ (لوگ) اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں (اور) یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں اور (نیز) ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دارُ الاسلام (یعنی مدینہ) میں اور اِیمان میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں (مراد اس سے انصاری حضرات ہیں،

اور مدینہ میں اُن کا پہلے قرار پکڑنا تو ظاہر ہے کہ وہ یہیں کے باشندے تھے، اور ایمان میں پہلے قرار پکڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب انصار کا ایمان سب مہاجرین سے مقدم ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ مہاجرین کے مدینہ میں آنے سے پہلے ہی یہ حضرات مشرف باسلام ہو چکے تھے، خواہ اصل ایمان ان کا بعض مہاجرین کے ایمان سے مؤخر ہی ہو) جو اُن کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو (مالِ غنیمت وغیرہ میں سے) جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار بوجہ محبت کے) اپنے دِلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں کہ اِطعام وغیرہ میں ان کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو (یعنی خود بسا اوقات فاقے سے بیٹھ رہتے ہیں اور مہاجرین کو کھلا دیتے ہیں) اور (واقعی) جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے (جیسے یہ لوگ ہیں کہ حرص اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک رکھا ہے) ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اور ان لوگوں کا (بھی اس مالِ فئی میں حق ہے) جو (دارُ الاسلام میں، یا ہجرت میں، یا دُنیا میں) ان (مہاجرین وانصار مذکورین) کے بعد آئے (یا آئیں گے) جو دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں (خواہ نفسِ ایمان یا ایمانِ کامل کہ موقوف ہجرت پر تھا) اور ہمارے دِلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے (یہ دُعا متقدمین کے علاوہ معاصرین کو بھی شامل ہے) اے ہمارے ربّ آپ بڑے شفیق رحیم ہیں۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ الآیۃ، لفظ اَفَآءَ فَیْء سے مشتق ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اسی لئے دوپہر کے بعد جو چیزوں کا سایہ مشرق کی طرف لوٹتا ہے اس کو بھی فَیْء کہا جاتا ہے۔ اموالِ غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں، اُن سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اُن کے باغی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اموال بحقِ سرکار ضبط ہو جاتے ہیں، اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالکِ حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں، اس لئے اُن کے حاصل ہونے کو اَفَآءَ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے اموال کو فَیْء ہی کہا جاتا، مگر جو مال جہاد وقتال کے ذریعے حاصل ہوا اس میں انسانی عمل اور جد وجہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے، اس لئے اس کو تو لفظ غنیمت سے تعبیر فرمایا گیا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ [1] (الانفال: ۴۱) لیکن جس کے حصول میں جہاد وقتال کی بھی کوئی ضرورت نہ پڑی اس کو لفظ فَیْء سے تعبیر فرمایا گیا، اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ جو مال بغیر جہاد وقتال کے حاصل ہوا ہے وہ مجاہدین وغانمین میں مالِ غنیمت کے قانون کے مطابق تقسیم نہیں ہوگا، بلکہ اس میں کلی اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوگا،

[1] ترجمہ: اور اس بات کو جان لو کہ جو شے بطور غنیمت تم کو حاصل ہو۔

جس کو جتنا چاہیں عطا فرمادیں، یا اپنے لئے رکھیں، البتہ یہ پابندی لگادی گئی کہ چند اقسام مستحقین کی متعین کردی گئیں کہ اس مال کی تقسیم انہیں اقسام میں دائر رہنی چاہئے، اس کا بیان اگلی آیت میں اس طرح فرمایا: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى اس میں ''اَهْلِ الْقُرٰى'' سے مراد بنونضیر اور ان جیسے دُوسرے قبائل بنوقریظہ وغیرہ ہیں جن کے اموال بغیر قتال کے حاصل ہوئے، آگے مصارف و مستحقین کی پانچ قسمیں بتلائی گئی ہیں، جن کا بیان آگے آتا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں فَیْء کے اَحکام، اس کے مستحقین اور ان میں تقسیم کا طریقۂ کار بیان فرمایا ہے۔ سورۂ انفال کے شروع میں مالِ غنیمت اور فَیْء کا فرق واضح طور پر بیان ہوچکا ہے، کہ غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو کفار سے جہاد و قتال کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے، اور فَیْء وہ مال ہے جو بغیر جہاد و قتال کے ان سے حاصل ہو، خواہ اس طرح کہ وہ اپنا مال چھوڑ کر بھاگ گئے یا رضامندی سے بصورتِ جزیہ وخراج یا تجارتی ڈیوٹی وغیرہ کے ذریعے اُن سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی کچھ تفصیل شروع سورۂ اَنفال میں معارف القرآن جلد چہارم صفحہ: ۱۹۳ میں اور مزید تفصیل اسی سورۂ اَنفال کی آیت: ۴۱ کے تحت معارف القرآن جلد چہارم صفحہ: ۲۶۳ میں لکھی جاچکی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سورۂ اَنفال کی آیت: ۴۱ میں جو الفاظ خُمس غنیمت کے متعلق آئے ہیں، تقریباً وہی الفاظ یہاں مالِ فَیْء کے بارے میں ہیں، سورۂ اَنفال میں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔

ان دونوں آیتوں میں مال کے حق داروں میں چھ نام ذِکر کئے گئے: اللہ، رسول، ذَوِی القربیٰ، یتیم، مسکین، مسافر۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ تو دُنیا و آخرت اور تمام مخلوقات کا مالکِ حقیقی ہے، اس کا نام مبارک تو حصوں کے بیان میں محض تبرکاً اس فائدے کے لئے ہے کہ اس سے اس مال کی شرافت وفضیلت اور حلال وطیب ہونے کی طرف اشارہ ہوجائے، حسن بصری، قتادہ، عطاء، ابراہیم، شعبی اور عام مفسرین رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ (مظہری) [1]

اللہ جل شانہٗ کا نام ذِکر نے سے اس مال کی فضیلت وشرافت کی طرف اشارہ کس طرح ہوا اس کا تفصیلی بیان سورۂ اَنفال کی تفسیر میں ہوچکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے مال صدقہ جو مسلمانوں سے حاصل ہوتا ہے، وہ بھی حلال نہیں فرمایا، مالِ غنیمت اور جو کافروں سے حاصل ہو، اس پر یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیسے حلال ہوا؟ اس شبہ کا اِزالہ اللہ جل شانہٗ کا نام اس جگہ ذِکر کرکے اس طرح کیا گیا کہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے اپنے فضل سے ایک خاص قانون کے تحت انسانوں کو حقِ ملکیت دیا ہے، لیکن جو انسان باغی ہوجائیں ان کو صحیح راستے پر لانے کے لئے اوّل تو اَنبیاء علیہم السلام اور آسمانی ہدایات بھیجی گئیں، جو اُن سے بھی متاثر

[1] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۲۳۸

نہیں ہوئے ان کو یہ حق دیا گیا کہ کم از کم اسلامی قانون کی اطاعت قبول کرلیں اور مقررہ جزیہ وخراج اپنے مال میں سے حکومت کو ادا کیا کریں، جن لوگوں نے اس سے بھی بغاوت کی ان کے مقابلے میں جہاد وقتال کا حکم ہوگیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اُن کی جان اور مال قابلِ احترام نہیں، ان کے اموال بحق حکومتِ الٰہیہ ضبط ہوگئے، اور بذریعہ جہاد وقتال جو مال اُن سے حاصل ہوا، وہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں رہا، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی مِلک میں واپس ہوگیا، اور لفظ فَیْء میں اس مفہوم کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اس کے اصلی معنی لوٹنے ہی کے ہیں، اس مال کو فَیْء اس لئے کہا گیا کہ یہ اصل مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی طرف لوٹ گیا، اب اس میں کسی انسانی ملکیت کا کوئی دخل نہیں، اس کے بعد جن مستحقین کو اس میں کوئی حصہ دیا جائے گا یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، اس لئے ایسا ہی حلال طیب ہوگا جیسے پانی اور خود اُگنے والی گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا عطیہ انسان کے لئے ہے اور حلال طیب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس جگہ ذِکر کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سارا مال دراصل اللہ کا ہے، اس کی طرف سے مستحقین کو دِیا جاتا ہے، یہ کسی کا صدقہ وخیرات نہیں۔

اب مستحقین اور مصارف کل پانچ رہ گئے: ۱- رسول، ۲- ذَوِی القربیٰ، ۳- یتیم، ۴- مسکین، ۵- مسافر، یہی پانچ مصارف مالِ غنیمت کے خمس کے ہیں، جس کا بیان سورۂ اَنفال میں آیا ہے، اور یہی مصارف مال فَیْء کے ہیں، اور دونوں کا حکم یہ ہے کہ یہ سب اموال درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے مکمل اختیار میں ہوتے ہیں، وہ چاہیں تو ان سب اموال کو عام مسلمانوں کے مفاد کے لئے روک لیں، اور بیت المال میں جمع کردیں، کسی کو کچھ نہ دیں اور چاہیں تقسیم کردیں، البتہ تقسیم کئے جائیں تو ان پانچ اقسام میں دائر رہیں۔ (قرطبی) [1]

خلفائے راشدین اور دُوسرے صحابۂ کرام کے تعامل سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو مالِ فَیْء آپ کے اختیار میں تھا، آپ کی صواب دید کے مطابق صَرف کیا جاتا تھا، آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے اختیار اور صواب دید پر رہا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ اس مال میں رکھا گیا تھا، وہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا، ذَوِی القربیٰ کو اس مال میں سے دینے کی دو وجہ تھیں، ایک نصرتِ رسول، یعنی اسلامی کاموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا، اس لحاظ سے اغنیاء ذَوِی القربیٰ کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔

دُوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذَوِی القربیٰ پر مالِ صدقہ حرام کردیا گیا ہے، تو ان کے فقراء ومساکین کو صدقے کے بدلے میں مالِ فَیْء سے حصہ دیا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نصرت

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۸ ص:۱۵

وامداد کا سلسلہ ختم ہوگیا، تو یہ وجہ باقی نہ رہی، اس لئے اغنیائے ذَوِی القربیٰ کا حصہ بھی حصۂ رسول کی طرح ختم ہوگیا۔ البتہ فقرائے ذَوِی القربیٰ کا حصہ بحیثیت فقر واحتیاج کے اس مال میں باقی رہا، اور وہ اس مال میں دُوسرے فقراء ومساکین کے مقابلے میں مقدم رکھے جائیں گے۔ (کذا فی الهدایة) [۱] اس کی پوری تفصیل سورۂ انفال میں آچکی ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ دُوْلَةً بضم دال اُس مال کو کہا جاتا ہے جس کا آپس میں لین دین کیا جائے۔ (قرطبی) [۲] معنی آیت کے یہ ہیں کہ مالِ فَیء کے مستحقین اس لئے متعین کردیئے ''تاکہ یہ مال تمہارے مال داروں اور توانگروں میں گردش کرنے والی دولت نہ بن جائے۔'' اس میں اشارہ اس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کی طرف ہے جس میں اس طرح کے تمام اموال پر رئیس خود قابض ومالک ہوجاتا تھا، غریبوں، مسکینوں کے حق کا اس میں کوئی حصہ نہ رہتا تھا۔

اِکتنازِ دولت پر اِسلامی قوانین کی ضربِ کاری

حق تعالیٰ رَبّ العالمین ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے انسانی ضروریات میں تمام انسانوں کا یکساں حق ہے، اس میں مؤمن وکافر کا بھی فرق نہیں کیا گیا، خاندانی اور طبقاتی امیر وغریب کا کیا امتیاز ہوتا، اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں تقسیمِ دولت کا بہت بڑا حصہ جو اِنسان کی فطری اور اصلی ضروریات پر مشتمل ہے اس کی تقسیم خود اپنے دستِ قدرت میں رکھ کر اس طرح فرمائی ہے کہ اس سے ہر طبقہ، ہر خطہ، ہر کمزور وقوی یکساں فائدہ اُٹھاسکے، ایسی اشیاء کو اللہ جل شانہٗ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے عام انسانی دست بُرد اور قبضہ وتسلط سے مافوق بنادیا ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس پر ذاتی قبضہ جماسکے، ہوا، فضاء، آفتاب، ماہتاب اور سیاروں کی روشنی، فضاء میں پیدا ہونے والے بادل، ان کی بارش، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کے بغیر اِنسان تھوڑی دیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا، ان سب کو قدرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا وقفِ عام بنادیا کہ کوئی بڑی سے بڑی حکومت وطاقت اس پر قبضہ نہیں جماسکتی، یہ چیزیں اللہ کی مخلوق کو ہر جگہ یکساں ملتی ہیں۔

اشیائے ضرورت کی دُوسری قسط زمین سے نکلنے والا پانی اور کھانے کی چیزیں ہیں، یہ اگرچہ اتنی عام نہیں، مگر اِسلامی قانون میں پہاڑوں اور غیرآباد جنگلوں اور قدرتی چشموں کو وقفِ عام چھوڑ کر ایک خاص قانون کے تحت خاص خاص انسانوں کو زمین کے بعض حصوں پر جائز حقِ ملکیت بھی دیا جاتا ہے اور ناجائز قبضہ وتسلط جمانے والے بھی زمین پر قبضہ جمالیتے ہیں، لیکن قدرتی طور پر زمین کے فوائد کوئی بڑا سرمایہ دار بھی بغیر غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو ساتھ لئے حاصل نہیں کرسکتا، اس لئے ایک گونہ قبضے کے باوجود وہ اس میں دُوسرے کمزور غریبوں کو حصہ دینے پر مجبور ہے۔

تیسری قسط سونا چاندی، روپیہ پیسہ ہے، جو اصلی اور فطری ضروریات میں داخل نہیں، مگر حق تعالیٰ نے اس کو تمام

---

[۱] الهداية، كتاب السير، فصل فى باب الغنائم، فصل فى كيفية القسمة، ج:۲ ص:۵۷۷ و۵۷۸

[۲] تفسير القرطبى ج:۱۸ ص:۱۶ تحت هٰذه الآية۔

ضروریات کی تحصیل کا ذریعہ بنادیا ہے، اور یہ معادن سے نکالنے کے بعد خاص قانون کے تحت نکالنے والوں کی ملکیت ہوجاتا ہے، اور اُن سے اُن کی ملکیت مختلف طریقوں پر دُوسروں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے، اور اگر اس کی گردش پورے انسانوں میں خاطر خواہ ہوتی رہے تو کوئی انسان بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، مگر ہوتا یہ ہے کہ مال سے صرف خود ہی فائدہ اُٹھائے، دُوسروں تک اس کا فائدہ نہ پہنچے، اس بخل وحرص نے دُنیا میں اکتنازِ دولت اور سرمایہ پرستی کے پُرانے اور نئے بہت سے طریقے ایجاد کرائے، جن کے ذریعے اس دولت کی گردش صرف سرمایہ داروں اور بڑے لوگوں کے ہاتھوں تک محدود ہوکر رہ گئی، عام غریب مساکین محروم کردیئے گئے، جس کے رَدِّ عمل نے دُنیا میں کمیونزم اور سوشلزم جیسے نامعقول طریقے ایجاد کئے۔

اسلامی قانون نے ایک طرف تو شخصی ملکیت کا اتنا اِحترام کیا کہ ایک شخص کے مال کو اس کی جان کی برابر اور جان کو بیت اللہ کی حرمت کے برابر قرار دِیا، اس پر کسی کے ناجائز تصرف کو شدّت سے روکا، دُوسری طرف جو ہاتھ ناجائز طور پر اس کی طرف بڑھا، وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا، تیسری طرف ایسے تمام دروازے بند کردیئے کہ قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی چیزوں پر کوئی خاص شخص یا جماعت قبضہ کرکے بیٹھ جائے اور عوام کو محروم کردے۔

کسب واِکتساب کے مروّجہ طریقوں میں سود، سٹہ، جوا، ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے ذریعے دولت سمٹ کر چند اَفراد واَشخاص میں دائر ہوکر رہ جاتی ہے، ان سب کو سخت حرام قرار دے کر تمام معاملاتِ تجارت اور کرایہ داری وغیرہ میں اُن کی جڑ کاٹ دی، اور جو دولت کسی شخص کے پاس جائز طریقوں سے جمع ہوئی اس میں بھی غریبوں، فقیروں کے حقوق، زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، کفارات وغیرہ مقرّرہ فرائض کی صورت میں اور اس سے زائد رضا کارانہ صورت میں قائم فرمادیئے، اور ان سب اِخراجات کے بعد بھی جو کچھ انسان کے مرنے کے وقت تک باقی رہ گیا اس کو ایک خاص حکیمانہ اُصول کے مطابق تقسیم کردیا کہ اس کا حق دار اسی مرنے والے کے رشتہ داروں کو اَقرب فالاَقرب کے اُصول پر بنادیا، اس کو عام فقراء میں تقسیم کرنے کا قانون اس لئے نہ بنایا کہ ایسا ہوتا تو مرنے والا اپنے مرنے سے پہلے ہی اس کو جا وبے جا خرچ کرکے فارغ ہونے کی خواہش طبعی طور پر رکھتا، اپنے ہی خویش وعزیز کو ملتا دیکھ کر یہ داعیہ اس کے دل میں پرورِش نہ پائے گا۔

یہ طریقہ تو کسب واِکتساب کے عام مروّجہ طریقوں میں اکتنازِ دولت سے بچانے کا اِختیار کیا، دُوسرا طریقہ دولت حاصل ہونے کا جنگ وجہاد ہے، اس سے حاصل ہونے والے اموال میں وہ تقسیمِ شرعی جاری فرمادی جس کا ذِکر کچھ سورۂ اَنفال میں گزرا ہے، اور کچھ اس سورت میں بیان ہوا ہے، کیسے بے بصیرت ہیں وہ لوگ جو اِسلام کے اس منصفانہ، عادلانہ اور حکیمانہ نظام کو چھوڑ کر نئے نئے ازموں کو اِختیار کرکے اَمنِ عالم کو برباد کرتے ہیں۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الآیۃ، یہ آیت اگرچہ مالِ فَیْء کی تقسیم کے سلسلے

میں آئی ہے، اور اس سلسلے کے مناسب اس کا مفہوم یہ ہے کہ مالِ فَیْءِ میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مستحقین کے طبقات بیان کردیئے ہیں، مگر ان میں کس کو اور کتنا دیں اس کی تعیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر رکھی ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس آیت میں ہدایت دی گئی کہ جس کو جتنا آپ عطا فرمادیں اس کو راضی ہوکر لے لیں، اور جو نہ دیں اس کی فکر میں نہ پڑیں، آگے اس کو وَاتَّقُوا اللّٰہَ کے حکم سے مؤکد کردیا، کہ اگر اس معاملے میں کچھ غلط حیلے بہانے بنا کر زائد وصول کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے وہ اس کی سزا دے گا۔

حکمِ رسول مثل حکمِ قرآن کے واجب التعمیل ہے

لیکن الفاظِ آیت عام ہیں، صرف اَموال کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اَحکام بھی اس میں داخل ہیں، اس لئے عام انداز میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم، یا مال، یا اور کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو عطا فرمادیں، وہ اس کو لے لینا چاہئے اور اس کے مطابق عمل کے لئے تیار ہوجانا چاہئے، اور جس چیز سے روک دیں اس سے رُکنا چاہئے۔

بہت سے صحابۂ کرام نے اسی عام مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم اور واجب التعمیل قرار دِیا ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں آتیٰ کے بالمقابل نَھٰی کا لفظ آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتیٰ کے معنی یہاں اَمَرَ کے ہیں، جو نَھٰی کا صحیح مقابل ہے۔ اھ [۱] اور قرآنِ کریم نے نَھٰی کے مقابل میں اَمَرَ کے لفظ کو چھوڑ کر آتیٰ کا لفظ استعمال شاید اس لئے فرمایا تاکہ جس مضمون کے سیاق میں یہ آیت آئی ہے یعنی مالِ فَیء کی تقسیم اس پر بھی آیت کا مضمون شامل رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اِحرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو حکم دیا کہ یہ کپڑے اُتار دو، اس شخص نے کہا کہ آپ اس کے متعلق مجھے قرآن کی کوئی آیت بتاسکتے ہیں جس میں سلے ہوئے کپڑوں کی ممانعت ہو، حضرت اِبنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں وہ آیت میں بتاتا ہوں۔ پھر یہی آیت: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ پڑھ کر سنادی۔ اِمام شافعی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں، پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے، ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زنبور (تتیّا) مار ڈالا تو اس کا کیا حکم ہے، اِمام شافعی رحمہ اللہ نے یہی آیت: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ تلاوت کر کے حدیث سے اس کا حکم بیان فرمادیا۔ (قرطبی) [۲]

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ، ان چند آیات میں آخر رُکوع تک فقراء مہاجرین وانصار اور ان کے بعد آنے والی عام

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۷

[۲] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

اُمت کے افراد کا بیان ہے، ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے لِلْفُقَرَآءِ کو لِذِی الْقُرْبٰی کا بدل قرار دیا گیا، جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے۔ (مظہری) [1] اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پچھلی آیت میں جو عام یتیموں، مساکین اور مسافرین کو ان کے فقر و احتیاج کی بناء پر مالِ فَیْ ء کے مستحقین میں شمار کیا گیا ہے، ان آیات میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اگرچہ حق دار اس مال میں تمام ہی فقراء و مساکین ہیں، لیکن پھر اُن میں یہ حضرات اور سب لوگوں سے مقدم ہیں، جن کی دینی خدمات اور ذاتی اوصاف و کمالاتِ دِینیہ معروف ہیں۔

اموالِ صدقات میں صلحاء اور دِینی خدمات انجام دینے والے حاجت مندوں کو مقدّم کیا جائے

اس سے معلوم ہوا کہ اموالِ صدقات خصوصاً مالِ فَیْ ء اگرچہ عام فقرائے مسلمین کی حاجت رفع کرنے کے لئے ہیں، لیکن ان میں بھی نیک، صالح، دِین دار، خصوصاً دِینی خدمات انجام دینے والے طلباء، علماء اوروں سے مقدم رکھے جائیں، اسی لئے اسلامی حکومتوں میں تعلیم و تبلیغ اور اصلاحِ خلق میں مشغول علماء اور مفتیوں، قاضیوں کو ان کے گزارے کے اخراجات مالِ فَیْ ء ہی سے دینے کا رِواج تھا، کیونکہ ان آیات میں صحابۂ کرام میں بھی اوّل دو درجے قائم کئے گئے، ایک مہاجرین جنہوں نے سب سے پہلے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بڑی قربانیاں پیش کیں، اور اسلام کے لئے بڑے مصائب جھیلے، بالآخر مال و جائیداد، وطن اور تمام خویش و اقرباء کو خیر باد کہہ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، دُوسرے انصارِ مدینہ ہیں، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ آنے والے مہاجرین حضرات کو بلا کر دُنیا کو اپنا مخالف بنایا اور ان حضرات کی ایسی میزبانی کی کہ جس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی، ان دونوں طبقوں کے بعد تیسرا درجہ اُن مسلمانوں کا قرار دِیا جو حضراتِ صحابہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے اور ان کے نقشِ قدم پر چلے جس میں قیامت تک آنے والے مسلمان سب شریک ہیں، آگے ان تینوں طبقات کے کچھ فضائل و کمالات اور دِینی خدمات کا بیان ہے۔

فضائلِ مہاجرین

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ اس میں مہاجرین کا پہلا وصف یہ بیان فرمایا کہ ان کو اُن کے وطن اور مال و جائیداد سے نکال دیا گیا، یعنی کفارِ مکہ نے صرف اس جرم میں کہ یہ لوگ مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار ہو گئے تھے، ان پر

[1] تفسیر المظہری ج: ۹ ص: ۲۳۹

طرح طرح کے مظالم کئے یہاں تک کہ وہ اپنا وطن اور مال وجائیداد چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، بعض لوگ بھوک سے مجبور ہو کر پیٹ کو پتھر باندھ لیتے تھے، اور بعض لوگ سردی کا سامان نہ ہونے کے سبب زمین میں گڑھا کھود کر اس میں سردی سے بچتے تھے۔ (مظہری، قرطبی) [۱]

ایک اہم مسئلہ: مسلمانوں کے اموال پر کفار کے قبضے کا حکم

اس آیت میں حضراتِ مہاجرین کو فقراء فرمایا ہے، اور فقیر وہ شخص ہوتا ہے جس کی مِلک میں کچھ نہ ہو یا کم از کم بقدرِ نصاب کوئی چیز نہ ہو، حالانکہ حضراتِ مہاجرین میں سے اکثر مکہ مکرمہ میں اَصحابِ اموال وجائیداد تھے، اگر ہجرت کے بعد بھی وہ اموال ان کی ملکیت ہوتے تو اُن کو فقراء کہنا دُرست نہ ہوتا، قرآنِ کریم نے اُن کو فقراء فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ہجرت کے بعد ان کی جائیداد اور مال جو مکہ میں چھوڑ آئے اور کفار نے اُن پر قبضہ کرلیا وہ اُن کی مِلک سے نکل گئے۔

اسی لئے اِمامِ اعظم ابوحنیفہ و اِمام مالک رحمہما اللہ نے فرمایا کہ اگر مسلمان کسی جگہ ہجرت کر کے چلے آئیں اور ان کے مال و جائیداد پر کفار قابض ہو جائیں، یا خدانخواستہ کسی دارُالاسلام پر وہ غالب آ کر مسلمانوں کے اموال و جائیداد چھین لیں تو یہ اموال و جائیداد کفار کے مکمل قبضۂ مالکانہ کے بعد انہی کی مِلک ہو جاتے ہیں، اُن کے تصرفاتِ بیع وشرا ان اموالِ مسلمین میں نافذ ہوتے ہیں، روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، تفسیر مظہری میں اس جگہ وہ سب روایات نقل کی ہیں۔ [۲]

دُوسری صفت مہاجرین کی اس آیت میں یہ ذکر فرمائی ہے: يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا یعنی اُن کے اسلام میں داخل ہونے اور پھر ہجرت کر کے مال و وطن کو چھوڑنے کی کوئی دُنیاوی غرض نہ تھی، بلکہ صرف اللہ کا فضل و رضا مطلوب تھی، جس سے ان کا کمالِ اِخلاص معلوم ہوا، لفظ فَضْلٌ عموماً دُنیوی نعمت کے لئے اور رِضْوَانٌ آخرت کی نعمت کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے مفہوم یہ ہوا کہ ان حضرات نے اپنے تمام سابقہ اسبابِ عیش مکان، جائیداد وغیرہ کو تو چھوڑ دیا، اب دُنیاوی ضروریات بھی اور آخرت کی نعمتیں بھی صرف اسلام کے سایہ میں مطلوب تھیں، اور دُنیا کی ضروریاتِ زندگی بھی اللہ و رسول کی رضا کے تحت حاصل کرنا مقصود تھا۔

تیسرا وصف حضراتِ مہاجرین کا یہ بیان فرمایا: وَيَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ یعنی یہ سب کام انہوں نے اس لئے اختیار کئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کریں۔ اللہ کی مدد سے مراد اس کے دِین کی مدد ہے، جس میں انہوں نے حیرت

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۹، ۲۰، وتفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۴۲

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۴۰ و۲۴۱

انگیز قربانیاں پیش کیں۔

چوتھا وصف اُن کا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ یعنی یہی لوگ قول وعمل کے سچے ہیں، کلمۂ اسلام پڑھ کر جو عہد اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھا تھا، اس میں بالکل پورے اُترے، اس آیت نے تمام صحابہ مہاجرین کے صادق ہونے کا عام اعلان کردیا، جو شخص ان میں سے کسی کو جھوٹا قرار دے، وہ مسلمان نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ اس آیت کا منکر ہے، معاذ اللہ، روافض جو ان حضرات کو منافق کہتے ہیں، یہ اس آیت کی کھلی تکذیب ہے، ان حضراتِ مہاجرین کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ مقام تھا کہ اپنی دُعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ان فقرائے مہاجرین کا وسیلہ دے کر دُعا فرماتے تھے۔ (کما رواہ البغوی، مظہری) [1]

فضائلِ انصارؓ

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ الآیۃ، تَبَوُّءٌ کے معنی ٹھکانے بنانے کے ہیں، اور دَار سے مراد دارِ ہجرت یا دارِ ایمان یعنی مدینہ طیبہ ہے۔

مدینہ طیبہ کی ایک خاص فضیلت

اسی لئے حضرت امام مالک رحمہ اللہ ایک حیثیت سے مدینہ طیبہ کو باقی دُنیا کے سب شہروں سے افضل قرار دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دُنیا کے تمام شہر اور ملک جہاں جہاں اسلام پہنچا اور پھیلا ہے، سب جہاد کے ذریعے فتح ہوئے ہیں، یہاں تک کہ مکہ مکرّمہ بھی، بجز مدینہ طیبہ کے یہ صرف ایمان سے فتح ہوا ہے۔ (قرطبی) [2]

اس آیت میں تَبَوُّءٌ کے تحت دَار کے ساتھ ایمان کا بھی ذِکر فرمایا ہے، حالانکہ ٹھکانا پکڑنے کا تعلق کسی مقام اور جگہ سے ہوتا ہے، اِیمان کوئی ایسی چیز نہیں جس میں ٹھکانا پکڑا جائے، اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں ایک لفظ محذوف ہے، یعنی ''اَخْلَصُوْا'' یا ''تَمَكَّنُوْا'' مطلب یہ ہوگا کہ یہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے دارُالہجرت میں ٹھکانا بنایا اور اِیمان میں مخلص اور مضبوط ہوئے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں اِستعارہ کے طور پر اِیمان کو ایک محفوظ مکان سے تشبیہ دے کر اس میں پناہ گزین ہوجانے کو بیان فرمایا ہو، اور لفظ ''مِنْ قَبْلِهِمْ'' یعنی مہاجرین سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ ان انصارِ مدینہ کی ایک فضیلت یہ ہے کہ جو شہر اللہ کے نزدیک دارُالہجرت اور دارُالایمان بننے والا تھا، اس میں ان لوگوں کا

---

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۴۲، والبغوی ج:۸ ص:۷۵، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ رقم الحدیث:۸۵۵

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۳

قیام وقرار مہاجرین سے پہلے ہو چکا تھا، اور مہاجرین کے یہاں منتقل ہونے سے پہلے ہی یہ حضرات ایمان قبول کر کے اس میں پختہ ہو چکے تھے۔

دُوسری صفت حضراتِ انصار رضی اللہ عنہم کی اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے: يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ یعنی یہ حضرات ان لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے شہر میں چلے آئے ہیں، جو عام دُنیا کے انسانوں کے مزاج کے خلاف ہے، ایسے اُجڑے ہوئے خستہ حال لوگوں کو اپنی بستی میں جگہ دینا کون پسند کرتا ہے، ہر جگہ ملکی اور غیر ملکی کے سوالات کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان حضراتِ انصار نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان کو اپنی بستی میں جگہ دی، بلکہ اپنے مکانوں میں آباد کیا اور اپنے اموال میں حصہ دار بنایا، اور اس طرح عزّت واحترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا کہ ایک ایک مہاجر کو اپنے پاس جگہ دینے کے لئے کئی کئی انصاری حضرات نے درخواست کی، یہاں تک کہ قرعہ اندازی کرنا پڑی، قرعے کے ذریعے جو مہاجر جس انصاری کے حصے میں آیا، اس کو سپرد کیا گیا۔ (مظہری) [1]

تیسرا وصف حضراتِ انصار کا یہ بیان فرمایا: وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا اس جملے کا تعلق اُس خاص واقعے سے ہے جو بنونضیر کے جلاوطن ہونے اور اُن کے باغات ومکانات پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے وقت پیش آیا۔

اموالِ بنونضیر کی تقسیم کا واقعہ

صورت یہ تھی کہ جب اس آیت میں اموالِ فَیْء کی تقسیم مہاجرین وانصار وغیرہ میں کرنے کا اختیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا گیا، یہ وہ وقت تھا کہ جب مہاجرین کے پاس نہ اپنا کوئی مکان تھا نہ جائیداد، وہ حضرات انصار کے مکانوں میں رہتے اور انہی کی جائیدادوں میں محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتے تھے۔ جب بنونضیر اور بنوقینقاع کے اموال بطور فَیْء کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کے سردار ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ اپنی قوم انصار کو میرے پاس بلا دو۔ انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! انصار کے اپنے قبیلۂ خزرج کو یا سب انصار کو؟ آپ نے فرمایا: سب ہی کو بلانا ہے۔ یہ حضرات سب جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا، جس میں حمد وصلوٰۃ کے بعد انصارِ مدینہ کی اس بات پر مدح وثنا فرمائی کہ انہوں نے جو سلوک اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ کیا، وہ بڑے عزم وہمت کا کام تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے اموال آپ لوگوں کو دے دیئے ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں ان اموال کو مہاجرین وانصار سب میں تقسیم کر دوں، اور مہاجرین بدستورِ سابق آپ کے

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۴۳

مکانوں میں رہائش پذیر رہیں، اور آپ چاہیں تو ایسا کیا جائے کہ یہ بے گھر و بے زر لوگ ہیں، یہ اموال صرف ان میں تقسیم کر دیئے جائیں، اور یہ لوگ آپ کے گھروں کو چھوڑ کر الگ اپنے اپنے گھر بسالیں۔

یہ سن کر انصارِ مدینہ کے دو بڑے سردار حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سب اموال بھی صرف مہاجر بھائیوں میں تقسیم فرما دیجئے اور وہ پھر بھی ہمارے مکانوں میں بدستور مقیم رہیں۔ اُن کی بات سن کر تمام حاضرین انصار بول اُٹھے کہ ہم اس فیصلے پر راضی اور خوش ہیں، اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انصار اور اَبنائے انصار کو دُعا دی، اور ان اموال کو صرف مہاجرین میں تقسیم فرما دیا، انصار میں سے صرف دو حضرات کو جو بہت حاجت مند تھے اس میں سے حصہ عطا فرمایا، یعنی سہل بن حنیف اور ابودجانہ رضی اللہ عنہما، اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ایک تلوار عطا فرمائی جو ابن ابی الحقیق کی ایک ممتاز تلوار تھی۔ (مظہری بحوالہ سبیل الرشاد، محمد بن یوسف الصالحی) [۱]

آیتِ مذکورہ میں جو یہ ارشاد فرمایا: وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا اس میں حاجت سے مراد ہر ضرورت کی چیز ہے، اور ''مِمَّآ اُوْتُوْا'' کی ضمیر مہاجرین کی طرف راجع ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اس تقسیم میں جو کچھ مہاجرین کو دے دیا گیا، انصارِ مدینہ نے خوشی سے اس کو اس طرح قبول کیا کہ گویا ان کو ان چیزوں کی کوئی حاجت ہی نہیں، اُن کو دینے سے بُرا ماننا یا شکایت کرنا اس کا تو دُور دُور کوئی اِمکان ہی نہ تھا۔ اس کے بالمقابل جب بحرین فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ یہ پورا مال صرف انصار میں تقسیم کر دیا جائے، مگر انصار نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ عرض کیا ہم اُس وقت تک نہ لیں گے جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اس میں سے حصہ نہ دیا جائے۔ (رواہ البخاری عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ، از ابن کثیر) [۲]

چوتھا وصف انصارِ مدینہ کا اس آیت میں یہ ذِکر فرمایا ہے: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ خَصَاصَةٌ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں، اور اِیْثَارٌ کے معنی دُوسروں کی خواہش اور حاجت کو اپنی خواہش و حاجت پر مقدّم رکھنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ حضراتِ انصار اپنے اُوپر دُوسروں کو یعنی مہاجرین کو ترجیح دیتے تھے کہ اپنی حاجت ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے ان کی حاجت کو پورا کرتے تھے، اگرچہ یہ خود حاجت مند اور فقر و فاقہ میں ہوں۔

---

[۱] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۴۴

[۲] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۲۹، تحت هٰذه الآية، وصحيح البخاری، كتاب المناقب، باب قول النبی صلی الله عليه وسلم للأنصار: اصبروا حتّى تلقونی علی الحوض، ج:۱ ص:۵۳۵

حضراتِ صحابہ خصوصاً انصارؓ کے ایثار کے چند واقعات

اگرچہ تفسیر آیات کے لئے بیانِ واقعات کی ضرورت نہیں، مگر یہ واقعات ہر انسان کو اعلیٰ انسانیت کا سبق دینے والے اور زندگی میں انقلاب لانے والے ہیں، اس لئے حضراتِ مفسرین نے اس موقع پر ان کو تفصیل سے لکھا ہے، خصوصاً قرطبی نے، اسی سے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ [۱]

ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری کے گھر رات کو کوئی مہمان آ گیا، اُن کے پاس صرف اتنا کھانا تھا کہ یہ خود اور اُن کے بچے کھا سکیں، انہوں نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ بچوں کو تو کسی طرح سلا دو اور گھر کا چراغ گل کر دو، پھر مہمان کے سامنے کھانا رکھ کر برابر بیٹھ جاؤ کہ مہمان سمجھے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں، مگر ہم نہ کھائیں تا کہ مہمان بافراغت کھانا کھا سکے، اس پر یہ آیت مذکورہ: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ نازل ہوئی۔ (قال الترمذی: هذا حسن صحيح) [۲]

اور ترمذی ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دُوسرا واقعہ یہ منقول ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھوک سے پریشان ہوں، آپ نے ازواجِ مطہرات میں سے ایک کے پاس اطلاع بھیجی تو ان کا جواب آیا کہ ہمارے پاس تو اس وقت بجز پانی کے کچھ نہیں، دُوسری کے پاس پیغام بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، پھر تیسری چوتھی یہاں تک کہ تمام اُمہات المؤمنین کے پاس بھیجا اور سب کا ایک ہی جواب آیا کہ پانی کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں، اب آپ نے حاضرینِ مجلس سے خطاب فرمایا کہ کون ہے جو آج رات اس شخص کی مہمانی کرے ایک انصاری نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں کروں گا۔ ان کو ساتھ لے گئے اور جا کر گھر میں پوچھا کہ کھانے کے لئے کچھ ہے، تو بیوی نے بتلایا کہ صرف اتنا ہے کہ ہمارے بچے کھالیں، انصاری بزرگ نے بچوں کو سلا دینے کے لئے فرمایا اور فرمایا کہ مہمان کے سامنے کھانا رکھنے اور خود ساتھ بیٹھ جانے کے بعد اُٹھ کر چراغ گل کر دینا تا کہ ہمارے نہ کھانے کا مہمان کو اِحساس نہ ہو، مہمان نے کھانا کھالیا، جب یہ صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس معاملے کو جو تم نے گزشتہ رات اپنے مہمان کے ساتھ کیا بہت پسند فرمایا۔ [۳]

---

[۱] تفسير القرطبي ج:۱۸ ص:۲۴۔

[۲] صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب إكرام الضيف وفضل إيثاره ج:۲ ص:۱۸۳ و۱۸۴، وجامع الترمذي، ابواب التفسير، باب تفسير سورة الحشر ج:۲ ص:۱۶۶

[۳] صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب إكرام الضيف وفضل إيثاره ج:۲ ص:۱۸۴

اور مہدوی نے ایک ایسا ہی واقعہ ایک انصاری بزرگ کا حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ رات کو چراغ گل کر کے کھانا کھلانے کا ذِکر کیا ہے۔ [۱] اور تمام واقعات کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ آیتِ مذکورہ اس واقعے میں نازل ہوئی ہے۔

اور قشیری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ صحابۂ کرام میں سے ایک بزرگ کو کسی شخص نے ایک بکری کا سر بطور ہدیہ پیش کیا، اس بزرگ نے خیال کیا کہ ہمارا فلاں بھائی اور اس کے اہل وعیال ہم سے زیادہ ضرورت مند ہیں، یہ سر ان کے پاس بھیج دیا، اس دُوسرے بزرگ کے پاس پہنچا تو اسی طرح انہوں نے تیسرے کے پاس اور تیسرے نے چوتھے کے پاس بھیج دیا، یہاں تک کہ سات گھروں میں پھرنے کے بعد پھر پہلے بزرگ کے پاس واپس آگیا، اس واقعے پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئی۔ [۲] یہی واقعہ ثعلبی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔

موطا اِمام مالک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مسکین نے اُن سے سوال کیا، ان کے گھر میں صرف ایک روٹی تھی اور اُن کا اُس روز روزہ تھا، آپ نے اپنی خادمہ سے فرمایا کہ یہ روٹی اس کو دے دو خادمہ نے کہا کہ اگر یہ دے دی گئی تو شام کو آپ کے اِفطار کرنے کے لئے کوئی چیز نہ رہے گی۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر بھی دے دو یہ خادمہ کہتی ہیں کہ جب شام ہوئی تو ایک ایسے شخص نے جس کی طرف سے ہدیہ دینے کی کوئی رسم نہ تھی، ایک سالم بکری بھنی ہوئی اور اس کے اُوپر آٹے میدے کا خول چڑھا ہوا پختہ، جو عرب میں سب سے بہترین کھانا سمجھا جاتا ہے، اُن کے پاس بطور ہدیہ بھیج دیا، حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خادمہ کو بلایا کہ آؤ، یہ کھاؤ، یہ تمہاری اُس روٹی سے بہتر ہے۔ [۳]

اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ بیمار تھے، اور انگور کو جی چاہا، ان کے لئے ایک درہم میں ایک خوشہ انگور کا خرید کر لایا گیا، اتفاق سے ایک مسکین آگیا اور سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ خوشہ اس کو دے دو حاضرین میں سے ایک شخص خفیہ طور پر اس کے پیچھے گیا اور خوشہ اس مسکین سے خرید کر پھر ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو پیش کر دیا، مگر یہ سائل پھر آیا اور سوال کیا تو حضرت اِبنِ عمر رضی اللہ عنہما نے پھر اس کو دے دیا، پھر کوئی صاحب خفیہ طور پر گئے اور اس مسکین کو ایک درہم دے کر خوشہ خرید لائے، اور حضرت اِبنِ عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں پیش کر دیا، وہ سائل پھر آنا چاہتا

---

[۱] تفسير القرطبي ج:۱۸ ص:۲۵

[۲] المستدرك للحاكمؒ، تفسير سورة الحشر، رقم الحديث: ۳۷۹۹

[۳] موطا إمام مالك، كتاب الصدقة، باب الترغيب في الصدقة، ج:۲ ص:۹۹۷

تھا، لوگوں نے منع کر دیا، اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو یہ اطلاع ہوتی کہ یہ وہی خوشہ ہے جو انہوں نے صدقے میں دے دیا تھا تو ہرگز نہ کھاتے، مگر ان کو یہ خیال ہوا کہ لانے والا بازار سے لایا ہے، اس لئے استعمال فرمالیا۔ [۱]

اور ابنِ مبارک نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے چار سو دِینار ایک تھیلی میں بھر کر تھیلی غلام کے سپرد کی کہ ابوعبیدہ بن جراح کے پاس لے جاؤ کہ ہدیہ ہے، قبول کر کے اپنی ضرورت میں صَرف کریں۔ اور غلام کو ہدایت کر دی کہ ہدیہ دینے کے بعد کچھ دیر گھر میں ٹھہر جانا اور یہ دیکھنا کہ ابوعبیدہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں غلام نے حسبِ ہدایت یہ تھیلی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دی اور ذرا ٹھہر گیا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے تھیلی لے کر کہا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو یعنی عمر بن خطاب کو اس کا صلہ دے اور اُن پر رحمت فرمائے۔ اور اُسی وقت اپنی کنیز کو کہا کہ لو یہ سات فلاں شخص کو، پانچ فلاں کو دے آؤ، یہاں تک کہ پورے چار سو دِینار اسی وقت تقسیم کر دیئے۔

غلام نے واپس آ کر واقعہ بیان کر دیا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اُسی طرح چار سو دِینار کی ایک دُوسری تھیلی تیار کی ہوئی غلام کو دے کر ہدایت کی کہ معاذ بن جبل کو دے آؤ، اور وہاں بھی دیکھو وہ کیا کرتے ہیں یہ غلام لے گیا، انہوں نے تھیلی لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں دُعا دی: ''رَحِمَهُ اللّٰهُ وَوَصَلَهٗ''، یعنی ''اللہ اُن پر رحمت فرمائے اور اُن کو صلہ دے'' اور یہ بھی تھیلی لے کر فوراً تقسیم کرنے کے لئے بیٹھ گئے، اور اس کے بہت سے حصے کر کے مختلف گھروں میں بھیجتے رہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بیوی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھیں، آخر میں بولیں کہ ہم بھی تو بخدا مسکین ہی ہیں، ہمیں بھی کچھ ملنا چاہئے، اس وقت تھیلی میں صرف دو دِینار رہ گئے تھے، وہ ان کو دے دیئے۔ غلام یہ دیکھنے کے بعد لوٹا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ سب بھائی بھائی ہیں، سب کا مزاج ایک ہی ہے۔ [۲]

اور حذیفہ عدوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جنگِ یرموک میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش شہداء کی لاشوں میں کرنے کے لئے نکلا، اور کچھ پانی ساتھ لے لیا کہ اگر ان میں کچھ جان ہوئی تو پانی پلاؤں گا۔ ان کے پاس پہنچا تو کچھ رمق زندگی کی باقی تھی، میں نے کہا کہ کیا آپ کو پانی پلاؤں، اِشارے سے کہا کہ ہاں، مگر فوراً ہی قریب سے ایک دُوسرے شہید کی آواز ''آہ آہ'' کی آئی تو میرے بھائی نے کہا کہ یہ پانی اُن کو دے دو، ان کے پاس پہنچا اور پانی دینا چاہا تو تیسرے آدمی کی آواز ان کے کان میں آئی، اس نے بھی اس تیسرے کو دینے کے لئے کہہ دیا، اسی طرح یکے بعد دیگرے سات

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۷، والمعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۱۲۸۹۱، ومجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۱۵۸۲۵، باب ما جاء فی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۷، ومعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۱۶۴۷۶، ومجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۴۶۸۷، باب فی الإنفاق۔

شہیدوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، جب ساتویں شہید کے پاس پہنچا تو وہ دَم توڑ چکے تھے، یہاں سے اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ [۱]

یہ چند واقعات ہیں جن میں کچھ انصار کے کچھ مہاجرین کے ہیں، اکثر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آیتِ ایثار اس واقعے میں نازل ہوئی، مگر ان میں کوئی تضاد و اِختلاف نہیں، کیونکہ جس طرح کے واقعے میں ایک آیت نازل ہو چکی ہے، اگر اسی طرح کا کوئی دُوسرا واقعہ پیش آجائے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے اس میں یہ آیت نازل ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ہی واقعات نزولِ آیت کا سبب یا مصداق ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعاتِ اِیثار جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، اُن پر ایک شبہ روایاتِ حدیث سے یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پورا مال صدقہ کرڈالنے سے منع فرمایا ہے، [۲] جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بیضہ کے برابر سونے کا ٹکڑا بغرضِ صدقہ پیش کیا، تو آپ نے اس کو اسی کی طرف پھینک کر اِرشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کو لے آتے ہیں، پھر محتاج ہو کر لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں۔ [۳]

جواب اس شبہ کا انہی روایات سے یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، ہر حال کا حکم الگ ہے، پورا مال صدقہ کرڈالنے کی ممانعت اُن لوگوں کے لئے ہے جو بعد میں فقر و فاقہ پر صبر نہ کرسکیں، اپنے صدقہ کئے ہوئے پر پچتائیں، یا پھر لوگوں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور وہ لوگ جن کے عزم و ہمت اور ثبات و اِستقلال کا یہ حال ہو کہ سب کچھ خرچ کرڈالنے کے بعد فقر و فاقہ پر انہیں کوئی پریشانی نہ ہو، بلکہ ہمت کے ساتھ اس پر صبر کرسکتے ہوں اُن کے لئے سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرڈالنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک جہاد میں چندے میں اپنا سارا مال پیش کردیا تھا۔ اسی کے نظائر یہ واقعات ہیں جو اس جگہ مذکور ہیں، ایسے حضرات نے اپنے اہل و عیال کو بھی اسی صبر و اِستقلال کا خوگر بنا رکھا تھا، اس لئے اس میں ان کی بھی کوئی حق تلفی نہ تھی، اگر مال خود اہل و عیال کے قبضے میں ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ (قرطبی باضافہ اشیاء) [۴]

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۸، وشعب الإیمان للبیہقیؒ، رقم الحدیث:۳۳۲۸

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۷

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۸، وسنن ابی داود، کتاب الزکاۃ، باب الرجل یخرج من مالہ ج:۱ ص:۲۳۵

[۴] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۸

حضراتِ مہاجرین کی طرف سے ایثارِ انصار کی مکافات

دُنیا میں کوئی اِجتماعی کام یک طرفہ رواداری و اِیثار سے قائم نہیں رہتا، جب تک دونوں طرف سے اسی طرح کا معاملہ نہ ہو، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا اس کی ترغیب دی کہ مسلمان آپس میں ایک دُوسرے کو ہدیہ دے کر باہمی محبت بڑھایا کریں، [۱] اسی طرح جن کو ہدیہ دیا گیا ہے ان کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم بھی ہدیہ دینے والے کے احسان کی مکافات کرو، اگر مالی وسعت اللہ تعالیٰ عطا فرمادے تو مال سے، ورنہ دُعا ہی سے اس کی مکافات کرو، [۲] بے حسی کے ساتھ کسی کے احسانات کا بار سر پر لیتے رہنا شرافت اور خلق کے خلاف ہے۔

حضراتِ مہاجرین کے معاملے میں حضراتِ انصار نے بڑے اِیثار سے کام لیا، اپنے مکانوں، دُکانوں، کاروبار، زمین اور زراعت میں ان کو شریک کرلیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کو وسعت عطا فرمائی تو انہوں نے بھی حضراتِ اَنصار کے احسانات کی مکافات میں کمی نہیں کی۔

قرطبی نے بحوالۂ صحیحین حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آئے تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا، اور اَنصارِ مدینہ زمین و جائیداد والے تھے، انصار نے ان حضرات کو ہر چیز نصفا نصف تقسیم کردی، اپنے باغات کے آدھے پھل سالانہ اُن کو دینے لگے، اور حضرت انسؓ کی والدہ اُمِّ سلیمؓ نے اپنے چند درخت کھجور کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیئے تھے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ بن زید کی والدہ اُمِّ ایمن کو عطا فرمادیئے۔ [۳]

اِمام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خیبر کے جہاد سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہوکر مدینہ طیبہ واپس آئے، (اس غزوہ میں مسلمانوں کو اَموالِ غنیمت کافی مقدار میں ہاتھ آئے) تو سب مہاجرین نے حضراتِ انصار کے سب عطایا کا حساب کرکے ان کو واپس کردیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ کے درخت اُمِّ اَیمن سے لے کر ان کو واپس کردیئے، اور اس کی جگہ اُمِّ اَیمن کو اپنے باغ میں سے درخت عطا فرمائے۔ [۴]

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ حضراتِ انصار کے اِیثار اور اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان

---

[۱] موطا إمام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ما جاء في المهاجرة، رقم الحديث:۳۳۶۸

[۲] مسند احمد، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضى الله عنهما، رقم الحديث:۲۴۵۹۳

[۳] تفسير القرطبى ج:۱۸ ص:۲۵، وصحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب رد المهاجرين إلى الأنصار ...إلخ، ج:۲ ص:۹٦

[۴] تفسير القرطبى ج:۱۸ ص:۲٦، وصحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب رد المهاجرين إلى الأنصار منائحهم من الشجر والثمر ...إلخ، ج:۲ ص:۹٦

کر دینے کا ذکر کرنے کے بعد عام ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچ گئے تو اللہ کے نزدیک وہ ہی فلاح وکامیابی پانے والے ہیں۔ لفظ "شُحَّ" اور بخل تقریباً ہم معنی ہیں، لفظ "شُحَّ" میں کچھ مبالغہ ہے کہ بہت شدید بخل کو کہا جاتا ہے، بخل وشح اگر حقوقِ واجبہ میں کیا جائے خواہ وہ اللہ کے حقوق ہوں، جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، عشر، قربانی وغیرہ کہ ان کی ادائیگی میں بوجہ بخل کے کوتاہی کرے، یا انسانوں کے حقوقِ واجبہ ہوں جیسے اہل وعیال کا نفقہ یا اپنے حاجت مند والدین اور عزیزوں کا نفقۂ واجبہ جو بخل ان حقوقِ واجبہ کی ادائیگی سے مانع ہو، وہ قطعاً حرام ہے، اور جو اُمورِ مستحبہ اور فضائلِ انفاق سے مانع ہو، وہ مکروہ ومذموم ہے، اور جو محض رسمی چیزوں میں خرچ سے مانع ہو وہ شرعاً بخل نہیں۔

بخل وشح اور دُوسروں پر حسد ایسی مذموم خصلتیں ہیں کہ قرآن وحدیث میں ان کی بڑی مذمت آئی ہے، اور جو اُن سے بچ جائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے، حضراتِ انصار کی جو صفات اُوپر بیان ہوئی ہیں اُن میں اُن کا بخل وحسد سے بَری ہونا واضح ہے۔

کینہ اور حسد سے پاک ہونا جنتی ہونے کی علامت ہے

ابنِ کثیر نے بحوالہ امام احمد حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:-

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ ابھی تمہارے سامنے ایک شخص آنے والا ہے جو اہلِ جنت میں سے ہے۔ چنانچہ ایک صاحب انصار میں سے آئے، جن کی ڈاڑھی سے تازہ وضو کے قطرات ٹپک رہے تھے، اور بائیں ہاتھ میں اپنے نعلین لئے ہوئے تھے۔ دُوسرے دن بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور یہی شخص اسی حالت کے ساتھ سامنے آیا، تیسرے روز پھر یہی واقعہ پیش آیا اور یہی شخص اپنی مذکورہ حالت میں داخل ہوا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اُٹھ گئے تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اس شخص کے پیچھے لگے (تاکہ اس کے اہلِ جنت ہونے کا راز معلوم کریں) اور ان سے کہا کہ میں نے کسی جھگڑے میں قسم کھالی ہے کہ میں تین روز تک اپنے گھر نہ جاؤں گا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو تین روز مجھے اپنے یہاں رہنے کی جگہ دے دیں۔ انہوں نے منظور فرمالیا۔ عبداللہ بن عمرو نے یہ تین راتیں اُن کے ساتھ گزاریں، تو دیکھا کہ رات کو تہجد کے لئے نہیں اُٹھتے، البتہ جب سونے کے لئے بستر پر جاتے تو کچھ اللہ کا ذِکر کرتے تھے، پھر صبح کی نماز کے لئے اُٹھ جاتے تھے، البتہ اس پورے عرصے میں میں نے ان کی زبان سے بجز کلمۂ خیر کے کوئی کلمہ نہیں سنا۔ جب تین راتیں گزر گئیں اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی حقارت آجائے تو میں

نے اُن پر اپنا راز کھول دیا، کہ ہمارے گھر کوئی جھگڑا نہیں تھا، لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین روز تک یہ سنتا رہا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہلِ جنت میں سے ہے، اور اس کے بعد تینوں دن آپ ہی آئے، اس لئے میں نے چاہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھوں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے، جس کے سبب یہ فضیلت آپ کو حاصل ہوئی، مگر عجیب بات ہے کہ میں نے آپ کو کوئی بڑا عمل کرتے نہیں دیکھا، تو وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو اس درجے پر پہنچایا، انہوں نے کہا میرے پاس تو بجز اس کے کوئی عمل نہیں جو آپ نے دیکھا ہے۔ میں یہ سن کر واپس آنے لگا تو مجھے بلا کر کہا کہ ہاں ایک بات ہے کہ ''میں اپنے دِل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ اور بُرائی نہیں پاتا، اور کسی پر حسد نہیں کرتا جس کو اللہ نے کوئی خیر کی چیز عطا فرمائی ہو۔'' عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ بس یہی وہ صفت ہے جس نے آپ کو یہ بلند مقام عطا کیا ہے۔''

اِبنِ کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس کو نسائی نے بھی عمل الیوم واللیلۃ میں نقل کیا ہے اور اس کی اسناد ''صحیح علیٰ شرط الشیخین'' ہے۔ [1]

مہاجرین وانصار کے بعد عام اُمت کے مسلمان

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ الآیۃ، اس آیت کے مفہوم میں صحابۂ کرام مہاجرین وانصار کے بعد پیدا ہونے والے قیامت تک کے مسلمان شامل ہیں، اور اس آیت نے ان سب کو مالِ فَیْء میں حق دار قرار دیا ہے، یہی سبب تھا کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دُنیا کے بڑے ممالک عراق، شام، مصر وغیرہ فتح کئے، تو اُن کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم نہیں فرمایا، بلکہ ان کو اگلی آنے والی نسلوں کے لئے وقفِ عام رکھا، کہ ان کی آمدنی اسلامی بیت المال میں آتی رہے اور اس سے قیامت تک آنے والے مسلمان فائدہ اُٹھاسکیں۔ بعض صحابۂ کرام نے جو اُن سے مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کا سوال کیا تو انہوں نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ اگر میرے سامنے آئندہ آنے والی نسلوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں جو ملک فتح کرتا اس کی سب زمینوں کو بھی غانمین میں تقسیم کر دیتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا، اگر یہ ساری زمینیں موجودہ مسلمانوں میں تقسیم ہوگئیں تو آنے والے مسلمانوں کے لئے کیا باقی رہے گا۔ (رواہ مالک، قرطبی) [2]

---

[1] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية، ج:٨ ص:٦٩، ومسند احمد، مسند انس بن مالك رضى الله عنه، رقم الحديث:١٢٦٩٧

[2] تفسير القرطبى ج:١٨ ص:٣٢

اُمت کے حق پر ہونے کی پہچان صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت وعظمت ہے

اس مقام میں حق تعالیٰ نے پوری اُمت محمدیہ کے تین طبقے کئے مہاجرین، انصار اور باقی اُمت۔ مہاجرین وانصار کے خاص اوصاف اور فضائل بھی اس جگہ ذِکر فرمائے، مگر باقی اُمت کے فضائل وکمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابۂ کرام کی سبقتِ ایمانی اور اِیمان کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کو پہچانیں اور سب کے لئے دُعائے مغفرت کریں، اور اپنے لئے یہ دُعا کریں کہ ہمارے دِلوں میں کسی مسلمان سے کینہ ونفرت نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام کے بعد والے جتنے مسلمان ہیں اُن کا ایمان واسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ صحابۂ کرام کی عظمت ومحبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور اُن کے لئے دُعا کرتے ہوں، جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اسی لئے حضرت مصعب بن سعد نے فرمایا کہ اُمت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں، جن میں سے دو درجے تو گزر چکے، یعنی مہاجرین وانصار، اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا، یعنی وہ جو صحابۂ کرام سے محبت رکھے، اُن کی عظمت پہچانے، اب اگر تمہیں اُمت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجے میں داخل ہوجاؤ۔

حضرت حسینؓ سے کسی نے حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں سوال کیا (جب کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا) تو انہوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے اِنکار کیا، پھر پوچھا کہ انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا، تو فرمایا بس اب تیسری آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کی رہ گئی، اگر تم عثمان غنی کی شان میں شک وشبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجے سے بھی نکل جاؤ گے۔

قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابۂ کرام کی محبت ہم پر واجب ہے، حضرت اِمام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی صحابی کو بُرا کہے یا اس کے متعلق بُرائی کا اِعتقاد رکھے، اس کا مسلمانوں کے مالِ فَیْء میں کوئی حصہ نہیں، پھر اسی آیت سے اِستدلال فرمایا، اور چونکہ مالِ فَیْء میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا اس میں حصہ نہ رہا، اس کا اسلام وایمان ہی مشکوک ہوگیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اَصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اِستغفار اور دُعا کرنے کا حکم دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کے آپس میں جنگ وجدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے (اس

لئے کسی مسلمان کو مشاجراتِ صحابہ کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں)۔ [۱]

حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ اُمت اُس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی، جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت وملامت نہ کریں گے۔ [۲]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی کو بُرا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں سے زیادہ بُرا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ [۳] یہ ظاہر ہے کہ زیادہ بُرے صحابہ تو ہو نہیں سکتے، یہی ہوگا جو اُن کی بُرائی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کسی کو بُرا کہنا سببِ لعنت ہے۔

اور عوام بن حوشبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس اُمت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابۂ کرام کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو، تا کہ لوگوں کے دِلوں میں ان کی محبت پیدا ہو، اور وہ مشاجرات اور اختلافات جو اُن کے درمیان پیش آئے ہیں، اُن کا ذِکر نہ کیا کرو، جس سے ان کی جرأت بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جائیں)۔ (یہ سب روایات تفسیر قرطبی سے لی گئی ہیں) [۴]

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دغاباز ہیں کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو جو کہ کافر ہیں

مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ

اہلِ کتاب میں سے اگر تم کو کوئی نکال دے گا تو ہم بھی نکلیں گے تمہارے ساتھ اور کہا نہ مانیں گے

فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا ۙ وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَشْهَدُ

کسی کا تمہارے معاملے میں کبھی، اور اگر تم سے لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے

---

[۱] تفسير القرطبی ج:۱۸ ص:۳۱ و ۳۲

[۲] المعجم الأوسط للطبرانیؒ، رقم الحديث: ۵۳۹۹، ومجمع الزوائد، كتاب المناقب، باب ما جاء في حق الصّحابة رضی الله عنهم والزجر عن سبهم، رقم الحديث: ۱۶۴۲۸

[۳] جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فيمن سب اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم، ج:۲ ص:۲۱۵

[۴] تفسير القرطبی ج:۱۸ ص:۳۱ تا ۳۳

إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا

کہ وہ جھوٹے ہیں، اگر وہ نکالے جائیں یہ نہ نکلیں گے اُن کے ساتھ، اور اگر ان سے لڑائی ہوئی،

لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ۙ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

یہ نہ مدد کریں گے اُن کی، اور اگر مدد کریں گے تو بھاگیں گے پیٹھ پھیر کر، پھر کہیں مدد نہ پائیں گے،

لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ

البتہ تمہارا ڈر زیادہ ہے اُن کے دِلوں میں اللہ کے ڈر سے، یہ اس لئے کہ وہ لوگ

لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا إِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ

سمجھ نہیں رکھتے، لڑ نہ سکیں گے تم سے سب مل کر مگر بستیوں کے کوٹ میں یا

مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۗ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۗ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا

دیواروں کی اوٹ میں، ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے، تو سمجھے وہ اکٹھے ہیں

وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ

اور اُن کے دِل جُدا جُدا ہو رہے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے، جیسے قصہ ان لوگوں کا

مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جو ہو چکے ہیں ان سے پہلے قریب ہی چکھی انہوں نے سزا اپنے کام کی اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے،

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ

جیسے قصہ شیطان کا جب کہے انسان کو تو منکر ہو پھر جب وہ منکر ہوگیا، کہے میں الگ ہوں

مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ⑯ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ

تجھ سے، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو ربّ سارے جہان کا پھر انجام دونوں کا یہی کہ وہ دونوں ہیں آگ میں

ع ۲ / ۵

خٰلِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ⑰

ہمیشہ رہیں اسی میں، اور یہی ہے سزا گنہگاروں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جنہوں نے منافقت سے کام لیا ہے کہ وہ اپنے اُن بھائیوں سے جو کافر اہلِ کتاب میں سے ہیں یہ کہتے ہیں کہ: ''اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور تمہارے بارے میں کبھی کسی اور کا کہنا نہیں مانیں گے، اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔'' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔ ⑪ یہ پکی بات ہے کہ اگر ان (اہلِ کتاب) کو نکالا گیا تو یہ اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے، اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے، اور اگر بالفرض اُن کی مدد کی بھی تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر اُن کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ ⑫ (مسلمانو!) حقیقت یہ ہے کہ ان کے دِلوں میں تمہاری دہشت اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں سمجھ نہیں ہے۔ ⑬ یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر بھی تم سے جنگ نہیں کریں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعوں میں محفوظ ہوں، یا پھر دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ ان کی آپس کی مخالفتیں بہت سخت ہیں۔ تم انہیں اِکٹھا سمجھتے ہو، حالانکہ ان کے دِل پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عقل نہیں ہے۔ ⑭ ان کی حالت ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کرتوت کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ⑮ ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ: ''کافر ہو جا'' پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ: ''میں تجھ سے بَری ہوں، میں اللہ سے ڈَرتا ہوں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔'' ⑯ چنانچہ ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی ظلم کرنے والوں کی سزا ہے۔ ⑰

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان منافقین (یعنی عبداللہ بن اُبیّ وغیرہ) کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے (ہم مذہب) بھائیوں سے

کہ کفار اہلِ کتاب ہیں (یعنی بنی نضیر سے) کہتے ہیں (یعنی کہتے تھے، کیونکہ یہ سورت واقعۂ جلاوطنی بنی نضیر کے بعد نازل ہوئی ہے، کما فی الروح مستدلًا بالحدیث والسِّیَر [1]) کہ واللہ! (ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں، پس) اگر تم (اپنے وطن سے جبراً) نکالے گئے تو ہم (بھی) تمہارے ساتھ (اپنے وطن سے) نکل جائیں گے اور تمہارے معاملے میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہ مانیں گے (یعنی ہم کو خواہ کوئی کیسا ہی سمجھا دے کہ خروج وقتال میں جو آئندہ مذکور ہے تمہارا ساتھ نہ دیں لیکن ہم نہ مانیں گے، پس جملہ وَلَا نُطِيعُ سیاق وسباق دونوں کے متعلق ہے) اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں (یہ تو ان کے کاذب ہونے کا اجمالاً بیان ہوا، آگے تفصیلاً فرماتے ہیں کہ) واللہ اگر اہلِ کتاب نکالے گئے تو یہ (منافقین) اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ اُن کی مدد نہ کریں گے اور اگر (بفرضِ محال) ان کی مدد بھی کی (اور لڑائی میں شریک ہوئے) تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر (ان کے بھاگ جانے کے بعد ان (اہلِ کتاب) کی کوئی مدد نہ ہوگی (یعنی جو ناصر تھے وہ تو بھاگ گئے، اور دُوسرا بھی کوئی ناصر نہ ہوگا، پس لامحالہ مغلوب ومقہور ہوں گے، غرض منافقین کی جو غرض ہے کہ اپنے ان بھائیوں پر کوئی آفت نہ آنے دیں، اس میں ہر طرح ناکامی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب آخر میں بنی نضیر نکالے گئے تو منافقین ان کے ساتھ نکلے نہیں، اور جب اوّل میں ان کا محاصرہ کیا گیا جس میں اِحتمالِ قتال کا تھا تو اس میں انہوں نے نصرت نہیں کی، اور بعد وقوعِ واقعہ کے اس طرح فرمانا لَئِنْ اُخْرِجُوْا... اِلخ جو آئندہ واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، یا تو واقعۂ ماضیہ کو متحضر وموجود فرض کرنے پر مبنی ہے تا کہ اُن کا خلف وعدا اور ان کا مخذول ہونا خوب پیشِ نظر ہو جائے، اور یا آئندہ جو اِحتمالِ موہوم تھا ساتھ دینے کا اس کی نفی کر دی، آگے اس ساتھ نہ دینے کا سبب فرماتے ہیں کہ) بے شک تم لوگوں کا خوف ان (منافقین) کے دِلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے (یعنی دعوئ ایمان سے جو یہ اپنا ڈرنا اللہ تعالیٰ سے بیان کرتے ہیں وہ تو خلافِ واقع ہے، ورنہ کفر کو کیوں نہ چھوڑ دیتے، اور تمہارا واقعی خوف ہے، پس اس خوف کی وجہ سے یہ لوگ ان بنی نضیر کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور) یہ (ان کا تم سے ڈرنا اور خدا سے نہ ڈرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ (بوجہ کفر کے خدا تعالیٰ کی عظمت کو) سمجھتے نہیں، (اور یہ یہود عام ہیں بنی نضیر وغیر بنی نضیر سے، اور منافقین الگ الگ تو تمہارے مقابلے کا کیا حوصلہ کرتے) یہ لوگ (تو) سب مل کر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیوار (قلعہ وشہر پناہ) کی آڑ میں (حفاظت سے مراد عام ہے، خندق سے ہو یا قلعہ وغیرہ سے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کبھی ایسا واقعہ پیش آیا ہو کہ منافقین نے مسلمانوں کا مقابلہ کسی قلعہ اور محفوظ مقام سے کیا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ اگر کبھی یہود یا منافقین اکیلے اکیلے یا جمع ہو کر تمہارے مقابلے میں آئے بھی تو ان کا مقابلہ محفوظ قلعوں میں یا شہر پناہ کی دیوار کے پیچھے سے ہوگا، چنانچہ یہود بنی قریظہ واہلِ خیبر اسی طرح مقابلے میں پیش آئے

[1] تفسیر روح المعانی ج:۱۹ ص:۱۵۷

اور منافقین نہ اُن کے ساتھ ہوئے اور نہ اُن کا کبھی اتنا حوصلہ ہوا کہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلے پر آئیں، اس میں مسلمانوں کی تشجیع یعنی ہمت افزائی بھی ہے کہ ان سے اندیشہ نہ رکھیں، اور ان کے بعض قبائل جیسے اوس وخزرج کے واقعاتِ جنگ دیکھ کر یہ اندیشہ نہ کیا جائے کہ شاید اسی طرح اہلِ اسلام کے مقابلے میں کسی وقت یہ بھی آسکیں، بات یہ ہے کہ) ان کی لڑائی آپس (ہی) میں بڑی تیز ہے (مگر مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہیں، اور اسی طرح یہ اِحتمال نہ کیا جائے کہ گو بمقابلہ اہلِ اسلام کے تنہا یہ ضعیف ہوں گے، مگر بہت سے ضعفاء مل کر قوی ہو جاتے ہیں، شاید اس طرح یہ سب جمع ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کرسکیں، یہ اِحتمال اس لئے قابلِ اِلتفات نہیں کہ) اے مخاطب! تو ان کو (ظاہر میں) متفق خیال کرتا ہے، حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں (یعنی گو عداوت اہلِ حق ان سب میں ایک وجہ اِشتراک کی ہے، مگر خود بھی تو ان میں اختلافِ عقائد کی وجہ سے اِفتراق وعداوت ہے، جیسا سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے: وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ...اِلخ [۱] (المائدۃ: ۶۴) اور ان کے باہم مجمع ہونے کے اِحتمال کی نفی بھی زیادت تاکید وتقویت مقصود کے لئے ہے، ورنہ حق تعالیٰ کی مشیت ان کی مغلوبی ومقہوری کے ساتھ ہو چکی ہے، تو اگر اِتفاق ہو بھی جاتا تو کیا کام آتا اس نااِتفاقی کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ) یہ (تشتّتِ قلوب) اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دِین کی) عقل نہیں رکھتے، (اس لئے ہر ایک اپنے اپنے خیال کا تابع ہے، اور جب نظریات اور اَغراض مختلف ہوں تو اس کے لئے اِختلافِ قلوب لازم ہے، اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بے دِینوں میں بسا اوقات اِتفاق دیکھا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مقصود قاعدہ کلیہ بیان کرنا نہیں، بلکہ اُن میں جو نااِتفاقی تھی اس کا سبب بیان کرنا مقصود ہے کہ اُن کے لئے یہی امر سبب ہو گیا تھا، چنانچہ ظاہر ہے، آگے بالخصوص بنی نضیر اور ان منافقین کی جنہوں نے وعدۂ نصرت کر کے دھوکے میں ڈالا اور عین وقت پر دغا دی، ان کی حالت کا بیان ہے کہ ان کے مجموعے کی دو مثالیں ہیں، ایک مثال خاص بنی نضیر کی اور دُوسری منافقین کی، بنی نضیر کی مثال تو (ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں جو (دُنیا میں بھی) اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں، اور (آخرت میں بھی) اُن کے لئے دردناک عذاب (ہونے والا) ہے (مراد ان سے یہود بنی قینقاع ہیں، جن کا قصہ یہ ہوا کہ واقعۂ بدر کے بعد اُنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲ھ میں عہد شکنی کر کے جنگ کی، پھر مغلوب ومقہور ہوئے، اور قلعے سے آپ کے فیصلے پر باہر نکلے، اور سب کی مشکیں باندھی گئیں، پھر عبداللہ بن اُبیّ کے اِصرار واِلحاح کی وجہ سے ان کی اس شرط پر جان بخشی گئی کہ مدینہ سے چلے جائیں، چنانچہ وہ اَذْرُعَات شام کو نکل گئے، اور اُن کے اموال مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کئے گئے، کذا فی زاد المعاد۔ [۲] اور ان منافقین کی مثال) شیطان کی سی مثال ہے کہ (اوّل تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا پھر

---

[۱] ترجمہ: اور ہم نے ان میں باہم عداوت ڈال دی۔

[۲] قد مرّ تخریجہ۔

جب وہ کافر ہو جاتا ہے (اور کفر کے وبال میں گرفتار ہوتا ہے خواہ دُنیا میں، خواہ آخرت میں) تو (اس وقت صاف جواب دے دیتا ہے اور) کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، میں تو اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں (دُنیا میں ایسی تبری کا قصہ تو سورۂ انفال، آیت وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ... اِلخ [1] (الانفال:۴۸) میں گزر چکا ہے، اور آخرت میں تبری مُضلّین کی ضالین سے آیات متعددہ میں مذکور ہے) سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے، (ایک ضلال کی وجہ سے، دُوسرا اضلال کی وجہ سے) اور ظالموں کی یہی سزا ہے (پس جس طرح اس شیطان نے اس انسان کو اوّل بہکایا، پھر وقت پر ساتھ نہ دیا اور دونوں خسران میں پڑے، اسی طرح ان منافقین نے اوّل بنی نضیر کو بُری رائے دی، کہ تم نکلو نہیں، پھر عین وقت پر اُن کو دھوکا دیا، اور دونوں بلا میں پھنسے، بنی نضیر تو جلاوطنی کی مصیبت میں اور منافقین ناکامیابی کی ذِلت میں مبتلا ہوئے)۔

معارف و مسائل

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ... اِلخ، یہ بنو نضیر کی مثال کا بیان ہے، اور "الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" کی تفسیر میں حضرت مجاہد نے فرمایا کہ کفارِ اہلِ بدر مراد ہیں، اور حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا: بنو قینقاع (قبیلۂ یہود) مراد ہیں، اور دونوں کا انجامِ بد اور مقتول و مغلوب اور ذلیل و خوار ہونا اس وقت واضح ہو چکا تھا، کیونکہ بنو نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ غزوۂ بدر واُحد کے بعد واقع ہوا ہے، اور بنو قینقاع کا واقعہ بھی بدر کے بعد پیش آ چکا تھا، بدر میں مشرکینِ عرب کے ستر سردار مارے گئے، اور باقی بڑی ذِلت و خواری کے ساتھ واپس ہوئے، اور بقول ابنِ عباسؓ یہ مراد ہیں تو مطلب آیت کا واضح ہے کہ ان کے بارے میں جو آیت میں فرمایا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ یعنی انہوں نے اپنے کرتوت کا بدلہ چکھ لیا، یہ آخرت سے پہلے دُنیا ہی میں آنکھوں کے سامنے آ گیا، اسی طرح اگر "الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" سے مراد یہود ہی کا قبیلہ بنو قینقاع ہو تو ان کا واقعہ بھی ایسا ہی عبرتناک ہے۔

بنو قینقاع کی جلاوطنی

واقعہ یہ تھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مدینہ کے آس پاس جتنے قبائل یہود کے تھے، سب کے ساتھ ایک معاہدہ صلح کا ہو گیا تھا، جس کی شرائط میں یہ داخل تھا کہ ان میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے کسی مخالف کی اِمداد نہ کرے گا، ان معاہدہ کرنے والوں میں قبیلۂ بنو قینقاع بھی شامل تھا، مگر اس

[1] ترجمہ: اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جب کہ شیطان نے ان کو ان کے اعمال خوشنما کر کے دکھلائے۔

نے چند مہینوں کے بعد ہی غدر و عہد شکنی شروع کر دی اور غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین کے ساتھ خفیہ سازش و امداد کے کچھ واقعات سامنے آئے، اُس وقت یہ آیت قرآن نازل ہوئی: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ (الانفال:۵۸) یعنی "اگر (معاہدہ اور صلح کے بعد) کسی قوم کی خیانت کا خطرہ لاحق ہو تو آپ ان کا معاہدۂ صلح ختم کر سکتے ہیں" بنوقینقاع اس معاہدے کو اپنی غداری سے خود توڑ چکے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور علمِ جہاد حضرت حمزہؓ کو عطا فرمایا، اور مدینہ طیبہ کے شہر پر حضرت ابولبابہؓ کو اپنا خلیفہ مقرّر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تشریف لے گئے، یہ لوگ مسلمانوں کا لشکر دیکھ کر اپنے قلعے میں بند ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، پندرہ روز تک تو یہ لوگ محصور ہو کر صبر کرتے رہے، بالآخر اللہ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا، اور یہ سمجھ گئے کہ مقابلے سے کام نہ چلے گا اور قلعے کا دروازہ کھول دیا، اور کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی ہیں، جو آپ ہمارے بارے میں نافذ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ان کے مَردوں کے قتل کا ہونے والا تھا، کہ عبداللہ ابن اُبیّ منافق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بے حد اِصرار و اِلحاح کیا کہ اُن کی جان بخشی کر دی جائے، بالآخر آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ لوگ بستی خالی کر کے جلاوطن ہو جائیں، اور ان کے اموال مسلمانوں کا مالِ غنیمت ہوں گے، اس قرارداد کے مطابق یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر ملکِ شام کے علاقہ اَذْرُعَات میں چلے گئے، اور اُن کے اموال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے قانون کے مطابق اس طرح تقسیم فرمایا کہ ایک خمس بیت المال کا رکھ کر باقی چار خمس غانمین میں تقسیم کر دیئے۔

غزوۂ بدر کے بعد یہ پہلا خمس تھا جو بیت المال میں داخل ہوا، یہ واقعہ بروز شنبہ ۱۵ رشوال ۲ھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے بیس ماہ بعد پیش آیا۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ الآیۃ، یہ دُوسری مثال اُن منافقین کی ہے جنہوں نے بنونضیر کو جلاوطنی کا حکم نہ ماننے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر جنگ کرنے کے لئے اُبھارا اور اُن کی مدد کرنے کا وعدہ کیا، مگر جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا تو کوئی منافق اِمداد کو نہ پہنچا، ان کی مثال قرآنِ کریم نے شیطان کے ایک واقعے سے دی ہے کہ شیطان نے انسان کو کفر پر آمادہ کیا اور اس سے طرح طرح کے وعدے کئے، مگر جب وہ کفر میں مبتلا ہو گیا تو سب سے مُکر گیا۔

شیطان کے ایسے واقعات خدا جانے کتنے ہوں گے، اُن میں سے ایک واقعہ تو خود قرآنِ کریم میں منصوص ہے، جس کا بیان سورۂ انفال کی ان آیات میں آیا ہے وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ

جَاۗرٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ [1] الآیۃ (الانفال: ۴۸) یہ واقعہ غزوۂ بدر کا ہے، جس میں شیطان نے بطور وسوسہ کے یا بشکلِ انسانی سامنے آکر مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے مقابلے پر اُبھارا اور اپنی مدد کا یقین دِلایا، مگر جب مسلمانوں سے مقابلہ ہوا تو مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا، اس واقعے کی پوری تشریح معارف القرآن جلد چہارم صفحہ: ۲۸۳ سے صفحہ: ۲۸۶ تک تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔

اگر آیتِ مذکورہ میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے تو یہ ارشاد کہ شیطان انسان سے کفر کرنے کو کہتا ہے، اور جب وہ کر لیتا ہے تو اس سے بَری ہو کر الگ ہو جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس واقعے میں بظاہر شیطان نے ان کو کفر کرنے کے لئے نہیں کہا، کافر تو وہ پہلے ہی سے تھے، شیطان نے تو ان کو مقابلے پر جمع کرنے کے لئے کہا تھا، جواب ظاہر ہے کہ کفر پر جمے رہنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر قتال کرنے کو کہنا بھی اسی حکم میں ہے کہ ان کو کفر کرنے کے لئے کہا جائے۔

اور تفسیر مظہری و قرطبی و ابن کثیر وغیرہ میں اس جگہ شیطان کی اس مثال کے واقعات بنی اسرائیل کے متعدّد راہبوں اور عبادت گزاروں کو شیطان کے بہکا کر کفر تک پہنچا دینے کے متعلق نقل کئے ہیں، مثلاً بنی اسرائیل کا ایک راہب عبادت گزار جو اپنے صومعہ میں ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتا، اور روزے اس طرح رکھتا تھا کہ دس دن میں صرف ایک مرتبہ اِفطار کرتا تھا، ستر سال اس کے اسی حال میں گزرے، شیطانِ لعین اس کے پیچھے پڑا، اور اپنے سب سے زیادہ مکار، ہوشیار شیطان کو اس کے پاس بصورت راہب، عبادت گزار بنا کر بھیجا، جس نے اس کے پاس جا کر اس راہب سے بھی زیادہ عبادت گزاری کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ راہب کو اس پر اِعتماد ہو گیا۔

بالآخر یہ مصنوعی راہب شیطان اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ اس راہب کو کچھ دُعائیں ایسی سکھلائیں جس سے بیماروں کو شفا ہو جائے، پھر اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے اثر سے بیمار کر کے ان کو خود ہی اس راہب کا پتہ دیا، جب یہ راہب اُن پر دُعا پڑھتا تو یہ شیطان اپنا اثر اس سے ہٹا دیتا، وہ شفایاب ہو جاتا تھا، اور عرصۂ دراز تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کے بعد اس نے ایک اسرائیلی سردار کی حسین لڑکی پر اپنا یہ عمل کیا اور اس کو بھی راہب کے پاس جانے کا مشورہ دیا، یہاں تک کہ اس کو راہب کے صومعہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا، اور رفتہ رفتہ اس کو اس لڑکی کے ساتھ زنا میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوا، جس کے نتیجے میں اس کو حمل ہو گیا، تو رُسوائی سے بچنے کے لئے اس کو قتل کرنے کا مشورہ دیا، قتل کرنے کے بعد شیطان ہی نے سب کو واقعۂ قتل وغیرہ بتلا کر راہب کے خلاف کھڑا کر دیا، یہاں تک کہ لوگوں نے اس کا صومعہ ڈھا دیا اور اس کو قتل کر کے سولی دینے کا فیصلہ کیا، اس وقت شیطان اس کے پاس پھر پہنچا کہ اب تو تیری جان بچنے کی کوئی صورت نہیں،

---

[1] ترجمہ: اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جب کہ شیطان نے ان کو ان کے اعمال خوشنما کر کے دکھلائے اور کہا کہ لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں پھر جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہاں اگر تو مجھے سجدہ کرلے تو میں تجھے بچا سکتا ہوں۔ راہب سب کچھ گناہ پہلے کر چکا تھا، کفر کا راستہ ہموار ہو چکا تھا، اس نے سجدہ بھی کرلیا، اس وقت شیطان نے صاف کہہ دیا کہ تو میرے قبضے میں نہ آتا تھا، میں نے یہ سب مکر تیرے مبتلائے کفر کرنے کے لئے کئے تھے، اب میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

یہ واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔[1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ج

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہئے کہ دیکھ لے ہر ایک جی کیا بھیجتا ہے کل کے واسطے

وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ

اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو، اور مت ہو اُن جیسے

نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِي

جنہوں نے بھلادیا اللہ کو پھر اللہ نے بھلادیئے ان کو اُن کے جی، وہ لوگ وہی ہیں نافرمان، برابر نہیں

أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ط أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۲۰﴾

دوزخ والے اور بہشت والے، بہشت والے جو ہیں وہی ہیں مراد پانے والے،

لَوْ أَنْزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا

اگر ہم اُتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تُو دیکھ لیتا کہ وہ دَب جاتا پھٹ جاتا

مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ط وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾

اللہ کے ڈر سے، اور یہ مثالیں ہم سناتے ہیں لوگوں کو تاکہ وہ غور کریں،

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۳۷، والتفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۵۲ إلی ۲۵۴

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ

وہ اللہ ہے جس کے سوائے بندگی نہیں کسی کی، جانتا ہے جو پوشیدہ ہے اور جو ظاہر ہے، وہ ہے بڑا مہربان

الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ

رحم والا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوائے بندگی نہیں کسی کی، وہ بادشاہ ہے، پاک ذات، سب عیبوں سے سالم،

الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ

امان دینے والا، پناہ میں لینے والا، زبردست، دباؤ والا، صاحبِ عظمت، پاک ہے اللہ

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ

اُن کے شریک بتلانے سے، وہ اللہ ہے بنانے والا، نکال کھڑا کرنے والا، صورت کھینچنے والا، اسی کے ہیں سب نام

الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ ع

خاصے، پاکی بول رہا ہے اس کی جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۸﴾ اور تم اُن جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے اُنہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ وہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ ﴿۱۹﴾ جنت والے اور دوزخ والے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے ہی وہ ہیں جو کامیاب ہیں۔ ﴿۲۰﴾ اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اُتارا ہوتا تو تم اُسے دیکھتے کہ وہ اللہ کے رُعب سے جھکا جارہا ہے، اور پھٹا پڑتا ہے۔ اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔ ﴿۲۱﴾ وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ چھپی اور کھلی ہر بات کو جاننے والا ہے۔ وہی ہے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔ ﴿۲۲﴾ وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جو بادشاہ ہے، تقدس کا مالک

ہے، سلامتی دینے والا ہے، امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، بڑے اِقتدار والا ہے، ہر خرابی کی اِصلاح کرنے والا ہے، بڑائی کا مالک ہے۔ پاک ہے اللہ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ﴿۲۳﴾ وہ اللہ وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے، وجود میں لانے والا ہے، صورت بنانے والا ہے، اُسی کے سب سے اچھے نام ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں، وہ اُس کی تسبیح کرتی ہیں، اور وہی ہے جو اِقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (تم نے نافرمانوں کا انجام سن لیا، سوتم) اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اُس نے کیا (ذخیرہ) بھیجا ہے (یعنی اعمالِ صالحہ میں کوشش کرو جو کہ ذخیرۂ آخرت ہیں) اور (جس طرح تحصیل طاعات واعمالِ صالحہ میں تقویٰ کا حکم ہے، اسی طرح سیئات ومعاصی سے بچنے کے بارے میں تم کو حکم ہے کہ) اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے (پس معاصی کے اِرتکاب سے اندیشۂ عقوبت ہے، پس پہلا "اتَّقُوا اللّٰهَ" طاعات کے متعلق ہے، جس کا قرینہ "قَدَّمَتْ لِغَدٍ" ہے، اور دُوسرا معاصی کے متعلق ہے، جس کا قرینہ "خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾" ہے) اور (آگے ان اَحکام کی مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے اَحکام) سے بے پروائی کی (یعنی عمل بالا حکام کو ترک کر دیا، اس طرح کہ اَوامر کے خلاف کیا اور نواہی کا اِرتکاب کیا) سو (اثر اس کا یہ ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے خود اُن کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا (یعنی اُن کی ایسی عقل ماری گئی کہ خود اپنے نفع حقیقی کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا) یہی لوگ نافرمان ہیں (اور نافرمانی کی سزا بھگتیں گے، اور اُوپر جن دو قسم کے لوگوں کا ذِکر ہوا، یعنی ایک وہ جو اہلِ تقویٰ ہوئے اور دُوسرے وہ جو تارکِ اَحکام ہوئے، ان میں ایک اہلِ جنت ہیں، دُوسرے اہلِ نار اور) اہلِ نار اور اہلِ جنت باہم برابر نہیں (بلکہ) جو اہلِ جنت ہیں وہ لوگ کامیاب ہیں (اور اہلِ نار ناکام ہیں، جیسا اُوپر "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾" سے معلوم ہوا، پس تم کو اَصحاب الجنۃ میں سے ہونا چاہئے، اہلِ نار میں سے نہ ہونا چاہئے، اور یہ چند نصائح جس قرآن کے ذریعے سے تم کو سنائے جاتے ہیں، وہ ایسا ہے کہ) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے (اور اس میں سمجھنے کا مادّہ رکھ دیتے اور شہوات کا مادّہ نہ رکھتے) تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دَب جاتا اور پھٹ جاتا (یعنی قرآن فی نفسہٖ ایسا مؤثر اور قوی الاثر ہے، مگر اِنسان میں بوجہ غلبۂ شہوات کے قابلیت فاسد ہوگئی، جس کے سبب تأثر نہیں ہوتا، پس اُس کو چاہئے کہ تحصیل طاعات اور ترکِ معاصی سے اپنی شہوت کو مغلوب کرے تاکہ مواعظ قرآنیہ سے اس کو تأثر ہو اور اَحکام پر اِستقامت واِستدامت اور ذِکر وفکر نصیب ہو، جس کا اُوپر حکم ہوا ہے) اور ان مضامینِ عجیبہ کو ہم لوگوں کے (نفع کے) لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (اور منتفع ہوں، اسی

لئے یہ مضمون: "لَوْ اَنْزَلْنَا ... اِلخ" یہاں بیان کیا گیا، آگے حق تعالیٰ کے صفاتِ کمال بیان کئے جاتے ہیں جس سے حق تعالیٰ کی عظمت قلب پر نقش ہو کر اَحکام بجالانے میں مددگار ثابت ہو، پس ارشاد ہے کہ) وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں، وہ جاننے والا ہے، پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا، وہی بڑا مہربان رحم والا ہے، (اور چونکہ توحید نہایت مہتم بالشان چیز ہے، اس لئے اس کی تاکید کے لئے مکرّر فرمایا کہ) وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں، وہ بادشاہ ہے (سب عیبوں سے) پاک ہے، سالم ہے، (یعنی نہ ماضی میں اُس میں کوئی عیب ہوا جو حاصل ہے قُدُّوسِی کا اور نہ آئندہ اس کا اِحتمال ہے جو حاصل ہے سَلَامٌ کا، (کذا فی الکبیر)[1] اپنے بندوں کو خوف کی چیزوں سے) امن دینے والا ہے (اپنے بندوں کی خوف کی چیزوں سے) نگہبانی کرنے والا ہے (یعنی آفت بھی نہیں آنے دیتا اور آئی ہوئی کو بھی دُور کر دیتا ہے) زبردست ہے، خرابی کا دُرست کر دینے والا ہے، بڑی عظمت والا ہے، اللہ تعالیٰ (جس کی یہ شان ہے کہ) لوگوں کے شرک سے پاک ہے، وہ معبود (برحق) ہے، پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے (یعنی ہر چیز کو حکمت کے موافق بناتا ہے)، صورت (شکل) بنانے والا ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں (جو اچھی اچھی صفتوں پر دلالت کرتے ہیں) سب چیزیں اس کی تسبیح (وتقدیس) کرتی ہیں (حالاً یا قالاً) جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس ایسے باعظمت کے اَحکام کی بجا آوری ضرور اور نہایت ضرور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ حشر میں شروع سے کفار اہلِ کتاب اور مشرکین و منافقین کے حالات و معاملات اور اُن پر دُنیا و آخرت کے وبال کا بیان فرمانے کے بعد اب آخر سورت تک مؤمنین کو متنبہ کرنا اور اعمالِ صالحہ کی پابندی کرنے کی ہدایت ہے۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں ایک بلیغ انداز سے آخرت کی فکر اور اس کے لئے تیاری کا حکم ہے، جس میں پہلے فرمایا:- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تم میں سے ہر نفس کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس نے آخرت کے لئے کیا سامان بھیجا ہے۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:-

اوّل:- یہ کہ اس آیت میں قیامت کو لفظ "غَدٍ" سے تعبیر کیا، جس کے معنی ہیں آنے والی کل، اس میں تین چیزوں کی طرف اشارہ ہے، اوّل پوری دُنیا کا بمقابلہ آخرت نہایت قلیل و مختصر ہونا ہے کہ ساری دُنیا آخرت کے مقابلے میں ایک دن کی مثل ہے، اور حساب کے اعتبار سے تو یہ نسبت ہونا بھی مشکل ہے، کیونکہ آخرت دائمی ہے، جس کی کوئی اِنتہا اور اِنقطاع

[1] التفسير الكبير للرازيؒ، تحت هذه الآية ج:۱۵ ص:۳۱۴

نہیں، انسانی دُنیا کی عمر تو چند ہزار سال ہی بتلائی جاتی ہے، اگر زمین و آسمان کی تخلیق سے حساب لگائیں تو چند لاکھ سال ہو جائیں گے، مگر پھر ایک محدود مدّت ہے، غیر محدود اور غیر متناہی سے اس کو کوئی بھی نسبت نہیں ہوتی۔

بعض روایاتِ حدیث میں ہے: ''اَلدُّنْیَا یَوْمٌ وَلَنَا فِیْہِ صَوْمٌ'' ''ساری دُنیا ایک دن ہے اور اُس دن میں ہمارا روزہ ہے۔'' [۱] اور غور کرو تو تخلیقِ انسانی سے شروع کر دیا، تخلیقِ زمین و آسمان سے یہ دونوں چیزیں ایک فردِ انسانی کے لئے قابلِ اہتمام نہیں، بلکہ ہر فرد کی دُنیا تو اس کی عمر کے ایام و سال ہیں، اور وہ آخرت کے مقابلے میں کتنی حقیر مدّت ہے، اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

دُوسرا اِشارہ:- اس میں قیامت کے یقینی ہونے کی طرف ہے، جیسے آج کے بعد کل کا آنا اَمرِ یقینی ہے، کسی کو اس میں شبہ نہیں ہوتا، اسی طرح دُنیا کے بعد قیامت و آخرت کا آنا یقینی ہے۔

تیسرا اِشارہ:- اس طرف ہے کہ قیامت بہت قریب ہے، جیسے آج کے بعد کل کچھ دُور نہیں، بہت قریب سمجھی جاتی ہے، اسی طرح دُنیا کے بعد قیامت بھی قریب ہے۔

اور قیامت ایک تو پورے عالم کی ہے، جب زمین و آسمان سب فنا ہو جائیں گے، وہ بھی اگرچہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد ہو، مگر بمقابلہ مدّتِ آخرت کے بالکل قریب ہی ہے، دُوسری قیامت ہر انسان کی اپنی ہے، جو اس کی موت کے وقت آجاتی ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے: ''مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ'' [۲] یعنی ''جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو اَبھی قائم ہوگئی۔'' کیونکہ قبر ہی سے عالمِ آخرت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، اور عذاب و ثواب کے نمونے سامنے آجاتے ہیں، کیونکہ عالمِ قبر جس کو عالمِ برزخ بھی کہا جاتا ہے، اس کی مثال دُنیا کی انتظار گاہ (ویٹنگ رُوم) کی سی ہے، جو فرسٹ کلاس سے لے کر تھرڈ کلاس تک کے لوگوں کے لئے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اور مجرموں کا ویٹنگ رُوم حوالات یا جیل خانہ ہوتا ہے، اسی انتظار گاہ ہی سے ہر شخص اپنا درجہ اور حیثیت متعین کر سکتا ہے، اس لئے مرنے کے ساتھ ہی ہر اِنسان کی اپنی قیامت آجاتی ہے، اور اِنسان کا مرنا اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا معما بنایا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنس دان اس کا یقینی وقت مقرّر نہیں کر سکتا، بلکہ ہر وقت، ہر آن انسان اس خطرے سے باہر نہیں ہوتا، کہ شاید اگلا گھنٹہ زندگی کی حالت میں نہ آئے، خصوصاً اس برق رفتار زمانے میں تو ہارٹ فیل ہونے کے واقعات نے اس کو روزمرّہ کی بات بنا دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں قیامت کو لفظ ''غَدٌ'' سے تعبیر کر کے بےفکرے انسان کو متنبہ کر دیا کہ قیامت کو کچھ دُور نہ سمجھو، وہ آنے والی کل کی طرح قریب ہے، اور ممکن یہ بھی ہے کہ کل سے پہلے ہی آجائے۔

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۵۵

[۲] شرح السُّنَّة للبغوی، کتاب الفتن، باب قول اللّٰه عزَّ وجلَّ: "وما امر الساعة الا کلمح البصر" ج:۱۵ ص:۹۷

دُوسری غور طلب بات:- اس آیت میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس میں انسان کو اس پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی کہ قیامت جس کا آنا یقینی بھی ہے اور قریب بھی، اس کے لئے تم نے کیا سامان بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا اصل وطن اور مقام آخرت ہے، دُنیا میں اس کا مقام ایک مسافر کی طرح ہے، وطن کے دائمی قیام وقرار کے لئے یہیں سے کچھ سامان بھیجنا ضروری ہے، اور اِنسان کے اس سفر کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ یہاں رہ کر کچھ کمائے اور جمع کرے پھر اس کو اپنے وطنِ آخرت کی طرف بھیج دے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں سے دُنیا کا سامان، مال ودولت کوئی وہاں ساتھ نہیں لے جاسکتا، تو بھیجنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ایک ملک سے دُوسرے ملک کی طرف مال منتقل کرنے کا جو طریقہ دُنیا میں رائج ہے کہ یہاں کی حکومت کے بنک میں جمع کرکے دُوسرے ملک کی کرنسی حاصل کرلے جو وہاں چلتی ہے، یہی صورت آخرت کے معاملے میں ہے کہ جو کچھ یہاں اللہ کی راہ میں اور اللہ کے اَحکام کی تعمیل میں خرچ کیا جاتا ہے، وہ آسمانی حکومت کے بنک (اسٹیٹ بنک) میں جمع ہوجاتا ہے، وہاں کی کرنسی ثواب کی صورت میں اس کے لئے لکھ دی جاتی ہے، اور وہاں پہنچ کر بغیر کسی دعوے اور مطالبے کے اس کے حوالے کردی جاتی ہے۔

اور لفظ "مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" عام ہے، نیک اعمال اور بداعمال دونوں کے لئے جس نے نیک اعمال آگے بھیجے ہیں، اس کو ثواب کی صورت میں آخرت کے نقود (کرنسی) مل جائے گی، اور جس نے بُرے اعمال آگے بھیجے ہیں، وہاں اس پر فردِ جرم عائد ہوگی، اس کے بعد لفظ "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" کا اعادہ کیا گیا، یہ تاکید کے لئے بھی ہوسکتا ہے، اور وہ مراد بھی ہوسکتی ہے جو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوئی کہ پہلے "اتَّقُوا اللّٰہَ" سے واجبات وفرائض کی ادائیگی کا اہتمام سکھایا گیا ہے، اور دُوسرے "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" سے گناہوں سے بچنے کا اہتمام بتلایا گیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے "اتَّقُوا اللّٰہَ" سے اعمال واَحکامِ خداوندی کی تعمیل کرکے آخرت کے لئے کچھ سامان بھیجنے کا حکم ہو، اور دُوسرے "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" سے اس طرف ہدایت ہو کہ دیکھو جو سامان وہاں بھیجتے ہو اس کو دیکھ لو کہ وہ کوئی کھوٹا خراب سامان نہ ہو، جو وہاں کام نہ آئے، کھوٹا سامان وہاں کے لئے وہ ہے کہ جس کی صورت تو عملِ صالح کی ہو مگر اس میں اِخلاص اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو، بلکہ نام ونمود یا اور کوئی غرضِ نفسانی شامل ہو، یا وہ عمل جو صورت میں تو عبادت ہے مگر دِین میں اس کا کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بدعت وگمراہی ہے، تو اس دُوسرے "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" کا خلاصہ یہ ہوا کہ آخرت کے لئے محض سامان کی صورت بنادینا کافی نہیں، دیکھ کر بھیجو کہ کھوٹا سامان نہ ہو جو وہاں نہ لیا جائے۔

فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ یعنی ان لوگوں نے اللہ کو بھول اور نسیان میں کیا ڈالا، درحقیقت خود اپنے آپ کو اس بھول میں ڈال دیا کہ اپنے نفع ونقصان کی خبر نہ رہی۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ، یہ ایک تمثیل ہے کہ اگر قرآن پہاڑوں جیسی سخت اور ثقیل چیز پر اُتارا گیا ہوتا،

اور جس طرح انسان کو فہم و شعور دِیا گیا ہے اُن کو بھی دے دیا جاتا، تو پہاڑ بھی اس قرآن کی عظمت کے سامنے جھک جاتے، بلکہ ریزہ ریزہ ہوجاتے، مگر اِنسان اپنی خواہش پرستی اور خودغرضی میں مبتلا ہوکر اپنے فطری شعور کو کھو بیٹھا، وہ قرآن سے متأثر نہیں ہوتا، گویا یہ ایک فرضی مثال ہے کہ پہاڑوں میں شعور ہوتا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ پہاڑوں اور درختوں اور دُنیا کی تمام چیزوں میں شعور واِدراک ہونا عقل و نقل سے ثابت ہے، اس لئے یہ کوئی فرضی مثال نہیں حقیقت ہے۔ (مظہری) [1] واللہ اعلم۔

انسان کو آخرت کی فکر اور قرآن کی عظمت بتلانے کے بعد آخر میں حق تعالیٰ کی چند صفاتِ کمال کا ذِکر کر کے سورت کو ختم کیا گیا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چھپی اور کھلی چیز اور غائب و حاضر کا پوری طرح جاننے والا ہے۔ اَلْقُدُّوْسُ بضم قاف وہ ذات جو ہر عیب سے پاک اور ہر ایسی چیز سے بَری ہو جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ اَلْمُؤْمِنُ یہ لفظ جب انسان کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ''ایمان لانے والے اور اللہ و رسول کے کلام کی تصدیق کرنے والے'' کے آتے ہیں، اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ''امن دینے والے'' کے ہوتے ہیں، (کما قاله ابن عباس رضی الله عنهما) [2] یعنی وہ اللہ و رسول پر ایمان لانے والوں کو ہر طرح کے عذاب و مصیبت سے امن اور سلامتی دینے والا ہے۔

اَلْمُهَيْمِنُ، اس کے معنی ہیں نگرانی کرنے والا، (کذا قال ابن عباس ومجاهد وقتادة رضی الله عنهم) قاموس میں ہے کہ هَمَنَ يَهْمِنُ کے معنی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے کے آتے ہیں۔ (مظہری) [3]

اَلْعَزِيْزُ بمعنی قوی۔ اَلْجَبَّارُ صاحبِ جبروت و عظمت، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ جَبْرٌ سے مشتق ہو، جس کے معنی ٹوٹی ہڈی وغیرہ کو جوڑنے کے آتے ہیں، اس لئے ''جَبِيْرَة'' اُس پٹی کو کہا جاتا ہے جو ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے بعد اس پر باندھی جاتی ہے، تو معنی اس لفظ کے یہ ہوں گے کہ وہ ہر ٹوٹی ہوئی شکستہ و ناکارہ چیز کی اصلاح کر کے دُرست کردینے والا ہے۔ (مظہری) [4]

اَلْمُتَكَبِّرُ تکبر سے، اور وہ کبریاء سے مشتق ہے، جس کے معنی بڑائی کے ہیں، اور ہر بڑائی درحقیقت اللہ جل شانہٗ کے لئے مخصوص ہے، جو کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں، اور جو محتاج ہو وہ بڑا نہیں ہوسکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا دُوسروں

---

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۵۵

[2] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۸۷

[3] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۵۶

[4] تفسیر المظهری بحوالۂ بالا

کے لئے یہ لفظ عیب اور گناہ ہے، کیونکہ حقیقت میں بڑائی حاصل نہ ہونے کے باوجود بڑائی کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ ذات جو حقیقت میں سب سے بڑی اور بے نیاز ہے، اس کی خاص صفت میں شرکت کا دعویٰ ہے، اس لئے متکبر کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے صفتِ کمال ہے اور غیر اللہ کے لئے جھوٹا دعویٰ۔

الْمُصَوِّرُ، کے معنی صورت بنانے والا، مراد یہ ہے کہ تمام مخلوقات کو حق تعالیٰ نے خاص خاص شکل وصورت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے وہ دُوسری چیزوں سے ممتاز ہوئی اور پہچانی جاتی ہے، دُنیا کی عام مخلوقات آسمانی اور زمینی خاص خاص صورتوں ہی سے پہچانی جاتی ہیں، پھر ان میں انواع واصناف کی تقسیم اور ہر نوع وصنف کی جداگانہ ممتاز شکل وصورت اور ایک ہی نوعِ انسانی میں مرد وعورت کی شکل وصورت کا امتیاز پھر سب مردوں سب عورتوں کی شکلوں میں باہم ایسے امتیازات کہ اربوں کھربوں انسان دُنیا میں پیدا ہوئے ایک کی صورت بالکلیہ دُوسرے سے نہیں ملتی کہ بالکل امتیاز نہ ہو سکے، یہ کمالِ قدرت صرف ایک ہی ذاتِ حق جل شانہٗ کا ہے، جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، جس طرح غیر اللہ کے لئے تکبر جائز نہیں کہ کبریاء صرف اللہ جل شانہٗ کی صفت ہے، اسی طرح تصویر سازی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت میں شرکت کا عملی دعویٰ ہے۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ یعنی ''اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں'' قرآنِ کریم میں ان کی تعداد متعین نہیں فرمائی، صحیح احادیث میں ننانوے تعداد بتلائی ہے، ترمذی کی ایک حدیث میں یہ سب یک جا مذکور ہیں، اور بہت سے علماء نے اسمائے حسنیٰ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، احقر کا بھی ایک مختصر رسالہ ''اسمائے حسنیٰ'' کے نام سے ''مناجاتِ مقبول'' کے شروع میں طبع ہوا ہے۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یہ تسبیح زبانِ حال سے ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ ساری مخلوقات اور ان کے اندر رکھی ہوئی عجیب وغریب صنعتیں اور صورتیں زبانِ حال سے اپنے بنانے والے کی حمد وثنا میں مشغول ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ حقیقی تسبیح مراد ہو، کیونکہ تحقیق یہی ہے کہ تمام اشیاء کو عالم میں اپنی اپنی حیثیت کا عقل وشعور ہے، اور عقل وشعور کا سب سے پہلا مقتضیٰ اپنے بنانے والے کو پہچاننا اور اس کا شکر گزار ہونا ہے، اس لئے ہر چیز حقیقۃً تسبیح کرتی ہو تو اس میں کوئی بُعد نہیں، اگرچہ ہم ان کی تسبیح کو کانوں سے نہ سن سکیں، اسی لئے قرآنِ کریم نے ایک جگہ فرمایا ہے: وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ (بنی اسرائیل: ۴۴) یعنی تم اُن کی تسبیح کو سنتے سمجھتے نہیں۔

سورۂ حشر کی آخری آیات کے فوائد وبرکات

ترمذی میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صبح

کے وقت تین مرتبہ ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ '' اور اس کے ساتھ ایک مرتبہ سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں: ''ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ '' سے آخر سورت تک پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرّر فرما دیتے ہیں جو شام تک اس کے لئے رحمت کی دُعا کرتے رہتے ہیں، اگر اس دن میں وہ مرگیا تو شہادت کی موت حاصل ہوگی، اور جس نے شام کو یہی کلمات تین مرتبہ پڑھ لئے تو یہی درجہ اس کو حاصل ہوگا۔ (مظہری) [1]

تَمَّتْ

بِعَوْنِ اللّٰہِ تَعَالٰی سُبْحَانَہٗ وَحَمْدِہٖ سُوْرَۃُ الْحَشْرِ

لِعَاشِرِ جُمَادَی الْاُوْلٰی ۱۳۹۱ھ ضُحَا یَوْمَ الْاَحَدِ وَیَتْلُوْھَا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی سُوْرَۃُ الْمُمْتَحِنَۃِ

---

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۵۷، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فیمن قرأ حرفًا من القرآن ما له من الأجر، ج:۲ ص:۱۱۹

سُورَةُ المُمتَحنَة

أياتها ۱۳ | ۶۰ سُورَةُ المُمتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱ | رکوعاتھا ۲

سورۂ ممتحنہ مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی تیرہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ

اے ایمان والو نہ پکڑو میرے اور اپنے دُشمنوں کو دوست

تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ

تم اُن کو پیغام بھیجتے ہو دوستی سے اور وہ منکر ہوئے ہیں اس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دِین،

یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاکُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ

نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو ربّ ہے تمہارا، اگر تم نکلے ہو

خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۚ تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ ۖ

لڑنے کو میری راہ میں اور طلب کرنے کو میری رضامندی، تم ان کو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کے پیغام،

وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ ۚ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ

اور مجھ کو خوب معلوم ہے جو چھپایا تم نے اور جو ظاہر کیا تم نے، اور جو کوئی کرے تم میں یہ کام تو وہ بھول گیا

سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١﴾ إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ

سیدھی راہ۔ اگر تم اُن کے ہاتھ آجاؤ ہوجائیں تمہارے دُشمن اور چلائیں تم پر

أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ﴿٢﴾ لَن تَنفَعَكُمْ

اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں بُرائی کے ساتھ اور چاہیں کہ کسی طرح تم بھی منکر ہوجاؤ، ہرگز کام نہ آئیں گے

أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ

تمہارے کنبے والے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن وہ فیصلہ کرے گا تم میں اور اللہ

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣﴾ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ

جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے، تم کو چال چلنی چاہئے اچھی ابراہیم کی

وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ

اور جو اس کے ساتھ تھے، جب انہوں نے کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور ان سے کہ جن کو تم پوجتے ہو

مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ

اللہ کے سوائے، ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دُشمنی

معانقۃ ۱۲ — السماء الوقف علی القیمۃ ۱۲

وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ

اور بیر ہمیشہ کو، یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ اکیلے پر مگر ایک کہنا ابراہیم کا اپنے باپ کو

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا

کہ میں مانگوں گا معافی تیرے لئے اور مالک نہیں میں تیرے نفع کا اللہ کے ہاتھ سے کسی چیز کا، اے رَبّ ہمارے

عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ④ رَبَّنَا

ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رُجوع ہوئے اور تیری طرف ہے سب کو پھر آنا، اے رَبّ ہمارے

لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ

مت جانچ ہم پر کافروں کو اور ہم کو معاف کر اے رَبّ ہمارے تو ہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ⑤ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ

حکمت والا، البتہ تم کو بھلی چال چلنی چاہئے ان کی جو کوئی اُمید رکھتا ہو اللہ کی

وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ⑥ ع

اور پچھلے دن کی، اور جو کوئی منہ پھیرے تو اللہ وہی ہے بے پرواسب تعریفوں والا

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے ایمان والو! اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے کی خاطر اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (گھروں سے) نکلے ہو تو میرے دُشمنوں اور اپنے دُشمنوں کو ایسا دوست مت بناؤ کہ اُن کو محبت کے پیغام بھیجنے لگو، حالانکہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے، انہوں نے اس کو اتنا جھٹلایا ہے کہ وہ رسول کو بھی اور تمہیں بھی صرف اس وجہ سے (مکّے سے) باہر نکالتے

رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو۔تم ان سے خفیہ طور پر دوستی کی بات کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم خفیہ طور پر کرتے ہو، اور جو کچھ علانیہ کرتے ہو، میں اُس سب کو پوری طرح جانتا ہوں۔ اور تم میں سے جو کوئی بھی ایسا کرے، وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔ ① اگر تم ان کے ہاتھ آ جاؤ تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے، اور اپنے ہاتھ اور زبانیں پھیلا پھیلا کر تمہارے ساتھ بُرائی کریں گے، اور اُن کی خواہش یہ ہے کہ تم کافر بن جاؤ۔ ② قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں ہرگز تمہارے کام آئیں گی، اور نہ تمہاری اولاد۔ اللہ ہی تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُسے پوری طرح دیکھتا ہے۔ ③ تمہارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جب اُنھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا تم جن جن کی عبادت کرتے ہو، اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے دُشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔ البتہ ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ ضرور کہا تھا کہ: ''میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت کی دُعا ضرور مانگوں گا، اگرچہ اللہ کے سامنے میں آپ کو کوئی فائدہ پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے پروردگار! آپ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، اور آپ ہی کی طرف ہم رُجوع ہوئے ہیں، اور آپ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ ④ اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافروں کا تختۂ مشق نہ بنایئے، اور ہمارے پروردگار! ہماری مغفرت فرما دیجئے۔ یقیناً آپ، اور صرف آپ کی ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔'' ⑤ (مسلمانو!) یقیناً تمہارے لئے ان لوگوں کے طرزِ عمل میں بہترین نمونہ ہے، ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت سے اُمید رکھتا ہو۔ اور جو شخص منہ موڑے، تو (وہ یاد رکھے کہ) اللہ سب سے بے نیاز ہے، بذاتِ خود قابلِ تعریف۔ ⑥

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم میرے دُشمنوں اور اپنے دُشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو (یعنی گو دِل سے دوستی نہ ہو مگر ایسا دوستانہ برتاؤ بھی مت کرو) حالانکہ تمہارے پاس جو دینِ حق آ چکا ہے وہ اس کے منکر ہیں (جس سے اُن کا دُشمنِ خدا تعالیٰ ہونا معلوم ہوا، جو آیت میں بلفظ ''عَدُوِّیْ'' بیان کیا گیا) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں (یہ بیان ہے ''عَدُوَّکُمْ'' کا، یعنی وہ صرف اللہ کے دُشمن نہیں، تمہارے بھی دُشمن ہیں۔ غرض ایسے لوگوں سے دوستی مت کرو) اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو (کفار کی دوستی جس کا حاصل کفار کی رضامندی کی فکر ہے، اور یہ حق تعالیٰ کی رضاجوئی اور اس کے مناسب اعمال کے منافی ہے) تم اُن سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو

(یعنی اوّل تو دوستی ہی بُری چیز ہے، پھر خفیہ پیغام بھیجنا جو خصوصی ربط و تعلق کی علامت ہے یہ اور زیادہ بُرا ہے) حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کر کے کرتے ہو (یعنی مثل دُوسرے موانع مذکورہ کے یہ امر بھی ان کی دوستی سے مانع ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کی خبر ہے) اور (آگے اس پر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہِ راست سے بہک گیا، (اور انجام گمراہوں کا معلوم ہی ہے، آگے اُن کی دُشمنی کا بیان ہے کہ وہ تمہارے ایسے سخت دُشمن ہیں کہ) اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو (فوراً) اِظہارِ عداوت کرنے لگیں اور (وہ اِظہارِ عداوت یہ کہ) تم پر بُرائی (اور ضرر رسانی) کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں (یہ تو دُنیوی نقصان ہے) اور (دینی اِضرار یہ کہ) وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کافر (ہی) ہو جاؤ (پس ایسے لوگ کب قابلِ دوستی ہیں؟ اور اگر تم کو دوستی کے بارے میں اپنے اہل و عیال کا خیال ہو تو خوب سمجھ لو کہ) تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے (کچھ) کام نہ آئیں گے خدا (ہی) تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے (پس ہر عمل کا فیصلہ ٹھیک کرے گا، پس اگر تمہارے اعمال موجبِ سزا ہوں گے تو اس سزا سے اولاد و اَرحام بچا نہ سکیں گے، پھر اُن کی رعایت میں خدا کے حکم کے خلاف کرنا بہت مذموم اَمر ہے، اور اس سے اموال کا قابلِ رعایت نہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، آگے حکم مذکور پر تحریض کے لئے حضرت اِبراہیم علیہ السلام کا قصہ ارشاد ہے کہ) تمہارے لئے اِبراہیم (علیہ السلام) میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان و اطاعت میں) ان کے شریکِ حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے (یعنی اس بارے میں کفار سے ایسا برتاؤ رکھنا چاہئے، جیسے حضرت اِبراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے کیا) جب کہ ان سب نے (اوقاتِ مختلفہ میں) اپنی قوم (کے لوگوں) سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو، اُن سے بیزار ہیں (اوقاتِ مختلفہ اس لئے کہا گیا کہ اِبراہیم علیہ السلام نے جس وقت اوّل یہ بات اپنی قوم سے کہی تھی اس وقت وہ بالکل تنہا تھے، پھر جو جو آپ کے ساتھ ہوتے گئے کفار سے قطع تعلق قولاً و فعلاً کرتے گئے، آگے اس بیزاری کا بیان ہے کہ) ہم تمہارے (یعنی کفار اور ان کے معبودین کے) منکر ہیں (یعنی تمہارے عقائد اور معبودات کی عبادت کے منکر ہیں، یہ تو تبری باعتبار عقیدہ کے ہوئی) اور (تبری باعتبار معاملہ اور برتاؤ کے یہ ہے کہ) ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا (کیونکہ بناءِ عداوت کی اِختلافِ عقائد ہے، اور اَب اس کا زیادہ اعلان ہو گیا تو عداوت کا بھی زیادہ اظہار ہو گیا، عداوت اور بغض متقارب ہیں اور دونوں کا جمع کرنا تاکید کے لئے ہے، اور یہ عداوت ہم کو تم سے ہمیشہ رہے گی) جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ (غرض اِبراہیم علہ السلام اور ان کے متبعین نے کفار سے صاف قطع تعلق کر دیا) لیکن اِبراہیم (علیہ السلام) کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی (جس سے بظاہر ان کے ساتھ محبت و دوستی کا اِحتمال تھا) کہ میں تمہارے لئے اِستغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے (اِستغفار سے زیادہ) مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اِختیار نہیں (کہ دُعا کو قبول کرا لوں یا باوجود ایمان نہ لانے کے تم کو

عذاب سے بچالوں۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی بات تو اِبراہیم علیہ السلام نے کہی تھی، جس کا مطلب تم میں سے بعض لوگ مطلق اِستغفار سمجھ گئے، حالانکہ یہ اِستغفار کے دُوسرے معنی ہیں، یعنی اُن کے لئے یہ دُعا کرنا کہ وہ ایمان لاکر مغفرت کے مستحق بن جائیں، جس کی سب کو اِجازت ہے، اور واقع میں وہ قطع تعلق کے خلاف بھی نہیں، مگر ظاہری صورتِ تعلق اور ظاہری معنی اِستغفار کے اعتبار سے صورۃً اس کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ یہ گفتگو تو اِبراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم سے ہوئی، آگے اُن کی دُعا کا مضمون ہے، یعنی کفار سے قطع تعلق کر کے انہوں نے اس بارے میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم (کفار کے اعلانِ براءت وعداوت کے معاملے میں) آپ پر توکل کرتے ہیں اور (آپ ہی ہماری تمام مہمات ومشکلات کی کفالت اور دُشمنوں کی ایذاؤں سے حفاظت فرمائیں گے، ونیز ایمان لانے میں) آپ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں اور (اِعتقاد رکھتے ہیں کہ) آپ ہی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے (پس اس اعتقاد کی وجہ سے ہم نے جو کچھ کفار سے اعلانِ براءت کیا ہے محض خلوص سے کیا ہے، اس میں کوئی دُنیوی غرض نہیں، اور اس سے مقصود تفاخر بھی نہیں، بلکہ عرضِ حال بغرضِ سوال ہے، اور) اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنا، (یعنی ہم پر اس تبری سے یہ کافر ظلم نہ کرنے پائیں) اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف کردیجئے، بے شک آپ زبردست حکمت والے ہیں (اور ہر طرح کی آپ کو قدرت حاصل ہے) بے شک ان لوگوں میں (یعنی اِبراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین میں) تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ (کے سامنے جانے) کا اور قیامت کے دن (کے آنے) کا اِعتقاد رکھتا ہو (یعنی یہ اعتقاد مقتضی ہے اس بارے میں اِتباعِ اِبراہیمی کو) اور (آگے دُوسرے طرز پر وعید ہے جیسے اس سے پہلے ''وَمَنْ يَّفْعَلْهُ'' میں وعید آچکی ہے، یعنی) جو شخص (اس حکم سے) روگردانی کرے گا سو (اسی کا ضرر ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بالکل بے نیاز اور (بوجہ جامع الکمالات ہونے کے) سزاوارِ حمد ہے۔

معارف ومسائل

اس سورت کا ابتدائی حصہ کفار ومشرکین سے موالات اور دوستانہ تعلقات رکھنے کی حرمت وممانعت میں آیا ہے، اور اس کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے۔

شانِ نزول

تفسیر قرطبی میں قشیری اور ثعلبی کے حوالے سے مذکور ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد فتحِ مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ کی ایک مغنیہ عورت جس کا نام سارہ تھا، پہلے مدینہ طیبہ آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ہجرت کر کے آئی

ہوتو کہا کہ نہیں، آپ نے پوچھا کہ کیا پھر تم مسلمان ہو کر آئی ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا، آپ نے فرمایا کہ پھر یہاں کس غرض سے آئی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ مکہ مکرمہ کے اعلیٰ خاندان کے لوگ تھے، آپ ہی میں میرا گزارہ تھا، اب مکہ کے بڑے سردار تو غزوۂ بدر میں مارے گئے اور آپ لوگ یہاں چلے آئے ہیں، میرا گزارہ مشکل ہو گیا، میں سخت حاجت وضرورت میں مبتلا ہو کر آپ سے مدد لینے کے لئے یہاں آئی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم مکہ مکرمہ کی پیشہ ور مغنیہ ہو، وہ مکہ کے نوجوان کیا ہوئے (جو تجھ پر روپیہ پیسے کی بارش کیا کرتے تھے) اس نے کہا کہ واقعۂ بدر کے بعد (ان کی تقریبات اور جشنِ طرب ختم ہو چکے ہیں) اس وقت سے کسی نے مجھے نہیں بلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالمطلب کو اس کی اِمداد کرنے کی ترغیب دی، انہوں نے اس کو نقد اور پوشاک وغیرہ دے کر رُخصت کیا۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب صلح حدیبیہ کے معاہدے کو کفارِ قریش نے توڑ ڈالا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ پر حملہ آور ہونے کا اِرادہ کر کے اس کی خفیہ تیاری شروع کر رکھی تھی، اور یہ دُعا بھی کی تھی کہ ہمارا راز اہلِ مکہ پر قبل اَز وقت فاش نہ ہو۔ اِدھر مہاجرینِ اَوّلین میں ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہؓ تھے، جو اَصل سے یمن کے باشندے تھے، مکہ مکرمہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے، وہاں ان کا کوئی کنبہ قبیلہ نہ تھا، وہیں مسلمان ہو گئے، پھر ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے، ان کے اہل وعیال بھی مکہ ہی میں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت صحابۂ کرام کی ہجرت کے بعد مشرکینِ مکہ اُن مسلمانوں کو جو مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے، ستاتے اور پریشان کرتے تھے، جن مہاجرین کے خویش وعزیز مکہ میں موجود تھے، ان کو تو کسی درجے میں تحفظ حاصل تھا، حاطبؓ کو یہ فکر تھی کہ میرے اہل وعیال کو دُشمنوں کی ایذاؤں سے بچانے والا وہاں کوئی نہیں، انہوں نے اپنے اہل وعیال کے تحفظ کا موقع غنیمت جانا کہ اہلِ مکہ پر کچھ اِحسان کر دیا جائے تو وہ ان کے بچوں پر ظلم نہ کریں گے۔

ان کو اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حق تعالیٰ فتح ہی عطا فرمائیں گے، آپ کو یا اِسلام کو یہ راز فاش کر دینے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اگر میں نے ان کو کوئی خط لکھ کر اس کی اطلاع کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرادہ تم لوگوں پر حملہ کرنے کا ہے تو میرے بچوں کی حفاظت ہو جائے گی۔ یہ غلطی ان سے ہو گئی کہ ایک خفیہ خط اہلِ مکہ کے نام لکھ کر اس جانے والی عورت سارہ کے سپرد کر دیا۔ (قرطبی ومظہری) [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس معاملے کی اطلاع دے دی اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ عورت اس وقت روضۂ خاخ کے مقام تک پہنچ چکی ہے۔

صحیحین بخاری ومسلم میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۵۰ و۵۱، والمظهری ج:۹ ص:۲۵۸

ابومرثد اور زُبیر بن عوّام کو حکم دیا کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اُس عورت کا تعاقب کرو، وہ تمہیں روضۂ خاخ میں ملے گی، اور اس کے ساتھ حاطب بن ابی بلتعہ کا خط بنام مشرکینِ مکہ ہے، اس کو پکڑ کر وہ خط واپس لے لو۔ حضرت علی کرّم اللّٰہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حسب الحکم تیزی کے ساتھ تعاقب کیا، اور ٹھیک اسی جگہ جہاں کے لئے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی اس عورت کو اُونٹ پر سوار جاتے ہوئے پکڑ لیا، اور ہم نے کہا کہ وہ خط نکالو جو تمہارے پاس ہے، اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی کسی کا خط نہیں۔ ہم نے اس کے اُونٹ کو بٹھادیا، اس کی تلاشی لی مگر خط ہمیں ہاتھ نہ آیا، لیکن ہم نے دل میں کہا کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خبر غلط نہیں ہوسکتی، ضرور اس نے خط کو کہیں چھپایا ہے، تو اَب ہم نے اس کو کہا کہ یا تو خط نکال دو، ورنہ ہم تمہارے کپڑے اُتروائیں گے۔

جب اُس نے دیکھا کہ اب ان کے ہاتھ سے نجات نہیں تو اپنے اِزار میں سے یہ خط نکالا، ہم یہ خط لے کر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللّٰہ عنہ نے واقعہ سنتے ہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس شخص نے اللّٰہ اور اس کے رسول اور سب مسلمانوں سے خیانت کی کہ ہمارا راز کفار کو لکھ دیا، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن ماردُوں۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے حاطب بن ابی بلتعہ سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس حرکت پر آمادہ کیا؟ حاطب بن ابی بلتعہؓ نے عرض کیا یارسول اللّٰہ! میرے ایمان میں اب بھی ذرا فرق نہیں ہے، بات یہ ہے کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اہلِ مکہ پر کچھ اِحسان کردوں تا کہ وہ میرے اہل وعیال کو کچھ نہ کہیں، میرے سوا دُوسرے حضراتِ مہاجرین میں کوئی ایسا نہیں جس کا کنبہ قبیلہ وہاں موجود نہ ہو جو اُن کے اہل وعیال کی حفاظت کرے۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے حاطبؓ کا بیان سن کر فرمایا کہ اس نے سچ کہا ہے، اس کے معاملے میں خیر کے سوا کچھ نہ کہو۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے (اپنی غیرتِ ایمانی سے) پھر اپنی بات دُہرائی اور اُن کے قتل کی اجازت مانگی، آپ نے فرمایا کہ کیا یہ اہلِ بدر (یعنی غزوۂ بدر کے شرکاء) میں سے نہیں ہیں، اللّٰہ تعالیٰ نے سب شرکائے غزوۂ بدر کی مغفرت کا اور ان کے لئے وعدۂ جنت کا اعلان فرمادیا ہے۔ یہ سن کر حضرت فاروقِ اعظمؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور عرض کیا کہ اللّٰہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی حقیقت کا علم رکھتے ہیں۔ (یہ بخاری کی روایت کتاب المغازی، غزوۂ بدر میں ہے، اَز ابن کثیر) [1] اور بعض روایات میں حاطبؓ کا یہ قول بھی ہے کہ میں نے یہ کام اسلام اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے لئے ہرگز نہیں کیا، کیونکہ میرا یقین تھا کہ آپ کو فتح ہی ہوگی، اہلِ مکہ کو خبر بھی ہوگئی تو آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۸۲ و۸۳، وصحيح البخاري، كتاب المغازي، باب فضل من شهد بدرًا، ج:۲ ص:۵۶۷

اس واقعے کی بنا پر سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، جن میں اس واقعے پر سرزنش اور تنبیہ اور مسلمانوں کو کفار کے ساتھ کسی قسم کے دوستانہ تعلق رکھنے کو حرام قرار دیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ، یعنی ''اے ایمان والو! میرے دُشمن اور اپنے دُشمن کو دوست نہ بناؤ کہ تم اُن کو دوستی کے پیغام دو۔'' اس میں اسی واقعۂ مذکورہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کا خط کفار کو لکھنا ان کو دوستی کا پیغام دینا ہے، اور آیت میں لفظ ''کفار'' کو چھوڑ کر ''عَدُوِّيْ'' اور ''عَدُوَّكُمْ'' کا عنوان اِختیار کرنے میں اوّل تو اس حکم کی علت اور دلیل کی طرف اشارہ ہوگیا کہ اپنے اور خدا کے دُشمنوں سے دوستی کی توقع رکھنا سخت دھوکا ہے، اس سے بچو، دُوسرے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ کافر جب تک کافر ہے وہ کسی مسلمان کا جب تک کہ وہ مسلمان ہے دوست نہیں ہوسکتا، وہ خدا کا دُشمن ہے تو مسلمان جو خدا کی محبت کا دعوے دار ہے، اس سے اس کی دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔

وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ حق سے مراد قرآن یا اسلام ہے، اس آیت میں ان کا کفر جو اصل سبب ہے عداوت کا اس کا بیان کرنے کے بعد ان کی ظاہری عداوت کو بھی بتلایا کہ انہوں نے تم کو اور تمہارے رسول کو ان کے وطنِ عزیز سے نکالا اور اس نکالنے کی وجہ کوئی دُنیاوی سبب نہ تھا بلکہ صرف تمہارا ایمان اس کا سبب تھا، تو یہ بات کھل گئی کہ جب تک تم مؤمن ہو، وہ تمہارے دوست نہیں ہوسکتے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جیسا حاطبؓ نے خیال کیا تھا کہ اُن پر کچھ احسان کردُوں گا تو وہ میرے اہل وعیال کی حفاظت کریں گے، یہ خیال غلط ہے، کیونکہ وہ تمہارے دُشمن ایمان کی وجہ سے ہیں، جب تک خدانخواستہ تمہارا ایمان سلب نہ ہوجائے ان سے کسی دوستی وتعلق کی توقع رکھنا دھوکا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۤ اس میں بھی اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تمہاری ہجرت واقعی اللہ کے لئے اور اس کی رضاجوئی کے لئے تھی تو کسی کافر دُشمنِ خدا سے اس کی کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمہاری کوئی رعایت کرے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ اس میں یہ بھی بتلادیا کہ جو لوگ کفار سے خفیہ دوستی رکھیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ حرکت پوشیدہ رہ جائے گی، اللہ تعالیٰ کو اُن کے چھپے اور کھلے ہر حال اور عمل کی خبر ہے، جیسا کہ واقعۂ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی خبردار کرکے سازش کو پکڑوادیا۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ، یعنی ان لوگوں سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ موقع پانے کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی رواداری برتیں گے، اس کا کوئی اِمکان نہیں، ان کو جب کبھی تم پر غلبہ حاصل ہوگا تو

اُن کے ہاتھ اور زبان تمہاری بُرائی اور خرابی کے سوا کسی چیز کی طرف نہ اُٹھیں گے۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ اس میں اشارہ ہے کہ جب تم اُن سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو ان کی دوستی صرف تمہارے ایمان کی قیمت پر ہوگی، جب تک تم کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤ، وہ کبھی تم سے راضی نہ ہوں گے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ یعنی قیامت کے روز تمہارے رشتے ناتے اور تمہاری اولاد تمہارے کام نہ آئیں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز یہ سب تعلقات ختم کر دیں گے، اولاد ماں باپ سے اور ماں باپ اولاد سے بھاگتے پھریں گے، اس میں حضرت حاطبؓ کے عذر کی تردید ہے کہ جس اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر یہ کام کیا تھا، سمجھ لو کہ قیامت کے دن وہ اولاد تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اور اللہ تعالیٰ سے کوئی راز اور خفیہ چیز چھپنے والی نہیں۔

اگلی آیات میں کفار سے ترکِ موالات کی تائید و تاکید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ذِکر کیا گیا ہے کہ اُن کا تو سارا خاندان مشرکین کا تھا، انہوں نے سب سے بیزاری اور براءت کا ہی نہیں، بلکہ عداوت کا اعلان کر دیا، اور بتلا دیا کہ جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ گے اور اپنے شرک سے باز نہ آؤ گے ہمارے تمہارے درمیان بغض و عداوت کی دیوار حائل رہے گی، قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (تا) حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ کا یہی مطلب ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اُوپر کی آیت میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ اور سنت پر چلنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے والد مشرک کے لئے اِستغفار کرنا ثابت ہے، جس کا ذِکر سورۂ توبہ وغیرہ میں آیا ہے تو اتباعِ سنتِ ابراہیمی کے حکم سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اپنے مشرک والدین یا عزیزوں کے لئے دُعائے مغفرت کرنا بھی اس میں داخل ہے، یہ جائز ہونا چاہئے، اس لئے اس اُسوۂ ابراہیمی کے اِتباع سے اس کو مستثنیٰ کر کے فرما دیا کہ اور سب چیزوں میں اُسوۂ ابراہیمی کا اِتباع لازم ہے، مگر ان کے اس فعل کی اقتدا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ مشرک والدین اور عزیزوں کے لئے دُعائے مغفرت کرنے لگیں۔ آیت اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ کا یہی مطلب ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عذر سورۂ توبہ میں آ چکا ہے کہ انہوں نے باپ کے لئے اِستغفار کا وعدہ ممانعت سے پہلے کر لیا تھا، یا اس گمان پر کر لیا تھا کہ اس کے دل میں ایمان آ گیا ہے، جب معلوم ہوا کہ وہ خدا کا دُشمن ہے تو اس سے بھی براءت و بیزاری کا اعلان کر دیا: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ الآیۃ (التوبۃ: ۱۱۴) کا یہی مطلب ہے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے "اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ" کے استثنیٰ کو استثنائے منقطع قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار اس اُسوۂ ابراہیمی کے منافی نہیں، کیونکہ انہوں نے اس بنا پر استغفار کیا تھا کہ انہوں نے گمان کیا تھا کہ وہ مسلمان ہوگیا، پھر جب حقیقت معلوم ہوگئی تو استغفار چھوڑ دیا اور براءت و بیزاری کا اعلان فرمادیا، اور ایسا کرنا اب بھی جائز ہے کہ جس شخص کو کسی کافر کے متعلق گمانِ غالب یہ ہوجائے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے، اس کے استغفار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، (قرطبی)[1] خلاصۂ تفسیر مذکور میں بھی اسی صورت کو اختیار کرکے تفسیر کی گئی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ط

اُمید ہے کہ کردے اللہ تم میں اور جو دُشمن ہیں تمہارے ان میں دوستی،

وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ

اوراللہ سب کچھ کرسکتا ہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے

لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ

جو لڑے نہیں تم سے دِین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلائی

وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ

اور اِنصاف کا سلوک، بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو۔ اللہ تو منع کرتا ہے تم کو

عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا

ان سے جو لڑے تم سے دِین پر اور نکالا تم کو تمہارے گھروں سے اور شریک ہوئے

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۵۷

عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨

تمہارے نکالنے میں کہ ان سے کرو دوستی، اور جو کوئی اُن سے دوستی کرے سو وہ لوگ وہی ہیں گنہگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تمہارے اور جن لوگوں سے تمہاری دُشمنی ہے، اُن کے درمیان دوستی پیدا کر دے، اور اللہ بڑی قدرت والا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ⑦ اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے دِین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اُن کے ساتھ تم کوئی نیکی کا یا انصاف کا معاملہ کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ⑧ اللہ تو تمہیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ دِین کے معاملے میں جنگ کی ہے، اور تمہیں اپنے گھروں سے نکالا ہے، اور تمہیں نکالنے میں ایک دُوسرے کی مدد کی ہے، تم اُن سے دوستی رکھو۔ اور جو لوگ اُن سے دوستی رکھیں گے، وہ ظالم لوگ ہیں۔ ⑨

خلاصۂ تفسیر

(اور چونکہ ان کی عداوت سن کر مسلمانوں کو فکر ہو سکتی تھی، کچھ قطعِ قرابات سے طبعًا رنج ہو سکتا تھا، اس لئے بطور بشارت کے آگے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے (یعنی ادھر سے وعدہ ہے) کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کر دے (گو بعض ہی سے سہی، یعنی ان کو مسلمان کر دے جس سے عداوت مبدل بہ صداقت ہو جائے) اور (اس کو کچھ بعید نہ سمجھو کیونکہ) اللہ کو بڑی قدرت ہے (چنانچہ فتحِ مکہ کے روز بہت آدمی خوشی سے مسلمان ہو گئے، مطلب یہ کہ اوّل تو اگر قطع تعلق ہمیشہ کے لئے ہوتا، تب بھی بوجہ مامور بہ ہونے کے واجب العمل تھا، پھر خاص کر جبکہ تھوڑی ہی مدّت کے لئے کرنا پڑے اور پھر مشارکت فی الایمان سے دوستی اور تعلق بدستور عود کر آئے تو کوئی فکر کی بات نہیں) اور (اب تک جو کسی سے اس حکم کے خلاف خطا ہو گئی ہے جس سے اب وہ تائب ہو چکا ہے تو) اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) غفور رحیم ہے (اور یہاں تک تو دوستانہ تعلقات کی نسبت حکم فرمایا تھا کہ ان کا قطع واجب ہے، آگے محسنانہ تعلقات کے حکم کی تفصیل فرماتے ہیں وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ تم کو اُن لوگوں کے ساتھ احسان اور اِنصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دِین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا (مراد وہ کافر ہیں جو ذِمی یا مصالح ہوں، یعنی محسنانہ برتاؤ ان سے جائز ہے، باقی رہا عدل و انصاف کا منصفانہ برتاؤ تو اس میں ذِمی یا مصالح کی شرط نہیں بلکہ

وہ تو ہر کافر بلکہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے، اس آیت میں عدل و انصاف سے مراد محسنانہ برتاؤ کرنا ہے، اس لئے مصالحین کے ساتھ مخصوص کیا گیا) اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں (البتہ) صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی (یعنی بِرّ و احسان) کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دِین کے بارے میں لڑے ہوں (خواہ بالفعل یا بالعزم) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا نہ بھی ہو، لیکن) تمہارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو (یعنی اُن کے ساتھ شریک ہوں، خواہ ان کے عمل میں شرکت کی ہو، یا عزم و ارادہ اس کا رکھتے ہوں، اس میں وہ سب کافر آ گئے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ صلح کا یا عقدِ ذِمہ نہیں تھا، ان کے ساتھ بِرّ و احسان کا معاملہ جائز نہیں، بلکہ ان سے جنگ اور مقابلہ مطلوب ہے) اور جو شخص ایسوں سے دوستی (کا برتاؤ یعنی بِرّ و احسان کا برتاؤ) کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار سے دوستانہ تعلق رکھنے کی سخت ممانعت و حرمت کا بیان آیا ہے، اگرچہ وہ کفار رشتہ و قرابت میں کتنے ہی قریب ہوں۔ صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکام کے معاملے میں نہ ذاتی خواہش کی پروا کرتے تھے، نہ کسی خویش و عزیز کی، اس پر عمل کیا گیا، جس کے نتیجے میں گھر گھر یہ صورت پیش آئی کہ باپ مسلمان بیٹا کافر، یا اس کے برعکس ہے تو دوستانہ تعلق قطع کر دیا گیا، ظاہر ہے انسانی فطرت اور طبیعت پر یہ عمل آسان نہ تھا، اس لئے آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی اس مشکل کو عنقریب آسان کر دینے کی خبر سنادی۔

بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ جب اللہ کی رضاجوئی کے لئے اپنی کسی محبوب چیز کو چھوڑتا ہے تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسی چیز کو حلال کر کے اس تک پہنچا دیتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتے ہیں۔

ان آیات میں حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ آج جو لوگ کفر پر ہیں اور اس کی وجہ سے وہ تمہارے دُشمن، تم ان کے دُشمن ہو، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عداوت کو دوستی سے مبدل فرما دے، مطلب یہ ہے کہ اُن کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر تمہارے تعلقاتِ باہمی کو پھر اَز سرِ نو ہموار کر دے، اس پیشین گوئی کا ظہور فتحِ مکہ کے وقت اس طرح ہوا کہ بجز اُن کفار کے جو قتل کئے گئے اور سب مسلمان ہو گئے۔ (مظہری) [1] قرآنِ کریم میں اس کا بیان: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ (النصر) میں کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ فوج فوج بڑی تعدادوں میں اللہ کے دِینِ اسلام میں داخل ہو جائیں گے، اور ایسا ہی ہوا۔

---

[1] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۶۱

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ اُن کی والدہ بحالتِ کفر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچیں۔ (مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ غزوۂ حدیبیہ کے بعد قریشِ مکہ سے معاہدۂ صلح ہو گیا تھا اور ان کی والدہ کا نام قُتَیْلَہ ہے، یہ اپنی بیٹی اسماء کے لئے کچھ تحفے ہدیئے لے کر مدینہ پہنچیں تو حضرت اسماءؓ نے ان کے تحفے قبول کرنے سے اِنکار کر دیا، اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کر لیا) [1] غرض حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہیں اور وہ کافر ہیں، میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی والدہ کی صلۂ رحمی کرو، یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت اسماءؓ کی والدہ قُتَیْلَہ کو صدیقِ اکبرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں طلاق دے دی تھی، حضرت اسماءؓ ان کے بطن سے تھیں، اور ان کی بہن اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ، صدیقِ اکبرؓ کی دُوسری بیوی اُمِّ رُومان کے بطن سے تھیں، یہ مسلمان ہو گئی تھیں۔ (ابنِ کثیر ومظہری) [2]

اس آیت میں ایسے کفار جنہوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ نہیں کیا، اور ان کے گھروں سے نکالنے میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا، ان کے ساتھ احسان کے معاملے اور اچھے سلوک اور عدل وانصاف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ عدل وانصاف تو ہر کافر کے ساتھ ضروری ہے، جس میں کافرِ ذمی اور مصالح اور کافرِ حربی ودُشمن سب برابر ہیں، بلکہ اسلام میں تو عدل وانصاف جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ بار اُن پر نہ ڈالے اور اُن کے چارے اور آرام کی نگہداشت رکھے، اس آیت میں اصل مقصود برّ واحسان کرنے کی ہدایت ہے۔

مسئلہ:- اس آیت سے ثابت ہوا کہ نفلی صدقات ذِمی اور مصالح کافر کو بھی دیئے جاسکتے ہیں، صرف کافرِ حربی کو دینا ممنوع ہے۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ (الیٰ) اَنْ تَوَلَّوْهُمْ اس آیت میں اُن کفار کا بیان ہے جو مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ وقتال کر رہے ہوں، اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے میں کوئی حصہ لے رہے ہوں، اُن کے بارے میں ارشاد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ موالات اور دوستی سے منع فرماتا ہے، اس میں برّ واحسان

---

[1] مسند احمد، حديث اسماء بنت ابى بكر الصديق رضى الله عنهما، رقم الحديث:۲۶۹۱۵، وصحيح البخارى، كتاب الأدب، باب صلة الوالد المشرك ج:۲ ص:۸۸۴

[2] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۹۰، والمظهرى ج:۹ ص:۲۶۲

کا معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں، بلکہ صرف قلبی دوستی اور دوستانہ تعلقات کی ممانعت ہے، اور یہ ممانعت کچھ ان میں برسر پیکار دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہلِ ذِمہ اور اہلِ صلح کافروں کے ساتھ بھی قلبی موالات اور دوستی جائز نہیں، اس سے تفسیر مظہری میں یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حربی یعنی برسر جنگ کفار کے ساتھ عدل وانصاف تو اسلام میں ضروری ہے ہی، اور ممانعت صرف موالات یعنی دوستی کی کی گئی، بِرّ واحسان کی ممانعت نہیں کی گئی،[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسنانہ سلوک برسر پیکار دشمنوں کے ساتھ بھی جائز ہے، البتہ دوسری نصوص کی بنا پر یہ شرط ہے کہ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے سے مسلمانوں کو کسی نقصان وضرر کا خطرہ نہ ہو، جہاں یہ خطرہ ہو وہاں بِرّ واحسان اُن پر جائز نہیں، ہاں! عدل وانصاف ہر حال میں، ہر شخص کے لئے ضروری اور واجب ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ

اے ایمان والو جب آئیں تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر تو ان کو جانچ لو، اللہ

اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ

خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو، پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو مت پھیرو اُن کو کافروں کی طرف،

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ

نہ یہ عورتیں حلال ہیں اُن (کافروں) کو اور نہ وہ (کافر) حلال ہیں ان عورتوں کو، اور دے دو اُن (کافروں) کو جو اُن کا

اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ

خرچ ہوا ہو، اور گناہ نہیں تم کو کہ نکاح کرلو ان عورتوں سے جب اُن کو دو اُن کے مہر،

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ

اور نہ رکھو اپنے قبضے میں ناموس کافر عورتوں کے اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ (کافر) مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا،

---

[1] تفسیر المظہری تحت هٰذه الآیة، ج: ۹ ص: ۲۶۲

ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ وَاِنْ

یہ اللہ کا فیصلہ ہے، تم میں فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اگر

فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ

جاتی رہیں تمہارے ہاتھ سے کچھ عورتیں کافروں کی طرف، پھر تم ہاتھ مارو تو دے دو اُن کو جن کی

ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ

عورتیں جاتی رہی ہیں جتنا انہوں نے خرچ کیا تھا، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر

اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ

تم کو یقین ہے۔ اے نبی جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو

عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ

اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو، اور چوری نہ کریں، اور بدکاری نہ کریں،

وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ

اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں، اور طوفان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں

وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۖ

اور پاؤں میں، اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں، تو تو ان کو بیعت کرلے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا

بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو مت دوستی کرو اُن لوگوں سے

غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ

کہ غصہ ہوا ہے اللہ اُن پر، وہ آس توڑ چکے ہیں پچھلے گھر سے جیسے آس توڑی منکروں نے

مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع

قبر والوں سے۔

النصف ۲ ع ۸

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم اُن کو جانچ لیا کرو۔ اللہ ہی اُن کے ایمان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مؤمن عورتیں ہیں تو تم اُنہیں کافروں کے پاس واپس نہ بھیجنا۔ وہ ان کافروں کے لئے حلال نہیں ہیں، اور وہ کافر ان کے لئے حلال نہیں ہیں۔ اور ان کافروں نے جو کچھ (ان عورتوں پر مہر کی صورت میں) خرچ کیا ہو، وہ انہیں ادا کر دو۔ اور تم پر ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، جبکہ تم نے اُن کے مہر انہیں ادا کر دیئے ہوں۔ اور تم کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے قبضے میں باقی نہ رکھو، اور جو کچھ تم نے (ان کافر بیویوں پر مہر کی صورت میں) خرچ کیا تھا، وہ تم (اُن کے نئے شوہروں سے) مانگ لو، اور اُنہوں نے جو کچھ (اپنی مسلمان ہو جانے والی بیویوں پر) خرچ کیا تھا، وہ (اُن کے نئے مسلمان شوہروں سے) مانگ لیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہی تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ بڑے علم والا، بڑی حکمت والا ہے۔ ﴿۱۰﴾ اور اگر تمہاری بیویوں میں سے کوئی کافروں کے پاس جا کر تمہارے ہاتھ سے نکل جائے، پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں، اُن کو اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے (اپنی ان بیویوں پر) خرچ کی تھی، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ﴿۱۱﴾ اے نبی! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں مانیں گی، اور چوری نہیں کریں گی، اور زنا نہیں کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور نہ کوئی ایسا بہتان باندھیں گی جو اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیا ہو، اور نہ کسی بھلے کام میں تمہاری نافرمانی کریں گی، تو تم اُن کو بیعت کر لیا کرو، اور اُن کے حق میں اللہ سے مغفرت کی دُعا کیا کرو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ﴿۱۲﴾ اے ایمان والو! اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جیسے کافر لوگ قبروں میں مدفون لوگوں سے مایوس ہیں۔ ﴿۱۳﴾

خلاصۂ تفسیر

سببِ نزول کا واقعہ

(یہ آیتیں بھی ایک خاص موقع کے متعلق ہیں، اور وہ موقع صلحِ حدیبیہ کا ہے، جس کا بیان آغاز سورۂ فتح میں ہوا ہے، من جملہ ان شرطوں کے جو صلح نامے میں لکھی گئی تھیں، ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص مسلمانوں میں سے کافروں کی طرف چلا جائے وہ واپس نہ دیا جائے، اور جو شخص کافروں میں سے مسلمانوں کی طرف چلا جائے وہ واپس دے دیا جائے۔ چنانچہ بعض مسلمان مرد آئے اور واپس کر دیئے گئے، پھر بعض عورتیں مسلمان ہو کر آئیں، ان کے اقارب نے ان کی واپسی کی درخواست کی، اس پر یہ آیتیں حدیبیہ میں نازل ہوئیں، جس میں عورتوں کے واپس کرنے کی ممانعت کی گئی، پس عموم مضمون صلح نامے کا اس سے مخصوص اور منسوخ ہو گیا، اور ایسی عورتوں کے باب میں کچھ خاص اَحکام مقرّر کئے گئے اور اُن کے ساتھ کچھ اَحکام ایسی عورتوں کے باب میں مقرّر ہوئے جو پہلے مسلمانوں کے نکاح میں تھیں، مگر اِسلام نہ لائیں اور مکہ ہی میں رہ گئیں، اور چونکہ مدار ان اَحکام کا ان عورتوں کا مسلمان ہونا ہے، اس لئے طریقِ امتحان بھی بتلایا گیا، پس بخطابِ عام ارشاد فرماتے ہیں کہ) اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (دارُالحرب سے) ہجرت کر کے آئیں، (خواہ مدینہ میں کہ دارُالاسلام ہے، خواہ حدیبیہ میں کہ مُعَسکرِ اِسلام حکمِ دارُالاسلام میں ہے، کذا فی کتاب الحدود من الهداية [1]) تو تم ان (کے مسلمان ہونے) کا اِمتحان کر لیا کرو (جس کا طریقہ آگے خطابِ خاص "یَاَیُّهَا النَّبِیُّ" میں آتا ہے، اور اس امتحان میں ظاہری امتحان پر اِکتفا کیا کرو کیونکہ) اُن کے (حقیقی) اِیمان کو (تو) اللہ ہی خوب جانتا ہے (تم کو تحقیق ہو ہی نہیں سکتا) پس اگر ان کو (اس امتحان کی رُو سے) مسلمان سمجھو تو ان کو کفار کی طرف واپس مت کرو (کیونکہ) نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر اُن عورتوں کے لئے حلال ہیں (کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے مطلقاً نہیں رہتا) اور (اس صورت میں) ان کافروں نے جو کچھ (مہر کے بابت ان عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو اَدا کر دو اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہ ہوگا جب کہ تم اُن کے مہر ان کو دے دو، اور (اے مسلمانو!) تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو، (یعنی جو تمہاری بیبیاں دارُالحرب میں کفر کی حالت میں رہ گئیں اُن کا نکاح تم سے زائل ہو گیا، اُن کے تعلقات کا کوئی اثر باقی مت سمجھو) اور (اس صورت میں) جو کچھ تم نے (اُن عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو (ان کافروں سے) مانگ لو اور (اسی طرح) جو کچھ ان کافروں نے (مہر کے بابت) خرچ کیا ہو وہ (تم سے) مانگ لیں (جیسا

---

[1] الهداية، كتاب الحدود، باب الوطی الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه، ج:۲ ص:۵۱۷

اُوپر اِرشاد ہوا ہے: وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا شاید یہ تکریر مُعَنْوَنْ باختلافِ عنوان اس لئے ہو کہ تمہارے ذِمہ جو دُوسروں کا حق ہو اس کو زیادہ مؤکد سمجھو) یہ (جو کچھ کہا گیا) اللہ کا حکم ہے (اس کا اِتباع کرو) وہ تمہارے درمیان (ایسا ہی مناسب) فیصلہ کرتا ہے اور اللہ بڑا علم اور حکمت والا ہے (علم وحکمت کے مناسب اَحکام مقرّر فرماتا ہے) اور اگر تمہاری بیبیوں میں سے کوئی بی بی کافروں میں رہ جانے سے (بالکل ہی) تمہارے ہاتھ نہ آئے (یعنی وہ نہ ملے اور نہ اس کا بدل مہر ملے اور) پھر (کافروں کو مہر دینے کی) تمہاری نوبت آئے (یعنی تمہارے ذِمہ کسی کافر کا حقِ مہر واجب الادا ہو) تو (تم وہ مہر اُن کافروں کو نہ دو) بلکہ جن (مسلمانوں) کی بیبیاں ہاتھ سے نکل گئیں (جن کا ابھی ذِکر ہوا "فَاتَكُمْ" میں) جتنا (مہر) انہوں نے (ان بیبیوں پر) خرچ کیا تھا اس کے برابر (اس رقم واجب الادا میں سے) تم ان کو دے دو اور اللہ سے کہ جس پر تم ایمان رکھتے ہو ڈرتے رہو اور (اَحکامِ واجبہ میں خلل مت ڈالو، آگے خطابِ خاص میں طریقِ امتحان ایمان کا فرماتے ہیں کہ) اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس (اس غرض سے) آئیں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ بدکاری کریں گی، اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی، اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی اولاد ہونے کا دعویٰ کر کے) بنالائیں (جیسا جاہلیت میں بعض عورتوں کا دستور تھا کہ کسی غیر کا بچہ اُٹھا لائیں اور کہہ دیا کہ میرے خاوند کا ہے، اور یا کسی سے بدکاری کی اور اس نطفۂ حرام کو اپنے خاوند کا بتلا دیا کہ اس میں علاوہ گناہِ زِنا کے اپنے شوہر کے ساتھ غیر کے بچے کا اِلحاق بھی ہے، جس پر حدیث میں بھی وعید آئی ہے، رواہ ابوداود والنسائی [1]) اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی (اس میں سب اَحکامِ شرعیہ آگئے، پس وہ عورتیں اگر ان شرطوں کو قبول کرلیں جن کا اِعتقاد شرطِ ایمان ہے اور اِلتزامِ عمل شرطِ کمالِ ایمان ہے) تو آپ اُن کو بیعت کرلیا کیجئے اور اُن کے لئے اللہ سے (پچھلے گناہوں کی) مغفرت طلب کیا کیجئے، بے شک اللہ غفور رحیم ہے (مطلب یہ کہ جب ان اَحکام کے حق اور واجب العمل سمجھنے کا اِظہار کریں تو اُن کو مسلمان سمجھئے، اور ہر چند کہ خود اِسلام ہی سے پچھلے گناہوں کی مغفرت ہوجاتی ہے، مگر یہاں اِستغفار کا حکم یا تو مکمل طور پر آثارِ مغفرت حاصل کرنے کے لئے ہے، اور یا حاصل اس کا دُعا ہے قبولِ ایمان کی جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے)۔ اے ایمان والو! ان لوگوں سے (بھی) دوستی مت کرو جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا ہے (مراد اس سے یہود ہیں، لقولہ تعالٰی فی المائدۃ: مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ الآیۃ: ۶۰) کہ وہ آخرت کے (خیر وثواب) سے ایسے نااُمید ہوگئے ہیں جیسا کفار جو قبروں میں (مدفون) ہیں (خیر وثواب آخرت سے) نااُمید ہیں (جو کافر مرجاتا ہے بوجہ اس کے کہ

[1] سنن النسائی، کتاب الطّلاق، باب التغلیظ فی الإنتفاء من الولد ج:۲ ص:۱۱۰، وسنن ابی داود، کتاب النکاح، باب التغلیظ فی الإنتفاء، رقم الحدیث:۱۹۲۸

اس کو معائنہ آخرت کا ہو جاتا ہے، حقیقتِ امر پر یقین کے ساتھ مطلع ہو جاتا ہے کہ اب میری بخشش ہرگز نہ ہوگی، چونکہ حسبِ آیت: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ [1] (البقرۃ ۲: ۱۴۶) آپ کی نبوّت کو اور اسی طرح مخالفِ نبی کے کافر اور غیر ناجی ہونے کو خوب جانتے ہیں، گو عار و حسد کی وجہ سے اِتباع نہ کرتے تھے، اس لئے ان کو دِل سے یقین تھا کہ ہم ناجی نہیں ہیں، گو شیخی کے مارے ظاہراً اس کے خلاف کرتے ہوں، پس حاصل یہ ہوا کہ جن کی گمراہی ایسی مسلّم ہے کہ وہ خود بھی دل سے اس کو تسلیم کرتے ہیں، ایسے گمراہوں سے تعلق رکھنا کیا ضرور اور یہ نہ سمجھا جائے کہ جو گمراہ اشد درجے کا نہ ہو اس سے دوستی جائز ہے، جوازِ دوستی سے تو مطلق کفر مانع ہے، مگر اس صفت سے وہ عدمِ جواز اور شدید ہو جائے گا، اور شاید تخصیص یہود کی اس جگہ اس لئے ہو کہ مدینہ میں یہود زیادہ تھے اور دُوسرے وہ لوگ شریر و مفسد بھی بہت تھے)۔

معارف و مسائل

معاہدۂ صلح حدیبیہ کی بعض شرائط کی تحقیق

سورۂ فتح میں حدیبیہ کا واقعہ تفصیل سے آچکا ہے، جس میں بالآخر قریشِ مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک معاہدۂ صلح دس سال کے لئے لکھا گیا، اس معاہدے کی بعض شرائط ایسی تھیں جن میں دَب کر صلح کرنے اور مسلمانوں کی بظاہر مغلوبیت محسوس ہوتی تھی، اسی لئے صحابۂ کرام میں اس پر غم و غصّے کا اِظہار ہوا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشاراتِ ربانی یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس وقت کی چند روزہ مغلوبیت بالآخر ہمیشہ کے لئے فتحِ مبین کا پیش خیمہ بننے والی ہے، اس لئے قبول فرمالیا، اور پھر سب صحابۂ کرام بھی مطمئن ہوگئے۔

اس صلح نامے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے کوئی آدمی مدینہ جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو واپس کردیں گے، اگرچہ وہ مسلمان ہی ہو، اور اگر مدینہ طیبہ سے کوئی مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو قریشِ مکہ اس کو واپس نہ کریں گے۔ اس معاہدے کے الفاظ عام تھے جس میں بظاہر مرد و عورت دونوں داخل تھے، یعنی کوئی مسلمان مرد یا عورت جو بھی مکہ مکرمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اس کو آپ واپس کریں گے۔

جس وقت یہ معاہدہ مکمل ہو چکا اور ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ حدیبیہ میں تشریف فرما تھے، کئی ایسے واقعات پیش آئے جو مسلمانوں کے لئے بہت صبر آزما تھے، جن میں ایک واقعہ ابوجندل رضی اللہ عنہ کا ہے، جن کو قریشِ مکہ نے قید میں ڈالا ہوا تھا، وہ کسی طرح ان کی قید سے چھوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے، صحابۂ کرام میں اُن

[1] ترجمہ: وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

کو دیکھ کر سخت تشویش پھیلی کہ معاہدے کی رُو سے اُن کو واپس کیا جانا چاہئے، اور ہم اپنے مظلوم بھائی کو پھر ظالموں کے ہاتھ میں دے دیں، یہ کیسے ہوگا؟

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ تحریر فرما چکے تھے اور اُصولِ شریعت کی حفاظت اور اُن پر پختگی کو ایک فرد کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے تھے، اور اس کے ساتھ آپ کی چشمِ بصیرت عنقریب ان سب مظلوموں کی فاتحانہ نجات کا بھی گویا مشاہدہ کر رہی تھی، طبعی رنج وتکلیف تو ابوجندل کی واپسی میں آپ کو بھی یقیناً ہوگی، مگر آپ نے معاہدے کی پابندی کی بنا پر اُن کو سمجھا بجھا کر رُخصت کر دیا۔

اسی کے ساتھ ایک دُوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سعیدہ بنت الحارث الاسلمیہ جو مسلمان تھیں، مگر صیفی بن انصب کے نکاح میں تھیں جو کافر تھا، بعض روایات میں اس کا نام مسافر المخزومی بتلایا گیا ہے، (اس وقت تک مسلمانوں اور کفار میں رشتۂ مناکحت طرفین سے حرام نہیں ہوا تھا) یہ مسلمان عورت مکہ سے بھاگ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئیں، ساتھ ہی ان کا شوہر حاضر ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ میری عورت مجھے واپس کی جائے، کیونکہ آپ نے یہ شرط قبول کر لی ہے اور ابھی تک اس معاہدے کی مہر بھی خشک نہیں ہوئی۔

اس واقعے پر یہ آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں، جن میں دراصل مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان عقدِ مناکحت کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ بھی کہ جو عورت مسلمان خواہ اس کا مسلمان ہونا پہلے سے معلوم ہو جیسے سعیدہ مذکورہ تھیں، یا بوقتِ ہجرت اس کا مسلمان ہونا صحیح طور سے ثابت ہو جائے، وہ اگر ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جائے اس کو کفار کے قبضے میں واپس نہ دیا جائے، کیونکہ وہ اپنے کافر شوہر کے لئے حلال نہیں رہی۔ (تفسیر قرطبی میں یہ واقعہ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے) [1]

غرض ان آیات کے نزول نے یہ واضح کر دیا کہ صلح نامے کی یہ شرط کہ جو بھی مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے آپ واپس کریں گے، اپنے لفظی عموم کے ساتھ جس میں مرد وعورت دونوں داخل ہیں، صحیح نہیں، یہ شرط صرف مردوں کے حق میں قبول کی جا سکتی ہے، عورتوں کے معاملے میں یہ شرط قابلِ قبول نہیں، ان کے بارے میں صرف اتنا کیا جا سکتا ہے کہ جو عورت مسلمان ہو کر ہجرت کرے اس کے کافر شوہر نے جو کچھ اس پر مہر کی صورت میں خرچ کیا ہے وہ خرچ اس کو واپس کیا جائے گا، ان آیات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے مفہوم کو واضح فرما دیا، اور اس کے مطابق سعیدہ مذکورہ کو واپس نہیں کیا۔

بعض روایات میں ہے کہ اُمِّ کلثوم بنتِ عتبہ ابنِ ابی معیط مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئیں،

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۸ ص:۶۱

ان کے خاندان کے لوگوں نے واپسی کا مطالبہ عمومِ شرط کی وجہ سے کیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اُمِّ کلثوم عمرو بن عاص کے نکاح میں تھیں، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہ اور ان کے ساتھ دو بھائی مکہ سے بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور ساتھ ہی عمرو بن عاص شوہر اُمِّ کلثوم وغیرہ نے آکر ان کی واپسی کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے شرط کے مطابق ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید کو تو واپس کر دیا، مگر اُمِّ کلثوم کو واپس نہیں فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ یہ شرط مردوں کے لئے تھی، عورتیں اس میں شامل نہیں۔ اس پر یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے نازل ہوئیں۔ [1]

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچنے والی دُوسری عورتوں کے بھی کچھ واقعات روایات میں مذکور ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ متعدّد واقعات سب ہی پیش آئے ہوں۔

شرطِ مذکور سے عورتوں کا اِستثناء نقضِ عہد نہیں بلکہ ایک شرط کی وضاحت بقبول فریقین ہے

مذکور الصدر روایت قرطبی سے تو معلوم ہوا کہ معاہدے کی شرط کے الفاظ اگرچہ عام تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ عورتوں کے لئے عام اور شامل نہیں تھے، اس لئے آپ نے اس کی وضاحت وہیں حدیبیہ کے مقام پر فرمادی اور اسی کی تصدیق پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس شرط کو عموم کے ساتھ قبول فرمالیا تھا جس میں عورتیں بھی شامل تھیں، ان آیات کے نزول نے اس کے عموم کو منسوخ قرار دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ پر اسی وقت یہ واضح کردیا کہ عورتیں اس شرط میں داخل نہ ہوں گی، چنانچہ عورتوں کو آپ نے واپس نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ صورت نہ نقضِ عہد کی تھی جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اِمکان ہی نہ تھا، اور نہ یہ نبذِ عہد کی صورت تھی یعنی معاہدے کو ختم کردینے کی، بلکہ ایک شرط کی وضاحت کا معاملہ تھا، خواہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد پہلے ہی سے یہ ہو، یا نزولِ آیت کے بعد آپ نے اس عموم کو صرف مردوں تک محدود کرنے کے لئے فرمادیا ہو۔ بہرحال ہوا یہ ہے کہ اس توضیح کے بعد بھی معاہدۂ صلح کو طرفین نے قبول کیا اور اس پر ایک مدّت تک طرفین سے عمل ہوتا رہا، اس صلح کے نتیجے میں راستے مامون ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوکِ دُنیا کے نام خطوط بھیجے، اور اسی کے نتیجے میں ابوسفیان کا

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۶۱

قافلہ بے فکری کے ساتھ ملکِ شام تک پہنچا، جہاں ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وواقعات کی تحقیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس شرطِ صلح کے عام الفاظ میں عورتوں کا شامل نہ ہونا خواہ پہلے ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں تھا، یا نزولِ آیت کے بعد آپ نے عورتوں کو اس عموم سے خارج کیا، بہر دو صورت کفارِ قریش اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ اس وضاحت کے بعد بھی مکمل ہی سمجھا گیا، اور ایک عرصے تک اس پر عمل ہوتا رہا، اس لئے اس شرط کی وضاحت کو نقضِ عہد یا نبذِ عہد میں داخل نہیں کیا جاسکتا، واللہ اعلم، آگے آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کے تحت دیکھئے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ مراد آیت کی یہ ہے کہ عورتوں کو شرطِ صلح سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ اُن کا مسلمان اور مؤمن ہونا ہے، مکہ سے مدینہ آنے والی عورتوں میں اِحتمال اس کا بھی تھا کہ ان میں سے کوئی اسلام وایمان کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے شوہر سے ناراضی کے سبب یا مدینہ کے کسی شخص سے محبت کے سبب یا کسی دُوسری دُنیوی غرض سے ہجرت کر کے آگئی ہو، وہ عنداللہ اس شرط سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اس کو واپس کرنا شرطِ صلح کے تحت ضروری ہے، اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے ایمان کا امتحان لو، اس کے ساتھ ہی یہ جملہ فرمایا کہ ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ'' اس میں اشارہ کردیا کہ حقیقی اور اَصل ایمان کا تعلق تو اِنسان کے دل سے ہے، جس پر اللہ کے سوا کسی کو اِطلاع نہیں، البتہ آدمی کے زبانی اقرار اور قرائن سے ایمان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بس مسلمان اسی کے مأمور ومکلّف ہیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ اُن کے امتحان کا طریقہ یہ تھا کہ مہاجر عورت سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے بغض ونفرت کی وجہ سے نہیں آئی، اور نہ مدینہ کے کسی آدمی کی محبت کی وجہ سے، اور نہ کسی دُوسری دُنیوی غرض سے، بلکہ اس کا آنا خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ورضاجوئی کے لئے ہے، جب وہ یہ حلف کرلیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیتے، اور اس کا مہر وغیرہ جو اس نے اپنے کافر شوہر سے وصول کیا تھا، وہ اس کے شوہر کو واپس دے دیتے تھے۔ (قرطبی) [۱]

اور حضرت صدیقہ عائشہؓ سے ترمذی میں روایت ہے، جس کو ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' کہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اُن کے امتحان کی صورت وہ بیعت تھی جس کا ذِکر اگلی آیات میں تفصیل سے آیا ہے: اِذَا جَاۗءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الآیۃ [۲] گویا آنے والی مہاجر عورتوں کے امتحانِ ایمان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۶۲

[۲] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة الممتحنة ج:۲ ص:۱۶۶

پر اُن چیزوں کا عہد کریں جو اس بیعت کے بیان میں آگے آئی ہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابتدائی طور پر پہلے وہ کلمات اُن سے کہلوائے جاتے ہوں جو بروایت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہ اُوپر ذِکر کئے گئے ہیں، اور اس کی تکمیل اس بیعت سے ہوتی ہو جس کا آگے ذِکر ہے۔ واللہ اعلم۔

فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۔ یعنی جب بطرزِ مذکوران مہاجرات کے ایمان کا امتحان لے کر تم ان کو مؤمن قرار دے دو تو پھر ان کو کفار کی طرف واپس کرنا جائز نہیں۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۔ یعنی نہ یہ عورتیں کافر مردوں پر حلال ہیں، اور نہ کافر مرد اُن کے لئے حلال ہوسکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ نکاح کرسکیں۔

مسئلہ:- اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ جو عورت کسی کافر کے نکاح میں تھی اور پھر وہ مسلمان ہوگئی تو کافر سے اس کا نکاح خود بخود فسخ ہوگیا، یہ اس کے لئے اور وہ اس کے لئے حرام ہوگئے، اور یہی وجہ عورتوں کو شرطِ صلح میں واپسی سے مستثنیٰ کرنے کی ہے کہ اب وہ اس کے شوہرِ کافر کے لئے حلال نہیں رہی۔

وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا ۔ یعنی مہاجر مؤمنہ کے کافر شوہر نے اس کے نکاح میں جو مہر وغیرہ اس کو دِیا ہے، وہ سب اس کے شوہر کو واپس دیا جائے، کیونکہ شرطِ صلح سے مستثنیٰ صرف عورتوں کی واپسی تھی، جو بوجہ اُن کے حرام ہوجانے کے نہیں ہوسکتی، مگر جو مال انہوں نے ان کو دِیا ہے، وہ حسبِ شرط واپس کر دینا چاہئے، اس مال کی واپسی کا خطاب مہاجر عورتوں کو نہیں کیا گیا کہ تم واپس کرو، بلکہ عام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ واپس کریں، کیونکہ بہت ممکن بلکہ غالب یہ ہے کہ جو مال ان کے شوہر نے اُن کو دِیا تھا، وہ ختم ہو چکا ہو، اب اُن سے واپس دِلانے کی صورت ہی نہیں ہوسکتی، اس لئے یہ فریضہ عام مسلمانوں پر ڈال دیا گیا کہ معاہدۂ صلح کو پورا کرنے کے لئے اس کی طرف سے کافر شوہروں کا مال واپس کر دیں، اگر بیت المال سے دیا جاسکتا ہے تو وہاں سے، ورنہ عام مسلمانوں کے چندے سے۔ (من القرطبی)[1]

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۔ پچھلی آیت میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کا نکاح اس کے کافر شوہر سے فسخ ہو چکا ہے، اور یہ اس پر حرام ہو چکی ہے، اس آیت میں اسی حکم کا تکملہ یہ ہے کہ اب مسلمان مرد سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے، اگرچہ سابق شوہر کافر زِندہ بھی ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی، مگر شرعی حکم سے نکاح فسخ ہو چکا ہے، اس لئے دُوسرے مرد سے اس کا نکاح حلال ہوگیا۔

کافر مرد کی بیوی مسلمان ہوجائے تو نکاح فسخ ہوجانا آیتِ مذکورہ سے معلوم ہو چکا، لیکن دُوسرے کسی مسلمان مرد سے اس کا نکاح کس وقت جائز ہوگا، اس کے متعلق اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اصل ضابطہ تو یہ ہے کہ جس کافر مرد کی

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۶۹

عورت مسلمان ہو جائے تو حاکمِ اسلام اس کے شوہر کو بلا کر کہے کہ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ نکاح فسخ ہو جائے گا، اگر وہ اس پر بھی اسلام لانے سے انکار کرے تو اَب ان دونوں میں فرقت کی تکمیل ہوگئی، اس وقت وہ کسی مسلمان مرد سے نکاح کرسکتی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ حاکمِ اسلام کا شوہر کو حاضر کرنا وہیں ہوسکتا ہے جہاں حکومت اسلام کی ہو، دارُالکفر یا دارُالحرب میں ایسا واقعہ پیش آئے تو شوہر سے اسلام کے لئے کہنے اور اس کے انکار کی صورت نہیں ہوگی جس سے دونوں میں تفریق کا فیصلہ کیا جاسکے، اس لئے اس صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کی تکمیل اُس وقت ہوگی جب یہ عورت ہجرت کر کے دارُالاسلام میں آجائے یا مسلمانوں کے لشکر میں آجائے، دارُالاسلام میں آنے کی صورت مذکورہ واقعات میں مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد ہوسکتی ہے، اور لشکرِ اسلام حدیبیہ میں بھی موجود تھا، اس میں پہنچنے سے بھی اس کا تحقق ہوجاتا ہے، جس کو فقہاء کی اِصطلاح میں اِختلافِ دارین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب کافر مرد اور اس کی بیوی مسلمان کے درمیان دارین کا فاصلہ ہوجائے، یعنی ایک دارُالکفر میں ہے، دُوسرا دارُالاسلام میں تو یہ تفریق مکمل ہوکر عورت دُوسرے سے نکاح کے لئے آزاد ہوجاتی ہے۔ (ہدایہ وغیرہ) [1]

اور اس آیت میں جو اِذَآ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ کو بطور شرط کے فرمایا کہ تم ان سے نکاح کرسکتے ہو بشرطیکہ اُن کے مہر دے دو، یہ درحقیقت نکاح کی شرط نہیں، کیونکہ باتفاقِ اُمت نکاح کا اِنعقاد اَدائے مہر پر موقوف اور مشروط نہیں ہے، البتہ نکاح پر مہر کی ادائیگی واجب ولازم ضرور ہے، یہاں اس کو بطور شرط کے شاید اس لئے ذِکر کیا گیا ہے کہ ابھی ایک مہر تو اس کے کافر شوہر کو واپس کرایا جاچکا ہے، ایسا نہ ہو کہ اب اس سے نکاح کرنے والے مسلمان یہ سمجھ بیٹھیں کہ مہر تو دِیا جاچکا، اور جدید مہر کی ضرورت نہیں، اس لئے فرمادیا کہ اس مہر کا تعلق پچھلے نکاح سے تھا، یہ دُوسرا نکاح ہوگا تو اس کا جدید مہر لازم ہے۔

وَلَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ، عِصَم، عِصۡمَت کی جمع ہے، جس کے اصلی معنی حفاظت اور اِستحکام کے ہیں، مراد اس سے وہ عقدِ نکاح وغیرہ ہیں جن کی حفاظت کی جاتی ہے۔

كَوَافِر، جمع كَافِرَة کی ہے، اور مراد اس سے مشرکہ عورت ہے، کیونکہ کافرہ کتابیہ سے نکاح کی اجازت قرآنِ کریم میں منصوص ہے، مراد آیت کی یہ ہے کہ اب تک جو مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کی اجازت تھی وہ ختم کردی گئی، اب کسی مسلمان کا نکاح مشرک عورت سے جائز نہیں، اور جو نکاح پہلے ہوچکے ہیں وہ بھی ختم ہوچکے، اب کسی مشرک عورت کو اپنے نکاح میں روکنا حلال نہیں۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو جن صحابۂ کرام کے نکاح میں کوئی مشرک عورت تھی اس کو چھوڑ دیا، حضرت فاروقِ

[1] الهداية، كتاب النّكاح، باب نكاح اهل الشرك، ج: ٢ ص: ٣٤٧

اعظمؓ کے نکاح میں دو مشرک عورتیں اُس وقت تک تھیں جو بوقتِ ہجرت مکہ مکرمہ میں رہ گئی تھیں، حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہ آیت نازل ہونے کے بعد دونوں کو طلاق دے دی۔ (رواہ البغوی بسند الزہری، کذا فی المظہری) [1] اور طلاق سے مراد اس جگہ چھوڑ دینا اور قطع تعلق کر لینا ہے، اِصطلاحی طلاق کی یہاں ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اس آیت کے ذریعے نکاح ٹوٹ چکا ہے۔

وَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا یعنی جب معاملہ یہ ٹھہرا کہ جو عورت مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ جائے تو وہ واپس مکہ نہ بھیجی جائے گی، البتہ اس کے شوہر نے جو مہر وغیرہ اس کو دِیا ہے وہ اس کے شوہر کو واپس دیا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان عورت خدانخواستہ مرتد ہو کر مکہ معظّمہ چلی جائے یا پہلے ہی سے کافرہ ہو، مگر مسلمان شوہر کے قبضے سے نکل جائے (خلاصۂ تفسیر میں اسی صورت کو شاید اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا کہ کوئی مسلمان عورت مرتد ہو کر مکہ چلی گئی ہو، اور پھر وہیں کافر ہو کر رہ گئی ہو، ہاں ایسے واقعات پیش آئے جو پہلے ہی سے کافر تھیں وہ اپنے مسلمان شوہر کے قبضے سے نکل کر مکہ ہی میں رہیں) کفارِ مکہ اس کو واپس نہیں کریں گے، مگر اس کے مسلمان شوہر نے جو مہر وغیرہ اس کو دِیا ہے اس کی واپسی کفارِ مکہ کے ذِمہ ہوگی، اس لئے ان معاملات کا تصفیہ باہمی حساب فہمی سے کر لیا جائے، طرفین سے جو کچھ مہر وغیرہ میں خرچ کیا گیا ہے وہ دریافت کر کے اس کے مطابق لین دین کر لیا جائے۔

اس حکم پر مسلمانوں نے تو بطیبِ خاطر عمل کیا کہ اَحکامِ قرآن کی پابندی اُن کے نزدیک فرض ہے، اس لئے جتنی عورتیں ہجرت کر کے آئیں سب کے مہر وغیرہ ان کے کافر شوہروں کو واپس بھیج دیئے، مگر کفارِ مکہ کا قرآن پر ایمان نہیں تھا، انہوں نے عمل نہ کیا، اس پر اگلی آیت نازل ہوئی۔ (ذکرہ البغوی عن الزہری، مظہری) [2]

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ الآیۃ، عَاقَبْتُمْ، مُعَاقَبَۃ سے مشتق ہے جس کے ایک معنی انتقام اور بدلہ لینے کے بھی ہیں، یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ (کما روی عن قتادۃ ومجاھد، قرطبی) [3] اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی کچھ عورتیں اگر کفار کے قبضے میں آ جائیں تو شرطِ صلح کے ماتحت اوروں پر لازم تھا کہ اُن کے مسلمان شوہروں کو ان کا دِیا ہوا مہر وغیرہ واپس کریں، جیسا کہ مسلمانوں کی طرف سے مہاجرات کے کافر شوہروں کو ان کا مہر واپس کیا گیا، لیکن جب کفار نے ایسا نہ کیا اور مسلمان عورتوں کے مہر ان کو اَدا نہ کئے تو ان کے اس عمل کا اگر تم اِنتقام اور بدلہ لو اس طرح کہ کفارِ مکہ کو جو رقم مہاجرات کے مہر کی ادا کرنا تھی، تم بھی وہ اپنے حق کے مطابق روک لو تو اس کا حکم یہ

---

[1] تفسیر البغوی تحت ھذہ الآیۃ، ج:۸ ص:۹۸، والمظھری ج:۹ ص:۲۶۵

[2] تفسیر البغوی ج:۸ ص:۹۹، والمظھری ج:۹ ص:۲۶۵

[3] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۶۹

ہے کہ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا یعنی تم اس رقم میں سے جو مہاجرات کے مہر کی روک لی گئی ہے، ان مسلمان شوہروں کے خرچ کئے ہوئے مہر وغیرہ ادا کر دو جن کی عورتیں کفارِ مکہ کے قبضے میں آ گئی ہیں۔

دوسرے معنی عَاقَبْتُمْ، عَقَّبْتُمْ، اَعْقَبْتُمْ کے جنگ میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کے بھی ہیں، اور اس آیت میں لفظ "عَاقَبْتُمْ" کی یہ تینوں قراءتیں بھی مختلف قراء سے منقول ہیں، اور حضرت قتادہؒ و مجاہدؒ سے ان تینوں لفظوں کے معنی غنیمت کے بھی منقول ہیں، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جن مسلمان شوہروں کی عورتیں کفار کے قبضے میں چلی گئیں اور شرطِ صلح کے مطابق کفار نے اُن کے مہر مسلمان شوہروں کو ادا نہیں کیا، پھر مسلمانوں کو مالِ غنیمت حاصل ہوا تو ان شوہروں کا حق مالِ غنیمت سے ان کو ادا کر دیا جائے۔ (قرطبی) [۱]

کیا مسلمانوں کی کچھ عورتیں مرتد ہو کر مکہ چلی گئی تھیں؟

اس آیت میں جس معاملے کا حکم بیان کیا گیا ہے اس کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک صرف ایک ہی پیش آیا تھا کہ حضرت عیاض بن غنم قریشی کی بیوی اُمّ الحکم بنتِ ابی سفیان مرتد ہو کر مکہ مکرمہ چلی گئی تھی، اور پھر یہ بھی اسلام کی طرف لوٹ آئی۔

اور حضرت ابنِ عباسؓ نے کل چھ عورتوں کا اسلام سے انحراف اور کفار کے ساتھ مل جانا ذکر فرمایا ہے، جن میں سے ایک تو یہی اُمّ الحکم بنت ابی سفیان تھیں اور باقی پانچ عورتیں وہ تھیں جو ہجرت کے وقت ہی مکہ مکرمہ میں رُک گئیں اور پہلے ہی سے کافر تھیں، جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس نے مسلم و کافرہ کے نکاح کو توڑ دیا، اس وقت بھی وہ مسلمان ہونے کے لئے تیار نہ ہوئیں، اس کے نتیجے میں یہ بھی اُن عورتوں میں شمار کی گئیں، جن کا مہر اُن کے مسلمان شوہروں کو کفارِ مکہ کی طرف سے واپس ملنا چاہئے تھا، جب انہوں نے نہیں دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت سے اُن کا یہ حق ادا کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ سے مکہ چلے جانے اور مرتد ہونے کا تو صرف ایک ہی کا واقعہ تھا، باقی پانچ عورتیں پہلے ہی سے کفر پر تھیں، اور کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے نکاح سے اس آیت کی بنا پر نکل گئیں، اس لئے اُن کو بھی اس ضمن میں شمار کیا گیا ہے، اور ایک عورت جس کا مرتد ہو کر مکہ چلے جانا مذکور ہوا ہے، یہ بھی بعد میں پھر مسلمان ہو گئیں۔ (قرطبی) [۲] اور بغوی نے بروایت ابنِ عباسؓ نقل کیا ہے کہ باقی پانچ عورتیں جو اس میں شمار کی گئی ہیں وہ بھی بعد

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۶۹

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۷۰

میں مسلمان ہوگئیں۔ (مظہری) [۱]

عورتوں کی بیعت

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الآیۃ، اس آیت میں مسلمان عورتوں سے ایک تفصیلی بیعت لینے کا ذکر ہے جس میں ایمان وعقائد کے ساتھ احکامِ شرعیہ کی پابندی کا بھی معاہدہ ہے، سابقہ آیات جن کے سیاق میں یہ آیتِ بیعت آئی ہے، وہ اگرچہ اُن مہاجرات کے ایمان کا امتحان کرنے کے سلسلے میں ہے، اور یہ بیعت اُن کے امتحانِ ایمان کی تکمیل ہے، لیکن الفاظِ آیت عام ہیں، نو مسلم مہاجرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لئے عام ہیں، اور واقعہ بھی اسی طرح پیش آیا کہ بیعتِ مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے والی صرف نو مسلم مہاجرات ہی نہیں، دُوسری قدیم عورتیں بھی شریک تھیں، جیسا کہ صحیح بخاری [۲] میں اُمِّ عطیہؓ سے اور بسند بغوی اُمیمہؓ بنتِ رقیہؓ سے منقول ہے، حضرت اُمیمہ سے روایت ہے کہ میں نے چند دُوسری عورتوں کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو آپ نے جن احکامِ شرعیہ کی پابندی کا معاہدہ اس بیعت میں لیا اس کے ساتھ یہ کلمات بھی تلقین فرمائے کہ "فِيْمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَاَطَقْتُنَّ"، یعنی ہم اُن چیزوں کی پابندی کا عہد اسی حد تک کرتے ہیں جہاں تک ہماری اِستطاعت وطاقت میں ہے۔ اُمیمہؓ نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت وشفقت ہم پر خود ہماری ذات سے بھی زائد تھی کہ ہم نے تو بلا کسی قید وشرط کے عہد کرنا چاہا تھا، آپ نے اس شرط کی تلقین فرمادی، تا کہ کسی اضطراری حالت میں خلاف ورزی ہوجائے تو عہد شکنی میں داخل نہ ہو۔ (مظہری) [۳]

اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس بیعتِ نساء کے متعلق فرمایا کہ عورتوں کی یہ بیعت صرف گفتگو اور کلام کے ذریعے ہوئی، مردوں کی بیعت میں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا دستور ہے، عورتوں کی بیعت میں ایسا نہیں کیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے کبھی کسی غیر محرم کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ (مظہری) [۴]

اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ یہ بیعتِ نساء صرف اس واقعۂ حدیبیہ کے بعد ہی نہیں بلکہ بار بار ہوتی رہی، یہاں تک کہ فتحِ مکہ کے روز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی بیعت سے فارغ ہونے کے بعد کوہِ صفا پر عورتوں سے بیعت لی، اور پہاڑ کے دامن میں حضرت عمر بن خطابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] تفسیر المظھری ج:۹ ص:۲۶۵، والبغوی تحت ھٰذہ الآیة ج:۸ ص:۹۹

[۲] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ج:۲ ص:۷۲۶

[۳] تفسیر البغوی تحت ھٰذہ الآیة، ج:۸ ص:۱۰۳، والمظھری ج:۹ ص:۲۶۷

[۴] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ج:۲ ص:۷۲۶، والمظھری ج:۹ ص:۲۶۷

کے الفاظ کو دُہرا کر نیچے جمع ہونے والی عورتوں کو پہنچا رہے تھے جو اس بیعت میں شریک تھیں۔

اس وقت بیعت ہونے والی عورتوں میں ابوسفیان کی بیوی ہند بھی داخل تھیں، جو شروع میں حیاء کے سبب اپنے آپ کو چھپانا چاہتی تھیں، پھر بیعت میں کچھ اَحکام کی تفصیل آئی تو بولنے اور دریافت کرنے پر مجبور ہوگئیں، کئی سوالات کئے، یہ واقعہ تفصیل سے تفسیر مظہری میں مذکور ہے۔

مَردوں کی بیعت میں اِجمال اور عورتوں کی بیعت میں تفصیل

مَردوں سے جو بیعت لی گئی وہ عموماً اسلام اور جہاد پر لی گئی ہے، عملی اَحکام کی تفصیل اس میں نہیں ہے، بخلاف عورتوں کی بیعت کے کہ اس میں وہ تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے۔ وجہ فرق کی یہ ہے کہ مردوں سے ایمان واطاعت کی بیعت لینے میں یہ سب اَحکام داخل تھے، اس لئے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اور عورتیں عموماً عقل وفہم میں مردوں سے کم ہوتی ہیں، اس لئے ان کی بیعت میں تفصیل مناسب سمجھی گئی، یہ اس بیعت کی ابتدا ہے جو عورتوں سے شروع ہوئی، مگر آگے یہ عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی، مردوں سے بھی انہی چیزوں کی بیعت لینا روایاتِ حدیث میں ثابت ہے، (کما روی عن عبادة بن الصامت رضی الله عنه، قرطبی)[1] اس کے علاوہ جن اَحکام کی پابندی کا عہد عورتوں سے لیا گیا عموماً عورتیں ان میں بے راہی اختیار کرنے کی عادی ہوتی ہیں، اس لئے بھی خصوصیت سے ان کی بیعت میں مندرجہ ذیل تفصیل آئی: يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا الآیۃ، اس میں پہلی بات تو وہی ایمان کی اور شرک سے بچنے کی ہے، جو عام مردانہ بیعتوں میں بھی آتی ہے، دُوسری بات چوری نہ کرنا ہے، بہت سی عورتیں اپنے شوہر کے مال میں چوری کرنے کی عادی ہوتی ہیں، اس لئے ذِکر کیا گیا۔ تیسری بات زِنا سے پرہیز کرنا ہے، جس میں عورتیں پختہ ہوجائیں تو مردوں کو بھی نجات آسان ہوجائے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اپنے بچوں کو قتل نہ کریں۔

زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زِندہ دفن کرکے ہلاک کردینے کا رِواج تھا، اس کو روکا گیا۔ پانچویں بات یہ ہے کہ اِفترا اور بہتان نہ باندھیں، اس بہتان کی ممانعت کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں: بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ یعنی اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان بہتان نہ باندھیں، ان کا ذِکر اس لئے کیا گیا کہ قیامت کے روز اِنسان کے ہاتھ پاؤں ہی اس کے اعمال پر شہادت دیں گے، مطلب یہ ہوا کہ ایسے گناہ کے اِرتکاب کے وقت یہ خیال رہنا چاہئے کہ میں چار گواہوں کے درمیان یہ کام کررہا ہوں جو میرے خلاف گواہی دیں گے۔

یہاں لفظ بہتان عام ہے اپنے شوہر پر ہو یا کسی دُوسرے پر، کیونکہ اِفترا و بہتان ہر شخص پر یہاں تک کہ کافر پر بھی

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۸ ص:۷۴، وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب الحدود کفارات لأهلها ج:۲ ص:۷۳

حرام ہے، خصوصاً اپنے شوہر پر بہتان اور بھی اَشد گناہ ہے، اور شوہر پر بہتان لگانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت کسی اور شخص کا بچہ لے کر اس کو اپنے شوہر کا بچہ ظاہر کرے اور اس کے نسب میں داخل کر دے، اور یہ بھی کہ معاذ اللہ بدکاری کرے اور حمل رہ جائے جس کے نتیجے میں یہ بچہ شوہر کے نسب میں داخل سمجھا جائے۔

چھٹی بات ایک عام ضابطہ ہے کہ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ یعنی وہ کسی نیک کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کریں گی، یہاں "مَعْرُوْفٍ" یعنی نیک کام کی قید لگانا جب کہ یہ یقینی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم معروف اور نیکی کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، یا تو اس لئے ہے کہ عام مسلمان پوری طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، یہاں تک کہ رسول کی اطاعت بھی اس شرط کے ساتھ مشروط کر دی گئی۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں معاملہ عورتوں کا ہے، ان سے عام اطاعت کہ ان کے کسی حکم کے خلاف نہ کریں گی، کسی کے دل میں اس سے شیطان گمراہی کے وسوسے پیدا کر سکتا ہے، اس کا راستہ روکنے کے لئے یہ قید لگادی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ بِعَوْنِ اللهِ تَعَالٰى وَحَمْدِهٖ

لِعِشْرِيْنَ خَلَتْ مِنْ جُمَادَى الْاُوْلٰى ۱۳۹۱ھ

يَوْمَ الثُّلٰثَاءِ وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَآءَ اللهُ سُوْرَةُ الصَّفِّ

سُورَةُ الصَّفِّ

اٰیاتھا ۱۴ ۶۱ سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۹ رکوعاتھا ۲

سورۂ صف مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چودہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور جو کچھ ہے زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ

اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں

اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ

کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو، اللہ چاہتا ہے اُن لوگوں کو جو لڑتے ہیں اُس کی راہ میں

صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ

قطار باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔ اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری

لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا

کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں تمہارے پاس پھر جب وہ پھر گئے

اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤ وَاِذْ قَالَ

تو پھیر دیئے اللہ نے اُن کے دِل اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔ اور جب کہا

عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا

عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا آیا ہوں اللہ کا تمہارے پاس یقین کرنے والا اس پر جو

بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ

مجھ سے آگے ہے توراۃ اور خوش خبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے

اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑥ وَمَنْ اَظْلَمُ

احمد پھر جب آیا اُن کے پاس کھلی نشانیاں لے کر کہنے لگے یہ جادو ہے صریح، اور اس سے زیادہ بے انصاف کون

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ

جو باندھے اللہ پر جھوٹ اور اس کو بلاتے ہیں مسلمان ہونے کو، اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑦ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔـوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ

راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو، چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کی روشنی اپنے منہ سے،

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝٨ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ

اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی اور پڑے بُرا مانیں منکر۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول

بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ

راہ کی سوجھ دے کر اور سچا دِین کہ اس کو اُوپر کرے سب دِینوں سے اور پڑے

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝٩ ع

بُرا مانیں شرک کرنے والے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

آسمانوں اور زمین میں جو بھی کوئی چیز ہے، اُس نے اللہ کی تسبیح کی ہے، اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ① اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ ② اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابلِ نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ ③ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کے راستے میں اس طرح صف بنا کر لڑتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہوں۔ ④ اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے تکلیف کیوں پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا پیغمبر بن کر آیا ہوں؟'' پھر جب اُنہوں نے ٹیڑھ اِختیار کی تو اللہ نے ان کے دِلوں کو ٹیڑھا کر دیا، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ⑤ اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ: ''اے بنو اِسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا ایسا پیغمبر بن کر آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی، میں اُس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور اُس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہے۔'' پھر جب وہ اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ: ''یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔'' ⑥ اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جبکہ اُسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو؟ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ⑦ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی بُری لگے۔ ⑧ وہی تو ہے جس نے اپنے

رسول کو ہدایت اور سچائی کا دِین دے کر بھیجا ہے تا کہ وہ اُسے تمام دُوسرے دِینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی بُری لگے۔ ⑨

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں (قالاً یا حالاً) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس جو ایسا باعظمت وشان ہو، اس کی اطاعت ہر حکم میں ضروری ہے، جن میں سے ایک حکم جہاد کا ہے، جو اس سورت میں مذکور ہے، جس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ایک بار بعض مسلمانوں نے باہم تذکرہ کیا کہ اگر ہم کو کوئی ایسا عمل معلوم ہو جو حق تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب ہے تو ہم اس کو عمل میں لائیں، اور اس سے قبل جنگِ اُحد میں بعض جہاد سے بھاگ چکے تھے جس کا قصہ سورۂ آلِ عمران میں ہے، اور نیز وقتِ نزولِ حکم جہاد کے بعض کو وہ حکم گراں گزرا تھا، جس کا قصہ سورۂ نساء میں ہے، اس پر یہ ارشاد نازل ہوا) اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو (خاص طور پر) پسند کرتا ہے جو اس کے راستے میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہے (یعنی جس طرح یہ عمارت مستحکم نا قابلِ شکست ہوتی ہے، اسی طرح وہ مجاہدین دُشمن کے مقابلے سے ہٹتے نہیں، مطلب یہ ہوا کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم کو وہ کام معلوم ہوتا جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے تو یہ عمل تو جہاد ہے، پھر اس کے نزول کے وقت گرانی کیوں ہوتی تھی اور اُحد میں کیوں بھاگ گئے تھے، باوجود ان تمام اُمور کے پیشِ نظر ہونے کے نہایت نازیبا بات اور خدا کو ناپسند ہے ایسے دعوے کی باتیں کرنا جس کا خلاف ہونا معلوم بھی ہو چکا ہے، تو اس میں لاف زنی اور غلط دعوے پر زجر کیا گیا، وعظ بے عمل اس کے مفہوم سے خارج ہے) اور (آگے کفار کے مستحقِ قتل وقتال ہونے کی علت یعنی ایذا رسانی، تکذیب، مخالفتِ رسول کا بیان فرمانا مقصود ہے، اور اسی کی مناسبت سے موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذِکر فرماتے ہیں، پس ارشاد ہے کہ وہ وقت قابلِ ذِکر ہے) جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں (وہ ایذائیں مختلف طور پر تھیں، جن میں سے بعض بعض قرآن مجید میں بھی خصوص سورۂ بقرہ میں مذکور ہیں، اور حاصل ان سب کا سرکشی اور مخالفت ہے) پھر جب (اس فہمائش پر بھی) وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے (اور راہ پر نہ آئے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں کو اور (زیادہ) ٹیڑھا کر دیا (یعنی مادّہ مخالفت اور عصیان کا اور زیادہ بڑھ گیا، جیسا کہ قاعدہ ہے کہ گناہ پر مداومت کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف قلب کا میلان اور

اس کی اطاعت کا جذبہ کم ہوتا چلا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (کا معمول ہے کہ وہ) ایسے نافرمانوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (اسی طرح یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انواعِ مخالفت سے ایذائیں پہنچاتے ہیں، اس لئے اُن کا ٹیڑھا پن اور فسق زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ اُمید اِصلاح کی نہیں رہی، پس ان کا فساد مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا) اور (اسی طرح وہ وقت بھی قابلِ تذکرہ ہے) جب کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ارشاد) فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو توراۃ (آچکی) ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔ (اور اس بشارت کا عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہونا خود اہلِ کتاب کے بیان سے حدیثوں میں ثابت ہے، چنانچہ خازن میں بروایت ابوداؤد، نجاشی بادشاہِ حبشہ کا جو کہ نصاریٰ کے عالم بھی تھے، یہ قول آیا ہے کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ [1] اور خازن ہی میں ترمذی سے عبداللہ بن سلامؓ کا قول جو کہ علمائے یہود میں سے تھے آیا ہے کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدفون ہوں گے۔ [2] اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام توراۃ کے مبلغ تھے، اس لئے توراۃ میں اس بشارت کا ہونا نیز عیسیٰ علیہ السلام سے منقول کہا جائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے ''اِظہارُ الحق'' میں خود توراۃ کے موجودہ نسخوں سے متعدّد بشارتیں نقل کی ہیں، جلد دوم صفحہ: ۱۶۴، مطبوعہ قسطنطنیہ، اور ان کے مضامین کا اناجیلِ موجودہ میں نہ ہونا اس لئے مضر نہیں کہ حسبِ تحقیق علمائے محققین اَناجیل کے نسخے محفوظ نہیں رہے، مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اس قسم کا مضمون موجود ہے، چنانچہ یوحنا کی اِنجیل مترجمہ عربی مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء کے چودھویں باب میں ہے کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو ''فارقلیط'' تمہارے پاس نہ آئے، پس اگر میں جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دُوں گا۔ ''فارقلیط'' کا ترجمہ ''احمد'' کا ہے۔ اہلِ کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں ''احمد'' فرمایا تھا، جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو ''پیرکلوطوس'' لکھ دیا، جس کے معنی ہیں ''احمد'' یعنی بہت سراہا گیا، بہت حمد کرنے والا، پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو ''فارقلیط'' کر دیا، اور بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک ''احمد'' موجود ہے، دیکھو پادری پارکہرست کی یہ عبارت دباد حمدہ خل ہکوٹیم از حمایت اسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء ص: ۸۴۸۱ ترجمہ اپالوجی گاڈفری ہینگنس مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء، اور اس فارقلیط کی نسبت اس اِنجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں: ''وہ تمہیں سب

---

[1] تفسیر الخازن تحت هٰذه الآية، ج:٦ ص:٩٢، وسنن ابی داود، كتاب الجنائز، باب فی الصلاة علی المسلم يموت فی بلاد الشرك، ج:٢ ص:٤٥٧

[2] تفسیر الخازن ج:٦ ص:٩٢، وجامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فضل النبی صلی الله عليه وسلم ج:٢ ص:٢٠١

چیزیں سکھا دے گا''، ''اِس جہان کا سردار آتا ہے''، ''وہ آکر دُنیا کو گناہ پر اور راستی اور عدالت (کے خلاف) پر سزا دے گا۔'' یہ ہیں وہ الفاظ جو نبیٔ مستقل ہونے پر دال ہیں، اور پوری بحث اس مقام کی تفسیر حقانی میں ہے، اس کا ایک شمّہ نقل کیا گیا ہے، غرض عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا) پھر جب (یہ تمام مضامین ارشاد فرما کر اپنی نبوّت کے اِثبات کے لئے) وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت) کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے! (اور جادو بتا کر نبوّت کی تکذیب کی، کما فی المائدة: وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ... اِلـخ [1] (المائدة:۱۱۰) اسی طرح بعد عیسیٰ علیہ السلام کے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ رسالت میں کفارِ موجودین نے آپ کی تکذیب کی اور مخالفت کی اور یہ ظلم عظیم ہے، پس اس ظلم کا تعدیہ مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا) اور (واقعی) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہو، اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا (اللہ پر جھوٹ باندھنا یہ ہے کہ نبوّت کی تکذیب کی، اِثبات المنفی اور نفی المثبت یعنی جو چیز اللہ کی طرف سے نہ ہو، اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا، اور جو اللہ کی طرف سے واقع میں ہو، اس کی نفی کرنا، دونوں اِفتراء علی اللہ ہیں، اور وَهُوَ يُدْعٰى اس لئے بڑھایا کہ اس سے زیادہ تقبیح ہوگئی، یعنی خود تو متنبہ کرنے سے بھی متنبہ نہ ہوا، اور وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي اس لئے بڑھایا کہ اُن کی حالتِ موجودہ اِصلاح سے بعید ہوگئی، اس لئے سزائے قتال ہی تجویز کیا جانا مصلحت ہوا، چنانچہ جس کو اب بھی اسلام کی خبر نہ پہنچی ہو اوّل اس کو دعوتِ اسلام کرنا چاہئے، جب اس سے اِنکار کرے جو کہ ظاہراً علامت نااُمیدی کی ہے، تب جہاد مشروع ہے، آگے ترغیبِ جہاد کے لئے وعدۂ نصرت وغلبۂ حق اور مغلوبیتِ باطل ارشاد ہے کہ) یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دِینِ اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں (یعنی تدبیر عملی کے ساتھ منہ سے بھی رَدّ و اعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دِینِ حق کو فروغ نہ ہو، اور بعض اوقات قولی شبہات مؤثر ہو جاتے ہیں، یا یہ تمثیل ہے کہ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہ سے نورِ الٰہی کو بجھانا چاہتا ہو، یعنی ایسے طریقے سے بجھائے جس میں ناکام رہے) حالانکہ اللہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا کر رہے گا، گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اسی اِتمامِ نور کے لئے) اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دِین (یعنی اسلام) دے کر (دُنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دِین) کو (کہ وہ نورِ مذکور ہے) تمام (بقیہ) دِینوں پر غالب کر دے (کہ یہی اِتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

(وقد مرّ تفسير الإتمام والظهور في سورة البراءة في مثل هذه الآية)۔

[1] ترجمہ: اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے باز رکھا جب تم اُن کے پاس دلیلیں لے کر آئے تھے۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس کو روایت کر کے سند کو صحیح قرار دیا ہے، کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے آپس میں یہ مذاکرہ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے تو ہم اس پر عمل کریں۔ بغوی نے اس میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان حضرات میں سے بعض نے کچھ ایسے الفاظ بھی کہے کہ اگر ہمیں اَحَبُّ الْاَعْمَالِ عِنْدَ اللہِ معلوم ہوجائے تو ہم اپنی جان و مال سب اُس کے لئے قربان کردیں۔ (مظہری) [۱]

ابنِ کثیر نے بحوالہ مسندِ احمد روایت کیا ہے کہ ان چند حضرات نے آپس میں جمع ہوکر یہ مذاکرہ کیا، اور چاہا کہ کوئی صاحب جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا سوال کریں، مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی، ابھی یہ لوگ اسی حالت پر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب لوگوں کو نام بنام اپنے پاس بلایا (جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بذریعہ وحی ان کا اجتماع اور ان کی گفتگو معلوم ہوگئی تھی) جب یہ سب لوگ حاضرِ خدمت ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۂ صف پڑھ کر سنائی جو اسی وقت آپ پر نازل ہوئی تھی۔ [۲]

اس سورۃ نے یہ بھی بتلادیا کہ اَحبّ الاعمال جس کی تلاش میں یہ حضرات تھے، وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، اور ساتھ ہی ان حضرات نے جو ایسے کلمات کہے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہوجائے تو ہم اس پر عمل کرنے میں ایسی ایسی جانبازی دکھائیں وغیرہ، جن میں ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ ہم ایسا کرسکتے ہیں، اس پر ان حضرات کو تنبیہ کی گئی کہ کسی مؤمن کے لئے ایسے دعوے کرنا دُرست نہیں، اُسے کیا معلوم ہے کہ وقت پر وہ اپنے اِرادے کو پورا کر بھی سکے گا یا نہیں، اس کے اسباب کا جمع ہونا اور موانع کا زائل ہونا اس کے اختیار میں نہیں، پھر خود اس کے دست و بازو اور اَعضا و جوارح بلکہ قلبی عزم و ارادہ ان میں سے کوئی چیز بھی بالکلیہ اس کے قبضے میں نہیں، اسی لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآنِ کریم میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو کام آپ کو آئندہ کل میں کرنا ہو، اگر اس کو بیان کرنا ہے تو "اِن شاء اللہ" کی قید کے ساتھ بیان کرو کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں کل فلاں کام کروں گا: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ [۳] (الکہف) صحابۂ کرام کی

---

[۱] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:۹ ص:۲۷۰

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۱۰۴، ومسند احمد، حدیث عبدالله بن سلام رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۲۳۷۸۹

[۳] ترجمہ: اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کردوں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملادیا کیجئے۔

نیت وقصد خواہ دعوے کا نہ ہو، مگر صورت دعوے کی تھی، وہ اللہ کے نزدیک پسند نہیں کہ کوئی کسی کام کے کرنے کا دعویٰ کرے، بجز اس کے کہ اس کو اللہ کی مشیت کے حوالے کرے، اور اِن شاء اللہ ساتھ کہے، اس تنبیہ کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو کام تمہیں کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو جس سے ایسے کام کے دعوے کی ممانعت تو واضح ہو ہی گئی، جس کو کرنے کا عزم وارادہ ہی انسان کے دل میں نہ ہو، کیونکہ یہ تو محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے نام ونمود وغیرہ کے لئے ہوسکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ شانِ نزول کے واقعے میں جن صحابہ نے مذاکرہ کیا وہ ایسے نہ تھے کہ دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور دعویٰ کریں، اس لئے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اگرچہ دل میں عزم وارادہ کام کرنے کا ہو، پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے، شانِ عبدیت کے خلاف ہے، اوّل تو اس کے کہنے ہی کیا ضرورت ہے جب موقع ملے کر گزرنا چاہئے، اور کسی مصلحت سے کہنا بھی پڑے تو اس کو ''اِن شاء اللہ'' کے ساتھ مقید کر دے تو پھر وہ دعویٰ نہیں رہے گا۔

مسئلہ:- اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو، اور اس کو کرنا ہی نہ ہو، یہ تو گناہِ کبیرہ اور اللہ کی سخت ناراضی کا سبب ہے، كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ کا مصداق یہی ہے، اور جہاں یہ صورت نہ ہو، بلکہ ارادہ کرنے کا ہو، وہاں بھی اپنی قوت وقدرت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا ممنوع ومکروہ ہے۔

دعویٰ اور دعوت میں فرق

مذکورہ تفسیر سے یہ معلوم ہوگیا کہ ان آیات کا تعلق دعوے سے ہے کہ جو کام آدمی کو کرنا نہیں ہے، اس کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، رہا معاملہ دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اُس کی نصیحت دُوسروں کو کرے، اور اس کی طرف دُوسرے مسلمانوں کو دعوت دے، وہ اس آیت کے مفہوم میں تو شامل نہیں، اس کے احکام دُوسری آیات اور احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً قرآنِ کریم نے فرمایا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرۃ: ۴۴) یعنی تم لوگوں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو کہ خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔ اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ ونصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو، اور مقصد یہ ہے کہ جب دُوسروں کو نصیحت کرتے ہو تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے، جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو خود بھی اس پر عمل کرو۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے تو دُوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت و توفیق نہیں ہے، اس کی طرف دُوسروں کو بلانے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے، اُمید ہے کہ اس وعظ و نصیحت کی برکت سے کسی وقت اُس کو بھی عمل کی توفیق ہو جائے، جیسا کہ بکثرت تجربہ و مشاہدہ میں آیا ہے، البتہ اگر وہ عمل واجب یا سنتِ مؤکدہ کے درجے میں ہو تو آیاتِ مذکورہ پر نظر کر کے اپنے نفس میں نادم و شرمندہ ہونے کا سلسلہ جاری رکھنا بھی واجب ہے، اور اگر مستحبات کے متعلق ہے تو یہ سلسلۂ ندامت بھی مستحب ہے۔

اگلی آیات میں اُس اصل معاملے کا ذِکر ہے جو اس سورت کے نزول کا سبب بنا، یعنی اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل زیادہ محبوب ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب وہ صفِ قتال ہے جو اللہ کے دُشمنوں کے مقابلے میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے قائم ہو اور مجاہدین کے عزم و ہمت کی وجہ سے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو کہ اُن کے قدموں میں کوئی تزلزل نہ آنے پائے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں دُشمنوں کی ایذائیں سہنے کا ذِکر ہے، اور اس کے بعد پھر مسلمانوں کو جہاد کی تلقین کی گئی، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واقعات جن کا ذِکر اس جگہ آیا ہے، ان میں بھی بہت سے علمی و عملی فوائد اور ہدایات ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ انہوں نے جب بنی اسرائیل کو اپنی نبوّت کے ماننے اور اطاعت کرنے کی دعوت دی تو دو چیزوں کو خصوصیت سے ذکر فرمایا، ایک یہ کہ وہ کوئی انوکھے رسول نہیں، انوکھی باتیں لے کر نہیں آئے، بلکہ وہ باتیں ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کہتے آئے ہیں، اور پہلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، اور بعد میں بھی جو آخری پیغمبر آنے والے ہیں وہ بھی اسی قسم کی ہدایات لے کر آئیں گے۔

یہاں پہلی کتابوں میں سے توراۃ کا خصوصیت سے ذِکر غالباً اس لئے کیا کہ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی قریبی کتاب وہی تھی، ورنہ تصدیقِ انبیاء تو سب پچھلی کتابوں کو شامل اور عام ہے، نیز اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ شریعتِ عیسوی اگرچہ مستقل شریعت ہے مگر اس کے اکثر اَحکام شریعتِ موسوی اور توراۃ کے اَحکام ہی کے مطابق ہیں، صرف چند اَحکام ہیں جو بدلے گئے ہیں، یہ تو پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کا مضمون تھا۔ دُوسری چیز یہ کہ بعد میں آنے والے رسول کی خوش خبری سنائی، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اُن کی ہدایات بھی اسی کے مطابق ہوں گی، اس لئے اس پر ایمان لانا عین تقاضائے عقل و دیانت ہے۔

ساتھ ہی جس آنے والے رسول کی خوش خبری عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو سنائی، اس کا نام پتہ بھی اِنجیل میں بتلا دیا گیا، اس میں بنی اسرائیل کو اس کی ہدایت ہے کہ جب وہ رسول تشریف لائیں تو تمہارا فرض ہوگا کہ اُن پر ایمان

لاؤ، اوران کی اطاعت کرو، وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ میں اسی کا بیان ہے۔ اس میں آنے والے رسول کا نام ''احمد'' بتلایا گیا ہے، ہمارے نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ''محمد'' بھی تھا، اور ''احمد'' بھی، اور بھی متعدّد نام تھے، مگر انجیل میں آپ کا نام ''احمد'' بتلانے میں شاید یہ مصلحت ہو کہ ''محمد'' نام رکھنے کا عرب میں قدیم سے دستور تھا، اس لئے اس نام کے دُوسرے آدمی بھی عرب میں تھے، بخلاف ''احمد'' کے، یہ نام عرب میں معروف نہیں تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔

اِنجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت

یہ سب کو معلوم ہے اور خود یہود ونصاریٰ کو بھی اس کا اِقرار کرنا پڑا ہے کہ توراۃ واِنجیل میں تحریف ہوئی ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اتنی ہوئی ہے کہ اصل کلام کا پہچاننا بھی آسان نہیں رہا، موجودہ تحریف شدہ اِنجیل کی بنا پر آج کل کے عیسائی قرآن کی اس خبر کو تسلیم نہیں کرتے کہ اِنجیل میں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ''احمد'' لے کر خوش خبری دِی گئی ہو، اس کا مختصر جواب وہ کافی ہے جو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکا ہے۔

اور مفصل جواب کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اِظہارُ الحق'' کا مطالعہ کیا جائے، جو مذہبِ عیسائیت کی حقیقت اور اِنجیل میں تحریفات اور باوجود تحریفات کے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں موجود ہونے کے متعلق بے نظیر کتاب ہے، خود بڑے عیسائیوں کے مقولے چھپے ہوئے ہیں کہ اگر ''دُنیا میں یہ کتاب شائع ہوتی رہی تو عیسائیت کا کبھی فروغ نہیں ہوسکتا۔''

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، پھر ترکی، انگریزی میں اس کے ترجمے چھپے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مشن نے اس کتاب کو گم کردینے میں اپنی پوری کوشش صَرف کی ہے، اس کا اُردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا تھا، حال میں اس کا اُردو ترجمہ دارالعلوم کراچی کے مدرّس مولانا اکبر علی صاحب نے اور تحقیقاتِ جدیدہ مفیدہ موجودہ زمانے کی مطبوعہ اِنجیلوں سے مولانا محمد تقی صاحب اُستاذ دارالعلوم نے لکھی ہیں، جو تین جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اس کی تیسری جلد میں صفحہ: ۱۸۲ سے صفحہ: ۳۶۲ تک انہی بشارتوں کی تفصیل موجودہ اِنجیلوں کے حوالے سے اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ

اے ایمان والو میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو

مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ تُجَاهِدُوۡنَ

ایک عذاب دردناک سے، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور لڑو

فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ

اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾ يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ وَيُدۡخِلۡكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا

سمجھ رکھتے ہو، بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں

الۡاَنۡهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۲﴾

نہریں، اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں کے اندر، یہ ہے بڑی مراد ملنی،

وَاُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی، اور خوشی سنادے ایمان والوں کو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ

اے ایمان والو تم ہوجاؤ مددگار اللہ کے جیسے کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے

لِلۡحَوَارِيّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ

اپنے یاروں کو کون ہے کہ مدد کرے میری اللہ کی راہ میں بولے یار ہم ہیں

اَنۡصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَكَفَرَتۡ طَّآئِفَةٌ ۚ

مددگار اللہ کے پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے اور منکر ہوا ایک فرقہ،

ع
فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

پھر قوت دی ہم نے اُن کو جو اِیمان لائے تھے اُن کے دُشمنوں پر پھر ہو رہے غالب۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ دُوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دِلا دے؟ ﴿۱۰﴾ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اُس کے رسول پر اِیمان لاؤ، اور اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین بات ہے، اگر تم سمجھو۔ ﴿۱۱﴾ اس کے نتیجے میں اللہ تمہاری خاطر تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور تمہیں ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ایسے عمدہ گھروں میں بسائے گا جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں واقع ہوں گے۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔ ﴿۱۲﴾ اور ایک اور چیز تمہیں دے گا جو تمہیں پسند ہے، (اور وہ ہے) اللہ کی طرف سے مدد، اور ایک ایسی فتح جو عنقریب حاصل ہوگی! اور (اے پیغمبر!) ایمان والوں کو (اس بات کی) خوشخبری سنادو۔ ﴿۱۳﴾ اے ایمان والو! تم اللہ (کے دِین) کے مددگار بن جاؤ، اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے حواریوں سے کہا تھا کہ: ''وہ کون ہیں جو اللہ کے واسطے میرے مددگار بنیں؟'' حواریوں نے کہا: ''ہم اللہ کے (دِین کے) مددگار ہیں۔'' پھر بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لے آیا، اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا۔ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے تھے، ہم نے ان کے دُشمنوں کے خلاف ان کی مدد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غالب آئے۔ ﴿۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(آگے اوّل جہاد کا ثمرۂ آخرت، پھر ثمرۂ دُنیویہ کا وعدہ کر کے ترغیب دیتے ہیں کہ) اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ (جب ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (بنے) ہوں گے یہ بڑی کامیابی ہے اور (اس ثمرۂ حقیقیہ اُخرویہ کے علاوہ) ایک اور ثمرہ (دُنیویہ) بھی ہے کہ تم اس کو (بھی خاص طور پر) پسند کرتے ہو (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی ہے (اس کا خاص طور پر محبوب ہونا اس لئے ہے کہ انسان طبعاً ثمرۂ عاجلہ بھی

چاہتا ہے) اور (اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان تمام اُمور کی) مؤمنین کو بشارت دے دیجئے (چنانچہ فتح ونصرت کی پیشین گوئی کا ظہور اِسلامی فتوحات سے ظاہر ہے، آگے اَصحابِ عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ یاد دِلا کر نصرتِ دِین کی ترغیب دیتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم اللہ کے (دِین کے) مددگار ہو جاؤ (اس طریقے سے جو تمہارے لئے مشروع ہے، یعنی جہاد) جیسا کہ (حواریین اپنی شریعت کے طریقے کے موافق ناصرِ دِین ہوئے تھے، جبکہ لوگ کثرت سے عیسیٰ علیہ السلام کے دُشمن اور مخالف تھے اور جب کہ) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ان) حواریین سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے وہ حواری بولے ہم اللہ (کے دِین) کے مددگار ہیں (چنانچہ ان حواریین نے دِین کی یہ مدد کی کہ اس کی اشاعت میں کوشش کی) سو (اس کوشش کے بعد) بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ منکر رہے، (پھر ان میں باہم اِختلافِ مذہبی سے عداوت اور خانہ جنگیاں ہوئیں، یا مذہبی گفتگو ہوئی) سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دُشمنوں کے مقابلے میں تائید کی سو وہ غالب ہوگئے (اسی طرح تم دِینِ محمدی کے لئے کوشش اور جہاد کرو، اور اگر اِبتدا ان خانہ جنگیوں کی کفار کی طرف سے ہو تو اس سے دِینِ عیسوی میں جہاد کا ہونا لازم نہیں آتا)۔

معارف ومسائل

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ اس آیت میں ایمان اور مجاہدہ بالمال والنفس کو تجارت فرمایا ہے، کیونکہ جس طرح تجارت میں کچھ مال خرچ کرنے اور محنت کرنے کے صلے میں منافع حاصل ہوتے ہیں، ایمان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے بدلے میں اللہ کی رضا اور آخرت کی دائمی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، جس کا ذِکر اگلی آیت میں ہے کہ جس نے یہ تجارت اِختیار کی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے گا، اور جنت میں اس کو پاکیزہ و بہترین مساکن ومکانات عطا فرمادے گا، جن میں ہر طرح کے آرام وعیش کے سامان ہوں گے، جیسا کہ حدیث میں "وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً" کی تفسیر میں اس کا بیان آیا ہے۔[1] آگے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ کچھ دُنیا کی نعمتوں کا بھی وعدہ فرماتے ہیں۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ لفظ "اُخْرٰی" نعمت کی صفت ہے، معنی یہ ہیں کہ آخرت کی نعمتیں اور جنت کے مکانات تو ملیں گے ہی، جیسا کہ وعدہ کیا گیا ہے، ایک نعمت نقد دُنیا میں بھی ملنے والی ہے، وہ ہے اللہ کی مدد اور اس کے ذریعے فتحِ قریب یعنی دُشمنوں کے ممالک کا فتح ہونا، یہاں "قَرِيْبٌ" اگر بمقابلہ آخرت کے لیا جائے تو بعد میں

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: المعجم الکبیر للطبرانیؒ، رقم الحدیث:۱۴۷۶۸، ومسند البزار، مسند عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۳۵۶۳

آنے والی اسلامی فتوحات عرب وعجم کی سب اس میں داخل ہیں، اور ''قَرِیْبٌ'' عرفی مراد لیا جائے تو اس کا پہلا مصداق فتحِ خیبر ہے، اور اس کے بعد فتحِ مکہ مکرمہ ہے، اور اس ''فَتْحٌ قَرِیْبٌ'' کے متعلق ''تُحِبُّوْنَهَا'' فرمایا، یعنی یہ نقد نعمت تمہاری پسندیدہ اور محبوب ہے، کیونکہ انسان فطری طور پر عجلت پسند واقع ہوا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ (بنی اسرائیل) یعنی ''ہے انسان جلد باز'' اس کا یہ مفہوم نہیں کہ آخرت کی نعمتیں ان کو محبوب نہ تھیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں کی طلب ومحبت تو ظاہر ہی ہے، مگر طبعی طور پر کچھ نقد نعمت دُنیا میں بھی تمہیں مطلوب ومحبوب ہے، وہ بھی عطا کی جائے گی۔

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ حَوَارِيّٖنَ، حَوَارِیْ کی جمع ہے، جس کے معنی مخلص دوست کے ہیں، جو ہر عیب سے پاک وصاف ہو، (رُوح از ازہری)[1] اسی لئے جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ان کو ''حواری'' کہا جاتا ہے، اور وہ بارہ آدمی تھے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔ اس آیت میں زمانۂ عیسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعے کا ذِکر کر کے مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دِین کی مدد کے لئے تیار ہو جائیں، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دُشمنوں سے تنگ آئے تو لوگوں سے کہا: مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ یعنی اللہ کے دِین کی اشاعت میں کون میرا مددگار ہوتا ہے جس پر بارہ آدمیوں نے وفاداری کا عہد کیا، اور پھر دِینِ عیسوی کی اشاعت میں خدمات انجام دیں، تو مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اللہ کے دِین کے انصار ومددگار بنیں۔

صحابۂ کرام نے اس حکم کی تعمیل ایسی کی کہ پچھلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور دِین کی خاطر سب عرب وعجم سے دُشمنی خریدی، ان کی ایذائیں سہیں، اپنی جان ومال اور اولاد کو اس پر قربان کیا، اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنی فتح ونصرت سے نوازا، اور سب دُشمنوں پر اُن کو غالب فرمایا، ان کے ممالک ان کے ہاتھ آئے، اور دُنیا کی فرمانروائی بھی اُن کو نصیب ہوئی۔

فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

عیسائیوں کے تین فرقے

بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان میں اُٹھالیا تو عیسائیوں میں تین فرقے ہوئے، ایک فرقے نے کہا کہ وہ خود خدا ہی تھے، آسمان میں چلے گئے۔ دُوسرے فرقے نے کہا کہ وہ خدا تو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے تھے، اللہ نے ان کو اُٹھالیا اور دُشمنوں پر فوقیت دے دی۔ تیسرے

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۲۰ ص:۴۹۳

فرقے نے وہ بات کہی جو صحیح اور حق ہے کہ وہ نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے، بلکہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دُشمنوں سے حفاظت اور رفعتِ درجہ کے لئے اُٹھالیا، یہ لوگ صحیح مؤمن تھے، تینوں فرقوں کے ساتھ کچھ عوام لگ گئے اور باہمی نزاع بڑھتے بڑھتے باہم قتال کی نوبت آگئی، اتفاق سے دونوں کافر فرقے مؤمنین پر غالب آگئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے اس مؤمن فرقے کی تائید کی، اس طرح انجامِ کار وہ مؤمن فرقہ بحیثیت حجت و دلیل کے غالب آگیا۔ (مظہری) [1]

اس تفسیر کے مطابق ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے مؤمنین اُمتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی مراد ہوں گے، جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت سے مظفر و منصور ہوں گے۔ (مظہری) [2] اور بعض حضرات نے فرمایا کہ رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں میں دو فرقے ہوگئے، ایک عیسیٰ علیہ السلام کو خدا، یا خدا کا بیٹا قرار دے کر مشرک ہوگیا، دُوسرا صحیح دِین پر قائم رہا، جو اُن کو اللہ کا بندہ اور رسول کہنے کا قائل تھا، پھر اُن مشرکین و مؤمنین میں باہم جنگ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین اُمتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اس اُمت کے کافروں پر غالب کر دیا۔ مگر مشہور یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں جہاد وقتال کا حکم نہیں تھا، اس لئے مؤمنین کا قتال کرنا بعید معلوم ہوتا ہے۔ (رُوح المعانی) [3] مگر اُوپر خلاصۂ تفسیر میں اس کے جواب میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا اِمکان ہے کہ جنگ کی اِبتدا کفارِ نصاریٰ کی طرف سے ہوئی ہو اور مؤمنین مدافعت پر مجبور ہوگئے ہوں، تو یہ جہاد و قتال کے حکم میں نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

تَمَّتْ

سُوْرَةُ الصَّفِّ بِحَمْدِ اللهِ وَعَوْنِهٖ

لِلْحَادِيْ وَالْعِشْرِيْنَ مِنْ جُمَادَى الْاُوْلٰى

۱۳۹۱ھ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَآءَ اللهُ

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

---

[1] تفسیر البغوی ج:۸ ص:۱۱۰، والمظهری ج:۹ ص:۲۷۴

[2] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۷۴

[3] تفسیر روح المعانی ج:۲۰ ص:۴۹۳

سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ

آیاتھا ۱۱ ۶۲ سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۰ رکوعاتھا ۲

سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی، اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رُکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں، بادشاہ پاک ذات

الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ① ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ

زبردست حکمتوں والا، وہی ہے جس نے اُٹھایا اَن پڑھوں میں ایک رسول ان ہی میں کا،

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ ق

پڑھ کر سناتا ہے اُن کو اس کی آیتیں اور اُن کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور عقل مندی،

وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ

اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔ اور (اُٹھایا اس رسول کو ایک) دُوسرے لوگوں کے واسطے بھی ان ہی میں سے

لَمَّا يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ

جو ابھی نہیں ملے ان میں، اور وہی ہے زبردست حکمت والا، یہ بڑائی اللہ کی ہے

يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِيۡنَ

دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ مثال ان لوگوں کی

حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ يَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ يَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ

جن پر لادی توراۃ، پھر نہ اُٹھائی انہوں نے جیسے مثال گدھے کی کہ پیٹھ پر لے چلتا ہے کتابیں،

بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى

بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی باتوں کو اور اللہ راہ نہیں دیتا

الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵﴾ قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ

بے انصاف لوگوں کو، تو کہہ اے یہودی ہونے والو اگر تم کو دعویٰ ہے کہ تم

اَوۡلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۶﴾

دوست ہو اللہ کے سب لوگوں کے سوائے تو مناؤ اپنے مرنے کو اگر تم سچے ہو،

وَلَا يَتَمَنَّوۡنَهٗۤ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۷﴾

اور وہ کبھی نہ منائیں گے اپنا مرنا اُن کاموں کی وجہ سے جن کو آگے بھیج چکے ہیں اُن کے ہاتھ، اور اللہ کو خوب معلوم ہیں سب گنہگار،

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ

تو کہہ موت وہ جس سے تم بھاگتے ہو سو وہ تم سے ضرور ملنے والی ہے، پھر تم پھیرے جاؤ گے

اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ ع

اس چھپے اور کھلے جاننے والے کے پاس، پھر جتلا دے گا تم کو جو تم کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو بادشاہ ہے، بڑے تقدس کا مالک ہے، جس کا اِقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔ ① وہی ہے جس نے اُمّی لوگوں میں اُنہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو اُن کے سامنے اُس کی آیتوں کی تلاوت کریں، اور اُن کو پاکیزہ بنائیں، اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں، جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، ② اور (یہ رسول جن کی طرف بھیجے گئے ہیں) ان میں کچھ اور بھی ہیں جو ابھی ان کے ساتھ آکر نہیں ملے۔ اور وہ بڑے اِقتدار والا، بڑی حکمت والا ہے۔ ③ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے، دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ④ جن لوگوں پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا، پھر انہوں نے اُس کا بوجھ نہیں اُٹھایا، ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو۔ بہت بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ⑤ (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: ''اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو! اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ سارے لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے دوست ہو، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔'' ⑥ اور انہوں نے اپنے ہاتھوں جو اَعمال آگے بھیج رکھے ہیں، اُن کی وجہ سے یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے، اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ⑦ کہو کہ: ''جس موت سے تم بھاگتے ہو، وہ تم سے آ ملنے والی ہے، پھر تمہیں اُس (اللہ) کی طرف لوٹایا جائے گا جسے تمام پوشیدہ اور کھلی ہوئی باتوں کا پورا علم ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کچھ کیا کرتے تھے۔'' ⑧

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (قالاً یا حالاً) اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں، جو کہ

بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے، زبردست ہے، حکمت والا ہے، وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اَخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانش مندی (کی باتیں جس میں سب علومِ ضروریہ دینیہ آ گئے) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے (یعنی شرک وکفر میں اور مرادا کثر ہیں، کیونکہ جاہلیت میں بھی بعض موحّد تھے، مگر تاہم تکمیلِ ہدایت کے وہ بھی محتاج تھے) اور (علاوہ ان موجودین کے) دُوسروں کے لئے بھی (آپ کو مبعوث فرمایا) جو (اسلام لاکر) اُن میں سے ہونے والے ہیں، لیکن ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے (خواہ بوجہ اس کے کہ موجود ہیں مگر اِسلام نہیں لائے، یا بوجہ اس کے کہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، اس میں تمام اُمت قیامت تک عربی و عجمی سب آ گئے، اور ان کو "مِنْهُمْ" اس لئے فرمایا کیونکہ مسلمان سب رشتۂ اِسلام میں منسلک اور متحد ہیں، کذا فی الخازن [1]) اور وہ زبردست حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے ایسا نبی بھیجا اور پہلی آیت میں فی نفسہٖ ان صفات کا اِثبات مقصود تھا، پس تکرار نہ رہا اور) یہ (رسول کے ذریعے سے ضلال سے نکل کر کتاب وحکمت وہدایت کی طرف آنا) خدا کا فضل ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے، (اگر سب کو بھی عنایت کرے تو وسعت ہے، مگر وہ اپنی حکمت سے جس کو چاہے تخصیص فرماتا ہے، اور جس کو چاہے بے بہرہ رکھتا ہے، جیسا کہ اُوپر اُمّیّین کے ایمان لانے سے اور آئندہ کی آیت میں علمائے یہود کے ایمان نہ لانے سے یہ امر ظاہر ہے، آگے بعض مکذبینِ رسالت کی تقبیح ہے کہ) جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا اُن کی حالت اُس گدھے کی سی حالت ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے (مگر ان کتب کے نفع سے محروم ہے، اسی طرح اصل مقصود اور نفعِ علم کا عمل ہے، جب یہ نہ ہوا اور صرف تحصیل وحفظِ علم میں تعب ہوا تو بالکل ایسی ہی مثال ہوگئی، اور گدھے کی تخصیص اس لئے کہ وہ جانوروں میں بے وقوف مشہور ہے، تو اس میں زیادہ تنفیر ہوگئی غرض) ان لوگوں کی بُری حالت ہے جنہوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا (جیسے یہ یہود ہیں) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیا کرتا (کیونکہ جان کر عناد کرتے ہیں اور اگر ہدایت ہوگی تو بعد ترکِ عناد کے ہوگی، اور توراۃ پر عمل کرنے کے لوازم میں سے ہے ایمان لانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر، جیسا کہ اس میں حکم ہے، پس ایمان نہ لانا مستلزم ہے ترکِ عمل بالتوراۃ کو، اور اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ ہم باوجود اس حالت کے بھی اللہ کے مقبول ہیں تو) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکتِ غیرے اللہ کے مقبول (ومحبوب) ہو تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر (کے دِکھلا) دو، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو اور (ہم ساتھ ہی یہ کہہ دیتے ہیں کہ) وہ (خاص مدعی) کبھی اس (موت) کی تمنا

[1] تفسیر خازن ج:۶ ص:۹۴ تحت هذه الآية.

نہ کریں گے بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمالِ (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب تاریخ مقدمہ کی آئے گی، فردِ قرارداد جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائے گا اور اس وعدۂ سزا کی تاکید کے لئے) آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو (اور اس کی تمنا باوجود دعویٰ ولایت کے اس لئے نہیں کرتے ہو کہ سزا بھگتنا ہوگی) وہ (موت ایک روز) تم کو آ پکڑے گی، پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے (خدا) کے پاس لے جائے جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلا دے گا (اور سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، قرآنِ کریم کی جو سورتیں ''سَبَّحَ'' یا ''يُسَبِّحُ'' سے شروع ہوتی ہیں، اُن کو مُسَبِّحَاتْ کہا جاتا ہے، اُن سب میں تمام زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب کے لئے اللہ تعالیٰ کی تسبیح خوانی ثابت کی گئی ہے، یہ تسبیح حالی یعنی بزبانِ حال تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کا ذرّہ ذرّہ اپنے صانع حکیم کی حکمت وقدرت پر گواہی دیتا ہے، یہی اس کی تسبیح ہے، اور صحیح بات یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے طرز میں حقیقی تسبیح کرتی ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ شعور و اِدراک اللہ تعالیٰ نے ہر شجر و حجر اور ہر چیز میں اس کے حوصلے کے مطابق رکھا ہے، اس عقل وشعور کا لازمی تقاضا تسبیح ہے، مگر ان چیزوں کی تسبیح کو لوگ سنتے نہیں، اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا: وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ [1] (بنی اسرائیل: ۴۴) اکثر سورتوں کے شروع میں ''سَبَّحَ'' بصیغۂ ماضی آیا ہے، صرف سورۂ جمعہ اور سورۂ تغابن میں بلفظ مضارع ''يُسَبِّحُ'' لایا گیا ہے، تغیرِ عنوان میں ایک بلاغت ولطافت بھی اس کا سبب ہوگئی ہے، وہ یہ ہے کہ صیغۂ ماضی قطعیت اور یقین پر دلالت کرتا ہے، اس لئے اکثر وہی استعمال فرمایا، اور صیغۂ مضارع کی دلالت اِستمرار و دَوام پر ہے، دو جگہ اس فائدے کے لئے صیغۂ مضارع استعمال فرمایا۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، اُمِّيّٖنَ، اُمّی کی جمع ہے، ناخواندہ شخص کو کہا جاتا ہے، عرب کے لوگ اس لقب سے معروف ہیں، کیونکہ ان میں نوشت وخواند کا رِواج نہیں تھا، بہت کم آدمی لکھے پڑھے ہوتے تھے، اس آیت میں حق تعالیٰ کی عظیم قدرت کے اِظہار کے لئے خاص طور پر عربوں کے لئے یہ لقب اِختیار فرمایا، اور یہ بھی کہ جو رسول بھیجا گیا وہ بھی ان ہی میں سے ہے یعنی اُمّی ہے، اس لئے یہ معاملہ بڑا حیرت انگیز ہے کہ قوم ساری اُمّی اور جو رسول بھیجا گیا وہ بھی اُمّی، اور جو فرائض اس رسول کے سپرد کئے گئے جن کا ذِکر اگلی آیت میں آ رہا ہے وہ سب علمی، تعلیمی، اصلاحی ایسے ہیں کہ نہ کوئی اُمّی ان کو سکھا سکتا ہے اور نہ اُمّی قوم اُن کو سیکھنے کے قابل ہے۔

---

[1] ترجمہ: لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔

یہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِعجاز ہی ہوسکتا ہے کہ آپ نے جب تعلیم واِصلاح کا کام شروع فرمایا تو ان ہی اُمِّیّٖنَ میں وہ علماء اور حکماء پیدا ہوگئے جن کے علم وحکمت، عقل ودانش اور ہر کام کی عمدہ صلاحیت نے سارے جہان سے اپنا لوہا منوالیا۔

بعثتِ نبوی کے تین مقصد

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین وصف نعمائے الٰہیہ کے ضمن میں بتلائے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیاتِ قرآن، یعنی قرآن پڑھ کر اُمت کو سنانا۔ دُوسرے اُن کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک کرنا، جس میں بدن اور لباس وغیرہ کی ظاہری پاکی بھی داخل ہے، اور عقائد واعمال اور اخلاق وعادات کی پاکیزگی بھی۔ تیسرے تعلیم کتاب وحکمت۔

یہ تینوں چیزیں اُمت کے لئے حق تعالیٰ کے اِنعامات بھی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بھی۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ، تلاوت کے اصل معنی اِتباع وپیروی کے ہیں، اصطلاح میں یہ لفظ کلام اللہ کے پڑھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور آیات سے آیاتِ قرآنِ کریم مراد ہیں، لفظ عَلَیْهِمْ سے یہ بتلایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منصب اور مقصدِ بعثت یہ ہے کہ آیاتِ قرآن لوگوں کو پڑھ کر سنادیں۔

آیاتِ مذکورہ میں بعثتِ نبوی کا دُوسرا مقصد یُزَكِّیْهِمْ بتلایا ہے، یہ تزکیہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پاک کرنے کے ہیں، بیشتر معنوی اور باطنی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے، یعنی کفر وشرک اور بُرے اخلاق وعادات سے پاک ہونا، اور کبھی مطلقاً ظاہری اور باطنی پاکی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں بظاہر یہی معنی مراد ہیں۔

تیسرا مقصد وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کتاب سے مراد قرآنِ کریم اور حکمت سے مراد وہ تعلیمات وہدایات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہیں، اسی لئے بہت سے حضراتِ مفسرین نے یہاں حکمت کی تفسیر سنت سے فرمائی ہے۔

ایک سوال وجواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ تلاوت کے بعد تعلیم کا ذِکر کیا جاتا، اس کے بعد تزکیہ کا، کیونکہ ان تینوں وظائف کی ترتیبِ طبعی یہی ہے کہ پہلے تلاوت یعنی تعلیمِ الفاظ، پھر تعلیم معانی، اور ان دونوں کے نتیجے میں اعمال واخلاق کی دُرستی جو تزکیہ کا مفہوم ہے، مگر قرآنِ کریم میں یہ آیت کئی جگہ آئی ہے، اکثر جگہوں میں ترتیب بدل کر

تلاوت اور تعلیم کے درمیان تزکیہ کا ذِکر فرمایا ہے۔

روح المعانی میں اس کی یہ کیفیت بتلائی ہے کہ اگر ترتیبِ طبعی کے مطابق رکھا جاتا تو یہ تینوں چیزیں مل کر ایک ہی چیز ہوتی، جیسے معالجات کے نسخوں میں کئی دوائیں مل کر مجموعہ ایک ہی دوا کہلاتی ہے، اور یہاں اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل نعمتِ خداوندی ہیں،[1] اور تینوں کو الگ الگ فرائضِ رسالت قرار دِیا گیا ہے، اس ترتیب کے بدلنے سے اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اس آیت کی مکمل تفسیر وتشریح بہت سے اہم مسائل وفوائد پر مشتمل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے، معارف القرآن جلد اوّل، صفحہ: ۳۸۲ سے ۳۹۳ تک یہ مضامین آئے ہیں۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اٰخَرِيْنَ کے لفظی معنی ''دُوسرے لوگ''، ''لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ'' کے معنی جو ابھی تک اُن لوگوں یعنی اُمِّیّٖنَ کے ساتھ نہیں ملے، مراد ان سے وہ تمام مسلمان ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے، (کما روی عن ابن زید ومجاهد وغیرهما)[2] اس میں اشارہ ہے کہ قیامت تک آنے والے مسلمان سب کے سب مؤمنینِ اوّلین یعنی صحابۂ کرام ہی کے ساتھ ملحق سمجھے جائیں گے، یہ بعد کے مسلمانوں کے لئے بڑی بشارت ہے۔ (رُوح)[3]

لفظ ''اٰخَرِيْنَ'' کے عطف میں دو قول ہیں، بعض حضرات نے اس کو ''اُمِّیّٖنَ'' پر عطف قرار دِیا ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ بھیجا اللہ نے اپنا رسول ''اُمِّیّٖنَ'' میں اور ان لوگوں میں جو ابھی اُن سے نہیں ملے، اس پر جو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اُمِّیّٖنَ یعنی موجودین میں رسول بھیجنا تو ظاہر ہے، جو لوگ ابھی آئے ہی نہیں ان میں بھیجنے کا کیا مطلب ہوگا اس کا جواب بیان القرآن میں یہ دیا ہے کہ ان میں بھیجنے سے مراد ان کے لئے بھیجنا ہے، کیونکہ لفظ ''فِیْ'' عربی زبان میں اس معنی کے لئے بھی آتا ہے۔[4]

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ''اٰخَرِيْنَ'' کا عطف ''يُعَلِّمُهُمْ'' کی ضمیرِ منصوب پر ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دیتے ہیں اُمِّیّٖنَ کو بھی اور اُن لوگوں کو بھی جو اَبھی اُن کے ساتھ ملے نہیں۔ (اختاره فی المظهری)[5]

---

[1] روح المعانی ج:۲۰ ص:۴۹۵

[2] روح المعانی ج:۲۰ ص:۴۹۶

[3] روح المعانی بحوالۂ بالا

[4] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۱۲ ص:۵

[5] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۲۷۵

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ آپ پر نازل ہوئی، (اور آپ نے ہمیں سنائی) جب آپ نے یہ آیت پڑھی: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہیں جن کا ذکر "اٰخَرِيْنَ" کے لفظ سے کیا گیا ہے، آپ نے اس وقت سکوت فرمایا، مکرر سہ کرر سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسیؓ پر رکھ دیا (جو اُس وقت مجلس میں موجود تھے) اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریا ستارے کی بلندی پر بھی ہوگا تو ان کی قوم کے کچھ لوگ وہاں سے بھی ایمان کو لے آئیں گے۔ (مظہری) [1]

اس روایت میں بھی اہلِ فارس کی تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ اتنا ثابت ہوا کہ یہ بھی اٰخَرِيْنَ کے مجموعے میں داخل ہیں، اس حدیث میں اہلِ عجم کی بڑی فضیلت ہے۔ (مظہری) [2]

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۔ اَسْفَارًا، سِفْر بکسر سین کی جمع ہے، بڑی کتاب کو کہا جاتا ہے، سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوّت اُمِّيّٖنَ میں ہونا اور آپ کی بعثت کے تین مقاصد کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے، پچھلی آسمانی کتاب توراۃ میں بھی آپ کا ذِکر تقریباً انہی الفاظ و صفات کے ساتھ آیا ہے، جس کا مقتضا یہ تھا کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ پر ایمان لے آتے، مگر ان کو دُنیا کے جاہ و مال نے توراۃ کے اَحکام سے اندھا کر دیا اور باوجود توراۃ کا علم ہونے کے عمل کے اعتبار سے ایسے ہوگئے جیسے بالکل جاہل ناواقف ہوں، اُن لوگوں کی مذمت مذکورہ آیت میں اس طرح کی گئی کہ یہ لوگ جن پر توراۃ لادی گئی تھی، یعنی اُن کو بے مانگے اللہ کی یہ نعمت دے دی گئی تھی، مگر انہوں نے اس کے اُٹھانے کا حق ادا نہ کیا، یعنی توراۃ کے اَحکام کی پروانہ کی، ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کی پشت پر علوم و فنون کی بڑی بڑی کتابیں لاد دِی جاتی ہیں، یہ گدھا اُن کا بوجھ تو اُٹھاتا ہے مگر ان کے مضامین کی نہ اس کو کچھ خبر ہے، نہ اُن سے کوئی فائدہ اس کو پہنچتا ہے، یہود کا بھی یہی حال ہے کہ دُنیا سازی کے لئے توراۃ تو لئے پھرتے ہیں، اور لوگوں میں اس کے ذریعے جاہ اور اپنا مقام بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کی ہدایات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

عالمِ بے عمل کی مثال

حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ جو مثال یہود کی دِی گئی ہے، یہی مثال اُس عالمِ دِین کی ہے جو اپنے علم پر عمل نہ کرے۔

---

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۷۵، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب سورة الجمعة، ج:۲ ص:۷۲۷، وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل الفارس، ج:۲ ص:۳۱۲

[2] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۲۷۵

نہ محقق بود نہ دانش مند　　　چار پائے برو کتابے چند [۱]

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ یہود اپنے کفر وشرک اور ساری بداَخلاقیوں کے باوجود یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ:۱۸) یعنی ہم تو اللہ کی اولاد اور محبوب ہیں۔ اور اپنے سوا کسی کو جنت کا مستحق نہ کہتے تھے، بلکہ یوں کہا کرتے تھے: لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا [۲] (البقرۃ:۱۱۱) گویا وہ آخرت کے عذاب سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے اور جنت کی نعمتوں کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ آخرت کی نعمتیں دُنیا کی نعمتوں سے ہزاروں درجے افضل وبہتر ہیں اور دُنیا میں ہر وقت یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ یہاں کی زندگی رنج وغم اور تکلیفوں سے اور محنتوں سے خالی نہیں، اور بیماریاں بھی آتی ہی رہتی ہیں، اور اس کو یہ بھی یقین ہو کہ موت آتے ہی مجھے وہ عظیم اور دائمی نعمتیں ضرور مل ہی جائیں گی، تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی عقل وفہم ہے تو اس کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہو اور وہ دِل سے چاہے کہ موت جلد آجائے تاکہ دُنیا کی مکدّر اور رنج وغم سے بھری ہوئی زندگی سے نکل کر خالص راحت اور آرام کی دائمی زندگی میں پہنچ جائے۔

اس لئے آیتِ مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ آپ یہود سے فرمائیں کہ اگر تمہارا یہ دعویٰ کہ ساری مخلوق میں تم ہی اللہ کے محبوب اور لاڈلے ہو اور تمہیں یہ خطرہ بالکل نہیں کہ آخرت میں تمہیں کوئی عذاب ہوسکتا ہے، تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تم موت کی تمنا کرو اور اس کے مشتاق رہو۔

پھر قرآن نے خود ان کی تکذیب کر دی اور فرمایا: وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یعنی یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ اس کے کہ اُن کے ہاتھوں نے (آخرت کے لئے کفر وشرک اور اعمالِ بد) آگے بھیج رکھے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ آخرت میں ہمارے لئے عذابِ جہنم کے سوا کچھ نہیں، اور یہ دعوے اللہ کے مقبول ومحبوب ہونے کے بالکل جھوٹ ہیں، جن کا جھوٹ ہونا خود اُن پر بھی واضح ہے، مگر دُنیا کے کچھ فوائد حاصل کرنے کے لئے ایسے دعوے کرتے ہیں، اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر موت کی تمنا ظاہر کر دی تو وہ ضرور قبول ہو جائے گی اور ہم مر جائیں گے، اس لئے فرمایا کہ وہ ہرگز ایسی تمنا نہیں کرسکتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس وقت ان میں کوئی موت کی تمنا کرتا تو اسی وقت مر جاتا۔ (رُوح) [۳]

---

[۱] ترجمہ: نہ محقق ہے نہ عقل مند، چار پائے پر چند کتابیں ہیں۔

[۲] ترجمہ: بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں۔

[۳] تفسیر روح المعاني تحت هٰذه الآية ج:۲۱ ص:۱

موت کی تمنا جائز ہے یا نہیں

یہ بحث مفصل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، حدیث میں موت کی تمنا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے،[1] اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی شخص کو دُنیا میں یہ یقین کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مرتے ہی جنت میں ضرور جائے گا، اور کسی قسم کے عذاب کا اس کو خطرہ نہیں تو ایسی حالت میں موت کی تمنا کرنا اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بہادری جتانے کا مرادف ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ، یعنی یہود جو اس دعوے کے باوجود موت کی تمنا سے گریز کرتے ہیں اس کا حاصل موت سے گریز کرنا اور بھاگنا ہے، ان کو آپ فرمادیں کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو آکر رہے گی، اس وقت نہیں تو پھر بعد چند روز کے، اس لئے موت سے فرار بالکلیہ کسی کے بس ہی میں نہیں۔

اسبابِ موت سے فرار کے اَحکام

جو چیزیں عادۃً موت کا سبب ہوتی ہیں، اُن سے فرار مقتضائے عقل بھی ہے، مقتضائے شرع بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جھکی ہوئی دیوار کے نیچے سے گزرے تو تیزی کے ساتھ نکل گئے، اسی طرح کہیں آگ لگ جائے وہاں سے نہ بھاگنا، عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے، مگر وہ فرار من الموت جس کی مذمت آیتِ مذکورہ میں وارِد ہوئی ہے اس میں داخل نہیں، جبکہ عقیدہ سالم ہو اور یہ جانتا ہو کہ جس وقت موت آجائے گی تو میرا بھاگنا مجھے بچا نہ سکے گا، مگر چونکہ اس کو معلوم نہیں کہ یہ آگ، یا زہر، یا کوئی دُوسری مہلک چیز متعین طور پر میری موت اس میں لکھ دی گئی ہے، اس لئے اس سے بھاگنا فرار من الموت جو مذموم ہے اس میں داخل نہیں۔

باقی رہا طاعون یا وَبا جس بستی میں آجائے اس سے بھاگنا، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، جس کی تفصیلات کتبِ فقہ وحدیث میں مذکور ہیں، وہاں دیکھی جاسکتی ہیں، اور تفسیر رُوح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں بھی اُس پر کافی بحث کر کے مسئلے کو واضح کردیا ہے، یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

اے ایمان والو جب اَذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب ما یکرہ من التمنی ج:۲ ص:۱۰۷۶

اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹

اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید وفروخت، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

پھر جب تمام ہوچکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَۨا

اور یاد کرو اللہ کو بہت سا تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ اور جب دیکھیں سودا بکتا یا کچھ تماشا

انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَاۗىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ

متفرق ہوجائیں اس کی طرف اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا، تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے تماشے

وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۱۱ ع

اور سوداگری سے، اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دِن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذِکر کی طرف لپکو، اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ ۝۹ پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں منتشر ہوجاؤ، اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ ۝۱۰ اور جب کچھ لوگوں نے کوئی تجارت یا کوئی کھیل دیکھا تو اُس کی طرف ٹوٹ پڑے، اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ کہہ دو کہ: ’’جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کھیل اور تجارت سے کہیں زیادہ بہتر ہے، اور اللہ سب سے بہتر رِزق دینے والا ہے۔ ۝۱۱

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اَذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز وخطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید وفروخت (اور اسی طرح دُوسرے مشاغل مانعہ عن السعی کما فی ردّ المحتار [۱]) چھوڑ دِیا کرو (اور تخصیص بیع کی بوجہ زیادہ اہتمام کے ہے کہ اس کے ترک کو فوتِ نفع سمجھا جاتا ہے) یہ (چل پڑنا مشاغلِ بیع وغیرہ کو چھوڑ کر) تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا نفع فانی) پھر جب نماز (جمعہ کی) پوری ہو چکے (اور اگر اِبتدا میں خطبہ مؤخر تھا تو نماز پورا ہونے سے مراد اس کا مع متعلقات کے پورا ہونا ہے، جس کا حاصل نماز اور خطبے کا پورا ہو چکنا ہے) تو (اس وقت تم کو اِجازت ہے کہ) تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو (یعنی اُس وقت دُنیا کے کاموں کے لئے چلنے پھرنے کی اجازت ہے) اور (اس میں بھی) اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو (یعنی اَشغالِ دُنیویہ میں ایسے منہمک مت ہو جاؤ کہ اَحکام وعباداتِ ضروریہ سے غافل ہو جاؤ) تا کہ تم کو فلاح ہو، اور (بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ) وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ: جو چیز (از قسم ثواب وقرب) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلے اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے اور (اگر اس سے افزونی رزق کی طمع ہو تو سمجھ لو کہ) اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے (اس کی طاعاتِ ضروریہ میں مشغول رہنے پر رِزقِ مقدّر دیتا ہے، پھر کیوں اس کے اَحکام کو ترک کیا جائے)۔

معارف ومسائل

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ　يَوْمِ الْجُمُعَةِ، اس دن کو یوم جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے اِجتماع کا دِن ہے، اور آسمان وزمین اور تمام کائنات کی تخلیق جو حق تعالیٰ نے چھ دن میں فرمائی ہے، ان چھ میں سے آخری دن جمعہ ہے، جس میں تخلیق کی تکمیل ہوئی، اسی دن میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی روز میں اُن کو جنت میں داخل کیا گیا، پھر اسی دن میں اُن کو زمین کی طرف اُتارا گیا، [۲] اسی دن میں قیامت قائم ہوگی، اور اسی دن میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ اس میں انسان جو بھی دُعا کرے قبول ہوتی ہے، [۳] یہ سب باتیں

---

[۱] ردّ المحتار ج:۲ ص:۱۶۵، باب العیدین۔

[۲] صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب فضیلۃ یوم الجمعۃ ...اِلخ، ج:۱ ص:۲۸۳

[۳] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ البروج، ج:۲ ص:۱۷۱

احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں۔ (ابن کثیر) [۱]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے اجتماع اور عید کا ہر ہفتے میں یہ دن جمعہ کا رکھا تھا، مگر پچھلی اُمتوں کو اس کی توفیق نہ ہوئی، یہود نے یوم السبت (سنیچر کے دن) کو اپنا یوم اجتماع بنالیا، نصاریٰ نے اتوار کو، اللہ تعالیٰ نے اِس اُمت کو اس کی توفیق بخشی کہ انہوں نے یومِ جمعہ کا انتخاب کیا، (کما رواہ البخاری ومسلم عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ، ابن کثیر) [۲]

زمانۂ جاہلیت میں اس دن کو ''یوم عروبہ'' کہا جاتا تھا، سب سے پہلے عرب میں کعب بن لوئی نے اس کا نام جمعہ رکھا، اور قریش اُس دن جمع ہوتے، اور کعب بن لوئی خطبہ دیتے تھے، یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سوساٹھ سال پہلے کا ہے۔

کعب بن لوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اَجداد میں سے ہیں، اُن کو حق تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی بت پرستی سے بچایا، اور توحید کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خوش خبری بھی لوگوں کو سنائی تھی، قریش میں ان کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ ان کی وفات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سوساٹھ سال پہلے ہوئی، اسی سے اپنی تاریخ شمار کرنے لگے، عرب کی تاریخ اِبتدا میں بناءِ کعبہ سے لی جاتی تھی، کعب بن لوئی کی وفات کے بعد اس سے تاریخ جاری ہوگئی، پھر جب واقعۂ فیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال میں پیش آیا تو اس واقعے سے عرب کی تاریخ کا سلسلہ جاری ہوگیا، خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ کا اہتمام عرب میں قبل اَز اِسلام بھی کعب بن لوئی کے زمانے میں ہو چکا تھا، اور اس دن کا نام جمعہ رکھنا بھی انہی کی طرف منسوب ہے۔ (مظہری) [۳]

بعض روایات میں ہے کہ انصارِ مدینہ نے قبل اَز ہجرت فرضیتِ جمعہ نازل ہونے سے پہلے اپنے اِجتہاد سے جمعہ کے روز جمع ہونے اور عبادت کرنے کا اِہتمام کر رکھا تھا۔ (کما رواہ عبد الرزّاق باسناد صحیح عن محمد بن سیرین، اَز مظہری) [۴]

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ، ندائے صلوٰۃ سے مراد اَذان ہے، اور ''مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ'' بمعنی فی یوم الجمعہ ہے۔ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ سعی کے معنی دوڑنے کے بھی آتے ہیں، اور کسی کام کو اہتمام کے ساتھ کرنے کے بھی، اس جگہ یہی دُوسرے معنی مراد ہیں، کیونکہ نماز کے لئے دوڑتے ہوئے آنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، اور یہ

---

[۱] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية، ج:۸ ص:۱۱۹

[۲] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۱۱۹، وصحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب فرض الجمعة، ج:۱ ص:۱۲۰، وصحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب فضيلة يوم الجمعة على باقي الأيام وبيان أن خير الأُمم هديت إليه، ج:۱ ص:۲۸۲

[۳] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۷۸

[۴] تفسير المظهری ج:۹ ص:۲۷۸، ومصنف عبدالرّزّاق، رقم الحديث:۵۱۴۴، كتاب الجمعة، باب اوّل من جمع۔

ارشاد فرمایا ہے کہ جب نماز کے لئے آؤ تو سکینت اور وقار کے ساتھ آؤ۔ [۱] آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب جمعہ کے دن جمعہ کی اَذان دی جائے تو اللہ کے ذِکر کی طرف دوڑو، یعنی نماز و خطبے کے لئے مسجد کی طرف چلنے کا اِہتمام کرو، جیسا دوڑنے والا کسی دُوسرے کام کی طرف توجہ نہیں دیتا، اَذان کے بعد تم بھی کسی اور کام کی طرف بجز نماز و خطبے کے توجہ نہ دو۔ (ابنِ کثیر) [۲]

''ذِكْرِ اللهِ'' سے مراد نمازِ جمعہ بھی ہوسکتی ہے، اور خطبہ جمعہ جو نمازِ جمعہ کے شرائط و فرائض میں داخل ہے، وہ بھی، اس لئے مجموعہ دونوں کا مراد لیا جائے یہ بہتر ہے۔ (مظہری وغیرہ) [۳]

وَذَرُوا الْبَيْعَ یعنی چھوڑ دو بیع (فروخت کرنے کو) صرف بیع کہنے پر اِکتفا کیا گیا اور مراد بیع و شراء (یعنی خرید وفروخت) دونوں ہیں، وجہ اکتفا کی یہ ہے کہ ایک کے چھوٹنے سے دُوسرا خود بخود چھوٹ جائے گا، جب کوئی فروخت کرنے والا فروخت نہ کرے گا تو خریدوالے کے لئے خریدنے کا راستہ ہی نہ رہے گا۔

اس میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ اَذانِ جمعہ کے بعد جو خرید و فروخت کو اس آیت نے حرام کردیا ہے، اس پر عمل کرنا تو بیچنے والوں اور خریداروں سب پر فرض ہے، مگر اس کا عملی اِنتظام اس طرح کیا جائے کہ دُکانیں بند کردی جائیں تو خریداری خود بخود بند ہوجائے گی، اس میں حکمت یہ ہے کہ گاہکوں اور خریداروں کی تو کوئی حد و شمار نہیں ہوتی، اُن سب کے روکنے کا انتظام آسان نہیں، فروخت کرنے والے دُکان دار متعین اور معدود ہوتے ہیں، ان کو فروخت سے روک دیا جائے تو باقی سب خرید سے خود رُک جائیں گے، اس لئے وَذَرُوا الْبَيْعَ میں صرف بیع چھوڑ دینے کے حکم پر اِکتفا کیا گیا۔

فائدہ:- اَذانِ جمعہ کے بعد سارے ہی مشاغل کا ممنوع کرنا مقصود تھا، جن میں زراعت، تجارت، مزدوری سبھی داخل ہیں، مگر قرآنِ کریم نے صرف بیع کا ذِکر فرمایا، اس سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے مخاطب شہروں اور قصبوں والے ہیں، چھوٹے دیہات اور جنگلوں میں جمعہ نہیں ہوگا، اس لئے شہروں اور قصبوں میں جو مشاغل عام لوگوں کو پیش آتے ہیں ان کی ممانعت فرمائی گئی، وہ بیع و شراء کے ہوتے ہیں، بخلاف گاؤں والوں کے کہ ان کے مشاغل کاشت اور زمین سے متعلق ہوتے ہیں، اور باتفاقِ فقہائے اُمت یہاں بیع سے مراد فقط فروخت کرنا نہیں بلکہ ہر وہ کام جو جمعہ کی طرف جانے کے اِہتمام میں مخل ہو، وہ سب بیع کے مفہوم میں داخل ہے، اس لئے اَذانِ جمعہ کے بعد کھانا پینا، سونا، کسی سے بات کرنا، یہاں تک کہ کتاب کا مطالعہ کرنا وغیرہ سب ممنوع ہیں، صرف جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہوں وہ کئے جاسکتے ہیں۔

[۱] صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب المشي إلى الجمعة، ج:۱ ص:۱۲۴

[۲] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۱۲۰

[۳] تفسير المظهري ج:۹ ص:۲۸۲

اَذانِ جمعہ شروع میں صرف ایک ہی تھی، جو خطبے کے وقت اِمام کے سامنے کہی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پھر صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اسی طرح رہا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور اَطرافِ مدینہ میں پھیل گئی، اِمام کے سامنے والی خطبے کی اَذان دُور تک سنائی نہ دیتی تھی، تو عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک اور اَذان مسجد سے باہر اپنے مکان زوراء پر شروع کرادی، جس کی آواز پورے مدینہ میں پہنچنے لگی، صحابۂ کرام میں سے کسی نے اس پر اِعتراض نہیں کیا، اس لئے یہ اَذانِ اوّل باجماعِ صحابہ مشروع ہوگئی، اور اَذانِ جمعہ کے وقت بیع وشراء وغیرہ تمام مشاغل حرام ہوجانے کا حکم جو پہلے اَذانِ خطبہ کے بعد ہوتا تھا، اب پہلی اَذان کے بعد سے شروع ہوگیا، کیونکہ الفاظِ قرآن نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ اس پر بھی صادق ہیں، یہ تمام باتیں حدیث وتفسیر اور فقہ کی عام کتابوں میں بلااِختلاف مذکور ہیں۔

اس پر پوری اُمت کا اِجماع واتفاق ہے کہ جمعہ کے روز ظہر کے بجائے نمازِ جمعہ فرض ہے، اور اس پر بھی اِجماع واِتفاق ہے کہ نمازِ جمعہ عام پانچ نمازوں کی طرح نہیں، اس کے لئے کچھ مزید شرائط ہیں، پانچوں نمازیں تنہا بلاجماعت کے بھی پڑھی جاسکتی ہیں، دو آدمی کی بھی جماعت سے، اور جمعہ بغیر جماعت کے ادا نہیں ہوتا، اور جماعت کی تعداد میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ اسی طرح نماز پنج گانہ ہر جگہ دریا، پہاڑ، جنگل میں ادا ہوجاتی ہے، مگر جمعہ جنگل، صحراء میں کسی کے نزدیک ادا نہیں ہوتا۔ عورتوں، مریضوں، مسافروں پر جمعہ فرض نہیں، وہ جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز پڑھیں۔ جمعہ کس قسم کی بستی والوں پر فرض ہے اس میں اَئمۂ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، اِمام شافعیؒ کے نزدیک جس بستی میں چالیس مرد اَحرار، عاقل، بالغ بستے ہوں اس میں جمعہ ہوسکتا ہے، اس سے کم میں نہیں۔ اِمام مالکؒ کے نزدیک ایسی بستی کا ہونا ضروری ہے جس کے مکانات متصل ہوں اور اس میں بازار بھی ہو۔ اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شہر، یا قصبہ، یا بڑا گاؤں ہو، جس میں گلی کوچے اور بازار ہوں، اور کوئی قاضی، حاکم فیصلۂ معاملات کے لئے ہو۔ مسئلہ اور اس کے دلائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرات علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھ کر سب کچھ واضح کردیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اور فَاسْعَوْا باتفاقِ جمہور اُمت عام مخصوص البعض ہے، علی الاطلاق ہر مسلمان پر جمعہ فرض نہیں، بلکہ کچھ قیود وشرائط سب کے نزدیک ہیں، اختلاف صرف شرائط کی تعیین میں ہے، البتہ جہاں فرض ہے اُن کے لئے اس فرض کی بڑی اہمیت وتاکید ہے، ان لوگوں میں بلاعذرِ شرعی کوئی جمعہ چھوڑ دے تو اَحادیثِ صحیحہ میں اُس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، اور نمازِ جمعہ اس کے شرائط وآداب کے ساتھ ادا کرنے والوں کے مخصوص فضائل وبرکات کا وعدہ ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ، سابقہ آیات میں اذانِ جمعہ کے بعد بیع وشراء وغیرہ کے تمام دُنیوی اُمور کو ممنوع کر دیا گیا تھا، اس آیت میں اس کی اجازت دے دی گئی کہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد تجارتی کاروبار اور اپنا اپنا رِزق حاصل کرنے کا اِہتمام سب کر سکتے ہیں۔

جمعہ کے بعد تجارت وکسب میں برکت

حضرت عراک بن مالک رضی اللہ عنہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر باہر آتے تو دروازۂ مسجد پر کھڑے ہو کر یہ دُعا کرتے تھے:-

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَجَبْتُ دَعْوَتَكَ وَصَلَّيْتُ فَرِيضَتَكَ وَانْتَشَرْتُ كَمَا أَمَرْتَنِي فَارْزُقْنِي مِنْ فَضْلِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ۔ (رواہ ابن ابی حاتم، از ابن کثیر) [1]

''یعنی یا اللہ! میں نے تیرے حکم کی اطاعت کی اور تیرا فرض ادا کیا، اور جیسا کہ تو نے حکم دیا ہے نماز پڑھ کر میں باہر جاتا ہوں، تو اپنے فضل سے مجھے رِزق عطا فرما، اور تو تو سب سے بہتر رِزق دینے والا ہے۔''

اور بعض سلفِ صالحین سے منقول ہے کہ جو شخص نمازِ جمعہ کے بعد تجارتی کاروبار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر مرتبہ برکات نازل فرماتے ہیں۔ (ابن کثیر) [2]

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾ یعنی نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر کسبِ معاش تجارت وغیرہ میں لگو، مگر کفار کی طرح خدا سے غافل ہو کر نہ لگو، عین خرید وفروخت اور مزدوری کے وقت بھی اللہ کی یاد جاری رکھو۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ﴿١١﴾ اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے، جو جمعہ کا خطبہ چھوڑ کر تجارتی کام کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اِمام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ جمعہ نمازِ جمعہ کے بعد دِیا کرتے تھے، جیسا کہ عیدین میں اب بھی یہی معمول ہے، ایک جمعہ کے روز یہ واقعہ پیش آیا کہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک ایک تجارتی قافلہ مدینہ طیبہ کے بازار میں پہنچا، اور ڈھول باجے وغیرہ سے اس کا اعلان ہونے لگا، اس وقت نمازِ جمعہ سے فراغت ہو چکی تھی، خطبہ ہو رہا تھا، بہت سے حضراتِ صحابہ بازار چلے گئے اور آپ کے ساتھ تھوڑے سے حضرات رہ گئے، جن کی تعداد بارہ بتلائی گئی ہے۔ (یہ روایت ابوداؤد

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:١٢٢، ١٢٣، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:١٨٨٩٧

[2] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:١٢٣

نے مراسیل میں بیان فرمائی ہے) [1] بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ پر فرمایا کہ اگر تم سب کے سب چلے جاتے تو مدینہ کی ساری وادی عذاب کی آگ سے بھر جاتی۔ (رواہ ابویعلی، ابن کثیر) [2]

امام تفسیر مقاتل کا بیان ہے کہ یہ تجارتی قافلہ دِحیہ بن خلف کلبی کا تھا، جو ملکِ شام سے آیا تھا، اور تجارِ مدینہ میں اس کا قافلہ عموماً تمام ضروریات لے کر آیا کرتا تھا، اور جب مدینہ کے لوگوں کو اس کی آمد کی خبر ملتی تھی تو سب مرد و عورت اس کی طرف دوڑتے تھے، یہ دِحیہ بن خلاف اس وقت تک مسلمان نہ تھے، بعد میں داخلِ اسلام ہوئے۔

اور حسن بصریؒ اور ابو مالکؒ نے فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ میں اشیائے ضرورت کی کمی اور سخت گرانی تھی۔ (تفسیر مظہری) [3] یہ اسباب تھے کہ حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بڑی جماعت تجارتی قافلے کی آواز پر مسجد سے نکل گئی، اوّل تو نماز فرض ادا ہو چکی تھی، خطبے کے متعلق یہ معلوم نہ تھا کہ جمعہ میں وہ بھی فرض کا جزء ہے، دُوسرے اشیاء کی گرانی، تیسرے تجارتی قافلے پر لوگوں کا ٹوٹ پڑنا، جس سے ہر ایک کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ دیر کروں گا تو اپنی ضروریات نہ پاسکوں گا۔

بہرحال ان اسباب کے تحت صحابہ کرام سے یہ لغزش ہوئی جس پر حدیثِ مذکور میں وعید کے الفاظ آئے کہ سب کے سب چلے جاتے تو اللہ کا عذاب آجاتا، اسی پر عار دِلانے اور تنبیہ کرنے کے لئے آیتِ مذکورہ نازل ہوئی: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اور اسی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے معاملے میں اپنا طرز بدل دیا کہ نمازِ جمعہ سے پہلے خطبہ دینے کا معمول بنالیا، اور یہی اب سنت ہے۔ (ابن کثیر) [4]

آیتِ مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اُن لوگوں کو بتلا دیں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس تجارت اور ڈھول ڈھماکے سے بہتر ہے، جس میں آخرت کا ثواب تو مراد ہے ہی، یہ بھی بعید نہیں کہ نماز و خطبے کی خاطر تجارت و کسبِ معاش کو چھوڑنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دُنیا میں بھی خاص برکات نازل ہوں، جیسا کہ اُوپر سلف صالحین سے بروایت ابنِ کثیر نقل کیا گیا ہے۔

تَمَّتْ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ یَوْمَ الْخَمِیْسِ ٢٨ جُمَادَی الْاُوْلٰی ١٣٩١ھ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:١٢٣، ومراسیل ابی داود، باب ما جاء فی الخطبة یوم الجمعة، رقم الحدیث:٦٠

[2] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:١٢٣ و١٢٤، ومسند ابی یعلی الموصلی، رقم الحدیث:١٩٣٥ مسند جابر، وصحیح ابن حبان، رقم الحدیث:٦٨٧٧

[3] تفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:٩ ص:٢٩٩

[4] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:١٢٤

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

آیاتها ۱۱ | ۶۳ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۴ | رکوعاتها ۲

سورۂ منافقون مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

جب آئیں تیرے پاس منافق کہیں ہم قائل ہیں تو رسول ہے اللہ کا، اور اللہ جانتا ہے

اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ۱

کہ تو اس کا رسول ہے، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ

انہوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر، پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، یہ لوگ برے کام ہیں

وقف لازم

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

جو کر رہے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہوگئے، پھر مہر لگ گئی ان کے دل پر

فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا

سو وہ اب کچھ نہیں سمجھتے، اور جب تو دیکھے اُن کو تو اچھے لگیں تجھ کو اُن کے ڈیل، اور اگر بات کہیں

تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ

سنے تو اُن کی بات، کیسے ہیں جیسے کہ لکڑی لگادی دِیوار سے، جو کوئی چیخیں جانیں ہم ہی پر بلا آئی،

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ز اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

وہی ہیں دُشمن ان سے بچتا رہ، گردن مارے اُن کی اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں، اور جب کہئے اُن کو

تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ

آؤ معاف کرادے تم کو رسول اللہ کا مٹکاتے ہیں اپنے سر، اور تو دیکھے کہ وہ روکتے ہیں اور وہ

مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۵ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ

غرور کرتے ہیں، برابر ہے اُن پر تو معافی چاہے اُن کی یا نہ معافی چاہے،

لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۶

ہرگز نہ معاف کرے گا اُن کو اللہ، بے شک اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو،

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ

وہی ہیں جو کہتے ہیں خرچ مت کرو ان پر جو پاس رہتے ہیں رسول اللہ کے یہاں تک کہ متفرق ہوجائیں،

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۷

اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے، ولیکن منافق نہیں سمجھتے،

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ

کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو نکال دے گا جس کا زور ہے وہاں سے کمزور لوگوں کو

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۸ ع

اور زور تو اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا، لیکن منافق نہیں جانتے،

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں“ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ واقعی اُس کے رسول ہیں، اور اللہ (یہ بھی) گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱ انہوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنا رکھا ہے، پھر یہ لوگ دُوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی بُرے ہیں وہ کام جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ ۲ یہ ساری باتیں اس وجہ سے ہیں کہ یہ (شروع میں بظاہر) اِیمان لے آئے، پھر انہوں نے کفر اَپنا لیا، اس لئے ان کے دِلوں پر مہر لگا دی گئی، نتیجہ یہ کہ یہ لوگ (حق بات) سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ۳ جب تم ان کو دیکھو تو ان کے ڈیل ڈول تمہیں بہت اچھے لگیں، اور اگر وہ بات کریں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ، ان کی مثال ایسی ہے جیسے یہ لکڑیاں ہیں جو کسی سہارے سے لگی رکھی ہیں۔ یہ ہر چیخ پکار کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہی ہیں جو (تمہارے) دُشمن ہیں، اس لئے ان سے ہوشیار رہو۔ اللہ کی مار ہو ان پر! یہ کہاں اوندھے چلے جا رہے ہیں؟ ۴ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کے رسول تمہارے حق میں مغفرت کی دُعا کریں، تو یہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں، اور تم انہیں دیکھو گے کہ وہ بڑے گھمنڈ کے عالم میں بے رُخی سے کام لیتے ہیں۔ ۵ (اے پیغمبر!) ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں، چاہے تم ان کے لئے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ یقین جانو اللہ ایسے نافرمان لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ۶ یہی تو ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں اُن پر کچھ خرچ نہ کرو، یہاں تک کہ یہ خود ہی منتشر

ہو جائیں گے، حالانکہ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے اللہ ہی کے ہیں، لیکن منافق لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ ⑦ کہتے ہیں کہ: ''اگر ہم مدینہ کو لوٹ کر جائیں گے تو جو عزّت والا ہے، وہ وہاں سے ذِلت والے کو نکال باہر کرے گا'' حالانکہ عزّت تو اللہ ہی کو حاصل ہے، اور اُس کے رسول کو، اور اِیمان والوں کو، لیکن منافق لوگ نہیں جانتے۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں، اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو اُن کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں (کہ ہم دل سے گواہی دیتے ہیں، کیونکہ وہ گواہی محض زبانی ہے، اعتقادِ قلب سے نہیں) ان لوگوں نے اپنی قسموں کو (اپنی جان و مال کو بچانے کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (کیونکہ اظہارِ کفر کرتے تو ان کی حالت بھی مثل دُوسرے کفار کے ہوجاتی کہ جہاد کیا جاتا اور قتل و غارت ہوتا) پھر (اس لازمی خرابی کے ساتھ متعدی خرابی بھی ہے کہ) یہ لوگ (دُوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں بے شک ان کے یہ اعمال بہت ہی بُرے ہیں (اور ہمارا) یہ (کہنا کہ ان کے اعمال بہت بُرے ہیں) اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (اوّل ظاہر میں) ایمان لے آئے پھر (اپنے شیاطین کے پاس جا کر کلماتِ کفریہ اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ [1] (البقرۃ) کہہ کر) کافر ہوگئے، (مطلب یہ کہ اُن پر بُرے اعمال کا حکم کرنا اُن کے نفاق کے سبب سے ہے کہ وہ بدترین عمل کفر ہے) سو (اس نفاق کی وجہ سے) اُن کے دِلوں پر مہر کردی گئی تو یہ (حق بات کو) نہیں سمجھتے اور (ظاہر میں یہ ایسے چکنے چپڑے ہیں کہ) جب آپ اُن کو دیکھیں (تو شان و شوکت ظاہری کی وجہ سے) اُن کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور (باتوں میں ایسے ہیں کہ) اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی بات (غایت فصاحت و شیرینی کی وجہ سے) سن لیں (لیکن چونکہ اندر خاک بھی نہیں ہے اس لئے قد و قامت ظاہری کے ساتھ باطنی کمالات سے خالی ہونے کے سبب ان کی ایسی مثال ہے کہ) گویا یہ لکڑیاں ہیں جو (دیوار کے) سہارے سے لگائی ہوئی (کھڑی) ہیں (کہ جثّہ میں تو لمبی چوڑی موٹی موٹی، مگر بے جانِ محض، اور عام عادت یہ ہے کہ اکثر جو لکڑی فی الحال کام میں نہیں لگتی وہ اس طرح رکھ دی جاتی ہے، ایسی لکڑی بے نفع محض بھی ہے، اسی طرح یہ لوگ ظاہری دیکھنے میں تو شاندار ہیں لیکن اندر سے محض بیکار اور چونکہ بوجہ عدمِ اخلاص و عدمِ ایمان کے ہر وقت ان کو اندیشہ رہتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو ہمارے حال کی اطلاع کسی قرینے سے یا بذریعہ وحی کے نہ ہوجائے اور مثل دیگر کفار کے ہم پر بھی جہاد وغیرہ نہ ہونے لگے، اس خیال سے ایسے خائف رہتے ہیں کہ) ہر غل پکار

[1] ترجمہ: ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں۔

کو (گو کسی وجہ سے ہو) اپنے ہی اُوپر (پڑنے والی) خیال کرنے لگتے ہیں (یعنی جب کوئی شور وغل ہوتا ہے یہی سمجھتے ہیں کہ کہیں ہمارے اُوپر بھی اُفتاد پڑنے والی نہ ہو، حقیقت میں) یہی لوگ (تمہارے پورے) دُشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہئے (یعنی اُن کی کسی بات پر اِعتماد نہ کیجئے) خدا اُن کو غارت کریں کہاں (دینِ حق سے) پھرے چلے جاتے ہیں (یعنی روزانہ دُور ہی ہوتے جاتے ہیں) اور (ان کے تکبر اور شرارت کی یہ کیفیت ہے کہ) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) آؤ تمہارے لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِستغفار کردیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ اُن کو دیکھیں گے کہ وہ (اس خیر خواہی اور اِستغفارِ رسول سے) تکبر کرتے ہوئے بے رُخی کرتے ہیں (جب اُن کے کفر کی یہ حالت ہے تو) اُن کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں، خواہ آپ اُن کے لئے اِستغفار کریں یا اُن کے لئے اِستغفار نہ کریں، اللہ تعالیٰ اُن کو ہرگز نہ بخشے گا (مطلب یہ کہ اگر وہ آپ کے پاس آتے بھی اور آپ ان کی ظاہری حالت کے اِعتبار سے اِستغفار بھی فرماتے تب بھی اُن کو کچھ نفع نہ ہوتا، یہ تو ماضی کے اعتبار سے اُن کی حالت ہوئی، اور آئندہ کے لئے یہ ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ ایسے نافرمان لوگوں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیتا، یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس (جمع) ہیں اُن پر کچھ خرچ مت کرو، یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہوجائیں گے اور (ان کا یہ کہنا جہلِ محض ہے، کیونکہ) اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں اور زمین کے ولیکن منافق سمجھتے نہیں ہیں (کہ رزق کا مدار اہلِ شہر کے نفقات کو سمجھتے ہیں اور) یہ (لوگ) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ لوٹ کر جائیں گے تو عزّت والا وہاں سے ذِلت والے کو باہر نکال دے گا، (یعنی ہم اُن مسافر پردیسیوں کو نکال باہر کردیں گے) اور (اس قول میں جو اپنے کو عزّت والا اور مسلمانوں کو ذِلت والا کہتے ہیں، یہ جہلِ محض ہے، بلکہ) اللہ ہی کی ہے عزّت (بالذات) اور اس کے رسول کی (بواسطہ تعلق باللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ والرسول کے) ولیکن منافق جانتے نہیں (بلکہ مدار اُمورِ فانیہ کو سمجھتے ہیں)۔

معارف ومسائل

سورۂ منافقون کے نزول کا مفصل واقعہ

یہ واقعہ محمد بن اِسحاق کی روایت کے مطابق شعبان ۶ھ میں، اور قتادہ وعروہ کی روایت کے مطابق شعبان ۵ھ میں غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر پیش آیا ہے۔ (مظہری) [1] جو محمد بن اِسحاق اور اکثر علمائے مغازی وسِیَر کی روایت

[1] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۳۰۱، ودلائل النُّبوَّة للبيهقي، رقم الحديث: ۱۳۹۴

کے مطابق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ بنی المصطلق کے رئیس حارثہ بن ضرار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے ہیں، یہ حارث بن ضرار، جویریہؓ کے والد ہیں جو بعد میں مسلمان ہو کر اَزواجِ مطہرات میں داخل ہوئیں، اور خود حارث بن ضرار بھی بعد میں مسلمان ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کی جنگی تیاری کی خبر ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے مقابلے کے لئے نکلے، اس جہاد کے لئے نکلنے والے مسلمانوں کے ساتھ بہت سے منافق بھی اس طمع میں نکلے کہ ہمیں بھی مالِ غنیمت میں حصہ ملے گا، کیونکہ یہ لوگ باوجود دِل میں کافر و منکر ہونے کے یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے اور آپ ہی غالب اور فاتح ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بنی المصطلق کے مقام پر پہنچے تو حارث بن ضرار کے لشکر سے سامنا اس پانی کے چشمے یا کنویں پر ہوا جو ''مُرَیْسِیْع'' کے نام سے معروف تھا، اسی لئے اس غزوہ کو غزوۂ مُرَیْسِیْع بھی کہا جاتا ہے، جانبین سے جنگ کی صفیں مرتب ہو کر تیروں کے ساتھ مقابلہ ہوا، جس میں بنی المصطلق کے بہت سے آدمی مارے گئے، باقی بھاگنے لگے، حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح عطا فرمائی، ان کے کچھ اموالِ غنیمت اور کچھ مرد و عورت قید ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ [1] اس جہاد کا قضیہ تو ختم ہوا۔

وطنی یا نسبی قومیت کی بنیاد پر تعاون و تناصر کفر و جاہلیت کا نعرہ ہے

مگر اس کے بعد ابھی مسلمانوں کا لشکر اسی مُرَیْسِیْع کے پانی پر جمع تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آ گیا کہ ایک مہاجر اور ایک انصاری میں اسی پانی پر باہم جھگڑا ہو گیا اور نوبت باہم قتل و قتال کی آ گئی، مہاجر نے اپنی مدد کے لئے مہاجرین کو پکارا، اور انصاری نے انصار کو، دونوں کی مدد کے لئے کچھ افراد پہنچ گئے، اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے باہم ایک فتنہ کھڑا ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً موقع پر تشریف لے گئے، اور سخت ناراضی کے ساتھ فرمایا ''مَا بَالُ دَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ'' (یعنی یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے) کہ وطنی اور نسبی قومیت کو بنیاد بنا کر امداد و دِفاع کا معاملہ ہونے لگا، اور فرمایا ''دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ'' (اس نعرے کو چھوڑ دو! یہ بدبودار نعرہ ہے)۔ [2] اور فرمایا کہ ہر مسلمان کو اپنے ہر مسلمان بھائی کی مدد کرنا چاہئے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مظلوم کی مدد کرنا تو ظاہر ہے کہ اس کو ظلم سے بچائے اور ظالم کی مدد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکے، [3] کیونکہ اس کی حقیقی مدد یہی ہے، مراد یہ تھی کہ ہر معاملے میں یہ دیکھنا چاہئے

---

[1] المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحديث: ۱۹۶۵۲، ودلائل النُّبوّة للبيهقی، رقم الحديث: ۱۳۹۶ ،

[2] صحيح البخاری، كتاب التفسير، تفسير سورة المنافقون، قوله: يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ ...إلخ، ج:۲ ص:۷۲۹

[3] صحيح البخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب اعن اخاك ظالمًا او مظلومًا، ج:۱ ص:۳۳۰

کہ مظلوم کون ہے، ظالم کون پھر ہر مسلمان کا، خواہ وہ مہاجری ہو یا انصاری اور کسی قبیلے وخاندان کا ہو یہ فرض ہو جاتا ہے کہ مظلوم کو ظلم سے چھڑائے اور ظالم کا ہاتھ روکے، خواہ وہ اپنا حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو، یہ نسبی اور وطنی قومیت جاہلانہ اور بدبودار نعرہ ہے، جس سے گندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنتے ہی جھگڑا ختم ہو گیا، اس معاملے میں زیادتی جہجاہ مہاجری کی ثابت ہوئی، اس کے بالمقابل سنان بن وبرہ جہنی انصاری کو زخم آ گیا تھا، حضرت عبادہ بن صامت کے سمجھانے سے سنان بن وبرہ نے اپنا حق معاف کر دیا، اور جھگڑنے والے ظالم ومظلوم پھر بھائی بھائی بن گئے۔

منافقین کی ایک جماعت جو مالِ غنیمت کی طمع میں مسلمانوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی، ان کا سردار عبداللہ بن اُبیّ تھا، جو دِل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے دُشمنی رکھتا تھا، مگر دُنیوی فوائد کی خاطر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، اس کو جب مہاجرین وانصار کے باہم تصادم کی خبر ملی تو اس نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کا موقع غنیمت پایا اور اپنی مجلس میں جس میں منافقین جمع تھے اور مؤمنین میں سے صرف زید بن اَرقمؓ موجود تھے، اس نے انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکایا اور کہنے لگا کہ تم نے ان کو اپنے وطن میں بلا کر اپنے سروں پر مسلط کیا، اپنے اموال و جائیداد ان کو تقسیم کر کے دے دیئے، یہ تمہاری روٹیوں پر پلے ہوئے اب تمہارے ہی مقابلے پر آئے ہیں، اگر تم نے اب بھی اپنے انجام کو نہ سمجھا تو آگے یہ تمہارا جینا مشکل کر دیں گے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ آئندہ مال سے ان کی مدد نہ کرو تو خود ہی اِدھر اُدھر بھاگ جائیں گے، اور اب تمہیں چاہئے کہ جب مدینہ پہنچ جاؤ تو تم میں سے جو عزّت والا ہے، وہ ذلیل کو نکال باہر کرے۔

اس کی مراد عزّت والے سے خود اپنی جماعت اور انصار تھے، اور ذلیل سے مراد معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہ تھے، حضرت زید بن اَرقمؓ نے جب اس کا یہ کلام سنا تو فوراً بولے کہ واللہ! تو ہی ذلیل وخوار اور مبغوض ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے دی ہوئی عزّت اور مسلمانوں کی دلی محبت سے کامیاب ہیں۔

عبداللہ بن اُبیّ چونکہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا، اسی لئے الفاظ صاف نہ بولے تھے، اس وقت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے اظہارِ غضب سے اس کو ہوش آیا کہ میرا کفر ظاہر ہو جائے گا، تو حضرت زیدؓ سے عذر کیا کہ میں نے تو یہ بات ہنسی میں کہہ دی تھی، میرا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کچھ کرنا نہیں تھا۔

حضرت زید بن ارقم اس مجلس سے اُٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ابنِ اُبیّ کا یہ سارا واقعہ کہہ سنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خبر بہت شاق ہوئی، چہرۂ مبارک پر تغیر کے آثار نظر آنے لگے، (زید بن

ارقم کم عمر صحابی تھے) آپ نے اُن سے کہا کہ لڑکے تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ زید بن ارقم نے قسم کھا کر کہا کہ نہیں میں نے اپنے کانوں سے اس کے یہ کلمات سنے ہیں۔ آپ نے پھر فرمایا کہ تمہیں کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا، زید بن ارقم نے پھر وہی جواب دیا، اور پھر ابنِ اُبیّ کی یہ بات مسلمانوں کے پورے لشکر میں پھیل گئی، اور آپس میں اس بات کے سوا کوئی بات ہی نہ رہی۔ ادھر حضراتِ انصار سب زید بن ارقم کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے قوم کے سردار پر تہمت لگائی اور قطع رحمی کی، زید بن ارقم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی قسم پورے قبیلۂ خزرج میں مجھے ابنِ اُبیّ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، (مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ کلمات کہے تو میں اسے برداشت نہیں کر سکا) اور اگر میرا باپ بھی ایسی بات کہتا تو میں اس کو بھی ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتا۔

دُوسری طرف حضرت عمر بن خطابؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن ماردُوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ فاروقِ اعظمؓ نے یہ عرض کیا کہ آپ عباد بن بشر کو حکم دے دیجئے کہ اس کا سر قلم کر کے آپ کے سامنے پیش کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اس کا کیا ہوگا کہ لوگوں میں یہ شہرت دی جائے گی کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کر دیتا ہوں۔ اس لئے آپ نے ابنِ اُبیّ کے قتل سے روک دیا۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اس کلام کی خبر عبداللہ بن اُبیّ منافق کے بیٹے کو پہنچی، ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اور یہ پکے مسلمان تھے، یہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ کا ارادہ میرے باپ کو ان کی اس گفتگو کے نتیجے میں قتل کرنے کا ہے تو آپ مجھے حکم دیجئے، میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں اس سے پہلے کہ آپ اپنی مجلس سے اُٹھیں، پیش کردُوں گا، اور عرض کیا کہ پورا قبیلۂ خزرج اس کا گواہ ہے کہ اُن میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ اپنے والدین کی خدمت واطاعت کرنے والا نہیں ہے، مگر اللہ ورسول کے خلاف اُن کی بھی کوئی چیز برداشت نہیں ہو سکتی، اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے کسی اور کو میرے باپ کے قتل کا حکم دیا اور اس نے قتل کر دیا تو ایسا نہ ہو کہ جب میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں تو مجھ پر غیرتِ نسبی غالب آجائے اور میں اُسے قتل کر بیٹھوں، جو میرے لئے عذاب کا سبب بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ میرا ارادہ اس کے قتل کا ہے، نہ میں نے کسی کو اس کا حکم دیا ہے۔

اس واقعے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عادت کے خلاف بے وقت سفر کرنے کا اعلانِ عام فرمادیا اور خود ناقۂ قصویٰ پر سوار ہو گئے، جب عام حضراتِ صحابہ روانہ ہو گئے تو آپ نے عبداللہ بن اُبیّ کو بلایا اور دریافت کیا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے، یہ قسمیں کھا گیا کہ میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا، یہ لڑکا (زید بن ارقم) جھوٹا ہے۔ عبداللہ بن اُبیّ کی اپنی

قوم میں عزّت تھی، سب نے یہ قرار دیا کہ شاید زید بن ارقمؓ کو کچھ مغالطہ لگ گیا ہے، ابن اُبیّ نے ایسا نہیں کہا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ اُبیّ کی قسم اور عذر کو قبول کر لیا، اور لوگوں میں زید بن ارقمؓ پر غصہ اور اُن کی ملامت اور تیز ہوگئی، اور یہ اُس رُسوائی کے سبب لوگوں سے چھپے رہنے لگے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکرِ اسلام کے ساتھ پورے دن، پھر پوری رات سفر کیا، اور اگلے روز صبح کو بھی برابر سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ دُھوپ تیز ہونے لگی، اُس وقت آپ نے قافلے کو ایک جگہ ٹھہرایا، پورے ایک دن ایک رات کے مسلسل سفر سے تھکے ہوئے صحابۂ کرام جب اس منزل پر اُترے تو فوراً سب محوِ خواب ہوگئے۔

راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام سفر کرنے کی عادت کے خلاف فوری طور پر بے وقت سفر شروع کرنے اور پھر سفر کو اتنا طویل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ابنِ اُبیّ کے واقعے کا چرچا جو تمام مسلمانوں میں پھیل گیا تھا، مسلمانوں کو سفر کے ایسے شغل میں لگا دے کہ یہ چرچا ختم ہو جائے۔

اس کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شروع کیا، اسی دوران جب تک ابنِ اُبیّ کے بارے میں قرآن کی آیات نازل نہ ہوئی تھیں تو عبادہ بن صامتؓ نے اس کو نصیحت کی کہ تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرما دیں گے، تیری نجات ہو جائے گی۔ ابنِ اُبیّ نے اُن کی نصیحت سن کر اپنا سر اس طرف سے پھیر لیا، حضرت عبادہ نے اسی وقت فرمایا کہ ضرور تیرے اس اعراض کے بارے میں قرآن نازل ہوگا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور زید بن ارقم بار بار آپ کے قریب آتے تھے، کیونکہ ان کو اپنی جگہ یقین تھا کہ اس شخص منافق نے مجھے پوری قوم میں جھوٹا قرار دے کر رُسوا کیا ہے، ضرور میری تصدیق اور اس شخص کی نکیر میں قرآن نازل ہوگا، اچانک زید بن ارقم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو وحی کے وقت ہوتی تھی کہ سانس پھولنے لگا اور پیشانی مبارک پر پسینہ بہنے لگا اور آپ کی سواری ناقہ بوجھ سے دبنے لگی، تو ان کو اُمید ہوئی کہ اب کوئی وحی اس بارے میں نازل ہوگی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت رفع ہوئی، میری سواری چونکہ آپ کے قریب تھی، آپ نے اپنی سواری ہی پر سے میرا کان پکڑا اور فرمایا: ''يَا غُلَامُ! صَدَّقَ اللّٰهُ حَدِيْثَكَ وَنَزَلَتْ سُوْرَةُ الْمُنَافِقِيْنَ فِيْ اِبْنِ اُبَيٍّ مِنْ اَوَّلِهَا اِلٰى آخِرِهَا'' (یعنی اے لڑکے! اللہ نے تیری بات کی تصدیق کر دی اور پوری سورۂ منافقون اسی واقعۂ ابنِ اُبیّ کے متعلق نازل ہوئی ہے)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورۂ منافقون دورانِ سفر ہی میں نازل ہوگئی تھی، [1] مگر بغوی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور زید بن ارقمؓ رُسوائی کے خوف سے گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے، اُس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ [2] واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے قریب وادی عقیق میں پہنچے تو عبداللہ بن اُبیّ منافق کے مؤمن صاحبزادے عبداللہ آگے بڑھے اور تمام سواریوں میں تلاش کرتے ہوئے اپنے باپ ابنِ اُبیّ کی سواری کے قریب پہنچ کر باپ کی اُونٹنی کو بٹھادیا، اوراس کے گھٹنے پر پاؤں رکھ کر باپ سے خطاب کیا کہ خدا کی قسم! تم مدینہ میں داخل نہیں ہوسکو گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ اور جب تک تم یہ بات واضح نہ کرو کہ تم نے جو بات کہی ہے کہ عزّت والا ذِلت والے کو نکال دے گا، اس میں عزّت والا کون ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تم؟ عبداللہ بن عبداللہ بن اُبیّ اپنے باپ کا راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے، اور پاس سے گزرنے والے لوگ عبداللہ کو ملامت کررہے تھے کہ باپ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے، آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اُن کے قریب آئی تو معاملے کے متعلق دریافت کیا، لوگوں نے بتلایا کہ عبداللہ مؤمن نے اپنے باپ کا راستہ اس لئے روکا ہوا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے یہ مدینہ میں داخل نہ ہوسکے گا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابنِ اُبیّ منافق بیٹے سے مجبور ہوکر یہ کہہ رہا ہے کہ میں تو بچوں اور عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر صاحبزادے سے کہا کہ ان کا راستہ چھوڑ دو، مدینہ میں جانے دو، تب بیٹے نے راستہ چھوڑا۔

سورۂ منافقون کے نزول کا قصہ تو اتنا ہی تھا، جو اُوپر لکھا گیا۔ قصے کے شروع میں یہ بھی اِجمالاً ذِکر ہوا ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق کا اصل ذمہ دار اُمّ المؤمنین حضرت جویریہؓ کا والد حارث بن ضرار ہوا تھا، بعد میں حضرت جویریہؓ کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ اسلام کے ساتھ اُمہات المؤمنین میں داخل ہونے کا شرف عطا فرمایا اور باپ بھی مسلمان ہوگیا۔

اس کا واقعہ مسندِ احمد، ابوداؤد وغیرہ میں یہ منقول ہے کہ جب بنوالمصطلق کو شکست ہوئی تو مالِ غنیمت کے ساتھ اُن کے کچھ قیدی بھی ہاتھ آئے، اسلامی قانون کے مطابق سب قیدی اور مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کردیئے گئے، قیدیوں

---

[1] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:۹ ص:۳۰۵

[2] تفسير البغوی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۱۳۳

میں حارث بن ضرار کی بیٹی جُوَیۡرِیَہ بھی تھیں، یہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصے میں آ گئیں، انہوں نے جویریہ کو بصورت کتابت آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ غلام یا کنیز پر کچھ رقم مقرّر کر دی جائے اور اس کو محنت مزدوری یا تجارت کی اجازت دے دی جائے، وہ مقرّر رقم کما کر مالک کو ادا کر دے تو آزاد ہو جائے۔

جویریہؓ پر جو رقم مقرّر کی تھی وہ بڑی رقم تھی، جس کی ادائیگی ان کے لئے آسان نہ تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں، شہادت دیتی ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اپنا واقعہ سنایا کہ ثابت بن قیس جن کے حصے میں، میں آئی ہوں انہوں نے مجھے مکاتب بنا دیا ہے، مگر رقم کتابت کی ادائیگی میرے بس میں نہیں، آپ اس میں میری کچھ مدد فرما دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور ساتھ ہی اُن کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا، جویریہ کے لئے یہ بہت بڑی نعمت تھی، وہ کیسے قبول نہ کرتیں، بخوشیٔ خاطر قبول کیا، [1] اور یہ ازواجِ مطہرات میں داخل ہو گئیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت جویریہؓ کا بیان ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے تین دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یثرب کی طرف سے چاند چلا اور میری گود میں آ کر گر گیا، اس وقت تو میں نے یہ خواب کسی سے ذِکر نہ کیا تھا، اب اس کی تعبیر آنکھوں سے دیکھ لی۔

یہ سردارِ قوم کی بیٹی تھیں، ان کے ازواجِ مطہرات میں داخل ہونے سے پورے قبیلے پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے، اور ایک فائدہ اُن تمام عورتوں کو پہنچا جو اُن کے ساتھ گرفتار ہوئی تھیں، اور ان کی رشتہ دار تھیں، کیونکہ ان کا اُمّ المؤمنین ہو جانا معلوم کرنے کے بعد جس جس مسلمان کے پاس اُن کی رشتہ دار کوئی کنیز تھی سب نے اُن کو آزاد کر دیا کہ اُن کی عزیز کسی عورت کو کنیز بنا کر اپنے پاس رکھنا ادب کے خلاف سمجھا، اس طرح سو کنیزیں اُن کے ساتھ آزاد ہو گئیں، اور پھر اُن کے والد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

واقعۂ مذکورہ میں اہم ہدایات وفوائد

سورۂ منافقون کے نزول کا واقعہ اس کی تفسیر کے سمجھنے میں تو معین ہے ہی، اس کے ضمن میں بہت اہم ہدایات ومسائل، اخلاق، سیاست اور معاشرت کے متعلق آ گئے ہیں، اس لئے احقر نے اس واقعے کی پوری تفصیل یہاں نقل کی ہے، وہ ہدایات یہ ہیں:-

[1] مسند احمد، حديث السّيّدة عائشة رضى الله عنها، رقم الحديث: ٢٦٤٠٨، وسنن ابى داود، كتاب العتق، باب في بيع المكاتب إذا فسخت الكتابة، رقم الحديث: ٣٤٢٩

اسلامی سیاست کا سنگِ بنیاد خالص اسلامی برادری قائم کرنا ہے، جس میں رنگ ونسل اور زبان، اور ملکی وغیر ملکی کے سب اِمتیازات بالکل ختم کردیئے جائیں

غزوۂ بنی المصطلق میں پیش آنے والا ایک انصاری اور ایک مہاجر کا جھگڑا اور دونوں طرف سے انصار ومہاجرین کو اپنی اپنی مدد کے لئے پکارنا، یہ وہ جاہلیت کا بت تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑ دیا تھا، اور مسلمان کہیں کا رہنے والا ہو، کسی رنگ وزبان اور کسی نسل وقوم کا ہو، سب کو آپس میں بھائی بھائی بنادیا، انصار ومہاجرین میں باقاعدہ پھر مواخات کرا کر ان کی مشترک اسلامی برادری بنادی تھی، مگر شیطان کا یہ پُرانا جال ہے جس میں لوگوں کو پھنسا کر باہمی جھگڑوں کے وقت قوم ووطن اور زبان ورنگ وغیرہ کو تعاون وتناصر کی بنیاد بنادیتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعاون وتناصر کا اسلامی معیارِ حق وانصاف سب کے ذہنوں سے اوجھل ہوجاتا ہے، صرف برادری اور قومیت کی بنیاد پر ایک دُوسرے کی مدد کرنے کا اُصول بن جاتا ہے، اس طرح وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھڑادیتا ہے۔ اس واقعے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت بن رہی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً موقع پر پہنچ کر اس فتنے کو ختم کردیا، اور بتلایا کہ یہ جاہلیت وکفر کا بدبودار نعرہ ہے، اس سے بچو، اور پھر سب کو قرآنی اُصولِ تعاون پر قائم کردیا جس میں ارشاد ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ (المائدۃ:۲)، یعنی مسلمانوں کے لئے کسی کی مدد کرنے یا مدد حاصل کرنے کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ جو شخص عدل وانصاف اور نیکی پر ہے اس کی مدد کرو، اگرچہ وہ نسب وخاندان اور زبان ووطن میں تم سے الگ ہو، اور جو شخص کسی گناہ اور ظلم پر ہو، اس کی ہرگز مدد نہ کرو، اگرچہ وہ تمہارا باپ اور بھائی ہی ہو، یہی وہ معقول اور منصفانہ بنیاد ہے جس کو اِسلام نے قائم فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قدم پر اس کی خود رعایت فرمائی، اور سب کو اس کے تابع رہنے کی تلقین فرمائی، اور اپنے آخری خطبۂ حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا کہ جاہلیت کی سب رسمیں میرے قدموں کے نیچے مسل دی گئی ہیں، اب عربی، عجمی، کالے گورے، ملکی غیر ملکی کے امتیازات کے بت ٹوٹ چکے ہیں، باہمی تعاون وتناصر کی اسلامی بنیاد صرف حق وانصاف ہے، سب کو اس کے تابع چلنا ہے۔

اس واقعے نے ہمیں یہ بھی سبق دیا ہے کہ دُشمنانِ اسلام آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کے لئے یہی برادری اور وطنی قومیت کا حربہ استعمال کرتے ہیں، جب اور جس وقت موقع مل جاتا ہے اس سے کام لے کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔

افسوس ہے کہ زمانۂ دراز سے پھر مسلمان اپنے اس سبق کو بھول گئے، اور اَغیار نے مسلمانوں کی اسلامی وحدت کے ٹکڑے کرنے میں پھر وہی شیطانی جال پھیلادیا، اور دِین واُصولِ دِین سے غفلت کی بنا پر عام دُنیا کے مسلمان اس جال

میں پھنس کر باہمی خانہ جنگیوں کے شکار ہو گئے، اور کفر و الحاد کے مقابلے کے لئے اُن کی متحدہ قوت پاش پاش ہو گئی، صرف عربی و عجمی ہی نہیں، عربوں میں مصری، شامی، حجازی، یمنی ایک دُوسرے سے متحد نہ رہے، ہندوستان اور پاکستان میں پنجابی، بنگالی، سندھی، ہندی، پٹھان اور بلوچی باہم آویزش کا شکار ہو گئے، فالی اللہ المشتکٰی، دُشمنانِ اسلام ہماری آویزش سے کھیل رہے ہیں، اس کے نتیجے میں وہ ہر میدان میں ہم پر غالب آتے جاتے ہیں، اور ہم ہر جگہ شکست خوردہ، غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ان ہی کی پناہ لینے پر مجبور نظر آتے ہیں، کاش! آج بھی مسلمان اپنے قرآنی اُصول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر غور کریں، غیروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اِسلامی برادری کو مضبوط بنالیں، رنگ و نسل اور زبان و وطن کے بتوں کو پھر ایک دفعہ توڑ ڈالیں تو آج بھی خدا تعالیٰ کی نصرت و اِمداد کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہونے لگے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اسلامی اُصول پر بے نظیر ثابت قدمی اور مقامِ بلند

اس واقعے نے یہ بھی بتلایا کہ اگرچہ وقتی طور پر شیطان نے کچھ لوگوں کو نعرۂ جاہلیت میں مبتلا کر دیا تھا، مگر درحقیقت سب کے دِلوں میں ایمان رچا بسا ہوا تھا، ذرا سی تنبیہ پر سب ان خیالات سے تائب ہو گئے، اور اُن کے دِلوں پر اللہ اور رسول کی محبت و عظمت کا ایسا غلبہ تھا جس میں کوئی رشتہ ناطہ، برادری اور قومیت حائل نہ ہوئی، اس کی شہادت خود اسی واقعے میں اوّل زید بن ارقمؓ کے بیان سے واضح ہوئی کہ وہ خود بھی قبیلۂ خزرج کے آدمی ہیں، اور اِبنِ اُبَیّ اس قبیلے کا سردار تھا، اور زید بن ارقمؓ بھی اس کی عزّت و عظمت کے قائل تھے، لیکن جس وقت اس کی زبان سے مؤمنینِ مہاجرین اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الفاظ سنے تو برداشت نہ کر سکے، اُسی مجلس میں اِبنِ اُبَیّ کو منہ توڑ جواب دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت پیش کر دی۔ اگر آج کل کی برادری پرستی ہوتی تو اپنی برادری کے سردار کی یہ بات وہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچاتے۔

اس واقعے میں خود اِبنِ اُبَیّ کے صاحبزادے عبداللہ کے واقعے نے اس کو کس قدر روشن کر دیا کہ ان کی محبت و عظمت کا اصل تعلق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے تھا، جب اپنے باپ سے اُن کے خلاف بات سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خود اپنے باپ کا سر قلم کرنے کی پیشکش کر دی اور اِجازت طلب کی، آپ نے اس سے روک دیا، تو مدینہ کے قریب پہنچ کر باپ کی سواری کو بٹھا دیا، اور مدینہ جانے کا راستہ روک کر باپ کو مجبور کیا کہ وہ یہ اقرار کرے کہ عزّت دار صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، وہ خود ذلیل و خوار ہے، پھر آپ کی اجازت ملنے سے پہلے باپ کا راستہ نہیں کھولا، جس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو سمن   ہمہ زخویش برید ند و با تو پیوستند [۱]

اس کے علاوہ بدر و اُحد اور اَحزاب کی جنگوں نے تو بذریعہ تلوار اس قوم پرستی اور وطن پرستی کے بت کے ٹکڑے اُڑائے ہیں، جس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی قوم و وطن اور کسی رنگ و زبان کا ہو وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور جو اللہ و رسول کو نہ مانے وہ اگرچہ حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو، وہ دُشمن ہے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد   فدائے یک تنِ بیگانہ کاشنا باشد [۲]

مسلمانوں کے مصالحِ عامہ کی رعایت اور اُن کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام

اس واقعے نے ہمیں ایک سبق یہ بھی دیا کہ جو کام فی نفسہٖ جائز و دُرست ہو، مگر اس کے کرنے سے کوئی یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہوگی، یا دُشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا تو یہ کام نہ کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن اُبیّ کا نفاق کھل جانے کے بعد بھی فاروقِ اعظمؓ کے اس مشورے کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دُشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

مگر دُوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرے سے ایسے کاموں کو چھوڑا جا سکتا ہے جو مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہوں، گو مستحب اور کارِ ثواب ہوں، کسی مقصدِ شرعی کو ایسے خطرے سے ترک نہیں کیا جا سکتا بلکہ خطرے کے اِزالے کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔

آیات کا ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر اُوپر لکھا جا چکا ہے، اب اس کے خاص خاص جملوں کی مزید توضیح دیکھئے:-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ الآیۃ۔ عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین جس کے معاملے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے، جس میں اس کی قسموں کا جھوٹا ہونا واضح کر دیا گیا تو لوگوں نے اس کو اَز راہِ خیر خواہی یہ کہا کہ تجھے معلوم ہے کہ تیرے بارے میں قرآن میں کیا نازل ہوا ہے، اب بھی وقت نہیں گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جا، (اور اعترافِ جرم کر لے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے اِستغفار فرما دیں گے۔ اس نے جواب میں کہا کہ تم لوگوں نے مجھے کہا کہ ایمان لے آ، میں نے ایمان اِختیار کر لیا، پھر تم نے مجھے اپنے مال سے زکوٰۃ دینے کو کہا، وہ دینے لگا، اب اس کے سوا کیا رہ گیا ہے کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سجدہ کیا کروں۔ اس پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں، جن میں واضح کر دیا گیا کہ جب اُس کے دِل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے لئے کسی کا اِستغفار نافع نہیں ہو سکتا۔

---

[۱] ترجمہ: تم کیسے اچھے پھل دار درخت ہو کہ سرو اور چنبیلی جیسے درخت بھی اپنوں سے ہٹ کٹ کر تجھ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

[۲] ترجمہ: ہزار قریب رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بے گانہ ہوں، اس ایک شخص پر فدا ہیں جو آشنائے حق ہو۔

ابن اُبیّ اس واقعے کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر چند روز ہی زندہ رہا، پھر جلد ہی مر گیا۔ (مظہری) [1]

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا یہ وہی قول ہے جو جہجاہ مہاجر اور سنان انصاری کے جھگڑے کے وقت ابن اُبیّ نے کہا تھا، جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دے دیا کہ یہ بے وقوف یوں سمجھ رہے ہیں کہ مہاجرین ہماری داد و دہش کے محتاج ہیں، ہم ہی اُن کو دیتے ہیں، حالانکہ تمام آسمان و زمین کے خزانے تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ چاہیں تو مہاجرین کو تمہاری کسی امداد کے بغیر سب کچھ دے سکتے ہیں، اس کا ایسا سمجھنا چونکہ بے عقلی اور بے وقوفی کی دلیل ہے، اس لئے قرآنِ حکیم نے اس جگہ ''لَا يَفْقَهُوْنَ'' کا لفظ اختیار فرما کر بتلا دیا کہ ایسا خیال کرنے والا بے عقل و بے سمجھ ہے۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ یہ بھی اسی منافق عبداللہ بن اُبیّ کا قول ہے، جس میں اگرچہ الفاظ صاف نہیں بولے، مگر مطلب ظاہر تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اور اَنصارِ مدینہ کو عزّت والا اور اُن کے مقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہ کو معاذ اللہ ذلیل قرار دیا اور اَنصارِ مدینہ کو اس پر بھڑکانا چاہا کہ ان کمزور اور ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں۔ حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں اس کی بات کو اسی پر اُلٹ دیا کہ اگر عزّت والوں نے ذِلت والوں کو نکالا تو اس کا خمیازہ تم ہی کو بھگتنا پڑے گا، کیونکہ عزّت تو اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کا حق ہے، مگر تم اپنی جہالت کی بنا پر اس سے بے خبر ہو۔ یہاں قرآنِ کریم نے ''لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾'' کا لفظ استعمال فرمایا، اور اس سے پہلے ''لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۷﴾'' فرمایا تھا۔ وجہ فرق کی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو دُوسرے انسان کا رازِق سمجھ بیٹھے تو یہ سراسر عقل کے خلاف ہے، اس کا یہ سمجھنا بے وقوفی اور بے عقلی کی علامت ہے، اور عزّت و ذِلت دُنیا میں کبھی کسی کو، کبھی کسی کو ملتی رہتی ہے، اس لئے اس میں مغالطہ ہو تو یہ واقعات سے بے خبری اور ناواقفی کی دلیل ہے، اس لئے یہاں ''لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾'' فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

اے ایمان والو غافل نہ کردیں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے،

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۰۶

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ

اور جو کوئی یہ کام کرلے تو وہی لوگ ہیں ٹوٹے میں، اور خرچ کرو کچھ ہمارا دیا ہوا

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ

اس سے پہلے کہ آپہنچے تم میں کسی کو موت تب کہے اے ربّ کیوں نہ ڈھیل دی تو نے مجھ کو

اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ

ایک تھوڑی سی مدّت کہ میں خیرات کرتا اور ہوجاتا نیک لوگوں میں، اور ہرگز نہ ڈھیل دے گا اللہ

ع ۲
نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ ع

کسی جی کو جب آپہنچا اس کا وعدہ، اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! تمہاری دولت اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں گے، وہ بڑے گھاٹے کا سودا کرنے والے ہوں گے۔ ۝۹ اور ہم نے تمہیں جو رزق دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کے حکم کے مطابق) خرچ کرلو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے تو وہ یہ کہے کہ: ''اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اور مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں خوب صدقہ کرتا، اور نیک لوگوں میں شامل ہوجاتا۔'' ۝۱۰ اور جب کسی شخص کا معین وقت آجائے گا تو اللہ اُسے ہرگز مہلت نہیں دے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۝۱۱

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد (مراد اس سے مجموعۂ دُنیا ہے) اللہ کی یاد (اور اِطاعت) سے (مراد

اس سے مجموعۂ دِین ہے) غافل نہ کرنے پائیں (یعنی دُنیا میں ایسے منہمک مت ہوجانا کہ دِین میں خلل پڑنے لگے) اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں (کیونکہ نفع دُنیوی تو ختم ہوجائے گا اور آخرت کا ضرر اور خسارہ ممتد یا دائم رہ جائے گا) اور (من جملہ طاعات کے ایک طاعتِ مالیہ کا حکم کیا جاتا ہے کہ لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ کے عام مضمون میں سے ایک فرد خاص ہے یعنی) ہم نے جو کچھ تم کو دِیا ہے اس میں سے (حقوقِ واجبہ کو) اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو، پھر وہ (بطور تمنا وحسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دِنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہوجاتا (اور اس کی یہ تمنا وحسرت اس لئے غیر مفید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب کہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے (ویسی ہی جزا کے مستحق ہوگے)۔

معارف و مسائل

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ، اس سورت کے پہلے رُکوع میں منافقین کی جھوٹی قسموں اور اُن کی سازشوں کا ذِکر تھا، اور سب کا خلاصہ دُنیا کی محبت سے مغلوب ہونا تھا، اسی وجہ سے ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی زَد سے بھی بچیں اور اَموالِ غنیمت وغیرہ کا حصہ بھی ملے، اسی وجہ سے اُن کی یہ سازش تھی کہ مہاجرین صحابہ پر خرچ کرنا بند کردو، اس دُوسرے رُکوع میں خطاب مؤمنینِ مخلصین کو ہے، جس میں اُن کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ دُنیا کی محبت میں ایسے مدہوش نہ ہوجائیں جیسے منافقین ہوگئے، دُنیا کی سب سے بڑی دو چیزیں ہیں جو اِنسان کو اللہ سے غافل کرتی ہیں، مال اور اولاد، اس لئے ان دونوں کا نام لیا گیا، ورنہ مراد اس سے پوری متاعِ دُنیا ہے، اور حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ مال اور اولاد سے محبت ایک درجے میں مذموم نہیں، ان کے ساتھ ایک درجے تک اِشتغال صرف جائز نہیں بلکہ واجب بھی ہوجاتا ہے، مگر اس کی یہ حدِّ فاصل ہر وقت سامنے رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذِکر سے غافل نہ کردیں، یہاں ذِکر سے مراد بعض مفسرین نے پانچ وقت کی نماز، بعض نے حج اور زکوٰۃ، بعض نے قرآن قرار دِیا ہے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ذکر سے مراد یہاں تمام طاعات وعبادات ہیں، اور یہی قول سب کا جامع ہے۔ (قرطبی) [1]

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۲۹

خلاصہ یہ ہے کہ اس دُنیاوی معیشت کے سامان میں اس قدر مشغول رہنے کی تو اِجازت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذِکر یعنی طاعت سے انسان کو غافل نہ کردے کہ اُن کی محبت میں مبتلا ہوکر فرائض وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے، یا حرام اور مکروہات میں مبتلا ہوجائے، اور جو ایسا کرے اُن کے بارے میں ہے: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ یعنی یہی لوگ ہیں خسارے میں پڑنے والے، کیونکہ انہوں نے آخرت کی عظیم اور ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں کے بدلے میں دُنیا کی حقیر اور فانی نعمتوں کو اِختیار کرلیا، اس سے بڑا خسارہ کیا ہوگا۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ، اس آیت میں موت کے آجانے سے مراد موت کے آثار کا مشاہدہ ہے، اور مراد یہ ہے کہ موت کے آثار سامنے آنے سے پہلے صحت وقوّت کی حالت میں اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرکے آخرت کے درجات حاصل کرلو، ورنہ موت کے بعد یہ مال وغیرہ تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔ اُوپر معلوم ہوچکا ہے کہ ذِکر سے مراد تمام طاعات اور اَحکامِ شرعی کی پابندی ہے، جس میں ضرورت کے مواقع پر مال خرچ کرنا بھی داخل ہے، پھر یہاں صرف اِنفاقِ مال کو جدا کرکے بیان کرنے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں، اوّل یہ کہ اللہ اور اس کے اَحکام کی تعمیل سے انسان کو غفلت میں ڈالنے والی سب سے بڑی چیز مال ہی ہے، اس لئے جن چیزوں میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، جیسے زکوٰۃ، عشر، حج وغیرہ ان کو مستقلاً بیان کردیا۔ دُوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ موت کے آثار کا مشاہدہ ہونے کے وقت یہ تو نہ کسی کے بس میں ہے، نہ کسی کو اس کا تصوّر ہوسکتا ہے کہ اس وقت قضا شدہ نمازیں ادا کروں، یا فوت شدہ حجِ فرض ادا کروں، یا رمضان کے فوت شدہ روزے رکھوں، مگر مال سامنے ہوتا ہے اور یہ یقین ہو ہی جاتا ہے کہ اب یہ مال میرے ہاتھ سے چلا، تو اُس وقت بھی تمنا ہوسکتی ہے کہ جلد سے جلد مال کو خرچ کرکے مالی عبادات کی کوتاہی سے نجات حاصل کرلیں، نیز یہ کہ صدقہ تمام دُوسری بلاؤں اور عذاب کے ٹلادینے میں بھی مؤثر ہے۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے زیادہ اجر وثواب رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا جب کہ انسان تندرست ہو اور اپنی آئندہ ضروریات کے پیشِ نظر یہ خوف بھی ہو کہ مال خرچ کرڈالا تو کہیں بعد میں خود محتاج نہ ہوجاؤں، اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس وقت تک نہ ٹلاؤ جب تک کہ رُوح تمہارے حلق میں آجائے اور مرنے لگو تو اس وقت کہو کہ اتنا مال فلاں کو دے دو، اتنا فلاں کام میں خرچ کردو۔ [۱]

فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ حضرت ابنِ عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کے

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب فضل صدقة الشحيح الصحيح ج: ۱ ص: ۱۹۰

ذمہ زکوۃ واجب تھی اور ادا نہیں کی، یا حج فرض تھا اور ادا نہیں کیا، وہ موت سامنے آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کی تمنا کرے گا کہ میں پھر دُنیا کی طرف لوٹ جاؤں، یعنی موت میں اور کچھ مہلت مل جائے تاکہ میں صدقہ وخیرات کرلوں اور فرائض سے سبکدوش ہوجاؤں۔[1] وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ یعنی وہ مرنے کے وقت یہ بھی تمنا کرے گا کہ کچھ مہلت مل جائے تو ایسے اعمال کرلوں جن کی وجہ سے صالحین میں داخل ہوجاؤں، یعنی جو فرائض وواجبات چھوٹے ہیں اُن کو قضا کرلوں، جن محرمات ومکروہات میں مبتلا ہوا ہوں، ان سے توبہ واستغفار کرکے بے باق ہوجاؤں، مگر حق تعالیٰ نے اگلی آیت میں بتلا دیا کہ موت کے آجانے کے بعد کسی کو مہلت نہیں دی جاتی، یہ تمنائیں لغو وفضول ہیں۔

تَمَّتْ

بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰی سُوْرَةُ الْمُنَافِقُوْنَ قَبْلَ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ

لِلثَّالِثِ عَشَرَ مِنْ جُمَادَی الثَّانِيَةِ ۱۳۹۱ھ

[1] تفسير المظهرى ج:۹ ص:۳۱۰

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ

آیاتها ۱۸ ۶۴ سُوْرَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۸ رکوعاتها ۲

سورۂ تغابن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۫

پاکی بول رہا ہے اللہ کی جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اسی کا راج ہے، اور اسی کی تعریف ہے

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ

اور وہی ہر چیز کرسکتا ہے، وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر کوئی تم میں منکر ہے

وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

اور کوئی تم میں ایمان دار اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے، بنایا آسمانوں کو

وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

اور زمین کو تدبیر سے اور صورت کھینچی تمہاری پھر اچھی بنائی تمہاری صورت اور اس کی طرف سب کو پھر جانا ہے،

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ

جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو کھول کر کرتے ہو

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ

اور اللہ کو معلوم ہے جیوں کی بات۔ کیا پہنچی نہیں تم کو خبر اُن لوگوں کی

كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑤

جو منکر ہو چکے ہیں پہلے، پھر انہوں نے چکھی سزا اپنے کام کی، اور اُن کو عذاب دردناک ہے،

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ

یہ اس لئے کہ لاتے تھے اُن کے پاس اُن کے رسول نشانیاں پھر کہتے کیا آدمی ہم کو راہ سجھائیں گے،

فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑥ زَعَمَ

پھر منکر ہوئے اور منہ موڑ لیا اور اللہ نے بے پروائی کی، اور اللہ بے پروا ہے سب تعریفوں والا، دعویٰ کرتے ہیں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ

منکر کہ ہرگز اُن کو کوئی نہ اُٹھائے گا، تو کہہ کیوں نہیں قسم ہے میرے ربّ کی تم کو بے شک اُٹھانا ہے، پھر تم کو جتلانا ہے

بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑦ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

جو کچھ تم نے کیا، اور یہ اللہ پر آسان ہے، سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر

وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ

اور اس نور پر جو ہم نے اُتارا، اور اللہ کو تمہارے سب کام کی خبر ہے، جس دن تم کو اکٹھا کرے گا

لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا

جمع ہونے کے دن، وہ دن ہے ہار جیت کا، اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کرے کام بھلا

يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اُتار دے گا اس پر سے اس کی بُرائیاں اور داخل کرے گا اس کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

رہا کریں اُن میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی مراد ملنی، اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلائیں انہوں نے

ع ۱۵ بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰ ع

ہماری آیتیں وہ لوگ ہیں دوزخ والے رہا کریں اسی میں، اور بُری جگہ جا پہنچے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے، اور بادشاہی اُسی کی ہے، اور تعریف اُسی کی، اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ۞۱ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے، اور کوئی مؤمن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب دیکھتا ہے۔ ۞۲ اُس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورتیں بنائی ہیں، اور تمہاری صورتیں اچھی بنائی ہیں، اور اُسی کی طرف آخرکار (سب کو) پلٹ کر جانا ہے۔ ۞۳ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اُسے جانتا ہے، اور جو کچھ تم چھپ کر کرتے ہو اور جو کچھ کھلم کھلا کرتے ہو، اُس کا بھی اُسے پورا علم ہے، اور اللہ دلوں کی باتوں تک کا خوب جاننے والا ہے۔ ۞۴ کیا تمہارے پاس اُن لوگوں کے واقعات نہیں پہنچے جنہوں نے پہلے کفر

اختیار کیا تھا، پھر اپنے کاموں کا وبال چکھا، اور (آئندہ) ان کے حصے میں ایک دردناک عذاب ہے؟ ⑤ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اُن کے پاس اُن کے پیغمبر روشن دلائل لے کر آتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ: "کیا (ہم جیسے) انسان ہیں جو ہمیں ہدایت دیں گے؟ غرض انہوں نے کفر اختیار کیا، اور منہ موڑا، اور اللہ نے بھی بے نیازی برتی، اور اللہ بالکل بے نیاز ہے، بذاتِ خود قابلِ تعریف! ⑥ جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنہیں کبھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ کہہ دو: "کیوں نہیں؟ میرے پروردگار کی قسم! تمہیں ضرور دوبارہ زندہ کیا جائے گا، پھر تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا تھا، اور یہ اللہ کے لئے معمولی سی بات ہے۔" ⑦ لہٰذا اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس روشنی پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کی ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ⑧ (یہ دُوسری زندگی) اُس دن (ہوگی) جب اللہ تمہیں روزِ حشر میں اِکٹھا کرے گا۔ وہ ایسا دِن ہوگا جس میں کچھ لوگ دُوسروں کو حسرت میں ڈال دیں گے، اور جو شخص اللہ پر ایمان لایا ہوگا، اور اس نے نیک عمل کئے ہوں گے، اللہ اُس کے گناہوں کو معاف کردے گا، اور اُس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ ⑨ اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہوگا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا، وہ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ⑩

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں ہیں اللہ کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان کرتی ہیں اسی کی سلطنت ہے اور وہی تعریف کے لائق ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے (یہ تمہید اگلے بیان کی ہے کہ وہ ایسے صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے تو اس کی اطاعت واجب اور معصیت قبیح ہے) وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا (جو مقتضی اس کا تھا کہ سب ایمان لاتے) سو (باوجود اس کے بھی) تم میں بعض کافر ہیں اور بعض مؤمن ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال (ایمانیہ وکفریہ) کو دیکھ رہا ہے (بس ہر ایک کے مناسب جزا دے گا) اسی نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر (یعنی پُرحکمت وپُرمنفعت) پیدا کیا اور تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا (کیونکہ اعضائے انسانی کے برابر کسی حیوان کے اعضا میں تناسب نہیں) اور اسی کے پاس (سب کو) لوٹنا ہے (اور) وہ سب چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سب چیزوں کو جانتا ہے جو تم پوشیدہ کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ دِلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے، اور یہ تمام اُمور مقتضی اس کو ہیں کہ تم اس کی اطاعت کیا کرو اور علاوہ اُن مقتضیات کے) کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی (کہ وہ خبر پہنچنا بھی مقتضی وجوبِ

اطاعت کو ہے) جنہوں نے (تم سے) پہلے کفر کیا، پھر انہوں نے اپنے (ان) اعمال کا وبال (دُنیا میں بھی) چکھا اور (اس کے علاوہ آخرت میں بھی) ان کے لئے عذاب دردناک ہونے والا ہے یہ (وبال عاجل وعذاب آجل) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں کے پاس اُن کے پیغمبر دلائلِ واضحہ لے کر آئے تو ان لوگوں نے (ان رسولوں کی نسبت) کہا کہ کیا آدمی ہم کو ہدایت کریں گے (یعنی بشر کہیں پیغمبر یا ہادی ہوسکتا ہے) غرض انہوں نے کفر کیا اور اِعراض کیا اور خدا نے (بھی ان کی کچھ) پروا نہ کی (بلکہ مقہور کردیا) اور اللہ (سب سے) بے نیاز (اور) ستودہ صفات ہے (اس کو نہ کسی معصیت سے ضرر اور نہ کسی کی طاعت سے نفع، خود مطیع وعاصی ہی کا نفع اور ضرر ہے اور) یہ کافر (مضمون عذابِ آخرت کا سن کر جیسا کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ میں مذکور ہے) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے (جس کے بعد عذابِ الیم کا وقوع بتلایا جاتا ہے) آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں، واللہ ضرور دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے پھر جو کچھ تم نے کیا ہے تم سب کو جتلا دیا جائے گا (اور اس پر سزا دی جائے گی) اور یہ (بعث وجزا) اللہ کو (بوجہ کمالِ قدرت) بالکل آسان ہے سو (جب یہ مقتضیات ایمان کے مجتمع ہیں تو تم کو چاہئے کہ) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر (یعنی قرآن پر) جو کہ ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس دن کو یاد کرو) جس دن کہ تم سب کو اس جمع ہونے کے دن میں جمع کرے گا یہی دن ہے سود وزیاں (کے ظاہر ہونے) کا (یعنی مسلمانوں کا نفع اور کافروں کا نقصان اُس روز عملاً ظاہر ہوجائے گا) اور (بیان اس کا یہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہوگا اور نیک کام کرتا ہوگا اللہ اس کے گناہ دُور کردے گا اور اس کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا یہ لوگ دوزخی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

معارف ومسائل

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں بعض کافر ہوگئے، بعض مؤمن رہے، اس میں لفظ ''فَمِنْكُمْ'' کا حرف فاء جو تعقیب (یعنی ایک چیز کا دُوسرے کے بعد ہونے) پر دلالت کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اوّل تخلیق وآفرینش میں کوئی کافر نہیں تھا، یہ کافر ومؤمن کی تقسیم بعد میں اس کسب واختیار کے تابع ہوئی، جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بخشا ہے، اور اسی کسب واختیار کی وجہ سے اس پر گناہ وثواب عائد ہوتا ہے، ایک حدیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ

فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ ''(الحدیث) یعنی'' ہر پیدا ہونے والا انسان فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے (جس کا تقاضا مؤمن ہونا ہے) مگر پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ (قرطبی) [1]

دو قومی نظریئے

قرآنِ حکیم نے اس جگہ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے، کافر، مؤمن۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولادِ آدم علیہ السلام سب ایک برادری ہیں، اور دُنیا کے پورے انسان اس برادری کے افراد ہیں، اس برادری کو قطع کرنے اور ایک الگ گروہ بنانے والی چیز صرف کفر ہے، جو شخص کافر ہوگیا، اس نے انسانی برادری کا رِشتہ توڑ دیا، اس طرح پوری دُنیا میں انسانوں میں تحزّب اور گروہ بندی صرف ایمان و کفر کی بنا پر ہوسکتی ہے، رنگ اور زبان، نسب و خاندان، وطن اور ملک میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی برادری کو مختلف گروہوں میں بانٹ دے، ایک باپ کی اولاد اگر مختلف شہروں میں بسنے لگے، یا مختلف زبانیں بولنے لگے، یا ان کے رنگ میں تفاوت ہو تو وہ الگ الگ گروہ نہیں ہوجاتے، اِختلافِ رنگ و زبان اور وطن و ملک کے باوجود یہ سب آپس میں بھائی ہی ہوتے ہیں، کوئی سمجھ دار انسان ان کو مختلف گروہ نہیں قرار دے سکتا۔

زمانۂ جاہلیت میں نسب اور قبائل کی تفریق کو قومیت اور گروہ بندی کی بنیاد بنا دیا گیا، اسی طرح ملک و وطن کی بنیاد پر کچھ گروہ بندی ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب بتوں کو توڑا، اور مسلمان خواہ کسی ملک اور کسی خطے کا ہو کسی رنگ اور خاندان کا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، ان سب کو ایک برادری قرار دیا، بنصِ قرآن: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰) (مؤمنین سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں) اسی طرح کفار کسی ملک و قوم کے ہوں، وہ اسلام کی نظر میں ملتِ واحدہ ہیں، یعنی ایک قوم ہیں۔

قرآنِ کریم کی مذکورۃ الصدر آیت بھی اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل بنی آدم کو صرف کافر و مؤمن دو گروہوں میں تقسیم فرمایا، اختلافِ رنگ و زبان کو قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نشانی اور اِنسان کے لئے بہت سے معاشی فوائد پر مشتمل ہونے کی بنا پر ایک عظیم نعمت قرار دِیا ہے، مگر اس کو بنی آدم میں گروہ بندی کا ذریعہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔

اور اِیمان و کفر کی بنا پر دو قوموں کی تقسیم یہ ایک اَمرِ اِختیاری پر مبنی ہے، کیونکہ ایمان بھی اِختیاری اَمر ہے، اور کفر بھی، اگر کوئی شخص ایک قومیت چھوڑ کر دُوسری میں شامل ہونا چاہے تو بڑی آسانی سے اپنے عقائد بدل کر دُوسرے میں شامل ہوسکتا ہے، بخلاف نسب و خاندان، رنگ اور زبان اور ملک و وطن کے کہ کسی انسان کے اِختیار میں نہیں کہ اپنا نسب بدل دے، یا رنگ بدل دے، زبان اور وطن اگرچہ بدلے جاسکتے ہیں مگر زبان و وطن کی بنیاد پر بننے والی قومیں دُوسروں کو عادۃً

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۳۳، وصحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، ج:۱ ص:۱۸۵، وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة ...إلخ، ج:۲ ص:۳۳۶

اپنے اندر جذب کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتیں، خواہ اُن کی ہی زبان بولنے لگے اور اُن کے وطن میں آباد ہو جائے۔

یہی وہ اسلامی برادری اور ایمانی اُخوّت تھی جس نے تھوڑے ہی عرصے میں مشرق و مغرب، جنوب و شمال، کالے گورے، عرب عجم کے بے شمار اَفراد کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، جس کی قوت و طاقت کا مقابلہ دُنیا کی قومیں نہ کر سکیں، تو انہوں نے پھر اُن بتوں کو زِندہ کیا، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اِسلام نے پاش پاش کر دیا تھا، مسلمانوں کی عظیم ترین ملتِ واحدہ کو ملک و وطن اور زبان اور رنگ اور نسب اور خاندان کے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کو باہم ٹکرا دیا، اس طرح دُشمنانِ اسلام کی یلغار کے لئے میدان صاف ہو گیا، جس کا نتیجہ آنکھیں آج دیکھ رہی ہیں کہ مشرق و مغرب کے مسلمان جو ایک قوم، ایک دل تھے اب چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منحصر ہو کر ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہیں، اور اُن کے مقابلے پر کفر کی طاغوتی قوّتیں باہمی اِختلاف رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں ملتِ واحدہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (اس نے تمہاری صورت بنائی پھر تمہاری صورتوں کو بہتر بنایا) صورت گری درحقیقت خالقِ کائنات کی مخصوص صفت ہے، اسی لئے اسمائے الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کا نام مصوّر آیا ہے، اور غور کرو کہ کائنات میں کتنی اجناس مختلفہ ہیں اور ہر جنس میں کتنی انواعِ مختلفہ، ہر نوع میں اصنافِ مختلفہ اور ہر صنف میں لاکھوں کروڑوں افراد مختلفہ پائے جاتے ہیں، ایک کی صورت دُوسرے سے نہیں ملتی، ایک نوعِ انسانی میں ملکوں اور خطوں کے اختلاف سے نسلوں اور قوموں کے اِختلاف سے شکل و صورت میں کُھلے ہوئے امتیازات، پھر ان میں ہر فرد کی شکل و صورت کا دوسرے سب سے ممتاز ہونا ایک ایسی حیرت انگیز صنعت و صورت گری ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، انسانی چہرہ جو چھ سات مربع انچ سے زیادہ نہیں، اربوں، پدموں انسانوں میں ایک ہی طرح کا چہرہ ہونے کے باوجود ایک کی صورت بالکلیہ دُوسرے سے نہیں ملتی کہ پہچاننا دُشوار ہو جائے، آیتِ مذکورہ میں ایک نعمت صورت گری ہے اس کا ذِکر فرمایا، اس کے بعد فرمایا: فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ یعنی شکلِ انسانی کو ہم نے تمام کائنات و مخلوقات کی صورتوں سے زیادہ حسین اور بہتر بنایا ہے، کوئی انسان اپنی جماعت میں کتنا ہی بدشکل، بدصورت سمجھا جاتا ہو، مگر باقی تمام حیوانات وغیرہ کی اَشکال کے اِعتبار سے وہ بھی حسین ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

فَقَالُوٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا لفظ ''بشر'' اگرچہ مفرد ہے، مگر معنی میں جمع کے ہے، اس لئے ''يَهْدُوْنَ'' جمع کا لفظ اس کے لئے استعمال فرمایا گیا، بشریت کو نبوّت و رِسالت کے منافی سمجھنا سبھی کفار کا خیالِ باطل تھا، جس پر قرآن میں جابجا رَدّ کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ اب مسلمانوں میں بھی بعض لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکر پائے جاتے ہیں، انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، بشر ہونا نہ نبوّت کے منافی ہے، نہ رِسالت کے بلند مقام کے منافی ہے، اور نہ رسول کے نور ہونے کے منافی ہے، وہ نور بھی ہیں، بشر بھی، ان کے نور کو چراغ اور آفتاب و ماہتاب کے نور پر قیاس کرنا غلطی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے) نور سے مراد اس جگہ قرآن ہے، کیونکہ نور کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی ظاہر اور روشن ہو اور دُوسری چیزوں کو بھی ظاہر و روشن کردے، قرآن کا اپنے اعجاز کی وجہ سے خود روشن اور ظاہر ہونا کھلی بات ہے، اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے اور ناراض ہونے کے اسباب اور اَحکام و شرائع اور تمام حقائق عالمِ آخرت جن کے جاننے کی انسان کو ضرورت ہے، وہ روشن ہو جاتے ہیں۔

قیامت کو یومِ تغابن کہنے کی وجہ

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ''جس روز تم کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا جمع کرنے کے دن، یہ دن ہوگا تغابن کا یعنی خسارے کا۔'' یوم الجمع اور یوم التغابن دونوں قیامت کے نام ہیں، يَوْمُ الْجَمْعِ ہونا اس دن کا تو ظاہر ہے کہ تمام مخلوق اوّلین و آخرین کو اس روز حساب کتاب اور جزا و سزا کے لئے جمع کیا جائے گا، اور يَوْمَ التَّغَابُنُ اس لئے کہ تَغَابُنْ، غَبَنْ سے مشتق ہے، جس کے معنی خسارے اور نقصان کے ہیں، مالی نقصان اور خسارے کو بھی غبن کہا جاتا ہے، اور رائے اور عقل کے نقصان کو بھی۔ امام راغب اصفہانی نے ''مفردات القرآن'' میں فرمایا کہ مالی خسارے کے لئے یہ لفظ بصیغۂ مجہول: ''غُبِنَ فُلَانٌ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ'' استعمال کیا جاتا ہے۔[1] اور عقل و رائے کے نقصان کے لئے باب سَمِعَ سے غَبِنَ استعمال کیا جاتا ہے، لفظ تَغَابُنْ اصل کے اعتبار سے دوطرفہ کام کے لئے بولا جاتا ہے کہ ایک آدمی دُوسرے کو اور دُوسرا اس کو نقصان پہنچائے، یا اس کے نقصان و خسارے کو ظاہر کرے، یہاں مراد یک طرفہ اظہارِ غبن ہے، جیسا کہ یک طرفہ استعمال بھی اس لفظ کا معروف و مشہور ہے، قیامت کو يَوْمُ التَّغَابُنْ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے آخرت میں دو گھر پیدا کئے ہیں، ایک جہنم میں، دُوسرا جنت میں، اہلِ جنت کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے اُن کا وہ مقام بھی دِکھلایا جائے گا جو ایمان اور عمل نہ ہونے کی صورت میں اس کے لئے مقرّر تھا کہ اس کو دیکھنے کے بعد جنت کے مقام کی اور زیادہ قدر اس کے دل میں پیدا ہو، اور اللہ تعالیٰ کا مزید شکرگزار ہو۔ اسی طرح اہلِ جہنم کو جہنم میں داخل کرنے سے پہلے اُن کا جنت کا وہ مقام دِکھلایا جائے گا جو ایمان اور عملِ صالح کی صورت میں اُن کے لئے مقرّر تھا، تاکہ اُن کو اور زیادہ حسرت ہو، ان روایات میں یہ بھی ہے کہ پھر جنت میں جو مقامات اہلِ جہنم کے تھے وہ بھی اہلِ جنت کو مل جائیں گے، اور جہنم میں جو مقامات اہلِ جنت کے تھے وہ بھی اہلِ جہنم کے حصے میں آجائیں گے۔ یہ روایاتِ

---

[1] مفردات القرآن للراغب، كتاب الغين، ج:۱ ص:۲۰۲

حدیث صحیحین اور دُوسری کتبِ حدیث میں مختلف الفاظ سے مفصل آئی ہیں۔[۱] اس وقت جب کہ کفار فجار اور اشقیاء کے جنتی مقامات بھی اہلِ جنت کے قبضے میں آئیں گے، تو ان کو اپنے غبن اور خسارے کا اِحساس ہوگا کہ کیا چھوڑا اور کیا پایا۔

صحیح مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے سوال فرمایا کہ تم جانتے ہو مفلس کون شخص ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ جس شخص کے پاس مال متاع نہ ہو، اس کو مفلس سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میری اُمت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں اپنے اعمالِ صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا ذخیرہ لے کر آئے گا، مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ دُنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر بہتان باندھا، کسی کو مارا، یا قتل کیا، کسی کا مال ناحق لے لیا (تو یہ سب جمع ہوں گے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کریں گے) کوئی اس کی نماز لے جائے گا، کوئی روزہ، کوئی زکوٰۃ اور دوسری حسنات، اور جب حسنات ختم ہوجائیں گی تو مظلوموں کے گناہ اس ظالم پر ڈال کر بدلہ چکایا جائے گا، جس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[۲]

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمے کسی کا کوئی حق ہو، اس کو چاہئے کہ دُنیا ہی میں اس کو اَدا یا معاف کرا کر سبکدوش ہوجائے، ورنہ قیامت کے دن درہم و دِینار تو ہوں گے نہیں، جس کا مطالبہ ہوگا اس کو اس شخص کے اعمالِ صالحہ دے کر بدلہ چکایا جائے گا، اعمالِ صالحہ ختم ہوجائیں گے تو بقدر اس کے حق کے مظلوم کا گناہ اس پر ڈال دیا جائے گا۔[۳]

حضرت ابنِ عباسؓ اور دُوسرے ائمۂ تفسیر نے قیامت کو **یَوْمُ التَّغَابُنْ** کہنے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور بہت سے ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ اُس دن غبن اور خسارے کا احساس صرف کفار، فجار اور اشقیاء ہی کو نہیں بلکہ صالحین مؤمنین کو بھی اس طرح ہوگا کہ کاش ہم عمل اور زیادہ کرتے تاکہ جنت کے مزید درجات حاصل کرتے، اس روز ہر شخص کو اپنی عمر کے اوقات پر حسرت ہوگی جو فضول ضائع کئے، جیسا کہ حدیث میں ہے:-

مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا لَّمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَ عَلَيْهِ تِرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔[۴]

''جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا اور پوری مجلس میں اللہ کا ذِکر نہ کیا تو یہ مجلس قیامت کے روز اس کے لئے حسرت بنے گی۔''

---

[۱] شعب الإيمان للبيهقي، رقم الحديث: ۲۷۱، وسنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب صفة الجنّة، ج:۲ ص:۳۲۳

[۲] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم ج:۲ ص:۳۱۹، وجامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب شان الحساب والقصاص ج:۲ ص:۶۷

[۳] تفسير المظهری ج:۹ ص:۳۱۳، وصحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب القصاص يوم القيامة، ج:۲ ص:۹۶۷

[۴] شعب الإيمان للبيهقي، فصل في إدلته ذكر الله عز وجل، رقم الحديث: ۵۳۹

قرطبی میں ہے کہ ہر مؤمن بھی اس روز احسان عمل میں اپنی کوتاہی پر اپنے غبن وخسارہ کا احساس کرے گا، قیامت کا نام یَوْمُ تَغَابُنْ رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سورۂ مریم میں اس کا نام یَوْمُ الْحَسْرَةِ آیا ہے وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ (مریم:۳۹) رُوح المعانی میں اس آیت کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ اس روز ظالم اور بدعمل لوگ اپنی تقصیرات پر حسرت کریں گے، اور مؤمنین صالحین نے بھی جو احسانِ عمل میں کوتاہی کی ہے اس پر اُن کو حسرت ہوگی، اس طرح قیامت کے روز سبھی اپنی اپنی کوتاہی پر نادم اور عمل کی کمی پر غبن وخسارہ کا احساس کریں گے۔[۱] اس لئے اس کو یَوْمُ التَّغَابُنْ کہا گیا۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ

نہیں پہنچتی کوئی تکلیف بدون حکم اللہ کے اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر وہ راہ بتلائے اس کے دل کو

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ

اور اللہ کو ہر چیز معلوم ہے، اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا،

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ

پھر اگر تم منہ موڑو تو ہمارے رسول کا تو یہی کام ہے پہنچادینا کھول کر، اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اور اللہ پر چاہئے بھروسہ کریں ایمان والے، اے ایمان والو

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا

تمہاری بعض جوروئیں اور اولاد دُشمن ہیں تمہارے، سو اُن سے بچتے رہو، اور اگر معاف کرو

وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ

اور درگزر کرو اور بخشو تو اللہ ہے بخشنے والا مہربان، تمہارے مال

[۱] تفسیر روح المعانی، تفسیر سورة مریم، آیة: ۳۹، ج: ۱۱ ص: ۴۹۳

وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۵ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

اور تمہاری اولاد یہی ہیں جانچنے کو اور اللہ جو ہے اس کے پاس ہے ثواب بڑا، سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے،

وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ

اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنے بھلے کو، اور جس کو بچادیا اپنے جی کے لالچ سے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۶ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ

سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے، اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا، وہ دونا کردے تم کو

وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۷ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ

اور تم کو بخشے اور اللہ قدردان ہے تحمل والا، جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ ع

زبردست حکمت والا۔

(ع ۲ / ۸ / ۱۶)

آسان ترجمۂ قرآن

کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی، اور جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا ہے، وہ اُس کے دِل کو ہدایت بخشتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ۝۱۱ اور تم اللہ کی فرماں برداری کرو، اور رسول کی فرماں برداری کرو۔ پھر اگر تم نے منہ موڑا تو ہمارے رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ صاف صاف بات پہنچادے۔ ۝۱۲ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور مؤمنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ۝۱۳ اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دُشمن ہیں، اس لئے اُن سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم معاف کردو، اور درگذر کرو، اور بخش دو تو اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ ۝۱۴ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو تمہارے لئے ایک آزمائش ہیں، اور وہ اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اَجر ہے۔ ۝۱۵ لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو، اور سنو اور مانو، اور (اللہ کے حکم کے مطابق) خرچ کرو، یہ

تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اور جو لوگ اپنے دِل کی لالچ سے محفوظ ہو جائیں، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ⑯ اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو اللہ تمہارے لئے اُس کو کئی گنا بڑھا دے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بڑا قدر دان، بہت بُردبار ہے۔ ⑰ وہ ہر بھید کا اور ہر کھلی ہوئی چیز کا جاننے والا ہے، بڑے اِقتدار کا، بڑی حکمت کا مالک! ⑱

خلاصۂ تفسیر

(جس طرح کفر آخرت کی فلاح سے کلیۃً مانع ہے، اسی طرح اموال واولاد اور بیوی وغیرہ میں مشغول ہو کر خدائے تعالیٰ کے اَحکام میں کوتاہی کرنا بھی ایک درجے میں فلاحِ آخرت سے مانع ہے، اس لئے مصیبت میں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ) کوئی مصیبت بدون خدا کے حکم کے نہیں آتی (اور یہ سمجھ کر صبر ورضا اِختیار کرنا چاہئے) اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر ورضا کی) راہ دِکھا دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (کہ کس نے صبر ورضا اِختیار کیا اور کس نے نہیں کیا، اور ہر ایک کو حسبِ حکمت جزا وسزا دیتا ہے) اور (خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر اَمر میں جس میں مصائب بھی داخل ہیں) اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور اگر تم (اطاعت سے) اِعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (جس کو وہ باحسن وجوہ کر چکے ہیں، اس لئے ان کا تو کوئی ضرر نہیں، تمہارا ہی ضرر ہوگا، اور چونکہ اللہ کو ضرر ہونے کا اِحتمال ہی نہیں، اس لئے اس کو یہاں بیان نہیں کیا، اور تم لوگوں کو اور خصوص اہلِ مصیبت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود (بننے کے قابل) نہیں، اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر (مصائب وغیرہ میں) توکل رکھنا چاہئے۔ اے ایمان والو (جیسا مصیبت میں تم کو صبر ورضا کا حکم کیا گیا ہے، اسی طرح نعمت کے بارے میں تم کو منہمک نہ ہونے کا حکم کیا جاتا ہے، پس نعمت کے بارے میں یوں سمجھنا چاہئے کہ) تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے (دین کے) دُشمن ہیں (جب کہ وہ اپنے نفعِ دُنیوی کے واسطے تم کو ایسی بات کا حکم کریں جو تمہارے لئے مضرِ آخرت ہو) سو تم ان سے (یعنی ایسوں سے) ہوشیار رہو (اور ان کے ایسے اَمر پر عمل مت کرو) اور اگر (تم کو ایسی فرمائشوں پر غصہ آئے اور تم ان پر تشدّد کرنے لگو اور وہ اس وقت معذرت اور توبہ کریں اور) تم (اس وقت اُن کی وہ خطا) معاف کر دو (یعنی سزا نہ دو) اور درگزر کر جاؤ (یعنی زیادہ ملامت نہ کرو) اور بخش دو (یعنی اس کو دل سے اور زبان سے بھلا دو) تو اللہ تعالیٰ (تمہارے گناہوں کا) بخشنے والا (اور تمہارے حال پر) رحم کرنے والا ہے (اس میں ترغیب ہے عفو کی اور یہ بعض اوقات واجب ہے، جب کہ عقوبت سے اِحتمال غالب بے باکی کا ہو، اور بعض اوقات مستحب ہے، آگے اولاد کے ساتھ اموال کے متعلق بھی اسی قسم کا مضمون ہے کہ) تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے

(کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے اَحکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے) اور (جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھے گا تو) اللہ کے پاس (اس کے لئے) بڑا اَجر ہے تو (ان سب باتوں کو سن کر) جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے اَحکام) سنو اور مانو اور (بالخصوص مواقع حکم میں) خرچ (بھی) کیا کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (غالباً اس کی تخصیص اس لئے ہے کہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے) اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں (آگے اس کے بہتر اور موجبِ فلاح ہونے کا بیان ہے کہ) اگر تم اللہ کو اچھی طرح (خلوص کے ساتھ) قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بڑا قدر دان ہے (کہ عملِ صالح کو قبول فرماتا ہے اور) بڑا بُردبار ہے (کہ عملِ معصیت پر فی الفور مؤاخذہ نہیں فرماتا اور) پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا ہے (اور) زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے (شَکُوْرٌ سے الْحَکِیْمُ تک تمام مضامین سورت کے لئے بمنزلہ علت کے ہیں کہ سب مضامین اُن پر مرتب و متفرع ہو سکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ ''یعنی کسی کو کوئی مصیبت اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں پہنچتی، اور جو شخص اللہ پر اِیمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ہدایت فرما دیتا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ یہ امر تو اپنی جگہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِذن و مشیت کے بغیر کہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، اللہ کے اِذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو نقصان و تکلیف پہنچا سکتا ہے، نہ نفع اور راحت، مگر جس شخص کا اللہ پر اور اس کی تقدیر پر اِیمان نہیں ہوتا مصیبت کے وقت اُس کے لئے قرار و سکون کا کوئی سامان نہیں ہوتا، وہ اِزالۂ مصیبت کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے، بخلاف مؤمن کہ جس کا تقدیرِ الٰہی پر اِیمان ہے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیتا ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے اِذن و مشیت سے ہوا، جو کچھ مصیبت مجھے پہنچی وہ پہنچنی ہی تھی، اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اور جس مصیبت سے نجات ہوئی وہ نجات ہونا ہی تھی، کسی کی مجال نہیں جو اس مصیبت کو مجھ پر ڈال دے، اس ایمان و اعتقاد کے نتیجے میں اس کو آخرت کے ثواب کا وعدہ بھی سامنے ہوتا ہے جس سے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ یعنی ''اے مسلمانو! تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے دُشمن ہیں، اُن کے شر سے بچتے رہو۔''

ترمذی و حاکم وغیرہ نے بہ سندِ صحیح حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں

نازل ہوئی جو ہجرتِ مدینہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخلِ اسلام ہوئے، اور اِرادہ کیا کہ ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، مگر ان کے اہل و عیال نے ان کو نہ چھوڑا کہ ہجرت کر کے چلے جائیں۔ (روح) [۱]

(اور یہ زمانہ وہ تھا کہ مکہ سے ہجرت کرنا ہر مسلمان پر فرض تھا) قرآنِ کریم کی آیتِ مذکورہ میں ایسی بیوی اور اولاد کو اِنسان کا دُشمن قرار دِیا، اور ان کے شر سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی، کیونکہ اس سے بڑا دُشمن انسان کا کون ہوسکتا ہے جو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب اور جہنم کی آگ میں مبتلا کر دے۔

اور حضرت عطاء بن ابی رباح کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعی کے بارے میں نازل ہوئی، جن کا واقعہ یہ تھا کہ یہ مدینہ میں موجود تھے، اور جب کسی غزوہ و جہاد کا موقع آتا تو جہاد کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تھے مگر ان کے بیوی بچے فریاد کرنے لگتے کہ ہمیں کس پر چھوڑ کر جاتے ہو، یہ اُن کی فریاد سے متأثر ہو کر رُک جاتے تھے۔ (رُوح، ابنِ کثیر) [۲]

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں ہی آیت کا سببِ نزول ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ کا فرض خواہ ہجرت ہو یا جہاد، جو بیوی اور اولاد فرض کی ادائیگی میں مانع ہوں وہ اس کی دُشمن ہیں۔

وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿١٤﴾ سابقہ آیت میں جن کے بیوی بچوں کو دُشمن قرار دِیا ہے اُن کو جب اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اِرادہ کیا کہ آئندہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ سختی اور تشدّد کا معاملہ کریں گے، اس پر آیت کے اس حصے میں یہ ارشاد نازل ہوا کہ اگرچہ ان بیوی بچوں نے تمہارے لئے دُشمن کا سا کام کیا کہ تمہیں ادائے فرض سے مانع ہوئے، مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ تشدّد اور بے رحمی کا معاملہ نہ کرو، بلکہ عفو و درگزر اور معافی کا برتاؤ کرو، تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ اللہ جل شانہٗ کی عادت بھی مغفرت و رحمت کی ہے۔

گناہگار بیوی بچوں سے بیزاری اور بغض نہیں چاہئے

مسئلہ:- علماء نے اس آیت سے استدلال کیا کہ اہل و عیال سے کوئی کام خلافِ شرع بھی ہو جائے تو اُن سے بیزار ہو جانا اور اُن سے بغض رکھنا، یا اُن کے لئے بددُعا کرنا مناسب نہیں۔ (رُوح) [۳]

اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ فِتۡـنَـہ کے معنی اِبتلا اور اِمتحان کے ہیں، مرادِ آیت کی یہ ہے کہ مال و اولاد کے

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۵۳، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ التغابن، والمستدرك للحاكم، كتاب التفسير، تفسير سورة التغابن، رقم الحديث: ۳۸۱۴

[۲] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۵۳

[۳] تفسیر روح المعانی بحوالۂ بالا

ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کی آزمائش کرتا ہے کہ اُن کی محبت میں مبتلا ہو کر اَحکام و فرائض سے غفلت کرتا ہے، یا محبت کو اپنی حد میں رکھ کر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا۔

مال واولادِ انسان کے لئے بڑا فتنہ ہیں

حقیقت یہ ہے کہ مال واولاد کی محبت انسان کے لئے بڑا فتنہ اور آزمائش ہیں، انسان اکثر گناہوں میں خصوصاً حرام کمائی میں انہی کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز بعض اشخاص کو لایا جائے گا، اُس کو دیکھ کر لوگ کہیں گے: "اَكَلَ عَيَالُهٗ حَسَنَاتِهٖ" یعنی "اُس کی نیکیوں کو اس کے عیال نے کھالیا۔" (روح) [۱] ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے بارے میں فرمایا: "مَبْخَلَةٌ مَّجْبَنَةٌ" یعنی "یہ بخل اور جبن یعنی نامردی اور کمزوری کے اسباب ہیں۔" [۲] کہ ان کی محبت کی وجہ سے آدمی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رُکتا ہے، ان ہی کی محبت کی وجہ سے جہاد میں شرکت سے رہ جاتا ہے۔ بعض سلف صالحین کا قول ہے: "اَلْعَيَالُ سُوْسُ الطَّاعَاتِ" یعنی "عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گُھن ہے۔" جیسا گُھن غلے کو کھا جاتا ہے، یہ اس کی نیکیوں کو کھا جاتے ہیں۔ [۳]

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، یعنی "تقویٰ اِختیار کرو مقدور بھر۔" جب آیت: اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران:۱۰۲) نازل ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ سے ایسا تقویٰ اِختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔" تو صحابۂ کرام پر بہت بھاری اور شاق ہوا، کہ اللہ کے حق کے مطابق تقویٰ کس کے بس میں ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی طاقت اور مقدور سے زیادہ تکلیف نہیں دی، تقویٰ بھی اپنی طاقت کے مطابق واجب ہے، مقصد یہ ہے کہ حصولِ تقویٰ میں اپنی پوری توانائی اور کوشش کرلے تو اس سے اللہ کا حق ادا ہو جائے گا۔ (روح ملخصًا) [۴]

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّغَابُنِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۵۴، وتخریج احادیث الإحیاء للعراقی ج:۲ ص:۹۶۳

[۲] سنن ابن ماجة، ابواب الأدب، باب بر الوالد والإحسان إلى البنات، ج:۲ ص:۲۶۱، ومسند احمد بن حنبل، حدیث یعلی بن مرة الثقفی، رقم الحدیث:۱۷۵۹۸

[۳] تفسیر القرطبی، تحت هٰذه الآیة ج:۱۸ ص:۱۴۳

[۴] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۵۵

سُوْرَةُ الطَّلَاق

اٰيَاتُهَا ۱۲ | ۶۵ سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ ۹۹ | رُكُوْعَاتُهَا ۲

سورۂ طلاق مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ

اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدّت پر اور گنتے رہو عدّت کو،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ

اور ڈرو اللہ سے جو ربّ ہے تمہارا، مت نکالو اُن کو اُن کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں

اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ

مگر جو کریں صریح بے حیائی، اور یہ حدیں ہیں باندھی ہوئی اللہ کی،

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ

اور جو کوئی بڑھے اللہ کی حدوں سے تو اُس نے بُرا کیا اپنا، اُس کو خبر نہیں شاید اللہ

يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ

پیدا کردے اس طلاق کے بعد نئی صورت۔ پھر جب پہنچیں اپنے وعدہ کو تو رکھ لو اُن کو

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ

دُستور کے موافق یا چھوڑ دو اُن کو دُستور کے موافق، اور گواہ کرلو دو معتبر اپنے میں کے،

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

اور سیدھی ادا کرو گواہی اللہ کے واسطے، یہ بات جو ہے اس سے سمجھ جائے گا جو کوئی یقین رکھتا ہوگا اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ڛ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ۙ وَّيَرْزُقْهُ

اور پچھلے دِن پر، اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کردے اس کا گزارہ اور روزی دے اس کو

مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ

جہاں سے اس کو خیال بھی نہ ہو اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اس کو کافی ہے،

اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳ وَالّٰۗـِٔيْ يَىِٕسْنَ

تحقیق اللہ پورا کرلیتا ہے اپنا کام، اللہ نے رکھا ہے ہر چیز کا اندازہ۔ اور جو عورتیں نااُمید ہوگئیں

مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ

حیض سے تمہاری عورتوں میں اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت ہے تین مہینے

وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ

اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آیا، اور جن کے پیٹ میں بچہ ہے اُن کی عدّت یہ کہ جَن لیں پیٹ کا بچہ،

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ

اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے کردے وہ اس کے کام میں آسانی۔ یہ حکم ہے اللہ کا جو اُتارا

اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝۵

تمہاری طرف، اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے اُتار دے اُس پر سے اس کی بُرائیاں اور بڑا دے اُس کو ثواب۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ

اُن کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم آپ رہو اپنے مقدور کے موافق اور ایذا دینا نہ چاہو اُن کو

لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ

تاکہ تنگ پکڑو اُن کو، اور اگر رکھتی ہوں پیٹ میں بچہ تو اُن پر خرچ کرو

حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ

جب تک جنیں پیٹ کا بچہ، پھر اگر وہ دُودھ پلائیں تمہاری خاطر، تو دو اُن کو اُن کا بدلہ،

وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝۶ ۭ

اور سکھاؤ آپس میں نیکی، اور اگر ضد کرو آپس میں تو دُودھ پلائے گی اس کی خاطر اور کوئی عورت،

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ

چاہئے خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق، اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے

مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ

جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے، اللہ کسی پر تکلیف نہیں رکھتا مگر اُسی قدر جو اُس کو دِیا، اب کردے گا اللہ

ع ۱۷

بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ⑦

سختی کے پیچھے کچھ آسانی

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے نبی! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دینے لگو تو اُنہیں اُن کی عدّت کے وقت طلاق دو، اور عدت کو اچھی طرح شمار کرو، اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے۔ اُن عورتوں کو اُن کے گھروں سے نہ نکالو، اور نہ وہ خود نکلیں، اِلّا یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا اِرتکاب کریں۔ اور یہ اللہ کی (مقرّر کی ہوئی) حدود ہیں، اور جو کوئی اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود سے آگے نکلے، اُس نے خود اپنی جان پر ظلم کیا۔ تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کردے۔ ① پھر جب وہ عورتیں اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچنے لگیں تو تم یا تو انہیں بھلے طریقے پر (اپنے نکاح میں) روک رکھو، یا پھر بھلے طریقے سے اُن کو الگ کردو، اور اپنے میں سے دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو عدل والے ہوں۔ اور اللہ کی خاطر سیدھی سیدھی گواہی دو۔ لوگو! یہ وہ بات ہے جس کی نصیحت اُس شخص کو کی جارہی ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر اِیمان رکھتا ہو۔ اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے لئے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا، ② اور اُسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اُسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے، تو اللہ اُس (کا کام بنانے) کے لئے کافی ہے۔ یقین رکھو کہ اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے۔ (البتہ) اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرّر کر رکھا ہے۔ ③ اور تمہاری عورتوں میں سے جو ماہواری آنے سے مایوس ہوچکی ہوں، اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو (یاد رکھو کہ) ان کی عدّت تین مہینے ہے، اور اُن عورتوں کی (عدت) بھی (یہی ہے) جنہیں ابھی ماہواری آئی ہی نہیں۔ اور جو عورتیں حاملہ ہوں، اُن کی (عدت کی) میعاد یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کا بچہ جن لیں۔ اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے کام میں آسانی پیدا کردے گا۔ ④ یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے تم پر اُتارا ہے، اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے گناہوں کو معاف کردے گا، اور اُس کو زبردست ثواب دے گا۔ ⑤ ان عورتوں کو اپنی حیثیت کے مطابق اُسی جگہ رہائش مہیا کرو جہاں تم رہتے ہو، اور اُنہیں تنگ

کرنے کے لئے اُنہیں ستاؤ نہیں، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو اُن کو اُس وقت تک نفقہ دیتے رہو جب تک وہ اپنے پیٹ کا بچہ جن لیں۔ پھر اگر وہ تمہارے لئے بچے کو دُودھ پلائیں تو انہیں ان کی اُجرت ادا کرو، اور (اُجرت مقرر کرنے کے لئے) آپس میں بھلے طریقے سے بات طے کرلیا کرو، اور اگر تم ایک دوسرے کے لئے مشکل پیدا کرو گے تو اُسے کوئی اور عورت دُودھ پلائے گی۔ ⑥ ہر وسعت رکھنے والا اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے۔ اور جس شخص کے لئے اُس کا رِزق تنگ کردیا گیا ہو، تو جو کچھ اللہ نے اُسے دیا ہے، وہ اُسی میں سے نفقہ دے۔ اللہ نے کسی کو جتنا دیا ہے، اُس پر اُس سے زیادہ کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ کوئی مشکل ہو تو اللہ اُس کے بعد کوئی آسانی بھی پیدا کردے گا۔ ⑦

خلاصۂ تفسیر

اے پیغمبر! (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ (ایسی) عورتوں کو طلاق دینے لگو (جن کے ساتھ خلوت ہوچکی ہے کیونکہ عدّت کا حکم ایسی عورتوں سے متعلق ہے، جیسا کہ دُوسری آیت میں ہے: ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ [1] (الاحزاب:۴۹)) تو اُن کو (زمانہ) عدّت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو (اور یہ احادیثِ صحاح سے ثابت ہے کہ اس طہر میں صحبت نہ ہو جس میں طلاق دینا ہے) اور (طلاق دینے کے بعد) تم عدّت کو یاد رکھو (یعنی مرد و عورت سب یاد رکھیں، لیکن خطاب میں تخصیص صیغہ مذکر کی اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں میں غفلت غالب ہوتی ہے تو مردوں کو بھی اس کا اہتمام رکھنا چاہئے، کما فی المدارک [2]) اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا ربّ ہے (یعنی ان ابواب میں جو اس کے اَحکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو۔ مثلاً یہ کہ تین طلاق دفعۃً مت دو اور یہ کہ حالتِ حیض میں طلاق مت دو، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے، اور یہ کہ عدّت میں) ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیونکہ سُکنیٰ یعنی حقِ سکونت مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے) اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں (کیونکہ یہ سُکنیٰ محض شوہر کا حق نہیں ہے جو اس کی رضا سے ساقط ہوجائے بلکہ حق الشرع ہے) مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے (یعنی مثلاً مرتکب بدکاری یا سرقہ کی ہوں تو سزا کے لئے نکالی جائیں، یا بقول بعض علماء زبان درازی اور ہمہ وقت کا تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا جائز ہے) اور یہ سب خدا کے مقرّر کئے ہوئے اَحکام ہیں اور جو شخص اَحکامِ خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً اس عورت کو گھر سے نکال دیا) اس نے اپنے اُوپر ظلم کیا (یعنی گناہگار ہوا، آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں طلاقِ رجعی بہتر ہے، پس ارشاد ہے کہ اے طلاق دینے والے!) تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس

[1] ترجمہ: پھر تم ان کو قبل ہاتھ لگانے کے طلاق دے دو تو تمہاری ان پر کوئی عدت نہیں۔

[2] مدارك التنزيل المعروف بتفسير النسفي تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۴۰

(طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دِل میں) پیدا کردے (مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو طلاقِ رجعی میں اس کا تدارک آسانی سے ہو سکے گا) پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں (جب کہ ان کو طلاقِ رجعی دی ہو بقرینہ فَاَمْسِكُوْهُنَّ) اپنی عدت گزارنے کے قریب پہنچ جائیں (اور عدت ختم نہیں ہوئی) تو (تم کو دو اختیار ہیں، یا تو) ان کو قاعدے کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو (یعنی انقضائے عدّت تک رجعت نہ کرو، مطلب یہ کہ تیسری بات مت کرو کہ رکھنا بھی مقصود نہ ہو مگر تطویلِ عدّت کے ذریعے عورت کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے رجعت کرلو) اور (جو کچھ بھی کرو مرافقت یا مفارقت اُس پر) آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو، (یہ مستحب ہے، كذا في الهداية والنهاية[1]، رجعت میں تو اس لئے کہ بعد انقضائے عدّت کبھی عورت اختلاف نہ کرنے لگے اور مفارقت میں اس لئے کہ کبھی اپنا نفس شرارت نہ کرنے لگے کہ جھوٹا دعویٰ کردے کہ میں رجعت کر چکا تھا) اور (اے گواہو! اگر گواہی کی حاجت پڑے تو) تم ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے (بلا رُو و رعایت) گواہی دو، اس مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور یومِ قیامت پر یقین رکھتا ہو (مطلب یہ کہ ایمان دار ہی نصائح سے منتفع ہوتے ہیں، اور یوں تو نصائح سب کے لئے عام ہیں) اور (اُوپر جو تقویٰ کا حکم ہے اَحکام کے بعد اس کی متعدد فضیلتیں ارشاد فرماتے ہیں، اوّل فضیلت یہ کہ) جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور (منافع عطا فرماتا ہے، چنانچہ ایک بڑی منفعت ہے رزق، سو) اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور (ایک شعبہ اس تقویٰ کا توکل ہے، اس کی یہ خاصیت ہے کہ) جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس (کی اِصلاح مہمات) کے لئے کافی ہے (یعنی اپنی کفایت کا اثر خاص اصلاحِ مہمات میں ظاہر فرماتا ہے ورنہ اس کی کفایت تو تمام عالم کے لئے عام ہے، اور یہ اصلاحِ مہمات بھی عام ہے حسًّا ہو یا باطناً ہو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنا کام (جس طرح چاہتا ہے) پورا کر کے رہتا ہے (اور اسی طرح اصلاحِ مہمات کا وقت بھی اُسی کے اِرادے پر ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک انداز (اپنے علم میں) مقرّر کر رکھا ہے (اور اسی کے موافق اس کو واقع کرنا قرینِ حکمت ہوتا ہے، آگے پھر عود ہے اَحکام کی طرف یعنی اُوپر تو عدّت کا اجمالاً ذِکر تھا) اور (تفصیل اس کی آگے ہے وہ یہ کہ) تمہاری (مطلقہ) بیبیوں میں سے جو عورتیں (بوجہ زیادت عمر کے) حیض آنے سے نا اُمید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کی عدّت کے تعین میں) شبہ ہو (جیسا کہ واقع میں شبہ ہوا تھا اور پوچھا تھا) تو ان کی عدّت تین مہینے ہیں، اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک بوجہ کم عمری کے) حیض نہیں آیا (ان کی عدّت بھی تین مہینے ہیں) اور حاملہ عورتوں کی عدّت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے (خواہ کامل ہو یا ناقص، بشرطیکہ کوئی عضو بن گیا ہو، گو ایک اُنگلی ہی سہی) اور (چونکہ تقویٰ خود بھی مہتم بالشان ہے اور اَحکامِ مذکورہ میں جو کہ متعلق بمعاملاتِ دُنیا ہیں عام طبائع میں خیال ہو سکتا

[1] الهداية، كتاب الطّلاق، باب الرَّجعة، ج:۲ ص:۳۹۵

ہے کہ ان دُنیوی معاملات کو دِین سے کیا تعلق ہم جس طرح چاہیں کرلیں، اس لئے آگے پھر تقویٰ کا مضمون ہے، یعنی) جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کردے گا (آخرت کی یا دُنیا کی، ظاہراً یا باطناً، آگے پھر تاکید امتثالِ اَحکام کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص (ان معاملات میں اور دُوسرے اُمور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دُور کردے گا (جو سب سے بڑی مضرت سے نجات ہے) اور اس کو بڑا اَجر دے گا (جو سب سے بڑی منفعت کا حصول ہے، آگے پھر مطلّقات کے اَحکام کا بیان ہے، یعنی عدّت میں علاوہ عدم تطویلِ عدّت اور حق سُکنیٰ کے ان کے کچھ اور حقوق بھی ہیں وہ یہ کہ) تم ان (مطلّقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو (یعنی عدّت میں سُکنیٰ بھی مطلّقہ کا واجب ہے، البتہ طلاقِ بائن میں ایک مکان میں خلوت کے ساتھ دونوں کا رہنا جائز نہیں، بلکہ پردہ حائل ہونا ضرور ہے) اور ان کو تنگ کرنے کے لئے (سُکنیٰ کے بارے میں) تکلیف مت پہنچاؤ (مثلاً کوئی ایسی بات کرنے لگو جس سے وہ پریشان ہوکر نکل جائیں) اور اگر وہ (مطلّقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو (بخلاف غیر حمل والیوں کے کہ ان کے نفقہ کی حد تین حیض یا تین ماہ ہیں، اور یہ اَحکام تو عدّت کے متعلق تھے) پھر اگر (عدّت کے بعد) وہ (مطلّقہ) عورتیں (جب کہ پہلے سے بچے والیاں ہوں یا بچہ ہی پیدا ہونے سے ان کی عدّت ختم ہوئی ہو) تمہارے لئے (بچے کو اُجرت پر) دُودھ پلادیں تو تم ان کو (مقرّرہ) اُجرت دو اور (اُجرت کے بارے میں) باہم مناسب طور پر مشورہ کرلیا کرو (یعنی نہ تو عورت اس قدر زیادہ مانگے کہ مرد کو دُوسری اَنّا ڈھونڈنی پڑے، اور نہ مرد اس قدر کم دینا چاہے کہ عورت کا کام نہ چل سکے، بلکہ حتی الامکان دونوں اس کا خیال رکھیں کہ ماں ہی دُودھ پلادے کہ بچے کی اس میں زیادہ مصلحت ہے) اور اگر تم باہم کشمکش کروگے تو کوئی دُوسری عورت دُودھ پلادے گی (مقصود اس خبر سے امر ہے یعنی اور کسی اَنّا کو تلاش کرلیا جائے نہ ماں کو مجبور کیا جائے نہ باپ کو، اور صورۃ خبر میں یہ نکتہ ہے کہ مرد کو کم اُجرت تجویز کرنے پر عتاب ہے کہ آخر کوئی اور پلادے گی اور وہ بھی غالباً بہت کم نہ لے گی، پھر یہ کمی ماں ہی کے لئے کیوں تجویز کی جائے اور عورت کو زیادہ اُجرت مانگنے پر عتاب ہے کہ تو نہ پلائیگی اور کوئی میسر ہوجائے گی، کیا دُنیا میں ایک تو ہی ہے جو اس قدر گراں بنتی ہے آگے بچے کے نفقہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ) وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق (بچے پر) خرچ کرنا چاہئے، اور جس کی آمدنی کم ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دِیا ہے اس میں سے خرچ کرے (یعنی امیر آدمی اپنی حیثیت کے موافق خرچ اُٹھائے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے موافق، کیونکہ) خدا تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دِیا ہے (اور تنگ دست آدمی خرچ کرتا ہوا اس سے نہ ڈرے کہ خرچ کرنے سے بالکل ہی کچھ نہ رہے گا، جیسا بعض آدمی اس خوف سے اولاد کو قتل کرڈالتے ہیں، پس ارشاد ہے کہ) خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دے دے گا (گو بقدرِ ضرورت وحاجت

روائی سہی، وھذا کقولہٖ تعالی: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ [1] (بنی اسرائیل: ۳۱))۔

معارف ومسائل

نکاح وطلاق کی شرعی حیثیت اور ان کا حکیمانہ نظام

معارف القرآن جلد اوّل صفحہ: ۵ ۶۳ میں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اسی عنوانِ مذکور کے تحت میں پوری تفصیل لکھی جا چکی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نکاح وطلاق کا معاملہ ہر مذہب وملت میں عام معاملاتِ بیع وشراء اور اِجارہ کی طرح نہیں کہ طرفین کی رضامندی سے جس طرح چاہیں کرلیں، بلکہ ہر مذہب وملت کے لوگ ہمیشہ سے اس پر متفق ہیں کہ ان معاملات کو ایک خاص مذہبی تقدس حاصل ہے، اُسی کی ہدایات کے تحت یہ کام سرانجام پانے چاہئیں۔ اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ تو بہرحال ایک آسمانی دِین اور آسمانی کتاب سے نسبت رکھتے ہیں، اُن میں سیکڑوں تحریفات کے باوجود اتنی قدرت مشترک اب بھی باقی ہے کہ ان معاملات میں کچھ مذہبی حدود وقیود کے پابند ہیں۔ کفار ومشرکین جو کوئی آسمانی کتاب اور مذہب نہیں رکھتے، مگر کسی نہ کسی صورت میں خدا تعالیٰ کے قائل ہیں، جیسے ہندو، آریہ، سکھ، مجوس، آتش پرست، نجوم پرست لوگ وہ بھی نکاح وطلاق کے معاملات کو عام معاملاتِ بیع وشراء یا اِجارہ کی طرح نہیں سمجھتے، اُن کے یہاں بھی کچھ مذہبی رُسوم ہیں جن کی پابندی ان معاملات میں لازم سمجھتے ہیں، اور انہیں اُصول ورُسوم پر تمام مذاہب وفرق کے عائلی قوانین چلتے ہیں۔

صرف دہریہ اور لامذہب منکرِ خدا لوگوں کا ایک فرقہ ہے جو خدا ومذہب ہی سے بیزار ہے، وہ ان چیزوں کو بھی اِجارہ کی طرح باہمی رضامندی سے طے ہوجانے والا ایک معاملہ قرار دیتے ہیں، جس کا مقصد اپنے شہوانی جذبات کی تسکین سے آگے کچھ نہیں۔ افسوس ہے کہ آج کل دُنیا میں یہی نظریہ عام ہوتا جاتا ہے جس نے انسانوں کو جنگل کے جانوروں کی صف میں کھڑا کردیا ہے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِلَيْهِ الْمُشْتَكٰى۔

شریعتِ اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ نظامِ حیات کا نام ہے، اس میں نکاح کو صرف ایک معاملہ اور معاہدہ نہیں بلکہ ایک گونہ عبادت کی حیثیت بخشی ہے، جس میں خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں رکھے ہوئے شہوانی جذبات کی تسکین کا بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے اور مرد وعورت کے اِزدواجی تعلقات سے جو عمرانی مسائل بقائے نسل اور تربیتِ اولاد کے متعلق ہیں، ان کا بھی معتدلانہ اور حکیمانہ بہترین نظام موجود ہے۔

[1] ترجمہ: اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل مت کرو ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔

اور چونکہ معاملۂ ازدواج کی دُرستی پر عام نسلِ انسانی کی دُرستی موقوف ہے، اس لئے قرآنِ کریم میں ان عائلی مسائل کو تمام دُوسرے معاملات سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآنِ کریم کو بغور پڑھنے والا یہ عجیب مشاہدہ کرے گا کہ دُنیا کے عام معاشی مسائل میں سب سے اہم تجارت شرکت، اِجارہ وغیرہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کے تو صرف اُصول بتلانے پر اِکتفا فرمایا ہے، ان کے فروعی مسائل قرآن میں شاذ و نادر ہیں، بخلاف نکاح و طلاق کے کہ ان میں صرف اُصول بتلانے پر اِکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے بیشتر فروع اور جزئیات کو بھی براہِ راست حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں نازل فرمایا ہے۔

یہ مسائل قرآن کی اکثر سورتوں میں متفرق اور سورۂ نساء میں کچھ زیادہ تفصیل سے آئے ہیں۔ یہ سورت جو سورۂ طلاق کے نام سے موسوم ہے، اس میں خصوصیت سے طلاق اور عدّت وغیرہ کے اَحکام کا ذِکر ہے، اسی لئے بعض روایاتِ حدیث میں اس کو سورۂ نساءِ صغریٰ بھی کہا گیا ہے، یعنی چھوٹی سورۂ نساء۔ (قرطبی بحوالہ بخاری) [1]

اسلامی اُصول کا رُخ یہ ہے کہ جن مرد و عورت میں اسلامی اُصول کے مطابق اِزدواجی تعلق قائم ہو وہ پائیدار اور عمر بھر کا رِشتہ ہو، جس سے ان دونوں کا دُنیا و دِین بھی دُرست ہو اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کے اعمال و اخلاق بھی دُرست ہوں۔ اسی لئے نکاح کے معاملے میں شروع سے آخر تک ہر قدم پر اِسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ اس تعلق کو تلخیوں اور رنجشوں سے پاک صاف رکھنے کی اور اگر کبھی پیدا ہوجائے تو ان کے اِزالے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بعض اوقات طرفین کی زندگی کی فلاح اسی میں منحصر ہوجاتی ہے کہ یہ تعلق ختم کردیا جائے۔ جن مذاہب میں طلاق کا اُصول نہیں ہے، ان میں ایسے اوقات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور بعض اوقات انتہائی بُرے نتائج سامنے آتے ہیں، اس لئے اسلام نے قوانینِ نکاح کی طرح طلاق کے بھی اُصول و قواعد مقرّر فرمائے، مگر ساتھ ہی یہ ہدایات بھی دے دیں کہ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض و مکروہ کام ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ حدیث میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ [2] اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا فَإِنَّ الطَّلَاقَ يَهْتَزُّ مِنْهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ'' [3] یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ طلاق سے عرشِ رحمٰن ہل جاتا ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو طلاق نہ دو بغیر کسی بدکاری کے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان مردوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے والے ہیں،

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب سورة الطَّلاق، ج:۲ ص:۷۲۹

[2] سنن ابی داود، کتاب الطَّلاق، باب فی کراهیة الطَّلاق ج:۱ ص:۲۹۶

[3] کنز العمال، رقم الحدیث: ۲۷۸۷۴

اور اُن عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے والی ہیں۔ (قرطبی، بروایت ثعلبی) [۱] اور دار قطنی نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے زمین پر جو کچھ پیدا فرمایا ہے، اُن سب میں اللہ کے نزدیک محبوب غلاموں کو آزاد کرنا ہے، اور جتنی چیزیں زمین پر پیدا کی ہیں، اُن سب میں مبغوض و مکروہ طلاق ہے۔(از قرطبی) [۲]

بہر حال اسلام نے اگرچہ طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی، بلکہ تا بہ مقدور اُس سے روکا ہے، لیکن بعض ضرورت کے مواقع میں اجازت دی تو اُس کے لئے کچھ اُصول وقواعد بنا کر اِجازت دی، جن کا حاصل یہ ہے کہ اس رشتۂ اِزدواج کو ختم ہی کرنا ضروری ہو جائے تو وہ بھی خوبصورتی اور حسنِ معاملہ کے ساتھ انجام پائے محض غصہ نکالنے اور اِنتقامی جذبات کا کھیل بنانے کی صورت نہ بننے پائے۔ اس سورت میں اَحکامِ طلاق کو اس طرح شروع کیا گیا کہ اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ" کے عنوان سے خطاب کیا گیا، جو اِمام قرطبی کے بیان کے مطابق ان مواقع میں استعمال ہوتا ہے جہاں حکم تمام اُمت کے لئے عام ہو، اور جس جگہ کوئی حکم رسول کی ذات سے متعلق ہوتا ہے تو وہاں "یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ" سے خطاب کیا جاتا ہے۔

اس جملے "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ" کا تقاضا یہ تھا کہ آگے بھی بصیغہ مفرد اَحکام کا بیان ہوتا، مگر یہاں اس کے خلاف بصیغۂ جمع خطاب فرمایا: اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ یعنی اے نبی! آپ مسلمانوں کو بتلادیں کہ جب وہ طلاق دیا کریں تو آگے بیان کئے ہوئے قانون کی پابندی کریں۔ اُوپر خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آگے بعض اَحکامِ طلاق کا بیان ہے۔

پہلا حکم:- فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ، **عدّت** کے لفظی معنی عدد شمار کرنے کے ہیں، شرعی اِصطلاح میں اُس مدّت کو کہا جاتا ہے جس میں عورت ایک شوہر کے نکاح سے نکلنے کے بعد دُوسرے نکاح سے ممنوع ہوتی ہے، اس مدّت انتظار کو عدّت کہا جاتا ہے، اور کسی شوہر کے نکاح سے نکلنے کی صورتیں دو ہوتی ہیں، ایک یہ کہ شوہر کا انتقال ہو جائے، اس کی عدّت کو عدّتِ وفات کہا جاتا ہے جو غیر حاملہ کے لئے چار ماہ دس دن مقرّر ہے۔ دُوسری صورت نکاح سے نکلنے کی طلاق ہے، عدّتِ طلاق غیر حاملہ عورت کے لئے اِمامِ اعظم ابوحنیفہ اور بعض دُوسرے اَئمہ کے نزدیک تین حیض پورے ہیں، اور اِمام شافعی اور بعض دُوسرے اَئمہ کے نزدیک تین طہر عدّتِ طلاق ہے۔ بہر حال اُس کے لئے کچھ ایام یا مہینے مقرّر نہیں، جتنے مہینوں میں تین حیض یا تین طہر پورے ہو جائیں وہ ہی عدّتِ طلاق ہوگی۔ اور جن عورتوں کو ابھی کم عمری کی وجہ سے حیض نہیں آیا، یا زیادہ عمر ہو جانے کے سبب حیض منقطع ہو چکا ہے اُن کا حکم آگے مستقلاً آرہا ہے، اور اسی طرح حمل والی عورتوں کا حکم بھی آگے

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۵۰، ومسند البزار، رقم الحدیث:۳۰۶۶، والمعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث:۱۵۷۱

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۱۵۰، وسنن الدارقطنی، رقم الحدیث:۳۹۸۴

آ رہا ہے، اس میں عدّتِ وفات اور عدّتِ طلاق دونوں یکساں ہیں۔ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "فَطَلِّقُوْهُنَّ لِقِبَلِ عِدَّتِهِنَّ" تلاوت فرمایا، [1] اور حضرت ابنِ عمر اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت میں بھی ایک روایت میں "لِقِبَلِ عِدَّتِهِنَّ" اور دُوسری ایک روایت میں "فِیْ قُبُلِ عِدَّتِهِنَّ" منقول ہے۔ (روح) [2]

اور صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی عورت کو بحالتِ حیض طلاق دے دی تھی، حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اس کا ذِکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ سخت ناراض ہوئے، پھر فرمایا:-

لِیُرَاجِعْهَا ثُمَّ یُمْسِكْهَا حَتّٰی تَطْهُرَ ثُمَّ تَحِیْضَ فَتَطْهُرَ فَإِنْ بَدَا لَهٗ فَلْیُطَلِّقْهَا طَاهِرًا قَبْلَ اَنْ یَمَسَّهَا فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِیْ اَمَرَهَا اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْ یُّطَلِّقَ بِهَا النِّسَاءُ۔ (بخاری ومسلم، ازمظہری) [3]

ان کو چاہئے کہ بحالتِ حیض دی ہوئی طلاق سے رُجوع کرلیں، پھر اپنی زوجیت میں رکھیں یہاں تک کہ حیض سے طہارت ہوجائے، اور پھر اس کے بعد حیض آئے، اُس حیض سے طہارت ہوجائے اُس وقت اگر طلاق دینا ہی ہے تو اس طہر میں مباشرت وصحبت کئے بغیر طلاق دے دیں، یہی وہ عدّت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آیت (مذکورہ) میں حکم دیا ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے۔ دُوسرے یہ کہ اگر کسی نے ایسا کرلیا تو اس طلاق سے رجعت کرلینا واجب ہے (بشرطیکہ طلاق قابلِ رجعت ہو، جیسا کہ ابنِ عمرؓ کے واقعے میں تھی)۔ تیسرے یہ کہ جس طہر میں طلاق دینا ہے اس میں عورت سے مباشرت وصحبت نہ ہو۔ چوتھے یہ کہ آیتِ قرآن: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کی یہی تفسیر ہے۔

آیتِ مذکورہ کی دونوں قراءتوں سے، پھر ایک روایتِ حدیث سے آیتِ مذکورہ کا یہ مفہوم متعین ہوگیا کہ جب کسی عورت کو طلاق دینا ہو تو عدّت شروع ہونے سے قبل طلاق دی جائے۔ اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک چونکہ عدّت حیض سے شروع ہوتی ہے تو معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ جس طہر میں طلاق دینے کا ارادہ ہو اس میں عورت سے مباشرت نہ کرے، اور آخر طہر میں حیض شروع ہونے سے پہلے طلاق دے دے۔ اور اِمام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک چونکہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الطّلاق، باب تحریم طلاق الحائض ...إلخ، (بإختلاف یسیر) ج:۱ ص:۴۷۵

[2] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۵۹

[3] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۱۸، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الطّلاق، ج:۲ ص:۷۲۹، وصحیح مسلم، کتاب الطّلاق، باب تحریم طلاق الحائض ...إلخ، ج:۱ ص:۴۷۵

عدّت طہر ہی سے شروع ہوتی ہے اس لئے ''لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ'' کا مفہوم یہ قرار دیا کہ بالکل شروع طہر میں طلاق دے دی جائے۔ اور یہ بحث کہ عدّت تین حیض ہیں یا تین طہر اس کا بیان سورۂ بقرہ کی آیت ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرۃ:٢٢٨) کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

بہرحال طلاق کے متعلق پہلا حکم اس آیت سے باجماعِ اُمت یہ ثابت ہوا کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا بھی حرام ہے اور ایسے طہر میں جس میں عورت کے ساتھ مباشرت وصحبت کرلی ہو اس میں بھی طلاق دینا حرام ہے، اور وجہ حرمت کی دونوں میں یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں عورت کی عدّت طویل ہوجائے گی، جو اُس کے لئے باعثِ تکلیف ہے، کیونکہ جس حیض میں طلاق دی یہ حیض تو عدّت میں شمار نہیں ہوگا، بلکہ حیض کے ایام پورے ہوں اور مذہبِ ابوحنیفہ کے مطابق اس کے بعد کا طہر بھی خالی گزرے، پھر جب دُوسرا حیض آئے تو اس وقت عدّت شروع ہوگی، جس میں بڑی تطویل ہے۔ اور مذہبِ شافعی کے مطابق بھی کم ازکم حیض کے بقیہ ایام جو عدّت سے پہلے گزریں گے وہ زیادہ ہوجائیں گے۔ طلاق کا یہ پہلا حکم ہی اس اہم ہدایت پر مشتمل ہے کہ طلاق کوئی غصہ نکالنے یا انتقام لینے کی چیز نہیں، بلکہ بدرجۂ مجبوری طرفین کی راحت کا انتظام ہے، اس لئے طلاق دینے کے وقت ہی سے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عورت کو طولِ عدّت کی بلاوجہ تکلیف نہ پہنچے۔ اور یہ حکم صرف ان عورتوں کے لئے ہے جن پر عدّت گزارنا حیض یا طہر سے لازم ہے، اور جن عورتوں پر عدّت واجب ہی نہیں، مثلاً وہ عورت جس سے خلوت ہی ابھی تک نہیں ہوئی اُس پر سرے سے عدّت ہی لازم نہیں، اس کو حالتِ حیض میں بھی طلاق دے دی جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح وہ عورت جس کو کم عمری یا زیادتی عمر کے سبب حیض نہیں آتا، اس لئے اُس کی عدّت میں حیض وطہر کا کوئی اعتبار ہی نہیں، بلکہ ان کی عدّت مہینوں کے حساب سے تین ماہ ہے، ان کو کسی بھی حالت میں طلاق دے دی جائے یا صحبت ومباشرت کے بعد طلاق دے دی جائے، سب جائز ہے، جیسا کہ آئندہ آیات میں آرہا ہے۔ (ازمظہری مع بعض تشریحات) [1]

دُوسرا حکم:- وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ احصاء کے معنی شمار کرنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ عدّت کے ایام کو اہتمام کے ساتھ یاد رکھنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ بھول میں پڑکر اختتامِ عدّت سے پہلے ہی ختم سمجھ لے۔ اور یہ ذمہ داری ایامِ عدّت کو محفوظ رکھنے کی مرد وعورت دونوں پر عائد ہے، مگر یہاں صیغۂ مذکر استعمال کیا گیا کیونکہ عام طور پر جو احکام مرد وعورت میں مشترک ہیں، ان میں عموماً خطاب بصیغۂ مذکر ہی آتا ہے، عورتیں تبعاً اس میں داخل سمجھی جاتی ہیں، اور اس خاص مسئلے میں وہ حکمت بھی ہوسکتی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھی گئی ہے کہ عورتوں میں غفلت کا احتمال زیادہ ہے اس لئے براہِ راست ذمہ داری مردوں پر ڈال دی گئی۔

---

[1] تفسیر المظهری ج: ٩ ص: ٣١٨

تیسرا حکم:- لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (نہ نکالو ان کو ان کے گھروں سے) اس میں لفظ ''بُيُوْتِهِنَّ'' میں (مکانات) کو ان عورتوں کے بیوت فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ جب تک ان کا حق سُکنیٰ (سکونت) مرد کے ذمہ ہے اس گھر میں اس کا حق ہے، اس میں سکونت کو بحال رکھنا کوئی احسان نہیں بلکہ ادائے واجب ہے، بیوی کے حقوق میں سے ایک حق سُکنیٰ بھی ہے، اس آیت نے بتلا دیا کہ یہ حق صرف طلاق دے دینے سے ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایامِ عدت تک عورت کو اسی جگہ رہنے کا اِستحقاق ہے، اور ان کا گھر سے نکال دینا قبل اِتمام عدّت کے ظلم و حرام ہے، اسی طرح خود اُن کے لئے باختیارِ خود ان گھروں سے نکل جانا بھی حرام ہے، اگرچہ شوہر بھی اس کی اجازت دے دے کیونکہ ایامِ عدّت اسی مکان میں گزارنا شوہر ہی کا حق نہیں، بلکہ حق اللہ بھی ہے جو من جانب اللہ معتدّہ پر لازم ہے۔ (هٰذا هو مذهب الحنفية) [1]

چوتھا حکم:- اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ یعنی معتدّہ عورتوں کو اُن کے گھروں سے نکالنا حرام ہے، مگر اس میں سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ عورت کسی کھلی بے حیائی میں مبتلا ہو جائے، اس کھلی بے حیائی سے کیا مراد ہے اس میں ائمہ تفسیر کے تین قول منقول ہیں:

اوّل:- یہ کہ بے حیائی سے مراد خود یہی گھر سے نکل جانا ہے تو اس صورت میں یہ اِستثناء صرف صورۃً اِستثناء ہے، جس سے خروج من البیت کی اجازت دینا مقصود نہیں، بلکہ اس کی ممانعت کو اور زیادہ مؤکد کرنا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں کام کسی کو نہیں کرنا چاہئے بجز اس کے کہ وہ آدمیت ہی سے نکل جائے، یا کہ اپنی ماں کو گالی نہ دو، بجز اس کے کہ تم ماں کے بالکل ہی نافرمان ہو جاؤ۔ تو یہ ظاہر ہے کہ پہلی مثال میں اس صورتِ اِستثناء سے اس فعل کا جواز بتلانا منظور نہیں، اور دُوسری مثال میں ماں کی نافرمانی کا جواز ثابت کرنا نہیں، بلکہ بلیغ انداز میں اس کی اور بھی زیادہ ممانعت وشناعت کا بیان ہے، تو خلاصہ مضمونِ آیت اس صورت میں یہ ہوا کہ مطلقہ عورتیں اپنے شوہروں کے گھروں سے نہ نکلیں مگر یہ کہ وہ بے حیائی ہی پر اُتر آئیں اور نکل بھاگیں، تو اس کا مطلب نکل بھاگنے کا جواز نہیں بلکہ اور زیادہ مذمت اور ممانعت کا اِثبات ہے۔ فَاحِشَةٌ مُّبَيِّنَةٌ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سدی، ابن السائب، نخعی وغیرہ سے منقول ہے، اور امامِ اعظم ابوحنیفہ نے اسی کو اِختیار فرمایا ہے۔ (رُوح المعانی) [2]

دُوسرا قول:- یہ ہے کہ فَاحِشَةٌ مُّبَيِّنَةٌ سے مراد زِنا اور بدکاری ہے، اس صورت میں اِستثناء اپنے معنی میں ہے کہ اگر مطلقہ عورت نے زِنا کیا اور جرم اُس پر ثابت ہو گیا تو اس کو حدِ شرعی جاری کرنے کے لئے لامحالہ بیتِ عدّت سے نکالا جائے گا۔ یہ تفسیر حضرت قتادہ، حسن بصری، شعبی، زید بن اسلم اور ضحاک وعکرمہ وغیرہ رحمہم اللہ سے منقول ہے، امام

[1] الهداية، كتاب الطّلاق، باب العدّة، ج:۲ ص:۴۲۲ و ۴۲۳

[2] تفسير روح المعاني ج:۲۱ ص:۲۴

ابو یوسف نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

تیسرا قول:- یہ ہے کہ فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ سے مراد زبان درازی اور لڑائی جھگڑا ہے، تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نکالنا جائز نہیں، بجز اس صورت کے کہ عورت بدزبان جھگڑالو ہو، اپنے شوہر اور اس کے متعلقین سے بدزبانی کے ساتھ پیش آئے، تو ایسی صورت میں اس کو مکانِ عدّت سے نکالا جا سکتا ہے۔ فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بروایت متعدّدہ منقول ہے، اور آیت مذکور میں حضرت اُبی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود کی قراءت اس طرح ہے: ''إِلَّآ أَنْ يُفْحِشَ ''اس لفظ کے ظاہری معنی فحش کلام اور بدزبانی کے ہیں، اس قراءت سے بھی آخری تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ (رُوح) [1] اس صورت میں بھی اِستثناء اپنی حقیقت پر رہے گا کہ بدزبانی اور جھگڑا کرنے کی صورت میں مطلقہ کو مکانِ عدّت سے نکالا جا سکتا ہے۔

یہاں تک طلاق کے متعلق چار اَحکام کا بیان آیا ہے۔ اور آگے مزید اَحکام بیان ہوں گے، مگر ان کے درمیان میں اَحکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید اور اُس کی مخالفت سے بچنے کے لئے چند وعظ و نصیحت کے جملے بیان ہوتے ہیں، یہ قرآنِ حکیم کا خاص اُسلوب ہے کہ ہر حکم کے بعد خدا تعالیٰ کے خوف اور آخرت کی فکر یاد دِلا کر اس کی خلاف ورزی کو روکا گیا ہے، کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ اور باہمی حقوق کی پوری ادائیگی کا انتظام کسی قانون کے ذریعے نہیں ہو سکتا، اس کے لئے خوفِ خدا و آخرت ہی روکنے والی چیز ہے۔

وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا ① ''حُدُودُ اللَّهِ'' سے مراد شریعت کے مقرّر کردہ قوانین ہیں۔ ''وَمَن يَتَعَدَّ'' یعنی جو شخص حدود اللہ میں تعدّی کرے یعنی ان حدود و اَحکام کی خلاف ورزی کرے ''فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ'' تو اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا، یعنی اللہ کا یا شریعتِ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ اور یہ نقصان عام ہے، دینی بھی اور دُنیاوی بھی، دِینی نقصان تو اس میں خلافِ شرع کرنے کا گناہ اور اس کا وبالِ آخرت ہے، اور دُنیوی نقصان یہ ہے کہ جو شخص شرعی ہدایات کے بغیر طلاق دے بیٹھتا ہے، وہ اکثر تین طلاقوں تک پہنچ جاتا ہے، جس کے بعد آپس میں رُجوع یا نکاحِ جدید بھی نہیں ہو سکتا، اور آدمی اکثر طلاق دینے کے بعد پچتاتا ہے اور مصیبت جھیلتا ہے، خصوصاً جب کہ صاحبِ اولاد بھی ہو، اس لئے یہ مصیبت دُنیا ہی میں اپنی جان پر پڑی اور بہت سے لوگ جو بیوی کو تکلیف دینے اور نقصان پہنچانے کی نیت سے ظالمانہ طلاق دیتے ہیں گو اس کی تکلیف عورت کو بھی کچھ پہنچ جائے لیکن اس کے لئے ظلم پر ظلم اور دُہرا وبال ہو جائے گا ایک اللہ کی مقرّر کردہ حدود کو توڑنے کا دُوسرے عورت پر ظلم کرنے کا، جس کی حقیقت یہ ہے کہ ۔

---

[1] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۶۵

پنداشت ستمگر جفا برما کرد بر گردن وے بماند و برما بگذشت [1]

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ یعنی تم نہیں جانتے شاید اللہ تعالیٰ اس غیظ وغضب کے بعد کوئی دُوسری حالت پیدا فرمادیں کہ بیوی سے جو راحتیں ملتی تھیں اور اولاد کی پرورش اور گھر کے اِنتظام کی سہولتیں تھیں، اُن کا خیال کرکے تم پھر اپنی طلاق پر پچھتاؤ اور دوبارہ اس کو نکاح میں رکھنے کا اِرادہ کرو تو دوبارہ نکاح میں رہنے کی صورت جب ہی ہوسکتی ہے جب کہ تم طلاق کے وقت حدودِ شرعیہ کی رعایت کرو کہ بلاوجہ طلاق کو بائن نہ کرو، بلکہ رجعی رہنے دو، جس میں رجعت کرنے کا شوہر کو اِختیار ہوتا ہے، رجعت کرلینے سے پہلا نکاح بدستور قائم رہ جاتا ہے، اور یہ کہ تین طلاق تک نوبت نہ پہنچادو، جس کے بعد رجعت کا حق نہیں رہتا، اور دونوں کی رضامندی کے باوجود آپس میں دوبارہ نکاح بھی شرعاً حلال نہیں ہوتا۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، اَجَلَهُنَّ میں لفظ اَجَلْ بمعنی عدّت ہے اور بلوغِ اَجل سے مراد عدّت کا اِختتام کے قریب ہونا ہے۔

طلاق کے متعلق **پانچواں حکم:-** اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ جب مطلقہ بیوی کی عدّت ختم کے قریب پہنچے تو اَب نکاح سے نکل جانے کا وقت آگیا، اس وقت تک وقتی تأثرات اور غم وغصّے کی کیفیت بھی ختم ہوجانی چاہئے، اس وقت پھر سنجیدگی کے ساتھ غور کرلو کہ نکاح رکھنا بہتر ہے یا اس کا بالکل منقطع کردینا اگر نکاح میں رکھنے کی رائے ہوجائے تو اس کو روک لو، جس کی مسنون صورت اگلی آیت کے اشارے اور حدیث کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ زبان سے کہہ دو کہ میں نے اپنی طلاق سے رُجوع کرلیا، اور اس پر دو گواہ بھی بنالو۔

اور اگر اَب بھی یہی رائے قائم ہو کہ نکاح ختم کرنا ہے تو پھر اس کو خوب صورتی کے ساتھ آزاد کردو۔ یعنی عدّت ختم ہوجانے دو، عدّت پوری ہوتے ہی وہ آزاد وخودمختار ہوجائے گی۔

چھٹا حکم:- اِختتامِ عدّت کے وقت بیوی کو روکنا اور نکاح میں رکھنا طے ہو، یا آزاد کردینا، دونوں میں قرآنِ کریم نے "بِمَعْرُوْفٍ" کی قید لگادی ہے۔ معروف کے لفظی معنی پہچانا ہوا طریقہ، اور مراد اس سے یہ ہے کہ جو طریقہ شریعت وسنت سے ثابت اور اِسلام اور مسلمانوں میں عام طور پر معروف ہے وہ اختیار کرو، وہ یہ ہے کہ اگر نکاح میں رکھنا اور رجعت کرنا طے کرو تو آگے اس کو زبانی یا عملی ایذا نہ پہنچاؤ، اور اُس پر احسان نہ جتلاؤ، اور اس کی جو عملی یا اخلاقی کمزوری طلاق کا سبب بن رہی تھی آگے خود بھی اُس پر صبر کرنے کا عزم کرلو تاکہ پھر وہ تلخی پیدا نہ ہو، اور اگر آزاد کرنا طے ہو تو اس میں معروف ومسنون طریقہ یہ ہے کہ اس کو ذلیل وخوار کرکے یا بُرا بھلا کہہ کر گھر سے نہ نکالو، بلکہ حسنِ اخلاق کے ساتھ رُخصت کرو۔ اور

[1] ترجمہ: ظالم نے سمجھا کہ اس نے مجھ پر ظلم کیا (حالانکہ ظلم) اس کی گردن میں رہ گیا اور ہم پر گزر گیا۔

جیسا کہ قرآنِ کریم کی دُوسری آیات سے ثابت ہے، چلتے وقت اس کو کوئی جوڑا کپڑے کا دے کر رُخصت کرنا کم از کم مستحب ضرور ہے، بعض صورتوں میں واجب بھی ہے، جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے۔

ساتواں حکم:- آیتِ مذکورہ میں روکنے یا آزاد کرنے کے دو اختیار دینے سے، نیز اس سے پہلی آیت میں لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ① سے ضمنی طور پر یہ مستفاد ہوا کہ منشائے ربانی یہ ہے کہ طلاق دینے کی مجبوری ہی پیش آجائے تو طلاق ایسی دی جائے جس میں رجعت کرنے کا حق باقی رہے، جس کی مسنون صورت یہ ہے کہ صاف لفظوں میں صرف ایک طلاق دے دے اور اُس کے ساتھ اظہارِ غیظ وغضب کے لئے ایسا کوئی لفظ نہ بولے جو رِشتۂ نکاح کو بالکلیہ منقطع کر دینے پر دلالت کرتا ہو، مثلاً کہہ دے کہ "میرے گھر سے نکل جاؤ" یا کہہ دے: "تمہیں بہت سخت طلاق دیتا ہوں" یا کہہ دے کہ: "اب میرا تم سے کوئی تعلق نکاح کا باقی نہیں" ایسے الفاظ اگر طلاقِ صریح کے ساتھ بھی کہہ دیئے جائیں یا خود یہی الفاظ بہ نیت طلاق کہہ دیئے جائیں تو اس سے رجعت کا حق باطل ہو جاتا ہے، یہ اِصطلاحِ شرع میں طلاقِ بائن ہو جاتی ہے، جس سے نکاح فوراً ٹوٹ جاتا ہے اور رجعت کا حق باقی نہیں رہتا۔ اور اس سے زیادہ اشد یہ ہے کہ طلاق کو تین کے عدد تک پہنچا دے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شوہر کا صرف حقِ رجعت ہی سلب نہیں ہو جائے گا بلکہ آئندہ اگر مرد وعورت دونوں راضی ہو کر باہم نکاح بھی کرنا چاہیں تو نکاحِ جدید بھی نہ ہو سکے گا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیات میں ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ [۱] (البقرۃ: ۲۳۰)

تین طلاق بیک وقت دینا حرام ہے، مگر کسی نے ایسا کیا تو تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی، اس پر اُمت کا اِجماع ہے

آج کل دِین سے بے پروائی، اس کے اَحکام سے غفلت بُری طرح عام ہوتی جاتی ہے، جاہلوں کا تو کہنا کیا ہے لکھے پڑھے عرائض نویس بھی تین طلاق سے کم کو گویا طلاق ہی نہیں سمجھتے، اور رات دِن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ تین طلاقیں دینے والے بعد میں پچھتاتے ہیں اور اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح بیوی ہاتھ سے نہ جائے۔ حدیثِ صحیح میں تین طلاق بیک وقت دینے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت غضب ناک ہونا امام نسائی نے بروایت محمود بن لبیدؓ نقل کیا ہے [۲]، اسی لئے بیک وقت تین طلاق دینا باجماعِ اُمت حرام وناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص تین طہر میں الگ الگ تین طلاقوں تک پہنچ جائے تو اس کے ناپسندیدہ ہونے پر بھی اُمت کا اِجماع اور خود قرآن کی آیات کے اشارے سے ثابت ہے، صرف

---

[۱] ترجمہ: پھر اگر کوئی طلاق دے دے عورت کو تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی اس کے بعد یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ نکاح کرے۔

[۲] سنن النسائي، كتاب الطّلاق، باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ، ج:۲ ص:۹۹

اس میں اختلاف ہے کہ یہ صورت بھی حرام وناجائز اور طلاق بدعی میں داخل ہے یا ایسا نہیں، امام مالکؒ کے نزدیک حرام ہے، امام اعظم ابوحنیفہ وشافعی حرام تو نہیں کہتے، یعنی اس صورت کو طلاقِ بدعی میں شمار نہیں کرتے، بلکہ طلاقِ سنت میں داخل سمجھتے ہیں، مگر ناپسندیدہ فعل ان کے نزدیک بھی ہے، تفصیل اس کی سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اوّل صفحہ: ۵۶۳۸ میں مذکور ہے۔

مگر جس طرح تین طلاق بیک وقت دینے کے حرام ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے، اسی طرح اس پر بھی اِجماع ہے کہ حرام ہونے کے باوجود کوئی شخص ایسا کر گزرے تو تینوں طلاق واقع ہو کر آئندہ آپس میں نکاحِ جدید بھی حلال نہیں ہوگا۔ پوری اُمت میں کچھ اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع کے سوا تمام مذاہبِ اَربعہ اس پر متفق ہیں کہ تین طلاق بیک وقت بھی دے دی گئیں تو تینوں واقع ہو جائیں گی، کیونکہ کسی فعل کے حرام ہونے سے اُس کے آثار کا وقوع متاثر نہیں ہوا کرتا، جیسے کوئی کسی کو بے گناہ قتل کر دے تو یہ فعل حرام ہونے کے باوجود مقتول تو بہرحال مر ہی جائے گا۔ اسی طرح تین طلاق بیک وقت حرام ہونے کے باوجود تینوں کا وقوع لازمی اَمر ہے۔ اور صرف مذاہبِ اَربعہ کا ہی نہیں بلکہ اس پر صحابۂ کرام کا بھی اِجماع حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں منقول ومعروف ہے، اس کا بھی مکمل بیان معارف القرآن جلد اوّل، صفحہ: ۶۴۱ تا ۶۴۸ میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۚ یعنی گواہ بنالو اپنے مسلمانوں میں سے دو معتبر آدمیوں کو، اور قائم کرو شہادت کو ٹھیک ٹھیک۔

آٹھواں حکم:- اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اختتامِ عدّت کے وقت خواہ رجعت کر کے بیوی کو روکنا طے کیا جائے یا عدّت پوری کر کے آزاد کرنا طے کیا جائے، دونوں صورتوں میں اپنے اس فعل رجعت یا ترکِ رجعت پر دو معتبر گواہ بنالو۔ یہ حکم اکثر ائمہ کے نزدیک استحبابی ہے، رجعت اس پر موقوف نہیں۔ اور گواہ بنانے کی حکمت رجعت کرنے کی صورت میں تو یہ ہے کہ کہیں کل کو عورت رجعت سے انکار کر کے اس کے نکاح سے نکل جانے کا دعویٰ نہ کرنے لگے، اور ترکِ رجعت اور انقطاعِ نکاح کی صورت میں اس لئے کہ کل کو خود اپنا نفس ہی کہیں شرارت یا بیوی کی محبت سے مغلوب ہو کر یہ دعویٰ نہ کرنے لگے کہ عدّت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔ ان دو گواہوں کے لئے "ذَوَیْ عَدْلٍ" فرما کر بتلا دیا کہ شرعی اور اصطلاحی معنی میں عدل یعنی ثقہ ومعتبر ہونا گواہوں کا ضروری ہے، ورنہ ان کی شہادت پر قاضی کوئی فیصلہ نہیں دے گا۔ اور "وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ" میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم کسی ایسے واقعہ رجعت یا انقطاعِ نکاح کے گواہ ہو اور قاضی کی عدالت میں گواہی دینے کی نوبت آئے تو کسی رُورعایت یا مخالفت وعداوت کی وجہ سے سچی گواہی دینے میں ذرا بھی فرق نہ کرو۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی اس مذکورہ مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور آخری دن یعنی قیامت پر۔ اس میں آخرت کا خصوصیت سے ذِکر اس لئے کیا گیا کہ زوجین کے باہمی حقوق کی ادائیگی بغیر تقویٰ اور فکرِ آخرت کے کسی سے نہیں کرائی جاسکتی۔

جرم وسزا کے قوانین میں قرآنِ حکیم کا عجیب وغریب حکیمانہ اور مربیانہ اُصول

دُنیا کی حکومتوں میں قواعد وقوانین کی تدوین اور جرائم کی سزا وتعزیر کا پُرانا دُستور ہے، ہر قوم وملک میں قوانین اور تعزیرات کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم بھی اللہ کے قانون کی کتاب ہے، مگر اس کا طرز تمام دُنیا کی کتبِ قوانین سے نرالا اور عجیب ہے کہ ہر قانون کے آگے پیچھے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کو سامنے کردیا جاتا ہے، تاکہ ہر اِنسان قانون کی پابندی کسی پولیس اور نگراں کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ کے خوف سے کرے، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، خلوَت ہو یا جلوَت ہر صورت میں پابندیٔ قانون کو ضروری سمجھے، صرف یہی سبب ہے کہ قرآن پر صحیح ایمان رکھنے والوں میں کسی سخت سے سخت قانون کی تنفیذ بھی زیادہ دُشوار نہیں ہوتی، اس کے لئے اسلامی حکومت کو پولیس، اور اس پر اسپیشل پولیس، اور اس پر خفیہ پولیس کا جال پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

قرآنِ کریم کا یہ مربیانہ اُصول تمام ہی قوانین میں عام ہے، خصوصیت سے میاں بیوی کے تعلقات اور باہمی حقوق کے قوانین میں اس کا سب سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، کیونکہ یہ تعلقات ہی ایسے ہیں کہ ان میں نہ ہر کام پر کوئی شہادت مہیا ہوسکتی ہے، نہ عدالتی تحقیق زوجین کے حقوقِ باہمی کی کمی وکوتاہی کا صحیح اندازہ لگاسکتی ہے، ان کا تمام تر مدار خود زوجین ہی کے قلوب اور ان کے اعمال وافعال پر ہے، یہی وجہ ہے کہ نکاح کے خطبۂ مسنونہ میں قرآنِ کریم کی جو تین آیتیں پڑھنا سنت سے ثابت ہے، یہ تینوں آیتیں تقویٰ کے حکم سے شروع اور اسی پر ختم ہوتی ہیں، جن میں یہ اشارہ ہے کہ نکاح کرنے والوں کو ابھی سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، مگر حق تعالیٰ ہمارے کھلے اور چھپے سب اعمال سے بلکہ دِلوں کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے، ہم نے آپس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، ایک سے دُوسرے کو تکلیف پہنچی تو عالم السرائر کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی، اسی طرح سورۂ طلاق میں جبکہ طلاق کے چند اَحکام بیان فرمائے گئے تو پہلے ہی حکم کے بعد وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ فرما کر تقویٰ کی ہدایت فرمائی، پھر چار اَحکام کا ذِکر کرنے کے بعد یہ وعظ ونصیحت کی کہ جو شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ کسی اور پر نہیں بلکہ اپنی ذات ہی پر ظلم کرتا ہے، اس کا وبال اسی کو تباہ کردے گا، وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ پھر اور چار ضمنی اَحکام وقوانین ذکر کرنے کے بعد دوبارہ اس ہدایت کو دُہرایا گیا: ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ آگے ایک آیت میں تقویٰ کے فضائل اور اس کی دِینی

وُنیوی برکات کا بیان فرمایا، پھر اسی آیت کے آخر میں اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنے کی برکات ارشاد فرمائی گئیں، اس کے بعد پھر چند اَحکامِ عدّت کے بیان فرمائے اور اس کے بعد پھر دو آیتوں میں تقویٰ کے مزید برکات وثمرات کا بیان آیا، اور اس کے بعد پھر کچھ نکاح وطلاق کے متعلقات بیوی کے نفقہ اور اولاد کے دُودھ پلانے وغیرہ کے اَحکام بتلائے گئے۔ طلاق وعدّت اور عورتوں کے نفقہ اور دُودھ پلانے وغیرہ کے اَحکام میں بار بار کہیں ذِکرِ آخرت، کہیں تقویٰ کی فضیلت وبرکت، اور کہیں توکل کی برکات، اور کچھ اَحکام بیان کرکے پھر تقویٰ کے مکرر سہ کرر فضائل کا بیان بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، مگر قرآنِ کریم کے اس مربیانہ اُصول کی حکمت سمجھ لینے کے بعد اس کا جوڑ اور گہرا ربط بھی واضح ہوگیا، اب آیاتِ مذکورہ کی تفسیر وتشریح دیکھئے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیں گے اور اس کو بے گمان رِزق عطا فرمائیں گے۔

لفظ ''تقویٰ'' کے اصلی اور لغوی معنی بچنے کے ہیں، شرعی اِصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت ونسبت ہوتی ہے تو ترجمہ اللہ سے ڈرنے کا کردیا جاتا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے۔

اس آیت میں ''تقویٰ'' کی دو برکتیں بیان فرمائی ہیں، اوّل یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں، کس چیز سے بچنا، اس میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دُنیا کی سب مشکلات ومصائب کے لئے بھی اور آخرت کی سب مشکلات ومصائب کے لئے بھی، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لئے دُنیا وآخرت کی ہر مشکل ومصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں، اور دُوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اس کو خیال وگمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہی ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے، خواہ دُنیا کی ہو یا آخرت کی، مؤمن متقی کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کردیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی تکفل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اس کی ضروریات مہیا کردیتا ہے جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ (کذا فی الروح)[1]۔

مناسبتِ مقام کی وجہ سے بعض حضراتِ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ طلاق دینے والے شوہر اور مطلقہ بیوی دونوں یا ان میں جو بھی تقویٰ اختیار کرنے والا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو طلاق اور انقطاعِ نکاح کے بعد پیش آنے والی ہر مشکل وتکلیف سے نجات عطا فرمائیں گے، اور مرد کو اس کے مناسب بیوی، اور عورت کو اس کے مناسب شوہر عطا

[1] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۶۸

فرمائیں گے، اور ظاہر ہے کہ آیت کا اصل مفہوم جو تمام مشکلات اور ہر قسم رزق کے لئے عام اور شامل ہے اس میں زوجین کی یہ مشکلات وضروریات بھی شامل ہیں۔ (کذا فی روح المعانی) [۱]

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دُشمن گرفتار کر کے لے گئے، اس کی ماں سخت پریشان ہے، مجھے کیا کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور لڑکے کی والدہ کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ'' پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی، کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے، اس کا یہ اثر ہوا کہ جن دُشمنوں نے لڑکے کو قید کر رکھا تھا، وہ کسی روز ذرا غافل ہوئے، لڑکا کسی طرح اُن کی قید سے نکل گیا اور اُن کی کچھ بکریاں ہنکا کر ساتھ لے کر اپنے والد کے پاس پہنچ گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اُن کا ایک اُونٹ ان کو مل گیا اس پر سوار ہوئے اور دُوسرے اُونٹوں کو ساتھ لگا یا سب کو لے کر والد کے پاس پہنچ گئے، اُن کے والد یہ خبر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال بھی کیا کہ یہ اُونٹ بکریاں جو میرا لڑکا ساتھ لے آیا ہے، یہ ہمارے لئے جائز وحلال ہیں یا نہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ الآیۃ۔ [۲]

اور بعض روایات میں ہے کہ عوف بن مالک اشجعی اور ان کی بیوی کو جب لڑکے کی مفارقت نے زیادہ بے چین کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا، اور اس میں کچھ بعد نہیں کہ تقویٰ کا بھی حکم دیا ہو، اور بکثرت ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ... اِلخ'' پڑھنے کا بھی (یہ سب روایات روح المعانی میں ابنِ مردویہ سے من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی الله عنهما نقل کی گئی ہیں)۔ [۳]

اس شانِ نزول سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ اس مقام پر یہ آیت طلاق سے تعلق رکھنے والے مرد وعورت کے متعلق آئی ہے، مگر مفہوم اس کا عام ہے سب کے لئے شامل ہے۔

مسئلہ:- اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی مسلمان کفار کی قید میں آجائے اور وہ ان کا کچھ مال لے کر واپس آجائے تو یہ مال بحکم مالِ غنیمت حلال ہے، اور مالِ غنیمت کے عام قاعدے کے مطابق اس کا پانچواں حصہ بیت المال کو دینا بھی اس کے ذمہ نہیں جیسا کہ واقعہ حدیث میں اس مال میں سے خمس نہیں لیا گیا۔ حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ کوئی

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۶۸

[۲] جامع العلوم والحکم لإمام إبن رجب، الحدیث التاسع عشر، ج:۲۱ ص:۴۱

[۳] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۶۷

مسلمان چھپ کر بغیر اَمان و اجازت لئے ہوئے دارُالحرب میں چلا جائے اور وہاں سے کفار کا کچھ مال چھین کر یا کسی طرح لے آئے اور دارُ السلام میں پہنچ جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن جو شخص کفار سے امان اور اجازت لے کر اُن کے ملک میں جائے جیسا آج کل ویزا لینے کا دستور ہے، تو اُس کے لئے جائز نہیں کہ ان کا کوئی مال بغیر اُن کی رضامندی کے لے آئے۔ اسی طرح جو شخص قید ہو کر اُن کے ملک میں چلا جائے پھر کفار میں سے کوئی آدمی اس کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو اس امانت کا لے آنا بھی حلال نہیں، پہلی صورت میں تو اس لئے کہ امان لے کر جانے سے ایک معاہدہ اُن کے درمیان ہو گیا، اب بغیر ان کی رضامندی کے اُن کے جان و مال میں کوئی تصرف کرنا عہد شکنی میں داخل ہے، اور دُوسری صورت میں بھی امانت رکھنے والے سے عملی معاہدہ ہوتا ہے کہ جب وہ مانگے گا امانت اس کو دے دی جائے گی، اب امانت واپس نہ کرنا بدعہدی اور عہد شکنی ہے جو شرعاً حرام ہے۔ (مظہری) [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت سے پہلے بہت سے کفار اپنی امانتیں رکھ دیتے تھے، ہجرت کے وقت آپ کے قبضے میں ایسی کچھ امانتیں تھیں، ان کو آپ اپنے ساتھ نہیں لائے بلکہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو اسی کام کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا کہ وہ جس جس کی امانت ہے اس کو سپرد کر دیں۔

مصائب سے نجات اور مقاصد کے حصول کا مجرّب نسخہ

حدیثِ مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو مصیبت سے نجات اور حصولِ مقصد کے لئے یہ تلقین فرمائی کہ کثرت کے ساتھ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھا کریں۔ حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دِینی اور دُنیوی ہر قسم کے مصائب اور مضرتوں سے بچنے اور منافع و مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کلمے کی کثرت بہت مجرّب عمل ہے۔ اور اس کثرت کی مقدار حضرت مجدّد نے بتلائی ہے کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمہ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھا کرے اور سو سو مرتبہ دُرود شریف اس کے اوّل و آخر میں پڑھ کر اپنے مقصد کے لئے دُعا کیا کرے۔ (تفسیر مظہری) [۲] اور اِمام احمد رحمہ اللہ اور حاکم، بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز اس آیت وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ الآیۃ کی تلاوت بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے نیند آنے لگی، پھر فرمایا کہ اے ابوذر! اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کر لیں تو سب کے لئے کافی ہے۔ (روح المعانی) [۳] کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دِینی اور دُنیوی مقاصد میں کامیابی کے لئے کافی ہے۔

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۲۱

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۲۱

[۳] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۶۷

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کرے گا اللہ اس کی مہمات کے لئے کافی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو جس طرح چاہے پورا کر کے رہتا ہے، اُس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرّر کر دیا ہے، اسی کے مطابق سب کام ہوتے ہیں۔ ترمذی اور ابنِ ماجہ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَوْ اَنَّكُمْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ [۱]

اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسا پرندے جانوروں کو دیتا ہے کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے، اُن کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہوں گے۔ (مظہری) [۲]

توکل کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اسبابِ اختیاریہ کو ضرور اختیار کرے، مگر بھروسہ اَسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جب تک اُس کی مشیت و ارادہ نہ ہو جائے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ مذکورہ آیت میں تقویٰ اور توکل کے فضائل و برکات بیان کرنے کے بعد مزید چند احکام طلاق وعدّت کے بیان فرمائے ہیں: وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ اس آیت میں مطلقہ عورتوں کی عدّت کی مزید تفصیل ہے جس میں تین قسم کی عورتوں کی عدّت کا عام قاعدۂ عدّت سے جداگانہ حکم مذکور ہے۔

عدّتِ طلاق کے متعلق نواں حکم

عدّتِ طلاق عام حالات میں تین حیض پورے ہیں، جس کا بیان سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے، لیکن وہ عورتیں جن کو عمر

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الزُّهد، باب فی التَّوكل على الله، (باب فی الزهادة عن الدُّنيا) ج:۲ ص:۲۰۔

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۲۲، وصحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب يدخل الجنة سبعون الفًا بغير حساب، وصحيح مسلم، کتاب الإيمان، باب الدليل على دخول طوائف من المسلمين الجنة بغير حساب۔

کی زیادتی یا کسی بیماری وغیرہ کے سبب حیض آنا بند ہو چکا ہو، اسی طرح وہ عورتیں جن کو کم عمری کے سبب ابھی تک حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، ان کی عدت آیتِ مذکورہ میں تین حیض کے بجائے تین مہینے مقرر فرما دی، اور حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل قرار دی ہے، خواہ وہ کتنے ہی دنوں میں ہو۔

اِنِ ارْتَبْتُمْ، یعنی اگر تمہیں شک ہو، مراد شک سے یہ ہے کہ اصل عدت حیض سے شمار ہوتی ہے، اور ان عورتوں کا حیض تو بند ہے، تو پھر عدت کی شمار کیسے ہوگی یہ تردد مراد ہے۔

آگے پھر تقویٰ کی فضیلت و برکت کا بیان ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ④ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے کام میں آسانی کر دیتا ہے۔ یعنی دُنیا و آخرت کے کام اس کے لئے آسان ہو جاتے ہیں، اس کے بعد پھر طلاق و عدت کے اَحکامِ مذکورہ کی پابندی کی تاکید ہے: ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ یہ حکم ہے اللہ کا جو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر تقویٰ کی ایک اور فضیلت کا بیان ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ⑤ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ کر دیں گے اور اس کا اَجر بڑھا دیں گے۔

تقویٰ کی پانچ برکات

آیاتِ مذکورہ میں جو تقویٰ کے فضائل و برکات کا بیان آیا، اس کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ متقی کے لئے دُنیا و آخرت کے مصائب و مشکلات سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ اُس کے لئے رزق کے ایسے دروازے کھول دیتے ہیں جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ تیسرے یہ کہ اُس کے سب کاموں میں آسانی پیدا فرما دیتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ اس کا اَجر بڑھا دیتے ہیں۔ اور ایک دُوسری جگہ تقوے کی یہ برکت بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو حق و باطل کی پہچان آسان ہو جاتی ہے، آیت: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا [1] (الانفال:۲۹) کا یہی مطلب ہے۔ آگے پھر مطلقہ عورتوں کی عدت اور ان کے نفقہ کا بیان اور عام عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ اس آیت کا تعلق اُس پہلے حکم سے ہے جو اُوپر آ چکا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ اس آیت میں اس کا ایجابی پہلو ذِکر کیا گیا کہ اُن کو عدت پوری ہونے تک اپنی وسعت و قدرت کے مطابق رہنے کا مکان دو، جہاں تم خود رہتے ہو اسی مکان کے کسی حصے میں رکھو، اگر مطلقہ بطلاقِ رجعی ہے جب تو باہم کسی پردے کی بھی ضرورت نہیں، ہاں اگر طلاقِ بائن دی ہے یا تین طلاق دے دی ہیں تو اَب رشتۂ نکاح ٹوٹ چکا ہے، اس کو سابق شوہر سے پردہ کرنا چاہئے، اس لئے

[1] ترجمہ: اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا۔

پردے کے ساتھ اسی مکان میں رہنے کا انتظام کیا جائے۔

دسواں حکم:- مطلقہ عورتوں کو ایام عدت میں پریشان نہ کرو

وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایامِ عدت میں جب کہ مطلقہ عورت تمہارے ساتھ رہے تو طعن تشنیع کر کے یا اس کی ضروریات میں تنگی کر کے اس کو پریشان نہ کرو کہ وہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ یعنی اگر مطلقہ عورتیں حمل والیاں ہوں تو اُن پر اُس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک کہ ان کا حمل پیدا نہ ہو جائے۔

گیارھواں حکم:- مطلقات کا نفقۂ عدت

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں تو اُن کا نفقہ اس وقت تک شوہر پر لازم ہے جب تک کہ حمل پیدا ہو۔ اسی لئے مطلقہ حاملہ کے متعلق پوری اُمت کا اجماع ہے کہ اس کا نفقہ اس کی عدت، جو وضعِ حمل ہے، پوری ہونے تک شوہر پر واجب ہے۔ باقی جو مطلقہ حاملہ نہیں اگر اس کو طلاقِ رجعی دی گئی ہے تو اس کا نفقۂ عدت بھی شوہر پر باجماعِ اُمت واجب ہے۔ باقی وہ مطلقہ جس کو طلاقِ بائن یا تین طلاق دی گئی ہیں، یا جس نے خلع وغیرہ کے ذریعے اپنا نکاح فسخ کرایا ہو اس کے متعلق امام شافعیؒ واحمدؒ اور بعض دُوسرے ائمہ کا قول یہ ہے کہ اُن کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں، اور امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کا نفقہ بھی ہر قسم کی مطلّقات کے لئے واجب ہے، اور دلیل یہی آیت ہے جس میں عام مطلّقات کے لئے حقِ سُکنٰی دینے کو لازم کیا گیا ہے، یعنی: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ، کیونکہ اسی آیت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت یہ ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ اور ایک قراءت دُوسری قراءت کے لئے مفسر ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آیتِ مذکورہ کی مشہور قراءت جس میں لفظ ''وَاَنْفِقُوْا'' مذکور نہیں، اس میں بھی یہ لفظ محذوف ہے، اور اس نے جس طرح تمام مطلّقات کا حقِ سُکنٰی شوہروں پر لازم کیا ہے اسی طرح حقِ نفقہ بھی ایامِ عدت تک واجب کر دیا ہے اور اس کی تائید حضرت فاروقِ اعظمؓ اور دُوسرے متعدد صحابۂ کرامؓ کے اس قول سے ہوئی کہ انہوں نے فاطمہ بنت قیسؓ کی جن کو اُن کے شوہر نے تین طلاق دے دی تھیں، اُن کی اس روایت کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نفقہ ان کے شوہر پر لازم نہیں کیا، یہ کہہ کر رَدّ فرمایا کہ ہم ان کی اس روایت کی بنا پر کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے جس میں تمام مطلّقات کا نفقۂ عدت شوہروں پر واجب کیا گیا ہے۔ (رواہ مسلم)[1]

[1] صحیح مسلم، کتاب الطّلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها، ج:۱ ص:۴۸۵

اس میں کتابُ اللہ کے حوالے سے بظاہر یہی آیت مراد ہے، اور فاروقِ اعظم کے نزدیک مفہومِ آیت میں نفقہ بھی داخل ہے، اور سنت سے مراد وہ حدیث ہے جو خود عمر بن خطابؓ سے طحاوی، دار قطنی اور طبرانی نے روایت کی ہے، عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے مطلقہ ثلاثہ کے لئے بھی نفقہ اور سُکنیٰ واجب کیا ہے۔ [۱]

خلاصہ یہ ہے کہ حمل والی عورتوں کا نفقہ عدّت تو صراحۃً اس آیت نے واجب قرار دِیا ہے، اسی لئے اُس پر اجماعِ اُمت ہے، اسی طرح مطلقہ رجعیہ کا چونکہ ابھی تک نکاح ٹوٹا نہیں ہے، اس کا نفقہ بھی باتفاق واجب ہے، مطلقہ بائنہ یا ثلاثہ وغیرہ کے معاملے میں فقہائے اُمت کا اختلاف ہے، امامِ اعظمؒ کے نزدیک اس کا بھی نفقہ واجب ہے، اس کی مکمل تفصیل اسی آیت کی تفسیر میں ''تفسیرِ مظہری'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ [۲]

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ یعنی مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں اور پھر حمل سے بچہ پیدا ہوگیا تو اُن کی عدّت تو وضعِ حمل کی وجہ سے پوری ہوگئی، اس لئے ان کا نفقہ تو شوہر پر لازم نہیں رہا، مگر جو بچہ پیدا ہوا ہے اگر یہ مطلقہ ماں اس کو دُودھ پلائے تو دُودھ پلانے کا معاوضہ لینا اور دینا جائز ہے۔

بارھواں حکم:- رضاعت یعنی بچے کو دُودھ پلانے کی اُجرت۔ جب تک عورت شوہر کے نکاح میں ہے، اُس وقت تک بچوں کو دُودھ پلانا خود ماں کے ذمے بحکمِ قرآن واجب ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ [۳] (البقرۃ:۲۳۳) اور جو کام کسی کے ذمے خود واجب ہو اُس پر معاوضہ لینا رِشوت کے حکم میں ہے، جس کا لینا بھی ناجائز ہے اور دینا بھی۔ اور اَیامِ عدّت بھی اس معاملے میں بحکمِ نکاح ہیں، کیونکہ عورت کا نفقہ جس طرح بحالتِ نکاح شوہر پر لازم ہے، عدّت میں بھی واجب ہے، البتہ جب وضعِ حمل کے ذریعے عدّت ختم ہوگئی اور عورت آزاد ہوگئی اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہیں رہا، اب اگر یہ اس بچے کو دُودھ پلائے تو آیتِ مذکورہ نے اس کا معاوضہ لینے اور دینے کو جائز قرار دے دیا۔

تیرھواں حکم:- وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ اِئتِمَار کے لفظی معنی باہم مشورہ اور ایک دُوسرے کی بات قبول کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ دُودھ پلانے کی اُجرت میں زوجین کو اس کی ہدایت دی گئی ہے کہ باہمی نزاع کی نوبت نہ آنے دیں، مطلقہ بیوی عام اُجرت سے زیادہ نہ مانگے، شوہر عام اُجرت کے مطابق دینے سے انکار نہ کرے، ایک دُوسرے کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔

---

[۱] سنن الدارقطنی، رقم الحدیث:۳۹۶۴، والمعجم الکبیر للطبرانی، (باختلاف الألفاظ) رقم الحدیث:۹۵۸۵

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۲۷

[۳] ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں۔

چودھواں حکم:- وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ أُخْرٰى ۝ یعنی اگر دُودھ پلانے کا معاملہ باہمی مشورے سے طے نہ ہو پائے یا مطلقہ عورت اگر اپنے بچے کو معاوضہ لے کر بھی دُودھ پلانے سے انکار کردے تو اُس کو قضاءً مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ ماں کی شفقت بچے پر سب سے زیادہ ہونے کے باوجود جب انکار کر رہی ہے تو کوئی واقعی عذر ہوگا، لیکن اگر فی الواقع اس کو عذر نہیں، محض غصہ و ناراضی کی وجہ سے انکار کرتی ہے تو عنداللہ وہ گنہگار ہوگی، مگر قاضی کی عدالت اس کو دُودھ پلانے پر مجبور نہیں کرے گی۔

اسی طرح اگر شوہر کو دُودھ پلانے کی اُجرت دینے کی بوجہ افلاس کے قدرت نہیں اور کوئی دُوسری عورت بلامعاوضہ یا اس معاوضے سے کم پر دُودھ پلانے کو تیار ہو جو معاوضہ مطلقہ ماں مانگتی ہے تو شوہر کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ ماں کا مطالبہ منظور کر کے اُسی سے دُودھ پلوائے، بلکہ دونوں صورتوں میں دُوسری عورت سے اس کو دُودھ پلوایا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر دُوسری دُودھ پلانے والی عورت بھی اُتنا ہی معاوضہ طلب کرے جتنا ماں کر رہی ہے تو شوہر کے لئے باتفاقِ فقہاء جائز نہیں کہ ماں کو چھوڑ کر دُوسری عورت سے اسی معاوضے پر دُودھ پلوائے۔

مسئلہ:- اگر دُوسری عورت سے دُودھ پلوانا طے ہوجائے تو یہ ضروری ہے کہ دُودھ پلانے والی عورت اس کی ماں کے پاس رکھ کر دُودھ پلائے، ماں سے الگ کر کے دُودھ پلوانا جائز نہیں، کیونکہ حضانت یعنی تربیت اور اپنی نگرانی میں رکھنا ازرُوئے اَحادیثِ صحیحہ ماں کا حق ہے،[1] اس سے یہ حق سلب کرنا جائز نہیں۔ (تفسیر مظہری)[2]

پندرہواں حکم:- بیوی کے نفقہ کی مقدار میں شوہر کی حالت کا اعتبار ہوگا: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ یعنی خرچ کرے وسعت والا آدمی اپنی وسعت کے مطابق اور جس شخص پر رزق تنگ ہو وہ اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کے نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ شوہر کی حالت کے مطابق نفقہ دینا واجب ہوگا، اگر شوہر مال دار ہے تو اَمیرانہ نفقہ دینا واجب ہے اگرچہ بیوی مال دار نہ ہو بلکہ تنگ دست فقیر ہو، اور اگر شوہر غریب ہے تو غریبانہ نفقہ اس کے مقدور کے مطابق واجب ہوگا اگرچہ بیوی مال دار ہو، اِمام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، بعض دُوسرے فقہاء کے اقوال اس کے خلاف بھی ہیں۔ (تفسیر مظہری)[3]

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ یہ اُسی سابقہ جملے کی مزید تشریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت و قدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا، اس لئے نادار مفلس شوہر پر اسی حیثیت کا نفقہ واجب ہوگا جو

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الطّلاق، باب الولد للفراش ومن احق بالولد، ج: ۱ ص: ۳۱۰

[2] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۳۳۰

[3] تفسیر المظهری ج: ۹ ص: ۳۳۰ و ۳۳۱

حیثیت اس کی اس وقت ہے۔ آگے بیوی کو غریبانہ نفقہ پر قناعت اور اُس پر صبر کی تلقین کے لئے فرمایا: سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ یعنی کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ موجودہ حالت میں تنگی ہے تو یہ تنگی ہمیشہ رہے گی، بلکہ تنگی اور فراخی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ تنگی کے بعد فراخی بھی دے سکتا ہے۔

فائدہ

اس آیت میں ایسے شوہروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراخی ملنے کی طرف اشارہ ہے جو مقدور بھر نفقاتِ واجبہ پورا کرنے کی کوشش میں رہیں، بیوی کو تنگ رکھنے کی عادت نہ ہو۔ (روح المعانی)[1] واللہ اعلم۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا

اور کتنی بستیاں کہ نکل چکیں حکم سے اپنے رَبّ کے اور اس کے رسولوں کے پھر ہم نے حساب میں پکڑا ان کو

حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا

سخت حساب میں اور آفت ڈالی اُن پر بن دیکھی آفت، پھر چکھی اُنہوں نے سزا اپنے کام کی

وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور آخر کو اُن کے کام میں ٹوٹا آگیا، تیار رکھا ہے اللہ نے واسطے اُن کے سخت عذاب سو ڈرتے رہو اللہ سے

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ مع

اے عقل والو جن کو یقین ہے بے شک اللہ نے اُتاری ہے تم پر نصیحت،

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

رسول ہے جو پڑھ کر سناتا ہے تم کو اللہ کی آیتیں کھول کر سنانے والی تا کہ نکالے اُن لوگوں کو جو کہ یقین لائے

[1] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۷۶

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ

اور کئے بھلے کام اندھیروں سے اُجالے میں، اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر

وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور کرے کچھ بھلائی اس کو داخل کرے باغوں میں نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ

سدا رہیں اُن میں ہمیشہ، البتہ خوب دی اللہ نے اس کو روزی، اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات

سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا

آسمان اور زمین بھی اتنی ہی، اُترتا ہے اُس کا حکم اُن کے اندر تاکہ تم جانو

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ ع ۲

ع ۱۰ ۵ ۱۸

کہ اللہ ہر چیز کرسکتا ہے اور اللہ کے علم میں سمائی ہے ہر چیز کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار اور اُس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے اُن کا سخت حساب لیا، اور اُنہیں سزا دی، ایسی بُری سزا جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی! ﴿۸﴾ چنانچہ انہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا، اور ان کے اعمال کا آخری انجام نقصان ہی نقصان ہوا۔ ﴿۹﴾ (اور آخرت میں) ہم نے اُن کے لئے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ لہٰذا اے عقل والو جو ایمان لے آئے ہو، اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ نے تمہارے پاس ایک سراپا نصیحت بھیجی ہے، ﴿۱۰﴾ یعنی وہ رسول جو تمہارے سامنے روشنی دینے والی اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں، تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرے، اللہ اُس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں جنتی لوگ

ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لئے بہترین رزق طے کر دیا ہے۔ (۱۱) اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور زمین بھی اُنہی کی طرح۔ اللہ کا حکم ان کے درمیان اُترتا رہتا ہے، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ (۱۲)

خلاصۂ تفسیر

اور بہت سی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے رَبّ کے حکم (ماننے) سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی، سو ہم نے اُن (کے اعمال) کا سخت حساب کیا (مطلب یہ کہ ان کے اعمالِ کفریہ میں سے کسی عمل کو معاف نہیں کیا، بلکہ سب پر سزا تجویز کی، یہاں حساب سے پُرسش کے طور پر حساب مراد نہیں) اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دِی (کہ عذاب کے ذریعے ہلاک کئے گئے) غرض انہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا اور ان کا انجامِ کار خسارہ ہی ہوا (یہ تو دُنیا میں ہوا اور آخرت میں) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے (اور جب انجام نافرمانی کا یہ ہے) تو اے سمجھ دارو جو کہ ایمان لائے ہو تم خدا سے ڈرو (کہ ایمان بھی اس کو مقتضی ہے اور ڈرنا یہ کہ اطاعت کرو، اور اسی اطاعت کا طریقہ بتلانے کے لئے) خدا نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا (اور وہ نصیحت نامہ دے کر) ایک ایسا رسول (بھیجا) جو تم کو اللہ کے صاف صاف اَحکام پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو کہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علم و عمل کے) نور کی طرف لے آئیں (مطلب یہ کہ جو نصیحت اس رسول کے ذریعے سے پہنچے اس پر عمل کرنا بھی اطاعت ہے) اور (آگے اطاعت یعنی ایمان و عملِ صالح پر وعدہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور اچھے عمل کرے گا خدا اس کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے، بے شک اللہ نے (ان کو بہت) اچھی روزی دی (آگے اللہ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کیا جاتا ہے یعنی) اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین بھی (سات پیدا کی، جیسا ترمذی وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ ایک زمین کے نیچے دُوسری زمین ہے، اس کے نیچے تیسری زمین، اسی طرح سات زمینیں ہیں،[۱] اور) ان سب (آسمانوں اور زمینوں) میں (اللہ تعالیٰ کے) اَحکام (تشریعی یا تکوینی یا دونوں) نازل ہوتے رہتے ہیں (اور یہ اس لئے بتلا دیا گیا) تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور اللہ ہر چیز کو (اپنے) احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہے (اس لئے اللہ تعالیٰ کا واجب الاطاعت ہونا ظاہر ہے)۔

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الحدید، ج:۲ ص:۱۶۵

معارف و مسائل

فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ آیت میں ان قوموں کے حساب و عذاب کا جو ذِکر ہے، وہ آخرت میں ہونے والا ہے، مگر یہاں اس کو بلفظِ ماضی "فَحَاسَبْنٰهَا" اور "وَّعَذَّبْنٰهَا" سے تعبیر کر دینا، یا تو اُس کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ گویا یہ کام ہو چکا۔ (کما فی الروح)[1] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حساب سے مراد اس جگہ سوالات اور پُرسش نہ ہو بلکہ اُس کی سزا کی تعیین ہو جیسا کہ خلاصۂ تفسیر مذکور میں لیا گیا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حسابِ شدید اگرچہ آخرت میں ہوگا، مگر صحائفِ اعمال میں اس کی کتابت تو ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے، اس کو حساب کر دینے سے تعبیر کیا گیا، اور عذاب سے مراد دُنیا کا عذاب ہو جو بہت سی پہلی قوموں پر نازل ہوا ہے، اس صورت میں بعد میں آنے والا جملہ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ صرف یہ آخرت کے عذاب سے متعلق رہے گا۔

قَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا اس آیت کی آسان توجیہ یہ ہے کہ یہاں لفظ "أَرْسَلَ" محذوف مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ "نازل کیا ذِکر یعنی قرآن کو اور بھیجا رسول کو۔" خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔ حضراتِ مفسرین نے دُوسری توجیہات بھی لکھی ہیں، مثلاً یہ کہ ذِکر سے مراد خود رسول ہوں کہ ذکر اللہ کی کثرت کے سبب اُن کا وجود گویا خود ذِکر اللہ بن گیا وغیر ذالک۔ (رُوح)[2]

سات زمینیں کہاں کہاں کس صورت میں ہیں

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ اس آیت سے اتنی بات تو واضح طور پر ثابت ہے کہ جس طرح آسمان سات ہیں ایسی ہی زمینیں بھی سات ہیں۔ پھر یہ سات زمینیں کہاں کہاں اور کس وضع و صورت میں ہیں، اُوپر نیچے طبقات کی صورت میں تہ بر تہ ہیں یا ہر ایک زمین کا مقام الگ الگ ہے اگر اُوپر نیچے طبقات ہیں تو کیا جس طرح سات آسمانوں میں ہر دو آسمان کے درمیان بڑا فاصلہ ہے اور ہر آسمان میں الگ الگ فرشتے آباد ہیں، اسی طرح ایک زمین اور دُوسری زمین کے درمیان بھی فاصلہ اور ہوا فضا وغیرہ ہیں اور اُس میں کوئی مخلوق آباد ہے یا یہ طبقاتِ زمین ایک دُوسرے سے پیوستہ ہیں قرآن مجید اس سے ساکت ہے، اور روایاتِ حدیث جو اس بارے میں آئی ہیں اُن میں اکثر احادیث میں ائمۂ حدیث کا اختلاف ہے، بعض نے ان کو صحیح و ثابت قرار دِیا ہے، بعض نے موضوع و من گھڑت تک کہہ دیا ہے، اور عقلاً یہ سب صورتیں ممکن ہیں، اور ہماری کوئی دِینی یا دُنیوی ضرورت اس کی تحقیق پر موقوف نہیں، نہ ہم سے قبر میں یا حشر میں اس کا

---

[1] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۷۷

[2] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۸۰

سوال ہوگا کہ ہم ان سات زمینوں کی وضع وصورت اور محلِ وقوع اور اُس میں بسنے والی مخلوقات کی تحقیق کریں، اس لئے اَسلم صورت یہ ہے کہ بس اس پر ایمان لائیں اور یقین کریں کہ زمینیں بھی آسمانوں کی طرح سات ہی ہیں، اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا ہے، اتنی ہی بات قرآن نے بیان کی ہے، جس کو قرآن نے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا، ہم بھی اُس کی فکر و تحقیق میں کیوں پڑیں۔ حضراتِ سلف صالحین کا ایسی صورتوں میں یہی طرزِ عمل رہا ہے، اُنہوں نے فرمایا ہے ''اَبْهِمُوْا مَا اَبْهَمَهُ اللهُ'' یعنی جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے، تم بھی اُسے مبہم رہنے دو، جبکہ اس میں تمہارے لئے کوئی عملی حکم نہیں، اور تمہاری کوئی دِینی یا دُنیوی ضرورت اُس سے متعلق نہیں۔ خصوصاً یہ تفسیر عوام کے لئے لکھی گئی ہے، ایسے خالص علمی اِختلافی مباحث اس میں نہیں لئے گئے جن کی عوام کو ضرورت نہیں ہے۔

یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ، یعنی اللہ کا حکم ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے، اور حکمِ الٰہی کی دو قسم ہیں، ایک تشریعی جو اللہ کے مکلّف بندوں کے لئے بذریعہ وحی بواسطہ انبیاء بھیجا جاتا ہے، جیسے زمین میں انسان اور جن کے لئے آسمانوں سے فرشتے یہ تشریعی اَحکام انبیاء تک لے کر آتے ہیں، جن میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت کے قوانین ہوتے ہیں، اُن کی پابندی پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب ہوتا ہے۔ دُوسری قسم حکم کی حکمِ تکوینی ہے، یعنی تقدیرِ الٰہی کی تنفیذ سے متعلق اَحکام جس میں کائنات کی تخلیق اور اُس کی تدریجی ترقی اور اُس میں کمی بیشی اور موت و حیات داخل ہیں، یہ اَحکام تمام مخلوقاتِ اِلٰہیہ پر حاوی ہیں، اس لئے اگر ہر دو زمینوں کے درمیان فضا اور فاصلہ اور اس میں کسی مخلوق کا آباد ہونا ثابت ہو جائے، خواہ مخلوق مکلّف اَحکامِ شرعیہ کی نہ ہو، تو اُس پر بھی یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ صادق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امرِ تکوینی اُس پر بھی حاوی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الطَّلَاقِ بِعَوْنِ اللهِ وَحَمْدِهٖ فِيْ آخِرِ يَوْمٍ مِنْ
جُمَادَى الثَّانِيَةِ ۱۳۹۱ھ يَوْمَ الْاَحَدِ وَاللهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْنُ

سُوْرَةُ التَّحْرِيْم

اٰيَاتُهَا ۱۲ | ۶۶ سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۷ | رُكُوْعَاتُهَا ۲

سورۂ تحریم مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی بارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ

اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر، چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی،

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ

اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔ مقرر کردیا ہے اللہ نے تمہارے لئے کھول ڈالنا تمہاری قسموں کا

وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ② وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ

اور اللہ مالک ہے تمہارا اور وہی ہے سب کچھ جانتا حکمت والا اور جب چھپا کر کہی نبی نے

إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ

اپنی کسی عورت سے ایک بات، پھر جب اُس نے خبر کردی اس کی اور اللہ نے جتلادی نبی کو وہ بات

عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ

تو جتلائی نبی نے اس میں سے کچھ اور ٹلادی کچھ، پھر جب وہ جتلائی عورت کو بولی تجھ کو کس نے بتلادی

هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٣﴾ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ

یہ کہا مجھ کو بتایا اُس خبر والے واقف نے۔ اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو

فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ

تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے اور اگر تم دونوں چڑھائی کروگی اس پر تو اللہ ہے اس کا رفیق

وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ﴿٤﴾

اور جبریل اور نیک بخت ایمان والے، اور فرشتے اس کے پیچھے مددگار ہیں۔

عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُنَّ

اگر نبی چھوڑ دے تم سب کو ابھی اس کا رَبّ بدلے میں دے دے اس کو عورتیں تم سے بہتر

مُسْلِمَاتٍ مُؤْمِنَاتٍ قَانِتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ

حکم بردار، یقین رکھنے والیاں، نماز میں کھڑی ہونے والیاں، توبہ کرنے والیاں، بندگی بجالانے والیاں، روزہ رکھنے والیاں،

ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا ﴿٥﴾

بیاہیاں اور کنواریاں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے نبی! جو چیز اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہے، تم اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُسے کیوں حرام کرتے ہو؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ (۱) اللہ نے تمہاری قسموں سے نکلنے کا طریقہ مقرّر کردیا ہے۔ اور اللہ تمہارا کارساز ہے، اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (۲) اور یاد کرو جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے راز کے طور پر ایک بات کہی تھی۔ پھر جب اُس بیوی نے وہ بات کسی اور کو بتلادی، اور اللہ نے یہ بات نبی پر ظاہر کردی تو اُس نے اُس کا کچھ حصہ جتلادیا، اور کچھ حصے کو ٹال گئے۔ پھر جب اُنہوں نے اُس بیوی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگیں کہ: ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟'' نبی نے کہا کہ: ''مجھے اُس نے بتائی جو بڑے علم والا، بہت باخبر ہے۔'' (۳) (اے نبی کی بیویو!) اگر تم اللہ کے حضور توبہ کرلو (تو یہی مناسب ہے) کیونکہ تم دونوں کے دِل مائل ہوگئے ہیں، اور اگر نبی کے مقابلے میں تم نے ایک دُوسری کی مدد کی، تو (یاد رکھو کہ) اُن کا ساتھی اللہ ہے، اور جبرئیل ہیں، اور نیک مسلمان ہیں۔ اور اس کے علاوہ فرشتے ان کے مددگار ہیں۔ (۴) اگر وہ تمہیں طلاق دے دیں تو ان کے پروردگار کو اس بات میں دیر نہیں لگے گی کہ وہ اُن کو (تمہارے) بدلے میں ایسی بیویاں عطا فرمادے جو تم سب سے بہتر ہوں، مسلمان، ایمان والی، طاعت شعار، توبہ کرنے والی، عبادت گذار اور روزہ دار ہوں، چاہے پہلے اُن کے شوہر رہے ہوں، یا کنواری ہوں۔ (۵)

خلاصۂ تفسیر

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اُوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (یعنی گو کسی مباح کا ترک کردینا جائز ہے اور اس ترک کا مؤکد بالقسم کرنا بھی کسی مصلحت سے جائز ہے لیکن تاہم خلافِ اَولیٰ ہے، خصوصاً جب کہ اس کا داعی بھی ضعیف ہو، یعنی بیبیوں کی رضاجوئی ایسے امر میں جس میں ان کا راضی کرنا ضروری نہ تھا) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (کہ گناہ تک کو معاف کردیتا ہے اور آپ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا اس لئے یہ عتاب نہیں بلکہ شفقۃً ورأفۃً آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک جائز نفع کو ترک کرکے کیوں تکلیف اُٹھائی اور چونکہ آپ نے قسم کھالی تھی اس لئے عام خطاب سے قسم کا کفارہ دینے کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اس کے کفارے کا طریقہ) مقرّر فرمادیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے (اس لئے وہ اپنے

علم وحکمت سے تمہاری مصلحتوں اور ضرورتوں کو جان کر تمہاری بہت سی دُشواریوں کو آسان کردینے کے طریقے مقرّر فرما دیتا ہے، چنانچہ کفارے کے ذریعے قسم کی پابندی کی کلفت کا علاج کردیا)۔ اور (آگے بیبیوں کو سناتے ہیں کہ وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کسی بی بی سے چپکے سے ایک بات فرمائی (وہ بات یہی تھی کہ میں پھر شہد نہ پیوں گا، مگر کسی سے کہنا نہیں) پھر جب اس بی بی نے وہ بات (دُوسری بی بی کو) بتلادی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے (بذریعۂ وحی) اس کی خبر کردی تو پیغمبر نے (اس ظاہر کردینے والی بی بی کو) تھوڑی سی بات تو جتلادی (کہ تو نے ہماری یہ بات دُوسری سے کہہ دی) اور تھوڑی بات کو ٹال گئے (یعنی آپ کا کرم اس غایت تک ہے کہ اپنے حکم کے خلاف کرنے پر جو بی بی کی شکایت کرنے بیٹھے تو شکایت کے وقت بھی اس کہی ہوئی بات کے پورے اجزا کا اعادہ نہیں فرمایا کہ تو نے میری یہ بات کہہ دی اور یہ بھی کہہ دی، بلکہ کچھ اجزا کا ذِکر کیا اور کچھ اجزا کا نہیں کیا تاکہ جو بی بی مخاطب ہے اس کو گمان ہو کہ ان کو اتنی ہی بات کہنے کی خبر ہوئی ہے، زائد کی نہیں ہوئی تو شرمندگی کم ہو، وھٰذا اسھل الأقوال فی تفسیر ھٰذین البعضین) سو جب پیغمبر نے اس بی بی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر کردی، آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے بڑے خبر رکھنے والے (یعنی خدا) نے خبر کردی (یہ بیبیوں کو شاید اس لئے سنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے راز پر مطلع ہونا سن کر آپ کے کریمانہ معاملے سے اپنی کارروائی پر زیادہ شرمندہ ہوں اور توبہ کریں، چنانچہ آگے خود بیبیوں کو توبہ وغیرہ کا خطاب ہے کہ) اے (پیغمبر کی) دونوں بیبیو! اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے، کیونکہ مقتضا توبہ کا موجود ہے، وہ یہ کہ) تمہارے دل (اس طرف) مائل ہو رہے ہیں (کہ دُوسری بیبیوں سے ہٹا کر آپ کو اپنا ہی بنالیں اور گو یہ امر باعتبار اس کے کہ اصل مقتضی اس کا حبِ رسول ہے، قبیح نہیں ہے، لیکن چونکہ اس میں دُوسروں کے حقوق کا اتلاف اور دِل شکنی لازم آتی ہے، اور مستلزمِ قبیح، قبیح ہوتا ہے، اس اِعتبار سے قبیح وموجب للتوبہ ہے) اور اگر (اسی طرح) پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو (یاد رکھو کہ) پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک مسلمان ہیں، اور اُن کے علاوہ فرشتے (آپ کے) مددگار ہیں (مطلب یہ کہ تمہاری ان سازشوں سے آپ کا کوئی ضرر نہیں ہے، بلکہ تمہارا ہی ضرر ہے کیونکہ جس شخص کے حامی ایسے ہوں، اس کے خلافِ مزاج کارروائیاں کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ بُرا ہی بُرا ہے، اور چونکہ بعض اسباب نزول میں حضرت عائشہ وحفصہ کے علاوہ اور بیبیاں بھی شریک تھیں، جیسے حضرت سودہ وصفیہ اس لئے آگے صیغۂ جمع سے خطاب فرماتے ہیں کہ تم یہ وسوسہ دِل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیبیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لئے چار و ناچار ہماری سب باتیں سہی جائیں گی، سو یہ سمجھ لو کہ) اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا، جو اِسلام والیاں، ایمان والیاں، فرمانبرداری کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ

رکھنے والیاں ہوں گی، کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں (بعض مصالح سے بیوہ بھی مرغوب ہوتی ہے، جیسے تجربہ، سلیقہ، ہم عمری وغیرہ، اس لئے اس کو بھی اوصافِ رغبت میں شمار فرمایا)۔

معارف و مسائل

آیاتِ تحریم کا واقعۂ نزول

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے سب بیبیوں کے پاس (خبر گیری کے لئے) تشریف لاتے تھے۔ ایک روز حضرت زینب کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا، اور میں نے حفصہ سے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں وہ یوں کہے کہ آپ نے مغافیر نوش فرمایا ہے۔ "مغافیر" ایک خاص قسم کا گوند ہے جس میں کچھ بدبو ہوتی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تو شہد پیا ہے۔ ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی ہو اور اس کا رَس چوسا ہو (اسی وجہ سے شہد میں بھی بدبو آنے لگی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدبو کی چیزوں سے بہت پرہیز فرماتے تھے، اس لئے آپ نے قسم کھالی کہ پھر میں شہد نہ پیوں گا، اور اس خیال سے کہ حضرت زینب کا جی بُرا نہ ہو، اس کے اِخفا کی تاکید فرمائی، مگر ان بی بی نے دُوسری سے کہہ دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہ شہد پلانے والی ہیں اور حضرت عائشہ و سودہ و صفیہ صلاح مشورہ کرنے والی۔ اور بعض روایات میں یہ قصہ دُوسری طرح بھی آیا ہے، ممکن ہے کہ کئی واقعے ہوں اور ان سب کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں۔ (از بیان القرآن)[1]

خلاصہ ان آیات کا یہ ہے کہ اس واقعے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حلال چیز یعنی شہد کو بذریعہ قسم اپنے اُوپر حرام کرلیا تھا، یہ فعل جب کہ کسی ضرورت و مصلحت سے ہو تو جائز ہے، گناہ نہیں، مگر اس واقعے میں ضرورت ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے آپ خود کوئی تکلیف اُٹھائیں اور ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام ازواجِ مطہرات کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، اور ایسے معاملے میں ان کا راضی کرنا آپ کے ذمے لازم نہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اَز رُوئے شفقت و عنایت فرمایا:-

يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① اس آیت میں بھی قرآنِ

---

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۱۸، وصحیح البخاری، کتاب الطّلاق، باب لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ج:۲ ص:۷۹۲، وصحیح مسلم، کتاب الطّلاق، باب وجوب الكفاءة ...إلخ، ج:۱ ص:۴۷۸

کریم کے عام اُسلوب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کا نام لے کر خطاب نہیں کیا بلکہ "یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ" کے لقب سے خطاب فرمایا جو آپ کا خصوصی اعزاز واکرام ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اپنی ازواج کی رضا جوئی کے لئے آپ اپنے اُوپر ایک حلال چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں، یہ کلام اگرچہ ازرُوئے شفقت ہوا، مگر صورت جواب طلبی کی تھی جس سے یہ خیال ہوسکتا تھا کہ شاید آپ سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی اس لئے ساتھ ہی فرمایا: وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ① یعنی اگر گناہ ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ مغفرت اور معاف کرنے والے ہیں۔

مسئلہ:- کسی حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام کرنے کی تین صورتیں ہیں، جن کا مفصل ذِکر سورۂ مائدہ کی آیت: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ [1] (المائدۃ:۸۷) کے تحت معارف القرآن جلد سوم میں آچکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حلالِ قطعی کو عقیدۃً حرام قرار دے تو یہ کفر اور گناہِ عظیم ہے، اور اگر عقیدۃً حرام نہ سمجھے مگر بلا کسی ضرورت ومصلحت کے قسم کھا کر اپنے اُوپر حرام کرلے تو یہ گناہ ہے، اس قسم کا توڑنا اور کفارہ ادا کرنا اس پر واجب ہے، جس کا ذِکر آگے آتا ہے۔ اور کوئی ضرورت ومصلحت ہو تو جائز، مگر خلافِ اَولیٰ ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ نہ عقیدۃً حرام سمجھے، نہ قسم کھا کر اپنے اُوپر حرام کرے، مگر عملاً اس کو ہمیشہ ترک کرنے کا دِل میں عزم کرلے، یہ عزم اگر اس نیت سے کرے کہ اس کا دائمی ترک باعثِ ثواب ہے، تب تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جو شرعاً گناہ اور مذموم ہے، اور اگر ترکِ دائمی کو ثواب سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے کسی جسمانی یا رُوحانی مرض کے علاج کے طور پر کرتا ہے تو بلاکراہت جائز ہے۔ بعض صوفیائے کرام سے جو ترکِ لذائذ کی حکایتیں منقول ہیں، وہ اسی صورت پر محمول ہیں۔

واقعۂ مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھالی تھی، نزولِ آیت کے بعد اس قسم کو توڑا اور کفارہ ادا فرمایا، جیسا کہ دُرِّ منثور کی روایت میں ہے کہ آپ نے ایک غلام کفارۂ قسم میں آزاد کیا۔ (از بیان القرآن) [2]

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ۚ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتوں میں جہاں قسم کا توڑنا ضروری یا مستحسن ہو تمہاری قسموں سے حلال ہونے یعنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کردینے کا راستہ نکال دیا ہے، جس کا ذِکر دُوسری آیات میں مفصل ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ یعنی جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بی بی سے ایک راز کی بات کہی۔ وہ راز کی بات صحیح اور اکثر روایات کی رُو سے یہی تھی کہ آپ نے حضرت زینبؓ کے پاس جو شہد پیا اور دُوسری ازواج کو بھاری معلوم ہوا، آپ نے ان کو راضی کرنے کے لئے شہد نہ پینے کی قسم کھالی مگر یہ فرمایا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہوتا کہ

---

[1] ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان میں لذیذ چیزوں کو حرام مت کرو۔

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۵۷۰، وتفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۱۲ ص:۲۰

زینب کو رنج نہ پہنچے، مگر اس بی بی نے یہ راز دُوسری پر ظاہر کر دیا جس کا ذِکر اگلی آیت میں ہے۔ اس راز کی بات کے متعلق دُوسری روایات میں اور بھی چیزیں منقول ہیں، مگر اکثر اور صحیح روایات میں یہی ہے جو لکھا گیا۔

فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ یعنی جب اس بی بی نے وہ راز کی بات دُوسری بی بی سے کہہ ڈالی اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کر دی کہ اس نے آپ کا راز فاش کر دیا تو آپ نے اس بی بی سے افشائے راز کا شکوہ تو کیا مگر پوری بات نہیں کھولی، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم اور حسنِ خلق تھا کہ پوری بات کھولنے سے ان کو زیادہ خجالت اور شرمندگی ہوگی، جس بی بی سے راز کی بات کہی گئی تھی وہ کون تھیں اور جس پر راز ظاہر کیا وہ کون قرآنِ کریم نے اس کو بیان نہیں کیا، اکثر روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ راز کی بات حضرت حفصہؓ سے کہی گئی تھی، انہوں نے حضرت عائشہؓ سے ذِکر کر دیا، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں حضرت ابنِ عباسؓ سے اس کا بیان آگے آئے گا۔

بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ حضرت حفصہؓ کے رازفاش کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو طلاق دے دینے کا اِرادہ فرمایا، مگر اللہ نے جبریلِ امین کو بھیج کر ان کی طلاق سے روک دیا، اور فرمایا کہ بہت نماز گزار، بکثرت روزے رکھنے والی ہیں، اور اُن کا نام جنت میں آپ کی بیبیوں میں لکھا ہوا ہے۔ [1] (مظہری)

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا ازواجِ مطہرات میں سے جن دو کا اِجمالی ذِکر اُوپر آیا ہے کہ اُنہوں نے باہم مشورہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہد پینے پر ایسا طرزِ اِختیار کیا جس سے آپ نے شہد پینے سے قسم کھالی، اور پھر آپ نے اس کے اِخفا کے لئے فرمایا تھا، وہ اِخفا نہیں کیا بلکہ ایک نے دُوسری پر بات کھول دی۔ یہ دو کون ہیں ان کے متعلق صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابنِ عباسؓ کی ایک طویل روایت ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ عرصہ تک میرے دِل میں یہ خواہش تھی کہ میں ان دو عورتوں کے متعلق عمر بن خطاب سے دریافت کروں جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ یہاں تک ایک موقع آیا کہ عمر بن خطاب حج کے لئے نکلے اور میں بھی شریکِ سفر ہوگیا، دورانِ سفر میں ایک روز عمر بن خطاب قضائے حاجت کے لئے جنگل کی طرف تشریف لے گئے اور واپس آئے تو میں نے وضو کے لئے پانی کا انتظام کر رکھا تھا، میں نے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالا، اور وضو کراتے ہوئے میں نے سوال کیا کہ یہ دو عورتیں جن کے متعلق قرآن میں ''اِنْ تَتُوْبَآ'' آیا ہے کون ہیں، حضرت عمر نے فرمایا آپ سے تعجب ہے کہ آپ کو خبر نہیں یہ دونوں عورتیں حفصہ اور عائشہ ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنا ایک طویل قصہ اس واقعے سے متعلق ذِکر فرمایا جس میں اس واقعے کے

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۴۰، تفسیر سورة الطّلاق، ومسند البزار (باختلاف) رقم الحديث: ۸۴۰۱، والمعجم الكبير للطبرانی (باختلاف) رقم الحديث: ۱۵۳۲۲

پیش آنے سے پہلے کے کچھ حالات بھی بیان فرمائے جن کی پوری تفصیل تفسیر مظہری میں ہے۔ [1] آیتِ مذکورہ میں ان دونوں ازواجِ مطہرات کو مستقل خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اگر تم توبہ کرو جیسا کہ اس واقعے کا تقاضا ہے کہ تمہارے دل حق سے مائل ہو گئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کی رضا جوئی ہر مؤمن کا فرض ہے، مگر تم دونوں نے باہم مشورہ کر کے ایسی صورت اختیار کی جس سے آپ کو تکلیف پہنچی، یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اور آگے فرمایا:-

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ الآیۃ، اس میں یہ بتلا دیا کہ اگر تم نے توبہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی نہ کیا تو یہ نہ سمجھو کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائے گا، کیونکہ آپ کا تو اللہ مولیٰ اور کفیل ہے، اور جبرئیل امین اور سب نیک مسلمان اور اُن کے بعد سب فرشتے، جس کی رفاقت واعانت پر سب لگے ہوں اس کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے، نقصان وضرر جو کچھ ہے تمہارا ہی ہے، آگے اُن ہی کے متعلق فرمایا:-

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الآیۃ، اس میں عورتوں کے اس خیال کا جواب ہے کہ اگر ہمیں طلاق دے دی تو ہم جیسی دُوسری عورتیں شاید آپ کو نہ ملیں۔ حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا چیز باہر ہے اگر وہ تمہیں طلاق دے دیں تو وہ تم جیسی ہی نہیں بلکہ تم سے بہتر عورتیں عطا فرما دے گا، اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ ان سے بہتر عورتیں اس وقت موجود تھیں، ہوسکتا ہے کہ اس وقت نہ ہوں، اور جب ضرورت پڑے اللہ تعالیٰ دُوسری عورتوں کو ان سے بہتر بنا دیں۔ ان آیات میں جیسا کہ خاص ازواجِ مطہرات کے اعمال واخلاق کی اصلاح اور ان کی تادیب وتربیت کا بیان تھا، آگے عام مؤمنین کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ

اے ایمان والو بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اُس آگ سے جس کی چھپٹیاں آدمی

وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ

اور پتھر، اُس پر مقرر ہیں فرشتے تندخو زبردست، نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے اُن کو،

[1] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۴۱، وصحیح البخاری، کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها ج:۲ ص:۷۸۰ و ۷۸۱

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ

اور وہی کام کرتے ہیں جو اُن کو حکم ہو۔ اے منکر ہونے والو مت بہانے بتلاؤ آج کے دن،

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ ع

وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اُس پر سخت کڑے مزاج کے فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے کسی حکم میں اُس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا اُنہیں حکم دیا جاتا ہے۔ (۶) اے کفر اختیار کرنے والو! آج معذرتیں پیش مت کرو۔ تمہیں اُنہی اعمال کا بدلہ دیا جارہا ہے جو تم کیا کرتے تھے۔ (۷)

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (جب رسول کی بیبیوں کو بھی عملِ صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اُوپر معلوم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کر کے عملِ صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب اُمت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ مؤکد ہوگیا کہ اپنے اہل وعیال کی اصلاحِ اعمال واخلاق میں غفلت نہ برتیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعتِ احکام کرنا، اور گھر والوں کو بچانا اُن کو احکامِ الٰہیہ کا سکھانا اور اُن پر عمل کرانے کے لئے زبان سے، ہاتھ سے بقدرِ امکان کوشش کرنا ہے۔ آگے اُس آگ کی دُوسری حالت کا بیان ہے کہ) جس پر تندخو (اور) مضبوط (قوی) فرشتے (متعین) ہیں (کہ نہ وہ کسی پر رحم کریں نہ کوئی اُن کا مقابلہ کر کے بچ سکے) جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو اُن کو حکم دیتا ہے، اور جو کچھ اُن کو حکم دیا جاتا ہے اُس کو (فوراً) بجالاتے ہیں (غرض اس دوزخ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو کافروں کو دوزخ میں داخل کر کے چھوڑیں گے اور اس وقت کافروں سے کہا جائے گا کہ) اے کافرو! تم آج عذر (ومعذرت) مت کرو (کہ بے سود ہے) بس تم کو تو اُسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے۔

معارف ومسائل

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ الآیۃ، اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل وعیال کو بھی، پھر نارِ جہنم کی ہولناک شدت کا ذِکر فرمایا، اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور، طاقت، جتھہ، یا خوشامد، یا رشوت کے ذریعے اُن فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا جو جہنم پر مسلط ہیں، جن کا نام ''زبانیہ'' ہے۔

لفظ ''اَهْلِيْكُمْ'' میں اہل وعیال سب داخل ہیں، جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں، اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور اَحکامِ الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے، اُن کاموں سے ان سب کو منع کرو، اور جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے، تم اُن کے کرنے کا اہل وعیال کو بھی حکم کرو، تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔ (رُوح المعانی) [1]

بیوی اور اولاد کی تعلیم وتربیت ہر مسلمان پر فرض ہے

حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائضِ شرعیہ اور حلال وحرام کے اَحکام کی تعلیم دے اور اُس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میرے بیوی بچو! تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوٰۃ، تمہارا مسکین، تمہارا یتیم، تمہارے پڑوسی، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے۔ ''تمہاری نماز، تمہارا روزہ'' وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے۔ اور ''مِسْكِيْنَكُمْ، يَتِيْمَكُمْ'' وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں اُن کو خوشی اور پابندی سے ادا کرو۔ اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دِین سے جاہل وغافل ہوں۔ (رُوح) [2]

---

[1] تفسیر رُوح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲۱ ص:۱۰۱

[2] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۱۰۱

عام مؤمنین کی نصیحت کے بعد کفار کو خطاب ہے کہ اب تمہارا کیا ہوا تمہارے سامنے آرہا ہے، اب کوئی عذر کسی کا قبول نہیں کیا جا سکتا، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ کا یہی مطلب ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ

اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ، اُمید ہے تمہارا ربّ

اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

اُتار دے تم پر سے تمہاری بُرائیاں اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى

جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور اُن لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ، ان کی روشنی دوڑتی ہے

بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ

اُن کے آگے اور اُن کے داہنے، کہتے ہیں اے رَبّ ہمارے پوری کردے ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو،

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۸ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ

بے شک تو سب کچھ کرسکتا ہے۔ اے نبی لڑائی کر منکروں سے اور دغابازوں سے

وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۹ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

اور سختی کر ان پر اور ان کا گھر دوزخ ہے، اور بُری جگہ جا پہنچے۔ اللہ نے بتلائی ایک مثل

لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ

منکروں کے واسطے، عورت نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے

مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا

ہمارے نیک بندوں میں سے، پھر انہوں نے اُن سے چوری کی، پھر وہ کام نہ آئے اُن کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی،

وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا

اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ نے بتلائی ایک مثل ایمان والوں کے لئے،

امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ

وقف لازم

عورت فرعون کی، جب بولی اے ربّ بنا میرے واسطے اپنے پاس ایک گھر بہشت میں اور بچا نکال مجھ کو

مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾ لا وَمَرْيَمَ ابْنَتَ

فرعون سے اور اس کے کام سے، اور بچا نکال مجھ کو ظالم لوگوں سے۔ اور مریم بیٹی

عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ

عمران کی، جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو، پھر ہم نے پھونک دی اس میں ایک اپنی طرف سے جان، اور سچا جانا

بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾ ع

ع ۲ ۲۰

اپنے ربّ کی باتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور وہ تھی بندگی کرنے والوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری برائیاں تم سے جھاڑ دے، اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کردے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُس دن جب اللہ نبی کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں اُن کو رُسوا نہیں کرے گا۔ اُن کا نور اُن کے آگے اور اُن کی دائیں طرف دوڑ رہا ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہوں گے کہ: "اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے اس نور کو مکمل کردیجئے، اور ہماری مغفرت فرمادیجئے۔ یقیناً آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے

ہیں۔" ⑧ اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو، اور اُن کے مقابلے میں سخت ہو جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ⑨ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، اللہ اُن کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ دونوں ہمارے دو ایسے بندوں کے نکاح میں تھیں جو بہت نیک تھے۔ پھر انہوں نے ان کے ساتھ بے وفائی کی، تو وہ دونوں اللہ کے مقابلے میں اُن کے کچھ بھی کام نہیں آئے، اور (اُن بیویوں سے) کہا گیا کہ: "دُوسرے جانے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں چلی جاؤ۔" ⑩ اور جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا ہے، اُن کے لئے اللہ، فرعون کی بیوی کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہے جب اُس نے کہا تھا کہ: "میرے پروردگار! میرے لئے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے، اور مجھے فرعون اور اُس کے عمل سے نجات دیدے، اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی نجات عطا فرما۔" ⑪ نیز عمران کی بیٹی مریم کو (مثال کے طور پر پیش کرتا ہے) جنہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، تو ہم نے اُس میں اپنی رُوح پھونک دی، اور اُنہوں نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اُس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ طاعت شعار لوگوں میں شامل تھیں۔ ⑫

خلاصۂ تفسیر

(ان آیات میں دوزخ سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے، اور وہی اہل وعیال کو بتلا کر جہنم کی آگ سے بچانے کا طریقہ ہے، وہ یہ ہے) اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو (یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو، اور آئندہ اُس کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو، اس میں تمام احکامِ دین فرائض واجبات بھی داخل ہوگئے کہ اُن کا چھوڑنا گناہ ہے، اور تمام محرمات ومکروہات بھی آگئے کہ اُن کا کرنا گناہ ہے) اُمید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمہارا ربّ (اس توبہ کی بدولت) تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور یہ اُس روز ہوگا) جس دن کہ اللہ، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور جو مسلمان (ایمان اور دِین کی رُو سے) اُن کے ساتھ ہیں اُن کو رُسوا نہ کرے گا، ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا (جیسا کہ سورۂ حدید میں گزر چکا ہے اور وہ) یوں دُعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ ہمارے لئے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھئے (یعنی راستے میں گُل نہ ہو جائے) اور ہماری مغفرت فرما دیجئے، آپ ہر شے پر قادر ہیں (اور اس دُعا کی وجہ یہ ہوگی کہ قیامت میں ہر مؤمن کو کچھ نہ کچھ نور عطا ہوگا، جس وقت پل صراط کے پاس پہنچ کر منافقین کا نور بجھ جائے گا جس کا ذکر سورۂ حدید میں آچکا ہے، اس وقت مؤمنین یہ دُعا کریں گے کہ منافقین کی طرح کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے، کذا فی الدر المنثور عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)[1]

اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بذریعہ تلوار) اور منافقین سے (بذریعہ زبان وبیانِ حجت) جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجئے (دُنیا میں تو یہ اس سزا کے مستحق ہوئے) اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے (آگے اس کا

[1] تفسیر الدر المنثور ج: ۹ ص: ۴۱۶

بیان ہے کہ آخرت میں ہر شخص کو اپنا ہی ایمان کام آئے گا، کافر کو کسی اُس کے خویش وعزیز کا ایمان عذاب سے نہ بچائے گا، اسی طرح مؤمن کے خویش وعزیز کافر ہوں تو مؤمن کو اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا) اللہ تعالیٰ کافروں (کی عبرت) کے لئے نوح کی بی بی اور لوط کی بی بی کا حال بیان فرماتا ہے، وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، سو اُن عورتوں نے اُن دونوں بندوں کا حق ضائع کیا (یعنی بوجہ اُن کے نبی ہونے کے اُن کا حق یہ بھی تھا کہ اُن پر ایمان لاتیں اور دینی اَحکام میں اُن کی اطاعت کرتیں جو انہوں نے نہیں کی) تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلے میں اُن کے ذرا کام نہ آسکے اور ان دونوں عورتوں کو (بوجہ کافر ہو جانے کے) حکم ہو گیا کہ تم دونوں بھی دُوسرے جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ (یہاں تک کافروں کی عبرت کے لئے واقعہ بیان کیا گیا تھا، آگے مسلمانوں کے اطمینان کے لئے فرمایا) اللہ تعالیٰ مسلمانوں (کی تسلی) کے لئے فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) کا حال بیان کرتا ہے جب کہ اُن بی بی نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنایئے اور مجھ کو فرعون (کے شر) سے اور اس کے عمل (کفر کے ضرر اور اَثر) سے محفوظ رکھئے اور مجھ کو تمام ظالم (یعنی کافر) لوگوں (کے ظاہری اور باطنی ضرر) سے محفوظ رکھئے۔ اور (نیز مسلمانوں کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ) عمران کی بیٹی حضرت مریم کا حال بیان کرتا ہے، جنہوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا، سو ہم نے اُن کے چاک گریبان میں (بواسطہ جبرائیل علیہ السلام) اپنی رُوح پھونک دی اور انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کی (جو ملائکہ کے ذریعے پہنچے تھے) اور اُس کی کتابوں کی (جن میں توراۃ وانجیل بھی ہیں) تصدیق کی (یہ بیان ہے اُن کے عقائد کا) اور وہ اِطاعت والوں میں سے تھیں (یہ بیان ہے اُن کے اعمال کا)۔

معارف ومسائل

تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۔ تَوْبَہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رُجوع ہونے کے ہیں، مراد گناہوں سے لوٹنا ہے۔ اور اِصطلاحِ قرآن وسنت میں تَوْبَہ اس کا نام ہے کہ آدمی اپنے پچھلے گناہ پر نادم ہو، اور آئندہ اُس کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم کرے۔ اور نَصُوْح کو اگر مصدر نَصَحَ اور نَصِیْحَۃ سے لیا جائے تو اس کے معنی خالص کرنے کے ہیں، اور مصدر نَصَاحَۃ سے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی کپڑے کو سینے اور جوڑ لگانے کے ہیں۔ پہلے معنی کے اعتبار سے نَصُوْح کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ رِیا اور نمود سے خالص ہو، محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوفِ عذاب سے گناہ پر نادم ہو کر اس کو چھوڑ دے۔ اور دُوسرے معنی کے اعتبار سے نَصُوْح اس مطلب کے لئے ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کا لباس جو گناہ کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تو یہ اس کے خرق یعنی پھٹن کو جوڑنے والی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ آدمی اپنے گزشتہ عمل پر نادم ہو اور پھر اس کی طرف نہ لوٹنے کا پختہ اِرادہ اور عزم رکھتا ہو۔ اور کلبی نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ زبان سے

اِستغفار کرے اور دِل میں نادم ہو، اور اپنے بدن اور اعضا کو آئندہ اُس گناہ سے روکے۔

اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جس میں چھ چیزیں جمع ہوں: ۱- اپنے گزشتہ بُرے عمل پر ندامت۔ ۲- جو فرائض و واجبات اللہ تعالیٰ کے چھوٹے ہیں اُن کی قضا۔ ۳- کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا تو اُس کی واپسی۔ ۴- کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی تھی تو اُس سے معافی۔ ۵- آئندہ اُس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم و اِرادہ۔ ۶- اور یہ کہ جس طرح اُس نے اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اب وہ اِطاعت کرتے ہوئے دیکھ لے۔ (مظہری) [۱]

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے جو شرائطِ توبہ بیان فرمائی ہیں وہ سبھی کے نزدیک مُسلَّم ہیں، بعض نے مختصر، بعض نے مفصل بیان کر دیا ہے۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ الآیۃ، لفظ عَسٰى کا ترجمہ اُمید ہے، اور یہاں مراد اُس سے وعدہ ہے مگر اس وعدے کو بلفظِ اُمید تعبیر کر کے اس طرف اِشارہ کر دیا کہ توبہ ہو، یا اِنسان کے دُوسرے اعمالِ صالحہ، ان میں سے کوئی بھی جنت و مغفرت کی قیمت نہیں، اور نہ اللہ کے ذمہ اَز رُوئے انصاف یہ لازم آتا ہے کہ جو عملِ صالح کرے اس کو ضرور جنت ہی میں داخل کرے، کیونکہ اعمالِ صالحہ کا ایک بدلہ تو ہر اِنسان کو دُنیوی زندگی میں عطا ہونے والی نعمتوں سے مل چکا ہے، اس کے بدلے میں اَز رُوئے قانون و قاعدہ جنت ملنا ضروری نہیں، وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و اِنعام ہی پر موقوف ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کسی کو صرف اس کا عمل نجات نہیں دلاسکتا، صحابہ عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کو بھی، آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کا معاملہ نہ فرمائیں۔ (بخاری و مسلم، از مظہری) [۲]

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ الآیۃ، آخر سورت میں حق تعالیٰ نے چار عورتوں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، پہلی دو عورتیں دو پیغمبروں کی بیویاں ہیں جنہوں نے دِین کے معاملے میں اپنے شوہروں کی مخالفت کی، کفار و مشرکین کی اِمداد و موافقت خفیہ کرتی رہیں، اس کے نتیجے میں جہنم میں گئیں۔ اللہ کے مقبول و برگزیدہ پیغمبروں کی زوجیت بھی ان کو عذاب سے نہ بچاسکی، ان میں ایک حضرت نوح علیہ السلام کی بی بی ہے جن کا نام "داغلہ" بیان کیا گیا ہے، اور دُوسری حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی جس کا نام "والہہ" کہا گیا ہے، (قرطبی) [۳] ان کے ناموں میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ تیسری وہ عورت ہے جو سب سے بڑے کافر، خدائی کے مدعی فرعون کی بیوی تھی، مگر موسیٰ علیہ السلام پر اِیمان لے آئی، اُس کو

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۴۵

[۲] تفسیر المظهری ج:۹ ص:۳۴۶، وصحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، ج:۲ ص:۹۵۷، وصحیح مسلم، کتاب صفة المنافقین، باب صفة القیامة ...إلخ، باب لن یدخل احد الجنة ج:۲ ص:۳۷۶

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۰۱

اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا کہ دُنیا ہی میں اس کو جنت کا مقام دِکھلا دیا، شوہر کی فرعونیت اس کی راہ میں کچھ حائل نہیں ہوسکی۔

چوتھی حضرت مریم ہیں، جو کسی کی بی بی نہیں مگر ایمان اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ درجہ دیا کہ ان کو نبوّت کے کمالات عطا فرمائے، اگرچہ جمہور اُمت کے نزدیک نبی نہیں۔

ان سب مثالوں سے یہ واضح کر دیا کہ ایک مؤمن کا ایمان اس کے کسی کافر عزیز کے کام نہیں آسکتا، اور ایک کافر کا کفر اُس کے کسی مؤمن عزیز کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے انبیاء و اولیاء کی بیویاں اس پر بے فکر نہ ہوں کہ ہمیں ہمارے شوہروں کی وجہ سے نجات ہو ہی جائے گی، اور کسی کافر، فاجر کی بیوی یہ فکر نہ کرے کہ اس کا کفر میرے لئے کسی مضرّت کا سبب بن جائے گا، بلکہ ہر ایک مرد و عورت کو اپنے ایمان و عمل کی فکر خود کرنا چاہئے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ الآیۃ، یہ مثال فرعون کی بیوی حضرت آسیہ بنت مزاحم کی ہے، جس وقت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے مقابلے میں کامیاب ہوئے اور جادوگر مسلمان ہوگئے تو اس بی بی نے اپنے ایمان کا اِظہار کر دیا، فرعون نے ان کو سخت سزا دینا تجویز کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کو چومیخہ کر کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا، یعنی چاروں ہاتھوں پیروں میں میخیں گاڑ دیں کہ حرکت نہ کر سکیں، اس حالت میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ تجویز کیا کہ اُوپر سے بہت بھاری پتھر اُن کے سر پر ڈال دیا جائے، ابھی ڈالنے نہیں پائے تھے کہ انہوں نے دُعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی رُوح قبض کر لی، پتھر بے جان جسم پر گرا۔ اور دُعا میں یہ فرمایا کہ میرے ربّ! جنت میں اپنے پاس گھر بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا ہی میں اُن کو جنت کا گھر دِکھلا دِیا۔ (مظہری)[1]

وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ، کلماتِ ربّ سے مراد اللہ کے نازل کردہ صحیفے ہیں جو انبیاء علیہم السلام پر اُترتے ہیں۔ اور کتب سے مراد معروف آسمانی کتابیں: اِنجیل، زَبور، تورات ہیں۔ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ﴿۱۲﴾ قانت کی جمع ہے، جس کے معنی عابد کے ہیں، جو اپنی عبادت وطاعت پر مداومت کرتا ہے، یہ حضرت مریم کی صفت ہے۔ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں میں سے بہت لوگ کامل و مکمل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں سے صرف آسیہ فرعون کی بیوی اور مریم بنت عمران کامل ہوئیں۔ (بخاری ومسلم، از مظہری)[2] ظاہر یہ ہے کہ مراد کمالاتِ نبوّت ہیں کہ باوجود عورت ہونے کے ان کو حاصل ہوئے۔ (مظہری)[3] واللہ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّحْرِیْمِ بِعَوْنِ اللّٰهِ وَحَمْدِهٖ فِیْ غُرَّةِ رَجَب ۱۳۹۱ھ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ

---

[1] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۷۴

[2] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۸۴، وصحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا ج:۱ ص:۵۳۲، وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل خدیجۃ رضی اللہ عنہا، ج:۲ ص:۲۸۳

[3] تفسیر المظہری ج:۹ ص:۳۸۴

سُورَةُ المُلك

آیاتها ۳۰ ۶۷ سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ ۷۷ رکوعاتها ۲

سورۂ ملک مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی تیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ز وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ ① الَّذِيْ خَلَقَ

بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے راج اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے، جس نے بنایا

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَهُوَ الْعَزِيْزُ

مرنا اور جینا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام، اور وہ زبردست ہے

الْغَفُوْرُ ۙ ② الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ

بخشنے والا، جس نے بنائے سات آسمان تہ پر تہ، کیا دیکھتا ہے تو رحمٰن کے بنانے میں

مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ

کچھ فرق پھر دوبارہ نگاہ کر کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ پھر لوٹا کر نگاہ کر

كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ④ وَلَقَدْ زَيَّنَّا

دو دو بار لوٹ آئے گی تیرے پاس تیری نگاہ رَدّ ہوکر تھک کر۔ اور ہم نے رونق دی

السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا

سب سے ورلے آسمان کو چراغوں سے اور اُن سے کر رکھی ہے ہم نے پھینک مار شیطانوں کے واسطے، اور رکھا ہے

لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ⑤ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ

اُن کے واسطے عذاب دہکتی آگ کا۔ اور جو لوگ منکر ہوئے اپنے رَبّ سے اُن کے واسطے ہے عذاب دوزخ کا

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑥ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ⑦ ۙ

اور بُری جگہ جا پہنچے۔ جب اس میں ڈالے جائیں گے سنیں گے اس کا دہاڑنا اور وہ اُچھل رہی ہوگی،

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ

ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے، جس وقت پڑے اُس میں ایک گروہ پوچھیں اُن سے دوزخ کے داروغہ

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ⑧ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا

کیا نہ پہنچا تھا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا وہ بولیں کیوں نہیں ہمارے پاس پہنچا تھا ڈر سنانے والا، پھر ہم نے جھٹلا دیا

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ⑨

اور کہا نہیں اُتاری اللہ نے کوئی چیز تم تو پڑے ہوئے ہو بڑے بہکاوے میں

وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١٠﴾

اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے دوزخ والوں میں

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ

سو قائل ہوگئے اپنے گناہ کے اب دفع ہوجائیں دوزخ والے۔ جو لوگ ڈرتے ہیں

رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١٢﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ

اپنے رَبّ سے بن دیکھے اُن کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا۔ اور تم چھپا کر کہو اپنی بات یا کھول کر،

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٣﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ

وہ خوب جانتا ہے جیوں کے بھید۔ بھلا وہ نہ جانے جس نے بنایا اور وہی ہے بھید جاننے والا

الْخَبِيْرُ ﴿١٤﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا

خبردار۔ وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست، اب چلو پھرو

فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿١٥﴾ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ

اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اُسی کی طرف جی اُٹھنا ہے۔ کیا تم نڈر ہوگئے اس سے

فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ

جو آسمان میں ہے اس سے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں، پھر تبھی وہ لرزنے لگے۔ یا نڈر ہوگئے ہو اُس سے

مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿١٧﴾

جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسادے تم پر مینہ پتھروں کا، سو جان لوگے کیسا ہے میرا ڈرانا

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا

اور جھٹلا چکے ہیں جو اُن سے پہلے تھے، پھر کیسا ہوا میرا اِنکار اور کیا نہیں دیکھتے ہو

اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۘؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ

وقف غفران

اُڑتے جانوروں کو اپنے اُوپر پَر کھولے ہوئے اور پَر جھپکتے ہوئے اُن کو کوئی نہیں تھام رہا رحمٰن کے سوائے

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ

اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز۔ بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری مدد کرے تمہاری

مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾ ۚ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ

رحمٰن کے سوائے منکر پڑے ہیں بُرے بہکائے میں۔ بھلا وہ کون ہے جو

يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ

روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی کوئی نہیں پر اَڑ رہے ہیں شرارت اور بدکنے پر۔ بھلا ایک جو چلے

مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾

اَوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا

تو کہہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا اور بنا دیئے تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دِل تم بہت تھوڑا

مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

حق مانتے ہو تو کہہ وہی ہے جس نے بکھیر دیا تم کو زمین میں اور اُسی کی طرف اِکٹھے کئے جاؤ گے۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ
اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو تو کہہ خبر تو ہے

عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً
اللہ ہی کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر۔ پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آلگا

سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾
تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ
تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کردے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو

مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
عذاب دردناک سے تو کہہ وہی رحمٰن ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ
سو اب تم جان لوگے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں۔ تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہوجائے صبح کو

ع ٢ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾ ع
پانی تمہارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

بڑی شان ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ ①
جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے، اور وہی ہے جو
مکمل اِقتدار کا مالک، بہت بخشنے والا ہے، ② جس نے سات آسمان اُوپر تلے پیدا کئے۔ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی
فرق نہیں پاؤ گے۔ اب پھر سے نظر دوڑا کر دیکھو کیا تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ ③ پھر بار بار نظر دوڑاؤ، نتیجہ یہی ہوگا کہ نظر
تھک ہار کر تمہارے پاس نامراد لوٹ آئے گی۔ ④ اور ہم نے قریب والے آسمان کو روشن چراغوں سے سجا رکھا ہے، اور ان
کو شیطانوں پر پتھر برسانے کا ذریعہ بھی بنایا ہے، اور ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ⑤ اور جن لوگوں نے
اپنے پروردگار سے کفر کا معاملہ کیا ہے، اُن کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ⑥ جب وہ اُس میں
ڈالے جائیں گے تو اُس کے دہاڑنے کی آوازیں سنیں گے، اور وہ جوش مارتی ہوگی، ⑦ ایسا لگے گا جیسے وہ غصّے سے پھٹ پڑے
گی۔ جب بھی اُس میں (کافروں کا) کوئی گروہ پھینکا جائے گا تو اُس کے محافظ اُن سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی
خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ ⑧ وہ کہیں گے کہ ہاں بیشک ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا، مگر ہم نے (اُسے)
جھٹلا دیا، اور کہا کہ: "اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا، تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم بڑی بھاری گمراہی میں پڑے
ہوئے ہو۔" ⑨ اور وہ کہیں گے کہ: "اگر ہم سن لیا کرتے اور سمجھ سے کام لیا کرتے تو (آج) دوزخ والوں میں شامل نہ
ہوتے۔" ⑩ اس طرح وہ اپنے گناہ کا خود اِعتراف کرلیں گے۔ غرض پھٹکار ہے دوزخ والوں پر! ⑪ (اس کے برخلاف)
جو لوگ بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اُن کے لئے بیشک مغفرت اور بڑا اَجر ہے۔ ⑫ اور تم اپنی بات چھپا کر
کرو، یا زور سے کرو، (سب اُس کے علم میں ہے، کیونکہ) وہ دِلوں تک کی باتوں کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ ⑬ بھلا جس نے
پیدا کیا وہی نہ جانے؟ جبکہ وہ بہت باریک بین، مکمل طور پر باخبر ہے! ⑭ وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو رام کر دیا
ہے، لہٰذا تم اُس کے مونڈھوں پر چلو پھرو، اور اُس کا رِزق کھاؤ، اور اُسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ ⑮ کیا تم آسمان
والے کی اس بات سے بے خوف ہو بیٹھے ہو کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، تو وہ ایک دم تھرتھرانے لگے؟ ⑯ یا کیا تم
آسمان والے کی اس بات سے بے خوف ہو بیٹھے ہو کہ وہ تم پر پتھروں کی بارش برسا دے؟ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میرا ڈرانا
کیسا تھا؟ ⑰ اور ان سے پہلے جو لوگ تھے، انہوں نے بھی (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا۔ پھر (دیکھ لو کہ) میرا عذاب کیسا

تھا؟ ⑱ اور کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اُوپر نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا کہ وہ پَروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، اور سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ اُن کو خدائے رحمٰن کے سوا کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز کی خوب دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ ⑲ بھلا خدائے رحمٰن کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کرے؟ کافر لوگ تو نرے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ⑳ اگر وہ اپنا رِزق بند کر دے تو بھلا وہ کون ہے جو تمہیں رزق عطا کر سکے؟ اس کے باوجود وہ سرکشی اور بیزاری پر جمے ہوئے ہیں۔ ㉑ بھلا جو شخص اپنے منہ کے بل اوندھا چل رہا ہو، وہ منزل تک زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ جو ایک سیدھے راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہو؟ ㉒ کہہ دو کہ: "وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دِل بنائے۔ (مگر) تم لوگ شکر تھوڑا ہی کرتے ہو۔" ㉓ کہہ دو کہ: "وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا، اور اُسی کے پاس تمہیں اِکٹھا کر کے لے جایا جائے گا۔" ㉔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟" ㉕ کہہ دو کہ: "اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے، اور میں تو بس صاف صاف طریقے پر خبردار کرنے والا ہوں۔" ㉖ پھر جب وہ اس (قیامت کے عذاب) کو پاس آتا دیکھ لیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے، اور کہا جائے گا کہ: "یہ ہے وہ چیز جو تم مانگا کرتے تھے۔" ㉗ (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: "ذرا یہ بتلاؤ کہ چاہے اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرما دے، (دونوں صورتوں میں) کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟" ㉘ کہہ دو کہ: "وہ رحمٰن ہے، ہم اس پر اِیمان لائے ہیں، اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ چنانچہ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کون ہے جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔" ㉙ کہہ دو کہ: "ذرا یہ بتلاؤ کہ اگر کسی صبح تمہارا پانی نیچے کو اُتر کر غائب ہو جائے تو کون ہے جو تمہیں چشمے سے اُبلتا ہوا پانی لا کر دیدے؟ ㉚

خلاصۂ تفسیر

وہ (خدا) بڑا عالی شان ہے جس کے قبضے میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے (حسنِ عمل میں موت کا تو دخل یہ ہے کہ موت کی فکر سے انسان دُنیا فانی اور قیامت کے اعتقاد سے آخرت کو باقی سمجھ کر وہاں کے ثواب حاصل کرنے اور وہاں کے عذاب سے بچنے کے لئے مستعد ہو سکتا ہے، اور حیات کا دخل یہ ہے کہ اگر حیات نہ ہو تو عمل کس وقت کرے؟ پس حسنِ عمل کے لئے موت بمنزلہ شرط کے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے۔ اور چونکہ موت عدمِ محض نہیں ہے، اس لئے اس پر مخلوقیت کا حکم صحیح ہے) اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے (کہ اعمالِ غیر حسنہ پر عتاب اور اعمالِ حسنہ پر مغفرت و ثواب مرتب فرماتا ہے)

جس نے سات آسمان اُوپر تلے پیدا کئے (جیسے حدیث صحیح میں ہے کہ ایک آسمان سے اُوپر بفاصلہ دراز دُوسرا آسمان ہے، پھر اسی طرح اس سے اُوپر تیسرا وعلیٰ ھٰذا۔ آگے آسمان کا اِستحکام بیان فرماتے ہیں کہ اے دیکھنے والے!) تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا، سو (اب کی بار) پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے (یعنی بلا تامل تو بہت بار دیکھا ہوگا، اب کی بار تأمل سے نگاہ کر) پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی (اور کوئی رَخنہ نظر نہ آئے گا، یعنی وہ جس چیز کو جیسا چاہے بنا سکتا ہے، چنانچہ آسمان کو مضبوط بنانا چاہا کہ باوجود زمانِ دراز گزر جانے کے اب تک اس میں کوئی خلل نہیں آیا۔ وھذا کقولہ تعالیٰ: وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ [1] (ق) اسی طرح کسی شے کو ضعیف اور جلد متأثر ہونے والی بنا دیا، غرض اس کو ہر طرح کی قدرت ہے) اور (ہماری قدرت کی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے، اور ہم نے ان (ستاروں) کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے (جس کی حقیقت سورۂ حجر میں گزری ہے) اور ہم نے ان (شیاطین) کے لئے (شہاب کی مار کے علاوہ جو کہ دُنیا میں ہوتا ہے، آخرت میں بوجہ ان کے کفر کے) دوزخ کا عذاب (بھی) تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اپنے رَبّ (کی توحید) کا انکار کرتے ہیں، اُن کے لئے دوزخ کا عذاب ہے، اور وہ بُری جگہ ہے۔ جب یہ لوگ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی ایک بڑی زور کی آواز سنیں گے، اور وہ اس طرح جوش مارتی ہوگی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ (ابھی) غصّے کے مارے پھٹ پڑے گی (یا تو اللہ تعالیٰ اس میں اِدراک اور غصہ پیدا کر دے گا کہ مبغوضینِ حق پر اس کو بھی غیظ آئے گا، اور یا مقصود تمثیل ہے، یعنی جیسے کوئی غصّے سے جوش میں آتا ہے اسی طرح وہ شدّتِ اِشتعال سے جوش میں آئے گی، اور) جب اس میں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جائے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا تھا (جس نے تم کو اس عذاب سے ڈرایا ہو، جس کا مقتضا یہ تھا کہ اس سے ڈرتے اور بچنے کا سامان کرتے۔ یہ سوال بطور توبیخ ہے، یعنی پیغمبر تو آئے تھے، اور یہ سوال ہر نئے جانے والے گروہ سے ہوگا کیونکہ دوزخ میں حسب تفاوت مراتبِ کفر سب فرقے کفار کے یکے بعد دیگرے جائیں گے)۔ وہ کافر (بطور اِعتراف کے) کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر) آیا تھا، سو (ہماری شامت تھی کہ) ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ نے (اَز قبیل اَحکام و کتب) کچھ نازل نہیں کیا (اور) تم بڑی غلطی میں پڑے ہو۔ اور (وہ کافر فرشتوں سے یہ بھی) کہیں گے کہ ہم اگر سنتے یا سمجھتے (یعنی پیغمبروں کے کہنے کو قبول کرتے اور مانتے) تو ہم اہلِ دوزخ میں (شامل) نہ ہوتے، غرض اپنے جرم کا اِقرار کریں گے، سو اہلِ دوزخ پر لعنت ہے۔ بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں (اور اِیمان و اطاعت اِختیار کرتے ہیں) ان کے لئے مغفرت اور اَجرِ عظیم (مقرّر) ہے۔ اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر

[1] ترجمہ: اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں۔

کہو (اس کو سب خبر ہے، کیونکہ) وہ دِلوں تک کی باتوں سے خوب آگاہ ہے (اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین ہے (اور) پورا باخبر ہے (حاصل اِستدلال کا یہ ہے کہ وہ ہر شے کا خالقِ مختار ہے، پس تمہارے احوال واقوال کا بھی خالق ہے اور کسی چیز کی تخلیق بغیر علم کے نہیں ہوسکتی، اس لئے اللہ کو ہر چیز کا علم ضروری ہوا، اور تخصیص اقوال کی مقصود نہیں بلکہ حکم عام ہے، افعال بھی اس میں داخل ہیں، تخصیص ذکری شاید اس بنا پر ہو کہ اقوال کثیر الوقوع ہیں، غرض اس کو سب علم ہے، وہ ہر ایک کو مناسب جزا دے گا) وہ ایسا (منعم) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، (کہ تم اس میں ہر طرح کے تصرفات کرسکتے ہو) سو تم اس کے رستوں میں چلو (پھرو) اور خدا کی روزی میں سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ (پیو) اور (کھاپی کر اس کو یاد رکھنا کہ) اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے (پس یہ اس کو مقتضی ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر اَدا کرو جو اِیمان وطاعت ہے) کیا تم لوگ اُس سے بے خوف ہوگئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم کو (مثل قارون کے) زمین میں دھنسا دے، پھر وہ زمین تھرتھرا (کر اُلٹ پلٹ ہو) نے لگے (جس سے تم اور نیچے اُتر جاؤ، اور زمین کے اجزا تمہارے اُوپر آکر مل جائیں) یا تم لوگ اس سے بے خوف ہوگئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم پر (مثل عاد کے) ایک ہوائے تند بھیج دے (جس سے تم ہلاک ہوجاؤ یعنی مقتضا تمہارے کفر کا یہی ہے) سو (اگر کسی مصلحت سے عذابِ عاجل تم پر سے ٹل رہا ہے تو کیا ہوا) عنقریب (مرتے ہی) تم کو معلوم ہوجائے گا کہ میرا ڈرانا (عذاب سے) کیسا (واقع اور صحیح) تھا۔ اور (اگر بدون عذابِ عاجل کے کفر کا مبغوض ہونا ان کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا نمونہ بھی موجود ہے، چنانچہ) ان سے پہلے جو لوگ ہوگزرے ہیں اُنہوں نے (دِینِ حق کو) جھٹلایا تھا سو (دیکھ لو ان پر) میرا عذاب کیسا (واقع) ہوا (جس سے صاف معلوم ہوا کہ کفر مبغوض ہے، پس اگر کسی مصلحت سے یہاں عذاب ٹل گیا تو دُوسرے عالم میں حسبِ وعید واقع ہوگا۔ اور اُوپر الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ... اِلخ میں وہ دلائلِ توحید بیان ہوئے جو آسمان کے متعلق ہیں، پھر هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ... اِلخ میں زمین کے متعلق چیزوں کا بیان ہوا، آگے ''جوّ'' یعنی فضائے آسمانی کے متعلقہ دلائل کا بیان ہے) کیا ان لوگوں نے اپنے اُوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پَر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں اور (کبھی اسی حالت میں) پَر سمیٹ لیتے ہیں (اور دونوں حالتوں میں باوجود ثقیل اور وزنی ہونے کے زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں پھرتے رہتے ہیں، زمین پر نہیں گر جاتے، اور) بجز (خدائے) رحمٰن کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (اور جس طرح چاہے اس میں تصرف کر رہا ہے) ہاں (خدا کے تصرفات تو سن لئے اب بتلاؤ کہ) رحمٰن کے سوا وہ کون ہے کہ وہ تمہارا لشکر بن کر (آفات سے) تمہاری حفاظت کرسکے (اور) کافر (جو اپنے معبودوں کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں) تو (وہ) نرے دھوکے میں ہیں۔ (اور) ہاں (یہ بھی بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو تم کو روزی پہنچائے اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی بند کرلے، (مگر

یہ لوگ اس سے بھی متاثر نہیں ہوتے) بلکہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت (عن الحق) پر جم رہے ہیں۔ (خلاصہ یہ کہ تمہارے معبوداتِ باطلہ بت وغیرہ نہ کسی مضرّت کے دفع پر قادر ہیں، وھو المراد بقولہٖ تعالیٰ: یَنْصُرُکُمْ اور نہ اِیصالِ منافع پر قادر ہیں، وھو المراد بقولہٖ تعالیٰ: یَرْزُقُکُمْ، پھر ان کی عبادت محض بے وقوفی ہے، یعنی جس کافر کا حال اُوپر سنا ہے اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۝۲۰ ، بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۝۲۱) سو (اس کو سن کر سوچو کہ) کیا جو شخص (بوجہ ناہموار ی راہ کے ٹھوکریں کھاتا ہوا اور) منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزلِ مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہو گا یا وہ شخص (زیادہ منزلِ مقصود پر پہنچنے والا ہو گا) جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو (یہی حال ہے مؤمن وکافر کا کہ مؤمن کے چلنے کا رستہ بھی دینِ مستقیم ہے، اور وہ چلتا بھی ہے سیدھا ہو کر، اِفراط وتفریط سے بچ کر، اور کافر کے چلنے کا رستہ بھی زیغ وضلالت کا ہے، اور چلنے میں بھی ہر وقت مہالک ومخاوف میں گرتا جاتا ہے، پس ایسی حالت میں کیا منزل پر پہنچے گا اور اُوپر دلائلِ توحید متعلق آفاق کے تھے، آگے متعلق اَنفس کے اِرشاد ہیں) آپ (ان سے) کہئے کہ وہی (ایسا قادر ومنعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں اور دِل دیئے (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (اور) آپ (یہ بھی) کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو رُوئے زمین پر پھیلایا اور تم اسی کے پاس (قیامت کے روز) اِکٹھے کئے جاؤ گے۔ اور یہ لوگ (جب قیامت کا ذِکر سنتے ہیں کما فی ھٰذہ السُّورۃ من قولہ: وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝۱۵ ، ومن قولہ: وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴ تو) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہو گا اگر تم (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین مؤمنین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ یہ (تعیین کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو محض (علی الاجمال مگر) صاف صاف ڈرانے والا ہوں، پھر جب اس (عذابِ قیامت) کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے (پاس آتا ہوا دیکھنا یہ کہ اعمال کا محاسبہ ہو گا، دوزخ میں جانے کا حکم ہو گا، جس سے متیقن ہو جائے گا کہ اب عذاب سر پر آ گیا، غرض جب اس کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے) تو (مارے غم کے) کافروں کے منہ بگڑ جائیں گے (کقولہٖ تعالیٰ: وَوُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱ [1] (عَبَسَ)) اور (ان سے) کہا جائے گا یہی ہے وہ جس کو تم مانگا کرتے تھے (کہ عذاب لاؤ، عذاب لاؤ، اور یہ کفار ان مضامینِ حقہ توحید وبعث وغیرہ کو سن کر جو ایسی باتیں کرتے ہیں شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰ [2] (الطّور)، اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا [3] (الفرقان: ۴۲)، جن کا حاصل انتظار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہلاکت اور آپ کو نعوذ باللہ منسوب الی الضلال کرنا ہے، آگے اس کے جواب کی تعلیم ہے، جس میں عذابِ کفار کی تقریر اور دُوسرے مضامین سے اس کی تتمیم ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ (ان سے) کہئے

[1] ترجمہ: بہت سے چہروں پر اس روز ظلمت ہوگی، ان پر کدورت چھائی ہوگی۔
[2] ترجمہ: یہ شاعر ہیں ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔
[3] ترجمہ: اس شخص نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم ان پر قائم نہ رہتے۔

کہ تم یہ بتلاؤ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے ساتھ والوں کو (موافق تمہاری تمنا کے) ہلاک کردے یا (ہماری اُمید اور اپنے وعدے کے مطابق) ہم پر رحمت فرمادے تو (دونوں حالت میں اپنی خبر لو اور یہ بتلاؤ کہ) کافروں کو عذابِ دردناک سے کون بچالے گا (یعنی ہماری تو جو حالت ہوگی دُنیا میں ہوگی اور اَنجام اس کا ہر حال میں اچھا ہے کقولہٖ تعالیٰ: قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ...إلخ [1] (التوبة: ۵۲) مگر اپنی کہو کہ تم پر جو مصیبتِ عظیمہ آنے والی ہے اس کو کون روکے گا، اور ہمارے دُنیوی حوادث سے تمہاری وہ مصیبت کیسے ٹل جائے گی تو اپنی فکر چھوڑ کر ہمارے حوادث کا انتظار ایک فضول حرکت ہے، یہ جواب نَّتَرَبَّصُ...إلخ کا۔ اور) آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے، ہم اس پر (اس کے حکم کے موافق) ایمان لائے اور ہم اس پر توکل کرتے ہیں (پس ایمان کی برکت سے تو وہ ہم کو عذابِ آخرت سے محفوظ رکھے گا اور توکل کی برکت سے حوادثِ دُنیویہ کو دفع یا سہل کردے گا، یہ بھی "نَّتَرَبَّصُ" کا تتمۂ جواب ہے) سو (جب تم پر عذابِ الیم آنے والا ہے اور ہم اِن شاء اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے اس عذاب سے محفوظ رہنے والے ہیں تو) عنقریب تم کو معلوم ہوجائے گا (جب اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا اور ہم کو اس سے محفوظ دیکھو گے) کہ صریح گمراہی میں کون ہے، (یعنی تم ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں، یا ہم ہیں جیسا کہ تم کہتے ہو۔ یہ جواب ہے اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا...إلخ کا، آگے تقریر ہے مضمونِ بالا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ...إلخ کی یعنی اُوپر جو کہا گیا ہے کہ تم کو عذابِ الیم سے کوئی نہیں بچاسکتا، ان کو اگر اپنے آلہۂ باطلہ کا گھمنڈ ہو کہ وہ بچالیں گے، تو اس زعم کے اِبطال و اِزالہ کے لئے ان سے) آپ (یہ) کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی (جو کنوؤں میں ہے) نیچے کو (اُتر کر) غائب ہی ہوجائے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آئے (یعنی کنویں کی سوت کو جاری کردے اور اَعماقِ اَرض سے اُوپر لے آئے، اور اگر کسی کو کھود لینے پر ناز ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس کو اور نیچے غائب کردے، وعلیٰ ھٰذا، پس جب خدا کے مقابلے میں کسی کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ معمولی طبعی واقعات میں تصرف کرسکے تو عذابِ آخرت سے بچانے کی کیا قدرت ہوگی)۔

معارف و مسائل

فضائل سورۂ ملک

اس سورت کو حدیث میں "وَاقِيَة" اور "مُنْجِيَة" بھی فرمایا ہے۔ "وَاقِيَة" کے معنی بچانے والی، اور "مُنْجِيَة" کے معنی نجات دینے والی۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "هِيَ الْمَانِعَةُ الْمُنْجِيَةُ تُنْجِيْهِ مِنْ

[1] ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک بہتری ہی کے منتظر رہتے ہو۔

عَذَابِ الْقَبْرِ "، یعنی یہ سورت عذاب کو روکنے والی، اور عذاب سے نجات دینے والی ہے، یہ اپنے پڑھنے والے کو عذابِ قبر سے بچالے گی۔ (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسنٌ غریبٌ۔ اَز قرطبی) [۱]

اور حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دِل چاہتا ہے کہ سورۂ ملک ہر مؤمن کے دِل میں ہو۔ (ذکرہ الثعلبی) [۲] اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں ایک ایسی سورت ہے جس کی آیتیں تو صرف تیس ہیں، قیامت کے روز یہ ایک شخص کی سفارش کرے گی یہاں تک کہ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردے گی، اور وہ سورۂ تبارک ہے۔ (قرطبی، از ترمذی) [۳]

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ۝۱ لفظ "تَبٰرَكَ" برکت سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا جاتا ہے تو سب سے بالا و برتر ہونے کے معنی میں آتا ہے، جیسے "اللہ اکبر"۔ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ اللہ کے ہاتھ میں ہے مُلک، اللہ جل شانہٗ کے لئے قرآنِ کریم میں جابجا لفظ "یَدٌ" بمعنی ہاتھ استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ جسم اور اعضا سے بالا و برتر ہے، اس لئے یہ لفظ متشابہات میں سے ہے، جس کے حق ہونے پر اِیمان لانا واجب ہے، اور اس کی کیفیت وحقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی، اُس کے درپے ہونا دُرست نہیں۔ اور مُلک سے مراد آسمانوں اور زمینوں کی اور دُنیا و آخرت کی حکومت ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ کے لئے چار صفات کا دعویٰ ہے۔ اوّل اس کا موجود ہونا، دُوسرے انتہائی درجے کی صفاتِ کمال کا مالک اور سب سے بالا و برتر ہونا، تیسرے آسمان و زمین پر اُس کی حکومت ہونا، چوتھے ہر چیز پر اُس کا قادر ہونا۔ اگلی آیات میں اس دعوے کے دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہی میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتے ہیں، اس لئے اگلی آیات میں تمام کائنات مخلوقات کی مختلف انواع واصناف سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر اور اس کے کمالِ علم وقدرت پر اِستدلال کیا گیا ہے، سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان کے اپنے وجود میں جو دلائلِ قدرت ہیں اُن کی طرف متوجہ فرمایا: الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ ...اِلخ، میں اس کا بیان ہے اس کے بعد کئی آیتوں میں آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر سے اِستدلال فرمایا الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ الآیۃ۔ اس کے بعد زمین کی تخلیق اور اُس کے فوائد متعلقہ میں غور و فکر کا بیان هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا سے دو آیتوں میں فرمایا۔ پھر فضائے آسمانی میں رہنے والی مخلوق پرندوں کا ذِکر فرمایا اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ ...اِلخ۔ غرض اس پوری سورت

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الفضائل، باب ما جاء فی سورة الملك ج:۲ ص:۱۱۶، وتفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۰۷

[۲] القرطبی ج:۱۸ ص:۲۰۵، والمستدرك للحاكم، كتاب التفسیر، رقم الحدیث:۲۰۷۶، وشعب الإیمان للبیهقی، كتاب تخصیص سور منها بالذكر، فصل فی فضائل السور والآیات، رقم الحدیث:۲۲۷۷

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۰۵، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی سورة الملك ج:۲ ص:۱۱۶

میں اصل مضمون حق تعالیٰ کے وجود، اور اس کے کمالِ علم وقدرت پر کائناتِ عالم کے مشاہدے سے دلائل پیش کرنا ہے، ضمناً دُوسرے مضامین کفار کی سزا اور مؤمنین کی جزا کے بھی آگئے ہیں۔ خود اِنسان کے نفس میں جو دلائل اللہ تعالیٰ کے کمالِ علم وقدرت کے ہیں، اُن کی طرف دو لفظوں سے ہدایت فرمائی۔

موت وحیات کی حقیقت

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ یعنی پیدا کیا اس نے موت اور حیات کو۔ اَحوالِ انسانی میں سے یہاں صرف دو چیزیں موت وحیات بیان کی گئیں، کیونکہ یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے اَحوال وافعال پر حاوی ہیں۔ حیات کے لئے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے کہ حیات ایک وجودی چیز ہے، تخلیق وتکوین کا اُس سے متعلق ہونا ظاہر ہے، لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے، اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا، اس کے جواب میں ائمۂ تفسیر سے متعدّد اَقوال منقول ہیں، سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدمِ محض کا نام نہیں، بلکہ رُوح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے رُوح کو ایک مکان سے دُوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے، اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال ہے، جو جسمِ انسانی پر طاری ہوتا ہے، اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دُوسرے ائمۂ تفسیر سے جو یہ منقول ہے کہ موت وحیات دو مجسم مخلوق ہیں، موت ایک مینڈھے کی شکل میں اور حیات ایک گھوڑی کی شکل میں ہے، اس سے مراد بظاہر اس صحیح حدیث کا بیان ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ جب قیامت میں اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں داخل ہوچکیں گے تو موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور پل صراط کے پاس اُس کو ذبح کر کے اعلان کردیا جائے گا اب جو جس حالت میں ہے، وہ دائمی اور اَبدی ہے، اب کسی کو موت نہیں آئے گی۔[١] مگر اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دُنیا میں موت کوئی جسم ہو، بلکہ جس طرح دُنیا کے بہت سے اَحوال واعمال قیامت میں مجسم اور متشکل ہوجائیں گے، جو بہت سی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اسی طرح موت جو اِنسان کو پیش آنے والی ایک حالت ہے وہ بھی قیامت میں مجسم ہوکر مینڈھے کی شکل میں ذبح کردی جائے گی۔[٢] (قرطبی)

اور تفسیر مظہری[٣] میں فرمایا کہ موت اگرچہ عدمی چیز ہے مگر عدمِ محض نہیں، بلکہ ایسی چیز کا عدم ہے جس کو وجود میں کسی وقت آنا ہے، اور ایسے تمام معدومات کی شکلیں عالمِ مثال میں قبل اَز وجود ناسوتی موجود ہوتی ہیں، جن کو اعیانِ ثابتہ کہا

---

[١] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنّة والنّار، ج:٢ ص:٩٦٩، وصحیح مسلم، کتاب الجنة، باب جهنم اعاذنا الله منها ج:٢ ص:٣٨٢

[٢] تفسیر القرطبی ج:١٨ ص:٢٠٦

[٣] تفسیر المظهری ج:١٠ ص:١٨، ١٩

جاتا ہے، ان اشکال کی وجہ سے ان کو قبل الوجود بھی ایک قسم کا وجود حاصل ہے اور عالمِ مثال کے موجود ہونے پر بہت سی روایاتِ حدیث سے اِستدلال فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

موت وحیات کے درجاتِ مختلفہ

تفسیر مظہری [۱] میں ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے اپنی قدرت اور حکمتِ بالغہ سے مخلوقات وممکنات کو مختلف اقسام میں تقسیم فرما کر ہر ایک کو حیات کی ایک قسم عطا فرمائی ہے، سب سے زیادہ کامل ومکمل حیات انسان کو عطا فرمائی، جس میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت ایک خاص حد تک حاصل کر سکے، اور یہ معرفت ہی بناء تکلیف اَحکامِ شرعیہ اور وہ بارِ اَمانت ہے جس کے اُٹھانے سے آسمان وزمین اور پہاڑ سب ڈر گئے اور اِنسان نے اپنی اس خداداد صلاحیت کے سبب اُٹھالیا، اس حیات کے مقابل وہ موت ہے جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی آیت: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ [۲] (الانعام:۱۲۲) میں ذکر فرمایا ہے کہ کافر کو مردہ اور مؤمن کو زِندہ قرار دیا گیا، کیونکہ کافر نے اپنی اُس معرفت کو ضائع کر دیا جو اِنسان کی مخصوص حیات تھی، اور بعض اصناف واقسام مخلوقات میں یہ درجہ حیات کا تو نہیں مگر حس وحرکت موجود ہے، اس کے مقابل وہ موت ہے جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی آیت: وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ [۳] (البقرۃ:۲۸) میں آیا ہے کہ اس جگہ حیات سے مراد حس وحرکت اور موت سے مراد اس کا ختم ہو جانا ہے۔ اور بعض اقسام ممکنات میں یہ حس وحرکت بھی نہیں صرف نمو (بڑھنے کی صلاحیت) ہے، جیسے عام درختوں اور نباتات میں اس کے بالمقابل وہ موت ہے جس کا ذِکر قرآن کی آیت: يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا [۴] (الحدید:۱۷) میں آیا ہے۔ حیات کی یہ تین قسمیں انسان، حیوان، نبات میں منحصر ہیں، ان کے علاوہ اور کسی چیز میں یہ اقسامِ حیات نہیں ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ نے پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کے متعلق فرمایا: اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ [۵] (النحل:۲۱) لیکن اس کے باوجود جمادات میں بھی ایک خاص حیات موجود ہے، جو وجود کے ساتھ لازم ہے، اسی حیات کا اثر ہے جس کا ذِکر قرآنِ کریم میں ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل:۴۴) یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ اور آیت میں موت کا ذِکر مقدم کرنے کی وجہ بھی اس بیان سے واضح ہوگئی کہ اصل کے اعتبار سے موت ہی مقدم ہے، ہر چیز جو وجود میں آئی ہے پہلے موت کے عالم

---

[۱] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۱۸

[۲] ترجمہ: ایسا شخص جو کہ پہلے مُردہ تھا ہم نے اس کو زندہ بنادیا۔

[۳] ترجمہ: حالانکہ تھے تم محض بے جان سوتم کو جاندار کیا پھر تم کو موت دیں گے پھر زندہ کریں گے۔

[۴] ترجمہ: زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ کردیتا ہے۔

[۵] ترجمہ: مردے ہیں زندہ نہیں۔

میں تھی، بعد میں اس کو حیات عطا ہوئی ہے، اس لئے موت کا ذکر مقدم کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آگے جو موت وحیات کی تخلیق کی وجہ انسان کی آزمائش و ابتلا کو قرار دیا ہے: لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا یہ آزمائش بہ نسبت حیات کے موت میں زیادہ ہے، کیونکہ جس شخص کو اپنی موت کا استحضار ہوگا وہ اچھے اعمال کی پابندی زیادہ سے زیادہ کرے گا۔ اور اگرچہ یہ آزمائش حیات میں بھی ہے کہ زندگی کے قدم قدم پر اس کو اپنا عجز اور اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کا استحضار ہوتا رہتا ہے جو حسنِ عمل کی طرف داعی ہے، لیکن موت کی فکر اصلاحِ عمل اور حسنِ عمل میں سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

حضرت عمار بن یاسر کی حدیثِ مرفوع میں ہے: ''كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا، وَكَفٰى بِالْيَقِيْنِ غِنًى '' یعنی موت وعظ کے لئے کافی ہے، اور یقین غنیٰ کے لئے۔ (رواہ الطبرانی) [۱] مراد یہ ہے کہ اپنے دوستوں عزیزوں کی موت کا مشاہدہ سب سے بڑا واعظ ہے، جو اس سے متأثر نہیں ہوتا اس کا دُوسری چیزوں سے متأثر ہونا مشکل ہے، اور جس کو اللہ نے ایمان یقین کی دولت عطا فرمائی، اس کے برابر کوئی غنی و بے نیاز نہیں۔ اور ربیع بن انس نے فرمایا کہ موت انسان کو دُنیا سے بیزار کرنے اور آخرت کی طرف رغبت دینے کے لئے کافی ہے۔

أَحْسَنُ عَمَلًا یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ انسان کی اس آزمائش میں جو اس کی موت وحیات سے وابستہ ہے، حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے یہ نہیں فرمایا کہ کس کا عمل زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی مقدار کا زیادہ ہونا قابلِ توجہ نہیں، بلکہ عمل کا اچھا اور صحیح ومقبول ہونا معتبر ہے، اسی لئے قیامت میں انسان کے اعمال کو گنا نہیں جائے گا، بلکہ تولا جائے گا، جس میں بعض ایک ہی عمل کا وزن ہزاروں اعمال سے بڑھ جائے گا۔

حُسنِ عمل کیا ہے

حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی یہاں تک کہ أَحْسَنُ عَمَلًا تک پہنچے تو فرمایا کہ أَحْسَنُ عَمَلًا وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو، اور اللہ کی اطاعت میں ہر وقت مستعد و تیار ہو۔ (قرطبی) [۲]

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③ اس آیت سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا والے آسمان کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ نیلگوں فضا جو دِکھائی دیتی ہے یہی آسمان ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آسمان اس سے بہت اُوپر

---

[۱] شعب الإيمان للبيهقي، باب الزهد وقصر الأمل، رقم الحديث: ١٠٠٧٢، ومعجم لابن الاعرابي، رقم الحديث: ٩٦٢

[۲] تفسير القرطبي ج:١٨ ص:٢٠٧، واتحاف الخيرة المهرة، رقم الحديث: ٥٢٥٨، ومسند الحارث رقم الحديث: ٨٣١

ہو اور یہ نیلگوں رنگ ہوا اور فضا کا ہو، جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں، مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آسمان انسان کو نظر ہی نہ آئے، ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں فضا شفاف ہونے کے سبب اصل آسمان کو جو اس سے بہت اُوپر ہے دیکھنے میں مانع نہ ہو۔ اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے آسمان کو آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا تو پھر اس آیت میں رُویت سے مراد رُویتِ عقلی یعنی غور و فکر ہوگا۔ (بیان القرآن) [۱]

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ، مَصَابِيْحَ سے مراد ستارے ہیں، اور نیچے کے آسمان کو ستاروں سے مزین کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ستارے آسمان کے اندر یا اس کے اُوپر لگے ہوئے ہوں، بلکہ یہ تزیین اس صورت میں بھی صادق ہے جب کہ ستارے آسمان سے بہت نیچے خلا میں ہوں، جیسا کہ تحقیقِ جدید سے اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، یہ اُس کے منافی نہیں۔ اور ستاروں کو شیاطین کے دفع کرنے کے لئے انگارے بنا دینے کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ستاروں میں سے کوئی مادّہ آتشیں ان کی طرف چھوڑ دِیا جاتا ہو، ستارے اپنی جگہ رہتے ہوں، عوام کی نظر میں چونکہ یہ شعلہ ستارے کی طرح حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اس لئے اس کو ستارہ ٹوٹنا اور عربی میں ''اِنْقِضَاضُ الْكَوْكَبِ'' کہہ دیتے ہیں۔ (قرطبی) [۲]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین جو آسانی خبریں چرانے کے لئے چڑھتے ہیں، وہ کواکب اور ستاروں سے نیچے ہی دفع کر دیئے جاتے ہیں۔ (قرطبی) [۳] یہاں تک مختلف مخلوقات میں غور و فکر کے ذریعے حق تعالیٰ کے کمالِ علم وقدرت کے دلائل بیان ہوئے، آگے منکرین اور کفار کا عذاب اور پھر مؤمنین اور اِطاعت شعار لوگوں کا ثواب بیان ہوا ہے وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ سے سات آیتوں تک یہ مضمون چلا ہے، آگے پھر وہی علم وقدرت کا بیان ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا، ذَلُوْلٌ کے لفظی معنی منقاد و مطیع کے ہیں، اس جانور کو ذَلُوْلٌ کہا جاتا ہے جو سواری دینے میں شوخی نہ کرے۔ مَنَاكِبُ، مَنْكَبٌ کی جمع ہے، مونڈھے کو کہتے ہیں۔ کسی بھی جانور کا مونڈھا سواری کی جگہ نہیں ہوتی، بلکہ اُس کی کمر یا گردن ہوتی ہے، جو جانور سوار ہونے والوں کے لئے اپنے مونڈھے بھی پیش کر دے وہ بہت ہی مطیع و منقاد اور مسخر ہوسکتا ہے، اس لئے فرمایا کہ زمین کو تمہارے لئے ہم نے ایسا مسخر و مطیع بنا دیا ہے کہ تم اس کے مونڈھوں پر چڑھتے پھرو۔ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام بخشا ہے کہ نہ تو پانی کی طرح سیال اور بہنے والا ہے، نہ رُوئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا رہنا، ٹھہرنا ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح زمین کو لوہے، پتھر کی طرح

---

[۱] تفسیر بیان القرآن ج:۳ ص:۸۱۳ تحت هٰذه الآية (طبع دار الاشاعت کراچی)

[۲] تفسير القرطبی، تفسیر سورة الجنّ ج:۱۹ ص:۱۲

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۱۱

سخت بھی نہیں بنایا، اگر ایسا ہوتا تو اس میں درخت اور کھیتی نہ بوئی جاسکتی، اس میں کنویں اور نہریں نہ کھودی جاسکتیں، اس کو کھود کر اُونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جاسکتی، اس قوام کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اُس پر عمارتیں ٹھہر سکیں، چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۖ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿١٥﴾ پہلے زمین کے اطراف میں چلنے پھرنے کی ہدایت فرمائی، اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کا رزق کھاؤ۔ اس میں اشارہ ہوسکتا ہے کہ تجارت کے لئے سفر اور مال کی درآمد، برآمد اللہ کے رزق کا دروازہ ہے، وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿١٥﴾ میں بتلا دیا کہ کھانے پینے، رہنے سہنے کے فوائد زمین سے حاصل کرنے کی اجازت ہے، مگر موت اور آخرت سے بےفکر نہ ہو کہ انجامِ کار اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، زمین پر رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں لگے رہو، اس میں تو اس بات سے ڈرایا گیا تھا کہ آخر کار قیامت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے، آگے اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زمین پر رہنے بسنے کے وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے، ارشاد فرمایا:-

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾ کیا تم اس سے بےخوف ہو کہ آسمان والا تمہیں زمین کے اندر خسف کر کے دھنسا دے اور زمین تمہیں نگل جائے، یعنی اگرچہ اللہ نے زمین کو ایسا معتدل قوام دیا ہے کہ آدمی بغیر کھودے ہوئے اس کے اندر نہیں اُتر سکتا، لیکن وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کو ایسا بنا دے کہ یہی زمین اپنے اُوپر رہنے والوں کو نگل جائے، اس کے بعد دُنیا میں بسنے والوں کو ایک اور طرح کے عذاب سے ڈرایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہارے اُوپر یعنی آسمان سے پتھر بھی برسا کر تمہیں ہلاک کیا جاسکتا ہے، اللہ کے منکر اور نافرمان دُنیا میں اس سے بےفکر ہو کر نہ بیٹھیں۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿١٧﴾ یعنی کیا تم اس سے بےخوف ہو کہ آسمان والا تم پر آسمان سے پتھر برسا دے، اس وقت تمہیں اس ڈرانے کا انجام معلوم ہوگا، مگر اس وقت معلوم ہونا بےسود ہوگا، آج جب کہ تم صحیح سالم محفوظ و مامون ہو، اس کی فکر کرو۔ اس کے بعد پچھلی ان قوموں کے واقعات کی طرف اشارہ کیا جن پر دُنیا میں عذابِ الٰہی نازل ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کرو۔ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿١٨﴾ کا یہی مطلب ہے۔ اس کے بعد پھر اصل مضمونِ سورت کی طرف رُجوع ہے کہ ممکنات مخلوقات کے حالات سے حق تعالیٰ کی توحید اور علم وقدرت پر اِستدلال ہے، خود اِنسان کے نفوس، آسمان، ستارے، زمین وغیرہ کے حالات کا بیان پہلے آچکا ہے، آگے ان پرندوں کا ذِکر ہے جو فضائے آسمانی میں اُڑتے پھرتے ہیں۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ الآیۃ، یعنی کیا وہ پرندوں کو اپنے سروں پر اُڑتے ہوئے نہیں دیکھتے، جو کبھی اپنے بازوؤں کو پھیلا دیتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں، ان میں غور کرو کہ یہ وزنی جسم ہیں، عام قاعدے کی رُو سے وزنی جسم جب اُوپر چھوڑا جائے تو اُسے زمین پر گر جانا چاہئے، ہوا ان وزنی جسموں کو عام طور پر نہیں روک سکتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان پرندے جانوروں کو ایسی وضع پر بنایا ہے کہ وہ ہوا پر ٹھہر سکیں، اور ہوا پر اپنے اجسام کا بوجھ ڈالنے اور اس میں تیرتے ہوئے پھرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس بظاہر بے عقل وشعور جانور کو یہ سلیقہ سکھا دیا ہے کہ وہ اپنے پَروں کو پھیلانے اور سمیٹنے کے ذریعے ہوا کو مسخر کر لیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ہوا میں یہ صلاحیت پیدا کرنا، پرندوں کے پَروں کو اس وضع پر بنانا، پھر اُن کو اپنے پروں کے ذریعے ہوا پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ سکھانا، یہ سب حق تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ سے ہے۔

یہاں تک ممکنات وموجودات کی مختلف اصناف کے حالات میں غور وفکر کے ذریعے حق تعالیٰ کے وجود اور توحید اور بے نظیر علم وقدرت کے دلائل جمع فرمائے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور وفکر کرنے والے کو حق تعالیٰ پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں رہتا، آگے ختم سورت تک کفار وفجار منکرین اور بدعمل لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے، پہلے اس پر تنبیہ کی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہیں تو دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو نہیں روک سکتی، تمہارے لشکر اور سپاہی اُس سے تم کو نہیں بچا سکتے، چنانچہ ارشاد فرمایا:-

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ﴿٢٠﴾ اس کے بعد اس سے ڈرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا جو رزق تم کو آسمان سے پانی برسنے اور زمین سے نباتات اُگانے کے ذریعہ مل رہا ہے، یہ کوئی تمہاری ذاتی جاگیر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا وبخشش ہے، وہ اس کو روک بھی سکتا ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ کا یہی مطلب ہے۔ آگے کفار کے حال پر افسوس ہے جو نہ آیاتِ قدرت میں خود غور کرتے ہیں، نہ دُوسرے بتانے والوں کی بات سنتے ہیں: بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿٢١﴾ یعنی یہ لوگ برابر اپنی سرکشی اور حق سے دُوری میں بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ آگے میدانِ قیامت میں کافر ومؤمن کا جو حال ہونا ہے اس کا ذِکر ہے کہ قیامت کے میدان میں کفار اس طرح حاضر کئے جائیں گے کہ پاؤں پر چلنے کے بجائے سر کے بل چلیں گے۔ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام نے سوال کیا کہ کفار چہرے کے بل کیسے چلیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس ذات نے اُن کو پیروں پر چلایا ہے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ اُن کو چہروں اور سروں کے بل چلا دے، [1] اسی کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے:-

[1] صحیح البخاري، کتاب الرقاق، باب کیف الحشر، ج:٢ ص:٩٦٥، وصحیح مسلم، کتاب صفة القیامة، باب في الکفار ج:٢ ص:٣٧٤

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ یعنی کیا وہ آدمی جو اوندھا اپنے چہرے کے بل چلے زیادہ ہدایت پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا چلنے والا ہے سیدھا چلنے والے سے مراد مؤمن ہے کہ ہدایت یافتہ وہی ہوسکتا ہے۔ آگے پھر اِنسانی تخلیق میں حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے چند مظاہر کا بیان ہے:-

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان، آنکھیں اور دِل بنائے، مگر تم لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

سمع و بصر اور قلب کی تخصیص

اس میں اعضائے انسانی میں سے اُن تین اعضا کا ذِکر ہے جن پر علم واِدراک اور شعور موقوف ہے۔ فلاسفہ نے علم واِدراک کے پانچ ذریعے بیان کئے ہیں، جن کو حواسِ خمسہ کہا جاتا ہے۔ یعنی سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا۔ سونگھنے کے لئے ناک، اور چکھنے کے لئے زبان، اور چھونے کی قوّت سارے بدن میں حق تعالیٰ نے رکھی ہے، سننے کے لئے کان، اور دیکھنے کے لئے آنکھ بنائی ہے، یہاں حق تعالیٰ نے ان پانچوں چیزوں میں سے صرف دو کا ذِکر کیا ہے، یعنی کان اور آنکھ۔ وجہ یہ ہے کہ سونگھنے چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے، اس کے معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے، اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوئی ہیں، اُن میں سنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدر جہا، زائد ہوتی ہیں، اس لئے اس جگہ حواسِ خمسہ میں سے صرف دو پر اِکتفا کیا گیا ہے کہ بیشتر معلومات انسانی اِن ہی دو راہوں سے حاصل ہوتی ہے، اور تیسری چیز قلب کو بتلایا ہے کہ وہ اصل بنیاد اور مرکز علم کا ہے، کانوں سے سنی ہوئی اور آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا علم بھی قلب پر موقوف ہے۔ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ قلب کو مرکزِ علم قرار دِیا ہے، بخلاف فلاسفہ کے کہ وہ دِماغ کو اس کا مرکز مانتے ہیں۔

اس کے بعد پھر کفار و منکرین کو تنبیہ اور عذاب کی وعید کا بیان ہے۔ آخرِ سورت میں پھر ایک جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اُس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اُگانے کا کام لینے والو! اس بات کو نہ بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمہاری ذاتی جاگیر نہیں، صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہے کہ اس نے پانی برسایا اور اُس پانی کو برف کی شکل میں بحرِ منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دِیا کہ سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے، پھر اس برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کی عروق کے ذریعے زمین کے اندر اُتار دِیا، اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو، مگر یہ پانی جو اس نے زمین کی اُوپر ہی کی سطح پر رکھ دیا ہے جس

کو چند فٹ یا گز زمین کھود کر نکالا جا سکتا ہے، یہ مالک وخالق کا عطیہ ہے، اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کے نیچے کی سطح پر اُتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝۳۰ یعنی آپ ان لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اس بات پر غور کریں کہ جو پانی کنووں کے ذریعے بآسانی نکال کر پی رہے ہو، اگر وہ پانی زمین کی گہرائی میں اُتر جائے تو تمہاری کون سی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے، حدیث میں ہے کہ جب آدمی یہ آیت تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہئے: ''اَللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ''، یعنی اللہ ربّ العالمین ہی پھر اس کو لا سکتا ہے، ہماری کسی کی طاقت نہیں۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْمُلْكِ بِحَمْدِ اللهِ فِيْ ثَالِثِ رَجَب ۱۳۹۱ھ يَوْمَ الْخَمِيْسِ

سورۃ القلم

اٰیاتھا ٥٢ ٦٨ سُوْرَۃُ الْقَلَمِ مَکِّیَّۃٌ ٢ رکوعاتھا ٢

سورۂ قلم مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی باون آیتیں ہیں، اور اس میں دو رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ ②

نٓ قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں، تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ،

وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ

اور تیرے واسطے بدلہ ہے بے انتہا، اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر، سو اب تو بھی دیکھ لے گا

وَیُبْصِرُوْنَ ⑤ بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ

اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ کون ہے تم میں جو بچل رہا ہے، بے شک تیرا رب وہی خوب جانے اُس کو جو بہکا

عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٧﴾ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٨﴾

اس کی راہ سے اور وہی خوب جانتا ہے راہ پانے والوں کو، سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ﴿٩﴾ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿١٠﴾ هَمَّازٍ

وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں، اور تو کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا، طعنے دے

مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ﴿١١﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ﴿١٣﴾

چغلی کھاتا پھرے بھلے کام سے روکے حد سے بڑھے بڑا گنہگار اُجڈ ان سب کے پیچھے بدنام

أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ﴿١٤﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ

اس واسطے کہ رکھتا ہے مال اور بیٹے، جب سنائے اس کو ہماری باتیں کہے یہ نقلیں ہیں

الْأَوَّلِينَ ﴿١٥﴾ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ ﴿١٦﴾ إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا

پہلوں کی اب داغ دیں گے ہم اس کو سونڈ پر۔ ہم نے اُن کو جانچا ہے جیسے جانچا تھا

أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿١٧﴾ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ﴿١٨﴾

باغ والوں کو، جب ان سب نے قسم کھائی کہ اس کا میوہ توڑیں گے صبح ہوتے، اور اِن شاء اللہ نہ کہا،

فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿١٩﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿٢٠﴾

پھر پھیرا کر گیا اُس پر کوئی پھیرے والا تیرے ربّ کی طرف سے اور وہ سوتے ہی رہے، پھر صبح تک ہو رہا جیسے ٹوٹ چکا،

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ﴿٢١﴾ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ﴿٢٢﴾

پھر آپس میں بولے صبح ہوتے کہ سویرے چلو اپنے کھیت پر اگر تم کو توڑنا ہے

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾

پھر چلے اور آپس میں کہتے تھے چپکے چپکے کہ اندر نہ آنے پائے اس میں آج تمہارے پاس کوئی محتاج

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾

اور سویرے چلے لپکتے ہوئے زور کے ساتھ پھر جب اس کو دیکھا بولے ہم تو راہ بھول آئے

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾

نہیں ہماری تو قسمت پھوٹ گئی بولا بچلا اُن کا میں نے تم کو نہ کہا تھا کہ کیوں نہیں پاکی بولتے اللہ کی

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

بولے پاک ذات ہے ہمارے رب کی ہم ہی تقصیر وار تھے پھر منہ کرکر ایک دوسرے کی طرف لگے

يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا

اُلاہنا دینے بولے ہائے خرابی ہماری ہم ہی تھے حد سے بڑھنے والے شاید ہمارا رب بدل دے ہم کو

خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط

اس سے بہتر ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں یوں آتی ہے آفت

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ ع ۱ (وقف لازم)

اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے اگر ان کو سمجھ ہوتی البتہ ڈرنے والوں کو

عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

ان کے رب کے پاس باغ ہیں نعمت کے کیا ہم کردیں گے حکم برداروں کو برابر گناہگاروں کے

مَا لَكُمْ وقفة كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾ ج اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ لا

کیا ہوگیا تم کو کیسے ٹھہراتے ہو بات کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں پڑھ لیتے ہو

اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾ ج اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ

اُس میں ملتا ہے تم کو جو تم پسند کرلو کیا تم نے ہم سے قسمیں لے لی ہیں ٹھیک پہنچنے والی

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لا اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾ ج سَلْهُمْ اَيُّهُمْ

قیامت کے دن تک کہ تم کو ملے گا جو کچھ تم ٹھہراؤ گے پوچھ ان سے کون سا ان میں

بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿٤٠﴾ ج اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ج فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا ع ٥

اس کا ذمہ لیتا ہے کیا اُن کے واسطے کوئی شریک ہیں پھر تو چاہئے لے آئیں اپنے اپنے شریکوں کو اگر وہ

صٰدِقِيْنَ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ

سچے ہیں۔ جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی اور وہ بلائے جائیں سجدہ کرنے کو

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٤٢﴾ لا خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ط وَ قَدْ كَانُوْا

پھر نہ کرسکیں جھکی پڑتی ہوں گی اُن کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی اُن پر ذلت اور پہلے اُن کو

يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ

بلاتے رہے سجدہ کرنے کو اور وہ تھے اچھے خاصے اب چھوڑ دے مجھ کو اور اُن کو جو کہ جھٹلائیں

بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ط سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٤﴾ لا

اس بات کو اب ہم سیڑھی سیڑھی اُتاریں گے اُن کو جہاں سے اُن کو پتہ بھی نہیں

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ

اور اُن کو ڈھیل دیئے جاتا ہوں بے شک میرا داؤ پکا ہے۔ کیا تو مانگتا ہے اُن سے کچھ حق سو اُن پر تاوان کا

مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ

بوجھ پڑ رہا ہے کیا اُن کے پاس خبر ہے غیب کی سو وہ لکھ لاتے ہیں اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ وقف لازم

اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا، جب پکارا اُس نے اور وہ غصہ میں بھرا تھا، اگر نہ

اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَاۗءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾

سنبھالتا اس کو احسان تیرے رب کا تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

پھر نوازا اُس کو اُس کے رب نے پھر کر دیا اس کو نیکوں میں اور منکر تو لگ ہی رہے ہیں کہ

لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ ۘ وقف لازم

پھسلا دیں تجھ کو اپنی نگاہوں سے جب سنتے ہیں قرآن اور کہتے ہیں وہ تو باؤلا ہے

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع

اور یہ قرآن تو یہی نصیحت ہے سارے جہان والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

نٓ۔ (اے پیغمبر!) قسم ہے قلم کی، اور اس چیز کی جو وہ لکھ رہے ہیں، ① اپنے پروردگار کے فضل سے تم دیوانے نہیں ہو، ② اور یقین جانو تمہارے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ③ اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔ ④ چنانچہ تم بھی دیکھ لوگے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے ⑤ کہ تم میں سے کون دیوانگی میں مبتلا ہے ⑥ یقیناً تمہارا پروردگار اُسے بھی خوب جانتا ہے جو اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے، اور اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جنہوں نے سیدھی راہ پالی ہے۔ ⑦ لہٰذا تم ان کی باتوں میں نہ آنا جو (تمہیں) جھٹلا رہے ہیں، ⑧ یہ چاہتے ہیں کہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔ ⑨ اور کسی بھی ایسے شخص کی باتوں میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھانے والا، بے وقعت شخص ہے، ⑩ طعنے دینے کا عادی ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، ⑪ بھلائی سے روکنے والا، زیادتی کرنے والا، بدعمل ہے ⑫ بدمزاج ہے، اور اس کے علاوہ نچلے نسب والا بھی۔ ⑬ صرف اس وجہ سے کہ وہ بڑے مال اور اولاد والا ہے۔ ⑭ جب اُس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ⑮ عنقریب ہم اُس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے۔ ⑯ ہم نے ان (مکہ والوں) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جیسے (ایک) باغ والوں کو اُس وقت آزمائش میں ڈالا تھا جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح ہوتے ہی ہم اس باغ کا پھل توڑ لیں گے ⑰ اور (یہ کہتے ہوئے) وہ کوئی اِستثناء نہیں کر رہے تھے۔ ⑱ پھر ہوا یہ کہ جس وقت وہ سو رہے تھے، اُس وقت تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اُس باغ پر پھیرا لگا گئی، ⑲ جس سے وہ باغ صبح کو کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہوگیا۔ ⑳ پھر صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دُوسرے کو آواز دی، ㉑ کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو اپنے کھیت کی طرف سویرے چل نکلو۔ ㉒ چنانچہ وہ ایک دُوسرے سے چپکے چپکے یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے ㉓ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس اُس باغ میں نہ آنے پائے۔ ㉔ اور وہ بڑے زوروں میں تیز تیز چلتے ہوئے نکلے۔ ㉕ پھر جب اُس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ: ''ہم ضرور راستہ بھٹک گئے ہیں، ㉖ (پھر کچھ دیر کے بعد کہا کہ:) نہیں! بلکہ ہم سب لٹ گئے ہیں۔'' ㉗ ان میں جو شخص سب سے اچھا تھا، وہ کہنے لگا: ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟'' ㉘ کہنے لگے: ''ہم اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے ہیں، یقیناً ہم ظالم تھے۔'' ㉙ پھر ایک دُوسرے کی طرف متوجہ ہوکر ایک دُوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ㉚ (پھر) سب نے (متفق ہوکر) کہا کہ: ''افسوس ہے ہم سب پر! یقیناً ہم سب نے سرکشی اِختیار کرلی تھی۔ ㉛ کیا بعید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمیں اس باغ کے بدلے اُس سے اچھا

عطا فرمادے۔ بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔'' (۳۲) عذاب ایسا ہی ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب یقیناً سب سے بڑا ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے! (۳۳) البتہ متقیوں کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس نعمتوں بھرے باغات ہیں۔ (۳۴) بھلا کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کردیں گے؟ (۳۵) تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم کیسی باتیں طے کرلیتے ہو؟ (۳۶) کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم یہ پڑھتے ہو (۳۷) کہ تمہیں وہاں وہی کچھ ملے گا جو تم پسند کروگے؟ (۳۸) یا تم نے ہم سے قیامت کے دن تک باقی رہنے والی قسمیں لے رکھی ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تم طے کروگے؟ (۳۹) (اے پیغمبر!) ان سے پوچھو کہ: ''ان میں سے کون ہے جس نے اس بات کی ضمانت لے رکھی ہو؟'' (۴۰) کیا خدائی میں ان کے مانے ہوئے کچھ شریک ہیں (جو یہ ضمانت لیتے ہوں؟) تو پھر لے آئیں اپنے ان شریکوں کو، اگر وہ سچے ہیں! (۴۱) جس دن ساق کھول دی جائے گی، اور ان کو سجدے کے لئے بلایا جائے گا تو یہ سجدہ کرنہیں سکیں گے۔ (۴۲) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ان پر ذِلت چھائی ہوئی ہوگی۔ اُس وقت بھی انہیں سجدے کے لئے بلایا جاتا تھا جب یہ لوگ صحیح سالم تھے، (اُس وقت قدرت کے باوجود یہ انکار کرتے تھے) (۴۳) لہٰذا (اے پیغمبر!) جو لوگ اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں اُنہیں مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم انہیں اس طرح دھیرے دھیرے (تباہی کی طرف) لے جائیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ (۴۴) اور میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں۔ یقین رکھو میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ (۴۵) کیا تم ان سے کوئی اُجرت مانگ رہے ہو کہ وہ تاوان کے بوجھ سے دبے جارہے ہیں؟ (۴۶) یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے وہ لکھ رہے ہوں؟ (۴۷) غرض تم اپنے پروردگار کا حکم آنے تک صبر کئے جاؤ، اور مچھلی والے کی طرح مت ہوجانا، جب انہوں نے غم سے گھٹ گھٹ کر (ہمیں) پکارا تھا۔ (۴۸) اگر ان کے پروردگار کے فضل نے انہیں سنبھال نہ لیا ہوتا تو انہیں بُری حالت کے ساتھ اُسی کھلے میدان میں پھینک دیا جاتا۔ (۴۹) پھر ان کے پروردگار نے انہیں منتخب فرمالیا، اور انہیں صالحین میں شامل کردیا۔ (۵۰) جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے جب وہ نصیحت کی یہ بات سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنی (تیز تیز) آنکھوں سے تمہیں ڈگمگا دیں گے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو دیوانہ ہے۔ (۵۱) حالانکہ یہ تو دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے ایک نصیحت ہی نصیحت ہے۔ (۵۲)

خلاصۂ تفسیر

نٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) قسم ہے قلم کی (جس سے مقادیرِ خلق لوحِ محفوظ پر لکھے گئے) اور (قسم ہے) ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتبِ اعمال ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے وَالْقَلَمِ اور وَمَا يَسْطُرُوْنَ کی یہی

تفسیر فرمائی ہے۔ (دُرّ منثور)[1] آگے جوابِ قسم ہے) کہ آپ اپنے رَبّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرینِ نبوّت کہتے ہیں (کذا فی الدر عن ابن جُریج فی سبب النّزول)[2] مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبیٔ برحق ہیں اور یہ قسمیں اس مدعا کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ من جملہ مقادیر کے نزولِ قرآن بھی ہے، پس اس آیت میں اشارہ ہے کہ نبوّت آپ کی علمِ الٰہی میں پہلے ہی سے محقق ومؤکد ہے، پس ثبوت اس کا متیقن ہوا اور اعمال لکھنے والے فرشتے مصدقین ومنکرین کے اعمال کو لکھ رہے ہیں، پس انکارِ نبوّت پر سزا ہوگی، اس سے ڈر کر اِیمان لانا واجب ہے) اور بے شک آپ کے لئے (اس تبلیغِ اَحکام پر) ایسا اَجر (ملنے والا) ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں (اس میں بھی تقریر ہے نبوّت کی جو مستلزم ہے نفی مطاعن کو اور تقریر نبوّت کے ساتھ متضمن ہے تسلی کو بھی کہ آپ چند روز برداشت کرلیجئے کہ انجام اس کا اَجرِ عظیم ہے) اور بے شک آپ کے اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں (کہ ہر فعل آپ کا موصوف باعتدال اور قرین رضائے ایزدمتعال ہے، اور مجنون میں اخلاق کا کمال کہاں ہوتا ہے یہ بھی جواب ہے طعنِ مذکور کا، آگے تسلیہ ہے یعنی یہ جو ایسے مہملات بکتے ہیں) سو (اس کا غم نہ کیجئے کیونکہ) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں کس کو جنون (حقیقی) تھا (یعنی جنون کی حقیقت ہے زوالِ عقل، اور عقل کی غایت ہے اِدراکِ نفع وضرر، اور ضررِ معتد بہ وہ ہے جو اَبدی ہو، پس قیامت میں ان کو بھی معلوم ہوجائے گا کہ عاقل اہلِ حق تھے، جنہوں نے اس نفع کو حاصل کیا اور مجنون یہ خود تھے جو اس نفع سے محروم رہ کر ضررِ اَبدی میں مبتلا ہوئے اور چونکہ) آپ کا پروردگار اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ راہِ (راست) پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے (اس لئے ہر ایک کے مناسب جزا وسزا دے گا، اور اس جزا وسزا کے مناسب ہونے کو یہ منکرین بھی اس وقت سمجھ لیں گے جب حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ عاقل کون تھا مجنون کون، آگے ذم منکرین کا مضمون ہے کہ جب آپ حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں) تو آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ مانئے (جیسا کہ اب تک نہیں مانا، اور وہ کہنا وہ ہے جو آگے مفہوم ہوتا ہے یعنی) یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ اپنے منصبی کام میں کہ تبلیغ ہے، ذرا) ڈھیلے ہوجائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہوجائیں (آپ کا ڈھیلا ہونا یہ کہ بت پرستی کی مذمت نہ کریں، اور ان کا ڈھیلا ہونا یہ کہ آپ کی مخالفت نہ کریں، سورۂ کافرون کی تفسیر میں اِبنِ عباسؓ نے ڈھیلے ہونے کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔ دُرّ منثور)[3] اور آپ (بالخصوص) کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت

---

[1] تفسیر الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۱۴ ص:۲۱۹

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۲۲۰

[3] تفسیر الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۱۴ ص:۲۲۴

قسمیں کھانے والا ہو (مراد جھوٹی قسم کھانے والا ہے، عادۃً اکثر جھوٹے آدمی قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں، اور جو اپنی حرکاتِ شنیعہ کی وجہ سے عنداللہ وعندالخلق) بے وقعت ہوں (دِل دُکھانے کے لئے) طعنہ دینے والا ہو، چغلیاں لگاتا پھرتا ہو، نیک کام سے روکنے والا ہو، حدِّ (اعتدال) سے گزرنے والا ہو، گناہوں کا (اِرتکاب) کرنے والا ہو، سخت مزاج ہو (اور) اس (سب) کے علاوہ بدنام (بھی) ہو (مراد ولدالزنا اور مطلب یہ ہے کہ اور اَخلاق وافعال بھی اس کے خبیث ہوں، چونکہ غالباً ولدالزنا کے اخلاق وافعال اچھے نہیں ہوتے اس لئے مجازاً اس سے یہ مراد لیا گیا، خلاصہ یہ کہ اوّل تو مطلقاً مکذبین کا، پھر خصوص جب کہ وہ مکذبین ان ذمائم کے ساتھ بھی متصف ہوں جیسا کہ آپ کے مکذبین میں سے بعض بڑے بڑے ایسے ہی تھے اور اس درخواست میں شریک بلکہ اس کے بانی تھے، غرض آپ ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے اور وہ بھی محض) اس سبب سے کہ وہ مال اور اولاد والا ہو، (یعنی دُنیا کی وجاہت رکھتا ہو، اور ایسے شخص کی اِطاعت سے اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی یہ عادت ہے کہ) جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ بے سند باتیں ہیں جو اَگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ کہ آیات کی تکذیب کرتا ہے، خلاصہ یہ کہ اُن کی اطاعت سے منع کرنے کی اصل علت ان کی تکذیب ہے، اور اسی بنا پر اوّل فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ فرمایا گیا، پھر بطور تخصیص بعد تعمیم کے ان مکذبین میں سے ایسے لوگوں کی اِطاعت سے ممانعت کی گئی جو علاوہ تکذیب کے اور بُری عادتیں بھی رکھتے ہوں، ایسوں کی اطاعت سے ممانعت مطلق مکذبین کی اطاعت کی ممانعت سے اور زیادہ اشد ہوگی، لیکن اصل علت وہی تکذیب رہے گی، آگے ایسے شخص کی سزا کا بیان ہے کہ) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگادیں گے۔ (یعنی قیامت میں اس کے چہرے اور ناک پر اس کے کفر کی وجہ سے کوئی علامت ذلت اور پہچان کی لگادیں گے جس سے وہ خوب رُسوا ہو۔ حدیثِ مرفوع میں ایسا ہی وارِد ہے، کما فی الدر المنثور۔ [1] آگے اہلِ مکہ کو ایک قصہ سنا کر اُن کو وبال سے ڈرایا گیا ہے) ہم نے (جوان اہلِ مکہ کو سامانِ عیش دے رکھا ہے، جس پر یہ مغرور ہو رہے ہیں، تو ہم نے) ان کی آزمائش کر رکھی ہے (کہ دیکھیں یہ نعمتوں کے شکر میں ایمان لاتے ہیں یا ناشکری وبے قدری کر کے کفر کرتے ہیں) جیسا (ان سے پہلے نعمتیں دے کر) ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی (یہ باغ بقول اِبنِ عباسؓ ملکِ حبشہ میں تھا، اور بقول سعید بن جبیرؒ یمن میں، کذا فی الدر المنثور۔ [2] اور یہ قصہ اہلِ مکہ میں مشہور معروف تھا، اور جن باغ والوں کا یہ قصہ ہے اُن کے باپ کا اپنے وقت میں معمول تھا کہ ایک بڑا حصہ اس باغ کے پھل کا مساکین میں صَرف کیا کرتا تھا، جب وہ مرگیا تو ان لوگوں نے کہا کہ

[1] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۶۳۴ تحت هٰذه الآیة۔

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۶۳۴ و۶۳۵

ہمارا باپ احمق تھا کہ اس قدر آمدنی مسکینوں کو دے دیتا تھا، اگر یہ سب آئے، کس قدر فراغت ہو چنانچہ ان آیتوں میں ان کا بقیہ قصہ مذکور ہے یعنی یہ واقعہ آئندہ اس وقت ہوا) جب کہ ان لوگوں نے (یعنی اکثر یا بعض نے لقولہ تعالیٰ: قَالَ اَوْسَطُهُمْ یا ہم) قسم کھائی کہ اس (باغ) کا پھل ضرور صبح چل کر توڑ لیں گے اور (ایسا وثوق ہوا کہ) انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا، سو اس باغ پر آپ کے رَبّ کی طرف سے ایک پھرنے والا (عذاب) پھر گیا (اور وہ ایک آگ تھی، کذا فی الدر عن ابن جریج[1] خواہ خالص آگ ہو، یا ہوا میں ملی ہوئی ہو، جیسے لو) اور وہ سو رہے تھے پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا جیسے کٹا ہوا کھیت (کہ خالی زمین رہ جاتی ہے اور بعض جگہ کاٹ کر جلا بھی دیا جاتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی) سو صبح کے وقت (سو کر جو اُٹھے تو) ایک دُوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو، اگر تم کو پھل توڑنا ہے (کھیت یا تو مجازاً کہہ دیا ہو، یا اس میں ایسی چیزیں بھی ہوں جو تنہ دار نہیں ہوتیں، جیسے انگور وغیرہ، یا کہ اس باغ کے متعلق کھیت بھی ہو) پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج نہ آنے پائے اور (بزعمِ خود) اپنے کو اس کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے (کہ سب پھل گھر لے آئیں گے اور کسی کو نہ دیں گے، کذا فی الدّر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)[2] پھر جب (وہاں پہنچے اور) اس باغ کو (اس حالت میں) دیکھا تو کہنے لگے کہ بے شک ہم رستہ بھول گئے (اور کہیں نکل آئے، کیونکہ یہاں تو باغ واغ کچھ بھی نہیں، پھر جب موقع وحدود کو دیکھ کر یقین کیا کہ وہی جگہ ہے، تو اس وقت کہنے لگے کہ بھولے نہیں) بلکہ (جگہ تو وہی ہے لیکن) ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی (کہ باغ کا یہ حال ہو گیا) ان میں جو (کسی قدر) اچھا آدمی تھا، وہ کہنے لگا کہ کیوں میں نے تم کو کہا نہ تھا (کہ ایسی نیت مت کرو، مساکین کے دینے سے برکت ہوتی ہے، اسی لئے اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اچھا کہا، مگر عملاً یہ شخص بھی باوجود کراہت قلب کے سب کے ساتھ شریک ہو گیا تھا، اس لئے احقر نے لفظ کسی قدر بڑھا دیا لأنّ الأوسط أمر اضافي۔ پھر پہلی بات کو یاد دِلا کر اس شخص نے کہا کہ اپنی شامتِ اعمال تو بھگت لی مگر) اب (توبہ اور) تسبیح (وتقدیس) کیوں نہیں کرتے (تا کہ وہ گناہ معاف ہو اور اس سے زیادہ وبال نہ آجائے) سب (توبہ کے طور پر) کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار پاک ہے (یہ تنزیہ ہے جو اِستغفار کی تمہید ہے) بے شک ہم قصوروار ہیں (یہ اِستغفار ہے) پھر ایک دُوسرے کو مخاطب بنا کر باہم اِلزام دینے لگے (جیسا کام بگڑنے کے وقت اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص دُوسرے کو رائے فاسدہ کا ذمہ دار بتلایا کرتا ہے، پھر سب متفق ہو کر) کہنے لگے کہ بے شک ہم (سب ہی) حد سے نکلنے والے تھے (کسی ایک کی خطا نہ تھی، ایک دُوسرے پر اِلزام بے کار ہے، سب مل

[1] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۲۳۶

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۲۳۸

کرتوبہ کرلو) شاید (توبہ کی برکت سے) ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ بدلے میں دے دے (اب) ہم اپنے رَبّ کی طرف رُجوع ہوتے ہیں (یعنی توبہ کرتے ہیں، اور بدلنا عام ہے خواہ دُنیا میں نعم البدل مل جائے، خواہ آخرت میں، اور ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مؤمن تھے، مرتکبِ معصیت ہوئے تھے، اور یہ بات کہیں سند کے ساتھ نظر سے نہیں گزری کہ آیا اس باغ کے عوض ان کو دُنیا میں کوئی باغ ملا، یا نہیں، البتہ بلا سند رُوح المعانی میں اِبنِ مسعودؓ کا قول لکھا ہے کہ اس سے اچھا باغ ان کو عطا کیا گیا، [1] واللہ اعلم۔ آگے قصے کی غرض یعنی تحذیر کی تصریح ہے کہ خلاف حکم کرنے پر) اسی طرح عذاب ہوا کرتا ہے (جب ہوا کرتا ہے یعنی اے اہلِ مکہ! تم بھی ایسے عذاب کے مستحق ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے، کیونکہ عذابِ مذکور تو محض معصیت پر تھا، اور تم تو کفر کرتے ہو) اور آخرت کا عذاب اس (عذابِ دُنیوی) سے بھی بڑھ کر ہے، کیا خوب ہوتا کہ یہ لوگ (اس بات کو) جان لیتے (تاکہ ایمان لے آتے۔ آگے ان سزاؤں کی تحقیق کے لئے کفار کے خیالِ باطل کا اِبطال فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے: وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى [2] (حم السجدۃ:۵۰) یعنی بے شک پرہیزگاروں کے لئے اُن کے رَبّ کے نزدیک آسائش کی جنتیں ہیں (یعنی سبب دُخولِ جنت کا تقویٰ ہے، اور اس سے کافر عاری ہیں، تو اُن کو جنت کیسے مل جائے گی) کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانبرداروں کے برابر کردیں گے (یعنی اگر کافروں کو نجات ہو تو فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں کیا فرق و اِمتیاز رہ جائے گا، جس سے فرمانبرداروں کی فضیلت ثابت ہو، کقوله تعالٰی فی صٓ: اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ... اِلخ [3] (صٓ:۲۸)) تم کو کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی (آسمانی) کتاب ہے جس میں پڑھتے ہو کہ اس میں تمہارے لئے وہ چیز (لکھی) ہو جو تم پسند کرتے ہو، (یعنی اس میں لکھا ہو کہ تم کو آخرت میں حسنٰی یعنی نعمت ملے گی) کیا ہمارے ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہارے لئے کھائی گئی ہوں اور وہ قسمیں قیامت تک باقی رہنے والی ہوں (جن کا یہ مضمون ہو) کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کررہے ہو (یعنی ثواب اور جنت) ان سے پوچھئے ان میں اس کا کون ذمہ دار ہے کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک (خدائی) ہیں (کہ انہوں نے ان کو ثواب دینے کا ذمہ لیا ہے) سو ان کو چاہئے کہ یہ اپنے ان شریکوں کو پیش کریں، اگر یہ سچے ہیں۔ (غرض جب یہ مضمون کسی آسمانی کتاب میں نہیں ویسے بلا کتاب دُوسرے طرقِ وحی سے ہمارا وعدہ نہیں جو مثل قسم کے ہوتا ہے، پھر ایسی حالت میں کون شخص ان میں سے یا ان کے شرکاء میں سے ذمہ داری کرسکتا ہے،

[1] تفسیر رُوح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۲۱ ص:۱۸۳

[2] ترجمہ: اور اگر میں اپنے رَبّ کے پاس پہنچایا بھی گیا تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔

[3] ترجمہ: ہاں تو کیا ہم ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ان کی برابر کردیں گے جو دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں۔

ہرگز نہیں، پھر دعویٰ کس بنا پر ہے آگے ان لوگوں کی قیامت کی رُسوائی کا ذِکر ہے، وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن کہ ساق کی تجلی فرمائی جائے گی اور سجدے کی طرف لوگوں کو بلایا جائے گا (اس کا قصہ حدیثِ شیخین میں مرفوعاً اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے میدان میں اپنی ساق ظاہر فرمائے گا، [1] ساق کہتے ہیں پنڈلی کو، اور یہ کوئی خاص صفت ہے جس کو کسی مناسبت سے ساق فرمایا، جیسا قرآن میں ہاتھ آیا ہے، اور ایسے مفہومات ''متشابہات'' کہلاتے ہیں۔ اور اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلی کو دیکھ کر تمام مؤمنین ومؤمنات سجدے میں گر پڑیں گے، مگر جو شخص رِیا سے سجدہ کرتا تھا اس کی کمر تختے کی طرح رہ جائے گی، سجدہ نہ کرسکے گا۔ [2] اور سجدے کی طرف بلائے جانے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ وہ دارُالتکلیف نہیں ہے، کیونکہ بلائے جانے سے مراد اَمر بالسجود نہیں ہے، بلکہ اس تجلی میں یہ اثر ہوگا کہ سب بالاضطرار سجدہ کرنا چاہیں گے، جن میں مؤمن اس بات پر قادر ہوجائیں گے، اور اہلِ رِیا ونفاق قادر نہ ہوں گے، اور کفار کا قادر نہ ہونا اس سے بدرجۂ اَولیٰ مفہوم ہوتا ہے، جس کا آگے ذِکر ہے، یعنی کفار بھی سجدہ کرنا چاہیں گے) سو یہ (کافر) لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے (اور) ان کی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) جھکی ہوں گی (اور) اُن پر ذِلت چھائی ہوگی اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ (دُنیا میں) سجدے کی طرف بلائے جایا کرتے تھے (اس طرح کہ ایمان لاکر عبادت کریں) اور وہ صحیح سالم تھے (یعنی سجدے پر قادر بھی تھے، چنانچہ ظاہر ہے کہ ایمان وعبادت فعلِ اختیاری ہے، بس دُنیا میں اِمتثالِ امر نہ کرنے سے آج ان کو یہ رُسوائی وذِلت ہوئی۔ اور دُوسری آیت میں جو نگاہ کا اُوپر اُٹھا رہنا آیا ہے، وہ اس کے معارض نہیں، کیونکہ گاہے غلبہ حیرت سے ایسا ہوگا، اور گاہے غلبہ ندامت سے ایسا ہوگا۔ آگے کفار کے اس خیال کا رَدّ ہے کہ عذاب میں دیر ہونے کو اپنے مقبول ہونے کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے ضمن میں آپ کی تسلی بھی ہے، یعنی جب ان کا مستحقِ عذاب ہونا اُوپر کی آیتوں سے معلوم ہوچکا) تو مجھ کو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں اُن کو (اس حالِ موجودہ پر) رہنے دیجئے (یعنی عذاب میں دیر ہونے سے رنج نہ کیجئے) ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لے جارہے ہیں، اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دُنیا میں اُن پر عذاب نہ ڈالنے سے) اُن کو مہلت دیتا ہوں بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے (آگے ان کے انکارِ نبوّت پر تعجب ہے) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ مانگتے ہیں کہ وہ اس تاوان سے دبے جاتے ہیں (اس لئے آپ کی اطاعت سے نفرت ہے، وھذا کقولہ تعالیٰ: اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا [3] (المؤمنون:۷۲)) یا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ نٓ وَالْقَلَمِ، باب وقولہ: یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ج:۲ ص:۷۳۸

[2] بحوالۂ بالا۔

[3] ترجمہ: یا آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں۔

کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یعنی کیا ان کو اَحکامِ خداوندی خود کسی طریقے سے معلوم ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ صاحبِ وحی کے اِتباع سے مستغنی ہیں اور ظاہر ہے کہ دونوں اَمر نہیں ہیں، پھر اِنکارِ نبوّت عجیب ہے۔ آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ ہے، جب ان کا اِستحقاقِ عذاب اور کفر جو موجبِ اِستحقاق ہے معلوم ہوگیا، اور یہ کہ ان کی مہلت اِستدراج یعنی ایک قسم کی ڈھیل ہے، اور وقتِ موعود پر عذاب ہوگا) تو آپ اپنے رَبّ کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے اور (تنگ دلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہوجیۓ (کہ وہ عذاب نازل نہ ہونے سے تنگ دِل ہوئے اور کہیں چلے گئے، جس کا قصہ کئی جگہ تھوڑا تھوڑا آچکا ہے، مضمون مقصود تشبیہ کا تو ختم ہوچکا، آگے بطور تتمیمِ قصد کے اِرشاد ہے کہ وہ وقت بھی یاد کیجئے) جب کہ یونس (علیہ السلام) نے (اپنے رَبّ سے) دُعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے (یہ غم مجموعہ تھا کئی غموں کا، ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا، ایک عذاب کے ٹل جانے کا، ایک بلا اِذن صریح حق تعالیٰ کے وہاں سے چلے آنے کا، ایک مچھلی کے پیٹ میں محبوس ہونے کا، اور وہ دُعا یہ ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿٨٧﴾ [1] (الانبیاء) جس سے مقصود معافی اور طلبِ نجات عن الحبس ہے، چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور مچھلی کے پیٹ سے نجات ہوئی، اسی کی نسبت اِرشاد ہے کہ) اگر خداوندی اِحسان ان کی دست گیری نہ کرتا تو وہ (جس میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈال دیئے گئے تھے اس) میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے (دست گیری سے مراد قبولِ توبہ ہے، اور بدحالی سے مراد یہ کہ ان کی اِجتہادی غلطی پر من جانب اللہ ان کو ملامت ہوئی، حاصل اس کا اور آیت سورۂ صافات کا یہ ہے کہ اگر یہ توبہ واِستغفار نہ کرتے تب تو شکمِ ماہی سے نجات ہی نہ ہوتی، کما قال: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ... اِلخ [2] (الصّٰفّٰت: ١٤٣) اور اگر توبہ واِستغفار کرتے مگر اللہ تعالیٰ قبول نہ فرماتا تو اس توبہ واِستغفار کی اس قدر دُنیوی برکت تو ہوتی کہ شکمِ ماہی سے نجات ہوجاتی اور میدان میں جس طرح اب ڈالے گئے اسی طرح ڈالے جاتے، لیکن اس وقت وہ ڈالا جانا مذموم ہوتا، اور اَب کا ڈالا جانا مذموم ہونے کی حالت میں نہیں ہوا، کیونکہ قبولِ توبہ کے بعد خطا پر مذمت وملامت نہیں ہوا کرتی) پھر ان کے رَبّ نے ان کو (اور زیادہ) برگزیدہ کرلیا اور ان کو (زیادہ رُتبے کے) صالحین میں سے کردیا (شاید اس تتمیمِ قصہ سے یہ بھی مقصود ہو کہ اپنے اِجتہاد پر عمل کرنا ان کو کیسا مضر ہوا، اور توکل کیسا نافع ہوا، اسی طرح عذاب کے بارے میں آپ بھی اپنی رائے سے جلدی نہ کیجئے بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے کہ انجام بہتر ہوگا) اور (آگے آپ کی شان میں کفار کے مجنون کہنے کا ایک دُوسرے انداز میں اِبطال ہے، شروع سورت میں اور انداز سے اس

---

[1] ترجمہ: آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے آپ پاک ہیں، میں بے شک قصوروار ہوں۔

[2] ترجمہ: سو اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے۔

کو باطل کیا گیا تھا یعنی) یہ کافر جب قرآن سنتے ہیں تو (شدّتِ عداوت سے) ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آپ کو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرادیں گے (یہ ایک محاورہ ہے جیسے بولتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح دیکھتا ہے جیسے کھا جائے گا کما فی رُوح المعانی [۱]: ''نَظَرَ اِلَیَّ نَظَرًا یَّکَادُ یَصۡدَعُنِیۡ اَوۡ یَکَادُ یَاۡکُلُنِیۡ'' مطلب یہ کہ شدّتِ عداوت سے آپ کو بُری بُری نگاہوں سے دیکھتے ہیں) اور (اسی عداوت سے آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ مجنون ہیں، حالانکہ یہ قرآن (جس کے ساتھ آپ تکلم فرماتے ہیں) تمام جہان کے واسطے نصیحت ہے (اور مجنون آدمی کے متعلق ایسی اصلاح عام نہیں ہوسکتی، اس میں تو جواب طعن جنون ظاہر ہے اور بیان عداوت سے بھی اس طعن کا ضعیف ہونا ثابت ہوگیا، کیونکہ جس قول کا منشا شدّتِ عداوت ہو وہ قابلِ اِلتفات نہیں)۔

معارف ومسائل

سورۂ ملک میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور علم وقدرت کے دلائل مشاہدۂ کائنات سے بیان ہوئے ہیں، اور کفار ومنکرین پر عذابِ شدید کا ذِکر ہے۔ سورۂ نون میں کفار کے اُن مطاعن کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلا اُن کا طعنہ یہ تھا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے کامل العقل، کامل العلم، جامع الفضائل رسول کو معاذ اللہ مجنون کہتے تھے، یا اس وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی فرشتے کے ذریعے نازل ہوتی تھی، بوقتِ وحی اُس کے آثار آپ کے جسمِ مبارک پر دیکھے جاتے تھے، پھر آپ وحی سے حاصل شدہ آیات پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ معاملہ کفار کے فہم وادراک سے باہر تھا، اس لئے اس کو جنون قرار دے دیا۔ اور یا اس وجہ سے کہ آپ نے اپنی قوم اور پوری دُنیا کے عقائدِ موجودہ کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ عبادت کے قابل اللہ کے سوا کوئی نہیں، جن خود تراشیدہ بتوں کو وہ خدا سمجھتے تھے، اُن کا بے علم وشعور نا قابلِ نفع وضرر ہونا بیان کیا، آپ کے پاس عقیدے کا کوئی ساتھی نہ تھا، آپ اکیلے یہ دعویٰ لے کر بغیر کسی ظاہری ساز وسامان کے ساری دُنیا کے مقابلے میں کھڑے ہوگئے، ظاہر بیں نظروں میں اس کی کامیابی کا کوئی اِمکان نہیں تھا، ایسے دعوے کو لے کر کھڑا ہونا جنون سمجھا گیا۔ اور بغیر کسی سبب کے بھی بعض طعن برائے طعن ہوسکتا ہے کہ مجنون کہتے ہوں، سورۂ نون کی اِبتدائی آیتوں میں اُن کے اس خیالِ باطل کی تردید قسم کے ساتھ مؤکد کرکے بیان فرمائی ہے۔

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۝۱ مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۝۲ حرفِ نون حروفِ مقطعہ میں سے ہے، جو قرآنِ کریم کی بہت سی سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں، ان کے معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں، یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو،

---

[۱] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۲۰۳

اُمت کو اُس کی تحقیق میں پڑنے سے روک دیا گیا ہے۔

قلم سے کیا مراد ہے اور قلم کی فضیلت

وَالْقَلَمِ میں واوٗ حرفِ قسم ہے، اور قَلَمْ سے مراد عام قلم بھی ہوسکتا ہے جس میں قلم تقدیر اور فرشتوں اور انسانوں کے سب قلم جن سے کچھ لکھا جاتا ہے، سب داخل ہیں (کما ھو قول ابی حاتم البستی) [۱] اور خاص قلمِ تقدیر بھی مراد ہوسکتا ہے (کما ھو قول ابن عباس رضی اللہ عنھما) اور اس قلمِ تقدیر کے متعلق حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا کیا اور اُس کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے عرض کیا کیا لکھوں تو حکم دیا کہ تقدیرِ الٰہی کو۔ قلم نے (حکم کے مطابق) ابد تک ہونے والے تمام واقعات اور حالات کو لکھ دیا۔ (رواہ الترمذی، وقال: ھٰذا حدیثٌ غریبٌ) [۲] اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیر کو آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا۔ [۳]

اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، جو اُس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک قلم، قلمِ تقدیر پیدا فرمایا، جس نے تمام کائنات و مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں، پھر دُوسرا قلم پیدا فرمایا جس سے زمین پر بسنے والے لکھتے ہیں اور لکھیں گے، اس دُوسرے قلم کا ذِکر سورۂ اِقْرَاْ میں آیا ہے: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ [۴] واللہ اعلم۔

آیت میں اگر قلم سے مراد قلمِ تقدیر لیا جائے جو سب سے پہلی مخلوق ہے تو اُس کی عظمت اور تمام چیزوں پر ایک برتری ظاہر ہے، اس لئے اس کی قسم کھانا مناسب ہوا۔ اور اگر قلم سے مراد عام قلم لئے جائیں جس میں قلمِ تقدیر اور فرشتوں کے اقلام کے علاوہ انسانوں کے قلم بھی داخل ہیں تو اس کی قسم اس لئے کھائی گئی کہ دُنیا میں بڑے بڑے کام سب قلم ہی سے ہوتے ہیں، ملکوں کی فتوحات میں تلوار سے زیادہ قلم کا مؤثر ہونا منقول و معروف ہے، ابوحاتم بستی نے اسی مضمون کو دو شعروں میں فرمایا ہے:

اِذَا اَقْسَمَ الْاَبْطَالُ یَوْمًا بِسَیْفِھِمْ وَعَدُّوْہُ مِمَّا یَکْسِبُ الْمَجْدَ وَالْکَرَمَ

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم، تحت ھٰذہ الآیۃ رقم الحدیث: ۱۸۹۳۶

[۲] جامع الترمذی، ابواب القدر، بابٌ ج:۲ ص:۳۸

[۳] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسٰی علیھما السلام ج:۲ ص:۳۳۵

[۴] ترجمہ: قلم سے تعلیم دی۔

جب کہ قسم کھائیں بہادر لوگ کسی دن اپنی تلوار کی، اور اس کو شمار کریں ان چیزوں میں جو اِنسان کو عزّت وشرف بخشتی ہیں۔

كَفٰى قَلَمُ الْكُتَّابِ عِزًّا وَرِفْعَةً مَدَى الدَّهْرِ اَنَّ اللّٰهَ اَقْسَمَ بِالْقَلَمِ [1]

تو کافی ہے لکھنے والوں کا قلم اُن کی عزّت وبرتری کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے، کیونکہ اللہ نے قسم کھائی ہے قلم کی۔

بہرحال اس آیت میں قلمِ تقدیر یا عام قلمِ خلائق کی اور پھر لفظ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ میں جو کچھ ان قلموں سے لکھا گیا، یا لکھا جائے گا اُس کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے کفار کے اس طعنہ باطلہ کا رَدّ فرمایا کہ آپ مجنون ہیں، ارشاد ہوا: مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ یعنی آپ اپنے رَبّ کی نعمت وفضل کی وجہ سے ہرگز مجنون نہیں۔ اس میں بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بڑھا کر دعوے کی دلیل بھی دے دی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ورحمت مکمل ہو، وہ کیسے مجنون ہوسکتا ہے اُس کو مجنون کہنے والا خود مجنون ہے۔

فائدہ

علماء نے فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں، وہ مضمونِ قسم پر ایک شہادت ہوتی ہے، یہاں وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ کے لفظ سے دُنیا کی تاریخ میں جو کچھ لکھا گیا اور لکھا جارہا ہے اس کو بطور شہادت پیش کیا ہے کہ دُنیا کی تاریخ کو دیکھو، ایسے اعلیٰ اخلاق واعمال والے کہیں مجنون ہوتے ہیں، وہ تو دُوسروں کی عقل دُرست کرنے والے ہوتے ہیں۔ آگے مضمونِ مذکور کی مزید تائید کے لئے فرمایا:-

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ (اور بے شک آپ کے لئے اَجرِ عظیم ہے جو کبھی منقطع ہونے والا نہیں) مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس کام کو یہ دیوانے مجنون کہہ رہے ہیں وہ تو اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقبول عمل ہے، اس پر آپ کو اَجرِ عظیم ملنے والا ہے، اور اَجر بھی ایسا جو دائمی ہے کبھی منقطع نہیں ہوگا، کہیں کسی مجنون کے عمل پر بھی مجنون کو اَجر ملا کرتا ہے آگے اسی مضمون کی مزید تائید وتاکید اس جملے سے فرمادی:-

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کاملہ میں غور کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ دیوانو ذرا تو دیکھو کہیں مجنونوں، دیوانوں کے ایسے اخلاق واعمال ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۸ ص:۲۲۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلقِ عظیم

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ خلقِ عظیم سے مراد دینِ عظیم ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دینِ اسلام سے زیادہ کوئی محبوب دِین نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق خود قرآن ہے۔ [۱] یعنی قرآنِ کریم جن اعلیٰ اعمال واخلاق کی تعلیم دیتا ہے، آپ اُن سب کا عملی نمونہ ہیں۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خلقِ عظیم سے مراد آدابُ القرآن ہیں، یعنی وہ آداب جو قرآن نے سکھائے ہیں۔ حاصل سب کا تقریباً ایک ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود میں حق تعالیٰ نے تمام ہی اخلاقِ فاضلہ بدرجۂ کمال جمع فرمادیئے تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' یعنی مجھے اس کام کے لئے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔ (ابوحیان) [۲]

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، اس پوری مدّت میں جو کام میں نے کیا آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اُس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ دس سال کی مدّت میں خدمت کرنے والے کے بہت سے کام خلاف طبع ہوئے ہوں گے)۔ (بخاری ومسلم) [۳]

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کا یہ حال تھا کہ مدینہ کی کوئی لونڈی باندی بھی آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں لے جانا چاہے لے جاسکتی تھی۔ (رواہ البخاری) [۴]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا، بجز جہاد فی سبیل اللہ کے کہ اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے، ورنہ آپ نے نہ کسی خادم کو، نہ کسی عورت کو کبھی مارا، اُن میں سے کسی سے خطا ولغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو اُس پر شرعی سزا جاری فرمائی۔ (رواہ مسلم) [۵]

---

[۱] مسند احمد، مسند الصدیقة عائشة رضی الله عنها، رقم الحدیث: ۲۴۶۰۱

[۲] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآیة ج:۱۰ ص:۲۳۷

[۳] صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب استخدام الیتیم فی السفر والحضر ...إلخ، ج:۱ ص:۳۸۸، وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن خلقه صلی الله علیه وسلم، ج:۲ ص:۲۵۳

[۴] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الکبر، ج:۲ ص:۸۹۶

[۵] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام واختیاره من المباح اسهله، ج:۲ ص:۲۵۶

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کسی چیز کا سوال نہیں کیا گیا جس کے جواب میں آپ نے نہیں فرمایا ہو۔ (بخاری ومسلم) [۱]

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ فحش گو تھے، نہ فحش کے پاس جاتے تھے، نہ بازاروں میں شور وشغب کرتے تھے، بُرائی کا بدلہ کبھی بُرائی سے نہیں دیتے تھے، بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ [۲] اور حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں خلقِ حسن کی برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں۔ (رواہ الترمذی، وقال: حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ) [۳]

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسنِ خلق کی بدولت اُس شخص کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دِن بھر روزہ رکھتا ہو۔ (رواہ ابوداود) [۴]

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل مقرّر کر کے بھیجنے کے وقت آخری وصیت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس وقت فرمائی جب کہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا وہ یہ تھی "یَا مَعَاذُ! اَحْسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ" اے معاذ لوگوں سے حسنِ خلق کا برتاؤ کرو۔ (رواہ مالک) [۵] یہ سب روایاتِ حدیث تفسیرِ مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔ [۶]

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝۵ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝۶ (عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے، اور یہ کفار بھی دیکھ لیں گے تم میں کون مجنون ہے) مفتون اس جگہ بمعنی مجنون ہے۔ پچھلی آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے والوں کے طعنے کو دلائل سے رَدّ کیا گیا تھا، اس آیت نے پیش گوئی کے طور پر یہ بتلایا کہ یہ بات یوں ہی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے، قریب آنے والے وقت میں سب آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ معاذ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون تھے یا آپ کو مجنون کہنے والے پاگل دیوانے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ بات کھل کر دُنیا کے سامنے آگئی اور ان ہی مجنون کہنے والوں میں سے ہزاروں حلقہ بگوش اسلام ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع ومحبت کو سرمایۂ سعادت سمجھنے لگے، اور بہت سے اشقیاء جن کو توفیق نہیں ہوئی وہ دُنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوئے۔

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائه صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۲۵۳، وصحیح البخاری، کتاب الأدب، باب حسن الخلق والسخاء ...إلخ ج:۲ ص:۸۹۲

۲ جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، کتاب خُلُق النبی صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۲۱

۳ جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی حسن الخُلُق ج:۲ ص:۲۰

۴ سنن ابی داود، کتاب الأدب، باب فی حسن الخُلُق ج:۲ س:۶۶۱

۵ موطا إمام مالك، کتاب حسن الخُلُق رقم الحدیث:۱۶۰۲

۶ تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۱ تا ۳۳

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑧ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ⑨ یعنی آپ ان جھٹلانے والوں کی بات نہ مانیں، یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ تبلیغِ احکام میں نرم پڑ جائیں اور شرک و بت پرستی سے ان کو روکنا چھوڑ دیں، تو یہ بھی نرم پڑ جائیں کہ آپ پر طعن تشنیع اور آپ کی ایذا رسانی چھوڑ دیں۔ (قاله ابن عباس رضی الله عنهما، قرطبی) [1]

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و فجار کے ساتھ یہ سودا کر لینا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے، تم ہمیں کچھ نہ کہو، یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے۔ (مظہری) [2] یعنی بلا کسی اضطرار و مجبوری کے ایسا معاہدہ جائز نہیں۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ⑩ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ⑪ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ⑬ آپ بات نہ مانیں ہر ایسے شخص کی جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، ذلیل ہو، اور لوگوں پر عیب لگانے والا ہو، غیبت کرنے والا ہو، چغل خوری کرنے والا ہو، نیک کاموں سے لوگوں کو روکنے والا ظلم و جور میں حد سے بڑھنے والا ہو، بکثرت گناہ کرنے والا، اور بہت قسمیں کھانا والا کج خلق، بخیل ہو، اور ان سب صفاتِ رذیلہ کے ساتھ وہ زنیم بھی ہو۔ زنیم کے معنی وہ شخص جس کا نسب کسی باپ سے ثابت نہ ہو۔ جس شخص کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں، وہ ایسا ہی غیر ثابت النسب تھا۔

پہلی آیت میں عام کفار کی بات نہ ماننے اور دِین کے معاملے میں ان کی وجہ سے کوئی مداہنت نہ کرنے کا عام حکم تھا، اس آیت میں ایک خاص شریر کافر ولید بن مغیرہ کی صفاتِ رذیلہ بیان کر کے اُس سے اِعراض کرنے اور اُس کی بات نہ ماننے کا خصوصی حکم دیا گیا ہے، (کما رواہ ابن جریر عن ابن عباس رضی الله عنهما) [3] آگے بھی کئی آیتوں میں اس شخص کی بد اخلاقی اور سرکشی کا ذِکر فرمانے کے بعد فرمایا: سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ⑯ یعنی ہم قیامت کے روز اس کی ناک پر داغ لگا دیں گے جس سے اوّلین و آخرین میں اُس کی رُسوائی ظاہر ہو جائے گی، اس کی ناک کو بغرضِ تقبیح خرطوم سے تعبیر کیا گیا ہے، جو ہاتھی یا خنزیر کی ناک کے لئے مخصوص ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (یعنی ہم نے آزمائش میں ڈالا ان (اہلِ مکہ) کو جس طرح آزمائش میں ڈالا تھا باغ والوں کو) سابقہ آیات میں کفار اہلِ مکہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن و تشنیع کا جواب تھا، ان آیات میں حق تعالیٰ نے پچھلے زمانے کا ایک قصہ ذِکر کر کے اہلِ مکہ کو تنبیہ فرمائی اور عذاب سے ڈرایا۔ اہلِ مکہ کو آزمائش میں ڈالنے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح آئندہ آنے والے قصے میں باغ والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، انہوں

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۸ ص:۲۳۰

[2] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۴

[3] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۱۹۳

نے ناشکری کی جس کے نتیجے میں عذاب آ گیا اور ان کی نعمت سلب ہوگئی، حق تعالیٰ نے اہلِ مکہ پر اپنا سب سے بڑا انعام تو یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے اندر پیدا فرمایا، اس کے علاوہ ان کی تجارتوں میں برکت عطا فرمائی اور اُن کو خوش حال بنا دیا، یہ اُن کی آزمائش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اللہ و رسول پر ایمان لاتے ہیں یا اپنے کفر و عناد پر جمے رہتے ہیں۔ دُوسری صورت میں ان کو باغ والوں کے قصے سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کفرانِ نعمت سے ان پر بھی ایسا ہی عذاب نہ آ جائے۔ یہ تفسیر اس صورت میں بھی صادق ہے جب کہ ان آیات کو بھی مثل اکثر سورت کے مکی قرار دِیا جائے، لیکن بہت سے حضراتِ مفسرین نے ان آیات کو مدنی قرار دِیا ہے، اور جس آزمائش کا یہاں ذِکر ہے اُس سے مراد وہ قحط کا عذاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددُعا سے ان لوگوں پر مسلط ہوا تھا جس میں وہ بھوک سے مرنے لگے اور مردار جانور اور درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے۔

باغ والوں کا قصہ

یہ باغ بعض سلف جیسے حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ کے قول پر یمن میں تھا، اور حضرت سعید بن جبیرؓ کی ایک روایت یہ ہے کہ صنعاء جو یمن کا مشہور شہر اور دارُ السلطنت ہے، اُس سے چھ میل کے فاصلے پر تھا، اور بعض حضرات نے اس کا محلِ وقوع حبشہ کو بتلایا ہے۔ (ابنِ کثیر) [۱] یہ لوگ اہلِ کتاب میں سے تھے اور یہ واقعہ رفع عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد کا ہے۔ (قرطبی) [۲]

آیتِ مذکورہ میں ان کو اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ یعنی باغ والوں کے نام سے تعبیر کیا ہے، مگر مضمونِ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس صرف باغ ہی نہیں بلکہ کاشت کی زمینیں بھی تھیں، ہوسکتا ہے کہ باغ کے ساتھ ہی مزروعہ زمین بھی ہو، مگر باغوں کی شہرت کے سبب باغ والے کہہ دیا گیا۔ واقعہ ان کا بروایت محمد بن مروان، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس طرح منقول ہے: صنعاء یمن سے دو فرسخ کے فاصلے پر ایک باغ تھا، جس کو "صروان" کہا جاتا تھا، یہ باغ ایک صالح اور نیک بندے نے لگایا تھا، اس کا عمل یہ تھا کہ جب کھیتی کاٹتا تو جو درخت درانتی سے باقی رہ جاتے تھے ان کو فقراء و مساکین کے لئے چھوڑ دیتا تھا، یہ لوگ اس سے غلہ حاصل کر کے اپنا گزارہ کرتے تھے۔

اسی طرح جب کھیتی کو گاہ کر غلہ نکالتا تو جو دانہ بھوسے کے ساتھ اُڑ کر الگ ہو جاتا، اُس دانے کو بھی فقراء و مساکین کے لئے چھوڑ دیتا تھا۔ اسی طرح جب باغ کے درختوں سے پھل توڑتا تو توڑنے کے وقت جو پھل نیچے گر جاتا وہ بھی فقراء کے لئے چھوڑ دیتا تھا (یہی وجہ تھی کہ جب اس کی کھیتی کٹنے یا پھل توڑنے کا وقت آتا تو بہت سے فقراء و مساکین جمع

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۱۹۷

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۸ ص:۲۳۹

ہو جاتے تھے)۔ اس مردِ صالح کا انتقال ہوگیا، اس کے تین بیٹے باغ اور زمین کے وارث ہوئے، انہوں نے آپس میں گفتگو کی کہ اب ہمارا عیال بڑھ گیا ہے اور پیداوار اُن کی ضرورت سے کم ہے، اس لئے اب ان فقراء کے لئے اتنا غلہ اور پھل چھوڑ دینا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان لڑکوں نے آزادنو جوانوں کی طرح یہ کہا کہ ہمارا باپ تو بے وقوف تھا، اتنی بڑی مقدار غلے اور پھل کی لوگوں کو لٹا دیتا تھا، ہمیں یہ طریقہ بند کرنا چاہئے، آگے ان کا قصہ خود قرآنِ کریم کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:-

اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ یعنی انہوں نے آپس میں حلف وقسم کر کے یہ عہد کیا کہ اب کی مرتبہ ہم صبح سویرے ہی جا کر کھیتی کاٹ لیں گے تا کہ مساکین وفقراء کو خبر نہ ہو، اور وہ ساتھ نہ لگ لیں، اور اپنے اس منصوبے پر اُن کو اتنا یقین تھا کہ اِن شاء اللہ کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی، جیسا کہ سنت ہے کہ کل جو کام کرنا ہے جب اس کا ذِکر کرے تو یوں کہے کہ ہم اِن شاء اللہ کل یہ کام کریں گے۔

وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ کے معنی استثناء نہ کرنے کے ہیں، اور مراد اس استثناء سے اِن شاء اللہ کہنا ہے۔ اور بعض حضراتِ مفسرین نے اِستثناء سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آئیں گے، فقراء کا حصہ مستثنٰی نہ کریں گے۔ (مظہری) [۱]

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ پھر پھر گیا اس کھیت اور باغ پر ایک پھرنے والا آپ کے رَبّ کی طرف سے۔ پھرنے والے سے مراد کوئی بلا اور آفت ہے، جس سے کھیتی اور باغ تباہ ہو جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ایک آگ تھی جس نے سب کھڑی کھیتی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ یعنی یہ واقعہ نزولِ عذاب کا رات کو اُس وقت ہوا جب کہ یہ لوگ محوِ خواب تھے۔ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ صَرْم کے معنی پھل وغیرہ کاٹنے کے ہیں، صَرِيْم بمعنی مصروم ومقطوع ہے، مطلب یہ ہے کہ آگ نے اس کھیتی کو ایسا بنا دیا کہ جیسے کھیتی کاٹ لینے کے بعد صاف زمین رہ جاتی ہے، اور صریم کے معنی رات کے بھی آتے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جیسے رات تاریک سیاہ ہوتی ہے، یہ کھیتی بھی خاک سیاہ ہوگئی۔ (مظہری) [۲]

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ یعنی صبح اندھیرے سے آپس میں ایک دُوسرے کو آواز دے کر جگانے لگے کہ اگر کھیتی کاٹنا ہے تو سویرے چلو۔ وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی گھر سے نکلنے کے وقت آپس میں آہستہ بات کرتے تھے کہ کسی فقیر و مسکین کو خبر نہ ہو جائے جو ساتھ لگے۔

---

۱ تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۷

۲ تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۶

وَّ غَدَوۡا عَلٰی حَرۡدٍ قٰدِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾ حَرۡدٍ کے معنی منع کرنے اور غیظ وغضب دِکھانے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھ کر چلے کہ ہمیں اس پر قدرت ہے کہ ہم کسی فقیر ومسکین کو کچھ نہ دیں، کوئی آ بھی جائے تو اُس کو دفع کردیں۔

فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ مگر جب اس جگہ کھیت باغ کچھ نہ پایا تو اوّل تو یہ کہنے لگے کہ ہم جگہ کو بھول کر کہیں اور آ گئے، یہاں تو نہ باغ ہے نہ کھیت، مگر پھر قریبی مقامات اور نشانات پر غور کیا تو معلوم ہوا جگہ تو یہی ہے اور کھیت جل کر ختم ہو چکا ہے، تو کہنے لگے: بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾ یعنی ہم اس نعمت سے محروم کر دیئے گئے۔

قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾ ان میں سے جو درمیانہ آدمی تھا یعنی باپ کی طرح نیک صالح، اللہ کی راہ میں خرچ پر خوش ہونے والا تھا، دُوسرے بھائیوں کی طرح بخیل، سخت دِل نہ تھا، اس نے کہا کہ میں نے تمہیں پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کے نام کی تسبیح کیوں نہیں کرتے، تسبیح کے لفظی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ فقراء ومساکین سے اپنا مال بچا لینے کی تدبیر کا منشا یہ ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تم کو اس کے بجائے اور نہ دے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے، وہ خرچ کرنے والوں کو اپنے پاس سے اور زیادہ دیتا ہے۔ (مظہری) [1]

قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ اس بھائی کی بات اس وقت تو کسی نے نہ سنی، مگر اَب سب نے اِقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے ہر نقص وکمی سے، اور ہم ظالم ٹھہرے کہ ہم نے فقراء کے حصے کو بھی کھا لینا چاہا۔

تنبیہ

یہ درمیانہ آدمی جس نے صحیح بات کہی تھی، اگرچہ دُوسروں سے بہتر تھا، مگر پھر بہرحال اُن ہی کے ساتھ ہو لیا اور اُن ہی کی غلط رائے پر عمل کے لئے تیار ہو گیا تھا، اس لئے حشر اس کا بھی اُن ہی جیسا ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی گناہ سے لوگوں کو روکے، مگر وہ نہ رُکیں، پھر خود بھی اُن کے ساتھ لگا رہے اور گناہ میں شریک رہے، تو یہ بھی اُن ہی کے حکم میں ہوتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ نہیں رُکے تو خود اپنے آپ کو اس گناہ سے بچائے۔

فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ یعنی ان لوگوں نے اپنے جرم کا تو اعتراف کر لیا، لیکن اب الزام ایک دُوسرے پر ڈالنے لگے کہ تو نے ہی اوّل ایسی غلط رائے دی تھی جس کے نتیجے میں یہ عذاب آیا، حالانکہ یہ جرم ان میں سے کسی کا تنہا نہیں تھا بلکہ سب یا اکثر اس میں شریک تھے۔

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۷

تنبیہ

آج کل اس معاملے میں ابتلائے عام ہے کہ بہت سی جماعتوں کے مجموعی عمل کی وجہ سے کوئی ناکامی یا مصیبت پیش آجائے تو اس وقت ایک دُوسرا عذاب ان پر یہ ہوتا ہے کہ اس کا اِلزام ایک دُوسرے پر ڈالنے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ یعنی اِبتداءً ایک دُوسرے پر اِلزام ڈالنے کے بعد جب غور کیا تو پھر سب نے اقرار کرلیا کہ ہم سب ہی سرکش گناہگار رہیں، یہ اعتراف ندامت کے ساتھ اُن کی توبہ کے قائم مقام تھا، اسی بنا پر اُن کو اللہ سے یہ اُمید ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باغ سے بہتر باغ عطا فرمادیں گے۔

اِمام بغوی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ابنِ مسعود نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب ان سب لوگوں نے سچے دِل سے توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس سے بہتر باغ عطا فرمادیا جس کے انگوروں کے خوشے اتنے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک خچر پر لادا جاتا تھا۔ (مظہری) [1]

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ اہلِ مکہ کے عذابِ قحط کا اِجمالی اور باغ والوں کے کھیت جل جانے کا تفصیلی ذِکر فرمانے کے بعد عام ضابطہ اِرشاد فرمایا کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اسی طرح آیا کرتا ہے، اور دُنیا میں عذاب آجانے سے بھی اُن کے آخرت کے عذاب کا کفارہ نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا عذاب اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

اگلی آیات میں اوّل نیک متقی بندوں کی جزا کا ذِکر ہے، اور اس کے بعد مشرکینِ مکہ کے ایک اور باطل دعوے کا رَدّ ہے، وہ یہ کہ کفارِ مکہ کہا کرتے تھے کہ اوّل تو قیامت آنے والی نہیں، اور دوبارہ زندہ ہوکر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے، اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں اور مال و دولت ملے گا جیسا دُنیا میں ملا ہوا ہے، اس کا جواب کئی آیتوں میں دیا گیا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نیک بندوں اور مجرمین کو برابر کردیں گے یہ کیسا عجیب وغریب فیصلہ ہے جس پر نہ کوئی سند، نہ دلیل، نہ کسی آسمانی کتاب سے اس کا ثبوت، نہ اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید کہ وہاں بھی تمہیں نعمت دے گا۔

قیامت کی ایک عقلی دلیل

ان آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قیامت آنا اور حساب کتاب ہونا اور نیک وبد کی جزا وسزا یہ سب عقلاً ضروری ہے کیونکہ اس کا تو دُنیا میں ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دُنیا میں جو عموماً فساق وفجار، بدکار، ظالم، چور اور

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۸، وتفسیر البغوی ج:۸ ص:۱۹۷

ڈاکو ہیں، نفع میں رہتے اور مزے اُڑاتے ہیں، ایک چور اور ڈاکو ایک رات میں بعض اوقات اتنا کما لیتا ہے کہ شریف نیک آدمی عمر بھر میں بھی نہ کما سکے، پھر وہ نہ خوفِ خدا و آخرت کو جانتا ہے نہ کسی شرم وحیا کا پابند ہے، اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہے پورا کرتا ہے، اور نیک شریف آدمی اوّل تو خدا سے ڈرتا ہے، وہ بھی نہ ہو تو برادری کی شرم وحیا سے مغلوب ہوتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا کے کارخانے میں تو بدکار، بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے، اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق وناحق کا صحیح انصاف ہو، نیک کو اچھا بدلہ ملے، بد کو سزا ملے، تو پھر اوّل تو کسی بُرائی کو بُرائی اور گناہ کو گناہ کہنا لغو وبے معنی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک انسان کو بلاوجہ اس کی خواہشات سے روکنا ہے، دُوسرے پھر عدل وانصاف کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے، جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا انصاف کہاں گیا۔

رہا یہ شبہ کہ دُنیا میں بسا اوقات مجرم پکڑا جاتا ہے، اُس کی رُسوائی ہوتی ہے، سزا پاتا ہے، شریف آدمی کا اِمتیاز اس سے یہیں واضح ہو جاتا ہے، اور عدل وانصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ اوّل تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جائے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچنا آسان نہیں، جس کے ذریعے مجرم سزا پا سکے، اور جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور وزَر اور رِشوت وسفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے، اور اس زمانے کی حکومتی اور عدالتی جرم وسزا کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت تو سزا صرف وہ بے وقوف، بے عقل، یا بے سہارا آدمی پاتا ہے جو ہوشیاری سے کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے اور جس کے پاس نہ رِشوت کے لئے پیسے ہوں، نہ کوئی بڑا آدمی اس کا مددگار ہو، یا پھر وہ اپنی بے وقوفی سے ان چیزوں کو اِستعمال نہ کر سکے۔ باقی سب مجرم آزاد پھرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے اس لفظ نے اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عقلاً یہ ہونا ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جہاں سب کا حساب ہو اور جہاں مجرموں کے لئے کوئی چور دروازہ نہ ہو، اور جہاں انصاف ہی انصاف ہو، اور نیک وبد کا کھل کر اِمتیاز واضح ہو، اور اگر یہ نہیں ہے تو دُنیا میں کوئی بُرا کام بُرا نہیں، اور کوئی جرم، جرم نہیں، اور پھر خدائی عدل وانصاف کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

اور جب قیامت آنا اور اعمال کی جزا وسزا ہونا یقینی ہو گیا تو آگے کچھ احوالِ قیامت اور مجرمین کی سزا کا ذِکر کیا گیا ہے جس میں قیامت کے دن کشفِ ساق کا اِعجاز بیان ہوا ہے، اس کی حقیقت خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے۔

فَذَرۡنِیۡ وَمَنۡ یُّکَذِّبُ بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ ۔ یعنی آپ اس قیامت کی بات جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دیں، پھر دیکھیں کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ یہاں چھوڑ دینا ایک محاورے کے طور پر فرمایا گیا ہے، مراد اس سے اللہ پر بھروسہ اور توکل کرنا

ہے، اور حاصل اس کلام کا یہ ہے کہ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ بھی بار بار پیش ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم واقعی اللہ کے نزدیک مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب دینے پر قادر ہے تو پھر ہمیں عذاب ابھی کیوں نہیں دے ڈالتا ان کے ایسے دِل آزار مطالبوں کی وجہ سے کبھی کبھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا اور ممکن ہے کسی وقت دُعا بھی کی ہو کہ ان لوگوں پر اسی وقت عذاب آجائے تو باقی ماندہ لوگوں کی اصلاح کی توقع ہے، اس پر یہ فرمایا گیا کہ اپنی حکمت کو ہم ہی خوب جانتے ہیں، ایک حد تک ان کو مہلت دیتے ہیں، فوراً عذاب نہیں بھیج دیتے، اس میں ان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور اِیمان لانے کی مہلت بھی۔ آخر میں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعے کا ذِکر فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت فرمائی گئی کہ جس طرح یونس علیہ السلام نے لوگوں کے مطالبے سے تنگ آکر عذاب کی دُعا کر دی اور عذاب کے آثار سامنے بھی آگئے، اور یونس علیہ السلام اس جائے عذاب سے دُوسری جگہ منتقل بھی ہوگئے، مگر پھر پوری قوم نے اِلحاح وزاری اور اِخلاص کے ساتھ توبہ کر لی، اللہ تعالیٰ نے ان کو معافی دے دی اور عذاب ہٹالیا تو اَب یونس علیہ السلام نے یہ شرمندگی محسوس کی کہ میں ان لوگوں میں جھوٹا قرار پاؤں گا، اس بدنامی کے خوف سے اللہ تعالیٰ کے اِذنِ صریح کے بغیر اپنے اجتہاد سے یہ راہ اختیار کر لی کہ اب ان لوگوں میں واپس نہ جائیں، اس پر حق تعالیٰ نے اُن کی تنبیہ کے لئے دریا کے سفر، پھر مچھلی کے نگل جانے کا معاملہ فرمایا، اور پھر یونس علیہ السلام کے متنبہ ہوکر اِستغفار ومعافی کی طرف متوجہ ہونے پر دوبارہ اُن پر اپنے سابقہ اِنعامات کے دروازے کھول دیئے۔ یہ واقعہ سورۂ یونس اور دُوسری سورتوں میں گزر چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ یاد دِلا کر اس کی نصیحت فرمائی کہ آپ ان لوگوں کے ایسے مطالبے سے مغلوب نہ ہوں اور ان پر جلدی عذاب نازل کرنے کے خواہش مند نہ ہوں، اپنی حکمتوں اور عالم کی مصلحتوں کو ہم ہی جانتے ہیں، ہم پر توکل کریں۔

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کو صاحبِ حوت اسی مناسبت سے کہا گیا کہ وہ کچھ عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ الآیۃ۔ لَيُزْلِقُوْنَكَ اِزْلَاقٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی لغزش دینے اور گرادینے کے ہیں۔ (راغب) [1] مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غضب ناک اور ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنی جگہ اور مقام سے لغزش دے دیں، جب کہ وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ حالانکہ یہ کلام تو تمام جہان والوں کے لئے ذِکر ونصیحت اور اُن کی صلاح وفلاح کا ضامن ہے، ایسے کلام والا کہیں مجنون کہا جاسکتا ہے کفار کے جس طعنے کا اس سورۃ کے شروع میں جواب دیا گیا تھا،

[1] غریب القرآن للأصفهانی ج:۱ ص:۲۱۵

ختم سورۃ پر اُسی کا ایک دُوسرے انداز سے جواب دے دیا گیا۔

اور امام بغوی [۱] وغیرہ مفسرین نے ان آیات کا ایک خاص واقعہ نقل کیا ہے کہ انسان کی نظر بد لگ جانا اور اُس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا، جیسا کہ حقیقت ہے اور اَحادیثِ صحیحہ میں اس کا حق ہونا وارِد ہے، عرب میں بھی معروف ومشہور تھا، اور مکہ میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا، اُونٹوں یا جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ فوراً مرجاتے تھے۔ کفارِ مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تو تھی ہی اور ہر طرح کی کوشش آپ کو قتل کرنے اور ایذا پہنچانے کی کیا کرتے تھے، ان کو یہ سوجھی کہ اس شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر لگواؤ، اور اُس کو بلا لائے، اس نے نظرِ بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کر لی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی، یہ آیات اسی سلسلے میں نازل ہوئیں، اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نگاہِ بد لگانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

فائدہ

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جس شخص کو نظرِ بد کسی انسان کی لگ گئی ہو، اُس پر یہ آیات پڑھ کر دَم کر دینا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے، یہ آیات وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے آخرِ سورت تک ہیں۔ (مظہری) [۲]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْقَلَمِ بِحَمْدِ اللهِ يَوْمَ الْاَحَدِ لِسِتٍّ مَضَيْنَ مِنْ رَجَب ۱۳۹۱ھ

---

[۱] تفسیر البغوی تحت هذه الآية، ج:۸ ص:۲۰۲۔

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۴۷

سورۃ الحاقۃ

اٰیاتھا ٥٢ | ٦٩ سُوْرَۃُ الْحَاۗقَّۃِ مَکِّیَّۃٌ ٧٨ | رکوعاتھا ٢

سورۂ حاقہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی باون آیتیں ہیں اور اس میں دو رُکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَاۗقَّۃُ ۙ﴿١﴾ مَا الْحَاۗقَّۃُ ۚ﴿٢﴾ وَمَاۗ اَدْرٰىکَ مَا الْحَاۗقَّۃُ ؕ﴿٣﴾ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ

وہ ثابت ہوچکنے والی، کیا ہے وہ ثابت ہوچکنے والی اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہوچکنے والی جھٹلایا ثمود

وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ ﴿٤﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُہْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ ﴿٥﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُہْلِکُوْا

اور عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو، سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کردیئے گئے اُچھال کر، اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے

بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ ۙ﴿٦﴾ سَخَّرَہَا عَلَیْہِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ

ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے نکل جائے ہاتھوں سے، مقرّر کردیا اس کو اُن پر سات رات اور آٹھ دن تک

حُسُوۡمًا ؕ فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۚ ﴿۷﴾

لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں پچھڑ گئے گویا وہ ڈھنڈ ہیں کھجور کے کھوکھلے،

فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾ وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ

پھر تو دیکھتا ہے کوئی ان میں کا بچا اور آیا فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور اُلٹ جانے والی بستیاں

بِالۡخَاطِئَةِ ۚ ﴿۹﴾ فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَهُمۡ اَخۡذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا

خطائیں کرتے ہوئے، پھر حکم نہ مانا اپنے رب کے رسول کا، پھر پکڑا اُن کو پکڑنا سخت۔ ہم نے جس وقت

طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِى الۡجَارِيَةِ ۙ ﴿۱۱﴾ لِنَجۡعَلَهَا لَكُمۡ تَذۡكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ

پانی اُبلا لادلیا تم کو چلتی کشتی میں، تاکہ رکھیں اس کو تمہاری یادگاری کے واسطے اور سینت کر رکھے اس کو کان

وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوۡرِ نَفۡخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الۡاَرۡضُ

سینت کر رکھنے والا، پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا، اور اُٹھائی جائے زمین

وَالۡجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ ﴿۱۴﴾ فَيَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۙ ﴿۱۵﴾

اور پہاڑ پھر کوٹ دیئے جائیں ایک بار، پھر اُس دن ہو پڑے وہ ہو پڑنے والی،

وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوۡمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ ﴿۱۶﴾ وَّالۡمَلَكُ عَلٰٓى اَرۡجَآئِهَا ؕ

اور پھٹ جائے آسمان پھر وہ اُس دن بکھر رہا ہے، اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر

وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ ﴿۱۷﴾ يَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ

اور اُٹھائیں گے تخت تیرے رب کا اپنے اوپر اُس دن آٹھ شخص اُس دن سامنے کئے جاؤ گے

لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ

چھپی نہ رہے گی تمہاری کوئی چھپی بات، سو جس کو ملا اُس کا لکھا داہنے ہاتھ میں وہ کہتا ہے

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ

لیجیو پڑھیو میرا لکھا میں نے خیال رکھا اس بات کا کہ مجھ کو ملے گا میرا حساب سو وہ ہیں

فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾

من مانتے گزران میں اُونچے باغ میں جس کے میوے جھکے پڑے ہیں

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنْ

کھاؤ اور پیو رَچ کر بدلہ اُس کا جو آگے بھیج چکے ہو تم پہلے دنوں میں۔ اور جس کو

اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ

ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں وہ کہتا ہے کیا اچھا ہوتا جو مجھ کو نہ ملتا میرا لکھا اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ

مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ﴿۲۷﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾

کیا ہے حساب میرا کسی طرح وہی موت ختم کرجاتی کچھ کام نہ آیا مجھ کو میرا مال

هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾

برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری۔ اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو پھر آگ کے ڈھیر میں اس کو ڈالو

ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ

پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اُس کو جکڑ دو، وہ تھا کہ یقین نہ لاتا تھا

بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ

اللہ پر جو سب سے بڑا اور تاکید نہ کرتا تھا فقیر کے کھانے پر، سو کوئی نہیں آج اس کا

هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾

یہاں دوستدار، اور نہ کچھ ملے کھانا مگر زخموں کا دھوون، کوئی نہ کھائے اس کو مگر وہی گناہگار،

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ

سو قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جو دیکھتے ہو اور جو چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے، یہ کہا ہے

رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

ایک پیغام لانے والے سردار کا، اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا، تم تھوڑا یقین کرتے ہو،

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ

اور نہیں ہے کہا پریوں والے کا، تم بہت کم دھیان کرتے ہو، یہ اُتارا ہوا ہے

رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ

جہان کے رَبّ کا، اور اگر یہ بنالاتا ہم پر کوئی بات، تو ہم پکڑ لیتے اس کا

بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ

داہنا ہاتھ، پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن، پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے

حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ

بچالے، اور یہ نصیحت ہے ڈرنے والوں کو، اور ہم کو معلوم ہے کہ تم میں بعضے

مُّكَذِّبِيْنَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٥١﴾

جھٹلاتے ہیں، اور وہ جو ہے پچتاوا ہے منکروں پر، اور وہ جو ہے یقین کرنے کے قابل ہے،

ع ۱۵/۲ ۲
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٥٢﴾ ع

اب بول پاکی اپنے رَبّ کے نام کی جو ہے سب سے بڑا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

وہ حقیقت جو ہو کر رہے گی! ① کیا ہے وہ حقیقت جو ہو کر رہے گی؟ ② اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ حقیقت کیا ہے جو
ہو کر رہے گی؟ ③ ثمود اور عاد کی قوموں نے اُسی جھنجوڑ ڈالنے والی حقیقت کو جھٹلایا تھا۔ ④ نتیجہ یہ کہ جو ثمود کے لوگ تھے، وہ
(چنگھاڑ کی) ایسی آفت سے ہلاک کئے گئے جو حد سے زیادہ (خوفناک) تھی۔ ⑤ اور جو عاد کے لوگ تھے، انہیں ایک ایسی
بے قابو طوفانی ہوا سے ہلاک کیا گیا ⑥ جسے اللہ نے اُن پر سات رات اور آٹھ دن لگاتار مسلط رکھا۔ چنانچہ تم (اگر وہاں
ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ لوگ وہاں کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح پچھاڑے ہوئے پڑے تھے۔ ⑦ اب کیا اُن میں سے کوئی
بچا ہوا نظر آتا ہے؟ ⑧ اور فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے اور (لوط علیہ السلام کی) اُلٹی ہوئی بستیوں نے بھی اسی
جرم کا اِرتکاب کیا تھا، ⑨ کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغمبر کی نافرمانی کی تھی، اس لئے اللہ نے انہیں سخت پکڑ میں لے
لیا۔ ⑩ جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کردیا، ⑪ تاکہ ہم اس واقعے کو تمہارے لئے سبق آموز بنادیں
اور یاد رکھنے والے کان اُسے (سن کر) یاد رکھیں۔ ⑫ پھر جب ایک ہی دفعہ صور میں پھونک ماردی جائے گی، ⑬ اور زمین
اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کردیا جائے گا، ⑭ تو اُس دن وہ واقعہ پیش آجائے گا جسے پیش آنا
ہے۔ ⑮ اور آسمان پھٹ پڑے گا، اور وہ اُس دن بالکل بودا پڑ جائے گا۔ ⑯ اور فرشتے اُس کے کناروں پر ہوں گے، اور
تمہارے پروردگار کے عرش کو اُس دن آٹھ فرشتے اپنے اُوپر اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ ⑰ اُس دن تمہاری پیشی اس طرح
ہوگی کہ تمہاری کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی نہیں رہے گی۔ ⑱ پھر جس کسی کو اُس کا اعمال نامہ اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے
گا، وہ کہے گا کہ: ”لوگو! لو یہ میرا اعمال نامہ پڑھو، ⑲ میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے حساب کا سامنا کرنا ہوگا۔“ ⑳

چنانچہ وہ من پسند عیش میں ہوگا، (۲۱) اُس اُونچی جنت میں (۲۲) جس کے پھل جھکے پڑ رہے ہوں گے، (۲۳) (کہا جائے گا کہ:)
"اپنے اُن اعمال کے صلے میں مزے سے کھاؤ پیو، جو تم نے گذرے ہوئے دنوں میں کئے تھے۔" (۲۴) رہا وہ شخص جس کا
اعمال نامہ اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، تو وہ کہے گا کہ: "اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ جاتا، (۲۵) اور مجھے
خبر بھی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے؟ (۲۶) اے کاش! کہ میری موت ہی پر میرا کام تمام ہو جاتا! (۲۷) میرا مال میرے کچھ کام
نہ آیا، (۲۸) میرا سارا زور مجھ سے جاتا رہا۔" (۲۹) (ایسے شخص کے بارے میں حکم ہوگا:) "پکڑو اسے، اور اس کے گلے میں
طوق ڈال دو، (۳۰) پھر اسے دوزخ میں جھونک دو، (۳۱) پھر اسے ایسی زنجیر میں پرو دو جس کی پیمائش ستر ہاتھ کے برابر
ہو۔ (۳۲) یہ نہ تو خدائے بزرگ و برتر پر اِیمان لاتا تھا، (۳۳) اور نہ غریب کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا، (۳۴) لہٰذا آج یہاں نہ
اُس کا کوئی یار و مددگار ہے، (۳۵) اور نہ اُس کو کوئی کھانے کی چیز میسر ہے، سوائے غسلین کے، (۳۶) جسے گناہگاروں کے سوا
کوئی نہیں کھائے گا۔" (۳۷) اب میں قسم کھاتا ہوں اُس کی بھی جسے تم دیکھتے ہو، (۳۸) اور اُس کی بھی جسے تم نہیں دیکھتے (۳۹) کہ یہ
(قرآن) ایک معزز پیغام لانے والے کا کلام ہے، (۴۰) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ (مگر) تم اِیمان تھوڑا ہی لاتے
ہو، (۴۱) اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔ (مگر) تم سبق تھوڑا ہی لیتے ہو۔ (۴۲) یہ کلام تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے
اُتارا جا رہا ہے۔ (۴۳) اور اگر (بالفرض) یہ پیغمبر کچھ (جھوٹی) باتیں بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتے، (۴۴) تو ہم ان کا داہنا
ہاتھ پکڑتے، (۴۵) پھر ہم ان کی شہ رَگ کاٹ دیتے (۴۶) پھر تم میں سے کوئی نہ ہوتا جو اُن کے بچاؤ کے لئے آڑے آسکتا۔ (۴۷)
اور یقین جانو کہ یہ پرہیزگاروں کے لئے ایک نصیحت ہے، (۴۸) اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے والے
بھی ہیں۔ (۴۹) اور یہ (قرآن) ایسے کافروں کے لئے حسرت کا سبب ہے۔ (۵۰) اور یہی وہ یقینی بات ہے جو سراسر حق
ہے۔ (۵۱) لہٰذا تم اپنے پروردگار کے عظمت والے نام کی تسبیح کرتے رہو۔ (۵۲)

خلاصۂ تفسیر

وہ ہونے والی چیز، کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز، اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز (مقصود اس سے قیامت کی عظمت اور ہولناک ہونے کا بیان ہے، یہ اِستفہامات تہویل کے لئے ہیں) ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی چیز (یعنی قیامت) کی تکذیب کی، سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے، اور عاد جو تھے سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کر دیا تھا، سو (اے

مخاطب اگر) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں (کیونکہ وہ بہت دراز قد تھے) سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے (یعنی کوئی نہیں بچا، کقولہ تعالیٰ: هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ [۱] (مریم)) اور (اسی طرح) فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے (جن میں قوم نوح و عاد و ثمود سب آگئے) اور (قوم لوط کی) الٹی ہوئی بستیوں نے بڑے بڑے قصور کئے (یعنی کفر و شرک اس پر ان کے پاس رسول بھیجے گئے) سو انہوں نے اپنے رَبّ کے رسول کا (جو اُن کی طرف بھیجا گیا تھا) کہنا نہ مانا (اور کفر و شرک سے باز نہ آئے جس میں تکذیبِ قیامت بھی داخل ہے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سخت پکڑا (جن میں سے عاد و ثمود کا قصہ تو ابھی آچکا ہے اور قومِ لوط اور قومِ فرعون کی عقوبت بہت سی آیتوں میں پہلے آچکی ہے، اور قومِ نوح کی عقوبت آگے بضمن امتنان مذکور ہے یعنی) ہم نے جب کہ (نوح علیہ السلام کے وقت میں) پانی کو طغیانی ہوئی تم کو (یعنی تمہارے بزرگوں کو جو مؤمن تھے اور ان کی نجات تمہارے وجود کا سبب ہوئی) کشتی میں سوار کیا (اور باقیوں کو غرق کردیا) تاکہ ہم اس معاملے کو تمہارے لئے ایک یادگار (اور عبرت) بنادیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھیں، (کان کو یاد رکھنے والا مجازاً کہہ دیا۔ حاصل یہ کہ اس کو یاد رکھ کر سزا کے اسباب سے بچیں، یہ قصے تو مکذبینِ قیامت کے ہوئے، آگے قیامت کے ہول وخوف کا بیان ہے، یعنی) پھر جب صور میں یک بارگی پھونک مار دی جائے گی (مراد نفخۂ اُولیٰ ہے) اور (اس وقت) زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اُٹھالئے جائیں گے (یعنی اپنی حیّز سے ہٹادیئے جائیں گے) پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے تو اس روز وہ ہونے والی چیز ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور وہ (آسمان) اس روز بالکل بودا ہوگا (چنانچہ پھٹ جانا دلیلِ ضعف ہے، یعنی جیسا اس وقت وہ مضبوط ہے اور اس میں کہیں فطور و شقوق نہیں، اس روز اس میں یہ بات نہ رہے گی بلکہ ضعف و انشقاق ہوجائے گا) اور فرشتے (جو آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں جس وقت وہ پھٹنا شروع ہوگا) اس کے کناروں پر آجائیں گے (اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ آسمان بیچ میں سے پھٹ کر چاروں طرف سمٹنا شروع ہوگا، اس لئے فرشتے بھی بیچ میں سے کناروں پر آرہیں گے۔ پھر آیت: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ...إلخ [۲] (الزمر:۶۸) کے مطابق ان فرشتوں پر بھی موت مسلط ہوجائے گی (كذا فى الكبير احد الوجهين [۳]) اور یہ سب واقعات تو نفخۂ اُولیٰ کے وقت کے ہیں) اور (آگے نفخۂ ثانیہ کے وقت کے واقعات ہیں کہ) آپ کے

[۱] ترجمہ: کیا آپ اُن میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا اُن کی کوئی آہستہ آواز سنتے ہیں۔

[۲] ترجمہ: سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔

[۳] التفسير الكبير للرازي تحت هذه الآية، ج:۳۰ ص:۹۶

پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اُٹھائے ہوں گے (حدیث میں ہے کہ اب عرش کو چار فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں، قیامت کو آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے (کما فی الدر مرفوعًا [1])۔ غرض آٹھ فرشتے عرش کو اُٹھا کر میدانِ قیامت میں لائیں گے اور حساب شروع ہوگا جس کا آگے بیان ہے، یعنی) جس روز تم (خدا کے رُوبرو حساب کے واسطے) پیش کئے جاؤ گے (اور) تمہاری کوئی بات (اللہ تعالیٰ سے) پوشیدہ نہ ہوگی پھر (نامۂ اعمال اُڑا کر ہاتھ میں دیئے جائیں گے تو) جس شخص کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ تو (خوشی کے مارے آس پاس والوں سے) کہے گا کہ میرا نامۂ اعمال پڑھ لو میرا (تو پہلے ہی سے) اعتقاد تھا کہ مجھ کو میرا حساب پیش آنے والا ہے۔ (یعنی میں قیامت اور حساب کا معتقد تھا، مطلب یہ کہ میں ایمان اور تصدیق رکھتا تھا، خدا تعالیٰ نے اس کی برکت سے آج مجھ کو نوازا) غرض وہ شخص پسندیدہ عیش یعنی بہشت بریں میں ہوگا، جس کے میوے (اس قدر) جھکے ہوں گے (کہ جس حالت میں چاہیں گے لے سکیں گے اور حکم ہوگا کہ) کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلے میں جو تم نے بأمید صلہ گزشتہ ایام (یعنی زمانہ قیامِ دُنیا) میں کئے ہیں۔ اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، سو وہ (نہایت حسرت سے) کہے گا کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامۂ اعمال ہی نہ ملتا، اور مجھ کو یہ ہی خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے کیا اچھا ہوتا کہ (پہلی) موت ہی خاتمہ کر چکتی (اور دوبارہ زندہ نہ ہوتے جس پر یہ حساب کتاب مرتب ہوا، افسوس) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا۔ (یعنی مال وجاہ سب بے سود ٹھہرے۔ ایسے شخص کے لئے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق پہنادو، پھر دوزخ میں اس کو داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے اس کو جکڑ دو، (اس گز کی مقدار خدا کو معلوم ہے، کیونکہ یہ گز وہاں کا ہوگا، آگے اس عذاب کی وجہ بتلاتے ہیں کہ) یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا (یعنی جس طرح ایمان لانا حسبِ تعلیم انبیاء ضروری تھا، وہ ایمان نہ رکھتا تھا) اور (خود تو کسی کو کیا دیتا، اَوروں کو بھی) غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔ (حاصل یہ کہ خدا کی عظمت اور مخلوق کی شفقت جو اصل عبادات متعلقہ حقوق اللہ وحقوق العباد ہیں، یہ دونوں کا تارک اور منکر تھا، اس لئے مستحقِ عذاب ہوا) سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوست دار ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے، (یعنی بجز ایک ایسی چیز کے جو کراہت وصورت میں مثلِ غِسلین کے ہوگا، جس سے زخم دھوئے گئے ہوں، اور یہ حصر اضافی ہے، اور مقصود اس سے نفی ہے مرغوب کھانوں کی، ورنہ زَقوم کی غذا ہونا خود آیات سے ثابت ہے، غرض ان کا طعام غِسلین ہوگا) جس کو بجز بڑے گناہگاروں کے کوئی نہ کھائے گا (آگے قرآن کی حقانیت، ارشاد فرمائی جاتی ہے جس میں قیامت میں جزا وسزا ہونے کا بیان ہے، اس کی تکذیب

---

[1] الدر المنثور ج:۱۴ ص:۶۷۰

موجبِ تعذیب مذکور ہے) پھر (بعد بیان مضمون مجازاۃ کے) میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے (کیونکہ بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوۃ آنکھوں سے نظر آنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوۃ یہ صلاحیت نہیں رکھتیں، اس قسم کو مقصود سے ایک خاص مناسبت ہے کہ قرآن مجید کا لانے والا نظر نہ آتا تھا، اور جن پر قرآن آتا تھا وہ نظر آتے تھے، مراد یہ ہے کہ تمام مخلوق کی قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا (پس جس پر یہ کلام نازل ہوا وہ ضرور رسول ہے) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے (جیسا کہ کفار آپ کو شاعر کہتے تھے، مگر) تم بہت کم ایمان لاتے ہو (یہاں قلّت سے مراد عدم ہے) اور یہ نہ کسی کاہن کا کلام ہے (جیسا بعض کفار آپ کو کہتے تھے، مگر) تم بہت کم سمجھتے ہو (یہاں بھی قلّت سے مراد عدم ہے، غرض یہ نہ شعر ہے، نہ کہانت ہے بلکہ) رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا (کلام) ہے۔ اور (آگے اس کی حقانیت کی ایک دلیلِ عقلی ارشاد ہوتی ہے کہ) اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے (یعنی جو کلام ہمارا نہ ہوتا اس کو ہمارا کلام کہتے اور جھوٹا دعویٰ نبوّت کا کرتے) تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر ہم اُن کی رگِ دِل کاٹ ڈالتے، پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا (رگِ دِل کاٹنے سے آدمی مر جاتا ہے، مراد اس سے قتل ہے)۔ اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے (یعنی فی نفسہٖ حق ہونا اس کی صفتِ کمالیہ ذاتیہ ہے، اور موجبِ نصیحت اس کی صفتِ کمالیہ اضافیہ ہے) اور (آگے مکذبین کی وعید ہے کہ) ہم کو معلوم ہے کہ تم میں سے بعض تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے) اور (اس اعتبار سے) یہ قرآن کافروں کے حق میں موجبِ حسرت ہے (کیونکہ ان کے لئے بوجہ تکذیب کے سببِ عذاب ہوگیا) اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کا یہ کلام ہے) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے۔

معارف ومسائل

اس سورت میں قیامت کے ہولناک واقعات اور پھر وہاں کفار و فجار کی سزا اور مؤمنین و متقین کی جزا کا ذِکر ہے۔

قیامت کے نام قرآنِ کریم میں بہت سے آئے ہیں، اس سورت میں قیامت کو حَاقَّۃٌ کے لفظ سے، پھر قَارِعَۃٌ کے، پھر وَاقِعَۃٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہ سب قیامت کے نام ہیں۔

لفظ حَاقَّۃٌ کے معنی حق اور ثابت کے بھی آتے ہیں، اور دُوسری چیزوں کو حق ثابت کرنے والی چیز کو بھی حَاقَّۃٌ کہتے ہیں۔ قیامت پر یہ لفظ دونوں معنی کے اعتبار سے صادق آتا ہے، کیونکہ قیامت خود بھی حق ہے اور اس کا وقوع ثابت اور یقینی ہے، اور قیامت مؤمنین کے لئے جنت اور کفار کے لئے جہنم ثابت اور مقرّر کرنے والی بھی ہے۔ یہاں قیامت کے اس نام

کے ساتھ سوال کو مکرّر کر کے اس کے مافوق القیاس اور حیرت انگیز ہولناک ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

قَــارِعَــۃ کے لفظی معنی کھڑ کھڑانے والی چیز کے ہیں، قیامت کے لئے یہ لفظ اس لئے بولا گیا کہ وہ سب لوگوں کو مضطرب اور بے چین کرنے والی، اور تمام آسمان وزمین کے اجسام کو منتشر کرنے والی ہے۔

طَاغِيَۃ، طُغْيَانٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں۔ مراد ایسی سخت آواز ہے جو تمام دُنیا کی آوازوں کی حد سے باہر ہے اور زیادہ ہے، جس کو اِنسان کا قلب ودِماغ برداشت نہ کر سکے۔ قومِ ثمود کی نافرمانی جب حد سے بڑھ گئی تو اُن پر اللہ کا عذاب اسی سخت آواز کی صورت میں آیا تھا جس میں تمام دُنیا کی بجلیوں کی کڑک اور دُنیا بھر کی سب سخت آوازوں کا مجموعہ تھا، جس سے اُن کے دِل پھٹ گئے۔

رِيْحٍ صَرْصَرٍ، اس سخت ہوا کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ سرد بھی ہو۔

سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کی صبح سے یہ آندھی کا عذاب شروع ہو کر دُوسرے بدھ کی شام تک رہا، اس طرح دن تو آٹھ ہو گئے اور راتیں سات آئیں۔

حُسُوْمًا، حَاسِمٌ کی جمع ہے، جس کے معنی قطع کرنے اور اِستیصال کرنے یعنی بالکل فنا کر دینے والے کے ہیں۔

مُؤْتَفِكٰتٌ کے معنی باہم مختلط اور ملے جلے کے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کو مُؤْتَفِكَات یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سب آپس میں ملی ہوئی بستیاں تھیں، اور یا اس لئے کہ عذاب آنے کے وقت جب ان کا تختہ اُلٹا گیا تو سب گڈمڈ ہو گئیں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ صور کوئی سینگ (کی شکل کی کوئی چیز) ہے جس میں قیامت کے روز پھونکا جائے گا۔[1]

نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ سے مراد یہ ہے کہ یکبارگی اچانک یہ صور کی آواز ہوگی اور ایک آواز مسلسل رہے گی یہاں تک کہ اس آواز سے سب مر جائیں گے۔ قرآن وسنت کی نصوص سے قیامت میں صور کے دو نفخے ہونا ثابت ہیں، پہلے نفخے کو نفخۂ صعق کہا جاتا ہے، جس کے متعلق قرآنِ کریم میں: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (الزمر:۶۸) یعنی اس نفخے سے تمام آسمان والے فرشتے اور زمین پر بسنے والے جن واِنس اور تمام جانور بیہوش ہو جائیں گے (پھر اسی بیہوشی میں سب کو موت آجائے گی)۔ دُوسرے نفخے کو نفخۂ بعث کہا جاتا ہے، بعث کے معنی اُٹھنے کے ہیں، اس نفخے کے ذریعے سب مُردے پھر زِندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے، جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی اس آیت میں ہے: ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ

[1] جامع الترمذی، ابواب صفة القیامة، باب شأن الصُّور ج:۲ ص:۶۹

یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ (الزمر) یعنی پھر صور دوبارہ پھونکا جائے گا جس سے اچانک سب کے سب مُردے زِندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔

بعض روایات میں جوان دونوں نفخوں سے پہلے ایک تیسرے نفخے کا ذِکر ہے، جس کا نام نفخۂ فزع بتلایا گیا ہے، مجموعہ روایات ونصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا نفخہ ہی ہے، اسی کو اِبتدا میں نفخۂ فزع کہا گیا ہے اور اِنتہا میں وہی نفخہ صعق ہوجائے گا۔ (مظہری) [1]

وَیَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ ﴿۱۷﴾ یعنی قیامت کے روز عرشِ رَحمٰن کو آٹھ فرشتے اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ کام چار فرشتوں کے سپرد ہے، قیامت کے روز اُن کے ساتھ اور چار بڑھادیئے جائیں گے۔

رہا یہ معاملہ کہ عرشِ رَحمٰن کیا چیز ہے اُس کی حقیقت اور حقیقی شکل وصورت کیا ہے اور فرشتوں کا اُس کو اُٹھانا کس صورت سے ہے یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ نہ عقلِ انسانی ان کا اِحاطہ کرسکتی ہے، نہ ان مباحث میں ان کو غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت ہے۔ سلف صالحین صحابہ وتابعین کا مسلک اس جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ اس پر اِیمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ جل شانہ کی مراد ہے وہ حق ہے، اور اس کی حقیقت وکیفیت نامعلوم ہے۔

یَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ لَا تَخۡفٰی مِنۡکُمۡ خَافِیَۃٌ ﴿۱۸﴾ یعنی اُس روز سب اپنے رَبّ کے سامنے پیش ہوں گے، کوئی چھپنے والا چھپ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے علم وبصر سے تو آج بھی کوئی نہیں چھپ سکتا، اُس روز کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ میدانِ حشر میں تمام زمین ایک سطح مستوی ہوجائے گی، نہ کوئی غار رہے گا، نہ پہاڑ، نہ کوئی تعمیر ومکان، نہ کسی درخت وغیرہ کی آڑ، یہی چیزیں ہیں جن کے پیچھے دُنیا میں چھپنے والے چھپا کرتے ہیں، وہاں ان میں سے کوئی چیز نہ ہوگی، کسی کو چھپنے کا اِمکان ہی نہ رہے گا۔

ہَآؤُمُ اقۡرَءُوۡا کِتٰبِیَہۡ ﴿۱۹﴾ لفظ ہَآؤُمُ، خُذُوۡ کے معنی میں ہے، جمع کے لئے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس کا نامۂ اَعمال داہنے ہاتھ میں آئے گا، وہ خوشی کے مارے آس پاس کے لوگوں سے کہنے لگے گا کہ لو یہ میرا اعمال نامہ پڑھو۔

ہَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَہۡ ﴿۲۹﴾ سُلۡطَانٌ کے لفظی معنی غلبہ وتسلط کے ہیں، اسی لئے حکومت کو ''سلطنت'' اور حاکم کو ''سلطان'' کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں جو مجھے دُوسرے لوگوں پر بڑائی اور غلبہ حاصل تھا میں سب میں بڑا مانا جاتا تھا آج وہ بڑائی اور غلبہ بھی کچھ کام نہ آیا۔ اور ''سلطان'' بمعنی حجت بھی لیا جاسکتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ افسوس آج

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۵۱

میرے ہاتھ میں کوئی حجت وسند نہیں جس کے ذریعے عذاب سے نجات حاصل ہو سکے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ یہ حکم فرشتوں کو ہوگا کہ اس مجرم کو پکڑ واور اس کے گلے میں طوق ڈالو، لیکن الفاظِ آیت میں اس کا ذِکر نہیں کہ کون پکڑے اور طوق ڈالے، اسی لئے بعض روایات میں ہے کہ یہ حکم صادر ہوگا تو ہر درودِیوار اور ہر چیز مطیع وفرمانبردار نوکروں کی طرح اس کے پکڑنے کو دوڑے گی۔

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ یعنی پھر اس کو ایک زنجیر میں پرودو، جس کی مقدار ستر گز ہے۔ زنجیر میں پرونے کے کا وہ مفہوم بھی مجازاً لیا جاسکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ زنجیر میں جکڑ دو، لیکن اس کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ زنجیر ان کے بدن کے اندر ڈال کر دُوسری طرف نکال لو، جیسے موتی یا تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں، بعض روایاتِ حدیث سے اسی حقیقی معنی کی تائید بھی ہوتی ہے۔ (از مظہری) [۱]

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ حَمِيْمٌ مخلص اور گہرے دوست کو کہا جاتا ہے، اور غِسْلِيْنٌ بکسر غین وہ پانی ہے جس میں جہنمیوں کے زخموں کی پیپ وغیرہ دھوئی جائے گی۔ مطلب آیات کا یہ ہے کہ آج اس کا کوئی دوست عزیز اس کی حمایت نہ کر سکے گا، اور اس کو عذاب سے نہ بچا سکے گا، اور اس کے کھانے کے لئے سوائے اُس گندے پانی کے جس میں اہلِ جہنم کی پیپ اور پس پڑی ہوگی اور کچھ نہ ہوگا۔ اور کچھ نہ ہونے کا مفہوم اُوپر خلاصۂ تفسیر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مرغوب کھانوں میں سے کچھ نہ ہوگا۔ غِسْلِيْنٌ کی طرح کی کوئی اور مکروہ، بدذائقہ چیز کی نفی نہیں ہے، اس لئے دُوسری آیت میں جو اہلِ جہنم کا ''زَقوم'' کھانا آیا ہے، وہ اس کے منافی نہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ یعنی قسم ہے اُن تمام چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، یا دیکھ سکتے ہو، اور جن کو تم نہ دیکھتے ہو، نہ دیکھ سکتے ہو، اس میں تمام مخلوقات آگئیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد حق تعالیٰ کی ذات وصفات ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد دُنیا کی چیزیں ہیں، اور نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد آخرت کی اشیاء۔ (مظہری) [۲] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا الخ، تَقَوَّلَ کے معنی بات گھڑنے کے ہیں، اور وَتِيْنٌ قلب سے نکلنے والی وہ رَگ ہے جس سے رُوح جسمِ انسانی میں پھیلتی ہے، اس کے قطع کر دینے سے موت فوراً واقع ہو جاتی ہے۔

سابقہ آیات میں کفارِ مکہ کے اس بیہودہ خیال کا رَدّ کیا گیا تھا، کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور آپ کے کلام کو

---

[۱] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۵۵

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۵۶ و۵۷

شعر کہتا تھا، کوئی آپ کو کاہن اور کلام کو کہانت کہتا تھا۔ ''کاہن'' وہ شخص ہوتا ہے جو کچھ شیاطین سے خبریں پاکر، کچھ نجوم کے اثرات سے معلوم کر کے آنے والے واقعات میں اٹکل پچو باتیں کیا کرتا تھا۔ غرض آپ کو شاعر یا کاہن کہنے والوں کے اِلزام کا حاصل یہ تھا کہ آپ جو کلام سناتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خیالات سے یا کاہنوں کی طرح شیاطین سے کچھ کلمات جمع کر لئے ہیں، اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مذکورہ آیات میں حق تعالیٰ نے اُن کے اس خیالِ باطل کو ایک دُوسری صورت سے بڑی شدّت کے ساتھ اس طرح رَدّ کیا ہے کہ دیوانو! اگر یہ رسول معاذ اللہ ہماری طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے اور ہم پر اِفترا پردازی کرتے تو کیا ہم یوں ہی دیکھتے رہتے اور ان کو ڈھیل دے دیتے کہ خلقِ خدا کو گمراہ کریں۔ یہ بات کوئی عقل والا باور نہیں کر سکتا، اس لئے اس آیت میں بطور فرضِ محال کے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ رسول کوئی قول بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کرتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی رَگِ جان کاٹ ڈالتے اور پھر ہماری سزا سے اُن کو کوئی بھی نہ بچا سکتا، یہاں یہ شدّت کے الفاظ ان جاہلوں کو سنانے کے لئے فرضِ محال کے طور پر اِستعمال فرمائے ہیں۔ داہنا ہاتھ پکڑنے کی تخصیص غالباً اس لئے ہے کہ جب کسی مجرم کو قتل کیا جاتا ہے تو قتل کرنے والا اس کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے، قتل کرنے والے کے بائیں ہاتھ کے مقابل مقتول کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے، اُس کو یہ قتل کرنے والا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر داہنے ہاتھ سے اس پر حملہ کرتا ہے۔

تنبیہ

اس آیت میں ایک خاص واقعے کے متعلق یہ فرمایا کہ اگر خدانخواستہ، معاذ اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا، اس میں کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا کہ جو شخص بھی نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کرے ہمیشہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کیا، اُن پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾ اس سے پہلی آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے، جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے، اور وہ تقویٰ اِختیار کرنے والوں کے لئے تذکرہ اور نصیحت ہے، مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان سب قطعی اور یقینی اُمور کو جانتے ہوئے تم میں بہت سے آدمی اس کی تکذیب بھی کرتے رہیں گے، جس کا نتیجہ آخرت میں اُن کی حسرت و یاس اور عذابِ دائمی ہوگا۔ اور آخر میں فرمایا: وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ یعنی یہ بات بالکل حق اور یقینی ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ سب کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾ جس میں اشارہ ہے کہ آپ ان معاند کفار کی باتوں پر دھیان نہ دیں، اور ان سے

مغموم نہ ہوں، بلکہ اپنے رَبِّ عظیم کی تسبیح وتقدیس کو اپنا مشغلہ بنالیں کہ یہی ان سب غموں سے نجات کا ذریعہ ہے، اور یہ ایسا ہے جیسا دُوسری جگہ قرآنِ کریم میں فرمایا ہے: وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۹۸﴾ (الحجر) یعنی ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کفار کی بیہودہ گفتگو سے دِل تنگ ہوتے ہیں، اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے رَبّ کی حمد میں مشغول ہوجائیں اور سجدہ گزاروں میں شامل ہوجائیں، اُن کی باتوں کی طرف اِلتفات نہ کریں۔

ابوداوٗد میں حضرت عقبہ ابن عامر جہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت: فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ ﴿۵۲﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنے رُکوع میں رکھو، اور جب آیت: سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ﴿۱﴾ [۱] (الاعلیٰ) نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کو اپنے سجدے میں رکھو۔ [۲] اسی لئے باجماعِ اُمت رُکوع اور سجدے میں یہ دونوں تسبیحات پڑھی جاتی ہیں، جمہور کے نزدیک ان کا پڑھنا اور تین مرتبہ تکرار کرنا سنت ہے، بعض حضرات نے واجب بھی کہا ہے۔

تَمَّتۡ سُوۡرَۃُ الۡحَآقَّۃِ بِحَمۡدِ اللہِ تَعَالٰی

---

[۱] ترجمہ: آپ اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجئے۔

[۲] ابوداود، ابواب الصلاۃ، باب ما یقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ، رقم الحدیث: ۷۳۶، ج: ۱ ص: ۱۲۶

سورة المعارج

آیاتها ۴۴ ۷۰ سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ ۷۹ رکوعاتها ۲

سورۂ معارج مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾

مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا، منکروں کے واسطے کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا،

مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ

آئے اللہ کی طرف سے جو چڑھتے درجوں والا ہے، چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور روح اس دن میں

كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾

جس کا لنباؤ پچاس ہزار برس ہے، سو تو صبر کر بھلی طرح کا صبر کرنا،

إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ﴿٦﴾ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ﴿٧﴾ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ

وہ دیکھتے ہیں اس کو دُور اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک، جس دن ہوگا آسمان

كَالْمُهْلِ ﴿٨﴾ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿٩﴾ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ﴿١٠﴾

جیسے تانبا پگھلا ہوا، اور ہوں گے پہاڑ جیسے اُون رنگی ہوئی، اور نہ پوچھے گا دوست دار دوست دار کو،

يُبَصَّرُونَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾

سب نظر آجائیں گے ان کو، چاہے گا گناہگار کسی طرح چھڑوائی میں دے کر اُس دن کے عذاب سے اپنے بیٹے کو،

وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ﴿١٣﴾ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ

اور اپنی ساتھ والی کو، اور اپنے بھائی کو، اور اپنے گھرانے کو جس میں رہتا تھا، اور جتنے زمین پر ہیں

جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ﴿١٤﴾ كَلَّا إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُو

سب کو، پھر اپنے آپ کو بچالے، ہرگز نہیں وہ تپتی ہوئی آگ ہے، کھینچ لینے والی کلیجہ، پکارتی ہے

مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾

اس کو جس نے پیٹھ پھیرلی اور پھر کر چلا گیا، اور جوڑا اور سینت کر رکھا، بے شک آدمی بنا ہے جی کا کچا،

إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾

جب پہنچے اس کو بُرائی تو بے صبرا، اور جب پہنچے اُس کو بھلائی تو بے توفیقا، مگر وہ نمازی

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ

جو اپنی نماز پر قائم ہیں، اور جن کے مال میں

حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ

حصہ مقرّر ہے مانگنے والے اور ہارے ہوئے کا، اور جو یقین کرتے ہیں

بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

انصاف کے دن پر، اور جو لوگ کہ اپنے ربّ کے عذاب سے ڈرتے ہیں،

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾

بے شک اُن کے ربّ کے عذاب سے کسی کو نڈر نہ ہونا چاہیئے، اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں،

اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾

مگر اپنی جوروؤں سے یا اپنے ہاتھ کے مال سے، سو اُن پر نہیں کچھ اُلاہنا،

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ

پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوائے سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے، اور جو لوگ کہ اپنی امانتوں

وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ

اور اپنے قول کو نباہتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر سیدھے ہیں، اور جو

عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَالِ

اپنی نماز سے خبردار ہیں، وہی لوگ ہیں باغوں میں عزّت سے، پھر کیا ہوا ہے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ

منکروں کو تیری طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں، داہنے سے اور بائیں سے،

عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ

غول کے غول، کیا طمع رکھتا ہے ہر ایک شخص اُن میں کہ داخل ہوجائے نعمت کے باغ میں ہرگز نہیں

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ

ہم نے ان کو بنایا ہے جس سے وہ بھی جانتے ہیں، سو میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی،

اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾

تحقیق ہم کرسکتے ہیں کہ بدل کر لے آئیں اُن سے بہتر، اور ہمارے قابو سے نکل نہ جائیں گے،

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾

سو چھوڑ دے ان کو کہ باتیں بنائیں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ مل جائیں اپنے اُس دن سے جس کا اُن سے وعدہ ہے،

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾

جس دن نکل پڑیں گے قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کسی نشانی پر دوڑتے جاتے ہیں،

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ

جھکی ہوں گی اُن کی آنکھیں، چڑھی آتی ہوگی اُن پر ذلت، یہ ہے وہ دن جس کا

كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع

اُن سے وعدہ تھا۔

ع ۲ ۸

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

ایک مانگنے والے نے وہ عذاب مانگا ہے جو کافروں پر آنے والا ہے، کوئی نہیں ہے جو اُسے روک سکے۔ ① - ②
وہ اللہ کی طرف سے آئے گا جو چڑھنے کے تمام راستوں کا مالک ہے، ③ فرشتے اور رُوح القدس اُس کی طرف ایک ایسے
دن میں چڑھ کر جاتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ④ لہٰذا تم خوبصورتی کے ساتھ صبر سے کام لو۔ ⑤ یہ لوگ
اُسے دُور سمجھ رہے ہیں، ⑥ اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ ⑦ (وہ عذاب) اُس دن ہوگا جب آسمان تیل کی تلچھٹ کی
طرح ہوجائے گا، ⑧ اور پہاڑ رنگین رُوئی کی طرح ہوجائیں گے، ⑨ اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو پوچھے گا
بھی نہیں، ⑩ حالانکہ وہ ایک دُوسرے کو دِکھا بھی دیئے جائیں گے۔ مجرم یہ چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے چھوٹنے
کے لئے اپنے بیٹے فدیہ میں دیدے، ⑪ اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی، ⑫ اور اپنا وہ خاندان جو اُسے پناہ دیتا تھا، ⑬ اور زمین
کے سارے کے سارے باشندے۔ پھر (ان سب کو فدیہ میں دے کر) اپنے آپ کو بچالے۔ ⑭ (لیکن) ایسا ہرگز نہیں
ہوسکے گا! وہ تو ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے، ⑮ جو کھال اُتار لے گی، ⑯ ہر اُس شخص کو بلائے گی جس نے پیٹھ پھیر کر منہ موڑا
ہوگا، ⑰ اور (مال) اِکٹھا کیا ہوگا، پھر اُسے سینت سینت کر رکھا ہوگا۔ ⑱ حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا
ہے، ⑲ جب اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے، ⑳ اور جب اُس کے پاس خوش حالی آتی ہے تو بہت بخیل
بن جاتا ہے، ㉑ مگر وہ نمازی ایسے نہیں ہیں، ㉒ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، ㉓ اور جن کے مال و دولت میں
ایک متعین حق ہے ㉔ سوالی اور بے سوالی کا ㉕ اور جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں، ㉖ اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے
سہمے رہتے ہیں، ㉗ — یقیناً اُن کے پروردگار کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے بےفکری برتی جائے — ㉘ اور جو
اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، ㉙ — سوائے اپنی بیویوں اور اُن باندیوں کے جو ان کی ملکیت
میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ㉚ البتہ جو لوگ ان کے علاوہ کوئی اور طریقہ اِختیار کرنا چاہیں،
وہ حد سے گذرے ہوئے لوگ ہیں — ㉛ اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس رکھنے والے ہیں، ㉜ اور جو اپنی گواہیاں ٹھیک
ٹھیک دینے والے ہیں، ㉝ اور جو اپنی نماز کی پوری پوری حفاظت کرنے والے ہیں، ㉞ وہ لوگ ہیں جو جنتوں میں عزّت
کے ساتھ رہیں گے۔ ㉟ تو (اے پیغمبر!) ان کافروں کو کیا ہوگیا کہ یہ تمہاری طرف چڑھے چلے آرہے ہیں، ㊱ دائیں
طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی، ٹولیاں بنا بنا کر! ㊲ کیا ان میں سے ہر شخص کو یہ لالچ ہے کہ اُسے نعمتوں والی جنت

میں داخل کیا جائے؟ (۳۸) ہرگز ایسا نہیں ہوگا! ہم نے ان کو اُس چیز سے پیدا کیا ہے جسے یہ خود جانتے ہیں۔ (۳۹) اب میں قسم کھاتا ہوں ان تمام مقامات کے مالک کی جہاں سے ستارے نکلتے اور جہاں سے غروب ہوتے ہیں کہ ہم یقیناً اس بات پر قادر ہیں (۴۰) کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں، اور کوئی ہمیں ہرا نہیں سکتا۔ (۴۱) لہٰذا تم انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی بے ہودہ باتوں میں منہمک اور کھیل کود میں پڑے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اُس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (۴۲) جس دن یہ جلدی جلدی قبروں سے اس طرح نکلیں گے جیسے اپنے بتوں کی طرف دوڑے جا رہے ہوں۔ (۴۳) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ وہی دن ہوگا جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (۴۴)

خلاصۂ تفسیر

ایک مانگنے والا (براہِ انکار) وہ عذاب مانگتا ہے جو کہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے، (اور) جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں، (اور) جو اللہ کی طرف سے واقع ہوگا جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے (جن سیڑھیوں سے) فرشتے اور (اہلِ ایمان کی) رُوحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں (اس کے پاس سے مراد یہ ہے کہ عالمِ بالا میں جو موقع ان کے عروج کا منتہا مقرّر کیا گیا ہے، وہاں جاتی ہیں، اور چونکہ اس عروج کا رستہ آسمان ہیں، اس لئے ان کو معارِج (یعنی سیڑھیاں) فرمادیا، اور وہ عذاب) ایسے دن میں (واقع) ہوگا جس کی مقدار (دُنیا کے) پچاس ہزار سال (کے برابر) ہے (مراد قیامت کا دِن ہے جو کچھ حقیقی مقدار سے، کچھ اُس کے اِشتداد سے کفار کو اس قدر طول محسوس ہوگا اور چونکہ کفر و سرکشی کے مراتب کے اعتبار سے اس کی شدّت اور درازی مختلف ہوگی، کسی کے لئے بہت زیادہ، کسی کے لئے کچھ کم، اس لئے ایک آیت میں: کَاَلْفِ سَنَةٍ [۱] (الحج:۴۷) آیا ہے، اور کافروں کی تخصیص اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ مؤمن کو وہ دن اس قدر ہلکا معلوم ہوگا جیسے ایک فرض پڑھنے کا وقت۔ (کذا فی الدّر وعن ابی سعید رضی الله عنه مرفوعًا بروایت احمد والبیهقی وغیرهما [۲]) سو (جب عذاب کا آنا ثابت ہے تو) آپ (ان کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو، (یعنی ان کے کفر و خلاف سے ایسے تنگ نہ ہوجئے کہ شکایت حکایت زبان پر آجائے، بلکہ یہ سمجھ کر تحمل کیجئے کہ ان کی سزا ہونے والی ہے اور اس یوم سزا کا جو اُن کو اِنکار ہے سو) یہ لوگ اس دن کو (قیامت پر ایمان نہ ہونے کے سبب اس کے وقوع کو) بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم (کو اس کا وقوع یقینی معلوم ہے، اس لئے) اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں (اور وہ عذاب اس روز واقع ہوگا) جس دن (کہ) آسمان (رنگ میں) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوجائے گا (اور

---

[۱] ترجمہ: برابر ایک ہزار سال کے ہے۔

[۲] الدر المنثور ج:۱۴ ص:۶۸۹، وشعب الإيمان للبيهقي، رقم الحديث:۳۷۸، ومسند احمد، مسند ابی سعید رضی الله عنه رقم الحديث:۱۱۷۳۵

ایک آیت میں كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ [۱] (الرحمٰن) ہے، جس کی تفسیر ادیم اَحمر یعنی سرخ چمڑے سے کی گئی ہے، تو جمع دونوں میں یہ ہے کہ سرخی کی شدّت سے بھی سیاہی کے مشابہ رنگ پیدا ہوجاتا ہے، پس اَحمر اور اَسود دونوں کہنا صحیح ہے، یا اوّل ایک رنگ ہو، پھر دُوسرا بدل جائے، ''کما نقل ابن کثیر فی الرحمٰن عن الحسن تتلوّن الوانًا'' [۲] اور اگر اس کی تفسیر بھی مثل بعض کے دُرْدِیِّ زَیْت سے کی جائے، یعنی روغنِ زیتون کی تلچھٹ، تو دونوں کا مفہوم متحد ہوجائے گا، غرض آسمان سیاہ ہوجائے گا اور پھٹ بھی جائے گا) اور پہاڑ رنگین اُون کی طرح (جو کہ دُھنکی ہوتی ہے، لقولہٖ تعالیٰ: كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾ [۳] (القارعۃ)) ہوجائیں گے (یعنی اُڑتے پھریں گے اور رنگین سے تشبیہ اس لئے دی گئی کہ پہاڑ بھی مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں، کما ھو المذکور فی قولہ تعالیٰ: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ [۴] (فاطر)) اور (اُس روز) کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا (کقولہٖ تعالیٰ: لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ [۵] (القصص)) باوجودیکہ ایک دُوسرے کو دِکھا بھی دیئے جائیں گے (یعنی ایک دُوسرے کو دیکھیں گے، مگر کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا، اور سورۂ صافات میں جو باہم سوال کرنے کا ذِکر ہے وہ بطور اِختلاف کے ہے، بطور ہمدردی کے نہیں، اس لئے وہ اس آیت کے منافی نہیں، اس روز) مجرم (یعنی کافر) اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں کو، اور بیوی کو، اور بھائی کو، اور کنبے کو جن میں وہ رہتا تھا، اور تمام اہلِ زمین کو اپنے فدیے میں دے دے، پھر یہ (فدیے میں دے دینا) اس کو (عذاب سے) بچالے (یعنی اُس روز ایسی نفسانفسی ہوگی کہ ہر شخص کو اپنی فکر پڑ جائے گی، اور کل تک جن پر جان دیتا تھا، آج ان کو اپنے فائدے کے لئے عذاب کے سپرد کردینے کو تیار ہوگا، اگر اس کے قابو کی بات ہو، لیکن) یہ ہرگز نہ ہوگا (یعنی نجات عن العذاب مطلقاً نہ ہوگی، بلکہ) وہ آگ ایسی شعلہ زن ہے جو کھال (تک) اُتار دے گی (اور) اور وہ اس شخص کو (خود) بلائے گی جس نے (دُنیا میں حق سے) پیٹھ پھیری ہوگی اور (طاعت سے) بے رُخی کی ہوگی اور (دُوسروں کا حق مار مار کر یا براہِ حرصِ مال) جمع کیا ہوگا، پھر اس کو اُٹھا اُٹھا رکھا ہوگا (مطلب یہ کہ حقوق اللہ وحقوق العباد ضائع کئے ہوں گے، یا اشارہ ہے فسادِ عقائد وفسادِ اَخلاق کی طرف، اور بلا نامعنی حقیقی پر محمول ہوسکتا ہے، خلاصہ یہ کہ ایسی صفات موجبِ اِستحقاقِ نار ہیں، اور اس مجرم میں یہ صفات پائی جاتی ہیں، پھر نجات عن العذاب کب متصوّر ہے اور وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ سے کفار کا مکلّف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ ان رذائل کی وجہ سے کفار کو اَصل عذاب نہیں ہوگا،

---

[۱] ترجمہ: جیسے سرخ نری۔

[۲] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ الرحمٰن، ج:۷ ص:۴۹۸، وتفسیر المظھری، تفسیر سورۃ الرحمٰن ج:۹ ص:۱۵۳

[۳] ترجمہ: دھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح۔

[۴] ترجمہ: اور پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، سفید اور سرخ کہ ان کی بھی رنگتیں مختلف ہیں اور بہت گہرے سیاہ۔

[۵] ترجمہ: آپس میں پوچھ پاچھ بھی نہ کرسکیں گے۔

بلکہ اِشتدادِ عذاب ہوگا، اور نفسِ عذاب کفر پر ہوگا، بخلاف گناہگار مؤمنین کے کہ ان کو معاصی پر نفسِ عذاب بھی ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم)

(آگے دُوسرے رذائل کا ذِکر ہے، جو عذاب کا سبب ہوتے ہیں، ان سے اہلِ ایمان کا اِستثناء اور پھر اِستثناء کے نتیجہ کا بیان ہے، یعنی) انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے (مراد اِنسان سے اِستثناء کو شامل کرنے کے بعد اِنسان کافر ہے اور پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اوّل پیدائش کے وقت سے ہی وہ ایسا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس کی جبلت میں ایسا مادّہ رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے وقت پر پہنچ کر یعنی بلوغ کے بعد ان رذیل صفات کا عادی ہوجائے گا، پس کم ہمتی سے مراد طبعی کم ہمتی نہیں ہے، بلکہ کم ہمتی کے آثارِ ذمیمہ اِختیار یہ مراد ہیں جن کو آگے بیان فرماتے ہیں یعنی) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (حدِّ جواز سے زیادہ) جزع فزع کرنے لگتا ہے، اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو (حقوقِ ضروریہ سے) بخل کرنے لگتا ہے، (یہ تتمہ ہوگیا موجباتِ عذاب کا جو مَنْ اَدْبَرَ سے شروع ہوئے ہیں) مگر وہ نمازی (یعنی مؤمن ان موجباتِ عذاب سے مستثنیٰ ہیں) جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں (یعنی نماز میں ظاہراً یا باطناً دُوسری طرف توجہ نہیں کرتے، جس کو قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ (المؤمنون) سے تعبیر فرمایا ہے، کذا نقل ابن کثیر عن عقبۃ بن عامر رضی اللہ عنہ بقولہ الدّائم السّاکن، [۱] وعنہ فی الدر المنثور: إذا صلّوا لم یلتفتوا عن یمین ولا شمال [۲]) اور جن کے مالوں میں سوالی اور بےسوالی سب کا حق ہے، (اس کے متعلق مضمون سورۂ ذاریات میں گزر چکا) اور جو قیامت کے دِن کا اِعتقاد رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں، (اور) واقعی ان کے رَبّ کا عذاب بےخوف ہونے کی چیز نہیں (یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے) اور جو اپنی شرم گاہوں کو (حرام سے) محفوظ رکھنے والے ہیں، لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اس میں) کوئی اِلزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلب گار ہو، ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں، اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ادا کرتے ہیں (ان میں کمی بیشی نہیں کرتے)، اور جو اپنی (فرض) نماز کی پابندی کرتے ہیں (پس) ایسے لوگ بہشتوں میں عزّت سے داخل ہوں گے (ان آیات کی تفسیر سورۂ مؤمنون میں دیکھ لی جائے۔ آگے کفار کی حالت کا عجیب ہونا اور وقوعِ قیامت کا مستبعد نہ ہونا بیان فرماتے ہیں، یعنی موجباتِ سعادت وشقاوت تو اُوپر بدلالتِ واضحہ معلوم ہوچکے) تو (معلوم بالدلیل ہونے کے بعد پھر) کافروں کو کیا ہوا کہ (ان مضامین کی تکذیب کے لئے) آپ کی طرف کو داہنے اور بائیں سے جماعتیں بن بن کر دوڑے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت ہٰذہ الآیۃ، ج:۸ ص:۲۲۶

[۲] تفسیر الدر المنثور ج:۱۴ ص:۶۹۶

آ رہے ہیں (یعنی چاہئے تھا کہ ان مضامین کی تصدیق کرتے، لیکن یہ لوگ متفق ہو ہو کر آپ کے پاس اس غرض سے آتے ہیں کہ ان مضامین کی تکذیب اور ان کے ساتھ اِستہزا کریں، جیسا کہ کفارِ عرب نبوّت کی خبریں سن سن کر اسی غرض سے آتے تھے اور اِسلام کو باطل سمجھنے کے ساتھ اپنے کو حق پر سمجھتے تھے اور حق ہونے کا ثمرہ جنت میں جانا ہے، اس بنا پر وہ اپنے کو مستحقِ جنت بھی سمجھتے تھے، کقولہٖ تعالٰی: وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی ؕ [1] (حم السجدة: ۵۰) اس لئے اس کے متعلق بطور اِنکار فرماتے ہیں کہ) کیا ان میں ہر شخص اس کی ہوس رکھتا ہے کہ وہ آسائش کی جنت میں داخل کرلیا جائے گا، یہ ہرگز نہ ہوگا! (کیونکہ موجباتِ جہنم کے ہوتے ہوئے جنت کیسے مل جائے گی اور یہ لوگ ان مضامین کی تکذیب میں نفسِ قیامت کی بھی تکذیب کرتے اور اس کو محال سمجھتے تھے، آگے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا اِستبعاد محض بے وقوفی ہے، کیونکہ) ہم نے ان کو ایسی چیز سے پیدا کیا ہے جس کی ان کو بھی خبر ہے (پس جب ان کو معلوم ہے کہ نطفے سے آدمی کو بنایا ہے، اور ظاہر ہے کہ نطفے سے کہ جس میں کبھی حیات نہیں آئی، آدمی بننے تک جتنا بُعد ہے، اُتنا بُعد اجزائے میّت سے دُوسری بار آدمی بننے تک نہیں ہے، کیونکہ ان اجزا میں ایک بار حیات پہلے آچکی ہے، اس کو محال سمجھنا ان کی بے وقوفی ہے) پھر (دُوسرے طور پر دفعِ اِستبعاد وقوعِ قیامت کے لئے) میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی (معنی اس کے سورۂ صافات کے شروع میں گزرے ہیں۔ آگے جوابِ قسم ہے) کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ (دُنیا ہی میں) ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں (یعنی پیدا کردیں) اور ہم (اس سے) عاجز نہیں ہیں (پس جب نئی مخلوق اور وہ بھی ایسی جس میں صفاتِ کمال زیادہ ہوں، جن میں زیادہ اشیاء پیدا کرنا پڑیں، ہم کو پیدا کرنا آسان ہے، تو تم کو دوبارہ پیدا کرنا کون مشکل کام ہے پہلا اِستدلال خود ان منکرین کی حالت کے اعتبار سے ہے، اور دُوسرا اِستدلال ان کے امثال ونظائر کے اِمکانِ مخلوقیت سے، اور جب باوجود وضوحِ حق مع الدلائل کے اپنے انکار وعناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو، جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، جس دن یہ قبروں سے نکل کر اس طرح دَوڑیں گے جیسے کسی پرستش گاہ کی طرف دَوڑے جاتے ہیں (اور) ان کی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) نیچے کو جھکی ہوں گی (اور) ان پر ذِلت چھائی ہوگی، یہ ہے ان کا وہ دِن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (جو کہ اب واقع ہوگیا)۔

معارف ومسائل

سَاَلَ سَآىِٕلٌ، سوال کبھی کسی چیز کی تحقیق کے لئے ہوتا ہے، اُس کے ساتھ عربی زبان میں صلہ حرف عن کا استعمال

---

[1] ترجمہ: اور اگر میں اپنے رَبّ کے پاس پہنچایا بھی گیا تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔

کیا جاتا ہے، اور کبھی سوال بمعنی درخواست اور کسی چیز کی طلب کے ہوتا ہے، یہاں ایسا ہی ہے، اس لئے اس کے صلے میں بجائے ''عَنْ'' حرف باء آیا: ''بِعَذَابٍ'' معنی یہ ہیں کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا۔ نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ مانگنے والا نضر بن حارث تھا، [1] جس نے قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں اس جرأت سے کام لیا کہ کہنے لگا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ (الانفال) یعنی یہ دُعا کی کہ یا اللہ! اگر یہ قرآن ہی حق ہے اور آپ کی طرف سے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دُوسرا عذابِ الیم بھیج دے۔ (مظہری) [2] اللہ تعالیٰ نے اس کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا۔ (مظہری بروایت ابنِ ابی حاتم)۔ [3] اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا جو عذاب اپنے منہ مانگا تھا، آگے اس کی کچھ حقیقت کا بیان ہے کہ یہ عذاب کافروں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا (خواہ دُنیا میں، یا آخرت میں، یا دونوں میں) اس عذاب کو دفع کرنا کسی کے بس میں نہیں، یہ عذاب اللہ کی طرف سے ہے جو درجاتِ عالیہ والا ہے، یہ آخری جملہ پہلے جملے کی دلیل بھی ہے کہ جو عذاب اللہ بالا و برتر کی طرف سے ہو، اس کو دفع کرنا اور ٹالنا کسی کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

مَعَارِجْ، مِعْرَجْ کی جمع ہے، عُرُوْجْ سے مشتق ہے، جس کے معنی اُوپر چڑھنے کے ہیں، اور مِعْرَجْ و مِعْرَاجْ اُس سیڑھی کو کہا جاتا ہے جس میں نیچے سے اُوپر چڑھنے کے لئے بہت سے درجات ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت اس آیت میں ''ذِی مَعَارِجْ'' اس معنی سے ہے کہ اللہ تعالیٰ درجاتِ عالیہ والا ہے (کذا قال سعید بن جبیر)۔ [4] اور یہ درجاتِ عالیہ اُوپر نیچے سات آسمان ہیں۔ حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا کہ ذِی الْمَعَارِجِ کے معنی ہیں ''ذِی السَّمَاوَاتِ'' یعنی مالکِ سماوات۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ، یعنی یہ درجات جو تہ بہ تہ اُوپر نیچے ہیں، ان درجات کے اندر چڑھتے ہیں فرشتے اور رُوح الامین یعنی جبرائیل امین، جبرائیل علیہ السلام بھی اگرچہ فرشتوں کے زُمرے میں شامل ہیں، لیکن اُن کے خصوصی اعزاز کے لئے ان کا الگ نام ذِکر فرمایا گیا ہے۔

فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ یہ جملہ ایک فعل محذوف سے متعلق ہے، یعنی یَقَعُ، مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب جس کا اُوپر ذِکر آیا ہے کہ کافروں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اس کا وقوع اُس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس دن کے

---

[1] السُّنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث:۱۱۵۵۶، ومسند البزار، رقم الحدیث:۵۰۹۸

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۶۰

[3] تفسیر المظهری بحوالۂ بالا

[4] تفسیر المظهری بحوالۂ بالا

متعلق سوال کیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی کہ یہ دن کتنا دراز ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! کہ یہ دن مؤمن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نمازِ فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا۔ (رواہ احمد وابویعلی وابن حبان والبیہقی بسند حسن، مظہری) [1]

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ:

یَکُوْنُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کَمِقْدَارِ مَا بَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ۔ (اخرجه الحاکم والبیهقی مرفوعًا وموقوفًا، مظهری) [2]

یعنی یہ روز مؤمنین کے لئے اتنا ہوگا جتنا وقت ظہر وعصر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً بھی منقول ہے، موقوفاً بھی۔

ان روایاتِ حدیث سے معلوم ہوا کہ اس دن کا یہ طول کہ پچاس ہزار سال کا ہوگا، ایک اِضافی امر ہے کفار کے لئے اتنا دراز، اور مؤمنین کے لئے اتنا مختصر ہوگا۔

روزِ قیامت کی درازی ایک ہزار سال یا پچاس ہزار کی تحقیق

اس آیت میں روزِ قیامت کی مقدار پچاس ہزار سال بتلائی ہے، اور سورۂ تنزیل السجدۃ کی آیت میں ایک ہزار سال آئے ہیں، آیت یہ ہے: یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (السجدۃ) یعنی تدبیر کرتے ہیں اَمرِ الٰہی کی آسمان سے زمین تک پھر چڑھتے ہیں اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے عام شمار کے اعتبار سے۔ بظاہر ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تعارض اور تضاد ہے، اس کا جواب مذکورہ روایاتِ حدیث سے ہوگیا کہ اس دن کا طول مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا، تمام کفار کے لئے پچاس ہزار سال کا، اور مؤمنینِ صالحین کے لئے ایک نماز کا وقت، ان کے درمیان طوائف کفار ہیں، ممکن ہے کہ بعض کے لئے صرف ایک ہزار کی برابر ہو، اور وقت کا دراز اور مختصر ہونا شدّت و بے چینی اور آرام وعیش میں مختلف ہونا مشہور ومعروف ہے کہ بے چینی اور شدّتِ تکلیف کا ایک گھنٹہ بعض اوقات انسان کو ایک دن بلکہ ایک ہفتہ عشرہ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے اور آرام وعیش کا بڑے سے بڑا وقت مختصر معلوم ہوتا ہے۔

اور آیت تنزیل السجدۃ جس میں ایک ہزار سال کا دِن بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک توجیہ تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ اس آیت میں جس دِن کا ذِکر ہے وہ دُنیا ہی کے دِنوں میں کا ایک دن ہے، اس میں جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۶۲، ومسند احمد، مسند ابی سعید الخدری رضی الله عنه، رقم الحدیث:۱۱۷۳۵

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۶۲، والمستدرك للحاکم، رقم الحدیث:۲۸۳ (بألفاظ مختلفة)

آسمان سے زمین پر آنا، پھر زمین سے آسمان واپس جانا، اتنی بڑی مسافت کو طے کرتا ہے کہ انسان طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے، کیونکہ احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے آسمان سے زمین تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔[1] تو پانچ سو سال اُوپر سے نیچے آنے کے اور پانچ سو سال واپس جانے کے، یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں کہ بالفرض انسان اس مسافت کو قطع کرتا تو آنے اور جانے میں ایک ہزار سال لگ جاتے، اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ تو سورۂ سجدہ کی آیت میں دُنیا ہی کے دِنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا، اور سورۂ معارج میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو اَیامِ دُنیا سے بہت بڑا ہوگا، اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالٰی اعلم۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۭ﴿۷﴾ یہاں قریب وبعید باعتبار مسافت یا زمانے کے نہیں، بلکہ بعید از اِمکان یا بعید از وقوع مراد ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ تو قیامت کے وقوع بلکہ اِمکان کو بھی بعید سمجھ رہے ہیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ حَمِيْمٌ کے معنی گہرے اور مخلص دوست کے ہیں، قیامت کی شدّت کا بیان ہے کہ اُس روز کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا، مدد کرنا تو درکنار۔ آگے یہ بھی بتلا دیا کہ یہ نہ پوچھنا اس لئے نہیں کہ وہ دوست سامنے نہیں ہوگا، بلکہ قدرتِ الٰہیہ ان سب کو ایک دُوسرے کے سامنے بھی کر دے گی، مگر ہر شخص نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا، کوئی کسی دُوسرے کی تکلیف وراحت کی طرف اِلتفات نہ کر سکے گا۔

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ اِنَّهَا کی ضمیر نار کی طرف راجع ہے، اور لَظٰى کے معنی خالص شعلہ بغیر آمیزش کے۔ اور شَوٰى، شَوَاةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی سر کی کھال کے بھی ہیں، اور ہاتھوں پاؤں کی کھال کے بھی، یعنی جہنم کی آگ ایک سخت بھڑکنے والا شعلہ ہوگا جو دِماغ کی یا ہاتھوں پاؤں کی کھال اُتار دے گا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ خود بلائے گی یہ آگ اُس شخص کو جس نے حق سے پیٹھ موڑی اور رُخ پھیرا، اور مال جامع کیا، پھر اس کو روک رکھا۔ مراد جمع کرنے سے وہ ہے کہ خلافِ شرع ناجائز طریقوں سے جمع کرے، اور روکنے سے مراد یہ ہے کہ مال پر عائد ہونے والے فرائض وواجبات ادا نہ کرے، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ هَلُوْعٌ کے لفظی معنی حریص، بے صبر، کم ہمت آدمی کے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں هَلُوْعٌ سے مراد وہ شخص ہے جو مالِ حرام کی حرص میں مبتلا ہو۔ اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ اس

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۹۲

سے مراد بخیل آدمی ہے۔ اور مقاتل نے فرمایا کہ تنگ دِل، بے صبر آدمی مراد ہے۔[1] اور یہ سب معانی متقارب ہیں۔ هَلُوْعٌ کے مفہوم میں سب داخل ہیں، اس هَلُوْعٌ کی تشریح خود قرآن کے الفاظ میں آ رہی ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کو پیدا ہی اس حال میں کیا ہے اور یہ عیب اُس کی تخلیق میں رکھے ہیں تو پھر اس کا کیا قصور ہوا وہ مجرم کیوں قرار دِیا گیا وجہ یہ ہے کہ مراد اس سے انسانی فطرت اور جبلت میں رکھی ہوئی اِستعداد اور مادّہ ہے، سو اس میں حق تعالیٰ نے ہر خیر و صلاح کا مادّہ اور اِستعداد بھی رکھی ہے اور شر و فساد کی بھی، اور اس کو عقل و ہوش بھی عطا فرمایا اور اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے ہر ایک کام کا انجام بھی بتلادیا، تو اپنے اِختیار سے مادّہ شر و فساد کی پرورش کی، اپنے اِختیاری اعمال کو اُس رُخ پر ڈال دیا تو وہ مجرم ان اِختیاری اعمال کی وجہ سے قرار پایا، جو مادّہ اُس کی پیدائش میں ودیعت رکھا گیا تھا اس کی وجہ سے اس کو مجرم نہیں قرار دِیا گیا، جیسا کہ آگے هَلُوْعٌ کے معنی کی تشریح خود قرآنِ کریم نے کی ہے ان میں صرف افعالِ اِختیاریہ کا ذِکر فرمایا ہے، وہ یہ ہیں:-

اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ یعنی اس انسان کی کم ہمتی اور بے صبری کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجاتی ہے تو صبر سے کام نہیں لیتا، اور جب کوئی راحت و آرام اور مال و دولت مل جاتا ہے تو اس میں بخل کرتا ہے۔ یہاں بے صبری اور جزع سے مراد وہ ہے جو حدودِ شرع سے باہر ہوں، اسی طرح بخل سے مراد فرائض وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہے، (کما مرّ)۔ آگے عام انسانوں کی اس خصلتِ مذکورہ سے مؤمنینِ صالحین کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور اُن کے اعمال و اخلاقِ صالحہ کا ذِکر کیا گیا ہے جو اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ سے شروع ہو کر عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ تک بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں استثناء بلفظ ''مُصَلِّيْن'' کیا گیا ہے، یعنی نمازی، اور مراد اس سے مؤمنین ہیں، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ نماز مؤمن کی پہلی اور سب سے بڑی علامت ہے، مؤمنین کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو نمازی ہیں۔ آگے ان مُصَلِّيْن کی یہ صفت بتلائی ہے: الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ مراد اس سے یہ ہے کہ وہ نمازی جو پوری نماز میں اپنی نماز کی طرف متوجہ رہیں، اِدھر اُدھر اِلتفات نہ کریں۔ امام بغوی[2] نے اپنی سند کے ساتھ ابوالخیر سے روایت کیا ہے کہ ہم نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے اس آیت: عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ کا مطلب پوچھا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اُنہوں نے فرمایا کہ نہیں یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو اوّل سے آخر نماز تک اپنی نماز کی طرف متوجہ رہے داہنے بائیں آگے پیچھے اِلتفات نہ کرے، اس کا حاصلِ مفہوم وہی ہے جو سورۂ مؤمنون

---

[1] تفسیر البغوی ج:۸ ص:۲۲۳ تحت هٰذه الآية۔

[2] تفسیر البغوی ج:۸ ص:۲۲۴ تحت هٰذه الآية۔

میں الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ کا ہے۔ تو اس جملے میں نماز کے خشوع کا ذکر ہوا، اور آگے جو جملہ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ آرہا ہے، اُس میں نماز اور آدابِ نماز پر مداومت کا ذِکر ہے، اس لئے مضمون میں تکرار نہ ہوا۔ آگے مؤمنینِ صالحین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، یہ سب تقریباً وہی ہیں جو سورۂ مؤمنون میں بیان ہوئی ہیں، اور اسی سورت میں اُن کے معانی کی پوری تفسیر مکمل لکھی جا چکی ہے، اُس کو دیکھ لیا جائے۔

مقادیرِ زکوٰۃ من جانب اللہ مقرّر ہیں، اُن میں کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقادیرِ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین اور معلوم ہیں، جن کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیثِ صحیحہ میں منقول ہے، اس لئے مقادیرِ زکوٰۃ خواہ نصابِ زکوٰۃ سے متعلق ہوں یا مقدارِ واجب سے، دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرّر کردہ، طے شدہ ہیں، یہ زمانے اور حالات کے بدلنے سے نہیں بدل سکتیں۔

فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ اس سے پہلی آیت میں نفسانی خواہش اور شہوت کا جائز مصرف منکوحہ بیوی یا شرعی لونڈی بتلایا گیا تھا، اس آیت میں ان دو صورتوں کے سوا شہوت رانی کی ہر صورت کو ممنوع و ناجائز قرار دیا ہے، اس میں نکاح کی وہ صورتیں بھی داخل ہیں جو شرعاً حلال نہیں، جیسے اُن عورتوں سے نکاح جن سے شرعاً نکاح حرام ہے، اسی طرح متعہ جو شرعاً نکاح نہیں۔

اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرنا حرام ہے

اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ نے اِستمناء بالید یعنی اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کر لینے کو بھی اس کے عموم میں داخل قرار دے کر حرام قرار دِیا ہے۔ اِبنِ جریج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے اس کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے فرمایا: مکروہ ہے۔ میں نے سنا ہے محشر میں کچھ ایسے لوگ آئیں گے جن کے ہاتھ حاملہ ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم پر عذاب نازل فرمایا جو اپنے ہاتھوں سے اپنی شرم گاہوں سے کھیلتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَلْعُوْنٌ مَّنْ نَّکَحَ یَدَهٗ'' یعنی جو اپنے ہاتھ سے نکاح کرے وہ ملعون ہے، سند اس کی ضعیف ہے۔ (مظہری) [1]

---

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۲۸، وتلخیص الحبیر للحافظ العسقلانی، رقم الحدیث:۱۵۴۵

تمام حقوق اللہ اور سب حقوق العباد امانت میں داخل ہیں

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۝۳۲ اس آیت میں امانات جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، جیسے دُوسری جگہ بھی: اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهۡلِهَا [1] (النساء:۵۸) فرمایا ہے، دونوں جگہ لفظ جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ امانت صرف وہ مال ہی نہیں جو کسی نے آپ کے پاس رکھ دیا ہو، بلکہ تمام حقوقِ واجبہ جن کا ادا کرنا آپ کے ذمے فرض ہے وہ سب امانات ہیں، ان میں کوتاہی کرنا خیانت ہے، اس میں تمام حقوق اللہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بھی داخل ہیں، اور تمام حقوق العباد جو من جانب اللہ کسی پر واجب ہیں، یا اس نے خود کسی معاہدے اور معاملے کے ذریعے اپنے پر لازم کر لئے ہیں، وہ سب امانت کی فہرست میں داخل اور اُن کی ادائیگی فرض، اس میں کوتاہی خیانت ہے۔ (از مظہری ملخصاً) [2]

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ بِشَهٰدٰتِهِمۡ قَآئِمُوۡنَ ۝۳۳ یہاں بھی لفظ شہادات کو بلفظ جمع لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں، اور ہر قسم شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے، اس میں شہادت ایمان توحید و رسالت بھی داخل ہے، ہلالِ رمضان اور حدودِ شرعیہ کی شہادت بھی، اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں، اُن کی شہادت بھی، کہ ان شہادتوں کا چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے، ان کو صحیح صحیح قائم کرنا اس آیت کی رُو سے فرض ہے۔ (از مظہری) [3] واللہ سبحانہ وتعالٰی اعلم۔

تَمَّتۡ بِحَمۡدِ اللّٰهِ يَوۡمَ الثُّلٰثَاءِ ۸ رَجَب ۱۳۹۱ھ

---

[1] ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہلِ حقوق کو اُن کے حقوق پہنچا دیا کرو۔

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۶۸

[3] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۶۸ و ۶۹

سورۃ نوح

آیاتها ۲۸ ۷۱ سُوْرَةُ نُوْحٍ مَّكِّيَّةٌ ۷۱ رکوعاتها ۲

سورۂ نوح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھائیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ

ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے اُن پر

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ① قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ② اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

عذاب دردناک بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی

وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِيْعُوْنِ ③ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ

اور اُس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو تا کہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو

وقف لازم

إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾

ایک مقرّر وعدہ تک وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے جب آپہنچے گا اُس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے

قَالَ رَبِّ إِنِّى دَعَوْتُ قَوْمِى لَيْلًا وَنَهَارًا ﴿٥﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىٓ

بولا اے ربّ میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن، پھر میرے بلانے سے

إِلَّا فِرَارًا ﴿٦﴾ وَإِنِّى كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِمْ

اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے جب کبھی اُن کو بلایا تاکہ تو اُن کو بخشے، ڈالنے لگے اُنگلیاں اپنے کانوں میں

وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾ ثُمَّ إِنِّى دَعَوْتُهُمْ

اور لپیٹنے لگے اپنے اُوپر کپڑے، اور ضد کی، اور غرور کیا بڑا غرور، پھر میں نے اُن کو بلایا

جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّىٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ﴿٩﴾

برملا، پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُۥ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُم

تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے ربّ سے، بے شک وہ ہے بخشنے والا، چھوڑ دے گا آسمان کی تم پر

مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّٰتٍ وَيَجْعَل

دھاریں، اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے، اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا

لَّكُمْ أَنْهَٰرًا ﴿١٢﴾ مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾

تمہارے لئے نہریں۔ کیا ہوا ہے تم کو کیوں نہیں اُمید رکھتے اللہ سے بڑائی کی اور اسی نے بنایا تم کو طرح طرح سے

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ

کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات آسمان تہ پر تہ اور رکھا چاند کو اُن میں

نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾

اُجالا اور رکھا سورج کو چراغ جلتا ہوا، اور اللہ نے اُگایا تم کو زمین سے جما کر،

ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ

پھر مکرّر ڈالے گا تم کو اس میں اور نکالے گا تم کو باہر، اور اللہ نے بنادیا تمہارے لئے زمین کو

بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ

بچھونا، تاکہ چلو اس میں کشادہ رستے۔ کہا نوح نے اے ربّ میرے انہوں نے میرا کہا نہ مانا

وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا

اور مانا ایسے کا جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا، اور داؤ کیا ہے

كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا

بڑا داؤ۔ اور بولے ہرگز نہ چھوڑیو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑیو وَدّ کو اور نہ سواع کو

وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ

اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو اور بہکادیا بہتوں کو اور تو نہ زیادہ کرنا بے انصافوں کو

اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ

مگر بھٹکنا، کچھ وہ اپنے گناہوں سے ڈبائے گئے پھر ڈالے گئے آگ میں پھر نہ پائے اپنے واسطے انہوں نے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ

اللہ کے سوائے کوئی مددگار۔ اور کہا نوح نے اے ربّ نہ چھوڑیو زمین پر

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا

منکروں کا ایک گھر بسنے والا، مقرر اگر تو چھوڑ دے گا اُن کو، بہکائیں گے تیرے بندوں کو اور جو جنیں گے

اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا

سو ڈھیٹھ حق کا منکر، اے ربّ معاف کر مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو آئے میرے گھر میں ایمان دار

ع ۲ وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ ع

اور سب ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو اور گنہگاروں پر بڑھتا رکھ یہی برباد ہونا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو خبردار کرو، قبل اس کے کہ اُن پر کوئی دردناک عذاب آ کھڑا ہو۔ ﴿۱﴾ (چنانچہ) اُنہوں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ: "اے میری قوم! میں تمہارے لئے ایک صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں ﴿۲﴾ کہ اللہ کی عبادت کرو، اور اُس سے ڈرو، اور میرا کہنا مانو، ﴿۳﴾ اللہ تمہارے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا، اور تمہیں ایک مقرّر وقت تک باقی رکھے گا۔ بیشک جب اللہ کا مقرّر کیا ہوا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ مؤخر نہیں ہوتا۔ کاش کہ تم سمجھتے ہوتے!" ﴿۴﴾ (پھر) نوح نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا کہ: "میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن (حق کی) دعوت دی ہے، ﴿۵﴾ لیکن میری دعوت کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوا کہ وہ اور زیادہ بھاگنے لگے۔ ﴿۶﴾ اور میں نے جب بھی اُنہیں دعوت دی، تاکہ آپ اُن کی مغفرت فرمائیں، تو انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں، اپنے کپڑے اپنے اُوپر لپیٹ لئے، اپنی بات پر اَڑے رہے، اور تکبر ہی تکبر کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ﴿۷﴾ پھر میں نے اُنہیں پکار پکار کر دعوت دی، ﴿۸﴾ پھر میں نے اُن سے علانیہ بھی بات کی، اور چپکے چپکے بھی سمجھایا، ﴿۹﴾ چنانچہ میں نے کہا کہ: اپنے پروردگار

سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، ⑩ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، ⑪ اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لئے باغات پیدا کرے گا، اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کر دے گا، ⑫ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے بالکل نہیں ڈرتے؟ ⑬ حالانکہ اُس نے تمہیں تخلیق کے مختلف مرحلوں سے گذار کر پیدا کیا ہے، ⑭ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اُوپر تلے پیدا فرمائے ہیں؟ ⑮ اور اُن میں چاند کو نور بنا کر اور سورج کو چراغ بنا کر پیدا کیا ہے، ⑯ اور اللہ نے تمہیں زمین سے بہترین طریقے پر اُگایا ہے، ⑰ پھر وہ تمہیں دوبارہ اُسی میں بھیج دے گا، اور (وہیں سے پھر) باہر نکال کھڑا کرے گا۔ ⑱ اور اللہ نے ہی تمہارے لئے زمین کو ایک فرش بنا دیا ہے، ⑲ تاکہ تم اُس کے کھلے ہوئے راستوں پر چلو۔'' ⑳ نوح نے کہا: ''اے میرے پروردگار! حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا، اور اُن (سرداروں) کے پیچھے چل پڑے جن کو اُن کے مال اور اولاد نے نقصان پہنچانے کے سوا کچھ نہیں دیا، ㉑ اور انہوں نے بڑی بھاری مکاری سے کام لیا ہے، ㉒ اور (اپنے آدمیوں سے) کہا ہے کہ: ''اپنے معبودوں کو ہرگز مت چھوڑنا۔ نہ وَدّ اور سواع کو کسی صورت میں چھوڑنا، اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو چھوڑنا'' ㉓ اس طرح انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کر دیا ہے، لہٰذا (یا ربّ!) آپ بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی اور چیز میں ترقی نہ دیجئے۔'' ㉔ ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ ہی سے انہیں غرق کیا گیا، پھر آگ میں داخل کیا گیا، اور انہیں اللہ کو چھوڑ کر کوئی حمایتی میسر نہیں آئے۔ ㉕ اور نوح نے یہ بھی کہا کہ: ''میرے پروردگار! ان کافروں میں سے کوئی ایک باشندہ بھی زمین پر باقی نہ رکھئے، ㉖ اگر آپ ان کو باقی رکھیں گے تو یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ بدکار اور پکی کافر ہی پیدا ہوگی۔ ㉗ میرے پروردگار! میری بھی بخشش فرما دیجئے، میرے والدین کی بھی، ہر اُس شخص کی بھی جو میرے گھر میں ایمان کی حالت میں داخل ہوا ہے اور تمام مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی۔ اور جو لوگ ظالم ہیں، اُن کو تباہی کے سوا کوئی اور چیز عطا نہ فرمائیے۔'' ㉘

خلاصۂ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تھا کہ تم اپنی قوم کو (وبالِ کفر سے) ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آئے (یعنی ان سے کہو کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ الیم آئے گا، خواہ دُنیوی یعنی طوفان، یا اُخروی یعنی دوزخ، غرض) اُنہوں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم! میں تمہارے لئے صاف صاف ڈرانے والا ہوں (اور کہتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت (یعنی توحید اختیار) کرو اور اس سے ڈرو، اور میرا کہنا مانو تو وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا (مِنْ ذُنُوْبِكُمْ کی تحقیق سورۂ اَحقاف میں گزر چکی) اور تم کو وقتِ مقرّر (یعنی وقتِ موت) تک

(بلاعقوبت) مہلت دے گا (یعنی ایمان نہ لانے پر جس عذاب کا مرنے سے پہلے وعدہ کیا جاتا ہے، اگر ایمان لے آئے تو وہ عذاب نہ آئے گا، اور باقی موت کے لئے جو) اللہ کا مقرّر کیا ہوا وقت (ہے) جب (وہ) آجائے گا تو ٹلے گا نہیں۔ (یعنی موت تو آنا ہر حال میں ضروری ہے، ایمان میں بھی اور کفر میں بھی، لیکن دونوں حالتوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک حالت میں علاوہ عذابِ آخرت کے دُنیا میں بھی عذاب ہوگا، اور ایک حالت میں مثل دُنیا وآخرت دونوں کے عذابوں سے محفوظ رہوگے) کیا خوب ہوتا اگر تم (ان باتوں کو) سمجھتے (جب مدت ہائے دراز تک ان نصائح کا کچھ اثر قوم پر نہ ہوا تو) نوح (علیہ السلام) نے (حق تعالیٰ سے) دُعا (اور التجا) کی کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دِن کو بھی (دینِ حق کی طرف) بلایا، سو میرے بلانے پر (دِین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے اور (وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی اُن کو (دینِ حق کی طرف) بلایا تاکہ (ان کے ایمان کے سبب) آپ اُن کو بخش دیں تو ان لوگوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں (تاکہ حق بات سنیں بھی نہیں، اور یہ نفرت کی انتہا ہے) اور (نیز انتہائی بغض سے انہوں نے) اپنے کپڑے (اپنے اُوپر) لپیٹ لئے (تاکہ حق بات کہنے والے کو دیکھیں بھی نہیں، اور کہنے والا بھی اُن کو نہ دیکھے) اور (انہوں نے اپنے کفر وانکار پر) اِصرار کیا اور (میری اِطاعت سے) غایت درجے کا تکبر کیا (مگر باوجود اس تنفیر وتکبر کے) پھر (بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت کرتا رہا، چنانچہ) میں نے ان کو (دینِ حق کی طرف) بآوازِ بلند بلایا (مراد اس سے خطاب ووعظِ عام ہے، جس میں عادۃً آواز بلند ہوتی ہے) پھر میں نے ان کو (خطابِ خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور ان کو بالکل خفیہ بھی سمجھایا (یعنی جتنے طریقے نفع کے ہوسکتے تھے سب ہی طرح سمجھایا، غرض اوقات میں بھی عموم کیا گیا، کما قال: لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ اور کیفیات میں بھی، کما قال: دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ...إلخ) اور (اس سمجھانے میں) میں نے (ان سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ (یعنی ایمان لے آؤ تاکہ گناہ بخشے جائیں) بے شک وہ بخشنے والا ہے (اگر تم ایمان لے آؤ گے تو علاوہ اُخروی نعمت کے) کہ (مغفرت ہے، دُنیوی نعمتیں بھی تم کو عطا کرے گا، چنانچہ) کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا، اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لئے باغ لگادے گا، اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا، (ان نعمتوں کے ذِکر سے شاید یہ فائدہ ہو کہ اکثر طبائع میں نقد اور جلد حاصل ہونے والی چیزوں کی طلب زیادہ ہے، دُرِّ منثور [1] میں قتادہ کا قول ہے کہ وہ لوگ دُنیا کے زیادہ حریص تھے اس لئے یہ فرمایا، اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بسا اوقات یہ اُمورِ دُنیویہ ایمان واستغفار پر مرتب نہیں ہوتے، بات یہ ہے کہ یا تو یہ وعدہ خاص انہی لوگوں کے لئے ہوگا، اور اگر عام ہو تو قاعدہ ہے کہ موعود سے افضل کوئی چیز مل جانا بھی ایفائے وعدہ ہی ہوتا ہے، بلکہ وعدے سے زیادہ، پس ایمانِ کامل پر رُوحانی مسرّت وقناعت ورضا بالقضا ضرور عطا ہوتا ہے، جو ان اشیاء سے بھی افضل واکمل ہے، بلکہ ساری

[1] تفسیر الدر المنثور ج:۱۰ ص:۱۰۷ تحت هذه الآية۔

متاعِ دُنیا اور سب اشیائے مذکورہ کا اصلی مقصد بھی تو دِل کا سکون و آرام ہی ہے۔ آگے نوح علیہ السلام کا تتمہ کلام ہے، یعنی میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ:) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو حالانکہ (مقتضیات اعتقادِ عظمت کے موجود ہیں کہ) اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا (کہ عناصرِ اَربعہ سے تمہاری غذا، پھر غذا سے نطفہ، اور نطفے کے بعد علقہ ومُضغہ وغیرہ کی مختلف صورتوں سے گزر کر مکمل انسان بنا، یہ دلیل تو خود اِنسان کی ذات سے متعلق تھی، آگے دلیلِ آفاقی فرماتے ہیں کہ) کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان اُوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا، اور سورج کو (مثل) چراغ (روشن کے) بنایا، (اور چاند گو سب آسمانوں میں نہیں ہے، مگر فِيهِنَّ باعتبار مجموعہ کے فرمادیا، اور اس کے متعلق کچھ سورۂ فرقان میں گزر چکا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے، اور یا اس طرح کہ انسان نطفے سے بنا، اور نطفہ غذا سے، اور غذا عناصر سے بنی، اور عناصر میں غالب اجزا مٹی کے ہیں) پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لے جائے گا، اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا تاکہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو (یہ تمام تر وہ کلام ہے جس کی حکایت نوح علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے بطور فریاد کے کی، اور یہ سب حکایت عرض کر کے) نوح (علیہ السلام) نے (یہ) کہا کہ اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا، اور ایسے شخصوں کی پیروی کی کہ جن کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا، (مراد ان شخصوں سے رُؤساء ہیں، جن کا عوام اِتباع کیا کرتے ہیں، اور مال اور اولاد کا ان رُؤساء کو نقصان پہنچانا بایں معنی ہے کہ مال واولاد سرکشی کا سبب بن گئے) اور (انہوں نے جن کا اِتباع کیا ہے وہ ایسے ہیں) جنہوں نے (حق کے مٹانے میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنہوں نے (اپنے تابعین سے یہ) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا، اور نہ (بالخصوص) وَدّ کو، اور سواع کو، اور یغوث کو، اور یعوق کو، اور نسر کو چھوڑنا، (خصوصیت ان کے ذِکر کی اس لئے ہے کہ یہ بت زیادہ مشہور تھے) اور ان (رئیس) لوگوں نے بہتوں کو (بہکا بہکا کر) گمراہ کردیا (وہ مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ یہی گمراہ کرنا ہے) اور (چونکہ مجھ کو آپ کے اِرشاد: لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ [1] (ہود:۳۶) سے معلوم ہوگیا کہ یہ اب ایمان نہ لائیں گے، اس لئے یہ بھی دُعا کرتا ہوں کہ) ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے (تاکہ یہ لوگ مستحق ہلاکت ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مقصود دُعا کرنا زیادہ ضلال کی نہیں، بلکہ اِستحقاقِ ہلاکت کی ہے، اور تحقیق اس دُعا کی سورۂ یونس میں قصہ موسیٰ علیہ السلام میں گزری ہے، غرض انجام ان لوگوں کا یہ ہوا کہ) اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کئے گئے، پھر (بعد غرق برزخی یا اُخروی) دوزخ میں داخل کئے گئے اور خدا کے سوا ان کو کچھ حمایتی بھی میسر نہ ہوئے، اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے پروردگار!

---

[1] ترجمہ: سوا ان کے جو ایمان لاچکے ہیں اور کوئی شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لائے گا۔

کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ (بلکہ سب کو ہلاک کر دے، اور عموم ہلاکت و عموم بعثت کی بحث سورۂ صافات میں گزری ہے، آگے اس دُعا کی علت ہے کیونکہ) اگر آپ ان کو رُوئے زمین پر رہنے دیں گے تو (حسب ارشاد لَنْ یُّؤْمِنَ ...الخ) یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہو گی (اور کافروں کے لئے بددُعا کرنے کے بعد مؤمنین کے لئے دُعا فرمائی کہ) اے میرے رَبّ! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو مؤمن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کو (یعنی اہل و عیال باستثناء زوجہ اور کنعان کے) اور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دیجئے، اور (چونکہ مقصود مقام میں بددُعا ہے کافروں کے لئے، اور مؤمنین کے لئے دُعا محض مقابلے کی مناسبت سے ہوگئی تھی، اس لئے پھر مضمونِ بددُعا کی طرف عود ہے جس میں وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ کے مقصود کی تفسیر ہے، یعنی) ان ظالموں کی ہلاکت اور بڑھا دیجئے (یعنی ان کی نجات کی کوئی صورت نہ رہے، ہلاک ہی ہو جائیں، اور یہی مقصود تھا اس دُعا سے کہ ان کی گمراہی بڑھا دی جائے۔ اور ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے والدین مؤمن تھے، اور اگر اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو والدین سے مراد آباء و اُمہاتِ بعیدہ ہوں گے۔ اوّل دُعا اپنے نفس کے لئے کی، پھر اُصول کے لئے، پھر اہل و عیال کے لئے، پھر عام تابعین کے لئے)۔

معارف و مسائل

یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ، حرف مِنْ اکثر تبعیض یعنی جزئیت کے لئے آتا ہے، اگر یہ معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لئے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں، ان کو اَدا کرے، جیسے مالی واجبات، اور جو قابلِ ادائیگی نہیں، جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچائی، اُس سے معاف کرائے۔

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایمان لانے سے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، [1] اس میں بھی حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی شرط ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ حرف مِنْ اس جگہ زائد ہے، اور مراد یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، مگر دُوسری نصوص کی بنا پر شرطِ مذکور بہر حال ضروری ہے۔

وَیُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، اَجَلٍ کے معنی مدّت اور مُّسَمًّى سے مراد متعین کردہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدّت تک دُنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لئے مقرّر اور متعین ہے، یعنی مقرّرہ مدّتِ عمر سے پہلے تمہیں کسی دُنیاوی عذاب میں پکڑ کر ہلاک نہ کرے گا۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدّتِ

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبله ...إلخ، ج:۱ ص:۷۶

مقرّرہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لاکر ہلاک کردے۔ معلوم ہوا کہ عمر کی مدتِ مقرّرہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کرلیا تو اس کی عمر مثلاً اسّی سال ہوگی، اور نہ کیا تو ساٹھ سال میں موت مسلط کردی جائے گی، یا منفی کاموں میں اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکرگزاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت وخدمت سے عمر میں ترقی ہونا، جو اَحادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اس کا بھی یہی مطلب ہے۔

انسان کی عمر میں کمی زیادتی کی بحث

اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے اِلٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک مبرم یعنی قطعی، دُوسری معلق یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو۔ یعنی لوحِ محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اگر اللہ کی اِطاعت کی تو اس کی عمر مثلاً ستر سال ہوگی، اور نہ کی تو پچاس سال میں مار دِیا جائے گا۔ اس دُوسری قسم کی تقدیر میں شرط نہ پائے جانے پر تبدیلی ہوسکتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ان دونوں قسم کی قضا وتقدیر کا ذِکر اس آیت میں ہے: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹ (الرعد) یعنی اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ میں محو واِثبات یعنی ترمیم وتبدیل کرتا رہتا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اصل کتاب۔ اصل کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیرِ مبرم لکھی ہوئی ہے، کیونکہ تقدیرِ معلق میں جو شرط لکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ شخص یہ شرط پوری کرے گا یا نہیں، اس لئے تقدیرِ مبرم میں قطعی فیصلہ لکھا جاتا ہے۔ [1]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ'' (رواہ الترمذی، مظہری) [2] یعنی قضائے اِلٰہی کو کوئی چیز بجز دُعا کے نہیں روک سکتی، اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز برّ والدین کے نہیں ہوسکتی۔ برّ کے معنی اُن کے ساتھ اچھا سلوک ہے، اور مطلب اس حدیث کا یہی ہے کہ تقدیرِ معلق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہوسکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو اَجَلٍ مُّسَمًّى تک مؤخر کرنے کو ان کے ایمان لانے پر موقوف کیا ہے، یہ اُن کی عمر کے بارے میں تقدیرِ معلق کا بیان ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو علم عطا فرمادیا ہوگا، اس کے سبب سے اُنہوں نے اپنی قوم کو بتلایا کہ تم ایمان لائے تو جو اَصلی عمر تمہارے لئے اللہ نے مقرّر فرمائی ہے، وہاں تک تمہیں مہلت ملے گی، اور کسی عذابِ دُنیوی کے ذریعے ہلاک نہ کئے جاؤ گے، اور اگر اِیمان نہ لائے تو اس اَصلی عمر سے پہلے ہی خدا تعالیٰ کا عذاب تمہیں ہلاک کردے گا، اور آخرت کا عذاب اس صورت میں اس کے علاوہ ہوگا، آگے یہ بھی بتلادیا کہ ایمان لانے پر بھی ہمیشہ کے لئے موت سے نجات نہیں ہوگی، بلکہ

---

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۷۲

[2] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۷۲، وجامع الترمذی، ابواب القدر، لا یرد القدر إلّا الدُّعاء ج:۲ ص:۳۵

تقدیرِ مبرم میں جو تمہاری عمر لکھی ہوئی ہے اُس پر موت آنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اس عالمِ دُنیا کو دائمی نہیں بنایا، یہاں کی ہر چیز کو فنا ہونا تقاضائے حکمت ہے، اس میں ایمان و اطاعت اور کفر و معصیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ میں اس کا بیان ہے۔ آگے حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کی اِصلاح و اِیمان کے لئے مسلسل مختلف قسم کی کوششوں میں لگے رہنے کا، اور قوم کی طرف سے اُن کی مخالفت و تکذیب کا بیان تفصیل سے آیا ہے، اور آخر میں مایوس ہوکر بددُعا کرنے اور پوری قوم کے عذابِ غرق میں مبتلا ہونے کا بیان ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوّت عطا ہوئی، اور قرآنی تصریح کے مطابق ان کی عمر پچاس کم ایک ہزار سال ہوگی، اس پوری مدّتِ دراز میں نہ کبھی اپنی کوشش کو چھوڑا، نہ کبھی مایوس ہوئے، قوم کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں، سب پر صبر کرتے رہے۔

بروایت ضحاک حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان کی قوم ان کو اتنا مارتی کہ وہ گر جاتے تو ان کو ایک کمبل میں لپیٹ کر مکان میں ڈال دیتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے یہ مر گئے، مگر پھر جب اگلے روز ان کو ہوش آتا تو اُن کو اللہ کی طرف بلاتے اور تبلیغ کے عمل میں لگ جاتے۔ محمد بن اسحاق نے عبید بن عمر ولیثی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ خبر پہنچی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم ان کا گلا گھونٹ دیتی تھی، جس سے وہ بیہوش ہو جاتے، اور جب ہوش آتا تو یہ دُعا کرتے تھے: "رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ اِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" اے میرے پروردگار! میری قوم کو معاف کر دے، کیونکہ وہ جانتے نہیں۔ ان کی ایک نسل کے ایمان لانے سے مایوسی ہوئی تو یہ اُمید رکھتے تھے کہ ان کی اولاد میں کوئی ایمان لے آئے گا، وہ نسل بھی گزر جاتی تو تیسری نسل سے یہی توقع لگا کر اپنے فرضِ منصبی میں مشغول رہتے، کیونکہ ان کی نسلوں کی عمریں اتنی طویل نہ تھیں جتنی حضرت نوح علیہ السلام کو بطور معجزہ عطا ہوئی تھی، جب ان کی نسل پر نسل گزرتی رہی اور ہر آنے والی نسل پچھلی سے زیادہ شریر اور بدتر ثابت ہوئی، تو حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ رَبّ العزّت میں اپنا شکوہ پیش فرمایا، جس میں بتلایا کہ میں نے ان کو رات دن، اِجتماعاً و اِنفراداً، علانیہ اور خفیہ جو جو طریقہ کسی کو راستے پر لانے کا ہوسکتا ہے وہ سب اِختیار کیا، کبھی اللہ کے عذاب سے ڈرایا، کبھی جنتوں کی نعمتوں کی ترغیب دِلائی، اور یہ بھی کہ ایمان اور عملِ صالح کی برکت سے تمہیں دُنیا میں بھی فراخی اور خوش حالی نصیب ہوگی، کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نشانیوں کو پیش کر کے سمجھایا، مگر اُنہوں نے ایک نہ سنی۔ دُوسری طرف حق تعالیٰ نے اُن کو یہ بھی بتلا دیا کہ آپ کی پوری قوم میں جس کو ایمان لانا تھا، لے آیا، آگے ان میں کوئی ایمان قبول نہ کرے گا، اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود:۳۶) کا یہی مطلب ہے۔ اُس وقت حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر بددُعا کے کلمات آئے جس کا آگے ذِکر کیا گیا، [1] جس کے نتیجے میں پوری قوم غرق و ہلاک ہوگئی بجز

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۷۲و۷۳

مؤمنین کے جن کو ایک کشتی میں سوار کر لیا گیا تھا۔ قوم کی فہمائش کے سلسلے میں نوح علیہ السلام نے ان کو اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرنے یعنی ایمان لاکر پچھلے گناہوں کی معافی مانگنے کی دعوت دی، اور اس کا دُنیاوی نفع یہ بتلایا کہ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ اس سے اکثر علماء نے اِستدلال کیا ہے کہ گناہوں سے توبہ واِستغفار سے اللہ تعالیٰ بارش حسبِ موقع برسا دیتے ہیں، قحط نہیں پڑنے دیتے، اور مال واولاد میں اِستغفار سے برکت ہوتی ہے، کہیں کسی حکمتِ اِلٰہیہ کے تقاضے سے اس کے خلاف بھی ہوتا ہے، مگر عادۃُ اللہ عام لوگوں کے ساتھ یہی ہے کہ توبہ واِستغفار اور ترکِ معصیت سے دُنیا کی بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا اس آیت میں دلائل توحید وقدرت کے سلسلے میں سات آسمانوں کا طبق برطبق ہونا اور پھر اُن میں قمر کا نور ہونا اِرشاد ہوا ہے، جس میں لفظ ''فِیْهِنَّ'' سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے کہ چاند آسمانوں کے جرم کے اندر داخل ہے، آج کل کی نئی تحقیقات ومشاہدات سے اس کے خلاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں سے بہت نیچے فضائے آسمانی میں ہے، جس کو آج کل ''خلا'' کہا جاتا ہے، اس کی مفصل تحقیق سورۂ فرقان کی آیت: تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ [1] کی تفسیر میں گزر چکی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ قوم کے شکوے کے سلسلے میں فرمایا: وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ كُبَّارْ اَكْبَرْ کا مبالغہ ہے، جس کے معنی بہت بڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بہت بڑا مکر کیا، وہ یہ تھا کہ خود تو تکذیب کر کے ایذائیں پہنچاتے ہی تھے، بستی کے غنڈوں اور شریروں کو بھی ان کے پیچھے ڈال دیتے تھے، اسی شکوے میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا کہ انہوں نے باہم معاہدہ کیا کہ: لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ یعنی اپنے بتوں کو خصوصاً ان پانچ بڑے بتوں کی عبادت کو نہ چھوڑو، یہ پانچ نام ہیں پانچ بتوں کے۔

اِمام بغوی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک وصالح بندے تھے، جو آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے، اُن کے بہت سے لوگ معتقد اور متبع تھے، ان لوگوں نے ان کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک اُن ہی کے نقشِ قدم پر عبادت اور اللہ کے اَحکام کی اطاعت جاری رکھی۔ کچھ عرصے کے بعد شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کے تابع عبادت کرتے ہو، اگر اُن کی تصویریں بنا کر سامنے رکھا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی، خشوع وخضوع حاصل ہوگا۔ یہ لوگ اس فریب میں آکر ان کے مجسّمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے اور ان کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ سب یکے بعد دیگرے مر گئے، اور بالکل نئی نسل نے ان کی جگہ لے لی، تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ

[1] ترجمہ: وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنایا۔

تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود بھی بت تھے، وہ اُن ہی کی عبادت کیا کرتے تھے، یہاں سے بت پرستی شروع ہوگئی اور ان پانچ بتوں کی عظمت ان کے دِلوں میں چونکہ سب سے زیادہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے باہمی معاہدے میں ان کا نام خاص طور سے لیا گیا۔[1]

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ یعنی ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا فرضِ منصبی قوم کو ہدایت کرنے کا ہے، نوح علیہ السلام نے اُن کی گمراہی کی بددُعا کیسے کی کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دے دی تھی کہ اب اُن میں کوئی مسلمان نہیں ہوگا، اس لئے اُن کا گمراہی اور کفر پر مرنا تو یقینی تھا، حضرت نوح علیہ السلام نے اُن کی گمراہی بڑھا دینے کی دُعا اس لئے فرمائی کہ جلد ان کا پیمانہ لبریز ہوجائے اور ہلاک کردیئے جائیں۔

مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ یعنی یہ لوگ اپنی خطاؤں کفر و شرک کی وجہ سے پانی میں غرق کئے گئے تو یہ آگ میں داخل ہوگئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈُوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا، یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآنِ کریم نے خبر دِی ہے۔

عذابِ قبر قرآن سے ثابت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالمِ برزخ یعنی قبر میں رہنے کے زمانے میں بھی مُردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیثِ صحیحہ متواترہ میں قبر کے اندر عذاب و ثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس پر اُمت کا اِجماع اور اس کا اِقرار اہلِ سنت والجماعت کی علامت ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ نُوْحٍ بِحَمْدِ اللهِ لَیْلَةَ الْاَرْبَعَاءِ ۸ رَجَب ۱۳۹۱ھ

---

[1] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۲۳۲

سُوْرَةُ الْجِنّ

اٰیاتھا ۲۸ | ۷۲ سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ ۴۰ | رکوعاتھا ۲

سورۂ جن مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھائیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا

تو کہہ مجھ کو حکم آیا کہ سن گئے کتنے لوگ جنوں کے، پھر کہنے لگے ہم نے سنا ہے

قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ

ایک قرآن عجیب، کہ سجھاتا ہے نیک راہ، سو ہم اُس پر یقین لائے، اور ہرگز نہ شریک بتلائیں گے ہم

بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾

اپنے ربّ کا کسی کو۔ اور یہ کہ اُونچی ہے شان ہمارے ربّ کی، نہیں رکھی اُس نے جورو، نہ بیٹا۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ﴿۴﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ

اور یہ کہ ہم میں کا بے وقوف اللہ پر بڑھا کر باتیں کہا کرتا تھا۔ اور یہ کہ ہم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ بولیں گے

الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ

آدمی اور جن اللہ پر جھوٹ۔ اور یہ کہ تھے کتنے مرد آدمیوں میں کے

يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ

پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں کے، پھر تو وہ اور زیادہ سر چڑھنے لگے۔ اور یہ کہ اُن کو بھی خیال تھا جیسا تم کو خیال تھا

اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿۷﴾ وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا

کہ ہرگز نہ اُٹھائے گا اللہ کسی کو۔ اور یہ کہ ہم نے ٹٹول دیکھا آسمان کو، پھر پایا اس کو بھر رہے ہیں اُس میں چوکیدار

شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۙ﴿۸﴾ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ

سخت اور اَنگارے۔ اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں سننے کے واسطے، پھر جو کوئی اب سننا چاہے

الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ

وہ پائے اپنے واسطے ایک انگارا گھات میں۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ بُرا ارادہ ٹھہرا ہے

بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ

زمین کے رہنے والوں پر، یا چاہا ہے اُن کے حق میں اُن کے ربّ نے راہ پر لانا۔ اور یہ کہ کوئی ہم میں نیک ہیں

وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ

اور کوئی اس کے سوائے، ہم تھے کئی راہ پر پھٹے ہوئے۔ اور یہ کہ ہمارے خیال میں آگیا کہ ہم چھپ نہ جائیں گے اللہ سے

فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ط

زمین میں اور نہ تھکا دیں گے اُس کو بھاگ کر۔ اور یہ کہ جب ہم نے سن لی راہ کی بات تو ہم نے اس کو مان لیا،

فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ

پھر جو کوئی یقین لائے گا اپنے ربّ پر سو وہ نہ ڈرے گا نقصان سے اور نہ زبردستی سے۔ اور یہ کہ کچھ ہم میں حکم بردار ہیں،

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ط فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَأَمَّا الْقٰسِطُوْنَ

اور کچھ ہیں بے انصاف، سو جو لوگ حکم میں آگئے سو اُنہوں نے اٹکل کرلیا نیک راہ کو، اور جو بے انصاف ہیں

فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَأَسْقَيْنٰهُمْ

وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن۔ اور یہ حکم آیا کہ اگر لوگ سیدھے رہتے راہ پر تو ہم پلاتے اُن کو

مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ط وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ

پانی بھر کر، تاکہ اُن کو جانچیں اُس میں، اور جو کوئی منہ موڑے اپنے ربّ کی یاد سے، وہ ڈال دے گا اس کو

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّأَنَّهٗ لَمَّا

چڑھتے عذاب میں۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں، سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو۔ اور یہ کہ جب

قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ إِنَّمَآ أَدْعُوْا رَبِّيْ ع ۱۹ ۱۱

کھڑا ہوا اللہ کا بندہ کہ اُس کو پکارے، لوگوں کا بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھ۔ تو کہہ میں تو پکارتا ہوں بس اپنے ربّ کو

وَلَآ أُشْرِكُ بِهٖٓ أَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾

اور شریک نہیں کرتا اُس کا کسی کو۔ تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا بُرا اور نہ راہ پر لانا۔

قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ۬ وَّلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۲﴾ لا

تو کہہ مجھ کو نہ بچائے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوائے کہیں سرک رہنے کو جگہ،

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ

مگر پہنچانا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے پیغام لانے اور جو کوئی حکم نہ مانے اللہ کا اور اُس کے رسول کا، سو اُس کے لئے

نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ ط حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ فَسَیَعۡلَمُوۡنَ

آگ ہے دوزخ کی، رہا کریں اس میں ہمیشہ۔ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو کچھ اُن سے وعدہ ہوا، تب جان لیں گے

مَنۡ اَضۡعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلۡ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ

کس کے مددگار کمزور ہیں اور گنتی میں تھوڑے تو کہہ میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے

اَمۡ یَجۡعَلُ لَهٗ رَبِّیۡۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡهِرُ عَلٰی غَیۡبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ لا

یا کردے اُس کو میرا ربّ ایک مدّت کے بعد، جاننے والا بھید کا، سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید کی کسی کو،

اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّهٗ یَسۡلُکُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ

مگر جو پسند کرلیا کسی رسول کو تو وہ چلاتا ہے اُس کے آگے اور پیچھے

رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لا لِّیَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمۡ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیۡهِمۡ

چوکیدار، تاکہ جانے کہ انہوں نے پہنچائے پیغام اپنے ربّ کے اور قابو میں رکھا ہے جو اُن کے پاس ہے،

وَاَحۡصٰی کُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع

اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی۔

ع ۲ ۹ ۱۲

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) کہہ دو: "میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے (قرآن) غور سے سنا، اور (اپنی قوم سے جاکر) کہا کہ: 'ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، ① جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لئے ہم اُس پر اِیمان لے آئے ہیں، اور اَب اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو (عبادت میں) ہرگز شریک نہیں مانیں گے۔' ② اور یہ کہ: 'ہمارے پروردگار کی بہت اُونچی شان ہے، اُس نے نہ کوئی بیوی رکھی ہے، اور نہ کوئی بیٹا۔' ③ اور یہ کہ: 'ہم میں سے بے وقوف لوگ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے تھے جو حقیقت سے بہت دُور ہیں۔' ④ اور یہ کہ: 'ہم نے یہ سمجھا تھا کہ انسان اور جنات اللہ کے بارے میں جھوٹی بات نہیں کہیں گے۔' ⑤ اور یہ کہ: 'انسانوں میں سے کچھ لوگ جنات کے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، اس طرح ان لوگوں نے جنّات کو اور سر چڑھا دیا تھا۔' ⑥ اور یہ کہ: 'جیسا گمان تم لوگوں کا تھا، انسانوں نے بھی یہی گمان کیا تھا کہ اللہ کسی کو بھی مرنے کے بعد دُوسری زندگی نہیں دے گا۔' ⑦ اور یہ کہ: 'ہم نے آسمان کو ٹٹولنا چاہا تو ہم نے پایا کہ وہ بڑے سخت پہرے داروں اور شعلوں سے بھرا ہوا ہے۔' ⑧ اور یہ کہ: 'ہم پہلے سن گن لینے کے لئے آسمان کی کچھ جگہوں پر جا بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن اب جو کوئی سننا چاہتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک شعلہ اُس کی گھات میں لگا ہوا ہے، ⑨ اور یہ کہ: 'ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی بُرا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے، یا اُن کے پروردگار نے اُن کو راہِ راست دِکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔' ⑩ اور یہ کہ: 'ہم میں کچھ نیک ہیں، اور کچھ ایسے نہیں ہیں، اور ہم مختلف طریقوں پر چلے آرہے ہیں۔' ⑪ اور یہ کہ: 'ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ نہ ہم زمین میں اللہ کو عاجز کرسکتے ہیں، اور نہ (کہیں اور) بھاگ کر اُسے بے بس کرسکتے ہیں۔' ⑫ اور یہ کہ: 'جب ہم نے ہدایت کی بات سن لی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ چنانچہ جو کوئی اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تو اُس کو نہ کسی گھاٹے کا اندیشہ ہوگا، اور نہ کسی زیادتی کا۔' ⑬ اور یہ کہ: 'ہم میں سے کچھ تو مسلمان ہوگئے ہیں، اور ہم میں سے (اب بھی) کچھ ظالم ہیں۔ چنانچہ جو اِسلام لاچکے ہیں، انہوں نے ہدایت کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ ⑭ اور رہے وہ لوگ جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔'" ⑮ اور (اے پیغمبر! اہلِ مکہ سے کہو کہ مجھ پر) یہ (وحی بھی آئی ہے) کہ: "اگر یہ لوگ راستے پر آکر سیدھے ہوجائیں تو ہم انہیں وافر مقدار میں پانی سے سیراب کریں، ⑯ تاکہ اس کے ذریعے اُن کو آزمائیں۔ اور جو کوئی اپنے پروردگار کی یاد سے منہ موڑے گا، اللہ اُسے چڑھتے ہوئے عذاب میں پرودے گا۔" ⑰ اور یہ کہ: "سجدے تو تمام تر اللہ ہی کا حق ہیں، اس لئے اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت

مت کرو۔" ⑱ اور یہ کہ: "جب اللہ کا بندہ اُس کی عبادت کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لوگ اُس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔" ⑲ کہہ دو کہ: "میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں، اور اُس کے ساتھ کوئی شریک نہیں مانتا۔" ⑳ کہہ دو کہ: "نہ تمہارا کوئی نقصان میرے اختیار میں ہے، اور نہ کوئی بھلائی۔" ㉑ کہہ دو کہ: "مجھے اللہ سے نہ کوئی بچا سکتا ہے، اور نہ میں اُسے چھوڑ کر کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں۔ ㉒ البتہ (جس چیز پر مجھے اختیار دیا گیا ہے، وہ) اللہ کی طرف سے بات پہنچا دینا، اور اُس کے پیغامات ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اُس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں ایسے لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔" ㉓ (اور یہ لوگ نافرمانی کرتے رہیں گے) یہاں تک کہ جب وہ چیز انہیں نظر آجائے گی جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو اُس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں، اور کون تعداد میں کم ہے۔ ㉔ کہہ دو کہ: "مجھے معلوم نہیں ہے کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے، آیا وہ نزدیک ہے یا میرا پروردگار اُس کے لئے کوئی لمبی مدت مقرّر فرماتا ہے۔" ㉕ وہی سارے بھید جاننے والا ہے، چنانچہ وہ اپنے بھید پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ㉖ سوائے کسی پیغمبر کے جسے اُس نے (اس کام کے لئے) پسند فرما لیا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اُس پیغمبر کے آگے اور پیچھے کچھ محافظ لگا دیتا ہے، ㉗ تاکہ اللہ جان لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں، اور وہ ان کے سارے حالات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اُس نے ہر ہر چیز کی پوری طرح گنتی کر رکھی ہے۔ ㉘

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول

تفسیرِ آیات سے پہلے چند واقعات جاننے کے قابل ہیں، جن کی ضرورت تفسیر میں پیش آئے گی۔ **واقعۂ اوّل:-** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین آسمان تک پہنچ کر فرشتوں کی باتیں سنتے تھے، آپ کی بعثت کے بعد اُن کو شہابِ ثاقب کے ذریعے اِس سننے سے روک دیا گیا، اور اسی حادثے کی تحقیق کے ضمن میں یہ جنات آپ تک پہنچے، جیسا کہ سورۂ احقاف میں گزرا۔ **واقعۂ دوم:-** زمانۂ جاہلیت میں عادت تھی کہ جب کسی جنگل یا وادی میں دورانِ سفر قیام کی نوبت آتی تو اس اعتقاد سے کہ جنات کے سردار ہماری حفاظت کریں گے، یہ الفاظ کہا کرتے تھے: "اَعُوْذُ بِعَزِیْزِ هٰذَا الْوَادِیْ مِنْ شَرِّ سُفَهَآءِ قَوْمِهٖ" یعنی میں اِس جنگل کے سردار کی پناہ لیتا ہوں اُس کی قوم کے بے وقوف شریر لوگوں سے۔ **واقعۂ سوم:-** مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دُعا سے قحط پڑا تھا اور کئی سال تک رہا۔ **واقعۂ چہارم:-** جب آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام شروع کی تو کفار مخالفین کا آپ کے خلاف ہجوم اور نرغہ ہوا، پہلے دو واقعے تفسیر دُرِّ منثور [۱] سے اور آخری دو تفسیر ابنِ کثیر [۲] سے لئے گئے ہیں۔

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ میرے پاس اِس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا، پھر (اپنی قوم میں واپس جا کر) انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو راہِ راست بتلاتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے (قرآن ہونا تو اُس کے مضمون سے معلوم ہوا، اور عجیب ہونا اس سے کہ مشابہ کلام بشر کے نہیں) اور ہم (اب) اپنے رَبّ کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے۔ (یہ بیان ہے فَاٰمَنَّا بِهٖ کا) اور (انہوں نے ان مضامین کا بھی باہم تذکرہ کیا جو ذیل میں آئے ہیں، اور وہ مضامین یہ ہیں کہ) ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے، اُس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ اَولاد (کیونکہ ایسا ہونا عقلاً محال ہے، یہ بیان ہے وَلَنْ نُّشْرِكَ کا) اور ہم میں جو اَحمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے (مراد اس سے کلماتِ شرک، بیوی اور اَولاد کا اِثبات وغیرہ ہیں) اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے (کیونکہ بڑی بے باکی کی بات ہے، اس میں وجہ اپنے مشرک ہونے کی بیان کی کہ چونکہ اکثر جن وانس شرک کرتے تھے، ہم سمجھے کہ خدا کی شان میں اِتنے شخصوں نے جھوٹ پر اِتفاق نہ کیا ہوگا، بس ہم نے بھی اسی طریقے کو اختیار کرلیا، حالانکہ نہ مطلق لوگوں کا اِتفاق کوئی دلیلِ حقانیت ہے، اور نہ ہر اتفاق کا اِتباع عذر ہے، اور یہ شرکِ مذکور تو مشترک تھا) اور (ایک شرک خاص تھا بعض آدمیوں کے ساتھ، جس سے جنات کا کفر اور بڑھ گیا تھا، وہ یہ کہ) بہت سے لوگ آدمیوں میں سے ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، سو اُن آدمیوں نے اُن جنات کی بد دِماغی اور بڑھا دی (کہ وہ اِس وہم میں مبتلا ہوگئے کہ ہم جنات کے سردار تو پہلے سے تھے، اب آدمی بھی ہم کو ایسا بڑا سمجھتے ہیں، بس اِس سے بد دِماغی بڑھی اور کفر وعناد پر اور زیادہ مصر ہوگئے۔ یہاں تک مضمون متعلق توحید کے تھا) اور (آگے بعثت یعنی قیامت کے متعلق ہے، یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا، ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا، (مگر یہ مضمون بھی غلط ثابت ہوا، اور بعثت کا حق ہونا معلوم ہوا) اور (آگے رِسالت کے متعلق مضمون ہے، یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) ہم نے آسمان (کی خبروں) کی (موافق عادتِ سابقہ کے) تلاشی لینا چاہا، سو ہم نے اُس کو سخت پہرہ (یعنی محافظ فرشتوں) اور شعلوں سے (کہ جن کے ذریعے سے حفاظت کی جاتی ہے) بھرا ہوا پایا (یعنی اب پہرہ ہوگیا کہ کوئی جن آسمانی خبر نہ لے جانے پائے اور جو جائے شہابِ ثاقب سے مارا جائے) اور (اس کے قبل) ہم آسمان

---

[۱] تفسیر الدر المنثور ج:۱۵ ص:۶۰۵

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۳۹

(کی خبر سننے) کے موقعوں میں (خبر) سننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے (اور یہ مواقع خواہ اجزا آسمان ہی کے ہوں اور یا اجزاء ہوا یا کسی ملأ، یا خلا کے ہوں، جو کہ آسمان کے قریب ہوں، اور جنات اپنی لطافت اور عدمِ ثقل کی وجہ سے اُس پر مستقر ہو سکتے ہوں، جیسے بعض پرندے ہوا میں چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں) سو جو کوئی اب سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے (اور تحقیق مباحث شہاب کی سورۂ حجر کے رُکوع دوم میں گزری ہے۔ یہ مضمون رسالت کے متعلق ہے، مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت دی ہے اور دفعِ التباس کے لئے باب کہانت بند کر دیا ہے، اور اس اِستراق یعنی خبروں کی چوری کا بند ہونا ہی سبب ہوا ان جنات کے پہنچنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں، جیسا واقعۂ اوّل میں مذکور ہے) اور (آگے مضامینِ مذکور کے متممات ہیں کہ) ہم نہیں جانتے کہ (ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے سے) زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے یا اُن کے رَبّ نے اُن کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے (یعنی مقصود تکوینی ارسالِ رُسل کا معلوم نہیں، کیونکہ رسول کے اِتباع سے رُشد و ہدایت ہوتی ہے، اور مخالفت سے مضرّت و عقوبت اور اِتباع اور مخالفت آئندہ کا ہم کو علم نہیں، اِس لئے ہم یہ نہیں جانتے کہ ان کے بھیجنے سے قوم کو سزا دینا مقصود ہے یا ہدایت دینا شاید یہ اِس لئے کہا کہ ان کو اپنی قوم کا اندازہ تھا کہ ایمان لانے والے کم ہوں گے، اور وہ سزا کے مستحق ہو جائیں گے، و نیز نفیٔ علمِ غیب سے تقویت ہے مضمونِ توحید کی کہ دیکھو بعض لوگ علم غیب کو جنات کی طرف نسبت کرتے ہیں مگر اُن کو اتنی بھی خبر نہیں) اور ہم میں (پہلے سے بھی) بعض نیک (ہوتے آئے) ہیں اور بعض اور طرح کے (ہوتے آئے) ہیں (غرض) ہم مختلف طریقوں پر تھے (اِسی طرح ان نبی کی خبر سن کر اَب بھی ہم میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں) اور (ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ) ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین (کے کسی حصے) میں (جا کر) اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ (اور کہیں) بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں (بھاگنے سے مراد زمین کے علاوہ آسمان وغیرہ میں بھاگ جانا ہے جو فِي الْاَرْضِ کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے، فهو كقوله تعالىٰ: وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ [1] (العنکبوت: ۲۲) شاید اس سے بھی مقصود اِنذار ہو کہ اگر کفر کریں گے تو خدا تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اور اپنے پہلے مختلف طریقوں کے بیان کرنے سے شاید یہ مقصود ہو کہ باوجود حق کے واضح ہو جانے کے بعض کا ایمان نہ لانا حق کے حق ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے) اور ہم نے جب ہدایت کی بات سن لی تو ہم نے تو اُس کا یقین کر لیا سو (ہماری طرح) جو شخص اپنے رَبّ پر اِیمان لے آئے گا تو اُس کو نہ کسی کمی کا اندیشہ ہو گا اور نہ زیادتی کا، (کمی یہ کہ اُس کی کوئی نیکی لکھنے سے رہ جائے اور زیادتی یہ کہ کوئی گناہ زیادہ لکھ لیا جائے، شاید مقصود اس سے ترغیب ہو) اور ہم میں بعضے تو (یہی مضامین اِنذار و ترغیب کو سمجھ کر) مسلمان (ہو گئے) ہیں اور بعض ہم میں (بدستورِ سابق) بے راہ ہیں، سو جو شخص مسلمان

[1] ترجمہ: اور تم نہ زمین میں ہرا سکتے ہو اور نہ آسمان میں۔

ہوگیا اُنہوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا (جس پر ثواب مرتب ہوگا) اور جو بے راہ ہیں وہ دوزخ کے ایندھن ہیں (یہاں تک کلام جنات کا ختم ہوگیا، جو معمول ہے فَقَالُوْٓا کا) اور (آگے اُوْحِیَ اِلَیَّ کے دُوسرے معمولات ہیں یعنی مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی ہے، ایک یہ کہ) اگر یہ (مکہ والے) لوگ (سیدھے) رستے پر قائم ہوجاتے تو ہم اُن کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ اِس میں اُن کا امتحان کریں (کہ نعمت کا شکر اَدا کرتے ہیں یا ناشکری و نافرمانی کرتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر اہلِ مکہ شرک نہ کرتے جس کی مذمت اُوپر بضمن کلامِ جنات آچکی ہے، تو اُن پر قحط مسلط نہ ہوتا، جیسا واقعۂ ثالثہ میں مذکور ہے، مگر انہوں نے بجائے ایمان کے اِعراض کیا اِس لئے مبتلائے قحط ہوئے) اور (عقوبتِ کفر میں کچھ تخصیص اہلِ مکہ کی نہیں بلکہ) جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان و اطاعت) سے رُوگردانی کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا، اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہے (یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جائے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو، جیسا مشرکین کرتے تھے) سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو (اِس مضمون میں بھی توحید کی تقریر ہے، جس کا اُوپر ذِکر تھا) اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جب خدا کا خاص بندہ (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اِس بندے پر بھیڑ لگانے کو ہوجاتے ہیں (یعنی تعجب و عداوت سے ہر شخص اِس طرح دیکھتا ہے جیسے اب حملہ کرنے کے لئے بھیڑ لگا چاہتی ہے، یہ بھی تتمہ ہے مضمونِ توحید کا، کیونکہ اس میں مذمت ہے مشرکین کی کہ توحید سے ان کو عداوت اور نفرت ہے، آگے اس تعجب اور عداوت کے متعلق جواب دینے کے لئے آپ کو اِرشاد ہے یعنی) آپ (ان سے) یہ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا (سو یہ کوئی تعجب اور عداوت کی بات نہیں، یہ سب مضمون متعلق توحید تھا، آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے کہ) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے نہ کسی ضرر کا اِختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا، (یعنی تم جو ایسی فرمائشیں کرتے ہو کہ اگر آپ رسول ہیں تو ہم پر عذاب نازل کردیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میرے اِختیار میں نہیں، اور اِسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک طرح ہم آپ کو رسول مان لیں کہ آپ مضامینِ توحید و قرآن میں کچھ تغیر و تبدل کردیں، تو اس کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (اگر خدانخواستہ میں ایسا کروں تو) مجھ کو خدا (کے غضب) سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اُس کے سوا کوئی پناہ (کی جگہ) پا سکتا ہوں (مطلب یہ کہ نہ خود کوئی میرا بچانے والا ہوگا اور نہ میری تلاش سے مل سکے گا۔ اور کفار کے ایسے اقوال استعجالِ عذاب و استبدالِ قرآن و دِین کے قرآن میں جا بجا مذکور ہیں، اور اُوپر لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ میں نفی اِختیارِ نفع و ضرر کی فرمائی، آگے اِثباتِ منصبِ رسالت کا فرماتے ہیں کہ ضرر و نفع کا مالک ہونا تو لازمۂ نبوّت نہیں، وہ تو منفی ہے) لیکن خدا کی طرف سے پہنچانا اور اُس کے پیغاموں کا اَدا کرنا یہ میرا کام ہے، اور (آگے توحید و رِسالت دونوں کے متعلق مضمون ہے کہ) جو لوگ

اللہ اور اُس کے رسول کا کہنا نہیں مانتے تو یقیناً اُن لوگوں کے لئے آتشِ دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (مگر کفار اِس وقت ان مضامین سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ اُلٹا مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں: اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾ [1] (مریم) اور یہ اِس جہالت سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اُس وقت جانیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کی جماعت کم ہے (یعنی کافر ہی ایسے ہوں گے جن کے کوئی کام نہ آئے گا، پس مراد جماعت سے جماعتِ مطیعہ ہے، نَاصِرًا میں نافع اعلیٰ کی نفی ہوگئی اور عَدَدًا میں نافعِ ادنیٰ کی۔ آگے قیامت کے متعلق کلام ہے کہ یہ لوگ قیامت کا وقت بطور اِنکار کے دریافت کرتے ہیں تو) آپ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آیا وہ نزدیک (آنے والی) ہے یا میرے پروردگار نے اُس کے لئے کوئی مدّتِ دراز مقرر کر رکھی ہے (لیکن ہر حال میں وہ آئے گی ضرور، رہا علمِ تعیین سو وہ محض غیب ہے، اور) غیب کا جاننے والا وہی ہے، سو (جس غیب پر کسی کو مطلع کرنا مصلحت نہیں ہوتا) وہ اپنے (ایسے) غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا (اور علمِ تعیینِ قیامت ایسا ہی ہے کہ اِس پر کسی کو مطلع کرنے میں کوئی مصلحت نہیں، کیونکہ وہ علوم متعلقہ بالنبوّۃ سے نہیں، جن کے حصول کو قربِ اِلٰہی میں دخل ہوتا ہے، پس ایسے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا) ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو (اگر کسی ایسے علم پر مطلع کرنا چاہتا ہے جو کہ علمِ نبوّت سے ہو، خواہ مثبتِ نبوّت ہو جیسے پیشین گوئیاں، خواہ فروعِ نبوّت سے ہو، جیسے علمِ اَحکام) تو (اِس طرح اِطلاع دیتا ہے کہ) اُس پیغمبر کے آگے اور پیچھے (یعنی جمیع جہات میں وحی کے وقت) محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (تاکہ وہاں شیاطین کا گزر نہ ہو، جو کہ وحی کو فرشتے سے سن کر اور کسی سے جا کہیں، یا کسی وسوسے وغیرہ کا اِلقاء کرسکیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے پہرہ دار فرشتے چار تھے، کما فی رُوح المعانی [2] اور یہ انتظام اِس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ (ظاہری طور پر) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک بحفاظت) پہنچا دیئے (اور اِس میں کسی کا دخل و تصرف نہیں ہوا، اور پہنچانے والا تو صرف وحی کا فرشتہ ہے، لیکن معیت کی وجہ سے رصد یعنی محافظ فرشتوں کی طرف بھی اسنادِ فعل کی کردی) اور اللہ تعالیٰ ان (پہرہ داروں) کے تمام اَحوال کا اِحاطہ کئے ہوئے ہے (اِس لئے پہرہ دار ایسے مقرّر کئے گئے ہیں جو اِس کام کے پورے پورے اہل ہیں) اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے (پس وحی کے سب اجزا ایک ایک کر کے اُس کو معلوم ہیں، اور وہ سب کی پوری حفاظت کرتا ہے، حاصلِ مقام یہ کہ تعیینِ قیامت کا علم علومِ نبوّت سے نہیں، اِس لئے اس کا علم نہ ہونا نبوّت کے منافی نہیں، البتہ علومِ نبوّت عطا کئے جاتے ہیں اور ان میں اِحتمال خطا کا نہیں ہوتا، تو ایسے علوم سے تم مستفید ہو اور زوائد کی تحقیق چھوڑو)۔

---

[1] ترجمہ: دونوں فریقوں میں مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے۔

[2] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۳۶۷ تحت ھٰذہ الآیۃ۔

معارف و مسائل

نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ لفظ نَفَرٌ تین سے دس تک عدد کے لئے بولا جاتا ہے، جن جنات کا یہاں ذِکر ہے روایت یہ ہے کہ یہ نو حضرات تھے، نصیبین کے رہنے والے۔

جنات کی حقیقت

"جن" مخلوقاتِ الٰہیہ میں ایک ایسی مخلوق کا نام ہے جو ذِی اَجسام بھی ہیں، ذِی رُوح بھی، اور اِنسان کی طرح عقل و شعور والے بھی، مگر لوگوں کی نظروں سے مخفی ہیں۔ اِسی لئے اِن کا نام "جن" رکھا گیا کہ "جن" کے لفظی معنی مخفی کے ہیں۔ ان کی تخلیق کا غالب مادّہ آگ ہے، جیسے انسان کی تخلیق کا غالب مادّہ مٹی ہے۔ اِس نوع میں بھی انسان کی طرح نر و مادہ یعنی مرد و عورت ہیں، اور اِنسان ہی کی طرح ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ قرآن میں جن کو شیاطین کہا گیا ہے وہ بھی جنات ہی میں سے شریر لوگوں کا نام ہے۔ جنات اور فرشتوں کا وجود قرآن و سنت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جس کا اِنکار کفر ہے۔ (تفسیر مظہری) [1]

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے جس واقعے کا یہاں ذِکر ہے، اُس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سننے والے جنات کو دیکھا نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو اِطلاع دی۔

سورۂ جن کے نزول کے واقعہ کی تفصیل

صحیح بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ (اس واقعے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو قرآن بالقصد سنایا نہیں، بلکہ اُن کو دیکھا بھی نہیں، بلکہ واقعہ یہ پیش آیا کہ آپ اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بازارِ عکاظ کی طرف جارہے تھے، اور یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب کہ شیاطین کو آسمان کی خبریں سننے سے شہابِ ثاقب کے ذریعے روک دیا گیا تھا، اور جنات نے باہم مشورہ کیا کہ یہ حادثہ جو ہم پر آسمانی خبروں سے ممنوع ہو جانے کا پیش آیا ہے، یہ کوئی اِتفاقی بات معلوم نہیں ہوتی، دُنیا میں کوئی نئی چیز پیش آئی ہے جو اس کا سبب ہوئی۔ اور یہ طے کیا کہ زمین کے مشرق و مغرب اور ہر طرف میں جنات کے وفود جائیں اور اِس کی تحقیق کر کے آئیں کہ یہ نئی چیز کیا پیش آئی ہے ان کا جو وفد "تہامہ" حجاز کی طرف بھیجا گیا تھا، وہ مقامِ نخلہ پر پہنچے تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ صبح کی نماز جماعت سے ادا کر رہے تھے۔

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۷۹

جنات کے اِس وفد نے جب قرآن سنا تو قسمیں کھا کر آپس میں کہنے لگے کہ واللہ! یہی کلام ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل اور مانع بنا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے لوٹے اور جا کر اپنی قوم سے یہ قصہ بیان کیا جس کا ذِکر اِن آیات میں ہے: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ الآیۃ، اللہ تعالیٰ نے اِس سارے واقعے کی خبر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن آیات میں دے دی۔[1]

ابوطالب کی وفات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ طائف

اور اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ ابوطالب کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تو آپ نے تنِ تنہا طائف کا سفر کیا کہ وہاں کے قبیلہ بنی ثقیف سے اپنی قوم کے مظالم کے مقابلے میں کچھ مدد اور معاونت حاصل کرسکیں۔ محمد بن اِسحاق کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف پہنچے تو قبیلۂ ثقیف کے تین بھائیوں کے پاس گئے جو قبیلے کے سردار اور شریف سمجھے جاتے تھے، یہ تین بھائی عمیر کے بیٹے ''عبد یالیل'' اور ''سعود'' اور ''حبیب'' تھے، ان کے گھر میں ایک عورت قریش کی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اِسلام کی دعوت دی اور اپنی قوم کے مظالم کا ذِکر کر کے اُن سے معاونت کے لئے فرمایا، مگر ان تینوں نے بڑا سخت جواب دیا اور آپ سے اور کچھ کلام نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ قبیلہ بنوثقیف کے یہی تین آدمی شریف سمجھے جاتے تھے، جن سے کسی معقول جواب کی اُمید تھی، ان سے بھی مایوسی ہوگئی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اچھا اگر آپ لوگ میری مدد نہیں کرتے تو کم از کم میرے آنے کو میری قوم پر ظاہر نہ کرنا۔ مقصد یہ تھا کہ اُن کو خبر ملے گی تو اور زیادہ ستائیں گے، مگر ان ظالموں نے یہ بات بھی نہ مانی بلکہ اپنے قبیلے کے بے وقوف لوگوں اور غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ آپ کو گالیاں دیں اور شور مچائیں۔ اُن کے شور و شغب سے بہت سے اور شریر جمع ہوگئے، آپ نے اُن کے شر سے بچنے کے لئے ایک باغ میں جو عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا باغ تھا، اُس میں پناہ لی، اور یہ دونوں بھی اُس باغ میں موجود تھے، اُس وقت یہ شریر لوگ آپ کو چھوڑ کر واپس ہوئے، اور آپ انگوروں کے باغ کے سائے میں بیٹھ گئے۔ یہ دونوں بھائی آپ کو دیکھ رہے تھے اور یہ بھی دیکھا تھا کہ ان کی قوم کے بے وقوفوں کے ہاتھوں آپ کو کیا تکلیف اور اَذیت پیش آئی۔ اِسی درمیان میں وہ قریشی عورت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی جو اُن ظالموں کے گھر میں تھی، آپ نے اُس سے شکایت کی کہ تمہاری سسرال کے لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

[1] صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الجهر بقراءة صلاة الفجر ج:۱ ص:۱۰۶، وصحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب الجهر بالقراءة في الصبح والقراءة علی الجن، ج:۱ ص:۱۸۴

جب اس باغ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ اطمینان حاصل ہوا تو آپ نے اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں دُعا مانگنی شروع کی، اس دُعا کے الفاظ بھی عجیب وغریب ہیں، اور کسی موقع پر آپ سے ایسے الفاظِ دُعا منقول نہیں، وہ دُعا یہ ہے:-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْا اِلَیْکَ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ وَاَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ، فَاَنْتَ رَبِّیْ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٍ یَّتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَّلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ، اِنْ لَّمْ تَکُنْ سَاخِطًا عَلَیَّ فَلَا اُبَالِیْ وَلٰکِنَّ عَافِیَتَکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ۔ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَکَ لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ۔ (مظہری باختصار) [1]

یااللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی، اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی، اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت و بے توقیری کی، اور آپ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، اور آپ کمزوروں کی پرورِش فرمانے والے ہیں، آپ ہی میرے رَبّ ہیں، آپ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں کیا ایک غیر آدمی کے جو مجھ پر حملہ کرے، یا کسی دُشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملے کا مالک بنادیا ہے (کہ جو چاہے کرے)، اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں تو مجھے اِن سب چیزوں کی بھی پروا نہیں، لیکن آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے (اُس کو طلب کرتا ہوں) میں آپ کی ذاتِ مبارک کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں روشن ہوجاتی ہیں اور اس کی بنا پر دُنیا و آخرت کے سب کام دُرست ہوجاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائیں، ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور منانے میں لگے رہیں جب تک کہ آپ راضی نہ ہوجائیں اور ہم تو کسی بُرائی سے بچ سکتے نہیں نہ کسی بھلائی کو حاصل کرسکتے ہیں، بجز آپ کی مدد کے۔

جب ربیعہ کے دونوں بیٹوں عتبہ اور شیبہ نے یہ حال دیکھا تو اُن کے دِل میں رحم آیا اور اپنے ایک نصرانی غلام عدّاس نامی کو بلاکر کہا کہ انگور کا ایک خوشہ لو اور ایک طبق میں رکھ کر اُس شخص کے پاس لے جاؤ اور اُن سے کہو یہ کھائیں عدّاس نے ایسا ہی کیا اُس نے جاکر انگور کا یہ طبق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا، آپ نے بسم اللہ پڑھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا، عدّاس یہ دیکھ رہا تھا، کہنے لگا واللہ یہ کلام یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے۔ پھر رسول اللہ

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۸۰، ومجمع الزوائد، باب خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلی الطّائف وعرضہ نفسہ علی القبائل، رقم الحدیث: ۹۸۵۱، وکنز العمال، رقم الحدیث: ۵۱۲۰

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے پوچھا: عدّاس تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا کیا مذہب ہے۔ اُس نے کہا میں نصرانی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا تو اللہ کے نیک بندے یونس بن متی علیہ السلام کی بستی کے رہنے والے ہو۔ اُس نے کہا کہ آپ کو یونس بن متی کی کیا خبر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی ہیں، کیونکہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے، میں بھی نبی ہوں۔

یہ سن کر عدّاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا، اور آپ کے سرِ مبارک اور ہاتھوں پاؤں کو بوسہ دیا، عتبہ اور شیبہ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے، ایک نے دُوسرے سے کہا کہ اُس نے ہمارے غلام کو تو خراب کر دیا۔ جب عدّاس لوٹ کر اُن کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ عدّاس تجھے کیا ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگا۔ اُس نے کہا کہ میرے سردارو اِس وقت زمین پر اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں، اس نے مجھے ایک ایسی بات بتلائی جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اُنہوں نے کہا کمبخت ایسا نہ ہو کہ یہ آدمی تجھے تیرے مذہب سے پھیر دے، کیونکہ تیرا دِین بہر حال اُس کے دِین سے بہتر ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گئے، جب کہ ثقیف کی ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔ واپسی میں آپ نے مقامِ نخلہ پر قیام فرمایا اور آخرِ شب میں نمازِ تہجد پڑھنے لگے تو ملک یمن نصیبین کے جنات کا یہ وفد بھی وہاں پہنچا ہوا تھا، اُس نے قرآن سنا اور سن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم کی طرف واپس جا کر واقعہ بتلایا، جس کا ذِکر اللہ تعالیٰ نے آیاتِ مذکورہ میں نازل فرمایا۔ (مظہری) [1]

ایک صحابی ''جِنّ'' کا واقعہ

اِبنِ جوزی نے ''کتاب الصفوہ'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ انہوں نے ایک مقام پر ایک بوڑھے جن کو دیکھا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ رہا ہے، اور اُون کا جبہ پہنے ہوئے تھا، جس پر بڑی رونق معلوم ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سہل کہتے ہیں کہ میں نے اُن کو سلام کیا اور اُنہوں نے سلام کا جواب دے کر بتلایا کہ تم اِس جبے کی رونق سے تعجب کر رہے ہو، یہ جبہ سات سو سال سے میرے بدن پر ہے، اِسی جبے میں، میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی، پھر اِسی جبے میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور میں اُن جنات میں سے ہوں جن کے بارے میں سورۂ جن نازل ہوئی ہے۔ (مظہری) [2]

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۸۱، وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۲ ص:۲۱۱ و۲۱۲

[2] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۸۱

اور روایاتِ حدیث میں جو ''لیلۃ الجن'' کا واقعہ مذکور ہے، جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اُس میں آپ کا بالقصد جنات کو تبلیغ و دعوت کے لئے مکہ مکرمہ کے قریب جنگل میں جانا اور قرآن سنانا منقول ہے، وہ بظاہر اس واقعے کے بعد کا قصہ ہے جس کا ذِکر سورۂ جن میں آیا ہے۔

اور علامہ خفاجی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ احادیثِ معتبرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات کے وفود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے ہیں، اِس لئے اِن دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ سورۂ جن والے واقعے میں آپ کو جنات کے آنے اور قرآن سننے کی خبر بھی نہ تھی، جب تک بذریعہ وحی آپ کو بتلایا نہ گیا، اور یہ کہ یہ واقعہ مقام نخلہ کا اور طائف سے واپسی کے وقت کا ہے۔ اور دُوسری روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر مکہ کے قریب ہی جنگل میں آپ بالقصد اسی کام کے لئے تشریف لے گئے کہ جنات کو دعوتِ اِسلام دیں اور قرآن سنائیں، یہ اس کے بعد پیش آیا۔ (مظہری) [1]

وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا، جَدُّ کے معنی شان کے ہیں، حق تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے: ''تَعَالٰى جَدُّهٗ''، یعنی بلند و بالا ہے اُس کی شان۔ یہاں جدّہٗ کی ضمیر راجع کرنے کے بجائے لفظ ربّ مظہر رکھ دیا گیا جس میں اس علوِشان کی دلیل بھی آ گئی کیونکہ جو ذات مخلوق کی پروردگار ہے اُس کا سب مخلوق سے عالی شان ہونا ظاہر ہے۔

اس آیت میں وَاَنَّهٗ کے عطف اور ترکیبِ نحوی میں مفسرین کا کلام طویل ہے، عوام کو اس کی حاجت نہیں۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ لفظ شَطَط کے معنی قول بعید اَز عقل اور ظلم و جور کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک و کفر میں مبتلا رہنے کا عذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کہا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کر سکتا ہے، اِس لئے اِن بے وقوفوں کی بات میں آ کر آج تک ہم کفر و شرک میں مبتلا تھے، اب قرآن سنا تو حقیقت کھلی۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶ اِس آیت میں مؤمن جنات نے یہ بیان کیا ہے کہ جاہلیت کے لوگ جب کسی جنگل میں قیام کرتے تو اُس جنگل کے جنات کی پناہ مانگتے تھے، اِس سے جنات یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو اِنسان سے بھی افضل ہیں کہ انسان بھی ہماری پناہ لیتا ہے، اس بات نے جنات کی گمراہی میں اور اِضافہ کر دیا۔

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۸۲

حضرت رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلام بسبب جنّات

تفسیر مظہری میں ہے کہ ''ھَوَاتِفُ الْجِنِّ'' میں سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ رافع بن عمیر صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام قبول کرنے کا ایک واقعہ یہ بتلایا ہے کہ میں ایک رات ایک ریگستان میں سفر کر رہا تھا، اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا، میں اپنی اُونٹنی سے اُترا اور سو گیا، اور سونے سے پہلے میں نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق یہ الفاظ کہہ لئے: ''اِنِّیْ اَعُوْذُ بِعَظِیْمِ هٰذَا الْوَادِیْ مِنَ الْجِنِّ'' یعنی میں پناہ لیتا ہوں اِس جنگل کے جنات کے سردار کی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے، اُس کو وہ میری ناقہ کے سینے پر رکھنا چاہتا ہے، میں گھبرا کر اُٹھا اور دائیں بائیں دیکھا، کچھ نہ پایا تو میں نے دِل میں کہا کہ یہ شیطانی خیال ہے، خواب اصلی نہیں، اور پھر سو گیا اور بالکل غافل ہو گیا، تو پھر وہی خواب دیکھا، پھر میں اُٹھا اور اپنی ناقہ کے چاروں طرف پھرا، کچھ نہ پایا، مگر ناقہ کو دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ میں پھر جا کر اپنی جگہ سو گیا تو پھر وہی خواب دیکھا، میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری ناقہ تڑپ رہی ہے، اور پھر دیکھا ایک نوجوان ہے جس کے ہاتھ میں حربہ ہے، یہ وہی شخص تھا جس کو خواب میں ناقہ پر حملہ کرتے دیکھا تھا، اور ساتھ ہی یہ دیکھا کہ ایک بوڑھے آدمی نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے جو ناقہ پر حملہ کرنے سے اُس کو روک رہا ہے۔ اسی عرصے میں تین گورخر سامنے آگئے تو بوڑھے نے اُس نوجوان سے کہا کہ ان تینوں میں سے جس کو تو پسند کرے وہ لے لے اور اِس اِنسان کی ناقہ کو چھوڑ دے۔ وہ جوان ایک گورخر لے کر رُخصت ہو گیا۔ پھر اُس بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر کہا کہ اے بے وقوف! جب تو کسی جنگل میں ٹھہرے اور وہاں کے جنات و شیاطین سے خطرہ ہو تو یہ کہا کر: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ رَبِّ مُحَمَّدٍ مِنْ هَوْلِ هٰذَا الْوَادِیْ'' یعنی میں پناہ پکڑتا ہوں ربّ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی، اِس جنگل کے خوف اور شر سے، اور کسی جن سے پناہ نہ مانگا کر، کیونکہ وہ زمانہ چلا گیا جب انسان جنوں کی پناہ لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ نبی عربی ہیں، نہ شرقی نہ غربی، پیر کے روز مبعوث ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کہاں رہتے ہیں۔ اُس نے بتلایا کہ وہ یثرب میں رہتے ہیں جو کھجوروں کی بستی ہے۔ میں نے صبح ہوتے ہی مدینہ کا راستہ لیا اور سواری کو تیز چلایا، یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو میرا سارا واقعہ مجھے سنا دیا، اِس سے پہلے کہ میں آپ سے کچھ ذِکر کروں، اور مجھے اسلام کی دعوت دی، میں مسلمان ہو گیا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اِس واقعے کو نقل کر کے فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک اسی معاملے کے متعلق قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ [1]

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۸۵

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۙ لفظ سَمَاءٌ عربی لغت میں جس طرح آسمان کے لئے بولا جاتا ہے اُسی طرح بادل پر بھی لفظ سَمَاءٌ کا اِطلاق عام اور معروف ہے، یہاں بظاہر سَمَاءٌ سے مراد یہی بادل ہے۔

جنات آسمانی خبریں سننے کے لئے صرف بادلوں تک جاتے تھے، آسمان تک نہیں

اور جنات وشیاطین کا آسمانی خبریں سننے کے لئے آسمان تک جانے کا مطلب یہی ہے کہ بادلوں تک جاتے تھے اور وہاں سے آسمانی خبریں سنتے تھے، اور دلیل اِس کی حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جو صحیح بخاری میں بالفاظِ ذیل آئی ہے:-

قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ وَهُوَ السَّحَابُ فَتَذْكُرُ الْاَمْرَ الَّذِيْ قُضِيَ فِي السَّمَاءِ فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ فَتَسْمَعُهُ فَتَتَوَجَّهُ اِلَى الْكُهَّانِ فَيَكْذِبُوْنَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ۔ (ازمظہری) [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرشتے عنان سماء میں اُترتے ہیں، جس کے معنی بادل کے ہیں، وہاں وہ اُن فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جاری فرمائے ہیں، یہاں سے شیاطین یہ خبریں چُراتے ہیں اور سن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر اُن کو بتاتے ہیں۔

اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور مسلم میں حضرت اِبن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اصل آسمانوں میں پیش آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم آسمان میں جاری فرماتے ہیں تو سب فرشتے بغرضِ اِطاعت اپنے پَر مارتے ہیں اور جب کلام ختم ہوجاتا ہے تو باہم تذکرہ کرتے ہیں کہ تمہارے رَبّ نے کیا فرمایا۔ اس تذکرے کو آسمانی خبریں چُرانے والے شیاطین سن لیتے ہیں اور کاہنوں کے پاس اُس میں بہت سے جھوٹ شامل کر کے پہنچاتے ہیں۔ [2]

یہ مضمون حدیثِ عائشہ مذکورہ کے منافی نہیں، کیونکہ اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیاطین آسمانوں میں جا کر یہ خبریں چُرا لاتے ہیں، بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ خبریں درجہ بدرجہ آسمانوں میں فرشتوں کے اندر پھیلتی ہوں، پھر فرشتے عنان سماء یعنی بادل تک آتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوں، یہاں سے شیاطین خبروں کی چوری کرتے ہوں، جیسا کہ

---

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۸۲، وصحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ ج:۱ ص:۴۵۶

[2] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الحجر، باب قولہ: اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ ...الخ ج:۲ ص:۶۸۲

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔ (کذا فی المظهری) [1]

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رُکاوٹ کے جاری تھا، شیاطین بادلوں تک پہنچ کر فرشتوں سے سن لیا کرتے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کی آسمانی وحی کی حفاظت کے لئے اس سلسلے کو اِس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان یہ خبریں سننے کے لئے اُوپر آتا تو اُس کی طرف شہابِ ثاقب کا انگارہ پھینک کر اُس کو دفع کر دیا جاتا ہے، یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی شیاطین و جنات کو فکر ہوئی اور تحقیقِ حال کے لئے دُنیا کے مشرق و مغرب میں وفود بھیجے، پھر مقامِ نخلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک وفدِ جنات کا قرآن سن کر ایمان لانا سورۂ جن میں ذِکر فرمایا گیا۔

شہابِ ثاقب بعثتِ نبوی سے پہلے بھی تھے، مگر ان کے ذریعے دفعِ شیاطین کا کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہوا

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شہابِ ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا عربی میں انقضاض الکوکب کہتے ہیں، یہ تو دُنیا میں قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہدِ نبوی کی تخصیص ہے۔ جواب یہ ہے کہ شہابِ ثاقب کا وجود تو پہلے سے تھا، خواہ اس کی حقیقت وہ ہو جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں کہ زمین سے کچھ آتشیں مادّے فضا میں پہنچتے ہیں، وہ کسی وقت بھڑک اُٹھتے ہیں، یا یہ ہو کہ خود کسی ستارے اور سیارے سے یہ آتشیں مادّہ نکلتا ہو، بہر حال اس کا وجود اگرچہ اِبتدائے عالم سے ہے، مگر اِس آتشیں مادّے سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے شہابِ ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو، اس کی پوری تفصیل سورۂ حجر کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ یعنی جنات وشیاطین کو آسمانی خبریں سننے سے روک دیا بطور سزا کے بھی ہوسکتا ہے کہ زمین والوں کو آسمان کی خبریں نہ ملا کریں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے یہ ہدایت کا سامان کیا ہو کہ جنات وشیاطین وحیِ آسمانی میں کوئی خلل نہ ڈال سکیں۔

فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ بَخْسٌ بفتح الباء وسکون الخاء کے معنی حق سے کم دینے اور کم کرنے کے ہیں، اور رَهَقٌ کے معنی ذلت ورُسوائی طاری ہونا، مراد یہ ہے کہ جو اللہ پر اِیمان لاتا ہے نہ اُس کی جزا میں کوئی کمی ہوسکتی ہے، اور نہ آخرت میں اُس کو کوئی ذِلت ورُسوائی پیش آسکتی ہے۔

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۸۶

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ مَسَاجِدُ جمع مَسْجِدُ ہے، یہاں اِس کے معروف ومشہور معنی بھی لئے جاسکتے ہیں یعنی وہ عبادت گاہیں جو نماز کے لئے وقف کی جاتی ہیں اور ''مسجد'' کہلاتی ہیں، اِس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جب سب مساجد صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں تو تم مسجدوں میں جاکر اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لئے نہ پکارو، جس طرح یہود ونصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں اِس شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حاصل اِس کا مساجد کو عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ باطلہ سے پاک رکھنا ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَسَاجِدُ، مَسْجَدُ بفتح الجیم کی جمع ہو، جو مصدر میمی بمعنی سجدہ آتا ہے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں، اور جو شخص غیر اللہ کو اِعانت کے لئے پکارتا ہے گویا وہ اُس کو سجدہ کرتا ہے، غیر اللہ کے سجدے سے اِجتناب کرو۔

مسئلہ:- باجماعِ اُمت غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے، اور بعض علماء کے نزدیک کفر ہے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ ان آیتوں میں سے پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ آپ ان منکرین سے جو آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں اور اِصرار کرتے ہیں، یہ فرما دیجئے کہ قیامت کا آنا اور وہاں جزا وسزا ہونا تو یقینی ہے، لیکن اُس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اور وقت کو اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتلایا، اِس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت قریب آچکا ہے یا میرا ربّ اُس کے لئے کوئی دُور کی مدّت مقرّر کردے گا۔ دُوسری آیت میں اس کی دلیل اِرشاد فرمائی: عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ یعنی قیامت کے وقتِ معین سے میری بے خبری اِس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں، بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ ربّ العالمین کی خصوصی صفت ہے، اِس لئے وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی غالب وقادر نہیں بناتا۔ یہاں عٰلِمُ الْغَیْبِ میں الْغَیْبِ کا الف لام اِستغراقِ جنس کے لئے ہے۔ (کما فی الروح عن الرضا) [1] یعنی عالم ہر فردِ غیب اور جنسِ غیب کا۔ اور عَلٰی غَیْبِهٖٓ میں غیب کی اِضافت اللہ کی طرف کرنے سے بھی اِسی اِستغراق اور جامعیت کا اِظہار مقصود ہے، یعنی ہر ہر فرد وجنسِ غیب کا علم جو اللہ ربّ العالمین کا مخصوص وصف ہے اُس پر وہ کسی کو قادر وغالب نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو چاہے معلوم کرلے۔

مقصود اِس کلام سے علمِ غیب کلی کا جس سے جہان کا کوئی ذرّہ مخفی نہ ہو، اُس کی غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اِثبات ہے، لیکن کسی بے وقوف کو اِس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بھی غیب کی چیز کی خبر نہیں تو پھر وہ رسول کیا ہوئے کیونکہ رسول کے پاس تو اللہ تعالیٰ ہزاروں غیب کی خبریں بذریعہ وحی بھیجتے ہیں، اور جس کے پاس اللہ کی وحی نہ آئے وہ نبی ورسول نہیں کہلاسکتا، اِس لئے آگے آیت میں ایک اِستثناء کا ذکر فرمایا:-

[1] روح المعانی ج:۲۱ ص:۳۶۱

علم غیب اور غیبی خبروں میں فرق

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ حاصل استثناء کا اُس سفیہانہ شبہ کا یہ جواب ہے کہ علم غیب کلی کی نفی سے ہر غیب کی نفی مطلقاً مراد نہیں، بلکہ منصب رسالت کے لئے جس قدر علم غیب کی خبروں اور غیب کی چیزوں کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے، وہ اُن کو من جانب اللہ بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے، اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اُس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اُس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اوّل تو لفظِ رسول سے اُس غیب کی نوعیت متعین کردی گئی جس کا علم رسول و نبی کو دِیا جاتا ہے، اور وہ ظاہر ہے علمِ شرائع واَحکام بتمامہ اور غیب کی خبریں بقدرِ ضرورتِ وقت، اِس کے بعد جو علم غیب رسول و نبی کو دِیا جاتا ہے اُس کی نوعیت اگلے جملے سے یوں بھی متعین کردی کہ وہ بذریعہ فرشتوں کے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتے کے گرد دُوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اِس استثناء سے جس علم غیب کا نبی و رسول کے لئے اِثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علم غیب ہے، جس کی ضرورت منصبِ رِسالت کے لئے درپیش ہو۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ اِستثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے، یعنی جس علم غیبِ کلی کی اصل کلام میں غیر اللہ سے نفی کی گئی تھی، مستثنیٰ میں اُس کا اِثبات نہیں بلکہ مخصوص علوم غیبیہ کا اِثبات ہے، جس کو قرآنِ کریم میں جابجا ''اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ [1] (ہود:۴۹)

بعض ناواقف ''غیب'' اور ''انباء الغیب'' میں فرق نہیں سمجھتے، اِس لئے وہ انبیاء اور خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیبِ کلی ثابت کرتے ہیں اور آپ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ہر ذرّہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں، جو کھلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْهُ۔ اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلادے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دُنیا میں کوئی بھی اس دوست کو ''عالم الغیب'' نہیں کہہ سکتا۔ اِسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلادینا اُن کو ''عالم الغیب'' نہیں بنادیتا، خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو اِن دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے، جب اُن کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں، وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں آپ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں، جس کا دُنیا میں کوئی قائل نہیں، اور نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوّت و رِسالت کی نفی ہوجاتی ہے، جس کا کسی مؤمن سے اِمکان نہیں۔

---

[1] ترجمہ: یہ قصہ منجملہ اخبار غیب کے ہے، جس کو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچاتے ہیں۔

آخر سورت میں فرمایا: وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص ہے جس کے علم میں ہر چیز کے اَعداد وشمار ہیں، اُس کو پہاڑوں کے اندر جتنے ذرّے ہیں اُن کا بھی عدد معلوم ہے، ساری دُنیا کے دریاؤں میں جتنے قطرے ہیں اُن کا شمار اُس کے علم میں ہے، ہر بارش کے قطروں اور تمام دُنیا کے درختوں کے پتوں کے اَعداد وشمار کا اُسی کو علم ہے، اس میں پھر علمِ غیب کلی کا ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا واضح کر دیا کہ کسی کو مذکورہ استثناء سے غلط فہمی نہ ہو جائے۔

مسئلہ علمِ غیب کے معنی اور اُس کے اَحکام سورۂ نمل کی آیت: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ [1] (النمل:۶۵) کے تحت میں پوری تحقیق وتفصیل کے ساتھ گزر چکے ہیں، وہاں دیکھ لیا جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمّتْ

بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى سُوْرَةُ الْجِنّ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ

۱۰ رَجب ۱۳۹۱ھ

[1] ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔

سُورَةُ الْمُزَّمِّلِ

آیاتها ۲۰ ۷۳ سُورَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ ۳ رکوعاتها ۲

سورۂ مزمل مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی بیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ② نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ

اے کپڑے میں لپٹنے والے، کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات آدھی رات، یا اُس میں سے کم کردے

قَلِيْلًا ③ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ④ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا

تھوڑا سا، یا زیادہ کر اُس پر اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف، ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات

ثَقِيْلًا ⑤ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ⑥ اِنَّ لَكَ

وزن دار، البتہ اُٹھنا رات کو سخت روندتا ہے اور سیدھی نکلتی ہے بات، البتہ تجھ کو

فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ﴿۷﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿۸﴾

دن میں شغل رہتا ہے لمبا، اور پڑھے جا نام اپنے رَبّ کا اور چھوٹ کر چلا آ اس کی طرف سب سے الگ ہوکر،

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿۹﴾ وَاصْبِرْ عَلَىٰ

مالک مشرق اور مغرب کا، اُس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، سو پکڑ لے اس کو کام بنانے والا، اور سہتا رہ

مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ

جو کچھ کہتے رہیں اور چھوڑ دے اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا، اور چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں کو جو آرام میں رہے ہیں

وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿۱۱﴾ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ﴿۱۲﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ

اور ڈھیل دے اُن کو تھوڑی سی، البتہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور آگ کا ڈھیر، اور کھانا گلے میں اٹکنے والا

وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ

اور عذاب دردناک، جس دن کہ کانپے گی زمین اور پہاڑ اور ہوجائیں گے پہاڑ

كَثِيبًا مَهِيلًا ﴿۱۴﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ

ریت کے تودے پھسلتے، ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول بتلانے والا تمہاری باتوں کا

كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿۱۵﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ

جیسے بھیجا فرعون کے پاس رسول، پھر کہا نہ مانا فرعون نے رسول کا، پھر پکڑی ہم نے اس کو

أَخْذًا وَبِيلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ

وبال کی پکڑ، پھر کیونکر بچوگے اگر منکر ہوگئے اُس دن سے جو کر ڈالے لڑکوں کو

شِيبًا ﴿١٧﴾ السَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهٖ ۚ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿١٨﴾ إِنَّ هٰذِهٖ

بوڑھا، آسمان پھٹ جائے گا اُس دن میں، اس کا وعدہ ہونے والا ہے، یہ تو

تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ

نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے بنالے اپنے ربّ کی طرف راہ۔ بے شک تیرا ربّ جانتا ہے

أَنَّكَ تَقُوْمُ أَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ

کہ تو اُٹھتا ہے نزدیک دوتہائی رات کے اور آدھی رات کے اور تہائی رات کے اور کتنے لوگ

مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۗ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ عَلِمَ أَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ

تیرے ساتھ کے، اور اللہ ماپتا ہے رات کو اور دن کو، اُس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کرسکو گے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۗ عَلِمَ أَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ

سو تم پر معافی بھیج دی، اب پڑھو جتنا تم کو آسان ہو قرآن سے، جانا کہ کتنے ہوں گے تم میں

مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ

بیمار اور کتنے اور لوگ پھریں گے ملک میں ڈھونڈتے اللہ کے فضل کو،

وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ

اور کتنے لوگ لڑتے ہوں گے اللہ کی راہ میں، سو پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو اس میں سے،

وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَأَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۗ

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا،

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا

اور جو کچھ آگے بھیجوگے اپنے واسطے کوئی نیکی، اس کو پاؤگے اللہ کے پاس بہتر

وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾ ع ۱۴/۲

اور ثواب میں زیادہ، اور معافی مانگو اللہ سے، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے چادر میں لپٹنے والے! ﴿١﴾ رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو جایا کرو، ﴿٢﴾ رات کا آدھا حصہ! یا آدھے سے کچھ کم کرلو، ﴿٣﴾ یا اُس سے کچھ زیادہ کرلو، اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو۔ ﴿٤﴾ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ ﴿٥﴾ بے شک رات کے وقت اُٹھنا ہی ایسا عمل ہے جس سے نفس اچھی طرح کچلا جاتا ہے، اور بات بھی بہتر طریقے پر کہی جاتی ہے۔ ﴿٦﴾ دن میں تو تم لمبی مصروفیت میں رواں دواں رہتے ہو۔ ﴿٧﴾ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذِکر کرو، اور سب سے الگ ہوکر پورے کے پورے اُسی کے ہو رہو۔ ﴿٨﴾ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے اُسی کو کارساز بنالو۔ ﴿٩﴾ اور جو باتیں یہ (کافر لوگ) کہتے ہیں، اُن پر صبر سے کام لو، اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے کنارہ کرلو۔ ﴿١٠﴾ اور تمہیں جھٹلانے والے جو عیش و عشرت کے مالک بنے ہوئے ہیں، اُن کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو، اور انہیں تھوڑے دن اور مہلت دو۔ ﴿١١﴾ یقین جانو ہمارے پاس بڑی سخت بیڑیاں ہیں، اور دہکتی ہوئی آگ ہے، ﴿١٢﴾ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے، اور دُکھ دینے والا عذاب ہے، ﴿١٣﴾ اُس دن جب زمین اور پہاڑ لرز اُٹھیں گے، اور سارے پہاڑ ریت کے بکھرے ہوئے تودے بن کر رہ جائیں گے! ﴿١٤﴾ (جھٹلانے والو!) یقین جانو ہم نے تمہارے پاس تم پر گواہ بننے والا ایک رسول اُسی طرح بھیجا ہے، جیسے ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا۔ ﴿١٥﴾ پھر فرعون نے رسول کا کہنا نہیں مانا، تو ہم نے اُسے ایسی پکڑ میں لے لیا جو اُس کے لئے زبردست وبال تھی۔ ﴿١٦﴾ اگر تم بھی نہ مانے تو پھر اُس دن سے کیسے بچوگے جو بچوں کو بوڑھا بنادے گا ﴿١٧﴾ (اور) جس سے آسمان پھٹ پڑے گا۔ اللہ کے وعدے کو تو پورا ہوکر رہنا ہے۔ ﴿١٨﴾ یہ ایک نصیحت کی بات ہے۔ اب جو چاہے، اپنے پروردگار کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرلے۔ ﴿١٩﴾ (اے پیغمبر!) تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ تم دو تہائی رات کے قریب،

اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات (تہجد کی نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہو، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک جماعت (ایسا ہی کرتی ہے)۔ اور رات اور دِن کی ٹھیک ٹھیک مقدار اللہ ہی مقرر فرماتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ تم اُس کا ٹھیک حساب نہیں رکھ سکو گے، اس لئے اُس نے تم پر عنایت فرمادی ہے۔ اب تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو۔ اللہ کو علم ہے کہ تم میں کچھ لوگ بیمار ہوں گے، اور کچھ دُوسرے ایسے ہوں گے جو اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لئے زمین میں سفر کررہے ہوں گے، اور کچھ ایسے جو اللہ کے راستے میں جنگ کررہے ہوں گے۔ لہٰذا تم اُس (قرآن) میں سے اتنا ہی پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو۔ اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو قرض دو، اچھا والا قرض! اور تم اپنے آپ کے لئے جو بھلائی بھی آگے بھیجو گے، اُسے اللہ کے پاس جاکر اس طرح پاؤ گے کہ وہ کہیں بہتر حالت میں اور بڑے زبردست ثواب کی شکل میں موجود ہے۔ اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ (۲۰)

خلاصۂ تفسیر

اے کپڑوں میں لپٹنے والے (وجہ اِس عنوان سے خطاب کرنے کی یہ ہے کہ ابتدائے نبوّت میں قریش نے دارُالندوہ میں جمع ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہئے کہ اس پر سب متفق رہیں۔ کسی نے کہا کہ "کاہن" ہیں، اس کو دُوسروں نے رَدّ کردیا۔ کسی نے "مجنوں" کہا، پھر اس کو بھی سب نے غلط قرار دِیا۔ پھر "ساحر" کہا، پھر بعض نے اِس کو بھی رَدّ کردیا، لیکن پھر یہی کہنے لگے کہ ساحر اِس لئے ہیں کہ دوست کو دوست سے جدا کردیتے ہیں۔ آپ کو یہ خبر پہنچ کر رَنج ہوا، اور رَنج کی حالت میں لپٹ گئے۔ اکثر سوچ اور رَنج میں آدمی اِس طرح کرلیتا ہے، اِس لئے آپ کو خوش کرنے اور لطف کا اِظہار کرنے کے لئے اِس عنوان سے خطاب فرمایا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو "ابوتراب" فرمایا تھا۔[1] غرض آپ کو خطاب ہے کہ اِن باتوں کا رَنج نہ کرو، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف مداومت کے ساتھ اور زیادہ توجہ رکھو اس طرح سے کہ) رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو، مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات (کہ اس میں آرام کرو) یا اُس نصف سے کسی قدر کم کردو، (یعنی نصف سے کم قیام کرو اور نصف سے زیادہ آرام کرو، اور اس نصف سے کم کا مصداق ایک ثلث ہے، بقرینۂ قولہٖ تعالیٰ فیما بعد: وَثُلُثَهٗ) یا نصف سے کچھ بڑھادو (یعنی نصف سے زیادہ قیام کرو اور نصف سے کم آرام کرو، اور اس نصف سے زیادہ کا مصداق قریب دوثلث کے ہے، بقرینۂ قوله تعالىٰ فيما بعد: اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ غرض قیامِ لیل تو اَمرِ وجوبی سے فرض ہوا، مگر مقدارِ وقتِ قیام میں تین صورتوں میں اختیار ہے نصف شب، دوتہائی شب، ایک تہائی شب) اور (اِس

[1] صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب مناقب علي ابن ابي طالب القرشي الهاشمي رضي الله عنه، ج:۱ ص:۵۲۵

قیامِ لیل میں) قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (کہ ایک ایک حرف الگ الگ ہو اور یہی حکم غیرِ صلوٰۃ میں بھی ہے، اور تخصیص محض مقام کی وجہ سے ہے۔ آگے قیام اللیل کے حکم کی علت اور مصلحت کا بیان ہے کہ) ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں (مراد قرآن مجید ہے جو نزول کے وقت بھی آپ کی حالت کو متغیر کر دیتا تھا، جیسا حدیثوں میں ہے کہ ایک بار آپ کی ران زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر رکھی تھی، اُس وقت وحی نازل ہوئی تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پھٹنے لگی، اور جب آپ نزولِ وحی کے وقت ناقہ پر سوار ہوتے تو ناقہ گردن ڈال دیتی اور حرکت نہ کر سکتی، [۱] اور شدّت کے جاڑوں میں آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے۔ پھر علاوہ اِس کے اس کا محفوظ رکھنا، پھر دُوسروں تک پہنچانے میں کلفتیں برداشت کرنا، اِن اِعتبارات سے ثقیل کہا گیا۔ اور مقصد یہ ہے کہ قیامِ لیل کو شاق نہ سمجھنا، ہم تو اِس سے بھی بھاری بھاری کام تم سے لینے والے ہیں، قیام اللیل کا حکم آپ کو اِسی لئے دیا گیا ہے کہ آپ خوگر ہوں ریاضت کے، جس سے اِستعدادِ نفس اکمل واقویٰ ہو، کیونکہ ہم آپ پر قولِ ثقیل نازل کرنے والے ہیں تو اس کے لئے اپنی اِستعداد کا قوی کرنا ضروری ہے۔ آگے قیامِ لیل کی دُوسری مصلحت ہے کہ) بے شک رات کا اُٹھنا خوب مؤثر ہے (نفس کے) کچلنے میں اور (دُعا ہو یا قراءت ہو، ظاہراً و باطناً) بات خوب ٹھیک نکلتی ہے (ظاہراً تو اِس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے، الفاظ دُعا و قراءت کے خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں، اور باطناً اِس طرح کہ جی خوب لگتا ہے، اور موافقتِ دل و زبان کا یہی مطلب ہے، اور اس کا علت ہونا ظاہر ہے۔ آگے ایک تیسری علت ہے جس میں تخصیص شب کی حکمت کا بیان ہے، وہ یہ کہ) بے شک تم کو دِن میں بہت کام رہتا ہے (دُنیوی بھی جیسے تدبیر مہماتِ خانہ داری، اور دِینی بھی جیسے تبلیغ، اِس لئے اِن کاموں کے لئے رات تجویز کی گئی) اور (علاوہ قیامِ لیل کے جس کا اُوپر ذِکر ہوا دُوسرے اوقات میں بھی) اپنے رَبّ کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے (تعلق قطع) کر کے اُسی کی طرف متوجہ رہو (یعنی ذِکر و تبتل یہ ہر وقت کا فرض ہے اور تعلق قطع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا تعلق مخلوق کے سب تعلقات پر غالب رہے، آگے توحید کے ساتھ اس کی تاکید اور تصریح ہے یعنی) وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں، تو اُسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لئے قرار دیئے رہو، اور یہ لوگ جو جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ (الگ ہونا یہ کہ کوئی تعلق نہ رکھو اور خوبصورتی سے یہ کہ ان کی شکایت و اِنتقام کی فکر میں مت پڑو) اور (آگے ان کے عذاب کی خبر دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے) مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو ناز و نعمت میں رہنے والوں کو (حالتِ موجودہ پر) چھوڑ دو (یعنی رہنے دو، ومرّ تفسیرہ فی آیۃ: فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ [۲] (القلم: ۴۴)) اور ان لوگوں کو تھوڑے دِنوں اور مہلت دے دو (یہ کنایہ ہے

---

[۱] المستدرك للحاكم، كتاب التفسير، تفسير سورة المزّمّل ج: ۲ ص: ۵۴۹

[۲] ترجمہ: تو مجھ کو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں ان کو رہنے دیجئے۔

صبر و انتظار سے یعنی کچھ دن اور صبر کر لیجئے عنقریب ان کو سزا ہونے والی ہے، کیونکہ) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے، اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے (وھذا کقولہ: یَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ [1] (ابراہیم:۱۷)) اور دردناک عذاب ہے (پس ان لوگوں کو اِن چیزوں سے سزا دی جائے گی اور یہ سزا اُس روز ہوگی) جس روز زمین و پہاڑ ہلنے لگیں اور پہاڑ (ریزہ ریزہ ہوکر) ریگ رواں ہوجائیں گے (پھر اُڑتے پھریں گے۔ آگے مکذبین مذکورین کو بطور التفات کے خطاب ہے جس میں اِثباتِ رسالت و تحقیقِ وعید بھی ہے، یعنی) بے شک ہم نے تمہارے پاس ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر (قیامت کے روز) گواہی دیں گے (کہ ان لوگوں نے تبلیغ کے بعد کیا برتاؤ کیا) جیسا ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا، پھر فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اُس کو سخت پکڑنا پکڑا، سو اگر تم (بھی بعثتِ رسول کے بعد نافرمانی اور) کفر کرو گے تو (اِسی طرح ایک روز تم کو بھی مصیبت بھگتنا پڑے گی، چنانچہ وہ مصیبت کا دن آنے والا ہے سو تم) اُس دن (کی مصیبت) سے کیسے بچو گے جو (اپنی شدّت اور طول کی وجہ سے) بچوں کو بوڑھا کردے گا، جس میں آسمان پھٹ جائے گا، بے شک اُس کا وعدہ ضرور ہوکر رہے گا (یہ بھی احتمال نہیں ہے کہ وہ وقت ٹل جائے) یہ (تمام مضمون) ایک (بلیغ) نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف رستہ اختیار کرے (یعنی اس تک پہنچنے کے لئے دِین کا رستہ قبول کرے، آگے اس قیامِ لیل کی فرضیت کا نسخ ہے جو شروع سورت میں مذکور تھا، یعنی) آپ کے ربّ کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور رات اور دِن کا پورا اندازہ اللہ ہی کرسکتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ تم اس (مقدارِ وقت) کو ضبط نہیں کرسکتے (اور اِس وجہ سے تم کو سخت مشقت لاحق ہوتی ہے کیونکہ انداز سے تخمینہ کرنے میں تو شبہ رہتا ہے کمی کا، اور انداز سے زیادہ کرنے میں تمام رات کے قریب صَرف ہوجاتا ہے تاکہ وقت مقدّر یقیناً پورا ہوجائے اور ان دونوں امر میں مشقت شدید ہے، رُوحانی یا جسمانی) تو (ان وجوہ سے) اس نے تمہارے حال پر عنایت کی (اور اس سے پہلے حکم کو منسوخ فرمادیا) سو (اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو (مراد اس قرآن پڑھنے سے تہجد پڑھنا ہے کہ اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ امر اِستحباب کے لئے ہے، مطلب یہ کہ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، اب جس قدر وقت تک آسان ہو بطور اِستحباب کے اگر چاہو پڑھ لیا کرو، اور منسوخ ہونے کی اصل علت مشقت ہے جس پر عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کا قرینہ ہے، اور اس کے قبل کا مضمون اس کی تمہید ہے۔ آگے اسی نسخ کی دُوسری علت کا بیان ہے کہ) اس کو (یہ بھی) معلوم ہے کہ بعض آدمی تم میں بیمار ہوں گے اور بعض تلاشِ معاش کے لئے ملک میں سفر کریں گے، اور بعض اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (اس لئے بھی اس حکم کو منسوخ کردیا کیونکہ ان حالتوں میں پابندی تہجد اور اس کے اوقات کی مشکل تھی) سو (اس

[1] ترجمہ: جس کو گھونٹ گھونٹ کرکے پیوے گا اور گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

لئے بھی تم کو اجازت ہے کہ اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو، اور (گو تہجد منسوخ ہو گیا، مگر یہ اَحکام اب بھی باقی ہیں، یعنی یہ کہ) نماز (فرض) کی پابندی رکھو، اور زکوٰۃ دیتے رہو، (قد مرّ تفسیرہ فی اوّل المؤمنین) اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اِخلاص سے) قرض دو، اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے (ذخیرہ آخرت کا بنا کر) بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے (یعنی دُنیوی اغراض میں خرچ کرنے سے جو عوض اور نفع مرتب ہوتا ہے اس سے بہتر اور اعظم نفقات خیر پر ملے گا) اور اللہ سے گناہ معاف کراتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (اِستغفار بھی ان ہی اَحکام باقیہ میں ہے)۔

معارف ومسائل

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ مُزَّمِّل کے لفظی معنی اپنے اُوپر کپڑے لپیٹنے والا۔ تقریباً اسی کا ہم معنی لفظ مُدَّثِّر ہے جو اگلی سورت میں آرہا ہے، ان دونوں سورتوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک وقتی حالت اور مخصوص صفت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدّتِ خوف وفزع کے سبب سخت سردی محسوس کر رہے تھے، اس لئے اپنے اُوپر کپڑے ڈالنے کے لئے فرمایا، یہ کپڑے ڈال دیئے گئے تو آپ اُن میں لپٹ گئے۔ واقعہ اس کا صحیح بخاری ومسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فترتِ وحی کے زمانے کا ذِکر فرما رہے تھے، فترت کے لفظی معنی سست یا بند ہو جانے کے ہیں، واقعہ اس کا یہ پیش آیا تھا کہ سب سے پہلے غارِ حرا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرائیل امین علیہ السلام نازل ہوئے اور سورۂ اِقْرَاْ کی اِبتدائی آیتیں آپ کو سنائیں۔ یہ فرشتے کا نزول اور وحی کی شدّت پہلے پہل تھی، جس کا اثر طبعی طور پر ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، سخت سردی محسوس کر رہے تھے، اس لئے فرمایا ''زَمِّلُوْنِیْ، زَمِّلُوْنِیْ'' یعنی مجھے ڈھانپو، مجھے ڈھانپو۔ اس کا مفصل اور طویل واقعہ صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں مذکور ہے۔ اس کے بعد کچھ دِنوں تک یہ سلسلہ وحی کا بند رہا، اس زمانے کو جس میں سلسلۂ وحی بند رہا، زمانۂ فترۃ الوحی کہا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانۂ فترت کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک روز میں چل رہا تھا کہ اچانک میں نے آواز سنی تو نظر آسمان کی طرف اُٹھائی، دیکھتا کیا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان وزمین کے درمیان ایک معلق کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، مجھے ان کو اس ہیئت میں دیکھ کر پھر وہی رُعب وہیبت کی کیفیت طاری ہوگئی جو پہلی ملاقات کے وقت ہو چکی تھی، میں واپس اپنے گھر چلا آیا اور گھر والوں سے کہا کہ مجھے ڈھانپ دو، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ اس حدیث میں آیت یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ کے

نزول کا ذکر ہے،[۱] ہوسکتا ہے کہ اسی حالت کو بیان کرنے کے لئے يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① کا خطاب بھی آیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ "مُزَّمِّل" کے لقب کا واقعہ الگ وہ ہو جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے، اس عنوان سے خطاب کرنے میں ایک خاص لطف وعنایت کی طرف اشارہ ہے، جیسے محبت وشفقت میں کسی کو اُس کی وقتی حالت کے عنوان سے محض تلطّف کے لئے خطاب کیا جاتا ہے۔ (روح المعانی)[۲] اس عنوانِ خاص سے خطاب فرما کر آپ کو نمازِ تہجد کا حکم اور اس کی کچھ تفصیل بتلائی ہے۔

نمازِ تہجد کے احکام اور ان میں تبدیلی

لفظ "مُزَّمِّل" اور "مُدَّثِّر" خود اس کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ آیات بالکل شروع اسلام اور نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی ہیں، جب کہ اس وقت پانچ نمازیں اُمت پر فرض نہیں ہوئی تھیں، کیونکہ پانچ نمازوں کی فرضیت تو شبِ معراج میں ہوئی ہے۔

اِمام بغوی رحمہ اللہ نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہا کی احادیث کی بنا پر یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کی رُو سے قیام اللیل یعنی رات کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اُمت پر فرض تھی اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب پانچ نمازیں فرض نہیں تھیں۔

اس آیت میں "قیام اللیل" یعنی تہجد کی نماز کو صرف فرض ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس میں کم ازکم ایک چوتھائی رات سے مشغول رہنا بھی فرض قرار دِیا گیا ہے، کیونکہ ان آیات میں اصل حکم یہ تھا کہ تمام رات باستثنائے قلیل نماز میں مشغول رہیں، اور اِستثنائے قلیل کا بیان اور تفصیل آگے آتی ہے۔

اِمام بغوی رحمہ اللہ روایاتِ حدیث کی بنا پر فرماتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رات کے اکثر حصے کو نمازِ تہجد میں صَرف فرماتے تھے، یہاں تک کہ اُن کے قدم وَرَم کر گئے اور یہ حکم خاصا بھاری معلوم ہوا۔ سال بھر کے بعد اسی سورت کا آخری حصہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ نازل ہوا، جس نے اس طویل قیام کی پابندی منسوخ کردی،[۳] اور یہ اِختیار دے دیا کہ جتنی دیر کسی کے لئے آسان ہوسکے اتنا وقت خرچ کرنا نمازِ تہجد میں کافی ہے۔ یہ

---

[۱] صحيح البخاري، باب كيف كان بدء الوحي ...إلخ، ج:۱ ص:۳

[۲] تفسير روح المعاني ج:۲۱ ص:۳۶۹

[۳] تفسير البغوي تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۲۵۰

مضمون ابوداؤد و نسائی میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے،[۱] اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب پانچ نمازوں کی فرضیت شبِ معراج میں نازل ہوئی تو نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، البتہ سنت پھر بھی رہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اُس پر مداومت فرمائی، اسی طرح اکثر صحابۂ کرام بڑی پابندی سے نمازِ تہجد ادا کرتے تھے۔ (مظہری)[۲] اب الفاظِ آیت کی تفسیر دیکھئے، ارشاد فرمایا:

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ الَّيْلَ پر الف لام داخل ہونے سے اس نے پوری رات کے معنی دیئے، تو مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات قیام اللیل میں مشغول رہیں بجز قلیل کے، مگر چونکہ یہ لفظ قلیل مبہم تھا اس لئے آگے اس کی تشریح اس طرح فرمادی نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ یعنی اب آپ نصف رات قیام فرمائیں یا نصف سے کچھ کم کردیں، یا نصرف سے کچھ بڑھادیں۔ یہ بیان اِلَّا قَلِيْلًا کے اِستثناء کا ہے، اس لئے اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نصف تو قلیل نہیں کہلاتا، جواب یہ ہے کہ رات کا ابتدائی حصہ تو نمازِ مغرب، پھر عشاء وغیرہ میں گزر رہی جاتا ہے، اب نصف سے مراد باقی ماندہ کا نصف ہوگا، وہ مجموعہ رات کے اِعتبار سے قلیل ہے، اور اس آیت میں چونکہ نصف سے کم کرنے کی بھی اجازت ہے، نصف سے زائد کرنے کی بھی، اس لئے مجموعی طور پر اس کا یہ حاصل ہوا کہ کم از کم چوتھائی رات سے کچھ زیادہ قیام اللیل میں مشغول رہنا فرض ہوگا۔

ترتیلِ قرآن کا مطلب

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ ترتیل کے لفظی معنی کلمے کو سہولت اور اِستقامت کے ساتھ منہ سے نکالنے کے ہیں۔ (مفردات امام راغب رحمہ اللہ)[۳] مطلب آیت کا یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن میں جلدی نہ کریں، بلکہ ترتیل و تسہیل کے ساتھ ادا کریں، اور ساتھ ہی اس کے معانی میں تدبر و غور کریں۔ (قرطبی)[۴] وَرَتِّلْ کا عطف قُمِ الَّيْلَ پر ہے، اور اس میں اس کا بیان ہے کہ رات کے قیام میں کیا کرنا ہے اس سے معلوم ہوا کہ نمازِ تہجد اگرچہ قراءت و تسبیح، رُکوع و سجود سب ہی اجزائے نماز پر مشتمل ہے، مگر اس میں اصل مقصود قراءتِ قرآنی ہے، اسی لئے احادیثِ صحیحہ اس پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز بہت طویل ادا فرماتے تھے، یہی عادت صحابہ و تابعین میں معروف رہی ہے۔

---

[۱] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب فی نسخ قیام اللیل والتیسیر فیہ، ج:۱ ص:۱۸۵، وسنن النسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النهار، باب قیام اللیل، ج:۱ ص:۲۴۸

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۰۳، ۱۰۴

[۳] مفردات القرآن للراغب الاصفهانی ج:۱ ص:۱۸۷

[۴] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۹ ص:۳۷

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کا صرف پڑھنا مطلوب نہیں، بلکہ ترتیل مطلوب ہے، جس میں ہر ہر کلمہ صاف صاف اور صحیح ادا ہو۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ترتیل فرماتے تھے، حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے بعض لوگوں نے رات کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوتِ قرآن کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے نقل کر کے بتلایا جس میں ایک ایک حرف واضح تھا۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، از مظہری) [1]

مسئلہ:- ترتیل میں تحسینِ صوت یعنی بقدرِ اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی قراءت وتلاوت کو ایسا نہیں سنتا جیسا اُس نبی کی تلاوت کو سنتا ہے جو خوش آوازی کے ساتھ جہراً تلاوت کرے۔ (مظہری) [2]

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حسنِ صوت کے ساتھ تلاوت کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''لَقَدْ رَتَّلَ الْقُرْآنَ فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ'' یعنی اس شخص نے قرآن کی ترتیل کی ہے، میرے ماں باپ اس پر قربان ہوں۔ (قرطبی) [3]

اور اَصل ترتیل وہی ہے کہ حروف والفاظ کی ادائیگی بھی صحیح اور صاف ہو اور پڑھنے والا اس کے معانی پر غور کر کے اُس سے متأثر بھی ہو رہا ہو، جیسا کہ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک شخص پر ہوا جو قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا، آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ بس یہی ترتیل ہے (جو یہ شخص کر رہا ہے)۔ (از قرطبی) [4]

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ ثقیل کے معنی بھاری کے ہیں، اور قولِ ثقیل سے مراد قرآن ہے، کیونکہ اس کے بیان کردہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کے حدود کی دائمی پابندی طبعی طور پر بھاری ہے، بجز اس کے کہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ اس کو آسان بنادے، اور قرآن کو قولِ ثقیل اس وجہ سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص وزن اور شدّت محسوس فرماتے تھے، جس سے سخت سردی کے زمانے میں بھی آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی، اور اگر اس وقت کسی اُونٹنی پر سوار ہیں تو بوجھ سے اپنی گردن ڈال دیتی تھی، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ اس پر شاہد ہیں۔ (صحیح بخاری وغیرہ) [5]

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۰۴، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب کیف کان قراءة النبی صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۱۲۰، وسنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب کیف یستحب الترتیل فی القراءة ج:۱ ص:۲۰۷، وسنن النسائی، کتاب الإفتتاح، باب تزیین القرآن بالصوت ج:۱ ص:۱۵۷

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۰۴ و۱۰۵، وصحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب من لم یتغن بالقرآن ج:۲ ص:۷۵۱

[3] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۹ ص:۳۸

[4] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۳۷و۳۸، ومصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث:۳۶۶۹۲، باب ما قالوا فی البکاء من خشیة الله۔

[5] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی ...إلخ، ج:۱ ص:۲

اس آیت میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ نمازِ تہجد کا حکم اس لئے دیا گیا کہ انسان مشقت اُٹھانے کا خوگر بنے، یہ رات کو نیند کے غلبہ اور نفس کی راحت کے خلاف ایک جہاد ہے، اس کے ذریعے ثقیل بوجھل اَحکام کی برداشت آسان ہوجائے گی جو قرآن میں نازل ہونے والے ہیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ لفظ نَاشِئَةَ بوزنِ عافیۃ مصدر ہے جس کے معنی ہیں رات کی نماز کے لئے کھڑا ہونا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سونے کے بعد رات کی نماز کے لئے اُٹھنا نَاشِئَةَ الَّيْلِ ہے، اس معنی کے لحاظ سے لفظ نَاشِئَةَ الَّيْلِ بمعنی تہجد ہوگیا، کیونکہ تہجد کے لفظی معنی بھی رات میں سو کر اُٹھنے کے بعد نماز پڑھنے کے ہیں۔ ابنِ کیسان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آخرِ رات کے قیام کو نَاشِئَةَ الَّيْلِ کہا جاتا ہے۔ ابنِ زید رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رات کے جس حصے میں بھی کوئی نماز پڑھی جائے وہ نَاشِئَةَ الَّيْلِ میں داخل ہے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عشاء کی نماز کے بعد ہر نماز نَاشِئَةَ الَّيْلِ میں داخل ہے۔ اِبنِ ابی مُلَیْکہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابنِ عباس اور ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما سے نَاشِئَةَ الَّيْلِ کے معنی پوچھے تو انہوں نے فرمایا ''اَللَّيْلُ كُلُّهَا نَاشِئَةٌ'' یعنی رات کے ہر حصے کی نماز نَاشِئَةَ الَّيْلِ میں داخل ہے۔ (مظہری) [۱]

ان مجموعہ اَقوال میں کوئی تضاد نہیں، حقیقت یہ ہے کہ قیام اللیل اور نَاشِئَةَ الَّيْلِ کا مفہوم اصل میں عام ہے، رات کے کسی بھی حصے میں جو نماز پڑھی جائے اس پر ان دونوں لفظوں کا اِطلاق ہوسکتا ہے، خصوصاً جو نماز عشاء کے بعد ہو جیسا کہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جمہور صحابہ و تابعین اور صلحائے اُمت کا ہمیشہ یہ عمل رہا ہے کہ اس نماز کو سو کر اُٹھنے کے بعد آخرِ شب میں ادا کرتے تھے، اس لئے وہ افضل و اعلیٰ اور موجبِ برکات زیادہ ہے، اور نفسِ سنت قیام اللیل اور نَاشِئَةَ الَّيْلِ کی عشاء کی نماز کے بعد ہر نماز نفل سے ادا ہوجاتی ہے۔

هِيَ اَشَدُّ وَطْاً، وَطْاً میں دو قراءتیں ہیں، مشہور قراءۃ بفتح الواو وسکون الطاء، بروزن ضَرْبٌ ہے، جس کے معنی روندنے اور کچلنے کے آتے ہیں، اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رات کی نماز نفس کشی اور نفس کو کچلنے میں بہت معین ہے، یعنی نفس کو قابو رکھنے اور ناجائز خواہشات پر اَڑنے سے روکنے میں نمازِ تہجد سے بڑی مدد ملتی ہے، خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی کو اِختیار کیا گیا ہے۔ دُوسری قراءۃ میں وِطَآءً بکسر الواوُ وبالألف المدودۃ بروزن کِتَاب ہے، اس صورت میں یہ مواطاۃ بمعنی موافقت کا مصدر ہے، قرآنِ کریم کی آیت: لِيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللهُ [۲] (التوبۃ: ۳۷) میں اسی

---

[۱] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۱۰۷ و ۱۰۸

[۲] ترجمہ: تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں اُن کی گنتی پوری کرلیں۔

موافقت کے معنی ہیں، ائمہ تفسیر میں سے حضرت ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہما سے اس کے یہی معنی منقول ہیں، ابن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ رات کے وقت نماز کے لئے اُٹھنا قلب، نگاہ، کان اور زبان سب میں باہمی موافقت پیدا کرنے میں اشد ہے، یعنی بہت زیادہ مؤثر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اَشَدُّ وَطْاً کے معنی یہ ہیں کہ کان اور قلب میں اس وقت زیادہ موافقت ہوتی ہے کہ رات کا وقت عموماً کاموں سے فراغت اور شور وشغب سے نجات اور سکون کا وقت ہوتا ہے، اس وقت جو الفاظ زبان سے نکلیں گے اپنے کان بھی ان کو سنیں گے اور دل بھی حاضر ہوگا۔

وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ۝ اور اَقْوَمُ کے معنی زیادہ مستقیم ودُرست اور زیادہ ثابت کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ رات کے وقت میں تلاوتِ قرآن زیادہ دُرست اور جماؤ اور ثبات کے ساتھ ہوسکتی ہے، کیونکہ مختلف قسم کی آوازوں اور شور وشغب سے قلب وذہن مشوش نہیں ہوتا۔

خلاصہ اس آیت کا بھی حکم قیام اللیل کی حکمت بیان کرنا ہے، اس سے پہلی آیت میں جو اس کی حکمت ارشاد فرمائی گئی تھی: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ ، یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی کے ساتھ خاص تھی کہ قولِ ثقیل یعنی قرآن کے نزول کا تعلق آپ ہی کی ذات سے ہے، اس دُوسری آیت میں جو حکمت بیان ہوئی وہ سب اُمت کے لئے عام ہے کہ رات کی نماز میں دو وصف ہیں، اوّل قلب وزبان میں موافقت، دُوسرے تلاوتِ قرآن میں بوجہ سکون کے آسانی۔

اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ۝ لفظ سَبْحٌ کے لفظی معنی جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں، اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سَبْحٌ اور سِبَاحَتٌ کہا جاتا ہے کہ پانی میں بغیر کسی رُکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیراکی کے ساتھ آسان ہے۔ یہاں مراد سَبْحٌ سے دن بھر کے مشاغل ہیں جن میں تعلیم وتبلیغ اور اِصلاحِ خلق کے لئے یا اپنی معاشی مصالح کے لئے چلنا پھرنا سب داخل ہیں۔

اس آیت میں قیام اللیل کے حکم کی تیسری حکمت ومصلحت کا بیان ہے، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری اُمت کے لئے عام ہے، وہ یہ کہ دن میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دُوسرے سبھی حضرات کو بہت سے مشاغل چلنے پھرنے کے رہتے ہیں، فراغ بالی سے عبادت میں توجہ مشکل ہوتی ہے، رات کا وقت اس کام کے لئے رہنا چاہئے کہ بقدرِ ضرورت نیند اور آرام بھی ہوجائے، اور قیام اللیل کی عبادت بھی۔

فائدہ

حضراتِ فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء ومشائخ جو تعلیم وتربیت اور اِصلاحِ خلق

کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں اُن کو بھی چاہئے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں، رات کا وقت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے، جیسا کہ علمائے سلف کا تعامل اس پر شاہد ہے، کوئی وقتی ضرورت دینی، تعلیمی، تبلیغی، کبھی اتفاقارات کو بھی اس میں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ بقدرِ ضرورت مستثنیٰ ہے، اس کی شہادت بھی بہت سے حضراتِ علماء وفقہاء رحمہم اللہ کے عمل سے ثابت ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿٨﴾ تَبَتَّلْ کے لفظی معنی مخلوق سے منقطع ہو کر خالق کی عبادت میں لگ جانے کے ہیں۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کا عطف قُمِ الَّيْلَ پر ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام اللیل یعنی رات کی نماز کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کے ضمن میں دن کی خاص خاص عبادتوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا، کما في قوله: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ﴿٧﴾ اس آیت میں ایک ایسی عبادت کا حکم ہے جو رات یا دِن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر وقت اور ہر حال میں جاری رہتی ہے، وہ ہے "ذِکر اللہ" اور مراد ذِکر اللہ کے حکم سے اُس پر مداومت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تو تصوّر ہی نہیں ہوسکتا کہ آپ بالکل ذِکر نہ کرتے ہوں، اس لئے اس حکم کا منشا دوامِ ذِکر ہی ہوسکتا ہے۔ (مظہری) [1] اور مراد آیت کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ذِکر اللہ کو شب و روز ہمہ وقت جاری رکھیں، اس میں نہ کبھی ذہول ہونا چاہئے نہ سستی۔ اور یہ مراد اُسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ ذِکر اللہ سے مراد عام لیا جائے، خواہ زبان سے ہو، یا قلب سے، یا اعضاء و جوارح کو اللہ تعالیٰ کے اَحکام میں مشغول رکھنے سے۔ اور ایک حدیث میں جو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ آیا ہے کہ: "كَانَ يَذْكُرُ اللهَ عَلَى كُلِّ حِيْنٍ" [2] یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذِکر فرماتے تھے۔ یہ بھی اس عام معنی کی رُو سے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ بیت الخلاء وغیرہ میں آپ کا ذِکرِ لسانی نہ کرنا روایاتِ حدیث سے ثابت ہے، مگر ذِکرِ قلبی ہر وقت جاری رہ سکتا ہے، اور ذِکرِ قلبی کی دو صورتیں ہیں، ایک الفاظِ متخیلہ کے ذریعے ذِکر کرنا، دُوسرے اللہ تعالیٰ کی صفات و کمالات میں غور و فکر کرنا، کما افاده شيخي التهانوي قدّس سِرّهٗ۔

دُوسرا حکم اس آیت میں یہ دیا گیا کہ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿٨﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے قطع نظر کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اُس کی عبادت میں لگ جائیں، اس کے عام مفہوم میں اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرنا بلکہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرنا بھی داخل ہے، اور یہ بھی کہ اپنے تمام اعمال و افعال اور حرکات و سکنات میں نظر اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر رہے، کسی مخلوق کو نفع و ضرر کا مالک یا حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھیں۔ حضرت ابنِ زید

---

[1] تفسير المظهري ج:١٠ ص:١٠٩

[2] سنن ابن ماجة، كتاب الطهارة، باب ذكر الله عزَّ وجلَّ على الخلاء ج:١ ص:٢٦

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وَتَبَتَّلْ کے معنی یہ ہیں کہ تمام دُنیا و مافیہا کو چھوڑیں اور صرف اُس چیز کی طرف متوجہ رہیں جو اللہ کے پاس ہے۔ (مظہری) [۱] لیکن جس تَبَتُّل اور مخلوق سے قطع تعلق کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے، وہ اس ترکِ تعلقات اور ترکِ دُنیا سے بالکل مختلف ہے جس کو قرآن میں ''رَہبانیت'' کہا ہے، اور اس کی مذمت کی طرف اشارہ کیا ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا [۲] (الحدید:۲۷) اور جس کے متعلق حدیث میں ہے: ''لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ'' [۳] کیونکہ رَہبانیت اِصطلاحِ شرع میں اُس ترکِ دُنیا اور ترکِ تعلقات کا نام ہے جس میں تمام لذائذ اور حلال طیب اشیاء کو بہ نیتِ عبادت چھوڑ دیا جائے، یعنی یہ اعتقاد ہو کہ ان حلال چیزوں کے چھوڑے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی۔ یا عملاً ترکِ تعلقات اس طرح کرے کہ لوگوں کے حقوقِ واجبہ کی رعایت نہ کرے، اُن میں خلل آئے اور یہاں جس تَبَتُّل اور ترکِ تعلق کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق پر کسی دُوسری مخلوق کا تعلق غالب نہ آجائے، خواہ اِعتقاداً یا عملاً، اور ایسا ترکِ تعلق دُنیوی تمام معاملات از دواج و نکاح اور تعلقاتِ رشتہ داری وغیرہ کے منافی نہیں، بلکہ ان سب کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت خصوصاً سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی اور شمائل اس پر شاہد ہیں۔ یہاں جس مفہوم کو لفظ تَبَتُّل سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کا دُوسرا عنوان سلف صالحین کی زبان میں اِخلاص ہے۔ (مظہری) [۴]

فائدہ مہمہ

ذِکر اللہ کی کثرت اور تعلقاتِ دُنیا کے ترک کے معاملے میں صوفیائے کرام رحمہم اللہ سلفاً وخلفاً سب سے آگے رہے ہیں، اُنہوں نے فرمایا کہ ہم جس مسافت کو طے کرنے اور راستہ قطع کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں، درحقیقت اُس کے دو قدم ہیں، پہلا قدم مخلوق سے اِنقطاع ہے، اور دُوسرا قدم وصول الی اللہ ہے، اور یہ دونوں ایک دُوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، آیتِ مذکورہ میں اُن ہی دو قدموں کو دو جملوں میں عطف کرکے بیان فرمایا گیا ہے: ۱-وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ۲-وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا۔

یہاں ذِکر اللہ سے مراد اُس پر ایسی مداومت ہے جس میں کبھی قصور وفتور نہ ہو، اور کسی وقت اُس سے ذہول نہ ہو، یہی وہ مقام ہے جس کو صوفیائے کرام کی اِصطلاح میں وصول اِلی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح پہلے جملے میں آخری قدم کا ذِکر

---

۱ تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۱۰

۲ ترجمہ: اور انہوں نے رہبانیت کو خود اِیجاد کرلیا۔

۳ شرح السُّنَّة للبغویؒ، کتاب الصلاۃ، باب فضل القعود فی المسجد لإنتظار الصلاۃ ج:۲ ص:۳۷۱، وکشف الخفاء رقم الحدیث:۳۱۵۴

۴ تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۱۰ و ۱۱۱

فرمایا، اور دُوسرے جملے میں پہلے قدم کا، یہ ترتیب شاید اس لئے بدل گئی کہ اگرچہ عمل میں تبتل یعنی قطع تعلقات (بالمعنی المذکور) مقدم ہے اور وصول اِلی اللہ اُس کے بعد اُس پر مرتب ہوتا ہے، مگر چونکہ مقصد سالک کا یہ دُوسرا ہی قدم ہے، اور یہی درحقیقت مقصود المقاصد ہے، اس کی اہمیت و افضلیت بتلانے کے لئے ترتیب طبعی و قوعی کو بدل کر ذِکر اللہ کو مقدم بیان فرمایا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اِن ہی دو قدموں کو خوب بیان فرمایا ہے ۔

تعلق حجاب است و بے حاصلی چو پیوندہا بگسلی واصلی [۱]

ذِکرِ اسمِ ذات یعنی ''اللہ، اللہ'' کا تکرار بھی مامور بہ ذِکر و عبادت ہے

اس آیت میں ذِکر اللہ کے حکم کو لفظ اسم کے ساتھ مقید کر کے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا، وَاذْكُرْ رَبَّكَ نہیں فرمایا، اس میں اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسمِ ربّ یعنی ''اللہ، اللہ'' کا تکرار بھی مطلوب و مامور بہ ہے۔ (مظہری) [۲] بعض علماء نے جو صرف اِسمِ ذات ''اللہ، اللہ'' کے تکرار کو بدعت کہہ دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَكِيْل لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی کام سپرد کیا جائے، فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سب کاروبار، معاملات اور حالات کو اللہ کے سپرد کر دو، اسی کا نام اِصطلاح میں ''توکُّل'' ہے۔ اس سورت میں جو اَحکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں، یہ ان میں پانچواں حکم ہے۔ اِمام یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شروع سورت سے اس آیت تک مقاماتِ سلوک کی طرف اشارہ ہے، یعنی ۱- رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے خلوَت۔ ۲- قرآنِ کریم میں اِشتغال۔ ۳- ذِکر اللہ پر دوام۔ ۴- ماسوی اللہ سے اعراض و ترکِ تعلق۔ ۵- اللہ تعالیٰ پر توکل۔ توکل کے آخری حکم سے پہلے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی صفت رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ بیان کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو ذاتِ پاک مشرق و مغرب یعنی سارے جہان کی پالنے والی اور ان کی تمام ضروریات ابتدا سے اِنتہا تک پورا کرنے کی متکفل ہے، توکل اور بھروسہ کرنے کے قابل صرف وہی ذات ہو سکتی ہے، اور اس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا، جیسا کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطّلاق: ۳) یعنی جو شخص اللہ پر توکل (بھروسہ) کرتا ہے اللہ اس کے (سب مہمات و مشکلات کے لئے) کافی ہو جاتا ہے۔

[۱] ترجمہ: محبت میں تعلق ایک پردہ ہے اور بڑی نامرادی ہے اگر تو ان تعلقات کو توڑے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۱۱

توکل کے معنیٰ شرعی

اللہ پر توکل اور بھروسے کے یہ معنی نہیں کہ کسبِ معاش اور دفعِ بلا کے جو اَسباب وآلات قدرتِ حق نے آپ کو عطا فرمائے ہیں اُن کو معطل کر کے اللہ پر بھروسہ کرو، بلکہ حقیقت توکل کی یہ ہے کہ اپنے مقاصد کے لئے اللہ کی دی ہوئی قوت وتوانائی اور جو اَسباب میسر ہیں اُن سب کو پورا اِستعمال کرو، مگر اَسبابِ مادّیہ میں غلو اور اِنہماک زیادہ نہ کرو، اَعمالِ اِختیاریہ کو کر لینے کے بعد نتیجے کو اللہ کے سپرد کر کے بےفکر ہو جاؤ۔

توکل کا یہ مفہوم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اِمام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السُّنَّة'' میں اور بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا، اَلَا فَاتَّقُوا اللهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ۔'' (مظہری) [1] یعنی رُوح القدس (جبرائیل امین) نے میرے دِل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنے مقدّر میں لکھا ہوا اللہ کا رِزق پورا پورا حاصل نہیں کر لے گا، اس لئے تم خدا سے ڈرو اور اپنے مقاصد کی طلب میں اِختصار سے کام لو، زیادہ منہمک نہ ہو کہ قلب کی توجہ ساری اِن ہی مادّی اسباب وآلات میں محصور ہو کر رہ جائے، اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ اور ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ترکِ دُنیا اس کا نام نہیں کہ تم اپنے اُوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر لو، یا جو مال تمہارے پاس ہو اُسے خواہ مخواہ اُڑا دو، بلکہ ترکِ دُنیا اس کا نام ہے کہ تمہارا اِعتماد اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اُس پر زیادہ ہو بہ نسبت اُس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ (مظہری) [2]

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ بقول اِمام کرخی رحمہ اللہ یہ چھٹا حکم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دِیا گیا ہے، یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبرِ جمیل، یہ مقاماتِ سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دُشمنوں کی جفا وایذا پر صبر کیا جائے، یعنی یہ حضرات جن لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی میں اپنی ساری قوّت وتوانائی اور ساری عمر خرچ کرتے ہیں، ان ہی کی طرف سے اُس کی جزا میں گالیاں، ایذائیں، طرح طرح کے جور وستم ان کے مقابلے میں آتے ہیں، اُن پر صبرِ جمیل کرنا یعنی اِنتقام کا ارادہ بھی نہ کرنا، یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جو اِصطلاحِ صوفیہ میں فنائے کامل کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ هَجْر بفتح الهاء کے لفظی معنی کسی چیز کو رَنج وملال وبیزاری کے ساتھ چھوڑنے کے

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۱۲، ومسند البزار، رقم الحديث:۲۹۱۴، وشرح السُّنَّة، رقم الحديث:۴۱۱۲، ومجمع الزوائد، كتاب البيوع، باب الإقتصاد فی طلب الرزق والاجمال فيه، رقم الحديث:۶۲۸۷

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۱۲

آتے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ تکذیب کرنے والے کفار جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا کے کلمات کہتے ہیں، آپ اس کا اِنتقام تو اُن سے نہ لیں، مگر اُن سے تعلقات بھی نہ رکھیں۔ مگر ترکِ تعلق کے وقت انسان کی طبعی عادت یہ ہے کہ جس سے تعلق چھوڑا جائے اس کا شکوہ شکایت اور اُس کو بُرا بھلا کہتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے هَجْر یعنی ترکِ تعلق کا جو حکم دیا گیا تو ساتھ هَجْرًا جَمِيْلًا ⑩ کی قید لگا دی گئی کہ آپ کے منصبِ عالی اور خلقِ عظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جن کفار سے ترکِ تعلق کریں زبان بھی اُن کو بُرا کہنے سے محفوظ رکھیں۔

بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا ہے کہ آیاتِ جہاد و قتال جو بعد میں نازل ہوئیں، اُن سے اس آیت کا حکم منسوخ ہوگیا، لیکن غور کیا جائے تو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیاتِ مذکورہ میں کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ہجر کی تلقین ہے، یہ زجر اور سزا و قتال کے منافی نہیں، اس آیت کا حکم ہر وقت، ہر حال میں ہے، اور قتال و جہاد میں زجر و سزا ہے اس کا حکم خاص خاص اوقات میں ہے، اور اسلامی قتال و جہاد در حقیقت کوئی انتقام یا اپنا غصہ نکالنا نہیں، جو صبر اور ہجرِ جمیل کے منافی ہو، بلکہ خالص حکمِ خداوندی کی تعمیل ہے، جس طرح صبر اور ہجرِ جمیل عام حالات میں اس کی تعمیل ہے۔ یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور ترکِ انتقام کی تلقین تھی، آگے آپ کی تسلی کے لئے ان کفار پر جو عذاب آخرت میں آنے والا ہے اس کا بیان ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی چند روزہ چیرہ دستی اور ظلم و جور سے آپ ملول نہ ہوں، ان کو تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں پکڑنے والا ہے، ہاں حکمتِ ربانی کے تقاضے سے کچھ مہلت دے رکھی ہے، اس میں آپ جلدی کی فکر نہ فرمائیں، یہی مفہوم ہے بعد کی آیت: وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ⑪ کا، اس میں کفار مکذبین کو أُولِي النَّعْمَةِ فرمایا ہے۔ نَعْمَت بفتح النون کے معنی تنعّم یعنی عیش و عشرت اور مال و اولاد کی بہتات کے ہیں، اس میں اشارہ ہے کہ دُنیا کے مال و اولاد اور ناز و نعمت میں مست ہو جانا، اُسی شخص سے ہوسکتا ہے جو آخرت کی تکذیب کرنے والا ہو، مؤمن کو بھی یہ چیزیں بسا اوقات نصیب ہوتی ہیں، مگر وہ ان میں ایسا مست نہیں ہوتا، اس لئے دُنیا کے ہر عیش و راحت کے وقت بھی اس کا قلب فکرِ آخرت سے خالی نہیں ہوتا، خالص عیش و عشرت اور بالکل بے فکری اس دُنیا میں کافروں اور آخرت کی تکذیب کرنیوالوں ہی کا حصہ ہوسکتا ہے۔

آگے آخرت کے اس سخت ترین عذاب کا ذکر ہے جس میں پہلے ''أَنْكَال'' کا ذِکر کیا، جس کے معنی قید و بند اور زنجیروں کے ہیں، پھر جہنم کی شدید آگ کا ذِکر فرمایا، پھر اہلِ جہنم کے دردناک کھانے کا ذِکر ہے، وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ، غُصَّة کے لفظی معنی گلے میں لگ جانے والے پھندے کے ہیں کہ کوئی لقمہ گلے میں اس طرح پھنس جائے کہ نہ نگلا جاسکے، نہ باہر اُگلا جاسکے۔ ضریع اور زَقوم جو اہلِ جہنم کو کھانے کے لئے دیا جائے گا، ان کا یہی حال ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس میں آگ کے کانٹے ہوں گے جو گلے میں پھنس جائیں گے۔ [۱] (نَعُوْذُ بِاللہِ مِنْہُ) آخر میں فرمایا: وَعَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ان معین عذابوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ مبہم لفظ لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا کہ اور عذاب ان سے بھی زیادہ شدید و سخت ہیں جن کا کوئی انسان تصور نہیں کرسکتا، (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهَا)۔

سلف صالحین کا خوفِ آخرت

امام احمد، ابن ابی داؤد، ابن عدی اور بیہقی رحمہم اللہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے قرآن کی یہ آیت سنی تو خوف سے بیہوش ہوگیا۔ [۲] اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ایک دن روزے سے تھے، اِفطار کے وقت کھانا سامنے آیا تو اس آیت کا دھیان آ گیا، کھانا نہ کھا سکے، اُٹھوادیا۔ اگلے روز پھر شام کو ایسا ہی ہوا، کھانا اُٹھوادیا۔ تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا تو ان کے صاحب زادے حضرت ثابت بنانی اور یزید ضبّی اور یحییٰ بکاء رحمہم اللہ کے پاس گئے اور حال سنایا، یہ تینوں حضرات آئے اور حضرت حسن کو کھانے کا بہت اِصرار کرتے رہے، جب مجبور ہو کر کچھ تناول فرمایا۔ (رُوح المعانی) [۳]

آگے کچھ قیامت کے ہولناک واقعات کا بیان فرمایا: يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ الآیۃ، اس کے بعد کفارِ مکہ کو فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنا کر اس سے ڈرایا گیا کہ جس طرح فرعون اپنے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے گرفتارِ عذاب ہوا، تم بھی اس پر جمے رہے تو سمجھ لو کہ تم پر بھی ایسا ہی کوئی عذاب دُنیا میں آسکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر دُنیا میں کوئی عذاب نہ بھی آیا تو قیامت کے اُس دن کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکے گا جس کی ہولناکی اور طول کی وجہ سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ روز قیامت کے شدید اور ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ اس میں لوگوں پر ایسا خوف اور ہول طاری ہوگا کہ اگر کوئی بچہ بھی ہو تو بوڑھا ہو جائے، غرض مراد اس سے ایک تمثیل ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد حقیقت ہے، اور روزِ قیامت اس قدر طویل ہوگا کہ اُس میں ایک بچہ بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے گا۔ (قرطبی و رُوح) [۴]

قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی

شروع سورت میں قُمِ الَّيْلَ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں پر قیام اللیل کو فرض قرار دیا گیا

---

[۱] المستدرك للحاكم، كتاب التفسير، رقم الحديث:۳۸۶۷

[۲] تفسير روح المعاني ج:۲۱ ص:۷، وشعب الإيمان للبيهقي، باب الخوف من الله، رقم الحديث:۸۸۹

[۳] تفسير روح المعاني ج:۲ ص:۳۸۳، وتفسير القرطبي ج:۱۹ ص:۴۷

[۴] تفسير القرطبي ج:۱۹ ص:۴۷، وروح المعاني ج:۲۱ ص:۳۸۷

تھا، اس قیام کا طویل ہونا بھی فرض تھا، مگر اس کے طول میں اِختیار دیا گیا تھا کہ آدھی رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور کم سے کم ایک تہائی رات ہونا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابۂ کرام کی ایک جماعت اس فرض کی ادائیگی میں اکثر عزیمت پر عمل فرماتے اور زیادہ سے زیادہ رات کا وقت اس نماز میں گزارتے تھے جو دوتہائی رات کے قریب ہوتا تھا۔ ہر رات میں یہ عمل، پھر دِن میں دِین کی دعوت و تبلیغ اور ذاتی ضروریات خصوصاً صحابۂ کرام کہ بیشتر محنت مزدوری یا تجارت کرتے تھے، اس طویل وثقیل نماز کی پابندی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے پاؤں وَرَم کر آئے، اُن کی یہ مشقت ومحنت اللہ تعالیٰ کے سامنے تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے، مگر علمِ الٰہی میں پہلے ہی سے متعین تھا کہ اتنی محنت کا فریضہ چندروز ہی رکھا جائے گا تا کہ آپ اور صحابۂ کرام محنت وریاضت کے خوگر ہو جائیں جس کی طرف آیاتِ مذکورہ میں بھی: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ سے یہ محنت ومشقت اس لئے لی جارہی ہے کہ آپ کو قولِ ثقیل یعنی قرآن کی خدمت سپرد ہونے والی تھی جو اس مشقت سے بڑی مشقت ہے۔ بہرحال علمِ اَزلی کے مطابق جب یہ حکمت ریاضت ومحنت کے خوگر بنانے کی پوری ہوگئی تو یہ فرض قیام اللیل منسوخ کر دیا گیا۔ اور حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ سے صرف طولِ قیام کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو، اصل نمازِ تہجد کا فرض بدستور رہا ہو، پھر شبِ معراج میں پانچ نمازوں کی فرضیت کے وقت نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔

اور ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اُمت سے یہ فرض منسوخ کر دیا گیا، البتہ اس کا اِستحباب اور عنداللہ پسندیدہ ہونا پھر بھی باقی رہا، اور اس میں بھی یہ آسانی کر دی گئی کہ وقت کی اور تلاوتِ قرآن کی کوئی تحدید نہیں رکھی گئی، ہر شخص اپنی اپنی طاقت وفرصت کے مطابق جتنے وقت میں ادا کر سکے کر لے، اور اس میں جتنا قرآن پڑھنا آسانی سے ہوسکے پڑھ لے۔

اَحکامِ شرعیہ کے منسوخ ہونے کی حقیقت

دُنیا کی حکومتیں یا اِدارے جو اپنے قوانین میں ترمیم وتنسیخ کرتے رہتے ہیں، اُس کی بیشتر وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ تجربے کے بعد کوئی نئی صورتِ حال سامنے آتی ہے جو پہلے سے معلوم نہ تھی، تو اس صورتِ حال کے مطابق پہلے حکم کو منسوخ کر کے دُوسرا حکم جاری کر دیا جاتا ہے، مگر اَحکامِ الٰہیہ جس میں اس کا کوئی تصوّر واحتمال ہی نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط اَزلی اور اَبدی سے کوئی چیز باہر نہیں۔ کوئی حکم شرعی جاری ہونے کے بعد لوگوں کے کیا حالات رہیں گے کیا کیا صورتیں

پیش آئیں گی حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم ہے، لیکن باقتضائے حکمت و مصلحت کوئی حکم کچھ عرصے کے لئے جاری کیا جاتا ہے پہلے ہی سے اس کا ہمیشہ جاری رکھنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک مدّت اللہ کے علم میں متعین ہوتی ہے کہ اس مدّت تک یہ حکم جاری رہے گا، مگر اس مدّت کا اِظہار مخلوق پر بہ مصلحت نہیں کیا جاتا، الفاظ کے عموم سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم غیر مؤقت اور دائمی ہے، عنداللہ جو اس کی مدّت مقرّر ہے جب وہ مدّت ختم ہوکر حکم واپس لیا جاتا ہے تو مخلوق کی نظر میں وہ حکم کی منسوخی ہوتی ہے، اور حقیقت میں وہ بیان مدّت ہوتا ہے یعنی اس وقت مخلوق پر ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے یہ حکم ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ صرف اسی مدّت کے لئے جاری کیا تھا، اب وہ مدّت ختم ہوگئی، حکم باقی نہیں رہا۔

قرآنِ کریم میں بہت سی آیات کے منسوخ ہونے پر جو عامیانہ شبہ کیا جاتا ہے اس تقریر سے وہ شبہ رفع ہوگیا، کیا نمازِ تہجد خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کے بعد بھی فرض رہی، بعض ائمۂ تفسیر نے اسی کو اِختیار کیا ہے، ان کا اِستدلال سورۂ بنی اسرائیل کی آیت: وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل: ۷۹) سے ہے جس میں نمازِ تہجد کو خاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے ایک زائد فرض کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے، کیونکہ نافلہ کے لغوی معنی زائدہ کے آتے ہیں، اور مراد فریضہ زائدہ ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ فرضیت اس نماز کی اُمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے منسوخ ہوگئی، البتہ بطور اِستحباب اس کی ادائیگی سب کے لئے باقی رہی، اور آیتِ مذکورہ میں نَافِلَةً لَّكَ اپنے اِصطلاحی معنی میں بحکم نفل ہے، پھر اس کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو آیت میں لفظ لَّكَ سے مفہوم ہوتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ پوری تفصیل اور نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہونے کے بعد یہ نماز صرف نفل و مستحب کے درجے میں رہی یا سنتِ مؤکدہ کے درجے میں؟ یہ پوری تحقیق سورۂ بنی اسرائیل کی آیت مذکورہ کے تحت میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لیا جائے، وہاں تہجد کے خاص فضائل اور مسائل کا بھی ذِکر کر دیا گیا ہے۔

یہ آیت جن کے ذریعے نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ سے شروع ہوکر فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ تک آئی ہے، یہ آیت شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی ہے، سال بھر کے بعد قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوئی۔ مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، ابنِ ماجہ اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ایک سال تک اس کی پابندی کرتے رہے، سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے تک آسمان میں روک رکھا، سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوکر تخفیف ہوگئی اور اس کے بعد قیام اللیل صرف نفل و مستحب رہ

گیا۔ (از روح المعانی) [۱] پھر ان آیات میں تنسیخ حکم کی علت یہ بتلائی ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ تم اس کا احصاء نہ کرسکو گے۔ اِحصاء کے لفظی معنی شمار کرنے کے ہیں، مطلب آیت کا بعض حضراتِ مفسرین نے یہ قرار دِیا ہے کہ قیام اللیل میں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مقدارِ وقت کی پوری تعیین نہیں فرمائی، بلکہ ایک تہائی رات سے دو تہائی رات تک کے درمیان کا وقت مقرّر فرمایا تھا، مگر صحابۂ کرام جب اس نماز میں مشغول ہوتے تو اِشتغالِ نماز کے ساتھ یہ معلوم ہونا دُشوار تھا کہ رات آدھی ہوئی یا کم وبیش کیونکہ اوقات معلوم کرنے کے ایسے آلات گھڑیاں وغیرہ اُس زمانے میں موجود نہ تھیں، اور ہوتیں بھی تب بھی شغلِ نماز کے ساتھ بار بار گھڑیوں کو دیکھتے رہنا اُن حضرات کے حالات اور ان کے خشوع وخضوع کے ساتھ آسان نہ تھا، یہ معنی ہوئے لَّنْ تُحْصُوْهُ کے۔ اور بعض حضرات نے یہاں احصاء سے مراد عمل احصاء یعنی اس طویل وقت اور نیند کے وقت کی نماز پر مداومت نہ کرسکنا مراد لیا ہے۔ لفظ اِحْصَاءٌ اس معنی کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں اسماء اللہ الحسنیٰ کے بارے میں آیا ہے "مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ" [۲] اس میں لفظ "اِحْصَاءٌ" کا مفہوم بہت سے علماء نے عمل احصاء لیا ہے یعنی اسمائے اِلٰہیہ کے مقتضیٰ پر پورا عمل ہونا، جیسا کہ معارف القرآن میں آیت وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا [۳] (ابراہیم: ۳۴) کے تحت میں اس کی تفصیل لکھی گئی۔ (پارہ نمبر ۱۳، سورۂ ابراہیم)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ لفظ توبہ کے اصلی معنی رُجوع کے ہیں، گناہ سے توبہ کو بھی اسی لئے توبہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جرم وگناہ سے رُجوع ہوتا ہے، اس جگہ مراد صرف رُجوع ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ حکم قیام اللیل کی فرضیت کا واپس لے لیا ہے۔ آخر میں فرمایا:-

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ یعنی نمازِ تہجد جو اَب بجائے فرض کے مستحب یا سنت باقی رہ گئی ہے، اس میں جس قدر قرآن آسانی سے کوئی شخص پڑھ سکے وہ پڑھ لیا کرے، کسی خاص مقدار کی تعیین نہیں ہے، اس آیت سے بہت سے مسائل فقہیہ نکلتے ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ، وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں جمہور مفسرین کے نزدیک نمازِ فرض مراد ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ نمازِ فرض پانچ ہیں جو لیلۃ المعراج میں فرض ہوئی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کی

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۳۹۱، وصحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ اللیل ...إلخ، ج:۱ ص:۲۵۶، ومسند احمد، حدیث السیّدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث:۲۴۳۱۴، وسنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب فی صلاۃ اللیل، رقم الحدیث:۱۱۴۴، وسنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث:۴۲۴

[۲] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ج:۲ ص:۱۸۹

[۳] ترجمہ: اور اللہ کی نعمتیں اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے۔

فرضیت جوایک سال تک جاری رہی تھی، اسی عرصے میں لیلۃ الاسراء کا واقعہ پیش آیا، جس میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں، اور اس کے بعد آیاتِ مذکورہ کے ذریعے نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، اور آخرِ سورت میں جو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اس سے مراد پانچ نمازیں فرض ہیں۔ (ابنِ کثیر، قرطبی، بحرِ محیط) [1]

اسی طرح وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ میں زکوٰۃ سے زکوٰۃ فرض مراد ہے، مگر مشہور یہ ہے کہ زکوٰۃ بعد ہجرت دُوسرے سال میں فرض ہوئی، اور یہ آیت مکی ہے، ابتدائے اسلام میں نازل ہوئی ہے، اس لئے بعض مفسرین نے خاص اس آیت کو مدنی کہا ہے۔ مگر ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں اوائلِ اسلام ہی میں فرض ہوگئی ہو مگر اس کے نصاب اور مقدار واجب کی تفصیلات مدینہ طیبہ میں ہجرت کے دُوسرے سال میں بیان کی گئی ہوں، اس طرح آیت کے مکی ہونے کی صورت میں بھی اس کو زکوٰۃِ فرض پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ رُوح المعانی میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے، [2] اور اس کی پوری تحقیق احقر کے رسالہ ''نظامِ زکوٰۃ'' میں تفصیل سے آئی ہے۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس عنوان سے تعبیر کیا ہے کہ گویا یہ خرچ کرنے والا اللہ کو قرض دے رہا ہے، اس میں اس کے حال پر لطف وکرم کی طرف اشارہ بھی ہے، اور اس کا بیان بھی کہ اللہ تعالیٰ غنی الاغنیاء ہے، اُس کو دِیا ہوا قرض کبھی مارا نہیں جاسکتا، ضرور وصول ہوگا، اور چونکہ زکوٰۃِ فرض کا حکم اس سے پہلے آچکا ہے اس لئے وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ میں جس خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ذِکر ہے اس کو اکثر حضرات نے صدقاتِ نافلہ اور تبرّعات پر محمول کیا ہے، جیسے اپنے اقارب واعزّا کو کچھ دینا یا مہمان کی مہمانی پر خرچ کرنا یا علماء وصلحاء کی خدمت کرنا وغیرہ اور بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ قرار دِیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے مالی واجبات انسان پر عائد ہوتے ہیں، جیسے ماں باپ، بیوی، اولاد کا نفقہ واجبہ یا دُوسری واجباتِ شرعیہ تو وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ میں ادائے زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد دُوسرے واجبات کا ذِکر وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ سے کردیا گیا۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ الآیۃ، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک کام اپنی زندگی میں کرگزرو وہ بہتر ہے، اس سے کہ مرنے کے وقت وصیت کرو، اس میں مالی عبادت صدقہ وخیرات بھی داخل ہے، اور نماز روزہ وغیرہ بھی، جو کسی کے ذمہ قضا ہو، اپنے ہاتھ سے، اپنے سامنے اللہ کی راہ میں خرچ کرکے اُس سے سبکدوشی بہتر ہے، بعد میں تو وارثوں کے اختیار میں بات رہتی ہے، وہ کریں یا نہ کریں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۵۹، وتفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۵۸، والبحر المحیط ج:۱۰ ص:۳۲۱

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۵۹، وتفسیر روح المعانی ج:۲۱ ص:۳۹۴

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے سوال کیا کہ تم میں ایسا کون ہے جو اپنے وارث کے مال سے بہ نسبت اپنے مال کے زیادہ محبت رکھتا ہو، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے وارث کے مال کی محبت خود اپنے مال سے زیادہ رکھے۔ آپ نے فرمایا: سوچ سمجھ کر بات کرو! صحابہ نے عرض کیا کہ ہمیں تو اس کے سوا کوئی دُوسری صورت معلوم نہیں۔ آپ نے فرمایا (جب یہ بات ہے تو سمجھ لو کہ) تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، اور جو رہ گیا وہ تمہارا مال نہیں، بلکہ تمہارے وارث کا مال ہے۔ (ذکرہ ابن کثیر باسناد ابی یعلی الموصلی، ثم قال: ورواہ البخاری من حدیث حفص بن غیاث ...إلخ) [1]

تَمَّتْ

سُوْرَۃُ الْمُزَّمِّلِ بِحَمْدِ اللہِ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ ۲۲ رَجَب ۱۳۹۱ھ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۶۰، ومسند ابی یعلی، مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۵۱۶۳، وصحیح ابن حبان، رقم الحدیث:۳۳۳۰

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

آیاتها ۵۶ ۷۴ سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ ۴ رکوعاتها ۲

سورۂ مدثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھپن آیتیں ہیں، اور اس میں دو رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝٤

اے لحاف میں لپٹنے والے کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے اور اپنے رَبّ کی بڑائی بول اور اپنے کپڑے پاک رکھ

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝٥ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝٧ فَاِذَا نُقِرَ

اور گندگی سے دُور رہ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے اور اپنے رَبّ سے اُمید رکھ پھر جب بجنے لگے

فِي النَّاقُوْرِ ۝٨ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝٩ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

وہ کھوکھری چیز پھر وہ اُس دن مشکل دن ہے منکروں پر

غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾ وَّجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ﴿١٢﴾

نہیں آسان، چھوڑ دے مجھ کو اور اُس کو جس کو میں نے بنایا اکّا، اور دِیا میں نے اس کو مال پھیلا کر،

وَّبَنِينَ شُهُودًا ﴿١٣﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا

اور بیٹے مجلس میں بیٹھنے والے، اور تیاری کر دی اس کے لئے خوب تیاری، پھر لالچ رکھتا ہے کہ اور بھی دُوں، ہرگز نہیں،

إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾

وہ ہے ہماری آیتوں کا مخالف، اب اُس سے چڑھواؤں گا بڑی چڑھائی، اُس نے فکر کیا اور دِل میں ٹھہرالیا،

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ

سو مارا جائیو، کیسا ٹھہرایا، پھر مارا جائیو کیسا ٹھہرایا، پھر نگاہ کی، پھر تیوری چڑھائی

وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿٢٤﴾

اور منہ تھتھایا، پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا، پھر بولا اور کچھ نہیں یہ جادو ہے چلا آتا،

إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا

اور کچھ نہیں یہ کہا ہوا ہے آدمی کا۔ اب اُس کو ڈالوں گا آگ میں، اور تو کیا سمجھا کیسی ہے

سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾

وہ آگ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے، جلا دینے والی ہے آدمیوں کو، اُس پر مقرر ہیں اُنیس فرشتے،

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً

اور ہم نے جو رکھے ہیں دوزخ پر داروغہ وہ فرشتے ہی ہیں اور اُن کی جو گنتی رکھی ہے سو جانچنے کو

لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا

منکروں کے، تاکہ یقین کرلیں وہ لوگ جن کو ملی ہے کتاب اور بڑھے ایمان داروں کا

إِيمَانًا ۙ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ

ایمان، اور دھوکا نہ کھائیں جن کو ملی ہے کتاب اور مسلمان اور تاکہ کہیں وہ لوگ کہ

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۚ كَذَٰلِكَ

جن کے دِل میں روگ ہے اور منکر کیا غرض تھی اللہ کو اس مثل سے یوں

يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا

بچلاتا ہے اللہ جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے جس کو چاہے، اور کوئی نہیں جانتا تیرے ربّ کے لشکر کو مگر

هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾

خود وہی، اور وہ تو سمجھانا ہے لوگوں کے واسطے، سچ کہتا ہوں اور قسم ہے چاند کی اور رات کی جب پیٹھ پھیرے،

وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَن شَاءَ

اور صبح کی جب روشن ہووے، وہ ایک ہے بڑی چیزوں میں کی، ڈرانے والی ہے لوگوں کو، جو کوئی چاہے

مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾

تم میں سے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے، ہر ایک جی اپنے کئے کاموں میں پھنسا ہوا ہے،

إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِي جَنَّاتٍ ۛ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾

مگر داہنی طرف والے باغوں میں ہیں، مل کر پوچھتے ہیں گنہگاروں کا حال

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ

تم کاہے سے جا پڑے دوزخ میں وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے اور نہ تھے کھانا کھلاتے

الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ

محتاج کو اور ہم تھے باتوں میں دھنستے دھنسنے والوں کے ساتھ اور ہم تھے جھٹلاتے

بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

انصاف کے دن کو یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر وہ یقینی بات۔ پھر کام نہ آئے گی ان کے سفارش

الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ

سفارش کرنے والوں کی، پھر کیا ہوا ہے اُن کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں، گویا کہ وہ گدھے ہیں

مُسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ

بدکنے والے، بھاگے ہیں غل مچانے سے، بلکہ چاہتا ہے ہر ایک مرد اُن میں کا کہ ملیں اس کو

صُحُفًا مُنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّا

ورق کھلے ہوئے، ہرگز نہیں، پر وہ ڈرتے نہیں آخرت سے، کوئی نہیں،

إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ

یہ تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے اس کو یاد کرے، اور وہ یاد جبھی کریں کہ چاہے

اللَّهُ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

اللہ، وہی ہے جس سے ڈرنا چاہئے اور وہی ہے بخشنے کے لائق۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے کپڑے میں لپٹنے والے! (۱) اُٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو (۲) اور اپنے پروردگار کی تکبیر کہو، (۳) اور اپنے کپڑوں
کو پاک رکھو، (۴) اور گندگی سے کنارہ کرلو، (۵) اور کوئی احسان اس نیت سے نہ کرو کہ زیادہ وصول کرسکو۔ (۶) اور اپنے
پروردگار کی خاطر صبر سے کام لو۔ (۷) پھر جب صور میں پھونک ماردی جائے گی، (۸) تو وہ بڑا مشکل دن ہوگا، (۹) کافروں
کے لئے وہ آسان نہیں ہوگا۔ (۱۰) اُس شخص کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، (۱۱) اور اُس کو مال دیا جو دُور تک
پھیلا پڑا ہے، (۱۲) اور بیٹے دیئے جو سامنے موجود رہتے ہیں، (۱۳) اور اُس کے لئے ہر کام کے راستے ہموار کردیئے، (۱۴) پھر
بھی وہ یہ لالچ کرتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دُوں۔ (۱۵) ہرگز نہیں! وہ ہماری آیتوں کا دُشمن بن گیا ہے، (۱۶) عنقریب میں
اُسے ایک کٹھن چڑھائی پر چڑھاؤں گا۔ (۱۷) اُس کا حال تو یہ ہے کہ اُس نے سوچ کر ایک بات بنائی، (۱۸) خدا کی مار ہو اُس پر
کہ کیسی بات بنائی! (۱۹) دوبارہ خدا کی مار ہو اُس پر کہ کیسی بات بنائی! (۲۰) پھر اُس نے نظر دوڑائی، (۲۱) پھر تیوری چڑھائی، اور
منہ بنایا، (۲۲) پھر پیچھے کو مڑا، اور غرور دِکھایا، (۲۳) پھر کہنے لگا کہ: ”کچھ نہیں، یہ تو ایک روایتی جادو ہے، (۲۴) کچھ نہیں، یہ تو ایک
انسان کا کلام ہے۔“ (۲۵) عنقریب میں اس شخص کو دوزخ میں جھونک دُوں گا، (۲۶) اور تمہیں کیا پتہ کہ دوزخ کیا چیز ہے؟ (۲۷)
وہ نہ کسی کو باقی رکھے گی، اور نہ چھوڑے گی، (۲۸) وہ کھالوں کو جھلس دینے والی چیز ہے، (۲۹) اُس پر اُنیس (کارندے) مقرّر
ہوں گے۔ (۳۰) اور ہم نے دوزخ کے یہ کارندے کوئی اور نہیں، فرشتے مقرّر کئے ہیں۔ اور اُن کی جو تعداد مقرر کی ہے، وہ
صرف اس لئے کہ اُس کے ذریعے کافروں کی آزمائش ہو، تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آجائے، اور جو لوگ ایمان لاچکے ہیں،
اُن کے ایمان میں اور اِضافہ ہو، اور اہلِ کتاب اور مؤمن لوگ کسی شک میں نہ پڑیں، اور تاکہ وہ لوگ جن کے دِلوں میں
روگ ہے، اور جو لوگ کافر ہیں، وہ یہ کہیں کہ بھلا اس عجیب سی بات سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے،
گمراہ کردیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے، اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ
ساری بات تو نوعِ بشر کے لئے ایک یاددہانی کرانے والی نصیحت ہے، اور بس! (۳۱) خبردار! قسم ہے چاند کی، (۳۲) اور رات کی
جب وہ منہ پھیر کر جانے لگے، (۳۳) اور صبح کی جب اُس کا اُجالا پھیل جائے، (۳۴) کہ یہ بڑی بڑی باتوں میں سے ایک ہے (۳۵)
جو تمام انسانوں کو خبردار کررہی ہے، (۳۶) تم میں سے ہر اُس شخص کو جو آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہے۔ (۳۷) ہر شخص اپنے کرتوت
کی وجہ سے گروی رکھا ہوا ہے، (۳۸) سوائے دائیں ہاتھ والوں کے (۳۹) کہ وہ جنتوں میں ہوں گے۔ وہ پوچھ رہے ہوں

گے ⑩ مجرموں کے بارے میں، ⑪ کہ: ''تمہیں کس چیز نے دوزخ میں داخل کردیا؟'' ⑫ وہ کہیں گے کہ: ''ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، ⑬ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، ⑭ اور جو لوگ بے ہودہ باتوں میں گھستے، ہم بھی اُن کے ساتھ گھس جایا کرتے تھے، ⑮ اور ہم روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے، ⑯ یہاں تک کہ وہ یقینی بات ہمارے پاس آہی گئی۔'' ⑰ چنانچہ سفارش کرنے والوں کی سفارش ایسے لوگوں کے کام نہیں آئے گی۔ ⑱ اب ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ نصیحت کی بات سے منہ موڑے ہوئے ہیں؟ ⑲ اس طرح جیسے وہ جنگلی گدھے ہوں ⑳ جو کسی شیر سے (ڈرکر) بھاگ پڑے ہوں۔ ㉑ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اُسے کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیئے جائیں۔ ㉒ ہرگز نہیں! بات اصل میں یہ ہے کہ ان کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔ ㉓ ہرگز نہیں! یہ (قرآن ہی) ایک نصیحت ہے، ㉔ اب جو چاہے، اس سے نصیحت حاصل کرلے۔ ㉕ اور یہ لوگ نصیحت حاصل کریں گے نہیں، اِلَّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہی اس بات کا اہل ہے کہ اُس سے ڈرا جائے، اور وہی اس کا اہل ہے کہ لوگوں کی مغفرت کرے۔ ㉖

خلاصۂ تفسیر

اے کپڑے میں لپٹنے والے اُٹھو (یعنی اپنی جگہ سے اُٹھو، یا یہ کہ مستعد ہوجاؤ) پھر (کافروں کو) ڈراؤ (جو کہ مقتضا منصبِ نبوّت کا ہے، اور یہاں تبشیر یعنی جنت کی بشارت کا اس لئے ذِکر نہیں فرمایا کہ یہ آیت بالکل ابتدائے نبوّت کی ہے، اس وقت باستثنا ایک دو کے کوئی مسلمان نہیں تھا، تو اِنذار ہی اَنسب تھا) اور اپنے رَبّ کی بڑائیاں کرو (کہ تبلیغ میں سب سے پہلی چیز توحید ہے) اور (آگے بعض ضروری اعمال وعقائد واخلاق کی تعلیم ہے جس پر خود بھی عامل رہنا چاہئے کہ تبلیغ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی ضروری ہے، یعنی ایک تو) اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے (یہ اعمال میں سے ہے اور چونکہ بالکل ابتدا میں نماز نہ تھی اس لئے اس کا حکم نہیں ہوا) اور (دُوسرے یہ کہ) بتوں سے الگ رہو (جس طرح کہ اب تک الگ ہو۔ یہ عقائد میں سے ہے، یعنی بدستورِ سابق توحید پر دَوام رکھو اور باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی احتمال نہ تھا، پھر بھی یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ عقیدۂ توحید کی اہمیت معلوم ہو کہ معصوم کو بھی باوجود اِحتیاج نہ ہونے کے اس کی تعلیم کی جاتی ہے) اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ (دُوسرے وقت) زیادہ معاوضہ چاہو (یہ متعلق اخلاق کے ہے اور گو اَوروں کے لئے یہ امر جائز ہے، مگر خلافِ اَولیٰ ہے، جیسا کہ سورۂ رُوم کی آیت وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا ...اِلخ [1] (الروم:۳۹) کی تفسیر

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور جو چیز تم اس غرض سے کروگے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجاوے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دوگے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہوگے تو ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔

سے معلوم ہوسکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان چونکہ اعلیٰ وارفع ہے، اس لئے آپ پر اس کو بھی حرام کردیا گیا، کما فی الروح، والأصحّ ان النهی للتحریم وانه من خواصه علیه الصلوٰة والسلام) [1] اور پھر (انذار وتبلیغ میں جو ایذا پیش آئے اس پر) اپنے رَبّ (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجئے (یہ خاص اخلاق متعلقہ بالتبلیغ میں سے ہے، پس یہ آیتیں جامع ہوگئیں اصلاحِ اعمال واخلاق کو، اپنے لئے بھی دُوسروں کے لئے بھی) پھر (اس ڈرانے کے بعد جو کوئی ایمان نہ لائے اس کے لئے یہ وعید ہے کہ) جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا، جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی (آگے بعض خاص کفار کا ذِکر ہے یعنی) مجھ کو اور اس شخص کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو (کہ ہم اس سے نمٹ لیں گے) جس کو میں نے (مال واولاد سے خالی اور) اکیلا پیدا کیا (جیسا کہ پیدا ہونے کے وقت آدمی کے پاس نہ مال ہوتا ہے اور نہ اولاد، اور مراد اس سے ولید بن مغیرہ ہے، جس کا قصہ معارف ومسائل کے تحت آئے گا) اور اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے (دیئے) اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کردیا، پھر بھی (باوجود اس کے اس مال واولاد کا شکر بجانہ لایا کہ ایمان لے آتا، بلکہ اس نعمتِ وافرہ کو براہِ کفران وبے قدری قلیل سمجھ کر) اس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اس کو) اور زیادہ دُوں، ہرگز (وہ زیادہ دینے کے قابل) نہیں (کیونکہ) وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے (اور مخالفت کے ساتھ عدم قابلیت ظاہر ہے اِستدراج کا معاملہ اس سے الگ ہے اس شخص کی نزولِ آیت کے روز سے ظاہراً بھی ترقی بند ہوگئی، چنانچہ پھر نہ کوئی اولاد ہوئی اور نہ کچھ مال بڑھا۔ اور یہ سزا تو دُنیا میں ہے، اور آخرت) میں اس کو عنقریب (یعنی مرنے کے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا (حدیث ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ صَعُود دوزخ میں ایک پہاڑ ہے، ستر برس میں اس کی چوٹی پر پہنچے گا، پھر وہاں سے گر پڑے گا، پھر اسی طرح ہمیشہ چڑھے گا اور گرے گا، [2] اور وجہ اس سزا کی وہی عناد ہے جو اُوپر مذکور ہوا، اور آگے بھی اس کی کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ) اس شخص نے (اس بارے میں) سوچا (کہ قرآن کی شان میں کیا بات تجویز کروں) پھر (سوچ کر) ایک بات تجویز کی (جس کا بیان آگے آتا ہے) سو اس پر خدا کی مار ہو، کیسی بات تجویز کی (اور) پھر (مکرر) اس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی (یہ تعجیبِ مکرر اس کی سخت مذمت اور قابلِ تعجیب بات پر ہے، یعنی کیسی بے جوڑ بات تجویز کی جس کا اِحتمال ہی نہیں ہوسکتا) پھر (حاضرین کے چہروں کو) دیکھا (کہ وہ تجویز کی ہوئی بات ان سے کہوں) پھر منہ بنایا (تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ اس کو قرآن سے بہت کراہت واِنقباض ہے) اور زیادہ منہ بنایا، پھر منہ پھیرا اور تکبر ظاہر کیا (جیسا عادت ہے کہ جس چیز کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی گردن پھیر لیتے ہیں اور اِظہارِ تنفر کرتے ہیں) پھر بولا کہ بس یہ تو جادو ہے

---

[1] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۴۰۲، تحت هذه الآیة۔

[2] جامع الترمذی، ابواب صفة جهنم، باب صفة قعر جهنم، ج:۲ ص:۸۵

(جو اَوروں سے) منقول (ہے) بس یہ تو آدمی کا کلام ہے (یہ بیان ہے اس تجویز مذکور کا، مطلب یہ کہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ بشر کا کلام ہے، جس کو آپ کسی جادوگر سے نقل کر دیتے ہیں، یا آپ خود مصنف ہیں، لیکن یہ مضامین مدعیانِ نبوت سابقین سے منقول ہیں، اور اُسلوبِ عبارت نعوذ باللہ آپ کے سحر کا اثر ہے۔ آگے اس عناد کی سزا تفصیلاً فرماتے ہیں، جیسا اُوپر سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ میں اِجمالاً فرمایا تھا، پس عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾ میں جرم کا ذِکر اور سَاُرْهِقُهٗ میں سزا کا ذِکر اِجمالاً اور اِنَّهٗ فَكَّرَ، عَنِيْدًا کی تفصیل ہے، اور سَاُصْلِيْهِ، سَاُرْهِقُهٗ کی تفصیل ہے، یعنی) میں اس کو جلدی دوزخ میں داخل کروں گا، اور تم کو کچھ خبر ہے کہ دوزخ کیسی چیز ہے؟ (وہ ایسی ہے کہ) نہ تو (داخل ہونے کے بعد داخل ہونے والے کی کوئی چیز جلانے سے) باقی رہنے دے گی اور نہ (داخل ہونے کے قبل جو کفار اس وقت باہر ہوں گے نہ ان میں سے کسی کو بغیر اپنے اندر لئے ہوئے) چھوڑے گی (اور) وہ (جلا کر) بدن کی حیثیت بگاڑ دے گی (اور) اس پر اُنیس فرشتے (جو اس کے خازن ہیں جن میں ایک کا نام ''مالک'' ہے، مقرّر) ہوں گے (جو کافروں کو اَنواع اَنواع عذاب دیں گے، حاصل یہ کہ فرشتے جن کی قوت معلوم ہے باوجودیکہ ان میں کا ایک بھی تمام اہلِ جہنم کی تعذیب کے لئے کافی ہے پھر اُنیس فرشتوں کے مقرّر ہونے سے ظاہر ہے کہ عذاب کا بہت ہی اہتمام ہوگا، اور نکتہ خاص اُنیس کے عدد میں حقیقۃً اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن دُوسرے حضرات نے جو ذِکر کیا ہے ان سب میں اقرب وہ ہے جو اللہ نے اس حقیر کے دِل میں اِلقاء فرمایا ہے، وہ یہ کہ اصل تعذیب کفار کی عقائدِ حقہ کی مخالفت پر ہے، اور عقائدِ قطعیہ جو عملیات کے متعلق نہیں حسب تفصیل رسالہ ''فروع الایمان'' نو ہیں۔ ۱-ایمان لانا اللہ تعالیٰ پر، ۲-اِعتقاد رکھنا کہ عالم حادث ہے، ۳-ایمان لانا فرشتوں پر، ۴-ایمان لانا اس کی سب کتابوں پر، ۵-ایمان لانا پیغمبروں پر، ۶-ایمان لانا تقدیر پر، ۷-ایمان لانا قیامت کے دن پر، ۸-جنت کا یقین کرنا، ۹-دوزخ کا یقین کرنا۔ باقی سب عقائد ان ہی کے ملحقات وفروع ہیں۔ اور عقائدِ قطعیہ جو عملیات کے متعلق ہیں دس ہیں۔ پانچ مأمورات کے متعلق، یعنی ان کے وجوب کا اِعتقاد ضروری ہے، وہ پانچ مأمور جو شعائرِ اِسلام ہیں، یہ ہیں: ۱-تلفظ بالشہادتین، ۲-اِقامتِ صلوٰۃ، ۳-اِیتاءِ زکوٰۃ، ۴-صومِ رمضان، ۵-حج بیت اللہ۔ اور پانچ منہیات کے متعلق یعنی اُن کی تحریم کا اِعتقاد واجب ہے، اور وہ پانچ منہیات جو کہ آیتِ امتحان وغیرہ میں مذکور ہیں، یہ ہیں: ۱-سرقہ، ۲-زِنا، ۳-قتل، خصوصاً قتلِ اولاد، ۴-بہتان، ۵-عصیان فی المعروف جس میں غیبت وظلم، یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانا، وغیرہ سب آگیا۔ پس یہ سب عقائد ملا کر اُنیس ہوئے، شاید ایک ایک عقیدے کے مقابلے میں ایک ایک فرشتہ معین ہو، اور چونکہ ان سب میں ایک عقیدہ سب سے بڑا ہے، یعنی توحید، اس لئے ان فرشتوں میں بھی ایک فرشتہ سب سے بڑا مقرّر ہوا، یعنی مالک، واللہ اعلم بأسرارہ) اور (اس آیت کا مضمون سن کر جو کفار نے تمسخر کیا جس کا بیان معارف کے تحت میں آئے گا،

اس پر اگلا مضمون نازل ہوا کہ) ہم نے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں، بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں (جن میں سے ایک ایک فرشتے میں تمام جن وانس کی برابر قوت ہے، کذا فی الدّر مرفوعًا ولفظه هكذا لهم مثل قوة الثقلين [1]) اور ہم نے جو ان کی تعداد (ذِکر وحکایت میں) صرف ایسی رکھی ہے جو کافروں کی گمراہی کا ذریعہ ہو (مراد اس سے اُنیس کا عدد ہے) تو اس لئے (کہ یہ نتائج اس پر مرتب ہوں، یعنی) تا کہ اہلِ کتاب (سننے کے ساتھ) یقین کرلیں اور اِیمان والوں کا اِیمان اور بڑھ جائے، اور اہلِ کتاب اور مؤمنین شک نہ کریں، اور تا کہ جن لوگوں کے دِلوں میں (شک کا) مرض ہے وہ اور کافر لوگ کہنے لگیں کہ اس عجیب مضمون سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے (اہلِ کتاب کے یقین کی دو توجیہ ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کی کتاب میں بھی یہ عدد لکھا ہو تو فوراً مان لیں گے، اور اگر اَب ان کی کتابوں میں یہ عدد نہ ہو تو ممکن ہے کہ کتابوں کے ضائع اور محرّف ہونے سے ضائع ہوگیا ہو۔ اور دُوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ عدد ان کی کتاب میں نہ ہو، لیکن وہ فرشتوں کی قوت کے قائل تھے، اور بہت سے اُمورِ توقیفیہ ان کی کتابوں میں موجود تھے، تو ان کے پاس کوئی مبنیٰ اِنکار کا نہ تھا، پس یقین سے مراد عدمِ اِنکار وعدمِ اِستہزا ہوگا، لیکن ظاہر توجیہ اوّل ہے، اور اہلِ ایمان کے ایمان کی زیارت کی بھی دو توجیہ ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ اہلِ کتاب کے اِستیقان کو دیکھ کر ان کا ایمان کیفاً قوی ہوجائے کہ آپ باوجود عدمِ اِختلاط اہلِ کتاب کے وحیٔ سابق کے موافق خبر دیتے ہیں، ضرور نبی برحق ہیں۔ دُوسری توجیہ یہ کہ جب کوئی مضمون نیا نازل ہوتا تھا، اس پر ایمان لاتے تھے، پس ایک فردِ تصدیق کی اور بڑھی، اس سے بحیثیت کمیت ایمان میں زیادتی ہوئی، اور یَرْتَابَ کو تاکید کے لئے بڑھایا کہ اِثباتِ یقین اور نفیٔ شک دونوں کی تصریح ہوجائے۔ اور مرض میں دو اِحتمال ہیں، ایک تو شک کیونکہ ظہورِ حق کے بعد بعض جاحد اور منکر ہوتے ہیں، بعض متردّد ہوتے ہیں، تو اہلِ مکہ میں بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ دُوسرا بمعنی نفاق تو اس میں پیشین گوئی ہوگی کہ مدینہ میں منافق ہوں گے اور ان کا یہ قول ہوگا، اور مؤمنین اور اہلِ کتاب کے اِثبات ونفیٔ شک کو جدا جدا اس لئے فرمایا کہ اہلِ کتاب کا یقین ونفیٔ شک لغوی ہے، اور مؤمنین کا شرعی، آگے فریقین کے حال پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جس طرح حق تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس باب میں خاص ہدایت کی اور کافروں کو اس باب میں خاص گمراہ کیا) اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے۔ اور (آگے تتمہ ہے مضمونِ سابق کا کہ جہنم کے خازن فرشتوں کا عدد اُنیس ایک خاص حکمت کی بنا پر ہے، ورنہ) تمہارے رَبّ کے (ان) لشکروں (کی یعنی فرشتوں کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ اس) کو بجز رَبّ کے کوئی نہیں جانتا (اگر وہ چاہتے تو بےانتہا فرشتوں کو خازن بنادیتے اور اب بھی گو خازن اُنیس ہیں مگر ان کے اور اعوان وانصار بہت کثرت سے ہیں، چنانچہ حدیث مسلم میں

---

[1] تفسیر الدر المنثور تحت هٰذه الآية ج:۱۵ ص:۸۰

ہے کہ جہنم کو اس حال میں حاضر کیا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے [۱]) اور (جو اَصل مقصود ہے جہنم کا حال بیان کرنے سے وہ عدد کی قلّت یا کثرت یا تعیین یا انکشافِ حکمت تخصیص یا عدمِ انکشاف پر موقوف نہیں اور وہ اصل مقصود یہ ہے کہ) دوزخ (کا حال بیان کرنا) صرف آدمیوں کی نصیحت کے لئے ہے (تاکہ وہاں کے عذاب کو سن کر ڈریں اور ایمان لائیں، اور یہ مقصود کسی خاص خصوصیات پر موقوف نہیں، پس مقتضا عقل کا بھی یہی ہے کہ اصل مقصود کو محفوظ وملحوظ رکھ کر ان بالائی اُمور کے درپے نہ ہوں۔ آگے جہنم کی عقوبت کا کسی قدر بیان ہے، جس میں ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾ کے اِجمال کی تفصیل ہے، پس ارشاد ہے کہ) بالتحقیق قسم ہے چاند کی اور رات کی جب جانے لگے، اور صبح کی جب روشن ہو جائے، کہ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے، جو اِنسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے، یعنی تم میں جو (خیر کی طرف) آگے بڑھے اس کے لئے بھی، یا جو (خیر سے) پیچھے ہٹے اس کے لئے بھی (مطلب یہ کہ جمیع مکلّفین کے لئے نذیر ہے، اور چونکہ نتائج اس انداز کے قیامت میں ظاہر ہوں گے، اس لئے قسم ایسی چیزوں کی کھائی گئی جو قیامت کے بہت ہی مناسب ہے، چنانچہ قمر کا اوّل بڑھنا، پھر گھٹنا نمونہ اس عالم کے نشو ونما اور پھر اضمحلال وفنا کا ہے، یہاں تک کہ چاند کے محاق یعنی بے نور ہو جانے کی طرح یہ بھی فانی محض ہو جائے گا، اسی طرح اس عالمِ دُنیا کو اس عالمِ آخرت کے ساتھ اِختفا واِنکشاف حقائق میں ایسی نسبت ہے جیسے رات کو دن کے ساتھ، پس اس عالم کا ختم ہو جانا مشابہ رات گزر جانے کے ہے، اور اس عالم کا ظہور مشابہ اسفارِ صبح کے ہے، آگے دُنیا اور اہلِ دُنیا کے بعض احوال کا بیان ہے یعنی) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) کے بدلے میں (دوزخ میں) محبوس ہوگا مگر داہنے والے (یعنی مؤمنین جس کی تفصیل سورۂ واقعہ میں گزری ہے، اور چونکہ یہاں اصحاب الیمین مقابل اصحاب الشمال کے ہے، اس لئے مقربین کو بھی شامل ہے، حاصل یہ کہ مؤمنین اس قید سے مستثنیٰ ہیں) کہ وہ بہشتوں میں ہوں گے (اور) مجرموں (یعنی کفار) کا حال (خود ان کفار ہی سے) پوچھتے ہوں گے (اور کیفیت باہمی کلام کی باوجود اُس بُعد کے جو دوزخ اور جنت میں ہے، سورۂ اَعراف کی آیات: وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ... اِلخ [۲] (الاعراف: ۴۴) کی تفسیر میں گزری ہے، اور یہ سوال زجر وتنبیہ کے لئے ہوگا، حاصل یہ کہ مؤمنین کفار سے پوچھیں گے کہ) تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور (جو لوگ دِینِ حق کے اِبطال کے مشغلے میں رہتے تھے ان) مشغلے میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی (اُس) مشغلہ (اِبطالِ دِین) میں رہا کرتے تھے، اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے،

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب صفة المنافقین ...إلخ، وباب جهنم أعاذنا الله منها، ج:۲ ص:۳۸۱

[۲] ترجمہ: اور اہلِ جنت اہلِ دوزخ کو پکاریں گے۔

یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو موت آ گئی (اور ہم ان حرکات سے باز نہ آئے، یعنی خاتمہ اسی نافرمانی پر ہوا، اس وجہ سے ہم دوزخ میں آئے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار مکلّف بالفروع یعنی نماز، روزہ، اَحکامِ شرعیہ کے مأمور ہوں، کیونکہ جہنم میں دو چیزیں ہوں گی، ایک عذاب، دُوسرا شدّتِ عذاب، پس ممکن ہے کہ مجموعۂ اَعمالِ مذکورہ سبب ہو مجموعۂ عذاب اور شدّتِ عذاب کا، اس طرح کہ کفر و شرک تو سبب ہو تعذیب کا، اور ترکِ صلوٰۃ وغیرہ سبب ہو زیادہ تعذیب کا، اور کفار کے غیر مکلّف بالفروع ہونے کے معنی یہ کہے جائیں گے کہ ان فروع پر نفسِ تعذیب نہ ہوگی، اور زیادہ تعذیب اس لئے ہوسکتی ہے کہ اُصول کے ضمن میں فروع بھی تبعاً آ ہی جاتے ہیں، اس لئے ضمناً مکلّف ہونا زیادتی عذاب کا سبب ہوسکتا ہے) سو (حالتِ مذکورہ میں) ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی (اور اس عدمِ نفع کا تحقق عدمِ شفاعت کے تحقق سے ہوگا، یعنی کوئی ان کافروں کی شفاعت ہی نہ کرسکے گا، لقولہٖ تعالیٰ: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ [1] (الشعراء)، آگے ان کے اعراض پر تفریع ہے کہ جب کفر و اِعراض کی بدولت ان کی یہ گت بننے والی ہے) تو اُن کو کیا ہوا کہ اس نصیحت (قرآنی) سے رُوگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں، جو شیر سے بھاگے جارہے ہیں (اس تشبیہ میں کئی امر کی رعایت ہے، اوّل تو گدھا بے وقوفی اور حماقت میں مشہور ہے، دُوسرے اس کو وحشی فرض کیا، جس کو گورخر کہتے ہیں کہ وہ جو چیزیں ڈرنے کی نہیں ہوتیں، اُن سے بھی بلاوجہ ڈرتا اور بدکتا بھاگتا ہے، تیسرے شیر سے اس کا ڈرنا فرض کیا کہ اس صورت میں ان کا بھاگنا انتہا درجہ کا ہوگا، اور اس بھاگنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کو بزعمِ خود حجیت میں کافی نہیں سمجھتے) بلکہ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے (آسمانی) نوشتے دیئے جائیں (جیسا دُرِّ منثور میں قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بعض کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا اِتباع کریں تو خاص ہمارے نام آسمان سے ایسے نوشتے آئیں جن میں آپ کے اِتباع کا حکم لکھا ہوا، اھ۔ وھٰذا کقولہٖ تعالیٰ: حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ [2] (بنی اسرائیل: ۹۳) اور مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ کا بڑھانا توضیحِ مقصود کے لئے ہے، یعنی جیسے معمولی خط ہوتے ہیں کہ کھولے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں، ایسے ہی نوشتے ہمارے پاس آنے چاہئیں، آگے اس بیہودہ درخواست کا رَدّ ہے کہ یہ) ہرگز نہیں (ہوسکتا کیونکہ نہ اس کی ضرورت، اور نہ ان لوگوں کو اس کی لیاقت، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس درخواست کا سبب یہ نہیں ہے کہ دِل میں ان کے اِرادہ ہو کہ اگر ایسا ہوگا تو اِتباع کرلیں گے) بلکہ (سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ آخرت (کے عذاب) سے نہیں ڈرتے (اس لئے حق کی طلب نہیں ہے اور یہ درخواستیں محض ضد اور ہٹ دھرمی

---

[1] ترجمہ: سو نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے۔

[2] ترجمہ: جب تک کہ آپ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ لاویں جس کو ہم پڑھ بھی لیں۔

سے ہیں حتیٰ کہ اگر یہ درخواستیں بالفرض پوری بھی ہو جائیں تب بھی یہ لوگ اتباع نہ کریں۔ لقولہٖ تعالیٰ: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ [1] (الانعام) آگے بطور نتیجے کے اس کا رَدّ اور اس پر زجر ہے کہ جب اس درخواست کا بیہودہ ہونا ثابت ہو گیا تو یہ) ہرگز نہیں (ہوسکتا، بلکہ) یہ قرآن (ہی) نصیحت (کے لئے کافی) ہے، (دُوسرے صحیفوں کی حاجت نہیں) سو (اس حالت میں) جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے (اور جس کا جی چاہے نہ کرے، جہنم میں جائے، ہم کو کوئی ضرورت نہیں کہ مطلوبہ قسم کے نوشتے نازل کریں) اور (قرآن کے تذکرہ یعنی ہدایت ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ بعض لوگوں کو اس سے تذکرہ و ہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن گو فی نفسہٖ تذکرہ ہے، لیکن) بدون خدا کے چاہے یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کریں گے (اور اس نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہیں، لیکن قرآن فی نفسہٖ تذکرہ ضرور ہے، پس اس سے تذکرہ حاصل کرو اور خدا کی اطاعت کرو، کیونکہ) وہی ہے جس (کے عذاب) سے ڈرنا چاہئے، اور (وہی ہے) جو (بندوں کے گناہ) معاف کرتا ہے (کقولہٖ تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۷ [2] (الاعراف))۔

معارف و مسائل

سورۂ مُدَّثِّر قرآنِ کریم کی ان سورتوں میں سے ہے جو نزولِ قرآن کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس سورت کو سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت بھی کہا ہے، اور روایاتِ صحیحہ معروفہ کی رُو سے سب سے پہلے سورۂ اِقْرَاْ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ پھر کچھ مدّت تک نزولِ قرآن کا سلسلہ بند رہا، جس کو زمانہ فترتِ وحی کا کہا جاتا ہے، اسی زمانۂ فترت کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے، اُوپر سے کچھ آواز سنی تو آپ نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی، دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں سورۂ اِقْرَاْ کی آیات لے کر آیا تھا، وہی آسمان کے نیچے فضاء میں ایک معلق کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، اس کو اس حال میں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہی طبعی رُعب و ہیبت کی کیفیت طاری ہوگئی جو غارِ حرا میں نزولِ اِقْرَاْ کے وقت ہوئی تھی، سخت سردی اور کپکپی کے احساس سے آپ گھر میں واپس تشریف لے گئے اور فرمایا ''زَمِّلُوْنِيْ! زَمِّلُوْنِيْ!'' یعنی ''مجھے ڈھانپو، مجھے ڈھانپو'' آپ کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے، اس پر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، کما فی

---

[1] ترجمہ: اور اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ پر نازل فرماتے پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ نہیں مگر صریح جادو ہے۔

[2] ترجمہ: بلاشبہ آپ کا رَبّ واقعی جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا ہے۔

حدیث الصحیحین۔[1] اسی لئے اس سورت میں آپ کو خطاب یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ کے الفاظ سے کیا گیا۔ یہ لفظ دِثَارٌ سے مشتق ہے، جو اُن زائد کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو آدمی عام لباس کے اُوپر کسی سردی وغیرہ کے دفع کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا ہے۔ اس لفظ سے خطاب ایک حبیبانہ، مشفقانہ خطاب ہے، جیسا کہ ''مُزَّمِّلُ'' میں بیان ہو چکا ہے۔ لفظ ''مُزَّمِّل'' کے معنی بھی اسی کے قریب ہیں۔ رُوح المعانی میں جابر بن زید تابعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سورۂ مدثر، مزمل کے بعد نازل ہوئی ہے،[2] اور بعض حضرات نے یہ روایت حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کی ہے، مگر صحیحین کی جو روایت اُوپر نقل کی گئی ہے اس میں اس کی تصریح ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی، (اور مراد یہ ہے کہ فترتِ وحی کے بعد سب سے پہلے یہ سورت نازل ہوئی) اگر مزمل کا نزول اس سے پہلے ہوا ہوتا تو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ راویٔ حدیث اس کو بیان کرتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ لفظ مزمل اور مدثر دونوں تقریباً ہم معنی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ایک ہی واقعے میں ان دونوں کا نزول ہوا ہو، اور وہ واقعہ وہی جبرائیل امین علیہ السلام کو آسمان کے نیچے کرسی پر بیٹھے دیکھنے کا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں واپس ہوکر کپڑوں میں لپٹ جانے کا ہو جو اُوپر مذکور ہوا ہے، اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ سورۂ مزمل اور مدثر کی ابتدائی آیتیں فترتِ وحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں، ان دونوں میں کون مقدم اور کون مؤخر ہے؟ اس میں روایتیں مختلف ہوگئیں، اور سورۂ اِقْرَاْ کی اِبتدائی آیات کا ان سب سے پہلے نازل ہونا تمام روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے، اور یہ دونوں سورتیں اگرچہ متقارب زمانے میں ایک ہی واقعے میں نازل ہوئی ہیں، مگر فرق دونوں میں یہ ہے کہ سورۂ مزمل کے شروع میں جو اَحکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں اُن میں اپنی ذاتی شخصی اصلاح سے متعلق ہیں۔ اور سورۂ مدثر کے شروع میں جو اَحکام دیئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اِصلاحِ خلق سے ہے۔

سورۂ مدثر میں سب سے پہلا حکم آپ کو یہ دیا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ یعنی کھڑے ہوجایئے، اس کے معنی حقیقی قیام کے بھی ہوسکتے ہیں کہ آپ جو کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے ہیں، اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے۔ اور یہ معنی بھی بعید نہیں کہ قیام سے مراد کام کے لئے مستعد اور تیار ہونا ہو، اور مطلب یہ ہو کہ اب آپ ہمت کر کے خلقِ خدا کی اصلاح کی خدمت سنبھالیئے۔ فَاَنْذِرْ ۝ اِنذار سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈرانے کے ہیں، مگر ایسا ڈرانا جو شفقت و محبت پر مبنی

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی ...إلخ، ج:۱ ص:۳، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱ ص:۹۰

[2] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۱ ص:۳۶۹

ہوتا ہے، جیسے باپ اپنے بچے کو سانپ، بچھو اور آگ سے ڈراتا ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہی شان ہوتی ہے، اس لئے اُن کا لقب نذیر اور بشیر ہوتا ہے۔ نذیر کے معنی شفقت و ہمدردی کی بنا پر مضر چیزوں سے ڈرانے والا، اور بشیر کے معنی خوش خبری سنانے والا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دونوں ہی لقب قرآنِ کریم میں جا بجا مذکور ہیں، مگر اس جگہ صرف انذار کے ذِکر پر اِکتفا اس لئے کیا گیا کہ اس وقت مؤمن مسلمان تو گنے چنے چند ہی تھے، باقی سب منکرین و کفار تھے جو کسی بشارت کے مستحق نہیں، بلکہ ڈرانے ہی کے مستحق تھے۔

دُوسرا حکم:- یہ دیا گیا کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ یعنی صرف اپنے رَبّ کی بڑائی بیان کیجئے، قول سے بھی، عمل سے بھی، لفظ رَبّ اس جگہ اس لئے اِختیار کیا گیا کہ یہ خود علت اس حکم کی ہے کہ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے، صرف وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے، تکبیر کے لفظی معنی اللہ اکبر کہنے بھی آتے ہیں، جس میں نماز کی تکبیرِ تحریمہ اور دُوسری تکبیرات بھی داخل ہیں، اور خارجِ نماز بھی اَذان، اِقامت وغیرہ کی تکبیر اس میں شامل ہیں۔ اس حکم کو نماز کی تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ مخصوص قرار دینے کا الفاظِ قرآن میں کوئی اشارہ نہیں۔

تیسرا حکم:- یہ دیا گیا وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ ثِيَابٌ، ثَوْبٌ کی جمع ہے، اس کے اصلی اور حقیقی معنی کپڑے کے ہیں، اور مجازی طور پر عمل کو بھی ثوب اور لباس کہا جاتا ہے، قلب اور نفس کو بھی، اور خلق اور دین کو بھی، انسان کے جسم کو بھی لباس سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے شواہد قرآن اور محاوراتِ عرب میں بکثرت ہیں۔ اس آیت میں حضراتِ مفسرین سے سبھی معانی منقول ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ کوئی تضاد اور اِختلاف نہیں۔ بطور عموم مجاز کے اگر ان الفاظ سے سبھی معنی مراد لئے جائیں تو کوئی بُعد نہیں، اور معنی اس حکم کے یہ ہوں گے کہ اپنے کپڑوں اور جسم کو ظاہری ناپاکیوں سے پاک رکھئے، قلب اور نفس کو باطل عقائد و خیالات سے اور اَخلاقِ رذیلہ سے پاک رکھئے، پائجامہ یا تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی ممانعت بھی اس سے مستفاد ہوتی ہے، کیونکہ نیچے لٹکے ہوئے کپڑوں کا آلودہ ہو جانا بعید نہیں، تو تطہیرِ ثوب کے حکم میں یہ بھی آ گیا کہ کپڑوں کا اِستعمال اس طرح کرو کہ نجاست سے دُور رہیں۔ اور کپڑوں کے پاک رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ مالِ حرام سے نہ بنائے جائیں، کسی ایسی وضع و ہیئت کے نہ بنائے جائیں جو شرعاً ممنوع ہیں، اور ظاہر آیت سے یہ ہے کہ یہ تطہیرِ ثوب کا حکم نماز کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام حالات میں عام ہے، اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ غیر حالتِ نماز میں بھی بغیر کسی ضرورت کے جسم کو ناپاک رکھنا یا ناپاک کپڑے پہنے رکھنا، یا ناپاک جگہ میں بیٹھے رہنا جائز نہیں، ضرورت کے اوقات مستثنیٰ ہیں۔ (از مظہری) [1]

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۲۵

اللہ تعالیٰ طہارت کو پسند فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرۃ) [1] اور حدیث میں طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ [2] اس لئے مسلمان کو ہر حال میں اپنے جسم اور مکان اور لباس کی ظاہری طہارت کا بھی اہتمام رکھنا ضروری ہے اور قلب کی باطنی طہارت کا بھی۔ واللہ اعلم۔

چوتھا حکم:- یہ دیا گیا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ رُجْزٌ بضم الراء وکسرها دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، ائمہ تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری، ابن زید وغیرہ رحمہم اللہ نے اس جگہ رُجز کے معنی بتوں کے قرار دیئے ہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں اس سے مراد ہر گناہ اور معصیت منقول ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ بتوں کو یا گناہ ومعصیت کو چھوڑیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی سب کو چھوڑے ہوئے تھے، آپ کو اس کا حکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ بھی ان چیزوں سے دُور رہیں، اور درحقیقت یہ حکم اُمت کے لئے تعلیم ہے، جو غایت تاکید کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے دیا گیا ہے، تاکہ وہ سمجھیں کہ جب پیغمبر معصوم کو بھی اس کا حکم ہے تو ہمیں اس کا کیسا اہتمام کرنا چاہئے۔

پانچواں حکم:- وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ یعنی کسی شخص پر احسان اس نیت سے نہ کیجئے کہ جو کچھ اُس کو دیا ہے، اس سے زیادہ وصول ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ہدیہ، تحفہ اس نیت سے دینا کہ وہ اس کے معاوضے میں اس سے زیادہ دے گا، یہ مذموم ومکروہ ہے، قرآن کی دُوسری آیت سے اگرچہ اس کا جواز عام لوگوں کے لئے معلوم ہوتا ہے، مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں اور شریفانہ اخلاق کے منافی ہے، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو اس کو حرام قرار دیا گیا۔ (قاله ابن عباس رضی الله عنهما) [3]

چھٹا حکم:- وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ صبر کے لفظی معنی اپنے نفس کو روکنے اور قابو میں رکھنے کے ہیں، اس لئے صبر کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر اپنے نفس کو قائم رکھے، اور یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نفس کو روکے، اور یہ بھی داخل ہے کہ مصائب اور تکلیف میں اپنے اختیار کی حد تک جزع فزع اور شکایت سے بچے، اس لئے یہ حکم ایک جامع حکم ہے، جو تقریباً پورے دین کو شامل ہے، اس موقع پر اس حکم کی خصوصیت ممکن ہے اس لئے بھی ہو کہ اُوپر کی آیات میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ عام خلقِ خدا تعالیٰ کو دینِ حق کی طرف دعوت دیں، کفر وشرک اور معاصی سے روکیں، یہ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ مخالفت وعداوت اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو جائیں گے،

---

[1] ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں صاف پاک رہنے والوں سے۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، ج:۱ ص:۱۱۸

[3] تفسیر الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۲۰۲، والسنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب النکاح، باب ما نهاه الله عز وجل، رقم الحدیث:۱۳۷۱۴

اس لئے داعیٔ حق کو صبر وضبط کا خوگر ہونا چاہئے۔ یہ چند احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینے کے بعد قیامت اور اُس کے ہولناک ہونے کا ذِکر ہے، نَاقُوْرْ کے معنی صور کے ہیں، اور نَقْرْ سے مراد صور میں پھونک مار کر آواز نکالنے کے ہیں۔ اور روزِ قیامت کا سبھی کفار کے لئے سخت وشدید ہونا بیان فرمانے کے بعد ایک خاص شریر کافر کے حالات اور اس کے عذابِ شدید کا بیان ہے۔

ولید بن مغیرہ کی آمدنی ایک کروڑ گنیاں سالانہ

یہ کافر ولید بن مغیرہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی مال ودولت اور اَولاد فراوانی کے ساتھ دی تھی، بقول اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما اس کی زمین جائیداد، باغات، مکہ سے طائف تک پھیلے ہوئے تھے، اور بقول ثوری اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ دِینار تھی، بعض نے اس سے کم بھی بتلایا ہے۔ اتنا سب کے نزدیک مُسلّم ہے کہ اس کے کھیت اور باغات کی آمدنی اور پیداوار سال بھر سردی، گرمی کے ہر موسم میں مسلسل رہتی تھی، قرآنِ کریم میں اسی کو فرمایا ہے: وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ اور یہ عرب کا سردار مانا جاتا تھا، لوگوں میں اس کا لقب ریحانہ قریش مشہور تھا، یہ خود اپنے آپ کو بطور فخر وتکبر کے ''وحید ابن الوحید'' یعنی ''یکتا کا بیٹا یکتا'' کہا کرتا تھا کہ نہ قوم میں میری کوئی نظیر ہے، نہ میرے باپ مغیرہ کی۔ (قرطبی) [۱] مگر اس ظالم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اور قرآن کو کلام اِلٰہی یقین کر لینے کے باوجود اس نے جھوٹی بات بنائی اور قرآن کو سحر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہا۔ اس کا واقعہ تفسیر قرطبی میں یہ بیان کیا ہے کہ جب قرآن کی آیت: حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۲﴾ سے اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ [۲] (المؤمن) تک نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کر رہے تھے، ولید بن مغیرہ نے یہ قراءت سنی تو بے ساختہ اس کے کلام اِلٰہی ماننے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:-

> وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ مِنْهُ كَلَامًا مَا هُوَ مِنْ كَلَامِ الْاِنْسِ وَلَا مِنْ كَلَامِ الْجِنِّ، وَاِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهٗ لَيَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ وَمَا يَقُوْلُ هٰذَا بَشَرٌ۔ [۳]
>
> واللہ! میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ کسی انسان کا کلام ہو سکتا ہے، نہ کسی جن کا، اور اس میں بڑی حلاوَت ہے، اور اُس پر خاص رونق ہے، اس کا اعلیٰ پھل دینے والا، اور اَسفل پانی

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۷۱
[۲] ترجمہ: یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے ہر چیز کا جاننے والا ہے۔۔۔۔اسی کے پاس جانا ہے۔
[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۷۴

جاری کرنے والا ہے، وہ بلاشبہ سب سے بالا و بلند ہو کر رہے گا، اس پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا، یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔

عرب کے سب سے بڑے مال دار سردار کا ایسا کہنا تھا کہ پورے قریش میں اس نے ایک زلزلہ ڈال دیا، اور وہ سب اسلام و ایمان کی طرف جھکنے لگے، قریش کے کافر سرداروں کو فکر ہوئی اور جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے، ابوجہل نے کہا کہ فکر نہ کرو میں ابھی جاتا ہوں اس کو ٹھیک کروں گا۔

ابوجہل اور ولید بن مغیرہ کا مکالمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر دونوں کا اِتفاق

ابوجہل، ولید بن مغیرہ کے پاس غمگین صورت بنا کر پہنچا (اور قصداً ایسی بات بنائی جس پر ولید کو غصہ آجائے) ولید نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم غمگین نظر آتے ہو ابوجہل نے کہا کہ غمگین کیسے نہ ہوں یہ سارے باہم چندہ کر کے تجھے مال دیتے ہیں کہ تو اَب بوڑھا ہو گیا ہے، تیری مدد کرنا چاہئے، مگر اَب ان کو یہ معلوم ہوا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابنِ ابی قحافہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے پاس اس لئے جاتے ہو کہ تمہیں کچھ کھانے پینے کو مل جائے اور اُن کی خوشامد میں اُن کے کلام کی تحسین و تعریف کرتے ہو۔ (ظاہر یہ ہے کہ قریش کا چندہ کر کے ولید کو مال دینا بھی جھوٹ تھا، جو صرف اس کو غصہ دِلانے کے لئے بولا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کی چیزیں لینا تو جھوٹ تھا ہی) اس پر ولید بن مغیرہ کے غصے کی انتہا نہ رہی اور اس کے نتیجے میں اُس پر اپنے تکبر و تعلّی کا جنون سوار ہو گیا، کہنے لگا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کے ٹکڑوں کا محتاج ہوں کیا تم کو میرے مال و دولت کی کثرت معلوم نہیں، قسم ہے لات اور عزّیٰ کی (دو بتوں کے نام ہیں) میں اس کا ہرگز محتاج نہیں، البتہ تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجنون ہیں، یہ بات ایسی غلط ہے، اس کا کوئی یقین نہیں کر سکتا، کیا تم میں سے کسی نے اُن کو کوئی مجنونانہ کام کرتے دیکھا ہے، ابوجہل نے اقرار کیا کہ ''لَا وَاللّٰہِ!'' یعنی واللہ! ہم نے کوئی ایسا کام اُن کا نہیں دیکھا۔ پھر ولید نے کہا تم لوگ ان کو شاعر کہتے ہو، کیا تم نے ان کو کبھی شعر کہتے ہوئے سنا ہے (ایسی غلط بات کہنا اپنے آپ کو رُسوا کرنا ہے) ابوجہل نے اس پر بھی یہی کہا ''لَا وَاللّٰہِ'' پھر ولید نے کہا کہ تم لوگ ان کو کذّاب کہتے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے عمر بھر میں کبھی اُن کی کسی بات کو جھوٹا پایا ہے اس پر بھی ابوجہل کو یہی اِقرار کرنا پڑا، ''لَا وَاللّٰہِ'' پھر ولید نے کہا کہ تم لوگ ان کو کاہن کہتے ہو، تو کیا تم نے کبھی ان کے ایسے حالات اور کلمات دیکھے سنے ہیں جو کاہنوں کے ہوا کرتے ہیں ہم کاہنوں کی باتوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، اُن کا کلام کہانت نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی ابوجہل کو یہی اِقرار کرنا پڑا، ''لَا وَاللہِ'' اور پورے قریش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''صادق امین'' کے لقب سے معروف تھے، اب ابوجہل اپنے ان سب بہتانوں سے تو دست بردار ہوگیا، فکر یہ پڑی کہ آخر پھر کیا کہہ کر لوگوں کو اِسلام سے روکا جائے، اس لئے خود ولید ہی کو خطاب کر کے کہا کہ پھر تم ہی بتلاؤ کہ ان کو کیا کہا جائے، اس پر اس نے پہلے تو اپنے دِل میں سوچا، پھر ابوجہل کی طرف نظر اُٹھائی، پھر منہ بسورا، جس سے نفرت کا اظہار ہو، اور آخر میں کہنے لگا کہ ان کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون، شاعر، کاہن، کذاب تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، ہاں ان کو ساحر کہو تو بات چل جائے گی۔ یہ کمبخت خوب جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساحر بھی نہیں اور نہ آپ کے کلام کو ساحروں کا کلام کہا جاسکتا ہے، مگر اس نے بات بنانے کی یہ صورت تجویز کی کہ آپ کے کلام کے آثار بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے ساحروں کے، کیونکہ جیسے جادوگر اپنے عمل سے میاں بیوی، بھائی بھائی میں تفرقہ اور نفرت ڈال دیتے تھے (معاذ اللہ) آپ کے کلام کا بھی یہی اثر ہے کہ جو اِیمان لے آتا ہے اپنے کافر ماں باپ اور عزیزوں سے متنفر ہو جاتا ہے، اس کے اس واقعے کے آخری اجزا ہی کو قرآنِ کریم نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے: اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾ اس میں قَدَّرَ تقدیر سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی تجویز کرنے کے ہیں، مراد اس سے یہ ہے کہ اس کمبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رِسالت پر یقینِ کامل ہوجانے کے باوجود غصہ اور غیرت سے مغلوب ہوکر مخالفت کرنا تو طے کرلیا، مگر صاف جھوٹ بولنے سے پرہیز کرنا چاہتا تھا، کہ اپنی رُسوائی نہ ہو، اس لئے بہت غور و فکر کر کے یہ تجویز نکالی کہ ان کو ساحر اس بنا پر کہو کہ آپ کے کلام اور تلقین سے باپ بیٹے، بھائی بھائی میں تفریق ہوجاتی ہے، جیسے جادو سے ہوتی ہے، اسی تقدیر و تجویز پر حق تعالیٰ نے اس پر مکرّر لعنت قرآن میں فرمائی: فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾

جھوٹ سے کفار بھی پرہیز کرتے تھے

غور کیجئے کہ یہ قریشی سردار سب ہی کفار، فجار اور طرح طرح کے معاصی و فواحش میں گرفتار تھے، مگر جھوٹ ایک ایسا عیب ہے کہ یہ کفار بھی اس سے بھاگتے تھے۔ ابوسفیان کا واقعہ قبل از اِسلام جو دربارِ قیصرِ رُوم میں پیش آیا، اُس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنی جان اور اَولاد تک کو قربان کرنے کے لئے تیار تھے، مگر ایسا جھوٹ بولنے کے لئے تیار نہیں تھے جس سے اُن کو دُنیا میں جھوٹا کہا جائے۔ افسوس ہے کہ اس معکوس ترقی کے زمانے میں یہ عیب، عیب ہی نہیں رہا، بلکہ سب سے بڑا ہنر ہوگیا، اور کفار و فجار ہی نہیں، دِین دار مسلمانوں کے دِلوں سے بھی اس کی

نفرت نکل گئی، بے تکان جھوٹ بولنے اور بلوانے کو فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ (نعوذ باللہ منه)

اولاد کا اپنے پاس موجود ہونا ایک مستقل نعمت ہے

ولید بن مغیرہ پر اللہ تعالیٰ نے جو دُنیا میں اِنعامات مبذول فرمائے تھے، اُن میں ایک یہ بھی فرمایا ہے کہ وَبَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ یعنی اولاد حاضر و موجود۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسا اولاد کا پیدا ہونا اور اس کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے اِنعامات ہیں، اسی طرح اولاد کا اپنے پاس حاضر و موجود ہونا بھی ایک بڑا اِنعام ہے جو والدین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اُن کی حاضری سے اپنی خدمت اور کاروبار میں اِمداد کا فائدہ مزید براں ہے۔ اس معکوس ترقی نے جو یہ زمانہ کر رہا ہے صرف سونے چاندی کے سکوں، بلکہ ان سکوں کے اِقرار ناموں (نوٹوں) کا نام عیش و آرام رکھ لیا ہے، جس کے لئے والدین بڑے فخر سے اولاد کو دُوسرے ملکوں میں پھینک دیتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اگرچہ سالہا سال بلکہ عمر بھر اولاد کی صورت بھی نہ دیکھیں مگر اُن کی بڑی تنخواہ اور آمدنی کی خبر ان کے کانوں تک پہنچتی رہے اور یہ اُس خبر کے ذریعے اپنی برادری میں اپنی برتری ثابت کرتے رہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آرام و راحت کے مفہوم سے بھی بے خبر ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ کو بھلانے کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے کہ وہ خود اپنے آپ کو یعنی اپنے اصلی آرام و راحت کو بھی بھول جائے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے فرمایا: نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ [۱] (الحشر:۱۹)

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ائمۂ تفسیر میں سے مقاتل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ جواب ابوجہل کے کلام کا ہے، اس نے جب یہ آیت سنی کہ جہنم کے خازن اُنیس فرشتے ہیں تو قریشی جوانوں کو خطاب کر کے کہنے لگا کہ محمد کے ساتھی تو فقط اُنیس ہیں، اس کی تمہیں کیا فکر ہوسکتی ہے، اور بیہقی نے سُدّی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ تو ایک بیہودہ کافر قریش جس کو ابوالاسدین کہا جاتا تھا، بول اُٹھا کہ اے قومِ قریش! کچھ فکر نہ کرو، ان اُنیس کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں، میں اپنے داہنے بازو سے دس کو اور بائیں بازو سے نو کو دفع کر کے ان اُنیس کا خاتمہ کر دُوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی [۲] کہ احمقو! اوّل تو فرشتہ ایک بھی سب کے لئے کافی ہے، اور اُنیس کا عدد جو یہاں بتلایا گیا ہے یہ اُن فرشتوں کے بڑوں اور ذمہ داروں کا عدد ہے، ان میں سے ہر ایک کے ماتحت خدائی خدمات اور کفار و فجار کو عذاب دینے کے لئے لاتعداد فرشتے مقرّر ہیں، جن کا عدد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [۳] آگے قیامت اور اَہوالِ قیامت کا ذِکر ہے، اس میں فرمایا: اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾، اِنَّهَا کی ضمیر سَقَرَ کی طرف راجع ہے، جس کا ذِکر اُوپر کی

[۱] ترجمہ: جنھوں نے اللہ سے بے پروائی کی سو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جانوں سے ان کو بے پروا بنادیا۔

[۲] تفسیر الدر المنثور ج:۱۵ ص:۷۸، والتفسیر المظهری ج:۸ ص:۱۲۹

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۸۱

آیات میں آیا ہے۔ كُبَر بضمِ کاف وفتح باء كُبریٰ کی جمع ہے، یہ صفت ہے واهية يا مصيبة کی، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ یہ سقر یعنی جہنم جس میں ان کو داخل کیا جائے گا، بڑی بڑی آفتوں اور مصیبتوں میں سے ایک ہے، اس کے علاوہ اور طرح طرح کے عذاب ہیں۔

لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ یہاں تقدم سے مراد تقدم الی الایمان والطاعة، اور تاخر سے مراد ایمان وطاعت سے پیچھے ہٹنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے ڈرانا جو اُوپر کی آیت میں ہے، یہ ہر ایک انسان کے لئے عام ہے، پھر کوئی یہ ڈر سن کر ایمان واطاعت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے، کوئی بدنصیب اس کے باوجود پیچھے رہ جاتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ ، رَهِيْنَةٌ بمعنی مرہونہ ہے، اور مراد اس سے اس کا محبوس ومقید ہونا ہے، جس طرح کوئی شخص قرض کے بدلے میں کوئی چیز رہن رکھ دے تو وہ چیز قرض خواہ کے قبضے میں محبوس رہتی ہے، مالک اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اسی طرح قیامت کے روز ہر ایک نفس اپنے گناہوں کے بدلے میں محبوس اور مقید رہے گا، مگر اَصحاب الیمین اس حبس اور قید سے مستثنیٰ ہوں گے۔

یہاں حبس سے مراد جہنم میں محبوس ہونا بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر مذکور میں لیا گیا ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص اپنے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں محبوس رہے گا، مگر اَصحاب الیمین اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس سیاق سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اصحاب الیمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا قرض ادا کردیا، یعنی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے سب حقوق دُنیا میں ادا کردیئے تھے، یا اللہ تعالیٰ اور بندوں نے معاف کردیئے، وہ فرض اور قرض سب ادا کرچکے، اُن کے نفوس کے مرہون ہونے کی کوئی وجہ نہیں، یہ تفسیر بظاہر صاف وبے تکلف ہے۔ اور اگر حبس سے مراد حساب کتاب اور جنت دوزخ کے داخلے سے پہلے کسی جگہ محبوس ہونا ہے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ تمام نفوس اپنے اپنے حساب کے لئے محبوس ہوں گے، جب تک حساب نہ ہوجائے کوئی کہیں نہ جاسکے گا۔ اس صورت میں اصحاب الیمین جو مستثنیٰ کئے گئے اُن سے مراد یا تو وہ معصومین ہوسکتے ہیں جن کے ذمے حساب نہیں، جیسے نابالغ بچے، كما هو قول علیؓ كرّم الله وجهه یا پھر وہ لوگ جن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اس اُمت کے بہت سے لوگ حساب سے مستثنیٰ کردیئے جائیں گے، وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔[1] اور سورۂ واقعہ میں جو حاضرینِ محشر کی تین قسمیں بتلائی ہیں، ایک سابقین ومقربین، دُوسرے اَصحابُ الیمین، تیسرے اَصحابُ الشمال۔ یہاں مقربین کو بھی اَصحاب الیمین میں شامل کرکے صرف اَصحاب الیمین کے ذِکر پر اِکتفا کیا گیا، لیکن اس معنی کے اِعتبار سے تمام اَصحاب الیمین کا حساب کے لئے محبوس ہونے

[1] صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب يدخل الجنّة سبعون الفًا بغير حساب، ج:۲ ص:۹۶۸

سے استثناء کسی نص سے ثابت نہیں، یہ معنی پہلی تفسیر یعنی جبس فی جہنم ہی کے ساتھ دُرست ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾، تَنْفَعُهُمْ کی ضمیر اُن مجرمین کی طرف راجع ہے جن کا ذِکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے چار جرائم کا اعتراف کیا، ایک یہ کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے، دُوسرے یہ کہ وہ کسی مسکین غریب کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مراد یہ ہے کہ غریبوں کی ضروریات پر خرچ نہیں کرتے تھے، تیسرے یہ کہ اہلِ باطل جو اِسلام وایمان کے خلاف باتیں کرتے یا معاصی وفواحش میں مبتلا ہوتے ہیں یہ بھی ان کے ساتھ لگے رہتے تھے، اُن سے بیزاری کا اِظہار نہیں کرتے تھے، چوتھے یہ کہ قیامت کا اِنکار کرتے تھے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ایسے مجرم جو ان سب گناہوں کے مرتکب ہوں، جن میں قیامت کی تکذیب بھی داخل ہے، جو عین کفر ہے، ایسے مجرموں کے لئے کسی کی شفاعت نافع نہ ہوگی، کیونکہ یہ کفار ہیں، کسی کافر کی شفاعت کرنے کی بھی کسی کو اِجازت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی کرے تو قبول نہیں ہوگی، خواہ سارے شفاعت کرنے والے جمع ہو کر شفاعت کا زور لگائیں، ہرگز نفع نہیں دے گی، اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾ بصیغہ جمع لایا گیا ہے۔

کافر کے لئے کسی کی شفاعت نافع نہیں، مؤمن کے لئے نافع ہوگی

اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ کفار کے علاوہ مسلمانوں کے لئے اگرچہ وہ گنہگار ہوں، شفاعت نفع دے گی، جیسا کہ بہت سی احادیثِ صحیحہ میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء، صلحاء بلکہ عام مؤمنین کا دُوسروں کی شفاعت کرنا اور قبول ہونا ثابت ہے۔ [۱]

فائدہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ [۲] نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے اور انبیاء اور شہداء وصالحین، گناہگاروں کی شفاعت کریں گے، اور وہ اُن کی شفاعت سے جہنم سے نکال لئے جائیں گے، بجز ان چار قسم کے مجرمین کے جن کا ذِکر اُوپر آیا ہے، یعنی جو نماز وزکوٰۃ کے تارک ہیں، اور جو اہلِ باطل کفار کی خلافِ اسلام باتوں میں شریک رہتے ہیں، اور جو قیامت کا اِنکار کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے نماز اور تارکِ زکوٰۃ کے لئے شفاعت قبول نہیں ہوگی۔ مگر دُوسری روایات سے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں جن لوگوں کی شفاعت قبول نہ ہونا مذکور ہے، وہ مراد ہیں جو اُن چاروں

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۳۲، وسنن ابی داود، کتاب السُّنَّة، باب ذکر البعث والصُّور والشّفاعة، ج:۲ ص:۶۵۲، وجامع الترمذی، ابواب صفة القیامة ...إلخ، باب ما جاء فی الشّفاعة، ج:۲ ص:۶۹

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۳۳

جرائم کے مجرم ہوں، جن میں تکذیبِ قیامت بھی داخل ہے۔ تکذیب کے علاوہ الگ الگ دُوسرے جرم کرنے والے کی یہ سزا ہونا ضروری نہیں، مگر بعض روایاتِ حدیث میں خاص خاص گناہوں کے مرتکب کے متعلق بھی یہ آیا ہے کہ وہ شفاعت سے محروم رہے گا، جیسے حدیث میں ہے کہ جو شخص شفاعت کے حق ہونے ہی کا منکر ہو، یا حوضِ کوثر کے وجود کا منکر ہو، اس کا شفاعت اور حوضِ کوثر میں کوئی حصہ نہیں۔ [1]

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۴۹﴾ یہاں تذکرہ سے مراد قرآنِ حکیم ہے، کیونکہ تذکرہ کے لفظی معنی یاد دِلانے والی چیز کے ہیں، اور قرآن اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال اور اُس کی رحمت و غضب اور ثواب و عذاب کو یاد دِلانے میں بے نظیر ہے۔ اور آخر میں فرمایا: كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ یعنی بلاشبہ قرآن تذکرہ ہے، جس کو تم نے چھوڑ رکھا ہے۔

قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ کے معنی شیر کے بھی آتے ہیں اور تیر انداز شکاری کے بھی، اس جگہ صحابۂ کرام سے دونوں منقول ہیں۔

هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ اللہ تعالیٰ کا اہلِ تقویٰ ہونا بایں معنی ہے کہ صرف وہی اس کا مستحق ہے کہ اُس سے ڈرا جائے، اور اُس کی نافرمانی سے بچا جائے، اور اہلِ مغفرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی ایسی ذات ہے جو بڑے سے بڑے مجرم گناہگار کو اُس کے سب گناہ جب چاہتے ہیں بخش دیتے ہیں، اور کسی کا یہ حوصلہ نہیں ہوسکتا۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ بِحَمْدِ اللّٰهِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۲۵ رَجَب ۱۳۹۱ھ

[1] فتح الباری، باب صفة الجنّة والنّار، تحت الحدیث رقم: ۶۱۹۰، ان احادیث کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تفسیر المظھری ج: ۱۰ ص: ۱۳۴

سُورَةُ القِيٰمَةِ

اٰیاتها ۴۰ ۷۵ سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ ۳۱ رکوعاتها ۲

سورۂ قیامت مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢ؕ

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے بُرائی پر

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝٣ؕ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ

کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ جمع نہ کریں گے ہم اُس کی ہڈیاں کیوں نہیں ہم ٹھیک کر سکتے ہیں

بَنَانَهٗ ۝٤ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝٥ۚ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ

اُس کی پوریاں، بلکہ چاہتا ہے آدمی کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے پوچھتا ہے کب ہوگا دن

الْقِيٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ

قیامت کا پھر جب چندھیانے لگے آنکھ اور گہ جائے چاند، اور اکٹھے ہوں سورج

وَالْقَمَرُ ۝۹ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱

اور چاند، کہے گا آدمی اُس دن کہاں چلا جاؤں بھاگ کر، کوئی نہیں کہیں نہیں ہے بچاؤ

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ

تیرے رَبّ تک ہے اُس دن جاٹھہرنا، جتلادیں گے انسان کو اُس دن جو اُس نے آگے بھیجا

وَاَخَّرَ ۝۱۳ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵

اور پیچھے چھوڑا، بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے، اور پڑا لاڈالے اپنے بہانے،

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ

نہ چلا تو اُس کے پڑھنے پر اپنی زبان تا کہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینہ میں

وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا

اور پڑھنا تیری زبان سے، پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتے کی زبانی تو ساتھ رہ اُس کے پڑھنے کے، پھر مقرّر ہمارا ذِمہ ہے

بَيَانَهٗ ۝۱۹ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱

اس کو کھول کر بتلانا، کوئی نہیں، پر تم چاہتے ہو جو جلد آئے، اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے،

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ

کتنے منہ اُس دن تازہ ہیں، اپنے رَبّ کی طرف دیکھنے والے، اور کتنے منہ اُس دن

بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾

اُداس ہیں، خیال کرتے ہیں کہ اُن پر وہ آئے جس سے ٹوٹے کمر، ہرگز نہیں جس وقت جان پہنچے ہانس تک،

وَ قِيْلَ مَنْ سکتۃ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ

اور لوگ کہیں کون ہے جھاڑنے والا اور وہ سمجھا کہ اب آیا وقت جدائی کا، اور لپٹ گئی پنڈلی پر

بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ﹰالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾

پنڈلی، تیرے رَبّ کی طرف ہے اُس دن کھینچ کر چلا جانا، پھر نہ یقین لایا اور نہ نماز پڑھی،

وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

پھر جھٹلایا اور منہ موڑا، پھر گیا اپنے گھر کو اکڑتا ہوا،

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ

خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری، پھر خرابی تیری خرابی پر، خرابی تیری، کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا

سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ

بے قید بھلا نہ تھا وہ ایک بوند منی کی جو ٹپکی پھر تھا لہو جما ہوا، پھر اُس نے بنایا

فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ

اور ٹھیک کر اُٹھایا، پھر کیا اس میں جوڑا نر اور مادہ، کیا یہ (خدا)

بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

زندہ نہیں کر سکتا مُردوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، ① اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی، (کہ ہم انسان کو ضرور
دوبارہ زندہ کریں گے) ② کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو اِکٹھا نہیں کرسکیں گے؟ ③ کیوں نہیں؟ جبکہ ہمیں
اس پر بھی قدرت ہے کہ اُس کی اُنگلیوں کے پور پور کو ٹھیک ٹھیک بنادیں۔ ④ اصل بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ اپنی
آگے کی زندگی میں بھی ڈھٹائی سے گناہ کرتا رہے۔ ⑤ پوچھتا ہے کہ: ''کب آئے گا وہ قیامت کا دِن؟'' ⑥ پھر جب
آنکھیں چندھیا جائیں گی، ⑦ اور چاند بے نور ہوجائے گا، ⑧ اور چانداور سورج اکٹھے کردیئے جائیں گے، ⑨ اُس وقت
انسان کہے گا کہ: ''کہاں ہے کوئی جگہ جہاں بھاگ کر جاؤں؟'' ⑩ نہیں نہیں! پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ ⑪ اُس دن تو ہر
ایک کو تمہارے پروردگار ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا پڑے گا۔ ⑫ اُس دن ہر انسان کو جتلا دیا جائے گا کہ اُس نے کیا کچھ
آگے بھیجا ہے، اور کیا کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔ ⑬ بلکہ انسان خود اپنے آپ سے اچھی طرح واقف ہوگا، ⑭ چاہے وہ کتنے
بہانے بنائے۔ ⑮ —— (اے پیغمبر!) تم اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو ہلایا نہ کرو۔ ⑯ یقین
رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، ⑰ پھر جب ہم اسے (جبرئیل کے واسطے سے) پڑھ رہے ہوں تو تم
اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ ⑱ پھر اُس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ⑲ —— خبردار (اے کافرو!)! اصل
بات یہ ہے کہ تم فوری طور پر حاصل ہونے والی چیز (یعنی دُنیا) سے محبت کرتے ہو، ⑳ اور آخرت کو نظر انداز کئے ہوئے
ہو۔ ㉑ اُس دن بہت سے چہرے شاداب ہوں گے، ㉒ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، ㉓ اور بہت سے
چہرے اُس دن بگڑے ہوئے ہوں گے، ㉔ سمجھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ وہ معاملہ ہوگا جو کمر توڑ دینے والا
ہے۔ ㉕ خبردار! جب جان ہنسلیوں تک پہنچ جائے گی، ㉖ اور (تیمارداروں کی طرف سے) کہا جائے گا کہ: ''ہے کوئی
جھاڑ پھونک کرنے والا؟'' ㉗ اور اِنسان سمجھ جائے گا کہ جدائی کا وقت آگیا، ㉘ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی ㉙
تو اُس دن تمہارے پروردگار ہی کی طرف روانگی ہوگی۔ ㉚ اس کے باوجود اِنسان نے نہ مانا، اور نہ نماز پڑھی، ㉛ بلکہ
حق کو جھٹلایا، اور منہ موڑ لیا، ㉜ پھر اَکڑ دِکھاتا ہوا اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا۔ ㉝ بربادی ہے تیری، ہاں بربادی
ہے تیری! ㉞ پھر سن لے کہ بربادی ہے تیری، ہاں بربادی ہے تیری! ㉟ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ دیا
جائے گا؟ ㊱ کیا وہ اُس منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو (ماں کے رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ ㊲ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے

اُسے بنایا، اور اُسے ٹھیک ٹھاک کیا، (۳۸) نیز اُسی سے مرد اور عورت کی دو صنفیں بنائیں، (۳۹) کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو پھر سے زندہ کر دے؟ (۴۰)

خلاصہ تفسیر

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اُوپر ملامت کرے (یعنی نیکی کر کے کہے کہ میں نے کیا کیا ہے، اس میں اِخلاص نہ تھا، اس میں فلانی خرابی رہ گئی تھی، اور گناہ ہو جائے تو بہت ہی نادم ہو۔ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباس والحسن، رضی اللہ عنہما۔[۱] پس اس معنی کے اعتبار سے یہ نفسِ مطمئنہ کو بھی شامل ہے۔ اور جوابِ قسم محذوف ہے، یعنی تم ضرور مبعوث ہو گے، اور ان دونوں قسموں کا مناسبِ مقام ہونا ظاہر ہے قیامت کا تو اس لئے کہ وہ ظرف ہے حشر و نشر کا، اور نفسِ لوامہ کا اس لئے کہ ایسا نفس قیامت کی عملی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے، آگے منکرینِ بعث پر رَدّ ہے یعنی) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں ہرگز جمع نہ کریں گے (انسان سے مراد کافر، اور ہڈیوں کی تخصیص اس لئے کہ اصل عمادِ بدن یہی ہیں۔ آگے اس اِنکار کا جواب ہے یعنی) ہم ضرور جمع کریں گے (اور یہ جمع کرنا ہم کو کچھ دُشوار نہیں) کیونکہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی اُنگلیوں کی پوریوں تک دُرست کر دیں (پوریوں کی تخصیصِ ذکری دو وجہ سے ہے، ایک یہ کہ اطرافِ بدن ہیں، اور تکمیل ہر شے کے بننے کی اس کے اطراف پر ہوتی ہے، چنانچہ ہمارے محاورے میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ میرے پور پور میں درد ہے، یعنی تمام بدن میں، دُوسرے یہ کہ پوریوں میں باوجود چھوٹی ہونے کے صنعت کی رعایت زیادہ ہے، اور عادۃً یہ زیادہ دُشوار ہے، پس جو اس پر قادر ہوگا، وہ آسان پر بدرجۂ اَولیٰ قادر ہوگا، لیکن بعضا آدمی قدرتِ اِلٰہیہ میں غور نہیں کرتا اور قیامت کا قائل نہیں ہوتا) بلکہ (ایسا) بعضا آدمی (قیامت کا منکر ہو کر) یوں چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی (بے خوف و خطر ہو کر) فسق و فجور کرتا رہے (اس لئے بطور اِنکار کے) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دِن کب آئے گا (یعنی چونکہ اپنی تمام عمر معاصی و شہوات میں گزارنا طے کر چکا ہے، اس لئے اس کو طلبِ حق کی نوبت ہی نہیں آتی کہ قیامت کا ہونا اس کو ثابت ہو، اس لئے اِنکار پر مصر ہے، اور اِنکاراً پوچھتا ہے کہ کب آئے گی) سو جس وقت (مارے حیرت کے) آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی (اور وجہ اس حیرت کی یہ ہوگی کہ جن اُمور کی تکذیب کرتا تھا، وہ دفعۃً نظر آ جائیں گے، کذا فی الجلالین)[۲] اور چاند بے نور ہو جائے گا، اور (چاند کی کیا تخصیص ہے، بلکہ) سورج اور چاند (دونوں) ایک حالت کے ہو جائیں گے (یعنی دونوں بے نور ہو جائیں گے، جیسا حدیثِ بخاری میں

[۱] تفسیر الدر المنثور ج:۱۵ ص:۹۶

[۲] تفسیر الجلالین تحت هذه الآیة ص:۴۸۱

آیا ہے: تُکَوِّرَانِ وَمَعْنٰی کُوِّرَتْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا: اَظْلَمَتْ، رواھما فی الدّر المنثور، سورۃ التکویر[1]۔ اور چاند کو جدا بیان کرنا شاید اس لئے ہو کہ عرب کو بوجہ قمری حساب رکھنے کے اُس کا حال دیکھنے کا زیادہ اہتمام تھا) اس روز اِنسان کہے گا کہ اب کدھر بھاگوں (ارشاد ہوتا ہے کہ) ہرگز (بھاگنا ممکن) نہیں (ہوگا، کیونکہ) کہیں پناہ کی جگہ نہیں (ہوگی) اس دن صرف آپ ہی کے رَبّ کے پاس ٹھکانا (جانے کا) ہے (پھر خواہ جنت میں بھیجیں یا دوزخ میں، اور رَبّ کے سامنے جانے کے وقت) اس روز اِنسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جائے گا (اور اِنسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا) بلکہ انسان خود اپنی حالت پر (بوجہ انکشاف ضروری کے) خوب مطلع ہوگا گو (باقتضائے طبیعت اس وقت بھی) اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے (جیسے کفار کہیں گے: وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾[2] (الانعام) مگر دِل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اپنے سب حال کو خوب جانتا ہوگا، اس لئے جتلانا اعلام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ تنبیہ و اِتمامِ حجت و قطع جواب کے لئے ہوگا، اور) اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) یُنَبَّؤُا اور بَلِ الْاِنْسَانُ سے دو مضمون مستفاد ہوئے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں۔ دُوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب حکمت مقتضی ہوتی ہے تو علومِ غائبہ کثیرہ کو ذہنِ مخلوق میں حاضر کر دیتا ہے، گو اُن علومِ غائبہ کا حاضر ہوجانا خلافِ عادتِ طبعی ہو، جیسا کہ قیامت میں اس کا وقوع ہوگا، جب یہ بات ہے تو آپ نزولِ وحی کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے، اس قدر مشقت کہ سنتے بھی ہیں، پڑھتے بھی ہیں، دھیان بھی رکھتے ہیں، محض اس احتمال سے کیوں برداشت کرتے ہیں کہ شاید کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل جائے، کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں حاضر رکھے جائیں اور ہمارا اس پر قادر ہونا تو ظاہر ہی ہے، اس لئے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیا کیجئے، اور جب وحی نازل ہوا کرے تو) آپ (قبل وحی ختم ہوچکنے کے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اُس کو جلدی جلدی لیں (کیونکہ) ہمارے ذِمہ ہے (آپ کے قلب میں) اُس کا جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) اُس کا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذِمہ ہے) تو جب ہم اُس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ (اپنے ذہن سے اور فکر سے ہمہ تن) اُس کے تابع ہوجایا کیجئے (یعنی اُدھر ہی متوجہ ہوجایا کیجئے اور اُس کے دُہرانے میں مشغول نہ ہوا کیجئے، کقولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ... اِلخ[3] (طٰہٰ:۱۱۴)) پھر (آپ کی زبان سے لوگوں کے سامنے) اس کا بیان کرا دینا (بھی) ہمارے

[1] الدر المنثور، تفسیر سورۃ التکویر ج:۱۵ ص:۲۵۷

[2] ترجمہ: قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔

[3] ترجمہ: اور قرآن میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہوچکے عجلت نہ کیا کیجئے۔

ذِمہ ہے (یعنی آپ کو یاد کرادینا اور آپ کی زبان پر جاری کرادینا، پھر تبلیغ کے وقت بھی اُس کا یاد رکھوانا اور لوگوں کے سامنے پڑھوا دینا، یہ سب ہمارے ذِمہ ہے اور یہ مضمون اِستطرادًا آ گیا تھا، آگے پھر عود ہے خطاب منکرین کی طرف یعنی) اے منکرو! (انسان کا اعمال متقدمہ ومتاخرہ پر مطلع کیا جانا قیامت میں ضرور ہے، اور جیسا تم سمجھ رہے ہو کہ قیامت نہ ہوگی) ہرگز ایسا نہیں (اور نہ تمہارے پاس اس نفی کی کوئی دلیل ہے) بلکہ (صرف بات یہ ہے کہ) تم دُنیا سے محبت رکھتے ہو اور (اُس محبت میں منہمک ہوکر) آخرت (سے غافل ہو، اور غفلت کے سبب اُس) کو چھوڑ بیٹھے ہو (پس بنا تمہاری اس نفی کی محض فاسد ہے، سو قیامت ضرور ہوگی، اور ہر ایک کو اُس کے اعمال پر مطلع کر کے اُن اعمال کے مناسب جزا ملے گی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ) بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے، اور بہت سے چہرے اُس روز بدرونق ہوں گے (اور وہ لوگ) خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ کیا جائے گا (یعنی اس کو عذابِ شدید ہوگا۔ آگے دُنیا کی محبت پر زجر ہے کہ تم جو دُنیا کو محبوب اور آخرت کو متروک ہونے کے قابل سمجھ رہے ہو) ہرگز ایسا نہیں (کیونکہ دُنیا سے ایک روز مفارقت ہونے والی ہے، اور بالآخر آخرت میں جانا ہے، جس کا بیان یہ ہے کہ) جب جان ہنسلی تک پہنچ جاتی ہے اور (نہایت حسرت سے اُس وقت) کہا جاتا ہے (یعنی تیماردار کہتے ہیں) کہ (ارے) کوئی جھاڑ (پھونک کر) نے والا بھی ہے (مراد مطلق معالج ہے، چونکہ عرب میں جھاڑ پھونک کا زیادہ چرچا تھا، اس لئے رَاقٍ سے تعبیر کیا) اور (اس وقت) وہ (مردہ) یقین کر لیتا ہے کہ یہ مفارقت (دُنیا) کا وقت ہے اور (شدّتِ سکراتِ موت سے) ایک پنڈلی دُوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے (مراد اس سے ظہور آثارِ سکراتِ موت ہے، کچھ تخصیص ساقین کے لپٹ جانے کی نہیں، اس کا ذِکر تمثیلاً ہے، جب یہ حالتیں پیش آتی ہیں تو اے شخص) اس روز تیرے رَبّ کی طرف جانا ہوتا ہے (پس ایسی حالت میں حبِ عاجلہ وترکِ آخرت کس درجہ نادانی ہے، پھر خدا کے پاس پہنچنے کے بعد اگر وہ کافر ہے) تو (اُس کا بُرا حال ہوگا، کیونکہ) اُس نے نہ تو (خدا ورسول کی) تصدیق کی تھی اور نہ نماز پڑھی تھی، لیکن (خدا ورسول کی) تکذیب کی تھی اور (اَحکام سے) منہ موڑا تھا، پھر (اس پر طرّہ یہ کہ داعیٔ حق سے منہ موڑ کر اس پر اِفتخار اور) ناز کرتا ہوا اپنے گھر چل دیتا تھا۔ (مطلب یہ کہ اوّل تو کفر وعصیان، پھر اس پر ندامت نہیں، بلکہ اور اُلٹا فخر کرتا تھا کہ ہم نے اس طرح حق کو رَدّ کیا، اور باطل پر جمے رہے، اور پھر اس کے بعد طلبِ حق نہیں بلکہ اپنے خدم وحشم میں جا کر اور زیادہ مغرور اور غافل ہو جاتا۔ آگے اس کافر کی بدحالی کا بیان ہے کہ ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے، پھر (مکرّر سن لے! کہ) تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے (تکریر مفرد سے مقدار کی زیادتی مستفاد ہوئی، اور تکریر مجموع سے کیفیت کی زیادتی، اور چونکہ وقوع جزائے مذکور موقوف ہے دو اَمر پر، ایک انسان کا مکلّف ہونا، دُوسرے اس کا مر کر دوبارہ زندہ ہونا، جس کے اِمکان میں اُن کو کلام تھا، اس لئے آگے دونوں مضمون ہیں، یعنی) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی

مہمل چھوڑ دیا جائے گا (نہ اس پر احکام عائد کئے جائیں گے اور نہ اس سے حساب کتاب ہوگا، بلکہ مکلّف ہونا بھی یقینی ہے اور اُس پر باز پُرس ہونا بھی یقینی، اور یہ جو بعث کو محال سمجھتا ہے، یہ بھی اُس کی حماقت ہے) کیا یہ شخص (ابتدا میں محض) ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا، پھر وہ خون کا لوتھڑا ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا، پھر اعضاء دُرست کئے، پھر اُس (انسان) کی دو قسمیں کردیں، مرد اور عورت، (اور یہ فاءِ تفسیر یہ ہے تو) کیا وہ (خدا جس نے ابتدا میں اپنی قدرت سے یہ سب کچھ کیا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مُردوں کو زِندہ کردے (حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے پیدا کرنے کی نسبت آسان ہے)۔

معارف و مسائل

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ یہاں قسم سے پہلے حرف "لا" زائد ہے،، جب قسم کسی مخالف کی بات رَدّ کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے تو اُس کے شروع میں حرف "لا" اُس شخص کے خیالِ باطل کی نفی کے لئے زائد اِستعمال ہوتا ہے، اور محاوراتِ عرب میں یہ استعمال معروف و مشہور ہے۔ ہماری زبان میں بھی بعض اوقات کسی قابلِ تاکید مضمون کے بیان سے پہلے کہا جاتا ہے: "نہیں" آگے اپنا مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ اس سورت میں قیامت و آخرت کے منکروں کو تنبیہ اور اُن کے شکوک وشبہات کا جواب ہے۔ سورت کو اوّل قیامت، پھر نفسِ لوامہ کی قسموں سے شروع فرمایا ہے، اور جوابِ قسم بقرینہ مقام محذوف ہے، یعنی قیامت ضرور آکر رہے گی۔ قیامت کی قسم تو اُس کی عظمت کے اِثبات کے لئے مناسب مقام ہونا ظاہر ہے، اسی طرح نفسِ لوامہ کی قسم میں بھی اس کی عظمت اور مقبولیت عند اللہ کا اظہار ہے، نفس کے معنی جان یا رُوح کے معروف ہیں، اور لوّامہ، لَوْم بفتح اللام سے مشتق ہے جس کے معنی ملامت اور سرزنش کرنے کے ہیں، نفسِ لوامہ سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرکے اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے، یعنی جو گناہ سرزد ہوا یا عملِ واجب میں کوتاہی ہوئی، اُس پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا اور اَعمالِ خیر اور حسنات کے متعلق بھی اپنے آپ کو اس پر ملامت کرے کہ اس سے زیادہ نیک کام کرکے اعلیٰ درجات کیوں نہ حاصل کئے غرض مؤمنِ کامل اپنے ہر عمل خیر و شر اور حسنات وسیئات میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا ہے، گناہ یا واجب میں کوتاہی پر ملامت تو ظاہر ہے، حسنات اور نیک کاموں میں ملامت کی وجہ یہ ہے کہ اے نفس! تو یہ نیکی اس سے زیادہ بھی تو کرسکتا تھا، اُس زیادتی سے کیوں محروم رہا یہ تفسیر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور دُوسرے ائمۂ تفسیر سے منقول ہے۔ (ابنِ کثیر وغیرہ) [1] اور اسی مفہوم کی وجہ سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے نفسِ لوامہ کی تفسیر نفسِ مؤمنہ سے کی ہے۔ اور فرمایا کہ: واللہ! مؤمن تو

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۷۵و۲۷۶، وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۹ ص:۹۳

ہمیشہ ہر حال میں اپنے نفس کو ملامت ہی کرتا ہے، سیئات پر تو ظاہر ہی ہے، اپنے حسنات اور نیک کاموں میں بھی وہ بمقابلہ شانِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے کمی اور کوتاہی محسوس کرتا ہے، کیونکہ حقِ عبادت کو پورا اَدا کرنا تو کسی کے بس میں نہیں، اس لئے ادائے حق میں تقصیر اس کے سامنے رہتی ہے، اُس پر ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوّامہ کی تفسیر

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری وغیرہ کی اس تفسیر پر نفسِ لوّامہ کی قسم کھانا حق تعالیٰ کی طرف سے ایسے نفوسِ مؤمنہ کے اِکرام وشرف کے اِظہار کے لئے ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے کوتاہی پر نادم ہوتے اور اپنے کو ملامت کرتے ہیں۔

نفسِ لوّامہ اور مطمئنہ

اور نفسِ لوّامہ کی اس تفسیر کے مطابق یہ نفسِ مطمئنہ کو بھی شامل ہے، لوّامہ اور مطمئنہ دونوں نفسِ متقی کے لقب ہیں۔

نفسِ اَمارہ، لوّامہ، مطمئنہ

اور حضراتِ صوفیائے کرام نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ نفس اپنی جبلت وفطرت کے اعتبار سے اَمَّارۃ بالسُّوْء ہوتا ہے، یعنی انسان کو بُرے کاموں کی طرف بلانے اور اس میں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے، مگر اِیمان اور عملِ صالح اور ریاضت ومجاہدہ سے یہ نفسِ لوّامہ بن جاتا ہے کہ بُرائی اور کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے، مگر بُرائی سے بالکلیہ اِنقطاع اس کا نہیں ہوتا۔ آگے عملِ صالح میں ترقی اور قربِ حق تعالیٰ کے حصول کی کوشش کرتے کرتے جب اس کا یہ حال ہوجائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلافِ شرع کام سے طبعی نفرت بھی ہونے لگے تو اُس نفس کا لقب مطمئنہ ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے منکرینِ قیامت کے اس عامیانہ شبہ کا جواب ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان مٹی ہوگیا، اُس کی ہڈیاں بھی ریزہ ریزہ ہوکر منتشر ہوگئیں، اُن کو دوبارہ کیسے جمع کر کے زِندہ کیا جائے گا، جس کے جواب میں فرمایا: بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ جس کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں تو اس پر تعجب ہے کہ میّت کے ذرّاتِ منتشرہ اور بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کیسے کیا جائے گا، اور اُن میں دوبارہ حیات کیسے ڈالی جائے گی، حالانکہ یہ بات پہلے ایک مرتبہ مشاہدے میں آچکی ہے کہ ہر انسان کا وجود جو دُنیا میں پلتا اور بڑھتا ہے وہ دُنیا بھر کے مختلف ملکوں خطوں کے اجزا اور ذرّات کا مرکب ہوتا ہے، تو جس ذاتِ قادر نے پہلی مرتبہ ساری دُنیا میں بکھرے ہوئے ذرّات کو ایک انسان کے وجود میں جمع کر دیا تھا، اب دوبارہ جمع کر لینا اس کے

لئے کیوں مشکل ہوگا، اور جس طرح پہلے اس کے ڈھانچے میں رُوح ڈال کر زِندہ کیا تھا، دوبارہ ایسا کرنے میں کیا حیرت کی بات ہے۔

حشرِ اَجساد میں قدرتِ حق تعالیٰ کا عجیب وغریب عمل

غور اس پر کرو کہ ایک انسان جس ہیئت و جسامت اور شکل وصورت پر پہلے پیدا کیا گیا تھا قدرتِ حق دوبارہ بھی اس کے وجود میں اُن ہی ساری چیزوں کو بغیر کسی ادنیٰ فرق کے جمع کردے گی، حالانکہ یہ اربوں پدموں انسان ابتدائے دُنیا سے قیامت تک پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہے، کس کی مجال ہے کہ ان سب شکلوں، صورتوں اور قد وقامت کی کیفیتوں کو الگ الگ یاد بھی رکھ سکے، اُس جیسا دوبارہ بنانا تو بڑا کام ہے، مگر حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ ہم صرف اسی پر قادر نہیں ہیں کہ میّت کے سارے بڑے بڑے اجزاء و اعضا کو دوبارہ اُسی طرح بنادیں، بلکہ انسانی وجود کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی ہم ٹھیک اُسی طرح کردیں گے جس طرح وہ پہلے تھی، اس میں ''بنان''، یعنی اُنگلیوں کے پوروں کا خاص ذِکر فرمایا کہ وہ سب سے چھوٹے اجزا ہیں، جب ان چھوٹے اجزا کی دوبارہ ساخت میں فرق نہیں آیا تو بڑے بڑے اعضا ہاتھ پاؤں وغیرہ میں تو کیا فرق ہوتا۔

اور اگر غور کیا جائے تو شاید ''بنان''، یعنی اُنگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو کہ حق تعالیٰ نے ایک انسان کو دُوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے اُس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے، اور ایک دُوسرے سے ممتاز ہوتا ہے، خصوصاً انسانی چہرہ جو چند اِنچ مربع سے زائد نہیں، اس کے اندر قدرتِ حق نے ایسے اِمتیازات رکھے ہیں کہ اربوں پدموں انسانوں میں ایک کا چہرہ بالکل دُوسرے کے ساتھ ایسا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔ انسان کی زبان اور حلقوم بالکل ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دُوسرے سے ایسی ممتاز ہے کہ بچے بوڑھے، عورت مرد کی آوازیں الگ پہچانی جاتی ہیں، اور ہر اِنسان کی آواز الگ الگ پہچانی جاتی ہے، اُس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اِنسان کے انگوٹھے اور اُنگلیوں کے پورے ہیں کہ اُن کے اُوپر جو نقش ونگار خطوط کے جال کی صورت میں قدرت نے بنائے ہیں، وہ کبھی ایک انسان کے دُوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے، صرف آدھ انچ کی جگہ میں ایسے اِمتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ پورے مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط دُوسرے سے نہیں ملتے، اور قدیم وجدید ہر زمانے میں نشان انگوٹھے کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر عدالتی فیصلے اُس پر ہوتے ہیں، اور فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں، ہر اُنگلی کے پورے کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد پوروں کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں تو اسی پر تعجب

ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوگیا، ذرا اس سے آگے سوچو اور غور کرو کہ صرف زندہ ہی نہیں ہوگیا، بلکہ اپنی سابقہ شکل وصورت اور اس کے ہر اِمتیازی وصف کے ساتھ زندہ ہوا ہے، یہاں تک کہ انگوٹھے اور اُنگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے، اس نشأۃِ ثانیہ میں بھی بالکل وہی ہوں گے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ لفظ اَمَام بفتح الھمزہ سامنے اور مستقبل کے معنی میں ہے، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوئے کہ کافر اور غافل انسان اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے ان مشاہدات میں غور نہیں کرتا کہ ماضی کے انکار پر نادم ہوکر اپنے مستقبل کو دُرست کرلے، بلکہ مستقبل میں بھی وہ یہی چاہتا رہتا ہے کہ اپنے کفر وشرک اور اِنکار وتکذیب پر جما رہے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے، بَرِقَ بفتح الباء وکسر راء کے معنی آنکھ خیرہ ہوگئی کہ دیکھ نہ سکی۔ قیامت کے روز سب کی نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی، نگاہ جما کر کسی چیز کو نہ دیکھ سکیں گے۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ خسوف سے مشتق ہے، جس کے معنی روشنی ختم ہوکر تاریکی ہوجانے کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ چاند بے نور ہوجائے گا۔ آگے وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹ میں یہ بتلایا کہ صرف چاند ہی بے نور نہیں ہوگا بلکہ آفتاب بھی بے نور ہوجائے گا، جس کے متعلق دُنیا کے فلاسفہ کا یہ کہنا ہے کہ اصل روشنی آفتاب میں ہے، چاند کی روشنی بھی آفتاب کی شعاعوں سے مستفاد ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ چاند اور سورج دونوں ایک ہی حال میں جمع کردیئے جائیں گے کہ دونوں بے نور ہوں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چاند، سورج کے جمع ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز چاند اور سورج دونوں ایک ہی مطلع سے طلوع ہوں گے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔ [۱] واللہ اعلم۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳ یعنی اُس روز اِنسان کو جتلا دیا جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا کیا پیچھے چھوڑا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کرلیا وہ آگے بھیج دیا، اور جو نیک یا بد مفید یا مضر کوئی طریقہ، کوئی رسم ایسی چھوڑی کہ اس کے بعد لوگ اس پر عمل کریں، وہ پیچھے چھوڑا (اس کا ثواب یا عذاب اس کو ملتا رہے گا)۔ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بِمَا قَدَّمَ سے مراد وہ عملِ صالح ہے جو اپنی زندگی میں کرگزرا، اور وَاَخَّرَ ۝۱۳ سے مراد وہ عملِ صالح ہے جس کو کرسکتا تھا، مگر نہ کیا اور فرصت ضائع کردی۔ [۲]

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵ بصیر اور بَصِيْرَةٌ کے معنی دیکھنے والے کے بھی آتے

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۹۷

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۹۸

ہیں، اور بَصِيْرَةٌ کے معنی حجت کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم میں ہے: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ [1] (الانعام:۱۰۴) اس میں بَصَآئِرُ، بَصِيْرَةٌ کی جمع ہے، اور معنی اس کے حجت کے ہیں۔ اور مَعَاذِيْرُ مِعْذَارٌ بمعنی عذر کی جمع ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ عدالت کے ضابطے کی رُو سے انسان کے سارے اعمال محشر میں اس کو ایک ایک کر کے بتلائے جائیں گے، مگر درحقیقت اس کو اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ اپنے اعمال کو خوب جانتا ہے، خود اس کو معلوم ہے کہ اس نے کیا کیا کام کئے نیز یہ کہ حشر میں تمام اپنے اعمال نیک و بد کا مشاہدہ بھی اُس کے سامنے ہو جائے گا، جیسا کہ قرآنِ کریم نے فرمایا: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (الکہف:۴۹) یعنی جو عمل اُنہوں نے دُنیا میں کیا تھا اُس کو محشر میں حاضر و موجود پائیں گے، اور آنکھوں سے دیکھ لیں گے، یہاں جو انسان کو اپنے نفس پر بصیرہ فرمایا، اس کا یہی حاصل ہے۔

اور اگر بَصِيْرَةٌ کے معنی حجت کے لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ انسان خود اپنے نفس پر حجت و دلیل ہوگا، وہ اِنکار بھی کرے گا تو اُس کے اعضا اِقرار کریں گے، مگر اِنسان اپنے جرائم و تقصیرات کو جاننے کے باوجود عذر تراشی نہ چھوڑے گا، اپنے کئے کا عذر بیان کرتا ہی رہے گا، یہ معنی ہیں وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ کے۔

یہاں تک قیامت کے اَحوال اور اَہوال کا تذکرہ تھا، اور آگے بھی یہی آنے والا ہے۔ درمیان چار آیتوں کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ہدایت دی گئی ہے جو نزولِ وحی کے وقت نازل شدہ آیات کے متعلق ہے، وہ یہ کہ جب جبرائیلِ امین علیہ السلام قرآنِ کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے پڑھنے کے وقت ایک تو یہ فکر ہوتی تھی کہ کہیں اس کے سننے اور پھر اس کے مطابق پڑھنے میں کوئی فرق نہ آجائے۔ دُوسری فکر یہ ہوتی تھی کہ کہیں اس کا کوئی حصہ، کوئی کلمہ ذہن سے نکل جائے اور بھول جائیں، اس لئے آپ کو جس وقت جبرائیلِ امین علیہ السلام کوئی آیت سناتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ پڑھتے اور زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے لگتے تھے کہ بار بار پڑھ کر اس کو یاد کرلیں، آپ کی اس محنت و مشقت کو دُور کرنے کے لئے ان چار آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے صحیح صحیح پڑھوانے، پھر یاد کرادینے اور پھر اس کو مسلمانوں کے سامنے اُسی طرح پیش کرادینے کی ذِمہ داری خود لے لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمادیا کہ آپ اس غرض کے لئے زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے کی زحمت نہ اُٹھائیں، لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ کا یہی مطلب ہے۔ پھر فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ یعنی ان تمام آیات کو آپ کے قلب میں جمع کردینا، پھر اُس کو اُسی طرح آپ سے پڑھوادینا، یہ سب ہمارے ذِمہ ہے، اس لئے آپ اس کی فکر چھوڑ دیں۔ اور فرمایا فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾، قُرْاٰن اس جگہ بمعنی قراءت ہے، معنی یہ ہیں کہ جب ہم یعنی ہماری طرف سے جبرائیلِ امین قرآن پڑھیں تو آپ ساتھ ساتھ نہ پڑھا کریں، بلکہ ہمارے پڑھنے کے بعد پڑھا کریں،

[1] ترجمہ: اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی جانب سے حق بینی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں۔

اور اس وقت خاموش ہو کر سنا کریں۔ یہاں باتفاق ائمہ اتباعِ قرآن سے مراد یہ ہے کہ جب جبرائیلِ امین پڑھیں تو آپ خاموش رہ کر سنیں۔

اِمام کے پیچھے مقتدی کے قراءت نہ کرنے کی ایک دلیل

حدیثِ صحیح میں جو یہ آیا ہے کہ اِمام کو اِقتدا اور اِتباع ہی کے لئے بنایا گیا ہے، اس لئے مقتدیوں کو اس کا اِتباع کرنا چاہئے، جب وہ رُکوع کرے تو سب مقتدی رُکوع کرلیں، جب وہ سجدے میں جائے تو سب سجدے میں جائیں[۱] صحیح مسلم کی روایت میں اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ جب اِمام قراءت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو: "إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا"[۲] یہ بھی اس کا بیان ہے کہ مقصود اِمام کا اِتباع ہے، رُکوع سجدے میں تو اِتباعِ اِمام کی صورت یہ ہے کہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ افعال رُکوع وسجدے کے ادا کئے جائیں، مگر قراءت کا اِتباع یہ نہیں کہ ساتھ ساتھ پڑھا جائے، بلکہ قراءت کا اِتباع یہی ہے کہ جب اِمام قراءت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو۔ یہی اِستدلال ہے اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دُوسرے ائمہ کا اس معاملے میں کہ اِمام کے پیچھے مقتدی کو قراءت نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

آخر میں فرمایا ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿۱۹﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ فکر بھی اپنے اُوپر نہ رکھیں کہ نازل شدہ آیات کا صحیح مفہوم اور مراد کیا ہے۔ اس کا بتلانا، سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذِمہ ہے، ہم قرآن کے ہر ہر لفظ اور اُس کی مراد کو آپ پر واضح کردیں گے۔ ان چار آیتوں میں قرآن اور اُس کی تلاوت وغیرہ کے متعلقہ اَحکام بیان کرنے کے بعد آگے پھر قیامت کے اَحوال واَہوال ہی کا بقیہ تذکرہ آتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان چار آیتوں کا اگلی پچھلی آیتوں سے ربط اور جوڑ کیا ہے۔ خلاصۂ تفسیر مذکور میں اس کا ربط یہ بیان کیا گیا ہے کہ چار آیتوں سے پہلے جو قیامت کے حالات میں اس کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ ایک ایک انسان کو جس کیفیت، جس شکل وصورت میں وہ پہلے تھا اُسی میں دوبارہ پیدا فرمادیں گے، یہاں تک کہ اُس کی اُنگلیوں کے پوروں کو اور اُن پر بنے ہوئے امتیازی خطوط ونشانات کو بھی بالکل پہلے جیسا بنادیں گے، اُس میں سرِ مو فرق نہ ہوگا، یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ذاتِ حق تعالیٰ کا علم بھی بے انتہا ہے اور اس کا اِحصاء اور محفوظ رکھنا بھی بے مثال ہے، اس کی مناسبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چار آیتوں میں یہ تسلی دی گئی کہ آپ تو بھول بھی سکتے ہیں، نقل میں غلطی کا بھی اِمکان ہوسکتا ہے، مگر حق تعالیٰ ان سب سے بالا وبرتر ہیں، ان چیزوں کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذِمہ لے لی ہے، اس لئے آپ قرآن کے کلمات کو محفوظ رکھنے یا اُن کے معانی سمجھنے میں غور

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی السطوح والمنبر والخشب، ج:۱ ص:۵۴، وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ائتمام المأموم بالإمام، ج:۱ ص:۱۷۶

[۲] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب التشهد فی الصلاۃ، ج:۱ ص:۱۷۴

کرنے کی زحمت چھوڑ دیں، یہ سب کام حق تعالیٰ خود انجام دیں گے۔ آگے پھر قیامت کے حالات کا بیان ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾، نَاضِرَةٌ بمعنی تروتازہ یعنی اُس روز کچھ چہرے ہشاش بشاش تروتازہ ہوں گے، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ یعنی یہ چہرے اپنے رَبّ کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آخرت میں اہلِ جنت کو حق تعالیٰ کا دیدار بچشمِ سر نصیب ہوگا، اس پر اہلِ سنت والجماعت اور سب علماء وفقہاء کا اِجماع ہے، صرف معتزلہ اور خوارج منکر ہیں۔ وجہِ اِنکار کی فلسفیانہ شبہات ہیں کہ آنکھ سے دیکھنے کے لئے دیکھنے والے اور جس کو دیکھا جائے اور ان دونوں کے درمیان مسافت کے لئے جو شرائط ہیں، خالق ومخلوق کے درمیان اُن کا تحقق نہیں ہوسکتا۔ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کی رُؤیت وزیارت ان سب شرائط سے بے نیاز ہوگی، نہ کسی جہت اور سمت سے اس کا تعلق ہوگا، نہ کسی خاص شکل وصورت اور ہیئت سے۔ روایاتِ حدیث سے یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے ثابت ہے، البتہ اس رُؤیت وزیارت میں اہلِ جنت کے مختلف درجات ہوں گے، بعض کو یہ زیارت ہفتہ وار جمعہ کو حاصل ہوگی، بعض کو روزانہ صبح شام، اور بعض کے لئے یہ ہر وقت، ہر حال میں رہے گی۔ (مظہری) [۱]

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ سابقہ آیات میں قیامت کے حساب کتاب اور اہلِ جنت ودوزخ کا کچھ حال بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں انسان کو متوجہ کیا گیا کہ اپنی موت کو نہ بھولے، موت سے پہلے پہلے ایمان اور عملِ صالح کی طرف آجائے، تاکہ آخرت میں نجات ملے۔ آیتِ مذکورہ میں موت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ غفلت شعار اِنسان بھول میں رہتا ہے، یہاں تک کہ موت سر پر آکھڑی ہو اور رُوح ترقوہ یعنی گلے کی ہنسلی میں آپھنسے، اور تیماردار لوگ دوا وعلاج سے عاجز ہوکر جھاڑ پھونک کرنے والوں کو تلاش کرنے لگیں، اور ایک پاؤں کی پنڈلی دُوسری پر لپٹنے لگے تو یہ وقت اللہ کے پاس جانے کا آگیا، اب نہ توبہ قبول ہوتی ہے، نہ کوئی عمل، اس لئے عقل مند پر لازم ہے کہ اس وقت سے پہلے اِصلاح کی فکر کرے۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ میں لفظ ساق کے مشہور معنی پاؤں کی پنڈلی کے ہیں، اور پنڈلی کے ایک دُوسرے پر لپٹنے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت اِضطراب اور بے چینی سے ایک پنڈلی دُوسری پر مارتا ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اس وقت اگر ایک پاؤں دُوسرے پر رکھا ہوا ہے اور اس کو حرکت دے کر ہٹانا چاہتا ہے تو وہ اس کی قدرت میں نہیں ہوتا۔ (کما قال الشعبی والحسن رحمهما الله) [۲]

اور حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں دو ساقوں سے مراد دو عالم دُنیا وآخرت کے ہیں، اور

---

[۱] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۴۲

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۴۵

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اس وقت دُنیا کا آخری دِن اور آخرت کا پہلا دِن جمع ہوا ہے، اس لئے دُہری مصیبت میں گرفتار ہے، دُنیا سے جدائی کا غم اور آخرت کے معاملے کی فکر۔ [۱] واللہ اعلم

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ لفظ اَوْلٰى وَيْل کا مقلوب ہے، ویل کے معنی ہلاکت اور بربادی ہیں۔ یہاں اُس شخص کے لئے جس نے کفر و تکذیب ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور دُنیا کے مال و دولت میں مست رہا، پھر اسی حال پر مرگیا، اس کے لئے چار مرتبہ لفظ ہلاکت و بربادی استعمال کیا گیا کہ مرنے کے وقت، پھر مرنے کے بعد قبر میں، پھر حشر ونشر کے وقت، پھر جہنم میں داخلے کے وقت یہ مصیبت و بربادی تیرا حصہ ہے۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾ یعنی کیا وہ ذاتِ حق جس کے قبضۂ قدرت میں موت وحیات اور سارا جہان ہے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زِندہ کردے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی اس آیت کی تلاوت کرے تو اُس کو یہ کلمات کہنا چاہئے: ''بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ'' یعنی بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے، اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸﴾ پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے، اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلات کی اس آیت پر پہنچے: فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ تو اس کو ''آمَنَّا بِاللّٰهِ'' کہنا چاہئے۔ [۲]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْقِيَامَةِ بِحَمْدِ اللّٰهِ ۲۷ رجب ۱۳۹۱ھ

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۹ ص:۱۱۲

[۲] مسند احمد، مسند ابی ہریرة رضی اللہ عنه، رقم الحدیث:۷۳۸۵، والسُّنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم الحديث:۳۸۴۴، ومجمع الزوائد، باب سورة القيامة، رقم الحديث:۱۱۴۵

سُوْرَةُ الدَّهْر

آیاتها ۳۱ | ۷۶ سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَكِّيَّةٌ ۹۸ | رکوعاتها ۲

سورۂ دہر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اِکتیس آیتیں ہیں اور دو رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ①

کبھی گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں کہ نہ تھا وہ کوئی چیز جو زبان پر آتی،

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②

ہم نے بنایا آدمی کو ایک دو رنگی بوند سے، ہم پلٹتے رہے اُس کو پھر کردیا اُس کو ہم نے سننے والا دیکھنے والا،

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

ہم نے اُس کو سجھائی راہ یا حق ماننا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے، ہم نے تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے

سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ

زنجیریں اور طوق اور آگ دہکتی، البتہ نیک لوگ پیتے ہیں پیالہ

كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿۵﴾ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا

جس کی ملونی ہے کافور، ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں بندے اللہ کے، چلاتے ہیں وہ

تَفْجِیْرًا ﴿۶﴾ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ﴿۷﴾

اُس کی نالیاں، پورا کرتے ہیں منّت کو اور ڈرتے ہیں اُس دن سے کہ اس کی بُرائی پھیل پڑے گی،

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ﴿۸﴾ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ

اور کھلاتے ہیں کھانا اُس کی محبت پر محتاج کو، اور یتیم کو، اور قیدی کو، ہم جو تم کو کھلاتے ہیں

لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿۹﴾ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا

سو خالص اللہ کی خوشی چاہنے کو، نہ تم سے ہم چاہیں بدلہ اور نہ چاہیں شکرگزاری، ہم ڈرتے ہیں اپنے رَبّ سے

یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْیَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً

ایک دِن اُداسی والے کی سختی سے، پھر بچالیا ان کو اللہ نے بُرائی سے اُس دن کی اور ملادی ان کو تازگی

وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا

اور خوش وقتی، اور بدلہ دیا اُن کو اُن کے صبر پر باغ اور پوشاک ریشمی، تکیہ لگائے بیٹھیں اُس میں

عَلَی الْاَرَآىِٕكِ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِیَةً عَلَیْهِمْ

تختوں کے اُوپر، نہیں دیکھتے وہاں دُھوپ اور نہ ٹھر، اور جھک رہیں

ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ

اُن پر اس کی چھائیں اور پست کر رکھے ہیں اس کے گچھے لٹکا کر، اور لوگ لئے پھرتے ہیں اُن کے پاس برتن چاندی کے،

قرء حفص بغیر الالف فی الوصل فیھما ووقف علی الاول بالالف وعلی الثانی بغیر الالف ۱۲

وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿۱۵﴾ قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿۱۶﴾

اور آبخورے جو ہو رہے ہیں شیشے کے، شیشے ہیں چاندی کے ماپ رکھا ہے اُن کا ماپ،

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ

اور اُن کو وہاں پلاتے ہیں پیالے جس کی ملونی ہے سونٹھ، ایک چشمہ ہے اس میں اس کا نام کہتے ہیں

سَلْسَبِيلًا ﴿۱۸﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ

سلسبیل، اور پھرتے ہیں اُن کے پاس لڑکے سدا رہنے والے، جب تو اُن کو دیکھے خیال کرے کہ

لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿۱۹﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿۲۰﴾

موتی ہیں بکھرے ہوئے، اور جب تو دیکھے وہاں تو دیکھے نعمت اور سلطنت بڑی،

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ

اُوپر کی پوشاک اُن کی کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے، اور اُن کو پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿۲۱﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً

اور پلائے اُن کو اُن کا رب شراب جو پاک کرے دِل کو، یہ ہے تمہارا بدلہ

ع ۲۲ / ۱۹

وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿۲۲﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿۲۳﴾

اور کمائی تمہاری ٹھکانے لگی، ہم نے اُتارا تجھ پر قرآن سہج سہج اُتارنا،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ ج وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ

سو تو انتظار کر، اپنے رب کے حکم کا، اور کہنا مت مان اُن میں سے کسی گنہگار یا ناشکر کا، اور لیتا رہ نام اپنے رب کا

بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ صلے وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

صبح اور شام، اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اُس کو اور پاکی بول اس کی بڑی رات تک

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾

یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والے کو، اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو،

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ج وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ

ہم نے اُن کو بنایا اور مضبوط کیا اُن کی جوڑ بندی کو اور جب ہم چاہیں بدل لائیں اُن جیسے لوگ

تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ج فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾

بدل کر، یہ تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ،

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا

اور تم نہیں چاہوگے مگر جو چاہے اللہ، بے شک اللہ ہے سب کچھ جاننے والا،

حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ قلے يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ

حکمتوں والا۔ داخل کر لے جس کو چاہے اپنی رحمت میں اور جو گناہگار ہیں تیار ہے ان کے واسطے

ع ۲ ۹ ۲۰ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾ ع

عذاب دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

انسان پر کبھی ایسا وقت آیا ہے کہ نہیں جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا؟ ① ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا، کہ اُسے آزمائیں، پھر اُسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ ② ہم نے اُسے راستہ دِکھایا کہ وہ یا تو شکر گذار رہو، یا ناشکرا بن جائے۔ ③ ہم نے ہی کافروں کے لئے زنجیریں، گلے کے طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ ④ بیشک نیک لوگ ایسے جام سے مشروبات پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، ⑤ یہ مشروبات ایک ایسے چشمے کے ہوں گے جو اللہ کے (نیک) بندوں کے پینے کے لئے مخصوص ہے، وہ اُسے (جہاں چاہیں گے) آسانی سے بہا کر لے جائیں گے۔ ⑥ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی منتیں پوری کرتے ہیں، اور اُس دن کا خوف دِل میں رکھتے ہیں جس کے بُرے اثرات ہر طرف پھیلے ہوئے ہوں گے۔ ⑦ اور وہ اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ⑧ (اور اُن سے کہتے ہیں کہ:) "ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں، اور نہ کوئی شکریہ! ⑨ ہمیں تو اپنے پروردگار کی طرف سے اُس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جس میں چہرے بُری طرح بگڑے ہوئے ہوں گے۔" ⑩ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو اُس دن کے بُرے اثرات سے بچالے گا، اور اُن کو شادابی اور سرور سے نوازے گا، ⑪ اور اُنہوں نے جو صبر سے کام لیا تھا، اُس کے بدلے میں اُنہیں جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔ ⑫ وہ اُن باغوں میں آرام دہ اُونچی نشستوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، جہاں نہ وہ دُھوپ کی تپش دیکھیں گے، اور نہ کڑاکے کی سردی۔ ⑬ اور حالت یہ ہوگی کہ اُن باغوں کے سائے اُن پر جھکے ہوئے ہوں گے، اور اُن کے پھل مکمل طور سے اُن کے آگے رام کردیئے جائیں گے۔ ⑭ اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور وہ پیالے گردش میں لائے جائیں گے جو شیشے کے ہوں گے، ⑮ شیشے بھی چاندی کے جنہیں بھرنے والوں نے توازن کے ساتھ بھرا ہوگا۔ ⑯ اور وہاں ان کو ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملا ہوا ہوگا، ⑰ وہاں کے ایسے چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہے۔ ⑱ ان کے سامنے (خدمت کے لئے) ایسے لڑکے گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ جب تم انہیں دیکھو گے تو یہ محسوس کرو گے کہ وہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ ⑲ اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) جب تم وہ جگہ دیکھو گے تو تمہیں نعمتوں کا ایک جہان اور ایک بڑی سلطنت نظر آئے گی۔ ⑳ اُن کے اُوپر باریک ریشم کا سبز لباس اور دبیز ریشم کے کپڑے ہوں گے، اور اُنہیں چاندی کے کنگنوں سے آراستہ کیا جائے گا، اور اُن کا پروردگار اُنہیں نہایت پاکیزہ شراب

پلائے گا۔ (۲۱) (اور فرمائے گا کہ:) "یہ ہے تمہارا اِنعام! اور تم نے (دُنیا میں) جو محنت کی تھی، اُس کی پوری قدر دانی کی گئی ہے۔" (۲۲) (اے پیغمبر!) ہم نے ہی تم پر قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے۔ (۲۳) لہٰذا تم اپنے پروردگار کے حکم پر ثابت قدم رہو، اور ان لوگوں میں سے کسی نافرمان یا کافر کی بات نہ مانو۔ (۲۴) اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح و شام ذکر کیا کرو۔ (۲۵) اور کچھ رات کو بھی اُس کے آگے سجدے کیا کرو، اور رات کے لمبے وقت میں اُس کی تسبیح کرو۔ (۲۶) یہ لوگ تو (دُنیا کی) فوری چیزوں سے محبت کرتے ہیں، اور اپنے آگے جو بھاری دن آنے والا ہے، اُسے نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ (۲۷) ہم نے ہی انہیں پیدا کیا ہے، اور اُن کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں۔ اور ہم جب چاہیں ان کے بدلے ان جیسے دوسرے پیدا کردیں۔ (۲۸) حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نصیحت کی بات ہے۔ اب جو چاہے، اپنے پروردگار کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرلے۔ (۲۹) اور تم چاہو گے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک، (۳۰) وہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے، اور یہ جو ظالم لوگ ہیں، ان کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۳۱)

خلاصۂ تفسیر

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابلِ تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا، اور اس سے قبل غذا اور اس سے پہلے عناصر کا جز تھا) ہم نے اس کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے، پھر کبھی فمِ رحم سے خارج ہوکر ضائع ہوجاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے۔ اور مخلوط کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ اجزائے مختلفہ سے مرکب ہے، چنانچہ ترکیب منی کی اجزائے مختلفہ سے ظاہر ہے، غرض ہم نے اس کو ایسے نطفے سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلّف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا (اور چونکہ محاورے میں سمیع و بصیر استعمالاً مخصوص ہے عاقل کے ساتھ، اس لئے عقل دینے کی، جو کہ مدار ہے مکلّف ہونے کا، تصریح نہیں فرمائی گئی، مگر مراد وہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم نے ایسی ہیئات وصفات کے ساتھ پیدا کیا کہ اس میں اَحکامِ شرعیہ کا مکلّف بننے کی قابلیت ہو، اس کے بعد جب مکلّف ہونے کا وقت آگیا تو) ہم نے اس کو (بھلائی بُرائی پر مطلع کرکے) رستہ بتلایا (یعنی اَحکام کا مخاطب بنایا، پھر) یا تو وہ شکر گزار (اور مؤمن) ہوگیا، یا ناشکر (اور کافر) ہوگیا (یعنی جس رستے پر چلنے کو اس کو کہا تھا جو اس پر چلا وہ مؤمن ہوگیا، جو بالکل نہ چلا کافر ہوگیا، آگے فریقین کی جزا کا ذِکر ہے کہ) ہم نے کافروں کیلئے زنجیریں اور طوق اور آتشِ سوزاں تیار کر رکھی ہے (اور) جو نیک

(لوگ) ہیں وہ ایسے جامِ شراب سے (شرابیں) پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، یعنی ایسے چشمے سے (پئیں گے) جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے (اور) جس کو وہ (خاص بندے جہاں چاہیں گے) بہا کر لے جائیں گے (اور یہ بہشتیوں کی ایک کرامت ہوگی کہ انہارِ جنت ان کے تابع ہوں گی، جیسا کہ دُرِّ منثور میں ابنِ شوذب سے مروی ہے کہ جنتیوں کے ہاتھ میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی، وہ چھڑیوں سے جس طرف اشارہ کردیں گے نہریں اُسی طرف چلنے لگیں گی۔ [1] اور یہ کافور دُنیا کا کافور نہیں ہے، بلکہ جنت کا کافور ہے جو سپیدی اور خنکی اور تفریح وتقویتِ دِل ودِماغ میں اس کا مشارک ہے، شراب میں خاص کیفیات حاصل کرنے کے لئے عادت ہے بعض مناسب چیزوں کے ملانے کی، پس وہاں اس جام میں کافور ملایا جائے گا، اور وہ جامِ شراب ایسے چشمے سے بھرا جائے گا جس سے مقرّب بندے پئیں گے، تو ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا ہوگا، سواس سے اَبرار کی بشارت میں تقویت ہوگئی اور اگر اَبرار وعباد اللہ کا مصداق ایک ہو تو دو جگہ بیان کرنے سے جدا جدا مقصود ہے، ایک جگہ اس کی آمیزش بتلانا ہے، دُوسری جگہ اس کا کثیر ومسخر ہونا کہ اسبابِ عیش کی کثرت اور تابع طبیعت ہونا لذّتِ عیش کو بڑھا دیتا ہے۔ آگے ان ابرار کی صفات مذکور ہیں کہ) وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور (ادا بھی کرتے ہیں خلوص سے، کیونکہ وہ) ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی (یعنی کم وبیش سب پر اس کی سختی کا اثر ہوگا، مراد قیامت کا دن ہے، اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی) اور (وہ لوگ ایسے مخلص ہیں کہ عباداتِ مالیہ میں بھی جس میں غالباً اِخلاص کم ہوتا ہے کمال درجے کا اِخلاص رکھتے ہیں، چنانچہ) وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (قیدی اگر مظلوم ہے کہ ظلماً قید کرلیا گیا تب تو اُس کی اِعانت کا مستحسن ہونا ظاہر ہے، اور اگر ظالم ہے کہ ظلم کی سزا میں قید ہوا ہے، تو شدّتِ حاجت کے وقت اس کا اِطعام بھی مستحسن ہے، اور وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دِل سے یوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے (اس کا عملی) بدلہ چاہیں اور نہ (اس کا قولی) شکریہ (چاہیں، اور ہم خدا کی رضامندی کے لئے اس واسطے تم کو کھانا کھلاتے ہیں کہ) ہم اپنے رَبّ کی طرف ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں (تو اُمید رکھتے ہیں کہ ان مخلصانہ اعمال کی بدولت اُس دن کی تلخی اور سختی سے محفوظ رہیں، اور اس سے معلوم ہوا کہ خوفِ آخرت سے کوئی کام کرنا اِخلاص اور اِبتغائے مرضاۃ اللہ کے منافی نہیں) سو اللہ تعالیٰ ان کو (اس اِطاعت واِخلاص کی برکت سے) اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا، (یعنی چہروں پر تازگی اور قلوب میں خوشی دے گا) اور ان کی پختگی (یعنی اِستقامت فی الدین) کے بدلے میں اُن کو جنت اور ریشمی لباس دے گا، اس حالت میں کہ وہ وہاں (جنت میں) مسہریوں پر (آرام وعزّت سے) تکیہ لگائے ہوں گے (اور)

---

[1] تفسیر الدر المنثور تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۱۵

نہ وہاں تپش (اور گرمی) پائیں گے اور نہ جاڑا (بلکہ فرحت بخش معتدل موسم ہوگا) اور یہ حالت ہوگی کہ (وہاں کے یعنی جنت کے) درختوں کے سائے اُن (بہشتیوں) پر جھکے ہوں گے (یعنی قریب ہوں گے اور سایہ اسبابِ تنعّم سے ہے، جنت میں آفتاب ماہتاب نہیں ہوں گے تو پھر سایہ کا کیا مطلب ہے؟ ہوسکتا ہے کہ دُوسرے اَجسامِ نورانیہ کی روشنی سے سایہ مقصود ہو، اور فائدہ سائے کا غالباً یہ ہے کہ حالات بدلتے رہیں، ایک حال کتنے بھی آرام ولذّت کا ہو، آخر کار اُس سے طبیعت اُکتا جاتی ہے) اور اُن کے میوے اُن کے اِختیار میں ہوں گے (کہ ہر وقت، ہر طرح، بلا مشقت لے سکیں گے) اور ان کے پاس (کھانے پینے کی چیزیں پہنچانے کے لئے) چاندی کے برتن لائے جائیں گے اور آبخورے جو شیشے کے ہوں گے (اور) وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا (یعنی اس میں مشروب ایسے انداز سے بھرا ہوگا کہ نہ اس وقت کی خواہش میں کمی رہے اور نہ اس سے بچے کہ دونوں میں بے لطفی ہوتی ہے۔ اور چاندی کے شیشے کے یہ معنی کہ سفیدی تو چاندی جیسی ہوگی اور شفافی شیشے جیسی، اور دُنیا کی چاندی میں آر پار نظر نہیں آتا، اور شیشے میں یہاں ایسی سفیدی نہیں ہوتی، پس یہ ایک عجیب چیز ہوگی) اور وہاں اُن کو (علاوہ جامِ شراب مذکورہ بالا کے جس میں کافور کی آمیزش تھی اور بھی) ایسا جامِ شراب پلایا جائے گا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی (کہ انتعاشِ حرارت غریزی اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے شراب میں اس کو بھی ملاتے تھے) یعنی ایسے چشمے سے جو وہاں ہوگا (اُن کو پلایا جائے گا) جس کا نام (وہاں) سلسبیل (مشہور) ہوگا (مجموعہ مقامِ بالا اور مقام ھٰذا سے معلوم ہوتا ہے کہ چشمۂ مذکورہ بالا کی شراب میں آمیزش کافور کی ہوگی، اور اس چشمۂ مذکورہ مابعد کی شراب میں آمیزش زنجبیل کی ہوگی، واللہ اعلم بأسرارہ) اور ان کے پاس (یہ چیزیں لے کر) ایسے لڑکے آمد و رفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے (اور وہ اس قدر حسین ہیں کہ) اے مخاطب! اگر تو ان کو (چلتے پھرتے) دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں (موتی سے تو تشبیہ صفائی اور اشراق میں، اور بکھرے ہوئے کا وصف اُن کے چلنے پھرنے کے لحاظ سے، جیسے بکھرے موتی منتشر ہو کر کوئی اِدھر جا رہا ہے، کوئی اُدھر جا رہا ہے، اور یہ اعلیٰ درجے کی تشبیہ ہے) اور (اُن مذکورہ اسبابِ تنعّم میں اِنحصار نہیں، بلکہ وہاں اور بھی ہر سامان اس اِفراط اور رفعت کے ساتھ ہوگا کہ) اے مخاطب! اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دِکھلائی دے (اور) اُن جنتیوں پر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے، اور دبیز ریشم کے کپڑے ہوں گے (کیونکہ ہر لباس میں جدا لطف ہے) اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے (اس سورت میں تین جگہ چاندی کے سامان کا ذِکر آیا ہے، اور دُوسری آیات میں سونے کا، مگر دونوں میں تعارض نہیں، کیونکہ دونوں طرح کا سامان ہوگا، اور حکمت اس کی وہی تفنّن اور تغیر طبائع و تنعّمات کا ہے، اور یہ شبہ کہ مردوں کو زیور معیوب ہے اس لئے مندفع ہے کہ ہر مقام کا مقتضا جدا ہے، یہاں عیب ہونا، وہاں عیب ہونے کو مستلزم

نہیں) اور اُن کا رَبّ (جواُن کو شراب پینے کو دے گا جس کا اُوپر ذِکر آیا ہے تو وہ مثل شراب دُنیا کے ناپاک اور مزیلِ عقل وموجب خمار نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ) اُن کو پاکیزہ شراب پینے کو دے گا (جس میں نہ نجاست ہوگی اور نہ کدورت، وھذا کقولہٖ تعالیٰ: لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ [۱] (الواقعة) اور تین جگہ جو سورت میں ذِکر شراب کا آیا ہے، ہر جگہ غرض جدا ہے، جیسا تقریر ترجمے سے واضح ہے، پھر اوّل میں ''يَشْرَبُوْنَ'' ہے، دُوسری جگہ ''يُسْقَوْنَ'' جو زیادتِ اِکرام واِعزاز پر دَلالت کرتا ہے، تیسری جگہ ''وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ'' میں نہایت ہی تشریف وتکریم ہے، پس تکرار کا شائبہ نہ رہا، اور ان سب نعمتوں کو دے کر اہلِ جنت سے مسرّتِ رُوحانی بڑھانے کے لئے کہا جائے گا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو دُنیا میں کیا کرتے تھے) مقبول ہوئی (آگے فریقین کی جزا کا ذِکر کرنے کے بعد بطور تفریعِ معنوی کے آپ کو تسلی دینے کا بیان ہے، یعنی ان مخالفین کی سزا آپ نے سن لی، پس آپ اُن کی مخالفت سے غم نہ کیجئے، اور اپنی عبادت اور دعوت واِصلاح کے کام میں لگے رہئے، کہ علاوہ طاعت ہونے کے اس میں قلب کی بھی تو تقویت ہے، اور بیان اس طاعت کا یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے (تاکہ تھوڑا تھوڑا لوگوں کو پہنچاتے رہیں اور ان کو اس سے فائدہ اُٹھانے میں آسانی ہو، جیسا کہ سورۂ اِسراء کے آخر میں ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ... إلخ [۲] (بنی اسرائیل:۱۰۶)) سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر (کہ اس میں تبلیغ بھی داخل ہے) مستقل رہئے اور اُن میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے (یعنی یہ جو تبلیغ سے منع کرتے ہیں، کما فی الدّرّ المنثور من سورة الكافرين، [۳] اس کی موافقت نہ کیجئے، مقصود اس سے اِظہار اہتمامِ شان ہے، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی موافقت کرنے کا کوئی اِحتمال ہی نہیں تھا، یہ تو عباداتِ متعدیہ کا اَمر ہوا) اور (آگے عباداتِ لازمہ کا اَمر ہے یعنی) اپنے پروردگار کا صبح وشام نام لیا کیجئے اور کسی قدر رات کے حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے (یعنی نمازِ فرض پڑھا کیجئے) اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح (وتقدیس) کیا کیجئے (مراد اس سے تہجد ہے علاوہ فرائض کے، اور آگے تقویتِ تسلی کے لئے ایک اور مضمون ہے جس میں کفار کی مذمت بھی ہے، یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی اصل وجہ آپ کے ساتھ یہ ہے کہ) یہ لوگ دُنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دِن کو چھوڑ بیٹھے ہیں (پس حبِ دُنیا نے اندھا کر رکھا ہے اس لئے حق کہنے سے بغض رکھتے ہیں، اور یومِ ثقیل کا ذِکر سن کر چونکہ اِحتمال اُن کے اِنکار کا تھا اس لئے آگے اُس یومِ ثقیل کے اِستبعاد کو دفع فرماتے ہیں یعنی) ہم ہی نے اُن کو پیدا کیا

---

[۱] ترجمہ: نہ اس سے اُن کو دردِ سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آوے گا۔

[۲] ترجمہ: اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا۔

[۳] تفسیر الدّرّ المنثور ج:۱۵ ص:۷۱۱

اور ہم ہی نے اُن کے جوڑ بند مضبوط کئے اور (نیز) جب ہم چاہیں اُن ہی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں (اور اَمر اَوّل تو مشاہد ہے اور دُوسرا اَمر اَدنیٰ تنبیہ سے معلوم ہوسکتا ہے، پس دونوں اَمروں سے قدرتِ الٰہیہ ظاہر ہے، پھر مُردوں کو دوبارہ زِندہ کرنے ہی میں کون بات زیادہ دُشوار ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو، آگے اُن تمام مضامین سابقہ پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ) یہ (سب جو مذکور ہوا کافی) نصیحت ہے سو جو شخص چاہے اپنے رَبّ کی طرف راستہ اِختیار کرلے (وقد مرّ فی المزمّل) اور (قرآن کے تذکرہ ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ بعض کو اس سے ہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن فی نفسہٖ تذکرہ اور ہدایت کافی ہے، لیکن) بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لئے خدا کے نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہوتی ہیں، کیونکہ) خدا تعالیٰ بڑا علم والا اور حکمت والا ہے، وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور (جس کو چاہے کفر اور ظلم میں مبتلا رکھتا ہے، پھر) ظالموں کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ دہر کا نام سورۂ اِنسان اور سورۃ الابرار بھی ہے۔ (رُوح) [1] اس میں تخلیقِ انسانی کی اِبتدا و انتہا اور اعمال پر جزا و سزا، قیامت اور جنت، دوزخ کے خاص حالات نہایت بلیغ اور مؤثر اَنداز میں بیان ہوئے ہیں۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ① حرف "هَلْ" دراصل اِستفہام کے لئے آتا ہے، اور بعض اوقات کسی بدیہی اور کھلی ہوئی چیز کو بصورتِ اِستفہام اس لئے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اس کا واضح ہونا اور مؤکد ہوجائے کہ جس سے پوچھو گے یہی جواب دے گا، دُوسرا اِحتمال ہی نہیں۔ جیسے کوئی شخص نصف النہار کے وقت کسی سے کہے کہ "کیا یہ دن نہیں ہے؟" اس کی صورت تو اِستفہام کی ہے، مگر درحقیقت اُس کے اِنتہائی واضح ہونے کا بیان ہے۔ اسی لئے ایسے مواقع میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ حرف "هَلْ" بمعنیٰ "قَدْ" ہے جو تحقیقِ واقع کے لئے بولا جاتا ہے۔ بہر دو صورت مطلب آیت کا یہ ہے کہ انسان پر ایک زمانہ دراز ایسا گزرا ہے کہ دُنیا میں کہیں اس کا نام و نشان یہاں تک کہ ذِکر و تذکرہ تک نہ تھا۔ لفظ "حِيْنٌ" تنوین کے ساتھ ذِکر کرنے سے اس وقت اور زمانے کی درازی کی طرف اشارہ ہے، اور اس آیت میں یہ زمانہ دراز اِنسان پر گزرنا بیان فرمایا ہے، جس میں اس کا فی الجملہ کسی نہ کسی طرح کا وجود ہونا لازم ہے، عدمِ محض کے زمانے کو تو اِنسان پر گزرنا نہیں کہا جاسکتا، اس لئے اکثر حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اس زمانہ دراز سے جو اِنسان

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۱۱۸ (باختصار)

ہرگز را وہ زمانہ مراد ہے جو قرارِ حمل کے بعد سے پیدائش تک کا وقت ہے جو عادۃً نو مہینے ہوتے ہیں کہ اس میں انسان کی تخلیق پر جتنے دَور گزرتے ہیں، نطفے سے لے کر جسم اور اور اعضا اور پھر اُس میں رُوحِ حیات آنے تک وہ سب شامل ہیں۔ اس پورے زمانے میں اگرچہ اس کا وجود ایک طرح قائم ہو چکا ہے، مگر نہ کوئی جانتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ نہ کوئی اس کا نام ہے، نہ کسی کو اس کی شکل وصورت معلوم ہے، اس لئے اس کا کہیں ذِکر وتذکرہ تک نہیں ہے۔ اور اگر اس کو وسیع تر معنی دیئے جائیں تو تخلیقِ انسانی کی ابتدا جس طرح نطفے سے سمجھی گئی ہے، وہ نطفہ بھی جس غذا سے پیدا ہوا، وہ غذا اور غذا سے پہلے اُس غذا کا مادّہ کسی نہ کسی صورت سے دُنیا میں تھا، اگر اُس زمانے کو بھی شامل کریں تو یہ زمانہ دراز ہزاروں سال کا ہوسکتا ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کو ایک ایسے امر کی طرف توجہ دِلائی کہ اُس میں ذرا بھی شعور ہو، اور کچھ بھی غور کرے تو اُس کو اپنی حقیقت کے اِنکشاف کے ساتھ اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے کے وجود اور علم وقدرت پر مکمل ایمان ویقین کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگر ایک ستر برس کا انسان اس کا مراقبہ کرے اور اس پر غور کرے کہ اب سے اکہتر سال پہلے اس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا، اور نہ اس کا کسی عنوان سے کوئی ذِکر کرسکتا تھا، ماں باپ اور دادا دادی کے دِل میں بھی اس کے مخصوص وجود کا کوئی خطرہ تک نہ تھا، گو مطلق بچے کا تصوّر ہو۔ اس وقت کیا چیز اُس کی ایجاد وتخلیق کی داعی ہوئی، اور کس محیر العقول قدرت نے دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ذرّات کو اس کے وجود میں سمو کر اس کو ایک ہوشیار، دانا، سمیع وبصیر اِنسان بنادیا، تو وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا۔

ما نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ ما می شنود [۱]

اس کے بعد تخلیقِ انسانی کی اِبتدا کا بیان اس طرح فرمایا إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ یعنی ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک مخلوط نطفے سے۔ ''أَمْشَاجٍ''، مشج یا مشیج کی جمع ہے، جس کے معنی مخلوط کے آتے ہیں، اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد وزَن کا مخلوط نطفہ مراد ہے، جیسا کہ اکثر مفسرین نے فرمایا ہے، اور رُوح المعانی میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ ''أَمْشَاجٍ'' سے مراد اخلاطِ اَربعہ یعنی خون، بلغم، سودا، صفرا ہیں، جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔ [۲]

ہر اِنسان کی تخلیق میں دُنیا بھر کے اجزا اور ذرّات کی شمولیت

اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاطِ اَربعہ مذکورہ بھی اقسامِ غذا سے حاصل ہوتے ہیں، اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اس میں دُوردَراز ملکوں اور خطوں کے اجزا آب وہوا وغیرہ کے ذریعے شامل ہوتے ہیں، اس طرح ایک انسان کے

---

[۱] ترجمہ: نہ ہم تھے اور نہ ہمارا تقاضا تھا، تو نے اپنی مہربانی سے ہماری ان کہی سنی تھی۔

[۲] تفسیر روح المعانی ج:۲۹ ص:۱

موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسے اجزا اور ذرّات کا مجموعہ ہے جو دُنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قدرت کے نظامِ عجیب نے حیرت انگیز طریقے پر اُن کو اس کے وجود میں سمویا ہے، اگر ''اَمْشَاجٍ'' کا مطلب یہ لیا جائے تو اس جگہ لفظ ''اَمْشَاجٍ'' کے ذِکر سے منکرینِ قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا کیونکہ ان خدا ناشناس لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زِندہ ہونے میں سب سے بڑا اِشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دُنیا میں بکھر جاتا ہے، ان کو دوبارہ جمع کرنا، پھر ان میں رُوح ڈالنا، اُن کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔

''اَمْشَاجٍ'' بمعنی اخلاط کی تفسیر میں اُن کے اس شبہ کا ایک واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیقِ انسانی میں بھی تو دُنیا بھر کے اجزا و ذرّات شامل تھے، جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اُس کے لئے اس کا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہوگیا اور اس تفسیر پر لفظ ''اَمْشَاجٍ'' کا اس جگہ اِضافہ بھی ایک مستقل فائدے کے لئے ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نَّبْتَلِیْهِ، ابتلاء سے مشتق ہے، جس کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں، یہ تخلیقِ انسانی کی غرض وحکمت کا بیان ہے کہ انسان کو اس شان کے ساتھ پیدا کرنے کا مقصد اُس کی آزمائش ہے جس کا بیان اگلی آیتوں میں آیا ہے کہ ہم نے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعے اُس کو راستہ دکھلا دیا کہ یہ راستہ جنت کی طرف اور دُوسرا دوزخ کی طرف جاتا ہے، اور اُسے اِختیار دے دیا کہ ان میں سے جس کو چاہے اِختیار کرے، چنانچہ ان میں دو گروہ ہوگئے: اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳ یعنی ایک گروہ اُن لوگوں کا ہوا جنہوں نے اپنے پیدا کرنے والے اور نعمت دینے والے کو پہچان کر اس کا شکر اَدا کیا اور اُس پر اِیمان لایا، دُوسرا گروہ وہ ہوا جس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور کافر رہا۔ اس کے بعد ان دونوں گروہوں کی جزا اور اَنجام کا ذِکر فرمایا کہ کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور جہنم ہے، اور اَبرار یعنی اِیمان وطاعت کے پابند لوگوں کے لئے بڑی بڑی نعمتیں ہیں، سب سے پہلے پینے کی چیزوں کا ذِکر فرمایا کہ اُن کو ایسا جامِ شراب دیا جائے گا جس میں ''کافور'' کی آمیزش ہوگی يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵ بعض مفسرین نے فرمایا کہ کافور جنت کے ایک چشمے کا نام ہے، اس شراب میں لذت وکیف بڑھانے کے لئے اُس چشمے کا پانی شامل کیا جائے گا۔ اور ''کافور'' کے مشہور معنی لئے جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ جنت کا کافور بھی دُنیا کے کافور کی طرح ہو، کھانے پینے کے قابل نہ ہو، اس کافور کی خصوصیات جُدا ہوں۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ لفظ ''عَيْنًا'' ترکیبِ نحوی میں ''كَافُوْرًا ۝۵'' کا بدل بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں یہ متعین ہوجاتا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں کافور سے مراد چشمۂ جنت ہے، اور ''عِبَادُ اللّٰهِ'' سے مراد وہی اللہ کے نیک بندے ہیں جن کا ذِکر پہلے ''اَبرار'' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ اور اگر ''عَيْنًا'' کو ''مِنْ كَاْسٍ'' سے بدل قرار دیں تو یہ کسی دُوسرے

چشمے اور پانی کا بیان ہے، اور اس صورت میں ''عِبَادُ اللّٰہِ'' سے مراد اہلِ جنت کی کوئی دُوسری جماعت ہے، جو ''اَبرار'' سے کم درجے میں ہے۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ یہ بیان اس کا ہے کہ ''اَبرار'' اور ''عِبَادُ اللّٰہِ'' کو یہ انعامات کس بنا پر ملیں گے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جس کام کی اللہ کے لئے نذر (منّت) مان لیتے ہیں اُس کو پورا کرتے ہیں۔ نذر کے لفظی معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے اُوپر کوئی ایسا کام واجب کرلیں جو شریعت سے آپ کے ذمے واجب نہیں ہے، ایسی نذر کو پورا کرنا شرعاً واجب ہوتا ہے، جس کی کچھ تفصیل آگے آتی ہے۔ یہاں اہلِ جنت کی جزائے عظیم اور اِنعامات کا سبب ایفائے نذر کو قرار دیا ہے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہ لوگ جب اپنی طرف واجب کردہ چیزوں کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تو جو فرائض و واجبات ان کے اِختیار سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر لازم کئے گئے ہیں، ان کا اہتمام بدرجۂ اَولیٰ کرتے ہوں گے۔ اس طرح لفظ ''ایفائے نذر'' میں درحقیقت تمام واجباتِ شرعیہ اور فرائض کی ادائیگی شامل ہوگئی، اور اِنعاماتِ جنت کا سبب مکمل اطاعت اور تمام فرائض و واجبات کو اَدا کرنا ہوگا۔ بہرحال اس جملے سے ''ایفائے نذر'' کی اہمیت اور وجوب ثابت ہوا۔

مسئلہ:- نذر (منّت) کے منعقد ہونے کے لئے چند شرائط ہیں۔ اوّل یہ کہ جس کام کی نذر مانی جائے وہ جائز وحلال ہو، معصیت نہ ہو۔ اگر کسی نے کسی گناہ اور ناجائز کام کی نذر مان لی تو اس پر لازم ہے کہ وہ ناجائز کام نہ کرے، اپنی قسم کو توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔ دُوسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے واجب نہ ہو، اس لئے اگر کوئی شخص نمازِ فرض یا وتر واجب کی نذر مان لے تو یہ نذر لغو ہوگی، وہ فرض یا واجب پہلے ہی سے اس پر واجب الاَدا ہے۔

اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ جس کام کو بذریعہ نذر اپنے اُوپر واجب کیا ہے اُس کی جنس سے کوئی عبادت شریعت میں واجب کی گئی ہو، جیسے نماز، روزہ، صدقہ، قربانی وغیرہ، اور جس کی جنس سے شرعاً کوئی عبادت مقصود نہیں ہے، اس کی نذر ماننے سے نذر لازم نہیں ہوتی، جیسے کسی مریض کی عیادت یا جنازے کے پیچھے چلنا وغیرہ، جو اگرچہ عبادات ہیں، مگر عباداتِ مقصودہ نہیں، نذر و یمین کے اَحکام کی تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جائے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴿٨﴾ یعنی اہلِ جنت کے یہ اِنعامات اس سبب سے بھی ہیں کہ وہ دُنیا میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ''عَلٰى حُبِّهٖ'' میں حرف ''عَلٰى'' بمعنی مع ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی حالت میں بھی غریبوں کو کھانا کھلاتے جب کہ وہ کھانا خود اپنے لئے بھی ان کو محبوب اور پسند ہے۔ یہی نہیں کہ اپنے سے زائد، فالتو کھانا غریبوں کو دے دیں۔ مسکین اور یتیم کو کھانا کھلانے کا عبادت و ثواب ہونا تو ظاہر ہے، قیدی سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اُصولِ شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہے، خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم، مگر بہرحال اس کا کھانا کھلانا حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے، جو شخص اس کو کھانا کھلاتا ہے وہ گویا حکومت اور بیت المال کی اِعانت کرتا ہے

اس لئے قیدی چاہے کافر بھی ہو، اس کو کھانا کھلانا ثواب ہوگا۔ خصوصاً ابتدائے اسلام میں تو قیدیوں کا کھانا پینا اور ان کی حفاظت عام مسلمانوں میں تقسیم کر کے ان کے ذمہ کر دی جاتی تھی، جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا۔

قَوَارِیْرَاْ مِنْ فِضَّةٍ دُنیا میں چاندی کا برتن کثیف ہوتا ہے، آئینے کی طرح نہیں ہوسکتا، اور جو کانچ سے تیار کیا جاتا ہے وہ چاندی نہیں ہوسکتا، ان دونوں میں تضاد ہے، مگر یہ جنت کی خصوصیت ہے کہ وہاں کی چاندی آئینے کی طرح شفاف ہوگی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنت میں جتنی چیزیں ملیں گی اُن سب کی نظیر اور شبیہ دُنیا میں بھی ملتی ہے، سوائے ان گلاسوں اور برتنوں کے جن کی ساخت چاندی سے ہے، مگر آئینے کی طرح شفاف ہیں۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ زنجبیل کے معروف معنی سونٹھ کے ہیں، اور عرب لوگ شراب میں اُس کی آمیزش کو پسند کرتے تھے، اس لئے اس کو جنت میں بھی اختیار کیا گیا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں اور دُنیا کی چیزوں میں نام کے اشتراک کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں، اس لئے وہاں کی زنجبیل کو دُنیا کی زنجبیل پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ، اَسَاوِرَ، سوار کی جمع ہے، کنگن کو کہا جاتا ہے، جو ہاتھوں میں پہننے کا زیور ہے۔ اس آیت میں چاندی کے کنگن کا ذکر ہے، اور ایک دُوسری آیت میں اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (الکہف: ۳۱) آیا ہے، یعنی کنگن سونے کے، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت چاندی کے، کسی وقت سونے کے کنگن استعمال کئے جائیں، یا بعض کے کنگن سونے کے ہوں، بعض کے چاندی کے، مگر ایک سوال اس جگہ بہر حال ہے کہ چاندی کے کنگن ہوں یا سونے کے، بہر حال یہ زیور ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لئے ہوتے ہیں، مردوں کے لئے ایسے زیور پہننا عیب سمجھا جاتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا عورتوں یا مردوں کے لئے مخصوص ہونا اور ان کے لئے مستحسن یا عیب ہونا، یہ چیز عرف وعادت کے تابع ہوتی ہے، بعض ملکوں یا قوموں میں ایک چیز بڑی عیب اور بُری سمجھی جاتی ہے، دُوسری قوموں میں وہ بڑا احسن سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا میں ملوکِ کسریٰ ہاتھوں میں کنگن اور سینے اور تاج میں زیورات استعمال کرتے تھے، اور یہ اُن کا خاص امتیاز و اعزاز سمجھا جاتا تھا، ملکِ کسریٰ فتح ہونے کے بعد جو خزائنِ کسریٰ مسلمانوں کو ہاتھ آئے اُن میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے۔ جب دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کے معمولی جغرافیائی اور قومی تفاوت سے یہ معاملہ مختلف ہوسکتا ہے، تو جنت کو دُنیا پر قیاس کرنے کے کوئی معنی نہیں، ہوسکتا ہے کہ وہاں زیور مردوں کے لئے بھی مستحسن سمجھا جائے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ یعنی اہلِ جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوگا کہ جنت کی یہ محیر العقول نعمتیں سب تمہارے اُن اعمال کی جزا ہے جو تم نے دُنیا میں کئے تھے، اور تمہارے عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہوگئے۔ یہ کلمات ان کو بطور مبارک باد کے کہے جائیں گے۔ اہلِ عشق و محبت سے پوچھئے تو

جنت کی ساری نعمتیں ایک طرف، اور ربّ العالمین کا یہ فرمانا ایک طرف، سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے کہ اس میں حق تعالیٰ ان کو اپنی رضائے کامل کی سند دے رہے ہیں۔ عام اہلِ جنت کے اِنعامات کا ذِکر کرنے کے بعد خاص ان انعامات کا ذِکر کیا گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے، اُن میں سب سے بڑا انعام تنزیلِ قرآن ہے، اس اِنعامِ عظیم کا ذِکر کرنے کے بعد اوّل تو آپ کو اس کی ہدایت کی گئی کہ مخالفین و کفار کی طرف سے جو ضد و اِنکار اور ان کی ایذاؤں کی تکلیف آپ کو پہنچتی ہے، آپ اس پر صبر سے کام لیں، دُوسرے اللہ کی عبادت کو دِن رات کا مشغلہ بنائیں، اسی سے کفار کی اذیت کا بھی اِزالہ ہوگا۔

آخر میں معاند کفار کے کفر پر جمے رہنے کی وجہ بتلائی گئی کہ یہ جاہل دُنیا کی سطحی سرسری اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہوگئے کہ انجام کو یعنی آخرت کو بھلا بیٹھے، حالانکہ ہم نے دُنیا میں بھی خود اُن کے وجود میں ایسی چیزیں رکھی تھیں کہ ان میں غور کرتے تو اپنے خالق و مالک کو پہچانتے، مثلاً نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ یعنی ہم نے ہی اُن کو پیدا کیا اور ان کے وجود کی صنعت میں ایک خاص کمال یہ رکھا کہ اُس کے جوڑ بند مضبوط و مستحکم بنائے۔

انسانی جوڑ بند میں کرشمۂ قدرت

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ بند پر نظر ڈالے کہ بتقاضائے حکمت وراحت، انسانی جوڑ دیکھنے میں نرم و نازک معلوم ہوتے ہیں، اور نرم نرم پٹھوں کے ذریعے ایک دُوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جس کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ سال دو سال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے، خصوصاً جب کہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں، موڑے توڑے جاتے ہیں، اتنی شبانہ روز حرکت کے ساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دو سال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں، یہ نرم و نازک پٹھے دیکھو، کس طرح اعضا کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں، نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں، انسان اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں کیسے کیسے زور اور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھِس گیا ہوتا، مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اَسّی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الدَّهْرِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

اٰیاتها ۵۰ | ۷۷ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ ۳۳ | رکوعاتها ۲

سورۂ مرسلات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳

قسم ہے چلتی ہواؤں کی دِل کو خوش آتی، پھر جھونکا دینے والیوں کی زور سے، پھر اُبھارنے والیوں کی اُٹھا کر،

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶

پھر پھاڑنے والیوں کی بانٹ کر، پھر فرشتوں کی جو اُتار کر لائیں وحی، اِلزام اُتارنے کو یا ڈر سنانے کو،

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝۸ وَاِذَا السَّمَآءُ

مقرر جو تم سے وعدہ ہوا وہ ضرور ہونا ہے، پھر جب تارے مٹائے جائیں، اور جب آسمان میں

فُرِجَتْ ﴿٩﴾ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿١٠﴾ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿١١﴾ لِاَیِّ یَوْمٍ

جھروکے پڑجائیں، اور جب پہاڑ اُڑادیئے جائیں، اور جب رسولوں کا وقت مقرر ہوجائے، کس دن کے واسطے

اُجِّلَتْ ﴿١٢﴾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ﴿١٣﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ﴿١٤﴾

اُن چیزوں میں دیر ہے، اس فیصلے کے دن کے واسطے، اور تو نے کیا بُوجھا کیا ہے فیصلے کا دِن

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿١٥﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، کیا ہم نے نہیں مار کھپایا پہلوں کو، پھر ان کے پیچھے بھیجتے ہیں

الْاٰخِرِیْنَ ﴿١٧﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿١٨﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ

پچھلوں کو، ہم ایسا ہی کیا کرتے ہیں گنہگاروں کے ساتھ، خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿١٩﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ

جھٹلانے والوں کی، کیا ہم نے نہیں بنایا تم کو ایک بے قدر پانی سے پھر رکھا اُس کو ایک جمے ہوئے

مَّكِیْنٍ ﴿٢١﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٢٢﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿٢٣﴾

ٹھکانے میں، ایک وعدہ مقرر تک، پھر ہم اس کو پورا کرسکے، سو ہم کیا خوب سکت والے ہیں،

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿٢٤﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ اَحْیَآءً

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی زِندوں کو

وَّ اَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَّ جَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾

اور مُردوں کو، اور رکھے ہم نے زمین میں بوجھ کے لئے پہاڑ اُونچے، اور پلایا ہم نے تم کو پانی میٹھا پیاس بجھانے والا،

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، چل کر دیکھو جس چیز کو تم جھٹلاتے تھے،

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾

چلو ایک چھاؤں میں جس کی تین پھانکیں ہیں، نہ گہری چھاؤں اور نہ کچھ کام آئے تپش میں،

اِنَّهَا تَرْمِىْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

وہ آگ پھینکتی ہے چنگاریاں جیسے محل، گویا وہ اونٹ ہیں زرد، خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

جھٹلانے والوں کی، یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے، اور نہ اُن کو حکم ہو کہ توبہ کریں،

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ

خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، یہ ہے دن فیصلے کا، جمع کیا ہم نے تم کو

وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

اور اگلوں کو، پھر اگر کچھ داؤ ہے تمہارا تو چلالو مجھ پر، خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا ع ۱ / ۲۱

جھٹلانے والوں کی، البتہ جو ڈرنے والے ہیں وہ سائے میں ہیں اور نہروں میں، اور میوے جس قسم کے

يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

وہ چاہیں، کھاؤ اور پیو مزے سے بدلہ ان کاموں کا جو تم نے کئے تھے، ہم یونہی

نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۵﴾ کُلُوۡا وَتَمَتَّعُوۡا

دیتے ہیں بدلہ نیکی والوں کو، خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، کھالو اور برت لو

قَلِیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ

تھوڑے دِنوں بے شک تم گنہگار ہو، خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، اور جب کہئے ان کو

ارۡکَعُوۡا لَا یَرۡکَعُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ

کہ جھک جاؤ نہیں جھکتے، خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، اب کس بات پر

بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾ ع

ع ۲ ۲۲

اس کے بعد یقین لائیں گے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو ایک کے بعد ایک بھیجی جاتی ہیں، ﴿۱﴾ پھر جو آندھی بن کر زور سے چلتی ہیں، ﴿۲﴾ اور
جو (بادلوں کو) خوب اچھی طرح پھیلا دیتی ہیں، ﴿۳﴾ پھر قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتے
ہیں، ﴿۴﴾ پھر نصیحت کی باتیں نازل کرتے ہیں، ﴿۵﴾ جو یا تو لوگوں کے لئے معافی مانگنے کا سبب بنتی ہیں، یا ڈرانے کا، ﴿۶﴾
یقیناً وہ واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ ﴿۷﴾ چنانچہ (وہ واقعہ اُس وقت ہوگا) جب ستارے
بجھا دیئے جائیں گے، ﴿۸﴾ اور جب آسمان کو چیر دیا جائے گا، ﴿۹﴾ اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے، ﴿۱۰﴾ اور
جب پیغمبروں کے جمع ہونے کا وقت آجائے گا۔ ﴿۱۱﴾ (کوئی پوچھے کہ) اس معاملے کو کس دن کے لئے ملتوی کیا گیا ہے؟ ﴿۱۲﴾
(تو جواب یہ ہے کہ) فیصلے کے دن کے لئے! ﴿۱۳﴾ اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلے کا دِن کیا چیز ہے؟ ﴿۱۴﴾ بڑی خرابی ہوگی اُس دن
ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ﴿۱۵﴾ کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ﴿۱۶﴾ پھر اُنہی کے پیچھے بعد والوں کو بھی چلتا
کردیں گے۔ ﴿۱۷﴾ ایسا ہی سلوک ہم مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ ﴿۱۸﴾ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو

جھٹلاتے ہیں۔ ⑲ کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ ⑳ پھر ہم نے اُسے مقررہ وقت تک ایک مضبوط قرار کی جگہ میں رکھا، ㉑ و ㉒ پھر ہم نے توازن پیدا کیا، چنانچہ اچھا توازن پیدا کرنے والے ہم ہیں! ㉓ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㉔ کیا ہم نے زمین کو ایسا نہیں بنایا کہ وہ سمیٹ کر رکھنے والی ہے، ㉕ زندوں کو بھی، اور مُردوں کو بھی؟ ㉖ اور ہم نے اُس میں گڑے ہوئے اُونچے اُونچے پہاڑ پیدا کئے، اور تمہیں میٹھے پانی سے سیراب کرنے کا انتظام کیا۔ ㉗ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㉘ (ان سے کہا جائے گا کہ:) ''چلو اَب اُسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ㉙ چلو اُس سائبان کی طرف جو تین شاخوں والا ہے، ㉚ جس میں نہ تو (ٹھنڈک والا) سایہ ہے، اور نہ وہ آگ کی لپٹ سے بچاسکتا ہے۔ ㉛ وہ آگ تو محل جیسے بڑے بڑے شعلے پھینکے گی، ㉜ ایسا لگے گا جیسے وہ زرد رنگ کے اُونٹ ہوں۔ ㉝ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㉞ یہ ایسا دن ہے جس میں یہ لوگ بول نہیں سکیں گے، ㉟ اور نہ انہیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ کوئی عذر پیش کرسکیں۔ ㊱ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㊲ یہ فیصلے کا دِن ہے۔ ہم نے تمہیں اور پچھلے لوگوں کو اِکٹھا کرلیا ہے۔ ㊳ اب اگر تمہارے پاس کوئی داؤ ہے تو مجھ پر وہ داؤ چلالو۔ ㊴ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔'' ㊵ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، وہ بیشک سایوں اور چشموں کے درمیان ہوں گے، ㊶ اور اپنے من پسند میووں کے درمیان! ㊷ (اُن سے کہا جائے گا کہ:) مزے سے کھاؤ، اور پیو اُن اعمال کی بدولت جو تم کیا کرتے تھے۔ ㊸ ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ ㊹ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㊺ (اے کافرو!) کچھ وقت کھالو، اور مزے اُڑالو۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ ㊻ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㊼ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے آگے جھک جاؤ، تو یہ جھکتے نہیں ہیں۔ ㊽ بڑی خرابی ہوگی اُس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ ㊾ اب اس کے بعد اور کونسی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟ ㊿

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں، پھر ان ہواؤں کی جو سختی سے چلتی ہیں (جس سے خطرات کا اِحتمال ہوتا ہے) اور ان ہواؤں کی جو بادلوں کو (اُٹھا کر) پھیلاتی ہیں (جس کے بعد بارش ہونے لگتی ہے) پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کردیتی ہیں (جیسا بارش کے بعد ہوتا ہے) پھر ان ہواؤں کی جو (دِل میں) اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا اِلقاء کرتی ہیں (یعنی یہ ہوائیں مذکورہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر دلالت کی وجہ سے خالقِ کائنات کی طرف متوجہ ہوجانے کا سبب ہوجاتی ہیں، اور وہ توجہ دو طور سے ہوتی ہے، ایک خوف سے جب کہ ان ہواؤں سے آثار خوف کے

نمایاں ہوں، اور دُوسرا توبہ و معذرت سے اور یہ خوف و رجا کی دونوں صورت میں ہوسکتا ہے۔ اگر ہوائیں نفع بخش ہوں تب تو خدا کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا شکر اور اپنی تقصیرات سے عذر کرتے ہیں، اور اگر وہ ہوائیں خوفناک ہوں تو خدا کے عذاب سے ڈر کر اپنے معاصی سے توبہ کرتے ہیں۔ آگے جوابِ قسم ہے) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے، (مراد قیامت ہے اور یہ سب قسمیں قیامت کے نہایت مناسب ہیں، کیونکہ نفخۂ اُولیٰ کے بعد تمام عالم کی فنا کا واقعہ تیز آندھیوں کے مشابہ ہے، اور نفخۂ ثانیہ کے بعد کے واقعات مُردوں کا زِندہ ہونا وغیرہ مشابہ واقعات ہوائے نافع کے ہیں، جس سے بارش اور بارش سے حیاتِ نباتی اُبھرتی ہے۔ آگے اس کے وقوع پر تفریع فرماتے ہیں) سو جب ستارے بے نور ہوجائیں گے اور جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب پہاڑ اُڑتے پھریں گے اور جب سب پیغمبر وقت معین پر جمع کئے جائیں گے (اس وقت سب کا فیصلہ ہوگا، آگے اس یوم کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ کچھ معلوم ہے) کس دن کے لئے پیغمبروں کا معاملہ ملتوی رکھا گیا ہے (آگے جواب ہے کہ) فیصلے کے دن کے لئے (ملتوی رکھا گیا ہے، مطلب اس سوال و جواب کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جو رسولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں اور اَب بھی اس اُمت کے کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جب اس تکذیب پر عذابِ آخرت سے ڈرائے جاتے ہیں تو آخرت کی بھی تکذیب کرتے ہیں، اور یہ تکذیب فی نفسہٖ مقتضی اس کو ہے کہ رسولوں کا جو قصہ کفار سے پیش آرہا ہے، اس کا فیصلہ ابھی ہوجائے، اور اس کی تاخیر سے کفار کو مزید اِنکار و تکذیب کا موقع ملتا ہے اور مسلمانوں کو طبعی طور پر اس کے جلد ہوجانے کی خواہش ہوتی ہے، پس اس آیت میں اِستعجال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض حکمتوں سے اس کو مؤخر کر رکھا ہے، لیکن واقع ضرور ہوگا) اور (آگے اُس فیصلے کے دن کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ) آپ کو معلوم ہے کہ وہ فیصلے کا دن کیسا کچھ ہے (یعنی بہت سخت ہے، اور جو لوگ اس اَمرِ حق یعنی وقوعِ قیامت کو جھٹلا رہے ہیں، سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے نظائر سابقہ کے ذریعے موجودہ لوگوں کو ڈرانا ہے) کیا ہم اگلے (کافر) لوگوں کو (عذاب سے) ہلاک نہیں کر چکے پھر پچھلوں کو بھی (عذاب میں) اُن (پہلوں) ہی کے ساتھ ساتھ کردیں گے (یعنی آپ کی اُمت کے کفار پر بھی وبالِ ہلاکت نازل کریں گے، جیسا بدر وغیرہ غزوات میں ہوا) ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (یعنی اُن کے کفر پر سزا دیتے ہیں خواہ دارین میں، خواہ دارِ آخرت میں، اور جو اس اَمرِ حق یعنی کفر پر مستحقِ عذاب ہونے کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے وقوعِ قیامت اور اِحیائے موتیٰ کو ذہنوں کے قریب کرنے کے لئے فرمایا) کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی (یعنی نطفے) سے نہیں بنایا (یعنی ابتدا میں تم نطفہ تھے) پھر ہم نے اس کو ایک وقتِ مقرّر تک ایک محفوظ جگہ (یعنی عورت کے رحم) میں رکھا، غرض ہم نے (ان سب تصرفات کا) ایک انداز ٹھہرایا، سو ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھہرانے والے ہیں، (اس سے مُردوں کو دوبارہ زِندہ کرنے پر قدرت ثابت ہوئی، پھر

جولوگ اس امرِ حق یعنی قدرت علی البعث کو جھٹلا رہے ہیں، سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے اپنی بعض نعمتیں جن سے ترغیبِ اطاعت وایمان ہو ذِکر فرماتے ہیں یعنی) کیا ہم نے زمین کو زِندوں اور مُردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا (کہ زندگی اسی پر بسر ہوتی ہے، مرنے کے بعد دفن اور غرق ہوجانے اور جل جانے کی صورت میں بالآخر مٹی ہوکر اجزائے ارضیہ ہی میں کھپ جاتے ہیں، اور اس حالت بعد الموت کا نعمت ہونا اس طرح ہے کہ اگر مُردے خاک نہ ہوجایا کرتے تو زِندے پریشان ہوکر مُردے سے بدتر ہوجاتے کہ اُن کو اپنے بسنے بلکہ چلنے پھرنے کی جگہ نہ ملتی) اور ہم نے اُس (زمین) میں اُونچے اُونچے پہاڑ بنائے (جن سے بہت سے منافع متعلق ہیں) اور ہم نے تم کو میٹھا پانی پلایا (اس نعمت کو خواہ مستقل کہا جائے یا زمین ہی کے متعلق کہا جائے، کیونکہ مرکز پانی کا بھی زمین ہی ہے، اور ان نعمتوں کا تقاضا وجوبِ توحید ہے، پس جولوگ اس اَمرِ حق یعنی وجوبِ توحید کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے قیامت کی بعض سزاؤں کا بیان ہے، یعنی قیامت کے روز کفار سے کہا جائے گا کہ) تم اس عذاب کی طرف چلو جس کو جھٹلایا کرتے تھے (جس میں کی ایک سزا وہ ہے جس کا بیان اس حکم میں ہے کہ) ایک سائبان کی طرف چلو، جس کی تین شاخیں ہیں، جس میں نہ (ٹھنڈا) سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے (مراد اس سائبان سے ایک دُھواں ہے جو جہنم سے نکلے گا، اور چونکہ کثرت سے ہوگا اس لئے بلند ہوکر پھٹ کر تین ٹکڑے ہوجائیں گے، کما فی الطبری عن قتادة رحمہ اللہ۔[۱] اور فراغِ حساب تک کفار اسی دُھویں کے احاطے میں رہیں گے، جیسا کہ مقبولین ظلِ عرش میں ہوں گے، کذا فی الخازن۔[۲] آگے اس دُھویں کا اور حال مذکور ہے کہ) وہ انگارے برسائے گا، جیسے بڑے بڑے محل، جیسے کالے کالے اُونٹ (قاعدہ ہے کہ جب چنگاری آگ سے جھڑتی ہے تو بڑی ہوتی ہے، پھر بہت سے چھوٹے ٹکڑے ہوکر زمین پر گرتی ہے، پس پہلی تشبیہ ابتدائی حالت کے اعتبار سے ہے، اور دُوسری تشبیہ انتہائی حالت کے اِعتبار سے، کذا فی الروح۔[۳] پھر جولوگ اس اَمرِ حق یعنی اس واقعے کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ (آگے اور واقعہ متعلق کفار ہے، یعنی) یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو اِجازت (عذر پیش کرنے کی) ہوگی، سو عذر بھی نہ کرسکیں گے (کیونکہ واقع میں کوئی معقول عذر ہوگا ہی نہیں، اور جولوگ اس واقعہ حقہ کو بھی جھٹلا رہے ہیں، سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ (آگے بھی اسی یوم کا بیان ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے فیصلے کا دِن (جس کی تم تکذیب کیا کرتے

---

[۱] تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج:۲۳ ص:۲۰۰

[۲] تفسیر الخازن تحت هذه الآية ج:۴ ص:۳۸۴

[۳] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۲ ص:۶۴

تھے) ہم نے (آج) تم کو اور اگلوں کو (فیصلے کے لئے) جمع کرلیا، سو اگر تمہارے پاس (آج کے نتیجے اور فیصلے سے بچنے کی) کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلالو (اور یہ کفار اس واقعہ حقہ کی بھی تکذیب کرتے ہیں، سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خراب ہوگی۔ (آگے کفار کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے ثواب کا بیان ہے، یعنی) پرہیزگار لوگ سایوں میں اور چشموں میں اور مرغوب میووں میں ہوں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) اپنے اعمال (نیک) کے صلے میں خوب مزے سے کھاؤ پیو، ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ (اور یہ کفار نعمائے جنت کی بھی تکذیب کرتے ہیں، سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ (آگے پھر توبیخ و تنبیہ ہے کفار کو، یعنی اے کافرو!) تم (دُنیا میں) تھوڑے دن اور کھالو اور برت لو، (عنقریب کمبختی آنے والی ہے، کیونکہ) تم بے شک مجرم ہو (اور مجرم کا یہی حال ہونے والا ہے، اور جو لوگ سزائے جرم کو جھٹلاتے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی اور (ان کافروں کی سرکشی اور جرم کی یہ حالت ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (خدا کی طرف) جھکو (یعنی ایمان اور عبدیت اِختیار کرو) تو نہیں جھکتے (اس سے زیادہ کیا جرم ہوگا؟ اور یہ لوگ اس کے جرم ہونے کو بھی جھٹلاتے ہیں، سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (اور ان تقریعات و تہدیداتِ قرآنیہ کا مقتضا یہ تھا کہ سنتے ہی ڈر کر اِیمان لے آتے، مگر جب اس پر بھی ان کو اثر نہیں) تو پھر اس (قرآنِ بلیغ الالفاظ والانذار) کے بعد اور کون سی بات پر اِیمان لائیں گے (اس میں کفار پر توبیخ اور اُن کے ایمان سے آپ کو مایوس کرنا ہے)۔

معارف و مسائل

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ کے ایک غار میں تھے، اچانک سورۂ مرسلات نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے جاتے تھے اور میں آپ کے مبارک منہ سے اس کو سنتا، یاد کرتا جاتا تھا، آپ کا دہن مبارک اس سورۃ کی حلاوت سے رطب (شاداب) ہورہا تھا، اچانک ایک سانپ نے ہم پر حملہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، ہم اُس کی طرف جھپٹے، وہ نکل بھاگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح تم اس کے شر سے محفوظ رہے، وہ بھی تمہارے شر سے محفوظ ہوگیا۔ (ابنِ کثیر) [۱]

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور پر آنے کا ذِکر فرمایا ہے، ان چیزوں کا نام قرآن میں بیان نہیں کیا گیا، البتہ ان کی اس جگہ پانچ صفتیں بیان فرمائی ہیں: مُرسلات، عاصفات، ناشرات،

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۸ ص:۲۹۶، وصحيح البخاري، باب العمرة، باب ما يقتل المحرم من الدواب ج:۱ ص:۲۴۶

فارقات، مُلقیات الذکر۔ کسی حدیثِ مرفوع میں اس کی پوری تعیین نہیں آئی کہ ان صفات کے موصوفات کیا ہیں اس لئے صحابہ وتابعین کی تفسیریں اس معاملے میں مختلف ہوگئیں۔

بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دِیا ہے، اور یہ کہ ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کی مختلف جماعتیں ان مختلف صفات کی حامل ہوں۔ بعض حضرات نے ان صفات کا موصوف ہواؤں کو قرار دِیا ہے، وہ بھی مختلف اقسام اور نوعیت کی ہوتی ہیں، اس لئے یہ صفاتِ مختلفہ اُن میں ہوسکتی ہیں۔ بعض حضرات نے ان کا موصوف خود انبیاء و رُسل کو قرار دِیا ہے۔ ابنِ جریر طبری رحمہ اللہ نے اسی لئے اس معاملے میں توقف اور سکوت کو اَسلم قرار دِیا کہ اِحتمال دونوں ہیں، ہم اپنی طرف سے کسی کو متعین نہیں کرتے۔ [۱]

اور اس میں شبہ نہیں کہ جو پانچ صفات اس جگہ ذِکر کی گئی ہیں، اُن میں سے بعض تو ملائکۃ اللہ پر زیادہ چسپاں اور اُن کے مناسب ہیں، ان کو رِیاح کی صفت بنائیں تو کھینچ تان اور تأویل کرنا پڑتی ہے، اور بعض صفات ایسی ہیں جو رِیاح یعنی ہواؤں پر زیادہ چسپاں اور واضح ہیں، اُن کو فرشتوں کی صفت بنائیں تو تأویل کے بغیر نہیں بنتی۔ اس لئے اس مقام میں بہتر فیصلہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کا معلوم ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کی صفتیں ہیں، ان تین میں رِیاح اور ہواؤں کی قسم ہوگئی، باقی آخری دو صفتیں یہ فرشتوں کی صفات ہیں، تو یہ فرشتوں کی قسم ہوگئی۔ [۲]

رِیاح کی صفت قرار دینے میں آخری دو صفتوں میں جو تأویل کی جاتی ہے، وہ آپ خلاصۂ تفسیر میں دیکھ چکے ہیں، کیونکہ اُس میں اسی کو اِختیار کرکے تفسیر کی گئی ہے۔ اسی طرح جن حضرات نے ان سب صفات کو صفاتِ ملائکہ قرار دِیا ہے، ان کو پہلی تین صفات یعنی: ''مرسلات، عاصفات، ناشرات'' کو فرشتوں پر چسپاں کرنے کے لئے اسی طرح کی تأویلات سے کام لینا پڑا ہے۔ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کے اِختیار کے مطابق معنی ان آیتوں کے یہ ہوگئے کہ قسم ہے ان ہواؤں کی جو بھیجی جاتی ہیں۔ عُرْفًا ۞ یہاں عُرْفًا کا مفہوم وہ بھی ہوسکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اُوپر مذکور ہوا، یعنی جود وسخا اور نفع رسانی، جو ہوائیں بارش لے کر آتی ہیں اُن کی جود وسخا اور نفع رسانی ظاہر ہے۔ اور دُوسرے معنی عُرْفًا کے متتابع یعنی پے درپے کے بھی آتے ہیں، یہ معنی لئے جائیں تو مراد وہ ہوائیں ہوں گی جو بادل اور بارش کو لئے ہوئے مسلسل اور متتابع چلتی ہیں۔ اور عاصفات، عصف سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں، اس سے مراد وہ آندھیاں اور تیز ہوائیں ہیں جو بعض اوقات دُنیا میں آیا کرتی ہیں۔ اور ناشرات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بارش ختم ہونے کے بعد بادل کو پھاڑ کر منتشر کردیتی ہیں۔ اور فارقات یہ صفت فرشتوں کی ہے، جو وحیِ اِلٰہی نازل کرکے حق وباطل میں فرق واضح کردیتے

[۱] تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲۳ ص:۵۸۷

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۹۶

ہیں۔اور ملقیات ذکرًا بھی فرشتوں کی صفت ہے، اور ذِکر سے مراد قرآن یا مطلق وحی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو بذریعہ وحی حق و باطل میں فرق اور امتیاز واضح کر دیتے ہیں۔ اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو انبیاء علیہم السلام پر ذِکر یعنی وحی اور قرآن کا اِلقاء کرتے ہیں۔ اس طرح کسی صفت میں تأویل اور کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

رہا یہ سوال کہ اس تفسیر کی بنا پر پہلے ہواؤں کی مختلف اقسام کی قسم کھائی گئی پھر فرشتوں کی، ان دونوں میں ربط اور جوڑ کیا ہے سو کلامِ الٰہی کی حکمتوں کا احاطہ تو کوئی کر نہیں سکتا، یہ مناسبت بھی ہوسکتی ہے کہ ہواؤں کی دونوں قسمیں بارش والی نفع بخش، اور سخت آندھیاں مضرّت رساں یہ سب محسوسات میں سے ہیں، ہر شخص اُن کو پہچانتا ہے، پہلے غور و فکر کے لئے انسان کے سامنے ان کو لایا گیا، اس کے بعد فرشتوں اور وحی کو پیش کیا گیا، جو محسوس نہیں، مگر ذرا سے غور و فکر کرنے پر اُن کا یقین ہوسکتا ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ یہ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ سے متعلق ہے کہ یہ ذکر اور وحی انبیاء علیہم السلام پر اس لئے نازل کی جائے گی کہ وہ اہلِ حق مؤمنین کے لئے اُن کی کوتاہیوں سے معذرت کا سبب بنے اور اہلِ باطل کفار کے لئے نذیر اور عذاب سے ڈرانے والا ثابت ہو۔

ہواؤں یا فرشتوں یا دونوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ یعنی تم میں سے جس قیامت اور حساب و کتاب، جزا و سزا کا وعدہ بذریعہ انبیاء کیا جا رہا ہے، وہ ضرور پورا اور واقع ہوکر رہے گا۔ آگے اس کے واقع ہونے کے وقت کے چند حالات کا ذِکر ہے، اوّل یہ کہ سب ستارے بے نور ہو جائیں گے، جس کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ یہ سب بالکلیہ فنا ہی ہوجائیں، یا یہ کہ موجود رہیں مگر ان کا نور سلب ہو جائے، اس طرح پوری دُنیا ایک انتہائی سخت اندھیری میں غرق ہو جائے گی۔ دُوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ آسمان پھٹ جائیں گے۔ تیسرا یہ کہ پہاڑ رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ چوتھا حال یہ بتلایا گیا: وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ اُقِّتَتْ، توقیت سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی تعیینِ وقت اور تحدیدِ وقت کے ہیں، اور بقول زمخشری کبھی اس کے معنی کسی مقرّرہ وقت پر پہنچ جانے کے بھی آتے ہیں، (کما فی الرُّوح[1]) اس جگہ یہی دُوسرے معنی مناسب ہیں، اور معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ انبیاء ورُسل کے لئے جو میعاد اور وقت مقرّر کیا گیا تھا کہ اس میں اپنی اپنی اُمتوں کے معاملے میں شہادت کے لئے حاضر ہوں، وہ اس میعاد کو پہنچ گئے اور اُن کی حاضری کا وقت آ گیا، اسی لئے خلاصۂ تفسیر مذکورہ میں اس کا ترجمہ انبیاء کے جمع کرنے کے ساتھ کیا گیا، آگے قیامت کے دن کے عظیم اور ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ وہ فیصلے کا دِن ہے، جس میں مکذّبین اور کفار کے لئے تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

---

[1] تفسیر روح المعانی تحت هٰذہ الآیة ج:۲۲ ص:۴۳

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۵﴾ کے یہی معنی ہیں۔ وَيۡلٌ کے معنی ہلاکت و بربادی کے ہیں، اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ وَیۡل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، جس میں اہلِ جہنم کے زخموں کی پیپ جمع ہوگی، یہ جگہ مکذبین کے رہنے کی قرار دِی جائے گی۔ اس کے بعد موجودہ لوگوں کو پچھلی اُمتوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کے لئے فرمایا:

اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾ یعنی کیا ہم نے پہلے لوگوں کو اُن کے کفر و عناد کی وجہ سے ہلاک نہیں کردیا قومِ عاد و ثمود اور قومِ لوط، قومِ فرعون وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾ مشہور و معروف [1] قراءت کے مطابق بسکونِ عین عطف ہے نُهۡلِكِ پر، جس کے معنی یہ ہیں: کیا ہم نے اوّلین کے بعد آخرین کو بھی ان کے پیچھے ہلاک نہیں کردیا اس لئے آخرین سے مراد بھی پچھلی اُمتوں ہی کے آخرین ہوں گے، جن کی ہلاکت نزولِ قرآن سے پہلے واقع ہوچکی ہے، اور دُوسری ایک قراءت میں نُتۡبِعُهُمۡ بضمِ عین بھی آیا ہے، اس قراءت پر یہ جملہ الگ ہے اور آخرین سے مراد اُمتِ محمدیہ کے کفار ہیں۔ پچھلی اُمتوں کی ہلاکت اور عذاب کی خبر دینے کے بعد موجودہ کفار اہلِ مکہ کو آئندہ ان پر آنے والے عذاب کی خبر دینا مقصود ہے، جیسا کہ غزوۂ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر عذابِ ہلاکت نازل ہوا۔

فرق یہ ہے کہ پچھلی اُمتوں پر آسمانی عذاب آتا تھا جس سے پوری بستیاں تباہ ہوجاتی تھیں، اُمتِ محمدیہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے یہ اِکرامِ خاص ہے کہ ان کے کفار پر آسمانی عذاب نہیں آتا، بلکہ ان کا عذاب مسلمانوں کی تلوار سے آتا ہے، جس میں ہلاکت عام نہیں ہوتی، صرف بڑے بڑے سرکش مجرم ہی مارے جاتے ہیں۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾ یعنی ہم نے زمین کو كِفَاتٌ بنایا ہے زندہ اور مُردہ انسانوں کے لئے، كِفَاتٌ، كَفْتٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ملانے اور جمع کرلینے کے ہیں۔ كِفَاتٌ وہ چیز جو بہت سی چیزوں کو اپنے اندر جمع کرے، زمین کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ زندہ انسان اس کی پیٹھ پر سوار ہیں، اور مُردے سب اس کے پیٹ میں جمع ہیں۔

اِنَّهَا تَرۡمِىۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴿۳۳﴾ قصر کے معنی بڑا عالی شان محل، اور جمالة بمعنی جَمَل اُونٹ کو کہا جاتا ہے۔ صُفۡر، اصفر کی جمع ہے، جس کے معنی زرد کے ہیں۔ مراد آیت کی یہ ہے کہ اس جہنم کی آگ سے اتنے بڑے بڑے شرارے اُٹھیں گے جو ایک مستقل محل عالی شان کے برابر ہوں گے، پھر وہ متفرق ہوکر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوں گے، وہ ٹکڑے زرد اُونٹوں کے برابر ہوں گے۔ اور بعض حضرات نے اس جگہ صُفۡر کا ترجمہ سیاہ کیا ہے،

---

[1] اس مقام پر حضرتِ مصنف رحمۃ اللہ علیہ سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ مشہور و معروف قراءت سکونِ عین کی نہیں ہے، ضمِ عین کی ہے، جیسا کہ کتبِ قراءت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ سکونِ عین کی قراءت درحقیقت شاذ ہے۔ محمد عبداللہ

کیونکہ زرد اُونٹ کی زردی سیاہی مائل ہوتی ہے۔ (رُوح) [۱]

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ یعنی اس دن میں کوئی بول نہ سکے گا اور نہ کسی کو اپنے کئے ہوئے عمل کا عذر پیش کرنے کی اجازت ہوگی، اور دُوسری آیاتِ قرآن میں جو کفار کا بولنا اور عذر پیش کرنا مذکور ہے، وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ محشر میں مختلف مواقف اور مقامات آئیں گے، کسی مقام میں کلام اور عذر پیش کرنا ممنوع ہوگا، کسی میں اجازت ہوگی۔ (رُوح) [۲]

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ یعنی کھاؤ پیو اور آرام اُٹھالو تھوڑے دن، کیونکہ تم مجرم ہو، آخرکار سخت عذاب میں جانا ہے۔ یہ مکذبین کو خطاب ہے دُنیا میں، انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اُن کو کہا گیا ہے کہ یہ تمہارا عیش وآرام چندروزہ ہے، پھر عذاب ہی عذاب ہے۔ (کذا فسّرہ ابو حیّان) [۳]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک رُکوع سے مراد اُس کے لغوی معنی یعنی جھکنا اور اِطاعت کرنا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب دُنیا میں اُن کو اَحکامِ الٰہیہ کی اِطاعت کے لئے کہا جاتا تھا تو یہ اِطاعت نہ کرتے تھے۔ اور بعض حضرات نے رُکوع کے اِصطلاحی معنی بھی مراد لئے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب ان کو نماز کی طرف بلایا جاتا تھا تو یہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ رُکوع بول کر پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ (رُوح) [۴]

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ یعنی جب یہ لوگ قرآن جیسی عجیب وغریب بلیغ اور حکمتوں سے پُر واضح دلائل کی کتاب پر اِیمان نہ لائے، تو اس کے بعد اَب کس بات پر اِیمان لائیں گے مراد ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب تلاوت کرنے والا اس آیت پر پہنچے تو اس کو کہنا چاہئے: ''آمَنَّا بِاللهِ'' یعنی ہم اللہ پر اِیمان لے آئے۔ [۵] نماز سے خارج میں اور نوافل میں یہ الفاظ کہنے چاہئیں، مگر فرائض میں اور سنن میں اس زیادتی سے اِحتراز کرنا روایاتِ حدیث سے ثابت ہے، اس لئے اُس میں نہ کہا جائے۔ واللہ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ بِحَمْدِ اللهِ لِاٰخِرِ يَوْمٍ مِّنْ رَّجَبَ ۱۳۹۱ھ وَبِهٖ
تَمَّ الْجُزْءُ التَّاسِعُ وَالْعِشْرُوْنَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاللهُ الْمُوَفِّقُ لِاِتْمَامِ الْبَاقِيْ

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج:۲۲ ص:۶۵

[۲] تفسیر روح المعانی ج:۲۲ ص:۶۷

[۳] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۴۷۹

[۴] تفسیر روح المعانی ج:۲۲ ص:۷۷

[۵] مسند احمد، مسند ابی هريرة رضی الله عنه، رقم الحديث:۷۳۸۵، والسُّنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم الحديث:۳۸۴۴، ومجمع الزوائد، باب سورة القيامة، رقم الحديث:۱۱۴۵

سُوۡرَةُ النَّبَاِ

آیاتھا ۴۰　　۷۸ سُوۡرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ ۸۰　　رکوعاتھا ۲

سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ ① عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِيۡمِ ۙ ② الَّذِىۡ هُمۡ فِيۡهِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ ③

کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے، جس میں وہ مختلف ہیں،

كَلَّا سَيَعۡلَمُوۡنَ ۙ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعۡلَمُوۡنَ ⑤ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ

ہرگز نہیں، اب جان لیں گے، پھر بھی ہرگز نہیں، اب جان لیں گے، کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو

مِهٰدًا ۙ ⑥ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۖ ⑦ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ ⑧ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ

بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں، اور تم کو بنایا ہم نے جوڑے جوڑے، اور بنایا نیند کو تمہاری

سُبَاتًا ۝۹ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱

تکان دفع کرنے کے لئے، اور بنایا رات کو اوڑھنا، اور بنایا دن کمائی کرنے کو،

وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳ وَّ اَنْزَلْنَا

اور چنی ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط، اور بنایا ایک چراغ چمکتا ہوا، اور اتارا

مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝۱۵

نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا ریلا، تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ،

وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝۱۷ يَّوْمَ يُنْفَخُ

اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے، بے شک دن فیصلے کا ہے ایک وقت ٹھہرا ہوا، جس دن پھونکی جائے

فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝۱۸ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۱۹

صور، پھر تم چلے آؤ جٹ کے جٹ، اور کھولا جائے آسمان تو ہوجائیں اس میں دروازے،

وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱

اور چلائے جائیں گے پہاڑ تو ہوجائیں گے چمکتا ریتا، بے شک دوزخ ہے تاک میں،

لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝۲۲ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝۲۳ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا

شریروں کا ٹھکانا، رہا کریں اس میں قرنوں، نہ چکھیں وہاں کچھ مزہ ٹھنڈک کا

وَّ لَا شَرَابًا ۝۲۴ اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا ۝۲۵ جَزَآءً وِّفَاقًا ۝۲۶ اِنَّهُمْ

اور نہ پینا ملے کچھ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ، بدلہ ہے پورا، ان کو

كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا لا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ط ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ

توقع نہ تھی حساب کی، اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکرا کر، اور ہر چیز

اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا لا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ

ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر، اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائیں گے تم پر مگر عذاب، بے شک ڈر والوں کو

مَفَازًا لا ﴿۳۱﴾ حَدَاۗىِٕقَ وَاَعْنَابًا لا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا لا ﴿۳۳﴾ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ط ﴿۳۴﴾

اُن کی مُراد ملنی ہے، باغ ہیں اور انگور، اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب، اور پیالے چھلکتے ہوئے،

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ ج جَزَاۗءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاۗءً حِسَابًا لا ﴿۳۶﴾

نہ سنیں گے وہاں بک بک اور نہ مکرانا، بدلہ ہے تیرے ربّ کا دیا ہوا حساب سے،

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ

جو ربّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے، بڑی رحمت والا، قدرت نہیں کہ کوئی اُس سے

خِطَابًا ﴿۳۷﴾ ج يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ صَفًّا ط لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ

بات کرے، جس دن کھڑی ہو رُوح اور فرشتے قطار باندھ کر، کوئی نہیں بولتا

اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ج فَمَنْ شَاۗءَ

مگر جس کو حکم دیا رحمٰن نے اور بولا بات ٹھیک، وہ دن ہے برحق، پھر جو کوئی چاہے

اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ

بنا رکھے اپنے ربّ کے پاس ٹھکانا، ہم نے خبر سنا دی تم کو ایک آفت نزدیک آنے والی کی، جس دن دیکھ لے گا آدمی

مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع ۲

جو آگے بھیجا اُس کے ہاتھوں نے اور کہے گا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

یہ (کافر) لوگ کس چیز کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں؟ ① اُس زبردست واقعے کے بارے میں جس
میں خود ان کی باتیں مختلف ہیں! ② و ③ خبردار! انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا، ④ دوبارہ خبردار! انہیں بہت جلد پتہ لگ
جائے گا۔ ⑤ کیا ہم نے زمین کو ایک بچھونا نہیں بنایا؟ ⑥ اور پہاڑوں کو (زمین میں گڑی ہوئی) میخیں؟ ⑦ اور تمہیں
(مرد و عورت کے) جوڑوں کی شکل میں ہم نے پیدا کیا، ⑧ اور تمہاری نیند کو تھکن دُور کرنے کا ذریعہ ہم نے بنایا، ⑨ اور
رات کو پردے کا سبب ہم نے بنایا، ⑩ اور دِن کو روزی حاصل کرنے کا وقت ہم نے قرار دیا، ⑪ اور ہم نے ہی تمہارے
اُوپر سات مضبوط وجود (آسمان) تعمیر کئے، ⑫ اور ہم نے ہی ایک دہکتا ہوا چراغ (سورج) پیدا کیا، ⑬ اور ہم نے ہی
بھرے ہوئے بادلوں سے موسلا دھار پانی برسایا، ⑭ تاکہ اُس سے غلہ اور دُوسری سبزیاں بھی اُگائیں، ⑮ اور گھنے باغات
بھی۔ ⑯ یقین جانو فیصلے کا دِن ایک متعین وقت ہے، ⑰ وہ دن جب صور پھونکا جائے گا تو تم سب فوج در فوج چلے
آؤ گے، ⑱ اور آسمان کھول دیا جائے گا، تو اُس کے دروازے ہی دروازے بن جائیں گے، ⑲ اور پہاڑوں کو چلایا جائے
گا تو وہ ریت کے سراب کی شکل اختیار کر لیں گے، ⑳ یقین جانو جہنم گھات لگائے بیٹھی ہے، ㉑ وہ سرکشوں کا ٹھکانا ہے ㉒
جس میں وہ مدتوں اس طرح رہیں گے ㉓ کہ اُس میں نہ وہ کسی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے، اور نہ کسی پینے کے قابل چیز کا، ㉔
سوائے گرم پانی اور پیپ لہو کے، ㉕ یہ اُن کا پورا پورا بدلہ ہوگا۔ ㉖ وہ (اپنے اعمال کے) حساب کا عقیدہ نہیں رکھتے
تھے، ㉗ اور انہوں نے ہماری آیتوں کو بڑھ چڑھ کر جھٹلایا تھا۔ ㉘ اور ہم نے ہر ہر چیز کو لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے، ㉙ ''اب مزہ
چکھو! اس لئے کہ ہم تمہارے لئے سزا کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کریں گے۔'' ㉚ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا،
اُن کی بیشک بڑی جیت ہے، ㉛ باغات اور انگور! ㉜ اور نوخیز ہم عمر لڑکیاں! ㉝ اور چھلکتے ہوئے پیمانے! ㉞ وہاں پر وہ نہ
کوئی بے ہودہ بات سنیں گے، اور نہ کوئی جھوٹی بات، ㉟ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہوگا ــــــ (اللہ کی) ایسی
دین ہوگی جو لوگوں کے اعمال کے حساب سے دی جائے گی، ㊱ اُسی پروردگار کی طرف سے جو سارے آسمانوں اور زمین
اور اُن کے درمیان ہر چیز کا مالک، بہت مہربان ہے! کسی کی مجال نہیں ہے کہ اُس کے سامنے بول سکے۔ ㊲ جس دن ساری

رُوحیں اور فرشتے قطاریں بنا کر کھڑے ہوں گے، اُس دن سوائے اُس کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہو، اور وہ بات بھی ٹھیک کہے۔ (۳۸) وہ دن ہے جو برحق ہے۔ اب جو چاہے، وہ اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنا رکھے۔ (۳۹) حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ایک ایسے عذاب سے خبردار کر دیا ہے جو قریب آنے والا ہے، جس دن ہر شخص وہ اعمال آنکھوں سے دیکھ لے گا جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھے ہیں، اور کافر یہ کہے گا کہ کاش! میں مٹی ہو جاتا۔ (۴۰)

خلاصۂ تفسیر

یہ (قیامت کا اِنکار کرنے والے) لوگ کس چیز کا حال دریافت کرتے ہیں اس بڑے واقعے کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ (اہلِ حق کے ساتھ) اِختلاف کر رہے ہیں (مراد قیامت ہے اور دریافت کرنے سے مراد بطور اِنکار کے دریافت کرنا ہے، اور مقصود اس سوال و جواب سے اَذہان کا اُدھر متوجہ کرنا اور تفسیر بعد الابہام سے اُس کا اہتمامِ شان ظاہر کرنا ہے۔ آگے اُن کے اختلاف کا بے وجہ اور باطل ہونا بیان کیا گیا ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آئے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ قیامت آئے گی اور) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (یعنی جب دُنیا سے رُخصت ہونے کے بعد اُن پر عذاب واقع ہوگا تب حقیقت اور حقیت قیامت کی منکشف ہو جائے گی، اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آئے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ آئے گی اور) اُن کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (اور چونکہ وہ لوگ اِس کو مستبعد یا محال سمجھتے ہیں، آگے اس کے اِمکان اور وقوع کا بیان ہے کہ اس کو محال سمجھنے سے ہماری قدرت کا اِنکار لازم آتا ہے، اور ہماری قدرت کا اِنکار نہایت عجیب ہے، کیونکہ) کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا (یعنی مثل میخوں کے بنایا، جیسا کسی چیز میں میخیں لگا دینے سے وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلتی، اسی طرح زمین کو پہاڑوں سے مستقر کر دیا، اس کی تحقیق سورۂ نحل میں گزر چکی ہے) اور (اس کے علاوہ ہم نے اور بھی دلائلِ قدرت ظاہر فرمائے، چنانچہ) ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد و عورت) بنایا اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو راحت کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے رات کو پردے کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا، اور ہم ہی نے تمہارے اُوپر سات مضبوط آسمان بنائے، اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا (مراد آفتاب ہے لقولہٖ تعالیٰ: وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۱۶) [1] (نوح)) اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے بہت پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعے سے غلہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں (اور ان سب سے ہمارا اکمالِ قدرت ظاہر ہے، پھر قیامت پر ہمارے قادر ہونے کا کیوں اِنکار کیا جاتا ہے؟ یہ بیان تھا اِمکان کا آگے وقوع کا ذِکر ہے کہ) بے شک فیصلے کا دِن ایک معین وقت ہے، یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا، پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آ ؤ گے

[1] ترجمہ: اور سورج کو چراغ بنایا۔

(یعنی ہر اُمت جدا جدا ہوگی، پھر مؤمن جدا، کافر جدا، پھر اَبرار جدا، اَشرار جدا، سب ایک دُوسرے سے ممتاز ہوکر میدانِ قیامت میں حاضر ہوں گے) اور آسمان کھل جائے گا پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہوجائیں گے (یعنی اس قدر بہت سا کھل جائے گا جیسے بہت سے دروازے ملا کر بہت بڑی جگہ کھلی ہوتی ہے، پس کلام مبنی ہے تشبیہ پر، اب یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ دروازے تو آسمان میں اب بھی ہیں، پھر اس دن دروازے ہونے کے کیا معنی اور یہ کھلنا نزولِ ملائکہ کے لئے ہوگا، جیسے سورۂ فرقان میں: تَشَقَّقُ السَّمَآءُ [۱] (الفرقان:۲۵) سے تعبیر فرمایا، اور اس کی شرح وہاں گزری ہے۔) اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹادیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہوجائیں گے (کقولہٖ تعالیٰ: كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ [۲] (المزّمّل)۔ اور یہ واقعات نفخۂ ثانیہ کے وقت ہوں گے، البتہ تسییرِ جبال میں یہاں بھی اور جہاں جہاں واقع ہوا ہے، دونوں اِحتمال ہیں، یا تو نفخۂ ثانیہ کے بعد کہ اس سے عالم کی سب چیزیں اپنی ہیئت پر عود کر آئیں گی، جب حساب کا وقت آئے گا پہاڑوں کو زمین کے برابر کردیا جائے گا تاکہ زمین پر کوئی آڑ، پہاڑ نہ رہے، سب ایک ہی میدان میں نظر آئیں، اور یا یہ نفخۂ اُولیٰ کا وقت ہوگا جس سے خود فنا کرنا مقصود بالذات ہوگا، پھر اس تقدیر پر یوم کو ان سب واقعات کا ظرف فرمانا اس بنا پر ہوگا کہ نفخۂ اُولیٰ سے نفخۂ ثانیہ تک کا مجموعہ ایک یوم قرار دے دیا گیا، واللہ اعلم۔ آگے اس يَوْمَ الْفَصْلِ میں جو فیصلہ ہوگا اس کا بیان ہے، یعنی) بے شک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے (یعنی عذاب کے فرشتے انتظار اور تاک میں ہیں کہ کافر آئیں تو اُن کو پکڑتے ہی عذاب دینے لگیں اور وہ) سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) جس میں وہ بے انتہا زمانوں (پڑے) رہیں گے (اور) اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں گے (اس سے زمہریر یعنی سخت سردی کی نفی نہیں ہوئی) اور نہ پینے کی چیز کا (جس سے پیاس بجھے) بجز گرم پانی اور پیپ کے یہ (ان کو) پورا بدلہ ملے گا (اور وہ اعمال جن کا یہ بدلہ ہے یہ ہیں کہ) وہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ نہ رکھتے تھے اور ہماری (اُن) آیتوں کو (جن میں حساب و دیگر اُمورِ حقہ کی خبر تھی) خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (اُن کے اعمال میں سے) ہر چیز کو (ان کے نامۂ اَعمال میں) لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے سو (ان اعمال پر ان کو مطلع کر کے کہا جائے گا کہ اب اُن اعمال کا) مزہ چکھو کہ ہم تم کو سزا ہی بڑھاتے چلے جائیں گے (یہ تو کافروں کا فیصلہ ہوا، آگے اہلِ ایمان کا فیصلہ مذکور ہے کہ) خدا سے ڈرنے والوں کے لئے بے شک کامیابی ہے، یعنی (کھانے اور سیر کو) باغ (جن میں طرح طرح کے میوے ہوں گے) اور انگور (یہ تخصیص بعد التعمیم اہتمامِ شان کے لئے ہے) اور (دِل بہلانے کو) نوخاستہ ہم عمر عورتیں ہیں اور (پینے کو) لبالب بھرے ہوئے جامِ شراب (اور) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ جھوٹ (کیونکہ یہ باتیں وہاں محض معدوم ہیں) یہ (ان کو اُن کی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا

---

[۱] ترجمہ: اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جاوے گا۔

[۲] ترجمہ: اور پہاڑ ریگ رواں ہوجائیں گے۔

آپ کے رَبّ کی طرف سے، جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا، اور اُن چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں ہیں (اور جو) رحمٰن ہے (اور) کسی کو اس کی طرف سے (مستقل) اختیار نہ ہوگا کہ (اُس کے سامنے) عرض معروض کرسکے۔ جس روز تمام ذِی ارواح اور فرشتے (خدا کے رُوبرو) صف بستہ (خشوع وخضوع کے ساتھ) کھڑے ہوں گے (اُس روز) کوئی بول نہ سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن (بولنے کی) اجازت دِے دے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے (ٹھیک بات سے مراد وہ بات جس کی اجازت دی گئی ہے، یعنی بولنا بھی محدود ومقید ہوگا، یہ نہیں کہ جو چاہے بولنے لگے اور مستقل اِختیار سے اُوپر یہی مراد ہے، آگے اُوپر کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے کہ) یہ (دن جس کا اُوپر ذِکر ہوا) یقینی دِن ہے سو جس کا جی چاہے (اس کے حالات سن کر) اپنے رَبّ کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے (یعنی نیک عمل کرے کہ وہاں نیک ٹھکانا ملے، آگے اِتمام حجت ہے کہ لوگو!) ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرادیا ہے (جو کہ ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے) جس دن ہر شخص ان اعمال کو (اپنے سامنے حاضر) دیکھ لے گا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کئے ہوں گے اور کافر (حسرت سے) کہے گا کہ کاش! میں مٹی ہوجاتا (تاکہ عذاب سے بچتا، اور یہ اُس وقت کہے گا جب چوپائے جانور مٹی کردیئے جائیں گے، رواہ فی الدر عن ابی هريرة رضی الله عنه)۔ [1]

معارف ومسائل

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ① لفظ عَمَّ دو حرفوں سے مرکب "عن" اور "ما"، حرف "ما" اِستفہام کے لئے آتا ہے، اس ترکیب میں حرف "ما" میں سے الف ساقط کردیا گیا ہے، معنی یہ ہوئے کہ یہ لوگ کس چیز میں باہمی سوال وجواب کررہے ہیں، پھر خود ہی اس کا جواب دیا گیا عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③ لفظ "نَبَا" کے معنی خبر کے ہیں، مگر ہر خبر کو "نَبَا" نہیں بلکہ جب کوئی عظیم الشان خبر ہو اُس کو "نَبَا" کہا جاتا ہے، مراد اس "نَبَا" یعنی خبرِ عظیم الشان سے قیامت ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اہلِ مکہ اس عظیم الشان خبر یعنی قیامت کے بارے میں بحث اور سوال جواب کررہے ہیں، جس میں ان کے آپس میں اختلاف ہورہا ہے۔

حضرت اِبن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب قرآنِ کریم نازل ہونا شروع ہوا تو کفارِ مکہ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر اس کے متعلق رائے زنی اور چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے۔ قرآن میں قیامت کا ذِکر اہمیت کے ساتھ آیا ہے، اور ان کے نزدیک گویا یہ محال چیز تھی، اس لئے اس میں گفتگو بکثرت چلتی تھی، کوئی تصدیق کرتا، کوئی اِنکار، اس لئے اس سورت کے شروع میں ان کا یہ حال ذِکر کرکے آگے قیامت کا واقع ہونا مذکور ہے، اور اُن کے نزدیک جو اس کے واقع ہونے میں

[1] تفسير الدّر المنثور ج:۱۵ ص:۲۱۶

اِشکال اور اِستبعاد تھا اس کا جواب دیا گیا۔ اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ سوال جواب کوئی واقعی تحقیق کے لئے نہیں تھا، بلکہ محض اِستہزا و تمسخر کے لئے تھا، واللہ اعلم، قرآنِ کریم نے ان کے جواب میں ایک ہی جملے کو تاکید کے لئے دو مرتبہ فرمایا: كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵ ''كَلَّا'' کے معنی ہیں: ہرگز نہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ سوال و جواب اور بحث و تحقیق سے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں، وہ تو جب سامنے آئے گی اُس وقت حقیقت معلوم ہوگی۔ یہ ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں بحث و سوال اور اِنکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر فرمایا کہ اس کی حقیقت خود ان لوگوں پر عنقریب واضح ہو جائے گی، یعنی مرنے کے بعد ان کو دُوسرے عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوگا اور وہاں کے ہولناک مناظر کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے، اس وقت حقیقت کھل جائے گی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمت و صنعت کے چند مناظر کا ذِکر فرمایا ہے، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ اس سارے عالم کو ایک مرتبہ فنا کر کے دوبارہ پھر ویسا ہی پیدا کر دے، اس میں زمین اور اس کے پہاڑوں کی تخلیق، پھر اِنسان کی تخلیق مرد و عورت کے جوڑے کی صورت میں بیان فرمائی، پھر اِنسان کی راحت اور صحت اور کاروبار کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کا ذِکر فرمایا، اس میں ایک یہ ارشاد ہے: وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ سُبَاتٌ، سَبْتٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مونڈنے اور قطع کرنے کے ہیں، نیند کو حق تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ وہ انسان کے تمام ہموم و غموم اور اَفکار کو قطع کر کے اس کے قلب کو، دِماغ کو ایسی راحت دیتی ہے کہ دُنیا کی کوئی راحت اس کا بدل نہیں ہو سکتی، اسی لئے سُبَات کا ترجمہ بعض حضرات نے راحت سے بھی کیا ہے۔

نیند بہت بڑی نعمت ہے

یہاں حق تعالیٰ نے انسان کو جوڑے جوڑے بنانے کا ذِکر فرمانے کے بعد اس کی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذِکر فرمایا ہے۔ غور کیجئے تو یہ ایک ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ انسان کی ساری راحتوں کا مدار یہی ہے، اور اس نعمت کو حق تعالیٰ نے پوری مخلوق کے لئے عام ایسا فرما دیا ہے کہ امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت یکساں بیک وقت عطا ہوتی ہے، بلکہ دُنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مال داروں اور دُنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی، اُن کے پاس راحت کے سامان، راحت کا مکان، ہوا اور سردی گرمی کے اِعتدال کی جگہ، نرم گدّے، تکیے، سب کچھ ہوتے ہیں، جو غریبوں کو بہت کم ملتے ہیں، مگر نیند کی نعمت ان گدّوں تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں، وہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہِ راست اُس کی طرف سے ملتی ہے۔ بعض اوقات مفلس، بے سامان کو بغیر کسی بستر تکیے کے کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دے دی جاتی ہے، اور بعض

اوقات ساز وسامان والوں کو نہیں دِی جاتی، اُن کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے، اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام نہیں کرتیں، پھر غور کرو کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ نے جیسا ساری مخلوق انسان اور جانور کے لئے عام فرمایا ہے، اور مفت بلامحنت سب کو دِیا ہے، اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ صرف مفت بلامحنت ہی نہیں بلکہ اپنی رحمتِ کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنادیا ہے کہ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا رہے، مگر رحمتِ حق جل شانہٗ اس پر جبراً نیند مسلط کر کے اس کو سلا دیتی ہے کہ دن بھر کا تکان دُور ہو جائے، اور اُس کے قویٰ مزید کام کے لئے تیز ہو جائیں۔

آگے اسی نیند کی عظیم نعمت کا تکملہ یہ بیان فرمایا کہ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ یعنی رات کو ہم نے چھپانے کی چیز بنادیا، اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو فطرۃً نیند اُس وقت آتی ہے جب روشنی زیادہ نہ ہو، ہر طرف سکون ہو، شور شغب نہ ہو، حق تعالیٰ نے رات کو لباس یعنی اوڑھنے اور چھپانے کی چیز فرما کر اِشارہ کردیا کہ قدرت نے تمہیں صرف نیند کی کیفیت ہی عطا نہیں فرمائی بلکہ سارے عالم میں ایسے حالات پیدا کردیئے جو نیند کے لئے سازگار ہوں، اوّل رات کی تاریکی، دُوسرے پورے عالم انسان اور جانور سب پر بیک وقت نیند کا مسلط ہونا کہ جب سب ہی سو جائیں گے تو پورے عالم میں سکون ہوگا، ورنہ دُوسرے کاموں کی طرح اگر نیند کے اوقات بھی مختلف لوگوں کے مختلف ہوا کرتے تو کسی کو بھی نیند کے وقت سکون میسر نہ آتا۔

اس کے بعد اِرشاد فرمایا: وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ کہ انسان کی راحت وسکون کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو غذا وغیرہ کی ضروریات ملیں ورنہ وہ نیند موت ہو جائے گی، اگر ہمہ وقت رات ہی رہتی اور آدمی سوتا ہی رہتا تو یہ چیزیں کیسے حاصل ہوتیں، ان کے لئے جدوجہد اور محنت اور دوڑ دُھوپ کی ضرورت ہے، جو روشنی میں ہوسکتی ہیں، اس لئے فرمایا کہ تمہاری راحت کو مکمل کرنے کے لئے ہم نے صرف رات اور اس کی تاریکی ہی نہیں بنائی، بلکہ ایک روشن دن بھی دیا جس میں تم کاروبار کر کے اپنی معاشی ضروریات حاصل کرسکو، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ اس کے بعد اِنسان کی راحت کے اس سامان کا ذِکر ہے جو آسمان سے متعلق ہیں، اُن میں سب سے بڑی نفع بخش چیز آفتاب کی روشنی ہے، اس کا ذِکر فرمایا: وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ یعنی ہم نے آفتاب کو ایک روشن بھڑکنے والا چراغ بنادیا۔ پھر آسمان کے نیچے جو چیزیں انسان کی راحت کے لئے پیدا فرمائیں اُن میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز پانی برسانے والے بادل ہیں، ان کا ذِکر فرمایا۔

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ مُعْصِرات، مُعْصِرَہ کی جمع ہے، جو پانی سے بھرے ہوئے ایسے بادل کو کہا جاتا ہے جو برسنے ہی والا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے نازل ہوتی ہے، اور جن آیات میں آسمان سے نازل ہونے کا ذِکر ہے یا تو اُن میں بھی آسمان سے مراد فضائے آسمانی ہو جیسے کہ قرآن میں بکثرت لفظ ''سماء'' اس معنی کے لئے آیا ہے اور یا یہ کہا جائے کہ کسی وقت براہِ راست آسمان سے بھی بارش آسکتی ہے، اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، ان تمام صنائع قدرت اور اِنعاماتِ

ربانی کا ذکر فرمانے کے بعد پھر اصل مضمون قیامت کی طرف رُجوع ہے۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا ﴿۱۷﴾ یعنی فیصلے کا دن جس سے مراد قیامت ہے، وہ ایک موقت اور متعین حد ہے، جس پر یہ دُنیا ختم ہو جائے گی، جب کہ صور پھونکا جائے گا۔ اور دُوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخِ صور دو مرتبہ ہوگا، پہلے نفخے سے سارا عالم فنا ہو جائے گا، دُوسرے نفخے سے پھر زِندہ و قائم ہو جائے گا، اس دُوسرے نفخے کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے ربّ کے سامنے فوج در فوج ہو کر حاضر ہوں گے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے، ایک فوج اُن لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے، لباس پہنے ہوئے، سواریوں پر سوار میدانِ حشر میں آئیں گے، دُوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے، تیسری فوج اُن لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدانِ حشر میں لایا جائے گا۔ (مظہری بروایت نسائی وحاکم وبیہقی) [۱] بعض روایات میں ''افواج'' کی تشریح دس قسم کی ''افواج'' سے کی گئی ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرینِ محشر کی بے شمار جماعتیں اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے ہوں گی، ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں۔

وَّسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ سُیِّرَتْ سے مراد یہ ہے کہ پہاڑ جو آج ثبات و قرار میں بطور مثال کے پیش کئے جاتے ہیں، یہ سب اپنی اپنی جگہوں کو چھوڑ کر ریزہ ریزہ ہو کر اُڑتے پھرنے لگیں گے۔ سَرَابٌ کے لفظی معنی ذہاب یعنی چلے جانے کے ہیں، جنگل کا وہ ریت جو دُور سے چمکتا ہوا یا پانی کی صورت میں نظر آتا ہے اس کو بھی سراب اسی بنا پر کہتے ہیں کہ وہ قریب پہنچتے ہی نظر سے جاتا رہتا ہے۔ (کذا فی الصحاح والراغب) [۲]

اِنَّ جَهَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ مِرْصَاد، وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کی نگرانی یا انتظار کیا جائے۔ جهنم سے مراد اس جگہ جَسْرِ جهنم یعنی پل صراط ہے، یہاں ثواب دینے والے اور عذاب دینے والے دونوں فرشتے انتظار کرتے ہوں گے، اہلِ جہنم کو عذاب کے فرشتے پکڑیں گے، اور اہلِ جنت کے ساتھ ثواب کے فرشتے اُن کو اُن کے مقام پر پہنچا دیں گے۔ (مظہری) [۳]

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جہنم کے پل پر نگران فرشتوں کی چوکی ہوگی، جس کے پاس جنت میں جانے کا پروانہ ہوگا، اس کو گزرنے دِیا جائے گا، جس کے پاس نہ ہوگا اس کو روک لیا جائے گا۔ (قرطبی) [۴]

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۷۳، والمستدرك للحاكم، كتاب التفسير، تفسير سورة بنی إسرائیل، رقم الحدیث: ۳۳۸۹، ومصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث:۳۵۵۳۷

[۲] الصحاح فی اللغة، مادة: سرب، ج:۱ ص:۳۱۱، ومفردات القرآن للراغب، كتاب السين، ج:۱ ص:۴۰۶

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۷۴

[۴] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۹ ص:۱۷۷

لِلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا (۲۲) ظاہر یہ ہے کہ لِلطَّاغِيْنَ، مَاٰبًا کے متعلق ہے، اور یہ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ کی دُوسری خبر ہے۔ اس طرح معنی دونوں جملوں کے یہ ہوئے کہ جسرِ جہنم تو ہر نیک و بد کے لئے انتظار گاہ ہے، سب ہی کو اس کے اُوپر سے گزرنا ہے، اور جہنم طاغین کے لئے مستقر اور ٹھکانا ہے۔ طاغین، طاغی کی جمع ہے، طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں سرکشی، اور ''طاغی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سرکشی اور نافرمانی میں حد سے گزر جائے، اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ وہ ایمان ہی سے نکل جائے، اس لئے طاغین سے مراد اس جگہ کفار ہوں گے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ بدعقیدہ گمراہ مسلمانوں کے فرقے ہوں جو قرآن وسنت کی حدود سے نکلے ہوئے ہیں، اگرچہ صراحۃً کفر اختیار نہیں کیا جیسے روافض، خوارج، معتزلہ وغیرہ۔ (کما فی المظہری) [۱]

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (۲۳) لّٰبِثِيْنَ، لَابِثٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ٹھہرنے والے اور قیام کرنے والے کے ہیں۔ اَحْقَاب، حِقْبہ کی جمع ہے، زمانہ دراز کو حقبہ کہا جاتا ہے، اس کی مقدار میں اقوال مختلف ہیں۔ ابنِ جریر رحمہ اللہ نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے اس کی مقدار اَسّی سال نقل کی، اور ہر سال بارہ مہینے کا، اور ہر مہینہ تیس دن کا، اور ہر دِن ایک ہزار سال کا، اس طرح تقریباً دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا ایک حِقْبہ۔ اور حضرت ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، ابنِ عباس رضی اللہ عنہم، وغیرہ نے مقدار حِقْبہ اَسّی کے بجائے ستر قرار دِی، باقی حساب وہی ہے۔ (ابن کثیر) [۲] مگر مسند بزار میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لَا يَخْرُجُ اَحَدُكُمْ مِنَ النَّارِ حَتّٰى يَمْكُثَ فِيْهِ اَحْقَابًا وَالْحَقْبُ بِضْعٌ وَّثَمَانُوْنَ سَنَةً كُلُّ سَنَةٍ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَّسِتُّوْنَ يَوْمًا مِمَّا تَعُدُّوْنَ۔ (از مظہری) [۳]

تم میں سے جو لوگ گناہوں کی سزا میں جہنم میں ڈالے جائیں گے، کوئی اس وقت تک جہنم سے نہ نکلے گا جب تک اس میں چند اَحقاب نہ رہ لے، اور حقبہ کچھ اُوپر اَسّی سال کا، اور ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہے، تمہارے موجودہ دِنوں کے مطابق۔

اس حدیث میں اگرچہ اس آیتِ مذکورہ کی تفسیر مذکور نہیں ہے، مگر بہرحال لفظ ''احقاب'' کے معنی کا بیان ہے، چند صحابۂ کرام سے جو اس میں ہر دِن ایک ہزار سال کا منقول ہے، اگر وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا ہے تو روایاتِ حدیث میں تعارض ہوا، اس تعارض کے وقت کسی ایک پر جزم و یقین تو نہیں ہوسکتا، مگر اتنی بات دونوں ہی روایتوں

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۷۵

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۰۵

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۷۶، ومسند البزار، رقم الحدیث:۵۹۸۰

میں مشترک ہے کہ حقبہ یا حقب بہت ہی زیادہ طویل زمانے کا نام ہے، اسی لئے بیضاوی نے اَحْقَابًا کی تفسیر ''دُهُوْرٍ مُتَتَابِعَة'' سے کی ہے، یعنی پے در پے بہت سے زمانے۔

جہنم کے خلود اور دَوام پر اِشکال و جواب

حَقَبَہ کی مقدار کتنی بھی طویل سے طویل قرار دِی جائے، بہر حال وہ متناہی اور محدود ہے، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس مدّتِ طویلہ کے بعد کفار اہلِ جہنم بھی جہنم سے نکل جائیں گے، حالانکہ یہ قرآن مجید کی دُوسری واضح نصوص کے خلاف ہے جن میں '' خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا '' کے الفاظ آئے ہیں، اور اسی لئے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ نہ جہنم کبھی فنا ہوگی، نہ کفار کبھی اس سے نکالے جائیں گے۔

سدّی نے حضرت مُرہ بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ کفار اہلِ جہنم کو اگر یہ خبر دِی جائے کہ اُن کا قیام جہنم میں دُنیا بھر میں جتنی کنکریاں تھیں اُن کے برابر ہوگا، تو وہ اس پر بھی خوش ہوں گے کہ بالآخر یہ کنکریاں اربوں کھربوں کی تعداد میں سہی، پھر بھی محدود اور متناہی تو ہیں، بہر حال کبھی نہ کبھی اس عذاب سے چھٹکارا ہو جائے گا، اور اگر اہلِ جنت کو یہی خبر دِی جائے کہ اُن کا قیام جنت میں دُنیا بھر کی کنکریوں کے عدد کے مطابق سالوں رہے گا تو وہ غمگین ہوں گے کہ کتنی ہی مدّت دراز سہی، مگر بہر حال اس مدّت کے بعد جنت سے نکال دیئے جائیں گے۔ (مظہری) [1]

بہر حال اس آیت میں اَحْقَابًا کے لفظ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چند اَحْقَابْ کے بعد کفار اہلِ جہنم بھی جہنم سے نکال لئے جائیں گے، تمام نصوص اور اِجماعِ اُمت کے خلاف ہونے کی بنا پر یہ مفہوم معتبر نہیں ہوگا، کیونکہ اس آیت میں اس کی تصریح تو ہے نہیں کہ اَحْقَابًا کے بعد کیا ہوگا صرف اتنا ذِکر ہے کہ مدّتِ احقاب ان کو جہنم میں رہنا پڑے گا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احقاب کے بعد جہنم نہیں رہے گا، یا یہ لوگ اُس سے نکال لئے جائیں گے۔ اسی لئے حضرت حسن رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اہلِ جہنم کے لئے جہنم کی کوئی میعاد اور مدّت مقرّر نہیں فرمائی، جس کے بعد اُن کا اس سے نکل جانا سمجھا جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک حقبہ زمانے کا گزر جائے گا تو دُوسرا شروع ہو جائے گا، اسی طرح دُوسرے کے بعد تیسرا، چوتھا یہاں تک کہ ابدالآباد یہی سلسلہ رہے گا۔ اور سعید بن جبیر نے قتادہ سے بھی یہی تفسیر روایت کی ہے کہ احقاب سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا اِنقطاع اور اِنتہا نہیں، بلکہ ایک حقب ختم ہوگا تو دُوسرا حقب آجائے گا، اور یہی سلسلہ ابد تک رہے گا۔ (ابنِ کثیر و مظہری) [2] اور یہاں ایک دُوسرا اِحتمال اور بھی ہے، جس

---

[1] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۱۷۵و۱۷۶

[2] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۱۷۵ و۱۷۶، وتفسير ابن كثير ج:۸ ص:۳۰۶

کو ابنِ کثیر نے ''یَحْتَمِلُ'' کے لفظ سے بیان کیا ہے، اور قرطبی نے فرمایا کہ یہ بات بھی ممکن ہے، اور مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے، وہ اِحتمال یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ''طَاغِیْن'' سے مراد کفار نہ لئے جائیں بلکہ وہ اہلِ توحید جو عقائدِ باطلہ کے سبب اسلام کے گمراہ فرقوں میں شمار ہوتے ہیں، جن کو محدثین کی اِصطلاح میں ''اہلِ اہواء'' کہا جاتا ہے، وہ مراد ہوں تو آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ ایسے اہلِ توحید کلمہ گو جو عقائدِ باطلہ رکھنے کے سبب کفر کی حدود تک پہنچے ہوئے تھے، مگر صریح کافر نہ تھے، وہ مدّتِ اَحقاب جہنم میں رہنے کے بعد بالآخر کلمۂ توحید کی بدولت جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔

مظہری نے اس اِحتمال کی تائید میں وہ حدیثِ مرفوع بھی پیش کی جو اُوپر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بحوالہ مسند بزار نقل ہوچکی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بیان فرمایا ہے کہ مدّتِ اَحقاب گزرنے کے بعد یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ مگر ابوحیان نے فرمایا کہ بعد کی آیات: اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ اس اِحتمال کے منافی ہیں کہ طاغین سے مراد اس جگہ اہلِ توحید اور گمراہ فرقے ہوں، کیونکہ ان آخری آیات میں قیامت کے انکار اور تکذیبِ رُسل کی تصریح ہے۔ اسی طرح ابوحیان نے مقاتل کے اس قول کو بھی فاسد قرار دیا ہے کہ اس آیت کو منسوخ مانا جائے۔ [1]

اور ایک جماعتِ مفسرین نے ایک تیسرا احتمال اس آیت کی تفسیر میں یہ قرار دیا ہے کہ اس آیت کے بعد کا جملہ: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ یہ اَحْقَابًا سے جملہ حالیہ ہوا، اور معنی آیت کے یہ ہوں کہ اَحقاب کے زمانہ دراز تک یہ لوگ نہ ٹھنڈی لذیذ ہوا کا ذائقہ چکھیں گے، نہ کسی کھانے اور پینے کی چیز کا بجز حَمِیْم اور غَسَّاق، پھر اَحقاب گزرنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ یہ حال بدل جائے اور دُوسری اَقسام کے عذاب ہونے لگیں۔ حَمِیْم وہ کھولتا ہوا گرم پانی ہے کہ جب چہرے کے قریب آئے گا تو اس کا گوشت جل جائے گا، اور جب پیٹ میں ڈالا جائے گا تو اندرونی اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ اور غَسَّاق وہ خون اور پیپ وغیرہ جو اہلِ جہنم کے زخموں سے نکلے گی۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾ یعنی جو سزا ان کو جہنم میں دی جائے گی وہ اُن کے عقائدِ باطلہ اور اَعمالِ سیئہ کے مطابق ہوگی، اَز رُوئے عدل وانصاف اس میں کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ یعنی جس طرح تم دُنیا میں اپنے کفر وانکار میں زیادتی ہی کرتے چلے گئے اور اگر جبراً تمہیں موت نہ آجاتی تو اور بڑھتے ہی رہتے، اسی طرح آج اُس کی جزا یہ ہے کہ تمہارا عذاب بڑھتا ہی چلا جائے۔ یہاں تک کفار وفجار کی سزا کا بیان تھا، آگے اس کے بالمقابل مؤمنینِ متقین کے ثواب اور نعمائے جنت کا تذکرہ ہے۔ ان نعمتوں کا ذِکر فرمانے کے بعد اِرشاد فرمایا:-

---

[1] تفسير البحر المحيط تحت هٰذه الآية ج:١٠ ص:٣٨٧

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ یعنی اُوپر جنت کی جن نعمتوں کا ذِکر آیا ہے، یہ جزا ہے مؤمنین کے لئے اور عطا ہے اُن کے ربّ کی طرف سے عطائے کثیر۔ یہاں ان نعمتوں کو اوّل جزائے اعمال بتلایا، پھر عطائے ربانی۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے، کیونکہ جزا اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے بدلے میں ہو، اور عطا وہ ہے جو بلا کسی بدلے کے بطور اِنعام واِحسان ہو۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں لفظوں کو یکجا جمع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت میں داخل ہونا اور اس کی نعمتیں صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے تو اہلِ جنت کے اعمال کی جزا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربانی ہے، کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے جو اُن کو دُنیا میں دے دی گئی ہیں، آخرت کی نعمتوں کا حصول تو صرف حق تعالیٰ کا فضل و اِنعام اور عطائے محض ہے، جیسا کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جاسکتا، جب تک حق تعالیٰ کا فضل نہ ہو، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی، آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جاسکتا۔[1] اور لفظ ''حِسَابًا ﴿۳۶﴾'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ائمۂ تفسیر میں بعض نے پہلے، بعض نے دُوسرے معنی لئے ہیں، پہلے معنی: ''حسابًا عطاءً کافیًا کثیرًا'' کے ہیں، یعنی ایسی عطا جو اس کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی وافی اور کثیر ہو، یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں: ''اَحْسَبْتُ فُلَانًا اَیْ اَعْطَیْتُہٗ مَا یَکْفِیْهِ حَتّٰی قَالَ حَسْبِیْ'' یعنی اَحْسَبْتُ کا لفظ اس معنی کے لئے آتا ہے کہ میں نے اس کو اتنا دِیا کہ اُس کے لئے بالکل کافی ہوگیا، یہاں تک کہ بول اُٹھا: ''حَسْبِیْ'' یعنی بس میرے لئے بہت ہے۔ اور دُوسرے معنی حساب کے موازنے اور مقابلے کے بھی آتے ہیں، حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اس جگہ یہی معنی لے کر مطلب آیت کا یہ قرار دِیا کہ یہ عطائے ربانی اہلِ جنت پر اُن کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی، اس عطا میں درجات بحسابِ اِخلاص اور احسانِ عمل کے ہوں گے، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں صحابۂ کرام کے اعمال کا درجہ باقی اُمت کے اعمال کے مقابلے میں یہ قرار دِیا ہے کہ صحابی اگر اللہ کی راہ میں ایک مُد خرچ کرے، جو تقریباً ایک سیر ہوتا ہے، اور غیر صحابی اُحد پہاڑ کے برابر خرچ کرے تو صحابی کا ایک مُد اس پہاڑ سے بڑھا ہوا رہے گا۔[2] واللہ اعلم۔

لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ اس جملے کا تعلق پہلے جملے جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ سے بھی ہوسکتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ حق تعالیٰ جس کو جو درجہ ثواب کا عطا فرمائیں گے، اُس میں کسی کو گفتگو کرنے کی مجال نہ ہوگی کہ فلاں کو زیادہ، فلاں کو کم کیوں دیا گیا، اور اگر اس کو علیحدہ جملہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ محشر میں کسی کو بغیر اِجازتِ حق تعالیٰ خطاب

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المرضیٰ، باب نهی تمنی المریض الموت، ج:۲ ص:۸۴۷

[2] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو کنت متخذًا خلیلًا ...إلخ، ج:۱ ص:۵۱۶، وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب تحریم سبّ الصحابة، ج:۲ ص:۳۱۰

کرنے کا اختیار نہ ہوگا، اور یہ اجازت بعض مواقفِ محشر میں ہوگی، بعض میں نہ ہوگی۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ رُوح سے مراد بعض ائمۂ تفسیر کے نزدیک جبریلِ امین علیہ السلام ہیں، ان کا ذکر عام ملائکہ سے پہلے ان کی عظمتِ شان کے اظہار کے لئے ہے۔ اور بعض روایاتِ مرفوعہ میں ہے کہ رُوح، اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان لشکر ہے جو فرشتے نہیں، اُن کے سر اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ [١] اس تفسیر پر گویا دو صفیں ہوں گی، ایک صف رُوح کی، دُوسری فرشتوں کی۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ، ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد روزِ قیامت ہے، اور محشر میں ہر شخص اپنے اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، خواہ اس طرح کہ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں آجائے گا، اس کو دیکھے گا، یا اس طرح کہ اعمال محشر میں مجسم اور متشکل ہوکر سامنے آجائیں گے، جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث سے ثابت ہے۔ اور احتمال یہ بھی ہے کہ اس روز سے مراد موت کا دن ہو، اور اپنے اعمال کا دیکھنا قبر و برزخ میں مراد ہو، کما فی المظهری۔ [٢]

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿٤٠﴾ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ساری زمین ایک سطحِ مستوی ہوجائے گی، جس میں انسان، جنات، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کردیئے جائیں گے، اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دُوسرے پر ظلم دُنیا میں کیا تھا تو اس سے اس کا انتقام دِلوادیا جائے گا، یہاں تک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا تھا، تو آج اُس کا بھی بدلہ دِلوایا جائے گا۔ جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہوجاؤ! وہ سب مٹی ہوجائیں گے۔ اس وقت کافر لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی جانور ہوتے اور اس وقت مٹی ہوجاتے، حساب کتاب اور جہنم کی سزا سے بچ جاتے۔ [٣] نعوذ باللہ منه، واللہ سبحانه وتعالیٰ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ النَّبَا بِحَمْدِ اللهِ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ ٢ شعبان ١٣٩١ھ

---

[١] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج:١٠ ص:١٨٢، وتفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:١٩ ص:١٨٧

[٢] تفسير المظهری ج:١٠ ص:١٨٤، ومسند احمد، حديث البراء بن عازب رضی الله عنه، رقم الحديث:١٨٥٥٧، والمستدرك للحاكم، كتاب الإيمان، رقم الحديث:١٠٧

[٣] تفسير القرطبی ج:١٩ ص:١٨٩، ومسند احمد، مسند ابی هريرة رضی الله عنه، رقم الحديث:٧٢٠٣، وصحيح ابن حبان، كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم من مناقب الصحابة، باب إخباره صلى الله عليه وسلم عن البعث واحوال الناس فی ذالك اليوم، رقم الحديث:٧٣٦٣

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

آیاتها ۴۶ | ۷۹ سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ ۸۱ | رکوعاتها ۲

سورۂ نازعات مکہ میں نازل ہوئی، اس کی چھیالیس آیتیں ہیں اور دو رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی غوطہ لگا کر، اور بند چھڑا دینے والوں کی کھول کر، اور پیرنے والوں کی تیزی سے،

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶ وقف لازم

پھر آگے بڑھنے والوں کی دوڑ کر، پھر کام بنانے والوں کی حکم سے، جس دن کانپے کانپنے والی،

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝۸ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹ وقف لازم

اُس کے پیچھے آئے دُوسری، کتنے دِل اُس دن دھڑکتے ہیں، اُن کی آنکھیں جھک رہی ہیں،

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾

لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئیں گے اُلٹے پاؤں کیا جب ہم ہوچکیں ہڈیاں کھوکھری

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ

بولے تو تو یہ پھر آنا ہے ٹوٹے کا سو وہ تو صرف ایک جھڑکی ہے، پھر تبھی وہ آرہیں

بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ

میدان میں، کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی جب پکارا اُس کو اُس کے رَبّ نے

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ

پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے جا فرعون کے پاس اس نے سر اُٹھایا، پھر کہہ

هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ

تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتلاؤں تجھ کو تیرے رَبّ کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو، پھر دِکھلادی اُس کو

الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾

وہ بڑی نشانی، پھر جھٹلایا اُس نے اور نہ مانا، پھر چلا پیٹھ پھیر کر تلاش کرتا ہوا،

فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ

پھر سب کو جمع کیا، پھر پکارا، تو کہا میں ہوں رَبّ تمہارا سب سے اُوپر پھر پکڑا اُس کو اللہ نے سزا میں آخرت کی

وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا

اور دُنیا کی، بے شک اس میں سوچنے کی جگہ ہے جس کے دِل میں ڈر ہے۔ کیا تمہارا بنانا مشکل ہے

أَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ

یا آسمان کا اُس نے اس کو بنالیا، اُونچا کیا اس کا اُبھار، پھر اُس کو برابر کیا، اور اندھیری کی رات اُس کی اور کھول نکالی

ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ أَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا

اس کی دُھوپ، اور زمین کو اس کے پیچھے صاف بچھادیا، باہر نکالا زمین سے اس کا پانی

وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ أَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

اور چارا، اور پہاڑوں کو قائم کردیا، کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے،

فَإِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾

پھر جب آئے وہ بڑا ہنگامہ جس دن کہ یاد کرے گا آدمی جو اُس نے کمایا،

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾

اور نکال ظاہر کردیں دوزخ کو جو چاہے دیکھے، سو جس نے کی ہو شرارت اور بہتر سمجھا ہو دُنیا کا جینا،

فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿٣٩﴾ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ

سو دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا، اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رَبّ کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اُس نے جی کو

عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿٤١﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ

خواہش سے، سو بہشت ہی ہے اُس کا ٹھکانا، تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی

أَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيمَ أَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ إِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾

کب ہوگا قیام اس کا تجھ کو کیا کام اُس کے ذِکر سے، تیرے رَبّ کی طرف ہے پہنچ اُس کی،

إِنَّمَآ أَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ﴿٤٥﴾ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا

تُو تو ڈرسنانے کے واسطے ہے اس کو جو اس سے ڈرتا ہے، ایسا لگے گا جس دن دیکھیں گے اس کو کہ نہیں ٹھہرے تھے دُنیا میں

إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا ﴿٤٦﴾

مگر ایک شام یا صبح اُس کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو (کافروں کی رُوح) سختی سے کھینچتے ہیں، ① اور جو (مؤمنوں کی رُوح کی) گرہ نرمی سے کھول دیتے ہیں، ② پھر (فضا میں) تیرتے ہوئے جاتے ہیں، ③ پھر تیزی سے لپکتے ہیں، ④ پھر جو حکم ملتا ہے، اُس (کو پورا کرنے) کا انتظام کرتے ہیں، ⑤ کہ جس دن بھونچال (ہر چیز کو) ہلا ڈالے گا، ⑥ پھر اُس کے بعد ایک اور جھٹکا آئے گا، ⑦ اُس دن بہت سے دِل لرز رہے ہوں گے، ⑧ اُن کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ ⑨ یہ (کافر لوگ) کہتے ہیں کہ: ''کیا ہم پہلی والی حالت پر لوٹا دیئے جائیں گے؟ ⑩ کیا اُس وقت جب ہم بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو چکے ہوں گے؟'' ⑪ کہتے ہیں کہ: ''اگر ایسا ہوا تو یہ بڑے گھاٹے کی واپسی ہوگی۔'' ⑫ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بس ایک زور کی آواز ہوگی، ⑬ جس کے بعد وہ اچانک ایک کھلے میدان میں ہوں گے۔ ⑭ (اے پیغمبر!) کیا تمہیں موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے؟ ⑮ جب اُن کے پروردگار نے اُنہیں طویٰ کی مقدس وادی میں آواز دی تھی ⑯ کہ: ''فرعون کے پاس چلے جاؤ، اُس نے بہت سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ ⑰ اور اُس سے کہو کہ کیا تمہیں یہ خواہش ہے کہ تم سنور جاؤ؟ ⑱ اور یہ کہ میں تمہیں تمہارے پروردگار کا راستہ دِکھاؤں تو تمہارے دِل میں خوف پیدا ہو جائے؟'' ⑲ چنانچہ موسیٰ نے اُس کو بڑی زبردست نشانی دِکھائی، ⑳ پھر بھی اُس نے (اُنہیں) جھٹلایا، اور کہنا نہیں مانا، ㉑ پھر دوڑ دُھوپ کرنے کے لئے پلٹا، ㉒ پھر سب کو اِکٹھا کیا، اور آواز لگائی ㉓ اور کہا کہ: ''میں تمہارا اعلیٰ درجے کا پروردگار ہوں۔'' ㉔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُسے آخرت اور دُنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ ㉕ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے میں اُس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو اللہ کا خوف دِل میں رکھتا ہو۔ ㉖ (انسانو!) کیا تمہیں پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے، یا آسمان کو؟ اُس کو اللہ نے بنایا ہے، ㉗ اُس کی بلندی اُٹھائی ہے، پھر اُسے ٹھیک کیا ہے، ㉘ اور اُس کی رات کو اندھیری بنایا ہے، اور اُس کے دن کی دُھوپ باہر نکال دی ہے، ㉙ اور

زمین کو اُس کے بعد بچھا دیا ہے، (۳۰) اُس میں سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا ہے، (۳۱) اور پہاڑوں کو گاڑ دیا ہے، (۳۲)
تا کہ تمہیں اور تمہارے مویشیوں کو فائدہ پہنچائے۔ (۳۳) پھر جب وہ سب سے بڑا ہنگامہ برپا ہوگا، (۳۴) جس دن انسان اپنا
سارا کیا دَھرا یاد کرے گا، (۳۵) اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے ظاہر کر دی جائے گی، (۳۶) تو وہ جس نے سرکشی کی تھی، (۳۷)
اور دُنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، (۳۸) تو دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔ (۳۹) لیکن وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا
خوف رکھتا تھا، اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکتا تھا، (۴۰) تو جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔ (۴۱) یہ لوگ تم سے قیامت کی
گھڑی کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی؟ (۴۲) تمہارا یہ بات بیان کرنے سے کیا کام؟ (۴۳) اس کا علم تو
تمہارے پروردگار پر ختم ہے۔ (۴۴) جو شخص اُس سے ڈرتا ہو، تم تو صرف اُس کو خبردار کرنے والے ہو۔ (۴۵) جس دن یہ اُس کو
دیکھ لیں گے، اُس دن انہیں ایسا معلوم ہوگا جیسے وہ (دُنیا میں یا قبر میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔ (۴۶)

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں اور جو (مسلمانوں کی رُوح آسانی سے نکالتے ہیں گویا اُن کا) بند کھول دیتے ہیں اور جو (رُوحوں کو لے کر زمین سے آسمان کی طرف اس طرح سرعت و سہولت سے چلتے ہیں، جیسے گویا) تیرتے ہوئے چلتے ہیں پھر (جب رُوحوں کو لے کر پہنچتے ہیں تو ان اَرواح کے باب میں جو خدا کا حکم ہوتا ہے اس کے اِمتثال کے لئے) تیزی کے ساتھ دَوڑتے ہیں پھر (ان ارواح کے متعلق ثواب کا حکم ہو یا عقاب کا دونوں امروں میں سے) ہر اَمر کی تدبیر کرتے ہیں (ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ) قیامت ضرور آئے گی جس روز ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی (مراد نفخۂ اُولیٰ ہے) جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی چیز آ جائے گی (مراد نفخۂ ثانیہ ہے)، بہت سے دِل اُس روز دھڑک رہے ہوں گے اُن کی آنکھیں (مارے ندامت کے) جھک رہی ہوں گی (مگر یہ لوگ قیامت کا اِنکار کر رہے ہیں اور) کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہوں گے (پہلی حالت سے مراد حیات قبل الممات، یعنی کیا بعد الموت پھر حیاتِ ثانیہ ہوگی؟ مقصود اِستبعاد ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے پھر (حیات کی طرف) واپس ہوں گے (مقصود استصعاب ہے کہ یہ سخت دُشوار ہے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو) اس صورت میں یہ واپسی (ہمارے لئے) بڑے خسارے کی ہوگی (کیونکہ ہم نے تو اس کے لئے کچھ سامان نہیں کیا، مقصود اس سے تمسخر تھا اہلِ حق کے اس عقیدے کے ساتھ، یعنی ان کے عقیدے پر ہم بڑے خسارے میں ہوں گے، جیسے کوئی شخص کسی کو خیرخواہی سے ڈرائے کہ ''اس راہ مت جانا، شیر ملے گا!'' اور مخاطب تکذیب کے طور پر کسی سے کہے کہ ''بھائی! اُدھر مت جانا شیر کھا جائے گا'' مطلب یہ کہ وہاں شیر ویر کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے اِستبعاد و اِستصعابِ مذکور کا رَدّ ہے کہ یہ لوگ جو قیامت کو بعید اور مشکل

کہتے ہیں) تو (یہ سمجھ رکھیں کہ ہم کو کچھ مشکل نہیں، بلکہ) وہ بس ایک ہی سخت آواز ہوگی جس سے سب لوگ فوراً ہی میدان میں آموجود ہوں گے (آگے مکذبین کی تخویف اور تکذیب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، پس فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ پہنچا ہے؟ جب کہ اُن کو اُن کے پروردگار نے ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں (یہ اس کا نام ہے) پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے، سو اُس سے (جاکر) کہو کہ کیا تجھ کو اس بات کی خواہش ہے کہ تو دُرست ہو جائے؟ اور (تیری دُرستی کی غرض سے) میں تجھ کو تیرے رَبّ کی طرف (ذات وصفات کی) رہنمائی کروں تو تو (ذات وصفات کو سن کر اس سے) ڈرنے لگے (اور اس ڈر سے دُرستی ہو جائے، غرض یہ حکم سن کر موسیٰ علیہ السلام اُن کے پاس گئے اور جاکر پیغام اَدا کیا) پھر (جب اُس نے دلیلِ نبوّت طلب کی تو) اُس کو بڑی نشانی (نبوّت کی) دِکھلائی (مراد معجزۂ عصا ہے یا بارادۂ جنس مجموعۂ عصا وید بیضا ہے) تو اُس (فرعون) نے (اُن کو) جھٹلایا اور (اُن کا) کہنا نہ مانا، پھر (موسیٰ علیہ السلام سے) جدا ہو کر (ان کے خلاف) کوشش کرنے لگا اور (لوگوں کو) جمع کیا، پھر (اُن کے سامنے) بآوازِ بلند تقریر کی اور کہا کہ ''میں تمہارا رَبِّ اعلیٰ ہوں'' (''اعلیٰ'' کی قیدِ واقعی کے طور پر کہا، پس اصل مقصود اَنَا رَبُّكُمْ ہے، اور ''اعلیٰ'' صفتِ مادحہ بڑھادی اور اِحترازی نہیں جس سے غیر اعلیٰ دُوسرے رَبّ کا ثبوت ہو) سو اللہ تعالیٰ نے اُس کو آخرت کے اور دُنیا کے عذاب میں پکڑا۔ (دُنیوی عذاب تو غرق ہے، اور اُخروی عذاب حرق یعنی جلنا ہے) بے شک اِس (واقعے) میں ایسے شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے (آگے قیامت کو بعید یا مشکل سمجھنے کا عقلی جواب ہے یعنی) بھلا تمہارا (دُوسری بار) پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا (اور فی نفسہ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نسبت سے تو سب مساوی ہیں، اور ظاہر ہے کہ آسمان ہی کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے، پھر جب اس کو پیدا کر دیا تو تمہارا پیدا کرنا کیا مشکل ہے آگے آسمان کے پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ) اللہ نے اس کو بنایا (اس طرح سے کہ) اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو دُرست بنایا (کہ کہیں اس میں شقوق وفطور، پھٹا ہوا یا جوڑ پیوند تو نہیں) اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دِن کو ظاہر کیا (رات اور دِن کو آسمان کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ رات اور دِن آفتاب کے طلوع اور غروب سے ہوتے ہیں، اور آفتاب آسمان سے متعلق ہے) اور اُس کے بعد زمین کو بچھایا (اور بچھا کر) اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو (اُس پر) قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے مواشی کے فوائد پہنچانے کے لئے (اصل اِستدلال خلقِ سماء سے تھا، مگر زمین کا ذِکر شاید اس لئے کر دیا کہ اس کے اَحوال ہر وقت پیشِ نظر ہیں، اور گو سماء کے برابر نہ سہی لیکن فی نفسہٖ انسان کی تخلیق سے زمین کی تخلیق بھی اشد ہے، پس حاصل اِستدلال کا یہ ہوا کہ جب ایسی ایسی چیزیں ہم نے بنادیں تو تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے، آگے بعث کے بعد جو واقعات مجازاۃ کے متعلق ہوں گے اُن کی تفصیل ہے، یعنی قیامت کا اِمکان اور صحتِ وقوع تو ثابت ہوگیا)

سو جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا یعنی جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کی جائے گی تو (اُس روز یہ حالت ہوگی کہ) جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہو کر اُس پر) دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ اُس کا ٹھکانا ہوگا، اور جو شخص (دُنیا میں) اپنے رَبّ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا (کہ قیامت اور آخرت اور حساب کتاب پر اس کا ایمان مکمل ہو) اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا (یعنی اِعتقادِ صحیح کے ساتھ عملِ صالح بھی کیا) ہوگا، سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا (اور عملِ صالح طریقِ جنت ہے، موقوف علیہ نہیں، چونکہ کفار بقصد اِنکارِ قیامت کے اس کا وقت پوچھا کرتے تھے، آگے اس کا جواب ہے یعنی) یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا (سو) اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق (کیونکہ بیان کا موقوف علیہ علم ہے اور قیامت کا معین وقت ہم نے کسی کو بتلایا نہیں، بلکہ) اُس (کے علم کی تعیین) کا مدار صرف آپ کے رَبّ کی طرف ہے (اور) آپ تو صرف (اخبار اِجمالی سے) ایسے شخص کے ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہو (اور ڈر کر اِیمان لانے والا ہو، اور یہ لوگ جو جلدی مچا رہے ہیں تو سمجھ لیں کہ) جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو (اُن کو) ایسا معلوم ہوگا گویا (دُنیا میں) صرف ایک دن کے آخری حصے میں یا اس کے اوّل حصے میں رہے ہیں (وبس یعنی دُنیا کی مدّتِ طویلہ قصیر معلوم ہوگی اور سمجھیں گے کہ عذاب بڑی جلدی آ گیا جس کی یہ اِستدعا کرتے ہیں، حاصل یہ کہ جلد بازی کیوں کرتے ہو وقوع کے وقت اس کو یہی سمجھو گے کہ بڑی جلد ہوگیا، جس دیر کو اَب دیر سمجھ رہے ہو یہ دیر معلوم نہ ہوگی)۔

معارف و مسائل

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ① نَزَعٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر نکالنے کے آتے ہیں، اور غَرْقًا اُس کی تاکید ہے کیونکہ غرق اور اِغراق کے معنی کسی کام میں پوری شدّت خرچ کرنے کے ہیں، محاورہ میں کہا جاتا ہے ''اَغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقَوْسِ''، یعنی کمان کھینچنے والے نے اس کے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کر دی۔ اس سورۃ کے شروع میں ملائکہ کی چند صفات اور حالات بیان کر کے اُن کی قسم کھائی گئی ہے، اور جوابِ قسم بدلالتِ حال حذف کر دیا گیا، مراد اس سے قیامت اور حشر و نشر کا یقیناً واقع ہونا ہے، فرشتوں کی قسم شاید اس مناسب سے کھائی گئی ہے کہ اگرچہ فرشتے اس وقت بھی تمام عالم کے نظم و نسق میں دخل رکھتے اور اپنی اپنی خدمت بجالاتے ہیں لیکن قیامت کے روز اسبابِ مادّیہ کے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے، غیر معمولی حالات و واقعات پیش آئیں گے، ان واقعات میں فرشتے ہی کام کریں گے۔

فرشتوں کی اس جگہ پانچ صفات وہ بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور نزعِ رُوح سے ہے، مقصد تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے، شروع اس کا انسان کی موت سے کیا گیا کہ ہر انسان کی موت خود اس کے لئے ایک جزوی

قیامت ہے، اور قیامت کے اعتقاد میں اس کا بڑا دخل ہے۔ ان پانچ صفات میں سے پہلی صفت "وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ①" یعنی سختی کے ساتھ کھینچ کر نکالنے والے، مراد اس سے وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی رُوح سختی کے ساتھ نکالتے ہیں، مراد اس سختی سے رُوحانی سختی اور تکلیف ہے، یہ ضروری نہیں کہ دیکھنے والوں کو بھی اس سختی کا احساس ہو، اسی لئے بسا اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کافر کی رُوح بظاہر آسانی سے نکلتی ہے، مگر یہ آسانی ہمارے دیکھنے میں ہے، جو سختی اُس کی رُوح پر ہو رہی ہے اس کو کون دیکھ سکتا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خبر دینے سے معلوم ہو سکتی ہے، اس لئے اس جملے میں یہ خبر دے دی گئی ہے کہ کفار کی رُوح کو کھینچ کر سختی سے نکالا جاتا ہے۔

دُوسری صفت وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ② نَاشِطَاتِ، نَشْطٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی بندھن کھول دینے کے ہیں۔ جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہوں اس کا بندھن کھول دینے سے وہ پانی وغیرہ آسانی کے ساتھ نکل جاتا ہے، اس میں مؤمن کی رُوح نکلنے کو اس سے تشبیہ دے کر بتلایا ہے کہ جو فرشتے مؤمن کی قبضِ رُوح پر مقرّر ہیں وہ آسانی سے اُس کو قبض کرتے ہیں، شدّت سے نہیں کرتے۔ یہاں بھی آسانیٔ رُوحانی مراد ہے جسمانی نہیں، اس لئے کسی مسلمان بلکہ مردِ صالح کو بوقتِ موت نزعِ رُوح میں دیر لگنے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس پر سختی ہو رہی ہے، اگرچہ جسمانی طور پر یہ سختی دیکھی جاتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو نزعِ رُوح کے وقت ہی سے برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے، اس کی رُوح اس سے گھبرا کر بدن میں چھپنا چاہتی ہے، فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں، اور مؤمن کی رُوح کے سامنے عالمِ برزخ کا ثواب، نعمتیں اور بشارتیں آتی ہیں، تو اُس کی رُوح تیزی سے ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔

تیسری صفت فرشتوں کی وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ③ ہے، سَبْحٌ کے لغوی معنی تیرنے کے آتے ہیں، مراد اس جگہ تیزی سے چلنا ہے، جیسے دریا میں کوئی آڑ پہاڑ نہیں ہوتا، تیرنے والا یا کشتی وغیرہ میں چلنے والا سیدھا اپنی منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے، فرشتوں کی یہ صفت کہ تیز جانے والے ہیں، یہ بھی ملائکۂ موت سے متعلق ہے کہ انسان کی رُوح قبض کرنے کے بعد اس کو تیزی سے آسمان کی طرف لے جاتے ہیں۔

چوتھی صفت فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ④ ہے، مراد یہ ہے کہ پھر یہ رُوح جو فرشتوں کے قبضے میں ہے، اس کو اس کے اچھے یا بُرے ٹھکانے پر پہنچانے میں سبقت اور عجلت سے کام لیتے ہیں، مؤمن کی رُوح کو جنت کی ہواؤں اور نعمتوں کی جگہ میں، کافر کی رُوح کو دوزخ کی ہواؤں اور عذابوں کی جگہ میں پہنچا دیتے ہیں۔

پانچویں صفت فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ⑤ ہے، اَمرِ الٰہی کی تدبیر و تنفیذ کرنے والے یعنی ان ملائکۂ موت کا آخری کام یہ ہوگا کہ جس رُوح کو ثواب اور راحت دینے کا حکم ہوگا اس کے لئے راحت کے سامان جمع کر دیں، اور جس کو عذاب اور تکلیف میں ڈالنے کا حکم ہوگا اس کے لئے اس کا انتظام کر دیں۔

قبر میں ثواب وعذاب

موت کے وقت فرشتوں کا آنا اور اِنسان کی رُوح قبض کر کے آسمان کی طرف لے جانا، پھر اس کے اچھے یا بُرے ٹھکانے پر جلدی سے پہنچا دینا، اور وہاں ثواب یا عذاب، تکلیف یا راحت کے اِنتظامات کر دینا، ان آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہو گیا۔ یہ عذاب وثواب قبر یعنی برزخ میں ہوگا، حشر کا عذاب وثواب اس کے بعد ہے، احادیثِ صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث مشکوٰۃ میں بحوالہ مسندِ احمد مذکور ہے۔ [۱]

''نفس'' اور ''رُوح'' کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ کی تحقیقِ مفید

تفسیرِ مظہری کے حوالے سے ''نفس'' و ''رُوح'' کی حقیقت پر کچھ کلام سورۂ حجر کی آیت نمبر ۲۹ کے تحت گزر چکا ہے۔ اسی سلسلے کی مزید تحقیق وتوضیح بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ نے اس جگہ تحریر فرمائی ہے، [۲] جس سے بہت سے اِشکالات حل ہو جاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ حدیثِ مذکورہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی ایک جسمِ لطیف ہے، جو اس کے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے، اور وہ ان ہی مادّی عناصرِ اَربعہ سے بنا ہے۔ فلاسفہ اور اطباء اسی کو ''رُوح'' کہتے ہیں، مگر درحقیقت رُوحِ انسانی ایک جوہرِ مجرّد اور لطیفۂ ربانی ہے، جو اس طبعی رُوح یعنی ''نفس'' کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے، اور طبعی رُوح یعنی ''نفس'' کی حیات خود اس لطیفۂ ربانی پر موقوف ہے، گویا اس کو ''رُوح الروح'' کہہ سکتے ہیں کہ جسم کی زندگی ''نفس'' سے ہے، اور ''نفس'' کی زندگی اس ''رُوح'' سے وابستہ ہے۔ اس رُوحِ مجرّد اور لطیفۂ ربانیہ کا تعلق اسی جسمِ لطیف یعنی ''نفس'' کے ساتھ کیا اور کس طرح کا ہے، اس کی حقیقت کا علم ان کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں۔ اور جسمِ لطیف جس کا نام ''نفس'' ہے اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آئینے کی مثال بنایا ہے، جو آفتاب کے بالمقابل رکھ دیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آجاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی طرح روشنی پھیلاتا ہے۔ نفسِ انسانی اگر تعلیمِ وحی کے مطابق ریاضت ومحنت کر لیتا ہے تو وہ بھی منوّر ہو جاتا ہے، ورنہ وہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوّث ہوتا ہے، یہی جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اُوپر لے جاتے ہیں اور پھر اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں، جب کہ وہ منوّر ہو چکا ہو، ورنہ آسمان کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے، اُوپر ہی سے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے۔ یہی جسمِ لطیف ہے جس کے بارے میں حدیثِ مذکور میں ہے کہ ہم نے اس کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں لوٹائیں گے، پھر اُسی سے دوبارہ پیدا کریں

---

[۱] مسند احمد، حديث البراء بن عازب رضى الله عنه، رقم الحديث:۱۸۵۵۷، ومشكوٰة المصابيح، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند من حضره الموت، الفصل الأوّل، رقم الحديث:۱۶۳۰

[۲] تفسير المظهری ج:۱۰ ص:۱۸۶

گے۔ یہی جسمِ لطیف اعمالِ صالحہ سے منوّر اور خوشبودار بن جاتا ہے اور کفر وشرک سے بدبودار ہوجاتا ہے۔ باقی رُوحِ مجرّد اس کا تعلق جسمِ کثیف کے ساتھ بواسطہ جسمِ لطیف یعنی ''نفس'' کے ہوتا ہے، اُس پر موت طاری نہیں ہوتی، قبر کا عذاب وثواب بھی اسی جسمِ لطیف یعنی ''نفس'' سے وابستہ ہے، اور اس ''نفس'' کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے، اور رُوحِ مجرّد علیّین میں ہوتی ہے، اور رُوحِ مجرّد اس کے ثواب وعذاب سے بالواسطہ متأثر ہوتی ہے، اس طرح رُوح کا قبر میں ہونا بمعنی ''نفس'' کے صحیح ہے، اور اس کا عالمِ ارواح یا علّیین میں رہنا بمعنی رُوحِ مجرّد صحیح ہے، اس سے ان روایاتِ مختلفہ کی تطبیق بھی ہوجاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے قیامت کے وقوع اور اس میں پہلے نفخِ صور سے سارے عالم کی فنا، پھر دُوسرے سے سارے عالم کی دوبارہ اِیجاد اور اس پر کفار کے شبۂ اِستبعاد کا جواب مذکور ہے۔ اس کے آخر میں فرمایا: فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ ساھرہ سطحِ زمین کو کہا جاتا ہے، قیامت میں جو زمین دوبارہ پیدا کی جائے گی وہ پوری ایک سطحِ مستوی ہوگی، اس میں آڑ پہاڑ، عمارت یا غار نہیں ہوگا، اسی کو ساھرہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد کفار منکرینِ قیامت کی ضد اور عناد سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِیذا پہنچتی تھی اس کا اِزالہ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے کیا گیا ہے کہ مخالفین سے ایسی ایذائیں کچھ آپ کے لئے مخصوص نہیں، انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی بڑی بڑی ایذائیں ان سے پہنچی ہیں، اُنہوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر سے کام لیں۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ نکال ایسے عذاب کو کہا جاتا ہے جس کو دیکھ کر دُوسروں کو عبرت ہو اور سب سہم جائیں، نکالِ آخرت فرعون کے لئے آخرت کا عذاب ہے، اور نکالِ اُولیٰ سے مراد وہ عذاب ہے جو دُنیا میں اس کی پوری قوم کے غرقِ دریا ہوجانے سے ان کو پہنچا۔ آگے پھر منکرینِ حشر ونشر کے اس اِستبعاد اور شبہ کا اِزالہ ہے کہ مرنے اور مٹی ہوجانے کے بعد کیسے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اس میں حق تعالیٰ نے آسمان وزمین اور ان کے اندر پیدا کی ہوئی عظیم مخلوقات کا ذِکر کر کے انسانِ غافل کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ جس ذات نے ایسی عظیم الشان مخلوقات کو اِبتدائی وجود بغیر کسی مادّے وآلے کے عطا فرمایا، وہ اگر ان کو نیست ونابود کرنے کے بعد دوبارہ وجود عطا فرمادے تو تمہارے تعجب کا کیا مقام ہے، آگے پھر روزِ قیامت کی شدّت اور اُس روز ہر شخص کے اعمال کا سامنے آجانا اور اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے دونوں ٹھکانوں کا بیان اور آخر میں اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی خاص خاص علامات کا بیان ہے جس سے ایک انسان دُنیا ہی میں فیصلہ کرسکتا ہے کہ ضابطے سے میرا ٹھکانا جنت میں ہے یا دوزخ میں، ضابطہ اس لئے کہا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت یا بلاواسطہ حق تعالیٰ کی رحمت سے کسی جہنمی کو اُس سے آزاد کر کے جنت میں پہنچا دینا جیسا کہ بہت سی آیات وروایاتِ حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں، وہ ایک اِستثنائی حکم ہے، اور اصل ضابطہ جنت یا دوزخ میں ٹھکانے کا وہی ہے جو ان

آیات میں بیان فرمایا ہے۔

پہلے اہلِ جہنم کی خاص علامات بیان کی گئیں، وہ دو ہیں: فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ اوّل طغیان یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے اَحکام کی پابندی کے بجائے سرکشی کرنا، دُوسرے دُنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا۔ یعنی جب ایسا کوئی کام سامنے آئے کہ اس کے اِختیار کرنے سے دُنیا میں تو آرام یا لذّت ملتی ہے، مگر آخرت میں اُس پر عذاب مقرّر ہے، اس وقت وہ دُنیا کی لذّت کو ترجیح دے کر آخرت کی فکر کو نظر انداز کر دے۔ جو شخص دُنیا میں ان دو بلاؤں میں مبتلا ہے، اس کے لئے فرمادیا: فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾ یعنی جہنم ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔ اس کے بعد اہلِ جنت کی اسی طرح دو علامتیں بتلائی ہیں: وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ اوّل یہ کہ جس شخص کو دُنیا میں اپنے ہر عمل، ہر کام کے وقت یہ خوف لگا رہا کہ مجھے ایک روز حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوکر ان اعمال کا حساب دینا ہوگا، دُوسرے جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا، ناجائز خواہشوں سے اس کو روک دیا، جس نے دُنیا میں یہ دو وصف حاصل کر لئے قرآنِ کریم نے اس کو یہ خوش خبری دے دی: فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾ یعنی جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔

مخالفتِ نفس کے تین درجے

آیتِ مذکورہ میں جنت کے ٹھکانے کی دو شرطیں بتلائی ہیں، اور غور کیا جائے تو وہ نتیجے کے اِعتبار سے ایک ہی ہے، کیونکہ پہلی شرط خدا تعالیٰ کے حضور جواب دہی کا خوف ہے۔ دُوسری شرط نفس کو ہویٰ سے روکنا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کا خوف ہی نفس کو اِتباعِ ہویٰ سے روکنے والی چیز ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ مخالفتِ ہویٰ کے تین درجے ہیں:-

اوّل درجہ:- تو یہ ہے کہ آدمی اُن عقائدِ باطلہ سے بچ جائے جو ظاہرِ نصوص اور اِجماعِ سلف کے خلاف ہوں، اس درجے میں پہنچ کر وہ سُنّی مسلمان کہلانے کا مستحق ہوجاتا ہے۔

متوسط درجہ:- یہ ہے کہ وہ کسی معصیت اور گناہ کا اِرادہ کرے، پھر اس کو یہ بات یاد آجائے کہ مجھے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے، اس خیال کی بنا پر گناہ کو ترک کر دے۔ اسی متوسط درجے کا تکملہ یہ ہے کہ آدمی شبہات سے بھی پرہیز کرے اور جس مباح و جائز کام میں مشغول ہونے سے کسی ناجائز کام میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہو، اُس جائز کام کو بھی ترک کر دے۔ جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مشتبہات سے پرہیز کرلیا اُس نے اپنی آبرو اور دِین کو بچالیا، اور جو شخص مشتبہات میں مبتلا ہوگیا، وہ بالآخر محرمات میں مبتلا ہوجائے گا۔ مراد مشتبہات سے وہ کام ہیں جن میں جائز و ناجائز ہونے کے دونوں اِحتمال ہوں، یعنی عمل کرنے والے کو یہ

شبہ ہو کہ میرے لئے یہ کام جائز ہے یا ناجائز، مثلاً ایک شخص بیمار ہے، وضو کرنے پر قادر تو ہے اور اس کا یقین پورا نہیں کہ میرے لئے وضو کرنا اس حالت میں مضر ہی ہے، تو تیمّم کا جواز اور عدمِ جواز مشتبہ ہو گیا۔ اسی طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھ تو سکتا ہے، مگر مشقت بہت زیادہ ہے، اس کی وجہ سے یہ اشتباہ ہو گیا کہ بیٹھ کر نماز میرے لئے دُرست ہے یا نہیں ایسے مواقع میں مشتبہ چیز کو چھوڑ کر یقینی جواز کو اختیار کرنا تقویٰ ہے، اور مخالفت کا متوسط درجہ یہی ہے۔

مکائدِ نفس

نفس کی مخالفت ان چیزوں میں جو صریح طور سے گناہ اور سیئات ہیں، یہ تو اگر کوئی کوشش کرے تو باختیارِ خود بھی اس میں کامیابی ہو جاتی ہے، لیکن ایک ہوائے نفس وہ ہے جو عبادات اور اعمالِ حسنہ میں شامل ہو جاتی ہے، ریا و نمود، خود پسندی، یہ ایسے دقیق گناہ اور شدید ہوائے نفس ہیں جس میں انسان اکثر خود بھی دھوکا کھاتا ہے، اپنے عمل کو دُرست و صحیح سمجھتا رہتا ہے، اور یہی وہ ہوائے نفس ہے جس کی مخالفت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضروری ہے، مگر اس سے بچنے کا صحیح علاج اور مجرّب نسخہ اس کے سوا نہیں کہ انسان کوئی ایسا شیخِ کامل تلاش کرے جو کسی ماہر شیخ کی خدمت میں رہ کر مجاہدات کر کے عیوبِ نفس اور ان کے معالجے سے واقف ہو، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے اور اس کے مشورے پر عمل کرے۔

شیخ امام حضرت یعقوب کرخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی ابتدائی عمر میں نجار تھا (لکڑی کا کام کرتا تھا)، میں نے اپنے نفس میں سستی اور باطن میں ایک قسم کی ظلمت محسوس کی تو ارادہ کیا کہ چند روز روزے رکھوں تاکہ یہ ظلمت اور سستی دُور ہو جائے، اتفاقاً اسی روزے کی حالت میں ایک روز شیخ اجل امام بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، شیخ نے مہمانوں کے لئے کھانا منگایا اور مجھے بھی کھانے کا حکم دیا، اور فرمایا: بہت بُرا بندہ ہے جو اپنی ہوائے نفسانی کا بندہ ہو، جو اس کو گمراہ کرے۔ اور فرمایا کہ کھانا کھا لینا اُس روزے سے بہتر ہے جو ہوائے نفسانی کے ساتھ ہو۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا نفس عُجب و خود پسندی کا شکار ہو رہا تھا، جس کو شیخ نے محسوس کیا اور مجھے ثابت ہو گیا کہ ذِکر و شغل اور نفلی عبادات میں کسی شیخِ کامل کی اجازت و ہدایت درکار ہے، کیونکہ وہ مکائدِ نفس سے واقف ہوتا ہے، جس نفلی عمل میں کوئی نفس کا کید ہو گا، اسی سے روک دے گا، اس وقت میں نے حضرت شیخ نقشبند قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت! اگر ایسا شخص جس کو اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے کسی کو میسر نہ ہو تو وہ کیا کرے، شیخ نے فرمایا کہ اس کو چاہئے کہ اِستغفار کی کثرت کرے اور ہر نماز کے بعد بیس مرتبہ اِستغفار کرنے کی پابندی کرے، تاکہ پانچ وقت سو مرتبہ اِستغفار ہو جائے،

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض اوقات میں اپنے قلب میں کدورت محسوس کرتا ہوں اور میں ہر روز اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ اِستغفار یعنی طلبِ مغفرت کرتا ہوں۔

تیسرا اعلیٰ درجہ:- مخالفتِ ہوائے نفسانی کا یہ ہے کہ کثرتِ ذِکر اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعے اپنے نفس کو ایسا مزکّیٰ بنالے کہ اس میں وہ ہوائے نفسانی باقی ہی نہ رہے جو اِنسان کو شر کی طرف کھینچتی ہے، یہ مقام ولایتِ خاصہ کا مقام ہے اور اُسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کو صوفیہ کی اِصطلاح میں ''فانی فی اللہ'' اور ''باقی باللہ'' کہا جاتا ہے، یہی لوگ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہیں جو شیطان کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے: اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ (الحجر:۴۲) یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہیں چل سکے گا، اور یہی مصداق ہیں اُس حدیث کے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یَکُوۡنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئۡتُ بِہٖ'' [1] یعنی تم میں کوئی شخص اس وقت تک مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفسانی میری تعلیمات کے تابع نہ ہو جائیں۔ [2] اَللّٰھُمَّ ارۡزُقۡنَاہُ بِفَضۡلِکَ وَکَرَمِکَ۔

آخرِ سورت میں کفار کے اس معاندانہ سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ اور وقت بتلانے پر اِصرار کرتے تھے، حاصلِ جواب یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے صرف اپنی ذات کے لئے مخصوص رکھا ہے، اس کی اطلاع کسی فرشتے یا رسول کو بھی نہیں دی گئی ہے، اس لئے یہ مطالبہ لغو ہے۔

تَمَّتۡ سُوۡرَۃُ النّٰزِعَاتِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ۶ شَعۡبَان ۱۳۹۱ھ دو شنبہ

---

[1] شرح السُّنَّة رقم الحديث:۱۰۴، ومشكوٰة المصابيح، كتاب الإيمان، باب الإعتصام بالكتاب والسُّنَّة، الفصل الثانی، رقم الحديث:۱۶۷

[2] تفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۱۰ ص:۱۹۳ تا ۱۹۵

سُورَةُ عَبَسَ

اٰیاتھا ۴۲ ۸۰ سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ ۲۴ رکوعھا ۱

سورۂ عبس مکہ میں نازل ہوئی اور اُس کی بیالیس آیتیں ہیں، اور ایک رُکوع اور اسی طرح آخر تک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ﴿۳﴾

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، اس بات سے کہ آیا اس کے پاس اندھا، اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا،

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾

یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا، وہ جو پروا نہیں کرتا، سو تو اس کی فکر میں ہے،

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾

اور تجھ پر کچھ اِلزام نہیں کہ وہ نہیں دُرست ہوتا، اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا، اور وہ ڈرتا ہے،

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾

سو تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے،

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾

لکھا ہے عزّت کے ورقوں میں، اُونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے، ہاتھوں میں لکھنے والوں کے،

كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾

جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں، مارا جائیو آدمی کیسا ناشکر ہے، کس چیز سے بنایا اس کو

مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ

ایک بوند سے، بنایا اس کو پھر اندازے پر رکھا اس کو، پھر راہ آسان کردی اس کو، پھر اس کو مُردہ کیا،

فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾

پھر قبر میں رکھوا دیا اس کو، پھر جب چاہا اُٹھا نکالا اس کو، ہرگز نہیں، پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا،

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا

اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اُوپر سے گرتا ہوا، پھر چیرا

الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا

زمین کو پھاڑ کر، پھر اُگایا اس میں اناج، اور انگور اور ترکاری، اور زیتون

وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ

اور کھجوریں، اور گھن کے باغ، اور میوہ اور گھاس، کام چلانے کو تمہارے

وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۲﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ﴿۳۴﴾

اور تمہارے چوپایوں کے، پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی، جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے،

وَاُمِّهٖ وَاَبِيۡهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيۡهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امۡرِیًٔ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ

اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے، اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے، ہر مرد کو ان میں سے اُس دن

شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ ﴿۳۹﴾

ایک فکر لگا ہوا ہے جو اس کے لئے کافی ہے، کتنے منہ اُس دن روشن ہیں، ہنستے خوشیاں کرتے،

وَوُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ عَلَيۡهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ

اور کتنے منہ اُس دن اُن پر گرد پڑی ہے، چڑھی آتی ہے اُن پر سیاہی، یہ لوگ وہی ہیں جو

الۡكَفَرَةُ الۡفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

منکر ہیں ڈھیٹھ

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(پیغمبر نے) منہ بنایا، اور رُخ پھیرلیا، ① اس لئے کہ اُن کے پاس وہ نابینا آ گیا تھا۔ ② اور (اے پیغمبر!) تمہیں کیا خبر؟ شاید وہ سدھر جاتا، ③ یا وہ نصیحت قبول کرتا، اور نصیحت کرنا اُسے فائدہ پہنچاتا! ④ ـــــــ وہ شخص جو بے پروائی دِکھا رہا تھا، ⑤ اُس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو، ⑥ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں آتی، ⑦ اور وہ جو محنت کر کے تمہارے پاس آیا ہے، ⑧ اور وہ دِل میں اللہ کا خوف رکھتا ہے، ⑨ اُس کی طرف سے تم بے پروائی برتتے ہو! ⑩ ہرگز ایسا نہیں چاہئے! یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے، ⑪ اب جو چاہے، اُسے یاد کرلے، ⑫ وہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو بڑے مقدس ہیں، ⑬ اُونچے رُتبے والے ہیں، پاکیزہ ہیں، ⑭ اُن لکھنے والوں کے ہاتھ میں رہتے ہیں ⑮ جو خود

بڑی عزّت والے، بہت نیک ہیں۔ ⑯ خدا کی مار ہو ایسے انسان پر، وہ کتنا ناشکرا ہے! ⑰ (وہ ذرا سوچے کہ) اللہ نے اُسے کس چیز سے پیدا کیا؟ ⑱ نطفے کی ایک بوند سے! اُسے پیدا بھی کیا، پھر اُس کو ایک خاص انداز بھی دیا۔ ⑲ پھر اُس کے لئے راستہ بھی آسان بنا دیا، ⑳ پھر اُسے موت دی، اور قبر میں پہنچا دیا، ㉑ پھر جب چاہے گا، اُسے دوبارہ اُٹھا کر کھڑا کردے گا۔ ㉒ ہرگز نہیں! جس بات کا اللہ نے اُسے حکم دیا تھا، ابھی تک اُس نے وہ پوری نہیں کی۔ ㉓ پھر ذرا انسان اپنے کھانے ہی کو دیکھ لے! ㉔ کہ ہم نے اُوپر سے خوب پانی برسایا، ㉕ پھر ہم نے زمین کو عجیب طرح پھاڑا، ㉖ پھر ہم نے اُس میں غلے اُگائے، ㉗ اور انگور اور ترکاریاں، ㉘ اور زیتون اور کھجور، ㉙ اور گھنے گھنے باغات، ㉚ اور میوے اور چارہ، ㉛ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کی خاطر! ㉜ آخر جب وہ کان پھاڑنے والی آواز آہی جائے گی، (اُس وقت اس ناشکری کی حقیقت پتہ چل جائے گی) ㉝ یہ اُس دن ہوگا جب انسان اپنے بھائی سے بھی بھاگے گا، ㉞ اور اپنے ماں باپ سے بھی، ㉟ اور اپنے بیوی بچوں سے بھی، ㊱ (کیونکہ) ان میں سے ہر ایک کو اُس دن اپنی ایسی فکر پڑی ہوگی کہ اُسے دوسروں کا ہوش نہیں ہوگا۔ ㊲ اُس روز کتنے چہرے تو چمکتے دمکتے ہوں گے، ㊳ ہنستے، خوشی مناتے ہوئے، ㊴ اور کتنے چہرے اُس دن ایسے ہوں گے کہ اُن پر خاک پڑی ہوگی، ㊵ سیاہی نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا۔ ㊶ یہ وہی لوگ ہوں گے جو کافر تھے، بدکار تھے۔ ㊷

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول

ان آیات کے نزول کا قصہ یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض رُؤسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے، بعض روایات میں ان میں سے بعض کے نام بھی آئے ہیں: ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، اُبیّ بن خلف، اُمیہ بن خلف، شیبہ، کہ اتنے میں حضرت عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھا، یہ قطع کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا، اور آپ نے ان کی طرف التفات نہیں کیا، اور ناگواری کی وجہ سے آپ چیں بہ جبیں ہوئے، جب اس مجلس سے اُٹھ کر گھر جانے لگے تو آثارِ وحی کے نمودار ہوئے اور یہ آیتیں: عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ① ...اِلــخ نازل ہوئیں، اس کے بعد جب وہ آپ کے پاس آتے آپ بڑی خاطر کرتے تھے، ھٰذہ الروایات کلّھا فی الدّرّ المنثور،[1] غرض واقعہ مذکورہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بہ جبیں ہوئے اور متوجہ نہ ہوگئے، اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا،

[1] تفسیر الدُّرّ المنثور ج:۱۵ ص:۲۴۱

(یہاں تو غائب کے صیغے سے فرمایا، اور یہ متکلم کے انتہائی لطف وکرم اور مخاطب کی تکریم ہے کہ رُو دَر رُو اس اَمر کی نسبت نہیں فرمائی) اور (آگے خطاب کا صیغہ بطورِ التفات کے اس لئے اِختیار کیا کہ شبہ اِعراض کا نہ ہو، اِرشاد ہوتا ہے کہ) آپ کو کیا خبر شاید وہ (نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر) سنور جاتا، یا (کم سے کم کسی خاص اَمر میں) نصیحت قبول کرتا، سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا، تو جو شخص (دِین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں، حالانکہ آپ پر کوئی اِلزام نہیں کہ وہ نہ سنورے (اُس کی بے پروائی ذِکر کرکے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دینے کی ہدایت ہے) اور جو شخص آپ کے پاس (دِین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے آپ اس سے بے اِعتنائی کرتے ہیں (ان آیات میں آپ کی اِجتہادی لغزش پر آپ کو مطلع کیا گیا ہے، منشا اس اِجتہاد کا یہ تھا کہ یہ امر تو متیقن اور ثابت ہے کہ اہم کام کو مقدم کرنا چاہئے، آپ نے کفر کی اشدیت کو موجبِ اہمیت سمجھا، جیسے دو بیمار ہوں، ایک کو ہیضہ ہے اور دُوسرے کو زُکام، تو ہیضے کے مریض کا علاج مقدم ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مرض کی شدّت اُس وقت موجبِ اہمیت ہے جب دونوں مریض طالبِ علاج ہوں، لیکن اگر مرضِ شدید والا علاج کا طالب ہی نہیں، بلکہ مخالف ہو تو پھر مقدم وہ ہوگا جو طالبِ علاج ہے، اگرچہ مرض اس کا خفیف ہو۔ آگے ان مشرکین کی طرف اس قدر توجہ ضروری نہ ہونے کو اِرشاد فرماتے ہیں کہ آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے (کیونکہ) قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے، (اور آپ کے ذمے صرف اس کی تبلیغ ہے) سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے (اور جو قبول نہ کرے وہ جانے، آپ کا کوئی ضرر نہیں، پھر آپ اس قدر اِہتمام کیوں فرماتے ہیں۔ آگے قرآن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ) وہ (قرآن لوحِ محفوظ کے) ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو (عنداللہ) مکرّم ہیں (یعنی پسندیدہ ومقبول ہیں، اور) رفیع المکان ہیں (کیونکہ لوحِ محفوظ تحت العرش ہے، کما فی الدّر المنثور سورۃ البروج، [۱] اور وہ) مقدس ہیں (شیاطینِ خبیثہ کی وہاں تک رسائی نہیں، کقولہ تعالیٰ: لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ [۲] (الواقعۃ)) جو ایسے لکھنے والوں (یعنی فرشتوں) کے ہاتھوں میں (رہتے) ہیں کہ وہ مکرّم (اور) نیک ہیں (یہ سب صفات اس کے من جانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ سورۂ واقعہ کی آیت: لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ میں بیان ہوا ہے۔ اور لوحِ محفوظ ہر چند کہ شیٔ واحد ہے، مگر اس کے اجزا کو صحف سے تعبیر فرمایا، اور ان فرشتوں کو کاتب اس لئے کہا کہ یہ لوحِ محفوظ سے بأمرِ الٰہی نقل کرنے والے ہیں۔ حاصل آیات کا یہ ہوا کہ قرآن من جانب اللہ نصیحت کے لئے ہے، آپ نصیحت کرکے اپنے فرض سے فارغ ہو جائیں گے خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے، پس

---

[۱] تفسیر الدُّرّ المنثور، تفسیر سورۃ البروج، ج:۱۵ ص:۳۴۵، وشعب الإیمان للبیہقی، رقم الحدیث:۸۱۸۸، کتاب حسن الخلق، فصل فی الدعاء والمسألۃ من اللہ عزّ وجلّ حسن الخُلُق۔

[۲] ترجمہ: اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا۔

اس قسم کی تقدیم وتاخیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں تک آداب تذکیر وتبلیغ کے ہوئے، آگے کفار کے اُس سے فائدہ نہ اُٹھانے پر تشنیع ہے کہ منکر) آدمی پر (جو ایسے تذکرہ سے نصیحت حاصل نہ کرے جیسے ابوجہل وغیرہ جن کو آپ سمجھاتے تھے اور وہ نہیں سمجھے تو ایسے شخص پر) خدا کی مار کہ وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا (آگے جواب ہے کہ) نطفے سے (پیدا کیا، آگے اس کی کیفیت مذکور ہے کہ بہت سے انقلابات اور تغیرات کے بعد) اس کی صورت بنائی، پھر اس (کے اعضا) کو اَندازے سے بنایا (جیسا کہ سورۃ القیامہ کی آیت: فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝۳۸ [1] میں گزر چکا ہے) پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسے تنگ موقع سے اچھے خاصے تنومند بچے کا صحیح سالم نکل آنا صاف دلیل ہے اللہ کے قادر اور عبد کے مقدور ہونے کی) پھر (بعد عمر ختم ہونے کے) اس کو موت دی، پھر اس کو قبر میں لے گیا (خواہ اَوّل سے خاک میں رکھ دیا جائے یا بعد چندے خاک میں مل جائے) پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زِندہ کر دے گا (مطلب یہ کہ سب تصرفات دلیل ہیں انسان کے داخلِ قدرتِ الٰہیہ ہونے کی اور نعمت بھی ہیں، بعض حسّی، بعض معنوی، جس کا مقتضا تھا وجوبِ طاعت وایمان، مگر اس نے) ہرگز (شکر) نہیں (ادا کیا اور) اس کو جو حکم کیا تھا اس کو بجا نہیں لایا، سو اِنسان کو چاہئے کہ (اپنی تخلیق کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے کے بعد اسبابِ بقاو تعیش پر نظر کرے، مثلاً) اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (تا کہ وہ باعث ہو حق شناسی اور اِطاعت وایمان کا، اور آگے نظر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں، وہ یہ) کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طوڑ پر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا، (بعض چیزیں) تمہارے اور (بعض چیزیں) تمہارے مواشی کے فائدے کے لئے (اور یہ سب بھی نعمت اور دلیلِ قدرت ہیں، اور اس مجموع میں ہر جزو مقتضی ہے وجوبِ شکرِ اِیمان کو۔ یہاں تک تشنیع ہوگئی نصیحت قبول نہ کرنے پر، آگے عدم تذکُّر پر سزا اور تذکُّر پر ثوابِ آخرت مذکور ہے، یعنی اب تو یہ لوگ ناشکری اور کفر کرتے ہیں) پھر جس وقت کانوں کا بہرا کر دینے والا شور برپا ہوگا (یعنی قیامت، اُس وقت ساری ناشکری کا مزا معلوم ہو جائے گا۔ آگے اس دن کا بیان ہے کہ) جس روز (ایسا) آدمی (جس کا اُوپر بیان ہوا) اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا، کقولہٖ تعالیٰ: وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰ᚖ [2] (المعارج) وجہ یہ کہ) ان میں ہر شخص کو (اپنا ہی) ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا (یہ تو کفار کا حال ہوگا، آگے مجموعۂ مؤمنین اور کفار کی تفصیل ہے کہ) بہت سے چہرے اس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرّت سے) خنداں شاداں ہوں گے، اور بہت سے چہروں پر اس روز

[1] ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے بنایا پھر اعضاء درست کئے۔

[2] ترجمہ: اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔

(کفر کی وجہ سے) ظلمت ہوگی (اور اس ظلمت کے ساتھ) ان پر (غم کی) کدورت چھائی ہوگی، یہی لوگ کافر فاجر ہیں (کافر سے اشارہ ہے فسادِ عقائد کی طرف، اور فاجر سے فسادِ اعمال کی طرف)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول میں جو واقعہ حضرت عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کا نقل کیا گیا ہے، اس میں بغوی رحمہ اللہ نے یہ مزید روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو نابینا ہونے کے سبب یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دُوسرے سے گفتگو میں مشغول ہیں، مجلس میں داخل ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی اور بار بار آواز دی۔ (مظہری) [۱] اور ابنِ کثیر رحمہ اللہ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آیتِ قرآن پڑھوانے کا سوال کیا اور اس سوال کے فوری جواب دینے پر اِصرار کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ کے کفار سرداروں کو دِین کی تبلیغ کرنے اور سمجھانے میں مصروف تھے۔ یہ سردار عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ [۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کا اس طرح خطاب کرنا اور ایک آیت کے الفاظ دُرست کرنے کے معمولی سوال پر فوری جواب کے لئے اِصرار کرنا، ناگوار ہوا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم پکے مسلمان اور ہر وقت کے حاضر باش تھے، دُوسرے اوقات میں بھی سوال کرسکتے تھے، ان کے جواب کے مؤخر کرنے میں کسی دِینی نقصان کا خطرہ نہ تھا، بخلاف رُؤسائے قریش کے کہ نہ یہ لوگ ہر وقت آپ کی خدمت میں آتے ہیں اور نہ ہر وقت اُن کو اللہ کا کلمہ پہنچایا جاسکتا ہے، اس وقت یہ لوگ آپ کی بات سن رہے تھے، جس سے ان کے ایمان لانے کی توقع کی جاسکتی تھی، اور ان کی بات کاٹ دی جاتی تو ایمان ہی سے محرومی ان کی ظاہر تھی۔ ان مجموعۂ حالات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ سے رُخ پھیر کر اپنی ناگواری کا اِظہار فرمایا، اور جو گفتگو تبلیغِ حق کی رُؤسائے قریش کے ساتھ جاری تھی، اُس کو جاری رکھا، اس پر مجلس سے فارغ ہونے کے وقت سورۂ عَبَسَ کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جس میں آپ کے اس طرزِ عمل کو ناپسندیدہ قرار دے کر آپ کو ہدایت کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اپنے اجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آدابِ مجلس کے خلاف طرزِ گفتگو اِختیار کرے اس کو کچھ تنبیہ ہونی چاہئے، تاکہ آئندہ وہ آدابِ مجلس کی رعایت کرے، اس کے لئے تو آپ نے حضرت ابنِ اُمِّ

[۱] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۱۹۷، وتفسیر البغوی ج:۸ ص:۳۳۳

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۸ ص:۳۲۰

مکتوم رضی اللہ عنہ سے رُخ پھیر لیا، اور دُوسری بات یہ تھی کہ بظاہر حال کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں، ان کے ازالے کی فکر مقدم ہونا چاہئے، بمقابلے دِین کے فروعی اَحکام کی تعلیم کے جو عبداللہ ابنِ اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ چاہتے تھے، مگر حق تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ کے اس اِجتہاد کو دُرست قرار نہیں دِیا، اور اس پر متنبہ فرمایا کہ یہاں قابلِ غور بات یہ تھی کہ ایک شخص جو آپ سے دِینی تعلیم کا طالب ہو کر سوال کر رہا ہے، اس کے جواب کا فائدہ تو یقینی ہے، اور جو آپ کا مخالف ہے، آپ کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتا، اُس سے گفتگو کا فائدہ موہوم ہے، موہوم کو یقینی پر ترجیح نہ ہونا چاہئے۔ اور عبداللہ ابنِ اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ سے جو آدابِ مجلس کے خلاف بات سرزد ہوئی اُن کا عذر قرآن نے لفظ ''اَعْمٰی'' کہہ کر بتلا دیا کہ وہ نابینا تھے، اس لئے اس کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ آپ اس وقت کس شغل میں ہیں، کن لوگوں سے گفتگو چل رہی ہے اس لئے وہ معذور تھے، مستحقِ اعراض نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی معذور آدمی سے بےخبری میں کوئی بات آدابِ مجلس کے خلاف ہو جائے تو وہ قابلِ عتاب نہیں ہوتا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ عَبَسَ کے معنی ترش رُوئی اِختیار کرنا، یعنی چہرے سے اِظہارِ ناگواری کرنا۔ اور تَوَلّٰٓى کے معنی رُخ پھیر لینے کے ہیں۔ اس جگہ موقع اس کا تھا کہ یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصیغۂ خطاب کہے جاتے کہ آپ نے ایسا کیا، لیکن قرآنِ کریم نے صیغۂ خطاب کے بجائے صیغۂ غائب اِختیار کیا، جس میں عتاب کی حالت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِکرام ملحوظ رکھا گیا، اور صیغۂ غائب اِختیار کر کے یہ ایہام کیا کہ جیسے یہ کام کسی اور نے کیا ہو۔ اِشارہ اس طرف ہے کہ یہ کام آپ کے شایانِ شان نہیں۔ اور دُوسرے جملے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عذر کی طرف اشارہ فرما دیا کہ وَمَا يُدْرِيْكَ (یعنی آپ کو کیا خبر) اس میں بتلا دیا کہ اِعراض کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ آپ کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ یہ صحابی جو کچھ دریافت کر رہے ہیں اس کا اثر یقینی ہے، اور غیروں سے گفتگو کا اثر موہوم۔ اور اس دُوسرے جملے میں صیغۂ غائب چھوڑ کر صیغہ خطاب کا اِختیار فرمانے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور دِل جوئی ہے کہ اگر بالکل خطاب کا صیغہ استعمال نہ ہوتا تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس طرزِ عمل کی ناپسندیدگی ترکِ خطاب کا سبب بن گئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ناقابلِ برداشت رنج والم ہوتا، اس لئے جس طرح پہلے جملے میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم ہے، اسی طرح دُوسرے جملے میں خطاب کرنا بھی آپ کی تکریم اور دِل جوئی ہے۔

لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ یعنی آپ کو کیا معلوم کہ یہ صحابی جو بات دریافت کر رہے تھے اس کا فائدہ متیقّن تھا کہ آپ اُن کو تعلیم دیتے تو یہ اُس کے ذریعے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیتے اور کمال حاصل کر لیتے، اور یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم اس ذِکر اللہ سے وہ ابتدائی نفع اُٹھاتے کہ اس سے ان کے دِل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوف کی ترقی ہو جاتی۔ لفظ

الذِّكْرٰى کے معنی کثرتِ ذِکر کے ہیں۔ (کذا فی الصّحاح) [۱]

یہاں قرآنِ کریم نے دو جملے اختیار فرمائے: یَزَّکّٰی اور یَذَّکَّرُ، پہلے کے معنی پاک صاف ہوجانے کے ہیں، اور دُوسرے کے معنی نصیحت حاصل کرنے اور ذِکر سے متأثر ہونے کے ہیں۔ پہلا مقام اَبرار و اَتقیاء کا ہے، جو اپنے نفس کو ظاہری اور باطنی ہر قسم کی گندگیوں سے پاک صاف کرلیں، اور دُوسرا مقام طریقِ دِین پر چلنے کے ابتدائی حال کا ہے کہ مبتدی کو اللہ کی یاد دِلائی جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت وخوف اس کے دِل میں مستحضر ہوجاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو تعلیم دینا نفع سے کسی حال خالی نہیں تھا، خواہ نفع کامل ہوجاتا کہ تزکیۂ نفس مکمل حاصل کرلیتے یا ابتدائی نفع حاصل ہوتا کہ اللہ کی یاد اور عظمت وخوف ان کے دِل میں بڑھ جاتا۔ اور دونوں جملے بحرفِ تردید یعنی اَوْ کے ساتھ استعمال کئے گئے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک حال ضرور حاصل ہوتا، اس میں اصطلاحی مانعة الخلو ہے، یعنی اِحتمال یہ بھی ہے کہ دونوں نفع جمع ہوجائیں کہ ابتداءً تذکّر ہو اور اس کے بعد تزکیہ، مانعة الجمع نہیں کہ دونوں جمع نہ ہوسکیں۔ (مظہری) [۲]

تبلیغ وتعلیم کے لئے ایک اہم اُصولِ قرآنی

اس موقع میں یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آگئے، ایک مسلمان کو تعلیم اور اُس کی تکمیل اور دِل جوئی، دُوسرے غیرمسلموں کی ہدایت کے لئے اُن کی طرف توجہ۔ قرآنِ کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کردیا کہ پہلا کام دُوسرے کام پر مقدّم ہے، دُوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا دُرست نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی اصلاح کی فکر غیرمسلموں کو اِسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدّم ہے۔

اس میں اُن علماء کے لئے ایک اہم ہدایت ہے جو غیرمسلموں کے شبہات کے اِزالے اور ان کو اِسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے عام مسلمانوں کے دِلوں میں شکوک وشبہات یا شکایات پیدا ہوجاتی ہیں، اُن کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اِصلاحِ حال کو مقدّم رکھنا چاہئے۔ اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ؎

دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو

بعد کی آیتوں میں قرآنِ کریم نے اسی بات کو پوری وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ

[۱] مفردات القرآن للأصفهاني، مادّة: ذكر، ج:۱ ص:۱۷۹

[۲] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۱۹۸

تَصَدّٰی ﴿۶﴾ یعنی جو شخص آپ سے اور آپ کے دِین سے اِستغنا اور بے رُخی برَت رہا ہے، آپ اُس کے تو درپے ہیں کہ کسی طرح یہ مسلمان ہو جائے، حالانکہ یہ آپ کے ذمے نہیں، اور اگر وہ مسلمان نہ ہو تو آپ پر کوئی اِلزام نہیں، اور جو شخص دوڑتا ہوا طلبِ علمِ دِین کے لئے آیا، اور وہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والا بھی ہے، آپ اُس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس میں واضح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اِصلاح وتربیت کر کے اُن کو پکا مسلمان اور قوی مؤمن بنانا، یہ غیر مسلموں کو اِسلام میں داخل کرنے کی فکر سے زیادہ اہم اور مقدّم ہے، اس کی فکر زیادہ چاہئے۔ واللہ اعلم۔ اس کے بعد قرآن مجید کا اللہ کی طرف سے تذکرہ ونصیحت ہونا اور اس کا مکرّم عالی شان ہونا بیان فرمایا ہے۔

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ صُحُف سے مراد لوحِ محفوظ ہے، وہ اگرچہ ایک ہی ہے، مگر اس کو بصیغۂ جمع صحف سے تعبیر اس لئے کیا گیا کہ اس میں سب صحائفِ آسمانی لکھے ہوتے ہیں، یا اس لئے کہ فرشتے اپنے صحیفے اُس سے نقل کرتے ہیں۔ مَّرْفُوْعَةٍ سے مراد اُن صحیفوں کا عند اللہ عالی شان ہونا ہے۔ اور مُّطَهَّرَةٍ سے مراد یہ ہے کہ جنابت والے آدمی اور حیض، نفاس والی عورت اور بے وضو کے لئے اُن کا چھونا جائز نہیں۔

بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ سَفَرَةٍ بفتحتین سَافِرٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے جس کے معنی کاتب کے ہیں، اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، کراماً کاتبین، یا انبیاء علیہم السلام اور اُن کی وحی کو لکھنے والے حضرات ہوں گے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔

اور لفظ سَفَرَةٍ، سفیر بمعنی قاصد کی جمع بھی ہوسکتی ہے، اس صورت میں اس سے مراد رُسل ملائکہ، اور انبیاء علیہم السلام اور وحی کی کتابت کرنے والے حضراتِ صحابہ ہوں گے، اور علمائے اُمت بھی اس میں داخل ہیں، کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ قراءت میں بھی ماہر ہے، تو وہ سَفَرہ کرام ابرار کے ساتھ ہے۔ اور جو شخص ماہر نہیں، مگر تکلف کے ساتھ مشقت اُٹھا کر قراءت صحیح کر لیتا ہے، اُس کے لئے دُہرا اَجر ہے۔ (رواہ الشیخان عن عائشة رضی الله عنها، مظهری) [۱] اس سے معلوم ہوا کہ غیر ماہر کو دو اَجر ملتے ہیں، ایک قراءتِ قرآن کا، دُوسرا مشقت اُٹھانے کا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ماہر کو بے شمار اَجر ملیں گے۔ (مظہری) [۲]

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم کا عالی شان، واجب الایمان ہونا بیان کرنے کے بعد کافر انسان جو قرآن کے منکر

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۱۹۹ و ۲۰۰، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة عبس، ج:۲ ص:۷۳۵، وصحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضیلة حافظ القرآن ج:۱ ص:۲۶۹

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۰۰

ہیں اُن پر لعنت اور اللہ کی نعمت کی ناشکری پر تنبیہ ہے، اور قرآن کا من جانب اللہ ایک نعمتِ عظیم ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، جس کو اہلِ علم وفہم ہی سمجھ سکتے ہیں، آگے اُن اِنعاماتِ الٰہیہ کا ذِکر ہے جو انسان کی تخلیق سے آخر تک انسان پر مبذول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مادّی اور محسوس چیز ہے جس کو اَدنیٰ شعور والا اِنسان بھی سمجھ سکتا ہے، اسی سلسلے میں تخلیقِ انسانی کا ذِکر فرمایا:

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ پہلے تو اس میں ایک سوال کیا گیا کہ اے انسان! تو غور کر کہ تجھے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا ہے اور چونکہ اس کا جواب متعین ہے، اس کے سوا کوئی دُوسرا جواب ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے پھر خود ہی فرمایا مِنْ نُّطْفَةٍ یعنی انسان کو نطفے سے پیدا کیا، پھر فرمایا: خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ یعنی یہی نہیں کہ نطفے سے ایک جاندار کا وجود بنا دیا، بلکہ اس کو ایک خاص اندازے اور بڑی حکمت سے بنایا، اُس کے قدوقامت، اور جسامت، اور شکل وصورت، اور اعضا کے طول وعرض، اور جوڑ بند، اور آنکھ، ناک، کان وغیرہ کی تخلیق میں ایسا اندازہ قائم فرمایا کہ ذرا اس کے خلاف ہوجائے تو اِنسان کی صورت بگڑ جائے اور کام کاج مصیبت بن جائے۔

اور لفظ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ سے یہاں یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ انسان جس وقت بطنِ مادر میں زیرِ تخلیق ہوتا ہے، اُس وقت اللہ تعالیٰ اس کی چار چیزوں کی مقدار لکھ دیتے ہیں: ۱-وہ یہ کہ وہ کیا کیا اور کیسے کیسے عمل کرے گا، ۲-اس کی عمر کتنی ہوگی، ۳-اس کو رزق کتنا ملے گا، ۴-اور وہ انجامِ کار سعید ونیک بخت ہوگا، یا شقی بد بخت (كما فى حديث ابن مسعود رضى الله عنه عند الشيخين) [۱]

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ یعنی حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسان کی تخلیق بطنِ مادر کی تین اندھیریوں اور ایسے محفوظ مقام میں فرمائی کہ جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اس کو بھی اس تخلیق کی تفصیل کی کچھ خبر نہیں، پھر یہ زندہ تمام اعضا وجوارح سے مکمل انسان جس جگہ میں بنا ہے وہاں سے اس دُنیا میں آنے کا راستہ بھی باوجود تنگ ہونے کے حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی نے آسان فرمادیا کہ چار پانچ پونڈ کا وزنی جسم صحیح سالم برآمد ہوجاتا ہے اور ماں کے وجود کو بھی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ○

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ تخلیقِ انسانی کی اِبتدا بیان کرنے کے بعد اس کی اِنتہا موت اور قبر پر ہے، اس کا ذِکر بسلسلۂ اِنعامات فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی موت درحقیقت کوئی مصیبت نہیں، نعمت ہی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ'' [۲] کہ مؤمن کا تحفہ موت ہے۔ اور اس میں مجموعہ عالم کے اعتبار

---

[۱] صحيح البخارى، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة ج:۱ ص:۴۵۶، وصحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمى فى بطن أمه...إلخ، ج:۲ ص:۳۳۲

[۲] المستدرك للحاكم، كتاب الرقاق، رقم الحديث:۸۰۱۴

سے بڑی حکمتیں ہیں۔ اور فَاَقْبَرَهٗ کے معنی پھر اس کو قبر میں داخل کیا۔ یہ بھی ایک انعام ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے عام جانوروں کی طرح نہیں رکھا کہ مر گیا تو وہیں زمین پر سڑتا اور پھولتا پھٹتا ہے، بلکہ اُس کا اِکرام یہ کیا گیا کہ اُس کو نہلا کر، نئے اور پاک صاف کپڑوں میں ملبوس کر کے اِحترام کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردہ انسان کو دفن کرنا واجب ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ اس میں تخلیقِ انسانی کی اِبتدا و اِنتہا اور اُن میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اِنعامات کا ذِکر کرنے کے بعد منکر اِنسان کو تنبیہ کی گئی کہ ان آیاتِ اِلٰہیہ اور اِنعامات کا تقاضا تھا کہ انسان ان میں غور کر کے اللہ پر ایمان لاتا اور اس کے اَحکام کی تعمیل کرتا، مگر اس بدنصیب نے ایسا نہیں کیا، آگے پھر اُن انعاماتِ اِلٰہیہ کا تذکرہ ہے، جو تخلیقِ انسانی کی اِبتدا و اِنتہا کے درمیانی زمانے میں انسان پر مبذول ہوتے ہیں کہ انسان کا رِزق کس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ آسمان سے پانی برستا ہے، بیج اور دانہ جو زمین میں مدفون ہے، یہ بارش اس میں ایک حیاتِ نباتی پیدا کرتی ہے، جس کے ذریعے ایک نحیف وضعیف کونپل زمین کو شق کر کے اُوپر نکلتی ہے، اور پھر اس سے اَنواع واَقسام کے غلے، میوے اور باغات وجود میں آتے ہیں۔ ان سب اِنعاماتِ اِلٰہیہ پر اِنسان کو مکرّر، سہ کرّر تنبیہ کے بعد آخرِ سورت میں پھر قیامت کا ذِکر ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ صَـآخـه ایسے شور اور سخت آواز کو کہتے ہیں جس سے انسان کے کان بہرے ہو جائیں، مراد اس سے شورِ قیامت یعنی نفخِ صور ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ یہ محشر میں سب کے جمع ہونے کے وقت کا بیان ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں اور نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا، دُنیا میں جو رِشتے ناتے ایسے ہیں کہ لوگ ایک دُوسرے پر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں، اُس عالم میں ہر شخص اپنی اپنی ایسی فکر میں مبتلا ہوگا کہ کوئی کسی کی خبر نہ لے سکے گا، بلکہ سامنے دیکھے گا تو بھی گریز کرے گا، انسان اپنے بھائی سے، ماں باپ سے، بیوی اور اولاد سے منہ چھپاتا بھاگتا پھرے گا، دُنیا میں تعاون وتناصر اور اِمدادِ باہمی بھائیوں میں ہوتی ہے، اس سے زیادہ ماں باپ کی اِمداد و اِعانت کی فکر ہوتی ہے، طبعی طور پر اُن سے بھی زیادہ بیوی اور اولاد سے تعلق ہو جاتا ہے، اس میں ادنیٰ سے اعلیٰ تعلق کی طرف ترتیب سے بیان فرمایا ہے۔ آگے اس میدانِ حشر میں مؤمنین اور کفار کے انجام کا ذِکر کر کے سورت ختم کی گئی ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ عَبَسَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَيْلَةَ الْاَرْبِعَاء ۷ شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

آیاتها ۲۹ | ۸۱ سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ ۷ | رکوعها ۱

سورۂ تکویر مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی اُنتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَ اِذَا الْجِبَالُ

جب سورج کی دُھوپ تہ ہوجائے، اور جب تارے میلے ہوجائیں، اور جب پہاڑ

سُيِّرَتْ ۝۳ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵

چلائے جائیں، اور جب بیاتی اُونٹنیاں چھٹی پھریں، اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑجائے،

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ

اور جب دریا جھونکے جائیں، اور جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں، اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو

سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ

پوچھیں کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں، اور جب آسمان کا

كُشِطَتْ ﴿١١﴾ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾ عَلِمَتْ

پوست اُتار لیں، اور جب دوزخ دہکائی جائے، اور جب بہشت پاس لائی جائے، جان لے گا

نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾ وَالَّيْلِ

ہر ایک جی جو لے کر آیا، سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والوں، سیدھے چلنے والوں، دبک جانے والوں کی، اور رات کی

اِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾

جب پھیل جائے، اور صبح کی جب دم بھرے، مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا،

ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ

قوت والا عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا، سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے، اور یہ تمہارا رفیق

بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ

کچھ دیوانہ نہیں، اور اس نے دیکھا ہے اس فرشتے کو آسمان کے کھلے کنارہ کے پاس، اور یہ غیب کی بات بتانے میں

بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾

بخیل نہیں، اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا، پھر تم کدھر چلے جارہے ہو

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾

یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے، جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے،

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور تم جبھی چاہو کہ چاہے اللہ سارے جہان کا مالک۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، ﴿۱﴾ اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے، ﴿۲﴾ اور جب پہاڑوں کو چلایا جائے گا، ﴿۳﴾ اور جب دس مہینے کی گابھن اُونٹنیوں کو بھی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، ﴿۴﴾ اور جب وحشی جانور اِکٹھے کر دیئے جائیں گے، ﴿۵﴾ اور جب سمندروں کو بھڑکایا جائے گا، ﴿۶﴾ اور جب لوگوں کے جوڑے جوڑے بنا دیئے جائیں گے، ﴿۷﴾ اور جس بچی کو زندہ قبر میں گاڑ دیا گیا تھا، اُس سے پوچھا جائے گا ﴿۸﴾ کہ اُسے کس جرم میں قتل کیا گیا؟ ﴿۹﴾ اور جب اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے، ﴿۱۰﴾ اور جب آسمان کا چھلکا اُتار دیا جائے گا، ﴿۱۱﴾ اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی، ﴿۱۲﴾ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی، ﴿۱۳﴾ تو اُس وقت ہر شخص کو اپنا سارا کیا دھرا معلوم ہو جائے گا۔ ﴿۱۴﴾ اب میں قسم کھاتا ہوں اُن ستاروں کی جو پیچھے کی طرف چلنے لگتے ہیں، ﴿۱۵﴾ جو چلتے چلتے دبک جاتے ہیں، ﴿۱۶﴾ اور قسم کھاتا ہوں رات کی جب وہ رُخصت ہو، ﴿۱۷﴾ اور صبح کی جب وہ سانس لے، ﴿۱۸﴾ کہ یہ (قرآن) یقینی طور پر ایک معزز فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے، ﴿۱۹﴾ جو قوت والا ہے، جس کا عرش والے کے پاس بڑا رُتبہ ہے۔ ﴿۲۰﴾ وہاں اُس کی بات مانی جاتی ہے وہ امانت دار ہے۔ ﴿۲۱﴾ اور (اے مکہ والو!) تمہارے ساتھ رہنے والے یہ صاحب (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی دیوانے نہیں ہیں، ﴿۲۲﴾ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ انہوں نے اس فرشتے کو کھلے ہوئے اُفق پر دیکھا ہے، ﴿۲۳﴾ اور وہ غیب کی باتوں کے بارے میں بخیل بھی نہیں ہیں۔ ﴿۲۴﴾ اور نہ یہ (قرآن) کسی مردود شیطان کی (بنائی ہوئی) کوئی بات ہے۔ ﴿۲۵﴾ پھر بھی تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ ﴿۲۶﴾ یہ تو دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے ایک نصیحت ہے، ﴿۲۷﴾ ـــــ تم میں سے ہر اُس شخص کے لئے جو سیدھا سیدھا رہنا چاہے! ﴿۲۸﴾ اور تم چاہو گے نہیں، اِلّا یہ کہ خود اللہ چاہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ ﴿۲۹﴾

خلاصۂ تفسیر

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا، اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب دس مہینے کی گابھن اُونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (مارے گھبراہٹ کے) سب جمع ہو جائیں گے،

اور جب دریا بھڑ کائے جائیں گے (یہ چھ واقعے تو نفخۂ اُولیٰ کے وقت ہوں گے، جب کہ دُنیا آباد ہوگی، اور اس نفخے سے یہ تغیرات وتبدلات واقع ہوں گے، اور اُس وقت اُونٹنیاں وغیرہ بھی اپنی اپنی حالت پر ہوں گی، جن میں بعض وضعِ حمل کے قریب ہوں گی، جو کہ عرب کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی مال ہے، جس کی ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں، مگر اس وقت ہل چل میں کسی کو کہیں کا ہوش نہ رہے گا، اور وحوش بھی مارے گھبراہٹ کے سب گڈمڈ ہو جائیں گے، اور دریاؤں میں اوّل طغیانی پیدا ہوگی اور زمین میں شقوق واقع ہو جائیں گے، جس سے سب شیریں اور شور دریا ایک ہو جائیں گے، جس کا ذِکر آئندہ سورت میں وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ [۱] (الانفطار) میں فرمایا ہے۔ پھر شدّتِ حرارت سے سب کا پانی آگ ہو جائے گا، شاید اوّل ہوا ہو جائے، پھر ہوا آگ بن جائے، اس کے بعد عالم فنا ہو جائے گا) اور (اگلے چھ واقعات بعد نفخۂ ثانیہ کے ہوں گے، جن کا بیان یہ ہے کہ) جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے کئے جائیں گے (کافر الگ، مسلمان الگ، پھر ان میں ایک ایک طریقے کے الگ الگ) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی (مقصود اس پوچھنے سے زندہ درگور کرنے والے ظالموں کا اظہارِ جرم ہے) اور جب نامۂ اعمال کھول دیئے جائیں گے (تاکہ سب اپنے اپنے عمل دیکھ لیں، کقولہٖ تعالیٰ: يَلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ [۲] (بنی اسرائیل)) اور جب آسمان کھل جائے گا (اور اس کے کھلنے سے آسمان کے اُوپر کی چیزیں نظر آنے لگیں گی، اور نیز اُس کے کھلنے سے غمام کا نزول ہوگا جس کا ذِکر پارہ۱۹: وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ، آیت: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ... اِلٰـخ [۳] (الفرقان:۲۵) میں آیا ہے) اور جب دوزخ (اور زیادہ) دہکائی جائے گی، اور جب جنت نزدیک کردی جائے گی (کما فی سورة قٓ: وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ [۴] (قٓ:۳۱) جب یہ سب واقعات نفخۂ اُولیٰ اور ثانیہ کے واقع ہو جائیں گے تو اُس وقت) ہر شخص اُن اعمال کو جان لے گا جو لے کر آیا ہے (اور جب ایسا واقعۂ ہائلہ ہونے والا ہے) تو (میں منکرین کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں، اور مصدقین کو اس کے لئے آمادہ کرتا ہوں، اور یہ دونوں امر قرآن کی تصدیق اور اس پر عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں کہ اس میں اس کا اثبات اور نجات کا طریق ہے، اِس لئے) میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو (سیدھے چلتے چلتے) پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں (اور پھر پیچھے ہی کو) چلتے رہتے ہیں (اور کبھی پیچھے چلتے چلتے اپنے مطالع میں) جاچھپتے ہیں (ایسا اَمر پانچ سیاروں کو پیش آتا ہے کہ کبھی سیدھے چلتے ہیں، کبھی پیچھے چلتے ہیں، اور اُن کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں: زحل، مشتری، عطارد، مریخ، زہرہ) اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے، اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے (آگے جوابِ قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے،

---

[۱] ترجمہ: اور جب سب دریا بہ پڑیں گے۔

[۲] ترجمہ: جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا۔

[۳] ترجمہ: اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جاوے گا۔

[۴] ترجمہ: اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی۔

ایک معزز فرشتہ (یعنی جبریل علیہ السلام) کا لایا ہوا، جو قوت والا ہے (کما فی النجم: عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ﴿۵﴾[1] اور) مالکِ عرش کے نزدیک ذی رُتبہ ہے (اور) وہاں (یعنی آسمانوں میں) اس کا کہنا مانا جاتا ہے (یعنی فرشتے اس کا کہنا مانتے ہیں جیسا حدیثِ معراج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کہنے سے فرشتوں نے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے اور) امانت دار ہے (کہ وحی کو صحیح پہنچا دیتا ہے، پس وحی لانے والا تو ایسا ہے) اور (آگے جن پر وحی نازل ہوئی اُن کی نسبت ارشاد ہے کہ) یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کا حال بخوبی تم کو معلوم ہے) مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرینِ نبوّت کہتے تھے) اور انہوں نے اس فرشتے کو (اصلی صورت میں آسمان کے) صاف کنارے پر دیکھا بھی ہے (صاف کنارے سے مراد بلند کنارہ ہے کہ صاف نظر آتا ہے، کما فی النجم: وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ﴿۷﴾[2] اور اس کا مفصل بیان سورۂ نجم میں گزرا ہے) اور یہ پیغمبر مخفی (بتلائی ہوئی وحی کی) باتوں پر بخل کرنے والے بھی نہیں (جیسا کاہنوں کی عادت تھی کہ رقم لے کر کوئی بات بتلاتے تھے، اس سے کہانت کی بھی نفی ہوگئی، اور اس کی بھی کہ آپ اپنے کام کا کسی سے معاوضہ لیں) اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کی کہی ہوئی بات نہیں ہے (اس سے نفیٔ کہانت کی اور تاکید ہوگئی، حاصل یہ کہ نہ آپ مجنون ہیں، نہ کاہن، نہ صاحبِ غرض، اور وحی لانے والے کو پہچانتے بھی ہیں، اور وحی لانے والا ایسا ایسا ہے، پس لامحالہ یہ اللہ کا کلام اور آپ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ قسمیں مطلوب مقام کے نہایت مناسب ہیں، چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا اور لوٹنا اور چھپ جانا مشابہ ہے فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور نورِ ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے، جب یہ بات ثابت ہے) تو تم لوگ (اس بارے میں) کدھر کو چلے جا رہے ہو (کہ نبوّت کے منکر ہو رہے ہو) بس یہ تو (بالعموم) دُنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے (اور بالخصوص) ایسے شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے (عام لوگوں کے لئے ہدایت اس معنی سے ہے کہ اُن کو سیدھا راستہ بتلا دیا اور مؤمنینِ متقین کے لئے اس معنی سے کہ اُن کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا) اور (بعض کے نصیحت قبول نہ کرنے سے اس کے نصیحت نامہ ہونے میں شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ) تم بدون خدائے ربّ العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے ہو (یعنی فی نفسہٖ تو نصیحت ہے، لیکن تاثیر اس کی موقوف مشیت پر ہے، جو بعض لوگوں کے لئے متعلق ہوتی ہے، اور بعض کے لئے کسی حکمت سے متعلق نہیں ہوتی)۔

معارف و مسائل

اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ﴿۱﴾ تَکْوِیْرٌ سے مشتق ہے، اس کے معنی بے نور ہو جانے کے بھی آتے ہیں، حسن بصریؒ کی

---

[1] ترجمہ: ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے۔

[2] ترجمہ: ایسی حالت میں کہ وہ بلند کنارہ پر تھا۔

یہی تفسیر ہے، اور اس کے معنی ڈال دینے، پھینک دینے کے بھی آتے ہیں۔ ربیع بن خثیم رحمہ اللہ نے اس کی یہی تفسیر کی ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ آفتاب کو سمندر میں ڈال دیا جائے گا، جس کی گرمی سے سارا سمندر آگ بن جائے گا۔ اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ اوّل آفتاب کو بے نور کر دیا جائے، پھر اس کو سمندر میں ڈال دیا جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شمس وقمر قیامت کے دن دریا میں ڈال دیئے جائیں گے۔ [1] اور مسندِ بزار میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ [2] ابنِ ابی حاتم، ابنِ ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ان آیات کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ شمس وقمر اور تمام ستاروں کو سمندر میں ڈال دیں گے، اور پھر اُس پر تیز ہوا چلے گی جس سے سارا سمندر آگ ہو جائے گا۔ [3] اس طرح یہ کہنا بھی صحیح ہو گیا کہ شمس وقمر کو دریا میں ڈال دیا جائے گا، اور یہ کہنا بھی دُرست رہا کہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ سارا سمندر اس وقت جہنم بن جائے گا۔ (مستفاد من المظهری والقرطبی) [4]

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ اِنْكِدَارٌ سے مشتق ہے، اس کے معنی سقوط اور گرنے کے ہیں، سلف سے یہی تفسیر منقول ہے، اور مراد یہ ہے کہ آسمان کے سب ستارے سمندر میں گر پڑیں گے، جیسا کہ مذکورہ روایات میں اس کی تفصیل آ چکی ہے۔

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ یہ عرب کی عادت کے مطابق بطور مثال کے فرمایا ہے، کیونکہ اس کے پہلے مخاطب عرب لوگ تھے، ان کے نزدیک دس مہینے کی گابھن اُونٹنی ایک بڑی دولت سمجھی جاتی تھی کہ اُس سے دُودھ اور بچے کا اِنتظار ہوتا تھا، اور وہ اُس کی دُم سے لگے پھرتے تھے، کسی وقت اُس کو آزاد نہ چھوڑتے تھے۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ سُجِّرَتْ، تَسْجِيْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنی آگ لگانے اور بھڑکانے کے بھی آتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں، اور اس کے معنی بھر دینے کے بھی آتے ہیں، اور گڈمڈ، خلط ملط کر دینے کے بھی، بعض ائمۂ تفسیر نے یہی معنی لئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ پہلے سمندر اور میٹھے دریاؤں کے پانی خلط ملط بھی ہو جائیں گے اور زیادہ بھی، پھر شمس وقمر اور ستاروں کو اُس میں ڈال دیا جائے گا، پھر اس تمام پانی کو آگ بنا دیا جائے گا، جو جہنم میں شامل ہو جائے گا۔ (مظہری) [5]

وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ یعنی جب کہ حاضرینِ محشر کے جوڑے جوڑے اور جتھے بنا دیئے جائیں گے، یہ جتھے اور

[1] صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر بحسبان ج:۱ ص:۴۵۴

[2] مسند البزار، مسند انس بن مالك رضي الله عنه، رقم الحديث: ۶۶۹۲

[3] تفسير ابن ابي حاتم، تفسير سورة التّكوير، رقم الحديث: ۱۹۱۵۷

[4] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۲۰۴، وتفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۹ ص:۲۲۷

[5] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۲۰۵

جماعتیں ایمان وعمل کے اعتبار سے ہوں گے کہ کافر ایک جگہ، مؤمن ایک جگہ، پھر کافر ومؤمن میں بھی اعمال وعادات کا فرق ہوتا ہے، ان کے اعتبار سے کفار میں بھی مختلف قسم کے گروہ ہو جائیں گے، اور مسلمانوں میں بھی یہ گروہ عقیدے اور عمل میں اشتراک کی بنا پر ہوں گے، جیسا کہ بیہقی نے بروایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے ہوں گے، وہ ایک جگہ کر دیئے جائیں گے، اعمالِ حسنہ ہوں یا سیئہ۔ [۱] مثلاً اچھے مسلمانوں میں علمِ دِین کی خدمت کرنے والے علماء ایک جگہ، عبّاد وزُہّاد ایک جگہ، جہاد کرنے والے غازی ایک جگہ، صدقہ خیرات میں خصوصیت رکھنے والے ایک جگہ۔ اسی طرح بداَعمال لوگوں میں چور، ڈاکو ایک جگہ، زِنا کار فحاش ایک جگہ، دُوسرے خاص خاص گناہوں میں باہم شریک رہنے والے ایک جگہ ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں ہر شخص اپنی قوم کے ساتھ ہوگا، (مگر یہ قومیت نسبی یا وطنی نہیں، بلکہ عمل وعقیدے کے اعتبار سے ہوگی) نیک عمل کرنے والے ایک جگہ، بدعمل والے دُوسری جگہ ہوں گے، اور اس پر آیتِ قرآنی سے اِستشہاد فرمایا وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ (الواقعة) [۲] یعنی محشر میں لوگوں کے بڑے بڑے گروہ تین ہوں گے جیسا کہ سورۂ واقعہ کی آیت میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے کہ ایک گروہ سابقینِ اوّلین کا ہوگا، دُوسرا اَصحاب الیمین کا، یہ دونوں گروہ نجات پانے والے ہوں گے، تیسرا گروہ اصحاب الشمال کا ہوگا جو کفار فجار پر مشتمل ہوگا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ مَوْءٗدَةٌ وہ لڑکی جس کو زِندہ دفن کر دیا گیا، جیسا کہ جاہلیتِ عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لئے موجبِ عار سمجھتے تھے، اور زِندہ ہی اس کو دفن کر دیتے تھے، اسلام نے یہ رسم بد مٹائی، اس آیت میں قیامت ومحشر کے حالات کے بیان میں ارشاد ہوا کہ جب اُس لڑکی سے سوال کیا جائے گا جس کو زِندہ درگور کر کے مار دِیا گیا تھا، ظاہر الفاظ سے یہ ہے کہ یہ سوال خود اس لڑکی سے ہوگا، اُس سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مقصود اس سے سوال کرنے کا یہ ہے کہ یہ اپنی بے گناہی اور مظلوم ہونے کی پوری فریاد بارگاہِ ربّ العزّت میں پیش کرے تا کہ اُس کے قاتلوں سے اِنتقام لیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ مَوْءٗدَةٌ لڑکی کے بارے میں اس کے قاتلوں سے سوال کیا جائے گا کہ اس کو تم نے کس جرم میں کیا۔

فائدہ مہمہ

یہاں بہرحال ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا تو نام ہی یوم الحساب، یوم الجزاء، یوم الدین ہے، اس میں تو ہر شخص سے اس کے اعمال کا محاسبہ اور سوال ہوں گے، اس جگہ خصوصی احوال اور اہوالِ قیامت کے سلسلے میں خاص مَوْءٗدَةٌ

[۱] مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث: ۳۴۴۹۲، والمستدرك للحاكم، رقم الحدیث: ۳۹۲

[۲] تفسیر الدُّرّ المنثور ج:۸ ص:۴۲۵، وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۹ ص:۲۳۱

لڑکی کے معاملے میں اور اس کے متعلق سوال ہونے کو اتنی اہمیت اور خصوصیت کے ساتھ ذِکر کرنے میں کیا حکمت ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ مظلوم لڑکی جس کو خود اس کے ماں باپ نے قتل کیا ہے اس کے خون کا اِنتقام لینے کے لئے اس کی طرف سے کوئی دعویٰ کرنے والا تو ہے نہیں خصوصاً جب کہ اس کو خفیہ دفن کر دیا ہو تو کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ شہادت دے سکے، محشر کے میدان میں جو عدل وانصاف کی عدالت اِلٰہیہ قائم ہوگی، وہ ایسے مظالم کو بھی سامنے لائے گی جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے، نہ کوئی اس مظلوم کا پُرسانِ حال ہے۔ واللہ اعلم۔

چار ماہ کے بعد اِسقاطِ حمل قتل کے حکم میں ہے

مسئلہ:- بچوں کو زِندہ دفن کر دینا یا قتل کر دینا سخت گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم ہے۔ اور چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے، کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں رُوح پڑ جاتی ہے اور وہ زِندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے تو باجماعِ اُمت مارنے والے پر اس کی دِیت میں غُرّہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے، اور اگر بطن سے باہر آنے کے وقت وہ زندہ تھا، پھر مر گیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے۔ اور چار ماہ سے پہلے اِسقاطِ حمل بھی بدون اِضطراری حالات کے حرام ہے، مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے، کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتلِ صریح نہیں ہے۔ (مظہری) [۱]

مسئلہ:- کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے، جیسے آج کل دُنیا میں ضبطِ تولید کے نام سے اس کی سیکڑوں صورتیں رائج ہوگئی ہیں، اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "وَأْدِ خَفِيٌّ" فرمایا ہے، یعنی خفیہ طور سے بچے کو زِندہ درگور کر دینا۔ (كما رواه مسلم عن جذامة بنت وهب رضي الله عنها) [۲] اور بعض دُوسری روایات میں جو "عزل"، یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سکوت یا عدمِ ممانعت منقول ہے، [۳] وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے، وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لئے قطعِ نسل کی صورت نہ بنے۔ (مظہری) [۴]

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ كَشْطٌ کے لغوی معنی جانور کی کھال اُتارنے کے ہیں، بظاہر یہ حال قیامت کا نفخۂ اُولیٰ کے وقت کا ہے، جو اُس دُنیا میں پیش آئے گا کہ آسمان کی زینت جن ستاروں اور شمس وقمر سے تھی وہ سب بے نور ہو کر

[۱] تفسير المظهرى ج:۱۰ ص:۲۰۶

[۲] صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب جواز الغيلة وهى وطى المرضع وكراهة العزل ج:۱ ص:۴۶۶

[۳] صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب حكم العزل ج:۱ ص:۴۶۴

[۴] تفسير المظهرى ج:۱۰ ص:۲۰۶

دریا میں ڈال دیئے جائیں گے، آسمان کی موجودہ ہیئت بدل جائے گی، اس کو کُشِطَتْ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بعض حضراتِ مفسرین نے کَشْطٌ کے معنی لپیٹنے کے لکھے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ آسمان جو چھت کی طرح سروں پر محیط ہے، یہ لپیٹ دیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ یعنی جب قیامت کے حالاتِ مذکورہ پیش آئیں گے اُس وقت ہر انسان جان لے گا کہ وہ اپنے ساتھ کیا سامان لایا ہے۔ سامان سے مراد اُس کا نیک یا بدعمل ہے کہ وہ سب اعمال اس کے سامنے آجائیں گے جو دُنیا میں کئے تھے، خواہ اس طرح کہ صحائفِ اعمال میں لکھے ہوئے اس کے ہاتھ میں آجائیں، یا اس طرح کہ یہ اعمال کسی خاص شکل وصورت میں اس کے سامنے آئیں، جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ قیامت کے احوال اور ہولناک مناظر اور وہاں محاسبہ اعمال کا ذِکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے چند ستاروں کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ قرآن حق ہے، اللہ کی طرف سے بڑی حفاظت کے ساتھ بھیجا گیا ہے، اور جس ذات پر نازل ہوا ہے وہ ذات ایک بڑی ہستی ہے، وحی لانے والے فرشتے کو وہ پہلے سے جانتے پہچانتے تھے، اس لئے اس کے حق ہونے میں کسی شک وشبہ کی راہ نہیں۔ جن ستاروں کی قسم یہاں کھائی گئی وہ پانچ ستارے ہیں، جن کو علمِ ہیئت فلکیات میں خمسہ متحیرہ کہتے ہیں، اور متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پانچوں ستاروں کی حرکت دُنیا میں اس طرح دیکھی جاتی ہے کہ کبھی مشرق سے مغرب کی طرف چل رہے ہیں، کبھی پھر پیچھے کو مغرب سے مشرق کی طرف چلنے لگتے ہیں، اس کی وجہ کیا، اور دو مختلف حرکتوں کا سبب کیا ہے، اس کے بارے میں قدیم فلسفہ یونان والوں کے مختلف اقوال ہیں، اور جدید فلسفہ والوں کی تحقیق اُن میں سے بعض کے مطابق ہے، بعض کے خلاف، اور حقیقت کا علم پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں، سب تخمینے اور اندازے ہی ہیں، جو غلط بھی ہوسکتے ہیں، صحیح بھی۔ قرآنِ حکیم نے اُمت کو اس فضول بحث میں نہیں اُلجھایا، جتنی بات اُن کے فائدے کی تھی، وہ بتلادی کہ وہ رَبّ العزّت جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اس میں مشاہدہ کریں اور ایمان لائیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیْ قُوَّةٍ ...الخ، ستاروں کی قسم کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن قول ہے ایک رسولِ کریم کا، آگے اس رسولِ کریم کی صفت ایک تو یہ بیان فرمائی کہ وہ ذِی قوت ہے، دُوسری یہ کہ رَبّ العرش کے پاس وہ مُطَاعٍ ہے کہ اس کے اَحکام عرش والے مانتے ہیں، تیسری یہ کہ وہ اللہ کے نزدیک اَمِیْنٌ ہے، اس سے پیغام لانے اور پہنچانے میں کسی خیانت اور کمی بیشی کا اِمکان نہیں۔ اس جگہ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ سے مراد بظاہر جبریلِ امین علیہ السلام ہیں، کیونکہ لفظ ''رسول'' کا جیسے انبیاء پر اِطلاق ہوتا ہے ایسے ہی فرشتوں کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور آگے جتنی صفات ''رسول'' کی بیان کی گئی ہیں وہ سب جبریلِ امین علیہ السلام پر بغیر کسی تکلف وتأویل کے منطبق ہیں، ان کا ذِی قوت ہونا سورۂ نجم میں صراحۃً

مذکور ہے: عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ [۱] اہلِ عرش وسماوات میں اُن کا مُطَاع ہونا اور اُن کے اَحکام کی پیروی کرنا لیلۃ المعراج کی حدیث سے ثابت ہے کہ جب جبریلِ امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر آسمان پر پہنچے اور آسمانوں کے دروازے کھلوانے کا ارادہ کیا تو دروازوں پر مقرر فرشتوں نے ان کے حکم کی اطاعت کی۔ اور اَمِیْن ہونا جبریل علیہ السلام کا ظاہر ہے۔ اور بعض ائمۂ تفسیر نے اس جگہ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے، اور صفاتِ مذکورہ کو کسی قدر تکلف سے آپ کی ذات پر منطبق کیا ہے، واللہ اعلم۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور کفار کے بیہودہ الزاموں کا جواب ہے وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ یہ اُن کفار کے بیہودہ اعتراض کا جواب ہے جو معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین علیہ السلام کو کھلے اُفق پر دیکھا ہے، جیسا کہ سورۂ نجم میں فرمایا: فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ [۲] اور مقصود اس کے ذِکر کرنے سے یہ ہے کہ وحی لانے والے فرشتے جبریل علیہ السلام سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوب واقف تھے، اُن کو اصلی ہیئت وصورت میں بھی دیکھ چکے تھے، اس لئے اس وحی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی مضمونِ آیات خلاصۂ تفسیر میں واضح ہو چکا ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى يَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ ۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

---

[۱] ترجمہ: ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے۔

[۲] ترجمہ: پھر وہ فرشتہ اصلی صورت پر نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ بلند کنارہ پر تھا۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَار

اٰیاتها ۱۹ ۸۲ سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ ۸۲ رکوعها ۱

سورۂ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اور اُس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْبِحَارُ

جب آسمان چِر جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں، اور جب دریا

فُجِّرَتْ ۝۳ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ

اُبل نکلیں، اور جب قبریں زیر وزبر کردی جائیں، جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا

وَاَخَّرَتْ ۝۵ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ الَّذِيْ خَلَقَكَ

اور پیچھے چھوڑا، اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے ربِّ کریم پر جس نے تجھ کو بنایا،

فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ

پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر تجھ کو برابر کیا، جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا، ہرگز نہیں، پر تم جھوٹ جانتے ہو

بِالدِّیْنِ ۙ﴿۹﴾ وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۙ﴿۱۱﴾ یَعْلَمُوْنَ

اِنصاف کا ہونا، اور تم پر نگہبان مقرّر ہیں عزت والے، عمل لکھنے والے، جانتے ہیں

مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۚۖ﴿۱۴﴾

جو کچھ تم کرتے ہو، بے شک نیک لوگ بہشت میں ہیں، اور بے شک گنہگار دوزخ میں ہیں،

یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۱۵﴾ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآىٕبِیْنَ ؕ﴿۱۶﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ

ڈالے جائیں گے اس میں انصاف کے دن، اور نہ ہوں گے اُس سے جُدا ہونے والے، اور تجھ کو کیا خبر ہے

مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ؕ﴿۱۸﴾ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ

کیسا ہے دن انصاف کا پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا جس دن کہ بھلا نہ کر سکے

نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ ۧ﴿۱۹﴾ ع ۱۹

کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی، اور حکم اُس دن اللہ ہی کا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب آسمان چر جائے گا، ﴿۱﴾ اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے، ﴿۲﴾ اور جب سمندروں کو اُبال دیا جائے گا، ﴿۳﴾ اور جب قبریں اُکھاڑ دی جائیں گی، ﴿۴﴾ اُس وقت ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ﴿۵﴾

اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے اُس پروردگار کے معاملے میں دھوکا لگا دیا ہے جو بڑا کرم والا ہے، ⑥ جس نے تجھے پیدا
کیا، پھر تجھے ٹھیک بنایا، پھر تیرے اندر اِعتدال پیدا کیا؟ ⑦ جس صورت میں چاہا، اُس نے تجھے جوڑ کر تیار کیا۔ ⑧
ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے، لیکن تم جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو، ⑨ حالانکہ تم پر کچھ نگراں (فرشتے) مقرر ہیں، ⑩ وہ معزّز لکھنے
والے ⑪ جو تمہارے سارے کاموں کو جانتے ہیں۔ ⑫ یقین رکھو کہ نیک لوگ یقیناً بڑی نعمتوں میں ہوں گے، ⑬ اور
بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہوں گے۔ ⑭ وہ اُس میں جزا و سزا کے دن داخل ہوں گے، ⑮ اور وہ اُس سے غائب نہیں
ہوسکتے۔ ⑯ اور تمہیں کیا پتہ کہ جزا و سزا کا دِن کیا چیز ہے؟ ⑰ ہاں تمہیں کیا پتہ کہ جزا و سزا کا دِن کیا چیز ہے؟ ⑱ یہ وہ دن
ہوگا جس میں کسی دوسرے کے لئے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا، اور تمام تر حکم اُس دن اللہ ہی کا چلے گا۔ ⑲

خلاصۂ تفسیر

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے (ٹوٹ کر) جھڑ پڑیں گے اور جب سب دریا (شور اور شیریں) بہ پڑیں گے (اور بہ کر ایک ہو جائیں گے، جیسا اُوپر کی سورت میں سُجِّرَتْ کی تفسیر میں بیان ہوا ہے، یہ تینوں واقعات تو نفخۂ اُولیٰ کے ہیں، آگے نفخۂ ثانیہ کے بعد کا واقعہ ہے، یعنی) اور جب قبریں اُکھاڑ دی جائیں گی (یعنی ان میں کے مُردے نکل کھڑے ہوں گے، اس وقت) ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا (اور ان واقعات کا مقتضیٰ یہ تھا کہ انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا، اس لئے آگے غفلت پر زجر و تنبیہ ہے کہ) اے انسان! تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رَبِّ کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو (انسان) بنایا، پھر تیرے اعضا کو دُرست کیا، پھر تجھ کو (مناسب اِعتدال پر بنایا (یعنی اعضا میں تناسب رکھا اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا، ہرگز (مغرور) نہیں (ہونا چاہئے، مگر تم اغترار سے باز نہیں آتے) بلکہ (اس درجہ اغترار میں بڑھ گئے ہو کہ) تم (خود) جزا و سزا (ہی) کو (جس سے یہ غرور اور فریب دفع ہوسکتا تھا) جھٹلاتے ہو اور (یہ جھٹلانا تمہارا خالی نہ جائے گا، بلکہ ہماری طرف سے) تم پر (تمہارے سب اعمال کے) یاد رکھنے والے (جو ہمارے نزدیک) معزز (اور تمہارے اعمال کے) لکھنے والے (ہیں) مقرّر ہیں جو تمہارے سب افعال کو جانتے ہیں (اور لکھتے ہیں پس قیامت میں یہ سب اعمال پیش ہوں گے جن میں تمہاری یہ تکذیب اور کفر بھی ہے، اور سب پر مناسب جزا ملے گی، جس کی تفصیل آگے ہے کہ) نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بدکار (یعنی کافر) لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے، روزِ جزا کو اس میں داخل ہوں گے اور (پھر داخل ہو کر) اس سے باہر

نہ ہوں گے (بلکہ اس میں خلود ہوگا) اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ روزِ جزا کیسا ہے (اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ) آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روزِ جزا کیسا ہے (مقصود اس استفہام سے تہویل ہے، آگے جواب ہے کہ) وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے نفع کے لئے کچھ بس نہ چلے گا، اور تمام تر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہوگی۔

معارف و مسائل

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝ یعنی جب قیامت کے وہ حالات پیش آچکیں گے جن کا ذکر شروع سورت میں کیا گیا ہے، آسمان کا پھٹنا، ستاروں کا جھڑ جانا، سب شور و شیریں دریاؤں کا ایک ہو جانا، قبروں سے مُردوں کا اُٹھنا، اُس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اُس نے کیا آگے بھیجا کیا پیچھے چھوڑا آگے بھیجنے سے مراد اس پر عمل کر لینا ہے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد ترکِ عمل ہے، تو قیامت کے دن ہر شخص جان لے گا کہ اُس نے نیک و بد کیا کیا عمل کر لئے اور نیکی یا بدی میں سے کیا چھوڑ دی تھی اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آگے بھیجے ہوئے اعمال سے مراد وہ عمل ہوں جو اُس نے خود کئے، خواہ نیک ہوں یا بد، اور پیچھے چھوڑنے سے مراد وہ عمل ہوں جن کو اس نے خود تو نہیں کیا، لیکن اس کی رسم دُنیا میں ڈال گئے۔ اگر وہ نیک کام ہیں تو اُن کا ثواب ان کو ملتا رہے گا، اور بُرے ہیں تو اس کی بُرائی اُس کے اعمال نامے میں لکھی جاتی رہے گی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھی سنت اور طریقہ جاری کرایا، اس کا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہے گا، اور جس نے کوئی بُری رسم اور گناہ کا کام دُنیا میں جاری کر دیا تو جب تک لوگ اس بُرے کام میں مبتلا ہوں گے، اس کا گناہ اس شخص کے لئے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ [1] یہ مضمون پہلے بھی آیت: يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳ (القیامۃ) کے تحت میں گزر چکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ، اس سے پہلی آیات میں معاد اور انجام یعنی قیامت کے ہولناک معاملات کا ذکر فرمایا، اور اس آیت میں انسان کے مبدأ یعنی تخلیق کے ابتدائی مراحل کا ذکر فرمایا، اس مجموعے کا تقاضا یہ تھا کہ انسان کچھ بھی غور و فکر سے کام لیتا تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا، اور ان کے احکام کی سرمو خلاف ورزی نہ کرتا، مگر انسان غفلت اور بھول میں پڑ گیا، اس پر بطور زجر و تنبیہ کے یہ سوال فرمایا کہ اے انسان! تیری ابتدا و انتہا کے یہ حالات سامنے ہونے کے باوجود تجھے کس چیز نے بھول اور دھوکے میں ڈالا کہ اللہ کی نافرمانی کرنے لگا۔

یہاں بیان مبدأ یعنی تخلیقِ انسانی کے ابتدائی مراحل کے ذکر میں پہلے فرمایا خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ یعنی اللہ تعالیٰ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب العلم، باب من سَنّ سُنَّةً حسنةً ...إلخ، ج:۲ ص:۳۴۱

نے تجھے پیدا کیا، اور صرف پیدا ہی نہیں کر دیا بلکہ تیرے وجود اور تمام اعضا کو ایک خاص مناسبت کے ساتھ دُرست کر کے بنایا، ہر عضو کو اس کے مناسب جگہ دی، ہر عضو کی جسامت اور طول وعرض کو ایک تناسب سے بنایا کہ ذرا اس سے مختلف ہو جائے تو اعضائے انسانی کے وہ فوائد باقی نہ رہیں جو اس کی موجودہ صورت میں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: فَعَدَلَكَ ۞ یعنی تیرے وجود کو ایک خاص اعتدال بخشا، جو دُنیا کے کسی دُوسرے جاندار میں نہیں، اعضا کے تناسب کے اعتبار سے بھی اور مزاج وطبیعت کے اعتبار سے بھی کہ اگرچہ انسان کی تخلیق میں متضاد اور مختلف مواد شامل ہیں، خون، بلغم، سوداء، صفراء، کوئی گرم، کوئی سرد، مگر حکمتِ ربانی نے ان متضاد چیزوں سے ایک معتدل مزاج تیار کر دیا، اس کے بعد ایک تیسری خصوصیت بیان فرمائی:

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ۞ یعنی باوجود اس کے کہ تخلیق سب انسانوں کی ایک خاص وضع اور ہیئت اور مزاج پر ہونے کی وجہ سے سب میں اشتراک ہے، اس کا نتیجہ بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب ایک ہی شکل وصورت کے ہوتے، باہمی امتیاز دُشوار ہو جاتا، مگر حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ نے کروڑوں بلکہ اربوں، پدموں انسانوں کی شکل وصورت میں ایسے امتیازات پیدا فرما دیئے جو ایک دُوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتے، صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے۔

انسان کی ابتدائی تخلیق کے یہ کمالاتِ قدرت بیان فرما کر ارشاد فرمایا: مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۞ کہ اے غافل انسان! جس پروردگار نے تیرے وجود میں ایسے ایسے کمالات ودیعت فرمائے، اُس کے معاملے میں تو نے کیونکر دھوکا اور فریب کھایا کہ اُسی کو بھول بیٹھا، اُس کے احکام کی نافرمانی کرنے لگا، تجھے تو خود تیرے جسم کا جوڑ جوڑ اللہ کی یاد دِلانے اور اُس کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا، پھر یہ بھول اور غفلت، یہ غرور اور دھوکا کیسے لگا اس جگہ ربّ کی صفت کریم ذِکر کر کے اس کے جواب کی طرف بھی اِشارہ کر دیا کہ انسان کے بھول اور دھوکے میں پڑنے کا سبب حق تعالیٰ کا کریم ہونا ہے کہ وہ اپنے لطف وکرم سے انسان کے گناہ پر فوراً سزا نہیں دیتا، بلکہ اس کے رزق اور عافیت اور دُنیوی آسائش میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا، یہ لطف وکرم اس کے غرور اور دھوکے کا سبب بن گیا، حالانکہ ذرا عقل سے کام لیتا تو یہ لطف وکرم، غرور وغفلت کا سبب بننے کے بجائے اور زیادہ اپنے ربِّ کریم کے احسانات کا ممنون ہو کر اطاعت میں لگ جانے کا سبب ہونا چاہئے تھا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ”كَمْ مِنْ مَغْرُوْرٍ تَحْتَ السِّتْرِ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ“ [1] یعنی کتنے ہی انسان ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈالا ہوا ہے، اُن کو رُسوا نہیں کیا، وہ اس لطف وکرم سے اور زیادہ غرور اور دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔

[1] تفسیر القرطبی (باختلاف النسبة) ج:۱۹ ص:۲۴۶

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴿۱۴﴾ اس کا تعلق اُس جملے سے ہے، جو پہلے گزر چکا یعنی عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ کہ قیامت کے روز ہر اِنسان کو اپنا اپنا عمل سامنے آجائے گا۔ اس جملے میں اس عمل کی سزا و جزا کا ذِکر ہے کہ اِطاعت شعار اَبرار تو اس روز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں مسرور ہوں گے اور سرکش نافرمان جہنم کی آگ میں۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ﴿۱۶﴾ یعنی جہنمی لوگ کسی وقت جہنم سے غائب نہ ہوسکیں گے کیونکہ اُن کے لئے خلود اور دائمی عذاب کا حکم ہے: یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا یعنی کوئی شخص باختیارِ خود کسی دُوسرے کو محشر میں کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا، نہ کسی کی تکلیف کو کم کرسکے گا، اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی، کیونکہ شفاعت کسی کی اپنے اِختیار سے نہ ہوگی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کی شفاعت کی اجازت نہ دیں، اس لئے اصل حکم کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ ہی اپنے فضل سے کسی کو شفاعت کی اجازت دے دے، اور پھر شفاعت قبول فرمالے تو وہ بھی اُسی کا حکم ہے۔ واللہ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ بِحَمْدِ اللهِ لَیْلَةَ الْاَرْبِعَاء ۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْن

اٰیاتها ۳۶ | ۸۳ سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ ۸۶ | رکوعها ۱

سورۂ مطفّفین مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چھتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲

خرابی ہے گھٹانے والوں کی، وہ لوگ کہ جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں،

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ

اور جب ماپ کر دیں اُن کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں، کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ اُن کو

مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

اُٹھنا ہے اس بڑے دن کے واسطے جس دن کھڑے رہیں لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی،

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۞ ۷ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۞ ۸

ہرگز نہیں، بے شک اعمال نامہ گنہگاروں کا سجّین میں ہے، اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجّین

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۞ ۹ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞ ۱۰ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ

ایک دفتر ہے لکھا ہوا، خرابی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کی، جو جھوٹ جانتے ہیں

بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۞ ۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۞ ۱۲ اِذَا تُتْلٰى

انصاف کے دن کو، اور اس کو جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے، جب سنائے

عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۞ ۱۳ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

اس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں پہلوں کی، کوئی نہیں، پر زنگ پکڑ گیا ہے اُن کے دِلوں پر

مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۞ ۱۴ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۞ ۱۵

جو وہ کماتے تھے، کوئی نہیں، وہ اپنے رَبّ سے اُس دن روک دیئے جائیں گے،

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۞ ۱۶ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ

پھر مقرّر وہ گرنے والے ہیں دوزخ میں، پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کو تم

تُكَذِّبُوْنَ ۞ ۱۷ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۞ ۱۸ وَمَآ اَدْرٰىكَ

جھوٹ جانتے تھے، ہرگز نہیں، بے شک اعمال نامہ نیکوں کا علّیین میں ہے، اور تجھ کو کیا خبر ہے

مَا عِلِّيُّوْنَ ۞ ۱۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۞ ۲۰ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۞ ۲۱ اِنَّ الْاَبْرَارَ

کیا ہے علّیین ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اُس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے، بے شک نیک لوگ ہیں

لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ

آرام میں، تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے، پہچان لے تو اُن کے منہ پر

نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ

تازگی آرام کی، اُن کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی، جس کی مہر جمتی ہے مشک پر،

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾

اور اُس پر چاہئے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے، اور اُس کی ملونی ہے تسنیم سے،

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا

وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے، وہ لوگ جو گنہگار ہیں تھے

مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾

ایمان والوں سے ہنسا کرتے، اور جب ہوکر نکلتے ان کے پاس کو تو آپس میں آنکھیں مارتے،

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا

اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے، اور جب اُن کو دیکھتے کہتے

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ

بے شک یہ لوگ بہک رہے ہیں، اور اُن کو بھیجا نہیں اُن پر نگہبان بنا کر، سو آج

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں، تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں،

ع ۸

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع

اب بدلہ پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کہ کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی ﴿۱﴾ جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے خود کوئی چیز ناپ کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، ﴿۲﴾ اور جب وہ کسی کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ ﴿۳﴾ کیا یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اُنہیں ایک بڑے زبردست دن میں زندہ کرکے اُٹھایا جائے گا؟ ﴿۴﴾ و ﴿۵﴾ جس دن سب لوگ رَبّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ﴿۶﴾ ہرگز ایسا نہیں چاہئے! یقین جانو کہ بدکار لوگوں کا اعمال نامہ سجّین میں ہے ﴿۷﴾ اور تمہیں کیا معلوم کہ سجّین (میں رکھا ہوا اعمال نامہ) کیا چیز ہے؟ ﴿۸﴾ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ﴿۹﴾ اُس دن بڑی خرابی ہوگی حق کو جھٹلانے والوں کی، ﴿۱۰﴾ جو جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔ ﴿۱۱﴾ اور اُس دن کو وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے گذرا ہوا گنہگار ہو، ﴿۱۲﴾ اُسے جب ہماری آیتیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہوں تو وہ کہتا ہو کہ: "یہ تو پچھلے لوگوں کے افسانے ہیں۔" ﴿۱۳﴾ ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں، اُس نے اِن کے دِلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔ ﴿۱۴﴾ ہرگز نہیں! حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس دن اپنے پروردگار کے دیدار سے محروم ہوں گے۔ ﴿۱۵﴾ پھر ان کو دوزخ میں داخل ہونا پڑے گا۔ ﴿۱۶﴾ پھر کہا جائے گا کہ: "یہ ہے وہ چیز جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے!" ﴿۱۷﴾ خبردار! نیک لوگوں کا اعمال نامہ علّیّین میں ہے۔ ﴿۱۸﴾ اور تمہیں کیا معلوم کہ علّیّین (میں رکھا ہوا اعمال نامہ) کیا چیز ہے؟ ﴿۱۹﴾ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے ﴿۲۰﴾ جسے مقرّب فرشتے دیکھتے ہیں ﴿۲۱﴾ یقین جانو کہ نیک لوگ بڑی نعمتوں میں ہوں گے۔ ﴿۲۲﴾ آرام دہ نشستوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ﴿۲۳﴾ اُن کے چہروں پر نعمتوں میں رہنے سے جو رونق آئے گی، تم اُسے صاف پہچان لوگے۔ ﴿۲۴﴾ اُنہیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی، ﴿۲۵﴾ اُس کی مہر بھی مشک ہی مشک ہوگی۔ اور یہی وہ چیز ہے جس پر للچانے والوں کو بڑھ چڑھ کر للچانا چاہئے۔ ﴿۲۶﴾ اور اُس شراب میں تسنیم کا پانی ملا ہوا ہوگا، ﴿۲۷﴾ جو ایک ایسا چشمہ ہے کہ جس سے اللہ کے مقرّب بندے پانی پئیں گے۔ ﴿۲۸﴾ جو لوگ مجرم تھے، وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے۔ ﴿۲۹﴾ اور جب اُن کے پاس سے گذرتے تھے تو ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اِشارے کرتے تھے۔ ﴿۳۰﴾ اور جب اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاتے تھے، تو دِل لگی کرتے ہوئے

جاتے تھے۔ (۳۱) اور جب ان (مؤمنوں) کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں، (۳۲) حالانکہ ان کو ان مسلمانوں پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔ (۳۳) آخر ہوگا یہ کہ آج ایمان لانے والے کافروں پر ہنس رہے ہوں گے، (۳۴) آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے (۳۵) کہ کافر لوگوں کو واقعی اُن کاموں کا بدلہ مل گیا جو وہ کیا کرتے تھے۔ (۳۶)

خلاصۂ تفسیر

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کر لیں تو پورا لے لیں، اور جب اُن کو ناپ کر، یا تول کر دیں تو گھٹا دیں (گو لوگوں سے اپنا حق پورا لینا مذموم نہیں ہے، مگر اس کے ذِکر کرنے سے مقصود خود اس پر مذمت کرنا نہیں ہے، بلکہ کم دینے پر مذمت کی تاکید وتقویت ہے، یعنی کم دینا اگرچہ فی نفسہٖ مذموم ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر دُوسروں کی ذرا رعایت نہ کی جائے تو اور زیادہ مذموم ہے، بخلاف رعایت کرنے والے کے کہ اگر اس میں عیب ہے تو ایک ہنر بھی ہے، اس لئے اوّل شخص کا عیب اشد ہے، اور چونکہ اصل مقصود مذمت ہے کم دینے کی اس لئے اس میں ناپ اور تول دونوں کا ذِکر کیا تا کہ خوب تصریح ہو جائے کہ ناپنے میں بھی کم دیتے ہیں اور تولنے میں بھی کم دیتے ہیں، اور چونکہ پورا لینا فی نفسہٖ مدارِ مذمت کا نہیں اس لئے وہاں ناپ اور تول دونوں کا ذِکر نہیں گیا، بلکہ ایک ہی کا ذِکر کیا، پھر تخصیص ناپ کی شاید اس لئے ہو کہ عرب میں زیادہ دستور کیل کا تھا، خصوصاً اگر آیت مدنی ہو جیسا ''رُوح المعانی'' میں بروایت نسائی وابنِ ماجہ وبیہقی اس کا نزول اہلِ مدینہ کے باب میں لکھا ہے، [1] تو اس وقت اس تخصیص کی وجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ مدینہ میں کیل کا دستور مکہ سے بھی زیادہ تھا، آگے ایسا کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ) کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے؟ جس دن تمام آدمی رَبّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے (یعنی اس روز سے ڈرنا چاہئے اور تطفیف یعنی لوگوں کی حق تلفی سے توبہ کرنا چاہئے، اس بعث وجزا کو سن کر جو مؤمن تھے وہ ڈر گئے اور جو کافر تھے وہ انکار کرنے لگے، اس لئے آگے انکار پر تنبیہ فرما کر فریقین کی جزا کی تفصیل فرماتے ہیں کہ جیسا کفار لوگ جزا وسزا کے منکر ہیں) ہرگز (ایسا) نہیں (بلکہ جزا وسزا ضروری الوقوع ہے، جن اعمال پر جزا وسزا ہوگی وہ بھی منضبط اور محفوظ ہیں، اور اس مجموعے کا بیان یہ ہے کہ) بدکار (یعنی کافر) لوگوں کا نامۂ عمل سجّین میں رہے گا (وہ ایک

[1] السُّنن الکبریٰ للنسائی، کتاب التفسیر، سورۃ المطففین، رقم الحدیث:۱۱۵۹۰، وسنن ابن ماجۃ، ابواب التجارات، باب التوقی فی الکیل والوزن، ج:۱ ص:۱۶۰، وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۹ ص:۲۵۰

مقام ساتویں زمین میں ہے جو مقام ہے اَرواحِ کفار کا، کذا فی تفسیر ابن کثیر عن کعب رضی اللہ عنہ، وفی الدّرّ المنثور عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، ومجاهد وفرقد وقتادة رحمهم اللہ وعبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنهما مرفوعًا، [۱] اور کفار کے اعمال کا اس مقام پر رہنا بھی مجاہد و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دُرِّ منثور میں منقول ہے، آگے ڈرانے کے لئے سوال ہے کہ) اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجّین میں رکھا ہوا نامۂ عمل کیا چیز ہے؟ وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے (نشان سے مراد مہر ہے، کما فی الدّرّ المنثور [۲] عن کعب الأحبار فیختم ویوضع ای بعد الموت۔ مقصود یہ ہوگا کہ اس میں تغیر و تبدل کا کچھ اِحتمال نہیں، پس حاصل اس کا اعمال کا محفوظ ہونا ہے، جس سے جزا کا بحق ہونا ثابت ہوا، آگے ان اعمال کی جزا کا بیان ہے کہ) اس روز (یعنی قیامت کے روز) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی جو کہ روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اس (یومِ جزا) کو تو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد (عبدیت) سے گزرنے والا ہو، مجرم ہو (اور) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جائیں تو یوں کہہ دیتا ہو کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ بتلانا ہے کہ جو شخص روزِ قیامت کی تکذیب کرتا ہے، وہ معتدی، اثیم، مُکَذِّبْ بالقرآن ہے۔ آگے تکذیب روزِ جزا پر جو صراحۃً مذکور ہے تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ لوگ اس کو غلط سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ شاید ان کے پاس کوئی دلیل نفی کی ہوگی، جس سے یہ اِستدلال کرتے ہوں گے، ہرگز نہیں) بلکہ (اصل وجہ تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر اُن کے اعمالِ بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے (اس سے اِستعداد قبولِ حق کی فاسد ہوگئی اس لئے براہِ عناد اِنکار کرنے لگے۔ آگے پھر اِنکار پر زجر ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (آگے ویل کی کچھ تفصیل ہے کہ وہ خرابی یہ ہے کہ) یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے ربّ (کا دیدار دیکھنے) سے روک دیئے جائیں گے، پھر (صرف اسی پر اِکتفا نہ ہوگا بلکہ) یہ دوزخ میں داخل ہوں گے، پھر (ان سے) کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اور چونکہ یہ لوگ یومِ دِین کی تکذیب میں جس طرح اپنی سزا کو جھٹلاتے تھے اسی طرح مؤمنین کی جزا کو بھی جھٹلاتے تھے، آگے اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مؤمنین کے اجر و ثواب کے منکر ہیں) ہرگز ایسا نہیں، (بلکہ ان کا اجر و ثواب ضرور ہونے والا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) نیک لوگوں کا نامۂ عمل علّیّین میں رہے گا (وہ ایک مقام ہے ساتویں آسمان میں جو مستقر ہے اَرواحِ مؤمنین کا، کذا فی تفسیر ابن کثیر عن کعب [۳]) اور (آگے تفخیم کے لئے سوال ہے کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علّیّین میں رکھا ہوا نامۂ عمل

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۵۲، وتفسیر الدّرّ المنثور ج:۱۰ ص:۲۱۹ و ۲۲۰

[۲] تفسیر الدّرّ المنثور بحوالہ بالا (باختصار)

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۵۲

کیا چیز ہے وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے۔ جس کو مقرّب فرشتے (شوق سے) دیکھتے ہیں (اور یہ مؤمن کا بہت بڑا اِکرام ہے، جیسا کہ رُوح المعانی میں بتخریج عبد بن حمید حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ملائکہ مؤمن کی رُوح کو قبض کر کے لے جاتے ہیں تو ہر آسمان کے مقرّب فرشتے اس کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان تک پہنچ کر اس رُوح کو رکھ دیتے ہیں، پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم اس کا نامۂ اعمال دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ نامۂ عمل کھول کر دِکھلایا جاتا ہے، (مختصراً)[1] آگے ان کی جزائے آخرت کا بیان ہے کہ) نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے بہشت کے عجائب) دیکھتے ہوں گے (اے مخاطب!) تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا (اور) ان کو پینے کے لئے شرابِ خالص سربمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی، اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے (کہ حرص کے لائق یہی ہے، خواہ صرف شراب مراد لی جائے، خواہ کُل نعمائے جنت، یعنی شوق و رغبت کی چیز یہ نعمتیں ہیں، نہ کہ دُنیا کی ناقص اور فانی لذتیں اور اُن کی تحصیل کا طریق نیک اعمال ہیں، پس اس میں کوشش کرنا چاہئے) اور اس (شراب) کی آمیزش تسنیم (کے پانی سے) ہوگی (عرب عموماً شراب میں پانی ملا کر پیتے تھے تو اس شراب کی آمیزش کے لئے تسنیم کا پانی ہوگا، آگے تسنیم کی شرح ہے) یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرّب لوگ پانی پئیں گے، (مطلب یہ کہ سابقین یعنی مقرّبین کو تو خالص پینے کو اس کا پانی ملے گا، اور اصحاب الیمین یعنی اَبرار کو اس کا پانی دُوسری شراب میں ملا کر ملے گا، كذا في الدر المنثور عن قتادة ومالك ابن الحارث وابن عباس وابن مسعود وحذيفة۔[2] اور یہ مہر لگنا علامت اِکرام کی ہے، ورنہ وہاں ایسی حفاظت کی ضرورت نہیں، اور مشک کی مہر کا مطلب یہ ہے کہ جیسے قاعدہ ہے کہ لاکھ وغیرہ لگا کر اس پر مہر کرتے ہیں، اور ایسی چیز کو "طِين ختام" کہتے ہیں، وہاں شراب کے برتن کے منہ پر مشک لگا کر اس پر مہر کر دی جائے گی۔ یہاں تک فریقین کی جزائے اُخروی کا الگ الگ بیان تھا، آگے مجموعہ فریقین کا مجموعہ حال دُنیا و آخرت مذکور ہے، یعنی) جو لوگ مجرم (یعنی کافر) تھے وہ ایمان والوں سے (دُنیا میں تحقیراً) ہنسا کرتے تھے اور (ایمان والے) جب ان کافروں کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں کے اشارے کرتے تھے، (مطلب یہ کہ ان کے ساتھ استہزا و تحقیر سے پیش آتے تھے) اور جب اپنے گھروں کو جاتے تو (وہاں بھی ان کا تذکرہ کر کے) دل لگیاں (اور تمسخر) کرتے (مطلب یہ کہ غَیبت و حضور ہر حالت میں ان کی تحقیر و استہزا کا مشغلہ رہتا، البتہ حضور میں اِشارے چلا کرتے، اور غیبت میں صراحۃً تذکرہ کرتے) اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں (کیونکہ

---

[1] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۲ ص:۲۷۵

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۲۱

کفار اِسلام کو غلطی سمجھتی تھے) حالانکہ یہ (کافر) ان (مسلمانوں) پر نگرانی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (یعنی ان کو اپنی فکر کرنا چاہئے تھا، ان کے پیچھے کیوں پڑ گئے پس ان سے دو غلطیاں ہوئیں، اوّل اہلِ حق کے ساتھ اِستہزا، پھر اپنی اصلاح سے بے فکری) سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے، (دُرِّ منثور میں قتادہؒ سے منقول ہے کہ کچھ دریچے جھروکے ایسے ہوں گے جن سے اہلِ جنت اہلِ نار کو دیکھ سکیں گے، پس ان کا بُرا حال دیکھ کر بطور اِنتقام کے اُن پر ہنسیں گے، آگے تقریر ہے اس سزا کی یعنی) واقعی کافروں کو ان کے کئے کا خوب بدلہ ملا۔

معارف و مسائل

سورۂ تطفیف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول پر مکی سورت ہے، عام مصاحفِ قرآن میں اسی بنا پر اس کو مکی لکھا ہے، اور حضرت اِبنِ عباسؓ، قتادہؒ، مقاتلؒ، ضحاکؒ کے نزدیک مدنی سورت ہے، مگر اس کی صرف آٹھ آیتیں مکی ہیں۔ اِمام نسائی نے حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو دیکھا کہ مدینہ کے لوگ جن کے عام معاملات کیل یعنی ناپ کے ذریعے ہوتے تھے، وہ اس معاملے میں چوری کرنے اور کم ناپنے کے بہت عادی تھے، اس پر یہ سورت وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ نازل ہوئی۔ حضرت اِبنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی نازل ہوئی، وجہ یہ تھی کہ اہلِ مدینہ میں یہ رواج اس وقت عام تھا کہ جب خود کسی سے سودا لیتے تو ناپ تول پُورا پُورا لیتے تھے، اور جب دُوسروں کو بیچتے تو اس میں کمی اور چوری کیا کرتے تھے۔ اس سورت کے نازل ہونے پر یہ لوگ اس رسمِ بد سے باز آگئے اور ایسے باز آئے کہ آج تک اہلِ مدینہ ناپ تول پورا پورا کرنے میں معروف و مشہور ہیں (رواہ الحاکم والنسائی وابن ماجة بسند صحیح، از مظہری [1])۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ مُطَفِّفِيْنَ تَطْفِيْفٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں، اور ایسا کرنے والے کو "مُطَفِّفٌ" کہا جاتا ہے، قرآنِ حکیم کے اس اِرشاد سے ثابت ہوا کہ تطفیف کرنا حرام ہے۔

---

[1] تفسیر المظهری ج:١٠ ص:٢١٧، وابن ماجة ابواب التجارات، باب التوقی فی الکیل والوزن ج:١ ص:١٦٠، والسُّنن الکبریٰ للنسائی، کتاب التفسیر، سورة المطفّفین، رقم الحدیث: ١١٥٩٠، والمستدرك للحاکم، کتاب التفسیر، رقم الحدیث: ٢٢٤٠

تطفیف صرف ناپ تول ہی میں نہیں، بلکہ حق دار کو اُس کے حق سے کم دینا کسی چیز میں ہو تطفیف میں داخل ہے

قرآن و حدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ عام طور سے معاملات کا لین دین ان ہی دو طریقوں سے ہوتا ہے، ان ہی کے ذریعے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حق دار کا حق ادا ہو گیا یا نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ مقصود اس سے ہر ایک حق دار کا حق پورا پورا دینا ہے، اس میں کمی کرنا حرام ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر وہ چیز جس سے کسی کا حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے، اس کا یہی حکم ہے خواہ ناپ تول سے ہو یا عدد شماری سے، یا کسی اور طریقے سے، ہر ایک میں حق دار کے حق سے کم دینا بحکم تطفیف حرام ہے۔

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رُکوع سجدے وغیرہ پورے نہیں کرتا، جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے تو اُس کو فرمایا: "لَقَدْ طَفَّفْتَ" یعنی تو اللہ کے حق میں تطفیف کردی۔ فاروقِ اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: "لِكُلِّ شَيْءٍ وَفَاءٌ وَتَطْفِيفٌ"[1] یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت میں بھی، اور اسی طرح دُوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔ اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقرّرہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ مزدور، ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے، اُس میں سے وقت چُرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے، اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے، اس میں عام لوگوں میں یہاں تک کہ اہلِ علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔ اَعَاذَنَا اللهُ مِنْهُ۔

حدیث:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خَمْسٌ بِخَمْسٍ" یعنی پانچ گناہوں کی سزا پانچ چیزیں ہیں: ۱- جو شخص عہد شکنی کرتا ہے، اللہ اُس پر اُس کے دُشمن کو مسلط اور غالب کر دیتا ہے۔ ۲- جو قوم اللہ کے قانون کو چھوڑ کر دُوسرے قوانین پر فیصلے کرتے ہیں ان میں فقر و احتیاج عام ہو جاتا ہے۔ ۳- جس قوم میں بے حیائی اور زِنا عام ہو جائے، اُس پر اللہ تعالیٰ طاعون (اور دُوسرے وبائی امراض) مسلط کر دیتا ہے۔ ۴- اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگیں، اللہ تعالیٰ اُن کو قحط میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ۵- جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں

[1] موطّا مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب ما جاء في دلوك الشمس وغسق الليل، ج:۱ ص:۱۲

کرتے، اللہ تعالیٰ اُن سے بارش کو روک دیتا ہے۔ (ذکرہ القرطبی وقال: خرجه البزار بمعناه ومالك بن انس ايضًا من حديث ابن عمر رضى الله عنهما) [۱] اور طبرانی نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں مالِ غنیمت کی چوری رائج ہو جائے، اللہ تعالیٰ اُن کے دِلوں میں دُشمن کا رُعب اور ہیبت ڈال دیتے ہیں، اور جس قوم میں رِبا یعنی سودخوری کا رِواج ہو جائے، اُن میں موت کی کثرت ہو جاتی ہے، اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رِزق قطع کر دیتے ہیں، اور جو لوگ حق کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، اُن میں قتل وخون عام ہو جاتا ہے، اور جو لوگ معاہدات میں غداری کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن پر اُن کے دُشمن مسلط کر دیتا ہے۔ (رواہ مالک موقوفاً، ازمظہری) [۲]

فقر وفاقہ اور قحط وقطعِ رِزق کی مختلف صورتیں

حدیث میں جن لوگوں کا رِزق قطع کر دینے کا اِرشاد ہے، اُس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کو رِزق سے بالکل محروم کر دیا جائے، اور یہ صورت بھی قطعِ رِزق ہی میں داخل ہے کہ رِزق موجود ہوتے ہوئے وہ اُس کو کھا نہ سکے، یا استعمال نہ کر سکے، جیسے بہت سی بیماریوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیائے ضرورت مفقود ہو جائیں، اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود بلکہ کثیر ہونے کے باوجود اُن کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے، جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اور حدیث میں فقر مسلط کرنے کا اِرشاد ہے، اس کے معنی صرف یہی نہیں کہ روپیہ پیسہ اور ضرورت کی اشیاء اس کے پاس نہ رہیں، بلکہ فقر کے اصلی معنی محتاجی اور حاجت مندی کے ہیں، ہر شخص اپنے کاروبار اور ضروریاتِ زِندگی میں دُوسروں کا جتنا محتاج ہو، وہ اُتنا ہی فقیر ہے، اس زمانے کے حالات پر غور کیا جائے تو اِنسان اپنے رہن سہن اور نقل وحرکت اور اپنے اِرادوں کے پورا کرنے میں ایسے ایسے قوانین میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اُس کے لقمے اور کلمہ تک پر پابندیاں ہیں، اپنا مال موجود ہوتے ہوئے خریداری میں آزاد نہیں کہ جہاں سے چاہے کچھ خریدے، سفر میں آزاد نہیں کہ جب کہیں جانا چاہے چلا جائے۔ ایسی ایسی پابندیوں میں انسان جکڑا گیا ہے کہ ہر کام کے لئے دفتر گردی اور افسروں سے لے کر چپراسیوں تک کی خوشامد کئے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے، یہ سب محتاجی ہی تو ہے، جس کا دُوسرا نام "فقر" ہے۔ اس تفصیل سے وہ شبہات رفع ہو گئے جو

---

[۱] القرطبى تحت هٰذه الآية ج:۱۹ ص:۲۵۳، والمعجم الكبير، رقم الحديث:۱۰۸۳۰، ومجمع الزوائد، كتاب الزكاة، باب فرض الزكاة، رقم الحديث:۴۳۴۶

[۲] تفسير المظهرى ج:۱۰ ص:۲۱۸، وموطا مالك، كتاب الجهاد، باب ما جاء في الغلول، ج:۲ ص:۴۶۰

حدیث کے ارشاد کے متعلق ظاہری حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔

سِجِّیْنٍ اور عِلِّیِّیْنَ

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝۷، سِجِّیْنٍ بکسر سین وتشدید جیم بروزنِ سِکّین، سِجْن سے مشتق ہے، جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ سِجِّیْنٍ کے معنی دائمی قید کے ہیں، اور اَحادیث وآثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سِجِّیْنٍ ایک مقامِ خاص کا نام ہے، اور کفار فجار کی اَرواح کا مقام یہی ہے، اور اسی مقام میں ان کے اعمال نامے رہتے ہیں، جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے اعمال نامے اس جگہ میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی کتاب جامع ہو جس میں تمام دُنیا کے کفار وفجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔

یہ مقام کس جگہ ہے اس کے متعلق حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سِجِّیْنٍ ساتویں زمین کے نچلے طبقے میں ہے، اور عِلِّیِّیْنَ ساتویں آسمان میں زیرِ عرش ہے۔ (اخرجه البغوی بسنده، وأخرجه احمد وغيره، ازمظہری) [1] بعض روایاتِ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سِجِّیْنٍ کفار وفجار کی اَرواح کا مستقر ہے، اور عِلِّیِّیْنَ مؤمنینِ متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

جنت اور دوزخ کا مقام

بیہقیؒ نے ''دلائلِ نبوّت'' میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جنت آسمان میں ہے، اور جہنم زمین میں۔ [2] اور ابنِ جریرؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآنِ کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنم کو لایا جائے گا: وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ (الفجر: ۲۳) اس کا مطلب کیا ہے، جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین میں ہے، وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اُس کی آگ میں شامل ہو جائیں گے اور سب کے سامنے آجائے گی۔ جہنم کے لائے جانے کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے۔ اس طرح جن روایات میں یہ آیا ہے کہ سِجِّیْنٍ جہنم کے ایک مقام کا نام ہے، وہ بھی اس پر منطبق ہوگیا۔ (مظہری) [3] واللہ اعلم۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹، مَّرْقُوْمٌ کے معنی اس جگہ مختوم کے ہیں، یعنی مہر لگی ہوئی۔ اِمام بغویؒ اور ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۲۰، ومسند احمد، حدیث البراء بن عازب رضی الله عنه، رقم الحدیث:۱۸۵۳۴، وشعب الإیمان للبیهقیؒ، رقم الحدیث:۳۹۰، ومجمع الزوائد، کتاب الجنائز، باب السؤال فی القبر، رقم الحدیث:۴۲۶۷

[2] دلائل النُّبوّة للبیهقیؒ، رقم الحدیث:۲۲۳۷، باب ما جاء فی تحدث رسول الله صلی الله علیه وسلم، والمستدرك للحاکمؒ، رقم الحدیث:۸۶۹۸

[3] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۲۰

یہ جملہ مقام سِجِّيْنٍ کی تفسیر نہیں، بلکہ اس سے پہلے جو كِتٰبَ الْفُجَّارِ آیا ہے، اس کا بیان ہے، [1] معنی یہ ہیں کہ کفار و فجار کے اعمال نامے مہر لگا کر محفوظ کر دیئے جائیں گے کہ اُن میں کسی کمی بیشی اور تغیر کا اِمکان نہ رہے گا، اور ان کے محفوظ کرنے کی جگہ سِجِّيْنٍ ہے، یہیں کفار کی اَرواح کو جمع کر دیا جائے گا۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ ، رَانَ، رَيْنٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی زنگ اور میل کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کے دِلوں پر اُن کے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے، اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے، اسی طرح ان گناہوں کے زنگ نے اُن کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے بُرے کی تمیز ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دِل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اگر اُس نے توبہ کر لی اور اُس پر نادم ہو کر آگے اپنے عمل کو دُرست کر لیا تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اور دِل اپنی اصلی حالت پر منوّر ہو جاتا ہے، اور اگر اُس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اُس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے، اسی کا نام رَانَ ہے جو آیتِ بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ میں مذکور ہے۔ (رواہ البغوی وکذا اخرج احمد والترمذی وصحّحه والنَّسائی وابن ماجة وابن حبّان والحاکم۔ ازمظہری [2]) لفظ كَلَّا جو آیت کے شروع میں ہے، اس کو ''حرفِ ردع'' کہتے ہیں، جس کے معنی دفع کرنے اور زجر و تنبیہ کرنے کے ہیں۔ پہلی آیتوں میں کفار کی تکذیب کا ذِکر تھا کہ وہ آیاتِ قرآن کو کہانیاں کہہ کر جھٹلاتے ہیں، اس آیت میں لفظ كَلَّا سے اس پر زجر و تنبیہ ہے کہ ان جاہلوں نے اپنے گناہوں کے انبار میں مبتلا ہو کر اپنے دِلوں کی اُس نورانیت اور صلاحیت کو ختم کر دیا ہے جس سے حق و باطل پہچانا جاتا ہے اور یہ صلاحیت حق تعالیٰ ہر اِنسان کی جبلت اور فطرت میں رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کی یہ تکذیب کسی دلیل یا عقل وفہم کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے قلوب اندھے ہو چکے ہیں، اُنہیں بھلا بُرا نظر ہی نہیں آتا۔

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ یعنی قیامت کے روز یہ کفار فجار اپنے رَبّ کی زیارت سے محروم پسِ پردہ روک دیئے جائیں گے، یہ ان کے اس عمل کی سزا ہوگی کہ اُنہوں نے دُنیا میں حق کو نہیں پہچانا تو اَب اپنے رَبّ کی زیارت کے قابل نہیں رہے۔ حضرت اِمام مالک اور شافعی رحمہما اللہ نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمنین اور اولیاء اللہ کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۵۰، وتفسیر البغوی ج:۸ ص:۳۶۴

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۲۲، وتفسیر البغوی ج:۸ ص:۳۵۰، وجامع الترمذی، کتاب التفسیر، باب سورة المطفّفین ج:۲ ص:۱۷۱، وسنن ابن ماجة، ابواب الزُّهد، باب ذکر الذُّنوب، ج:۲ ص:۳۱۳، والمستدرك للحاكمؒ، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة المطفّفین، رقم الحدیث:۳۹۰۸، والسُّنن الکبریٰ للنَّسائی، رقم الحدیث:۱۱۶۵۸، وصحیح ابن حبّان، کتاب الرقائق، باب الأدعیة، رقم الحدیث:۹۳۲

حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی، ورنہ پھر کفار کے محجوب رہنے کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا۔ [1]

فائدہ

بعض اکابر علماء نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت سے حق تعالیٰ کی محبت پر مجبور ہے، اسی لئے دُنیا کے عام کفار ومشرین چاہے کتنے ہی کفر وشرک میں مبتلا ہوں اور اللہ جل شانہٗ کی ذات وصفات کے متعلق باطل عقیدے رکھتے ہوں مگر اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت سب کے دِلوں میں ہوتی ہے اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اُسی کی جستجو اور رضاجوئی کے لئے عبادتیں کرتے ہیں، راستہ غلط ہوتا ہے اس لئے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتے، مگر طلب اُسی منزلِ حق کی ہوتی ہے، وجہِ اِستدلال کی یہ ہے کہ اگر کفار میں حق تعالیٰ کی زیارت کا شوق نہ ہوتا تو اُن کی سزا میں یہ نہ کہا جاتا ہے کہ وہ زیارت سے محروم رہیں گے، کیونکہ جو شخص کسی کی زیارت کا طالب ہی نہیں، بلکہ متنفر ہے، اُس کے لئے یہ کوئی سزا نہیں کہ اُس کو اس کی زیارت سے محروم کیا جائے۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾، عِلِّيِّيْنَ بعض حضرات کے نزدیک عُلُو کی جمع ہے اور مراد اعلیٰ درجے کا عُلُو اور بلندی ہے، اور فراء کے نزدیک یہ ایک موضع کا نام ہے، وزن جمع پر آیا ہے، جمع نہیں، اور لفظ سِجِّيْنٍ کی تحقیق میں اُوپر گزر چکا ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت سے ثابت ہے کہ عِلِّيِّيْنَ ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ایک مقام ہے جس میں مؤمنین کی اَرواح اور صحائفِ اعمال رکھے جاتے ہیں۔ اور آگے جو كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ مذکور ہے، یہ بھی عِلِّيِّيْنَ کی تفسیر نہیں، بلکہ ابرار کے نامۂ اَعمال کا بیان ہے جس کا ذِکر اُوپر اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ میں آیا ہے۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ يَشْهَدُ، شُهُوْدٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی حاضر ہونے اور مشاہدہ کرنے کے آتے ہیں۔ بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اَبرار وصالحین کی کتاب الاعمال کو مقربین دیکھتے ہوں گے اور مراد مقربین سے فرشتے ہیں، اور دیکھنے سے مراد اس کی نگرانی اور حفاظت ہے، مطلب یہ ہے کہ ابرار وصالحین کے صحائفِ اعمال مقرّب فرشتوں کی نگرانی میں ہوں گے۔ (قرطبی) [2] اور شُهُوْدٌ سے مراد حضور کے معنی لئے جائیں تو يَّشْهَدُهُ کی ضمیر کتاب کے بجائے عِلِّيِّيْن کی طرف راجع ہوگی اور معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مقرّبینِ بارگاہ کی ارواح اسی مقامِ علّیّین میں حاضر ہوں گی، کیونکہ یہی مقام ان کی اَرواح کا مستقر بنایا گیا ہے جس طرح سجّین کفار کی اَرواح کا مستقر ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسیر البغوی ج:۸ ص:۳۶۵

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۲۶۴

فرمایا کہ شہداء کی اَرواح اللہ تعالیٰ کے نزدیک سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی، جو جنت کے باغات اور نہروں کی سیر کرتی ہوں گی، اور اُن کے رہنے کی جگہ قندیل ہوں گے جو عرش کے نیچے معلق ہیں۔[۱] اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کی ارواح تحت العرش رہیں گی اور جنت کی سیر کر سکیں گی، اور سورۂ یٰسٓ میں جو حبیب نجار کے واقعے میں آیا ہے: قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ،[۲] اس سے معلوم ہوا کہ حبیب نجار موت کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوگئے، اور بعض روایاتِ حدیث سے بھی اَرواحِ مؤمنین کا جنت میں ہونا معلوم ہوتا ہے،[۳] ان سب کا حاصل ایک ہی ہے کہ مستقر ان اَرواح کا ساتویں آسمان پر تحت العرش ہے، اور یہی مقام جنت کا بھی ہے، ان اَرواح کو جنت کی سیر کرنے کا اِختیار دِیا گیا ہے، اور یہاں اگرچہ یہ حال صرف مقرّبین کا ان کی اعلیٰ خصوصیت اور فضیلت کی وجہ سے بیان کیا گیا ہے، مگر درحقیقت یہی مستقر تمام مؤمنین کی ارواح کا بھی ہے، جیسا کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّمَا نسمة الْمُؤْمِن طَائِرٌ يّعلّق فِيْ شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتّٰى ترجع اِلٰى جَسَدِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مالك والنّسائى بسند صحيح)[۴]

مؤمن کی رُوح ایک پرندے کی شکل میں جنت کے درختوں میں معلق رہے گی، یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ اپنے جسم میں پھر لوٹ جائے۔

اور اسی مضمون کی ایک حدیث اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت سے مسندِ احمد اور طبرانی میں آئی ہے۔ (مظہری)[۵]

مقرِّ اَرواح یعنی موت کے بعد اِنسانی رُوحوں کا مقام کہاں ہے؟

اس معاملے میں روایاتِ حدیث بظاہر مختلف ہیں، سجّین اور علّیّین کی تفسیر میں جو رِوایات اُوپر مذکور ہوئیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اَرواحِ کفار سجّین میں رہتی ہیں جو ساتویں زمین میں ہے، اور اَرواحِ مؤمنین علّیّین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ہے، اور مذکور الصدر رِوایات میں بعض سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اَرواحِ کفار جہنم

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب بیان أنّ ارواح الشهداء فی الجنة، ج:۲ ص:۱۳۵

۲ ترجمہ: ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا۔

۳ کنز العمال، رقم الحدیث: ۴۲۶۸۹

۴ موطا مالك، کتاب الجنائز، باب جامع الجنائز، ج:۱ ص:۳۴۰، وسنن النّسائی، کتاب الجنائز، باب ارواح المؤمنین ج:۱ ص:۲۹۲

۵ تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۲۴، ومسند احمد، ومن حدیث اُمّ هانی بنت ابی طالب رضی الله عنها، رقم الحدیث:۲۷۳۸۷، والمعجم الکبیر، رقم الحدیث:۲۰۸۳۸

میں اور اَرواحِ مؤمنین جنت میں رہیں گی۔ اور بعض رِوایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین و کفار کی رُوحیں اُن کی قبروں میں رہتی ہیں، جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ جب مؤمن کی رُوح کو آسمان میں فرشتے لے جاتے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علّیّین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو، کیونکہ اس کو میں نے زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور مرنے کے بعد اُسی میں لوٹاؤں گا، اور پھر اُسی زمین سے اُن کو دوبارہ زِندہ کر کے نکالوں گا۔ اس حکم پر فرشتے اس رُوح کو قبر میں لوٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی رُوح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور یہی حکم ہوگا کہ اس کو اس کی قبر میں لوٹا دو۔ اِمام اِبنِ عبدالبر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ سب کی ارواح بعد الموت قبر ہی میں رہتی ہیں۔ ان میں پہلی اور دُوسری روایات میں جو یہ اِختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض سے اَرواحِ مؤمنین کا علّیّین میں رہنا معلوم ہوتا ہے اور بعض سے جنت میں رہنا، غور کیا جائے تو یہ کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ مقامِ علّیّین بھی ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ہے اور جنت کا بھی یہ مقام خود قرآنِ کریم کی تصریح سے ثابت ہے: عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ (النجم) [۱] اس میں تصریح ہے کہ جنت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے، اور سدرہ کا ساتویں آسمان میں ہونا حدیث سے ثابت ہے، اس لئے مقامِ اَرواح جب علّیّین ہوا تو وہ جنت کے متصل ہے، اور ان اَرواح کو جنت کے باغات کی سیر نصیب ہے، اس لئے ان کا مقام جنت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کفار کی اَرواح سجّین میں ہیں، اور وہ ساتویں زمین میں ہے، اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنم بھی ساتویں زمین میں ہے، اور اہلِ سجّین کو جہنم کی تپش اور اِیذائیں پہنچتی رہیں گی، اس لئے ان کا مقام جہنم میں کہہ دینا بھی صحیح ہے۔ البتہ اُوپر جس روایت میں اَرواح کا قبروں میں رہنا معلوم ہوتا ہے، بظاہر پچھلی دونوں روایتوں سے بہت مختلف ہے، اس کی تطبیق بیہقیٔ زمانہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ یہ بات کچھ بعید نہیں کہ اصل مستقر اَرواح کا علّیّین اور سجّین ہی ہوں، مگر ان اَرواح کا ایک خاص رابطہ قبروں کے ساتھ بھی قائم ہو۔ اس رابطے کی حقیقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، مگر جس طرح آفتاب ماہتاب آسمان میں ہیں، اور اُن کی شعاعیں زمین پر پڑ کر اس کو روشن بھی کر دیتی ہیں گرم بھی، اسی طرح علّیّین و سجّین کی اَرواح کا کوئی رابطۂ معنویہ قبروں سے ہو سکتا ہے، [۲] اور ان تمام اقوال کی تطبیق میں حضرت قاضی ثناء اللہؒ کی تحقیق سورۂ نازعات کی تفسیر میں ابھی گزر چکی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں، ایک جسمِ لطیف ہے جو اِنسان کے بدن میں حلول کرتا ہے، اور وہ مادّی اور عنصری جسم ہے، مگر

---

[۱] ترجمہ: سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص: ۲۲۴ و ۲۲۵، تحت ھٰذہ الآیۃ۔

لطیف ہے، نظر نہیں آتا، اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ دُوسری رُوح جوہرِ مجرّد ہے، مادّی نہیں، اور وہ رُوحِ مجرّد ہی رُوحِ اوّل کی حیات ہے، اس لئے اس کو رُوح الروح کہہ سکتے ہیں، انسان کے جسم سے تعلق تو ان دونوں قسم کی رُوحوں کا ہے، مگر پہلی قسم جسمِ انسانی کے اندر رہتی ہے اس کے نکلنے ہی کا نام موت ہے۔ دُوسری رُوح کا اس پہلی رُوح سے تعلق قریب تو ہے، مگر اس تعلق کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ مرنے کے بعد رُوحِ اوّل تو آسمانوں میں لے جائی جاتی ہے، پھر قبر میں لوٹا دی جاتی ہے، اس کا مستقر قبر ہی ہے، اسی پر عذاب وثواب ہوتا ہے، اور رُوحِ مجرّد علّیّین یا سجّین میں رہتی ہے۔ اس طرح اقوال جمع ہو گئے مستقر اَرواح کا جنت یا علّیّین میں یا اس کے بالمقابل جہنم یا سجّین میں ہونا رُوح مجرّد کے اعتبار سے ہے، اور ان کا مستقر قبر میں ہونا رُوح کی قسمِ اوّل یعنی نفس کے اعتبار سے ہے جو جسمِ لطیف ہے اور مرنے کے بعد قبر میں رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ تنافس کے معنی ہیں چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب ومحبوب چیز کے حاصل کرنے کے لئے جھپٹنا، دوڑنا تا کہ دُوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کر لیں۔ یہاں جنت کی نعمتوں کا ذِکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب ومطلوب سمجھ کر اُن کے حاصل کرنے میں دُوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو، یہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصودِ زِندگی سمجھ کر اُن کے لئے مسابقت کرو، بلکہ ان میں تو اگر قناعت وایثار سے کام لے کر یہ سمجھ لو کہ یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل ہی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں، ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے، البتہ تنافس اور مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ؎

یہ کہاں کا فسانہ ہے سود وزیاں، جو گیا سو گیا جو ملا سو ملا

کہو ذہن سے فرصتِ عمر ہے کم، جو دِلا تو خدا ہی کی یاد دِلا

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ ان آیات میں حق تعالیٰ نے اہلِ حق کے ساتھ اہلِ باطل کے طرزِ عمل کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ کفار اہلِ باطل، مؤمنین اہلِ حق پر اِستہزاء ہنستے اور دِل لگی کرتے ہیں، اور جب اہلِ حق اُن کے سامنے آتے ہیں تو یہ لوگ آپس میں ایک دُوسرے کو آنکھ کے اِشارے کرتے ہیں جس سے مقصود بھی ان کی اِستہزا اور ایذا رسانی ہوتی ہے۔ پھر جب یہ کفار اہلِ باطل اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹتے ہیں تو مؤمنین کے ساتھ جو تمسخر اور اِستہزا کیا ہے، اس کا باہم تذکرہ مزے لے کر کرتے ہیں کہ ہم نے خوب ان لوگوں کو ذلیل کیا۔ اور جب یہ کفار مؤمنین کو دیکھتے

ہیں تو بظاہر ہمدردی کے لہجے میں اور درحقیقت تمسخر کے لئے یہ کہتے ہیں کہ یہ بیچارے بڑے سادہ لوح بے وقوف ہیں، ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گمراہ کردیا ہے۔

آج کل کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت وہ لوگ جو کچھ نئی تعلیم کی نحوست سے دِین و آخرت سے بے فکر ہو چکے ہوتے ہیں، خدا اور رسول پر اِیمان برائے نام رہ جاتا ہے، وہ علماء و صلحاء کے ساتھ بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں، حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس عذابِ الیم سے نجات عطا فرمائیں، مؤمنینِ صالحین کے لئے اس آیت میں تسلی کا کافی سامان ہے کہ اُن کے ہنسنے کی پروانہ کریں، کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہنسے جانے سے جب تک ہم ڈریں گے زمانہ ہم پہ ہنستا ہی رہے گا

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّطْفِيْف، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَيْلَةَ يَوْمِ الْإِثْنَيْنِ ۱۲/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

اٰیاتہا ٢٥ ﴿٨٤ سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ ٨٣﴾ رکوعہا ١

سورۂ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچّیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿١﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿٢﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رَبّ کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے، اور جب زمین

مُدَّتْ ﴿٣﴾ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿٤﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿٥﴾

پھیلا دی جائے اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے، اور سن لے حکم اپنے رَبّ کا اور وہ زمین اسی لائق ہے،

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿٦﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ

اے آدمی تجھ کو تکلیف اُٹھانی ہے اپنے رَبّ تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر پھر اس سے ملنا ہے، سو جس کو ملا

كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

اعمال نامہ اس کا داہنے ہاتھ میں، تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب، اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس

مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَاۗءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا

خوش ہوکر، اور جس کو ملا اس کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے، سو وہ پکارے گا

ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ

موت موت، اور پڑے گا آگ میں، وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم، اُس نے خیال کیا تھا

معانقۃ ۷

اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَآ اُقْسِمُ

کہ پھر کر نہ جائے گا، کیوں نہیں، اُس کا ربّ اُس کو دیکھتا تھا، سو قسم کھاتا ہوں

بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا

شام کی سُرخی کی، اور رات کی اور جو چیزیں اس میں سمٹ آتی ہیں، اور چاند کی جب پورا اُبھر جائے، کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی

عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ

پر سیڑھی، پھر کیا ہوا ہے اُن کو جو یقین نہیں لاتے اور جب پڑھئے اُن کے پاس قرآن

السجدۃ ۱۳

لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

وہ سجدہ نہیں کرتے، اُوپر سے اور یہ کہ منکر جھٹلاتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو

يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

اندر بھر رکھتے ہیں، سو خوشی سنادے اُن کو عذابِ دردناک کی، مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کام کئے

الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾ ع

۱/۹ ع ۲۵

بھلے اُن کے لئے ثواب ہے بے انتہا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب آسمان پھٹ پڑے گا، ﴿۱﴾ اور وہ اپنے پروردگار کا حکم سن کر مان لے گا، اور اُس پر لازم ہے کہ یہی کرے، ﴿۲﴾ اور جب زمین کو کھینچ دیا جائے گا، ﴿۳﴾ اور اُس کے اندر جو کچھ ہے، وہ اُسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہوجائے گی، ﴿۴﴾ اور وہ اپنے پروردگار کا حکم سن کر مان لے گی، اور اُس پر لازم ہے کہ یہی کرے، (اُس وقت انسان کو اپنا انجام معلوم ہوجائے گا) ﴿۵﴾ اے انسان! تو اپنے پروردگار کے پاس پہنچنے تک مسلسل کسی محنت میں لگا رہے گا، یہاں تک کہ اُس سے جا ملے گا۔ ﴿۶﴾ پھر جس شخص کو اُس کا اعمال نامہ اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ﴿۷﴾ اُس سے تو آسان حساب لیا جائے گا، ﴿۸﴾ اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوشی مناتا ہوا واپس آئے گا، ﴿۹﴾ لیکن وہ شخص جس کو اُس کا اعمال نامہ اُس کی پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا، ﴿۱۰﴾ وہ موت کو پکارے گا، ﴿۱۱﴾ اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا، ﴿۱۲﴾ پہلے وہ اپنے گھر والوں کے درمیان بہت خوش رہتا تھا، ﴿۱۳﴾ اُس نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر (اللہ کے سامنے) نہیں جائے گا۔ ﴿۱۴﴾ بھلا کیوں نہیں؟ اُس کا پروردگار اُسے یقینی طور پر دیکھ رہا تھا۔ ﴿۱۵﴾ اب میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، ﴿۱۶﴾ اور رات کی اور اُن تمام چیزوں کی جنہیں وہ سمیٹ لے، ﴿۱۷﴾ اور چاند کی جب وہ بھر کر پورا ہوجائے، ﴿۱۸﴾ کہ تم سب ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف چڑھتے جاؤ گے۔ ﴿۱۹﴾ پھر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے؟ ﴿۲۰﴾ اور جب اُن کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے؟ ﴿۲۱﴾ بلکہ یہ کافر لوگ حق کو جھٹلاتے ہیں، ﴿۲۲﴾ اور جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں، اللہ کو خوب معلوم ہے۔ ﴿۲۳﴾ اب تم انہیں ایک دردناک عذاب کی 'خوشخبری' سنادو۔ ﴿۲۴﴾ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن کو ایسا ثواب ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ﴿۲۵﴾

خلاصۂ تفسیر

جب (نفخۂ ثانیہ کے وقت) آسمان پھٹ جائے گا (تاکہ اس میں سے غمام یعنی بادل کی شکل کی ایک چیز کا نزول

ہو جس میں فرشتے ہوں گے، جس کا ذِکر پارۂ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ (الفرقان:۲۱)، آیت وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ... اِلخ [1] (الفرقان:۲۵) میں ہے) اور اپنے رَبّ کا حکم سن لے گا (اور مان لے گا، یہاں حکم سے مراد حکمِ تکوینی اِنشقاق کا ہے، اور ماننے سے مراد اس کا وقوع ہے) اور وہ (آسمان بوجہ محکوم قدرت ہونے کے) اسی لائق ہے (کہ جس امر کی مشیت اس کے متعلق ہو اس کا وقوع ضرور ہو جائے)، اور جب زمین کھینچ کر بڑھادی جائے گی (جس طرح چمڑا یا ربڑ کھینچا جاتا ہے، پس اس وقت کی مقدار سے اُس وقت مقدار زیادہ ہو جائے گی تاکہ سب اوّلین وآخرین اُس میں سما جائیں جیسا دُرِّ منثور میں بسند جید حاکم کی روایت سے مرفوعاً وارِد ہے: تُمَدُّ الْاَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَدَّ الْاَدِيْمِ ...اِلخ، [2] پس آسمان کا یہ اِنشقاق اور زمین کا اِمتداد دونوں حسابِ محشر کے مقدمات میں سے ہیں) اور (وہ زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مُردوں کو) باہر اُگل دے گی اور (سب مُردوں سے) خالی ہو جائے گی اور (وہ زمین) اپنے رَبّ کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے (اس کی تفسیر بھی مثلِ سابق ہے، بس اس وقت انسان اپنے اعمال کو دیکھے گا جیسا آگے ارشاد ہے کہ) اے انسان! تو اپنے رَبّ کے پاس پہنچنے تک (یعنی مرنے کے وقت تک) کام میں کوشش کر رہا ہے (یعنی کوئی نیک کام میں لگا ہوا ہے، کوئی بُرے کام میں) پھر (قیامت میں) اُس (کام کی جزا) سے جا ملے گا تو (اس روز) جس شخص کا نامۂ اَعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا، سو اس سے آسان حساب لیا جائے گا، اور وہ (اس سے فارغ ہو کر) اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا (آسان حساب کے مراتب مختلف ہیں، ایک یہ کہ اس پر بالکل عذاب مرتب نہ ہو، بعض کے لئے تو یہ ہوگا، اور حدیث میں اسی کی تفسیر یہ آئی ہے کہ جس حساب میں مناقشہ (خوردہ گیری) نہ ہو، صرف پیشی ہو جائے، اور یہ اُن کے لئے ہوگا جو بلا کسی عذاب کے نجات پائیں گے۔ دُوسرا یہ کہ اُس پر عذاب دائمی نہ ہو، اور یہ عام مؤمنین کے لئے ہوگا، اور مطلق عذاب اس کے منافی نہیں) اور جس شخص کا نامۂ اَعمال (اس کے بائیں ہاتھ میں) اس کی پیٹھ کے پیچھے سے ملے گا (مراد اس سے کفار ہیں، اور پشت کی طرف سے ملنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اُس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں گی، تو بایاں ہاتھ بھی پشت کی طرف ہوگا۔ دُوسری صورت مجاہدؒ کا قول ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ پشت کی طرف نکال دیا جائے گا، کذا فی الدر المنثور [3]) سو وہ موت کو پکارے گا (جیسا مصیبت میں عادت ہے موت کی تمنا کرنے کی) اور جہنم میں داخل ہوگا، یہ

---

[1] ترجمہ: اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور فرشتے بکثرت اتارے جائیں گے۔

[2] تفسیر الدر المنثور، سورة الإسراء آیت:۷۱، وسنن ابن ماجة، ابواب الفتن، باب فتنة الدَّجَّال وخروج عيسى بن مريم (عليه السلام) وخروج يأجوج ومأجوج، ج:۲ ص:۲۹۵، وشعب الإيمان للبيهقيؒ، فصل فى اصحاب الكبائر من اهل القبلة ...إلخ، رقم الحديث:۲۹۸، والمستدرك، رقم الحديث:۸۷۰۱

[3] تفسير الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۲۵

شخص (دُنیا میں) اپنے متعلقین (اہل وعیال وحشم وخدم) میں خوش خوش رہا کرتا تھا، (یہاں تک کہ فرطِ خوشی میں آخرت کی تکذیب کرنے لگا تھا، جیسا کہ آگے اِرشاد ہے کہ) اُس نے خیال کر رکھا تھا کہ اُس کو (خدا کی طرف) لوٹنا نہیں ہے۔ (آگے رَدّ ہے اس گمان کا کہ لوٹنا) کیوں نہ ہوتا (آگے لوٹنے کے بعد جزا کا اِثبات ہے کہ) اس کا رَبّ اس کو خوب دیکھتا تھا (اور اس کے اعمال پر جزا دینے کے ساتھ مشیت متعلق کر چکا تھا، اس لئے جزا کا وقوع ضروری تھا) سو (اس بنا پر) میں قسم کھا کر کہتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو رات سمیٹ (کر جمع کر) لیتی ہے (مراد وہ سب جاندار ہیں جو رات کو آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے ٹھکانے میں آجاتے ہیں) اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے (یعنی بدر بن جائے، ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں) کہ تم لوگوں کو ضرور ایک حالت کے بعد دُوسری حالت پر پہنچنا ہے (یہ تفصیل ہے يَآ أَيُّهَا الْاِنْسَانُ تا فَمُلٰقِيْهِ ۝ کی، پس وہاں جنس کو خطاب تھا، یہاں جمیع افراد کو خطاب ہے، وہاں لقائے عمل کا ذِکر مجملاً فرمایا، یہاں اُس چیز کی تفصیل ہے جس سے روزِ محشر ملے گا یا اس کے سامنے آئے گی، اور وہ حالتیں ایک موت ہے، اس کے بعد اَحوالِ برزخ، اس کے بعد اَحوالِ قیامت، پھر خود اُن میں بھی تعدّد و کثرت ہے، اور ان قسموں کا مناسبِ مقام ہونا اس طرح ہے کہ رات کے اَحوال کا مختلف ہونا کہ اوّل شفق نمودار ہوتی ہے، پھر زیادہ رات آتی ہے تو سب سو جاتے ہیں، اور پھر ایک رات کا دُوسری رات سے نورِ قمر کی زیادت ونقصان میں مختلف ہونا، یہ سب مشابہ ہے اِختلافِ اَحوال بعد الموت کے، ونیز موت سے عالمِ آخرت شروع ہوتا ہے، جیسے شفق سے رات شروع ہوتی ہے، پھر عالمِ برزخ میں رہنا مشابہ لوگوں کے سو رہنے کے ہے، اور چاند کا پورا ہونا بعد محاق کے مشابہ ہے حیاتِ قیامت کے بعد فنائے عالم کے) سو (باوجود ان مقتضیات خوف وایمان کے اِجتماع کے) ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے اور (خود تو اِیمان اور حق کی کیا طلب کرتے ان کی عناد کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے رُوبرو قرآن پڑھا جاتا ہے تو (اس وقت بھی خدا کی طرف) نہیں جھکتے، بلکہ (بجائے جھکنے کے) یہ کافر (اور اُلٹی) تکذیب کرتے ہیں اور اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ یہ لوگ (اعمالِ بد کا ذخیرہ) جمع کر رہے ہیں سو (ان اعمالِ کفریہ کے سبب) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے، لیکن جو لوگ اِیمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اَجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں (عملِ صالح کی قید شرط کے طور پر نہیں سبب کے طریق پر ہے)۔

معارف ومسائل

اس سورت میں قیامت کے اَحوال اور حساب کتاب اور نیک وبد کی جزا وسزا کا پھر غافل انسان کو خود اس کی ذات

اور گردوپیش کے حالات میں غور کرنے اور اُن سے ایمان باللہ والقرآن تک پہنچنے کی ہدایت ہے۔ اس میں پہلے آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے، پھر زمین کا کہ جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے خواہ وہ خزائن دفائن ہوں، یا انسان کے مُردہ اجسام، وہ سب اُگل کر نکال دے گی اور محشر کے لئے ایک نئی زمین تیار ہوگی، جس میں نہ کوئی غار، پہاڑ ہوگا، نہ تعمیر اور درخت، ایک صاف سطح مستوی ہوگی، اُس کو کھینچ کر بڑھا دیا جائے گا تاکہ تمام اَوّلین و آخرین اُس پر جمع ہوسکیں، یہ بیان دُوسری سورتوں میں مختلف عنوان سے آیا ہے، یہاں ایک نئی زیادتی یہ ہے کہ آسمان اور زمین دونوں پر جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے روزِ قیامت ہوگا، اس کے متعلق فرمایا: وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝۲، اَذِنَ کے معنی ہیں سن لیا اور مراد سننے سے سن کر اطاعت کرنا ہے، اور حُقَّتْ بصیغۂ مجہول کے معنی یہ ہیں کہ حُقَّ لَهَا الْاِنْقِيَادُ، یعنی حق واجب تھا کہ وہ اللہ کے اس حکم کی اطاعت کرے۔

اَحکامِ الٰہیہ کی دو قسمیں

یہاں آسمان وزمین کی اطاعت اور تعمیل حکم کے دو معنی ہوسکتے ہیں، کیونکہ اَحکامِ الٰہیہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تشریعی اَحکام جن میں ایک قانون بتلایا جاتا ہے اور اُس کی خلاف ورزی کی سزا بتلا دی جاتی ہے، مگر کرنے والے کو اُس کی کسی جانب پر مجبورِ محض نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کو ایک درجے کا اِختیار دِیا جاتا ہے، وہ اپنے اِختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی، اور ایسے اَحکام عموماً اُن مخلوقات پر عائد ہوتے ہیں جو ذَوِی العقول کہلاتے ہیں، جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مؤمن وکافر اور مطیع ونافرمان کی دو قسمیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ دُوسری قسم اَحکام کی تکوینی اور تقدیری اَحکام ہیں، ان کی تنفیذ جبری ہوتی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ سرِمو ان کے خلاف کرسکے، ان اَحکام کی تعمیل کل مخلوقات جبراً کرتی ہے، ان میں انسان اور جن بھی داخل ہیں، تکوینی اَحکام میں اُن کے لئے جو کچھ مقدّر کردیا گیا ہے، مؤمن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاسق، سب کے سب اُسی تقدیری قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں۔

ذرّہ ذرّہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

اس جگہ یہ ہوسکتا ہے کہ آسمان وزمین کو حق تعالیٰ خاص شعور واِدراک عطا فرمادیں جو مکلّفین میں ہوتا ہے، اور جب ان کو کوئی حکم حق تعالیٰ کی طرف سے ملا، انہوں نے بہ اختیارِ خود اُس کی تعمیل اور اِطاعت کی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس حکم سے مراد حکم تکوینی لیا جائے جس میں کسی کے اِرادہ واِختیار کو دَخل ہی نہیں ہوتا، وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝۱ کے الفاظ پہلے معنی کے لئے زیادہ اقرب ہیں، دُوسرے معنی بھی بطورِ مجاز کے بن سکتے ہیں۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝۳ مَدّ کے معنی کھینچنے اور دراز کرنے کے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز زمین کو اس طرح کھینچ کر پھیلایا جائے گا جیسے چمڑے

(یا ربڑ) کو کھینچ کر بڑا کر دیا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود میدانِ حشر جو اس زمین پر ہوگا اس میں اِبتدائے دُنیا سے قیامت تک کے تمام انسان جمع ہوں گے تو صورت یہ ہوگی کہ ایک آدمی کے حصے میں صرف اتنی زمین ہوگی جس پر اس کے پاؤں ہیں۔ (رواہ الحاکم بسند جیّد، مظہری) [1]

وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ۝۴ یعنی اُگل دے گی زمین ہر اُس چیز کو جو اُس کے بطن میں ہے اور بالکل خالی ہوجائے گی، زمین کے بطن میں خزائن و دفائن اور معادن بھی ہیں، اور اِبتدائے دُنیا سے مرنے والے انسانوں کے اجسام و ذرّات بھی، زمین ایک زلزلے کے ساتھ یہ سب چیزیں اپنے بطن سے باہر نکال دے گی۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ، كَدْحٌ کے معنی کسی کام میں پوری جدوجہد اور اپنی توانائی صرف کرنے کے ہیں۔ اور اِلٰی رَبِّكَ سے مراد اِلٰی لِقَآءِ رَبِّكَ ہے، یعنی انسان کی ہر سعی وجدوجہد کی انتہا اس کے رَبّ کی طرف ہونے والی ہے۔

رُجوع الی اللہ

اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو خطاب فرما کر اس کے غور و فکر کے لئے ایک ایسی راہ دِکھائی ہے کہ اس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جدوجہد کا رُخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے، جو اس کو دُنیا و دِین میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مؤمن ہو یا کافر، اپنی فطرت سے اس کا عادی ہے کہ کچھ نہ کچھ حرکت کرے اور کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اس کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور محنت برداشت کرے، جس طرح ایک شریف نیک خو اِنسان اپنے معاش اور ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں فطری اور جائز طریقوں کو اِختیار کرتا ہے اور ان میں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے، بدکار، بدخو اِنسان بھی اپنے مقاصد کہیں بے محنت، بے جدوجہد حاصل نہیں کر سکتا۔ چور ڈاکو، بدمعاش دھوکا فریب سے لُوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو، کیسی کیسی ذہنی اور جسمانی محنت برداشت کرتے ہیں، جب اُن کو اُن کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ بتلائی کہ عاقل انسان اگر غور کرے تو اس کی تمام حرکات بلکہ سکنات بھی ایک سفر کی منزلیں ہیں، جس کو وہ غیر شعوری طور پر قطع کر رہا ہے، جس کی انتہا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری یعنی موت ہے، اِلٰی رَبِّكَ میں اسی کا بیان ہے۔ اور یہ انتہا ایسی حقیقت ہے کہ جس کا کسی کو اِنکار نہیں ہوسکتا کہ انسان کی ہر جدوجہد اور محنت موت پر ختم ہونا یقینی ہے۔ تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رَبّ کے سامنے حاضری کے وقت اس کی تمام حرکات و اعمال اور ہر جدوجہد کا حساب ہونا اَز رُوئے عقل و انصاف ضروری ہے، تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ معلوم ہوسکے، ورنہ دُنیا میں تو اس کا کوئی اِمتیاز نہیں ہوتا، ایک نیک آدمی ایک مہینہ محنت مزدوری کر کے

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۲۸، والمستدرك للحاكم، رقم الحدیث: ۸۷۰۱

اپنا رزق اور جو ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو اُس کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی وقت حساب کا اور جزا سزا کا نہ آئے تو دونوں برابر ہو گئے، جو عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ آخر میں فرمایا فَمُلٰقِيْهِ ؀ مُلَاقِيْهِ کی ضمیر كَدْحٌ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ جو جد و جہد انسان کر رہا ہے بالآخر اپنے رَبّ کے پاس پہنچ کر اپنی اس کمائی سے ملے گا اور اس کے اچھے یا بُرے نتائج اس کے سامنے آ جائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُلَاقِيْهِ کی ضمیر رَبّ کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ ہر اِنسان آخرت میں اپنے رَبّ سے ملنے والا اور حساب کے لئے اس کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ آگے نیک و بد اور مؤمن و کافر انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے، جس کی اِبتدا اعمال نامے کا داہنے یا بائیں ہاتھ میں آ جانا ہے، داہنے والوں کو جنت کی دائمی نعمتوں کی بشارت، اور بائیں والوں کو دوزخ کے عذاب کی اطلاع مل جاتی ہے۔ اس مجموعے پر اگر اِنسان غور کرے کہ ضروریاتِ زندگی بلکہ اپنے نفس کی غیر ضروری مرغوبات کو بھی حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں، اس طرح دُنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے، مگر ان دونوں کے انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک کے نتیجے میں دائمی غیر منقطع راحت ہی راحت ہے، دُوسرے کے نتیجے میں دائمی مصیبت و عذاب ہے، پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سوچ سمجھ کر اپنی سعی و عمل کا رُخ اُس کی طرف پھیر دے جو دُنیا میں بھی اُس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی اس کو حاصل رہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ؀ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ؀ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؀ اس میں مؤمنین کا حال بیان فرمایا ہے کہ ان کے نامۂ اَعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے اور ان سے بہت آسان حساب لے کر جنت کی بشارت دے دی جائے گی، اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش واپس ہو گا۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ حُوْسِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عُذِّبَ" یعنی قیامت کے روز جس سے حساب لیا جائے وہ عذاب سے نہ بچے گا۔ اس پر حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا قرآن میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت میں جس کو حسابِ یسیر فرمایا وہ درحقیقت مکمل حساب نہیں، بلکہ صرف رَبّ العزّت کے سامنے پیشی ہے، اور جس شخص سے اس کے اعمال کا پورا پورا حساب لیا گیا وہ ہرگز عذاب سے نہ بچے گا۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کے اعمال بھی رَبّ العزّت کے سامنے پیش تو سب ہوں گے، مگر ان کے ایمان کی برکت سے اُن کے ہر ہر عمل پر مناقشہ نہیں ہو گا، اسی کا نام حسابِ یسیر ہے۔ اور اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، یا تو گھر والوں سے مراد جنت کی حوریں ہیں، جو وہاں اس کے اہل ہوں گی، اور یہ

[1] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب من سمع شيئًا فلم يفهمه فراجع حتّٰى يعرفه ج:۱ ص:۲۱

بھی ممکن ہے کہ دُنیا میں جو اس کے اہل وعیال تھے، محشر کے میدان میں جب حساب کے بعد کامیابی ہوگی تو دُنیا کی عادت کے مطابق اس کی خوشخبری سنانے ان کے پاس جائے۔ ائمۂ تفسیر نے دونوں اِحتمال بیان فرمائے ہیں۔ [1]

فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ یعنی جس کا اعمال نامہ اُس کی پشت کی طرف سے اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ وہاں اس کی تمنا کرے گا کہ کاش وہ پھر مر کر مٹی ہوجائے اور عذاب سے بچ جائے، مگر وہاں یہ ناممکن ہوگا، بلکہ اس کو جہنم میں داخل کردیا جائے گا، اس کی ایک وجہ یہاں یہ ارشاد فرمائی کہ وہ دُنیا میں اپنے اہل وعیال میں آخرت سے بے فکر ہوکر مگن اور خوش رہا کرتا تھا، بخلاف مؤمنین کے کہ اُن کو دُنیا کی زندگی میں کبھی بے فکری نہیں ہوتی، ہر عیش وراحت کے وقت بھی آخرت کی فکر ضرور لگی رہتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے ان کا حال بیان فرمایا ہے: اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ (الطّور) یعنی ہم تو اپنے اہل وعیال میں رہتے ہوئے بھی آخرت کا خوف رکھتے تھے، اس لئے ان دونوں فریق کا انجام اُن کے مناسب ہوا، جو دُنیا میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ آخرت سے بے فکر ہوکر عیش وعشرت اور خوشی ومسرّت میں گزارتے تھے، آج ان کے حصے میں یہ عذابِ جہنم آئے گا، اور جو لوگ دُنیا میں آخرت کے حساب وعذاب سے ڈرتے رہتے تھے، ان کو وہاں مسرّت وخوشی حاصل ہوگی، اور اَب وہ اپنے اہل وعیال میں دائمی مسرّت کے ساتھ رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا کی راحتوں میں مست ومسرور ہوجانا مؤمن کا کام نہیں، اس کو کسی وقت کسی حال آخرت کے حساب سے بے فکری نہیں ہوتی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ اس آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کے ساتھ مؤکد کرکے انسان کو پھر اُس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے، جس کا کچھ ذِکر پہلے اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ میں آچکا ہے۔ یہ چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی ہے، اگر غور کرو تو اُس مضمون کی شاہد ہیں جو جوابِ قسم میں آنے والا ہے، یعنی انسان کو ایک حال پر قرار نہیں، اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی چیز شَفَق ہے، یعنی وہ سُرخی جو آفتاب غروب ہونے کے بعد اُفق مغرب میں ہوتی ہے، یہ رات کی اِبتدا ہے جو اِنسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا مقدمہ ہے کہ روشنی جارہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آرہا ہے، اس کے بعد خود رات کی قسم ہے جو اس انقلاب کی تکمیل کرتی ہے، اس کے بعد اُن تمام چیزوں کی قسم ہے جن کو رات کی تاریکی اپنے اندر جمع کرلیتی ہے۔ وَسَقَ ﴿۱۷﴾ کے اصل معنی جمع کرلینے کے ہیں۔[2] اس کے عام معنی مراد لئے جائیں تو اس میں تمام دُنیا کی کائنات داخل ہیں جو رات کی تاریکی میں چھپ جاتی ہیں، اس میں حیوانات، نباتات، جمادات، پہاڑ اور دریا سبھی شامل ہیں۔ اور جمع کرلینے کی مناسبت سے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ چیزیں جو عادۃً دن کی روشنی میں منتشر

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۲۷۲

[2] لسان العرب، تحت مادة "وسق" ج:۱۰ ص:۳۷۸

پھیلی ہوئی رہتی ہیں، رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہوجاتی ہیں، انسان اپنے گھر میں، حیوانات اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہوجاتے ہیں، کاروبار میں پھیلے ہوئے سامانوں کو سمیٹ کر یکجا کردیا جاتا ہے، یہ ایک عظیم انقلاب خود انسان اور اس کے متعلقات میں ہے۔ چوتھی چیز جس کی قسم کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ ہے، یہ بھی وَسَقَ سے مشتق ہے، جس کے معنی جمع کرلینے کے ہیں، قمر کے اِتساق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو جمع کرے، اور یہ چودھویں رات میں ہوتا ہے، جب کہ چاند بالکل مکمل ہوتا ہے۔ اِذَا اتَّسَقَ کا لفظ چاند کے مختلف اطوار اور حالات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ایک نہایت خفیف نحیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے، پھر اس کی روشنی روز کچھ ترقی کرتی ہے، یہاں تک کہ بدرِ کامل ہوجاتا ہے۔ مسلسل اور پیہم انقلاباتِ اَحوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ جو چیزیں تہ بر تہ ہوتی ہیں، اُس کی ایک تہ کو طبق یا طبقہ کہتے ہیں، جمع طبقات آتی ہے، لَتَرْكَبُنَّ، رُکوب بمعنی سوار ہونے سے مشتق ہے، معنی یہ ہیں کہ اے بنی نوعِ انسان! تم ہمیشہ ایک طبقے سے دُوسرے طبقے پر سوار ہوتے اور چڑھتے چلے جاؤ گے، یعنی انسان اپنی تخلیق کے اِبتدا سے اِنتہا تک کسی وقت ایک حال پر نہیں رہتا، بلکہ اس کے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

انسانی وجود میں بے شمار اِنقلابات اور دائمی سفر اور اُس کی آخری منزل

نطفے سے منجمد خون بنا، پھر اُس سے ایک مضغۂ گوشت بنا، پھر اُس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضا کی تکمیل ہوئی، پھر اُس میں رُوح لاکر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطنِ مادر کے اندر رحم کا گندہ خون تھا، نو مہینے کے بعد اللہ نے اس کے دُنیا میں آنے کا راستہ آسان کردیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دُودھ ملنے لگا، دُنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی، بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا، دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوّت بھی حرکت میں آئی، ماں کا دُودھ چھوٹ کر اُس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو ولعب اس کے دن رات کا مشغلہ بنا، کچھ ہوش وشعور بڑھا تو تعلیم وتربیت کے شکنجے میں کسا گیا، جوان ہوا تو پچھلے سب کام متروک ہوکر جوانی کی خواہشات نے اُن کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا، نکاح شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے، آخر یہ دَور بھی ختم ہونے لگا، قویٰ میں اِضمحلال اور ضعف پیدا ہوا، بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہان کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی رہیں، کسی کو مجالِ انکار نہیں، مگر حقیقت سے ناآشنا اِنسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل

ہے، آگے کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ جو خالقِ کائنات اور علیم وخبیر ہے، اُس نے آگے آنے والے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعے غافل انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں، بلکہ یہ صرف ایک انتظار گاہ (ویٹنگ رُوم) ہے، اور آگے ایک بڑا جہان آنے والا ہے، اور اس میں ایک بڑے امتحان کے بعد اِنسان کی آخری منزل مقرّر ہو جائے گی، جو یا دائمی راحت وآرام کی ہوگی یا پھر دائمی عذاب ومصیبت کی، اور اس آخری منزل پر ہی اِنسان اپنے حقیقی مستقر پر پہنچ کر اِنقلابات کے چکر سے نکلے گا، قرآنِ کریم نے اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾ (العلق)،[1] اور وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ (النجم)،[2] اور كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ (الانشقاق:۶) میں یہی مضمون بیان فرما کر غفلت شعار اِنسان کو حقیقت اور اُس کی آخری منزل سے آگاہ اور اس پر متنبہ کیا کہ عمرِ دُنیا کے تمام حالات اور اِنقلابات آخری منزل تک جانے کا سفر اور اس کے مراحل ہیں، اور اِنسان چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، کھڑے بیٹھے ہر حال میں اس سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے، اور بالآخر اپنے رَبّ کے پاس پہنچتا ہے اور عمر بھر کے اعمال کا حساب دے کر آخری منزل میں قرار پاتا ہے، جہاں یا راحت ہی راحت اور غیر منقطع آرام ہی آرام ہے، یا پھر معاذ اللہ عذاب ہی عذاب اور غیر منقطع مصائب ہیں، تو عقل مند اِنسان کا کام یہ ہے کہ دُنیا میں اپنے آپ کو ایک مسافر سمجھے اور اپنے وطنِ اصلی کے لئے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر ہی کو دُنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ“[3] یعنی دُنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر چند روز کے لئے کہیں ٹھہر گیا ہو۔ یا کسی رہ گزر میں چلتے چلتے کچھ دیر آرام کے لئے رُک گیا ہو۔

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ کی تفسیر جو اُوپر بیان کی گئی ہے، ابونعیم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی روایت کی ہے، یہ طویل حدیث اس جگہ قرطبی نے بحوالہ ابی نعیم اور ابنِ کثیرؒ نے بحوالہ اِبنِ ابی حاتم مفصل نقل کی ہے۔[4] ان آیات میں غافل انسان کو اُس کی تخلیق اور عمرِ دُنیا میں اُس کو پیش آنے والے حالات واِنقلابات سامنے کر کے یہ ہدایت دی کہ غافل اب بھی وقت ہے کہ اپنے انجام پر غور اور آخرت کی فکر کر! مگر ان تمام روشن ہدایات کے باوجود بہت سے لوگ اپنی غفلت سے باز نہیں آتے اس لئے آخر میں ارشاد فرمایا: فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ یعنی ان غافل وجاہل انسانوں کو کیا ہو گیا کہ یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے بعد بھی اللہ پر اِیمان نہیں لاتے وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ یعنی جب اُن کے سامنے ان واضح ہدایات سے بھرا ہوا قرآن پڑھا جاتا ہے

---

[1] ترجمہ: اے مخاطب تیرے رَبّ ہی کی طرف سب کا لوٹنا ہوگا۔

[2] ترجمہ: اور یہ کہ آپ کے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے۔

[3] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: كُن في الدُّنيا كأنَّك غريب، ج:۲ ص:۹۴۹

[4] تفسير القرطبي ج:۱۹ ص:۲۷۸، وتفسير ابن كثير ج:۸ ص:۳۶۱، وتفسير ابن ابي حاتم، رقم الحديث:۱۹۲۰۳

اُس وقت بھی وہ اللہ کی طرف نہیں جھکتے۔

سجدہ اور سجود کے معنی لغت میں جھکنے کے ہیں، اور یہ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری سے کنایہ کیا جاتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ سجدے سے مراد سجدۂ اِصطلاحی نہیں، بلکہ اللہ کے سامنے اطاعت کے ساتھ جھکنا جس کو خشوع وخضوع کہتے ہیں، وہ مراد ہے، اور وجہ اس کی یہ کھلی ہوئی ہے کہ اس آیت میں حکم سجدہ کسی خاص آیت کے متعلق نہیں، بلکہ پورے قرآن کے متعلق ہے، اگر اس سے سجدۂ اِصطلاحی مراد لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ پورے قرآن کی ہر آیت پر سجدہ لازم ہو جو باجماعِ اُمت مراد نہیں ہوسکتا، سلف وخلف میں کوئی اس کا قائل نہیں، اب رہا یہ مسئلہ کہ اس آیت کے پڑھنے اور سننے پر سجدہ واجب ہے یا نہیں تو اگرچہ کسی قدر تاویل کے ساتھ اس آیت سے بھی وجوبِ سجدہ پر اِستدلال ہوسکتا ہے، جیسا کہ بعض فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ یہاں ''اَلْقُرْاٰنُ'' سے مراد پورا قرآن نہیں، بلکہ الف لام عہد کا ہے، اور مراد اس سے خاص یہی آیت ہے، لیکن یہ ایک قسم کی تأویل ہی ہے جو اِحتمال کے درجے میں تو صحیح کہی جاسکتی ہے، مگر اس کا مراد قرآن ہونا ظاہر عبارت سے بعید معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم، اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ اس کا فیصلہ روایاتِ حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تعامل سے ہوسکتا ہے، مگر روایاتِ حدیث سجدۂ تلاوت کے متعلق مختلف قسم کی آئی ہیں، بعض سے وجوب معلوم ہوتا ہے، بعض سے رُخصت، اسی لئے ائمۂ مجتہدین کا اس معاملے میں اختلاف ہے، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدہ واجب ہے، جیسا کہ مفصل کی دُوسری آیتوں پر واجب ہے، اِمامِ اعظمؒ کا اِستدلال اس کے وجوب پر مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے ایک روز عشاء کی نماز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی، اُنہوں نے سورۂ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کی تلاوت نماز میں کی اور اس آیت پر سجدہ کیا، میں نے ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ یہ کیسا سجدہ ہے اُنہوں نے فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں اس آیت پر سجدہ کیا ہے، اس لئے میں ہمیشہ اس آیت پر سجدہ کرتا رہوں گا جب تک کہ محشر میں آپ سے ملاقات ہو۔[۱] اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ میں اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں سجدہ کیا ہے۔[۲] قرطبی نے ابنِ عربی سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت بھی آیاتِ سجدہ میں سے ہے، اس کے پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے، مگر ابنِ عربی جن لوگوں میں مقیم تھے اُن میں اس آیت پر سجدہ کرنے

[۱] صحیح البخاری، ابواب ما جاء فی سجود القرآن وسنتها، باب من قرأ السجدة فی الصلاة فسجد بها، ج:۱ ص:۱۴۷

[۲] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب سجود التلاوة، ج:۱ ص:۲۱۵

کا رواج نہیں تھا، وہ کسی ایسی اِمام کے مقلد ہوں گے جن کے نزدیک سجدہ واجب نہیں، تو اِبنِ عربی کہتے ہیں کہ میں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا کہ جب کہیں اِمامت کروں تو سورۂ اِنشقاق نہیں پڑھتا، کیونکہ میرے نزدیک اس پر سجدہ واجب ہے، اگر سجدہ نہیں کرتا تو گناہگار ہوتا ہوں، اور اگر کرتا ہوں تو پوری جماعت میرے اس فعل کو بُرا سمجھے گی، بلاوجہ اِختلاف کیوں ڈالا جائے، [1] واللہ سبحانہ وتعالٰی اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ بِحَمْدِ اللہِ تَعَالٰی ۱۶/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۹ ص:۲۸۰و۲۸۱، واحکام القرآن لابن العربی، سورۃ الإنشقاق، مسألة قوله تعالٰی: "وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ" ج:۸ ص:۲۲

سُورَةُ البُرُوج

اٰیاتها ۲۲ ۸۵ سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ ۲۷ رکوعها ۱

سورۂ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② وَشَاهِدٍ

قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں، اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے، اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے،

وَّمَشْهُوْدٍ ③ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ④ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ⑤

اور اس کی کہ جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، مارے گئے کھائیاں کھودنے والے، آگ ہے بہت ایندھن والی،

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ⑥ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ⑦

جب وہ اس پر بیٹھے، اور جو کچھ وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے،

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾

اور اُن سے بدلہ نہ لیتے تھے مگر اسی بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا،

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۭ﴿۹﴾

جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ

تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کی تو اُن کے لئے

عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۭ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

عذاب ہے دوزخ کا اور ان کے لئے عذاب ہے آگ لگنے کا۔ بے شک جو لوگ یقین لائے اور کیں انہوں نے

الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۭ﴿۱۱﴾

بھلائیاں ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، یہ ہے بڑی مراد ملنی،

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ

بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے، بے شک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری، اور وہی ہے بخشنے والا

الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ۙ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ۙ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۭ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ

محبت کرنے والا، مالک عرش کا بڑی شان والا، کر ڈالنے والا جو چاہے۔ کیا پہنچی تجھ کو بات

الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ۙ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۭ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ۙ

ان لشکروں کی فرعون اور ثمود کے، کوئی نہیں بلکہ منکر جھٹلاتے ہیں،

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾

اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، کوئی نہیں یہ قرآن ہے بڑی شان کا،

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

لکھا ہوا لوحِ محفوظ میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی، ﴿۱﴾ اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے، ﴿۲﴾ اور حاضر ہونے والے کی اور اُس کی جس کے پاس لوگ حاضر ہوں، ﴿۳﴾ کہ خدا کی مار ہے اُن خندق (کھودنے) والوں پر ﴿۴﴾ اُس آگ والوں پر جو ایندھن سے بھری ہوئی تھی، ﴿۵﴾ جب وہ اُس کے پاس بیٹھے تھے، ﴿۶﴾ اور وہ ایمان والوں کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے، اُس کا نظارہ کرتے جاتے تھے۔ ﴿۷﴾ اور وہ ایمان والوں کو کسی اور بات کی نہیں، صرف اس بات کی سزا دے رہے تھے کہ وہ اُس اللہ پر ایمان لے آئے تھے جو بڑے اقتدار والا، بہت قابلِ تعریف ہے، ﴿۸﴾ جس کے قبضے میں سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ﴿۹﴾ یقین رکھو کہ جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ظلم کا نشانہ بنایا ہے، پھر توبہ نہیں کی ہے، اُن کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور اُن کو آگ میں جلنے کی سزا دی جائے گی۔ ﴿۱۰﴾ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن کے لئے بیشک (جنت کے) ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ ہے بڑی کامیابی! ﴿۱۱﴾ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہے۔ ﴿۱۲﴾ وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے، اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ ﴿۱۳﴾ اور وہ بہت بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے، ﴿۱۴﴾ عرش کا مالک ہے، بزرگی والا ہے، ﴿۱۵﴾ جو کچھ ارادہ کرتا ہے، کر گذرتا ہے۔ ﴿۱۶﴾ کیا تمہارے پاس اُن لشکروں کی خبر پہنچی ہے، ﴿۱۷﴾ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟ ﴿۱۸﴾ اس کے باوجود کافر لوگ حق کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، ﴿۱۹﴾ جبکہ اللہ نے اُن کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ﴿۲۰﴾ (ان کے جھٹلانے سے قرآن پر کوئی اثر نہیں پڑتا) بلکہ یہ بڑی عظمت والا قرآن ہے، ﴿۲۱﴾ جو لوحِ محفوظ میں درج ہے۔ ﴿۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول

اس سورت میں ایک قصے کا اِجمالاً ذِکر ہے، جو صحیح مسلم[۱] میں مذکور ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ کوئی کافر بادشاہ تھا، اس کے پاس ایک کاہن تھا، (کاہن اس کو کہا جاتا ہے جو شیاطین کے ذریعے یا نجوم کے آثار کے ذریعے کچھ مستقبل کی غیبی خبریں معلوم کر کے لوگوں کو بتائے) اس کاہن نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دِیا جائے تو اُس کو اپنا علم سکھا دُوں، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا، اس کے راستے میں ایک راہب یعنی عیسائی پادری رہتا تھا، اور اُس زمانے میں دِینِ عیسیٰ علیہ السلام ہی دِینِ حق تھا، اور یہ راہب اسی پر قائم عبادت گزار تھا، وہ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مسلمان ہو گیا۔ ایک بار اس لڑکے نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور خلقِ خدا پریشان ہے تو اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دُعا کی کہ ''اے اللہ! اگر راہب کا دِین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جائے، اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جائے'' اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو شیر کو لگا اور وہ ہلاک ہو گیا، لوگوں میں شور ہو گیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے، کسی اندھے نے سنا، آ کر درخواست کی: میری آنکھیں اچھی ہو جائیں۔ لڑکے نے کہا: بشرطیکہ تو مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ اس نے قبول کیا، لڑکے نے دُعا کی، وہ اچھا ہو گیا اور مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس نابینا کو گرفتار کر کے بلایا، اس نے راہب اور اعمیٰ کو تو قتل کر دیا اور لڑکے کے لئے حکم دیا کہ پہاڑ کے اُوپر لے جا کر گرا دیا جائے، مگر جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا۔ پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنے کا حکم دیا، وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈُوب گئے۔ پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا: ''مجھ کو بسم اللہ کہہ کر تیر مارو تو میں مر جاؤں گا!'' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا۔ پس اس واقعۂ عجیبہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبانوں سے نعرہ بلند ہوا کہ ''ہم سب اللہ پر اِیمان لاتے ہیں!'' بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور اَرکانِ سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں آگ سے بھروا کر اِشتہار دیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا اس کو آگ میں جلا دیں گے۔ چنانچہ بہت آدمی جلائے گئے۔ اس سورت میں ان پر غضبِ اِلٰہی نازل ہونے کا بیان قسم کے ساتھ فرمایا ہے)۔

قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی (مراد بُرجوں سے بڑے بڑے ستارے ہیں، کذا فی الدر المنثور مرفوعًا[۲])

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الزُّھد، باب قصة اصحاب الأخدود، ج:۲ ص:۴۱۵

[۲] الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۲۸

اور قسم ہے وعدہ کئے ہوئے دن کی (یعنی قیامت کے دن کی)، اور قسم ہے حاضر ہونے والے (دن) کی، اور قسم ہے اُس (دن) کی جس میں لوگوں کی حاضری ہوتی ہے (حدیثِ ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ یومِ موعود قیامت کا دِن ہے، اور شاہد جمعہ کا دِن ہے، اور مشہود عرفہ کا دِن ہے[1]، اور ایک دِن کو شاہد، دُوسرے کو مشہود شاید اس لئے فرمایا کہ یومِ جمعہ میں تو سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں تو گویا وہ دن خود آتا ہے، اور یومِ عرفہ میں حجاج اپنے اپنے مقامات سے سفر کر کے عرفات میں اس یوم کے قصد سے جمع ہو جاتے ہیں تو گویا وہ دن مقصود و مشہود اور دُوسرے لوگ حاضری کا قصد کرنے والے ہیں۔ آگے جوابِ قسم ہے) کہ خندق والے یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہوئے جس وقت وہ لوگ اُس (آگ) کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ (ظلم وستم) کر رہے تھے، اس کو دیکھ رہے تھے (ان کے ملعون ہونے کی خبر دینے سے تسلی مؤمنین کی ظاہر ہے کہ اسی طرح جو کافر اس وقت مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں وہ بھی گرفتارِ لعنت ہوں گے، جس کا اثر خواہ دُنیا میں بھی مرتب ہو، جیسے غزوۂ بدر وغیرہ میں مقتول ومخذول ہوئے، یا صرف آخرت میں جیسا عام کفار کے لئے یقینی ہے، اور دُشمن کے عذاب کی خبر سے تسلی ہونا اَمرِ طبعی ہے، اور ان لوگوں کا بیٹھنا اس ظلم وستم کے انتظام اور نگرانی کے لئے تھا، اور لفظ شہود میں علاوہ نگرانی کے اشارہ ان لوگوں کی سنگدلی کی طرف بھی ہے کہ دیکھ کر بھی ترحم نہ آتا تھا، اور اس کو خدا تعالیٰ کی لعنت میں خاص دخل ہے کہ یہ سنگدلی سببِ لعنت ہے) اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں اور کوئی عیب نہیں پایا تھا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست (اور) سزاوارِ حمد ہے، ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی (یعنی ایمان لانے پر یہ معاملہ کیا اور ایمان لانا کوئی خطا نہیں، پس بے خطا اُن پر ظلم کیا اس لئے وہ لوگ ملعون ہوئے، اور آگے ظالموں کے لئے عام وعید اور مظلوموں کے لئے عام وعدہ ہے) کہ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے (مظلوم کی مظلومیت سے بھی، پس اس کی نصرت کرے گا، اور ظالم کی ظالمیت سے بھی تو اس کو سزا دے گا، خواہ یہاں خواہ وہاں، چنانچہ آگے یہی مضمون ہے کہ) جنہوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی (اور) پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور (جہنم میں بالخصوص) ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے، (عذاب میں ہر طرح کی تکلیف داخل ہے، سانپ، بچھو، طوق، زنجیریں، حمیم، غسّاق وغیرہ، اور سب سے بڑھ کر جلنے کا عذاب ہے، اس لئے اس کو بالتخصیص فرمایا۔ یہ تو ظالم کے حق میں فرمایا، آگے مؤمنین کے حق میں جن میں مظلوم بھی آگئے ارشاد ہے کہ) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، ان کے لئے (بہشت کے) باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (اور اُوپر دو مضمون تھے، کفار کے لئے جہنم ہونا، اور مؤمنین کے لئے جنت ہونا، آگے ان کے مناسب اپنے بعض افعال وصفات ان مضمونوں کی تقریر کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ کے رَبّ کی داروگیر بڑی سخت ہے (پس

---

[1] جامع الترمذي، ابواب التّفسير، باب تفسير سورة البروج، ج:۲ ص:۱۷۱

کفار پر سزائے شدید کا واقع ہونا مستبعد نہیں، اور نیز) وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ (قیامت میں بھی) پیدا کردے گا (پس یہ شبہ بھی نہ رہا کہ گو بطش شدید ہے مگر قیامت ہی واقع نہ ہوگی جو کہ وقت بطش کا ہے، اس سے تقریر ہوگئی وعیدِ کفار کی) اور (آگے تقریر ہے وعدۂ مؤمنین کی) وہی بڑا بخشنے والا (اور) بڑی محبت کرنے والا (اور) عرش کا مالک (اور) عظمت والا ہے (پس ایمان والوں کے گناہ معاف کردے گا اور ان کو اپنا محبوب بنالے گا، اور ذُوالعرش اور مجید گو تعذیب واثابت دونوں کے ساتھ متعلق ہوسکتا ہے کہ دونوں فرع ہیں صاحبِ سلطنت وکمالِ صفات کی، لیکن یہاں مقابلے کے قرینے سے ان پر اثابت کا متفرع کرنا مقصود ہے، اور آگے دونوں کے اثبات کے لئے ایک صفت ارشاد ہے کہ) وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے (آگے مؤمنین کی مزید تسلی اور کفار کی مزید تنبیہ کے لئے بعض خاص مغضوبین کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو ان لشکروں کا قصہ پہنچا ہے یعنی فرعون (اور آلِ فرعون) اور ثمود کا (کہ کس طرح کفر کیا اور کیونکر گرفتارِ عذاب ہوئے، اس سے مؤمنین کو تسلی حاصل کرنا چاہئے، اور کفار کو ڈرنا چاہئے، مگر کفار بالکل عذاب سے نہیں ڈرتے) بلکہ یہ کافر (خود قرآن کی) تکذیب میں (لگے) ہیں (پس اس کے مضمونِ تعذیب کو بھی اور دیگر مضامین کو بھی جھٹلاتے ہیں) اور (انجام کار اس کی سزا بھگتیں گے، کیونکہ) اللہ ان کو اِدھر اُدھر سے گھیرے ہوئے ہے (اس کے قبضۂ قدرت اور عقوبت سے بچ نہیں سکتے، اور ان کا قرآن کو جھٹلانا محض حماقت ہے، کیونکہ قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے (جس میں کوئی تغیر وتبدل محتمل نہیں، وہاں سے نہایت حفاظت کے ساتھ صاحبِ وحی کے پاس پہنچایا جاتا ہے، کما قال تعالیٰ فی سورة الجنّ: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ [۱] پس ایسی صورت میں تکذیب قرآن کی بلاشبہ جہالت وموجبِ عقوبت ہے)۔

معارف ومسائل

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿۱﴾ بُرُوْج، بُرْج کی جمع ہے، بڑے محل یا قلعے کو کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء: ۷۸) [۲] یہاں بُرُوْج سے مراد محلات وقصور ہی ہیں، اور اصل مادہ بُرْج کے لغوی معنی ظہور کے ہیں۔ تَبَرُّج کے معنی بے پردہ کھلے پھرنے کے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (الاحزاب: ۳۳)۔ [۳] اس آیت میں بُرُوْج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں، حضرت ابنِ عباس

---

[۱] ترجمہ: تو اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے۔

[۲] ترجمہ: تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں ہی تم کو موت آجائے گی اگر چہ تم قلعی چونہ کے قلعوں ہی میں ہو۔

[۳] ترجمہ: اور قدیم زمانۂ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔

رضی اللہ عنہ، مجاہد، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، سُدّی رحمہم اللہ سب کا یہی قول ہے۔ اور بعض دُوسرے ائمۂ تفسیر نے اس جگہ بُروج سے مراد قصور یعنی محلات لئے ہیں، اور اس سے مراد وہ مکانات ہیں جو آسمان میں پہرہ داروں اور نگران فرشتوں کے لئے مقرّر ہیں۔ اور بعض متأخرین نے بُروج سے مراد وہ بُروج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے کہ کُل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو ایک بُرج کہا جاتا ہے، اُن کا خیال یہ ہے کہ ثوابت ستارے انہی بُرجوں میں اپنی جگہ مقیم ہیں، اور سیارات حرکتِ فلک کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں اور ان بُرجوں میں سیارات کا نزول ہوتا ہے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے، قرآنِ کریم سیارات کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ ہر سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے جیسا کہ سورۂ یٰسٓ کی آیت میں ہے: وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ [1] فلک سے مراد اس میں آسمان نہیں، بلکہ سیارے کی مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے۔ (مظہری) [2]

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿۳﴾ خلاصۂ تفسیر میں ترمذی کی مرفوع حدیث کے حوالے سے ان الفاظ کی تفسیر لکھ دی گئی ہے کہ یومِ موعود سے مراد روزِ قیامت اور شاھد سے مراد روزِ جمعہ اور مشھود سے مراد روزِ عرفہ ہے، [3] اس آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھائی، اوّل بُرجوں والے آسمان کی، پھر قیامت کے روز کی، پھر جمعہ اور عرفہ کے دِنوں کی، مناسبت ان چیزوں کی قسم کی جوابِ قسم کے ساتھ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ پر، اور پھر قیامت کے روز حساب کتاب اور جزا سزا پر دلیل ہیں، اور روزِ جمعہ و عرفہ مؤمنین کے لئے ذخیرۂ آخرت جمع کرنے کے مبارک دن ہیں۔ آگے جوابِ قسم میں اُن کفار پر لعنت آئی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو اُن کے ایمان کی وجہ سے آگ میں جلایا اور پھر مؤمنین کے درجاتِ آخرت کا بیان فرمایا۔

واقعۂ اَصحابِ اُخدود کی کچھ تفصیل

یہی واقعہ اس سورت کے نزول کا سبب ہے، جس کا خلاصہ صحیح مسلم کی حدیث کے حوالے سے خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ یہ شخص جس کو اس واقعے میں کاہن کہا گیا، بعض روایات میں کاہن کے بجائے ساحر آیا ہے، اور یہ بادشاہ جس کا ذِکر اس قصے میں ہے، ملکِ یمن کا بادشاہ تھا، جس کا نام حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یوسف ذونواس تھا، اس کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا، اور یہ لڑکا جس کو کاہن یا ساحر کے پاس اس کا فن سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مأمور کیا تھا اس کا نام عبداللہ بن تامر ہے، اور راہب عیسائی مذہب کا عابد و زاہد ہے،

---

[1] ترجمہ: اور دونوں ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

[2] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۳۴

[3] جامع الترمذی، ابواب التّفسیر، باب تفسیر سورۃ البروج، ج:۲ ص:۱۷۱

اور اُس زمانے میں چونکہ مذہبِ عیسیٰ علیہ السلام ہی دِینِ حق تھا، اس لئے یہ راہب اس وقت کا سچا مسلمان تھا، یہ لڑکا عبداللہ بن تامر جس کو کہانت یا سحر سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مامور کیا تھا اور وہ راستے میں راہب کے پاس جاتا اور اس کا کلام سن کر متأثر ہوتا اور بالآخر مسلمان ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اِیمان بھی ایسا پختہ نصیب فرمایا کہ ایمان کی خاطر لوگوں کی ایذائیں برداشت کرتا تھا، کیونکہ جب جانے کے وقت راستے میں راہب کے پاس بیٹھتا یہاں کچھ وقت لگتا تو جب ساحر یا کاہن کے پاس دیر سے پہنچتا تو وہ اس کو مارتا تھا، اور واپسی کے وقت جب پھر راہب کے پاس بیٹھتا تو گھر واپس جانے میں دیر ہوتی، اس پر گھر والے اس کو مارتے تھے، مگر اُس نے کسی کی پروا کئے بغیر راہب کی صحبت ومجالست نہ چھوڑی، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ کرامات عطا فرمائیں جن کا ذِکر اُوپر آچکا ہے۔ اس ظالم بادشاہ نے ایمان لانے والوں کو عذاب دینے کے لئے خندق کھدوا کر اس کو آگ کے بڑے شعلوں سے لبریز کیا، پھر ایمان لانے والوں میں سے ایک ایک کو حاضر کرکے کہا کہ یا اِیمان کو چھوڑ دو، یا پھر اس خندق میں گر جانا پڑے گا، اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنین کو ایسی اِستقامت بخشی کہ ان میں سے ایک بھی ایمان چھوڑنے پر راضی نہ ہوا اور آگ میں گر جانا قبول کیا، صرف ایک عورت جس کی گود میں ایک بچہ تھا، اس کو آگ میں گرنے سے ذرا جھجک ہوئی تو چھوٹا سا بچہ بولا کہ: اَماں جان! صبر کرو، کیونکہ آپ حق پر ہیں۔ جو لوگ اس طرح دہکتی آگ میں جلا کر اس ظالم نے قتل کئے ان کی تعداد بعض روایات میں بارہ ہزار، بعض میں اس سے زیادہ منقول ہے۔

اور یہ لڑکا جس کی کرامتوں کا ذِکر اُوپر آچکا ہے اور یہ کہ اس نے خود بادشاہ کو اپنے قتل کی یہ صورت بتلائی کہ تم میرے ترکش کا تیر لو، اور اس پر ''بِاسْمِ اللهِ رَبِّیْ'' کہہ کر میرے تیر مارو تو میں مرجاؤں گا۔ اس ترکیب کے ساتھ لڑکے نے جان تو دے دی مگر اس واقعے کو دیکھ کر بادشاہ کی ساری قوم نے نعرہ لگایا اور اپنے مسلمان ہونے کا اِعلان کردیا، کافر ظالم کو حق تعالیٰ نے دُنیا میں بھی خائب وخاسر بنادیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا عبداللہ بن تامر جس جگہ مدفون تھا، اِتفاقاً کسی ضرورت سے وہ زمین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کا ہاتھ اپنی پُٹھ پُڑی پر رکھا ہوا تھا جہاں تیر لگا تھا، کسی دیکھنے والے نے اُن کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہوگیا، پھر ویسے ہی رکھ دیا تو بند ہوگیا، اُن کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا: ''اَللهُ رَبِّیْ'' عاملِ یمن نے اس واقعے کی اطلاع حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو دی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ اُن کو اُن کی ہیئت پر انگوٹھی سمیت اُسی طرح چھپادو جیسے پہلے تھے۔ (ابن کثیر) [1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۳۷۰

فائدہ

ابنِ کثیر نے بحوالہ ابنِ ابی حاتم نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دُنیا میں ایک ہی نہیں، بہت مختلف ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں، پھر ابنِ ابی حاتم نے ان واقعات میں سے تین کا خصوصیت سے ذِکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی (جس کا واقعہ زمانِ فترت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سال پہلے پیش آیا ہے)، دُوسری خندق شام میں، تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآنِ کریم میں جس خندق کا ذِکر اس سورت میں ہے وہ خندق نجران، ملکِ یمن کی خندق ہے، کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔ [۱]

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ ، یہ اُن ظالموں کی سزا کا بیان ہے جنہوں نے مسلمانوں کو صرف اُن کے اِیمان کی بنا پر آگ کی خندق میں ڈال کر جلایا تھا، اور سزا میں دو باتیں ارشاد فرمائیں: فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ یعنی ان کے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے، دُوسری وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ⑩ یعنی اُن کے لئے جلنے کا عذاب ہے، ہوسکتا ہے کہ دُوسرا جملہ پہلے ہی جملے کا بیان اور تاکید ہو، اور معنی یہ ہوں کہ جہنم میں جاکر اس کو ہمیشہ آگ میں جلتے رہنے کا عذاب ملے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دُوسرے جملے میں اُن کی اسی دُنیا میں سزا کا ذِکر ہو، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جن مؤمنین کو ان لوگوں نے آگ کی خندق میں ڈالا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو تو تکلیف سے اس طرح بچادیا کہ آگ کے چھونے سے پہلے ہی اُن کی ارواح قبض کرلی گئیں، آگ میں مردہ جسم پڑے، پھر یہ آگ اتنی بھڑک اُٹھی کہ خندق کے حدود سے نکل شہر میں پھیل گئی اور ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، اس آگ نے جلادیا، صرف بادشاہ یوسف ذونواس بھاگ نکلا اور آگ سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا، اس میں غرق ہوکر مرا۔ (مظہری) [۲]

ان لوگوں کے لئے عذابِ جہنم اور عذابِ حریق کی خبر کے ساتھ قرآنِ کریم نے یہ قید بھی لگادی کہ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا یعنی یہ عذاب اُن لوگوں پر پڑے گا جو اپنے اس فعل پر نادم ہوکر تائب نہیں ہوئے، اس میں ان لوگوں کو توبہ کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس جود و کرم کو دیکھو کہ ان لوگوں نے اللہ کے اولیاء کو زندہ جلاکر اُن کا تماشا دیکھا اور حق تعالیٰ اس پر بھی اُن کو توبہ اور مغفرت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ (ابنِ کثیر) [۳]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ۱۲/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۷۱

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۳۸

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۲۷۱

سُورَةُ الطَّارِقِ

أياتها ۱۷ ۸۶ سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ ۳۶ رکوعہا ۱

سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝٢ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝٣

قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں آنے والے کی، اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنے والا وہ تارا چمکتا ہوا،

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝٤ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝٥ خُلِقَ

کوئی جی نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان، اب دیکھ لے آدمی کہ کاہے سے بنا ہے بنا ہے

مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝٦ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝٧ اِنَّهٗ

ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے، جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے، بے شک وہ

عَلٰی رَجۡعِہٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَہٗ مِنۡ قُوَّۃٍ وَّ لَا

اس کو پھیر لاسکتا ہے، جس دن جانچے جائیں بھید، تو کچھ نہ ہوگا اس کو زور اور نہ کوئی

نَاصِرٍ ﴿ؕ۱۰﴾ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ﴿ۙ۱۱﴾ وَ الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ﴿ۙ۱۲﴾ اِنَّہٗ

مدد کرنے والا، قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی، اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی، بے شک

لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿ۙ۱۳﴾ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿ؕ۱۴﴾ اِنَّہُمۡ یَکِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا ﴿ۙ۱۵﴾

یہ بات ہے دوٹوک، اور نہیں یہ بات ہنسی کی، البتہ وہ لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں،

وَّ اَکِیۡدُ کَیۡدًا ﴿ۚ۱۶﴾ فَمَہِّلِ الۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡہِلۡہُمۡ رُوَیۡدًا ﴿۱۷﴾ ع

اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں، سو ڈھیل دے منکروں کو ڈھیل دے اُن کو تھوڑے دِنوں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے آسمان کی، اور رات کو آنے والے کی ﴿۱﴾ ــــ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ﴿۲﴾ چمکتا ہوا ستارا! ــــ ﴿۳﴾ کہ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کی کوئی نگرانی کرنے والا موجود نہ ہو۔ ﴿۴﴾ اب انسان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اُسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ ﴿۵﴾ اُسے ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے ﴿۶﴾ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ ﴿۷﴾ بیشک وہ اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ ﴿۸﴾ جس دن تمام پوشیدہ باتوں کی جانچ ہوگی، ﴿۹﴾ تو انسان کے پاس نہ اپنا کوئی زور ہوگا، نہ کوئی مددگار۔ ﴿۱۰﴾ قسم ہے بارش بھرے آسمان کی، ﴿۱۱﴾ اور پھوٹ پڑنے والی زمین کی ﴿۱۲﴾ کہ یہ (قرآن) ایک فیصلہ کن بات ہے، ﴿۱۳﴾ اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ ﴿۱۴﴾ بیشک یہ (کافر لوگ) چالیں چل رہے ہیں، ﴿۱۵﴾ اور میں بھی اپنی چال چل رہا ہوں۔ ﴿۱۶﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) تم ان کافروں کو ڈھیل دو، انہیں تھوڑے دنوں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ﴿۱۷﴾

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے آسمان کی اور اُس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے، اور آپ کو کچھ معلوم ہے وہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے؟ وہ روشن ستارہ ہے (کوئی ستارہ ہو کقولہٖ تعالیٰ: وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ① (النجم) [1] آگے جوابِ قسم ہے کہ) کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس پر کوئی اعمال کا یاد رکھنے والا (فرشتہ) مقرر نہ ہو (کقولہٖ تعالیٰ: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ⑩ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ⑪ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ⑫ (الانفطار) [2] مطلب یہ کہ ان اعمال پر محاسبہ ہونے والا ہے، اور اس قسم کو مقصود سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں، مگر ظہور ان کا خاص شب میں ہوتا ہے، اسی طرح اعمال سب نامۂ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں، مگر ظہور ان کا خاص قیامت میں ہوگا، جب یہ بات ہے) تو اِنسان کو (قیامت کی فکر چاہئے اور اگر اس کے اِستبعاد کا شبہ ہو تو اس کو) دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، وہ ایک اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینے (یعنی تمام بدن) کے درمیان سے نکلتا ہے (مراد اس پانی سے منی ہے خواہ صرف مرد کی یا مرد وعورت دونوں کی، اور عورت کی منی میں گو اِندفاق (اُچھلنا) مرد کی منی کے برابر نہیں ہوتا لیکن کچھ اِندفاق ضرور ہوتا ہے، اور دُوسری تقدیر پر یعنی جب کہ ماء سے مراد مرد وعورت دونوں کا نطفہ ہو تو لفظ ماء کا مفرد لانا اس بنا پر ہے کہ دونوں مادّے مخلوط ہو کر مثل شئ واحد کے ہوجاتے ہیں، اور پشت اور سینہ چونکہ بدن کے دو طرفین ہیں، اس لئے کنایہ جمیع بدن سے ہوسکتا ہے، حاصل یہ ہے کہ نطفے سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے، اور جب عجیب تر اَمر اُس کی قدرت سے ظاہر ہو رہا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ) وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے (پس وہ اِستبعادِ قیامت کا شبہ دفع ہوگیا، اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز ہوگا) جس روز سب کی قلعی کھل جائے گی (یعنی سب مخفی باتیں عقائدِ باطلہ ونیاتِ فاسدہ ظاہر ہوجائیں گی، اور دُنیا میں جس طرح موقع پر جرم سے مکر جاتے ہیں، اس کو چھپا لیتے ہیں، یہ بات وہاں ممکن نہ ہوگی) پھر اس انسان کو نہ تو خود (مدافعت) کی قوّت ہوگی اور نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا (کہ عذاب کو اس سے دفع کردے، اور اگر کہا جائے کہ اِمکان قیامت کا گو عقلی ہے، مگر وقوع نقلی ہے اور دلیلِ نقلی قرآن ہے اور وہ ہنوز محتاجِ اثبات ہے، تو اس کے متعلق سنو کہ) قسم ہے آسمان کی جس سے پیاپے بارش ہوتی ہے، اور زمین کی جو (بیج نکلنے کے وقت) پھٹ جاتی ہے (آگے جوابِ قسم ہے) کہ یہ قرآن حق وباطل میں ایک فیصلہ کردینے والا کلام ہے، اور وہ کوئی لغو چیز نہیں ہے، (اس سے قرآن کا کلامِ حق من جانب اللہ ہونا ثابت ہوگیا، مگر باوجود اِثباتِ حق کے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ لوگ

---

[1] ترجمہ: قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے۔

[2] ترجمہ: اور تم پر یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں جو تمہارے سب افعال کو جانتے ہیں۔

(نفیِ حق کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی (ان کی ناکامی اور سزا کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں (اور ظاہر ہے کہ میری تدبیر غالب آئے گی، اور جب میرا تدبیر کرنا سن لیا) تو آپ ان کافروں (کی مخالفت سے گھبرایئے نہیں اور ان پر جلدی عذاب آنے کی خواہش نہ کیجئے، بلکہ ان) کو یوں ہی رہنے دیجئے (اور زیادہ دِن نہیں بلکہ) ان کو تھوڑے ہی دِنوں رہنے دیجئے (پھر میں ان پر عذاب نازل کردوں گا، خواہ قبل الموت یا بعد الموت، اَخیر کی قسم کو اَخیر کے مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت ہوتی ہے اس کو مالامال کرتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے)۔

معارف ومسائل

اس سورت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور ستاروں کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہر انسان پر ایک محافظ نگران ہے جو اُس کے تمام افعال واعمال اور حرکات وسکنات کو دیکھتا جانتا ہے، اس کا تقاضائے عقلی یہ ہے کہ انسان اپنے انجام پر غور کرے کہ دُنیا میں وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ اللہ کے یہاں محفوظ ہے اور یہ محفوظ رکھنا حساب کے لئے ہے جو قیامت میں ہوگا، اس لئے کسی وقت آخرت اور قیامت کی فکر سے غافل نہ ہو، اس کے بعد اُس شبہ کا جواب ہے جو شیطان لوگوں کے دِلوں میں ڈالتا ہے کہ مر کر مٹی اور ذرّہ ہوجانے کے بعد پھر سب اجزا کا جمع ہونا اور اس میں زندگی پیدا ہونا ایک موہوم خیال، بلکہ عوام کی نظر میں محال وناممکن ہے۔ جواب میں انسان کی ابتدائی تخلیق پر غور کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ کس طرح مختلف ذرّات اور مختلف مواد سے ہوتی ہے، جیسے ابتدائی تخلیق میں دُنیا بھر کے مختلف ذرّات کو جمع کرکے ایک زندہ سمیع وبصیر انسان بنادیا، اُس کو اس پر بھی قدرت کیوں نہ ہوگی کہ پھر اس کو اسی طرح لوٹادے، اس کے بعد کچھ حال قیامت کا بیان فرما کر دُوسری قسم زمین اور آسمان کی کھا کر غافل انسان کو یہ جتلایا کہ جو کچھ اس کو فکرِ آخرت کی تلقین کی گئی ہے اس کو مذاق ودِل لگی نہ سمجھے، یہ ایک حقیقت ہے جو سامنے آکر رہے گی۔ آخر میں کفار کے اس شبہ کا جواب دیا گیا کہ کفر وشرک اور معاصی اگر اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تو پھر دُنیا ہی میں اُن پر عذاب کیوں نہیں آجاتا، اس پر سورت ختم کی گئی ہے۔

پہلی قسم میں آسمان کے ساتھ طَارِقْ کی قسم ہے، طَارِقْ کے معنی رات کو آنے والے کے ہیں، ستارے چونکہ دِن کو چھپے رہتے ہیں اس لئے ستارے کو طَارِقْ فرمایا، اور خود قرآن نے اس کی تفسیر کردی وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ یعنی تمہیں کیا خبر کہ طَارِقْ کیا چیز ہے پھر فرمایا النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳ یعنی ستارہ روشن، نجم کے معنی ستارے کے ہیں، قرآن نے کوئی ستارہ متعین نہیں کیا، اس لئے ہر ستارہ اس کا مصداق ہوسکتا ہے۔ بعض حضراتِ مفسرین نے نجم سے خاص ستارہ ثریا، یا

زُحل مرادلیا ہے، اور کلامِ عرب سے لفظِ نجم کا اس پر اطلاق ثابت کیا ہے، ثاقب کے معنی روشن چمک دار کے ہیں۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ یہ جوابِ قسم ہے، اس میں شروع کا حرف اِنْ نافیہ ہے، اور حرف لَمَّا بتشدید میم بمعنی اِلَّا ہے جو قبیلہ ہذیل کے لغت میں اِستثناء کے معنی دیتا ہے، اور معنی آیات کے یہ ہیں کہ کوئی نفس ایسا نہیں جس پر حافظ نہ ہو، حَافِظٌ کے معنی نگران کے بھی آتے ہیں، جو کسی کے اعمال کو نظر میں رکھے تاکہ ان کا حساب لے، اور حَافِظٌ بمعنی محافظ بھی آتا ہے جس کے معنی مصائب و آفات سے حفاظت کرنے والے کے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے حَافِظٌ سے مراد فرشتہ کاتبِ اعمال ہے، اور یہاں اگرچہ اس کو بلفظ مفرد بمعنی جنس بیان کیا ہے، مگر ان کا متعدّد ہونا دُوسری آیات سے ثابت ہے: وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ (الانفطار) [1]

اور دُوسرے معنی کے اعتبار سے وہ فرشتے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر اِنسان کی حفاظت کے لئے مقرّر کئے ہیں، وہ دن رات تمام آفات و مصائب سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اس مصیبت و آفت کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر کر دی ہے، جیسا کہ ایک دُوسری آیت میں اس کا صراحۃً بیان آیا ہے: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (الرعد:۱۱) یعنی انسان کے لئے نوبت بہ نوبت آنے والے محافظ فرشتے مقرّر ہیں جو اس کے آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت بامرِ الٰہی کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مؤمن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لئے مقرّر ہیں، جو اِنسان کے ہر ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں، اُن میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لئے مقرّر ہیں، یہ فرشتے انسان سے ہر بلا و مصیبت جو اس کے لئے مقدّر نہیں، اس طرح انسان سے دفع کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دفع کیا جاتا ہے، اور اگر اِنسان پر یہ حفاظتی پہرہ نہ ہو تو شیاطین اُس کو اُچک لیں۔ (قرطبی) [2]

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ یعنی انسان پیدا کیا گیا ہے ایک اُچھلنے والے پانی سے جو نکلتا ہے پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے۔ عام طور سے حضراتِ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینے سے نکلتا ہے، مگر اَعضائے انسانی کے ماہر اطباء کی تحقیق اور تجربہ یہ ہے کہ نطفہ درحقیقت انسان کے ہر ہر عضو سے نکلتا ہے اور بچے کا ہر عضو اُس جزءِ نطفہ سے بنتا ہے جو مرد و عورت کے اسی عضو سے نکلا ہے۔ البتہ

---

[1] ترجمہ: اور تم پر یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں۔

[2] تفسير القرطبي ج:۲۰ ص:۳، ومجمع الزوائد، كتاب القدر، باب دفع ما لم يقدر على العبد، رقم الحديث:۱۱۹۰۳

دِماغ کو اس معاملے میں سب سے زیادہ دخل ہے، اسی لئے مشاہدہ ہوتا ہے کہ جماع کی کثرت کرنے والے اکثر ضعفِ دِماغ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی تحقیق یہ بھی ہے کہ نطفہ تمام اعضا سے منفصل ہو کر نُخاع کے ذریعے خصیتین میں جمع ہوتا اور پھر وہاں سے نکلتا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو حضراتِ مفسرین نے جو نطفے کا خروج مرد کی پشت اور عورت کے سینے کے متعلق قرار دیا ہے، اس کی توجیہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ اس پر اَطباء کا اِتفاق ہے کہ نطفے کی تولید میں سب سے بڑا دخل دِماغ کو ہے، اور دِماغ کا خلیفہ وقائم مقام نُخاع ہے، جو ریڑھ کی ہڈی کے اندر دِماغ سے پشت، اور پھر خصیتین تک آیا ہوا ہے، اسی کے کچھ شعبے سینے کی ہڈیوں میں آئے ہوئے ہیں، ہوسکتا ہے کہ عورت کے نطفے میں سینے کی ہڈیوں سے آنے والے نطفے کا، اور مرد کے نطفے میں پشت سے آنے والے نطفے کا دخل زیادہ ہو۔ (ذکرہ البیضاوی) [1]

اور اگر قرآنِ کریم کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اُن میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں، صرف اتنا ہے کہ نطفہ پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بے تکلف ہوسکتا ہے کہ نطفہ مرد و عورت دونوں کے سارے بدن سے نکلتا ہے، اور "سارے بدن" کی تعبیر آگے پیچھے کے اہم اعضا سے کر دی گئی، سامنے کے حصے میں سینے اور پیچھے کے حصے میں پشت سب سے اہم اعضا ہیں، ان دونوں کے اندر سے نکلنے کا مطلب یہ لیا جائے کہ سارے بدن سے نکلتا ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾ رَجْعٌ کے معنی لوٹا دینے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جس خالقِ کائنات نے اوّل انسان کو نطفے سے پیدا کیا ہے، وہ اس کو دوبارہ لوٹا دینے یعنی مرنے کے بعد زِندہ کر دینے پر بدرجۂ اَولیٰ قادر ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴿۹﴾ تُبْلٰی کے لفظی معنی امتحان لینے اور آزمانے کے ہیں، اور سَرَآئِر کے معنی ہیں مخفی اُمور، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اِنسان کے تمام عقائد و خیالات اور نیت و عزم جو دِل میں پوشیدہ تھی، دُنیا میں اُس کو کوئی نہ جانتا تھا، اسی طرح وہ اعمال و افعال جو اُس نے چھپ کر کئے، دُنیا میں کسی کو اُن کی خبر نہیں، محشر میں سب کا امتحان لیا جائے گا، یعنی سب کو ظاہر کر دیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اِنسان کے ہر مخفی راز کو کھول دے گا۔ ہر اچھے بُرے عقیدے اور عمل کی علامت انسان کے چہرے پر، یا زینت ہو کر یا ظلمت و سیاہی کی صورت میں ظاہر کر دی جائے گی۔ (قرطبی) [2]

---

[1] تفسیر البیضاوی تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۳۸۹

[2] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۹

وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ رَجْــعٌ، کے معنی اُس بارش کے ہیں جو پے در پے ہو کہ ایک مرتبہ بارش ہو کر ختم ہو جائے اور پھر لوٹے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ⑬ یعنی قرآنِ کریم ایک فیصلہ کن قول ہے، جو حق و باطل میں فیصلہ کرتا ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قرآن کے متعلق فرمایا: ''كِتَابٌ فِيْهِ خَبَرُ مَا قَبْلَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَعْدَكُمْ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ'' یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں تم سے پہلی اُمتوں کے حالات واخبار ہیں، اور تمہارے بعد آنے والوں کے اَحکام ہیں، وہ فیصلہ کن قول ہے، ہنسی مذاق نہیں۔ [1]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الطَّارِقِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى ١٧/شَوَّال ١٣٩١هـ

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۹، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل القرآن ج:۲ ص:۱۱۸، ومسند احمد، مسند علی بن ابی طالب رضی الله عنه، رقم الحدیث:۷۰۴

سُوْرَةُ الْأَعْلٰى

آیاتها ۱۹ | ۸۷ سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ ۸ | رکوعها ۱

سورۂ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ

پاکی بیان کر اپنے رَبّ کے نام کی جو سب سے اُوپر، جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا، اور جس نے ٹھہرادیا

فَهَدٰى ۪ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۭ﴿۵﴾

پھر راہ بتلائی، اور جس نے نکالا چارا، پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۭ﴿۷﴾

البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولے گا، مگر جو چاہے اللہ، وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے،

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝٨ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩ سَيَذَّكَّرُ

اور سہج سہج پہنچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک، سو تو سمجھادے اگر فائدہ کرے سمجھانا، سمجھ جائے گا

مَنْ يَّخْشٰى ۝١٠ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝١١ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢

جس کو ڈر ہوگا، اور یکسو رہے گا اُس سے بڑا بدقسمت، وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں،

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝١٣ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝١٤ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ

پھر نہ مرے گا اُس میں اور نہ جیئے گا، بے شک بھلا ہوا اُس کا جو سنورا، اور لیا اُس نے نام اپنے رب کا

فَصَلّٰى ۝١٥ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝١٧

پھر نماز پڑھی، کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دُنیا کے جینے کو، اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا،

اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝١٩ ع ۱۹/۱۲

یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں میں، صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس کی شان سب سے اُونچی ہے، ۝١ جس نے سب کچھ پیدا کیا، اور ٹھیک ٹھیک بنایا، ۝٢ اور جس نے ہر چیز کو ایک خاص انداز دیا، پھر راستہ بتایا، ۝٣ اور جس نے سبز چارہ (زمین سے) نکالا، ۝٤ پھر اُسے کالے رنگ کا کوڑا بنا دیا۔ ۝٥ (اے پیغمبر!) ہم تمہیں پڑھائیں گے، پھر تم بھولو گے نہیں، ۝٦ سوائے اُس کے جسے اللہ چاہے۔ یقین رکھو وہ کھلی ہوئی چیزوں کو بھی جانتا ہے، اور اُن چیزوں کو بھی جو چھپی ہوئی ہیں۔ ۝٧ اور ہم تمہیں آسان شریعت (پر چلنے کے لئے) سہولت دیں گے۔ ۝٨ لہٰذا تم نصیحت کئے جاؤ، اگر نصیحت کا فائدہ ہو۔ ۝٩ جس کے دِل میں اللہ کا خوف ہوگا، وہ نصیحت مانے گا، ۝١٠ اور اُس سے دُور وہ رہے گا جو بڑا بدبخت ہوگا، ۝١١ جو سب سے بڑی آگ میں داخل

ہوگا، (۱۲) پھر اُس آگ میں نہ مرے گا، اور نہ جئے گا۔ (۱۳) فلاح اُس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی، (۱۴) اور اپنے
پروردگار کا نام لیا، اور نماز پڑھی۔ (۱۵) لیکن تم لوگ دُنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، (۱۶) حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور کہیں
زیادہ پائیدار ہے۔ (۱۷) یہ بات یقیناً پچھلے (آسمانی) صحیفوں میں بھی درج ہے، (۱۸) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ (۱۹)

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اور جو مؤمن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالی شان کے نام کی تسبیح (وتقدیس) کیجئے جس نے (ہر شئی کو) بنایا پھر (اس کو) ٹھیک بنایا (یعنی ہر شئی کو مناسب طور پر بنایا) اور جس نے (جانداروں کے لئے اُن کے مناسب چیزوں کو) تجویز کیا پھر (اُن جانداروں کو اُن چیزوں کی طرف) راہ بتلائی (یعنی اُن کی طبائع میں ان اشیاء کا تقاضا پیدا کردیا) اور جس نے (سبز خوشنما) چارہ (زمین سے) نکالا، پھر اس کو سیاہ کوڑا کردیا (اوّل عام تصرفات مذکور ہیں، پھر حیوانات کے متعلق، پھر نباتات کے متعلق، مطلب یہ ہے کہ طاعات کے ذریعے آخرت کی تیاری کرنا چاہئے جہاں اعمال پر جزا و سزا ہونے والی ہے، اور اسی طاعت کا طریقہ بتلانے کے لئے ہم نے قرآن نازل کیا ہے، اور آپ کو اس کی تبلیغ کے لئے مامور کیا ہے، سو اس قرآن کی نسبت ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم (جتنا) قرآن (نازل کرتے جائیں گے) آپ کو پڑھا دیا کریں گے (یعنی یاد کرا دیا کریں گے) پھر آپ (اُس میں سے کوئی جز) نہیں بھولیں گے مگر جس قدر (بھلانا) اللہ کو منظور ہو (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے، کما قال تعالیٰ: مَا نَنسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنسِهَا... اِلخ [1] (البقرۃ:۱۰۶) سو وہ البتہ آپ کے اور سب کے ذہنوں سے فراموش کردیا جائے گا، اور یہ یاد رکھانا اور فراموش کردینا سب قرینِ حکمت ہوگا، کیونکہ) وہ ہر ظاہر اور مخفی کو جانتا ہے، (اس لئے اُس سے کسی چیز کی مصلحت مخفی نہیں، تو جب کسی چیز کا محفوظ رکھنا مصلحت ہوتا ہے، محفوظ رکھتے ہیں، اور جب بھلا دینا مصلحت ہوتا ہے تو بھلا دیتے ہیں) اور (جیسا ہم آپ کے لئے قرآن کا یاد ہونا آسان کردیں گے، اسی طرح) ہم اس آسان (شریعت کے ہر حکم پر چلنے) کے لئے آپ کو سہولت دے دیں گے (یعنی سمجھنا بھی آسان ہوگا اور عمل بھی آسان ہوگا اور تبلیغ بھی آسان ہوجائے گی اور مزاحمتوں کو دفع کردیں گے، اور شریعت کی صفت یُسْرٰی لانا بطور مدح کے ہے، یا اس لئے کہ وہ سبب ہے یُسْر کا، اور جب ہم آپ کے لئے وحی کے متعلق ہر کام آسان کردینے کا وعدہ کرتے ہیں) تو آپ (جس طرح خود تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اُس طرح دُوسروں کو بھی) نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو (مگر جیسا کہ ظاہر اور معلوم ہے کہ نصیحت اپنی ذات میں ہمیشہ مفید ہی ہوتی ہے، کما قال تعالیٰ:

---

[1] ترجمہ: ہم کسی آیت کا جو حکم موقوف کردیتے ہیں یا اُس آیت کو فراموش کردیتے ہیں تو ہم اُس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں۔

وَّذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۵﴾ [۱] (الذاریات) حاصل یہ ہوا کہ جب نصیحت نفع کی چیز ہے تو آپ نصیحت کرنے کا اہتمام کریں، مگر باوجود اس کے کہ نصیحت اپنی ذات میں نافع ومفید ہے، اس سے یہ نہ سمجھئے کہ وہ سب ہی کے لئے مفید ہوگی، اور سب ہی اُس کو مان لیں گے، بلکہ) وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے اور جو سخت بدنصیب ہے وہ اُس سے گریز کرتا ہے جو (آخر کار) بڑی آگ میں (یعنی آتشِ دوزخ میں جو دُنیا کی سب آگوں سے بڑی ہے) داخل ہوگا، پھر (اس سے بڑھ کر یہ کہ) نہ اس میں مرہی جائے گا اور نہ (آرام کی زندگی) جئے گا (یعنی جس جگہ نصیحت قبول کرنے کی شرط موجود نہیں ہوتی وہاں اگرچہ اُس کا اثر ظاہر نہ ہو، مگر نصیحت فی نفسہٖ نافع ومفید ہی ہے، اور آپ کے ذمے اُس کے واجب ہونے کے لئے یہی کافی ہے، خلاصہ اوّل سورت سے یہاں تک کا یہ ہوا کہ آپ اپنی بھی تکمیل کیجئے اور دُوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کیجئے کہ ہم آپ کے معاون ہیں، آگے اس کی تفصیل ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے نصیحت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں) بامراد ہوا جو شخص (قرآن سن کر عقائدِ باطلہ اور اخلاقِ رذیلہ سے) پاک ہوگیا اور اپنے ربّ کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا (مگر اے منکرو! تم قرآن سن کر اس کو نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے) بلکہ تم دُنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، حالانکہ آخرت (دُنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے، (اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں، بلکہ) یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے، یعنی اِبراہیم وموسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں (رُوح المعانی میں عبد بن حمید کی روایت سے حدیثِ مرفوع مذکور ہے کہ اِبراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے، اور موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ کے نزول سے پہلے دس صحیفے نازل ہوئے)۔ [۲]

معارف ومسائل

مسئلہ:- علماء نے فرمایا کہ قاری جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی کی تلاوت کرے تو مستحب ہے کہ یہ کہے: ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' صحابۂ کرام حضرت عبداللہ بن عباس، اِبن عمر، اِبن زُبیر، ابوموسیٰ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی معمول تھا کہ جب یہ سورت شروع کرتے تو ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہا کرتے تھے۔ (قرطبی) [۳] یعنی نماز کے سوا جب تلاوت کریں تو ایسا کہنا مستحب ہے۔

---

[۱] ترجمہ: اور سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا۔

[۲] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۲ ص:۱۸۱، وصحیح ابن حبان، کتاب البر والإحسان، باب ما جاء فی الطاعات وثوابها، رقم الحديث: ۳۶۲، وكنز العمال رقم الحديث: ۴۴۱۵۸

[۳] تفسير القرطبي ج:۲۰ ص:۱۳

مسئلہ:- حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ'' یعنی یہ کلمہ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' اپنے سجدے میں کہا کرو۔ [۱] سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى تسبیح کے معنی پاک رکھنے اور پاکی بیان کرنے کے ہیں، سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رَبّ کے نام کو پاک رکھئے، مراد یہ ہے کہ رَبّ کے نام کی تعظیم وتکریم کیجئے، اور جب اللہ کا نام لیں تو خشوع خضوع اور اَدب کا لحاظ رکھئے، اور ہر ایسی چیز سے اُس کے نام کو پاک رکھئے جو اس کے شایان نہیں، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اُن ناموں سے پکاریئے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائے ہیں، یا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائے ہیں، ان کے سوا کسی اور نام سے اس کو پکارنا جائز نہیں۔

مسئلہ:- اسی طرح اس حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ کسی مخلوق کے لئے استعمال کرنا اس کی تنزیہ وتقدیس کے خلاف ہے، اس لئے جائز نہیں، (قرطبی) [۲] جیسے: رَحمٰن، رَزّاق، غفار، قدوس، وغیرہ۔ آج کل اس معاملے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے، لوگوں کو ناموں کے اِختصار کا شوق ہے، عبدالرحمٰن کو ''رحمٰن''، عبدالرزّاق کو ''رَزّاق''، عبدالغفار کو ''غفار'' بے تکلف کہتے رہتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا کہنے والا اور سننے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، اور یہ گناہِ بے لذّت رات دِن بلاوجہ ہوتا رہتا ہے۔ اور بعض حضراتِ مفسرین نے اس جگہ اسم سے مراد خود مسمّٰی کی ذات مراد لی ہے، اور عربی زبان کے اِعتبار سے اس کی گنجائش بھی ہے، اور قرآنِ کریم میں بھی اس معنی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور حدیث میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمے کو نماز کے سجدے میں پڑھنے کا حکم دیا اُس کی تعمیل میں جو کلمہ اِختیار کیا گیا وہ ''سُبْحَانَ اسْمَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' نہیں بلکہ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسم اس جگہ مقصود نہیں خود مسمّٰی مراد ہے۔ (قرطبی) [۳] واللہ اعلم۔

تخلیقِ کائنات میں لطیف اور دَقیق حکمتیں

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳ یہ سب رَبِّ اعلیٰ کی صفات کا ذِکر ہے جو تخلیقِ کائنات میں اُس کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کے مشاہدے سے متعلق ہیں، ان میں پہلی صفت خَلَقَ ہے، خَلَقَ کے معنی محض صنعت گری کے نہیں، بلکہ عدم سے بغیر کسی مادّۂ سابقہ کے وجود میں لانا ہے، اور یہ کام کسی مخلوق کے بس میں نہیں صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ کاملہ ہے کہ بغیر کسی سابق مادّے کے جب چاہتے ہیں اور جس چیز کو چاہتے ہیں عدم سے وجود میں لے

---

[۱] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب ما یقول الرجل فی رکوعه وسجوده، ج:۱ ص:۱۲۶

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۴

[۳] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا

آتے ہیں۔ دُوسری صفت اس تخلیق ہی کے ساتھ وابستہ فَسَوّٰی ﴿۲﴾ ہے، جو تَسْوِیَۃٌ سے مشتق ہے، اور اس کے لفظی معنی برابر کرنے کے ہیں، اور مراد برابر کرنے سے یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطا فرمایا اس کی جسامت اور شکل وصورت اور اعضا واجزا کی وضع وہیئت میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھ کر یہ وجود بخشا گیا ہے، انسان اور ہر جانور کو اُس کی ضروریات کے مناسب اعضا دیئے گئے اور اُن اعضا کی جسامت اور وضع وہیئت اُس کی ضروریات کے مناسب بنائی گئی ہیں، ہاتھ پاؤں اور اُن کی اُنگلیوں کے پوروں میں ایسے جوڑ رکھے اور قدرتی اسپرنگ لگائے کہ وہ ہر طرف موڑے توڑے اور تہ کئے جاسکتے ہیں، اسی طرح دُوسرے ایک ایک عضو کو دیکھو یہ حیرت انگیز تناسب خود اِنسان کو خالقِ کائنات کی حکمت وقدرت پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

تیسری چیز اسی سلسلے میں فرمائی قَدَّرَ، تقدیر کے معنی کسی چیز کو خاص اندازے پر بنانے اور باہمی موازنت کے بھی آئے ہیں، اور بمعنی قضا وقدر بھی استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور خاص تجویز کے ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی چیزوں کو صرف پیدا کرکے اور بنا کر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا اور اس کے مناسب اس کو وسائل دیئے، اور اُسی کام میں اس کو لگا دیا، غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوعِ مخلوق کے لئے مخصوص نہیں، ساری ہی کائنات اور مخلوقات ایسی ہیں کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے لئے بنایا ہے، اور اُن کو اُسی کام میں لگا دیا ہے، ہر چیز اپنے رَبّ کی مقرّر کردہ ڈیوٹی پر لگی ہوئی ہے، آسمان اور اُس کے ستارے، برق وباراں سے لے کر اِنسان وحیوان اور نباتات وجمادات سب میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جس کو جس کام پر خالق نے لگا دیا ہے، وہ اس پر لگا ہوا ہے ۔

ابر وباد ومہ خورشید وفلک درکار بند [۱]

اور مولانا رُومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ۔

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند　　　بامن وتُو مُردہ باحق زندہ اند [۲]

خصوصاً انسان اور حیوان کے ہر نوع وصنف کو حق تعالیٰ نے جن خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے، وہ قدرتی طور پر اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن کی رغبت وشوق سب اُسی کام کے گرد گھومتا ہے ۔

ہر یکے را بہرِ کارے ساختند　　　میل اورا در دلش انداختند [۳]

چوتھی چیز یہ فرمائی: فَهَدٰى ﴿۳﴾ یعنی خالقِ کائنات نے جس چیز کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا، اس کو اس کی

---

[۱] ترجمہ: بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں۔

[۲] ترجمہ: مٹی، ہوا، پانی اور آگ غلام ہیں، میرے اور تیرے اعتبار سے مردہ ہیں لیکن اللہ کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔

[۳] ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہر ایک کو کسی نہ کسی کام کے لئے پیدا کرتے ہیں، اس کام کا میلان اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔

ہدایت بھی فرمادی کہ وہ کس کس طرح اس کام کو انجام دے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہدایت تمام کائنات ومخلوقات کو شامل ہے، آسمان اور آسمانی مخلوقات ہوں یا زمین اور اُس کی مخلوقات، کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل وشعور اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی دیا ہے، گو وہ انسان کے عقل وشعور سے کم ہو، جیسا کہ قرآنِ کریم کی دُوسری آیت میں ارشاد ہے: الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰهٰ) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کر کے ایک وجود بخشا، پھر اس کو اس کے متعلقہ کام کی ہدایت کر دی۔ اسی ہدایتِ عامہ کا اثر ہے کہ آسمان وزمین، ستارے اور سیارات، پہاڑ اور دَریا سب کے سب جس خدمت پر اَوّلِ خلقت سے مأمور کر دیئے گئے، اُس خدمت کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح بغیر کسی کمی کوتاہی یا سستی کے بجا لاتے ہیں، خصوصاً انسان اور حیوانات جن کا عقل وشعور ہر وقت مشاہدے میں آتا ہے، ان میں بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر نوع، ہر صنف، بلکہ ہر ہر فرد کو حق تعالیٰ نے اپنی اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے اور اپنے مخالف چیزوں کو دفع کرنے کے لئے کیسے کیسے دقیق ہنر سکھائے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انسان تو سب سے زیادہ عقل وشعور والا ہے، جنگل کے جانوروں، درندوں، پرندوں اور حشرات الارض کو دیکھو کہ ہر ایک کو اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے اور رہنے بسنے اور اپنی انفرادی اور جنسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کیسے کیسے ہنر سکھائے ہیں، اور یہ سب بلاواسطہ تعلیم خالقِ کائنات کی طرف سے ہے، انہوں نے کسی اسکول، کالج میں رہ کر یا کسی اُستاد سے یہ چیزیں نہیں سیکھیں، بلکہ یہ سب اسی ہدایتِ عامہ اور تلقینِ ربانی کے ثمرات ہیں جس کا ذکر آیت اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰهٰ) اور اس سورت کی قَدَّرَ فَهَدٰی ﴿۳﴾ میں فرمایا ہے۔

انسان کو سائنسی تعلیم بھی درحقیقت عطائے ربانی ہے

انسان جس کو حق تعالیٰ نے عقل وشعور سب سے زیادہ مکمل عطا فرمایا، اور اس کو مخدومِ کائنات بنایا ہے، تمام زمین اور پہاڑ اور دَریا اور اُن میں پیدا ہونے والی اشیاء انسان کی خدمت اور اس کے نفع کے لئے پیدا ہوئی ہیں، مگر اُن سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا اور مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا، اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کر لینا، یہ بڑے علم وہنر کو چاہتا ہے، قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر یہ عقل وفہم رکھا ہے کہ پہاڑوں کو کھود کر، دریاؤں میں غوطہ لگا کر سیکڑوں معدنی اور دریائی چیزیں حاصل کر لیتا ہے، اور پھر لکڑی، لوہے، تانبے، پیتل وغیرہ کو باہم جوڑ کر ان سے نئی نئی چیزیں اپنی ضرورت کی بنالیتا ہے، اور یہ علم وہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، اِبتدائے دُنیا سے اَن پڑھ جاہل یہ سارے کام کرتے آئے ہیں، اور یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً بخشی ہے، آگے فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعے اس میں ترقی کرنے کی اِستعداد بھی اسی قدرتِ ربانی کا عطیہ ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے، اور اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا ہے، آگے اس میں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور اِنسان کی فطرت میں اس کے سمجھنے کی اِستعداد و صلاحیت رکھی ہے، جس کے مظاہر اس سائنسی دَور میں روز نئے نئے سامنے آرہے ہیں، اور معلوم نہیں آگے اس سے بھی زیادہ کیا کیا سامنے آئے گا۔ غور کرو تو یہ سب ایک لفظِ قرآن فَهَدٰى ۝۳ کی شرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان سب کاموں کا راستہ دِکھایا، اور اُس میں اُن کے پورا کر لینے کی اِستعداد عطا فرمائی، مگر افسوس ہے کہ سائنس میں ترقی کرنے والے اس حقیقت سے اور زیادہ نا آشنا بلکہ اندھے ہوتے جارہے ہیں۔

وَالَّذِىٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵ اَلْمَرْعٰى کے معنی چراگاہ کے ہیں جہاں چوپائے جانور چرتے ہیں، اور غُثَآءً اُس کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جو پانی کے سیلاب میں اُوپر آجاتا ہے۔ اَحْوٰى حُوَّةٌ سے مشتق ہے، گہری سبزی میں جو ایک قسم کی سیاہی آجاتی ہے اس کو حُــوَّتْ کہتے ہیں، اس آیت میں حق تعالیٰ نے نباتات سے متعلق کچھ اپنی قدرت و حکمت کا بیان فرمایا ہے کہ زمین سے سرسبز گھاس نکالی، پھر اس کو خشک کر کے سیاہ رنگ کر دیا، وہ سرسبزی جاتی رہی، اس میں انسان کو اس کے انجام کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ جسم کی شادابی، خوبصورتی اور چستی چالاکی حق تعالیٰ کا عطیہ ہے، مگر انجامِ کار پھر اس سب کو ختم ہونا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ سابقہ آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کے چند مظاہر بیان فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے فریضۂ پیغمبری کی طرف چند ہدایات دی ہیں، اور ہدایات سے پہلے آپ کے کام کو آسان کر دینے کی خوشخبری سنائی ہے، وہ یہ کہ اِبتدا میں جب آپ پر قرآن نازل ہوتا اور جبرائیلِ امین علیہ السلام کوئی آیتِ قرآن سناتے تو آپ کو یہ فکر ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ الفاظِ آیت ذہن سے نکل جائیں، اس لئے جبرائیلِ امین کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ بھی الفاظِ قرآن پڑھتے جاتے تھے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ کام یعنی قرآن کا یاد کرا دینا اپنے ذمے لے لیا اور آپ کو بے فکر کر دیا کہ جبرائیلِ امین کے چلے جانے کے بعد آیاتِ قرآن کا آپ سے صحیح صحیح پڑھوا دینا، پھر اُن کو یاد میں محفوظ کرا دینا، ہماری ذمہ داری ہے، آپ فکر نہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَلَا تَنْسٰىٓ ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ یعنی آپ قرآن کی کوئی چیز بھولیں گے نہیں، بجز اس کے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ ہی اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر آپ کے ذہن سے بھلا دینا اور محو کر دینا چاہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بعض آیاتِ قرآن کو منسوخ فرماتے ہیں، اس کا ایک طریقہ تو معروف ہے کہ صاف حکم پہلے حکم کے خلاف آگیا۔ اور ایک صورت منسوخ کرنے کی یہ بھی ہے کہ اُس آیت ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کے ذہنوں سے محو اور فراموش کر دیا جائے،

جیسا کہ نسخِ آیاتِ قرآنی کے بیان میں فرمایا ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (البقرة:١٠٦) یعنی ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا آپ کے ذہن سے بھلا دیتے ہیں... الخ۔ اور بعض حضرات نے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے اِستثناء کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مصلحت اور حکمت کی بنا پر عارضی طور سے کوئی آیت آپ کے ذہن سے بھلا دیں، پھر یاد آجائے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی سورت تلاوت فرمائی جس میں ایک آیت پڑھنے سے رہ گئی، حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ جو کاتبِ وحی تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ آیت منسوخ ہوگئی، مگر جب آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ منسوخ نہیں، مجھ سے سہواً ترک ہوگئی۔ (قرطبی) [1] تو حاصل اس اِستثناء کا یہ ہوگا کہ وقتی اور عارضی طور پر کسی آیت کا بھول جانا اور پھر بدستور یاد آجانا اس وعدے کے منافی نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ لفظی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ہم آپ کو طریقۂ یُسْرٰی کے لئے آسان کردیں گے۔ طریقۂ یسریٰ سے مراد شریعتِ اسلام ہے۔ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ یہ فرمایا جاتا کہ ہم اس طریقے اور شریعت کو آپ کے لئے آسان کردیں گے، مگر قرآنِ کریم نے اس کو چھوڑ کر یہ فرمایا کہ ہم آپ کو اس طریقے کے لئے آسان کردیں گے۔ حکمت اس میں یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو طبعی اور مادّی طور پر ایسا بنادیں گے کہ شریعت آپ کی طبیعت بن جائے اور آپ شریعت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے فریضۂ پیغمبری کے ادا کرنے میں حق تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی سہولتوں کا بیان تھا، اس آیت میں آپ کو اس فریضے کی ادائیگی کا حکم ہے اور معنی الفاظِ آیت کے یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو تبلیغ ونصیحت کیجئے، اگر نصیحت نفع دیتی ہو۔ یہ الفاظ اگرچہ شرط کے آئے ہیں، مگر درحقیقت مقصود کوئی شرط نہیں، بلکہ اس کا تاکیدی حکم دینا ہے، جس کی مثال ہمارے عرف میں یہ ہے کہ کسی شخص کو بطورِ تنبیہ کے کہا جائے کہ: ''اگر تو آدمی ہے تو فلاں کام کرنا ہوگا'' یا ''اگر تو فلاں کا بیٹا ہے تو تجھے ایسا کرنا چاہئے'' یہاں مقصود شرط نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اِظہار ہوتا ہے کہ جب تو آدمی زاد ہے یا جبکہ تو فلاں بزرگ یا شریف آدمی کا بیٹا ہے تو تجھ پر یہ کام لازم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نصیحت وتبلیغ کا نافع ومفید ہونا تو متعین اور متیقن ہے، اس لئے اس نافع چیز کو آپ کسی وقت نہ چھوڑیں۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ تَزَكّٰى، زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے اصل معنی پاک کردینے کے ہیں، مال کی زکوٰۃ کو بھی

[1] تفسیر قرطبی ج:۲۰ ص:۱۹، ومسند احمد، رقم الحدیث: ۱۵۳۶۵

اس لئے ''زکوٰۃ'' کہتے ہیں کہ وہ باقی مال کو انسان کے لئے پاک کر دیتی ہے، یہاں لفظ تَزَكّٰى کا مفہوم عام ہے، جس میں ایمانی اور اخلاقی تزکیہ وطہارت بھی داخل ہے اور مال کی زکوٰۃ دینا بھی۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ یعنی اپنے ربّ کا نام لیتا اور نماز پڑھتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کی نماز فرض ونفل شامل ہے، بعض مفسرین نے جو خاص نمازِ عید سے اس کی تفسیر کی ہے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا[1] کہ عام لوگوں میں دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کی نعمت وراحت تو نقد وحاضر ہے، اور آخرت کی نعمت وراحت نظروں سے غائب اور اُدھار ہے۔ حقیقت سے ناآشنا لوگوں نے حاضر کو غائب پر، اور نقد کو اُدھار پر ترجیح دے دی، جو اُن کے لئے دائمی خسارے کا سبب بنی، اسی خسارے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے آخرت کی نعمتوں، راحتوں کو ایسا واضح کر دیا کہ گویا وہ حاضر وموجود ہیں، اور یہ بتلا دیا کہ جس چیز کو تم نقد سمجھ کر اختیار کرتے ہو، یہ متاعِ کاسد وناقص اور بہت جلد فنا ہو جانے والا ہے، عقل مند کا کام نہیں کہ ایسی چیز پر اپنا دِل ڈالے اور اُس کے لئے اپنی توانائی صَرف کرے، اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے آگے ارشاد فرمایا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والوں کو تنبیہ ہے کہ ذرا عقل سے کام لو، کس چیز کو اختیار کر رہے اور کس کو چھوڑ رہے ہو دُنیا جس پر تم فریفتہ ہو، اوّل تو اس کی بڑی سے بڑی راحت ولذّت بھی رنج وغم اور کلفت ومشقت کی آمیزش سے خالی نہیں، دُوسرے اُس کا کوئی قرار وثبات نہیں، آج کا بادشاہ کل کا فقیر، آج کا جوان شہ زور کل کا ضعیف وعاجز ہوتا رات دن دیکھتے ہو۔ بخلاف آخرت کے کہ وہ ان دونوں عیبوں سے پاک ہے، اُس کی ہر نعمت وراحت خیر ہی خیر ہے، اور دُنیا کی نعمت وراحت سے اس کو کوئی نسبت نہیں، اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اَبْقٰى ہے، یعنی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ انسان ذرا غور کرے کہ اگر اُس کو کہا جائے کہ تمہارے سامنے دو مکان ہیں، ایک عالی شان محل اور بنگلہ، تمام ساز وسامان سے آراستہ ہے، اور دُوسرا ایک معمولی کچا مکان ہے اور یہ سامان بھی اُس میں نہیں، تمہیں ہم اختیار دیتے ہیں کہ یا تو یہ بنگلہ لے لو مگر صرف مہینہ دو مہینے کے لئے، اس کے بعد اسے خالی کرنا ہوگا، یا یہ کچا مکان لے لو جو تمہاری دائمی ملکیت ہوگی، تو عقل مند انسان ان دونوں میں کس کو ترجیح دے گا اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ آخرت کی نعمتیں اگر بالفرض ناقص اور دُنیا سے کم درجے کی بھی ہوتیں، مگر ان کے دائمی ہونے کی وجہ سے وہی قابلِ ترجیح تھیں، اور جب کہ وہ نعمتیں دُنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں خیر اور افضل اور اعلیٰ بھی ہیں اور دائمی بھی تو کوئی احمق بدنصیب ہی ان کو چھوڑ کر دُنیا کی نعمت کو ترجیح دے سکتا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۳

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٨﴾ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴿١٩﴾ یعنی اس سورت کے سب مضامین یا آخری مضمون یعنی آخرت کا بہ نسبت دُنیا کے خَیْرٌ اور اَبْقٰی ہونا پچھلے صحیفوں میں بھی موجود تھا، جس کا بیان آگے یہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں یہ مضمون تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے پہلے کچھ صحیفے بھی دیئے گئے تھے، وہ مراد ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ صحف موسیٰ سے تورات ہی مراد ہو۔

صحفِ ابراہیمی کے مضامین

آجری نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے کیسے اور کیا تھے آپ نے فرمایا کہ اُن صحیفوں میں امثالِ عبرت کا بیان تھا، اُن میں سے ایک مثال میں ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگوں پر مسلط ہوجانے والے مغرور مبتلیٰ! میں نے تجھے حکومت اس لئے نہیں دی تھی کہ تو دُنیا کا مال پر مال جمع کرتا چلا جائے، بلکہ میں نے تو تجھے اقتدار اس لئے سونپا تھا کہ تو مظلوم کی بددُعا مجھ تک نہ پہنچنے دے، کیونکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں مظلوم کی دُعا کو رَدّ نہیں کرتا، اگرچہ وہ کافر کی زبان سے نکلی ہو۔

اور ایک مثال میں عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات کے تین حصے کرے، ایک حصہ اپنے رَبّ کی عبادت اور اُس سے مناجات کا ہو، دُوسرا حصہ اپنے اعمال کے محاسبے کا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت وصنعت میں غور وفکر کا، تیسرا حصہ اپنی ضروریاتِ معاش حاصل کرنے اور طبعی ضرورتیں پوری کرنے کا۔

اور فرمایا کہ عقل مند آدمی پر لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف رہے اور اپنے مقصود کام میں لگا رہے، اپنی زبان کی حفاظت کرے، اور جو شخص اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھ لے گا، اس کا کلام بہت کم صرف ضروری کاموں میں رہ جائے گا۔[1]

صحفِ موسیٰ علیہ السلام کے مضامین

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا کہ صحفِ موسیٰ علیہ السلام میں کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُن میں سب عبرتیں ہی عبرتیں تھیں، جن میں سے چند کلمات یہ ہیں:

مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو مرنے کا یقین ہو، پھر وہ کیسے خوش رہتا ہے۔ اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو تقدیر

---

[1] تفسیر القرطبی ج:٢٠ ص:٢٥، وصحیح ابن حبان، کتاب البر والإحسان، رقم الحدیث: ٣٦١، وکنز العمال رقم الحدیث: ٤٤١٥٨

پر ایمان رکھتا ہو، وہ کیسے عاجز و درماندہ اور غمگین ہو۔ اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو دُنیا اور اس کے اِنقلابات اور لوگوں کے عروج و نزول کو دیکھتا ہے، وہ کیسے دُنیا پر مطمئن ہو بیٹھتا ہے۔ اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو آخرت کے حساب پر یقین ہو، وہ کیسے عمل کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پھر یہ سوال کیا کہ کیا ان صحیفوں میں سے کوئی چیز آپ کے پاس آنے والی وحی میں بھی ہے آپ نے فرمایا اے ابوذر یہ آیتیں پڑھو: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ آخر سورۂ اعلیٰ تک۔ (قرطبی) [1]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْاَعْلٰى بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى لَيْلَةَ يَوْمِ الْاَحَدِ ۱۸/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

[1] تفسیر القرطبی ج: ۲۰ ص: ۲۵، وصحیح ابن حبان، کتاب البر والإحسان، باب ما جاء فی الطاعات وثوابها، رقم الحدیث: ۳٦۲

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

آیاتها ۲٦ ۸۸ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ ٦۸ رکوعها ۱

سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھبیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿۲﴾

کچھ پہنچی تجھ کو بات اُس چھپالینے والی کی کتنے منہ اُس دن ذلیل ہونے والے ہیں،

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿۴﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿۵﴾

محنت کرنے والے تھکے ہوئے، گریں گے دہکتی ہوئی آگ میں، پانی ملے گا ایک چشمے کھولتے ہوئے کا،

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿۷﴾

نہیں اُن کے پاس کھانا مگر جھاڑ کانٹوں والا، نہ موٹا کرے اور نہ کام آئے بھوک میں،

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾

کتنے منہ اس دن تروتازہ ہیں، اپنی کمائی سے راضی، اونچے باغ میں،

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾

نہیں سنتے اس میں بکواس، اس میں ایک چشمہ ہے بہتا، اس میں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے،

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾

اور آبخورے سامنے چنے ہوئے، اور غالیچے برابر بچھے ہوئے، اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے،

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾

بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾

اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کردیئے ہیں اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى

سو، تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے، تو نہیں ان پر داروغہ، مگر جس نے منہ موڑا

وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾

اور منکر ہوگیا، تو عذاب کرے گا اس پر اللہ وہ بڑا عذاب، بے شک ہمارے پاس ہے ان کو پھر آنا،

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

پھر بے شک ہمارا ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کیا تمہیں اُس واقعے (یعنی قیامت) کی خبر پہنچی ہے جو سب پر چھا جائے گا؟ ① بہت سے چہرے اُس دن اُترے ہوئے ہوں گے، ② مصیبت جھیلتے ہوئے، تھکن سے چور! ③ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، ④ اُنہیں کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلایا جائے گا، ⑤ اُن کے لئے ایک کانٹے دار جھاڑ کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا، ⑥ جو نہ جسم کا وزن بڑھائے گا، اور نہ بھوک مٹائے گا۔ ⑦ بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے، ⑧ (دُنیا میں) اپنی کی ہوئی محنت کی وجہ سے پوری طرح مطمئن ⑨ عالیشان جنت میں ہوں گے، ⑩ جس میں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ ⑪ اُس جنت میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے، ⑫ اُس میں اُونچی اُونچی نشستیں ہوں گی ⑬ اور سامنے رکھے ہوئے پیالے، ⑭ اور قطار میں لگائے ہوئے گداز تکیے، ⑮ اور بچھے ہوئے قالین! ⑯ تو کیا یہ لوگ اُونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ اُنہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ ⑰ اور آسمان کو کہ اُسے کس طرح بلند کیا گیا؟ ⑱ اور پہاڑوں کو کہ اُنہیں کس طرح گاڑا گیا؟ ⑲ اور زمین کو کہ اُسے کیسے بچھایا گیا؟ ⑳ اب (اے پیغمبر!) تم نصیحت کئے جاؤ۔ تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو۔ ㉑ آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لئے مسلط نہیں کیا گیا۔ ㉒ ہاں مگر جو کوئی منہ موڑے گا، اور کفر اختیار کرے گا، ㉓ تو اللہ اُس کو بڑا زبردست عذاب دے گا۔ ㉔ یقین جانو ان سب کو ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے، ㉕ پھر یقیناً ان کا حساب لینا ہمارے ذمے ہے۔ ㉖

خلاصۂ تفسیر

آپ کو اس محیطِ عام واقعے کی کچھ خبر پہنچی ہے (مراد اس واقعے سے قیامت ہے کہ تمام عالم کو اس کا اثر محیط ہوگا، اور مقصود اس اِستفہام سے تشویق ہے جس سے کلام کے سننے کا اہتمام پیدا ہو۔ آگے بصورت جواب اس خبر کی تفصیل ہے، یعنی) بہت سے چہرے اُس روز ذلیل اور مصیبت جھیلتے خستہ (اور درماندہ) ہوں گے (اور) آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے (اور) کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جائیں گے (اور) ان کو بجز ایک خاردار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا، جو نہ (تو کھانے والوں کو) فربہ کرے گا اور نہ (اُن کی) بھوک کو دفع کرے گا (یعنی نہ اس میں غذا بننے کی صلاحیت ہے، نہ بھوک رفع کرنے کی، اور مصیبت جھیلنے سے مراد حشر میں پریشان پھرنا اور دوزخ میں سلاسل اور اَغلال کو لادنا، دوزخ کے پہاڑوں پر چڑھنا اور اس کے اثر سے خستگی ظاہر ہے، اور کھولتا ہوا چشمہ وہی جس کو دُوسری آیتوں میں حمیم فرمایا ہے، اور

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس کا بھی چشمہ ہوگا، اور یہ فرمانا کہ اس کا طعام بجز ضریع کے اور نہ ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لذیذ کھانا نہیں ہوگا، ضریع ہی کی طرح زَقوم یا غسلین کا اس کے کھانے میں شامل ہونا، اس کے منافی نہیں۔ اور چہروں سے مراد اصحابِ چہرہ ہیں۔ یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا۔ آگے اہلِ جنت کا حال ہے، (یعنی) بہت سے چہرے اُس روز بارونق (اور) اپنے نیک کاموں کی بدولت خوش ہوں گے (اور) بہشت بریں میں ہوں گے، جن میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے (اور) اس (بہشت) میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے (اور) اس (بہشت) میں اُونچے اُونچے تخت (بچھے) ہیں اور رکھے ہوئے آبخورے (موجود) ہیں (یعنی یہ سامان اس کے سامنے ہی موجود ہوگا، تاکہ جب پانی کو جی چاہے دیر نہ لگے) اور برابر لگے ہوئے گدّے (تکیے) ہیں، اور سب طرف قالین (ہی قالین) پھیلے پڑے ہیں (کہ جہاں چاہیں آرام کرلیں، ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانا بھی نہ پڑے، یہ تفصیل ہوگئی جزا کی، اور ان مضامین کو سن کر جو بعضے لوگ قیامت کا اِنکار کرتے ہیں جس میں یہ سب واقعات ہوں گے تو اُن کی غلطی ہے، کیونکہ) کیا وہ لوگ اُونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے (کہ ہیئت اور خاصیت دونوں بہ نسبت دُوسرے جانوروں کے اس میں عجیب ہیں) اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کئے گئے اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے (یعنی ان چیزوں کو دیکھ کر قدرتِ الٰہیہ پر اِستدلال نہیں کرتے تاکہ اس کا بعث یعنی قیامت پر قادر ہونا سمجھ لیتے، اور تخصیص ان چار چیزوں کی اس لئے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے رہتے تھے، اس وقت ان کے سامنے اُونٹ ہوتے تھے اور اُوپر آسمان اور نیچے زمین اور اَطراف میں پہاڑ، اس لئے ان علامات میں غور کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا، اور جب یہ لوگ باوجود قیامِ دلائل کے غور نہیں کرتے) تو آپ (بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیئے بلکہ صرف) نصیحت کردیا کیجئے (کیونکہ) آپ تو بس صرف نصیحت کرنے والے ہیں (اور) آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) ہاں! مگر جو رُوگردانی اور کفر کرے گا تو خدا اس کو (آخرت میں) بڑی سزا دے گا (کیونکہ) ہمارے ہی پاس اُن کا آنا ہوگا، پھر ہمارا ہی کام اُن سے حساب لینا ہے (آپ زیادہ غم میں نہ پڑیئے)۔

معارف و مسائل

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ قیامت میں دو فریق مؤمن و کافر الگ الگ ہوجائیں گے، اُن کے چہرے الگ الگ پہچانے جائیں گے، اس آیت میں کافروں کے چہروں کا ایک حال یہ بتلایا ہے کہ وہ خَاشِعَةٌ ہوں گے، خشوع کے معنی جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں، نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے اور ذِلت و پستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے، جن لوگوں نے دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع و تذلل اِختیار نہیں کیا اس کی سزا اُن کو

قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں ان کے چہروں پر ذِلت اور رُسوائی کے آثار نمایاں ہوں گے۔

دُوسرا اور تیسرا حال اُن کے چہروں کا یہ بیان فرمایا کہ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ ہوں گے، عَامِلَةٌ کے لفظی معنی عمل اور محنت کرنے والے کے ہیں، محاورات میں عامل اور عاملہ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو مسلسل عمل اور محنت سے تھکا ماندہ چور ہو گیا ہو۔ اور نَّاصِبَةٌ نصب سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی تھکنے اور تعب و مشقت میں پڑ جانے کے ہیں۔ کفار و مجرمین کے یہ دو حال کہ عمل اور محنت سے تھکے ماندہ ہوں گے، ظاہر یہ ہے کہ یہ حال اُن کی دُنیا کا ہے، کیونکہ آخرت میں تو کوئی عمل اور محنت نہیں، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دِیا ہے کہ پہلا حال یعنی چہروں پر ذِلت و رُسوائی یہ تو آخرت میں ہوگا۔ اور عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کے دونوں حال ان لوگوں کے دُنیا ہی میں ہوتے ہیں،[1] کیونکہ بہت سے کفار، فجار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں میں مجاہدہ و ریاضت دُنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، نصاریٰ کے راہب بہت سے ایسے بھی ہیں جو اِخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی کے لئے دُنیا میں عبادت و ریاضت کرتے ہیں، اور اس میں محنتِ شاقہ برداشت کرتے ہیں، مگر وہ عبادت مشرکانہ اور باطل طریقے پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر و ثواب نہیں رکھتی، تو ان لوگوں کے چہرے دُنیا میں بھی عاملہ ناصبہ رہے اور آخرت میں ان پر ذِلت و رُسوائی کی سیاہی چھائی ہوگی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جب ملکِ شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب آپ کے پاس آیا جو بوڑھا تھا اور اپنے مذہب کی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ و محنت میں لگا ہوا تھا، محنت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا، بدن خشک، لباس خستہ و بدہیئت تھا، جب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا تو آپ رو پڑے، لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو فاروقِ اعظم نے فرمایا کہ مجھے اس بوڑھے کے حال پر رحم آیا کہ اس بیچارے نے ایک مقصد کے لئے بڑی محنت و جانفشانی کی، مگر وہ اس مقصد یعنی رضائے اِلٰہی کو نہیں پا سکا۔ اور اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ (قرطبی)[2]

نَارًا حَامِيَةً ۝ حَامِيَةٌ کے لفظی معنی گرم کے ہیں، اور آگ کا گرم ہونا اُس کا طبعی حال ہے، پھر اس کی صفتِ خاصہ بیان کرنا یہ بتلانے کے لئے ہے کہ اس آگ کی گرمی دُنیا کی آگ کی طرح کسی وقت کم یا ختم ہونے والی نہیں، بلکہ یہ حامیہ دائماً ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ یعنی اہلِ جہنم کو کھانے کے لئے ضَرِيْعٍ کے سوا کچھ نہ ملے گا، ضَرِيْعٍ دُنیا

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۷

[2] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا

میں ایک خاص قسم کی خاردار گھاس ہے جو زمین پر پھیلتی ہے، کوئی جانور اُس کے پاس نہیں جاتا، بدبودار، زہریلی، کانٹوں والی ہے۔ (كذا فسّره عكرمة ومجاهد۔ قرطبی) [1]

جہنم میں گھاس، درخت کیسے؟

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گھاس، درخت تو آگ سے جل جانے والی چیزیں ہیں، جہنم میں یہ کیسے رہیں گی؟ کیونکہ جس خالق و مالک نے اُن کو دُنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے، اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ ہی بنا دے، وہ اسی سے پھلیں پھولیں۔

ایک شبہ کا جواب

قرآن میں اہلِ جہنم کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا ذِکر آیا ہے، یہاں ضَرِیْع ان کی غذا بتلائی ہے، دُوسری جگہ زَقُّوْم، اور تیسری جگہ غِسْلِیْن، تو اس آیت میں جو حصر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ جہنم کو کوئی غذا بجز ضَرِیْع کے نہ دی جائے گی، یہ حصر بمقابلہ اُس غذا کے ہے جو کھانے کے لائق، خوشگوار، جزءِ بدن بننے والی ہو، اور ضَرِیْع بطور مثال کے لایا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہلِ جہنم کو کوئی کھانے کے لائق غذا نہیں ملے گی، بلکہ ضَرِیْع جیسی تکلیف دہ مضر چیزیں دی جائیں گی، اس لئے ضَرِیْع میں حصر مقصود نہیں، بلکہ زَقُّوْم اور غِسْلِیْن بھی ضَرِیْع میں شامل ہیں، اور قرطبی نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ جہنم کے مختلف درکات طبقات میں ان کی مختلف غذائیں ہوں، کہیں ضَرِیْع، کہیں زَقُّوْم، کہیں غِسْلِیْن۔

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ ۞ آیتِ سابقہ میں جو اہلِ جہنم کی غذا ضَرِیْع بتلائی گئی ہے، بعض کفارِ مکہ نے جب یہ آیت سنی تو کہنے لگے کہ ہمارے اُونٹ تو ضَرِیْع کھا کر خوب فربہ ہوجاتے ہیں۔ اُن کے جواب میں فرمایا کہ جہنم کے ضَرِیْع کو دُنیا کے ضَرِیْع پر قیاس نہ کرو، وہاں کے ضَرِیْع سے نہ فربہی پیدا ہوگی اور نہ بھوک سے نجات ملے گی۔

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۞ یعنی جنت میں کوئی ایسا کلام، ایسی بات اہلِ جنت کے کان میں نہ پڑے گی جو لغو و بیہودہ اور دِلخراش ہو، اس میں کلماتِ کفریہ باطلہ بھی آگئے اور گالی گلوچ اِفترا و بہتان، الزام لگانا اور ایسے سب کلام آگئے جن کو سن کر اِنسان کو اِیذا پہنچتی ہے۔ دُوسری جگہ قرآنِ کریم نے اسی کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۞ (الواقعة) یعنی اہلِ جنت، جنت میں کوئی لغو بات یا اِلزام لگانے کی بات نہ سنیں گے۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ یہ مضمون قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اِلزام تراشی اور بے تکی، بے ڈھنگی باتیں بڑی ایذا کی چیز ہے، اسی لئے قرآنِ کریم نے اہلِ جنت

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۳۰

کے حالات میں اہتمام سے اس کو بیان فرمایا کہ اہلِ جنت کے کانوں میں کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں پڑے گا جس سے اُن کا دِل بُرا اور میلا ہو۔

بعض آدابِ معاشرت

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ اَكْوَابٌ، كُوْب کی جمع ہے، پانی پینے کے برتن کو کہا جاتا ہے، جیسے آبخورے، گلاس وغیرہ اس کی صفت میں لفظ مَّوْضُوْعَةٌ یعنی اپنی مقررہ جگہ پر پانی کے قریب رکھے ہوئے ہوں گے۔ یہ فرما کر آدابِ معاشرت کے ایک اہم باب کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ پانی پینے کے برتن پانی کے قریب مقرّرہ جگہ پر رہنے چاہئیں، وہاں سے اِدھر اُدھر ہو جائیں اور پانی پینے کے وقت تلاش کرنا پڑے، یہ ایذا و تکلیف کی چیز ہے، اس لئے ہر شخص کو اس کا اہتمام چاہئے کہ ایسی استعمالی چیزیں جو سب گھر والوں کے کام میں آتی ہیں، جیسے لوٹے، گلاس، تولیہ وغیرہ ان کی جگہ مقرر رہنی چاہئے اور استعمال کرنے کے بعد اس کو وہیں رکھنا چاہئے تاکہ دُوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔ یہ اشارہ لفظ مَّوْضُوْعَةٌ سے اس لئے نکلا کہ حق تعالیٰ نے اہلِ جنت کی راحت و آسائش کے لئے اس کے ذِکر کا اِہتمام فرمایا کہ اُن کے پانی پینے کے برتن پانی کے قریب رکھے ہوئے ملیں گے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ الآیۃ۔ قیامت کے اَحوال اور اس میں مؤمن و کافر کی جزا و سزا کا بیان فرمانے کے بعد ان جاہل معاندین کی ہدایت کی طرف توجہ فرمائی جو اپنی بے وقوفی سے قیامت کا انکار اس بنا پر کرتے ہیں کہ انہیں مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بہت بعید بلکہ محال نظر آتا ہے، اُن کی ہدایت کے لئے حق جل شانہٗ نے اپنی قدرت کی چند نشانیوں میں غور کرنے کا ان آیتوں میں ارشاد فرمایا ہے، اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں تو آسمان و زمین میں بے شمار ہیں، یہاں اُن میں سے ایسی چار چیزوں کا ذِکر فرمایا جو عرب کے بادیہ نشین لوگوں کے مناسبِ حال ہیں کہ وہ اُونٹوں پر سوار ہو کر بڑے بڑے سفر طے کرتے ہیں، اس وقت اُن کے سب سے زیادہ قریب اُونٹ ہوتا ہے، اُوپر آسمان اور نیچے زمین اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ ہوتا ہے، ان ہی چاروں چیزوں میں ان کو غور کرنے کا حکم دیا گیا کہ دُوسری آیاتِ قدرت کو بھی چھوڑو، ان ہی چار چیزوں میں غور کرو تو حق تعالیٰ کی ہر چیز پر قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ ہو جائے گا۔

اور جانوروں میں اُونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو خاص طور سے غور کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں۔ اوّل تو عرب میں سب سے زیادہ بڑا جانور اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے اُونٹ ہی ہے، ہاتھی وہاں ہوتا نہیں، دُوسرے حق تعالیٰ نے اس عظیم الجثہ جانور کو ایسا بنا دیا ہے کہ عرب کے بدو اور غریب مفلس آدمی

بھی اس اتنے بڑے جانور کے پالنے، رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں، کیونکہ اس کو چھوڑ دیجئے تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لے گا، اُونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی، یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارہ کر لیتا ہے، ہاتھی اور دُوسرے جانوروں کی سی اس کی خوراک نہیں جو بڑی گراں پڑتی ہے، عرب کے جنگلوں میں پانی ایک بہت ہی کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا، قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزروٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی پی کر یہ اُس ٹنکی میں محفوظ کر لیتا ہے، اور تدریجی رفتار سے وہ اس کی پانی کی ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ اتنے اُونچے جانور پر سوار ہونے کے لئے سیڑھی لگانا پڑتی، مگر قدرت نے اس کے پاؤں کو تین تہ میں تقسیم کر دیا، یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے کہ وہ طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اُس پر چڑھنا اور اُترنا آسان ہو جاتا ہے، محنت کش اتنا ہے کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا ہے، عرب کے میدانوں میں دن کا سفر دُھوپ کی وجہ سے سخت مشکل ہے، قدرت نے اس جانور کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا ہے، مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک لڑکی بچی اُس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لے جائے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات ہیں جو اِنسان کو حق تعالیٰ کی قدرت وحکمتِ بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔ آخر سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے فرمایا کہ آپ کو ہم نے اس پر مسلط نہیں کیا کہ سب کو مؤمن ہی بنا دیں، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ بلکہ آپ کا کام تبلیغ کرنے اور نصیحت کرنے کا ہے، وہ کر کے آپ بے فکر ہو جائیں، ان کا حساب کتاب اور جزاوسزا سب ہمارا کام ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ بِحَمْدِ اللهِ لَيْلَةَ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ ١٩ / شَعْبَان ١٣٩١ھ

سُورَةُ الفَجرِ

اٰیاتها ۳۰ ۸۹ سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۰ رکوعها ۱

سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی تیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْفَجْرِ ۝١ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝٢ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝٤

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جفت اور طاق کی، اور اُس رات کی جب رات کو چلے،

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝٥ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦

ہے ان چیزوں کی قسم پوری عقل مندوں کے واسطے، تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رَبّ نے عاد کے ساتھ

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨ وَثَمُوْدَ

وہ جو اِرم میں تھے بڑے ستونوں والے، کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں، اور ثمود

الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ طَغَوْا

کے ساتھ جنہوں نے تراشا پتھروں کو وادی میں، اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا، یہ سب تھے جنہوں نے سر اُٹھایا

فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ

ملکوں میں، پھر بہت ڈالی ان میں خرابی، پھر پھینکا اُن پر تیرے رَبّ نے کوڑا

عَذَابٍ ﴿١٣﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ

عذاب کا، بے شک تیرا رَبّ لگا ہے گھات میں، سو آدمی جو ہے جب جانچے اس کو رَبّ اس کا

فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ

پھر اس کو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے میرے رَبّ نے مجھ کو عزت دی اور وہ جس وقت اس کو جانچے

فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ﴿١٦﴾ كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ

پھر کھینچ کرے اُس پر روزی کی، تو کہے میرے رَبّ نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں پر تم عزّت سے نہیں رکھتے

الْيَتِيمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ

یتیم کو، اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی، اور کھا جاتے ہو مُردے کا مال

أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ

سمیٹ کر سارا، اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھرکر، کوئی نہیں جب پست کردی جائے زمین

دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ

کُوٹ کُوٹ کر، اور آئے تیرا رَبّ اور فرشتے آئیں قطار قطار، اور لائی جائے اُس دن دوزخ،

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ

اُس دن سوچے گا آدمی اور کہاں ملے اس کو سوچنا، کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیج دیتا

لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ

اپنی زندگی میں پھر اُس دن عذاب نہ دے اس کا سا کوئی، اور نہ باندھ کر رکھے

وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ

اس کا سا باندھنا کوئی، اے وہ جی جس نے چین پکڑلیا پھر چل اپنے رَبّ کی طرف

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے فجر کے وقت کی، ① اور دس راتوں کی، ② اور جفت کی اور طاق کی، ③ اور رات کی جب وہ چل کھڑی
ہو (کہ آخرت میں جزا وسزا ضرور ہوگی) ④ ایک عقل والے (کو یقین دِلانے) کے لئے یہ قسمیں کافی ہیں کہ نہیں؟ ⑤ کیا
تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا ⑥ اُس اُونچے ستونوں والی قوم اِرم کے ساتھ ⑦
جس کے برابر دُنیا کے ملکوں میں کوئی اور قوم پیدا نہیں کی گئی؟ ⑧ اور ثمود کی اُس قوم کے ساتھ کیا کیا جس نے وادی میں پتھر
کی چٹانوں کو تراش رکھا تھا؟ ⑨ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا کیا؟ ⑩ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دُنیا کے ملکوں میں
سرکشی اِختیار کرلی تھی، ⑪ اور ان میں بہت فساد مچایا تھا، ⑫ چنانچہ تمہارے پروردگار نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ ⑬
یقین رکھو تمہارا پروردگار سب کو نظر میں رکھے ہوئے ہے۔ ⑭ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا پروردگار اُسے آزماتا
ہے، اور اِنعام واِکرام سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ: "میرے پروردگار نے میری عزت کی ہے۔" ⑮ اور دُوسری طرف
جب اُسے آزماتا ہے، اور اُس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ: "میرے پروردگار نے میری توہین کی ہے۔" ⑯

ہرگز ایسا نہیں چاہئے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، (۱۷) اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے، (۱۸) اور میراث کا مال سمیٹ سمیٹ کر کھا جاتے ہو، (۱۹) اور مال سے بے حد محبت کرتے ہو۔ (۲۰) ہرگز ایسا نہیں چاہئے۔ جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، (۲۱) اور تمہارا پروردگار اور قطاریں باندھے ہوئے فرشتے (میدانِ حشر میں) آئیں گے، (۲۲) اور اُس دن جہنم کو سامنے لایا جائے گا، تو اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی، اور اُس وقت سمجھ آنے کا موقع کہاں ہوگا؟ (۲۳) وہ کہے گا کہ: "کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لئے کچھ آگے بھیج دیا ہوتا!" (۲۴) پھر اُس دن اللہ کے برابر کوئی عذاب دینے والا نہیں ہوگا، (۲۵) اور نہ اُس کے جکڑنے کی طرح کوئی جکڑنے والا ہوگا۔ (۲۶) (البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ:) "اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے! (۲۷) اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اُس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی، (۲۸) اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں، (۲۹) اور داخل ہو جا میری جنت میں۔" (۳۰)

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے (فجر کے وقت) کی اور (ذی الحجہ کی) دس راتوں (یعنی دس تاریخوں) کی (کہ وہ نہایت فضیلت والی ہیں، کذا فسّر فی الحدیث [۱]) اور جفت کی اور طاق کی (جفت سے مراد دسویں تاریخ ذی الحجہ کی، اور طاق سے نویں تاریخ، کذا فی الحدیث، [۲] اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سے نماز مراد ہے کہ کسی کی طاق رکعتیں ہیں، کسی کی جفت، [۳] اور پہلی حدیث کو روایۃً بھی اَصح کہا گیا ہے، کذا فی الرُّوح، [۴] اور درایۃً بھی وہ اَرجح ہے، کیونکہ اس سورت میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی وہ سب زمانے اور اوقات کی قسم سے ہیں، درمیان میں شفع اور وتر بھی اوقات ہی کی قسم سے ہو تو تناسب واضح رہتا ہے۔ اور یہ تطبیق بھی ہوسکتی ہے کہ شفع و وتر سے مراد ہر وہ جفت اور طاق ہوں جو لائقِ تعظیم ہیں، اوقات و ایام بھی اس میں داخل ہیں، اور عددِ رکعاتِ نماز بھی) اور (قسم ہے) رات کی جب وہ چلنے لگے (یعنی گزرنے لگے، کقولہٖ تعالیٰ: وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ (المدثر) [۵] آگے بطور جملہ معترضہ کے تاکید کے لئے اس قسم کا عظیم ہونا بیان فرماتے ہیں کہ) کیا اس (قسمِ مذکور) میں عقل مند کے واسطے کافی قسم بھی ہے (یہ اِستفہام تقریر و تاکید کے لئے ہے، یعنی ان مذکورہ قسموں

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی العمل فی ایام العشر ج:۲ ص:۱۵۸

[۲] مسند احمد، مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۱۴۵۱۱

[۳] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ الفجر، ومسند احمد، حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۳۲۶۵

[۴] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۲ ص:۴۱۰

[۵] ترجمہ: اور رات کی جب جانے لگے۔

میں ہر ہر قسم تاکیدِ کلام کے لئے کافی ہے، اور گو سب قسمیں جو قرآن میں مذکور ہیں، ایسی ہی ہیں، مگر اہتمام کے لئے اس کے کافی ہونے کی تصریح فرمادی، کما مر فی قوله تعالٰی فی سورة الواقعة: وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ [1] اور جوابِ قسم مقدر ہے کہ منکروں کو ضرور سزا ہوگی، کما فی الجلالین، [2] جس پر آئندہ کلام قرینہ ہے جس میں منکرینِ سابقین کی تعذیب کا ذِکر ہے، یعنی) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قومِ عاد یعنی قومِ اِرم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستون (وعمود) جیسے (دراز) تھے (اور) جن کی برابر (زور و قوت میں دُنیا بھر کے) شہروں میں کوئی شخص نہیں پیدا کیا گیا (اس قوم کے دو لقب ہیں، عاد اور اِرَم، کیونکہ عاد بیٹا ہے عاص کا، اور وہ اِرم کا، اور وہ سام بن نوح کا، پس کبھی اُن کو باپ کے نام پر عاد کہتے ہیں، اور کبھی دادا کے نام پر اِرم کہتے ہیں، اور اس اِرم کا ایک بیٹا عابر ہے، اور عابر کا بیٹا ثمود جس کے نام سے ایک قوم مشہور ہے، پس عاد اور ثمود دونوں اِرم میں جا ملے ہیں، عاد بواسطہ عاص کے اور ثمود بواسطہ عابر کے، اور یہاں اِرم اس لئے بڑھا دیا کہ اس قومِ عاد میں دو طبقے ہیں، ایک متقدمین جن کو عادِ اُولیٰ کہتے ہیں، دُوسرے متأخرین جن کو عادِ اُخریٰ کہتے ہیں، پس اِرم بڑھا دینے سے اشارہ ہوگیا کہ عادِ اُولیٰ مراد ہے، کیونکہ بوجہ قرب وقلّتِ وسائط کے اِرم کا اطلاق عادِ اُولیٰ پر ہوتا ہے۔ کذا فی الرُّوح، [3] وھٰذا التّحقیق عندی قاض علٰی ما سبق فی الأعراف والنجم، واللہ اعلم) اور (آگے عاد کے بعد دُوسری ہلاک ہونے والی اُمتوں کا بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ) قومِ ثمود کے ساتھ (کیا معاملہ کیا) جو وادی القریٰ میں (پہاڑ کے) پتھروں کو تراشا کرتے تھے (اور مکانات بنایا کرتے تھے۔ وادی القریٰ اُن کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے، جیسا ایک کا نام حجر ہے، اور یہ سب حجاز اور شام کے درمیان میں ہیں، اور سب میں ثمود رہتے تھے، کذا فی بعض التفاسیر [4]) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (دُرِّ منثور میں ابنِ مسعود و سعید بن جبیر و مجاہد و حسن وسدی سے اس کی تفسیر میں منقول ہے کہ وہ جس کو سزا دیتا اس کے چاروں ہاتھ پاؤں چار میخوں سے باندھ کر سزا دیتا۔ [5] اور ایک تفسیر اس کی سورۂ صٓ میں گزر چکی، آگے سب کی صفت مشترکہ فرماتے ہیں کہ) جنھوں نے شہروں میں سر اُٹھا رکھا تھا، اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا، سو آپ کے رَبّ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا (یعنی عذاب نازل کیا، پس عذاب کو کوڑے سے اور اس کے نازل کرنے کو برسانے سے تعبیر فرمایا، آگے اس عذاب کی علّت اور موجودین کی عبرت کے لئے ارشاد ہے کہ) بے شک آپ کا رَبّ (نافرمانوں کی) گھات میں

---

[1] ترجمہ: اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔

[2] تفسیر الجلالین ص:۴۹۸، تحت ھٰذہ الآیة۔

[3] تفسیر رُوح المعانی تحت ھٰذہ الآیة ج:۲۲ ص:۳۱۴

[4] تفسیر رُوح المعانی ج:۲۲ ص:۳۱۶

[5] تفسیر الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۵۸و۲۵۹

ہے (جن میں سے مذکورین کو تو ہلاک کر دیا اور موجودین کو عذاب کرنے والا ہے) سو (اس کا مقتضا یہ تھا کہ کفارِ موجودین عبرت پکڑتے اور اعمالِ موجبہ للعذاب سے بچتے لیکن کافر) آدمی (کا یہ حال ہے کہ اعمالِ موجبہ للعذاب کو اختیار کرتا ہے جن سب کی اصل حبِّ دُنیا ہے، چنانچہ اس) کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو (ظاہر) اِنعام واِکرام دیتا ہے (مثل مال و جاہ وغیرہ جس سے مقصود اُس کی شکر گزاری کا دیکھنا ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو آزمانے سے تعبیر فرمایا) تو وہ (اس کو اپنا حقِ لازم سمجھ کر فخر وغرور سے) کہتا ہے کہ میرے رَبّ نے میری قدر بڑھادی (یعنی میں اس کا مقبول ہوں کہ مجھ کو ایسی ایسی نعمتیں دیں) اور جب اس کو (دُوسری طرح) آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے (جس سے مقصود اس کے صبر و رضا کا دیکھنا ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو آزمانے سے تعبیر فرمایا) تو وہ (شکایت کرتا ہے) کہتا ہے کہ میرے رَبّ نے میری قدر گھٹادی (یعنی مجھ کو باوجود اِستحقاقِ اِکرام کے اپنی نظر سے آج کل گرا رکھا ہے کہ دُنیوی نعمتیں کم ہوگئیں، مطلب یہ کہ کافر دُنیا ہی کو مقصود بالذات سمجھتا ہے کہ اس کی فراخی کو دلیلِ مقبولیت اور اپنے کو اس کا مستحق، اور تنگی کو دلیلِ مرُدودیت اور اپنے کو اس کا غیر مستحق سمجھتا ہے۔ پس اس میں دو غلطیاں ہیں، ایک دُنیا کو مقصود بالذات سمجھنا، جس سے آخرت کا اِنکار اور اس سے اعراض پیدا ہوتا ہے، اور دُوسرے دعوائے اِستحقاق جس سے نعمت پر فخر وغرور اور ناشکری اور مصیبت پر شکوہ اور بے صبری پیدا ہوتی ہے، اور یہ سب اعمال سببِ عذاب ہیں، آگے اس پر زجر و تنبیہ ہے کہ) ہرگز ایسا نہیں (یعنی نہ تو دُنیا مقصود بالذات ہے اور نہ اس کا ہونا، نہ ہونا دلیل مقبولیت یا مخذولیت کی ہے، اور نہ کوئی کسی اِکرام کا مستحق ہے اور نہ کوئی صبر وشکر کے وجوب سے مستثنیٰ ہے، آگے بصیغۂ خطاب بطور اِلتفات کے فرماتے ہیں کہ تم لوگوں میں صرف یہی اعمال سببِ عذاب نہیں) بلکہ (تم میں اور اعمال بھی مذموم و نامرضی عنداللہ وموجبِ عذاب ہیں، چنانچہ) تم لوگ یتیم کی (کچھ) قدر (اور خاطر) نہیں کرتے ہو (مطلب یہ کہ یتیم کی اہانت اور اس پر ظلم کرتے ہو کہ اس کا مال کھا جاتے ہو) اور دُوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے (یعنی دُوسروں کے حقوقِ واجبہ نہ خود اَدا کرتے ہو اور نہ اَوروں کو حقوقِ واجبہ ادا کرنے کو کہتے ہو، اور عملاً اس کے تارک اور اِعتقاداً اس کے منکر ہو، اور کافر کے لئے ترکِ واجب زیادتیٔ عذاب کا سبب ہوتا ہے اور اِعتقاد کا فساد یعنی کفر وشرک اصل عذاب کی بنیاد ہے) اور (تم) میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو (یعنی دُوسروں کا حق بھی کھا جاتے ہو، اور میراث بتفصیل موجود گو مکہ مکرمہ میں مشروع نہ تھی، مگر نفسِ میراث شرعِ ابراہیمی و اِسماعیلی سے متوارث چلی آتی تھی، چنانچہ جاہلیت میں بچوں اور لڑکیوں کو میراث کا مستحق نہ سمجھنا اس کی دلیل ہے کہ میراث کا حکم پہلے سے بھی تھا، جس کا بیان سورۂ نساء کے پہلے رُکوع آیت لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ... اِلخ کے تحت میں گزر چکا ہے) اور (تم لوگ) مال سے بہت ہی محبت کرتے ہو (اور اعمالِ مذکورہ سب اسی کی فرع ہیں، کیونکہ حبِّ دُنیا سب خطیئات کی اصل ہے۔ غرض یہ سب اعمال قولیہ وفعلیہ وحالیہ موجبِ تعذیب ہیں، پس انسان کا یہ حال ہے کہ مضامینِ عبرت سن کر

بجائے اس کے کہ عبرت پکڑتا ایسے اعمال اختیار کرتا ہے جو اور زیادہ موجبِ عذاب ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے والا ہے، کما قال تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ آگے اُن لوگوں پر زجر وتنبیہ ہے جو ان افعال کو سببِ عذاب نہیں سمجھتے) ہرگز ایسا نہیں (جیسا تم سمجھتے ہو کہ ان اعمال پر عذاب نہ ہوگا، ضرور ہوگا۔ آگے جزا وسزا کا وقت بتلاتے ہیں جس میں ان کو عذاب اور اہلِ طاعت کو اَجر وثواب ملے گا، پس ارشاد ہے کہ) جس وقت زمین (کے بلند اجزا پہاڑ وغیرہ) کو توڑ توڑ کر (اور) ریزہ ریزہ (کر کے زمین کو برابر) کر دیا جائے گا (کقولہ تعالیٰ: لَّا تَرٰى فِيهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ [1] سورۂ طٰہٰ) اور آپ کا پروردگار اور جوق جوق فرشتے (میدانِ محشر میں) آئیں گے (یہ حساب کے وقت ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا آنا متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا (جیسا سورۂ مدثر میں وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ [2] (المدثر: ۳۱) کے متعلق بیان ہو چکا ہے) اس روز اِنسان کو سمجھ آئے گی اور اَب سمجھ آنے کا موقع کہاں رہا (یعنی اب سمجھ آنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دارُ الجزاء ہے، دارُ العمل نہیں۔ آگے سمجھ آنے کے بعد جو اس کا قول ہوگا اس کا بیان ہے کہ وہ) کہے گا کاش میں اس زندگی (اُخروی) کے لئے کوئی (نیک) عمل آگے بھیج لیتا پس اس روز نہ تو خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا، اور نہ اس کے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا (یعنی ایسی سخت سزا اور قید کرے گا کہ دُنیا میں کبھی کسی نے کسی کو نہ اتنی سخت سزا دی ہوگی، نہ ایسی سخت قید کی ہوگی، یہ سزا تو اُن لوگوں کی ہوگی جو اعمالِ عذاب کے مرتکب ہوئے، اور جو اللہ کے فرمانبردار تھے اُن کو اِرشاد ہوگا کہ) اے اطمینان والی رُوح (یعنی جس کو اَمرِ حق میں یقین واذعان تھا اور کسی طرح کا شک واِنکار نہ تھا، اور تعبیر رُوح سے باعتبار جزءِ اشرف کے ہے) تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (یہ بھی نعمتِ رُوحانی ہے کہ اُنس کے لئے احباب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں) اور میری جنت میں داخل ہو جا (لفظ مطمئنہ میں ان لوگوں کے اعمالِ حسنہ کی طرف اشارہ ہو گیا اور اعمالِ حسنہ کی طرف اِشارہ اور اَعمالِ عذاب کی تفصیل بیان فرمانا شاید اس لئے ہے کہ زیادہ مقصود یہاں اہلِ مکہ کو سنانا ہے، اور اس وقت وہاں ایسے اعمال کے مرتکب زیادہ تھے)۔

معارف ومسائل

اس سورت میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اُس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ میں

---

[1] ترجمہ: جس میں تو نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بلندی دیکھے گا۔

[2] ترجمہ: اور تمہارے رَبّ کے لشکروں کو بجز رَبّ کے کوئی نہیں جانتا۔

بیان ہوا ہے، یعنی اس دُنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اُس پر جزا و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے، تمہارا رَبّ تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے، خواہ اسی جملے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ کو جوابِ قسم کہا جائے یا محذوف قرار دِیا جائے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے، اُن میں پہلی چیز الْفَجْرِ یعنی صبح صادق کا وقت ہے، ہوسکتا ہے کہ مراد ہر روز کی صبح ہو کہ وہ عالم میں ایک انقلابِ عظیم لاتی ہے، اور حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ الْفَجْرِ کے الف لام کو عہد کا قرار دے کر اس سے کسی خاص دن کی فجر مراد ہو۔ مفسرین صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت ابنِ عباس، ابنِ زُبیر رضی اللہ عنہما سے پہلے معنی یعنی عام وقتِ فجر کسی روز کا ہو منقول ہے، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں اس سے مراد ماہِ محرم کی پہلی تاریخ کی فجر ہے، جو اِسلامی قمری سال کا آغاز ہے، حضرت قتادہ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر کی صبح اس کی مراد قرار دِی ہے، مجاہد و عکرمہ کا یہی قول ہے، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے، وجہ اس یوم النحر کی تخصیص کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دِن کے لئے ایک رات ساتھ لگائی ہے جو اِسلامی اُصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے، صرف یوم النحر ایسا دِن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رات نہیں، کیونکہ یوم النحر سے پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں، بلکہ شرعاً عرفہ ہی کی رات قرار دِی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں نہ پہنچ سکا، رات کو صبحِ صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روزِ عرفہ کی دو راتیں ہیں، ایک اس سے پہلے، دُوسری اس کے بعد، اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں، اس لحاظ سے صبح یوم النحر تمام ایامِ دُنیا میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ (قرطبی) [1]

دُوسری چیز جس کی قسم ہے وہ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ یعنی دس راتیں، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، مجاہد، سُدّی، ضحاک، کلبی، ائمۂ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں، کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبادت کرنے کے لئے اللہ کے نزدیک سب دنوں میں عشرۂ ذی الحجہ سب سے افضل ہے، اس کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور اس میں ہر رات کی عبادت شبِ قدر کے برابر ہے۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجة بسند ضعیف، عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ، مظہری [2]) اور ابوالزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۳۸و۳۹

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۵۳، وجامع الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی العمل فی ایام العشر ج:۲ ص:۱۵۸

سے مرادعشرۂ ذی الحجہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہ ہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آئی ہیں وَاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ (الاعراف: ۱۴۲) [1] کیونکہ یہی دس راتیں سال کے ایام میں افضل ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور سے افضل ایام ہونا عشرۂ ذی الحجہ کا معلوم ہوا۔ [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرّر کی گئی تھیں۔

وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۝۳ شفع کے لغوی معنی جوڑ کے ہیں، جس کو اُردو میں جفت کہتے ہیں، اور وَتۡر کے معنی طاق اور فرد کے ہیں۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں یہ متعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے اس لئے ائمۂ تفسیر کے اقوال اس میں بے شمار ہیں مگر خود حدیثِ مرفوع جو ابو الزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

(وَالۡفَجۡرِ ۝۱ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ ۝۲) هُوَ الصُّبۡحُ وَعَشۡرُ النَّحۡرِ وَالۡوَتۡرُ يَوۡمُ عَرَفَةَ وَالشَّفۡعُ يَوۡمُ النَّحۡرِ۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَالۡفَجۡرِ ۝۱ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ ۝۲ کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مرادعشرۂ نحر ہے، (اور یہ عشرۂ ذی الحجہ کا پہلا ہی عشرہ ہوسکتا ہے جس میں یوم نحر شامل ہے) اور فرمایا کہ وَتر سے مراد روزِ عرفہ، اور شفع سے مراد یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) ہے۔

قرطبی نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے اَصح ہے، بہ نسبت دُوسری حدیث کے جو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل ہوئی ہے، جس میں شفع و وتر نماز کا ذِکر ہے، اسی لئے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہؒ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ شفع سے مراد یوم النحر، اور وتر سے مراد یومِ عرفہ ہے۔ [4]

اور بعض ائمۂ تفسیر ابنِ سیرین، مسروق، ابوصالح، قتادہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ شفع سے مراد تمام مخلوقات ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب مخلوقات کو جوڑ جوڑ جفت پیدا کیا ہے، اور ارشاد فرمایا ہے: وَمِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ (الذاریات: ۴۹)، یعنی ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ کفر و ایمان، شقاوت و سعادت، نور و ظلمت، لیل و نہار، سردی گرمی، آسمان و زمین، جن و انس، مرد و عورت، اور ان سب کے بالمقابل وتر وہ صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے، هُوَ اللّٰهُ الۡاَحَدُ الصَّمَدُ۔ وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ ۝۴ يَسۡرِ، سَرۡیٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی رات کو چلنے کے ہیں۔ یہاں خود رات کو کہا گیا کہ جب وہ چلنے لگے یعنی ختم ہونے لگے۔ یہ پانچ قسمیں ذِکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار اِنسان کو ایک

---

[1] ترجمہ: اور دس شب اور ان تیس راتوں کا تتمہ بنایا۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۳۹

[3] السُّنن الکبریٰ للنّسائی، کتاب المناسک، یوم الحج الأکبر، رقم الحدیث: ۴۰۸۶

[4] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۴۰

خاص انداز میں سوچنے سمجھنے کی دعوت دینے کے لئے فرمایا: هَلْ فِي ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ ۝ حِجْر کے لفظی معنی روکنے کے ہیں، انسان کی عقل اُس کو بُرائی اور مضرّت رساں چیزوں سے روکنے والی ہے، اس لئے حجر بمعنی عقل بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ کیا عقل والے آدمی کے لئے یہ قسمیں بھی کافی ہیں یا نہیں۔ یہ صورت تو اِستفہام کی ہے، مگر درحقیقت انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کی ایک تدبیر ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان پر اور اس کے قسم کھا کر ایک بات کو بیان کرنے پر اور خود ان چیزوں کی عظمت پر جن کی قسم کھائی گئی ہے، ذرا سا غور کرو تو جس چیز کے لئے یہ قسم کھائی گئی اس کا یقینی ہونا ثابت ہو جائے گا، اور وہ چیز یہی ہے کہ انسان کے ہر عمل کا آخرت میں حساب ہونا اور اُس پر جزا و سزا ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہ جوابِ قسم اگرچہ صراحۃً مذکور نہیں، مگر سیاقِ کلام سے ثابت ہے۔ اور آگے جو کفار پر عذاب آنے کا بیان ہو رہا ہے، وہ بھی اسی کا بیان ہے کہ کفر و معصیت کی سزا آخرت میں تو ملنا طے شدہ ہی ہے، کبھی کبھی دُنیا میں بھی ایسے لوگوں پر عذاب بھیج دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تین قوموں کے عذاب کا ذِکر فرمایا، اوّل: قومِ عاد، دُوسرے: ثمود، تیسرے قومِ فرعون۔ عاد و ثمود دو قومیں جن کا سلسلۂ نسب اُوپر جا کر اِرَم میں مل جاتا ہے، اس طرح لفظ اِرَم عاد و ثمود دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے، یہاں صرف عاد کے ساتھ اِرَم کا ذِکر کرنے کی وجہ خلاصۂ تفسیر میں عاد و ثمود کے دونوں قوموں کے تحقیقی حالات کے ساتھ گزر چکی ہے۔

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ لفظ اِرَمَ عاد کا عطفِ بیان یا بدل ہے، اور مقصود اس سے قبیلۂ عاد کی دو قسموں میں سے ایک کی تعیین ہے، یعنی عادِ اُولیٰ جو ان کے متقدمین ہیں، ان کو عادِ اِرَم کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ یہ لوگ اپنے جدّ اعلیٰ اِرَم سے بہ نسبت عادِ اُخریٰ کے قریب تر ہیں۔ ان کو اس جگہ قرآنِ کریم عادِ اِرَم کے لفظ سے اور سورۂ نجم میں اَهْلَكَ عَادًا الْأُولٰى ۝ [1] کے عنوان سے تعبیر فرماتا ہے، ان کی صفت میں قرآنِ کریم نے ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ فرمایا۔ عماد اور عمود، ستون کو کہتے ہیں، قومِ عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ اس لئے کہا گیا کہ ان کے قد و قامت بڑے طویل تھے، اور یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور قوّت وطاقت میں سب دُوسری قوموں سے ممتاز تھی، ان کے اس اِمتیاز کو خود قرآنِ کریم نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ یعنی ایسی طویل القامت قوی قوم دُنیا میں اس سے پہلے پیدا نہیں کی گئی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان کے طولِ قامت اور ڈیل ڈول کا دُنیا کی ساری قوموں سے زیادہ ہونا تو واضح فرما دیا، مگر ان کی کوئی پیمائش ذِکر کرنا ضرورت سے زائد کام تھا، اس کو چھوڑ دیا۔ اسرائیلی روایات میں ان کے قد و قامت اور قوّت کے متعلق عجیب عجیب اقوال مذکور ہیں، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور مقاتل رحمہ اللہ سے اُن کی قامت کا طول بارہ ہاتھ یعنی چھ گز یا ۱۸ فٹ منقول

---

[1] ترجمہ: اس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کیا۔

ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اُن کا یہ قول بھی اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اِرَم اُس جنت کا نام ہے جو عاد کے بیٹے شداد نے بنائی تھی، اور اُسی کی صفت ذَاتِ الْعِمَادِ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت بہت سے عمودوں پر قائم سونے چاندی اور جواہرات سے تعمیر کی تھی، تاکہ لوگ آخرت کی جنت کے بدلے اس نقد جنت کو اختیار کرلیں، مگر جب یہ عالی شان محلات تیار ہوگئے اور شداد نے اپنے رُؤسائے مملکت کے ساتھ اس میں جانے کا اِرادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا، یہ سب ہلاک ہوگئے اور وہ محلات بھی مسمار ہوگئے۔ (قرطبی) [۱] اس اِعتبار سے اس آیت میں قومِ عاد کے ایک خاص عذاب کا ذِکر ہوا، جو شداد بن عاد اور اس کی بنائی ہوئی جنت پر نازل ہوا۔ اور پہلی تفسیر جس کو جمہور مفسرین نے اِختیار کیا ہے، اس میں قومِ عاد پر جتنے عذاب آئے ہیں، ان سب کا بیان ہے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ اَوْتَاد، وَتَد کی جمع ہے، میخ کو کہتے ہیں۔ فرعون کو ذِي الْأَوْتَادِ کہنے کی مختلف وجوہ حضراتِ مفسرین نے بیان فرمائی ہیں، مشہور جمہور مفسرین کے نزدیک وہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اُوپر آچکی ہے کہ اس لفظ میں اُس کے ظلم و جور اور وحشیانہ سزاؤں کا ذِکر ہے، وہ جس پر خفا ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں چار میخوں میں باندھ کر یا خود ان میں میخیں گاڑ کر اس کو دُھوپ میں لٹا دیتا اور اس پر سانپ بچھو چھوڑ دیتا تھا۔ اور بعض مفسرین نے اس کی اپنی بیوی حضرت آسیہ کے متعلق ایک طویل قصہ اُن کے مؤمن ہونے اور پھر فرعون کے سامنے اِظہارِ اِیمان کرنے کا اور پھر فرعون کی اسی قسم کی سزا کے ذریعے ہلاک کرنے کا ذِکر کیا ہے۔ (مظہری) [۲]

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ قومِ عاد و ثمود اور قومِ فرعون کے شر و فساد کا تذکرہ فرماتے ہوئے جو عذاب اُن پر نازل ہوا، اُس کو عذاب کا کوڑا برسانے کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، اس میں اِشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح کوڑا مختلف اطرافِ بدن پر پڑتا ہے ان پر بھی مختلف قسم کے عذاب نازل کئے گئے۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ مِرْصَاد اور مَرْصَد، رصدگاہ اور اِنتظارگاہ کو کہا جاتا ہے، جو کسی مقامِ بلند پر ہو، جہاں بیٹھ کر کوئی شخص دُور دُور تک کے لوگوں کو دیکھ سکے، اور ان کے افعال و اعمال کی نگرانی کرسکے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر انسان کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے اور سب کو اُن کی جزا و سزا دینے والا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ ہی ان قسموں کا جواب ہے جو وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ میں مذکور ہوئی ہیں۔

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۴۷

[۲] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۲۵۵ و۲۵۶

دُنیا میں رزق کی فراخی اور تنگی، اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ الآیۃ، یہاں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے، جو اللہ تعالیٰ کے متعلق جو چاہے خیال باندھ لے، مگر مفہومِ عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو، اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے رزق میں وسعت اور مال و دولت، صحت و تندرستی سے نوازے تو شیطان اس کو دو باطل خیالات میں مبتلا کرتا ہے، اوّل یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت اور عقل و فہم اور سعی و عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو مجھے ملنا ہی چاہئے، میں اس کا مستحق ہوں، دُوسرے یہ کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے سے یہ قرار دے کہ میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں، اگر مردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا اسی طرح جب کسی انسان پر رزق میں تنگی اور فقر و فاقہ آئے تو اس کو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے اور اُس پر اس لئے خفا ہو کہ میں تو مستحق اِنعام و اِکرام کا تھا، مجھے بے وجہ ذلیل و حقیر کر دیا، ایسے خیالات کفار و مشرکین میں تو ہوتے ہی تھے اور قرآنِ کریم میں کئی جگہ کفار کے ان خیالات کا اِظہار مذکور بھی ہے، افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حق تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے انسانوں کا حال ذِکر کر کے فرمایا كَلَّا یعنی تمہارا یہ خیال بالکل باطلِ بے بنیاد ہے، نہ دُنیا میں وسعتِ رزق نیک اور مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہے، اور نہ تنگیٔ رزق اور فقر و فاقہ اللہ کے نزدیک مردود یا ذلیل ہونے کی علامت ہے، بلکہ اکثر معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ فرعون کو دعوائے خدائی کے ساتھ کبھی دردِ سر بھی نہ ہوا، اور بعض پیغمبروں کو دُشمنوں نے آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات مہاجرین میں سے جو فقیر و مفلس تھے وہ اغنیاء مہاجرین سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے (رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، مظہری) [1]

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندے سے محبت فرماتے ہیں، اس کو دُنیا سے ایسا پرہیز کراتے ہیں جیسے تم لوگ اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو۔ (رواہ احمد والترمذی عن قتادۃ بن النعمان، مظہری) [2]

یتیم پر صرف خرچ کرنا کافی نہیں، اُس کا اِحترام بھی ضروری ہے

اس کے بعد کفار کو ان کی چند بُری خصلتوں پر تنبیہ ہے، اوّل: لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ یعنی تم یتیم بچے کا اِکرام نہیں

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۵۸، وصحیح مسلم، کتاب الزُّهد، فصل فی الصبر علیٰ قلۃ ما یجد ودخول الفقراء الجنۃ قبل الأغنیاء أربعین خریفًا، ج:۲ ص:۴۱۰

[2] تفسیر المظہر ج:۱۰ ص:۲۵۸، وجامع الترمذی، ابواب الطب، باب ما جاء فی الحمیۃ ج:۲ ص:۲۳

کرتے۔ اس میں اصل بتلانا تو یہ ہے کہ یتیم کے حقوق ادا نہیں کرتے، اس پر ضروری خرچ نہیں کرتے، لیکن اس کی تعبیر اِکرام کے عنوان سے کی گئی، جس میں اشارہ ہے کہ عقل و انسانیت کا اور اللہ نے جو مال تمہیں دیا ہے اس کے شکر کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم یتیم کو فقط یہی نہیں کہ اس کا حق دو، اور اس پر خرچ کرو، بلکہ واجب ہے کہ اس کا اِکرام بھی کرو، اپنے بچوں کے مقابلے میں اُس کو ذلیل وحقیر نہ جانو۔ یہ بظاہر کفار کے اس قول کا جواب ہے کہ دُنیا کی فراخی کو اِکرام اور تنگی کو اہانت سمجھا کرتے تھے، اس پر حرف بَلْ کے ساتھ یہ ذِکر فرمایا کہ اگر تمہیں کبھی تنگیٔ رزق پیش آتی ہے تو وہ اس وجہ سے کہ تم ایسی بُری عادتوں میں پھنسے ہوئے ہو کہ یتیم جیسے قابلِ رحم بچوں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے۔ دُوسری بُری خصلت اُن کی یہ بتلائی وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ یعنی تم خود تو کسی مسکین غریب کو کیا دیتے دُوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہیں دیتے کہ وہ بھی یہ کام کریں۔ اس عنوان میں بھی ان کفار کی بُری عادت اور مذمت کے بیان کے ساتھ اس طرف اشارہ ہے کہ غرباء ومساکین کا حق جیسے اغنیاء اور مال داروں پر ہے کہ اُن کو اپنے پاس سے دیں، اسی طرح جو لوگ خود دینے کی قدرت نہیں رکھتے ان کو بھی اتنا تو کرنا چاہئے کہ دُوسروں ہی کو اس کے لئے ترغیب دیں۔

تیسری بُری خصلت یہ بیان فرمائی وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ لَمّ کے معنی جمع کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم میراث کا مال حلال وحرام سب کو جمع کرکے کھاجاتے ہو، اپنے حصے کے ساتھ دُوسروں کا حصہ بھی غصب کرلیتے ہو۔ یہاں خصوصیت سے میراث کے مال کا ذِکر کیا گیا، حالانکہ ہر ایک مال جس میں حلال وحرام کو جمع کیا گیا ہو، ناجائز ہی ہے، وجہِ خصوصیت کی شاید یہ ہو کہ میراث کے مال پر زیادہ نظر رکھنا اور اُس کے درپے ہونا بڑی کم ہمتی اور کم حوصلہ ہونے کی دلیل ہے کہ مردار خور جانوروں کی طرح تکتے رہیں کہ کب ہمارا مورِث مرے اور کب ہمیں یہ مال تقسیم کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔ اُولوالعزم اور باہمت لوگ اپنی کمائی پر خوش ہوتے ہیں، مُردوں کے مال پر ایسی حریصانہ نظر نہیں ڈالتے۔

چوتھی بُری خصلت یہ بتلائی وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾ جَمّ کے معنی کثیر کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم مال کی محبت بہت کرتے ہو، بہت کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ مال کی ایک درجہ میں محبت تو اِنسان کا فطری تقاضا ہے، وہ سببِ مذمت نہیں، بلکہ اس کی محبت میں حد سے بڑھنا اور انہماک کرنا یہ سببِ مذمت ہے۔ کفار کی ان بُری خصلتوں کے بیان کے بعد پھر اصل مضمون کی طرف عود کیا گیا جو شروع سورت میں پانچ قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے، یعنی آخرت کی جزا وسزا، اس سلسلے میں اوّل قیامت کے آنے کا ذِکر فرمایا۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ لفظ دَكّ کے لفظی معنی کسی چیز کو ضرب مار کر توڑنے کے ہیں، مراد قیامت کا زلزلہ ہے جو پہاڑوں کو باہم ٹکرا کر ریزہ ریزہ کردے گا، اور دَكًّا دَكًّا کو مکرّر لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ یکے بعد دیگر مسلسل رہے گا۔

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ یعنی آئے گا آپ کا رَبّ اور فرشتے صف بہ صف۔ مراد میدانِ حشر میں آنا ہے، اللہ تعالیٰ کے آنے کی کیا شان ہوگی؟ اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ متشابہات میں سے ہے۔ اور فرشتوں کا صف بہ صف آنا ظاہر ہے۔ وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ یعنی لایا جائے گا اس روز جہنم کو۔ جہنم کو لائے جانے کا کیا مطلب ہے اور کس طرح میدانِ حشر میں لائی جائے گی اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ جہنم جو اَب ساتویں زمین کی تہ میں ہے، اُس وقت وہ بھڑک اُٹھے گی اور سمندر سب آگ ہو کر اُس میں شامل ہو جائیں گے، اس طرح جہنم عرصۂ حشر میں سب کے سامنے آجائے گی۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ اس جگہ تَذَكُّر سے مراد سمجھ میں آجانا ہے، یعنی کافر کو اُس روز سمجھ آئے گی کہ مجھے دُنیا میں کیا کرنا چاہئے تھا اور میں نے کیا کیا مگر اِس وقت یہ سمجھ میں آنا بے سود ہوگا کہ عمل اور اصلاحِ حال کا زمانہ گزر چکا، آخرت دارُالعمل نہیں، دارُالجزاء ہے۔ آگے اس تَذَكُّر کا بیان ہے کہ وہ تمنا کرے گا کہ کاش! وہ دُنیا میں کچھ نیک عمل کر لیتا یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾ پھر اس تمنا کا باطل اور غیر مفید ہونا بتلایا کہ اب جب کہ کفر و شرک کی سزا سامنے آگئی، اب اس تمنا سے کچھ فائدہ نہیں، اب تو عذاب اور پکڑ کا وقت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے برابر کوئی پکڑ نہیں ہوسکتی۔ کفار کے عذاب بیان کرنے کے بعد آخر میں مؤمن کا ثواب اور ان کا جنت میں داخل کیا جانا ذِکر فرمایا ہے۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ یہاں مؤمن کی رُوح کو نفسِ مطمئنہ کے لقب سے خطاب کیا گیا ہے۔ مطمئنہ کے لفظی معنی ساکنہ کے ہیں، مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذِکر اور اس کی اِطاعت سے سکون و قرار پاتا ہے، اس کے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے، اور یہ وہی نفس ہوسکتا ہے جو ریاضات و مجاہدات کر کے اپنی بُری عادات اور اَخلاقِ رذیلہ کو دُور کر چکا ہو۔ اِطاعتِ حق اور ذِکر اللہ اس کا مزاج اور شریعت اس کی طبیعت بن جاتی ہے، اس کو خطاب کر کے فرمایا گیا ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ یعنی لوٹ جاؤ اپنے رَبّ کی طرف۔ لوٹنے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مقام بھی رَبّ کے پاس تھا، اب وہیں واپس جانے کا حکم ہو رہا ہے، اس سے اُس روایت کی تقویت ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ مؤمنین کی ارواح ان کے اعمال ناموں کے ساتھ علّیّین میں رہیں گی، اور علّیّین ساتویں آسمان پر عرشِ رحمٰن کے سائے میں کوئی مقام ہے، کُل اَرواحِ اِنسان کا اصلی مستقر وہی ہے، وہیں سے رُوح لا کر اِنسان کے جسم میں ڈالی جاتی ہے، اور پھر موت کے بعد وہیں واپس جاتی ہے۔

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ یعنی یہ نفس اللہ تعالیٰ سے اس کے تکوینی اور تشریعی اَحکام پر راضی ہے، اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہے، کیونکہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے تقدیری اَحکام پر راضی ہونا ہی اس کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہوتا تو اس کو رضا بالقضا کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ یہ نفس اپنی موت کے وقت موت پر بھی راضی اور

خوش ہوتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَائَهٗ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَائَهٗ''، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ملنے کو پسند کرتا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اُس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ حدیث سن کر حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ سے ملنا تو موت ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے، لیکن موت تو ہمیں یا کسی کو بھی پسند نہیں! آپ نے فرمایا: یہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مؤمن کو موت کے وقت فرشتوں کے ذریعے اللہ کی رضا اور جنت کی بشارت دی جاتی ہے جس کو سن کر اس کو موت زیادہ محبوب ہو جاتی ہے، اسی طرح کافر کو موت کے وقت عذاب اور سزا سامنے کر دی جاتی ہے، اس لئے اس کو اُس وقت موت سے بڑھ کر کوئی چیز بُری اور مکروہ معلوم نہیں ہوتی۔ (رواہ البخاری ومسلم، مظہری) [1] خلاصہ یہ ہے کہ موت کی محبت یا کراہت اس وقت کی معتبر نہیں، بلکہ نزعِ رُوح کے وقت جو مرنے اور اللہ سے ملنے پر راضی ہے، اللہ بھی اس سے راضی، یہی مفہوم ہے رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ کا۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کر کے یہ حکم ہوگا کہ میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا! اس میں پہلے اللہ کے صالح اور مخلص بندوں میں شامل ہونے کا حکم ہے، پھر جنت میں داخل ہونے کا، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے اللہ کے صالح مخلص بندوں کے زُمرے میں شامل ہو، ان سب کے ساتھ ہی جنت میں داخلہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو دُنیا میں صالحین کی صحبت و معیت اختیار کرتا ہے، یہ علامت اس کی ہے کہ یہ بھی ان کے ساتھ جنت میں جائے گا، اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی دُعا میں فرمایا: وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ (النمل) [2] اور حضرت یوسف علیہ السلام نے دُعا میں فرمایا: وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾ (یوسف) [3] معلوم ہوا کہ صحبتِ صالحین وہ نعمتِ کبریٰ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس کی دُعا سے مستغنی نہیں۔

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ اس میں جنت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر کے ''میری جنت'' فرمایا، جو بڑا اِعزاز و اِکرام ہے، اور اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنت میں صرف یہی نہیں کہ ہر طرح کی راحتیں جمع ہیں اور دائمی ہیں، بلکہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے۔

---

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۲۶۲۔ وصحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من احبّ لقاء اللہ، احبّ اللہ لقائہ ج:۲ ص:۹۶۳، وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدّعاء والتوبة والاستغفار، باب من احبّ لقاء اللہ ...إلخ، ج:۲ ص:۳۴۳

[2] ترجمہ: اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے۔

[3] ترجمہ: اور مجھ کو خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے۔

آیاتِ مذکورہ میں مؤمنین کی جزاوثواب کو اس طرح ذِکر کیا گیا کہ اُن کی اَرواح کو حق تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ ملائک اِعزاز واِکرام کے ساتھ خطاب کیا جائے گا، جو ان آیات میں مذکور ہے۔ یہ خطاب کس وقت ہوگا اس میں بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد یہ خطاب ہوگا، اور سباقِ آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اُوپر جو عذاب کفار کا بیان ہوا ہے وہ آخرت میں قیامت کے بعد ہی ہوگا، اس سے ظاہر ہے کہ مؤمنین کا یہ خطاب بھی اسی وقت ہو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ خطاب مؤمنین کو موت کے وقت دُنیا ہی میں ہوتا ہے۔ بہت سی صحیح احادیث اس پر شاہد ہیں۔ اسی لئے اِبنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں وقتوں میں یہ خطاب اَرواحِ مؤمنین کو ہوگا، موت کے وقت بھی، پھر قیامت میں بھی۔ [۱]

وہ احادیث جن سے اس خطاب کا بوقتِ موت ہونا معلوم ہوتا ہے، ایک تو وہی حدیثِ عبادہ بن صامت ہے، جو اُوپر گزر چکی ہے، اور ایک طویل حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسند احمد، نسائی، ابنِ ماجہ میں ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مؤمن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا سامنے کر کے اس کی رُوح کو خطاب کرتے ہیں: ''اُخْرُجِيْ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً اِلٰى رَوْحِ اللّٰهِ وَرَيْحَانِهٖ'' یعنی اس بدن سے نکلو! اس حالت میں کہ تم اللہ سے راضی ہو اور اللہ تم سے راضی، اور یہ نکلنا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جنت کی دائمی راحتوں کی طرف ہوگا، الحدیث۔ [۲] اور حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے ایک روز یہ آیت يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھی، تو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جو مجلس میں موجود تھے کہنے لگے: یارسول اللہ! یہ کتنا اچھا خطاب اور اِکرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سن لو! فرشتہ موت کے بعد آپ کو یہ خطاب کرے گا۔ (ابنِ کثیر) [۳]

چند واقعاتِ عجیبہ

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما کا طائف میں انتقال ہوا، جنازہ تیار ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب پرندہ جس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی، آیا اور جنازے کی نعش میں داخل ہوگیا، پھر کسی نے اُس کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، جس وقت نعش قبر میں رکھی جانے لگی تو قبر کے کنارے ایک غیبی آواز نے یہ آیت

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۰۰

[۲] سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب ما یلقی به المؤمن من الکرامة ج:۱ ص:۲۵۹، وسنن ابن ماجة، ابواب الزُّهد، باب ذکر الموت والإستعداد له (بألفاظ مختلفة) ج:۲ ص:۳۱۴، ومسند احمد، مسند ابی هریرة رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۸۷۶۹

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۰۱، وتاریخ دمشق ج:۳۰ ص:۴۳۳

پڑھی: یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ... اِلـخ، سب نے تلاش کیا کہ کون پڑھ رہا ہے کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ (ابن کثیر) [۱] اور امام حافظ طبرانی نے کتاب العجائب میں اپنی سند سے فتان بن رزین ابی ہاشم سے ان کا اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہمیں بلادِ رُوم میں قید کرلیا گیا اور وہاں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، اس کافر بادشاہ نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اس کا دِین اِختیار کریں، اور جو اس سے اِنکار کرے گا اُس کی گردن مار دِی جائے گی، ہم چند آدمی تھے، اُن میں سے تین آدمی جان کے خوف سے مرتد ہوگئے، بادشاہ کا دِین اِختیار کرلیا، چوتھا آدمی پیش ہوا اُس نے کفر کرنے اور اس کے دِین کو اِختیار کرنے سے اِنکار کیا، اس کی گردن کاٹ کر سر کو ایک قریبی نہر میں ڈال دیا گیا، اُس وقت تو وہ سر پانی کی تہ میں چلا گیا، اس کے بعد پانی کی سطح پر اُبھرا اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر ان کے نام لے کر آواز دِی کہ فلانے فلانے، اور پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ اس کے بعد پھر پانی میں غوطہ لگا دیا۔

یہ عجیب واقعہ سب حاضرین نے دیکھا اور سنا، اور وہاں کے نصاریٰ یہ دیکھ کر تقریباً سب مسلمان ہوگئے اور بادشاہ کا تخت ہل گیا، یہ تین آدمی جو مرتد ہوگئے تھے، یہ سب پھر مسلمان ہوگئے، اور پھر خلیفہ ابوجعفر منصور نے ہم سب کو اُن کی قید سے رہا کرایا۔ (ابن کثیر) [۲]

الحمدللہ کہ تفسیر سورۂ والفجر آج ۲۱ رشعبان ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی، جب کہ اس ناکارہ گنہگار کی عمر کا چھیتّرواں سال ختم اور ستترواں شروع ہورہا ہے، یوں نصف صدی سے زیادہ حق تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں، گناہوں میں برباد کرنے پر حسرت و افسوس جتنا بھی ہو کم ہی ہے، مگر قدم قدم پر حق تعالیٰ شانہٗ کے اِنعامات کی بارش اور اپنی کتاب کی اس ناچیز خدمت کو قریب الختم پہنچا دینے کا احسانِ عظیم عفو و کرم ہی کی اُمید دِلا رہا ہے۔

یَا مَنْ لَّا تَضُرُّهُ الذُّنُوْبُ وَلَا تَنْقُصُهُ الْمَغْفِرَةُ، هَبْ لِیْ مَا لَا یَنْقُصُكَ وَاغْفِرْ لِیْ مَا لَا یَضُرُّكَ، وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ یُقَالُ لَهُمْ: یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۰۱، وتفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۵۸، وسیر اعلام النبلاء، فی ذکر عباس بن عبدالمطلب رضی الله عنه، ج:۳ ص:۳۳۲

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۰۱

سُورَةُ البَلَد

آیاتها ۲۰ ۹۰ سُوْرَةُ البَلَدِ مَكِّيَّةٌ ۳۵ رکوعها ۱

سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۝۱ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۝۲ وَ وَالِدٍ

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی، اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں، اور قسم ہے جنتے کی

وَّ مَا وَلَدَ ۝۳ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ كَبَدٍ ۝۴ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ

اور جو اُس نے جنا، تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں، کیا خیال رکھتا ہے وہ کہ اس پر بس نہ چلے گا

اَحَدٌ ۝۵ یَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝۷ وقف لازم

کسی کا کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں۔ کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اس کو کسی نے

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝٨ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝٩ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠

بھلا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ اور دکھلادیں اس کو دو گھاٹیاں

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝١١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝١٢ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝١٣ اَوْ اِطْعٰمٌ

سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی چھڑانا گردن کا یا کھلانا

فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝١٤ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝١٥ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝١٦

بھوک کے دن میں، یتیم کو جو قرابت والا ہے یا محتاج کو جو خاک میں رُل رہا ہے

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝١٧

پھر ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝١٨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ

وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے وہ ہیں

الْمَشْئَمَةِ ۝١٩ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝٢٠

کمبختی والے، ان ہی کو آگ میں موند دیا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی ① جبکہ (اے پیغمبر!) تم اس شہر میں مقیم ہو، ② اور (قسم کھاتا ہوں) باپ کی اور اُس کی اولاد کی، ③ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ④ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس پر کسی کا بس نہیں چلے گا؟ ⑤ کہتا ہے کہ: "میں نے ڈھیروں مال اُڑا ڈالا ہے۔" ⑥ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کو کسی نے دیکھا نہیں؟ ⑦ کیا ہم نے اُسے دو

آنکھیں نہیں دیں؟ ⑧ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے؟ ⑨ اور ہم نے اُس کو دونوں راستے بتا دیئے ہیں۔ ⑩ پھر بھی وہ اُس گھاٹی میں داخل نہیں ہوسکا، ⑪ ــــــ اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ ⑫ کسی کی گردن (غلامی سے) چھڑا دینا، ⑬ یا پھر کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلا دینا ⑭ کسی رشتہ دار یتیم کو، ⑮ یا کسی مسکین کو جو مٹی میں رُل رہا ہو، ــــــ ⑯ پھر وہ اُن لوگوں میں بھی شامل نہ ہوا جو ایمان لائے ہیں، اور جنھوں نے ایک دوسرے کو ثابت قدمی کی تاکید کی ہے، اور ایک دوسرے کو رحم کھانے کی تاکید کی ہے۔ ⑰ یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے نصیب والے ہیں، ⑱ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہے، وہ نحوست والے لوگ ہیں۔ ⑲ اُن پر ایسی آگ مسلط ہوگی جو اُن پر بند کردی جائے گی۔ ⑳

خلاصۂ تفسیر

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور (جوابِ قسم سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ایک بشارت دی گئی کہ) آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے، (چنانچہ فتحِ مکہ کے روز آپ کے لئے قتال جائز کردیا گیا تھا، اَحکامِ حرم باقی نہیں رہے تھے)۔ اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی (ساری اولاد کے باپ آدم علیہ السلام ہیں، پس آدم اور بنی آدم سب کی قسم ہوئی، آگے جوابِ قسم ہے) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (چنانچہ عمر بھر کہیں مرض میں، کہیں رنج میں، کہیں فکر میں، اکثر اوقات مبتلا رہتا ہے، اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس میں عجز و درماندگی پیدا ہوتی اور اپنے کو بستۂ حکم تقدیر سمجھ کر مطیع اَمر و تابعِ رضا ہوتا، لیکن انسان کافر کی یہ حالت ہے کہ بالکل بھول میں پڑا ہے تو) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا (یعنی کیا اللہ کی قدرت سے اپنے کو خارج سمجھتا ہے جو اس قدر بھول میں پڑا ہے اور) کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا (یعنی ایک تو شیخی بھگارتا ہے، پھر عداوتِ رسول و مخالفتِ اسلام و معاصی میں خرچ کرنے کو ہنر سمجھتا ہے، پھر جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اس کو مالِ کثیر بتلاتا ہے) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے تو دیکھا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ معصیت میں خرچ کیا ہے، پس اس پر سزا دے گا۔ نیز مقدار بھی دیکھی ہے کہ اس قدر نہیں ہے جس قدر لوگوں کو یقین دِلانا چاہتا ہے۔ یہ حال مطلق کافر کا ہے کہ اس وقت آپ کے مخالفین کے یہی اقوال و اَحوال تھے، غرض یہ شخص نہ تو محَن یعنی تکلیف و رنج سے متأثر ہوا اور نہ مِنَن یعنی اِنعامات و اِحسانات سے، جس کا آگے بیان ہے کہ) کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور (پھر) ہم نے اس کو دونوں رستے (خیر و شر) کے بتلا دیئے (تاکہ طریقِ مضر سے بچے اور نافع پر چلے، سو اس کا بھی مقتضا یہ تھا کہ اَحکامِ اِلٰہی کا تابع ہوتا، مگر) سو وہ شخص (دِین کی) گھاٹی میں سے ہوکر نہ نکلا (دِین کے کاموں کو اس لئے گھاٹی کہا کہ نفس پر شاق ہے) اور آپ کو معلوم

ہے کہ گھاٹی (سے) کیا (مراد) ہے وہ کسی (کی) گردن کا (غلامی سے) چھڑا دینا ہے، یا کھانا کھلانا فاقے کے دِن میں کسی رشتہ دار یتیم کو، یا کسی خاک نشین محتاج کو، (یعنی ان اَحکام اِلٰہیہ کو بجالانا چاہئے تھا) پھر (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ان لوگوں میں سے نہ ہوا جو ایمان لائے اور ایک دُوسرے کو (ایمان کی) پابندی کی فہمائش کی اور ایک دُوسرے کو ترحم (علی الخلق) کی (یعنی ترکِ ظلم کی) فہمائش کی (ایمان تو سب سے مقدّم ہے، پھر اَمر بالثبات علی الایمان اوروں سے افضل ہے، پھر لوگوں کی ایذا سے بچنا بقیہ سے اہم ہے، پھر ان اعمال کا رُتبہ ہے جو فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ سے مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ تک مذکور ہیں، پس یہ ثُمَّ تفخیمِ رُتبہ کے لئے ہے، مطلب یہ کہ جمیع اُصول وفروع میں اِطاعت کرنا چاہئے تھا، آگے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...اِلخ کی جزا کا بیان ہے، یعنی) یہی لوگ داہنے والے ہیں (جن کی تفصیل جزا سورۂ واقعہ میں ہے، اور یہاں اس میں مطلق اہلِ ایمان خواص وعوام سب داخل ہیں) اور (آگے اُن کے مقابلین کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہیں (خود اُصول ہی میں مخالف ہیں، فروع کا تو کہنا کیا) وہ لوگ بائیں والے ہیں، ان پر آگ محیط ہوگی جس کو بند کردیا جائے گا (یعنی دوزخیوں کو دوزخ میں بھر کر آگے سے دروازہ بند کردیں گے، کیونکہ خلود کی وجہ سے نکلنا تو ملے گا ہی نہیں)۔

معارف ومسائل

- لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ حرف لَا اس جگہ زائد ہے، اور قسموں میں یہ حرف زائد لانا عرب کے محاورے میں معروف ہے، اور زیادہ اَصح یہ ہے کہ یہ حرف لَا مخاطب کے باطل خیال کی تردید کے لئے شروع قسم میں لایا جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو تم نے خیال باندھ رکھا ہے وہ نہیں، بلکہ ہم قسم کے ساتھ کہتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں۔ اور الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے جیسا کہ سورۂ والتین میں بھی شہرِ مکہ کی قسم کھائی ہے اور اس کے ساتھ اس کی صفت امین بھی بیان فرمائی: وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿۳﴾ شہرِ مکہ کی قسم کھانا اس شہر کی بہ نسبت دُوسرے شہروں کے شرافت وافضلیت کو بتلانا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت شہرِ مکہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ تو ساری زمین میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے، اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کردیا جاتا تو میں تیری زمین سے نہ نکلتا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ، مظہری)[1]

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۶۴، وجامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فی فضل مكة، ج:۲ ص:۲۳۰، وسنن ابن ماجة، ابواب المناسك، باب فی فضل مكة، ج:۲ ص:۲۲۴

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ لفظ حِلٌّ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ حلول سے مشتق ہو، جس کے معنی کسی شیٔ کے اندر سمانے اور رہنے اور اُترنے کے آتے ہیں، اس اعتبار سے حِلٌّ کے معنی اُترنے والے اور رہنے والے کے ہوں گے، اور مراد آیت کی یہ ہوگی کہ شہرِ مکہ خود بھی محترم اور مقدس ہے، خصوصاً جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس شہر میں رہتے ہیں، تو مکین کی فضیلت سے بھی مکان کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، اس لئے شہر کی عظمت وحرمت آپ کے اس میں مقیم ہونے سے دُہری ہوگئی۔ دُوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ حِلٌّ مصدر حِلَّتْ سے مشتق ہو، جس کے معنی کسی چیز کے حلال ہونے کے ہیں، اس اعتبار سے لفظ حِلٌّ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفارِ مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے کہ آپ کے قتل کے درپے ہیں، حالانکہ وہ خود بھی شہرِ مکہ میں کسی شکار کو بھی حلال نہیں سمجھتے، مگر اُن کا ظلم وسرکشی اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ جس مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں، اور خود ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، وہاں اُنہوں نے اللہ کے رسول کا قتل وخون حلال سمجھ لیا ہے۔ دُوسرے معنی حِلٌّ کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کے لئے حرمِ مکہ میں قتالِ کفار حلال ہونے والا ہے، جیسا کہ فتحِ مکہ میں ایک روز کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَحکامِ حرم اُٹھا لئے گئے تھے، اور کفار کا قتل حلال کر دیا گیا تھا۔ خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہی تیسرے معنی لے کر تفسیر کی گئی۔ مظہری میں تینوں اِحتمال مذکور ہیں،[1] اور تینوں معنی کی گنجائش ہے۔ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ وَالِدٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جو سب انسانوں کے باپ ہیں، اور مَا وَلَدَ سے اُن کی اولاد مراد ہے جو ابتدائے دُنیا سے قیامت تک ہوگی، اس طرح اس لفظ میں حضرت آدم اور تمام بنی آدم کی قسم ہوگئی۔ آگے جوابِ قسم مذکور ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝ كَبَدٍ کے لفظی معنی محنت ومشقت کے ہیں، معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اوّل عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابتدائے حمل سے رحمِ مادر میں محبوس رہا، پھر وِلادت کے وقت کی محنت ومشقت برداشت کی، پھر ماں کا دُودھ پینے، پھر اُس کے چھوٹنے کی محنت، پھر اپنے معاش اور ضروریاتِ زِندگی فراہم کرنے کی مشقت، پھر بڑھاپے کی تکلیفیں، پھر موت، پھر قبر، پھر حشر اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال کی جواب دہی، پھر جزا وسزا، یہ سب دَور اُس پر محنتوں ہی کے آتے ہیں، اور یہ محنت ومشقت اگرچہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، سب جانور بھی اس میں شریک ہیں، مگر اس حال کو اِنسان کے لئے بالخصوص اس لئے فرمایا کہ اوّل تو وہ سب جانوروں سے زیادہ شعور واِدراک رکھتا ہے، اور محنت کی تکلیف بھی بقدرِ شعور زیادہ ہوتی ہے، دُوسرے آخری اور سب سے بڑی محنت محشر میں دوبارہ زندہ ہو کر عمر بھر کے اعمال کا حساب دینا ہے، وہ دُوسرے جانوروں میں نہیں۔

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۶۴

بعض علماء نے فرمایا کہ کوئی مخلوق اتنی مشقتیں نہیں جھیلتی جتنی انسان برداشت کرتا ہے، باوجودیکہ وہ جسم اور جثّے میں اکثر جانوروں کی نسبت ضعیف وکمزور ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ انسان کی دِماغی قوّت سب سے زیادہ ہے، اسی لئے اُس کی تخصیص کی گئی۔ مکہ مکرمہ اور آدم علیہ السلام واولادِ آدم کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے اس حقیقت کو بیان فرمایا کہ انسان کو ہم نے شدّت ومحنت اور مشقت ہی میں اور اُسی کے لئے پیدا کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ انسان خود بخود پیدا نہیں ہوگیا، یا اس کو کسی دُوسرے انسان نے جنم نہیں دیا، بلکہ اس کا پیدا کرنے والا ایک قادرِ مختار ہے، جس نے اپنی حکمت سے ہر مخلوق کو خاص خاص مزاج اور خاص اعمال وافعال کی اِستعداد دے کر پیدا کیا ہے، اگر اِنسان کی تخلیق میں خود اِنسان کو کچھ دخل ہوتا تو وہ اپنے لئے یہ محنتیں مشقتیں کبھی تجویز نہ کرتا۔ (قرطبی) [1]

دُنیا میں مکمل راحت جس میں کوئی تکلیف نہ ہو، کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے انسان کو چاہئے کہ مشقت کے لئے تیار رہے

اس قسم اور جوابِ قسم میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری جو یہ خواہش ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے، کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، یہ خیالِ خام ہے، جو کبھی حاصل نہیں ہوگا، اس لئے ضروری ہے کہ ہر شخص کو دُنیا میں محنت ومشقت اور رنج ومصیبت پیش آئے، اور جب مشقت وکلفت پیش آنا ہی ہے تو عقل مند کا کام یہ ہے کہ محنت ومشقت اُس چیز کے لئے کرے جو اس کو ہمیشہ کام آئے اور دائمی راحت کا سامان بنے، اور وہ صرف اِیمان اور طاعتِ حق میں منحصر ہے۔ آگے غافل اور آخرت کے منکر اِنسان کی چند جاہلانہ خصلتوں کا ذِکر کرکے فرمایا: اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝ یعنی کیا یہ بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے اعمالِ بد کو کسی نے دیکھا نہیں اس کو جاننا چاہئے کہ اس کا خالق اُس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔

آنکھ اور زبان کی تخلیق میں چند حکمتیں

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ نَجْدَيْنِ تثنیہ نَجْدٌ کا ہے، جس کے لفظی معنی اس راستے کے ہیں جو اُوپر بلندی کی طرف جاتا ہو، مراد اس سے کھلا واضح راستہ ہے، اور ان دوراستوں میں ایک خیر وفلاح کا، دُوسرا شر وہلاکت کا راستہ ہے۔

سابقہ آیت میں انسان کی اس غفلت وجہالت پر تنبیہ تھی کہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے اُوپر اللہ تعالیٰ کو بھی قدرت نہیں،

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۶۳

اور یہ کہ اُس کے اعمال و افعال کو کوئی دیکھنے والا نہیں، اس آیت میں چند اُن نعمتوں کا ذِکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے وجود میں ایسی عطا فرمائی ہیں کہ خود اُن کی صنعت و حکمت ہی پر غور کرے تو حق تعالیٰ کی بے مثال حکمت و قدرت کا نظارہ انہی چیزوں میں کرے، ان میں پہلے دو آنکھوں کا ذِکر فرمایا کہ آنکھ کے نازک پردے، نازک شرایین (رگیں)، اُن میں قدرتی روشنی، پھر آنکھ کی وضع و ہیئت کہ یہ نازک ترین عضو ہے، اس کی حفاظت کا کیا سامان خود اس کی خلقت میں کیا گیا کہ اس کے اُوپر ایسے پردے ڈال دیئے جو خود کار مشین کی طرح جب کوئی مضر چیز سامنے سے آتی دِکھائی دے خود بخود بغیر کسی اِختیار کے بند ہو جاتے ہیں، ان پردوں کے اُوپر پلکوں کے بال کھڑے کر دیئے کہ گرد و غبار کو روک لیں، اس کے اُوپر بھوؤں کے بال رکھے کہ اُوپر سے آنے والی چیز براہِ راست آنکھ میں نہ پہنچے، اس کو چہرے کے اندر اس طرح فٹ کیا گیا کہ اُوپر سخت ہڈی ہے، نیچے رُخسارے کی سخت ہڈی ہے، آدمی کہیں چہرے کے بل گر جائے، یا اس کے چہرے پر کوئی چیز آ پڑے تو اُوپر نیچے کی ہڈیاں آنکھ کو بچالیں گی۔

دُوسری چیز زبان ہے، اس کی عجیب و غریب تخلیق اور دِل کی باتوں کی ترجمانی جو اس پُر اسرار اور خود کار مشین کے ذریعے ہوتی ہے، اس کے حیرت انگیز طریقۂ کار کو دیکھو کہ دِل میں ایک مضمون آیا، دِماغ نے اُس پر غور کیا، اُس کے لئے عنوان اور الفاظ تیار کئے، وہ الفاظ اس زبان کی مشین سے نکلنے لگے، یہ اتنا بڑا کام کیسی سرعت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ سننے والے کو یہ احساس بھی نہیں ہوسکتا کہ ان الفاظ کے زبان پر آنے میں اس کے پیچھے کتنی مشینری نے کام کیا ہے، تب یہ کلمات زبان پر آئے ہیں۔ زبان کے ساتھ شَفَتَيْنِ یعنی ہونٹوں کا ذِکر اس لئے بھی فرمایا کہ زبان کے کام میں ہونٹ بڑے مددگار ہیں، آواز و حروف کی ممتاز شکلیں وہی بناتے ہیں اور شاید اس لئے بھی کہ قدرت نے زبان کو ایسی سریع العمل مشین بنایا ہے کہ آدھے منٹ میں اس سے ایسا کلمہ بھی بولا جاسکتا ہے جو اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچادے، جیسے کلمۂ ایمان، یا دُنیا میں دُشمن کی نظر میں بھی اس کو محبوب بنادے جیسے پچھلے قصور کی معافی، اور اسی زبان سے اتنے ہی وقفے میں ایسا کلمہ بھی بولا جاسکتا ہے جو اس کو جہنم میں پہنچادے، جیسے کلمۂ کفر، یا دُنیا میں اس کے بڑے سے بڑے مہربان دوست کو اس کا دُشمن بنادے، جیسے گالی گلوچ وغیرہ۔ جس طرح زبان کے منافع بے شمار ہیں، اس کی ہلاکت آفرینی بھی اسی انداز کی ہے، گویا یہ ایک تلوار ہے جو دُشمن پر بھی چل سکتی ہے اور خود اپنا گلا بھی کاٹ سکتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس تلوار کو دو ہونٹوں کے غلاف میں مستور کر کے عطا فرمایا۔ اور اس جگہ ہونٹوں کا ذِکر کرنا اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ جس مالک نے انسان کو زبان دِی، اُس نے اُس کو روکنے، بند کرنے کے لئے ہونٹ بھی دیئے ہیں، اس لئے اس کے استعمال میں سوچ سمجھ سے کام لے، بے موقع اس کو ہونٹوں کی میان سے نہ نکالے، تیسری چیز دو راستوں کی ہدایت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر اور بھلے بُرے کی پہچان کے لئے ایک استعداد اور مادّہ خود اس کے وجود میں رکھ دیا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے

فرمایا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾ (الشمس) یعنی نفسِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ دونوں کے مادّے رکھ دیئے ہیں، تو اس طرح ایک اِبتدائی ہدایت انسان کو خود اس کے ضمیر سے ملتی ہے، پھر اس ہدایت کی تائید کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں آتی ہیں، جو ان کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جاہل اور غافل انسان قدرتِ حق کے منکر ذرا اپنے ہی وجود کی چند نمایاں چیزوں میں غور کریں تو قدرت و حکمتِ حق کے کمال کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ آنکھوں سے دیکھو، پھر زبان سے اِقرار کرو، پھر دو راستوں میں سے خیر کے راستے کو اِختیار کرو۔

آگے پھر اس کی غفلت شعاری اور بے فکری پر تنبیہ ہے کہ ان روشن دلائل سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اور اس کے ذریعے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب دینے کا یقین ہو جانا چاہئے، اس یقین کا مقتضا یہ تھا کہ یہ خلقِ خدا کو نفع اور راحت پہنچاتا، اُن کی ایذاؤں سے بچتا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور خود اپنی اصلاح کرتا اور دُوسرے لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا، تاکہ قیامت میں وہ اصحابِ یمین یعنی اہلِ جنت میں شامل ہو جائے، مگر اس بدنصیب نے ایسا نہ کیا، بلکہ کفر پر قائم رہا، جس کا انجام جہنم کی آگ ہے۔ آخر سورت تک یہ مضمون بیان ہوا ہے، اس میں چند نیک اعمال کے اِختیار نہ کرنے کو ایک خاص انداز سے بیان فرمایا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ عَقَبَہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستے کو یعنی گھاٹی کو بھی، اور دُشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اُوپر چڑھ کر دُشمن سے اپنے کو بچالے، یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر یہاں سے نکل جائے۔ اس جگہ طاعات و عبادات کو ایک عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس طرح عقبہ دُشمن سے نجات دِلانے کا سبب ہوتا ہے، اعمالِ صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں، پھر اِن اعمالِ صالحہ میں پہلے فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ فرمایا، یعنی کسی غلام کو آزاد کرنا کہ بہت بڑی عبادت اور ایک انسان کی زندگی کو بنا دینا ہے۔ دُوسری چیز اَوْ اِطْعٰمٌ بیان فرمائی کہ بھوکے کو کھانا کھلانا بہت بڑا ثواب ہے، اور کھانا کھلانا کسی کو بھی ہو ثواب سے خالی نہیں، مگر بعض کو کھلانا بہت بڑا ثواب بن جاتا ہے، اس لئے اُس بڑے ثواب کے حاصل کرنے کے لئے فرمایا: يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ یعنی خصوصاً جب کھانا کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ تمہاری قرابت اور رِشتہ داری بھی ہے تو اس میں دُہرا ثواب ہو گیا، ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا، دُوسرے رشتہ دار کی صلہ رحمی اور اس کا حق ادا کرنا۔ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یعنی بالخصوص ایسے دن میں اس کو کھانا کھلانا جس میں وہ بھوکا ہو اور بھی زیادہ موجبِ ثواب ہے۔ اسی طرح یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جس کی مسکنت نے اُس کو خاک نشین بنا رکھا ہے، مراد بہت زیادہ مفلس و محتاج ہے، اور جس پر خرچ کیا جائے وہ جتنا زیادہ محتاج ہوگا، اُتنا ہی خرچ کرنے والے کا ثواب بڑھے گا۔

ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنی نیکی پر اکتفا نہ کرے، دُوسروں کو بھی نیکی کی ہدایت کرتا رہے

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ اس آیت میں ایمان کے بعد مؤمن کا یہ فرض بتلایا گیا کہ وہ دُوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی صبر اور رحمت کی تلقین کرتا رہے۔ صبر سے مراد نفس کو بُرائیوں سے روکنا اور بھلائیوں پر عمل کرنا ہے۔ اور مرحمت سے مراد دُوسروں کے حال پر رحم کھانا، اُن کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر اُن کی ایذا اور اُن پر ظلم سے بچنا، اس میں تقریباً دِین کے سارے ہی اَحکام آگئے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْبَلَدِ بِحَمْدِ اللهِ ۲۳/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

سُورَۃُ الشَّمْس

اٰیاتھا ۱۵ | ۹۱ سُوْرَۃُ الشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ ۲۶ | رکوعھا ۱

سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پندرہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰہَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰہَا ۝۲ وَالنَّہَارِ اِذَا جَلّٰہَا ۝۳

قسم ہے سورج کی اور اُس کے دُھوپ چڑھنے کی اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے اور دِن کی جب اُس کو روشن کرلے

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰہَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰہَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰہَا ۝۶

اور رات کی جب اس کو ڈھانک لیوے اور آسمان کی اور جیسا کہ اُس کو بنایا اور زمین کی اور جیسا کہ اس کو پھیلایا

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰہَا ۝۷ فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰہَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ

اور جی کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی، تحقیق مراد کو پہنچا

مَنۡ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝ كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰىهَآ ۝

جس نے اُس کو سنوار لیا، اور نامراد ہوا جس نے اُس کو خاک میں ملا چھوڑا، جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے

اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ

جب اُٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بڑا بدبخت، پھر کہا اُن کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اُونٹنی سے

وَسُقۡيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ

اور اس کی پانی پینے کی باری سے پھر انہوں نے جھٹلایا اس کو، پھر پاؤں کاٹ ڈالے اُس کے، پھر اُلٹ مارا اُن پر اُن کے ربّ نے

بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا ۝

بسبب اُن کے گناہوں کے، پھر برابر کر دیا سب کو، اور وہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے سورج کی اور اُس کی پھیلی ہوئی دُھوپ کی، ① اور چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے آئے، ② اور دن کی جب وہ سورج کا جلوہ دِکھادے، ③ اور رات کی جب وہ اُس پر چھا کر اُسے چھپالے، ④ اور قسم ہے آسمان کی، اور اُس کی جس نے اُسے بنایا، ⑤ اور زمین کی، اور اُس کی جس نے اُسے بچھایا، ⑥ اور اِنسانی جان کی، اور اُس کی جس نے اُسے سنوارا، ⑦ پھر اُس کے دِل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اُس کے لئے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اُس کے لئے پرہیزگاری کی ہے، ⑧ فلاح اُسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے، ⑨ اور نامراد وہ ہوگا جو اُس کو (گناہ میں) دھنسادے۔ ⑩ قومِ ثمود نے اپنی سرکشی سے (پیغمبر کو) جھٹلایا، ⑪ جب ان کا سب سے سنگدل شخص اُٹھ کھڑا ہوا، ⑫ تو اللہ کے پیغمبر نے اُن سے کہا کہ: "خبردار! اللہ کی اُونٹنی کا اور اُس کے پانی پینے کا پورا خیال رکھنا"۔ ⑬ پھر بھی اُنہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا، اور اُس اُونٹنی کو مار ڈالا۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے پروردگار نے اُن کے گناہ کی وجہ سے اُن کی اِینٹ سے اِینٹ بجا کر سب کو برابر کر دیا۔ ⑭ اور اللہ کو اس کے کسی بُرے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے۔ ⑮

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے سورج کی اور اُس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج (کے غروب) سے پیچھے آئے (یعنی طلوع ہو، مراد اس سے وسطِ ماہ کی بعض شبوں کا چاند ہے کہ سورج کے چھپنے کے بعد طلوع ہوتا ہے، اور یہ قید شاید اس لئے ہو کہ وہ وقت کمالِ نور کا ہوتا ہے، جیسا وَضُحٰهَا کا اِشارہ ہے کمالِ نورِ آفتاب کی طرف، اور یا اس وقت دو آیت قدرت علیٰ سبیل التعاقب والاتصال ظاہر ہوتی ہیں، غروبِ شمس وطلوعِ قمر) اور (قسم ہے) دِن کی جب وہ اس (سورج) کو خوب روشن کردے اور (قسم ہے) رات کی جب وہ اس (سورج) کو (اور اس کے آثار وانوار کو بالکلیہ) چھپالے (یعنی خوب رات ہوجائے کہ دِن کی روشنی کا کچھ اثر نہ رہے، اور چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی گئی ہے اُن میں جو قیدیں لگائی گئی ہیں، وہ اُن کے کمال کے اعتبار سے ہیں، یعنی ہر ایک کی قسم ان کی حالتِ کمال کے اِعتبار سے ہے) اور (قسم ہے) آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا (مراد اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح وَمَا طَحٰهَا اور وَمَا سَوّٰىهَا میں بھی اور مخلوق کی قسم کو خالق کی قسم پر مقدم فرمانا اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس میں ذہن کو دلیل سے مدلول کی طرف منتقل کرنا ہے، کیونکہ مصنوع دلیل ہے صانع پر، تو اس میں اِستدلال علی التوحید کی طرف بھی اشارہ ہوگیا) اور (قسم ہے) زمین کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بچھایا اور (قسم ہے انسان کی) جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو (ہر طرح صورت، شکل، اعضا سے) دُرست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو اِلقا کیا (یہ اسناد باعتبار تخلیق کے ہے، یعنی قلب میں جو نیکی کا رُجحان ہوتا ہے، یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے، دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، گو اِلقاءِ اوّل میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے اور ثانی میں شیطان، پھر وہ رُجحان ومیلان کبھی مرتبۂ عزم تک پہنچ جاتا ہے جو کہ انسان کے قصد واِختیار سے صادر ہوتا ہے، اسی قصد واِختیار پر عذاب وثواب مرتب ہوتا ہے، جس کے بعد صدورِ فعل بہ تخلیقِ حق ہوتا ہے، اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا، وہ معاف ہے۔ آگے مضمون کی تکمیل کے لئے اہلِ فجور واہلِ تقویٰ کا مآل بتلاتے ہیں کہ) یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کرلیا (یعنی نفس کو فجور سے روکا اور تقویٰ اِختیار کرلیا)، اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبادیا (اور فجور سے مغلوب کردیا، اس کے بعد جوابِ قسم مقدّر ہے، یعنی اے کفارِ مکہ جب تم اہلِ فجور ہو تو ضرور مبتلائے غضب وہلاک ہوگے، آخرت میں تو یقیناً اور دُنیا میں بعض اوقات جیسا کہ قومِ ثمود اس فجور کی وجہ سے غضبِ الٰہی اور عذاب کی مورد بنی جن کا قصہ یہ ہے کہ) قومِ ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالح علیہ السلام کی) تکذیب کی (اور یہ اس زمانے کا قصہ ہے) جب کہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ (اُونٹنی کے قتل کرنے کے لئے) اُٹھ کھڑا ہوا (یعنی آمادہ ہوگیا اور اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے) تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالح علیہ السلام) نے (جب ان کو اس عزمِ قتل کی

اطلاع ہوئی، کذا فی الخازن [۱]) فرمایا کہ اللہ کی (اس) اُونٹنی سے اور اس کے پانی پینے سے خبر دار رہنا (یعنی اس کو قتل مت کرنا اور نہ اس کا پانی بند کرنا، چونکہ ارادۂ قتل کا اصل سبب بھی پانی کی باری تھی، اس لئے اس کی تصریح فرمائی، اور اللہ کی اُونٹنی اس لئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو معجزے کے طور پر عجیب طرح سے پیدا کر کے دلیلِ نبوّت بنا دیا اور اس کے اِحترام کو واجب فرمایا) سو اُنھوں نے پیغمبر کو (یعنی دلیلِ نبوّت کو جو ناقۃ اللہ کے ذریعے ظاہر ہوئی) جھٹلایا (کیونکہ وہ اُن کو نبی نہ سمجھتے تھے) پھر اس اُونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے اُن کے گناہ کے سبب اُن پر ہلاکت نازل فرمائی، پھر اس (ہلاکت) کو (تمام قوم کے لئے) عام فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کو اس ہلاکت کے اَخیر میں کسی خرابی (نکلنے) کا (کسی سے) اندیشہ نہیں ہوا (جیسے ملوک دُنیا کو بعض اوقات کسی قوم کو سزا دینے کے بعد اِحتمال ہوتا ہے کہ اس پر کوئی شورش وہنگامہ ملکی مرتب نہ ہو) مفصل قصہ ثمود کا اور اُونٹنی کا سورۂ اَعراف میں گزر چکا ہے)۔

معارف و مسائل

اس سورت کے شروع میں سات چیزوں کی قسم آئی ہے، اور ساتوں چیزوں کے ساتھ اُن کی حالتِ کمال کے اِعتبار سے کچھ اوصاف اور قیود ذِکر کئے گئے ہیں۔ پہلی قسم وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ یہاں اگرچہ ضُحٰی کو واوِ عطف کے ساتھ ذِکر کیا ہے، مگر بقرینہ بعد کی اشیاء کے ضحٰی کا ذِکر بطور وصفِ شمس کے ہے، یعنی قسم ہے آفتاب کی جب کہ وہ وقتِ ضحیٰ میں ہو۔ ضحٰی اس وقت کو کہا جاتا ہے جب آفتاب طلوع ہو کر کچھ بلند ہو جائے اور اُس کی روشنی زمین پر پھیل جائے، اس وقت میں وہ انسان کو قریب نظر آتا ہے اور تمازت زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اُس کو پوری طرح دیکھ بھی سکتے ہیں۔

دُوسری قسم وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ یعنی چاند کی قسم جب کہ وہ آفتاب کے پیچھے آئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب چاند غروبِ آفتاب کے بعد طلوع ہو اور یہ مہینے کے وسط میں ہوتا ہے، جب کہ چاند تقریباً مکمل ہوتا ہے اور پیچھے آنے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح کہ ضحیٰ کے وقت میں آفتاب بکمال نظر آتا ہے، اسی طرح جب کہ چاند اُس کے پیچھے آئے، یعنی کامل ہونے میں آفتاب کے تابع ہو جائے۔ تیسری قسم وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳ جَلّٰىهَا کی ضمیر زمین یا دُنیا کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے، اگرچہ اس سے پہلے زمین اور دُنیا کا ذِکر نہیں آیا، مگر محاوراتِ عرب میں ایسی چند چیزیں جو عموماً انسانوں کے سامنے رہتی ہیں، اُن کی طرف بغیر ذِکر ماسبق کے بھی ضمیر راجع کر دینا مشہور و معروف ہے، اور قرآنِ کریم میں بھی اس کی نظائر موجود ہیں۔ اس اِعتبار سے معنی یہ ہوئے کہ قسم ہے دِن کی اور دُنیا کی، یا زمین کی جس کو دِن نے روشن کر دیا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دِن کی قسم اس حالت کے اِعتبار سے ہے جب کہ وہ پوری طرح روشن

---

[۱] تفسیر الخازن ج:۶ ص: ۲۷۱

ہوجائے، اور عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ قسم ہے دن کی جب کہ وہ آفتاب کو روشن کردے۔ یہ اسناد مجازی ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ جب دن نکل آنے کے سبب آفتاب روشن نظر آنے لگے۔

چوتھی قسم وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴ یعنی قسم ہے رات کی جب کہ وہ آفتاب پر چھا جائے، یعنی آفتاب کی روشنی کو مستور کردے۔

پانچویں قسم وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ اس میں سباقِ نظم کے اعتبار سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ وَمَا بَنٰىهَا میں صرف مَا کو مصدر یہ قرار دے کر معنی یہ لئے جائیں کہ قسم ہے آسمان اور اس کے بنانے کی، جیسا قرآنِ کریم میں ہے: بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ [1] (یٰس:۲۷)۔ اسی طرح چھٹی قسم وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ میں بمعنی مصدر لے کر ترجمہ یہ ہوا کہ قسم ہے زمین اور اس کے بچھانے پھیلانے کی، کیونکہ طَحْوٌ مصدر کے معنی بچھانے پھیلانے کے آتے ہیں۔ اس میں آسمان کے ساتھ بنانے کا اور زمین کے ساتھ بچھانے پھیلانے کا ذکر بھی اُسی حالتِ کمال کو بتلانے کے لئے ہے کہ قسم ہے آسمان کی اُس حالت میں جب کہ اُس کی تخلیق وتکوین مکمل ہوگئی، اور قسم ہے زمین کی جب کہ اس کو پھیلا کر اُس کی تخلیق مکمل کردی گئی۔ حضرت قتادہ وغیرہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ کشاف اور بیضاوی وقرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ [2] اور بعض حضراتِ مفسرین نے اس جگہ حرف مَا کو بمعنی مَنْ لے کر اس کی مراد حق تعالیٰ کی ذات لی ہے کہ قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی۔ اسی طرح وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ کا مفہوم یہ بیان کیا گیا کہ قسم ہے زمین اور اُس کے پھیلانے والے کی۔ مگر یہاں جتنی قسمیں اب تک مذکور ہوئیں اور جو آگے آرہی ہیں، وہ سب مخلوقات کی قسمیں ہیں، درمیان میں ذاتِ حق کی قسم آجانا نسق اور ترتیب سے بعید معلوم ہوتا ہے، اور اس صورت میں جو اُوپر لکھی گئی ہے، یہ اشکال بھی نہیں لازم آتا کہ مخلوقات کی قسم کو ذاتِ خالق پر مقدم کیوں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ اس میں مَا کو مصدر یہ لیا جائے تو معنی یہ ہیں کہ قسم ہے انسانی جان کی اور اس کے دُرست ومتناسب کرنے کی، اور اگر مَا کو بمعنی مَنْ لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ قسم ہے نفس کی اور اس کے برابر دُرست کرنے والے کی، تسویہ یعنی دُرست اور برابر کرنے کا مفہوم اس سے پہلی سورتوں میں آچکا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ اِلہام کے معنی دِل میں ڈالنا، فجور کے معنی کھلا گناہ، اور تقویٰ کا مفہوم معروف ومشہور ہے۔ یہ جملہ بھی ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ کے ساتھ مربوط ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو بنایا، پھر

---

[1] ترجمہ: کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا۔

[2] تفسير البيضاوي ج:۵ ص:۴۰۱، وتفسير الكشاف ج:۷ ص:۲۹۵

اس کے دِل میں فجور اور تقویٰ دونوں کا اِلہام کر دیا، مراد یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور طاعت دونوں کے مادّے اور اِستعداد رکھ دی ہے، پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اِختیار اور قدرت دے دی کہ وہ اپنے قصد و اِختیار سے گناہ کی راہ اِختیار کر لے یا طاعت کی، جب وہ اپنے قصد و اِختیار سے ان میں سے کوئی راہ اِختیار کرتا ہے تو اسی قصد و اِختیار پر اس کو ثواب یا عذاب ملتا ہے، اس تفسیر سے وہ شبہ رفع ہو گیا کہ گناہ اور طاعت جب خود اِنسان کی تخلیق میں رکھ دی گئی تو وہ اس کے کرنے پر مجبور ہوا، ایسی صورت میں وہ نہ کسی ثواب کا مستحق ہے، نہ عذاب کا، اور یہ تفسیر ایک حدیثِ مرفوع سے مستفاد ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلۂ تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [۱] اس آیت سے مسئلۂ تقدیر کے شبہ کا جواب اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ الہام، فجور و تقویٰ سے مراد یہ لیا جائے کہ دونوں کے مادّے اور اِستعداد میں حق تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے اندر رکھ دیئے ہیں، مگر اس کو ان میں سے کسی ایک پر مجبورِ محض نہیں کیا، بلکہ اُس کو قدرت و اِختیار دِیا کہ ان میں سے جس کو جی چاہے اِختیار کر سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت تلاوت فرماتے تو بلند آواز سے یہ دُعا پڑھا کرتے تھے: ”اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا وَاَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا“ [۲] یعنی یا اللہ! میرے نفس کو تقویٰ کی توفیق عطا فرما، آپ ہی میرے نفس کے ولی اور مربی ہیں۔

ان سات قسموں کے بعد جوابِ قسم میں فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ⑨ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ⑩ یعنی بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا۔ تزکیہ کے اصلی معنی باطنی پاکی کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کر کے اپنے ظاہر و باطن کو پاک کر لیا۔ اور محروم ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی دلدل میں دھنسا دیا، لفظ دَسّٰى، دَسٌّ سے مشتق ہے، جس کے معنی زمین میں دفن کر دینے کے ہیں، کما قال تعالیٰ: اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ [۳] (النحل:۵۹) اور بعض مفسرین نے یہاں زَكّٰى اور دَسّٰى دونوں میں ضمیر فاعل اللہ کی طرف راجع کر کے معنی یہ کئے ہیں کہ بامراد ہوا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے پاک کر دیا، اور نامراد و محروم ہوا وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں میں دھنسا دیا، اس آیت نے کُل انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ایک بامراد، دُوسرا نامراد، آگے اس دُوسری قسم کے لوگوں کا ایک واقعہ بطورِ مثال کے پیش کر کے اُن کے اَنجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے کہ ان نامرادوں کو آخرت میں تو سخت سزا ملے ہی گی، بعض اوقات دُنیا میں بھی

---

[۱] صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه ...إلخ، ج:۲ ص:۳۳۳

[۲] تفسير القرطبي ج:۲۰ ص:۷۶، والمعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث:۱۱۰۲۸، ومجمع الزوائد، كتاب التفسير، باب سورة الشمس، رقم الحديث:۱۱۴۹۵

[۳] ترجمہ: یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔

اُن کو سزا کی ایک قسط دے دی جاتی ہے، جیسے قومِ ثمود کو پیش آیا۔ ان کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ اَعراف میں آچکا ہے، یہاں اس کی طرف اِجمالی اِشارہ فرما کر ان کے عذاب کا بیان فرمایا۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ دَمْدَمَہ کا لفظ ایسے سخت عذاب کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی شخص یا قوم پر بار بار آتا رہے یہاں تک کہ ان کو بالکل فنا کردے۔ اور فَسَوّٰىهَا کا مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب پوری قوم پر محیط ہوگیا جس میں مرد و عورت، بچہ بوڑھا سب برابر ہوگئے۔ آخر میں فرمایا: وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾ یعنی حق تعالیٰ کا عذاب اور کسی قوم کو تباہ کردینے کے معاملے کو دُنیا کے معاملات کی طرح نہ سمجھ کہ اس میں بڑے سے بڑا بادشاہ صاحبِ قوت و شوکت بھی جب کسی قوم کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جس میں پوری قوم کی ہلاکت ہے تو اس کو خود بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کے بقایا، یا ان کے حامی لوگ ہم سے اِنتقام لیں اور بغاوت کرنے لگیں، غرض دُنیا میں دُوسروں کو مارنے والا خود بھی کبھی بے خطر نہیں رہتا، جو دُوسروں پر حملہ کرتا ہے اس کو اپنے پر حملے کا خطرہ بھی لازماً برداشت کرنا پڑتا ہے، بجز حق تعالیٰ جل شانہٗ کے کہ اس کو کسی وقت کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الشَّمْسِ بِحَمْدِ اللّٰهِ ۲۴/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ اللَّيْلِ

اٰیاتھا ۲۱ ۔ ۹۲ سُورَةُ اللَّيْلِ مَكِّيَّةٌ ۹ ۔ رکوعھا ۱

سورۂ لیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝۱ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝۳

قسم رات کی جب چھا جائے! اور دن کی جب روشن ہو اور اُس کی جو اُس نے پیدا کئے نر اور مادہ

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶

تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے، سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا، اور سچ جانا بھلی بات کو،

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ

تو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے آسانی میں، اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا، اور جھوٹ جانا

بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾

بھلی بات کو، سو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے سختی میں، اور کام نہ آئے گا اس کے مال اس کا جب گڑھے میں گرے گا،

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ

ہمارا ذِمہ ہے راہ سجھادینا، اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دُنیا، سو میں نے سنادی تم کو خبر

نَارًا تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۶﴾

ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی، اُس میں وہی گرے گا جو بڑا بدبخت ہے، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا،

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ﴿۱۷﴾ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ

اور بچادیں گے اُس سے بڑے ڈرنے والے کو، جو دیتا ہے اپنا مال دِل پاک کرنے کو، اور نہیں کسی کا

عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۰﴾

اُس پر اِحسان جس کا بدلہ دے، مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے ربّ کی جو سب سے برتر ہے،

ع ۱۷ ۲۱

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾ ع

اور آگے وہ راضی ہوگا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے، (۱) اور دِن کی جب اُس کا اُجالا پھیل جائے، (۲) اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، (۳) کہ حقیقت میں تم لوگوں کی کوششیں الگ الگ قسم کی ہیں۔ (۴) اب جس کسی نے (اللہ کے راستے میں مال) دیا، اور تقویٰ اختیار کیا، (۵) اور سب سے اچھی بات کو دِل سے مانا، (۶) تو ہم اُس کو آرام کی منزل تک پہنچنے کی

تیاری کرادیں گے۔ ⑦ رہا وہ شخص جس نے بخل سے کام لیا، اور (اللہ سے) بے نیازی اختیار کی، ⑧ اور سب سے اچھی بات کو جھٹلایا، ⑨ تو ہم اُس کو تکلیف کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کرادیں گے۔ ⑩ اور جب ایسا شخص تباہی کے گڑھے میں گرے گا تو اُس کا مال اُس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ ⑪ یہ سچ ہے کہ راستہ بتلا دینا ہمارے ذمے ہے، ⑫ اور یہ بھی سچ ہے کہ آخرت اور دُنیا دونوں ہمارے قبضے میں ہیں۔ ⑬ لہٰذا میں نے تمہیں ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے خبردار کردیا ہے۔ ⑭ اس آگ میں کوئی اور نہیں، وہی بدبخت داخل ہوگا ⑮ جس نے حق کو جھٹلایا، اور منہ موڑا، ⑯ اور اُس سے ایسے پرہیزگار شخص کو دُور رکھا جائے گا ⑰ جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے (اللہ کے راستے میں) دیتا ہے، ⑱ حالانکہ اُس پر کسی کا کوئی اِحسان نہیں تھا جس کا بدلہ دیا جاتا، ⑲ البتہ وہ صرف اپنے اُس پروردگار کی خوشنودی چاہتا ہے جس کی شان سب سے اُونچی ہے۔ ⑳ یقین رکھو ایسا شخص عنقریب خوش ہوجائے گا۔ ㉑

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے رات کی جب کہ وہ (آفتاب کو اور دِن کو) چھپالے اور (قسم ہے) دِن کی جب کہ وہ روشن ہوجائے اور (قسم ہے) اُس (ذات) کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا (مراد اللہ تعالیٰ ہے، آگے جوابِ قسم ہے) کہ بے شک تمہاری کوششیں (یعنی اعمال) مختلف ہیں (اور اسی طرح ان کے ثمرات بھی مختلف ہیں) سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام) کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے، (راحت کی چیز سے نیک عمل، اور بواسطہ نیک عمل کے جنت مراد ہے کہ یُسْرٌ کا سبب اور محل ہے، اسی لئے یُسْرٰی کہہ دیا گیا، ورنہ یُسْرٰی کے معنی ہیں آسان چیز) اور جس نے (حقوقِ واجبہ سے) بخل کیا اور (بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام) کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے (تکلیف کی چیز سے بدعمل اور بواسطہ بدعمل کے دوزخ مراد ہے کہ عُسْرٌ کا سبب اور محل ہے، اس لئے اُس عُسْرٌ کو عُسْرٰی کہہ دیا گیا اور سامان دینے سے مراد دونوں جگہ یہ ہے کہ اچھے یا بُرے کام اُس کے لئے آسان ہوجائیں گے اور بے تکلف سرزد ہونے لگیں گے، اور ویسے ہی اسباب جمع ہوجائیں گے، پھر نیک اعمال کا سامانِ جنت ہونا اور اعمالِ بد کا سامانِ دوزخ ہونا ظاہر ہی ہے۔ حدیث میں ہے: ''اَمَّا مَنْ کَانَ مِنْ اَھْلِ السَّعَادَةِ فَیُیَسَّرُ لِعَمَلِ اَھْلِ السَّعَادَةِ، وَکَذَا فِی الشَّقَاوَةِ''[1]) اور (آگے صاحبِ عسریٰ کا حال مذکور ہے کہ) اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا جب وہ برباد

[1] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب موعظة المحدث عند القبر ج:۱ ص:۱۸۲، وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن أمه ...إلخ، ج:۲ ص:۳۳۳

ہونے لگے گا، (بربادی سے مراد جہنم میں جانا ہے) واقعی ہمارے ذمہ (اپنے وعدے کے مطابق) راہ کا بتلا دینا ہے (سووہ ہم نے پورے طور سے بتلا دیا ہے، پھر کسی نے ایمان وطاعت کی راہ اختیار کرلی جس کا ذکر مَنْ اَعْطٰی ...الخ میں ہوا ہے، اور کسی نے کفر ومعصیت کی راہ کو اختیار کرلیا جس کا ذکر مَنْ بَخِلَ میں ہوا ہے) اور (جیسی راہ کوئی شخص اختیار کرے گا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے، کیونکہ) ہمارے ہی قبضے میں ہے آخرت اور دُنیا (یعنی دونوں میں ہماری ہی حکومت ہے اس لئے دُنیا میں ہم نے اَحکام مقرر کئے اور آخرت میں مخالفت اور موافقت پر سزا وجزا دیں گے، جس کا بیان دو جگہ فَسَنُیَسِّرُہٗ میں ہوا ہے۔ آگے بطور تنقیح اور توضیح کے ارشاد ہے کہ میں نے جو تم کو اَعمالِ مختلفہ کی مختلف جزائیں بتلادی ہیں) تو میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں (جس پر جملہ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ﴿۱۰﴾ دلالت کرتا ہے، تاکہ ایمان وطاعت جن کا ذکر اَعْطٰی ...الخ میں ہے، اختیار کرکے اس آگ سے بچو، اور کفر ومعصیت جن کا ذکر بَخِلَ ...الخ میں ہے، اختیار کرکے دوزخ میں نہ جاؤ، کیونکہ اس میں جانے اور نہ جانے کے یہی اسباب ہیں، چنانچہ آگے اس کی تصریح ہے کہ) اس میں (ہمیشہ کے لئے) وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے (دینِ حق کو) جھٹلایا اور (اس سے) رُوگردانی کی، اور اس سے ایسا شخص دُور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے، جو اَپنا مال (محض) اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہوجائے، (یعنی محض رضائے حق اس کا مطلوب ہے) اور بجز اپنے عالی شان پروردگار کی رضاجوئی کے (کہ یہی اس کا مقصود ہے) اس کے ذِمے کسی کا احسان نہ تھا کہ (اس دینے سے) اس کا بدلہ اُتارنا (مقصود) ہو (اس میں نہایت ہی مبالغہ ہے اخلاص میں، کیونکہ کسی کے احسان کا بدلہ اُتارنا بھی فی نفسہٖ مستحب اور افضل وموجبِ ثواب ہے، مگر فضیلت میں اِحسانِ ابتدائی کے برابر نہیں، پس جب اس شخص کا اِنفاق فی سبیل اللہ اس سے بھی مبرّا ہے، تو رِیا وغیرہ معاصی کی آمیزش سے بدرجۂ اَولیٰ بَری ہوگا، اور یہ کمالِ اِخلاص ہے) اور (ایسے شخص کے لئے اُوپر صرف جہنم سے بچنا مذکور تھا، آگے حصول نعمائے آخرت کو فرماتے ہیں کہ) یہ شخص عنقریب خوش ہوجائے گا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی جن سے اس کو دائمی خوشی نصیب ہوگی)۔

معارف ومسائل

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ﴿۴﴾ یہ ایسا جملہ ہے جیسے سورۂ اِنشقاق میں مذکور ہوا: اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا [۱] (الانشقاق:۶) جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی کام کے لئے سعی وعمل اور جدوجہد کرنے کا خوگر ہے، مگر بعض لوگ اپنی جدوجہد اور محنت سے دائمی راحت کا سامان کرلیتے ہیں، اور بعض دُوسرے اپنی اسی محنت سے دائمی عذاب خرید لیتے ہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ ہر انسان جب صبح کو اُٹھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو تجارت پر لگا دیتا ہے، کوئی

[۱] ترجمہ: تو اپنے رَبّ کے پاس پہنچنے تک کام میں کوشش کر رہا ہے۔

تو اس تجارت میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے آپ کو عذابِ آخرت سے آزاد کر لیتا ہے، اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی محنت اور سعی وعمل ہی اُس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر عقل کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی سعی وعمل کے انجام کو سوچے، جس عمل کے انجام میں وقتی آرام ولذّت ہو، مگر دائمی عذاب ورنج کا سبب بنے اُس کے پاس نہ جائے۔

سعی وعمل کے اِعتبار سے انسانوں کے دو گروہ

آگے قرآنِ حکیم نے سعی وعمل کے اِعتبار سے اِنسانوں کے دو گروہ بتلائے اور دونوں کے تین تین اوصاف ذِکر کئے۔ پہلا گروہ کامیاب لوگوں کا ہے، اُن کے تین عمل یہ ہیں: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور اللہ سے ڈر کر زِندگی کے ہر شعبے میں اُس کے اَحکام کی خلاف ورزی سے بچتا رہا، اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی۔ اچھی بات سے مراد کلمۂ ایمان لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ (کما قالہ ابن عباس والضحاک والسدّی) [۱] اس کلمے کی تصدیق سے مراد اِیمان لے آنا ہے، اور اگرچہ ایمان سب اعمال کی رُوح اور سب سے مقدم ہے، اس کو یہاں مؤخر کرنے کی شاید یہ وجہ ہو کہ اس جگہ ذِکر سعی وعمل اور جدوجہد کا ہے اور وہ اعمال ہی ہیں، ایمان تو ایک قلبی چیز ہے کہ دِل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تصدیق کرے، پھر زبان سے بھی اس کا اِقرار کلمۂ شہادت کے ذریعے کر لے، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی جسمانی محنت نہیں، نہ کوئی اس کو اعمال کی فہرست میں شمار کرتا ہے۔

دُوسرے گروہ کے بھی تین عمل کا ذِکر فرمایا: وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے بُخل کیا کہ زکوٰۃ فرض اور صدقاتِ واجبہ بھی ادا کرنے سے گریز کیا، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کی طرف جھکنے اور اِطاعت اِختیار کرنے کے بجائے اُس سے بے نیازی اور بے رُخی اِختیار کی اور اچھی بات یعنی کلمۂ اِیمان کی تکذیب کی۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا: فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷ یُسریٰ کے لفظی معنی ہیں آسان اور آرام دہ چیز جس میں مشقت نہ ہو، مراد اس سے جنت ہے۔ اسی طرح اس کے بالمقابل دُوسرے گروہ کے متعلق فرمایا: فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰ عُسریٰ کے لفظی معنی مشکل اور تکلیف دہ چیز کے ہیں، مراد اس سے جہنم ہے۔ اور معنی دونوں جملوں کے یہ ہیں کہ جو لوگ اپنی سعی ومحنت پہلے تین کاموں میں لگاتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں خرچ اور اللہ سے ڈرنا اور اِیمان کی تصدیق، ان لوگوں کو ہم یُسریٰ یعنی اعمالِ جنت کے لئے آسان کر دیتے ہیں، اور جو لوگ یہ سعی وعمل دُوسرے تین کاموں میں لگاتے ہیں، اُن کو ہم عُسریٰ یعنی اعمالِ جہنم کے لئے آسان کر دیتے ہیں، یہاں بظاہر مقتضائے مقام یہ کہنے کا تھا کہ اُن کے لئے اعمالِ جنت یا اعمالِ دوزخ آسان کر دیئے جائیں گے کیونکہ آسان یا مشکل ہونا صفت اعمال ہی کی ہوسکتی ہے، تو خود ذوات واَشخاص نہ آسان ہوتے ہیں نہ مشکل، مگر قرآنِ کریم نے اس کی

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۸۳ تحت هذه الآية۔

تعبیر اس طرح فرمائی کہ خود ان لوگوں کی ذات اور وجود ان اعمال کے لئے آسان کر دیئے جائیں گے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کی طبیعتوں اور مزاجوں کو ایسا بنا دیا جائے گا کہ پہلے گروہ کے لئے اعمالِ جنت ان کی طبیعت بن جائیں گے، اُن کے خلاف کرنے میں وہ تکلیف محسوس کرنے لگیں گے، اسی طرح دُوسرے گروہ کا مزاج ایسا بنا دیا جائے گا کہ اس کو اعمالِ جہنم ہی پسند آئیں گے، اُن ہی میں راحت ملے گی، اعمالِ جنت سے نفرت ہوگی۔ ان دونوں گروہوں کے مزاجوں میں یہ کیفیت پیدا کر دینے کو اس سے تعبیر فرمایا کہ یہ خود ان کاموں کے لئے آسان ہو گئے۔ ایک مرفوع حدیث میں اس کی تائید اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ'' [۱] (رواہ البخاری ومسلم عن علی رضی اللہ عنہ) یعنی تم جو عمل کرتے ہو، وہ کرتے رہو، کیونکہ ہر ایک آدمی کے لئے وہی کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا، اس لئے جو اہلِ سعادت، نیک بخت، خوش نصیب ہیں تو اہلِ سعادت ہی کے اعمال اُن کی طبعی رغبت بن جاتے ہیں، اور جو اہلِ شقاوت، بدنصیب یعنی اہلِ جہنم ہیں، اُن کے لئے اہلِ شقاوت ہی کے اعمال کرنا مزاج اور طبیعت بن جاتی ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں اپنے خداداد اختیار کو اِستعمال کرنے کے نتیجے میں ملتی ہیں، اس لئے ان پر عذاب وثواب کا ترتب مستبعد نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بعد بدنصیب گروہ اہلِ جہنم کو تنبیہ ہے: وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪ یعنی جس مال کی خاطر کمبخت حقوقِ واجبہ میں بھی بخل کیا کرتا تھا، یہ مال اس پر عذاب آنے کے وقت کچھ کام نہ دے گا۔ تَرَدّٰى کے لفظی معنی گڑھے میں گر جانے اور ہلاک ہونے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر قیامت میں جب وہ جہنم کے گڑھے میں گرتا ہوگا تو یہ مال اُس کو کچھ نفع نہیں دے گا۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ⑮ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ⑯ یہ نارِ جہنم کے حال کا بیان ہے کہ اس میں داخل نہیں ہوگا مگر وہی شخص جو بدنصیب ہے، اور جس نے اللہ ورسول کی تکذیب کی اور اُن کی اِطاعت سے رُوگردانی کی، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ورسول کی تکذیب کرنے والا صرف کافر ہی ہوسکتا ہے، اس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مؤمن گناہگار جو تکذیب کا مجرم نہیں، جہنم میں نہیں جائے گا، حالانکہ قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس سے بھری ہوئی ہیں، کہ مؤمن بھی جو گناہ کرتا ہے اگر اُس نے توبہ نہ کرلی یا کسی کی شفاعت سے یا خالص رحمت سے اس کو معاف نہ کر دیا گیا تو وہ بھی جہنم میں جائے گا اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے تک جہنم میں رہے گا، البتہ سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور پھر بہ برکتِ ایمان جنت میں داخل ہو جائے گا، بظاہر اس آیت کے الفاظ اس کے خلاف ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ مراد اس آیت کی وہ ہو جو دُوسری آیاتِ قرآن اور اَحادیثِ صحیحہ کے خلاف نہ ہو، اس کی بہت آسان توجیہ تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لی گئی ہے کہ یہاں

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب موعظة المحدث ...إلخ، ج:۱ ص:۱۹۲، وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی ...إلخ، ج:۲ ص:۳۳۳

دُخولِ جہنم سے مراد وہ دُخول ہے جو ہمیشہ کے لئے ہو، اور ایسا دُخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے، مؤمن کسی نہ کسی وقت بالآخر اپنے گناہ کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ علمائے مفسرین نے اس کے سوا دُوسری کچھ توجیہات بھی بیان فرمائی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ دُرست ہوسکتی ہیں۔ اور تفسیرِ مظہری میں اس کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ اس آیت میں اَشْقٰی اور اَتْقٰی سے مراد عام نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں موجود تھے، اُن موجودین میں سے کوئی مسلمان باوجود گناہ سرزد ہونے کے بھی بہ برکت صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہنم میں نہیں جائے گا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب کے سب جہنم سے محفوظ ہیں

وجہ یہ ہے کہ اوّل تو ان حضرات میں کسی سے بھی گناہ کا صدور بہت ہی شاذ و نادر ہوا ہے، اور بوجہ خوفِ آخرت کے اُن کے حالات سے یہ لازم معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی گناہ ہوا بھی ہے تو اُس نے توبہ کرلی ہوگی۔ پھر اس کے ایک گناہ کے مقابلے میں اُس کے اعمالِ حسنہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی وجہ سے بھی یہ گناہ معاف ہوسکتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: ۱۱۴) یعنی نیک اعمال بُرے اعمال کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ اور خود صحبتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسا عمل ہے جو تمام اعمالِ حسنہ پر غالب ہے۔ حدیث میں صلحائے اُمت کے بارے میں آیا ہے "هُمْ قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُهُمْ وَلَا یَخَابُ اَنِیْسُهُمْ" (صحیحین) [۱] یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے والا شقی و نامراد نہیں ہوسکتا، اور جو اُن سے مانوس ہو، وہ محروم نہیں رہ سکتا۔ تو جو شخص سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیس اور انیس ہو، وہ کیسے شقی ہوسکتا ہے اسی لئے احادیثِ صحیحہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ صحابہ کرام سب کے سب ہی عذابِ جہنم سے بَری ہیں۔ خود قرآنِ کریم میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ موجود ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی (الحدید: ۱۰) یعنی ان میں سے ہر ایک کے لئے اللہ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور دُوسری آیت میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (الانبیاء) یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر ہوچکی ہے وہ نارِ جہنم سے دُور رہیں گے۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس شخص کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا ہے۔ (ترمذی عن جابر رضی اللہ عنہ) [۲]

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ﴿۱۷﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ﴿۱۸﴾ یہ اہلِ شقاوت کے مقابل اہلِ سعادت تقویٰ شعار حضرات کی جزا کا بیان ہے کہ جو آدمی اتقیٰ یعنی مکمل اطاعتِ حق کا خوگر ہو اور وہ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف اس لئے خرچ کرتا ہے کہ

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۷۷، وصحیح البخاري، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر الله تعالی (باختصار) ج:۲ ص:۹۴۸، وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة، باب فضل مجالس الذکر (باختصار) ج:۲ ص:۳۴۴

[۲] جامع الترمذي، ابواب المناقب، باب ما جاء في فضل من رأی النبي صلی الله علیه وسلم وصحبه

وہ گناہوں سے پاک ہو جائے، ایسا شخص اس جہنم کی آگ سے دُور رکھا جائے گا۔

الفاظ آیت کے تو عام ہیں جو شخص بھی ایمان کے ساتھ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اُس کے لئے یہ بشارت ہے، لیکن شانِ نزول کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مراد اس لفظ اَتْقٰی سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، ابن ابی حاتم نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سات مسلمان ایسے تھے جن کو کفارِ مکہ نے اپنا غلام بنایا ہوا تھا، جب وہ مسلمان ہو گئے تو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے، حضرت صدیقِ اکبر نے اپنا بڑا مال خرچ کر کے اُن کو کفار سے خرید کر آزاد کر دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مظہری) [1]

اس کے مناسب آیت کا آخری جملہ ہے: وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾ یعنی جن غلاموں پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ احسانِ عظیم فرمایا کہ زرِ کثیر خرچ کر کے خریدا اور آزاد کر دیا، ان کا کوئی سابقہ احسان بھی ان کے ذمے نہیں تھا، جس کے بدلے میں یہ اِقدام کرتے، بلکہ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ یعنی ان کا مقصد اللہ تعالیٰ عالی شان کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔

مستدرک حاکم میں حضرت زُبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ عادت بھی تھی کہ جس مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں قیدی دیکھتے، اُس کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے، اور یہ لوگ عموماً ضعفاء ہوتے تھے، صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ جب تم غلاموں کو آزاد ہی کرتے تو اتنا کام کرلو کہ ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی و بہادر ہیں تا کہ وہ کل تمہارے دُشمنوں کا مقابلہ اور تمہاری حفاظت کر سکیں۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا مقصد ان آزاد کردہ حضرات سے کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں، بلکہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ان کو آزاد کرتا ہوں۔ (مظہری) [2]

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾ یعنی جس شخص نے اپنا مال خرچ کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو دیکھا، اپنا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں تکا، تو اللہ تعالیٰ بھی آخرت میں اس کو راضی ہی کر دیں گے کہ جنت کی نعمائے عجیبہ دائمہ نصیب فرما دیں گے۔ شانِ نزول کے واقعے سے ان آیات کا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہونا ثابت ہے، اس لئے یہ آخری کلمہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے ایک عظیم خوشخبری اور اعزاز ہے کہ ان کو دُنیا ہی میں اللہ کی طرف سے راضی کر دیئے جانے کی خوشخبری سنا دی۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ اللَّيْلِ بِحَمْدِ اللهِ ۲۵/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۷۹و۲۸۰، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:۱۹۳۶۷

[2] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۲۷۹، والمستدرك للحاكم، كتاب التفسير، باب تفسير سورة وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى، رقم الحديث:۳۹۰۳

سُوْرَةُ الضُّحٰى

اٰیاتها ۱۱ ۹۳ سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ ۱۱ رکوعها ۱

سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰى ۙ ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ ﴿۳﴾

قسم دُھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے نہ رُخصت کر دیا تجھ کو تیرے رَبّ نے اور نہ بیزار ہوا،

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۭ ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۭ ﴿۵﴾

اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے، اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رَبّ پھر تو راضی ہوگا،

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۠ ﴿۶﴾ وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۠ ﴿۷﴾ وَوَجَدَكَ

بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم پھر جگہ دی اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی، اور پایا تجھ کو

عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿٨﴾ؕ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿٩﴾ؕ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾ؕ

مفلس پھر بے پروا کردیا، سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا، اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک،

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿١١﴾ع

اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی، ① اور رات کی جب اُس کا اندھیرا بیٹھ جائے، ② کہ تمہارے پروردگار نے نہ تمہیں چھوڑا ہے، اور نہ ناراض ہوا ہے، ③ اور یقیناً آگے آنے والے حالات تمہارے لئے پہلے حالات سے بہتر ہیں۔ ④ اور یقین جانو کہ عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ ⑤ کیا اُس نے تمہیں یتیم نہیں پایا تھا، پھر (تمہیں) ٹھکانا دیا؟ ⑥ اور تمہیں راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دِکھایا، ⑦ اور تمہیں نادار پایا تو غنی کردیا۔ ⑧ اب جو یتیم ہے، تم اُس پر سختی مت کرنا، ⑨ اور جو سوال کرنے والا ہو، اُسے جھڑکنا نہیں، ⑩ اور جو تمہارے پروردگار کی نعمت ہے، اُس کا تذکرہ کرتے رہنا۔ ⑪

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے (قرار پکڑنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک حقیقی معنی اس کی ظلمت کا کامل ہو جانا، کیونکہ رات میں اندھیری رفتہ رفتہ بڑھتی ہے، کچھ رات گزرنے پر مکمل ہو جاتی ہے، دُوسرے مجازی یعنی جانداروں کا اس میں سو جانا اور چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آوازوں کا ساکن ہو جانا، آگے جوابِ قسم ہے) کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے بیزار ہوا (کیونکہ اوّل تو آپ سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی، دُوسرے حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ و معصوم بنایا ہے، پس آپ کفار کے خرافات ولغویات سے محزون نہ ہوجئے، جو چند روزہ وحی کی تاخیر کے سبب یہ کہنے لگے کہ آپ کو آپ کے خدا نے چھوڑ دِیا ہے، آپ برابر نعمتِ وحی سے مشرف رہیں گے، اور یہ شرف وکرامت تو آپ کے لئے دُنیا میں ہے) اور آخرت آپ کے لئے دُنیا سے بدرجہا بہتر

ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ نعمتیں ملیں گی) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں بکثرت نعمتیں) دے گا، سو آپ (ان کے عطا ہونے سے) خوش ہو جائیں گے (اور جس کی قسم کھائی ہے اُس کو اس بشارت سے مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ظاہر میں اپنی قدرت وحکمت کے مختلف نشان ظاہر کرتا ہے، دن کے پیچھے رات کو اور رات کے پیچھے دِن کو لاتا ہے، یہی کیفیت باطنی حالات کی سمجھو، اگر سورج کی دُھوپ کے بعد رات کی تاریکی کا آنا اللہ تعالیٰ کی خفگی اور ناراضی کی دلیل نہیں اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اس کے بعد دِن کا اُجالا کبھی نہ ہوگا، تو چند روز وحی کے رُکے رہنے سے یہ کیونکر سمجھ لیا جائے کہ آج کل خدا اپنے منتخب کئے ہوئے پیغمبر سے خفا اور ناراض ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے وحی کا دروازہ بند کر دیا، ایسا کہنا تو خدا تعالیٰ کے علمِ محیط اور حکمتِ بالغہ پر اِعتراض کرنا ہے، گویا اس کو خبر نہ تھی کہ جس کو میں نبی بنا رہا ہوں وہ آئندہ چل کر اس کا اہل ثابت نہ ہوگا، نعوذ باللہ منه۔ آگے بعض نعمتوں سے مضمونِ مذکور کی تائید ہے، یعنی) کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر (آپ کو) ٹھکانا دیا (کہ شکمِ مادر میں ہونے کے وقت ہی آپ کے والد کی وفات ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دادا سے پرورِش کرایا، پھر جب آپ آٹھ برس کے ہوئے تو ان کی بھی وفات ہوگئی تو آپ کے چچا سے پرورِش کرایا، ٹھکانا دینے کا مطلب یہی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا) رستہ بتلایا (کقوله تعالیٰ: مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ... إلخ (الشوریٰ:۵۲) [۱] اور وحی سے پہلے شریعت کی تفصیل معلوم نہ ہونا کوئی عیب نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا، سو مالدار بنادِیا (اس طرح کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال میں آپ نے بطور مضاربت کے تجارت کی، اس میں نفع ملا، پھر حضرت خدیجہ نے آپ سے نکاح کرلیا اور اپنا تمام مال حاضر کر دیا، مطلب یہ کہ آپ اِبتدا سے مورِدِ انعامات رہے ہیں، آئندہ بھی رہیں گے، اُن اِنعامات پر اَدائے شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو یہ نعمتیں دی ہیں) تو آپ (اس کے شکریہ میں) یتیم پر سختی نہ کیجئے اور سائل کو مت جھڑکئے (یہ تو شکرِ فعلی ہے) اور اپنے رَبّ کے اِنعامات (مذکورہ) کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

اس سورت کے سببِ نزول کے متعلق بخاری ومسلم میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے، [۲] اور ترمذی نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اُنگلی

[۱] ترجمہ: آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے؟

[۲] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة الضحیٰ، ج:۲ ص:۷۳۸و۷۳۹، وصحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب ما لقی النبی صلی الله علیه وسلم من أذی المشرکین والمنافقین، ج:۲ ص:۱۰۹، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب من تفسیر والضحیٰ، ج:۲ ص:۱۷۲

زخمی ہوگئی، اُس سے خون جاری ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اِنْ اَنْتِ اِلَّا اصْبَعٌ دَمِیْتِ، وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَا لَقِیْتِ'' یعنی تو ایک اُنگلی ہی تو ہے جو خون آلودہ ہوگئی، اور جو کچھ تکلیف تجھے پہنچی وہ اللہ کی راہ میں ہے (اس لئے کیا غم ہے) حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ ذِکر کر کے فرمایا کہ اس واقعے کے بعد (کچھ روز) جبرائیل امین کوئی وحی لے کر نہیں آئے تو مشرکینِ مکہ نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے خدا نے چھوڑ دیا اور ناراض ہوگیا۔ اس پر یہ سورتِ ضحیٰ نازل ہوئی۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی روایت جو بخاری میں ہے اس میں ایک دو رات تہجد کے لئے نہ اُٹھنے کا ذِکر ہے، [1] وحی میں تأخیر کا ذِکر نہیں، اور ترمذی میں تہجد میں ایک دو رات نہ اُٹھنے کا ذِکر نہیں، صرف وحی میں تأخیر کا ذِکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ دونوں باتیں پیش آئی ہوں، راوی نے کبھی ایک کو بیان کیا، کبھی دُوسرے کو، اور یہ عورت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا اُمّ جمیل، ابولہب کی بیوی تھی، جیسا کہ دُوسری روایات میں ہے۔ [2] اور تأخیرِ وحی کے واقعات متعدّد مرتبہ پیش آئے ہیں، ایک شروع نزولِ قرآن میں پیش آیا جس کو زمانۂ فترتِ وحی کہا جاتا ہے، یہ سب سے زیادہ طویل تھا۔ ایک واقعہ تأخیرِ وحی کا اس وقت پیش آیا جب کہ مشرکین یا یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوح کی حقیقت کے متعلق سوال کیا اور آپ نے بعد میں جواب دینے کا وعدہ فرمالیا، مگر ''اِن شاء اللہ'' نہ کہنے کے سبب کچھ روز تک سلسلہ وحی کا بند رہا، اس پر مشرکین نے یہ طعنے دینا شروع کئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خدا اُن سے ناراض ہوگیا اور اُن کو چھوڑ دِیا۔ اسی طرح کا یہ واقعہ ہے جو سورۂ ضحیٰ کے نزول کا سبب ہوا، یہ ضروری نہیں کہ یہ سب واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں، بلکہ آگے پیچھے بھی ہوسکتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ یہاں آخرت کو اپنے معروف معنی میں اور اس کے بالمقابل اُولیٰ کو دُنیا کے معنی میں لیا جائے تو تفسیر وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اُوپر آچکی ہے کہ یہ کفار و مشرکین جو طعنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے رہے ہیں، یہ دُنیا میں تو دیکھ ہی لیں گے کہ وہ سراسر لغو اور غلط تھے، ہم اُس سے آگے آخرت کے اِنعامات کا بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو دُنیا سے بہت زیادہ اِنعامات سے نوازا جائے گا اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ آخرت کو اس کے لفظی معنی میں لیا جائے، یعنی پچھلی حالت جیسا کہ لفظ اُولیٰ کے لفظی معنی پہلی حالت کے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے اِنعامات برابر زیادہ ہی ہوتے چلے جائیں گے کہ ہر پہلی حالت سے پچھلی حالت بہتر اور افضل ہوتی چلی جائے گی، اس میں علوم و معارف اور قربِ الٰہی کے درجات میں ترقی بھی داخل ہے، اور دُنیا کے معاشی مسائل اور عزّت و حکومت بھی۔

---

[1] صحیح البخاري، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة الضحیٰ، ج:۲ ص:۷۳۹

[2] المستدرك للحاکمؒ، رقم الحدیث: ۳۹۴۵

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ یعنی آپ کا ربّ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں، اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کر کے نہیں بتلایا کہ کیا دیں گے اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپ کی ہر مرغوب چیز آپ کو اتنی دیں گے کہ آپ راضی ہو جائیں۔ آپ کی مرغوب چیزوں میں دینِ اسلام کی ترقی، دینِ اسلام کا عام طور پر دُنیا میں پھیلنا، پھر اُمت کی ہر ضرورت اور خود آپ کا دُشمنوں پر غالب آنا، ان کے ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دینِ حق پھیلانا سب داخل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِذًا لَّا اَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِّنْ اُمَّتِيْ فِي النَّارِ ''یعنی جب یہ بات ہے تو میں اُس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری اُمت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا۔ (قرطبی) [١] اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرمادیں گے: ''رَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ'' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اَب بھی آپ راضی ہیں تو میں عرض کروں گا: ''يَا رَبِّ رَضِيْتُ'' یعنی اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ [٢] اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣٦ [٣] (ابراہیم)، پھر دُوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ [٤] (المائدۃ:١١٨)، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور گریہ وزاری شروع کی اور بار بار فرماتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ'' حق تعالیٰ نے جبرائیل امین علیہ السلام کو بھیجا کہ آپ سے دریافت کریں کہ آپ کیوں روتے ہیں (اور یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ ہمیں سب معلوم ہے) جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے جبرائیل امین علیہ السلام سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتے ہیں کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہ کریں گے۔ [٥]

اُوپر طعنہ کفار کے جواب میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اِنعاماتِ اِلٰہیہ کے دُنیا وآخرت میں فائض ہونے کا

---

[١] تفسیر القرطبی ج:٢٠ ص:٩٦، وشعب الإیمان للبیہقیؒ، کتاب حب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فصل فی بیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفصحاته، رقم الحدیث:١٣٧٤

[٢] المعجم الأوسط للطبرانیؒ، رقم الحدیث:٢١٣٩

[٣] ترجمہ: پھر جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے ہی اور جو شخص میرا کہنا نہ مانے سو آپ تو کثیر المغفرت کثیر الرحمت ہیں۔

[٤] ترجمہ: اگر آپ کو ان سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں۔

[٥] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم لأمته وبکائه شفقة علیہم، رقم الحدیث:٣٠١، ج:١ ص:١١٣

اِجمالی ذِکر آیا ہے، اس میں اس کی تھوڑی سی تفصیل تین خاص نعمتوں کے ذِکر سے فرمائی گئی ہیں، اوّل:- اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۞ یعنی ہم نے آپ کو یتیم پایا کہ والد کا انتقال ولادت سے پہلے ہی ہوچکا تھا، اور انہوں نے کوئی مال وجائیداد بھی نہ چھوڑی تھی جس سے آپ کی پرورِش ہوسکے، تو ہم نے آپ کا ٹھکانا بنادیا، یعنی آپ کے دادا عبدالمطلب اور اُن کے بعد چچا ابوطالب کے دِلوں میں آپ کی ایسی محبت ڈال دی کہ صلبی اولاد سے زیادہ آپ کی تربیت میں کوشش کرتے تھے۔

دُوسری نعمت:- وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۞ لفظ ضَـآلٌّ کے معنی گمراہ کے بھی آتے ہیں، اور ناواقف، بےخبر کے بھی۔ یہاں دُوسرے ہی معنی مراد ہوسکتے ہیں کہ نبوّت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریعتِ اِلٰہیہ کے اَحکام اور علوم سے بےخبر تھے، آپ کو منصبِ نبوّت پر فائز کرکے آپ کی رہنمائی فرمائی۔

تیسری نعمت:- وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۞ عَـآئِلٌ، عَیْلَۃٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی فقیر ومحتاج ہونے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نادار اور بےزَر پایا تو آپ کو غنی ومال دار کردیا، جس کی اِبتدا حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے مال میں بطور شرکت مضاربت کے تجارت کرنے سے ہوئی، پھر وہ خود آپ کے عقدِ نکاح میں آکر اُمّ المؤمنین ہوئیں تو اُن کا سارا مال ہی آپ کی خدمت کے لئے ہوگیا۔

ان تینوں نعمتوں کا ذِکر فرمانے کے بعد آپ کو تین چیزوں کا حکم دیا گیا، اوّل:- فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۞ قہر کے معنی غلبہ اور جبری تسلط کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ کسی یتیم کو ضعیف اور بےوارث سمجھ کر اس کے اموال وحقوق پر اس طرح مسلط نہ ہوں کہ اس کا حق ضائع ہوجائے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے ساتھ شفقت کے معاملے کی تاکید فرمائی اور اس کے ساتھ دِل شکنی کا برتاؤ کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ احسان ومحبت کا سلوک کیا جاتا ہو، اور سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو۔ (رواه البخاری فی الأدب المفرد، وابن ماجة والبغوی، مظهری) [1]

دُوسرا حکم:- وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۞ تَنْهَرْ، نَـهْرٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی زجر اور جھڑکنے کے ہیں، اور سائل کے معنی سوال کرنے والا، اس میں وہ بھی داخل ہے جو کسی مال کا سوال کرے، اور وہ بھی جو علمی تحقیق کا سوال کرے، دونوں کو جھڑکنے ڈانٹنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا گیا، بہتر یہ ہے کہ سائل کو کچھ دے کر رُخصت کرے، اور نہیں دے سکتا تو نرمی سے عذر کردے۔ اسی طرح کسی علمی مسئلے کا سوال کرنیوالے کے جواب میں بھی سختی اور بدخوئی ممنوع ہے، نرمی اور شفقت سے جواب دینا چاہئے، بجز اس کے کہ سائل کسی طرح مانتے ہی نہیں تو بضرورت زجر بھی جائز ہے۔

---

[1] تفسير المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۷، وسنن ابن ماجة، كتاب الأدب، باب حق اليتيم، والأدب المفرد، باب خير بيت فی المسلمين بيت فيه يتيم، رقم الحديث:۱۳۷، وشرح السُّنّة للبغویؒ، كتاب الإستئذان، باب ثواب كافل اليتيم، رقم الحديث:۳۴۵۴

تیسرا حکم :- وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ⑪ حَدِّثْ، تَحْدِیْث سے مشتق ہے، جس کے معنی بات کرنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا لوگوں کے سامنے ذِکر کیا کریں کہ یہ بھی ایک طریقہ شکر گزاری کا ہے، یہاں تک کہ آدمی جو کسی آدمی پر اِحسان کرے، اس کا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے جو شخص لوگوں کے اِحسان پر اُن کا شکر نہیں کرتا، وہ اللہ کا بھی شکر نہیں کرے گا۔ (رواہ احمد ورواتہ ثقات، مظهری) [1]

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم پر کوئی اِحسان کرے تو چاہئے کہ آپ بھی اس کے احسان کا بدلہ دو، اور اگر مالی بدلہ دینے کی اِستطاعت نہیں تو یہی کرو کہ لوگوں کے سامنے اُس کی تعریف کرو، کیونکہ جس نے لوگوں کے مجمع میں اس کی ثناوتعریف کی تو اُس نے شکر گزاری کا حق ادا کردیا۔ (رواہ البغوی عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، مظهری) [2]

مسئلہ:- ہر نعمت کا شکر اَدا کرنا واجب ہے، مالی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لئے اِخلاصِ نیت کے ساتھ خرچ کرے، اور نعمتِ بدن کا شکر یہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صَرف کرے، اور علم ومعرفت کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ دُوسروں کو اُس کی تعلیم دے۔ (مظہری) [3]

مسئلہ:- سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے، اور اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ" بتلائے ہیں۔ (مظہری) [4]

اِبنِ کثیر رحمہ اللہ نے ہر سورت کے ختم پر، اور بغوی رحمہ اللہ نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ (مظہری) [5] دونوں میں سے جو صورت بھی اِختیار کرے، سنت ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

فائدہ

سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآنِ کریم تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے خاص اِنعامات اور آپ کے مخصوص فضائل کا ذِکر ہے، اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے اَحوال کا۔ قرآنِ حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابلِ شک وشبہ ہونے سے کیا گیا، اور ختمِ قرآن اُس ذات کی عظمت وشان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الضُّحٰی ۲۸/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۷، ومسند احمد، مسند ابی هریرة رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۷۹۳۹

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۷، وسنن ابی داود، کتاب الأدب، باب الرفق وشکر المعروف، ج:۲ ص:۲۶۲، وجامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی المتشبع بما لم یعطه ج:۲ ص:۲۳

[3] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۸

[4] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۹

[5] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۸۸

سُوۡرَۃُ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ

اٰیاتہا ۸ | ۹۴ سُوۡرَۃُ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ مَکِّیَّۃٌ ۱۲ | رکوعہا ۱

سورۂ انشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور اُتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا، جس نے جھکا دی تھی

ظَہۡرَکَ ۙ﴿۳﴾ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ؕ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ

پیٹھ تیری، اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا، سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، البتہ

مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ٪﴿۸﴾

مشکل کے ساتھ آسانی ہے، پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر، اور اپنے ربّ کی طرف دِل لگا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ ① اور ہم نے تم سے تمہارا وہ بوجھ اُتار دیا ہے ② جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی، ③ اور ہم نے تمہاری خاطر تمہارے تذکرے کو اُونچا مقام عطا کردیا ہے۔ ④ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ مشکلات کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے، ⑤ یقیناً مشکلات کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے۔ ⑥ لہٰذا جب تم فارغ ہو جاؤ تو (عبادت میں) اپنے آپ کو تھکاؤ، ⑦ اور اپنے پروردگار ہی سے دِل لگاؤ۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم وحلم سے) کشادہ نہیں کردیا (یعنی علم بھی وسیع عطا فرمایا اور تبلیغ میں جو مخالفین کی مزاحمت سے ایذا پیش آتی ہے اس میں تحمل اور حلم بھی دیا، کذا قال الحسن کما فی الدر المنثور [1]) اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اُتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی (وِزْر سے مراد وہ مباح اور جائز اُمور ہیں جو کبھی کبھی کسی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر آپ سے صادر ہو جاتے تھے اور بعد میں اُن کا خلاف، حکمت وخلافِ اَوْلیٰ ہونا ثابت ہوتا تھا، اور آپ بوجہ علوِّشان وغایت قرب کے اس سے ایسے مغموم ہوتے تھے جس طرح گناہ سے کوئی مغموم ہوتا ہے، اس میں بشارت ہے ایسے اُمور پر مؤاخذہ نہ ہونے کی، کذا فی الدر المنثور عن مجاھد وشریح بن عبید الحضرمی۔[2] پس اس بنا پر یہ بشارت آپ کو دوبار ہوئی، اوّل مکہ میں اس سورت کے ذریعے، دُوسری مدینہ میں سورۂ فتح میں اس کی تاکید وتکمیل اور تجدید وتفصیل کے لئے) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا (یعنی اکثر جگہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک مقرون کیا گیا، کذا فی الدر المنثور مرفوعًا، قال اللہ تعالیٰ: ''اِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ مَعِیَ''،[3] یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جہاں میرا ذِکر ہوگا، آپ کا ذِکر بھی میرے ساتھ ہوگا۔ (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم)[4] جیسے خطبے میں، تشہد میں، نماز میں، اَذان میں، اِقامت میں، اور اللہ کے نام کی رفعت اور شہرت ظاہر ہے، پس جو

---

[1] تفسیر الدر المنثور ج:١٠ ص:٢٨٩

[2] تفسیر الدر المنثور ج:١٠ ص:٢٨٩

[3] تفسیر الدر المنثور ج:١٠ ص:٢٩٠

[4] تفسیر الطبری ج:٢٤ ص:٤٩٥، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:١٩٣٩٣، ومسند ابی یعلی، مسند ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:١٣٤٩، وصحیح ابن حبان، کتاب الزکاۃ، باب ذکر الإخبار عن إباحة تعداد النعم للمنعم علی المنعم، رقم الحدیث:٣٤٥١

اس کے قرین ہوگا، رفعت وشہرت میں وہ بھی تابع رہے گا، اور چونکہ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین طرح طرح کی تکالیف وشدائد میں گرفتار تھے، اس لئے آگے ان کے اِزالے کا بطریق تفریع علی السابق کے وعدہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے آپ کو رُوحانی راحت دی اور رُوحانی کلفت رفع کردی جیسا اَلَمْ نَشْرَحْ ...اِلـــخ سے معلوم ہوا) سو (اس سے دُنیوی راحت ومحنت میں بھی ہمارے فضل وکرم کا اُمیدوار رہنا چاہئے، چنانچہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ (یعنی عنقریب ہی جو حکماً ساتھ ہونے کے معنی میں ہے) آسانی (ہونے والی) ہے (اور چونکہ ان مشکلات کے انواع واعداد کثیر تھے، اس لئے اس وعدے کو مکرّر تاکید کے لئے فرماتے ہیں کہ) بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونے والی) ہے (چنانچہ وہ مشکلات ایک ایک کرکے سب رفع ہوگئیں جیسا روایاتِ احادیث وسیر وتواریخ اس پر متفق ہیں، آگے ان نعمتوں پر شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو ایسی ایسی نعمتیں دی ہیں) تو آپ جب (تبلیغِ اَحکام سے جو دُوسروں کی نفع رسانی کی وجہ سے عبادت ہے) فارغ ہوجایا کریں تو (دُوسری عبادت متعلقہ بذاتِ خاص میں) محنت کیا کیجئے (مراد کثرتِ عبادت وریاضت ہے کہ آپ کی شان کے یہی مناسب ہے) اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رَبّ ہی کی طرف توجہ رکھئے (یعنی اُسی سے مانگئے اور اس میں بھی ایک حیثیت سے بشارت ہے زوالِ عسر کی کہ خود درخواست کرنے کا حکم گویا درخواست پورا کرنے کا وعدہ ہے)۔

معارف ومسائل

جیسا کہ سورۂ ضحیٰ کے آخر میں بیان ہوچکا ہے کہ سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بائیس سورتوں میں بیشتر ذِکرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِنعاماتِ اِلٰہیہ اور آپ کی عظمتِ شان سے متعلق مضامین ہیں، صرف چند سورتیں اَحوالِ قیامت یا بعض دُوسرے مضامین سے متعلق آئی ہیں۔ سورۂ اِنشراح میں بھی اُن خاص خاص نعمتوں کا ذِکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ نے مبذول فرمائیں اور اس کے بیان میں اسی عنوان اِستفہام کو اِختیار فرمایا ہے جو سورۂ ضحیٰ میں اَلَمْ یَجِدْكَ...اِلخ میں تھا، فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① شَرْحٌ کے لفظی معنی کھولنے کے ہیں، اور سینے کو کھول دینا اس کو علوم ومعارف اور اخلاقِ حسنہ کے لئے وسیع کردینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ایک دُوسری آیت میں ہے: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ [1] (الانعام:۱۲۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کو حق تعالیٰ نے علوم ومعارف

[1] ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کردیتے ہیں۔

اور اَخلاقِ کریمہ کے لئے ایسا وسیع بنا دیا تھا کہ آپ کے علم وحکمت کو بڑے بڑے عقلاء بھی نہ پا سکے، اور اسی شرحِ صدر کا نتیجہ تھا کہ آپ کو مخلوق کی طرف توجہ کرنا حق تعالیٰ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہوتا تھا، اور بعض احادیثِ صحیحہ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے بحکمِ اِلٰہی آپ کا سینۂ مبارک ظاہری طور پر بھی چاک کر کے صاف کیا، بعض حضراتِ مفسرین نے شرحِ صدر سے اس جگہ وہی شقِ صدر کا معجزہ مراد لیا ہے، کما فی ابن کثیر وغیرہ۔ [1] واللہ اعلم۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳ وِزْر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں، اور نقضِ ظہر کے لفظی معنی کمر توڑ دینے یعنی کمر کو جھکا دینے کے ہیں، جیسا کوئی بڑا بوجھ انسان پر لاد دیا جائے تو اُس کی کمر جھک جاتی ہے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ وہ بوجھ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر جھکا دی تھی، ہم نے اس کو آپ سے ہٹا دیا۔ وہ بوجھ کیا تھا اس کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں آ چکی ہے کہ اس سے وہ جائز اور مباح کام ہیں جن کو بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرینِ حکمت ومصلحت سمجھ کر اِختیار کر لیا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مصلحت کے خلاف یا خلافِ اَولیٰ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی علوِّ شان اور تقرّبِ اِلٰہی میں خاص مقام حاصل ہونے کی بنا پر ایسی چیزوں پر بھی سخت رنج وملال اور صدمہ ہوتا تھا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں بشارت سنا کر وہ بوجھ آپ سے ہٹا دیا کہ ایسی چیزوں پر آپ سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے وِزْر یعنی بوجھ کی مراد اس جگہ یہ لکھی ہے کہ اِبتدائے نبوّت میں وحی کا اثر بھی آپ پر شدید ہوتا تھا، اور اُس میں آپ پر جو ذِمہ داری ساری دُنیا میں کلمۂ حق پھیلانے اور کفر وشرک کو مٹا کر خلقِ خدا کو توحید پر جمع کرنے کی ڈالی گئی تھی، اور اس سب کام میں حکم یہ تھا کہ: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ہود:۱۱۲) یعنی آپ اَمرِ اِلٰہی کے مطابق اِستقامت پر رہیں، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو، اس کا بارِ عظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے اور بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال آ گئے تو آپ نے فرمایا کہ اس آیت: فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ نے بوڑھا کر دیا۔ [2]

یہ وہ بوجھ تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے ہٹا دینے کی بشارت اس آیت میں دی گئی ہے، اور اُس کے ہٹا دینے کی صورت اگلی آیات میں یہ آئی ہے کہ آپ کی ہر مشکل کے بعد آسانی ہونے والی ہے، حق تعالیٰ نے شرحِ صدر کے ذریعے آپ کا حوصلہ اتنا بلند فرما دیا کہ یہ سب مشکلات آسان نظر آنے لگیں اور وہ بوجھ بوجھ نہ رہا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۲۹

[2] شعب الإیمان للبیهقیؒ، باب ذکر سورۃ ھود، رقم الحدیث: ۲۳۴۰

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفعِ ذِکر یہ ہے کہ تمام اِسلامی شعائر میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نامِ مبارک لیا جاتا ہے، جو ساری دُنیا میں مناروں اور منبروں پر اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پکارا جاتا ہے، اور دُنیا میں کوئی سمجھ دار اِنسان آپ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا، اگرچہ وہ مسلمان بھی نہ ہو۔

فائدہ

یہاں تین نعمتوں کا ذِکر ہے: شرحِ صدر، وضعِ وِزر، رفعِ ذِکر، ان تینوں کو تین جملوں میں ذِکر فرمایا ہے، اور سب میں فعل اور مفعول کے درمیان ایک حرف لَكَ یا عَنْكَ لایا گیا ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور خاص عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سب کام آپ کی خاطر کئے گئے ہیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کلمے کے شروع میں الف لام ہوتا ہے، جس کو اِصطلاح میں لام تعریف کہتے ہیں، اگر اسی کلمے کو الف لام ہی کے ساتھ مکرّر لایا جائے تو اس کا مصداق وہی ہوتا ہے جو پہلے کلمے کا تھا، اور اگر بغیر الف لام تعریف کے مکرّر لایا جائے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں، اس آیت میں اَلْعُسْر جب مکرّر آیا تو معلوم ہوا کہ اس سے وہ پہلا ہی عُسْر مراد ہے، کوئی نیا نہیں۔ اور لفظ يُسْرًا دونوں جگہ بغیر الف لام کے لایا گیا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ یہ دُوسرا يُسْر پہلے يُسْر کے علاوہ ہے تو اس آیت میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کے تکرار سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی عسر و مشکل کے لئے دو آسانیوں کا وعدہ ہے، اور دو سے مراد بھی خاص دو کا عدد نہیں بلکہ متعدّد ہونا مراد ہے، مطلب یہ ہوا کہ ایک عُسْر یعنی تنگی اور مشکل جو آپ کو پیش آئی یا آئے گی اُس کے ساتھ بہت سی آسانیاں آپ کو دی جائیں گی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام کو اس آیت سے بشارت سنائی اور فرمایا ''لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ يُّسْرَيْنِ'' یعنی ایک عسر دو یسروں پر (ایک مشکل دو آسانیوں پر) غالب نہیں آسکتی۔[2] چنانچہ تاریخ و سیرت کی سب کتابیں جو اپنوں اور غیروں، مسلم و غیر مسلم نے لکھی ہیں، وہ اس پر شاہد ہیں کہ جو کام مشکل سے مشکل بلکہ لوگوں کی نظر میں ناممکن نظر آتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] نور الأنوار، بحث التعريف باللام والاضافة، ص: ٨١و٨٢

[2] تفسير الدر المنثور ج:١٠ ص:٢٩١، والمستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:٣٩٥٠، وشعب الإيمان للبيهقيؒ، باب في الصبر على المصائب، فصل في ذكر ما في الأوجاع والأمراض ...إلخ، رقم الحديث: ٩٥٤١

لئے وہ سب آسان ہوتے چلے گئے۔ روایتِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں الْعُسْرِ کا الف لام عہد کے لئے ہے اور مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عسر ہے، یعنی یہ وعدہ کہ ہر مشکل کے ساتھ بہت سی آسانیاں دی جائیں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لئے ہے، جس کو حق تعالیٰ نے ایسا پورا فرمایا کہ دُنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب اگر دُنیا میں کسی شخص کو عسر کے بعد یسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دِل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اُسی سے لَو لگائے اور اُسی کے فضل کا اُمیدوار رہے اور کامیابی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اُس کے حق میں آسانی کر دے گا۔ (فوائد عثمانیہ)[1] بعض روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[2]

تعلیم و تبلیغ کرنے والوں کو خلوَت میں ذِکر اللہ اور توجہ اِلی اللہ بھی ضروری ہے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝ یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوتِ حق اور تبلیغِ اَحکام سے فارغ ہوں تو (دُوسری) محنت کے لئے تیار ہو جائیے، وہ یہ کہ نماز اور ذِکر اللہ اور دُعائے اِستغفار میں لگ جائیں۔ اکثر حضراتِ مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ بعض حضرات نے دُوسری تفسیریں بھی لکھی ہیں، مگر اَقرب وہی ہے جو اُوپر لکھی گئی، اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور خلقِ خدا کو راستہ دِکھانا، اُن کی اصلاح کی فکر، یہ آپ کی سب سے بڑی عبادت تھی، مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اس کی تدبیر کریں، آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں، بلکہ جب اس سے فرصت ملے تو بلاواسطہ خلوَت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں، اُسی سے ہر کام میں کامیابی کی دُعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ذِکر اللہ اور عبادت بلاواسطہ ہی ہے، اور شاید اسی لئے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذِکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لئے ہے، اُس سے فراغت ہو سکتی ہے اور دُوسرا کام یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مؤمن کو کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اس میں صَرف کرنا ہے۔

فائدہ

اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم و تبلیغ اور اِصلاحِ خلق کا کام کرنے والے ہیں، اُن کو اس سے غفلت نہ ہونا چاہئے

---

[1] تفسیر عثمانی، تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۸۲۴

[2] موطأ مالكؒ، كتاب الجهاد، باب الترغب في الجهاد، ج:۲ ص:۴۴۶، والمستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:۳۰۱۰

کہ اُن کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذِکر اللہ کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہئے، جیسا کہ علمائے سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں، اس کے بغیر تعلیم وتبلیغ بھی مؤثر نہیں ہوتی، اُن میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔

فائدہ

لفظ فَانْصَبْ نَصْبٌ سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی تعب اور تکان کے ہیں، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذِکر اللہ اس حد تک جاری رکھا جائے کہ کچھ مشقت اور تکان محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت وخوشی ہی پر اس کا مدار نہ رہے، اور کسی وظیفہ اور معمول کی پابندی خود ایک مشقت اور تعب ہے، خواہ کام مختصر ہی ہو۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاحِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

سُورَةُ التِّين

اٰیاتها ۸ ۹۵ سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ ۲۸ رکوعها ۱

سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳

قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طورِ سینین کی اور اس شہر امن والے کی

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ

ہم نے بنایا آدمی خوب سے اندازے پر، پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے

سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ

نیچے، مگر جو یقین لائے اور عمل کئے اچھے سو اُن کے لئے ثواب ہے

غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۝ اَلَیْسَ اللّٰهُ

بے انتہا، پھر تو اس کے پیچھے کیوں جھٹلائے بدلہ ملنے کو کیا نہیں ہے اللہ

بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ۝

سب حاکموں سے بڑا حاکم

ع ۸/۲۰

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے انجیر اور زیتون کی، (۱) اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی، (۲) اور اس امن وامان والے شہر کی، (۳) کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے، (۴) پھر ہم اُسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں، (۵) سوائے اُن کے جو ایمان لائے، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے، تو اُن کو ایسا اَجر ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (۶) پھر (اے انسان!) وہ کیا چیز ہے جو تجھے جزاوسزا کو جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے؟ (۷) کیا اللہ سارے حکمرانوں سے بڑھ کر حکمران نہیں ہے؟ (۸)

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اِنجیر (کے درخت) کی! اور زیتون (کے درخت) کی! اور طورِ سینین کی! اور اس امن والے شہر (یعنی مکہ معظّمہ) کی! کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے، پھر (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں (یعنی وہ خوبصورتی بدصورتی سے اور قوت ضعف سے بدل جاتی ہے، اور بُرے سے بُرا ہو جاتا ہے، مقصود اس سے بیان کرنا کمال قبح کا ہے، جس سے اُن کے دوبارہ پیدا کرنے پر حق تعالیٰ کی قدرت ہونا واضح ہوتا ہے، کقولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ...اِلخ [1] (الروم: ۵۴) اور مقصود اس سورت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت دوبارہ پیدا کرنے اور زِندہ کرنے پر ثابت کرنا ہے، جیسا کہ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ۝ کے جملے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے، اور اس آیت کے عموم سے چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے سب

[1] ترجمہ: اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا۔

کے سب قبیح اور بُرے ہو جاتے ہیں اور اس ابہام کو دُور کرنے کے لئے آگے آیت میں ایک استثنا بیان کیا جاتا ہے کہ) لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (جس میں بتلا دیا کہ مؤمن صالح بوڑھے ضعیف ہو جانے کے باوجود انجامِ کار کے اعتبار سے اچھے ہی رہتے ہیں، بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی عزّت بڑھ جاتی ہے، آگے خَلَقْنَا اور رَدَدْنٰهُ پر تفریع ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تخلیق و تقلیبِ احوال پر قادر ہیں) تو (اے انسان!) پھر کون چیز تجھ کو قیامت کے بارے میں منکر بنا رہی ہے (یعنی وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر تو ان دلائل کے ہوتے ہوئے قیامت کا منکر ہو رہا ہے) کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے (تصرفاتِ دُنیویہ میں بھی جن میں سے تخلیقِ انسانی اور پھر بڑھاپے میں اُس میں تغیرات کا ذِکر اُوپر آیا ہے، اور تصرفاتِ اُخرویہ میں بھی جن میں سے قیامت و مجازاۃ بھی ہے)۔

معارف و مسائل

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ① اس آیت میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، جن میں دو درخت ہیں، ایک تین یعنی اِنجیر، دُوسرے زیتون اور ایک پہاڑ طور اور ایک شہر یعنی مکہ مکرمہ کی۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں درخت کثیر البرکت، کثیر المنافع ہیں، جس طرح طور پہاڑ اور شہرِ مکہ کثیر البرکت ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں تین اور زیتون کے ذِکر سے مراد وہ جگہ ہو جہاں یہ درخت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، اور وہ ملک شام ہے جو معدنِ انبیاء علیہم السلام ہے، اور حضرت اِبراہیم علیہ السلام بھی اسی ملک میں مقیم تھے، ان کو ہجرت کرا کر مکہ معظّمہ لایا گیا تھا، اس طرح ان قسموں میں تمام وہ مقاماتِ مقدسہ شامل ہو گئے جہاں خاص خاص انبیاء علیہم السلام پیدا اور مبعوث ہوئے، ملکِ شام عام انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مسکن ہے۔ کوہِ طور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلام ہونے کی جگہ ہے، اور سینین یا سیناء اُس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے، اور بلدِ اَمین مکہ مکرمہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن ہے۔

ان چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ④ تَقْوِیْمٍ کے لفظی معنی کسی چیز کے قوام اور بنیاد کو دُرست کرنے کے ہیں۔ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ سے مراد یہ ہے کہ اس کی جبلت و فطرت کو بھی دُوسری مخلوقات کے اعتبار سے احسن بنایا گیا، اور اُس کی جسمانی ہیئت اور شکل و صورت کو بھی دُنیا کے سب جانداروں سے بہتر اور حسین بنایا گیا۔

انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ حسین ہے

جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ حسین بنایا ہے۔ ابنِ عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے اَحسن نہیں، کیونکہ اُس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کے ساتھ عالم،

قادر، متکلم، سمیع، بصیر، مدبر اور حکیم بنایا ہے، اور یہ سب صفات دراصل خود حق سبحانہ وتعالیٰ کی ہیں، چنانچہ بخاری ومسلم کی روایت میں آیا کہ: ''اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ مراد اس سے یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دِیا گیا ہے، ورنہ حق تعالیٰ ہر شکل وصورت سے بَری ہے۔ (قرطبی) [۱]

حسنِ انسانی کا ایک عجیب واقعہ

قرطبی رحمہ اللہ نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار کے مخصوص لوگوں میں سے تھے، اور اپنی بیوی سے بہت محبت رکھتے تھے، ایک روز چاندنی رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے بول اُٹھے ''اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا اِنْ لَّمْ تَکُوْنِیْ اَحْسَنَ مِنَ الْقَمَرِ'' یعنی تم پر تین طلاق ہیں، اگر تم چاند سے زیادہ حسین نہ ہو، یہ کہتے ہی بیوی اُٹھ کر پردے میں چلی گئی کہ آپ نے مجھے طلاق دے دی، بات ہنسی دِل لگی کی تھی، مگر طلاق کا حکم یہی ہے کہ کسی طرح بھی طلاق کا صریح لفظ بیوی کو کہہ دیا جائے تو طلاق ہوجاتی ہے، خواہ ہنسی دِل لگی ہی میں کہا جائے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے رات بڑی بے چینی اور رنج وغم میں گزاری، صبح کو خلیفۂ وقت ابوجعفر منصور کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا قصہ سنایا اور اپنی پریشانی کا اِظہار کیا۔ منصور نے شہر کے فقہاء اہلِ فتویٰ کو جمع کر کے سوال کیا، سب نے ایک ہی جواب دیا کہ طلاق ہوگئی، کیونکہ چاند سے زیادہ حسین ہونے کا کسی انسان کے لئے اِمکان ہی نہیں۔ مگر ایک عالم جو اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے تھے، خاموش بیٹھے رہے، منصور نے پوچھا کہ آپ کیوں خاموش ہیں تب یہ بولے اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر سورۂ تین تلاوت کی اور فرمایا کہ امیرالمؤمنین! اللہ تعالیٰ نے ہر اِنسان کا اَحسنِ تقویم میں ہونا بیان فرمادیا ہے، کوئی شے اس سے زیادہ حسین نہیں۔ یہ سن کر سب علماء فقہاء حیرت میں رہ گئے، کوئی مخالفت نہیں کی، اور منصور نے حکم دے دیا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ [۲]

اس سے معلوم ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ حسین ہے، ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی، حسن وجمال کے اعتبار سے بھی اور بدنی ساخت کے اعتبار سے بھی، اس کے سر میں کیسے کیسے اعضا، کیسے کیسے عجیب کام کر رہے ہیں کہ ایک مستقل فیکٹری معلوم ہوتی ہے، جس میں بہت سی نازک باریک خودکار مشینیں چل رہی ہیں، یہی حال اس کے سینے اور پیٹ کا ہے، اسی طرح اس کے ہاتھ پاؤں کی ترکیب وہیئت ہزاروں حکمتوں پر مبنی

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۱۴، وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الوجه، ج:۲ ص:۳۲۷، واحکام القرآن لابن العربیؒ، سورة التین، ج:۸ ص:۸۲

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۱۴، واحکام القرآن لابن العربیؒ، سورة التین، ج:۸ ص:۸۲

ہے۔ اسی لئے فلاسفہ نے کہا ہے کہ انسان ایک عالمِ اصغر یعنی پورے عالم کا ایک نمونہ ہے۔ سارے عالم میں جو چیزیں بکھری ہوئی ہیں، وہ سب اس کے وجود میں جمع ہیں۔ (قرطبی) [۱]

صوفیائے کرام نے بھی اس کی تائید کی اور بعض حضرات نے انسان کے سر سے پیر تک کا سراپا لے کر اشیائے عالم کے نمونے اس میں دِکھلائے ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ پہلے جملے میں ساری مخلوقات اور کائنات سے اَحسن بنانے کا بیان تھا، اس جملے میں اس کے بالمقابل یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح وہ اپنی اِبتدا اور شباب میں ساری مخلوقات سے زیادہ حسین اور سب سے بہتر تھا، آخر میں اس پر یہ حالت بھی آتی ہے کہ وہ بد سے بدتر اور بُرے بُرا ہو جاتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ بدتری اور بُرائی اُس کی ظاہری جسمانی حالت کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کہ شباب ڈھلنے کے بعد شکل وصورت بدلنے لگتی ہے، بڑھاپا اس کا رُوپ بالکل بدل ڈالتا ہے، بدہیئت، بدشکل نظر آنے لگتا ہے، بے کار اور دُوسروں پر بار ہو کر رہ جاتا ہے، کسی کے کام نہیں آتا، بخلاف دُوسرے جانوروں کے کہ وہ آخر تک اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، اِنسان اُن سے دُودھ اور سواری، بار برداری کے اور دُوسری قسم کے سیکڑوں کام لیتے ہیں، وہ ذبح کردیئے جائیں یا مرجائیں تو بھی اُن کی کھال، بال، ہڈی، غرض جسم کا ریزہ ریزہ انسانوں کے کام میں آتا ہے، بخلاف انسان کے کہ جب وہ بیماری اور بڑھاپے میں عاجز ودرماندہ ہو جاتا ہے تو مادّی اور دُنیاداری کے اعتبار سے کسی کام کا نہیں رہتا، مرنے کے بعد بھی اس کے کسی جزء سے کسی انسان یا جانور کو فائدہ نہیں پہنچتا، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے اسفل السافلین میں پہنچ جانے سے مراد اس کی مادّی اور جسمانی کیفیت ہے۔ یہ تفسیر حضرت ضحاک وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے۔ (کما فی القرطبی) [۲]

اس تفسیر پر اگلی آیت میں جو مؤمنینِ صالحین کے استثناء یعنی اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ کا ذِکر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر بڑھاپے کے حالات اور عجز ودرماندگی نہیں آتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جسمانی بے کاری اور مادّی خرابی کا نقصان ان کو نہیں پہنچتا، بلکہ نقصان صرف اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اپنی ساری فکر اور توانائی اسی مادّی دُرستی پر خرچ کی تھی، وہ اب ختم ہوگئی، اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، بخلاف مؤمنینِ صالحین کے کہ ان کا اجر وثواب کبھی قطع ہونے والا نہیں، اگر دُنیا میں بڑھاپے کی بیماری، کمزوری اور عجز سے سابقہ بھی پڑا تو آخرت میں اُن کے لئے درجاتِ عالیہ اور راحت ہی راحت موجود ہے، اور بڑھاپے کی بے کاری میں بھی عمل کم ہو جانے کے باوجود ان کے نامۂ اَعمال میں وہ سب اعمال لکھے جاتے ہیں جو وہ قوت کے زمانے میں کیا کرتے تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۱۴

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۱۵

اس کے اعمال لکھنے والے فرشتے کو حکم دے دیتے ہیں کہ جو جو عملِ خیر یہ اپنی تندرستی میں کیا کرتا تھا، وہ سب اس کے اعمال نامے میں لکھتے رہو۔ (رواہ البغوی فی شرح السُّنَّة، والبخاری عن ابی موسیٰ مثله فی المریض والمسافر) [۱] اس کے علاوہ اس مقام پر مؤمنینِ صالحین کی جزا جنت اور اس کی نعمتوں کو بیان کرنے کے بجائے فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ فرمایا ہے، یعنی اُن کا اجر کبھی مقطوع و منقطع ہونے والا نہیں۔ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کا یہ صلہ دُنیا کی مادّی زندگی ہی سے شروع ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لئے بڑھاپے اور ضعف میں ایسے مخلص رُفقا مہیا فرما دیتے ہیں جو اُن کے آخری لمحے تک ان سے رُوحانی فوائد اُٹھاتے ہیں اور ان کی ہر طرح کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی طرح بڑھاپے کا وہ وقت جب انسان مادّی اور جسمانی طور پر معطل، بے کار اور لوگوں پر بار سمجھا جاتا ہے، اللہ کے یہ بندے اُس وقت بھی بے کار نہیں ہوتے۔ اور بعض حضراتِ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ عام انسانوں کے لئے نہیں بلکہ کفار و فجار کے لئے ہے، جنہوں نے خداداد اَحسنِ تقویم اور اِنسانی کمالات و شرافت اور عقل کو مادّی لذائذ کے پیچھے برباد کردیا تو اس ناشکری کی سزا میں اُن کو اَسفل السافلین میں پہنچا دیا جائے گا، اس صورت میں اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا اِستثنا اپنے ظاہری مفہوم پر رہتا ہے کہ اسفل سافلین میں پہنچنے سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عملِ صالح کے پابند رہے، کیونکہ ان کا اُجر ہمیشہ جاری رہے گا۔ (کذا فی المظهری) [۲]

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۞ پچھلی آیات میں تخلیقِ انسانی کے کمال اور اُس پر حق تعالیٰ کے خاص اِنعام کا، پھر بڑھاپے میں حالات کے اِنقلاب کا ذِکر فرما کر اس آیت میں منکرینِ قیامت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قدرتِ الٰہیہ کے ایسے مناظر اور اِنقلابات دیکھنے کے بعد بھی کیا گنجائش ہے کہ تم آخرت اور قیامت کی تکذیب کرو، کیا اللہ تعالیٰ سب حکومت کرنے والوں پر حاکم نہیں۔

مسئلہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ تین پڑھے اور اس آیت پر پہنچے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۞ تو اُس کو چاہئے کہ یہ کلمہ کہے: ''بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ'' اس لئے حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ یہ کلمہ پڑھنا مستحب ہے۔ [۳]

تَمَّتْ سُوْرَةُ التِّيْنِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ۳۰/شَعْبَان ۱۳۹۱ھ

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب ما يكتب للمسافر مثل ما كان يعمل في الإقامة، ج:۱ ص:۴۲۰، ومسند احمد، مسند عبدالله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما، رقم الحديث:۶۸۲۵

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۲۹۸

[۳] سنن ابی داود، كتاب الصلاة، باب مقدار الركوع والسجود، ج:۱ ص:۱۲۸، وجامع الترمذی، ابواب التفسير، باب تفسير سورة التين، ج:۲ ص:۱۷۲

سُورَةُ العَلَق

آیاتها ۱۹ | ۹۶ سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ ۱ | رکوعها ۱

سورۂ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا، بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے،

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ

پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھلایا آدمی کو

مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝٥ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۝٦ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝٧ اِنَّ

جو وہ نہ جانتا تھا، کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا، بے شک

اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰىؕ ۞ ٨ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰىۙ ۞ ٩ عَبْدًا اِذَا صَلّٰىؕ ۞ ١٠

تیرے ربّ کی طرف پھر جانا ہے، تو نے دیکھا اُس کو جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھے،

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰىۙ ۞ ١١ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰىؕ ۞ ١٢ اَرَءَيْتَ

بھلا دیکھ تو اگر ہوتا نیک راہ پر، یا سکھاتا ڈر کے کام، بھلا دیکھ تو

اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰىؕ ۞ ١٣ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰىؕ ۞ ١٤ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬

اگر جھٹلایا اور منہ موڑا، یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے، کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا

لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِۙ ۞ ١٥ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍۚ ۞ ١٦ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗۙ ۞ ١٧

ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑکر، کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار، اب بلا لیوے اپنی مجلس والوں کو،

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَۙ ۞ ١٨ كَلَّاؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ۞ ١٩ (ع ۲۱/۱) السجدۃ ۱۳

ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو، کوئی نہیں مت مان اس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا، (۱) اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ (۲) پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، (۳) جس نے قلم سے تعلیم دی، (۴) انسان کو اُس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (۵) حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلی سرکشی کر رہا ہے (۶) کیونکہ اُس نے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ لیا ہے۔ (۷) سچ تو یہ ہے کہ تمہارے پروردگار ہی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ (۸) بھلا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے؟ (۹) - (۱۰) بھلا بتلاؤ کہ اگر وہ (نماز پڑھنے والا) ہدایت پر ہو، (۱۱) یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو، (تو کیا اُسے روکنا گمراہی نہیں؟) (۱۲) بھلا بتلاؤ کہ اگر وہ (روکنے والا) حق کو جھٹلاتا ہو، اور منہ موڑتا ہو، (۱۳) کیا اُسے یہ معلوم

نہیں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ (۱۴) خبردار! اگر وہ باز نہ آیا، تو ہم (اُسے) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے، (۱۵) اُس پیشانی کے بال جو جھوٹی ہے، گنہگار ہے۔ (۱۶) اب وہ بُلا لے اپنی مجلس والوں کو! (۱۷) ہم دوزخ کے فرشتوں کو بُلا لیں گے۔ (۱۸) ہرگز نہیں! اُس کی بات نہ مانو، اور سجدہ کرو، اور قریب آ جاؤ۔ (۱۹)

خلاصۂ تفسیر

اِقْرَاْ سے مَالَمْ يَعْلَمْ تک سب سے پہلی وحی ہے، جس کے نزول سے نبوّت کی اِبتدا ہوئی، جس کا قصہ حدیثِ شیخین میں یہ ہے کہ عطائے نبوّت کے قریب زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَز خود خلوَت پسند ہوگئی، آپ غارِ حرا میں تشریف لے جا کر کئی کئی شب رہتے، ایک روز دفعۃً جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ: اِقْرَاْ یعنی پڑھیے! آپ نے فرمایا کہ ''مَا اَنَا بِقَارِئٍ ''یعنی میں کچھ پڑھا ہوا نہیں، انہوں نے خوب آپ کو زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا، اور پھر کہا: اِقْرَاْ، آپ نے پھر وہی جواب دیا، اسی طرح تین بار کیا، پھر آخر میں دبانے کے بعد چھوڑ کر کہا: اِقْرَاْ اِلَى مَالَمْ يَعْلَمْ۔ [۱]

اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا جس میں اس وقت کی نازل ہونے والی آیتیں بھی داخل ہیں) اپنے رَبّ کا نام لے کر پڑھا کیجئے (یعنی جب پڑھیے تو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہہ کر پڑھا کیجئے، جیسا کہ اس آیت میں: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ... اِلخ (النحل:۹۸) میں قرآن کے ساتھ اَعُوْذُ بِاللهِ پڑھنے کا حکم ہوا ہے، اور ان دونوں اَمر سے جو اَصل مقصود ہے یعنی توکل و اِستعانت وہ تو واجب ہے، اور زبان سے کہہ لینا مسنون ومندوب ہے، اور گو اَصل مقصود کے اعتبار سے اس آیت کے نزول کے وقت بِسْمِ اللهِ کا آپ کو معلوم ہونا ضروری نہیں، لیکن بعض روایات میں اس سورت کے ساتھ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا نازل ہونا بھی آیا ہے، اخرجه الواحدی عن عكرمة والحسن انهما قالا: اوّل ما نزل بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ واوّل سورة اِقْرَاْ وأخرجه ابن جرير وغيره عن ابن عبّاس انه قال اوّل ما نزل جبريل عليه السلام على النّبى صلى الله عليه وسلم قال: يا محمد! إستعذ ثم قل بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، كذا فى رُوح المعانى۔ [۲] اور ان آیتوں میں جو قرأة کو اِسمِ اِلٰہی کے ساتھ اِفتتاح کرنے کا حکم ہوا ہے، اس حکم میں خود ان آیتوں کا داخل ہونا ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص دُوسرے سے کہے کہ: ''اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَكَ ''یعنی میں جو کچھ تجھ سے کہوں تو اس کو سن۔ تو خود اس جملے کے سننے کا حکم کرنا بھی اس کو مقصود

---

[۱] صحيح البخارى، باب كيف كان بدء الوحى ...إلخ، رقم الحديث:۳، ج:۱ ص:۳

[۲] تفسير رُوح المعانى تحت هٰذه الآية ج:۲۳ ص:۳٦

ہے، پس حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو یا جو آیات بعد میں نازل ہوں گی ان کو پڑھو، سب کی قراءت اسمِ الٰہی سے ہونا چاہئے، اور آپ کو بعلم ضروری معلوم ہوگیا کہ یہ قرآن اور وحی ہے، اور حدیثوں میں جو آپ کا ڈر جانا اور ورقہ ابن نوفل سے بیان کرنا آیا ہے، وہ بوجہ شبہ کے نہ تھا، بلکہ خوف وہیبت وحی سے اِضطراری تھا، اور ورقہ سے بیان کرنا مزید اطمینان وزیادتِ ایقان کے لئے تھا نہ کہ عدم ایقان کے سبب، اور معلّم متعلّم سے ابجد شروع کرانے کے وقت کہتا ہے کہ ہاں پڑھ! پس اس سے تکلیف مالایطاق لازم نہیں آتی، اور آپ کا عذر فرمانا یا تو اس وجہ سے ہے کہ آپ کو اس جملے کے معنی متعین نہ ہوئے ہوں کہ مجھ سے کیا پڑھوانا چاہتے ہیں، اور یہ امر کوئی خلافِ شان نہیں ہے، یا باوجود تعیینِ مراد کے اس سبب سے ہے کہ قراءت کا استعمال اکثر لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے معنی میں آتا ہے، تو آپ نے بوجہ حرف شناس نہ ہونے کے یہ عذر فرمایا ہو، اور حضرت جبریل علیہ السلام کا دبانا بہ ظنِ غالب واللہ اعلم بحقیقۃ الحال اس لئے ہوگا کہ آپ کے اندر بارِ وحی کے تحمل کی اِستعداد پیدا کردیں، اور لفظ رَبّ سے اشارہ اس طرف ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے اور نبوّت کے درجاتِ اعلیٰ پر پہنچادیں گے۔ آگے رَبّ کی صفت ہے یعنی وہ ایسا رَبّ ہے) جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا (اس وصف کی تخصیص میں یہ نکتہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں میں اوّل ظہور اس نعمت کا ہوتا ہے تو تذکیر میں اس کا مقدم ہونا مناسب ہے، اور نیز خلق دلیل ہے خالق پر اور سب سے اہم اور اَقدم معرفت خالق ہے، آگے بطور تخصیص بعد تعیم کے ارشاد ہے کہ) جس نے (سب مخلوقات میں سے بالخصوص) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا (اس تخصیص بعد تعیم میں اشارہ ہے کہ نعمتِ خلق میں بھی عام مخلوقات سے زیادہ انسان پر اِنعام ہے کہ اس کو کس درجہ تک ترقی دی کہ صورت کیسی بنائی، عقل وعلم سے مشرف بنایا، پس انسان کو زیادہ شکر اور ذِکر کرنا چاہئے، اور تخصیص علق کی شاید اس لئے ہے کہ یہ ایک برزخی حالت ہے کہ اس کے قبل نطفہ اور غذا وعنصر ہے، اور اس کے بعد مضغہ اور ترکیبِ عظام ونفخِ رُوح ہے، پس گویا وہ جمیع احوال متقدمہ ومتأخرہ کے درمیان ہے، آگے قراءت کو مقصود اہم قرار دینے کے لئے ارشاد ہے کہ) آپ قرآن پڑھا کیجئے (حاصل یہ کہ پہلے امر یعنی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہاں اصل مقصود ذِکر اسم اللہ ہے، بلکہ قراءت خود بھی فی نفسہا مقصود ہے کیونکہ تبلیغ کا ذریعہ یہی قراءت ہے، اور تبلیغ ہی اصل کام صاحب وحی کا ہے، پس اس تکرار میں آپ کی نبوّت اور مأمور بالتبلیغ ہونے کا اظہار بھی ہوگیا) اور (آگے اُس عذر کو رفع کردینے کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے اوّل جبریل علیہ السلام سے پیش کیا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ) آپ کا رَبّ بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور وہ ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو نوشتہ) قلم سے تعلیم دی (اور عموماً ومطلقاً) انسان کو (دُوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا (مطلب یہ کہ اوّل تو تعلیم کچھ کتابت میں منحصر نہیں، کیونکہ دُوسرے طریقوں سے بھی تعلیم کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، ثانیاً اسباب مؤثر بالذات نہیں، مسبّبِ حقیقی اور علم دینے والے ہم ہیں، پس گو

آپ لکھنا نہیں جانتے، مگر ہم نے جب آپ کو قراءت کا امر کیا ہے تو ہم دُوسرے ذریعے سے آپ کو قراءت اور حفظِ علومِ وحی پر قدرت دے دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پس ان آیات میں آپ کی نبوّت اور اُس کے مقدمات و متممات کا پورا بیان ہوگیا، اور چونکہ صاحبِ نبوّت کی مخالفت غایت درجے کا گناہ اور شنیع امر ہے، اس لئے آئندہ آیات میں جن کا نزول آیاتِ اُولیٰ سے ایک مدّت کے بعد ہوا ہے، آپ کے ایک خاص مخالف یعنی ابوجہل کی مذمت عام الفاظ سے ہے جس میں دُوسرے مخالفین بھی شامل ہوجائیں، جس کا سببِ نزول یہ ہے کہ ایک بار ابوجہل نے آپ کو نماز پڑھتے دیکھا، کہنے لگا کہ میں آپ کو اس سے بارہا منع کرچکا ہوں، آپ نے اس کو جھڑک دیا، تو کہنے لگا کہ مکہ میں سب سے بڑا مجمع میرے ساتھ ہے، اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر اب کی بار نماز پڑھتے دیکھوں گا تو... نعوذ باللہ... آپ کی گردن پر پاؤں رکھ دُوں گا، چنانچہ ایک بار اس قصد سے چلا، مگر قریب جاکر رُک گیا اور پیچھے ہٹنے لگا، لوگوں نے وجہ پوچھی، کہنے لگا کہ مجھ کو ایک خندق آگ کی حائل معلوم ہوئی، اور اس میں پردار چیزیں نظر آئیں۔ آپ نے فرمایا وہ فرشتے تھے، اگر اور آگے آتا تو فرشتے اس کو بوٹی بوٹی کرکے نوچ ڈالتے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، کذا فی الدر المنثور عن الصحاح وغیرھا من کتب الحدیث۔[1] ارشاد ہے کہ) سچ مچ بے شک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس وجہ سے کہ اپنے آپ کو (ابنائے جنس سے) مستغنی دیکھتا ہے (کقولہ تعالیٰ: وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا... إلخ[2] (الشوریٰ:۲۷) حالانکہ اس اِستغنا پر سرکشی حماقت ہے، کیونکہ کسی کو گو مخلوق سے من وجہٍ اِستغنا ہو بھی جائے لیکن حق تعالیٰ سے اِستغنا تو کسی حال میں نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ آخر میں) اے مخاطب (عام) تیرے رَبّ ہی کی طرف سب کا لوٹنا ہوگا (اور اس وقت بھی مثل حالتِ حیات کے اس کی قدرت کے اِحاطے میں گھرا ہوگا، اور اس حالت میں جو اس کو طغیان کی سزا ہوگی اس سے بھی کہیں نہ بھاگ سکے گا، پس ایسا عاجز، ایسے قادر سے کب مستغنی ہوسکتا ہے تو اپنے کو مستغنی سمجھنا اور اس کی بنا پر سرکشی کرنا بڑی بے وقوفی ہے۔ آگے بصورت اِستفہام تعجب ہے اس کی سرکشی پر یعنی) اے مخاطب (عام) بھلا اس شخص کا حال تو بتلا جو (ہمارے) ایک (خاص) بندے کو منع کرتا ہے جب وہ (بندہ) نماز پڑھتا ہے (مطلب یہ کہ اس شخص کا حال دیکھ کر تو بتلا کہ اس سے زیادہ عجیب بات بھی کوئی ہے حاصل یہ کہ نمازی کو نماز سے روکنا نہایت ہی بُری اور عجیب بات ہے، آگے اسی تعجب کی تاکید و تقویت کے لئے مکرّر فرماتے ہیں کہ) اے مخاطب (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ بندہ (جس کو نماز سے روکا گیا ہے) ہدایت پر ہو (کہ جو کمال لازمی ہے) یا وہ (دُوسروں کو بھی) تقویٰ کی تعلیم دیتا ہو (جو کمال متعدی یعنی دُوسروں کی نفع رسانی ہے، اور شاید کلمہ تردید

---

[1] تفسیر الدر المنثور، ج:۱۰ ص:۳۰۲، وصحیح مسلم، کتاب صفة المنافقین ...إلخ، باب صفة القیامة والجنة والنار، ج:۲ ص:۳۷۲، ومسند احمد، مسند ابی هریرة رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۸۸۳۱

[2] ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لئے روزی فراخ کردیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے۔

لانے سے اشارہ اس طرف ہو کہ اگر ان میں سے ایک صفت بھی ہوتی تب بھی منع کرنے والے کی مذمت کے لئے کافی تھی، چہ جائیکہ دونوں ہوں، اور) اے مخاطب (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ شخص (منع کرنے والا دینِ حق کو) جھٹلاتا ہو اور (دینِ حق سے) رُوگردانی کرتا ہو (یعنی نہ عقیدہ رکھتا ہو اور نہ عمل، یعنی اوّل تو یہ دیکھو کہ نماز سے منع کرنا کتنا بُرا ہے، پھر بالخصوص یہ دیکھو کہ جب منع کرنے والا ایک گمراہ، اور جس کو منع کر رہا ہے وہ ہدایت کا اعلیٰ نمونہ ہے، تو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ آگے اس منع کرنے پر اس کو وعید ہے، یعنی) کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ (اس کی سرکشی اور اُس سے پیدا ہونے والے اعمال کو) دیکھ رہا ہے (اور اس پر سزا دے گا، آگے اس پر زجر ہے یعنی اس کو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہئے اور) اگر یہ شخص (اپنی اس حرکت سے) باز نہ آئے گا تو ہم (اس کو) پٹھے پکڑ کر جو کہ دروغ اور خطا میں آلودہ پٹھے ہیں (جہنم کی طرف) گھسیٹیں گے (ناصیہ سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے جن کو اُردو میں پٹھے بولتے ہیں اس کی صفت میں کاذبہ خاطئہ مجازاً فرمایا، اور اس کو جو اپنے مجمع پر گھمنڈ ہے اور ہمارے پیغمبر کو دھمکاتا ہے) سو یہ اپنی مجلس والوں کو بلالے (اگر اس نے ایسا کیا تو) ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بلالیں گے (چونکہ اُس نے نہیں بلایا، اس لئے اللہ نے ان فرشتوں کو بھی نہیں بلایا، کما روی الطبری عن قتادة مرسلًا، قال النبی صلی الله علیه وسلم: لَوْ فَعَلَ اَبُوْجَهْلٍ لَاَخَذَتْهُ الْمَلَائِكَةُ الزَّبَانِيَةُ عَيَانًا۔ [۱] [۲] آگے پھر زیادتِ زجر کے لئے اس کو تنبیہ ہے کہ اس کو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہئے مگر) آپ (اس نالائق کی ان حرکتوں کی کچھ پروا نہ کیجئے اور) اس کا کہنا نہ مانئے (جیسا اب تک بھی نہیں مانا) اور (بدستور) نماز پڑھتے رہئے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہئے (اس میں ایک لطیف وعدہ ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو ان لوگوں کے ضرر سے محفوظ رکھے گا کیونکہ نماز سے قرب ہوتا ہے اور قرب موجبِ عظمت ہے، اِلَّا لِحِكْمَةٍ خَاصَّةٍ، پس ایسے اُمور کی طرف ذرا اِلتفات نہ کیجئے، اپنے کام میں لگے رہئے)۔

معارف و مسائل

وحیٔ نبوّت کی اِبتدا اور سب سے پہلی وحی

صحیحین اور دُوسری معتبر روایات سے ثابت اور جمہور سلف وخلف کا اس پر اِتفاق ہے کہ وحی کی اِبتدا سورۂ علق یعنی

---

[۱] تفسیر الطبری ج:۲۴ ص:۵۲۷، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورة اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ، ج:۲ ص:۱۷۲، ومسند احمد، مسند عبدالله بن عباس بن عبدالمطلب عن النبی صلی الله علیه وسلم، رقم الحدیث:۳۴۸۳

[۲] ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ابوجہل آپ کی طرف بڑھتا تو دوزخ کے فرشتے سب کے سامنے اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتے۔

اِقْرَاْ سے ہوئی ہے، اور اس سورت کی ابتدائی پانچ آیتیں مَالَمْ یَعْلَمْ تک سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ [1] بعض حضرات نے سورۂ مدثر کو سب سے پہلی سورت قرار دیا ہے، اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جمہور سلف وخلف کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اِقْرَاْ کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ (کذا روی عن ابن عباس والزھری وعمرو بن دینار، دُرِّ منثور [2]) اور جن حضرات نے سورۂ مدثر کو پہلی سورت فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اِقْرَاْ کی پانچ آیتیں نازل ہونے کے بعد نزولِ قرآن میں ایک مدّت تک توقف رہا، جس کو زمانہ فترت کا کہا جاتا ہے، اور وحی کی تأخیر وتوقف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت رنج وغم پیش آیا، اس کے بعد اچانک پھر حضرت جبریلِ امین علیہ السلام سامنے آئے اور سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی اور ملاقاتِ جبریل سے وہی کیفیت طاری ہوئی جو سورۂ اِقْرَاْ کے نزول کے وقت پیش آئی تھی، جس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اس طرح فترت کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی اِبتدائی آیات نازل ہوئیں، اس لحاظ سے اس کو بھی پہلی سورت کہہ سکتے ہیں۔ اور سورۂ فاتحہ کو جن حضرات نے پہلی سورت فرمایا ہے، اُس کی بھی ایک وجہ ہے، وہ یہ کہ مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی، اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات ہی کا نزول ہوا تھا۔ (مظہری) [3] صحیحین کی ایک طویل حدیث میں نبوّت اور وحی کی اِبتدا کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ وحی رُویائے صالحہ یعنی سچے خوابوں سے شروع ہوا، جس کی کیفیت یہ تھی کہ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے، بالکل اس کے مطابق واقعہ پیش آتا، اور اس میں کسی تعبیر کی بھی ضرورت نہ تھی، صبح کی روشنی کی طرح واضح طور پر خواب میں دیکھا ہوا واقعہ سامنے آجاتا تھا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق سے یکسوئی اور خلوَت میں عبادت کرنے کا داعیہ قوی پیش آیا، جس کے لئے آپ نے غارِ حرا کو منتخب فرمایا، (یہ غار مکہ مکرمہ کے قبرستان جنۃ المعلیٰ سے کچھ آگے ایک پہاڑ پر ہے، جس کو جبل النور کہا جاتا ہے، اس کی چوٹی دُور سے نظر آتی ہے)۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اس غار میں جاکر راتوں کو رہتے اور عبادت کرتے تھے، جب تک اہل وعیال کی خبرگیری کی ضرورت پیش نہ آتی وہیں مقیم رہتے تھے، اور اس وقت کے لئے آپ ضروری توشہ لے جاتے تھے، اور پھر توشہ ختم ہونے کے بعد حضرت خدیجہ اُمّ المؤمنین کے پاس تشریف لاتے اور

---

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی، ج:۱ ص:۳، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱ ص:۸۸

[2] تفسیر الدر المنثور ج:۱۰ ص:۲۹۹، وتفسیر البغوی ج:۸ ص:۴۷۳

[3] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۰۱

مزید کچھ دِنوں کے لئے توشہ لے جاتے، یہاں تک کہ آپ اسی غارِ حرا میں تھے کہ اچانک آپ کے پاس حق یعنی وحی پہنچی۔ [۱]

(غارِ حرا میں خلوت گزینی کی مدّت میں علماء کا اِختلاف ہے، صحیحین [۲] کی روایت ہے کہ آپ نے ایک ماہ یعنی پورے رمضان اس میں قیام فرمایا۔ اِبنِ اسحاق نے سیرت میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں فرمایا کہ اس سے زیادہ مدّت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے، اور یہ عبادت جو آپ غارِ حرا میں نزولِ وحی سے پہلے کرتے تھے، اس وقت نماز وغیرہ کی تعلیم تو ہوئی نہ تھی، بعض حضرات نے فرمایا کہ نوح اور اِبراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام کی شرائع کے مطابق عبادت کرتے تھے، مگر نہ کسی روایت سے اس کا ثبوت ہے، اور نہ آپ کے اُمّی ہونے کی وجہ سے یہ اِحتمال صحیح ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اس وقت آپ کی عبادت محض مخلوق سے اِنقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ خاص اور تفکر کی تھی۔ (مظہری) [۳]

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وحی آنے کی صورت یہ ہوئی کہ فرشتہ یعنی جبریلِ امین آپ کے پاس آیا، اور آپ سے کہا: اِقْرَاْ یعنی پڑھئے! آپ نے فرمایا: ''مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ'' یعنی میں پڑھنے والا نہیں ہوں (کیونکہ آپ اُمّی تھے، اور جبریلِ امین کے قول اِقْرَاْ کی مراد آپ پر اس وقت واضح نہ تھی کہ کیا اور کس طرح پڑھوانا چاہتے ہیں کیا کوئی لکھی ہوئی تحریر دیں گے جس کو پڑھنا ہوگا، اس لئے اپنے اُمّی ہونے کا عذر کردیا) حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے اس جواب پر جبریلِ امین نے مجھے آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے اس کی تکلیف محسوس ہونے لگی، اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا، اور پھر وہی بات کہی: اِقْرَاْ، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں، تو پھر جبریلِ امین نے دوبارہ آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے اس کی تکلیف محسوس ہونے لگی، پھر چھوڑ دیا، اور تیسری مرتبہ پھر کہا: اِقْرَاْ، میں نے پھر وہی جواب دیا: ''مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ'' تو تیسری مرتبہ پھر آغوش میں دبایا پھر چھوڑ کر کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵

قرآن کی یہ (سب سے پہلی پانچ) آیتیں لے کر آپ گھر واپس تشریف لائے، آپ کا دِل کانپ رہا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ! زَمِّلُوْنِیْ!'' مجھے ڈھانپو! مجھے ڈھانپو! (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ پر کپڑے ڈالے) یہاں تک کہ یہ ہیبت کی کیفیت رفع ہوئی (یہ کیفیت اور کپکپی جبرائیل علیہ السلام کے خوف سے نہیں تھی، کیونکہ آپ کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے، بلکہ اس وحی کے ذریعے جو نبوّت و رِسالت کی ذمہ داری آپ

---

[۱] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی ج:۱ ص:۳

[۲] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۸۸

[۳] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۰۰

کو سونپی گئی اس کا بارِگراں محسوس فرمانے اور ایک فرشتے کو اُس کی اصلی ہیئت میں دیکھنے سے طبعی طور پر یہ ہیبت کی کیفیت پیدا ہوئی)۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اِفاقے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو غارِ حرا کا پورا واقعہ سنایا، اور فرمایا کہ اس سے مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہو گیا۔ حضرت خدیجہ اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ ہر گز نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر گز ناکام نہ ہونے دیں گے، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اُٹھا لیتے ہیں، بے روزگار آدمی کو کسب پر لگا دیتے ہیں، مہمانوں کی مہمان داری کرتے ہیں، اور مصیبت زدوں کی اِمداد کرتے ہیں (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پڑھی لکھی خاتون تھیں، اُن کو شاید کتبِ سابقہ توراۃ واِنجیل سے یا اس کے علماء سے یہ بات معلوم ہوئی ہوگی کہ جس شخص کے اخلاق وعادات ایسے کریمانہ ہوں وہ محروم وناکام نہیں ہوا کرتا، اس لئے اس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی)۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، یہ زمانۂ جاہلیت ہی میں بت پرستی سے تائب ہو کر نصرانی ہو گئے تھے (کیونکہ اس وقت کا دِینِ حق یہی تھا)، ورقہ بن نوفل (لکھے پڑھے آدمی تھے، عبرانی زبان بھی جانتے تھے اور عربی تو اُن کی مادری زبان تھی) وہ عبرانی زبان میں بھی لکھتے تھے اور اِنجیل کو عربی زبان میں لکھتے تھے، اور اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے، بڑھاپے کی وجہ سے بینائی جاتی رہی تھی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اُن سے کہا کہ میرے چچازاد بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سنو! ورقہ بن نوفل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حال دریافت کیا تو آپ نے غارِ حرا میں جو کچھ دیکھا تھا، بیان کر دیا۔ ورقہ بن نوفل نے سنتے ہی کہا کہ یہ وہی ناموس یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا، کاش! میں آپ کی نبوّت کے زمانے میں قوی ہوتا، اور کاش کہ میں اُس وقت زِندہ ہوتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو (وطن سے) نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے) پوچھا کیا میری قوم مجھے نکال دے گی ورقہ نے کہا کہ بلاشبہ نکالے گی، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغامِ حق اور دِینِ حق لے کر آیا ہے جو آپ لائے ہیں، تو اُس کی قوم نے اُس کو ستایا ہے، اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ مگر ورقہ اس کے چند ہی روز کے بعد اِنتقال کر گئے۔ اور اس واقعے کے بعد وحیِ قرآن کا سلسلہ رُک گیا۔ (بخاری ومسلم) [1] فترتِ وحی کی مدّت کے متعلق سہیلی کی روایت یہ ہے کہ ڈھائی سال تک رہی، اور بعض روایات میں تین سال کی مدّت بیان کی گئی ہے۔ (مظہری) [2]

---

[1] صحیح البخاری، کیف کان بدء الوحی ...إلخ، ج:۱ ص:۳، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱ ص:۸۸

[2] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۰۲

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① بِاسْمِ رَبِّكَ میں لفظ اسم بڑھانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن جب بھی پڑھیں اللہ کا نام لے کر یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کریں، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔ دُوسرا اِشارہ اس میں اُس عذر کے جواب کا ہے جو آپ نے پیش کیا تھا کہ میں قاری نہیں، بِاسْمِ رَبِّكَ کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ اگرچہ آپ اپنی موجودہ حالت کے اِعتبار سے اُمّی ہیں، لکھے پڑھے نہیں، مگر آپ کے رَبّ کو سب قدرت ہے، وہ اُمّی شخص کو اعلیٰ علوم اور خطابت کا سلیقہ اور فصاحت و بلاغت کا وہ درجہ دے سکتا ہے کہ جس کے سامنے بڑے بڑے لکھے پڑھے عاجز ہوجائیں، جیسا کہ بعد میں اس کا ظہور ہوا۔ (مظہری) [1] اور اس جگہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے لفظ رَبّ کو خصوصیت سے اِختیار کرنے میں اس مضمون کی مزید تائید و تاکید ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ آپ کا پروردگار رہے، ہر طرح کی تربیت کرتا ہے، وہ اُمّی ہونے کے باوجود آپ سے پڑھوا بھی سکتا ہے۔ الَّذِيْ خَلَقَ ① صفاتِ الٰہیہ میں سے اس جگہ صفتِ تخلیق کو خصوصیت سے ذِکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ مخلوقات پر جیسے اِنعامات و اِحسانات حق تعالیٰ کے ہیں، اُن میں سب سے پہلا اِنعام اس کو وجود عطا کرنا ہے، جو تخلیقِ ربانی کے ذریعے عطا ہوتا ہے، اور اس جگہ خَلَقَ کا مفعول یعنی جس چیز کو پیدا کیا وہ ذِکر نہیں کی گئی، اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ ساری ہی کائنات اُس کی مخلوق ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② الَّذِيْ خَلَقَ میں پوری کائنات کی تخلیق کا بیان ہوا تھا، خَلَقَ الْاِنْسَانَ میں اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق کا ذِکر فرمایا کہ غور سے دیکھو تو پوری کائنات و مخلوقات کا خلاصہ انسان ہے، جہان میں جو کچھ ہے اُس کی نظائر اِنسان کے وجود میں موجود ہیں، اسی لئے انسان کو عالمِ اَصغر کہا جاتا ہے، اور اِنسان کی تخصیص بالذکر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبوّت و رِسالت اور قرآن کے نازل کرنے کا مقصد اَحکامِ اِلٰہیہ کی تنفیذ و تعمیل ہے، وہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ عَلَق کے معنی منجمد خون کے ہیں، انسان کی تخلیق پر مختلف دَور گزرے اور گزرتے ہیں، اُس کی اِبتدا مٹی اور عناصر سے ہے، پھر نطفے سے اُس کے بعد عَلَقَہ یعنی منجمد خون بنتا ہے، پھر مُضغہ گوشت، پھر ہڈیاں وغیرہ پیدا کی جاتی ہیں، علقہ ان تمام اَدوارِ تخلیق میں ایک درمیانہ حالت ہے، اس کو اِختیار کرکے اس کے اوّل و آخر کی طرف اشارہ ہوگیا۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ یہاں لفظ اِقْرَاْ کو مکرّر لایا گیا ہے، جس کی ایک وجہ خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا اِقْرَاْ تو خود آپ کے پڑھنے کے لئے فرمایا تھا، یہ دُوسرا تبلیغ و دعوت اور لوگوں کو پڑھانے کے لئے فرمایا، اور اگر محض تاکید کے لئے تکرار ہو تو وہ بھی کچھ بعید نہیں۔ اور صفت الْاَكْرَمُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم اور تخلیقِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی اپنی کوئی غرض اور نفع نہیں، بلکہ یہ سب بتقاضائے جود و کرم ہے، کہ بے مانگے کائنات کو وجود کی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائی۔

---

[1] تفسیر المظہری ج: ۱۰ ص: ۳۰۳ و ۳۰۴

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ تخلیقِ انسانی کے بعد اُس کی تعلیم کا بیان ہے، کیونکہ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو اِنسان کو دُوسرے تمام حیوانات سے ممتاز اور تمام مخلوقات سے اشرف واعلیٰ بناتی ہے، پھر تعلیم کی عام صورتیں دو ہیں، ایک زبانی تعلیم، دُوسرے بذریعہ قلم تحریر وخط سے، اِبتدائے سورت میں لفظ اِقْرَاْ میں اگرچہ زبانی تعلیم ہی کی اِبتدا ہے، مگر اس آیت میں جہاں تعلیم دینے کا بیان آیا ہے اس میں قلمی تعلیم کو مقدم کرکے بیان فرمایا ہے۔

تعلیم کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ قلم اور کتابت ہے

ایک صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَمَّا خَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِیْ كِتَابِهٖ فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ: اِنَّ رَحْمَتِیْ غَلَبَتْ غَضَبِیْ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے اَزل میں جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔'' [۱]

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ: اُكْتُبْ! فَكَتَبَ مَا يَكُوْنُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَهُوَ عِنْدَهٗ فِی الذِّكْرِ فَوْقَ الْعَرْشِ ''یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے، اُس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں، لکھ دیں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے۔ (قرطبی) [۲]

قلم کی تین قسمیں

علماء نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں، ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور تقدیرِ کائنات لکھنے کا اُس کو حکم دیا۔ دُوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور اُن کی مقادیر کو، نیز اِنسانوں کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد میں کام لیتے ہیں۔ اور کتابت درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے، اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے۔ (قرطبی) [۳] اِمامِ تفسیر مجاہد نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے خود بنائیں، اور اُن کے سوا باقی

[۱] صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی قول اللہ تعالیٰ: وھو الذی یبدء الخلق ثم یعیدہ، ج:۱ ص:۴۵۳، وشرح السُّنَّة للبغویؒ، کتاب الرقاق، باب الرجاء وسعة رحمة لله عزّ وجلّ، رقم الحدیث:۴۱۷۷

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۲۱، (واللفظ له)، وجامع الترمذی، ابواب القدر، باب ما جاء فی الرضا بالقضاء، ج:۲ ص:۳۷

[۳] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۲۱

مخلوقات کے لئے حکم دیا کُنْ یعنی ہو جا وہ موجود ہو گئیں۔ یہ چار چیزیں یہ ہیں: قلم، عرش، جنتِ عدن، آدم علیہ السلام۔

علمِ کتابت سب سے پہلے دُنیا میں کس کو دِیا گیا

بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فنِ کتابت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا، اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ (کعب احبار) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت اِدریس علیہ السلام کو ملا ہے، اور سب سے پہلے کاتب دُنیا میں وہی ہیں۔ (ضحاک) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہی ہے۔ [1]

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دِین قائم رہتا، نہ دُنیا کے کاروبار دُرست ہوتے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اکرم ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو اُن چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے، اور اُن کو جہل کی اندھیری سے نورِ علم کی طرف نکالا، اور علمِ کتابت کی ترغیب دی، کیونکہ اُس میں بے شمار اور بڑے منافع ہیں، جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تمام علوم وحِکَم کی تدوین اور اوّلین وآخرین کی تاریخ، ان کے حالات ومقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں، سب قلم ہی کے ذریعے لکھی گئیں، اور رہتی دُنیا تک باقی رہیں گی، اگر قلم نہ ہوتو دُنیا و دِین کے سارے ہی کام مختل ہوجائیں۔

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتابت کا بڑا اِہتمام کیا ہے، جس پر اُن کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس دَور میں علماء وطلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر اَنداز کیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریرِ کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں۔ فَإِلَى اللهِ الْمُشْتَكىٰ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابت کی تعلیم نہ دینے کا راز

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو لوگوں کے فکر وقیاس سے بالاتر بنانے کے لئے آپ کی جائے پیدائش سے لے کر آپ کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش ومحنت

[1] تفسير القرطبی ج:۲۰ ص:۱۲۰

سے کوئی کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ جائے پیدائش کے لئے عرب کا صحرا تجویز ہوا، جو متمدّن دُنیا اور علم وحکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا، اور راستے اور مواصلات اتنے دُشوار گزار تھے کہ شام وعراق اور مصر وغیرہ کے متمدّن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا، اسی لئے عرب سب کے سب ہی اُمیین کہلاتے ہیں، ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ پیدا ہوئے اور پھر حق تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم وحکمت اور خط وکتابت سیکھ لیتا تھا، آپ کو اُس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا، ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم وحکمت اور اخلاقِ فاضلہ عالیہ کا کس کو تصوّر ہوسکتا ہے اچانک حق تعالیٰ نے خلعتِ نبوّت سے نوازا اور علم وحکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کی زبان مبارک پر جاری فرمادیا، فصاحت وبلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء وبلغاء آپ کے سامنے عاجز ہوگئے، یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اس کو دیکھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کمالاتِ انسانی سعی وعمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں، خط وکتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی۔ (مأخوذ از قرطبی) [1]

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعے کا ذِکر تھا جو عام طور پر تعلیم کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی قلمی تعلیم۔

ذریعۂ علم صرف قلم نہیں بلکہ بے شمار ذرائع ہیں

اس آیت میں اس کا ذِکر ہے کہ اصل تعلیم دینے والا اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ہے، اور اُس کے لئے ذرائعِ تعلیم بے شمار ہیں، کچھ قلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے ناواقف تھا، اس میں قلم یا کسی دُوسرے ذریعۂ تعلیم کا ذِکر نہ فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی اِبتدائے آفرینش سے جاری ہے کہ اوّل اس میں عقل پیدا کی جو سب سے بڑا ذریعۂ علم ہے، انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے، پھر اس کے پس وپیش میں اپنی قدرتِ کاملہ کے ایسے مناظر اور دلائلِ قدرت رکھ دیئے جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکے۔ پھر وحی اور اِلہام کے ذریعے بہت سی چیزوں کا علم انسان کو عطا فرمایا اور بہت سی ضروری چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں خود بخود پیدا فرمادیا، جس میں کسی زبان یا قلم کی تعلیم کا دخل نہیں، ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی غذا کے مرکز یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے، پھر چھاتی سے دُودھ اُتارنے کے لئے منہ کو دبانا، اس کو کس نے سکھایا اور کون سکھا سکتا تھا پھر اس کو ایک ہنر رونے کا اللہ تعالیٰ نے اوّل ولادت ہی سے سکھادیا، بچے کا یہ رونا اُس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اُس کو روتا ہوا دیکھ کر ماں باپ

[1] تفسير القرطبي (إختصارًا) ج:۱۳ ص:۳۵۲، تفسير سورة العنكبوت، آيت:۴۸

اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کو کیا تکلیف ہے اس کی بھوک پیاس، سردی، گرمی کی سب ضروریات، اسی رو دینے سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ یہ رونے کی تعلیم اس نومولود کو کون کر سکتا تھا اور کس طرح کرتا یہ سب وہبی علم ہے جو اللہ تعالیٰ ہر جاندار کے خصوصاً انسان کے ذہن میں پیدا فرما دیتا ہے۔ اس ضروری علم کے بعد پھر زبانی تعلیم، پھر قلبی تعلیم کے ذریعے اس کے علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور مَالَمْ يَعْلَمْ یعنی جس کو وہ نہیں جانتا تھا، اس کے کہنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ عادۃً تعلیم تو اُسی چیز کی ہوتی ہے جس کو انسان نہیں جانتا، اس کے فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس خداداد علم و ہنر کو اِنسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے، مَالَمْ يَعْلَمْ سے اشارہ فرما دیا کہ اِنسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا (النحل: ٧٨) یعنی اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی علم و ہنر ملا ہے وہ اُس کا ذاتی نہیں، بلکہ سب خالق و مالک کا عطیہ ہے۔ (مظہری) [1] اور بعض حضراتِ مفسرین نے اس آیت میں انسان سے حضرت آدم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد قرار دِیا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو تعلیم دی گئی: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا [2] (البقرۃ: ٣١) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی تعلیم میں تمام انبیائے سابقین علیہم السلام کے علوم اور لوح و قلم کے علوم شامل ہیں، کما قال۔ وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ۔ [3]

یہاں تک سورۂ اِقْرَاْ کی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں، اس کے بعد کی آیتیں کافی عرصے کے بعد نازل ہوئی ہیں، کیونکہ باقی آیتیں آخر سورت تک ابوجہل کے ایک واقعے کے متعلق ہیں، اور اِبتدائے وحی و نبوّت میں تو مکہ میں کوئی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف نہ تھا، سب آپ کو ''اَمین'' کے لقب سے پکارتے تھے اور محبت و تعظیم کرتے تھے، ابوجہل کی مخالفت اور دُشمنی خصوصاً نماز پڑھنے سے روکنے کا واقعہ جو آگے آنے والی آیات میں مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اُس وقت کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت و دعوت کا اِعلان فرمایا اور شبِ معراج میں آپ کو نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اس آیت کا رُوئے سخن اگرچہ ایک خاص شخص یعنی ابوجہل کی طرف ہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، مگر عنوان عام رکھا ہے، جس میں عام انسانوں کی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جب تک دُوسروں کا محتاج رہتا ہے تو سیدھا چلتا ہے، اور جب اُس کو یہ گمان ہو جائے کہ میں کسی کا محتاج نہیں، سب سے بے نیاز ہوں تو اس کے نفس میں طغیان یعنی سرکشی وغیرہ اور دُوسروں پر ظلم و جور

---

[1] تفسیر المظھری ج:١٠ ص:٣٠٤ و ٣٠٥

[2] ترجمہ: اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے اسماء کا۔

[3] ترجمہ: لوح اور قلم کا علم آپ کے علوم میں سے ہے۔

کے رُجحانات پیدا ہوجاتے ہیں، جیسا کہ عموماً مال داروں اور اِقتدارِ حکومت والوں اور اولاد واحباب یا خدام کی کثرت رکھنے والوں میں اس کا بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تموّل اور جماعت، جتھے کی طاقت میں مست ہوکر کسی کو نظر میں نہیں لاتے، چونکہ ابوجہل کا بھی یہی حال تھا کہ مکہ مکرمہ کے خوشحال لوگوں میں سے تھا اور اس کے قبیلے بلکہ پورے شہر کے لوگ اس کی تعظیم وتکریم کرتے اور بات مانتے تھے، وہ بھی اسی پندار میں مبتلا ہوا یہاں تک کہ سیّد الانبیاء اور اشرف الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر بیٹھا۔ اگلی آیت میں ایسے سرکشوں کے بُرے انجام پر تنبیہ ہے۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝ رُجعی مثل بُشریٰ کے اسم مصدر ہے، معنی یہ ہیں کہ سب کو اپنے رَبّ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کے ظاہر معنی تو یہی ہیں کہ مرنے کے بعد سب کو اللہ کے پاس جانا اور اچھے بُرے اعمال کا حساب دینا ہے، اس وقت اس طغیانی اور سرکشی کے انجامِ بد کو آنکھوں سے دیکھ لے گا اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس جملے میں مغرور اِنسان کے غرور کا علاج بتلایا گیا ہو کہ اے احمق تو اپنے آپ کو سب سے بے نیاز، خود مختار سمجھتا ہے، اگر غور کرے گا تو اپنی ہر حالت، بلکہ ہر حرکت وسکون میں تو اپنے آپ کو رَبّ تعالیٰ کا محتاج پائے گا، اگر اُس نے تجھے کسی انسان کا محتاج بظاہر نہیں بنایا تو کم از کم اس کو تو دیکھ کہ اللہ تعالیٰ کا تو ہر چیز میں محتاج ہے، اور اِنسانوں کی محتاجی سے بے نیاز سمجھنا بھی صرف ظاہری مغالطہ ہی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے، وہ اکیلا اپنی ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کو بھی پورا نہیں کرسکتا، اپنے ایک لقمے کو دیکھے تو پتہ چلے گا کہ ہزاروں انسانوں اور جانوروں کی محنتِ شاقہ اور مدّت دراز تک کام میں لگے رہنے کا نتیجہ یہ لقمۂ تر ہے جو بے فکری کے ساتھ نگل رہا ہے، اور اتنے ہزاروں انسانوں کو اپنی خدمت میں لگا لینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہی حال اس کے لباس اور تمام دُوسری ضروریات کا ہے کہ ان کے مہیا کرنے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں اور جانوروں کی محنت کا دخل ہے، جو تیرے غلام نہیں، اگر تو اِن سب کو تنخواہیں دے کر بھی چاہتا کہ اپنے اس کام کو پورا کرے تو ہرگز تیرے بس میں نہ آتا، ان باتوں میں غور وفکر انسان پر یہ راز کھولتا ہے کہ اس کی تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا نظام خود اس کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خالقِ کائنات نے اپنی حکمتِ بالغہ سے بنایا اور چلایا ہے، کسی کے دل میں ڈال دیا کہ زمین میں کاشت کا کام کرے، کسی کے دل میں یہ پیدا کردیا کہ وہ لکڑی تراشنے اور نجاری کا کام کرے، کسی کے دل میں لوہار کے کام کی رغبت ڈال دی، کسی کو محنت مزدوری کرنے ہی میں راضی کردیا، کسی کو تجارت وصنعت کی طرف راغب کرکے انسانی ضروریات کے بازار لگادیئے، نہ کوئی حکومت اس کا نظم قانون سے کرسکتی تھی، نہ کوئی فرد، اس لئے اس غور وفکر کا لازمی نتیجہ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰى ہے، یعنی انجام کار سب چیزوں کا حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے تابع ہونا مشاہدے میں آجاتا ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ اس آیت سے آخر سورت تک ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا حکم دیا اور آپ نے نماز پڑھنا شروع کی تو ابوجہل نے آپ کو نماز

پڑھنے سے روکا اور دھمکی دی کہ آئندہ نماز پڑھیں گے اور سجدہ کریں گے تو وہ معاذ اللہ آپ کی گردن کو پاؤں سے کچل دے گا، اس کے جواب اور اُس کو زجر کرنے کے لئے یہ آیات آئی ہیں، ان میں فرمایا: اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾ یعنی کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے یہاں یہ ذِکر نہیں فرمایا کہ کس کو دیکھ رہا ہے اس لئے عام اور شامل ہے کہ نماز پڑھنے والی بزرگ ہستی کو بھی دیکھ رہا ہے اور اُس سے روکنے والے بدبخت کو بھی، اور یہاں صرف اس جملے پر اِکتفا کیا گیا کہ ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، آگے دیکھنے کے بعد کیا حشر ہوگا اُس کے ذِکر نہ کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہولناک انجام قابلِ تصوّر نہیں۔

لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ سَفْعٌ مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی سختی کے ساتھ کھینچنے کے ہیں، اور ناصیة سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے جو پیشانی کے اُوپر ہوتے ہیں، جس شخص کے پیشانی کے بال کسی کے ہاتھ میں آجائیں وہ اس کے ہاتھ میں مجبور و مقہور ہو کر رہ جاتا ہے۔

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ ابوجہل کی بات پر کان نہ دھریں، اور سجدہ اور نماز میں مشغول رہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ ہے۔

سجدے کی حالت میں قبولیتِ دُعا

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ فَاَكْثِرُوا الدُّعَآءَ'' [1] یعنی بندہ اپنے رَبّ سے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدے میں ہو، اس لئے سجدے میں بہت دُعا کیا کرو۔ اور ایک دُوسری صحیح حدیث میں یہ لفظ بھی آئے ہیں: ''فَاِنَّهٗ قَمِنٌ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ''، یعنی سجدے کی حالت میں دُعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

مسئلہ:- نفل نمازوں کے سجدے میں دُعا کرنا ثابت ہے، بعض رِوایاتِ حدیث میں اس دُعا کے خاص الفاظ بھی آئے ہیں، وہ الفاظ مأثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے، فرائض میں اس طرح کی دُعائیں ثابت نہیں، کیونکہ فرائض میں اِختصار مطلوب ہے۔

مسئلہ:- اس آیت کو پڑھنے اور سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت پر سجدۂ تلاوت کرنا ثابت ہے۔ [2] واللہ اعلم۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود، ج:۱ ص:۱۲۷، وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب النهی عن قراءة القرآن فی الرکوع والسجود، ج:۱ ص:۱۹۱

[2] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب سجود التلاوۃ، ج:۱ ص:۲۱۵

سُورَةُ الْقَدْرِ

ایاتها ۵　　٩٧ سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ ٢٥　　رکوعها ١

سورۂ قدر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ②

ہم نے اس کو اُتارا شبِ قدر میں، اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شبِ قدر

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ③ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا　وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شبِ قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے، اُترتے ہیں فرشتے اور رُوح اُس میں

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ④ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ⑤　ع ٢٢ معانقة ١٨

اپنے رَبّ کے حکم سے ہر کام پر امان ہے وہ رات صبح کے نکلنے تک۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

بیشک ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔ ① اور تمہیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا چیز ہے؟ ② شبِ قدر ایک ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ ③ اُس میں فرشتے اور رُوح اپنے پروردگار کی اجازت سے ہر کام کے لئے اُترتے ہیں، ④ وہ رات سراپا سلامتی ہے فجر کے طلوع ہونے تک۔ ⑤

خلاصۂ تفسیر

بے شک ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اُتارا ہے (تحقیق شبِ قدر میں نازل ہونے کی سورۂ دُخان میں گزری ہے) اور (زیادت تشویق کے لئے فرماتے ہیں کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شبِ قدر کیسی چیز ہے (آگے جواب ہے کہ) شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی ہزار مہینے تک عبادت کرنے کا جس قدر ثواب ہے اُس سے زیادہ شبِ قدر میں عبادت کرنے کا ثواب ہے، کذا فی الخازن،[1] اور وہ رات ایسی ہے کہ) اس رات میں فرشتے اور رُوح القدس (یعنی جبرائیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر اَمرِ خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اُترتے ہیں (اور وہ شب) سراپا سلام ہے (جیسا حدیثِ بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شبِ قدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو قیام وقعود وذِکر میں مشغول دیکھتے ہیں تو اُس پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں، یعنی اُس کے لئے دُعائے رحمت کرتے ہیں۔[2] اور خازن نے ابن الجوزیؒ سے اس روایت میں يُسَلِّمُوْنَ بھی بڑھایا ہے[3] یعنی سلامتی کی دُعا کرتے ہیں۔ اور يُصَلُّوْنَ کا خلاصہ بھی یہی ہے کیونکہ رحمت وسلامتی میں تلازم ہے، اسی کو قرآن میں سلام فرمایا ہے، اور اَمرِ خیر سے مراد یہی ہے، اور نیز روایات میں اس میں توبہ کا قبول ہونا، ابوابِ سماء کا مفتوح ہونا، اور ہر مؤمن پر ملائکہ کا سلام کرنا آیا ہے۔ کذا فی الدر المنثور۔[4] اور ان اُمور کا بواسطہ ملائکہ کے ہونا اور موجبِ سلامت ہونا ظاہر ہے، یا اَمر سے مراد وہ اُمور ہوں جن کا عنوان سورۂ دُخان میں: اَمْرٍ حَكِيْمٍ ④ اور اس شب میں ان کا طے ہونا ذِکر فرمایا ہے، اور) وہ شبِ قدر (اسی صفت وبرکت کے ساتھ) طلوعِ فجر تک

---

[1] تفسير الخازن ج:٦ ص:٢٩٢

[2] شعب الإيمان للبيهقیؒ، فصل فی ليلة القدر، فی ليلة العيدين ويومهما، رقم الحديث:٣٥٦٢

[3] تفسير الخازن تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:٢٩٢

[4] تفسير الدر المنثور ج:١٠ ص:٣١٥

رہتی ہے (یہ نہیں کہ اس شب کے کسی حصۂ خاص میں یہ برکت ہو اور کسی میں نہ ہو)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول

اِبنِ ابی حاتم نے مجاہد سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک مجاہد کا حال ذِکر کیا جو ایک ہزار مہینے تک مسلسل مشغولِ جہاد رہا، کبھی ہتھیار نہیں اُتارے، مسلمانوں کو یہ سن کر تعجب ہوا، اس پر سورۂ قدر نازل ہوئی جس میں اس اُمت کے لئے صرف ایک رات کی عبادت کو اُس مجاہد کی عمر بھر کی عبادت یعنی ایک ہزار مہینے سے بہتر قرار دِیا ہے۔ اور اِبنِ جریر نے بروایت مجاہد ایک دُوسرا واقعہ یہ ذِکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتا اور صبح ہوتے ہی جہاد کے لئے نکل کھڑا ہوتا، دن بھر جہاد میں مشغول رہتا، ایک ہزار مہینے اُس نے اسی مسلسل عبادت میں گزار دیئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر نازل فرما کر اس اُمت کی فضیلت سب پر ثابت فرمادی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبِ قدر اُمتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ (مظہری) [1]

اِبنِ کثیر نے یہی قول اِمام مالک رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے، اور بعض ائمۂ شافعیہ نے اس کو جمہور کا قول لکھا ہے۔ خطابی نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، مگر بعض محدثین نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ (مأخوذ از اِبنِ کثیر) [2]

لیلۃ القدر کے معنی

قدر کے ایک معنی عظمت و شرف کے ہیں۔ زہری وغیرہ حضرات علماء نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں، اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت و شرف ہے۔ اور ابوبکر ورّاق نے فرمایا کہ اس رات کو لیلۃ القدر اس وجہ سے کہا گیا کہ جس آدمی کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے سبب کوئی قدر و قیمت نہ تھی، اس رات میں توبہ و اِستغفار اور عبادت کے ذریعے وہ صاحبِ قدر و شرف بن جاتا ہے۔

قدر کے دُوسرے معنی تقدیر و حکم کے بھی آتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لئے جو کچھ تقدیرِ اَزلی میں لکھا ہے، اس کا جو حصہ اس سال میں رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے وہ اُن فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو کائنات کی تدبیر اور تنفیذِ اُمور کے لئے مأمور ہیں، اس میں ہر

---

[1] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۳۱۰، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:۱۹۴۲۴

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۴۲ و۴۴۳

اِنسان کی عمر اور موت اور رِزق اور بارش وغیرہ کی مقداریں مقرّرہ فرشتوں کو لکھوا دی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جس شخص کو اس سال میں حج نصیب ہوگا وہ بھی لکھ دیا جاتا ہے، اور یہ فرشتے جن کو یہ اُمور سپرد کئے جاتے ہیں بقول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ چار ہیں: اِسرافیل، میکائیل، عزرائیل، جبرائیل علیہم السلام۔ (قرطبی) [۱]

سورۂ دُخان کی آیت: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ۞ فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۞ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا میں یہ مضمون خود صراحت کے ساتھ آ گیا ہے کہ اس لیلۃ مبارکہ میں تمام اُمورِ تقدیر کے فیصلے لکھے جاتے ہیں، اور اس آیت کی تفسیر میں گزر گیا ہے کہ جمہور مفسرین کے نزدیک لیلۃ مبارکہ سے مراد بھی لیلۃ القدر ہی ہے، اور بعض حضرات نے جو لیلۂ مبارکہ سے نصف شعبان کی رات یعنی لیلۃ البراءت مراد لی ہے تو وہ اس کی تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ ابتدائی فیصلے اُمورِ تقدیر کے اجمالی طور پر شبِ براءت میں ہوجاتے ہیں، پھر اُن کی تفصیلات لیلۃ القدر میں لکھی جاتی ہیں، اس کی تائید حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول سے ہوتی ہے جس کو بغوی نے بروایت ابوالضحیٰ نقل کیا ہے، اس میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سال بھر کے تقدیری اُمور کا فیصلہ تو شبِ براءت یعنی نصف شعبان کی رات میں کرلیتے ہیں، پھر شبِ قدر میں یہ فیصلے متعلقہ فرشتوں کے سپرد کردیئے جاتے ہیں۔ (مظہری) [۲] اور یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اُمورِ تقدیر کے فیصلے اس رات میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سال میں جو اُمورِ تقدیر نافذ ہونا ہیں وہ لوحِ محفوظ سے نقل کرکے فرشتوں کے حوالے کردیئے جاتے ہیں، اور اصل نوشتۂ تقدیر اَزل میں لکھا جاچکا ہے۔

لیلۃ القدر کی تعیین

اتنی بات تو قرآنِ کریم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شبِ قدر ماہِ رمضان المبارک میں آتی ہے، مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، جو چالیس تک پہنچتے ہیں، مگر تفسیر مظہری [۳] میں ہے کہ ان سب اقوال میں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان مبارک کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، مگر آخری عشرے کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں، بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے، وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے، اور ان دس میں سے خاص طاق راتیں یعنی: ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ میں اَز رُوئے اَحادیثِ صحیحہ زیادہ احتمال ہے۔ اس قول میں تمام اَحادیث جو تعیینِ شبِ قدر کے متعلق آئی ہیں، جمع ہوجاتی ہیں، جن میں ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ راتوں میں شبِ قدر ہونے کا ذِکر آیا ہے۔ اگر شبِ قدر کو ان راتوں میں دائر اور ہر رمضان میں منتقل ہونے والا قرار دیا جائے تو یہ سب روایاتِ حدیث اپنی اپنی جگہ دُرست اور ثابت

[۱] تفسیر القرطبی، تفسیر سورة الدُّخان، ج:۱٦ ص:۱۲۷ و۱۲۸

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۱۱، وتفسیر البغوی، تفسیر سورة الدخان، ج:۷ ص:۲۲۸

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۱۳

ہو جاتی ہیں، کسی میں تاویل کی ضرورت نہیں رہتی، اسی لئے اکثر ائمہ فقہاء نے اس کو عشرۂ اخیرہ میں منتقل ہونے والی رات قرار دیا ہے۔ ابوقلابہ، امام مالک، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، ابوثور، مزنی، ابن خزیمہ وغیرہ رحمہم اللہ سب نے یہی فرمایا ہے، اور ایک روایت میں امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی اس کے موافق منقول ہے، اور دُوسری روایت امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ ہے کہ یہ رات منتقل ہونے والی نہیں بلکہ معین ہے۔ (ابن کثیر) [۱]

صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تَحَرَّوْا لَیْلَةَ الْقَدْرِ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ'' [۲] یعنی شبِ قدر کو رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کرو۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فَاطْلُبُوْهَا فِی الْوِتْرِ مِنْهَا'' یعنی شبِ قدر کو رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں طلب کرو۔ (مظہری) [۳]

لیلۃ القدر کے بعض فضائل اور اس رات کی مخصوص دُعا

اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی تراسی سال سے زائد کی عبادت سے بھی بہتر ہے، پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں، کتنی بہتر ہے کہ دُگنی، چوگنی، دس گنی، سوگنی وغیرہ سبھی احتمالات ہیں۔

اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شبِ قدر میں عبادت کے لئے کھڑا رہا، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ [۴] اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر میں وہ تمام فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ پر ہے جبرائیل امین کے ساتھ دُنیا میں اُترتے ہیں اور کوئی مؤمن مرد یا عورت ایسی نہیں جس کو وہ سلام نہ کرتے ہوں، بجز اُس آدمی کے جو شراب پیتا، یا خنزیر کا گوشت کھاتا ہو۔ [۵]

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شبِ قدر کی خیر و برکت سے محروم رہا، وہ بالکل

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۵۰ تحت ھٰذہ الآیۃ

[۲] صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب تحری لیلة القدر فی الوتر من العشر الأواخر ج:۱ ص:۲۷۰

[۳] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۳۱۴، وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل لیلة القدر ...إلخ، ج:۲ ص:۳۶۹

[۴] صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان إیمانًا واحتسابًا...إلخ، ج:۱ ص:۲۵۵، وصحیح مسلم، کتاب صلاة المسافر، باب الترغیب فی قیام رمضان ...إلخ، رقم الحدیث: ۲۵۹۱۱

[۵] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۳۷

ہی محروم بدنصیب ہے۔ [۱] شبِ قدر میں بعض حضرات کو خاص انوار کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے، مگر نہ یہ سب کو حاصل ہوتا ہے، نہ رات کی برکات اور ثواب حاصل ہونے میں ایسے مشاہدات کا کچھ دخل ہے، اس لئے اس کی فکر میں نہ پڑنا چاہئے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں شبِ قدر کو پاؤں تو کیا دُعا کروں آپ نے فرمایا کہ یہ دُعا کرو: ''اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ'' یا اللہ آپ بہت معاف کرنے والے ہیں، اور معافی کو پسند کرتے ہیں، میری خطائیں معاف فرمائیے۔ (قرطبی) [۲]

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① اس آیت میں تصریح ہے کہ قرآنِ کریم شبِ قدر میں نازل ہوا، اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے اس رات میں اُتارا گیا، پھر جبرائیل امین علیہ السلام اس کو تدریجاً تیئس سال کے عرصے میں حسبِ ہدایت تھوڑا تھوڑا لاتے رہے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اِبتدائے نزولِ قرآن اس رات میں چند آیتوں سے ہوگیا، باقی بعد میں نازل ہوتا رہا۔

تمام آسمانی کتابیں رمضان ہی میں نازل ہوئی ہیں

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحفِ اِبراہیم علیہ السلام تیسری تاریخ رمضان میں، اور توراۃ چھٹی تاریخ میں، اور اِنجیل تیرھویں تاریخ میں، اور زَبور اٹھارویں تاریخ رمضان میں نازل ہوئی ہیں، اور قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چوبیسویں تاریخ رمضان میں اُترا ہے۔ (مظہری) [۳]

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ، رُوح سے مراد جبرائیل امین علیہ السلام ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شبِ قدر ہوتی ہے تو جبرائیل امین فرشتوں کی بڑی جماعت کے ساتھ زمین پر اُترتے ہیں اور جتنے اللہ کے بندے مرد و عورت نماز یا ذِکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں سب کے لئے رحمت کی دُعا کرتے ہیں۔ (مظہری) [۴]

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ④ حرف مِنْ بمعنی باء ہے، جیسے: يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ الآیۃ [۵] (الرعد:۱۱) میں بھی مِنْ بمعنی باء استعمال ہوا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ فرشتے لیلۃ القدر میں تمام سال کے اندر پیش آنے والے تقدیری واقعات لے کر زمین پر

---

[۱] سنن النَّسائی، کتاب الصیام، باب فضل شھر رمضان، ذکر الإختلاف علی معمر فیه ج:۱ ص:۲۹۹، وسنن ابن ماجة ابواب الصیام، باب ما جاء فی فضل شھر رمضان ج:۱ ص:۱۱۸

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۳۸، وجامع الترمذی، ابواب الدعوات، بابٌ، رقم الحدیث:۳۴۳۵، ج:۲ ص:۱۹۱

[۳] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۳۱۱ و۳۱۲، والمعجم الأوسط للطبرانی، رقم الحدیث:۳۸۸۲

[۴] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۳۱۵، وشعب الإیمان للبیھقیؒ، رقم الحدیث:۳۵۶۲

[۵] ترجمہ: وہ بحکمِ خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

اُترتے ہیں۔ اور بعض حضراتِ مفسرین مجاہدؒ وغیرہ نے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کو سلام کے ساتھ متعلق کر کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ یہ رات سلامتی ہے ہر شر و آفت اور بُری چیز سے۔ (ابنِ کثیر) [1]

سَلٰمٌ ۛ عبارت کی اصل "هِيَ سَلٰمٌ" ہے، لفظ "هِيَ" حذف کر دیا گیا، معنی یہ ہیں کہ یہ رات سلام اور سلامتی ہی ہے، اور خیر ہی خیر ہے، اس میں شر کا نام نہیں۔ (قرطبی) [2] اور بعض حضرات نے تقدیرِ عبارت "سلام ہو" قرار دے کر اس کو مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کی صفت بنایا اور معنی یہ ہوئے کہ یہ فرشتے ہر ایسا اَمر لے کر آتے ہیں جو خیر و سلام ہے۔ (مظہری) [3]

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ یعنی لیلۃ القدر کی یہ برکات رات کے کسی خاص حصے کے ساتھ مخصوص نہیں، شروع رات سے طلوعِ فجر تک ایک ہی حکم ہے۔

فائدہ

ان آیات میں لیلۃ القدر کو ایک ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان ایک ہزار مہینوں کے اندر بھی ہر سال ایک شبِ قدر آئے گی تو حساب کس طرح بنے گا۔ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہاں ایک ہزار مہینوں سے وہ مراد ہیں جن میں شبِ قدر شامل نہ ہو، اس لئے کوئی اِشکال نہیں۔ (کذا ذکرہ ابن کثیر عن مجاھد) [4]

اِختلافِ مطالع کے سبب مختلف ملکوں اور شہروں میں شبِ قدر مختلف دنوں میں ہو تو اس میں کوئی اِشکال نہیں، کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شبِ قدر قرار پائے گی، اُس جگہ اُسی رات میں شبِ قدر کی برکات حاصل ہوں گی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:- جس شخص نے شبِ قدر میں عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لی، اُس نے بھی اس رات کا ثواب پالیا، اور جو شخص جتنا زیادہ کرے گا، زیادہ ثواب پائے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لی تو آدھی رات کے قیام کا ثواب پالیا، اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو پوری رات جاگنے عبادت کرنے کا ثواب حاصل کر لیا۔ [5]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْقَدْرِ بِحَمْدِ اللهِ ۷/ رَمَضَان ۱۳۹۱ھ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۴۵

[2] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۳۴

[3] تفسیر المظھری ج:۱۰ ص:۳۱۵

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۴۳

[5] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ ...إلخ، ج:۱ ص:۲۳۲

سُورَةُ البَيِّنَة

اٰیاتها ۸　۹۸ سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۰　رکوعها ۱

سورۂ بینہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہلِ کتاب اور مشرک باز آنے والے

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲

یہاں تک کہ پہنچے اُن کے پاس کھلی بات، ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک،

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا

اُس میں لکھی ہیں کتابیں مضبوط، اور وہ جو پھوٹ پڑی اہلِ کتاب میں سو جب کہ

جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ④ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

آچکی اُن کے پاس کھلی بات، اور اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کر کے

لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ

اس کے واسطے بندگی، ابراہیم کی راہ پر، اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے

دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ⑤ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ

راہ مضبوط لوگوں کی، اور جو منکر ہوئے اہلِ کتاب اور مشرک ہوں گے

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ⑥

دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اُس میں وہ لوگ ہیں سب خلق سے بدتر،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ⑦

وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے بھلے کام وہ لوگ ہیں سب خلق سے بہتر،

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

بدلہ اُن کا اُن کے رَبّ کے یہاں باغ ہیں ہمیشہ رہنے کو، نیچے بہتی ہیں اُن کے نہریں،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ

سدا رہیں اُن میں ہمیشہ اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی، یہ ملتا ہے

لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ⑧ ع

اُس کو جو ڈرا اپنے رَبّ سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے، وہ اُس وقت تک باز آنے والے نہیں تھے جب تک کہ اُن کے
پاس روشن دلیل نہ آتی ① یعنی ایک اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے، ② جن میں سیدھی سچی تحریریں لکھی
ہوں۔ ③ اور جو اہلِ کتاب تھے، اُنہوں نے جدا راستہ اُسی کے بعد اِختیار کیا جب اُن کے پاس روشن دلیل آچکی تھی۔ ④
اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اُسی کے
لئے خالص رکھیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی سیدھی سچی اُمت کا دِین ہے۔ ⑤ یقین جانو کہ اہلِ کتاب
اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر اَپنالیا ہے، وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ ساری
مخلوق میں سب سے بُرے ہیں۔ ⑥ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، وہ بیشک ساری مخلوق میں
سب سے بہتر ہیں۔ ⑦ اُن کے پروردگار کے پاس اُن کا اِنعام وہ سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔
وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے خوش ہوگا، اور وہ اُس سے خوش ہوں گے۔ یہ سب کچھ اُس کے لئے ہے جو اپنے
پروردگار کا خوف دِل میں رکھتا ہو۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے (قبل بعثتِ نبویہ) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے ہرگز) باز آنے والے نہ تھے، جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آتی (یعنی) ایک اللہ کا رسول جو (اُن کو) پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں دُرست مضامین لکھے ہوں (مراد قرآن ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کفار کا کفر ایسا شدید تھا اور ایسے جہل میں مبتلا تھے کہ بدون کسی عظیم رسول کے اُن کی راہ پر آنے کی کوئی توقع نہ تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے آپ کو قرآن دے کر مبعوث فرمایا) اور (اُن کو چاہئے تھا کہ اس کو غنیمت سمجھتے اور اس پر ایمان لے آتے، مگر) جو لوگ اہلِ کتاب تھے (اور غیر اہلِ کتاب تو بدرجۂ اَولیٰ) وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد (دِین میں) مختلف ہوگئے (یعنی دِینِ حق سے بھی اختلاف کیا اور باہمی اختلاف جو پہلے سے تھا اُن کو بھی دِینِ حق کا اِتباع کر کے دُور نہ کیا، اور مشرکین کو بدرجۂ اَولیٰ

اس لئے کہا کہ اُن کے پاس تو پہلے سے بھی کوئی علمِ سماوی نہ تھا) حالانکہ اُن لوگوں کو (کتبِ سابقہ میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں یکسو ہو کر (ادیانِ باطلہ کی طرح کسی کو اللہ کا شریک نہ بنائیں) اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں اور یہی طریقہ ہے اُن دُرست مضامین (مذکورہ) کا (بتلایا ہوا۔ حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ اُن اہلِ کتاب کو اُن کی کتابوں میں یہ حکم ہوا تھا کہ قرآن اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، اور یہی تعلیم تھی قرآن کی جس کو اُوپر کتبِ قیمہ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لئے اس قرآن کے نہ ماننے سے خود اپنی کتب کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ یہ تو الزام اہلِ کتاب کو ہوا، اور مشرکین اگرچہ پہلی کتب کو نہیں مانتے، مگر ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کا حق ہونا یہ بھی تسلیم کرتے تھے، اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام شرک سے بالکل بَری تھے، اور کتبِ قیمہ یعنی قرآن کا اُس طریقے کے ساتھ متوافق ہونا بھی ظاہر ہے، اس لئے اُن پر بھی حجت تمام ہوگئی، اور مراد ان متفرقین ومخالفین سے بعض وہ کفار ہیں جو ایمان نہ لائے تھے، اور قرینہ مقابلہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن لوگوں نے تفرق اور خلاف نہیں کیا وہ اہلِ ایمان ہیں، آگے بیان عمل کے بعد تصریحاً کفار کی دونوں قسموں یعنی اہلِ کتاب ومشرکین کی اور مؤمنین کی سزا وجزا کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں، یعنی) بے شک جو لوگ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتشِ دوزخ میں جائیں گے، جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ لوگ بدترین خلائق ہیں (اور) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، وہ لوگ بہترین خلائق ہیں، اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) اللہ تعالیٰ اُن سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے (یعنی نہ اُن سے کوئی معصیت ہوگی اور نہ اُن کو کوئی امر مکروہ پیش آئے گا، جس سے احتمال عدمِ رضا کا جانبین سے ہو، اور) یہ (جنت اور رضا) اُس شخص کے لئے ہے جو اپنے رَبّ سے ڈرتا ہے (اور اللہ سے ڈرنے ہی پر ایمان وعملِ صالح مرتب ہوتا ہے، جس کو دُخولِ جنت وحصولِ رضا کا مدار فرمایا ہے)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دُنیا میں کفر وشرک اور جہالت کے انتہائی عموم اور غلبے کو ذِکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ کفر وشرک کی ایسی عالمگیر ظلمت کو دُور کرنے کے لئے رَبّ العالمین کی حکمت ورحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ جیسے اُن کا مرض شدید اور وَبا عالمگیر ہے، اُس کے علاج کے لئے بھی کوئی سب سے بڑا ماہر، حاذق معالج بھیجنا چاہئے، اس کے بغیر وہ اس مرض سے نجات نہ پاسکیں گے۔ آگے اُس حاذق وماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک بینہ یعنی

حجتِ واضحہ ہو شرک وکفر کے اِبطال کے لئے، آگے فرمایا کہ مراد اس معالج سے اللہ کا وہ رسولِ اعظم ہے جو قرآن کی حجتِ واضحہ لے کر اُن کے پاس آئے، اس مجموعے میں بعثتِ نبوی سے پہلے زمانے کے فسادِ عظیم اور ہر طرف جہالت وظلمت ہونا بھی معلوم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا بھی بیان ہوا۔ آگے قرآن کی چند اہم صفات کا بیان فرمایا۔

يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ يَتْلُوا، تِلَاوَتٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، مگر ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا، بلکہ وہ پڑھنا جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو، اس کو تلاوت کہتے ہیں، اسی لئے عرف میں عموماً لفظ تلاوت صرف قرآن پڑھنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ صُحُفًا، صَحِيفَةٌ کی جمع ہے، جن کاغذات میں کوئی مضمون تحریر ہو، اُن کو صحیفہ کہتے ہیں۔ كُتُبٌ، كِتَابٌ کی جمع ہے، اس کے ایک معنی تو لکھی ہوئی چیز کے ہیں، اس اعتبار سے کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں، اور کبھی لفظ کتاب بمعنی حکم بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیت: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ [۱] (الانفال:۶۸) میں لفظ كِتٰبٌ بمعنی حکم ہی مستعمل ہوا ہے، اس جگہ بھی یہی دُوسرے معنی مراد ہیں کیونکہ معروف معنی میں لیں تو كُتُبٌ عین صحف ہیں، فِيهَا کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

مُّطَهَّرَةً ۝ یہ صحف کی صفت ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ اور شک اور نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ قَيِّمَةٌ بمعنی مستقیمہ کتب کی صفت ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ اَحکام مستقیم، منصفانہ ومعتدل ہیں۔ اور اس کے معنی مضبوط ومستحکم کے بھی ہوسکتے ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ اَحکامِ اِلٰہیہ جو قرآن میں آئے قیامت تک قائم دائم رہیں گے۔

مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس زمانے کے مشرکین اور اہلِ کتاب کی گمراہی اس درجے میں پہنچی ہوئی تھی کہ اُن کو اپنے عقائدِ باطلہ سے پٹنا ممکن نہ تھا، جب تک کہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانی اور حجتِ واضحہ نہ آجائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے واسطے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حجتِ واضحہ بنا کر بھیجا، جس کا کام یہ تھا کہ وہ اُن کو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ وحیٔ خداوندی کے وہ اَحکام سناتے تھے جو بعد میں صحیفوں کے ذریعے محفوظ کئے گئے، کیونکہ ابتداءً تلاوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحیفے سے نہیں، بلکہ اپنی یاد سے پڑھ کر سناتے تھے، اور یہ پاک صحیفے ایسے ہیں جن میں ایسے اَحکامِ اِلٰہیہ ہیں جو عدل واعتدال کے ساتھ دیئے گئے ہیں اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ تَفَرَّقَ سے مراد اس جگہ انکار واختلاف ہے۔ قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے جس پر تمام اہلِ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور بعثت سے

[۱] ترجمہ: اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا۔

پہلے متفق تھے، کیونکہ اُن کی آسمانی کتب توراۃ و اِنجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوّت کا اور آپ کی خاص خاص صفات اور آپ پر قرآن نازل ہونے کا واضح ذِکر موجود تھا، اس لئے کسی یہودی نصرانی کو اس میں اِختلاف نہیں تھا کہ آخر زمانے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے، آپ پر قرآن نازل ہوگا، آپ ہی کا اِتباع سب پر لازم ہوگا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں بھی ان کے اس اِتفاق کا ذِکر اس طرح کیا گیا ہے: وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ (البقرۃ:۸۹) یعنی یہ اہلِ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے آنے کے منتظر تھے اور جب کبھی مشرکین سے ان کا مقابلہ ہوتا تو آنے والے نبی کے واسطے سے اپنی فتح مانگتے تھے، یعنی اللہ سے دُعا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں جو آنے والے ہیں اُن کی برکت سے ہمیں فتح نصیب فرمادے، یا یہ کہ یہ مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ ہمارے خلاف زور آزمائی کرتے ہو، مگر عنقریب ایک ایسے رسول آنے والے ہیں جو تم سب کو زیر کردیں گے اور ہم چونکہ اُن کے ساتھ ہوں گے تو ہماری فتح ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تو اہلِ کتاب سب کے سب آپ کی نبوّت و رسالت پر متفق تھے، مگر جب آپ تشریف لے آئے تو منکر ہوگئے۔ اسی مضمون کو قرآن میں ایک جگہ فرمایا: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۠ (البقرۃ:۸۹) یعنی جب ان لوگوں کے پاس وہ رسول یا دِینِ حق یا قرآن آگیا جس کو اُنہوں نے بھی اپنی آسمانی کتابوں کی پیش گوئی کے مطابق پہچان لیا تو لگے کفر کرنے۔ اور آیتِ مذکورہ میں اسی مضمون کو اس طرح ذِکر فرمایا کہ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیۃ، یعنی یہ عجیب بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے اور دیکھنے سے پہلے تو ان لوگوں کو آپ سے کوئی اِختلاف نہیں تھا، سب آپ کی نبوّت کے اِعتقاد پر جمع تھے، مگر جب یہ اللہ کا بَيِّنَة واضحہ یعنی رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو ان میں اِفتراق پیدا ہوگیا، کچھ لوگ تو آپ پر اِیمان لائے اور بہت سے اِنکار کرنے لگے۔

یہ معاملہ چونکہ اہلِ کتاب ہی کے ساتھ مخصوص تھا، اس لئے اس آیت میں صرف اہلِ کتاب ہی کا ذِکر فرمایا ہے، مشرکین کو شامل نہیں کیا، بلکہ فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیۃ، اور پہلا معاملہ مشرکین اور اہلِ کتاب دونوں کو عام اور شامل تھا، اس لئے وہاں فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ۔

اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں معاملۂ ثانیہ کو بھی مشرکین اور اہلِ کتاب دونوں میں عام قرار دے کر اُس کے مطابق تقریر کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ یہاں لفظ الْقَيِّمَةِ بظاہر کتب کی صفت ہے، جس کا ذِکر اُوپر آیا ہے، اور بعض نے اس کو

ملت کی صفت قرار دیا ہے۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اہل کتاب کو اُن کی کتابوں میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اپنی عبادت واطاعت کو خالص اللہ کے لئے رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ کچھ اُن کی ہی خصوصیت نہیں، ہر ملتِ قَيِّمَه یا تمام کتبِ قَيِّمَه جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں، اُن سب کا دِین اور طریقہ یہی ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ قَيِّمَه جو کتب کی صفت ہے اس سے مراد بقرینہ سابق اَحکامِ قرآنیہ لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس شریعتِ محمدیہ نے بھی جو اَحکام اُن کو دیئے وہ بھی بعینہا وہی تھے جو پہلے اُن کی کتابوں نے دیئے تھے، اُن سے کچھ مختلف اَحکام ہوتے تو اُن کو مخالفت کا کچھ بہانا بھی ہوتا، اب وہ بھی نہیں۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸ اس آیت میں اہلِ جنت کی سب سے بڑی نعمت کا ذِکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے خطاب کے لئے فرمائیں گے: ''يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ'' تو اہلِ جنت جواب دیں گے ''لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ'' یعنی اے ہمارے رَبّ ہم حاضر ہیں اور اِطاعتِ حکم کے لئے تیار ہیں، اور ہر بھلائی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے ''هَلْ رَضِيْتُمْ'' یعنی تم لوگ راضی اور خوش ہو وہ جواب دیں گے اے ہمارے پروردگار اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا اِحتمال ہے جب کہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرمادیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دے دُوں؟ پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اُوپر نازل کردی، اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (رواہ البخاری ومسلم۔ مظہری) [1]

اس حدیث میں بھی اہلِ جنت سے پوچھا گیا کہ آپ راضی بھی ہو اور اس آیت میں خبر دِی گئی کہ وَرَضُوْا عَنْهُ یعنی اہلِ جنت بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہاں بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ سے اور اس کے ہر حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو فرائضِ بندگی اور لازمۂ عبدیت ہے، اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہلِ جنت کی رضامندی ذِکر کرنے کا کیا مطلب ہے جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے تو یہ صحیح ہے کہ رضا بالقدر واجبات وفرائضِ عبدیت میں سے ہے، لیکن رضا کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اُس کی ہر مراد عطا کردیں اور کوئی تمنا وآرزو باقی نہ چھوڑیں، اس جگہ رضا سے یہی مراد ہے، جیسے سورۂ ضحیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۱۹، وصحیح البخاري، کتاب التوحید، باب کلام الرَّبّ مع اهل الجنة، ج:۲ ص:۱۱۲۱، وصحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، ج:۲ ص:۳۷۸

علیہ وسلم کے لئے آیا ہے: وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ۝۵ یعنی عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو دیں گے وہ چیز جس سے آپ راضی ہو جائیں گے۔ یہاں بھی مراد غایت تمنا کا پورا کر دینا ہے، اسی لئے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو میں اُس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک ایک بھی مؤمن جہنم میں باقی رہے گا۔ (من مظهری) [1]

ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸ آخرِ سورت میں تمام کمالاتِ دینی اور نعمائے اُخروی کا جس پر مدار ہے، وہ بتلا دیا یعنی خشیۃ اللہ، ''خشیت'' اُس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دُشمن یا درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے، بلکہ ''خشیت'' اُس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی اِنتہائی عظمت وجلال کی وجہ سے پیدا ہو، جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کام، ہر حال میں اُس کی رضاجوئی کی فکر کرتا ہے، اور ناراضی کے شبہ سے بھی بچتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو اِنسان کو عبدِ کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔

تَمَّتۡ سُوۡرَةُ الۡبَيِّنَةِ بِحَمۡدِ اللهِ تَعَالٰى

[1] تفسير المظهری ج:۱۰ ص:۳۲۰، وشعب الإيمان للبيهقیؒ، كتاب النبی صلی الله عليه وسلم، فصل فی بيان النبی صلی الله عليه وسلم وفصاحته، رقم الحديث:۱۳۷۴

سُورَةُ الزِّلْزَال

أياتها ٨　　٩٩ سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ ٩٣　　ركوعها ١

سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ②

جب ہلا ڈالے زمین کو اُس کے بھونچال سے، اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ،

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④ بِاَنَّ رَبَّكَ

اور کہے آدمی اس کو کیا ہوگیا اُس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں، اس واسطے کہ تیرے رَبّ نے

اَوْحٰى لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥

حکم بھیجا اُس کو، اُس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر، کہ اُن کو دِکھادیئے جائیں ان کے عمل،

فَمَن يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَرَهُۥ ۝٧ وَمَن يَعۡمَلۡ

سو جس نے کی ذرّہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اُسے، اور جس نے کی

مِثۡقَالَ ذَرَّةٖ شَرًّا يَرَهُۥ ۝٨ ع

ذرّہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اُسے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب زمین اپنے بھونچال سے جھنجوڑ دی جائے گی، ① اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی، ② اور اِنسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوگیا ہے؟ ③ اُس دن زمین اپنی ساری خبریں بتادے گی، ④ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اُسے یہی حکم دیا ہوگا۔ ⑤ اُس روز لوگ مختلف ٹولیوں میں واپس ہوں گے، تاکہ اُن کے اعمال اُنہیں دِکھا دیئے جائیں۔ ⑥ چنانچہ جس نے ذرّہ برابر کوئی اچھائی کی ہوگی، وہ اُسے دیکھے گا، ⑦ اور جس نے ذرّہ برابر کوئی بُرائی کی ہوگی، وہ اُسے دیکھے گا۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی، اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی، (مراد بوجھ سے دفینے اور مُردے ہیں، اور اگرچہ بعض روایات سے پہلے بھی دفینوں کا باہر آجانا معلوم ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ قیامت سے پہلے جو دفینے باہر آگئے تھے مرورِایام سے پھر اُن پر مٹی آگئی ہو اور مستور ہوگئے ہوں اور قیامت کے روز پھر نکلیں، اور دفائن کے ظاہر ہوجانے کی شاید یہ حکمت ہو کہ مال کی بہت محبت کرنے والے اپنی آنکھوں اموال کا بے کار ہونا دیکھ لیں) اور (اس حالت کو دیکھ کر کافر) آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا (کہ زمین اس طرح ہل رہی ہے اور سب دفینے باہر آرہے ہیں) اس روز زمین اپنی سب (اچھی بُری) خبریں بیان کرنے لگے گی، اس سبب سے کہ آپ کے رَبّ کا اُس کو یہی حکم ہوگا (ترمذی وغیرہ میں اس کی تفسیر میں یہ حدیثِ مرفوع آئی ہے کہ جس شخص نے رُوئے زمین پر جیسا عمل کیا ہوگا اچھا یا بُرا، زمین سب کہہ دے گی، یہ اُس کی شہادت ہوگی[1]) اُس روز لوگ مختلف جماعتیں ہوکر (موقفِ حساب سے) واپس ہوں گے (یعنی جو لوگ

[1] جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب منه، ج:٢ ص:٦٨

حساب محشر سے فارغ ہو کر لوٹیں گے تو کچھ جماعتیں جنتی کچھ دوزخی قرار پا کر جنت و دوزخ کی طرف چلی جائیں گی) تا کہ اپنے اعمال (کے ثمرات) کو دیکھ لیں، سو جو شخص (دُنیا میں) ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا (بشرطیکہ اُس وقت تک وہ خیر و شر باقی رہی ہو، ورنہ اگر کفر کے سبب وہ چیز فنا ہو چکی ہو یا ایمان و توبہ کے ذریعے بدی معاف ہو چکی ہو تو وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ اب نہ وہ باطل شدہ خیر خیر ہے، اور نہ وہ معاف کیا ہوا گناہ اور شر شر ہے، اس لئے محشر میں وہ سامنے نہ آئیں گی)۔

معارف و مسائل

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں جس زلزلے کا ذِکر ہے، یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اُولیٰ سے پہلے دُنیا میں ہوگا، جیسا کہ علاماتِ قیامت میں اس زلزلے کا ذِکر آیا ہے، یا اس زلزلے سے مراد نفخہ ثانیہ کے بعد جب مُردے زندہ ہو کر زمین سے اُٹھیں گے اُس وقت کا زلزلہ ہے۔ روایات اور اقوال مفسرین کے مختلف ہیں، اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ زلزلے متعدّد ہوں، ایک نفخہ اُولیٰ سے پہلے، دُوسرا نفخہ ثانیہ کے بعد مُردوں کے زندہ ہونے کے وقت، اور اس جگہ یہی دُوسرا زلزلہ مراد ہو، اور اس سورت میں جو آگے اَحوالِ قیامت، حساب کتاب کا ذِکر ہے، وہ قرینہ اسی کا ہے کہ یہ زلزلہ دُوسرا نفخہ ثانیہ کے بعد کا ہے۔ واللہ اعلم (اَز مظہری) [١]

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝٢ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زلزلے کے متعلق ارشاد فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے سونے کی بڑی چٹانوں کی صورت میں اُگل دے گی، اس وقت ایک شخص جس نے مال کے لئے کسی کو قتل کیا تھا، وہ دیکھ کر کہے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا جس شخص نے اپنے رشتہ داروں سے مال کی وجہ سے قطع تعلق کیا تھا وہ کہے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لئے میں نے یہ حرکت کی تھی چور جس کا ہاتھ چوری کی سزا سے کاٹا گیا تھا، اُس کو دیکھ کر کہے گا کہ اس کے لئے میں نے اپنا ہاتھ گنوایا تھا پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف اِلتفات نہ کرے گا۔ (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ) [٢]

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝٧ آیت میں خیر سے مراد وہ خیر ہے جو شرعاً معتبر ہے، یعنی جو اِیمان کے ساتھ ہو، بغیر ایمان کے اللہ کے نزدیک کوئی نیک عمل نیک نہیں، یعنی آخرت میں ایسے نیک عمل کا جو حالتِ کفر میں کیا ہے کوئی اعتبار نہیں ہوگا، گو دُنیا میں اُس کو اس کا بدلہ دے دیا جائے، اسی لئے اس آیت سے اس پر اِستدلال کیا گیا ہے کہ جس

---

[١] تفسیر المظھری ج:١٠ ص:٣٢١

[٢] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الصدقۃ ج:١ ص:٣٢٦

شخص کے دِل میں ایک ذرّہ برابر ایمان ہوگا، وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا، کیونکہ اس آیت کے وعدے کے مطابق اس کو اپنی نیکی کا پھل بھی آخرت میں ملنا ضرور ہے، اور کوئی بھی نیکی نہ ہو تو خود ایمان بہت بڑی نیکی ہے، اس لئے کوئی مؤمن کتنا ہی گناہگار ہو، ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔ البتہ کافر نے اگر دُنیا میں کچھ نیک عمل بھی کئے تو شرطِ عمل یعنی ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے کالعدم ہیں، اس لئے آخرت میں اُس کی کوئی خیر خیر ہی نہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ مراد اس سے وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کرلی ہو، کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن وسنت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی ہے، وہ چھوٹا ہو، یا بڑا، آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ دیکھو ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر بھی مؤاخذہ ہونا ہے۔ (رواہ النسائی وابن ماجة عنها، رضی الله عنها) [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ مستحکم اور جامع آیت ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو ''اَلْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ'' فرمایا ہے، یعنی منفرد، یکتا اور جامع۔ [۲]

اور حضرت انس اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ کو نصف القرآن، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو ثلث القرآن، اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کو ربع القرآن فرمایا ہے۔ (رواہ الترمذی والبغوی، مظہری) [۳]

---

[۱] سنن ابن ماجة، کتاب التوحید، باب ذکر الذنوب، ج:۲ ص:۳۱۳، وسنن الکبریٰ للنسائی، کتاب الرقائق، رقم الحدیث: ۱۱۸۱۱

[۲] صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب اثم مانع الزکاة، ج:۱ ص:۳۱۸

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۲۶، وجامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب إذا زلزلت، ج:۲ ص:۱۷۳

سُورَةُ العٰدِيٰتِ

اٰیاتھا ۱۱ ۱۰۰ سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ ۱۴ رکوعھا ۱

سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر، پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر، پھر غارت ڈالنے والے صبح کو،

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾

پھر اُٹھانے والے اُس میں گرد، پھر گھس جانے والے اُس وقت فوج میں، بے شک آدمی اپنے ربّ کا ناشکر ہے،

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ

اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے، اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے، کیا نہیں جانتا

اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿ۙ۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ

وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے، بے شک اُن کے رَبّ کو اُن کی

یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾ ع

اُس دن سب خبر ہے۔

ع ۱۱-۱ ۲۵

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپ ہانپ کر دوڑتے ہیں، (۱) پھر جو (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں اُڑاتے ہیں، (۲) پھر صبح کے وقت یلغار کرتے ہیں، (۳) پھر اُس موقع پر غبار اُڑاتے ہیں، (۴) پھر اُسی وقت کسی جمگھٹے کے بیچوں بیچ جا گھستے ہیں، (۵) کہ انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے، (۶) اور وہ خود اس بات کا گواہ ہے۔ (۷) اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔ (۸) بھلا کیا وہ وقت اُسے معلوم نہیں ہے جب قبروں میں جو کچھ ہے، اُسے باہر بکھیر دیا جائے گا، (۹) اور سینوں میں جو کچھ ہے، اُسے ظاہر کر دیا جائے گا۔ (۱۰) یقیناً اُن کا پروردگار اُس دن اُن (کی جو حالت ہوگی اُس) سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۱۱)

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر (پتھر پر) ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں، پھر صبح کے وقت تاخت تاراج کرتے ہیں، پھر اُس وقت غبار اُڑاتے ہیں، پھر اُس وقت (دشمنوں کی) جماعت میں جا گھستے ہیں (مراد اس سے لڑائی کے گھوڑے ہیں، جہاد ہو یا غیرِ جہاد، عرب چونکہ حرب وضرب اور جنگ کے عادی تھے جس کے لئے گھوڑے پالتے تھے، اُن کی مناسبت سے ان جنگی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی، آگے جوابِ قسم ہے کہ) بے شک (کافر) آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے، اور اُس کو خود بھی اس کی خبر ہے (کبھی ابتداءً ہی اور کبھی کچھ غور کے بعد اپنی ناشکری کا اِحساس کر لیتا ہے) اور وہ مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے (یہی اس کی ناشکری کا سبب ہے، آگے حُبِّ مال اور ناشکری پر وعید ہے، یعنی) کیا اُس کو وہ وقت معلوم نہیں جب زندہ کئے جائیں گے جتنے مُردے قبروں میں ہیں، اور ظاہر ہو جائے گا جو کچھ دِلوں میں

ہے، بے شک اُن کا پروردگار اُن کے حال سے اُس روز پورا آگاہ ہے (اور مناسب جزا دے گا، حاصل یہ ہے کہ انسان کو اگر اُس وقت کی پوری خبر ہوتی اور آخرت کا حال مستحضر ہوتا تو اپنی ناشکری اور حُبِّ مال سے باز آجاتا)۔

معارف و مسائل

سورۂ عادیات حضرت اِبنِ مسعود اور جابر رضی اللہ عنہما، اور حسن بصری، عکرمہ، عطار حمہم اللہ کے نزدیک مکی، اور اِبنِ عباس، انس رضی اللہ عنہم، اِمام مالک وقتادہ رحمہما اللہ کے نزدیک مدنی سورت ہے۔ (قرطبی) [1]

اس سورت میں حق تعالیٰ نے جنگی گھوڑوں کے کچھ خاص حالات وصفات کا ذِکر فرمایا، اور ان کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا کہ انسان اپنے رَبّ کا بڑا ناشکر ہے۔ یہ بات تو قرآن میں بار بار معلوم ہوچکی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھا کر خاص واقعات اور اَحکام بیان فرماتے ہیں، یہ حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اور قسم کھانے کا مقصد عام قسموں کی طرح اپنی بات کو محقق اور یقینی بتلانا ہے، اور یہ بات بھی پہلے آچکی ہے کہ قرآنِ کریم جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اُس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے، اور یہ چیز گویا اُس مضمون کی شہادت دیتی ہے۔ یہاں جنگی گھوڑوں کی سخت خدمات کا ذِکر گویا اس کی شہادت میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکر ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ گھوڑوں کے اور خصوصاً جنگی گھوڑوں کے حالات پر نظر ڈالئے کہ وہ میدانِ جنگ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انسان کے حکم و اِشارے کے تابع انجام دیتے ہیں، حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا، ان کو جو گھاس دانہ انسان دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس کا کام صرف اتنا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پیدا کئے رزق کو اُن تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے، اب گھوڑے کو دیکھئے کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اُس کے ادنیٰ اِشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشقت برداشت کرتا ہے، اس کے بالمقابل انسان کو دیکھو جس کو ایک حقیر قطرے سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اس کو مختلف کاموں کی قوت بخشی، عقل وشعور دِیا، اُن کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اُس کی تمام ضروریات کو کس قدر آسان کر کے اس تک پہنچا دیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، مگر وہ ان تمام اکمل واعلیٰ احسانات کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا۔ اب الفاظِ آیت کی تشریح دیکھئے۔ اَلْعٰدِیٰتِ، عَدْوٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی دوڑنے کے ہیں۔ ضَبْحًا، ضَبْحٌ وہ خاص آواز ہے جو گھوڑے کے دوڑنے کے وقت اس کے سینے سے نکلتی ہے، جس کا ترجمہ ہانپنا کیا گیا ہے۔ فَالْمُوْرِیٰتِ، اِیْرَاءٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی آگ نکالنے کے ہیں، جیسے چقماق کو مار کر یا دِیا سلائی کو رگڑ کر نکالی جاتی ہے۔ قَدْحًا، قَدْحٌ کے معنی ٹاپ مارنے کے

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۵۳

ہیں، پتھریلی زمین پر جب گھوڑا تیزی سے دوڑے خصوصاً جب کہ اُس کے پاؤں میں آہنی نعل بھی ہو تو ٹکراؤ سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ فَالْمُغِيْرٰتِ، اِغَارَۃٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی حملہ کرنے اور چھاپہ مارنے کے ہیں۔ صُبْحًا، صبح کے وقت کی تخصیص بیان عادت کے طور پر ہے، کیونکہ عرب لوگ اظہارِ شجاعت کے لئے رات کی اندھیری میں چھاپہ مارنا معیوب سمجھتے تھے، حملہ صبح ہونے کے بعد کیا کرتے تھے۔ فَاَثَرْنَ، اِثَارَتٌ سے مشتق ہے، غبار اُڑانے کے معنی میں، اور نَقْعًا غبار کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ یہ گھوڑے میدان میں اس تیزی سے دوڑتے ہیں کہ اُن کے سموں سے غبار اُڑ کر چھا جاتا ہے، خصوصاً صبح کے وقت میں غبار اُڑنا زیادہ سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ وقت عادۃً غبار اُڑنے کا نہیں، کسی سخت دوڑ ہی سے اس وقت غبار اُٹھ سکتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ یعنی یہ دُشمن کی صفوں میں بے خوف وخطر گھس جاتے ہیں۔ كَنُوْدٌ کے معنی میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ شخص جو مصائب کو یاد رکھے اور نعمتوں کو بھول جائے، اُس کو كَنُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

ابوبکر واسطی رحمہ اللہ نے فرمایا: جو اللہ کی نعمتوں کو اُس کی معصیتوں میں صَرف کرے وہ كَنُوْدٌ ہے۔ اور ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص نعمت کو دیکھے اور منعم یعنی نعمت دینے والے کو نہ دیکھے وہ كَنُوْدٌ ہے۔ ان سب اقوال کا حاصل نعمت کی ناشکری کرنا ہے، اس لئے كَنُوْدٌ کا ترجمہ ناشکرا کیا گیا ہے۔[1]

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ خَيْرٌ کے لفظی معنی ہر بھلائی کے ہیں، عرب میں مال کو بھی لفظِ خیر سے تعبیر کرتے تھے، گویا مال بھلائی ہی بھلائی اور فائدہ ہی فائدہ ہے، حالانکہ درحقیقت بعض مال انسان کو ہزاروں مصیبتوں میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں، آخرت میں تو ہر مالِ حرام کا یہی انجام ہے، کبھی کبھی دُنیا میں بھی مال انسان کے لئے وبال بن جاتا ہے، مگر عرب کے محاورے کے مطابق اس آیت میں مال کو لفظِ خَيْرٌ سے تعبیر کر دیا ہے، جیسا ایک دُوسری آیت میں فرمایا: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا[2] (البقرۃ:۱۸۰) یہاں بھی ''خیر'' سے مراد مال ہے۔

آیتِ مذکورہ میں گھوڑوں کی قسم کھا کر اِنسان کے متعلق دو باتیں کہی گئیں، ایک یہ کہ وہ ناشکر ہے، مصیبتوں، تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے، نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے، یہ دونوں باتیں شرعاً وعقلاً مذموم ہیں، ان میں انسان کو ان مذموم خصلتوں پر متنبہ کرنا مقصود ہے، ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے، مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیا، حالانکہ وہ انسانی ضروریات کا مدار ہے، اور اُس کے کسب واکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدرِ ضرورت فرض قرار دیا ہے، تو مال کی محبت کا مذموم ہونا یا تو وصفِ شدّت کے اِعتبار سے ہے کہ مال کی محبت میں ایسا مغلوب ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام سے بھی غافل ہو جائے اور حلال وحرام کی پروا نہ رہے، اور یا اس لئے کہ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۶۲

[2] ترجمہ: بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو۔

مال کا کسب و اکتساب اور بقدرِ ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں، بلکہ فرض ہے، مگر محبت اُس کی بھی مذموم ہے، کیونکہ محبت کا تعلق دِل سے ہے، اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مال کو بقدرِ ضرورت حاصل کرنا اور اُس سے کام لینا تو ایک فریضہ اور محمود ہے، لیکن دل میں اُس کی محبت ہونا پھر بھی مذموم ہی ہے۔ جیسا انسان پیشاب پاخانے کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے، اُس کا اہتمام بھی کرتا ہے، مگر اس کے دِل میں محبت نہیں ہوتی، بیماری میں دوا بھی پیتا ہے، آپریشن بھی کراتا ہے، مگر دِل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی، بلکہ بدرجۂ مجبوری کرتا ہے، اسی طرح اللہ کے نزدیک مؤمن کو ایسا ہونا چاہئے کہ بقدرِ ضرورت مال کو حاصل بھی کرے، اُس کی حفاظت بھی کرے اور مواقعِ ضرورت میں اُس سے کام بھی لے، مگر دِل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو، جیسا کہ مولانا رُومی رحمہ اللہ نے بڑے بلیغ انداز میں فرمایا ہے ۔

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است　　　آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

یعنی پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کا مددگار رہے، مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے اِردگرد رہے تو مفید ہے، جب دِل کے اندر گھس گیا تو ہلاکت ہے۔ آخرِ سورت میں انسان کی ان دونوں مذموم خصلتوں پر آخرت کی وعید سنائی گئی۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ الآیۃ، کیا اس غافل انسان کو اس کی خبر نہیں کہ قیامت کے روز جب کہ مُردے قبروں سے زندہ کرکے اُٹھائے جائیں گے، اور دِلوں میں چھپی ہوئی باتیں بھی سب کھل کر سامنے آجائیں گی، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ رَبّ العالمین ان سب کے سب حالات سے باخبر ہیں، تو اس کے مطابق جزا سزا دیں گے، اس لئے عقل مند کا کام یہ ہے کہ ناشکری سے باز آئے اور مال کی محبت میں ایسا مغلوب نہ ہو کہ اچھے بُرے کی تمیز نہ رہے۔

فائدہ

اس آیت میں یہ دو مذموم خصلتیں مطلق انسان کی بیان کی گئی ہیں، حالانکہ انسان میں انبیاء و اولیاء اور بہت سے صلحاء عباد ایسے ہیں، جو ان مذموم خصلتوں سے پاک اور شکرگزار بندے ہوتے ہیں، مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنے کے لئے تیار رہتے ہیں، حرام مال سے بچتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ مطلق انسان کی طرف ان مذموم خصلتوں کی نسبت اس لئے کردی گئی کہ اکثر انسان ایسے ہی ہیں، اس سے سب کا ایسا ہونا لازم نہیں آتا، اسی لئے بعض حضرات نے اس آیت میں انسان سے مراد انسانِ کافر لیا ہے، جیسا کہ اُوپر خلاصۂ تفسیر میں ایسا ہی ہے، اس کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ دونوں مذموم خصلتیں دراصل کافر کی ہیں، کسی مسلمان میں بھی خدانخواستہ پائی جائیں تو اُسے فکر کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى

سُورَةُ القَارِعَة

آیاتها ۱۱ ۔ ۱۰۱ سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۳۰ ۔ رکوعها ۱

سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ

جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے، اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اُون

الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷

دُھنی ہوئی، سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں، تو وہ رہے گا من مانتے گزران میں،

وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾

اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں، تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے، اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے

ع ١١ / ٢٢

نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

آگ ہے دہکتی ہوئی

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(یاد کرو) وہ واقعہ جو دِل دہلا کر رکھ دے گا! ① کیا ہے وہ دِل دہلانے والا واقعہ؟ ② اور تمہیں کیا معلوم وہ دِل دہلانے والا واقعہ کیا ہے؟ ③ جس دن سارے لوگ پھیلے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے، ④ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے، ⑤ اب جس شخص کے پلڑے وزنی ہوں گے ⑥ تو وہ من پسند زندگی میں ہوگا، ⑦ اور وہ جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے ⑧ تو اُس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہوگا۔ ⑨ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گہرا گڑھا کیا چیز ہے؟ ⑩ ایک دہکتی ہوئی آگ! ⑪

خلاصۂ تفسیر

وہ کھڑکھڑانے والی چیز، کیسی ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز اور آپ کو کچھ معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز (مراد قیامت ہے جو دِلوں کو گھبراہٹ سے اور کانوں کو سخت آوازوں سے کھڑکھڑائے گی، اور یہ اُس روز ہوگا) جس روز آدمی پریشان پروانوں کی طرح ہو جائیں گے (پروانوں سے تشبیہ چند چیزوں کی وجہ سے دی گئی، ایک کثرت سے ہونا کہ سارے اوّلین و آخرین انسان ایک میدان میں جمع ہو جائیں گے، دُوسرے کمزور ہونا کہ سب انسان اُس وقت کمزوری میں پروانے جیسے ضعیف و عاجز ہوں گے، یہ دونوں وصف تو تمام اہلِ محشر انسانوں میں عام ہوں گے، تیسرے بے تاب اور بے چین اِدھر اُدھر پھرنا جو پروانوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، یہ صورت خاص مؤمنین میں نہیں ہوگی، وہ اپنی قبروں سے مطمئن اُٹھیں گے) اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے (عہن رنگین اُون کو کہا جاتا ہے، پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہیں، وہ سب اُڑتے پھریں گے، جن کی مثال اُس اُون کی ہوگی جس میں مختلف رنگ کے بال ملے ہوئے ہوں، اُس

روز اعمالِ انسانی تولے جائیں گے) پھر جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی جو مؤمن ہوگا) وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا (یعنی نجات پا کر جنت میں جائے گا) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی کافر) اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ (ہاویہ) کیا چیز ہے (وہ) ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت میں اعمال کے وزن ہونے اور اُن کے ہلکے بھاری ہونے پر دوزخ یا جنت ملنے کا ذِکر ہے۔ وزنِ اعمال کی پوری تحقیق اور شبہات کا جواب سورۂ اعراف کے شروع میں گزر چکا ہے (معارف القرآن جلد سوم ص:٥٦٨ تا ص:٥٧٥) وہاں دیکھ لیا جائے، اُس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ روایاتِ حدیث اور آیات کی تطبیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وزنِ اعمال غالباً دو مرتبہ ہوگا۔ ایک مرتبہ کے وزن سے مؤمن اور کافر کا اِمتیاز کر دیا جائے گا، ہر مؤمن کا پلہ بھاری اور کافر کا ہلکا رہے گا۔ پھر مؤمنین میں اعمالِ حسنہ اور سیئہ کا اِمتیاز کرنے کے لئے دُوسرا وَزن ہوگا۔ اس سورت میں بظاہر وہ پہلا وزن مراد ہے جس میں ہر مؤمن کا پلہ ایمان کی وجہ سے بھاری رہے گا، خواہ اس کا عمل کیسا بھی ہو، اور کافر کا پلّہ ایمان نہ ہونے کے سبب ہلکا رہے گا، خواہ اُس نے کچھ نیک کام بھی کئے ہوں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ قرآنِ کریم میں عام طور پر جزا و سزا میں تقابل کفار کا مؤمنین صالحین کے ساتھ کیا گیا کہ اصلی مؤمنین کاملین وہی ہیں، باقی رہے وہ مؤمنین جنہوں نے اعمالِ صالحہ اور سیئہ مخلوط کئے ہیں، قرآن میں عام طور پر اُن سے سکوت کیا گیا، اور ان سب آیات میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قیامت میں انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے، گنے نہیں جائیں گے، اور عمل کا وزن بقدرِ اِخلاص اور مطابقت سنت کے بڑھتا ہے، جس شخص کے عمل میں اِخلاص بھی کامل ہو، اور سنت کی مطابقت بھی مکمل ہو، اگرچہ اس کے عمل تعداد میں کم ہوں، اس کا وزن بہ نسبت اُس شخص کے بڑھ جائے گا جس نے تعداد میں تو نماز روزے، صدقہ خیرات، حج عمرے بہت کئے، مگر اِخلاص میں کمی رہی یا سنت کی مطابقت میں کمی رہی۔ [1] واللہ اعلم۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰی

[1] تفسیر المظہری ج:١٠ ص:٣٣٠ و ٣٣١

سُوْرَةُ التَّكَاثُر

اٰیاتھا ۸ ۱۰۲ سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ ۱۶ رکوعھا ۱

سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳

غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے، یہاں تک کہ جادیکھیں قبریں، کوئی نہیں آگے جان لوگے،

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لوگے، کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کرکے،

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ

بے شک تم کو دیکھنا ہے دوزخ، پھر دیکھنا ہے اُس کو یقین کی آنکھ سے، پھر پوچھیں گے تم سے

يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨ ع

اُس دن آرام کی حقیقت

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے

ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر (دُنیا کا عیش) حاصل کرنے کی ہوس نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا ہے، ۝١
یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو، ۝٢ ہرگز ایسا نہیں چاہئے۔ تمہیں عنقریب سب پتہ چل جائے گا، ۝٣ پھر
(سن لو کہ:) ہرگز ایسا نہیں چاہئے۔ تمہیں عنقریب سب پتہ چل جائے گا۔ ۝٤ ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات
جانتے ہوتے (تو ایسا نہ کرتے) ۝٥ یقین جانو تم دوزخ کو ضرور دیکھوگے، ۝٦ پھر یقین جانو کہ تم اُسے بالکل یقین کے
ساتھ دیکھ لوگے۔ ۝٧ پھر تم سے اُس دن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا (کہ اُن کا کیا حق ادا کیا)۔ ۝٨

خلاصۂ تفسیر

(دُنیوی سامان پر) فخر کرنا تم کو (آخرت سے) غافل کئے رکھتا ہے، یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو (یعنی مرجاتے ہو، کذا فی تفسیر ابن کثیر مرفوعًا [1]) ہرگز نہیں (یعنی دُنیوی سامان قابلِ فخر ہے اور نہ آخرت قابلِ غفلت) تم کو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی، یعنی مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا، پھر (دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں قابل فخر اور توجہ کے اور آخرت قابل غفلت و انکار کے) نہیں، تم کو بہت جلد (قبر سے نکلتے ہی یعنی حشر میں) معلوم ہو جائے گا (کذا فی فتح البیان مرفوعًا، اور سہ بارہ پھر تم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں قابل فخر و توجہ کے اور آخرت قابل غفلت و انکار کے) نہیں (اور) اگر تم یقینی طور پر جان لیتے (یعنی دلائل صحیحہ میں غور و توجہ سے کام لیتے اور اس کا یقین آجاتا تو کبھی اس سامان پر فخر اور آخرت سے غفلت میں نہ پڑتے) واللہ! تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھوگے، پھر (مکرّر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے) واللہ! تم لوگ ضرور اُس کو ایسا دیکھنا دیکھوگے جو کہ خود یقین ہے (کیونکہ یہ دیکھنا اِستدلال اور دلائل کی راہ سے نہیں ہوگا، جس سے یقین حاصل ہونے میں کبھی دیر بھی لگتی ہے، بلکہ یہ آنکھوں کا مشاہدہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنی آنکھوں دیکھ لینے کو عین الیقین سے تعبیر فرمایا ہے) پھر (اور بات سنو کہ) اُس روز تم سب سے نعمتوں کی

[1] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:٤٧٢

پوچھ ہوگی (کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا حق ایمان واطاعت کے ساتھ بجالائے یا نہیں)

معارف ومسائل

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ تکاثر، کثرت سے مشتق ہے، معنی ہیں کثرت کے ساتھ مال ودولت جمع کرنا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمہ اللہ نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے، اور یہ لفظ بمعنی تفاخر بھی استعمال کیا جاتا ہے، حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی یہی تفسیر ہے، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوتے ہیں ان میں خرچ نہ کریں۔ (قرطبی) [1]

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ یہاں زیارتِ مقابر سے مراد مرکر قبر میں پہنچنا ہے، جیسا کہ حدیثِ مرفوع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کی تفسیر میں فرمایا: "حَتّٰى يَاْتِيَكُمُ الْمَوْتُ" (ابنِ کثیر بروایت ابن ابی حاتم) [2]

اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تم لوگوں کو مال ودولت کی بہتات یا مال واولاد اور قبیلہ ونسب پر تفاخر غفلت میں ڈالے رہتی ہے، اپنے انجام اور آخرت کے حساب کی کوئی فکر نہیں کرتے، یہاں تک کہ اسی حال میں تمہیں موت آجاتی ہے، اور وہاں عذاب میں پکڑے جاتے ہو۔ یہ خطاب بظاہر عام انسانوں کو ہے، جو مال واولاد کی محبت یا دُوسروں پر اپنی برتری اور تفاخر میں ایسے مست رہتے ہیں کہ اپنے انجام کو سوچنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ:

يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِيْ مَالِيْ، وَهَلْ لَكَ مِنْ مَالِكَ اِلَّا مَا اَكَلْتَ فَاَفْنَيْتَ، اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَيْتَ، اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَيْتَ۔ وفی روایة لمسلم: وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ۔ (ابنِ کثیر وقرطبی بروایت مسلم، ترمذی واحمد) [3]

آدمی کہتا ہے کہ: میرا مال! میرا مال! حالانکہ اس میں تیرا حصہ تو اتنا ہی ہے جس کو تو نے کھا کر فنا کردیا، یا پہن کر بوسیدہ کردیا، یا صدقہ کر کے اپنے آگے بھیج دیا، اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے، تو اُس کو لوگوں کے لئے چھوڑنے والا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:٢٠ ص:١٦٩، وصحیح مسلم، کتاب الزهد، فصل لا ینبغی للإنسان ...إلخ، ج:٢ ص:٤٠٧

[2] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:٤٧٢

[3] صحیح مسلم، کتاب الزهد، فصل لا ینبغی للإنسان ...إلخ، ج:٢ ص:٤٠٧، وجامع الترمذی، ابواب الزُّهد، باب ما جاء لو کان لابن آدم وادیان ...إلخ، ج:٢ ص:٥٩، ومسند احمد، حدیث مطرف بن عبدالله رضی الله عنه، رقم الحدیث:١٦٣٠٥

اِمام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِّنْ ذَهَبٍ لَّاَحَبَّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَادِيَانِ، وَلَنْ يَّمْلَاَ فَاهُ اِلَّا التُّرَابُ، وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔ [1]

اگر آدم زادے کے لئے ایک وادی (دامنِ کوہ) سونے سے بھری ہوئی موجود ہو تو (وہ اس پر قناعت نہیں کرے گا، بلکہ) چاہے گا کہ ایسی دو وادیاں ہو جائیں، اور اُس کے منہ کو تو (قبر کی) مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکتی، اور اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اُس شخص کی جو اُس کی طرف رُجوع ہو۔

حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کے الفاظ مذکورہ کو قرآن سمجھا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورۂ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نازل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ کر مذکورہ الفاظ اُس کی تفسیر وتشریح کے طور پر پڑھے تھے، اس سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو شبہ ہو گیا کہ یہ بھی قرآن ہی کے الفاظ ہیں، بعد میں جب پوری سورۃ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ سامنے آئی تو اس میں یہ الفاظ نہیں تھے، اس سے حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ الفاظ تفسیر کے تھے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵ حرف لَوْ جو شرط کے لئے آتا ہے اس کے مقابل کوئی جزا ہونا چاہئے، وہ بقرینہ سیاق اس جگہ حذف کر دی گئی ہے، یعنی لَمَا اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ یعنی اگر تم کو قیامت کے حساب کتاب کا یقین ہوتا تو تم اس تکاثر اور تغافل میں نہ پڑتے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝۷ اُوپر خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے کہ عَيْنَ الْيَقِيْنِ سے مراد وہ یقین ہے کہ جو کسی چیز کے مشاہدے کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ یقین کا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر تشریف رکھتے تھے اور اُن کے پیچھے اُن کی قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو وہیں کوہِ طور پر خبر کر دی تھی کہ تمہاری قوم اس وبال میں مبتلا ہو گئی ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام پر اس خبر سے اتنا اثر نہیں ہوا، جتنا اس وقت ہوا جب واپس پہنچ کر اُنہوں نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی آنکھوں سے دیکھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ بے اختیار ہو کر اَلواحِ توراۃ ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ (رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح، مظہری) [2]

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸ یعنی تم سب سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے متعلق بازپُرس ہوگی کہ تم نے اُن کا شکر کیا ادا کیا اور اُن کو گناہوں میں تو خرچ نہیں کیا ان میں سے بعض نعمتوں کے متعلق تو خود قرآن میں دُوسری جگہ وضاحت آ گئی، جیسا فرمایا اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ما يتقي من فتنة المال، ج:۲ ص:۹۵۲

[2] تفسير المظهري ج:۱۰ ص:۳۳۵، ومسند احمد، مسند عبدالله بن عباس رضي الله عنهما، رقم الحديث:۲۴۴۷

مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ [۱] (بنی اسرائیل) جس میں انسان کی قوتِ شنوائی، بینائی اور دِل سے متعلق وہ لاکھوں نعمتیں آ گئیں جن کو اِنسان ہر لمحہ استعمال کرتا ہے۔

حدیث:- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بندے سے جس چیز کا سب سے پہلے سوال ہوگا (وہ تندرستی ہے) اُس کو کہا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں تندرستی نہیں دی تھی اور کیا ہم نے تمہیں ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا (الترمذی عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ وابن حبان فی صحیحہ، ابن کثیر) [۲]

حدیث:- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں کوئی آدمی اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا جب تک پانچ سوالوں کا جواب اُس سے نہ لیا جائے۔ ایک یہ کہ اُس نے اپنی عمر کو کن کاموں میں فنا کیا ہے دُوسرے یہ کہ اُس نے اپنے شباب کی قوت کو کن کاموں میں خرچ کیا ہے تیسرے یہ کہ جو مال اُس نے حاصل کیا وہ کس کس طریقے جائز یا ناجائز سے حاصل کیا چوتھے یہ کہ اس مال کو کہاں کہاں خرچ کیا پانچویں یہ کہ جو علم اللہ نے اُس کو دِیا تھا اُس پر کتنا عمل کیا (رواہ البخاری) [۳]

اور اِمامِ تفسیر مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قیامت میں یہ سوال دُنیا کی ہر لذّت کے متعلق ہوگا۔ (قرطبی) [۴] خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو، یا لباس اور مکان سے، یا بیوی اور اولاد سے، یا حکومت وعزّت سے۔ قرطبی نے اس کو نقل کر کے فرمایا یہ کہ بالکل دُرست ہے، اس سوال میں کسی خاص نعمت کی تخصیص نہیں ہے۔

سورۂ تکاثر کی خاص فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے خطاب کر کے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی آدمی اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ ہر روز قرآن کی ایک ہزار آیتیں پڑھا کرے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں کون پڑھ سکتا ہے آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ نہیں پڑھ سکتا، مطلب یہ ہے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ روزانہ پڑھنا ایک ہزار آیتوں کے پڑھنے کی برابر ہے۔ (مظہری بحوالہ حاکم وبیہقی عن ابن عمر رضی اللہ عنہما) [۵]

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى

---

۱ ترجمہ: کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی۔

۲ تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۷۶، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ، ج:۲ ص:۱۷۳، وصححہ ابن حبان، ذِکر الإخبار عن سؤال الرّبّ عزّ وجلّ، رقم الحدیث:۷۴۸۸

۳ تفسیر روح المعانی، تفسیر سورۃ الصافات ج:۱۲ ص:۷۸، وجامع الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ما جاء فی شاق الحساب والقصاص ج:۲ ص:۶۷

۴ تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۷۷

۵ تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۳۶، والمستدرک للحاکمؒ، رقم الحدیث:۲۰۸۱، کتاب فضائل القرآن، ذکر فضائل سور وآی متفرقۃ، وشعب الإیمان للبیہقیؒ، رقم الحدیث:۲۲۸۷، فصل فی فضائل السور الآیات وذکر اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔

سُورَةُ العَصرِ

آیاتها ۳ | ۱۰۳ سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۳ | رکوعها ۱

سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَ الْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا

قسم ہے عصر کی مقرر انسان ٹوٹے میں ہے، مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کئے بھلے کام

الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳ ع

اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی، اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی۔

ع ۱ / ۲۸

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

زمانے کی قسم، ① انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے، ② سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں، اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔ ③

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے زمانے کی (جس میں رنج وخسران واقع ہوتا ہے) کہ انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو اِیمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک دُوسرے کو حق (پر قائم رہنے) کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دُوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے (جو دُوسروں کی تکمیل ہے، تو جو لوگ خود بھی یہ کمال حاصل کریں اور دُوسروں کی بھی تکمیل کریں، یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)۔

معارف ومسائل

سورۂ عصر کی خاص فضیلت

حضرت عبید اللہ بن حصن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اُس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دُوسرے کے سامنے سورۂ والعصر نہ پڑھ لے۔ (رواہ الطبرانی)[1] اور اِمام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر لوگ صرف اسی سورت میں تدبر کر لیتے تو یہی اُن کے لئے کافی تھی۔ (ابنِ کثیر)[2]

سورۂ عصر قرآنِ کریم کی بہت مختصر سی سورت ہے، لیکن ایسی جامع ہے کہ بقول حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ اگر لوگ اسی سورت کو غور وتدبر کے ساتھ پڑھ لیں تو دِین ودُنیا کی دُرستی کے لئے کافی ہو جائے۔ اس سورت میں حق تعالیٰ نے زمانے

[1] المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۱۳۶۶

[2] تفسیر ابن کثیر ج: ۸ ص: ۴۷۹

کی قسم کھا کر فرمایا کہ نوعِ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو چار چیزوں کے پابند ہوں: ایمان، عملِ صالح، دُوسروں کو حق کی نصیحت و وصیت، اور صبر کی وصیت۔ دِین و دُنیا کے خسارے سے بچنے اور نفعِ عظیم حاصل کرنے کا یہ قرآنی نسخہ چار اجزا سے مرکب ہے، جن میں پہلے دو جزء اپنی ذات کی اصلاح کے متعلق ہیں، اور دُوسرے دو جزء دُوسرے مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح سے متعلق ہیں۔

یہاں پہلی بات یہ غور طلب ہے کہ اس مضمون کے ساتھ زمانے کو کیا مناسب ہے جس کی قسم کھائی گئی کیونکہ قسم اور جوابِ قسم میں باہم مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ عام حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ انسان کے تمام حالات اُس کا نشوونما، اُس کی حرکات و سکنات، اعمال، اخلاق، سب زمانے ہی کے اندر ہوتے ہیں، جن اعمال کی ہدایت اس سورت میں دی گئی ہے وہ بھی اسی زمانے کے لیل و نہار میں ہوں گے، اس کی مناسبت سے زمانے کی قسم اِختیار کی گئی۔

زمانے کو نوعِ انسانی کے خسارے میں کیا دخل ہے؟

اور توضیح اس کی یہ ہے کہ انسان کی عمر کا زمانہ، اس کے سال اور مہینے اور دِن رات بلکہ گھنٹے اور منٹ، اگر غور کیا جائے تو یہی اس کا سرمایہ ہے جس کے ذریعے وہ دُنیا و آخرت کے منافع عظیمہ عجیبہ بھی حاصل کرسکتا ہے، اور عمر کے اوقات اگر غلط اور بُرے کاموں میں لگادیئے تو یہی اس کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں، بعض علماء نے فرمایا ہے ۔

حَیَاتُکَ اَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَکُلَّمَا مَضیٰ نَفَسٌ مِنْهَا انْتَقَصَتْ بِهٖ جُزْءًا

یعنی تیری زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہے۔ جب اُن میں سے ایک سانس گزر جاتا ہے تو تیری عمر کا ایک جزء کم ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ نے ہر اِنسان کو اُس کی عمر کے اوقاتِ عزیز کا بے بہا سرمایہ دے کر ایک تجارت پر لگایا ہے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے اور اس سرمایہ کو خالص نفع بخش کاموں میں لگائے تو اس کے منافع کی کوئی حد نہیں رہتی، اور اگر اس کے خلاف کسی مضرّت رساں کام میں لگادیا تو نفع کی تو کیا اُمید ہوتی، یہ رأس المال بھی ضائع ہوجاتا ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں کہ نفع اور رأس المال ہاتھ سے جاتا رہا، بلکہ اُس پر سیکڑوں جرائم کی سزا عائد ہوجاتی ہے، اور کسی نے اس سرمائے کو نہ کسی نفع بخش کام میں لگایا، نہ مضرّت رساں میں تو کم از کم یہ خسارہ تو لازمی ہی ہے کہ اس کا نفع اور رأس المال دونوں ضائع ہوگئے اور یہ کوئی شاعرانہ تمثیل ہی نہیں، بلکہ ایک حدیثِ مرفوع سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

کُلٌّ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، ج:۱ ص:۱۱۸

یعنی ہر شخص جب صبح اُٹھتا ہے تو اپنی جان کا سرمایہ تجارت پر لگاتا ہے، پھر کوئی تو اپنے اس سرمائے کو خسارے سے آزاد کرالیتا ہے، اور کوئی ہلاک کرڈالتا ہے۔

خود قرآنِ کریم نے بھی ایمان وعملِ صالح کو اِنسان کی تجارت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩ [1] (الصّف) اور جب زمانہ عمرِ انسان کا سرمایہ ہو، اور اِنسان اس کا تاجر تو عام حالات میں اس تاجر کا خسارے میں ہونا اس لئے واضح ہے کہ اس مسکین کا سرمایہ کوئی منجمد چیز نہیں، جس کو کچھ دن بے کار بھی رکھا تو اگلے وقت میں کام آسکے، بلکہ یہ سیال سرمایہ ہے جو ہر منٹ، ہر سیکنڈ بہ رہا ہے، اس کی تجارت کرنے والا بڑا ہوشیار، مستعد آدمی چاہئے جو بہتی ہوئی چیز سے نفع حاصل کرے، اسی لئے ایک بزرگ کا قول ہے کہ وہ برف بیچنے والے کی دُکان پر گئے تو فرمایا کہ اس کی تجارت کو دیکھ کر سورۂ والعصر کی تفسیر سمجھ میں آگئی کہ یہ ذرا بھی غفلت سے کام لے تو اس کا سرمایہ پانی بن کر ضائع ہوجائے گا، اس لئے اس ارشادِ قرآنی میں زمانے کی قسم کھا کر اِنسان کو اس پر متوجہ کیا ہے کہ خسارے سے بچنے کے لئے جو چار اَجزاء سے مرکب نسخہ بتلایا گیا ہے، اُس کے استعمال میں ذرا غفلت نہ برتے، عمر کے ایک ایک منٹ کی قدر پہچانے اور ان چار کاموں میں اس کو مشغول کردے۔

زمانے کی قسم کی ایک مناسبت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے وہ ایک حیثیت سے اس معاملے کے شاہد کے قائم مقام ہوتی ہے، اور زمانہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس کی تاریخ اور اُس میں قوموں کے عروج ونزول کے بھلے بُرے واقعات پر نظر کرے گا تو ضرور اس یقین پر پہنچ جائے گا کہ صرف یہ چار کام ہیں جن میں انسان کی فلاح وکامیابی منحصر ہے جس نے ان کو چھوڑا وہ خسارے میں پڑا، دُنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

آگے ان چاروں اجزاء کی تشریح یہ ہے کہ ایمان اور عملِ صالح جو خود اِنسان کی ذات سے متعلق ہیں، ان کا معاملہ واضح ہے، کسی تشریح کا محتاج نہیں، البتہ آخر دو جزء یعنی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یہ قابلِ غور ہیں کہ ان سے کیا مراد ہے۔ لفظ ''تواصی'' وصیت سے مشتق ہے، کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر اَنداز میں نصیحت کرنے اور نیک کام کی ہدایت کرنے کا نام وصیت ہے، اسی وجہ سے مرنے والا جو اپنے بعد کے لئے کچھ ہدایات دیتا ہے اس کو بھی ''وصیت'' کہا جاتا ہے۔

یہ دو جزء درحقیقت اسی وصیت کے دو باب ہیں۔ ایک حق کی وصیت، دُوسرے صبر کی وصیت۔ اب ان دونوں لفظوں کے معنی میں کئی اِحتمال ہیں، ایک یہ کہ حق سے مراد عقائدِ صحیحہ اور اَعمالِ صالحہ کا مجموعہ ہو، اور صبر کے معنی تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچنا ہو، تو پہلے لفظ کا حاصل امر بالمعروف ہوگیا، یعنی نیک کاموں کا حکم کرنا، اور دُوسرے کا حاصل نہی

[1] ترجمہ: کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔

عن المنکر ہوگیا، یعنی بُرے کاموں سے روکنا، اس مجموعے کا حاصل پھر وہی ایمان اور عملِ صالح جس کو خود اِختیار کیا ہے اُس کی تاکید ونصیحت دُوسروں کو کرنا ہوگیا۔ اور ایک اِحتمال یہ ہے کہ حق سے مراد اِعتقاداتِ حقہ لئے جائیں اور صبر کے مفہوم میں تمام اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی ہو اور بُرے کاموں سے بچنا بھی، کیونکہ لفظ ''صبر'' کے حقیقی معنی اپنے نفس کو روکنے اور پابند بنانے کے ہیں، اس پابندی میں اعمالِ صالحہ بھی آگئے اور گناہوں سے اِجتناب بھی۔

اور حافظ اِبنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے کسی رسالے میں فرمایا کہ انسان کو ایمان اور عملِ صالح سے روکنے والی عادۃً دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک شبہات یعنی اُس کو اِیمان وعملِ صالح میں کچھ نظری اور فکری شبہات پیدا ہوجائیں، جن کے سبب عقائد ہی مختل ہوجائیں، اور عقائد کے مختل ہونے سے عملِ صالح کا خلل پذیر ہونا خود ظاہر ہے۔ دُوسرے شہوات یعنی خواہشاتِ نفسانی جو اِنسان کو بعض اوقات نیک عمل سے روک دیتی ہیں، اور بعض اوقات بُرے اعمال میں مبتلا کردیتی ہیں، اگرچہ وہ نظری اور اِعتقادی طور پر نیکی پر عمل اور بُرائی سے بچنے کو ضروری سمجھتا ہو، مگر نفسانی خواہشات اُس کے خلاف ہوں اور وہ ان خواہشات سے مغلوب ہوکر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے، تو آیتِ مذکور میں وصیتِ حق سے مراد یہ ہے کہ شبہات کو دُور کرے، اور وصیتِ صبر سے مراد یہ کہ نفسانی خواہشات کو چھوڑ کر اچھے اعمال اِختیار کرنے کی ہدایت کرے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وصیت بالحق سے مراد دُوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے، اور وصیت بالصبر سے مراد عملی اصلاح۔

نجات کے لئے صرف اپنے عمل کی اصلاح کافی نہیں، بلکہ دُوسرے مسلمانوں کی فکر بھی ضروری ہے

اس سورت نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ دی کہ اُن کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کرلینا جتنا اہم اور ضروری ہے، اُتنا ہی اہم یہ ہے کہ دُوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عملِ صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کرے، ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لئے کافی نہ ہوگا، خصوصاً اپنے اہل وعیال اور احباب ومتعلقین کے اعمالِ سیئہ سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمالِ صالحہ کا پابند ہو، اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی مقدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں عام مسلمان، بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں، خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھے ہیں، اولاد وعیال کچھ بھی کرتے رہیں، اس کی فکر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت کی ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرمادیں۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

اٰیاتھا ۹ | ۱۰۴ سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ ۳۲ | رکوعھا ۱

سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نو آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝۱ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲ يَحْسَبُ اَنَّ

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی، جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا، خیال کرتا ہے کہ

مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝۳ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا

اس کا مال سدا کو رہے گا اس کے ساتھ، کوئی نہیں وہ پھینکا جائے گا اُس روندنے والی میں، اور تو کیا سمجھا کون ہے

الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷

وہ روندنے والی ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، وہ جھانک لیتی ہے دِل کو،

ع ۲۹

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾

اُن کو اس میں موند دیا ہے، لمبے لمبے ستونوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

بڑی خرابی ہے اُس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا، (اور) منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو، ① جس نے مال اِکٹھا کیا ہو، اور اُسے گنتا رہتا ہو، ② وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ③ ہرگز نہیں! اُس کو تو ایسی جگہ میں پھینکا جائے گا جو چورا چورا کرنے والی ہے، ④ اور تمہیں کیا معلوم وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟ ⑤ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ⑥ جو دِلوں تک جا چڑھے گی! ⑦ یقین جانو وہ اُن پر بند کر دی جائے گی، ⑧ جبکہ وہ (آگ کے) لمبے چوڑے ستونوں میں (گھرے ہوئے) ہوں گے۔ ⑨

خلاصۂ تفسیر

بڑی خراب ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پسِ پشت عیب نکالنے والا ہو، (اور) رُودررُو طعنہ دینے والا ہو، جو (بہت حرص کی وجہ سے) مال جمع کرتا ہو اور (اُس کی محبت اور اُس پر فخر کے سبب) اس کو بار بار گنتا ہو (اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا) وہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا (یعنی مال کی محبت میں ایسا اِنہاک رکھتا ہو جیسے وہ اس کا معتقد ہے کہ وہ خود بھی ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اس کا مال بھی ہمیشہ یوں ہی رہے گا، حالانکہ یہ مال اس کے پاس) ہرگز نہیں (رہے گا، آگے اُس ویل یعنی خرابی کی تفصیل ہے کہ) واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں جو کچھ پڑے وہ اُس کو توڑ پھوڑ دے، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے) سلگائی گئی ہے (آگ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اُس آگ کے سخت اور ہولناک ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ایسی ہے) جو (بدن کو لگتے ہی) دِلوں تک جا پہنچے گی، وہ (آگ) اُن پر بند کر دی جائے گی (اس طرح سے کہ وہ لوگ آگ کے) بڑے لمبے لمبے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے جیسے کسی کو آگ کے صندوقوں میں بند کر دیا جائے)۔

معارف ومسائل

اس سورت میں تین سخت گناہوں پر عذابِ شدید کی وعید اور پھر اُس عذاب کی شدّت کا بیان ہے، وہ تین گناہ یہ ہیں: هَمْزَ، لَمْزَ، جَمْع مال۔ همز اور لمز چند معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اکثر مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ همز کے معنی غیبت یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کے عیوب کا تذکرہ کرنا ہے، اور لمز کے معنی آمنے سامنے کسی کو طعنہ دینے اور بُرا کہنے کے ہیں، یہ دونوں ہی چیزیں سخت گناہ ہیں۔ غیبت کی وعیدیں قرآن وحدیث میں زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس گناہ کے اِشتغال میں کوئی رُکاوٹ سامنے نہیں ہوتی، جو اس میں مشغول ہو تو بڑھتا چڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اس لئے گناہ بڑے سے بڑا اور زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے، بخلاف آمنے سامنے کہنے کے کہ وہاں دُوسرا بھی مدافعت کے لئے تیار ہوتا ہے، اس لئے گناہ میں اِمتداد نہیں ہوتا، اس کے علاوہ کسی کے پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ اس لئے بڑا ظلم ہے کہ اُس کو خبر بھی نہیں کہ مجھ پر کیا اِلزام لگایا جارہا ہے کہ اپنی صفائی پیش کرسکے۔

اور ایک حیثیت سے لَمْز زیادہ شدید ہے، کسی کے رُوبرو اُس کو بُرا کہنا اُس کی توہین وتذلیل بھی ہے، اور اس کی ایذا بھی اَشد ہے، اسی اعتبار سے اس کا عذاب بھی اَشد ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شِرَارُ عِبَادِ اللهِ تَعَالٰی اَلْمَشَّاءُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ، اَلْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ، اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَآءَ الْعَنَتَ“ [1] یعنی اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں، اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں، اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

تیسری خصلت جس پر عذاب کی وعید اس سورت میں آئی ہے، وہ مال کی حرص اور محبت ہے، اُسی کو آیت میں اس طرح سے تعبیر کیا ہے کہ حرص ومحبتِ مال کی وجہ سے اُس کو بار بار گنتا رہتا ہے، چونکہ دُوسری آیات وروایات اس پر شاہد ہیں کہ مطلقاً مال کا جمع رکھنا کوئی حرام وگناہ نہیں، اس لئے یہاں بھی مراد وہ جمع کرنا ہے جس میں حقوقِ واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں، یا فخر وتفاخر مقصود ہو، یا اُس کی محبت میں منہمک ہوکر دِین کی ضروریات سے غفلت ہو۔

الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ یعنی یہ جہنم کی آگ دِلوں تک پہنچ جائے گی۔ یوں تو ہر آگ کا خاصہ یہی ہے کہ جو چیز اس میں پڑے، اس کے سبھی اجزا کو جلا دیتی ہے، انسان اُس میں ڈالا جائے گا تو اُس کے سارے اعضا کے ساتھ دِل بھی جل جائے گا، یہاں جہنم کی آگ کی یہ خصوصیت اس لئے ذِکر کی گئی کہ دُنیا کی آگ جب انسان کے بدن کو لگتی ہے تو اُس کے دِل تک پہنچنے سے پہلے ہی موت واقع ہوجاتی ہے، بخلاف جہنم کے کہ اُس میں موت تو آتی نہیں تو دِل تک آگ کا پہنچنا بحالتِ حیات ہوتا ہے اور دِل کے جلنے کی اذیت اپنی زندگی میں انسان محسوس کرتا ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰی

---

[1] مسند احمد، حدیث عبدالرحمٰن بن غنم الأشعري رضي الله عنه، رقم الحديث: ۱۷۹۹۸

سُورَةُ الفِيل

آیاتها ٥ ۔ ١٠٥ سُورَةُ الفِيلِ مَكِّيَّةٌ ١٩ ۔ رکوعها ١

سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ

کیا تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ

فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝٣ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ

غلط اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں، پھینکتے تھے اُن پر پتھریاں

مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝٤ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝٥

کنکر کی، پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھس کھایا ہوا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ ① کیا اُس نے ان لوگوں کی ساری چالیں بیکار نہیں کر دی تھیں؟ ② اور اُن پر غول کے غول پرندے چھوڑ دیئے تھے، ③ جو اُن پر پکی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، ④ چنانچہ اُنہیں ایسا کر ڈالا جیسے کھایا ہوا بھوسا! ⑤

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ربّ نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا (اس اِستفہام وسوال سے مقصود اس واقعے کی عظمت اور ہولناک ہونے پر تنبیہ کرنا ہے، آگے اس معاملے کا بیان ہے) کیا اُن کی تدبیر کو (جو کعبہ ویران کرنے کے لئے تھی) سرتاپا غلط نہیں کر دیا (یہ اِستفہام وسوال تقریری ہے، یعنی واقعے کی صحت ثابت کرنے کے لئے) اور اُن پر غول کے غول پرندے بھیجے جو اُن لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے، سو اللہ تعالیٰ نے اُن کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح (پامال) کر دیا (حاصل یہ کہ اَحکامِ اِلٰہیہ کی بے حرمتی کرنے والوں کو ایسے عذاب وعقاب سے بے فکر نہ رہنا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ دُنیا ہی میں عذاب آجائے، جیسے اَصحابِ فیل پر آیا، ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہی ہے)۔

معارف ومسائل

اس سورت میں اَصحابِ فیل کے واقعے کا مختصر بیان ہے کہ اُنہوں نے بیت اللہ کو مسمار کرنے کے قصد سے ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی تھی، حق تعالیٰ نے معمولی پرندوں کے ذریعے اُن کی فوج کو عذابِ آسمانی نازل فرما کر نیست ونابود کر کے اُن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

واقعۂ فیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وِلادت کے سال میں ہوا

یہ واقعہ اُس سال میں پیش آیا جس سال میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وِلادت مکہ مکرمہ میں ہوئی، بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور یہی مشہور قول ہے۔ (ابن کثیر) [1] حضراتِ محدثین نے اس واقعے کو

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۸۳، تحت هٰذه الآية۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قسم کا معجزہ قرار دِیا ہے، مگر چونکہ معجزات کا قانون یہ ہے کہ وہ نبی کے دعوائے نبوّت کے ساتھ اُن کی تصدیق کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ دعوائے نبوّت سے پہلے بلکہ نبی کی وِلادت سے بھی پہلے حق تعالیٰ بعض اوقات دُنیا میں ایسے واقعات اور نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو خرقِ عادت ہونے میں مثل معجزہ کے ہوتے ہیں، اس طرح کی نشانیوں کو محدثین کی اِصطلاح میں ''ارہاص'' کہا جاتا ہے، جو تأسیس وتمہید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رہص سنگِ بنیاد کو کہتے ہیں۔ (قاموس) [۱] انبیاء علیہم السلام کی دُنیا میں تشریف آوری سے یا ان کے دعوائے نبوّت سے پہلے بھی حق تعالیٰ کچھ ایسی نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو معجزات کی قسم سے ہوتی ہیں، اور ایسی نشانیاں چونکہ ان کی نبوّت کے اِثبات کا مقدمہ اور اس قسم کی تمہید وتأسیس ہوتی ہیں، اس لئے ان کو ''ارہاص'' کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور وِلادت سے پہلے بھی اس قسم کے ارہاصات متعدّد قسم کے ہوئے ہیں، اَصحابِ فیل کو آسمانی عذاب کے ذریعے بیت اللہ پر حملے سے روک دینا بھی انہی ارہاصات میں سے ہے۔

اَصحابِ فیل کا واقعہ

اِمامِ حدیث وتاریخ اِبنِ کثیر رحمہ اللہ نے اس طرح نقل فرمایا ہے کہ یمن پر ملوک حِمْیَر کا قبضہ تھا، یہ لوگ مشرک تھے، ان کا آخری بادشاہ ذُونواس ہے، جس نے اُس زمانے کے اہلِ حق یعنی نصاریٰ پر شدید مظالم کئے، اسی نے ایک طویل عریض خندق کھدوا کر اُس کو آگ سے بھرا اور جتنے نصرانی بت پرستی کے خلاف ایک اللہ کی عبادت کرنے والے تھے، سب کو اس آگ کی خندق میں ڈال کر جلا دیا، جن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ یہی وہ خندق کا واقعہ ہے جس کا ذِکر اَصحابُ الاخدود کے نام سے سورۂ بروج میں گزرا ہے۔ ان میں دو آدمی کسی طرح اس کی گرفت سے نکل بھاگے اور اُنہوں نے قیصر ملکِ شام سے جا کر فریاد کی کہ ذُونواس ملک حمیر نے نصاریٰ پر ایسا ظلم کیا، آپ ان کا انتقام لیں۔ قیصر ملکِ شام نے بادشاہ حبشہ کو خط لکھا، یہ بھی نصرانی تھا اور یمن سے قریب تھا کہ آپ اس ظالم سے ظلم کا انتقام لو، اس نے اپنا عظیم لشکر دو کمانڈر (امیر) ارباط اور ابرہہ کی قیادت میں یمن کے اس بادشاہ کے مقابلے پر بھیج دیا، لشکر اُس کے ملک پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو قومِ حِمْیَر کے قبضے سے آزاد کرایا۔ ملک حِمْیَر ذُوالنواس بھاگ نکلا اور دریا میں غرق ہو کر مر گیا۔ اس طرح ارباط وابرہہ کے ذریعے یمن پر بادشاہ حبشہ کا قبضہ ہوگیا۔ پھر ارباط اور ابرہہ میں باہمی جنگ ہو کر ارباط مقتول ہوگیا ابرہہ غالب آگیا اور یہی بادشاہ حبشہ نجاشی کی طرف سے ملکِ یمن کا حاکم (گورنر) مقرّر ہوگیا۔ اس نے یمن پر قبضہ کرنے کے بعد

[۱] القاموس المحیط، فصل الراء، ج:۲ ص:۱۶۵

ارادہ کیا کہ یمن میں ایک ایسا شاندار کنیسہ بنائے جس کی نظیر دُنیا میں نہ ہو۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ لوگ اس کنیسہ کی عظمت وشوکت سے مرعوب ہوکر کعبہ کے بجائے اسی کنیسہ میں جانے لگیں گے، اس خیال پر اُس نے بہت بڑا عالی شان کنیسہ اتنا اُونچا تعمیر کیا کہ اُس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا اور اُس کو سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا اور پوری مملکت میں اعلان کرادیا کہ اب یمن سے کوئی کعبہ کے حج کے لئے نہ جائے، اس کنیسہ میں عبادت کرے۔ عرب میں اگرچہ بت پرستی غالب آگئی تھی، مگر دینِ ابراہیم اور کعبہ کی عظمت ومحبت ان کے دِلوں میں پیوست تھی، اس لئے عدنان اور قحطان اور قریش کے قبائل میں غم وغصّے کی لہر دوڑ گئی، یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہوکر اس کو گندگی سے آلودہ کردیا، اور بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے مسافر قبیلے نے کنیسہ کے قریب اپنی ضروریات کے لئے آگ جلائی، اس کی آگ کنیسہ میں لگ گئی اور اس کو سخت نقصان پہنچ گیا۔

ابرہہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور بتلایا گیا کہ کسی قریشی نے یہ کام کیا ہے تو اُس نے قسم کھائی کہ میں ان کے کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہوں گا۔ ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کی اور اپنے بادشاہ نجاشی سے اجازت مانگی، اس نے اپنا خاص ہاتھی کہ جس کا نام ''محمود'' تھا، ابرہہ کے لئے بھیج دیا کہ وہ اس پر سوار ہوکر کعبہ پر حملہ کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے بڑا عظیم الشان ہاتھی تھا جس کی نظیر نہیں پائی جاتی تھی، اور اُس کے ساتھ آٹھ ہاتھی دُوسرے بھی اس لشکر کے لئے بادشاہِ حبشہ نے بھیج دیئے تھے۔ ہاتھیوں کی یہ تعداد بھیجنے کا منشا یہ تھا کہ بیت اللہ کے ڈھانے میں ہاتھیوں سے کام لیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ بیت اللہ کے ستونوں میں لوہے کی مضبوط اور طویل زنجیریں باندھ کر ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھیں اور ان کو ہنکا دیں تو سارا بیت اللہ (معاذ اللہ) فوراً ہی زمین پر آگرے گا۔

عرب میں جب اس کے حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔ یمن کے عربوں میں ایک شخص ذونفر نامی تھا، اُس نے عربوں کی قیادت اختیار کی اور عرب لوگ اس کے گرد جمع ہوکر مقابلے کے لئے تیار ہوگئے، اور ابرہہ کے خلاف جنگ کی، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ ابرہہ کی شکست اور اُس کی رُسوائی نمایاں ہوکر دُنیا کے سامنے آئے، اس لئے یہ عرب مقابلے میں کامیاب نہ ہوئے۔ ابرہہ نے ان کو شکست دے دی اور ذُونفر کو قید کرلیا اور آگے روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد جب وہ قبیلہ خثعم کے مقام پر پہنچا تو اس قبیلے کے سردار نفیل بن حبیب نے پورے قبیلے کے ساتھ ابرہہ کا مقابلہ کیا، مگر ابرہہ کے لشکر نے اُن کو بھی شکست دے دی، اور نفیل بن حبیب کو بھی قید کرلیا اور ارادہ اُن کے قتل کا کیا، مگر پھر یہ سمجھ کر اُن کو زندہ رکھا کہ اُن سے ہم راستوں کا پتہ معلوم کرلیں گے، اس کے بعد جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے

باشندے قبیلہ ثقیف پچھلے قبائل کی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سن چکے تھے، اُنہوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا اور یہ کہ طائف میں جو ہم نے ایک عظیم الشان بت خانہ لات کے نام سے بنا رکھا ہے یہ اُس کو نہ چھیڑے تو ہم اس کا مقابلہ نہ کریں، انہوں نے ابرہہ سے مل کر یہ بھی طے کرلیا کہ ہم تمہاری اِمداد اور رہنمائی کے لئے اپنا ایک سردار ''اَبو رِغال'' تمہارے ساتھ بھیج دیتے ہیں، ابرہہ اس پر راضی ہو کر ابورِغال کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ کے قریب ایک مقام مَغْمَسْ پر پہنچ گیا، جہاں قریشِ مکہ کے اُونٹ چر رہے تھے، ابرہہ کے لشکر نے سب سے پہلے ان پر حملہ کر کے اُونٹ گرفتار کر لئے، جن میں دو سو اُونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ امجد عبدالمطلب رئیسِ قریش کے بھی تھے، ابرہہ نے یہاں پہنچ کر اَپنا ایک سفیر حناطہ حمیری کو شہرِ مکہ میں بھیجا کہ وہ قریش کے سرداروں کے پاس جا کر اطلاع کردے کہ ہم تم سے جنگ کے لئے نہیں آئے، ہمارا مقصد کعبہ کو ڈھانا ہے، اگر تم نے اس میں رُکاوٹ نہ ڈالی تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ حناطہ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو سب نے اُس کو عبدالمطلب کا پتہ دیا کہ وہ سب سے بڑے سردار قریش کے ہیں۔ حناطہ نے عبدالمطلب سے گفتگو کی اور ابرہہ کا پیغام پہنچادیا۔ ابنِ اِسحاق کی روایت کے مطابق عبدالمطلب نے یہ جواب دیا کہ ہم بھی ابرہہ سے جنگ کا کوئی اِرادہ نہیں رکھتے، نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ کرسکیں۔ البتہ میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ اللہ کا گھر اور اس کے خلیل اِبراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، وہ خود اس کی حفاظت کا ذِمہ دار ہے، اللہ سے جنگ کا اِرادہ ہے تو جو چاہے کرے، پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ حناطہ نے عبدالمطلب سے کہا کہ تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ابرہہ سے ملاتا ہوں۔ ابرہہ نے جب عبدالمطلب کو دیکھا کہ بڑے وجیہ آدمی ہیں تو اُن کو دیکھ کر اپنے تخت سے نیچے اُتر کر بیٹھ گیا، اور عبدالمطلب کو اپنے برابر بٹھایا، اور اپنے ترجمان سے کہا کہ عبدالمطلب سے پوچھے کہ وہ کس غرض سے آئے ہیں عبدالمطلب نے کہا کہ میری ضرورت تو اتنی ہے کہ میرے اُونٹ جو آپ کے لشکر نے گرفتار کر لئے ہیں، اُن کو چھوڑ دیں۔ ابرہہ نے ترجمان کے ذریعے عبدالمطلب سے کہا کہ جب میں نے آپ کو اوّل دیکھا تو میرے دِل میں آپ کی بڑی وقعت وعزّت ہوئی، مگر آپ کی گفتگو نے اس کو بالکل ختم کردیا کہ آپ مجھ سے صرف اپنے دو سو اُونٹوں کی بات کر رہے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ میں آپ کا کعبہ جو آپ کا دِین ہے اُس کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں، اس کے متعلق آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اُونٹوں کا مالک تو میں ہوں، مجھے اُن کی فکر ہوئی، اور بیت اللہ کا میں مالک نہیں، بلکہ اس کا مالک ایک عظیم ہستی ہے، وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ ابرہہ نے کہا کہ تمہارا خدا اُس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ اور بھی قریش کے چند سردار گئے تھے اور اُنہوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور لوٹ

جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ مگر ابرہہ نے اُس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالمطلب کے اُونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے، وہ اپنے اُونٹ لے کر واپس آئے تو بیت اللہ کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر دُعا میں مشغول ہوئے اور قریش کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی، سب نے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کیں کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے تو بس میں نہیں، آپ ہی اپنے بیت کی حفاظت کا انتظام فرما دیں۔ اِلحاح وزاری کے ساتھ دُعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دُوسرے لوگوں کو لے کر مختلف پہاڑوں پر پھیل گئے، ان کو یہ یقین تھا کہ اس کے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اسی یقین کی بنا پر اُنہوں نے ابرہہ سے خود اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کیا، بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اس لئے پسند نہ کیا کہ خود تو اس کے مقابلے کی طاقت نہ تھی اور دُوسری طرف یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی بےبسی پر رحم فرما کر دُشمن کی قوت اور اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی محمود نامی کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا۔ نفیل بن حبیب جن کو راستے سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا، اُس وقت وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کر کہنے لگے "تُو جہاں سے آیا ہے وہیں صحیح سالم لوٹ جا، کیونکہ تُو اللہ کے بلدِ امین (محفوظ شہر) میں ہے" یہ کہہ کر اس کا کان چھوڑ دیا۔ ہاتھی یہ سنتے ہی بیٹھ گیا۔ ہاتھی بانوں نے اُس کو اُٹھانا چلانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس کو بڑے بڑے آہنی تبروں سے مارا گیا، اُس کی بھی پروا نہ کی، اُس کی ناک میں آنکڑا لوہے کا ڈال دیا، پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا، اس وقت ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا تو فوراً کھڑا ہو گیا، پھر شام کی طرف چلانا چاہا تو چلنے لگا، پھر مشرق کی طرف چلایا تو چلنے لگا، ان سب اطراف میں چلانے کے بعد پھر اس کو مکہ مکرمہ کی طرف چلانے لگے تو پھر بیٹھ گیا۔

قدرتِ حق جل شانہٗ کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا۔ دُوسری طرف دریا کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دِکھائی دِیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے یا مسور کے برابر تھیں، ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں، واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے، جثّہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے، اُن کے پنجے سرخ تھے، ہر پنجے میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دِکھائی دیئے، اور اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر کے اُوپر چھا گئے، یہ کنکریں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں اُن کو ابرہہ کے لشکر پر گرایا، ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی، کہ جس پر پڑتی اُس کے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھس جاتی تھی، یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے، صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو اس کنکری سے ہلاک ہوا، اور لشکر کے سب آدمی اسی موقع پر ہلاک نہیں ہوئے، بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے، اُن سب کا یہ حال ہوا کہ راستے میں مر مر کر گر گئے۔ ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینا تھی، یہ

فوراً ہلاک نہیں ہوا، مگر اس کے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا کہ اس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا، اسی حال میں اس کو واپس یمن لایا گیا، دارالحکومت صنعاء پہنچ کر اس کا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گیا اور مر گیا۔ ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے، مگر اس طرح کہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے تھے۔ محمد بن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے۔ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے دونوں اپاہج اندھوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔ [۱] اصحابِ فیل کے اسی واقعے کے متعلق اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ یہاں اَلَمْ تَرَ فرمایا جس کے معنی ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا حالانکہ یہ واقعہ آپ کی ولادت باسعادت سے کچھ دن پہلے کا ہے، آپ کے دیکھنے کا یہاں بظاہر کوئی موقع نہیں تھا، مگر جو واقعہ یقینی ایسا ہو کہ عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہو، اُس کے علم کو بھی لفظ رُویت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے، اور ایک حد تک دیکھنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ اُوپر گزرا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہما نے ہاتھی بانوں کو اندھا اور اپاہج بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ اَبَابِيْلَ لفظ جمع کا ہے، مگر اس کا کوئی مفرد مستعمل نہیں، معنی اس کے پرندوں کے غول کے ہیں، کسی خاص جانور کا نام نہیں، اُردو زبان میں جو ایک خاص چڑیا کو اَبابیل کہتے ہیں، وہ مراد نہیں، جیسا کہ اُوپر روایت میں گزر چکا ہے، یہ پرندے کبوتر سے کسی قدر چھوٹے تھے اور کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ (کذا قال سعید بن جبیر رحمه الله، قرطبی) [۲]

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ سِجِّيْل بکسر سین سنگ گل کا معرّب کیا ہوا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ایسی کنکریں جو تر مٹی کو آگ میں پکانے سے بنتی ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کنکریں بھی خود کوئی طاقت نہ رکھتی تھیں، معمولی گارے اور آگ سے بنی ہوئی تھیں، مگر بقدرتِ حق سبحانہٗ اُنہوں نے رِیوالور کی گولیوں سے زیادہ کام کیا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ عصف، بھوسے کو کہتے ہیں، اوّل تو خود بھوسہ ہی منتشر تنکے ہوتے ہیں، پھر جب کہ اُس کو کسی جانور نے چبا بھی لیا ہو تو وہ تنکے بھی اپنے حال پر نہیں رہتے، ابرہہ کے لشکر میں جس پر یہ کنکر پڑی ہے اس کا

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۸۳ تا ۴۸۹

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۱۹۶

یہی حال ہوگیا ہے۔

اَصحابِ فیل کے اس عجیب وغریب واقعے نے پورے عرب کے دِلوں میں قریش کی عظمت بڑھادی اور سب ماننے لگے کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں، ان کی طرف سے خود حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اُن کے دُشمن کو ہلاک کردیا۔ (قرطبی) [1]
اسی عظمت کا یہ اثر تھا کہ قریشِ مکہ مختلف ملکوں کا سفر بغرضِ تجارت کرتے تھے، اور راستے میں کوئی اُن کو نقصان نہ پہنچاتا تھا، حالانکہ اُس وقت دُوسروں کے لئے کوئی سفر ایسے خطرات سے خالی نہیں تھا۔ قریش کے انہی سفروں کا ذِکر آگے اگلی سورت سورۂ قریش میں کرکے اُن کو شکرِ نعمت کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْفِيْلِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۰۰

سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ

آیاتھا ۴ ۱۰۶ سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ مَّکِّیَّۃٌ ۲۹ رکوعھا ۱

سورۂ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے.

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو، مانوس رکھنا اُن کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے،

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ ﴿۳﴾ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵

تو چاہئے کہ بندگی کریں اس گھر کے ربّ کی، جس نے اُن کو کھانا دیا بھوک میں

وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ ع

اور امن دیا ڈر میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

چونکہ قریش کے لوگ عادی ہیں، ① یعنی وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں (یمن اور شام کے) سفر کرنے کے عادی ہیں، ② اس لئے اُنہیں چاہئے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں ③ جس نے بھوک کی حالت میں اُنہیں کھانے کو دیا، اور بدامنی سے اُنہیں محفوظ رکھا۔ ④

خلاصۂ تفسیر

چونکہ قریش خوگر ہوگئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہوگئے ہیں تو (اس نعمت کے شکر میں) ان کو چاہئے کہ اس خانۂ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں، جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے اُن کو امن دیا۔

معارف و مسائل

اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے، اور شاید اس وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کر کے لکھا گیا تھا، دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی تھی، مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے زمانے میں تمام مصاحفِ قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوا، اسی نسخۂ قرآن کو جمہور کے نزدیک امام کہا جاتا ہے، اس میں ان دونوں کو دو الگ الگ سورتیں ہی لکھا ہے، دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ① حرف لام ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے اس کا مقتضی ہے کہ اس کا تعلق کسی سابق مضمون کے ساتھ ہو، اسی لئے اس کے متعلق میں متعدد اقوال ہیں، پچھلی سورت کے ساتھ معنوی تعلق کی بنا پر بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہاں محذوف جملہ: ''اِنَّـآ اَهْـلَـكْنَا اَصْحَابَ الْفِيْلِ'' ہے، یعنی ہم نے اَصحابِ فیل کو اس لئے ہلاک کیا کہ قریشِ مکہ سردی گرمی کے دو سفروں کے عادی تھے، ان کی راہ میں کوئی رُکاوٹ نہ رہے، سب کے دِلوں میں ان کی عظمت پیدا ہوجائے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ محذوف جملہ: ''اِعْـجَـبُـوْا'' ہے، یعنی تعجب کرو قریش کے معاملے سے کہ کس طرح سردی گرمی کے سفر آزادانہ بے خطر ہو کر کرتے ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ اس کا تعلق اس جملے سے ہے جو آگے آیت میں

آ رہا ہے، یعنی فَلْيَعْبُدُوْا مطلب یہ ہوا کہ قریش کو اس نعمت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا اور اس کی عبادت میں لگ جانا چاہئے، اس صورت میں فَلْيَعْبُدُوْا کے اُوپر حرف فاء اس لئے ہے کہ پہلے جملے میں ایک معنی شرط کے پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس سورت میں ارشاد یہ ہے کہ قریشِ مکہ چونکہ دوسفروں کے عادی تھے، ایک سردی میں یمن کی طرف، دُوسرا گرمی میں شام کی طرف، اور ان ہی دوسفروں پر ان کی تجارت اور کاروبار کا مدار تھا، اور اسی تجارت کی بنا پر وہ مال دار اور اغنیاء تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دُشمن اَصحابِ فیل کو عبرت ناک سزا دے کر ان کی عظمت لوگوں کے قلوب میں بڑھادی، یہ پورے ممالک میں جہاں بھی جائیں لوگ اُن کی تعظیم تکریم کرتے ہیں۔

قریش کی افضلیت سارے عرب پر

اس سورت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تمام قبائلِ عرب میں قریش اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ اسماعیل علیہ السلام میں سے کنانہ کو اور کنانہ میں سے قریش کو، اور قریش میں سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو اِنتخاب کرلیا ہے۔ (البغوی عن واثلة بن اسقع رضی الله عنه) [۱] اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام آدمی قریش کے تابع ہیں خیر و شر میں۔ (رواه مسلم عن جابر رضی الله عنه، مظهری) [۲] اور پہلی حدیث میں جس خداوندی اِنتخاب کا ذِکر ہے، غالباً اُس کی وجہ ان قبائل کے خاص ملکات اور اِستعدادیں ہیں، کفر و شرک اور جہالت کے زمانے میں بھی ان کے بعض اخلاق اور ملکات نہایت اعلیٰ تھے، ان میں قبولِ حق کی اِستعداد بہت کامل تھی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء اللہ میں بیشتر لوگ قریش میں سے ہوئے ہیں۔ (مظہری) [۳]

رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ مکہ مکرمہ ایک ایسے مقام میں آباد ہے جہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی، وہاں باغات نہیں، جن کے پھل مکہ والوں کو مل سکیں، اسی لئے بانیٔ بیت اللہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ کے آباد ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا فرمائی تھی کہ اس شہر کو جائے امن بنادے اور اہلِ مکہ کو ثمرات کا رِزق عطا فرمائے: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (البقرة:۱۲۶)۔ اور باہر سے ہر طرح کے پھل یہاں لائے جایا کریں: يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ (القصص:۵۷)۔ اس لئے اہلِ مکہ کے معاش کا مدار اس پر تھا کہ وہ تجارت کے لئے سفر کریں اور اپنی ضروریات وہاں سے لائیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مکہ والے بڑے افلاس اور تکلیف

---

[۱] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآية، ج:۸ ص:۵۴۶، وجامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فی فضل النبی صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۲۰۱

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۴۷، وصحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب الناس تبع لقریش ...إلخ، ج:۲ ص:۱۱۹

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۴۷

میں تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ امجد ہاشم نے قریش کو اس کے لئے آمادہ کیا کہ دُوسرے ملکوں سے تجارت کا کام کریں، ملکِ شام ٹھنڈا ملک تھا، گرمی کے زمانے میں وہاں، اور یمن گرم ملک ہے، سردی کے زمانے میں اس طرف تجارتی سفر کرتے اور منافع حاصل کرتے تھے۔ اور چونکہ یہ لوگ بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے تمام عرب میں مقدس ومحترم مانے جاتے تھے تو یہ راستے کے ہر خطرے سے بھی محفوظ رہتے تھے۔ اور ہاشم چونکہ ان سب کے سردار مانے جاتے تھے، اُن کا طریقہ یہ تھا کہ اس تجارت میں جو منافع حاصل ہوتے، اُن کو قریش کے امیر وغریب سب میں تقسیم کردیتے تھے، یہاں تک کہ ان کا غریب آدمی بھی مال داروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے اُن پر یہ مزید احسان فرمایا کہ ہر سال کے دوسفروں کی زحمت سے بھی اس طرح بچادیا کہ مکہ مکرمہ سے ملے ہوئے علاقے یمن، تبالہ اور حرش کو اتنا سرسبز اور زرخیز بنادیا کہ وہاں کا غلہ ان کی ضرورت سے زائد ہونے کی بنا پر ان کو اس کی ضرورت پڑی کہ یہ غلات وہاں سے لاکر جدّہ میں فروخت کریں، چنانچہ اکثر ضروریاتِ زندگی جدّہ میں ملنے لگیں، مکہ والے ان طویل دوسفروں کے بجائے صرف دومنزل پر جاکر جدّہ سے سب سامان لانے لگے۔ آیتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے مکہ والوں پر اسی احسان وانعام کا ذِکر فرمایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ انعامات کا ذِکر کرنے کے بعد اُن کا شکر اَدا کرنے کے لئے قریش کو خصوصی خطاب کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کیا کرو۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رَبّ البیت ہونے کی صفت کو خصوصیت سے اس لئے ذِکر فرمایا کہ یہی بیت کعبہ اُن کے تمام فضائل اور برکات کا سرچشمہ تھا۔

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ اس میں قریشِ مکہ کے لئے دُنیا کی اُن تمام عظیم نعمتوں کو جمع فرمادیا ہے جو اِنسان کے خوش عیش رہنے کے لئے ضروری ہیں، اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ میں کھانے پینے کی ضروریات داخل ہیں، اور وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں دُشمنوں، ڈاکوؤں کے خوف سے مأمون ہونا بھی شامل ہے، اور آخرت کے عذاب سے مأمون ہونا بھی۔

فائدہ

ابنِ کثیر رحمہ اللہ [۱] نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس آیت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دُنیا میں بھی اَمن اور بے خوف وخطر رہنے کا سامان فرمادیتے ہیں اور آخرت میں بھی، اور جو اس سے انحراف کرے اُس سے یہ دونوں قسم کے امن سلب کرلئے جاتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۹۲، تحت هٰذه الآية.

یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (النحل) یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک بستی تھی جو مامون و محفوظ اور ہر خطرے سے مطمئن تھی، اس کا رزق ہر جگہ سے وافر آجاتا تھا، پھر اس بستی والوں نے اللہ کے اِنعامات کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کی پریشانی میں مبتلا کر دیا اُن کے کرتوت کی بنا پر۔

فائدۂ عظیمہ

ابوالحسن قزوینی نے فرمایا کہ جس شخص کو کسی دُشمن یا اور کسی مصیبت کا خوف ہو، اس کے لئے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا پڑھنا امان ہے۔ اس کو اِمام جزری نے نقل کر کے فرمایا کہ یہ عمل آزمودہ اور مجرّب ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ مجھے میرے شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے خوف و خطر کے وقت اس سورت کے پڑھنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ ہر بلا و مصیبت کے دفع کرنے کے لئے اس کی قراءت مجرّب ہے۔ حضرت قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ [1]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْقُرَیْشِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰی

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۴۸

سُورَةُ المَاعُون

آیاتها ۷ | ۱۰۷ سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ ۱۷ | رکوعها ۱

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢

تو نے دیکھا اُس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو،

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ

اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر، پھر خرابی ہے اُن نمازیوں کی، جو

هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦

اپنی نماز سے بے خبر ہیں، وہ جو دِکھلاوا کرتے ہیں،

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ ع

ع ۷ ۳۲

اور مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کیاتم نے اُسے دیکھا جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ (۱) وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے (۲) اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ (۳) پھر بڑی خرابی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کی جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، (۴)۔ (۵) جو دِکھاوا کرتے ہیں (۶) اور دُوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں۔ (۷)

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے سو (آپ اس کا حال سننا چاہیں تو سنئے کہ) وہ شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور محتاج کو کھانا دینے کی (دُوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا (یعنی وہ ایسا سنگ دِل ہے کہ خود تو وہ کسی غریب کو کیا دیتا دُوسروں کو بھی اس پر آمادہ نہیں کرتا، اور جب بندوں کا حق ضائع کرنا ایسا بُرا ہے تو خالق کا حق ضائع کرنا تو اور زیادہ بُرا ہے) سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے (کیونکہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ سب کے سامنے ظاہر کر کے دے اس لئے اس کو بالکل نہ دینے سے بھی کوئی اعتراض نہیں کرسکتا، بخلاف نماز کے وہ جماعت کے ساتھ علانیہ ادا کی جاتی ہے، اس کو بالکل چھوڑ دے تو سب پر نفاق ظاہر ہو جائے، اس لئے نماز کو محض دِکھلاوے کے لئے پڑھ لیتا ہے)۔

معارف و مسائل

اس سورت میں کفار و منافقین کے بعض افعالِ قبیحہ مذمومہ کا ذِکر اور اُن پر جہنم کی وعید ہے، یہ افعال اگر کسی مؤمن سے سرزد ہوں جو تکذیب نہیں کرتا، وہ بھی اگرچہ شرعاً مذموم اور سخت گناہ ہیں، مگر وعیدِ مذکور اُن پر نہیں ہے، اسی لئے ان افعال و اعمال سے پہلے ذِکر اُس شخص کا فرمایا ہے جو دِین اور قیامت کا منکر ہے، اس کی تکذیب کرتا ہے، اس میں اشارہ

اس طرف ضرور ہے کہ یہ اعمال جن کا ذِکر آگے آرہا ہے مؤمن کی شان سے بعید ہیں، وہ کوئی منکر کافر ہی کرسکتا ہے، وہ اعمالِ قبیحہ جن کا اس جگہ ذِکر اس سورت میں فرمایا ہے، یہ ہیں: یتیم کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی توہین، مسکین محتاج کو باوجود قدرت کے کھانا نہ دینا اور دُوسروں کو اس کی ترغیب نہ دینا۔ نماز پڑھنے میں رِیاکاری کرنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، یہ سب افعال اپنی ذات میں بھی بہت مذموم اور سخت گناہ ہیں، اور جب کفر و تکذیب کے نتیجے میں یہ افعال سرزد ہوں تو ان کا وبال دائمی جہنم ہے، جیسا کہ اس سورت میں اس کو وَيْل کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ④ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ⑤ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ⑥ یہ حال منافقین کا بیان فرمایا ہے، جو لوگوں کو دِکھلانے اور اپنے دعوائے اسلام کو ثابت کرنے کے لئے نماز تو پڑھتے ہیں، مگر چونکہ وہ نماز کی فرضیت ہی کے معتقد نہیں اس لئے نہ اوقات کی پابندی کرتے ہیں، نہ اصل نماز کی، جہاں دِکھلانے کا موقع ہوا پڑھ لی، ورنہ ترک کردی۔ عَنْ صَلَاتِهِمْ میں لفظ عَنْ کا مفہوم یہی ہے کہ اصل نماز ہی سے بے پروائی اختیار کرے، جو منافقین کی عادت ہے، اور نماز کے اندر کچھ سہو و نسیان ہو جانا جس سے کوئی مسلمان یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خالی نہیں، وہ اس کلمے کی مراد نہیں ہے، کیونکہ اُس پر وعید ویل جہنم کی نہیں ہوسکتی، اور اگر یہ مراد ہوتی تو عَنْ صَلَاتِهِمْ کے بجائے فِي صَلَاتِهِمْ فرمایا جاتا، احادیثِ صحیحہ میں متعدّد مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں سہو واقع ہونا ثابت ہے۔

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ⑦ مـاعـون کے اصل لفظی معنی شئ قلیل و حقیر کے ہیں، اس لئے ماعون ایسی استعمالی اشیاء کو کہا جاتا ہے جو عادۃً ایک دُوسرے کو عاریۃً دی جاتی ہیں، اور جن کا باہم لین دین عام انسانیت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے، جیسے کلہاڑی، پھاوڑہ، یا کھانے پکانے کے برتن جن کا ضرورت کے وقت پڑوسیوں سے مانگ لینا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اور جو اس میں دینے سے بخل کرے وہ بڑا کنجوس، کمینہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر آیتِ مذکورہ میں لفظ مـاعون سے مراد زکوٰۃ ہے، اور زکوٰۃ کو مـاعون اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ مقدار کے اعتبار سے نسبۃً بہت قلیل ہے، یعنی صرف چالیسواں حصہ۔ حضرت علی، ابن عمر رضی اللہ عنہم، حسن بصری، قتادہ، ضحاک رحمہم اللہ، وغیرہ جمہور مفسرین نے اس آیت میں ماعون کی تفسیر زکوٰۃ ہی سے کی ہے۔ (مظہری) [1] اور اس کے نہ دینے پر جو عذاب ویل جہنم کا مذکور ہے، وہ بھی ترکِ فرض پر ہی ہوسکتا ہے۔ اشیائے استعمال کا دُوسروں کو دینا بہت بڑا ثواب اور اِنسانیت و مروّت کے لحاظ سے ضروری سہی، مگر فرض و واجب نہیں، جس کے روکنے پر جہنم کی وعید ہو، اور بعض روایاتِ حدیث میں جو اس جگہ مـاعـون کی تفسیر استعمالی اشیاء اور برتنوں سے کی گئی ہے، [2] اس کا مطلب ان لوگوں کی انتہائی خست کا اِظہار ہے کہ یہ زکوٰۃ تو کیا دیتے استعمالی اشیاء جن کے دینے میں اپنا کچھ خرچ نہیں ہوتا، اس میں بھی کنجوسی کرتے ہیں۔ تو وعید صرف ان اشیاء کے نہ دینے پر نہیں، بلکہ زکوٰۃِ فرض کی عدم ادائیگی اور اس کے ساتھ مزید بخلِ شدید پر ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۵۰

[2] سنن ابی داود، کتاب الزکاة، باب في حقوق المال، رقم الحديث:۱۶۵۷، ج:۱ ص:۲۳۴، والسُّنن الکبریٰ للنَّسائي، رقم الحديث: ۱۱۷۰۱

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

آیاتها ۳ | ۱۰۸ سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ ۱۵ | رکوعها ۱

سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ

بے شک ہم نے دی تجھ کو کوثر، سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر بے شک جو دشمن ہے تیرا

هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

وہی رہ گیا پیچھا کٹا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

(اے پیغمبر!) یقین جانو ہم نے تمہیں کوثر عطا کردی ہے، ① لہٰذا تم اپنے پروردگار (کی خوشنودی) کے لئے نماز پڑھو، اور قربانی کرو، ② یقین جانو تمہارا دُشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے۔ ③

خلاصۂ تفسیر

بے شک ہم نے آپ کو کوثر (جنت کے ایک حوض کا نام بھی ہے، اور ہر خیرِ کثیر بھی اس میں شامل ہے) عطا فرمائی ہے، (جس میں دُنیا وآخرت کی ہر خیر و بھلائی شامل ہے، دُنیا میں دِینِ اسلام کی بقا و ترقی اور آخرت میں جنت کے درجاتِ عالیہ سب داخل ہیں) سو (ان نعمتوں کے شکر میں) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھئے (کیونکہ سب سے بڑی نعمت کے شکر میں سب سے بڑی عبادت چاہئے اور وہ نماز ہے) اور (تکمیلِ شکر کے لئے جسمانی عبادت کے ساتھ مالی عبادت یعنی اُسی کے نام کی) قربانی کیجئے (جیسا دُوسری آیتوں میں عموماً نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہے، اس میں زکوٰۃ کے بجائے قربانی کا ذِکر شاید اس لئے اختیار کیا گیا کہ قربانی میں مالی عبادت ہونے کے علاوہ مشرکین اور مشرکانہ رُسوم کی عملی مخالفت بھی ہے کیونکہ مشرکین بتوں کے نام کی قربانی کیا کرتے تھے۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم کی بچپن میں وفات پر بعض مشرکین نے جو یہ طعنہ دیا تھا کہ ان نسل نہ چلے گی اور اُن کے دِین کا سلسلہ جلد ختم ہوجائے گا، اس کا جواب ہے کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ بے نام ونشان نہیں ہیں، بلکہ) بالیقین آپ کا دُشمن ہی بے نام ونشان ہے (خواہ ظاہری نسل اس دُشمن کی چلے یا نہ چلے، لیکن دُنیا میں اس کا ذِکرِ خیر باقی نہیں رہے گا، بخلاف آپ کے کہ آپ کی اُمت اور آپ کی یادِ نیک نامی، محبت واعتقاد کے ساتھ باقی رہے گی، اور یہ سب نعمتیں لفظ کوثر کے مفہوم میں داخل ہیں، اگر پسری اولاد کی نسل نہ ہو، نہ سہی، جو نسل سے مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے، یہاں تک کہ دُنیا سے گزر کر آخرت تک بھی، اور دُشمن اس سے محروم ہے)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

اِبنِ ابی حاتم نے سدّی سے اور بیہقی نے دلائلِ نبوّت میں حضرت محمد بن علی بن حسین رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ

جس شخص کی اولادِ ذکور مر جائے اُس کو عرب میں اَبْتَر کہا کرتے تھے، یعنی مقطوع النسل۔ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم یا ابراہیم کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تو کفارِ مکہ آپ کو اَبْتَر کہہ کر طعنہ دینے لگے، ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل کا نام خاص طور پر ذِکر کیا جاتا ہے، اس کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذِکر کیا جاتا تو کہتا تھا کہ اُن کی بات چھوڑو، یہ کچھ فکر کرنے کی چیز نہیں، کیونکہ وہ اَبْتَر (مقطوع النسل) ہیں، جب اُن کا انتقال ہو جائے گا، اُن کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (رواہ البغوی، ابن کثیر ومظہری)[1]

اور بعض روایات میں ہے کہ کعب بن اشرف یہودی ایک مرتبہ مکہ مکرمہ آیا تو قریشِ مکہ اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو کہتا ہے کہ وہ ہم سب سے (دِین کے اعتبار سے) بہتر ہے، حالانکہ ہم حجاج کی خدمت کرنے والے، اور بیت اللہ کی حفاظت کرنے والے، اور لوگوں کو پانی پلانے والے ہیں۔ کعب نے یہ سن کر کہا کہ نہیں تم لوگ اس سے بہتر ہو۔ اس پر یہ سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (ذکرہ ابن کثیر عن البزار باسناد صحیح وقد رواہ مسلم قالہ مظہری)[2]

خلاصہ یہ ہے کہ کفارِ مکہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسری اولاد نہ ہونے کے سبب اَبتر ہونے کے طعنے دیتے تھے، یا دُوسری وجوہ سے آپ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، اُن کے جواب میں سورۂ کوثر نازل ہوئی ہے، جس میں اُن کے طعنوں کا جواب بھی ہے کہ صرف اولادِ نرینہ کے نہ رہنے سے آپ کو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر کہنے والے حقائق سے بے خبر ہیں۔ آپ کی نسل نسبی بھی ان شاء اللہ دُنیا میں تا قیامت باقی رہے گی، اگرچہ دُختری اولاد سے ہو، اور نسل معنوی یعنی آپ پر ایمان لانے والے مسلمان جو درحقیقت نبی کی اولادِ معنوی ہوتے ہیں، وہ تو اس کثرت سے ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کے نزدیک مقبول اور مکرم و معظم ہونا بھی مذکور ہے، جس سے کعب بن اشرف کے قول کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ سب مضمون سورت کی تیسری آیت میں آیا ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا کہ: "کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔" ابنِ عباس کے خاص شاگرد سعید بن جبیر سے کسی نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے، تو سعید بن جبیر نے جواب دیا کہ (ابنِ عباس کا قول اس کے

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۵۱، وتفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۰۴

[2] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۵۱، وتفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۰۴، وصحیح ابن حبان، کتاب التاریخ، ذکر تسمیۃ المشرکین صفی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ...الخ، رقم الحدیث:۶۶۹۲

منافی نہیں، بلکہ) وہ نہرِ جنت جس کا نام کوثر ہے، وہ بھی اس خیرِ کثیر میں داخل ہے۔ اسی لئے امام تفسیر مجاہد نے "کوثر" کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ دُنیا و آخرت دونوں کی خیرِ کثیر ہے، اس میں جنت کی خاص نہر کوثر بھی داخل ہے۔

حوضِ کوثر

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

بَيْنَا رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَظْهُرِنَا فِي الْمَسْجِدِ اِذْ اُغْفِيَ اِغْفَاءَةً ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ مُتَبَسِّمًا۔ قُلْنَا: مَا اَضْحَكَكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ: لَقَدْ اُنْزِلَتْ عَلَيَّ آنِفًا سُوْرَةٌ فَقَرَاَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① ...اِلخ، ثُمَّ قَالَ: اَتَدْرُوْنَ مَا الْكَوْثَرُ قُلْنَا: اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ: فَاِنَّهٗ نَهْرٌ وَعَدَنِيْهِ رَبِّيْ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ خَيْرٌ كَثِيْرٌ وَهُوَ حَوْضٌ تَرِدُ عَلَيْهِ اُمَّتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، آنِيَتُهٗ عَدَدَ نُجُوْمٍ فِي السَّمَآءِ فَيُخْتَلَجُ الْعَبْدُ مِنْهُمْ، فَاَقُوْلُ: رَبِّ اِنَّهٗ مِنْ اُمَّتِيْ فَيَقُوْلُ: اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثَ بَعْدَكَ۔ [1]

ایک روز جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہمارے درمیان تھے، اچانک آپ پر ایک قسم کی نیند یا بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی، پھر ہنستے ہوئے آپ نے سر مبارک اُٹھایا، ہم نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے، تو فرمایا کہ مجھ پر اسی وقت ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے بسم اللہ کے ساتھ سورۂ کوثر پڑھی، پھر فرمایا تم جانتے ہو کوثر کیا چیز ہے، ہم نے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلم آپ نے فرمایا یہ ایک نہرِ جنت ہے، جس کا میرے رَبّ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، جس میں خیرِ کثیر ہے، اور وہ حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز پانی پینے کے لئے آئے گی۔ اس کے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے، اس وقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دیں گے تو میں کہوں گا کہ میرے پروردگار یہ تو میری اُمت میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ اس نے آپ کے بعد کیا نیا دِین اختیار کیا ہے۔

اِبنِ کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے مزید لکھا ہے:

وَقَدْ وَرَدَ فِيْ صِفَةِ الْحَوْضِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَّهٗ يَشْخَبُ فِيْهِ مِيْزَابَانِ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ نَهَرٍ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجۃ من قال البسملۃ آیۃ من اوّل کل سورۃ ...اِلخ، ج: ١ ص: ١٧٢، وسنن الکبریٰ للنّسائی، رقم الحدیث: ٩١٧

الْكَوْثَرِ وَاِنَّ آنِيَتَهٗ عَدَدَ نُجُوْمِ السَّمَاءِ۔ [۱]

حوض کی صفت میں روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے، جو نہرِ کوثر کے پانی سے حوض کو بھر دیں گے، اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔

اس حدیث سے سورۂ کوثر کا سببِ نزول بھی معلوم ہوا اور لفظ ''کوثر'' کی صحیح تفسیر بھی یعنی خیرِ کثیر، اور یہ بھی کہ اس خیرِ کثیر میں وہ حوضِ کوثر بھی شامل ہے جو قیامت میں اُمتِ محمدیہ کو سیراب کرے گی۔ نیز اس روایت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اصل نہرِ کوثر جنت میں ہے، اور یہ حوضِ کوثر میدانِ حشر میں ہوگی، اس میں دو پرنالوں کے ذریعے نہرِ کوثر کا پانی ڈالا جائے گا۔ اس میں اُن روایات کی بھی تطبیق ہوگئی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر پر اُمت کا ورود دُخولِ جنت سے پہلے ہوگا، اور اس حدیث میں جو بعض لوگوں کو حوضِ کوثر سے ہٹا دینے کا ذِکر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو بعد میں اسلام سے پھر گئے، یا پہلے ہی مسلمان نہیں تھے مگر منافقانہ اِظہارِ اسلام کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کا نفاق کھل گیا۔ واللہ اعلم۔

احادیثِ صحیحہ میں حوضِ کوثر کے پانی کی صفائی اور شیرینی اور اُس کے کناروں کا جواہرات سے مرصع ہونے کے متعلق ایسے اوصاف مذکور ہیں کہ دُنیا میں ان کا کسی چیز پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس سورت کا نزول اگر کفار کے طعنوں کے دفاع میں ہو، جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا کہ آپ کی اولادِ نرینہ فوت ہو جانے کی وجہ سے آپ کو اَبتر مقطوع النسل قرار دے کر کہا کرتے تھے کہ اِن کا کام چندروزہ ہے، پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ تو اس سورت میں آپ کو کوثر عطا فرمانے کا ذِکر جس میں حوضِ کوثر بھی شامل ہے، ان طعنہ زنوں کی مکمل تردید ہے کہ ان کی نسل ونسب صرف یہی نہیں کہ دُنیا کی عمر تک چلے گی، بلکہ اُن کی رُوحانی اولاد کا رِشتہ محشر میں بھی محسوس ہوگا، جہاں وہ تعداد میں بھی تمام اُمتوں سے زیادہ ہوں گے، اور ان کا اِعزاز واِکرام بھی سب سے زیادہ ہوگا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنْحَرْ، نَحْرٌ سے مشتق، اُونٹ کی قربانی کو نحر کہا جاتا ہے، جس کا مسنون طریقہ اس کا پاؤں باندھ کر حلقوم میں نیزہ یا چھری مار کر خون بہا دینا ہے، جیسا کہ گائے بکری وغیرہ کی قربانی کا طریقہ ذبح کرنا، یعنی جانور کو لٹا کر حلقوم پر چھری پھیرنا ہے۔ عرب میں چونکہ عموماً قربانی اُونٹ کی ہوتی تھی اس لئے قربانی کرنے کے لئے یہاں لفظ وَانْحَرْ استعمال کیا گیا۔ بعض اوقات لفظ نحر مطلقاً قربانی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں کفار کے زعمِ باطل کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر یعنی دُنیا وآخرت کی ہر خیر اور وہ بھی کثیر مقدار میں عطا فرمانے کی خوشخبری سنانے کے بعد اس کے شکر کے طور پر آپ کو دو چیزوں کی ہدایت کی گئی ہے: ایک نماز، دُوسرے قربانی۔ نماز بدنی اور جسمانی عباداتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے، اور قربانی مالی عباداتوں میں اس بنا پر خاص امتیاز اور اہمیت

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۴۹۸

رکھتی ہے کہ اللہ کے نام پر قربانی کرنا بت پرستی کے شعار کے خلاف ایک جہاد بھی ہے، کیونکہ اُن کی قربانیاں بتوں کے نام پر ہوتی تھیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم کی ایک اور آیت میں بھی نماز کے ساتھ قربانی کا ذِکر فرمایا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ [۱] (الانعام) اس آیت میں وَانْحَرْ کے معنی قربانی ہونا حضرت ابنِ عباس، عطا، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ سے مستند روایات میں ثابت ہے۔ بعض لوگوں نے جو وَانْحَرْ کے معنی نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے بعض ائمۂ تفسیر کی طرف منسوب کئے ہیں، اس کے متعلق ابنِ کثیر نے فرمایا کہ روایت منکر (نا قابلِ اعتبار) ہے۔ [۲]

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾ لفظ شَانِیء کے معنی بغض رکھنے والے، عیب لگانے والے کے ہیں۔ یہ آیت اُن کفار کے متعلق نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبتر مقطوع النسل ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ اکثر روایات میں عاص بن وائل، بعض میں عقبہ، بعض میں کعب بن اشرف اس کے مصداق ہیں۔ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر یعنی خیرِ کثیر عطا کی، جس میں اولادِ کثیر بھی داخل ہے، آپ کے لئے اولاد کی کثرت اس لحاظ سے ہے کہ نسبی اولاد بھی آپ کی ماشاء اللہ کچھ کم نہیں، اور پیغمبر چونکہ پوری اُمت کا باپ ہوتا ہے، اور پوری اُمت اُس کی اولادِ رُوحانی، اور آپ کی اُمت پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے تعداد میں زیادہ ہوگی۔ ایک طرف تو ان دُشمنوں کی بات کو اس طرح خاک میں ملادیا، دُوسری طرف یہ بھی فرمادیا کہ جو لوگ آپ کو اَبتر ہونے کا طعنہ دیتے ہیں وہی اَبتر ہیں۔

عبرت

اب غور کیجئے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذِکر کو حق تعالیٰ نے کیسی رفعت اور عظمت عطا فرمائی کہ آپ کے عہدِ مبارک سے آج تک پوری دُنیا کے چپے چپے پر آپ کا نامِ مبارک پانچ وقت اللہ کے نام کے ساتھ میناروں پر پکارا جاتا ہے، اور آخرت میں آپ کو شفاعتِ کبریٰ کا مقامِ محمود حاصل ہوگا، اس کے بالمقابل دُنیا کی تاریخ سے پوچھئے کہ عاص بن وائل، عقبہ، کعب کی اولاد کہاں اور ان کا خاندان کیا ہوا، خود ان کا نام بھی اسلامی روایات سے تفسیرِ آیات کے ذیل میں محفوظ ہوگیا، ورنہ دُنیا میں آج اُن کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ

---

[۱] ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۰۳

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

اٰیاتھا ۶ ۱۰۹ سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ ۱۸ رکوعھا ۱

سورۂ کافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ

تو کہہ اے منکرو میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجو

مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ

جس کو میں پوجوں، اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم کو پوجنا ہے

مَاۤ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

اس کا جس کو میں پوجوں، تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

تم کہہ دو کہ: ''اے حق کا اِنکار کرنے والو! ① میں اُن چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، ② اور تم اُس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، ③ اور نہ میں (آئندہ) اُس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم کرتے ہو، ④ اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ ⑤ تمہارے لئے تمہارا دِین ہے، اور میرے لئے میرا دِین۔ ⑥

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان کافروں سے) کہہ دیجئے کہ اے کافرو (میرا تمہارا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا، اور) نہ (تو فی الحال) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو، اور نہ (آئندہ اِستقبال میں) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کروگے (مطلب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ میں موحد ہوکر شرک نہیں کرسکتا، نہ اب، نہ آئندہ، اور تم مشرک ہوکر موحد نہیں قرار دیئے جاسکتے، نہ اب، نہ آئندہ، یعنی توحید و شرک جمع نہیں ہوسکتے) تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا (اس میں اُن کے شرک پر وعید بھی سنادی گئی)۔

معارف ومسائل

سورت کے فضائل اور خواص

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لئے دو سورتیں بہتر ہیں: سورۂ کافرون اور سورۂ اِخلاص۔ (رواہ ابن ھشام، مظہری) [1] اور تفسیر ابن کثیر [2] میں متعدّد صحابہ سے منقول ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور بعد مغرب کی سنتوں میں بکثرت یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ بعض صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی دُعا بتا دیجئے جو ہم

---

[1] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۵۵

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۰۶، وصحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب استحباب رکعتی سُنّة الفجر ...إلخ، ج:۱ ص:۲۵۰

سونے سے پہلے پڑھا کریں۔ آپ نے قُلْ يَاۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھنے کی تلقین فرمائی، اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔ (رواہ الترمذی وابوداود) [۱] اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب سفر میں جاؤ تو وہاں تم اپنے سب رُفقا سے زیادہ خوش حال، بامراد رہو اور تمہارا سامان زیادہ ہوجائے، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بے شک میں ایسا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آخر قرآن کی پانچ سورتیں: سورۂ کافرون، سورۂ نصر، سورۂ اِخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھا کرو، اور ہر سورت کو بسم اللہ سے شروع کرو اور بسم اللہ ہی پر ختم کرو۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُس وقت سے میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دُوسرے ساتھیوں کے بالمقابل قلیل الزاد، خستہ حال ہوتا تھا، جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم پر عمل کیا، میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا۔ (مظہری بحوالہ ابویعلیٰ) [۲] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے پانی اور نمک منگایا اور یہ پانی کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور قُلْ يَاۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے جاتے تھے۔ (مظہری) [۳]

شانِ نزول

اِبنِ اسحاق کی روایت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور اَسود بن عبدالمطلب اور اُمیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آؤ ہم آپس میں اس پر صلح کرلیں کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی عبادت کیا کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ (قرطبی) [۴] اور طبرانی کی روایت حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اوّل تو باہمی مصالحت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ صورت پیش کی کہ ہم آپ کو اتنا مال دیتے ہیں کہ آپ سارے مکہ میں سب سے زیادہ مال دار ہوجائیں، اور جس عورت سے آپ چاہیں آپ کا نکاح کردیں، آپ صرف اتنا کریں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہا کریں، اور اگر آپ یہ بھی نہیں مانتے تو ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب منه، فصل ما جاء فیمن یقرأ القرآن عند المنام، ج:۲ ص:۱۷۷، وسنن ابی داود، کتاب الأدب، باب ما یقال عند النوم۔

[۲] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۵۵، ومسند ابی یعلی الموصلی، رقم الحدیث:۷۴۵۳، حدیث جبیر بن مطعم عن النبی صلی الله علیه وسلم، ومجمع الزوائد، کتاب الأذکار، باب ما تحصل به البرکة فی الزاد، رقم الحدیث:۱۷۱۱۲

[۳] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۵۵

[۴] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۲۷ تحت هذه الآیة۔

عبادت کیا کریں۔ (مظہری) [۱]

اور ابو صالح کی روایت حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے باہمی مصالحت کے لئے یہ صورت پیش کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں میں سے بعض کو صرف ہاتھ لگا دیں تو ہم آپ کی تصدیق کرنے لگیں گے۔ اس پر جبریلِ امین علیہ السلام سورۂ کافرون لے کر نازل ہوئے، جس میں کفار کے اعمال سے براءت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم ہے۔ شانِ نزول میں جو متعدّد واقعات بیان ہوئے ہیں، اُن میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ واقعات سب ہی پیش آئے ہوں اور ان سب کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی ہو، جس کا حاصل ایسی مصالحت سے روکنا ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ الآیۃ، اس سورت میں یہ چند کلمات مکرّر آئے ہیں، اس تکرار کو رفع کرنے کے لئے ایک تفسیر تو وہ ہے جس کو بخاری نے بہت سے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ دو کلمے ایک مرتبہ زمانۂ حال کے لئے، اور دُوسری مرتبہ زمانۂ مستقبل کے متعلق آئے ہیں، اس لئے کوئی تکرار نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو بالفعل ایسا ہو رہا ہے کہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں اور تم میرے معبود کی عبادت کرو، اور نہ آئندہ ایسا ہوسکتا ہے کہ میں اپنی توحید پر، تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے ایک دُوسرے کے معبود کی عبادت کریں۔ اسی تفسیر کو حضرت حکیم الامت نے تفسیر بیان القرآن [۲] میں اختیار فرمایا ہے، جو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے، مگر بخاری کی تفسیر میں لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ کی تفسیر دِین بمعنی مذہب اسلام و کفر سے کی ہے، اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مصالحت کی مجوّزہ صورت قابلِ قبول نہیں، میں تو اپنے دِین پر قائم ہوں ہی، تم بھی اپنے دِین پر مصر ہو تو تم جانو، اس کا انجام تمہیں بھگتنا ہے۔ اور بیان القرآن میں دِین کو بمعنی جزا قرار دیا ہے۔

دُوسری تفسیر وہ ہے جس کو ابنِ کثیر نے اِختیار فرمایا ہے کہ حرف مَا لغتِ عرب میں جیسا اسم موصول الَّذِیْ کے معنی میں آتا ہے، ایسا ہی کبھی مصدری معنی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ وہ جس فعل پر داخل ہو اس کو بمعنی مصدر کر دیتا ہے، اس سورت میں پہلی جگہ تو حرف مَا اسمِ موصول الَّذِیْ کے معنی میں ہے اور دُوسری جگہ مَا مصدریہ ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے جملے: لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ کے معنی یہ ہوئے کہ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا، اور جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم نہیں کرتے۔ اور دُوسرے جملے: وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ میں حرف مَا مصدریہ ہے، اور معنی یہ ہیں: ''لَا اَنَا عَابِدٌ عِبَادَتَكُمْ، وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ عِبَادَتِيْ'' یعنی ہماری اور تمہاری عبادت کے طریقے ہی الگ الگ ہیں، میں تمہارے طرز کی عبادت نہیں کرسکتا، اور تم جب تک ایمان نہ لاؤ تو میرے طرز کی عبادت نہیں کرسکتے۔ اس طرح پہلے جملے میں معبودوں کا

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۱۰ ص:۳۵۴، والمعجم الصغیر للطبرانی، رقم الحدیث:۷۵۲

[۲] تفسیر بیان القرآن، تحت هذه الآیة ج:۱۲ ص:۱۲۲

اختلاف بتلایا اور دُوسرے جملے میں عبادت کے طرز وطریقے کے اختلاف کو ظاہر کیا۔ حاصل یہ ہوا کہ نہ تمہارے اور ہمارے معبود میں اشتراک ہے، نہ طریقِ عبادت میں، اس طرح تکرار رفع ہوا اور طریقِ عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا وہ ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلایا گیا اور مشرکین کے طریقے خود ساختہ ہیں۔

ابنِ کثیر نے اس تفسیر کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کلمۂ اسلام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے یہی مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور طریقِ عبادت وہ معتبر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۞ کی تفسیر میں ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے دُوسری جگہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ [1] (یونس:۴۱)، اور دُوسری جگہ ہے: لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ [2] (الشوریٰ:۱۵) اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ دِین کو ابنِ کثیر نے اعمالِ دِین کے معنی میں لیا ہے، اور پھر مقصود اس سے وہی ہوگا جو بیان القرآن میں بیان کیا گیا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کی جزا، سزا خود بھگتنی پڑے گی۔

اور بعض مفسرین نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی کہ حرف مَا دونوں جگہ موصولہ ہی ہے، اور حال و استقبال کا بھی فرق نہیں، بلکہ یہ دو جملے فی المواقع مکرّر لائے گئے ہیں، مگر ہر تکرار بُرا نہیں ہوتا، بہت جگہ تکرار تقاضائے بلاغت ہوتا ہے، جیسا کہ: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۞ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۞ [3] (الم نشرح) میں ہے۔ یہاں اس تکرار کا مقصد تاکیدِ مضمون بھی ہے اور یہ بھی کہ کفار کی طرف سے چونکہ ایسی مصالحت کی پیش کش متعدّد مرتبہ کی گئی تو متعدّد جملوں سے اُس کو رَدّ کیا گیا۔ (نقله ابن جرير، ابن كثير) [4]

کفار سے معاہدۂ صلح کی بعض صورتیں جائز ہیں، بعض ناجائز

سورۂ کافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی چند صورتوں کو بالکلیہ رَدّ کر کے اعلانِ براءت کیا گیا، مگر خود قرآنِ کریم میں یہ ارشاد بھی موجود ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال:۶۱) یعنی کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی جھک جایئے (یعنی معاہدۂ صلح کر لیجئے) اور مدینہ طیبہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو یہودِ مدینہ سے آپ کا معاہدۂ صلح مشہور و معروف ہے، اس لئے بعض مفسرین نے سورۂ کافرون کو منسوخ کہہ دیا اور منسوخ کہنے کی بڑی وجہ آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۞ کو قرار دیا ہے، کیونکہ بظاہر یہ احکامِ جہاد کے منافی ہے، مگر صحیح یہ

[1] ترجمہ: تو یہ کہہ دیجئے کہ میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا۔

[2] ترجمہ: ہمارے عمل ہمارے لئے اور تمہارے عمل تمہارے لئے۔

[3] ترجمہ: سو بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے، بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۰۷، ۵۰۸

ہے کہ یہاں لَكُمْ دِيْنُكُمْ کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رکھنے کی ضمانت دے دی گئی، بلکہ اس کا حاصل وہی ہے جو لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (الشوریٰ:۱۵) کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے، اس لئے راجح اور صحیح جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں، جس قسم کی مصالحت سورۂ کافرون کے نزول کا سبب بنی وہ جیسے اُس وقت حرام تھی، آج بھی حرام ہے، اور جس صورت کی اجازت آیتِ مذکورہ میں آئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدۂ یہود سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اُس وقت جائز تھی، آج بھی جائز ہے، بات صرف موقع و محل کو سمجھنے اور شرائطِ صلح کو دیکھنے کی ہے، جس کا فیصلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمادیا ہے، جس میں کفار سے معاہدے کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثناء کا ارشاد ہے، وہ یہ ہے: ''اِلَّا صُلْحًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوْ حَرَّمَ حَلَالًا'' یعنی ہر صلح جائز ہے، بجز اُس صلح کے جس کی رُو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال، یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اب غور کیجئے کہ کفارِ مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں، اُن سب میں کم از کم کفر واسلام کی حدود میں التباس یقینی ہے، اور بعض صورتوں میں تو اُصولِ اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا ہے، ایسی صلح سے سورۂ کافرون نے اعلانِ براءت کر دیا، اور دُوسری جگہ جس صلح کو جائز قرار دیا اور معاہدۂ یہود سے اُس کی عملی صورت معلوم ہوئی، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں اُصولِ اسلام کا خلاف کیا گیا ہو، یا کفر واسلام کی حدود آپس میں ملتبس ہوئی ہوں۔ اسلام سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حسنِ سلوک، صلح وسالمیت کا داعی نہیں، مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے، خدا کے قانون اور اُصولِ دِین میں کسی صلح مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ

اٰیاتھا ۳ | ۱۱۰ سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۴ | رکوعھا ۱

سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ ① وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ، اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے

فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ ② فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ

دین میں غول کے غول، تو پاکی بول اپنے ربّ کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے،

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ ③

بے شک وہ معاف کرنے والا ہے

وقف النبی ع ۲۵

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے ① اور تم لوگوں کو دیکھ لو کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دِین میں داخل ہو رہے ہیں، ② تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، اور اُس سے مغفرت مانگو۔ یقین جانو وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔ ③

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے اور (اس فتح پر مرتب ہونے والے آثار یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دِین (اسلام) میں جوق جوق داخل ہوتا دیکھ لیں، تو (اُس وقت سمجھئے کہ مقصود دُنیا میں رہنے کا اور آپ کی بعثت کا جو تکمیلِ دِین تھا، وہ پورا ہو چکا، اور اَب سفرِ آخرت قریب ہے، اُس کے لئے تیاری کیجئے اور) اپنے رَبّ کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اُس سے مغفرت کی درخواست کیجئے (یعنی ایسے اُمور جو خلافِ اَولیٰ واقع ہوگئے اُن سے مغفرت مانگئے) وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

معارف ومسائل

یہ سورت باجماع مدنی ہے، اور اس کا نام "سُوْرَۃُ التَّوْدِیْع" بھی ہے، تَوْدِیْع کے معنی کسی کو رُخصت کرنے کے ہیں، اس سورت میں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو "سُوْرَۃُ التَّوْدِیْع" بھی کہا گیا۔

قرآن مجید کی آخری سورت اور آخری آیات

[1] صحیح مسلم میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ سورۂ نصر قرآن کی آخری سورت ہے۔ (قرطبی) مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی، بعض آیات کا نزول جو اس کے بعد ہونا بعض روایات میں ہے، وہ اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کی سب سے پہلی سورت اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ نازل ہوئی ہے، سورۂ اِقْرَاْ اور مُدَّثِّر وغیرہ کی چند آیات کا اس سے پہلے نازل ہونا اس کے منافی نہیں۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ سورت حجۃ الوداع میں نازل ہوئی، اس کے بعد آیت: اَلْیَوْمَ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۲۹

اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ [۱] (المائدۃ:۳) نازل ہوئی، ان دونوں کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا میں صرف اَسّی روز رہے، (اَسّی روز کے بعد وفات ہوگئی)۔ ان دونوں کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی، جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ شریف کے کُل پچاس دن رہ گئے تھے۔ اس کے بعد آیت: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ الآيۃ [۲] (التوبۃ:۱۲۸) نازل ہوئی، جس کے بعد عمرِ شریف کے کُل پینتیس روز باقی تھے۔ اس کے بعد آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ [۳] (البقرۃ:۲۸۱) نازل ہوئی، جس کے بعد صرف اکیس روز، اور مقاتل کی روایت میں صرف سات روز کے بعد وفات ہوگئی۔ (قرطبی) [۴]

اس پر سب کا اِتفاق ہے کہ اس آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ میں فتح سے فتحِ مکہ مراد ہے، اور اس میں اِختلاف ہے کہ یہ سورت فتحِ مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں، لفظ اِذَا جَآءَ سے بظاہر قبل فتح نازل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور رُوح المعانی میں بحرِ محیط سے ایک روایت بھی اس کے موافق نقل کی ہے، جس میں اس سورت کا نزول غزوۂ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا، اور خیبر کی فتح فتحِ مکہ سے مقدم ہونا معلوم ومعروف ہے، اور رُوح المعانی میں بہ سند عبد ابن حمید، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کے نزول کے بعد دو سال زندہ رہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اس کا نزول فتحِ مکہ سے پہلے ہوا، کیونکہ فتحِ مکہ سے وفات تک دو سال سے کم مدّت ہے۔ فتحِ مکہ رمضان ۸ھ ہجری میں ہوئی، اور وفات ربیع الاوّل ۱۱ھ ہجری میں۔ اور جن روایات میں اس کا نزول فتحِ مکہ یا حجۃ الوداع میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے، اُن کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت پڑھی ہوگی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ مزید تحقیق اس کی بیان القرآن [۵] میں مذکور ہے۔

متعدّد اَحادیثِ مرفوعہ اور آثارِ صحابہ میں ہے کہ اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آجانے کی طرف اشارہ ہے کہ اب آپ کی بعثت اور دُنیا میں قیام کا کام پورا ہوچکا، اب تسبیح واستغفار میں لگ جائیے۔ مقاتل کی روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے مجمع کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی، جن میں حضرت ابوبکر وعمر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم وغیرہ موجود تھے، سب اس کو سن کر خوش ہوئے

---

[۱] ترجمہ: آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا۔

[۲] ترجمہ: تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے۔

[۳] ترجمہ: اور اُس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے۔

[۴] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۳۳

[۵] تفسیر بیان القرآن ج:۱۲ ص:۱۲۲ و ۱۲۳

کہ اس میں فتحِ مکہ کی خوشخبری ہے، مگر حضرت عباسؓ رونے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ رونے کا کیا سبب ہے تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ اس میں تو آپ کی وفات کی خبر مضمر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ سے یہی مضمون روایت کیا ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب اس کو حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا کہ اس سورت کے مفہوم سے میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ (رواہ الترمذی، وقال: حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، قرطبی) [1]

وَرَاَیْتَ النَّاسَ، فتحِ مکہ سے پہلے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام کی حقانیت پر تقریباً یقین ہو چکا تھا، مگر اسلام میں داخل ہونے سے ابھی تک قریش کی مخالفت کے خوف سے یا کسی تذبذب کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے۔ فتحِ مکہ نے وہ رُکاوٹ دُور کر دی تو فوج فوج ہو کر یہ لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یمن سے سات سو نفر مسلمان ہو کر پہنچے، جو راستے میں اَذانیں دیتے اور قرآن پڑھتے ہوئے آئے۔ اسی طرح عام عرب فوج فوج ہو کر داخلِ اسلام ہوئے۔

جب موت قریب محسوس ہو تو تسبیح و اِستغفار کی کثرت چاہئے

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دُعا کرتے تھے: "سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ۔" (رواہ البخاری) [2]

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے ہر وقت میں یہ دُعا پڑھتے تھے: "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ" اور فرماتے تھے کہ مجھے اس کا حکم کیا گیا، اور دلیل میں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ کی تلاوت فرماتے تھے۔ [3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت میں بڑا مجاہدہ فرمایا، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں وَرَم کر گئے۔ (قرطبی) [4]

تَمَّتْ سُوْرَةُ النَّصْرِ بِحَمْدِ اللهِ تَعَالٰى

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۳۲، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النصر، ج:۲ ص:۷۴۲، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الفتح ج:۲ ص:۱۷۳

[2] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ النصر، ج:۲ ص:۷۴۲

[3] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرُّکوع والسُّجود، ج:۱ ص:۱۹۱

[4] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۳۲

سُوْرَۃُ اللَّهَب

اٰیاتھا ۵ ۱۱۱ سُوْرَۃُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ ٦ رکوعہا ۱

سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ، کام نہ آیا اس کو مال اُس کا اور نہ جو اُس نے کمایا،

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤

اب پڑے گا ڈیگ مارتی آگ میں، اور اُس کی جورو، جو سر پر لئے پھرتی ہے ایندھن،

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥ ع

اُس کی گردن میں رسّی ہے مونجھ کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

ہاتھ ابولہب کے برباد ہوں، اور وہ خود برباد ہو چکا ہے، ① اُس کی دولت اور اُس نے جو کمائی کی تھی، وہ اُس کے کچھ کام نہیں آئی۔ ② وہ بھڑکتے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا، ③ اور اُس کی بیوی بھی، لکڑیاں ڈھوتی ہوئی، ④ اپنی گردن میں مونجھ کی رسّی لئے ہوئے۔ ⑤

خلاصۂ تفسیر

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔ نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا اور نہ اُس کی کمائی (مال سے مراد اصل سرمایہ، اور کمائی سے مراد اس کا نفع ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی سامان اُس کو ہلاکت سے نہ بچائے گا، یہ حالت تو اس کی دُنیا میں ہوئی، اور آخرت میں) وہ عنقریب (یعنی مرتے ہی) ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا، وہ بھی اور اُس کی بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے (مراد خار دار لکڑیاں ہیں جن کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں بچھا دیتی تھی، تاکہ آپ کو تکلیف پہنچے۔ اور دوزخ میں پہنچ کر) اُس کے گلے میں (دوزخ کی زنجیر اور طوق ہوگا کہ گویا وہ) ایک رسّی ہوگی خوب بٹی ہوئی (تشبیہ شدّت اور اِستحکام میں ہے)۔

معارف و مسائل

ابولہب کا اصلی نام عبدالعزّیٰ تھا، یہ عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہے، سرخ رنگ ہونے کی وجہ سے اس کی کنیت ابولہب مشہور تھی۔ قرآنِ کریم نے اس کا اصلی نام اس لئے چھوڑا کہ وہ نام بھی مشرکانہ تھا، اور ابولہب کنیت میں، لہب جہنم سے ایک مناسبت بھی تھی۔ یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد دُشمن اور اِسلام کا شدید مخالف، آپ کو سخت اِیذائیں دینے والا تھا، جب آپ لوگوں کو اِیمان کی دعوت دیتے، یہ ساتھ لگ جاتا اور آپ کی تکذیب کرتا جاتا تھا۔ (ابنِ کثیر)[1]

شانِ نزول

صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾[2] (الشعراء) نازل

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:٨ ص:٥١٤

[2] ترجمہ: اور آپ اپنے نزدیک کے کنبے کو ڈرایئے۔

ہوئی تو آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی، بعض روایات میں ہے کہ ''یَا صَبَاحَاہُ'' کہہ کر یا بنی عبد مناف اور یا بنی عبد المطلب وغیرہ ناموں کے ساتھ آواز دی، (اس طرح آواز دینا عرب میں خطرے کی علامت سمجھا جاتا تھا) سب قریش جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دُوں کہ دُشمن (تم پر چڑھ آیا ہے اور) صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے، کیا آپ لوگ میری تصدیق کرو گے سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ضرور تصدیق کریں گے پھر آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک عذابِ شدید سے (جو شرک وکفر پر اللہ کی طرف سے مقرّر ہے)۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا ہلاکت ہو تیرے لئے کیا تو نے ہمیں اس کے لئے جمع کیا تھا اور آپ کو مارنے کے لئے ایک پتھر اُٹھالیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ [۱]

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ یَدٌ کے اصلی معنی ہاتھ کے ہیں، چونکہ انسان کے سب کاموں میں بڑا دخل ہاتھوں کو ہے، اس لئے کسی شخص کی ذات اور نفس کو یَدٌ سے تعبیر کر دیتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے: ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ [۲] (الحج:۱۰) اور بیہقی نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابولہب نے ایک روز لوگوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں فلاں کام ہوں گے، پھر اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ان ہاتھوں میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی آیا نہیں، پھر اپنے ہاتھوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ''تَبًّا لَّکُمَا مَآ اَرٰی فِیْکُمَا شَیْئًا مِّمَّا قَالَ مُحَمَّدٌ''، یعنی تم برباد ہو جاؤ، میں تمہارے اندر اُن چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھتا جن کے ہونے کی خبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دیتے ہیں۔ اس کی مناسبت سے قرآنِ کریم نے ہلاکت کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا۔ [۳]

تَبَّ، تباب سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ہلاک وبرباد ہو، اس آیت میں پہلا جملہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ بطور بددُعا کے ہے، یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے، اور دُوسرا جملہ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ جملہ خبریہ ہے، گویا بددُعا کے ساتھ اس کا اثر بھی بتلا دیا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اور جملہ بددُعا کا مسلمانوں کے شفائے غیظ کے لئے ارشاد فرمایا گیا، کیونکہ جس وقت ابولہب نے آپ کی شان میں ''تَبًّا'' کہا تو مسلمانوں کے دِل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لئے بددُعا کریں، حق تعالیٰ نے گویا اُن کے دِل کی بات خود فرمادی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی کہ یہ بددُعا اس کو لگ بھی گئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ قرآن نے اس کی ہلاکت وبربادی کی خبر جو پہلے ہی دے دی تھی اُس کا اثر یہ ہوا کہ واقعۂ بدر کے سات روز بعد اس کے طاعون کی گلٹی نکلی، جس کو عرب ''عَدَسَہ'' کہتے ہیں، مرض دُوسروں کو لگ جانے کے خوف سے سب گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا، یہاں

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ لھب، ج:۲ ص:۷۴۳، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان من مات علی الکفر ...إلخ، ج:۱ ص:۱۱۴

[۲] ترجمہ: کہ یہ تیرے ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے۔

[۳] رُوح المعانی ج:۲۳ ص:۱۶۸، بحوالہ دلائل النبوۃ للبیہقیؒ

تک کہ اسی بے کسی کی حالت میں مرگیا اور تین روز تک اس کی لاش یوں ہی پڑی رہی، جب سڑنے لگا تو مزدوروں سے اُٹھوا کر دَبوادِیا، اُنہوں نے ایک گڑھا کھود کر ایک لکڑی سے اُس کی لاش کو گڑھے میں ڈال دیا، اُوپر سے پتھر بھر دیئے۔(بیان القرآن بحوالہ روح) [۱]

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ وَمَا كَسَبَ کے معنی ہیں جو کچھ اس نے کمایا، اس سے مراد وہ منافع تجارت وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں جو مال کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں کہا گیا ہے، اور اولاد بھی مراد ہوسکتی ہے کیونکہ اولاد کو بھی انسان کی کمائی کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهٖ، وَاِنَّ وَلَدَهٗ مِنْ كَسْبِهٖ''یعنی جو کھانا آدمی کھاتا ہے اس میں سب سے زیادہ حلال طیب وہ چیز ہے جو آدمی اپنی کمائی سے حاصل کرے، اور آدمی کی اولاد بھی اس کے کسب میں داخل ہے، یعنی اولاد کی کمائی کھانا بھی اپنی ہی کمائی سے کھانا ہے۔(قرطبی) [۲] اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، مجاہد، عطاء، ابنِ سیرین رحمہم اللہ وغیرہ نے اس جگہ وَمَا كَسَبَ کی تفسیر اولاد سے کی ہے۔ ابولہب کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی بہت دیا تھا اولاد بھی، یہی دونوں چیزیں ناشکری کی وجہ سے اُس کے فخر وغرور اور وبال کا سبب بنیں۔ حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو ابولہب نے یہ بھی کہا تھا کہ جو کچھ یہ میرا بھتیجا کہتا ہے اگر وہ حق ہی ہوا تو میرے پاس مال واولاد بہت ہے، میں اس کو دے کر اپنی جان بچالوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ یعنی جب اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب نے پکڑا تو نہ اُس کا مال کام آیا، نہ اولاد، یہ تو حال اس کا دُنیا میں ہوا، آگے آخرت کا ذِکر ہے۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ یعنی قیامت کے بعد یا مرنے کے فوراً بعد قبر ہی میں یہ ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے نام کی مناسبت سے آگ کے ساتھ ذَاتَ لَهَبٍ کی صفت میں خاص بلاغت ہے۔

وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ جس طرح ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت غیظ اور دُشمنی تھی اُس کی بیوی بھی اس دُشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِیذا رسانی میں اس کی مدد کرتی تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن بنتِ حرب بن اُمیہ ہے، جس کو اُمّ جمیل کنیت کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اس آیت نے بتلایا کہ یہ بدبخت بھی اپنے شوہر کے ساتھ جہنم کی آگ میں جائے گی، اس کے ساتھ اس کا ایک حال یہ بتلایا کہ وہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ہے، جس کے لفظی معنی ہیں سوختہ کی لکڑیاں لادنے والی، یعنی آگ لگانے والی۔ عرب کے محاورات میں چغل خوری کرنے والے کو'' حَمَّالَ

[۱] تفسیر بیان القرآن ص:۱۲۳ و۱۲۴، وتفسیر رُوح المعانی ج:۳۰ ص:۲۶۲

[۲] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۳۸، سنن النّسائی، کتاب البیوع، باب الحث علی الکسب ج:۲ ص:۲۱۰

الْحَطَبِ '' کہا جاتا تھا کہ جیسے کوئی سوختہ لکڑیاں جمع کر کے آگ لگانے کا سامان کرتا ہے، چغل خور کا عمل بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی چغل خوری کے ذریعے افراد اور خاندانوں میں آگ بھڑکا دیتا ہے۔ یہ عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی ایذارسانی کے لئے چغل خوری کا کام بھی کرتی تھی۔ اس آیت میں ابولہب کی بیوی کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کہنے کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ وغیرہ ایک جماعت مفسرین نے یہی کی ہے کہ یہ چغل خوری کرنیوالی تھی، اور ابن زید، ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو اپنے حقیقی معنی میں رکھا ہے، جس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ یہ عورت جنگل سے خاردار لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں بچھا دیتی تھی تا کہ آپ کو تکلیف پہنچے، اس کی اس ذلیل وخسیس حرکت کو قرآن نے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر) [1] اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ حال جہنم میں ہوگا کہ اپنے شوہر پر جہنم کے درختوں زقوم وغیرہ کی لکڑیاں لا کر ڈالے گی تا کہ اس کی آگ اور بھڑک جائے، جس طرح دُنیا میں وہ اس کے کفر وظلم کو بڑھاتی تھی، آخرت میں اس کے عذاب کو بڑھائے گی۔ (ابن کثیر) [2]

چغل خوری سخت گناہِ کبیرہ ہے

حدیثِ صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔ [3] اور حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تین عمل ایسے ہیں جو اِنسان کے تمام اعمالِ صالحہ کو برباد کر دیتے ہیں، روزہ دار کا روزہ اور وضو والے کا وضو خراب کر دیتے ہیں، یعنی غیبت اور چغل خوری اور جھوٹ۔ عطاء بن سائب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شعبی رحمہ اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ذِکر کیا جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَافِكُ دَمٍ وَّلَا مَشَّاءٌ بِنَمِيْمَةٍ وَّلَا تَاجِرٌ يَرْبِىْ '' یعنی تین قسم کے آدمی جنت میں نہ داخل ہوں گے، ناحق خون بہانے والا، اور چغل خوری کرنے والا، اور وہ تاجر جو سود کا کاروبار کرے۔ عطاء کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذِکر کر کے شعبی سے بطور تعجب کے دریافت کیا کہ حدیث میں چغل خور کو قاتل اور سود خور کے برابر بیان فرمایا ہے! اُنہوں نے کہا کہ ہاں! چغل خوری تو ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے قتلِ ناحق اور غصبِ اموال کی نوبت آجاتی ہے۔ (قرطبی) [4]

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ مَسْد بسکون السین مصدر ہے جس کے معنی رسّی یا ڈور بٹنے یا اس کے تار پر تار چڑھا کر مضبوط کرنے کے ہیں۔ اور مَسَد بفتح میم وسین اُس رسّی یا ڈور کو کہا جاتا ہے جو مضبوط بنائی گئی ہو، خواہ وہ کسی چیز کی

---

[1] تفسير القرطبي ج:۲۰ ص:۲۳۹، وتفسير ابن كثير ج:۸ ص:۵۱۵ و۵۱۶

[2] تفسير ابن كثير ج:۸ ص:۵۱۵

[3] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب ما يكره من النميمة، رقم الحديث:۵۵۹۲

[4] تفسير القرطبي ج:۲۰ ص:۲۳۹ و۲۴۰، وصحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب غلظ تحريم النميمة ج:۱ ص:۷۰

ہو، کھجور یا ناریل وغیرہ سے یا آہنی تاروں سے ہر طرح کی مضبوط رسّی اس میں داخل ہے۔(کذا فی القاموس) [1] بعض حضرات نے جو خاص کھجور کی رسّی اس کا ترجمہ کیا ہے، وہ عرب کی عام عادت کے مطابق کیا گیا ہے، اصل مفہوم عام ہے۔ اسی مفہومِ عام کے اعتبار سے حضرت ابنِ عباس، عروہ بن زبیر وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ سے مرادلوہے کے تاروں سے بٹا ہوا رسا ہے، اور یہ اس کا حال جہنم میں ہوگا کہ آہنی تاروں سے مضبوط بٹا ہوا طوق اُس کے گلے میں ہوگا۔ حضرت مجاہدؒ نے بھی اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: مِّنۡ مَّسَدٍ اَیۡ مِنۡ حَدِیۡدٍ۔(مظہری) [2]

اور شعبی اور مقاتل وغیرہ مفسرین نے اس کو بھی دُنیا کا حال قرار دے کر حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ سے مراد کھجور کی رسّی لی ہے، اور فرمایا کہ اگرچہ ابولہب اور اُس کی بیوی مال دار غنی اور اپنی قوم کے سردار مانے جاتے تھے، مگر اُس کی بیوی اپنی خستِ طبیعت اور کنجوسی کے سبب جنگل سے سوختہ لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور اُس کی رسّی کو اپنے گلے میں ڈال لیتی تھی کہ یہ گٹھا سر سے گر نہ جائے، اور یہی ایک روز اُس کی ہلاکت کا سبب بنا کہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اور رسّی گلے میں تھی، تھک کر کہیں بیٹھ گئی، اور پھر گر کر اس کا گلا گھٹ گیا اور اسی میں مرگئی۔ اس دُوسری تفسیر کی رُو سے یہ حال اس کا اس کی خستِ طبیعت اور اس کا انجامِ بد بیان کرنے کے لئے ہے۔(مظہری) [3] مگر چونکہ ابولہب کے گھرانے خصوصاً بیوی سے ایسا کرنا مستبعد تھا، اس لئے اکثر حضراتِ مفسرین نے پہلی ہی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

تَمَّتۡ سُوۡرَۃُ اللَّھَبِ بِحَمۡدِ اللّٰہِ تَعَالٰی

---

[1] لسان العرب، تحت مادّة: مد، ج:۴ ص:۴۰۲

[2] تفسير المظهرى ج:۱۰ ص:۳۶۸

[3] تفسير المظهرى ج:۱۰ ص:۳۶۸

سُورَةُ الإِخْلَاصِ

آیاتها ۴ ۱۱۲ سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ ۲۲ رکوعها ۱

سورۂ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا،

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

اور نہیں اُس کے جوڑ کا کوئی۔

ع

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کہہ دو: ''بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ (۱) اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اُس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، (۲) نہ اُس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ (۳) اور اُس کے جوڑ کا کوئی بھی نہیں۔'' (۴)

خلاصۂ تفسیر

(اس کا سببِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آپ سے کہا کہ اپنے رَبّ کی صفات اور نسب بیان کیجئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی، كذا في الدر المنثور بأسانيد متعددة [۱]) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمالِ ذات وصفات میں) ایک ہے (کمالِ ذات یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، یعنی ہمیشہ سے اور ہمیشہ رہے گا، اور کمالِ صفات یہ کہ علمِ قدرت وغیرہ اس کے قدیم اور محیط ہیں، اور) اللہ بے نیاز ہے (یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور اُس کے سب محتاج ہیں) اُس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور نہ کوئی اُس کے برابر کا ہے۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

ترمذی، حاکم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا نسب پوچھا تھا، اُن کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ [۲] دُوسری بعض روایات میں یہ سوال یہودِ مدینہ کی طرف منسوب کیا ہے، اسی لئے اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بصری، عطاء، عکرمہ، جابر رضی اللہ عنہم نے اس کو مکی کہا ہے، اور قتادہ، ضحاک وغیرہ نے مدنی، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے دو قول منقول ہیں۔ [۳]

بعض روایات میں ہے کہ مشرکین کے سوال میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کس چیز کا بنا ہوا ہے، سونا چاندی یا اور کچھ، ان کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔

---

[۱] تفسير الدر المنثور ج:۱۰ ص:۳۸۳

[۲] جامع الترمذی، ابواب التفسير، باب تفسير سورة الإخلاص، ج:۲ ص:۱۷۴، والمستدرك للحاكم، رقم الحديث:۳۹۸۷

[۳] تفسير القرطبی ج:۲۰ ص:۲۴۶

فضائلِ سورت

اِمام احمد نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے اس سورت (یعنی سورۂ اِخلاص) سے بڑی محبت ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تمہیں جنت میں داخل کردیا۔ (ابنِ کثیر) [۱]

ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ سب جمع ہوجاؤ میں تمہیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا۔ جو جمع ہو سکتے تھے، جمع ہوگئے تو آپ تشریف لائے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ... اِلخ کی قراءت فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (رواہ مسلم فی صحیحہ) [۲]

ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور معوّذتین پڑھ لیا کرے تو یہ اُس کے لئے کافی ہے۔ [۳] اور ایک روایت میں ہے کہ یہ اس کو ہر بلا سے بچانے کے لئے کافی ہے۔ (ابن کثیر) [۴]

اِمام احمد نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں کہ جو توراۃ، اِنجیل، زَبور اور قرآن سب میں نازل ہوئی ہیں، اور فرمایا کہ رات کو اُس وقت تک نہ سوؤ جب تک ان تینوں (معوّذتین اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) کو نہ پڑھ لو۔ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُس وقت سے میں نے کبھی ان کو نہیں چھوڑا۔ (ابنِ کثیر) [۵]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ لفظ قُلْ میں اشارہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت کی طرف کہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا حکم ہو رہا ہے اور لفظ اللّٰهُ اُس ذات کا نام ہے جو واجب الوجود ہے، اور تمام کمالات کا جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے۔ اَحَدٌ اور واحد ترجمہ تو دونوں کا ایک ہی کیا جاتا ہے، مگر مفہوم کے اعتبار سے لفظ اَحَدٌ کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ترکیب اور تجزیے سے اور تعدّد سے اور کسی چیز کی مشابہت اور مشاکلت سے پاک ہے، یعنی وہ کسی ایک یا متعدّد مادّوں سے نہیں بنا، نہ اُس میں تعدّد کا کوئی اِمکان ہے، نہ کسی کے مشابہ ہے۔ یہ جواب ہوگیا

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۱۹، وصحیح البخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...إلخ، ج:۲ ص:۱۰۹۶

[۲] صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، ج:۱ ص:۲۷۱

[۳] سنن ابی داود، کتاب الأدب، باب ما یقول إذا اصبح، رقم الحدیث:۴۴۱۹، ج:۲ ص:۲۹۳، وجامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب فی انتظار الفرج وغیر ذالك، ج:۲ ص:۱۹۷

[۴] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۲۷

[۵] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۲۷، ومسند احمد، حدیث عقبة بن عامر الجهنی رضی الله عنه، عن النبی صلی الله علیه وسلم، رقم الحدیث:۷۳۷۲

اُن لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کے متعلق پوچھتے تھے کہ وہ سونے چاندی کا ہے یا کسی جوہر کا اس ایک مختصر جملے میں ذات وصفات کے سب مباحث آگئے۔ اور لفظ قُلْ میں نبوّت ورسالت کا مسئلہ آگیا، اس میں غور کرو تو یہ ایک مختصر جملہ اُن عظیم الشان مباحث کو حاوی ہے جو بڑی بڑی جلدوں میں لکھے جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لفظ صمد کے بہت سے معنی ہوسکتے ہیں، اسی لئے حضراتِ مفسرین کے اقوال اس میں بہت ہیں، اِمامِ حدیث طبرانی رحمہ اللہ نے کتاب السنۃ میں ان تمام اقوال کو جمع کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب صحیح ہیں اور ان میں جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ سب ہمارے رَبّ کی صفات ہیں، لیکن اصل معنی صمد کے یہ ہیں کہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور ضروریات میں رُجوع کریں اور جو بڑائی اور سرداری میں ایسا ہو کہ اُس سے کوئی بڑا نہیں، خلاصہ یہ کہ سب اُس کے محتاج ہوں، وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ (ابنِ کثیر) [1]

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ یہ اُن لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نسب نامے کا سوال کیا تھا کہ اس کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جو توالد وتناسل کے ذریعے وجود میں آتی ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، نہ کوئی اس کی اولاد۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ کفو کے لفظی معنی مثل اور مماثل کے ہیں، معنی یہ ہیں کہ نہ کوئی اُس کا مثل ہے، نہ کوئی اُس سے مشاکلت اور مشابہت رکھتا ہے۔

سورۂ اِخلاص میں مکمل توحید اور ہر طرح کے شرک کی نفی ہے

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنے والے منکرینِ توحید کی دُنیا میں مختلف اقسام ہوئی ہیں۔ سورۂ اِخلاص نے ہر طرح کے مشرکانہ خیالات کی نفی کرکے مکمل توحید کا سبق دیا ہے، کیونکہ منکرینِ توحید میں ایک گروہ وخود اللہ کے وجود ہی کا منکر ہے، بعض وجود کے تو قائل ہیں مگر وجوبِ وجود کے منکر ہیں۔ بعض دونوں کے قائل ہیں، مگر کمالِ صفات کے منکر ہیں۔ بعض یہ سب کچھ مانتے ہیں، مگر پھر عبادت میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان سب کے خیالاتِ باطلہ کا رَدّ اَللّٰهُ اَحَدٌ میں ہوگیا۔ بعض لوگ عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے، مگر حاجت رَوا اور کارساز اللہ کے سوا دُوسروں کو بھی سمجھتے ہیں، اُن کے خیال کا اِبطال لفظ اَلصَّمَدُ سے ہوگیا۔ بعض لوگ اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہیں، اُن کا رَدّ لَمْ يَلِدْ میں ہوگیا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۲۸

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

اٰیاتھا ۵ | ۱۱۳ سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ ۲۰ | رکوعھا ۱

سورۂ فلق مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی، ہر چیز کی بدی سے جو اُس نے بنائی، اور بدی سے اندھیرے کی

اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ

جب سمٹ آئے، اور بدی سے عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں، اور بدی سے بُرا چاہنے والے کی

اِذَا حَسَدَ ۝۵ ع ۱ ۳۸

جب لگے ٹوک لگانے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کہو کہ: ''میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں، (۱) ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے، (۲) اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ پھیل جائے، (۳) اور اُن جانوں کے شر سے جو (گنڈے کی) گرہوں میں پھونک مارتی ہیں (۴) اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔'' (۵)

خلاصۂ تفسیر

آپ (اپنے اِستعاذہ یعنی اللہ سے پناہ مانگنے کے لئے اور دُوسروں کو بھی یہ اِستعاذہ سکھلانے کے لئے جس کا حاصل اللہ پر توکل اور مکمل بھروسے کی تعلیم ہے۔ یوں) کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں، تمام مخلوقات کے شر سے، اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات آجائے (رات میں شرور وآفات کا اِحتمال ظاہر ہے) اور (بالخصوص گنڈے کی) گرہوں میں پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے (اوّل تمام مخلوقات کے شر سے پناہ لینے کا ذِکر کرنے کے بعد خاص خاص چیزوں کا ذِکر شاید بمناسبت مقام یہ ہو کہ اکثر سحر کی ترتیب اور ترکیب رات کو ہوتی ہے (کذا فی الخازن [1]) تاکہ کسی کو اِطلاع نہ ہو اِطمینان سے اُس کی تکمیل کرسکیں۔ اور گنڈے پر دَم کرنے والی جانوں یا عورتوں کی مناسبت اس جگہ ظاہر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر اسی طرح ہوا تھا، خواہ مرد نے کیا ہو، یا عورتوں نے، کیونکہ لفظ ''النّفّٰثٰتِ'' کا موصوف نفوس بھی ہو سکتے ہیں، جو مرد وعورت دونوں کو شامل ہیں، اور عورتیں بھی اس کی موصوف ہوسکتی ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو یہودیوں نے سحر کیا تھا اُس کا اصل منشا حسد تھا، اس طرح سحر کے متعلقہ جتنی چیزیں تھیں سب سے اِستعاذہ ہوگیا، اور باقی شرور وآفات کو شامل کرنے کے لئے مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲) فرمادیا۔ اور آیت میں جو اللہ کی صفت رَبّ الفلق یعنی صبح کا مالک ذِکر کی گئی، حالانکہ اللہ تو صبح اور شام سب ہی چیزوں کا رَبّ اور مالک ہے۔ اس تخصیص میں شاید اشارہ اس طرف ہو کہ جیسے اللہ تعالیٰ رات کی اندھیری کا اِزالہ کرکے صبح کی روشنی نکال دیتا ہے، اسی طرح سحر کا بھی اِزالہ کرسکتا ہے۔

---

[1] تفسیر الخازن، تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۵۰۱

معارف ومسائل

یہ سورت سورۂ فلق اور اس کے بعد کی سورۂ ناس دونوں سورتیں ایک ساتھ ایک ہی واقعے میں نازل ہوئی ہیں۔ حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے ان دونوں سورتوں کی تفسیر یکجا لکھی ہے، اُس میں فرمایا ہے کہ ان دونوں سورتوں کے منافع اور برکات اور سب لوگوں کو اُن کی حاجت وضرورت ایسی ہے کہ کوئی انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا، ان دونوں سورتوں کو سحر اور نظرِ بد اور تمام آفاتِ جسمانی ورُوحانی کے دُور کرنے میں تأثیرِ عظیم ہے، اور حقیقت کو سمجھا جائے تو اِنسان کو اس کی ضرورت اپنے سانس اور کھانے پینے اور لباس سب چیزوں سے زیادہ ہے۔[1] اس کا واقعہ مسند احمد میں اس طرح آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے جادو کردیا تھا، جس کے اثر سے آپ بیمار ہوگئے۔ جبریلِ امین علیہ السلام نے آکر آپ کو اِطلاع کی کہ آپ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جادو کا عمل جس چیز میں کیا گیا ہے، وہ فلاں کنویں کے اندر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں آدمی بھیجے وہ یہ جادو کی چیزیں کنویں سے نکال لائے، اُس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گرہوں کو کھول دیا، اُسی وقت آپ بالکل تندرست ہوکر کھڑے ہوگئے۔ (اور اگرچہ جبریل علیہ السلام نے آپ کو اس یہودی کا نام بتلا دیا تھا، اور آپ اُس کو جانتے تھے، مگر اپنے نفس کے معاملے میں کسی سے انتقام لینا آپ کی عادت نہ تھی، اس لئے) عمر بھر اُس یہودی سے کچھ نہیں کہا اور نہ کبھی اُس کی موجودگی میں آپ کے چہرۂ مبارک سے کسی شکایت کے آثار پائے گئے (وہ منافق ہونے کی وجہ سے حاضر باش تھا)۔[2] اور صحیح بخاری کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ہے کہ آپ پر ایک یہودی نے سحر کیا تو اس کا اثر آپ پر یہ تھا کہ بعض اوقات آپ محسوس کرتے تھے کہ فلاں کام کرلیا ہے، مگر وہ نہیں کیا ہوتا۔ پھر ایک روز آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ میری بیماری کیا ہے، اور فرمایا کہ (خواب میں) دو شخص آئے، ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا، ایک پاؤں کی طرف، سرہانے والے نے دُوسرے سے کہا کہ ان کو کیا تکلیف ہے، دُوسرے نے کہا کہ یہ مسحور ہیں، اس نے پوچھا کہ سحر ان پر کس نے کیا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جو یہودیوں کا حلیف منافق ہے۔ اُس نے پوچھا کہ کس چیز میں جادو کیا ہے، اُس نے بتلایا کہ ایک کنگھے اور اُس کے دندانوں میں۔ پھر اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے، تو اُس نے بتلایا کہ کھجور کے اُس غلاف میں جس میں کھجور کا پھل پیدا ہوتا ہے، بئر ذروان (ایک کنویں کا نام ہے)

[1] بدائع الفوائد لابن القیم رحمه الله، تفسیر المعوّذتین وما ورد فی المعوّذتین من الأحادیث ج:۲ ص:۴۲۵و ۴۲۶

[2] مسند احمد، حدیث زید بن ارقم رضی الله عنه، رقم الحدیث:۱۹۲۸۶

میں ایک پتھر کے نیچے مدفون ہے۔ آپ اُس کنویں پر تشریف لے گئے اور اس کو نکال لیا، اور فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی کنواں دِکھلایا گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ نے اس کا اعلان کیوں نہ کر دیا (کہ فلاں شخص نے یہ حرکت کی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی، اور مجھے یہ پسند نہیں کہ میں کسی شخص کے لئے کسی تکلیف کا سبب بنوں۔ [1] (مطلب یہ تھا کہ اس کا اعلان ہوتا تو لوگ اس کو قتل کر دیتے یا تکلیف پہنچاتے)۔ اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کا یہ مرض چھ مہینے تک رہا۔ [2] اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن صحابہ کرام کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کام لبید بن اعصم نے کیا ہے، اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اس خبیث کو کیوں قتل نہ کر دیں، آپ نے وہی جواب دیا جو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دِیا تھا۔ اور اِمام ثعلبی کی روایت میں ہے کہ ایک لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، اس منافق یہودی نے اُس کو بہلا پھسلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا کنگھا اور کچھ اُس کے دندانے اس سے حاصل کر لئے اور ایک تانت کے تار میں گیارہ گرہیں لگائیں، ہر گرہ میں ایک سوئی لگائی، کنگھے کے ساتھ اُس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک نویں میں پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دو سورتیں نازل فرمائیں جن میں گیارہ آیتیں ہیں، آپ ہر گرہ پر ایک ایک آیت پڑھ کر ایک ایک کھولتے رہے، یہاں تک کہ سب گرہیں کھل گئیں، اور آپ سے اچانک ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ (یہ سب روایتیں تفسیر ابنِ کثیر سے لی گئی ہیں) [3]

سحر کے اثر سے متأثر ہو جانا نبوّت و رِسالت کے منافی نہیں

جو لوگ سحر کی حقیقت سے ناواقف ہیں، اُن کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر کیسے ہو سکتا ہے، سحر کی حقیقت اور اُس کے اقسام و اَحکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اوّل ص:۳۱۸ تا ص:۳۲۵ میں بیان کئے جا چکے ہیں، وہاں دیکھ لئے جائیں۔ خلاصہ اس کا جس کا جاننا یہاں ضروری ہے، اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی اسبابِ طبعیہ کا اثر ہوتا ہے، جیسے آگ سے جلنا، یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا، بعض اسبابِ طبعیہ سے بخار آ جانا، یا مختلف قسم کے درد و اَمراض کا پیدا ہو جانا ایک اَمرِ طبعی ہے، جس سے پیغمبر و انبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے، اسی طرح سحر و جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے، اس لئے کوئی بعید نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الطب، باب السحر، ج:۲ ص:۸۵۸

[2] مسند احمد بن حنبل، حدیث السیّدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث: ۲۳۳۹۲

[3] تفسیر ابن کثیر، تحت هذه الآية ج:۸ ص:۵۳۶ إلى ۵۳۸

معوذتین ہر قسم کی دُنیوی اور دِینی آفات سے حفاظت کا قلعہ ہیں، ان کے فضائل

یہ تو ہر مؤمن کا عقیدہ ہے کہ دُنیا و آخرت کا ہر نفع نقصان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، بغیر اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ایک ذرّے کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا، تو دُنیا و آخرت کی تمام آفات سے محفوظ رہنے کا اصل ذریعہ ایک ہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دے اور اپنے عمل سے اُس کی پناہ میں آنے کے قابل بننے کی کوشش کرے۔ ان دونوں سورتوں میں پہلی یعنی سورۂ فلق میں تو دُنیاوی آفات سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے، اور دُوسری سورت یعنی سورۂ ناس میں اُخروی آفات سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ مستند احادیث میں ان دونوں سورتوں کے بڑے فضائل اور برکات منقول ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں کچھ خبر ہے کہ آج کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل فرمائی ہیں کہ ان کی مثل نہیں دیکھی، یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ [۱] اور ایک روایت میں ہے کہ توراۃ، انجیل اور زبور اور قرآن میں بھی اُن کی مثل کوئی دُوسری سورت نہیں ہے۔ [۲] ایک دُوسری روایت اِن ہی حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معوذتین پڑھائی اور پھر مغرب کی نماز میں اِن ہی دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ ان سورتوں کو سونے کے وقت بھی پڑھا کرو، اور پھر اُٹھنے کے وقت بھی۔ (رواہ النسائی) [۳] اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان دونوں سورتوں کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ (رواہ ابوداود والنسائی) [۴]

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بیماری پیش آتی تو یہ دونوں سورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دَم کر کے سارے بدن پر پھیر لیتے تھے۔ پھر جب مرضِ وفات میں آپ کی تکلیف بڑھی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپ کے ہاتھوں پر دَم کر دیتی تھی، آپ اپنے تمام بدن پر پھیر لیتے تھے۔ میں یہ کام اس لئے کرتی تھی کہ حضرت کے مبارک ہاتھوں کا بدل میرے ہاتھ نہ ہو سکتے تھے۔ (رواہ الإمام مالك) [۵] (یہ سب روایتیں تفسیر ابن کثیر سے

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءة المعوّذتین ج:۱ ص:۲۷۲

[۲] مسند احمد، حدیث عقبة بن عامر الجهنی رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم، رقم الحدیث:۱۷۴۸۸

[۳] سنن النَّسائی، کتاب الإستعاذة، ج:۲ ص:۳۱۲

[۴] السُّنن الکبریٰ للنَّسائی، رقم الحدیث:۷۸۱۰، ومسند احمد، حدیث رجل رضی الله عنه، رقم الحدیث:۲۰۷۶۴

[۵] مسند احمد بن حنبل، حدیث السیّدة عائشة رضی الله عنها، رقم الحدیث:۲۶۲۳۲

نقل کی گئی ہیں) [۱] اور حضرت عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں بارش اور سخت اندھیری تھی، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنے کے لئے نکلے، جب آپ کو پالیا تو آپ نے فرمایا کہ کہو میں نے عرض کیا کہ کیا کہوں، آپ نے فرمایا: قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ اور معوذتین پڑھو، جب صبح ہو اور جب شام ہو تین مرتبہ، یہ پڑھنا تمہارے لئے ہر تکلیف سے امان ہوگا۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی، مظہری) [۲]

خلاصہ یہ ہے کہ تمام آفات سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دو سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا معمول تھیں۔ آگے سورت کے الفاظ کے ساتھ تفسیر دیکھئے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ فلق کے معنی پھٹنے کے ہیں، مراد رات کی پو پھٹنا اور صبح کا نمودار ہونا ہے، جیسا ایک دُوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ [۳] (الانعام:۹۶) آئی ہے، اس کلمے میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات میں سے اس کو اختیار کرنے کی حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ رات کی اندھیری اکثر شرور وآفات کا سبب بنتی ہے، اور صبح کی روشنی اس کو دُور کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں یہ اشارہ ہے کہ جو اس کی پناہ مانگے گا اللہ تعالیٰ اُس کی تمام آفات کو دُور فرمادے گا۔ (مظہری) [۴]

لفظِ شر کے معنی اَز علامہ ابنِ قیم

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ علامہ ابنِ قیم نے لکھا ہے کہ لفظِ شر دو چیزوں کے لئے عام اور شامل ہے، ایک آلام وآفات، جن سے براہِ راست انسان کو رنج وتکلیف پہنچتی ہے، دُوسرے وہ چیزیں جو آلام وآفات کے موجبات اور اسباب ہیں۔ اس دُوسری قسم میں کفر وشرک اور تمام معاصی بھی لفظِ شر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ قرآن وحدیث میں جن چیزوں سے پناہ کا ذکر آیا ہے، وہ ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک میں داخل ہوتی ہیں کہ یا تو وہ خود آفت یا مصیبت ہوتی ہیں، یا اُس کے لئے سبب موجب ہوتی ہیں۔ نماز کے آخر میں جو دُعائے اِستعاذہ مسنون ہے اس میں چار چیزیں مذکور ہیں: ۱- عذابِ قبر، ۲- عذابِ نار، ۳، ۴- فتنۃ المحیا والممات، ان میں پہلی دو چیزیں خود مصیبت وعذاب ہیں، اور آخری دو چیزیں مصیبت وعذاب کے اسباب ہیں۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۳۳ و۵۳۴

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۸۱

[۳] ترجمہ: وہ صبح کا نکالنے والا ہے۔

[۴] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۷۶

مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ کے لفظ میں ساری مخلوقات کا شر داخل ہے، اس لئے یہ کلمہ تمام شرور وآفات سے پناہ لینے کے لئے کافی تھا، مگر اس جگہ تین چیزوں کو ممتاز کر کے اُن کے شر سے پناہ مانگنے کا علیحدہ ذِکر فرمایا، جو اکثر آفات ومصائب کا سبب بنتی ہیں۔ پہلے فرمایا: وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ اس میں لفظ غَاسِقٍ، غسق سے مشتق ہے جس کے معنی اندھیری کا پھیل جانا اور چھاجانا ہے، اس لئے غَاسِقٍ کے معنی حضرت اِبنِ عباسؓ اور حسنؒ اور مجاہدؒ نے رات کے لئے ہیں، اور وَقَبَ، وُقُوۡبٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی اندھیری کے پوری طرح بڑھ جانے کے ہیں، معنی یہ ہیں کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں رات سے جب کہ اُس کی اندھیری پوری ہوجائے۔ رات کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہی وقت جنات وشیاطین اور موذی جانوروں اور حشرات الارض اور چوروں، ڈاکوؤں کے پھیلنے اور دُشمنوں کے حملہ کرنے کا وقت ہوتا ہے، اور جادو کی تأثیر بھی رات میں زیادہ ہوتی ہے، صبح ہوتے ہی ان چیزوں کا تسلط ختم ہوجاتا ہے۔ (اِبنِ قیم) [1]

دُوسری چیز یہ فرمائی: وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ﴿۴﴾ النَّفّٰثٰتِ، نَفۡثٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پھونک مارنے کے ہیں۔ اور الۡعُقَدِ، عقدۃ کی جمع ہے جس کے معنی گرہ کے ہیں۔ جادو کرنے والے ڈورے وغیرہ میں گرہیں لگا کر اُس پر جادو کے کلمات پڑھ کر پھونکتے ہیں۔ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ کے معنی ہوئے: گرہوں پر پھونکنے والیاں۔ مراد جادو کرنے والیاں۔ اور لفظ النَّفّٰثٰتِ کا موصوف نفوس بھی ہوسکتا ہے جس میں مرد وعورت دونوں داخل ہیں، اس صورت میں جادو کرنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی جانیں ہوں گی، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا موصوف عورتیں ہیں۔ عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی گئی کہ جادو کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں، اور کچھ خلقۃً عورتوں کو اس سے مناسبت بھی زیادہ ہے، اور یا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا جو واقعہ ان سورتوں کا سببِ نزول ہوا، اس میں جادو کرنے والیاں ولید بن اعصم کی لڑکیاں تھیں، جنہوں نے باپ کے کہنے سے یہ کام کیا تھا، اس لئے جادو کی نسبت ان کی طرف کردی گئی۔ اور جادو کرنے والوں سے پناہ مانگنے کو خصوصیت کے ساتھ ذِکر کرنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ سببِ نزول یہی جادو کا واقعہ ہے، اور یہ بھی کہ اس کا شر اور ضرر اس لئے زیادہ ہے کہ انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، بے خبری کی وجہ سے اس کے اِزالے کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ بیماری سمجھ کر دوا دارو میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

تیسری چیز جو خصوصیت کے ساتھ ذِکر کی گئی وہ حاسد اور حسد ہے، اس کی تخصیص کی وجہ بھی یہی دونوں ہوسکتی ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا اِقدام اسی حسد کے سبب سے ہوا۔ یہود اور منافقین آپ کی اور مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر جلتے تھے اور ظاہری جنگ وقتال میں آپ پر غالب نہیں آسکے تو جادو کے ذریعے اپنی حسد کی

---

[1] تفسیر ابن القیم، تفسیر سورۃ الفلق، ص: ۵۶۱

آگ کو بجھانا چاہا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاسد دُنیا میں بے شمار تھے، اس لئے بھی خصوصیت سے پناہ مانگی گئی۔ نیز حاسد کا حسد اُس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا، وہ ہر وقت اس کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے، اس لئے یہ ضرر شدید بھی ہے۔

''حسد'' کہتے ہیں کسی کی نعمت وراحت کو دیکھ کر جلنا اور یہ چاہنا کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے، چاہے اس کو بھی حاصل نہ ہو، یہ حسد حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اور یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں کیا گیا، اور سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین میں کیا گیا، کیونکہ آسمان میں اِبلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اور زمین پر اُن کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے کیا۔ (قرطبی) [1] حسد سے ملتا جلتا غبطہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ یہ نعمت مجھے بھی حاصل ہو جائے، یہ جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔

یہاں تین چیزوں سے خصوصی پناہ مانگنے کا ذِکر ہے، مگر پہلی اور تیسری میں تو ایک ایک قید کا ذِکر کیا گیا، پہلی غَاسِقٍ کے ساتھ اِذَا وَقَبَ ۝ فرمایا۔ اور تیسری میں حَاسِدٍ کے ساتھ اِذَا حَسَدَ ۝ فرمایا، اور درمیانی چیز یعنی جادو کرنے والوں میں کوئی قید ذِکر نہیں فرمائی، سبب یہ ہے کہ جادو کی مضرّت عام ہے، اور رات کی مضرّت اُسی وقت ہوتی ہے جب اندھیری پوری ہو جائے، اسی طرح حاسد کا حسد جب تک وہ اپنے حسد کی وجہ سے کسی ایذا پہنچانے کا اقدام نہ کرے اُس وقت تک تو اُس کا نقصان خود اُسی کی ذات کو پہنچتا ہے کہ دُوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جلتا کڑھتا ہے، البتہ محسود کو اس کا نقصان اس وقت پہنچتا ہے جبکہ وہ مقتضائے حسد پر عمل کر کے ایذا رسانی کی کوشش کرے، اس لئے پہلی اور دُوسری چیز میں یہ قیدیں لگا دی گئیں۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۵۹

سُورَةُ النَّاسِ

أٰيَاتُهَا ٦ | ۱۱۴ سُوْرَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ ۲۱ | رُكُوْعُهَا ١

سورۃ الناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اُس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رَبّ کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی،

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝٤ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ

بدی سے اُس کی جو پُھسلائے اور چُھپ جائے، وہ جو خیال ڈالتا ہے

فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦ ع

لوگوں کے دِل میں، جنوں میں اور آدمیوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کہو کہ: "میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی، ① سب لوگوں کے بادشاہ کی، ② سب لوگوں کے معبود کی، ③ اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے ④ جو لوگوں کے دِلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، ⑤ چاہے وہ جِنّات میں سے ہو، یا انسانوں میں سے۔" ⑥

خلاصۂ تفسیر

آپ کہئے کہ میں آدمیوں کے مالک، آدمیوں کے بادشاہ، آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں، وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے (پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ کہ حدیث میں ہے کہ اللہ کا نام لینے سے شیطان ہٹ جاتا ہے) جو لوگوں کے دِلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والا) جن ہو یا آدمی (یعنی جس طرح میں شیاطین الجن سے پناہ مانگتا ہوں، اسی طرح شیاطین الانس سے بھی پناہ مانگتا ہوں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ جنات اور اِنسان دونوں میں شیاطین ہونے کا ذِکر ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ [۴] الانعام: ۱۱۲)۔

معارف و مسائل

سورۂ فلق میں دُنیوی آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم ہے، اور اس سورت میں اُخروی آفات سے پناہ مانگنے کی تاکید ہے، اور جیسا کہ لفظ شَرٍّ کا مفہوم سورۂ فلق میں بیان کیا گیا ہے کہ آلام اور موجباتِ آلام دونوں کو شامل ہے، اس سورت میں اُس شر سے پناہ مانگی گئی ہے، جو تمام گناہوں کا سبب ہے، یعنی شیطانی وساوس و اثرات، اور چونکہ آخرت کی مضرت اشد ہے اس لئے اس کی تاکید پر قرآن ختم کیا گیا۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① رَبّ کے معنی پالنے والے اور ہر حال کی اصلاح کرنے والے کے ہیں، اس جگہ رَبّ کی اضافت ناس کی طرف کی گئی، اور پہلی سورت میں فلق کی طرف، وجہ یہ ہے کہ سورۂ فلق میں ظاہری اور جسمانی آفات سے پناہ مانگنا مقصود ہے اور وہ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، جانوروں کو بھی بدنی آفات و مصائب پہنچتے ہیں بخلاف

[۴] ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دُشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن۔

وسوسۂ شیطانی کے کہ اس کا نقصان انسان کے ساتھ مخصوص ہے، اور جنات بھی اس میں تبعاً شامل ہیں، اس لئے یہاں رَبّ کی اضافت ناس کی طرف کی گئی۔ (مظہری عن البیضاوی) [۱]

مَلِكِ النَّاسِ ۝ یعنی لوگوں کا بادشاہ، اِلٰهِ النَّاسِ ۝ لوگوں کا معبود، ان دو صفتوں کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ لفظ رَبّ جب کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہو تو اللہ تعالیٰ کے سوا بھی دُوسروں کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا ''رَبّ الدّار''، گھر کے مالک کو، ''رَبُّ المَال'' مال کے مالک کو کہا جاتا ہے۔ اور ہر مالک بادشاہ نہیں ہوتا، اس لئے مَلِك کا اضافہ کیا کہ وہ رَبّ یعنی مالک بھی ہے اور مَلِك یعنی بادشاہ بھی، پھر ہر بادشاہ معبود نہیں ہوتا، اس لئے تیسری صفت ذکر فرمائی اِلٰهِ النَّاسِ، ان تین صفتوں کو جمع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر صفت حفاظت کی داعی ہے، کیونکہ ہر مالک اپنے مملوک کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح ہر بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کرتا ہے، اور معبود کا اپنے عابد کے لئے محافظ ہونا تو سب سے اظہر ہے۔ یہ تینوں صفتیں صرف حق تعالیٰ میں جمع ہیں، اُس کے سوا کوئی ان صفتوں کا جامع نہیں، اس لئے اُس کی پناہ حاصل کرنا سب سے بڑی پناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ان تین صفتوں کے ساتھ پناہ مانگنا دُعا کی قبولیت کے لئے اقرب ہے کہ یا اللہ آپ ہی ان صفات کے جامع ہیں، ہم صرف آپ ہی سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہاں جب کہ پہلے جملے میں رَبّ النَّاس آچکا تو بظاہر تقاضا مقام کا یہ تھا کہ آگے اس کی طرف ضمیریں راجع کرنے سے کام لیا جاتا: مَلِكِهِمْ وَاِلٰهِهِمْ فرمایا جاتا، مگر اس لفظ کا بار بار تکرار اس لئے ہے کہ مقام دُعا اور مدح وثنا کا ہے، اس میں تکرار ہی بہتر ہے۔ اور بعض حضرات نے لفظ نَاس کے بار بار تکرار میں یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ اس سورت میں یہ لفظ پانچ مرتبہ آیا ہے، پہلے لفظ نَاس سے مراد بچے ہیں، اور لفظ رَبّ اور رُبوبیت اس کا قرینہ ہے، کیونکہ پرورِش کی حاجت سب سے زیادہ بچوں کو ہوتی ہے۔ اور دُوسرے لفظ نَاس سے جوان مراد ہیں، اور لفظ مَلِك اس کا قرینہ ہے جو ایک سیاست کے معنی رکھتا ہے، وہ جوانوں کے مناسب ہے۔ اور تیسرے لفظ ناس سے بوڑھے مراد ہیں جو دُنیا سے منقطع ہو کر عبادت میں مشغول ہوں، اور لفظ اِلٰه اس کا قرینہ ہے، جو عبادت کی طرف مشیر ہے۔ اور چوتھے لفظ ناس سے مراد اللہ کے صالح بندے ہیں اور لفظ وسوسہ اس کا قرینہ ہے کیونکہ شیطان نیک بندوں کا دُشمن ہے، اُن کے دِلوں میں وسوسے ڈالنا اس کا مشغلہ ہے۔ اور پانچویں لفظ نَاس سے مراد مفسد لوگ ہیں، کیونکہ اُن کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ اللہ تعالیٰ کی تین صفات ذِکر کر کے اب اُس کا بیان ہے جس سے پناہ مانگنا مقصود ہے، وہ ہے الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ، وَسْوَاسُ مصدر دراصل بمعنی وسوسہ ہے، یہاں شیطان کو وَسْوَاسُ مبالغۃً فرمایا گویا کہ

[۱] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۷۹

وہ سراپا وسوسہ ہے، اور وسوسے کے معنی شیطان کا اپنی اطاعت کی طرف ایک مخفی کلام کے ذریعے بلانا ہے، جس کا مفہوم انسان کے دِل میں آجائے اور کوئی آواز سنائی نہ دے۔ (قرطبی) [۱]

اَلْخَنَّاسِ، خَنَسْ سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے لوٹنے کے ہیں۔ شیطان کو خناس اس لئے کہا گیا کہ اس کی عادت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کا نام لیتا ہے تو پیچھے بھاگتا ہے، پھر جب ذرا غفلت ہوئی پھر آجاتا ہے، پھر وہ اللہ کا نام لیتا ہے تو پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، یہی عمل مسلسل جاری رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب میں دو گھر ہیں، ایک میں فرشتہ رہتا ہے، دُوسرے میں شیطان، (فرشتہ اس کو نیک کاموں کی رغبت دِلاتا رہتا ہے، اور شیطان بُرے کاموں کی) پھر جب انسان اللہ کا ذِکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب تک وہ ذکر اللہ میں مشغول نہیں ہوتا تو اپنی چونچ انسان کے دِل پر رکھ کر اس میں بُرائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے۔ (رواہ ابویعلی عن انس رضی اللہ عنہ مرفوعًا، مظہری) [۲]

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ یہ بیان ہے وسواس کا، یعنی وسوسہ ڈالنے والے جنات میں سے بھی ہوتے ہیں، اور اِنسانوں میں سے بھی، تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کی تلقین فرمائی کہ اللہ کی پناہ مانگیں جنات شیاطین کے شر سے بھی اور اِنسانی شیاطین کے شر سے بھی۔ اگر یہ شبہ ہو کہ وسوسہ جناتی شیاطین کی طرف سے ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ مخفی طور پر اِنسان کے قلب میں کوئی مخفی کلام ڈال دیں، مگر اِنسانی شیاطین تو کھلم کھلا سامنے آکر بات کرتے ہیں، اُن کا وسوسے سے کیا تعلق ہے تو جواب یہ ہے کہ انسانی شیاطین بھی اکثر ایسی باتیں کسی کے سامنے کرتے ہیں جن سے اس کے دِل میں کسی معاملے کے متعلق ایسے شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں جن کو وہ صراحۃً نہیں کہتے۔ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب ''الفوائد فی مشکلات القرآن'' میں فرمایا کہ انسانی شیطان کے شر سے مراد خود اپنے نفس کا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دِل میں بُرے کاموں کی طرف رغبت ڈالتا ہے، اسی طرح خود اِنسان کا اپنا نفس بھی بُرے ہی کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنا سکھلایا ہے حدیث میں: ''اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَشَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ'' [۳] یعنی یا اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر سے بھی اور شیطان کے شر اور شرک سے بھی۔

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۲۰ ص:۲۶۱

[۲] تفسیر المظہری ج:۱۰ ص:۳۸۰ ومسند ابی یعلی الموصلی، رقم الحدیث: ۴۳۰۱

[۳] مصنف ابن ابی شیبۃ کتاب الأدب باب ما یقول الرجل إذا نام وإذا استیقظ، رقم الحدیث: ۲۶۵۲۳

شیطانی وساوس سے پناہ مانگنے کی بڑی اہمیت

ابن کثیر [۱] نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انسان کو اس کی تلقین فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تین صفتیں: رَبّ، مَلِك، اِلٰـه ذِکر کر کے اس سے شیطانی وساوس اور وسائس سے پناہ مانگنا چاہئے، کیونکہ ہر اِنسان کے ساتھ ایک قرین (ساتھی) شیطان لگا ہوا ہے، جو ہر قدم پر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ انسان کو تباہ و برباد کر دے، اوّل تو اُس کو گناہوں کی رغبت دیتا ہے اور طرح طرح سے اس اُس کو بہلا کر گناہوں کی طرف لے جاتا ہے، اگر اس میں کامیاب نہ ہوا تو اِنسان جو طاعات وعبادت کرتا ہے اُس کو خراب اور ضائع کرنے کے لئے رِیا و نمود اور غرور و تکبر کے وسوسے دِل میں ڈالتا ہے، علم والوں کے دِلوں میں عقائدِ حقہ کے متعلق شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے شر سے وہی بچ سکتا ہے جس کو اللہ ہی بچائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اس کا قرین (ساتھی) شیطان مسلط نہ ہو، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے ساتھ بھی یہ قرین ہے۔ فرمایا ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے مقابلے میں میری اعانت فرمائی اور اُس کو ایسا کر دیا کہ وہ بھی مجھے بجز خیر کے کسی بات کو نہیں کہتا۔ [۲]

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، ایک رات میں اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کی زیارت کے لئے مسجد میں گئیں، واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہوئے، گلی میں دو انصاری صحابی سامنے آ گئے تو آپ نے آواز دے کر فرمایا: ٹھہرو! میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دونوں نے بکمالِ ادب عرض کیا: سبحان اللہ یا رسول اللہ! (یعنی کیا آپ نے ہمارے بارے میں یہ خیال کیا کہ ہم کوئی بدگمانی کریں گے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اُس کی رگ و پے میں اَثر انداز ہوتا ہے، مجھے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دِلوں میں کوئی وسوسہ بدگمانی کا پیدا نہ کر دے (اس لئے میں نے بتلا دیا کہ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں)۔ [۳]

فائدہ

جیسا کہ خود بُرے کاموں سے بچنا انسان کے لئے ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے بارے میں بدگمانی کا

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۸ ص:۵۳۹

[۲] صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة ...إلخ، باب تحریش الشیطان ...إلخ، رقم الحدیث:۷۲۸۷

[۳] صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبلیس وجنوده، ج:۱ ص:۴۶۴

موقع دینا بھی دُرست نہیں، ایسے مواقع سے بچنا چاہئے جس سے لوگوں کے دِلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہو، اور کوئی ایسا موقع آجائے تو بات واضح کر کے تہمت کے مواقع کو ختم کر دینا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث نے شیطانی وسوسے کا بڑا خطرناک ہونا ثابت کیا ہے، جس سے بچنا آسان نہیں، بجز خدا کی پناہ کے۔

تنبیہ

یہاں جس وسوسے سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیارِ خود مشغول ہو، اور غیر اِختیاری وسوسہ وخیال جو دِل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اُس پر کوئی گناہ ہے۔

لطیفہ، سورۂ فلق اور ناس کے تعوّذات میں ایک فرق

سورۂ فلق میں تو اللہ تعالیٰ، جس کی پناہ مانگی گئی ہے، اُس کی صرف ایک صفت پر اِکتفا کیا گیا، یعنی: رَبّ الفلق، اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی وہ بہت ہیں، جن کو اوّلاً مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ میں اِجمالاً ذِکر کیا، پھر اُن میں سے خاص تین آفات کو الگ بیان فرمایا، اور سورۂ ناس میں جس چیز سے پناہ مانگی گئی ہے، وہ تو صرف ایک ہی ہے، یعنی وسواس اور جس کی پناہ مانگی ہے اُس کی اس جگہ تین صفات بیان کر کے پناہ کی دُعا کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا شر سب شرور وآفات سے بڑھا ہوا ہے، اوّل تو اس لئے کہ اور آفات ومصائب کا اثر تو اِنسان کے جسم اور دُنیاوی اُمور پر پڑتا ہے، بخلاف شیطان کے کہ یہ انسان کی دُنیا وآخرت دونوں کو اور بالخصوص آخرت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے، اس لئے اس کا ضرر اَشد ہے۔ دُوسرے یہ کہ دُنیا کی آفات کا تو کچھ نہ کچھ علاج مادّی بھی انسان کے قبضے میں ہے، اور وہ کرتا رہتا ہے، بخلاف شیطان کے کہ اس کے مقابلے کی کوئی مادّی تدبیر اِنسان کے بس کی نہیں، وہ تو اِنسان کو دیکھتا ہے اِنسان اُس کو نہیں دیکھتا، وہ انسان کے باطن میں غیر معلوم طریقے پر تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اس کا علاج صرف اللہ کا ذِکر اور اس کی پناہ لینا ہے۔

انسان کے دو دُشمن، اِنسان اور شیطان، اور دونوں دُشمنوں کا الگ الگ علاج

انسان کا دُشمن انسان بھی ہوتا ہے اور شیطان بھی اس کا دُشمن ہے، حق تعالیٰ نے انسانی دُشمن کو اوّل تو حسنِ خلق اور مدارات اور ترکِ انتقام وصبر کے ذریعے رام کرنے کی تلقین فرمائی ہے، اور جو ان تدبیروں سے باز نہ آئے اس کے ساتھ جہاد وقتال کا حکم دیا ہے۔ بخلاف دُشمنِ شیطانی کے، کہ اس کا مقابلہ صرف اِستعاذہ اور اللہ کی پناہ لینے سے تلقین کیا گیا

ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں قرآن کریم کی تین آیتیں اس مضمون کی لکھی ہیں جن میں ان دونوں دُشمنوں کا ذکر کر کے انسانی دُشمن کا دفاع حسنِ خلق، ترکِ انتقام اور اس کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا بتلایا، اور اس کے مقابلے میں شیطان کا دفاع اِستعاذہ تلقین فرمایا، ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پورے قرآن میں یہ تین ہی آیتیں اس مضمون کی آئی ہیں۔ ایک آیت سورۂ اَعراف میں ہے کہ اوّل فرمایا: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ یہ تو انسانی دُشمن کے مقابلے کی تدبیر اِرشاد فرمائی جس کا حاصل عفو ودرگزر اور اُس کو نیک کام کی تلقین اور اس کی بُرائی سے چشم پوشی بتلائی۔ اسی آیت میں آگے فرمایا: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ یہ تلقین دُشمنِ شیطانی کے مقابلے میں فرمائی، جس کا حاصل اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔ دُوسری آیت سورۂ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ میں اوّل دُشمنِ انسانی کے مقابلے کے علاج میں فرمایا: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ (المؤمنون:۹۶) یعنی بُرائی کو بھلائی کے ذریعے دفع کرو۔ پھر دُشمنِ شیطانی کے مقابلے کے لئے فرمایا: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ (المؤمنون) یعنی اے میرے رَبّ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے، اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ اور تیسری آیت سورۂ حٰمٓ سجدہ کی ہے، جس میں اوّل دُشمنِ انسانی کی مدافعت کے لئے ارشاد فرمایا: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ یعنی تم بُرائی کو بھلائی کے ذریعے دفع کرو، اگر ایسا کرلو گے تو مشاہدہ ہوگا کہ تمہارا دُشمن تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔ اسی آیت میں دُوسرا جزء دُشمنِ شیطانی کے مقابلے میں یہ فرمایا: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾ یہ تقریباً وہی الفاظ ہیں جو سورۂ اَعراف میں شیطان کے مقابلے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کا مقابلہ بجز اِستعاذہ کے کچھ نہیں۔ (ابنِ کثیر) [۱]

ان تینوں آیتوں میں انسانی دُشمن کا علاج عفو ودرگزر اور حسنِ سلوک سے بتلایا گیا ہے کیونکہ انسانی فطرت یہی ہے کہ حسنِ خلق اور احسان سے مغلوب ہوجاتا ہے، اور جو شریر النفس فطری انسانی صلاحیت کھو بیٹھے ہوں، ان کا علاج دُوسری آیات میں جہاد وقتال بتلایا گیا ہے کیونکہ وہ کھلے دُشمن ہیں، کھلے ساز وسامان کے ساتھ سامنے آتے ہیں، ان کی قوت کا مقابلہ قوت سے کیا جاسکتا ہے، بخلاف شیطانِ لعین کے کہ وہ اپنی فطرت میں شریر ہے، اِحسان اور عفو ودرگزر اس پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالتا ہے جس سے یہ اپنی شرارت سے باز آجائے، اور نہ ظاہری مقابلہ اس کا جہاد وقتال سے ہوسکتا ہے، یہ دونوں قسم کی نرم وگرم تدبیریں صرف انسانی دُشمن کے مقابلے میں چلتی ہیں، شیطان کے مقابلے میں نہیں چلتیں، اس لئے اُس کا

[۱] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورة الفاتحة، ج:۱ ص:۱۱۰ (هٰذا آخر ما اردنا من التّخريج، اللّهم ربّنا تقبّل منّا انّك انت السّميع العليم، وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وآله واصحابه اجمعين)

علاج صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا اور ذِکر اللہ میں مشغول ہو جانا ہے، جو پورے قرآن میں تلقین کیا گیا ہے اور اسی پر قرآن کو ختم کیا گیا ہے۔

اِنسانی اور شیطانی دُشمن کے مقابلے میں انجام کے اعتبار سے بڑا فرق

اُوپر قرآنی تعلیمات میں انسانی دُشمن کا دِفاع اوّل اِحسان اور صبرِ جمیل سے بتلایا گیا ہے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو جہاد و قتال سے، اور دونوں صورتوں میں مقابلے کرنیوالا مؤمن کامیاب ہی کامیاب ہے، بالکل ناکامی مؤمن کے لئے ممکن ہی نہیں، کیونکہ دُشمن سے مقابلے میں یہ غالب آگیا تب تو اس کی کامیابی کھلی ہوئی ہے، اور اگر شکست کھا گیا یا مقتول بھی ہو گیا تو آخرت کا اجر و ثواب اور شہادت کے فضائل اُس کو اتنے بڑے ملیں گے جو دُنیا کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ غرض انسانی دُشمن کے مقابلے میں ہار جانا بھی مؤمن کے لئے کوئی مضرّت نہیں، بخلاف شیطان کے کہ اس کی خوشامد اور اس کو راضی کرنا بھی گناہ ہے، اور اس کے مقابلے میں ہار جانا تو آخرت کو تباہ کر لینا ہے، یہی وجہ ہے جس کے لئے دُشمنِ شیطانی کی مدافعت کے واسطے حق تعالیٰ ہی کی پناہ لینا علاج ہے، اس کی پناہ کے سامنے شیطان کی ہر تدبیر ضعیف و بے اثر ہے۔

کیدِ شیطانی ضعیف ہے

مذکورہ وجوہ سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ شیطان کی طاقت بڑی ہے، اس کا مقابلہ مشکل ہے، اسی خیال کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝۷۶ [1] (النساء) اور سورۂ نحل میں جہاں قرآن پڑھنے کے وقت اِستعاذہ کا حکم دیا گیا ہے، اُس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ ایمان والوں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں پر یعنی اللہ کی پناہ لینے والوں پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں ہوتا، ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝۹۸ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۹۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝۱۰۰ یعنی جب تو قرآن پڑھنے لگے تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے، اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رَبّ پر بھروسہ کرتے ہیں، اس کا زور تو ان ہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو شریک مانتے ہیں۔

سورۂ نحل کی تفسیر معارف القرآن جلد پنجم ص: ۴۵۵ میں اس آیت کی پوری تشریح اور اِستعاذہ کے مسائل اور شرعی اَحکام کی تفصیل گزر چکی ہے، اُس کو دیکھ لیا جائے۔

---

[1] ترجمہ: واقع میں شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم کے فاتحہ اور خاتمہ میں مناسبت

قرآنِ کریم کو حق تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے، جس کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اُس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دُنیا و دِین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد اس کے استعمال میں ہر قدم پر شیطانِ لعین کے مکر و فریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے، اس لئے اس جال کو پاش پاش کرنے کی مؤثر تدبیر اِستعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔

وَبِاخْتِتَامِہٖ تَمَّ بِحَمْدِ اللہِ وَفَضْلِہٖ وَکَرَمِہٖ وَعَوْنِہٖ تَفْسِیْرُ الْقُرْآنِ الْکَرِیْمِ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ وَظَاھِرَہٗ وَبَاطِنَہٗ، فَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ اِلَیْہِ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللہُ، وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَصَفْوَۃِ رُسُلِہٖ وَاِمَامِ اَنْبِیَآئِہٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیّیْنَ وَسَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ صَلَوَاتُ اللہِ وَسَلَامُہٗ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، وَذَالِکَ فِی الْحَادِیْ وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ شَعْبَانَ ۱۳۹۲ھ ضَحْوَۃَ یَوْمِ السَّبْتِ، وَمِنْ غَرِیْبِ الْاِتِّفَاقِ اَنَّ ھٰذَا الْیَوْمَ ھُوَ الْیَوْمُ الَّذِیْ وُلِدْتُّ فِیْہِ، فَفِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ تَمَّتْ مِنْ عُمُرِ ھٰذَا الْعَبْدِ الضَّعِیْفِ الْجَانِیْ عَلٰی نَفْسِہٖ سَبْعَۃٌ وَّسَبْعُوْنَ سَنَۃً وَاَخَذْتُ فِی الثَّامِنِ وَالسَّبْعِیْنِ، وَاللہَ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَدْعُوْ وَاَرْجُوْ اَنْ یَّجْعَلَ خَیْرَ عُمُرِیْ آخِرَہٗ وَخَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِیْمَہٗ وَخَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ اَلْقَاہُ فِیْہِ، بِبَرَکَۃِ کِتَابِہِ الْمُبِیْنِ وَنَبِیِّہِ الْاَمِیْنِ، وَاَنْ یَّتَقَبَّلَ مِنِّیْ جُھْدَ الْمُقِلِّ الَّذِیْ اَتْعَبْتُ فِیْہِ نَفْسِیْ فِیْ اَمْرَاضٍ وَّھُمُوْمٍ وَّضُعْفِ الْقُوٰی، وَمَا ھُوَ اِلَّا بِتَوْفِیْقِہٖ وَعَوْنِہٖ، وَاَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْئَاتِیْ وَتَقْصِیْرَاتِیْ فِیْ حُقُوْقِ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ، وَاَنْ یَّنْفَعَ بِہِ الْمُسْلِمِیْنَ اِلٰی اَمَدٍ بَعِیْدٍ، وَاَنْ یَّجْعَلَہٗ ذُخْرًا لِّیَوْمٍ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلَالٌ وَّلَا یُجْدِیْ فِیْہِ مَالٌ وَّلَا آلٌ، فَسُبْحَانَ اللہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللہِ الْعَظِیْمِ

وَتَمَّ النَّظَرُ الثَّانِیْ عَلَی الْمُجَلَّدِ الثَّامِنِ مِنْ تَفْسِیْرِ مَعَارِفِ الْقُرْآنِ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ عَاشِرَ شَوَّالِ ۱۳۹۲ھ بَعْدَ مَا اَخَذْتُ فِیْہِ لِثَالِثِ رَمَضَانَ ۱۳۹۲ھ فَکَانَ فِیْ نَحْوِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

تفسیر معارف القرآن میں قرآنِ کریم کی سورتوں کی فہرست

جامعہ دار العلوم کراچی

JAMIA DARULULOOM KARACHI